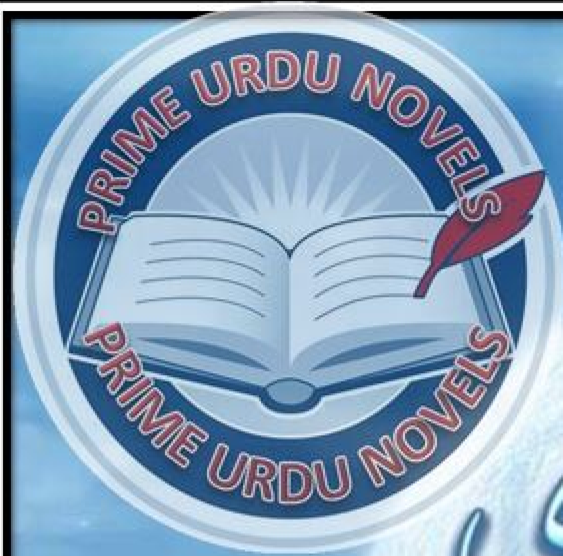


آبِ حیات

تَبارَکَ الَّذِی

اللہ کی ذات جو تمام خوبیوں کی مالک ہے۔

جسکی محبت آبِ حیات ہے۔۔۔

عمیرہ احمد

عمیرہ احمد

آبِ حیات



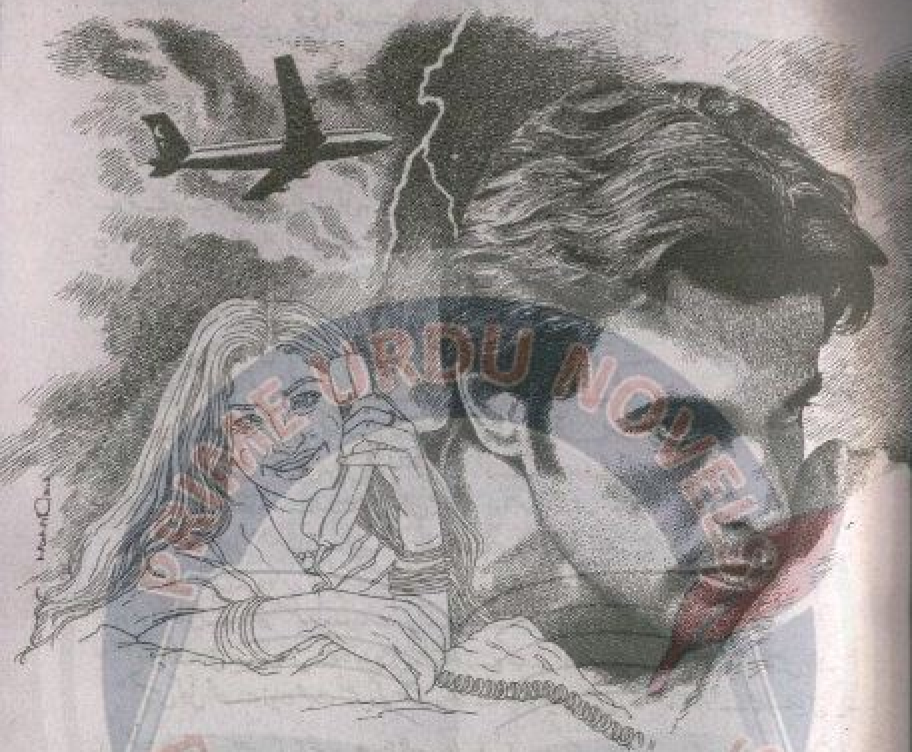
2

♠

اس نے دور سے سالار کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں سوفٹ ڈرنک کا ایک گلاس تھا۔

"تم یہاں کیوں آکر بیٹھ گئیں؟" امامہ کے قریب آتے ہوئے اس نے دور سے کہا۔

"ایسے ہی۔ شال لینے آئی تھی۔ پھر یہیں بیٹھ گئی۔" وہ مسکرائی۔ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سالار نے



سوفٹ ڈرنک کا گلاس اپنی ٹانگوں کے درمیان نچلی سیڑھی پر رکھ دیا۔ امامہ لکڑی کے ستون سے ٹیک لگائے ایک گھٹنے پر کھانے کی پلیٹ ٹکائے کھاتے ہوئے دور لان میں ایک کینوپی کے نیچے اسٹیج پر بیٹھے گلوکار کو دیکھ رہی تھی جو نئی غزل شروع کرنے سے پہلے سازندوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ سالار نے کانٹا اٹھا کر اس کی پلیٹ سے کباب کا ایک ٹکڑا اپنے منہ میں ڈالا۔ وہ بھی اب گلوکار کی طرف متوجہ تھا جو اپنی نئی غزل شروع کرچکا تھا۔

"انجوائے کررہی ہو؟" سالار نے اس سے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے مسکرا کر کہا وہ غزل سن رہی تھی۔

کسی کی آنکھ پرنم ہے محبت ہوگئی ہوگی
زبان پر قصہ غم ہے محبت ہوگئی ہوگی

وہ بھی غزل سننے لگا تھا۔

کبھی ہنستا کبھی روتا، کبھی ہنس ہنس کر رو دیتا
عجب دل کا یہ عالم ہے، محبت ہوگئی ہوگی

"اچھا گارہا ہے۔" امامہ نے ستائشی انداز میں کہا۔ سالار نے کچھ کہنے کے بجائے سر ہلادیا۔

خوشی کا حد سے بڑھ جانا بھی' اب اک بے قراری ہے
نہ غم ہونا بھی اک غم ہے' محبت ہو گئی ہو گی

سالار سوفٹ ڈرنک پیتے پیتے ہنس پڑا۔ امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ جیسے کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔
"تمہیں کچھ دینا چاہ رہا تھا میں۔" وہ جیکٹ کی جیب میں سے کچھ ڈھونڈ کر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔
"بہت دنوں سے دینا چاہتا تھا لیکن۔" وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈبیا تھی۔ امامہ کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ آئی۔ "اچھا تو اسے خیال آ گیا۔" اس نے ڈبیا لیتے ہوئے سوچا اور اسے کھولا۔ وہ ساکت رہ گئی۔ اندر ایئر رنگز تھے۔ ان ایئر رنگز سے تقریباً" ملتے جلتے۔ جو وہ اکثر اپنے کانوں میں پہنے رہتی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر سالار کو دیکھا۔
"میں جانتا ہوں یہ اتنے ویلیو ایبل تو نہیں ہوں گے جتنے تمہارے فادر کے۔ لیکن مجھے اچھا لگے گا اگر کبھی کبھار تم انہیں پہنو۔" ان ایئر رنگز کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
"تم نہیں پہننا چاہتیں تو بھی ٹھیک ہے۔ میں ریپلیس کرنے کے لیے نہیں دے رہا ہوں۔" سالار نے اس کی آنکھوں میں نمودار ہوتی نمی دیکھ کر بے ساختہ کہا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ بہت ساری چیزیں پہلے ہی اپنی جگہ بدل چکی ہیں۔ اور اپنی جگہ بنا چکی ہیں۔ اس کی خواہش اور ارادے کے نہ ہونے کے باوجود۔
کچھ کہنے کے بجائے امامہ نے اپنے دائیں کان میں لٹکا ہوا جھمکا اتارا۔
"میں پہنا سکتا ہوں؟" سالار نے ایک ایئر رنگ نکالتے ہوئے پوچھا۔ امامہ نے سر ہلا دیا۔ سالار نے باری باری اس کے دونوں کانوں میں وہ ایئر رنگ پہنا دیے۔
وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔ وہ بہت دیر تک کچھ کہے بغیر مبہوت اسے دیکھتا رہا۔
"اچھی لگ رہی ہو۔" وہ اس کے کانوں میں لٹکتے ہلکورے کھاتے موتی کو چھوتے ہوئے مدھم آواز میں بولا۔
"تمہیں کوئی مجھ سے زیادہ محبت نہیں کر سکتا۔ مجھ سے زیادہ خیال نہیں رکھ سکتا تمہارا۔ میرے پاس ایک واحد قیمتی چیز تم ہو۔" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ وعدہ کر رہا تھا۔ یاد دہانی کرا رہا تھا یا کچھ جتا رہا تھا۔ وہ جھک کر اب اس کی گردن چوم رہا تھا۔
"مجھے نوازا گیا ہے۔" سیدھا ہوتے ہوئے اس نے سرشاری سے کہا۔
"رومانس ہو رہا ہے؟" اپنے عقب میں آنے والی کامران کی آواز پر وہ دونوں ٹھٹکے تھے۔ وہ شاید شارٹ کٹ کی وجہ سے پردے کے اس دروازے سے نکلا تھا۔
"کوشش کر رہے ہیں۔" سالار نے پلٹے بغیر کہا۔
"گڈ لک۔" وہ کہتے ہوئے ان کے پاس سیڑھیاں اترتا ہوا انہیں دیکھے بغیر چلا گیا۔ امامہ کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ وہ جھینپ گئی تھی۔ سالار اور اس کی فیملی کم از کم ان معاملات میں بے حد آزاد خیال تھے۔

کسی کو سامنے پا کر' کسی کے سرخ ہونٹوں پر
انوکھا سا تبسم ہے' محبت ہو گئی ہو گی

امامہ کو لگا وہ زیر لب گلوکار کے ساتھ گنگنا رہا ہے۔

جہاں ویران راہیں تھیں' جہاں حیران آنکھیں تھیں
وہاں پھولوں کا موسم ہے' محبت ہو گئی ہو گی

لکڑی کی ان سیڑھیوں پر ایک دوسرے کے قریب بیٹھے وہ خاموشی کو توڑتی آس پاس کے پہاڑوں میں گونج کی طرح پھیلتی گلوکار کی سریلی آواز کو سن رہے تھے۔ زندگی کے وہ لمحے یادوں کا حصہ بن رہے تھے۔ دوبارہ نہ آنے کے لیے گزر رہے تھے۔

ان کے اپارٹمنٹ کی دیوار پر لگنے والی ان دونوں کی پہلی اکٹھی تصویر اس فارم ہاؤس کی سیڑھیوں ہی کی تھی۔ سرخ لباس میں گولڈن کڑھائی والی سیاہ پشمینہ شال اپنے بازوؤں کے گرد اوڑھے کھلے سیاہ بالوں کو کانوں کی لوؤں کے پیچھے سمیٹے خوشی اس کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک میں نہیں' بلکہ اس قرب میں جھلک رہی تھی جو اس اور سالار کے درمیان نظر آرہا تھا۔ سفید شرٹ اور سیاہ جیکٹ میں اسے اپنے ساتھ لگائے سالار کی آنکھوں کی چمک جیسے اس فوٹوگراف میں موجود دوسری ہر شے کو مات کررہی تھی۔ کوئی بھی کیمرے کے لیے بنائے ہوئے اس ایک پوز میں نظر آنے والے جوڑے کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ضرور ٹھٹکتا۔

سکندر نے اس فوٹوگراف کو فریم کرواکر انہیں ہی نہیں بھیجا تھا' انہوں نے اپنے گھر کی فیملی وال فوٹوز میں بھی اس تصویر کا اضافہ کیا تھا۔

9

وہ شخص دیوار پر لگی اس تصویر کے سامنے اب پچھلے پندرہ منٹ سے کھڑا تھا۔ پلکیں جھپکائے بغیر ٹکٹکی لگائے اس لڑکی کا چہرہ دیکھتے ہوئے۔ چہرے میں کوئی شباہت تلاش کرتے ہوئے۔ اس شخص کے شجرے میں دبے آتش فشاں کی شروعات ڈھونڈتے ہوئے۔ اگر وہ اس شخص کو نشانہ بنا سکتا تھا تو اسی ایک جگہ سے بنا سکتا تھا۔ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے ساتھ ساتھ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ خودکلامی۔ ایک اسکینڈل کا تانا بانا تیار کرنے کے لیے ایک کے بعد ایک مکروفریب کا جال۔ جھوٹ۔ حقائق کو مخفی کرنے۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر اپنے عقب میں بیٹھے لوگوں کو کچھ ہدایات دینے کے لیے مڑا تھا۔

سی آئی اے ہیڈکوارٹرز کے اس کمرے کی دیواروں پر لگے بورڈز چھوٹے بڑے نوٹس' چارٹس' فوٹوگرافس اور ایڈریسز کی چٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔

کمرے میں موجود چار آدمیوں میں سے تین اس وقت بھی کمپیوٹرز پر مختلف ڈیٹا کھنگالنے میں لگے ہوئے تھے۔ یہ کام وہ پچھلے ڈیڑھ ماہ سے کررہے تھے۔ اس کمرے میں جگہ جگہ بڑے بڑے ڈبے پڑے تھے جو مختلف فائلز' کیسز' میگزینز اور نیوز پیپرز کے تراشوں اور دوسرے ریکارڈز سے بھرے ہوئے تھے۔ کمرے میں موجود ریکارڈ کیبنٹس پہلے ہی بھری ہوئی تھیں۔ کمرے میں موجود تمام ڈیٹا ان کمپیوٹرز کی ہارڈ ڈسکس میں بھی محفوظ تھا۔

کمرے میں موجود دو آدمی پچھلے ڈیڑھ ماہ سے اس شخص کے بارے میں آن لائن آنے والا تمام ریکارڈ اور معلومات اکٹھی کرتے رہے تھے۔ کمرے میں موجود تیسرا آدمی اس شخص اور اس کی فیملی کے ہر فرد کی ای میلز کا ریکارڈ کھنگالتا رہا تھا۔ چوتھا شخص اس فیملی اور مالی معلومات کو چیک کرتا رہا تھا۔ اس ساری جدوجہد کا نتیجہ ان تصویروں اور شجرہ نسب کی صورت میں ان بورڈز پر موجود تھا۔

وہ چار لوگ دعوا کرسکتے تھے کہ اس شخص اور اس کی فیملی کی پوری زندگی کا ریکارڈ اگر خدا کے پاس موجود تھا تو اس کی ایک کاپی اس کمرے میں تھی۔ اس شخص کی زندگی کے بارے میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں تھی جو ان کے علم میں نہیں تھی یا جس کے بارے میں وہ ثبوت نہیں دے سکتے تھے۔

سی آئی اے کے شدید آپریشنز سے لے کر اس کی گرل فرینڈز تک اور اس کے مالی معاملات سے لے کر اس کی

اولاد کی پرسنل اور پرائیویٹ لائف تک ان کے پاس ہر چیز کی تفصیلات تھیں۔
لیکن سارا مسئلہ یہ تھا کہ ڈیڑھ ماہ کی اس محنت اور پوری دنیا سے اکٹھے کیے ہوئے اس ڈیٹا میں سے وہ ایسی کوئی چیز نہیں نکال سکے تھے جس سے اس کی کردار کشی کر سکتے۔
وہ ٹیم جو پندرہ سال سے اسی طرح کے مقاصد پر کام کرتی رہی تھی، یہ پہلی بار تھا کہ وہ اتنی سر توڑ محنت کے باوجود اس شخص اور اس کے گھرانے کے کسی شخص کے حوالے سے کسی قسم کا بری حرکت یا ناشائستہ عمل کی نشان دہی نہیں کر پائی تھی۔ وہ سو پوائنٹس کی وہ چیک لسٹ جو انہیں دی گئی تھی وہ دو سو کراسز سے بھری ہوئی تھی اور یہ ان سب کی زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا۔ انہوں نے ایسا صاف ریکارڈ کسی کا نہیں دیکھا تھا۔
کسی حد تک ستائش کے جذبات رکھنے کے باوجود وہ ایک آخری کوشش کر رہے تھے۔ ایک آخری کوشش۔
کمرے کے ایک بورڈ سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے بورڈ تک جاتے جاتے وہ آدمی اس کے مجوزہ بیٹے کی اس تصویر پر رکا تھا۔ اس تصویر کے آگے پیچھے اور تصویریں بھی تھیں اور ان کے ساتھ کچھ بلٹ پوائنٹس۔ ایک دم جیسے بجلی کا سا جھٹکا لگا تھا۔ اس نے اس لڑکی کی تصویر کے نیچے اس کی تاریخ پیدائش دیکھی پھر مڑ کر ایک کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کو وہ سال بتاتے ہوئے کہا۔
"دیکھو! یہ اس سال کہاں تھا؟"
کمپیوٹر پر بیٹھے ہوئے آدمی نے چند منٹوں کے بعد اسکرین دیکھتے ہوئے کہا۔
"پاکستان میں۔" اس شخص کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آئی تھی۔
"کب سے کب تک؟" اس آدمی نے اگلا سوال کیا۔ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی نے تاریخیں بتائیں۔
"آخر کار ہمیں کچھ مل ہی گیا۔" اس آدمی نے بے اختیار ایک سیٹی بجاتے ہوئے کہا تھا۔ انہیں جہاز ڈبونے کے لیے تارپیڈو مل گیا تھا۔
یہ پندرہ منٹ پہلے کی روداد تھی۔ پندرہ منٹ بعد اب وہ جانتا تھا کہ اسے اس آتش فشاں کا منہ کھولنے کے لیے کیا کرنا تھا۔

☆

وہ یہاں کسی جذباتی ملاقات کے لیے نہیں آئی تھی۔ سوال و جواب کے کسی لمبے چوڑے سیشن کے لیے بھی نہیں۔ لعنت و ملامت کے کسی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بھی نہیں۔ وہ یہاں کسی کا ضمیر جھنجوڑنے آئی تھی نہ ہی کسی سے نفرت کا اظہار کرنے کے لیے۔ نہ ہی وہ کسی کو یہ بتانے آئی تھی کہ وہ اذیت کے ماؤنٹ ایورسٹ پر کھڑی ہے۔ نہ ہی وہ اپنے باپ کو گریبان سے پکڑنا چاہتی تھی۔ نہ اسے یہ بتانا چاہتی تھی کہ اس نے اس کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ اس کے صحت مند ذہن اور جسم کو ہمیشہ کے لیے مفلوج کر دیا تھا۔
وہ یہ سب کچھ کہتی۔ یہ سب کچھ کرتی، اگر اسے یقین ہوتا کہ یہ سب کرنے کے بعد اسے سکون مل جائے گا۔ اس کا باپ احساس جرم یا پچھتاوے جیسی کوئی چیز پالنے لگے گا۔
پچھلے کئی ہفتے سے وہ آبلہ پا تھی۔ وہ راتوں کو سکون آور گولیاں لیے بغیر سو نہیں پا رہی تھی اور اس سے بڑھ کر تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ وہ سکون آور ادویات لینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سوچنا چاہتی تھی اس بھیانک خواب کے بارے میں جس میں وہ چند ہفتے پہلے داخل ہوئی تھی اور جس سے اب وہ ساری زندگی

نہیں نکل سکتی تھی۔
وہ یہاں آنے سے پہلے پچھلی پوری رات روتی رہی تھی۔ یہ بے بسی کی وجہ سے نہیں تھا۔ یہ اذیت کی وجہ سے بھی نہیں تھا۔ یہ اس غصے کی وجہ سے تھا جو وہ اپنے باپ کے لیے اپنے دل میں اتنے دنوں سے محسوس کر رہی تھی۔ ایک آتش فشاں تھا یا جیسے کوئی الاؤ' جو اس کو اندر سے سلگا رہا تھا' اندر سے جلا رہا تھا۔

کسی سے پوچھے' کسی کو بتائے بغیر یوں اٹھ کر وہاں آجانے کا فیصلہ جذباتی تھا' احمقانہ تھا اور غلط تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار ایک جذباتی' احمقانہ اور غلط فیصلہ بے حد سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ ایک اختتام چاہتی تھی وہ اپنی زندگی کے اس باب کے لیے' جس کے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ سکتی تھی اور جس کی موجودگی کا انکشاف اس کے لیے دل دہلا دینے والا تھا۔

اس کا ایک ماضی تھا۔ وہ جانتی تھی لیکن اسے ابھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کے ماضی کا "ماضی" بھی ہو سکتا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر تھا جب وہ "خوش" تھی اپنی زندگی میں۔ جب وہ خود کو باسعادت سمجھتی تھی۔ اور "مقرب" سے "ملعون" ہونے کا فاصلہ اس نے چند سیکنڈز میں طے کیا تھا۔ چند سیکنڈز شاید زیادہ وقت تھا۔ شاید اس سے بھی بہت کم وقت تھا جس میں وہ احساس کمتری' احساس محرومی' احساس ندامت اور ذلت و بدنامی کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہوئی تھی۔

اور یہاں وہ اس ڈھیر کو دوبارہ وہی شکل دینے آئی تھی۔ اس بوجھ کو اس شخص کے سامنے اتار پھینکنے آئی تھی' جس نے وہ بوجھ اس پر لادا تھا۔ زندگی

کسی کو اس وقت یہ پتا نہیں تھا کہ وہ وہاں تھی۔ کسی کو پتا ہوتا تو وہ وہاں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کا سیل فون پچھلے کئی گھنٹوں سے آف تھا۔ وہ چند گھنٹوں کے لیے خود کو اس دنیا سے دور لے آئی تھی جس کا وہ حصہ تھی۔ اس دنیا کا حصہ' یا پھر اس دنیا کا حصہ جس میں وہ اس وقت موجود تھی۔؟ یا پھر اس کی کوئی بنیاد نہیں تھی۔۔ وہ کہیں کی نہیں تھی۔ اور جہاں کی بھی تھی' جس سے تعلق رکھتی تھی' اس کو اپنا نہیں سکتی تھی۔

انتظار لمبا ہو گیا تھا۔ انتظار ہمیشہ لمبا ہوتا ہے۔ کسی بھی چیز کا انتظار ہمیشہ لمبا ہوتا ہے۔ چاہے آنے والی شے پاؤں کی زنجیر بننے والی ہو یا گلے کا ہار۔ سر کا تاج بن کر سجنا ہو اس نے یا پاؤں کی جوتی۔ انتظار ہمیشہ لمبا ہی لگتا ہے۔

وہ ایک سوال کا جواب چاہتی تھی اپنے باپ سے۔ صرف ایک چھوٹے سے سوال کا۔ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا؟

6

♠

گرینڈ حیات ہوٹل کا بال روم اس وقت Scripps National Spelling Bee کے 92 ویں مقابلے کے فائنل میں پہنچنے والے فریقین سمیت دیگر شرکا ان کے والدین' بہن بھائیوں اور اس مقابلے کو دیکھنے کے لیے موجود لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہونے کے باوجود ایسا خاموش تھا کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنی جا سکے۔

وہ دو افراد جو فائنل میں پہنچے تھے ان کے درمیان چودھواں راؤنڈ کھیلا جا رہا تھا۔ تیرہ سالہ نیسی اپنے لفظ کو ہجے کرنے کے لیے اپنی جگہ پر آچکی تھی۔ پچھلے بانوے سالوں سے اس ہال روم میں دنیا کے بہترین اسپیلر کی تاج پوشی ہو رہی تھی۔ امریکا کی مختلف ریاستوں کے علاوہ دنیا کے بہت سارے ممالک میں اسپیلنگ بی کے مقامی مقابلے جیت کر آنے والے پندرہ سال سے کم عمر کے بچے اس آخری راؤنڈ کو جیتنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ ایسی ہی ایک بازی کے شرکا آج بھی اسٹیج پر موجود تھے۔

"Sassafras" بینسی نے رکی ہوئی سانس کے ساتھ پروناؤنسر کا لفظ سنا۔ اس نے پروناؤنسر کو لفظ دہرانے کے لیے کہا، پھر اس نے اس لفظ کو خود دہرایا۔ وہ چیمپئن شپ ورڈز میں سے ایک تھا لیکن فوری طور پر اسے وہ یاد نہیں آسکا۔ بہرحال اس کی ساؤنڈ سے وہ اسے بہت مشکل نہیں لگا تھا اور اگر سننے میں اتنا مشکل نہیں تھا تو اس کا مطلب تھا، وہ ترکی لفظ ہوسکتا تھا۔

نو سالہ دوسرا فائنلسٹ اپنی کرسی پر بیٹھے، گلے میں لٹکے اپنے نمبر کارڈ کے پیچھے انگلی سے اس لفظ کی ہجے کرنے میں لگا ہوا تھا۔ وہ اس کا لفظ نہیں تھا لیکن وہاں بیٹھا ہر بچہ ہی لاشعوری طور پر اس وقت یہی کرنے میں مصروف تھا، جو مقابلے سے آؤٹ ہوچکا تھا۔

بینسی کا ریگولر ٹائم ختم ہوچکا تھا۔

"S-A-S-S" اس نے رک رک کر لفظ کی ہجے کرنا شروع کی۔ وہ پہلے چار حرف بتانے کے بعد ایک لمحہ کے لیے رکی۔ زیر لب اس نے باقی کے پانچ حرف دہرائے، پھر دوبارہ بولنا شروع کیا۔

"A-F-R" وہ ایک بار پھر رکی۔ دوسرے فائنلسٹ نے بیٹھے بیٹھے زیر لب آخری دو حرف کو دہرایا۔

"U-S" مائیک کے سامنے کھڑی بینسی نے بھی بالکل اسی وقت یہی دو حرف بولے اور پھر بے یقینی سے اس گھنٹی کو بجتے سنا جو اسپیلنگ کے غلط ہونے پر بجتی تھی۔ شاک صرف اس کے چہرے پر نہیں تھا۔ اس دوسرے فائنلسٹ کے چہرے پر بھی تھا۔ پروناؤنسر اب Sassafras کے درست اسپیلنگ دہرا رہا تھا۔ بینسی نے بے اختیار اپنی آنکھیں بند کیں۔

"آخری لیٹر سے پہلے A ہی ہونا چاہیے تھا۔ میں نے U کیا سوچ کر لگا دیا؟" اس نے خود کو کوسا۔ تقریباً" فق رنگت کے ساتھ بینسی گراہم نے مقابلے کے شرکا کے لیے رکھی ہوئی کرسیوں کی طرف چلنا شروع کردیا۔ ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ یہ ممکنہ رنرز اپ کو کھڑے ہو کر دی جانے والی داد و تحسین تھی۔ نو سالہ دوسرا فائنل میں پہنچنے والا بھی اس کے لیے کھڑا تالیاں بجا رہا تھا۔ بینسی کے قریب پہنچنے پر اس نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ بینسی نے ایک مدھم مسکراہٹ کے ساتھ اسے جواب دیا اور اپنی سیٹ سنبھال لی۔ ہال میں موجود لوگ دوبارہ اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے اور وہ دوسرا فائنلسٹ مائیک کے سامنے اپنی جگہ پر آچکا تھا۔ بینسی اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے ایک موہوم سی امید تھی کہ اگر وہ بھی اپنے لفظ کے غلط ہجے کرتا تو وہ ایک بار پھر اپنے فائنل راؤنڈ میں واپس آجاتی۔

"That was a catch 22" اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکی، وہ اس کے لیے کہہ رہا تھا یا وہ اس لفظ کو واقعی اپنے لیے بھی Catch 22 ہی سمجھ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی ایسا ہوتا۔ ہر کوئی چاہتا۔

سینٹر اسٹیج پر اب وہ نو سالہ فائنلسٹ تھا۔ اپنی اسی شرارتی مسکراہٹ اور گہری سیاہ چمکتی آنکھوں کے ساتھ۔ اس نے اسٹیج سے نیچے بیٹھے چیف پروناؤنسر کو دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ جوناتھن جواباً" مسکرایا تھا اور صرف جوناتھن ہی نہیں، وہاں سب کے لبوں پر ایسی ہی مسکراہٹ تھی۔ وہ نو سالہ فائنلسٹ اس چیمپئن شپ کو دیکھنے والے حاضرین کا سویٹ ہارٹ تھا۔

اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ چمکتی ہوئی تقریباً" گول آنکھیں جو کسی کارٹون کریکٹر کی طرح پُرجوش اور جان دار تھیں اور اس کے تقریباً" گلابی ہونٹ جن پر وہ وقتاً" فوقتاً" زبان پھیر رہا تھا اور جن پر آنے والا ذرا سا خم بہت سے لوگوں کو بلاوجہ مسکرانے پر مجبور کررہا تھا۔ وہ "معصوم فتنہ" تھا۔ یہ صرف اس کے والدین جانتے تھے، جو دوسرے بچوں کے والدین کے ساتھ اسٹیج کی بائیں طرف پہلی رو میں اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں

بیٹھے دوسرے فائنلسٹس کے والدین کے برعکس وہ بے حد پرسکون تھے۔ ان کے چہرے پر اب بھی کوئی ٹینشن نہیں تھی جب ان کا بیٹا چیمپئن شپ بورڈ کے لیے آکر کھڑا تھا۔ ٹینشن اگر کسی کے چہرے پر تھی تو وہ ان کی سات سالہ بیٹی کے چہرے پر تھی جو دو دن پر مشتمل اس پورے مقابلے کے دوران ہلکان رہی تھی اور وہ اب بھی آنکھوں پر گلاسز ٹکائے پورے انہماک کے ساتھ اپنے نو سالہ بھائی کو دیکھ رہی تھی جو پرونائونسر کے لفظ کے لیے تیار تھا۔

"Cappelletti" جوناتھن نے لفظ ادا کیا۔ اس فائنلسٹ کے چہرے پر بے اختیار ایسی مسکراہٹ آئی تھی، جیسے وہ بمشکل اپنی ہنسی کو کنٹرول کر رہا ہو۔ اس کی آنکھیں پہلے کلاک وائز اور پھر اینٹی کلاک وائز گھومنا شروع ہوئی تھیں۔ ہال میں کچھ کھکھلاہٹیں ابھری تھیں۔ اس نے اس چیمپئن شپ میں اپنا ہر لفظ سننے کے بعد اسی طرح ری ایکٹ کیا تھا۔ بھنچی ہوئی مسکراہٹ اور گھومتی ہوئی آنکھیں۔۔۔ کمال کی خود اعتمادی تھی۔ کئی دیکھنے والوں نے اسے داد دی۔ اس کے حصے میں آنے والے الفاظ دوسروں کی نسبت زیادہ مشکل ہوتے تھے۔ یہ اس کے لیے مشکل وقت ہوتا تھا۔ لیکن بے حد روانی سے بغیر اٹکے بغیر گھبرائے اسی پُر اعتماد مسکراہٹ کے ساتھ وہ ہر پہاڑ سر کرتا رہا تھا اور اب وہ آخری چوٹی کے سامنے کھڑا تھا۔

"Definition Please" اس نے اپنا ریگولر ٹائم استعمال کرنا شروع کیا۔

"Language of origin" (اس زبان کا ماخذ) اس نے پرونائونسر کے جواب کے بعد اگلا سوال کیا۔

"اٹالین" اس نے پرونائونسر کے جواب کو دہراتے ہوئے کچھ سوچنے والے انداز میں ہونٹوں کو دائیں بائیں حرکت دی۔ اس کی بہن بے چینی اور تناؤ کی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے والدین اب بھی پرسکون تھے۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ لفظ اس کے لیے آسان تھا۔ وہ ایسے ہی تاثرات کے ساتھ پچھلے تمام الفاظ ہجے کرتا رہا تھا۔

"پلیز اس لفظ کو کسی جملے میں استعمال کریں۔" وہ اب پرونائونسر سے کہہ رہا تھا۔ پرونائونسر کا بتایا ہوا جملہ سننے کے بعد گلے میں لٹکے ہوئے نمبر کارڈ کی پشت پر انگلی سے اس لفظ کو لکھنے لگا۔

"اب آپ کا ٹائم ختم ہونے والا ہے۔" اسے آخری تیس سیکنڈز کے شروع ہونے پر اطلاع دی گئی جس میں اس نے اپنے لفظ کے ہجے کرنا تھا۔ اس کی آنکھیں گھومنا بند ہو گئیں۔

"Cappelletti" اس نے ایک بار پھر لفظ دہرایا۔

"C-A-P-P-E-L-I" وہ ہجے کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رکا۔ پھر ایک سانس لیتے ہوئے اس نے دوبارہ ہجے کرنا شروع کیا۔

"E-T-T-I"

ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا اور بہت دیر تک گونجتا رہا۔

اسپیلنگ بی کا نیا چیمپئن صرف ایک لفظ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔

تالیوں کی گونج تھمنے کے بعد جوناتھن نے اسے آگاہ کیا تھا کہ اسے اب ایک اضافی لفظ کے حرف بتانے ہیں۔

اس نے سر ہلایا۔ اس لفظ کے ہجے نہ کر سکنے کی صورت میں، نینسی ایک بار پھر مقابلے میں واپس آجاتی۔

"Weissnichtwo" اس کے لیے لفظ پرونائونس کیا گیا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوئی تھی۔ پھر اس کا منہ کھلا اور اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"اوہ مائی گاڈ!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ وہ سکتہ میں تھا اور پوری چیمپئن شپ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی آنکھیں اور وہ خود اس طرح جامد ہوا تھا۔

نینسی بے اختیار اپنی کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ تو کوئی ایسا لفظ آگیا تھا جو اسے دوبارہ چیمپئن شپ میں

واپس لا سکتا تھا۔

اس کے والدین کو پہلی بار اس کے تاثرات نے کچھ بے چین کیا تھا۔ ان کا بیٹا اب اپنے نمبر کارڈ سے اپنا چہرہ حاضرین سے چھپا رہا تھا۔ حاضرین اس کی انگلیوں اور ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑی آسانی سے اسکرین پر دیکھ سکتے تھے، اور ان میں سے بہت سوں نے اس بچے کے لیے واقعی بہت ہمدردی محسوس کی۔ وہاں بہت کم تھے جو اسے جیتتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

ہال میں بیٹھا ہوا صرف ایک شخص مطمئن اور پُرسکون تھا۔ پُرسکون... یا پُرجوش... ؟ کہنا مشکل تھا اور وہ اس بچے کی سات سالہ بہن تھی، جو اپنے ماں باپ کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی اور جس نے اپنے بھائی کے تاثرات پر پہلی بار بڑے اطمینان کے ساتھ کرسی کی پشت کے ساتھ مسکراتے ہوئے ٹیک لگائی تھی۔ گود میں رکھے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو بہت آہستہ آہستہ اس نے تالی کے انداز میں بجانا بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کے ماں باپ نے بیک وقت اس کے تالی بجاتے ہاتھوں اور اس کے مسکراتے چہرے کو الجھے ہوئے انداز میں دیکھا پھر اسٹیج پر اپنے لرزتے کانپتے کنفیوز بیٹے کو جو نمبر کارڈ کے پیچھے اپنا چہرہ چھپائے انگلی سے کچھ لکھنے اور پڑھنے میں مصروف تھا۔

A

♠

اس کتاب کا پہلا باب اگلے نو ابواب سے مختلف تھا۔ اسے پڑھنے والا کوئی بھی شخص یہ فرق محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ پہلا باب اور اگلے نو ابواب ایک شخص کے لکھے ہوئے نہیں لگ رہے تھے... وہ ایک شخص نے لکھے... بھی نہیں تھے۔

وہ جانتی تھی وہ اس کی زندگی کی پہلی بددیانتی تھی، لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ وہی آخری بھی ہو گی۔ اس کتاب کا پہلا باب اس کے علاوہ اب کوئی اور نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس نے پہلا باب بدل دیا تھا۔

نم آنکھوں کے ساتھ اس نے پرنٹ کمانڈ دی۔ پرنٹر برق رفتاری سے وہ پچاس صفحے نکالنے لگا جو اس کتاب کا ترمیم شدہ پہلا باب تھے۔

اس نے ٹیبل پر پڑی ڈسک اٹھائی اور بے حد تھکے ہوئے انداز میں اس پر ایک نظر ڈالی۔ پھر اس نے اسے دو ٹکڑوں میں توڑ ڈالا۔ پھر چند اور ٹکڑے... اپنی ہتھیلی پر پڑے ان ٹکڑوں کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اس نے انہیں ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

ڈسک کا کور اٹھا کر اس نے زیرِ لب اس پر لکھے چند لفظوں کو پڑھا... پھر چند لمحے پہلے لیپ ٹاپ سے نکالی ہوئی ڈسک اس نے اس کور میں ڈال دی۔

پرنٹر تب تک اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ اس نے ٹرے میں سے ان صفحات کو نکال لیا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ انہیں ایک فائل کور میں رکھ کر اس نے انہیں ان دوسری فائل کورز کے ساتھ رکھ دیا جن میں اس کتاب کے باقی نو ابواب تھے۔

ایک گہرا سانس لیتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کھڑے ہو کر اس نے ایک آخری نظر اس لیپ ٹاپ کی مدھم پڑتی اسکرین پر ڈالی۔

اسکرین تاریک ہونے سے پہلے اس پر ایک تحریر ابھری تھی **Will Be Waiting!**

اس کی آنکھوں میں ٹھہری نمی ایک دم چھلک پڑی تھی۔ وہ مسکرا دی۔ اسکرین اب تاریک ہو گئی۔ اس نے پلٹ کر ایک نظر کمرے کو دیکھا۔ پھر بیڈ کی طرف چلی آئی۔ ایک عجیب سی تھکن اس کے وجود پر چھانے لگی تھی،

اس کے وجود سے دیا ہوا جیز ہے۔۔۔ بیڈ پر بیٹھ کر چند لمحے اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی چیزوں پر نظر دوڑائی۔
وہ پتا نہیں کب وہاں اپنی رسٹ واچ چھوڑ گیا تھا۔ شاید رات کو جب وہ وہاں تھا۔ وہ وضو کرنے گیا تھا۔ پھر شاید اسے یاد نہیں رہا تھا۔ وہ رسٹ واچ اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ سیکنڈ کی سوئی تیزی سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ زندگی میں سیکنڈز کی سوئی کبھی نہیں رکتی۔ صرف منٹ اور گھنٹے ہیں جو رکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔۔۔ سفر ختم ہوتا ہے۔۔۔ سفر شروع ہو جاتا ہے۔
بہت دیر اس گھڑی پر انگلیاں پھیرتی وہ جیسے اس کے لمس کو کھوجتی رہی۔ وہ لمس وہاں نہیں تھا۔ وہ اس گھر کی واحد گھڑی تھی جس کا ٹائم بالکل ٹھیک ہوتا تھا۔ صرف منٹ نہیں۔۔۔ سیکنڈز تک۔۔۔ کاملیت اس گھڑی میں نہیں تھی۔ اس شخص کے وجود میں تھی۔ جس کے ہاتھ پر وہ ہوتی تھی۔
اس نے آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے اس گھڑی کو دوبارہ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ کمبل اپنے اوپر کھینچتے ہوئے وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے لائٹ بند نہیں کی۔ اس نے دروازہ بھی مقفل نہیں کیا تھا۔ وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بعض دفعہ انتظار بہت ”لمبا“ ہوتا ہے۔۔۔ بعض دفعہ انتظار بہت ”مختصر“ ہوتا ہے۔
اس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔۔۔ وہ ”اسے“ ”نیند“ سمجھ رہی تھی۔۔۔ ہمیشہ کی طرح آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے وہ اسے چاروں طرف پھونک رہی تھی جب اسے یاد آیا۔ وہ اس وقت وہاں ہوتا تو اس سے آیت الکرسی اپنے اوپر پھونکنے کی فرمائش کرتا۔
بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑے ایک فوٹو فریم کو اٹھا کر اس نے بڑی نرمی کے ساتھ اس پر پھونک ماری پھر فریم کے شیشے پر جیسے کسی نظر نہ آنے والی گرد کو اپنی انگلیوں سے صاف کیا۔ چند لمحے تک وہ فریم میں اس ایک چہرے کو دیکھتی رہی، پھر اس نے اس کو دوبارہ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ سب کچھ جیسے ایک بار پھر سے یاد آنے لگا تھا۔۔۔ اس کا وجود جیسے ایک بار پھر سے ریت بننے لگا تھا۔ آنکھوں میں ایک بار پھر سے نمی آنے لگی تھی۔
اس نے آنکھیں بند کر لیں۔۔۔ ”آج“ کسے بہت دیر ہو گئی تھی۔

7

♠

”ایکسکیوزمی۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھ کر بار کی طرف چلی گئی تھی۔ اس کی نظروں نے جیکی کا تعاقب کیا۔ وہ بار کاؤنٹر پر بار ٹینڈر سے بات کر رہی تھی۔ اس کے سیاہ بیک لیس ڈریس سے اس کی سفید خوب صورت پشت کمر تک نظر آ رہی تھی۔ اس نے نظر ہٹاتے ہوئے اپنے سامنے پڑے اورنج جوس کا ایک گھونٹ بھرا۔ بہت عرصے کے بعد اس نے کسی عورت کے جسم پر غور کیا تھا اور بہت عرصے کے بعد وہ کسی عورت کے ساتھ اکیلے کسی بار میں بیٹھا تھا۔ وہ ایک ہوٹل کا بار روم تھا لیکن وہ کسی ایسی جگہ پر بھی بہت عرصے کے بعد آیا تھا۔
وہ ہاتھ میں پکڑے گلاس سے دوسرا گھونٹ لے رہا تھا جب جیکی دو شیمپین گلاسز کے ساتھ واپس آ گئی تھی۔
”میں نہیں پیتا۔“ اس نے ایک گلاس اپنے سامنے رکھے جانے پر چونک کر اسے یاد دلایا تھا۔
”یہ شیمپین ہے۔“ جیکی نے جواباً ”ایک کندھے کو ہلاتے ہوئے بے حد گہری مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا۔ اس کا اپنا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔
”شیمپین شراب نہیں ہوتی کیا؟“ اس نے جواباً ”جیسے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ وہ ٹیبل پر پڑی سگریٹ کی ڈبیا سے اب ایک سگریٹ نکال کر لائٹر کی مدد سے سلگا رہا تھا۔ جیکی نے آگے جھکتے ہوئے بڑی سہولت سے اس کے ہونٹوں میں دبا سگریٹ نکال لیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی یہ حرکت بے حد غیر متوقع تھی۔ وہ اب

اسی سگریٹ کو اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبائے بائیں ہاتھ میں شیمپئن گلاس پکڑے مسکراتے ہوئے سگریٹ کے کش لے رہی تھی۔ اس نے نظریں چراتے ہوئے سگریٹ کی ڈبیا سے ایک اور سگریٹ نکال لیا۔

"آؤ ڈانس کریں۔"

وہ جیکی کی آفر پر ایک بار پھر چونکا۔ وہ ڈانس فلور پر رقص کرتے چند جوڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ بار روم میں اس وقت زیادہ لوگ نہیں تھے اور ان میں سے بھی صرف چند ایک ہی ڈانس فلور پر موجود تھے جنہیں واقعی ڈانس کرنا تھا۔ وہ اسی ہوٹل کے نائٹ کلب میں موجود تھے۔

"میں ڈانس نہیں کرتا۔" اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے لائٹر رکھا۔

"آتا نہیں ہے؟" جیکی ہنسی تھی۔

"پسند نہیں ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔ وہ شیمپئن کا گھونٹ بھرتے ہوئے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ اس نے راکھ جھاڑنے کے بجائے نظریں چرائیں۔ جیکی کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی تھی۔

"شراب بھی نہیں پی تم نے؟"

اس نے ہاتھ میں پکڑا گلاس میز پر رکھتے ہوئے کچھ آگے جھکتے ہوئے پوچھا۔

اس شخص کی نظریں ایک لمحہ کے لیے گلاس سے اٹھی تھیں پھر اس نے جیکی کو دیکھا۔

"بہت عرصہ پہلے۔" اس نے جیسے اعتراف کیا۔

"شیمپئن؟" جیکی نے مصنوعی حیرت کے ساتھ کہا۔

"یہ بھی۔" بے تاثر چہرے کے ساتھ اس نے ڈانس فلور کو دیکھتے ہوئے کہا۔ گلاس دوبارہ اٹھاتے ہوئے اور سامنے بیٹھے ہوئے مرد کے چہرے پر نظریں جمائے جیکی نے اپنی زندگی میں آنے والے پرکشش ترین مردوں کی فہرست میں اس کو رکھا تھا۔ وہ بلاشبہ ٹاپ پر تھا۔ یہ اس کے جسمانی خدوخال نہیں تھے جس کی بنا پر وہ اسے یہ درجہ دے رہی تھی۔ اس کی زندگی میں شکل و صورت کے اعتبار سے اس سے زیادہ خوب صورت مرد آئے تھے۔ سامنے بیٹھے ہوئے شخص میں کچھ اور تھا' جو اسے بے حد ممتاز کر رہا تھا۔ اس کی بے حد مردانہ آواز' اس کا رکھ رکھاؤ' شفاف ذہین اور بے ریا گہری آنکھیں' اس کی مسکراہٹ یا پھر اس کی تمکنت اور رعونت۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف کھنچ رہی تھی اور بری طرح کھنچ رہی تھی۔ اور اس میں اس کا قصور نہیں تھا۔ وہ عوے سے کہہ سکتی تھی کہ وہ مرد کسی بھی عورت کو متوجہ کر سکتا تھا۔ اس نے اس کے کریکٹر پروفائل میں پڑھا تھا کہ وہ Womanizer نہیں تھا۔ اسے حیرت تھی وہ کیوں نہیں تھا۔ اسے ہونا چاہیے تھا۔ اس پر نظریں جمائے اس نے سوچا اور بالکل اسی لمحے اس شخص نے ڈانس فلور سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔ جیکی کی مسکراہٹ بے اختیار گہری ہوئی تھی۔ وہ بھی بے مقصد مسکرا دیا تھا۔ وہ بہت عرصے کے بعد کسی عورت کی کمپنی کو انجوائے کر رہا تھا۔

وہ خوب صورت تھی' اسمارٹ تھی اور وہ مضطرب تھا۔ نہ ہوتا تو یہاں اس وقت دو گھنٹے ایک اجنبی عورت کے ساتھ کبھی نہ بیٹھا ہوتا۔

"تمہاری شیمپئن؟" جیکی نے اسے ایک بار پھر یاد دلایا۔

"تم لے سکتی ہو۔" اس نے جواباً گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اگر پہلے پیتے تھے تو اب اس میں کیا برائی نظر آئی تمہیں؟" جیکی اس بار سنجیدہ ہوئی تھی۔

"مزے کے لیے پیتا تھا جب مزا آنا ختم ہو گیا تو چھوڑ دی۔" وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنسی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔

جیکی دونوں ہاتھ ٹیبل پر رکھتے ہوئے آگے جھکی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔
"تمہیں پتا ہے، مجھے تم میں ساحرانہ کشش محسوس ہو رہی ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔ یوں جیسے اس کے جملے سے محظوظ ہوا ہو۔
"میرے لیے خوشی کی بات ہے۔" اس نے جواباً کہا تھا۔ جیکی نے بڑے غیر محسوس انداز میں میز پر رکھے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ ہاتھ ہٹانا چاہتا تھا لیکن چاہتے ہوئے بھی نہیں ہٹا سکا۔ وہ اس کے ہاتھ کی پشت پر بظاہر غیر محسوس انداز میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑا سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دیا۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے پھر جیکی نے کہا۔
"Do You Believe in one- night Stands"
(کیا تم ایک رات کے تعلق پر یقین رکھتے ہو؟)
جواب فوری آیا تھا۔
"بالکل۔"

4

♠

اینٹوں سے بنے چولہے پر رکھی جھلسی ہوئی پرانی مٹی کی ہنڈیا میں ساگ اپنے پانی میں گل رہا تھا۔ اس بوڑھی عورت نے نہر کے کنارے سے چنی ہوئی خشک جھاڑیوں کی ٹہنیوں کو توڑ توڑ کر چولہے میں پھینکنا شروع کر دیا۔ وہ آگ کو اسی طرح بھڑکائے رکھنے کی ایک کوشش تھی۔ وہ مٹی سے لیپے ہوئے گرم فرش پر چولہے کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ پاؤں سے چپل اتار کر اس نے اپنے سرد ہلکے ہلکے سوجے ہوئے پیروں کو دھوپ سے گرم فرش سے جیسے کچھ حدت پہنچانے کی کوشش کی تھی۔
اماں اس عمر میں بھی پنجوں کے بل بیٹھی لکڑیوں کو توڑ موڑ کر چولہے میں جھونک رہی تھی۔ آگ میں لکڑیوں کے تڑخنے اور چٹخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ساگ کی ہانڈی سے اٹھتی بھاپ اور اس میں اٹھتے ابال دیکھتی رہی۔
"مرد کیا کرتا ہے تیرا؟" وہ اماں کے اس اچانک سوال پر چونکی پھر بڑبڑائی۔
"کیا کرتا ہے؟" اس نے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی تھی پھر کہا۔ "کام کرتا ہے۔"
"کیا کام کرتا ہے؟" اماں نے پھر پوچھا۔
"باہر کام کرتا ہے۔" وہ ساگ کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔
"پردیس میں ہے؟" بوڑھی عورت نے جواباً پوچھا۔ وہ بھی اب اسی کی طرح زمین پر بیٹھ گئی تھی اور اس نے اپنے گھٹنوں کے گرد اس کی طرح بازو لپیٹ لیے تھے۔
"ہاں۔ پردیس میں ہے۔" وہ اسی طرح ساگ کو دیکھتے ہوئے بولی۔
"تب تو یہاں کس کے پاس ہے۔ سسرال والوں کے پاس؟"
"نہیں۔"
"پھر؟"
"میں کسی کے پاس نہیں ہوں۔" ساگ پر نظریں جمائے اس نے بے ربط جواب دیا۔
"مرد نے گھر سے نکال دیا ہے کیا؟" اس نے چونک کر اس عورت کا چہرہ دیکھا۔
"نہیں۔"
"پھر تو لڑ کر آئی ہے کیا؟"
"نہیں۔" اس نے پھر بے ساختہ سر ہلایا۔

"تو پھر یہاں کس لیے آئی ہے؟"
"سکون کے لیے۔" اس نے بے اختیار کہا۔
"سکون کہیں نہیں ہے۔" وہ اس عورت کا چہرہ دیکھنے لگی۔
"جو چیز دنیا میں ہے ہی نہیں اسے دنیا میں کیا ڈھونڈنا؟" اس نے حیرت سے اس عورت کو دیکھا۔ وہ گہری بات تھی اور اس عورت کے منہ سے سن کر اور بھی گہری لگی تھی اسے جو اس جھگی میں بیٹھی آگ میں لکڑیاں جھونک رہی تھی۔
"پھر بندہ رہے کیوں دنیا میں اگر بے سکون رہتا ہے؟"
وہ اس سے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہتی تھی جو اس نے پوچھا تھا۔
"تو پھر کہاں رہے؟" لکڑیاں جھونکتی اس عورت نے ایک لمحہ کے لیے رک کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ کچھ لاجواب ہوتے ہوئے دوبارہ ساگ کو دیکھنے لگی۔
"مرد کہتا نہیں واپس آنے کو؟"
"پہلے کہتا تھا۔ اب نہیں کہتا۔"
اس نے خود بھی لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے آگ میں پھینکنے شروع کردیے تھے۔
"بے چارہ اکیلا ہے وہاں؟" وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی۔
"ہاں۔" اس نے اس بار مدھم آواز میں کہا۔ وہ بوڑھی عورت اب پلاسٹک کے ایک شاپر میں پڑا ہوا آٹا ایک تھالی میں ڈال رہی تھی۔
"تو اکیلا چھوڑ کر آگئی اسے؟" دھوپ میں پڑے ایک گھڑے سے ایک گلاس میں پانی نکالتے ہوئے اماں نے جیسے افسوس کیا تھا۔ وہ بے مقصد آگ میں لکڑیاں پھینکتی رہی۔
"تجھ سے پیار نہیں کرتا تھا؟" وہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہوئی۔
"کرتا تھا۔" اس کی آواز بے حد مدھم تھی۔
"خیال نہیں رکھتا تھا؟" ساگ سے اٹھتی بھاپ کی نمی اس کی آنکھوں میں اترنے لگی تھی۔ اسے بڑے عرصے کے بعد پتا نہیں کیا کیا یاد آیا تھا۔
"رکھتا تھا۔" آواز اور بھی مدھم ہوگئی تھی۔
اماں اب اس کے پاس بیٹھی اس تھالی میں دو روٹیوں کا آٹا گوندھ رہی تھی۔ "روٹی کپڑا نہیں دیتا تھا؟"
اس نے چادر سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔ "دیتا تھا۔" وہ اپنی آواز خود بھی بمشکل سن پائی تھی۔

"تو نے پھر بھی چھوڑ دیا اسے؟ تو نے بھی اللہ سے بندے والا معاملہ کیا اس کے ساتھ۔ سب کچھ لے کر بھی دور ہوگئی اس سے۔"
اماں نے آٹا گوندھتے ہوئے جیسے ہنس کر کہا تھا۔ وہ بول نہیں سکی تھی۔ بولنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔
پلکیں جھپکائے بغیر وہ صرف اماں کا چہرہ دیکھتی رہی۔
"تجھے یہ ڈر بھی نہیں لگا کہ کوئی دوسری عورت لے آئے گا وہ؟"
"نہیں۔" اس بار آٹا گوندھتے اماں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔
"تجھے پیار نہیں ہے اس سے؟" کیا سوال آیا تھا۔ وہ نظریں چرا گئی۔
اس کی چپ نے اماں کو جیسے ایک اور سوال دیا۔
"کبھی پیار کیا ہے؟" آنکھوں میں سیلاب آیا تھا۔ کیا کچھ یاد آیا تھا۔

”میں تھا۔“ اس نے آنسوؤں کو بہنے دیا تھا۔

”پھر کیا ہوا؟“ ماں نے اس کے آنسوؤں کو نظر انداز کر دیا تھا۔

”وہ نہیں ملا۔“ سر جھکائے اس نے آگ میں کچھ اور لکڑیاں ڈالیں۔

”ملا نہیں یا اس نے چھوڑ دیا؟“ اس کے منہ میں جیسے ہری مرچ آگئی تھی۔

”اس نے چھوڑ دیا۔“ پتا نہیں ساگ زیادہ پانی چھوڑ رہا تھا یا اس کی آنکھیں۔ پر آنچ اور آنسو دونوں جگہ تھے۔

”پیار نہیں کرتا ہوگا۔“ ماں نے بے ساختہ کہا۔

”پیار کرتا تھا لیکن انتظار نہیں کر سکتا تھا۔“ اس نے پتا نہیں کیوں اس کی طرف سے صفائی دی تھی۔

”جو پیار کرتا ہے وہ انتظار کرتا ہے۔“ جواب کھٹاک سے آیا تھا اور اس کی ساری وضاحتوں ' دلیلوں کے پرخچے اڑا گیا تھا۔ وہ روتے ہوئے ہنسی تھی یا پھر شاید ہنستے ہوئے روئی تھی۔ کیا سمجھا دیا تھا اس عورت نے جو دل و دماغ کبھی سمجھا نہیں سکے تھے اسے۔

”اس آدمی کی وجہ سے گھر چھوڑ آئی اپنا؟“ ماں نے پھر پوچھا۔

”وہ نہیں۔ بس وہاں بے سکونی تھی مجھے اس لیے آگئی۔“ اس نے بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔

”کیا بے سکونی تھی؟“ وہ برستی آنکھوں کے ساتھ بتا نہ سکی۔ ماں چپ چاپ آٹا گوندھتی رہی۔ اس کے خاموش ہونے پر بھی اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ خاموشی کا وہ وقفہ طویل ہو گیا تھا۔ بے حد طویل۔ ماں آٹا گوندھنے کے بعد ساگ میں ڈوئی چلانے لگی تھی۔ وہ ہاتھوں کے گرد بازو لپیٹے ساگ کو گھلتے دیکھتی رہی۔

”وہاں نہر کے کنارے کیوں کھڑی تھی؟“ ماں نے یک دم ساگ گھوٹتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس نے سر اٹھا کر ماں کا چہرہ دیکھا۔

5

بیرونی گیٹ ہمیشہ کی طرح گھر میں کام کرنے والی ملازمہ نے کھولا تھا۔ ڈرائیو وے پر گاڑی کھڑی کرتے ہوئے اس نے ابھی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ ہر روز کی طرح لان میں کھیلتے اس کے دونوں بچے بھاگتے ہوئے اس کے پاس آگئے تھے۔ چار سالہ جبریل پہلے پہنچا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے بیٹے کا چہرہ چوما تھا۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔ اس نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

”السلام علیکم!“ جبریل نے روزانہ کی رسومات پوری کیں۔ گاڑی میں پڑے ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر اس نے جبریل کا چہرہ صاف کیا جو اس نے بڑی فرماں برداری سے کروایا تھا۔ دو سالہ عنایہ تب تک ہانپتی کانپتی 'شور مچاتی' گرتی پڑتی اس کے پاس آگئی تھی۔ وہ ہمیشہ پہلے اس کے بالوں کو دیکھ کر وہ کچھ اور کھکھلائی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اسے دور سے گود میں لیا تھا۔ بہت زور سے اسے بھینچنے کے بعد اس نے باری باری بچی کے دونوں گال چومے۔ جبریل تب تک ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ بند کر چکا تھا۔ اس نے عنایہ کو اب نیچے اتار دیا۔ وہ دونوں باپ سے ملنے کے بعد دوبارہ لان میں بھاگ گئے تھے۔ جہاں وہ ملازمہ کی دو بیٹیوں کے ساتھ فٹ بال کھیلنے میں مصروف تھے۔ وہ چند لمحے ڈرائیو وے پر کھڑا اپنے بچوں کو دیکھتا رہا۔ پھر گاڑی کے پچھلے حصے سے اپنا بریف کیس اور جیکٹ نکالتے ہوئے وہ گھر کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی بیوی تب تک اس کے استقبال کے لیے دروازے تک آچکی تھی۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں۔ وہ حیرانی سے اس کے پاس آتے ہوئے مسکرائی۔

”تم جلدی آگئے آج؟“ اس نے ہمیشہ کی طرح اسے گلے لگاتے ہوئے اس کے بالوں کو ہولے سے سہلاتے

ہوئے کہا۔

"ہاں آج زیادہ کام نہیں تھا۔"

"تو ڈھونڈ لیتے۔" وہ جواباً اس کے ہاتھ سے جیکٹ لیتے ہوئے ہنسی۔ وہ جواب دینے کے بجائے مسکرا دیا۔

اپنے بیڈروم میں اس نے جب تک اپنا بریف کیس رکھا اور جوتے اتارے، وہ اس کے لیے پانی لے آئی تھی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟" وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے سے گلاس اٹھا رہا تھا جب اس نے اچانک پوچھا تھا۔ اس نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

"ہاں... بالکل ہوں، کیوں؟"

"نہیں... مجھے تھکے ہوئے لگے ہو اس لیے پوچھ رہی ہوں۔" اس نے جواب دینے کے بجائے گلاس منہ سے لگا لیا۔ وہ ٹرے لے کر چلی گئی۔

کپڑے تبدیل کرکے وہ لاؤنج میں آ گیا تھا۔ لان میں اس کے دونوں بچے ابھی بھی فٹ بال کے پیچھے بھاگتے پھر رہے تھے۔ وہ لاؤنج کی کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ کانگو کا موسم اسے کبھی پسند نہیں رہا تھا اور اس کی وجہ وہ بارش تھی جو کسی وقت بھی شروع ہو سکتی تھی اور جو شاید ابھی کچھ دیر میں پھر سے شروع ہونے والی تھی۔ کنگ ساشا میں پچھلے کئی دنوں سے ہر روز اسی وقت بارش ہوتی تھی... سہ پہر کے آخر چند گھنٹے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی بارش اور اس کے بعد مطلع صاف۔

"چائے۔" وہ اپنی بیوی کی آواز پر باہر لان میں دیکھتے بے اختیار پلٹا۔ وہ ایک ٹرے میں چائے کے دو مگ اور ایک پلیٹ میں چند کوکیز لیے کھڑی تھی۔

"تھینکس..." وہ ایک مگ اور ایک بسکٹ اٹھاتے ہوئے مسکرایا۔

"باہر چلیں بچوں کے پاس۔" وہ باہر جاتے ہوئے بولی۔

"میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ کسی کال کا انتظار کر رہا ہوں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے باہر چلی گئی۔ چند منٹوں کے بعد اس نے اپنی بیوی کو لان میں نمودار ہوتے دیکھا۔ لان کے ایک کونے میں پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ کھڑکی میں اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہ بھی جواباً مسکرا دیا تھا۔ چائے کا مگ اور بسکٹ کی پلیٹ اب لان میں اس کے سامنے پڑی ٹیبل پر رکھے تھے۔ اس نے باری باری جبرئیل اور عنایہ کو اس کے پاس آ کر بسکٹ لیتے دیکھا۔ جبرئیل نے وہ بسکٹ لے کر تو اور لیا کو دیے تھے۔ چاروں بچے ایک بار پھر فٹ بال سے کھیلنے لگے تھے۔ اس کی بیوی اب مکمل طور پر بچوں کی طرف متوجہ تھی۔ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے دائیں کندھے پر پڑی شال سے اپنے جسم کا وہ حصہ چھپائے جہاں ایک نئی زندگی پرورش پا رہی تھی۔ ان سے کہاں بہتر اچھے ہوتے جا رہا تھا سو فٹ بال کے پیچھے بھاگتے بچوں کو دیکھتے ہوئے وقتاً فوقتاً ہنس رہی تھی اور پھر انہیں ہدایات دینے لگتی۔

لاؤنج کی کھڑکی کے سامنے کھڑے باہر دیکھتے ہوئے وہ جیسے ایک فلم دیکھ رہا تھا۔ ایک مکمل فلم۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے مگ وہیں رکھ دیا۔ اس کی بیوی کا اندازہ ٹھیک تھا، وہ "ٹھیک" نہیں تھا۔

وہ کھڑکی کے شیشے سے باہر لان میں نظر آنے والی ایک خوش و خرم فیملی دیکھ رہا تھا۔ آئیڈیل پرفیکٹ لائف کا ایک منظر، اس کے بچوں کے بچپن کے قیمتی لمحے۔ اپنے اندر ایک اور ننھا وجود لیے اس کی بیوی کا مطمئن و مسرور چہرہ۔ چند پیپرز کو پھاڑ کر پھینک دینے سے یہ زندگی ایسے ہی خوب صورت رہ سکتی تھی۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بری طرح کمزور پڑا۔ اولاد اور بیوی واقعی انسان کی آزمائش ہوتے ہیں۔ ان کے لیے جنہیں "مال" آزمانے سے

قاصر رہتا ہے۔ انہیں دیکھتے ہوئے وہ بھی اسی آزمائش کا شکار ہو رہا تھا۔ ایک مرد' ایک شوہر اور ایک باپ کے طور پر لان میں موجود اس کی فیملی اس کی ذمہ داری تھی۔ وہ ان سے "خون" اور "محبت" کے رشتوں سے بندھا ہوا تھا۔

ایک لمحے کے لیے اس کی نظر بھٹک کر جبریل اور عنایہ کے ساتھ کھیلنے والی چار اور چھ سال کی ان دو سیاہ فام لاغر بچیوں پر گئی تھی۔ اس کے خوب صورت گورے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ اور بھی زیادہ بدصورت لگ رہی تھیں۔ ہیڈی کی وہ دونوں بیٹیاں اگر اس وقت مناسب لباس اور جوتوں میں ملبوس تھیں تو اس کی وجہ ہیڈی کا ان کے گھر کام کرنا تھا۔ ورنہ وہ کومیسے کے غریبوں کے ہزاروں بچوں کی طرح اپنا بچپن کسی بھی سہولت کے بغیر چائلڈ لیبر کے طور پر گزار رہی ہوتیں اور وہاں سے چلے جانے کے بعد ان کا مستقبل پھر کسی غیر یقینی صورت حال کا شکار ہو جاتا۔ بالکل اسی طرح' جس طرح اس مغربی استعماریت کے وہاں آجانے سے پورا افریقہ بے یقینی اور عدم استحکام کا شکار ہو رہا تھا۔ وہ اسی مغربی استعماریت کے ایک نمائندے کے طور پر وہاں موجود تھا۔

اس نے اپنی تیس سالہ ملازمہ کو ورانڈے پر کھڑے اپنی بچیوں کی کسی لگ پر تالیاں بجاتے دیکھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے لان کے ایک کونے میں کرسی پر بیٹھی اس کی بیوی اپنے دونوں بچوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ ہیڈی نے خود بھی "بچپن" نہیں دیکھا تھا۔ وہ پیدا ہونے کے فوراً "بعد بالغ" ہو گئی تھی۔ افریقہ کے نوے فیصد بچوں کی طرح جنہیں "بچپن یا بقائے زندگی" میں سے کوئی ایک چیز ہی مل سکتی تھی۔ "بچپن" بہرحال ان آپشنز میں سے تھا جو پریمیم کی لسٹ میں آتے تھے اور ایسا ہی ایک آپشن اپنے بچوں کو دینے کے لیے ہیڈی سنگل پیرنٹ کے طور پر جان توڑ محنت کر رہی تھی۔ وہ ان کے ساتھ انسانیت کے رشتے میں منسلک تھا۔

ایک لمبے عرصے کے بعد وہ پہلی بار وہاں کھڑا اپنی اولاد اور اس عورت کی اولاد کا موازنہ کر رہا تھا۔ اپنی بیوی کی زندگی اور اس عورت کی زندگی کا مقابلہ کر رہا تھا۔ حالانکہ وہ آج وہاں اس کام کے لیے نہیں کھڑا تھا۔

اس کا فون بجنے لگا تھا۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے کالر آئی ڈی دیکھی۔ اس کا جسم ایک لمحے کے لیے تنا تھا۔ کال ریسیو کرتے ہوئے اسے اندازہ تھا اس وقت دوسری طرف وہ کس سے بات کرنے والا تھا۔

اسے اپنی فیملی کی زندگی اور استعفیٰ میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑا۔

8

پریذیڈنٹ نے کافی کا خالی کپ واپس میز پر رکھ دیا۔ پچھلے پانچ گھنٹے میں یہ کافی کا آٹھواں کپ تھا جو اس نے پیا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی اتنی کافی نہیں پی تھی مگر زندگی میں کبھی اسے اس طرح کا فیصلہ بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔

وہ between devil and the blue sea (آگے کنواں' پیچھے کھائی) والی صورت حال سے دوچار تھا اور اپنے عہد صدارت کے ایک بہت غلط وقت پر ایسی صورت حال سے دوچار ہوا تھا۔ کانگریس کے الیکشنز سر پر تھے اور یہ فیصلہ ان الیکشنز کے نتائج پر بری طرح اثر انداز ہوتا۔ "بری طرح" کا لفظ شاید ناکافی تھا۔ اس کی پارٹی درحقیقت الیکشن ہار جاتی' لیکن اس فیصلہ کو نہ کرنے کے اثرات زیادہ مضر تھے۔ وہ اسے جتنا ٹال سکتا تھا' ٹال چکا تھا۔ جتنا کھینچ چکا تھا۔ اب بہرحال اس کے پاس ضائع کرنے کے لیے مزید وقت نہیں تھا۔ کچھ لابیز کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ کچھ پاور پلیئرز دبے لفظوں میں اپنی ناراضی اور شدید رد عمل سے اسے خبردار کر رہے تھے۔ فارن آفس اسے مسلسل متعلقہ ممالک سے امریکن سفارت کاروں کی تقریباً "روزانہ کی بنیاد پر آنے والی کوریز اور کنسرنز کے بارے میں آگاہ کر رہا تھا اور خود وہ دو ہفتے کے دوران مستقل ہاٹ لائن پر رہا

تھا۔ امریکا کی بین الاقوامی پسپائی ایک الیکشن ہارنے سے زیادہ سنگین تھی مگر اس کے پاس آپشنز نہ ہونے کے برابر تھے۔ اپنی کیبنٹ کے چھ اہم ترین ممبرز کے ساتھ پانچ گھنٹے کی طویل گفت و شنید کے بعد وہ جیسے تھک کر پندرہ منٹ کا ایک وقفہ لینے پر مجبور ہو گیا تھا اور اس وقت وہ اس وقفے کے آخری کچھ منٹ گزار رہا تھا۔

ٹیبل سے کچھ پیپرز اٹھا کر وہ دوبارہ دیکھنے لگا تھا۔ وہ کیبنٹ آفس میں ہونے والی پانچ گھنٹے طویل میٹنگ کے بلٹ پوائنٹس تھے اس کی کیبنٹ کے وہ چھ ممبرز دو برابر گروپس میں بٹے ہوئے' دو مختلف لائنز کے ساتھ تھے۔ وہ ٹائی اس کے کاسٹنگ ووٹ سے ٹوٹنے والی تھی اور یہی چیز اسے الجھا رہی تھی۔ بس کر رہی تھی۔ اس فیصلے کی ذمہ داری ہر حال میں اسی کے سر پر آ رہی تھی۔ یہ اس کے عہد صدارت میں ہوتا اور اس کے کاسٹنگ ووٹ سے ہوتا۔ اگر ہوتا تو اور اس ذمہ داری کو وہ لاکھ کوشش کے باوجود وہ کہیں اور منتقل نہیں کر پا رہا تھا۔

اس نے ہاتھ میں پکڑے کاغذات کو ایک نظر پھر دیکھنا شروع کیا۔ وہ بلٹ پوائنٹس اس وقت اس کے لیے بلنٹس کا کام کر رہے تھے۔

بریک کے آخری دو منٹ باقی تھے جب وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔ بعض دفعہ تاریخ بنانے والے کے ہاتھوں کو جکڑ کر خود کو بنواتی ہے۔

اور تاریخ 17 جنوری 2030ء کو بھی یہی کر رہی تھی۔

10

وہ یخنی میں ڈوبے ہوئے روٹی کے ٹکڑے چمچے کے ساتھ اپنے باپ کو کھلا رہا تھا۔ اس کا باپ ایک لقمے کو چبانے اور نگلنے میں تقریباً" دو منٹ لے رہا تھا۔ وہ ہر بار صرف اتنی ہی یخنی پیالے میں ڈالتا جس میں ایک ٹکڑا ڈوب جاتا' پھر چمچے سے اس ٹکڑے کو باپ کے منہ میں ڈالنے کے بعد وہ بے حد تحمل سے پیالے میں نیا ٹکڑا اور گرم یخنی ڈالتا۔ لقمے کے چبائے جانے تک روٹی کا نیا ٹکڑا یخنی میں پھولنے لگتا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں یخنی اس پیالے میں ڈالتا تو یخنی اب تک ٹھنڈی ہو چکی ہوتی۔ یخنی کا ایک پیالہ پینے میں اس کا باپ تقریباً" ایک گھنٹہ لگاتا تھا۔ ٹھنڈی یخنی میں ڈوبے ہوئے روٹی کے ٹکڑے بھی وہ اسی رغبت سے کھاتا جیسے وہ ان گرم لقموں کو کھا رہا تھا۔ اس کی ذائقے کی حس آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ گرم اور ٹھنڈی خوراک میں تخصیص کرنا وہ کب کا چھوڑ چکا تھا۔ یہ صرف اس کی دیکھ بھال کرنے والے اس کی فیملی کے افراد تھے جو اس تخصیص کو اس کے لیے اب بھی برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب بھی خوراک کو اس کے لیے ممکنہ حد تک ذائقہ دار بنا رہے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس ذائقے سے لطف اندوز ہو سکتا تھا نہ اس ذائقے کو یاد رکھ سکتا تھا۔

باپ کو کھانا کھلانے کے ساتھ ساتھ اس نے اور اس کی بیوی نے بھی وہاں بیٹھے کھانا کھایا تھا۔ وہ جب بھی یہاں آتا تھا تینوں وقت کا کھانا باپ کے کمرے میں اسے کھلاتے ہوئے ہی کھاتا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں یہ کام اس کی بیوی اور بچے کرتے تھے۔ ان کے گھر کا ڈائننگ روم ایک عرصہ سے نہ ہونے کے برابر استعمال ہو رہا تھا۔ اس کے باپ کا بیڈ روم اس کی فیملی کے افراد کی بہت ساری سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہ اس شخص کو تنہائی سے بچانے کی ایک کوشش تھی جو پچھلے کئی سال سے بستر پر پڑا تھا اور الزائمر کی آخری اسٹیج میں داخل ہو چکا تھا۔

ٹرالی میں پڑا نیپکن اٹھا کر اس نے اپنے باپ کے ہونٹوں کے کونے سے نکلنے والی یخنی کے وہ قطرے صاف کیے جو چند لمحے پہلے نمودار ہوئے تھے۔ اس کے باپ نے خالی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھا جن سے وہ ہمیشہ دیکھتا تھا۔

وہ اسے کھانا کھلاتے ہوئے جواب کی توقع کیے بغیر اس سے بات کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس کے باپ کی خاموشی کے وقفے اب گھنٹوں پر مشتمل ہونے لگے۔ گھنٹوں کے بعد کوئی لفظ کوئی جملہ اس کے منہ سے نکلتا تھا

جس کا تعلق اس کی زندگی کے کسی سال کی کسی یاد سے ہوتا تھا اور وہ سب اس جملے کو حال کے ساتھ جوڑنے کی کوشش میں لگ جاتے تھے۔

اس کا باپ یک ٹک کھانا کھاتے اسے دیکھتا تھا۔ اب بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کا باپ جیسے ایک اجنبی کا چہرہ پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کو کھانا کھلانے کی کوئی احتیاط کوئی محبت کوئی لگن اس کی یادداشت پر کہیں محفوظ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ایک اجنبی کے ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا اور اس کی ختم ہوتے دماغی خلیے سارا وقت اس اجنبی کے چہرے کو کوئی نام دینے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے باپ کو اس کے ہاتھ سے کھایا ہوا دوپہر کا کھانا تک یاد نہیں ہوگا۔ وہ جتنی بار اس کے کمرے میں آتا ہوگا۔ وہ اپنے باپ کے لیے ایک نیا شخص ایک نیا چہرہ ہوگا اور صرف وہی نہیں اس کی فیملی کے تمام افراد بھی۔ اس کا باپ شاید حیران ہوتا ہوگا کہ اس کے کمرے میں بار بار نئے لوگ کیوں آتے ہیں۔ اس کا باپ اپنے گھر میں "اجنبیوں" کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ لوگ جو اسے کھانا کھلاتے ہیں۔ باتھ روم لے کر جاتے تھے۔ نہلاتے تھے۔ کپڑے بدلتے تھے۔ باتیں کرتے تھے۔ لیکن وہ یہ سب کیوں کرتے تھے؟ اور پھر "کیوں؟" کا یہ سوال بھی اس کے ذہن کی اسکرین سے مٹ گیا یا شاید تحلیل ہو گیا۔

اس نے یخنی کا آخری چمچہ اپنے باپ کے منہ میں ڈالا۔ پھر پیالہ ٹرالی میں رکھ دیا۔ اب وہ اپنے باپ کو اسی طرح چمچے کے ساتھ پانی پلا رہا تھا۔ اس کا باپ لمبا گھونٹ نہیں بھر سکتا تھا۔

اس کی بیوی تھوڑی دیر پہلے کمرے سے اٹھ کر گئی تھی۔ اس کا سامان کچھ دیر پہلے ایئر پورٹ جا چکا تھا۔ اب باہر ایک گاڑی اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ جو اسے تھوڑی دیر میں ایئر پورٹ تک لے جاتی۔ اس کا اسٹاف بے صبری سے اس کمرے سے اس کی برآمدگی کا منتظر تھا۔

اس نے گلاس واپس رکھتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ کر اپنے باپ کی گردن کے گرد پھیلایا ہوا نیپکن ہٹایا۔ پھر کچھ دیر تک وہ اپنے باپ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بیٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنے باپ کو اپنی روانگی کے بارے میں بتایا تھا اور اس تشکر و احسان مندی کے بارے میں جو وہ اپنے باپ کے لیے محسوس کرتا تھا اور خاص طور پر آج محسوس کر رہا تھا۔ اس کا باپ خالی نظروں سے اسے دیکھ اور سن رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کچھ نہیں سمجھ رہا لیکن یہ ایک رسم تھی جو وہ ہمیشہ ادا کرتا تھا۔ اس نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد باپ کے ہاتھ چومے پھر انہیں لٹا کر کمبل اوڑھا دیا اور کچھ دیر بے مقصد بیڈ کے پاس کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا۔ اس کے بعد جانے وہ کب دوبارہ اپنے باپ کے پاس آنے کے قابل ہوتا۔

وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ آخری کھانا تھا جو اس نے باپ کے ساتھ کھایا تھا۔

☆

اس کا ہاتھ پکڑے وہ اسے اب کسی راستے پر لے جانے لگا۔

ایک قدم۔ دوسرا قدم۔ تیسرا۔ پھر وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ ایک جھیل تھی۔ چھوٹی سی جھیل جس کے کنارے پر وہ تھے۔ ہلکی نیلی رنگت کے شفاف پانی کی ایک جھیل۔ جس کے پانی میں وہ رنگ برنگی مچھلیاں تیرتے ہوئے دیکھ سکتی تھی۔

اور اس کی تہ میں بے شمار رنگوں کے موتی۔ پتھر۔ سیپیاں۔

جھیل کے پانی پر آبی پرندے تیر رہے تھے۔ خوب صورت راج ہنس۔ جھیل کے چاروں اطراف پھول تھے، اور بہت سے پھول جھیل کے پانی تک چلے گئے تھے۔ کچھ پانی کی سطح پر تیر رہے تھے۔

مگر اس کے قدموں کو ان میں سے کسی چیز نے نہیں روکا تھا۔ اس کے قدموں کو روکنے والی شے جھیل کے کنارے پر موجود لکڑی کی وہ خوب صورت چھوٹی سی کشتی تھی جو پانی میں ہلکورے لے رہی تھی۔ اس نے بے اختیار کھلکھلا کر اسے دیکھا۔

"یہ میری ہے؟" وہ مسکرا دیا۔

وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بچوں کی طرح بھاگتی کشتی کی طرف گئی۔ وہ اس کے پیچھے لپکا۔

اس کے پاس پہنچنے پر کشتی پانی سے کچھ باہر آگئی۔ وہ بڑی آسانی سے اس میں سوار ہو گئی۔ اسے لگا وہ کشتی صندل کی لکڑی سے بنی تھی۔ خوشبودار صندل سے۔

وہ اس کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا کشتی کو پانی میں لے گیا۔ دونوں بے اختیار ہنسے۔ کشتی اب جھیل کے دوسرے کنارے کی طرف سفر کر رہی تھی۔ اس نے جھک کر پانی میں تیرتا کنول کا ایک پھول پکڑ لیا۔ پھر اسی احتیاط کے ساتھ اسے چھوڑ دیا۔

اس نے دوسری طرف جھک کر اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں جھیل کا پانی ایک چھوٹی سی رنگین مچھلی سمیت لیا اور اس کے سامنے کر دیا۔ اس کے ہاتھوں کے پیالے میں حرکت کرتی مچھلی کو دیکھ کر وہ ہنسی۔ پھر اس نے اس مچھلی کو ہاتھ سے پکڑا اور پانی میں اچھال دیا۔ وہ دونوں جھک کر اسے دیکھتے رہے۔

پانی پر تیرتا ایک ہنس کشتی کے پاس آگیا۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا۔ وہ کشتی کے گرد جیسے ایک دائرہ سا بنا کر تیر رہے تھے۔ یوں جیسے ان کا استقبال کر رہے تھے۔ وہ پاس سے تیر کر گزرتے ہر ہنس کو اپنے ہاتھ سے چھوتی کھلکھلا رہی تھی۔ پھر یک دم اس نے جھیل کے پانی پر کنول کے پھولوں کی قطاروں کو حرکت کرتے دیکھا۔ وہ جھیل کے پانی پر تیرتے اب رقص کر رہے تھے۔ ادھر سے ادھر جاتے۔ خوب صورت شکلیں بناتے۔ پاس آتے۔ دور جاتے۔ پھر پاس آتے۔ یوں جیسے وہ یک دم ہنسوں کی طرح زندہ ہو گئے تھے۔ جھیل کے نیلے پانی پر وہ سفید کنول اپنے سبز خوب صورت پتوں کے ساتھ ہونے والی مسلسل حرکت سے پانی میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ وہ بے خود ہو رہی تھی یا بے اختیار۔ وہ بھی کچھ نہیں پا رہی تھی۔ سمجھنا اب ضروری بھی نہیں تھا۔

جھیل کے نیلے پانی پر رقص کرتے لاتعداد خوب صورت پھولوں کے بیچ اس نے پانی میں یک دم کسی عکس کو نمودار ہوتے دیکھا۔ کشتی میں بیٹھے بیٹھے وہ چونک کر مڑی اور پھر وہ بے ساختہ کھڑی ہو گئی۔ کشتی دوسرے کنارے کے پاس آگئی تھی اور وہاں۔ وہاں۔ کچھ تھا۔

K

ٹیلی اسکوپ سے اس نے ایک بار پھر اس بینکویٹ ہال کی کھڑکی سے اندر نظر ڈالی۔ ہال میں سیکورٹی کے لوگ اپنی اپنی جگہوں پر مستعد تھے۔ کیٹرنگ اسٹاف بھی اپنی اپنی جگہ پر تھا۔ اس بینکویٹ ہال کا داخلی دروازہ اس قد آدم کھڑکی کے بالکل سامنے تھا۔ جس کھڑکی کے بالمقابل ساٹھ فٹ چوڑی دو رویہ میں روڈ کے پار ایک عمارت کی تیسری منزل کے ایک اپارٹمنٹ میں وہ موجود تھا۔ اس اپارٹمنٹ کے بیڈ روم کی کھڑکی کے سامنے ایک کرسی رکھے وہ ایک جدید ترین اسنائپر رائفل کی ٹیلی اسکوپ سائٹ سے کھڑکی کے پردے میں موجود ایک چھوٹے سے سوراخ سے اس بینکویٹ ہال میں جھانک رہا تھا۔ بینکویٹ ہال کا داخلی دروازہ کھلا ہوا تھا اور کوریڈور میں استقبالی قطار اپنی پوزیشن لے چکی تھی۔ اس کی گھڑی پر 9:02 بجے تھے۔ مہمان کو ٹھیک پندرہ منٹ پر اس کوریڈور میں داخل ہونے والا تھا اور تقریباً ایک گھنٹہ اور پندرہ منٹ وہاں گزارنے کے بعد وہ وہاں سے جانے والا تھا۔ مہمان کے اس ہوٹل میں پہنچنے سے اس کی روانگی کے بعد تک اس علاقے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے لیے ہر طرح کا مواصلاتی رابطہ جام ہونے والا تھا۔ یہ سیکورٹی کے ہائی الرٹ کی وجہ سے تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے لیے وہاں سیل فون اور متعلقہ کوئی

ڈیوائسز کام نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن وہ ایک پروفیشنل ہٹ مین تھا۔ اس سے پہلے بھی اسی طرح کے ہائی الرٹس میں کامیابی سے کام کرتا رہا تھا۔ اس کو ہائر کرنے کی وجہ بھی اس کی کامیابی کا تناسب تھا جو تقریباً" نوے فیصد تھا۔ وہ صرف دو لوگوں کو مارنے میں ناکام رہا تھا اور اس کی وجہ اس کے نزدیک اس کی بری قسمت تھی۔ پہلی بار اس کی رائفل لاسٹ سیکنڈز میں اس اسٹینڈ سے ہل گئی تھی جس پر وہ رکھی تھی اور دوسری بار۔۔۔ خیر دوسری بار کا قصہ طویل تھا۔

وہ پچھلے دو مہینے سے اس اپارٹمنٹ میں رہ رہا تھا۔ اس دن سے تقریباً" ایک مہینہ پہلے سے جب یہ ہوٹل اس بینکوئٹ کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ جنہوں نے اسے اس اہم کام پر مامور کیا تھا اس تقریب کے لیے اس ہوٹل اور ہوٹل کے اس بینکوئٹ ہال کا انتخاب کرنے والے بھی وہی تھے۔

اس مہمان کو ختم کرنے کا فیصلہ چار ماہ پہلے ہوا تھا۔ وقت، جگہ اور قاتل کا انتخاب بے حد ماہرانہ طریقے سے بڑے غور و خوض کے بعد کیا گیا تھا۔ اس مہمان کے سال کی مکمل مصروفیات کے شیڈول میں سے مقام، ملک اور ممکنہ قاتلوں کے نام شارٹ لسٹ کیے گئے تھے۔ پھر ہر جگہ اور تاریخ پر ہونے والے اس حادثے کے اثرات پر سیر حاصل بحث کی گئی تھی۔ فوری اثرات اور اس سے نمٹنے کی حکمت عملی پر بات کی گئی تھی۔ ممکنہ رد عمل کے نقصانات سے نپٹنے کے لیے منصوبے تیار کیے گئے تھے۔ ایک قاتلانہ حملے کے ناکام ہو جانے کی صورت میں ہونے والے ممکنہ رد عمل اور نقصانات پر غور کیا گیا تھا اور ہر میٹنگ کے بعد "کام" کی جگہیں اور تاریخیں بدلتی رہی تھیں لیکن قاتل ایک ہی رہا تھا۔ کیونکہ وہ موزوں ترین تھا۔

اس شہر میں اس تاریخ پر اس تقریب کے لیے سیکورٹی کی وجوہات کے باعث تین مختلف ہوٹلز کا نام لسٹ میں رکھا گیا تھا، لیکن اسے ہائر کرنے والے جانتے تھے کہ تقریب کہاں ہوگی۔

اس کو دو ماہ پہلے ہی اس اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر ستائیس سالہ لڑکی سے دوستی کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس لڑکی کے چار سالہ پرانے بوائے فرینڈ سے بریک اپ کے لیے ایک پروفیشنل کال گرل کا استعمال کیا گیا تھا جو اس کے کار ڈیلر بوائے فرینڈ سے ایک کار خریدنے کے بہانے ملی تھی اور اسے ایک ڈرنک کی آفر کرکے ایک موٹل لے گئی تھی۔

اس کال گرل کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کی ریکارڈنگ دوسرے دن اس لڑکی کو میل میں موصول ہو گئی تھی۔ اس کا بوائے فرینڈ نشے میں تھا اسے پھنسایا گیا تھا اور یہ سب ایک غلطی تھی، لیکن اس کے بوائے فرینڈ کی کوئی تاویل اس کے غصے اور رنج کو کم نہیں کر سکی تھی۔ اس کی گرل فرینڈ کے لیے یہ بات اس لیے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی۔ زیادہ ناقابل برداشت تھی کیونکہ وہ تین ہفتے بعد شادی کرنے والے تھے۔ اس نے اپنے بوائے فرینڈ کا سامان گھر کے دروازے سے باہر نہیں پھینکا تھا۔ اسے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے باہر پھینکا تھا۔ سڑک پر بکھرے سامان کو اکٹھا کرتے ہوئے خود کو اور اس کال گرل کو کوستے ہوئے بھی اس کا بوائے فرینڈ یہ سوچ رہا تھا کہ چند ہفتوں میں اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور وہ دونوں دوبارہ اکٹھے ہو جائیں گے۔ جنہوں نے ان کا تعلق ختم کروایا تھا۔ انہیں اس بات کا اندیشہ بھی تھا۔ چنانچہ معاملات کو پوائنٹ آف نو ریٹرن تک پہنچانے کے لیے اس لڑکے کے کمپیوٹر کو ہیک کیا گیا تھا۔ اس کی اور اس کی گرل فرینڈ کی بے حد قابل اعتراض تصویروں کو اس کی ای میل آئی ڈی کے ساتھ بہت ساری ویب سائٹس پر اپ لوڈ کر دیا گیا تھا۔

یہ جیسے تابوت میں آخری کیل تھی۔ اس لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ کی ای میل آئی ڈی سے بھیجا ہوا پیغام پڑھا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ اس نے اپنے بریک اپ کے بعد اس کی ساری پکچرز کو قابل اعتراض ویب سائٹس پر اپ لوڈ کر دیا ہے۔ اس کی گرل فرینڈ نے پہلے وہ لنکس وزٹ کیے تھے پھر اپنے بوائے فرینڈ کی اس کال گرل کے ساتھ ویڈیو کو اپ لوڈ کیا تھا اور اس کے بعد اپنے سابقہ بوائے فرینڈ کو اس کے شوروم میں جا کر اس کے کسٹمرز کے

بیچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔
سامنے اس وقت پڑا تھا جب وہ انہیں ایک جدید ماڈل کی گاڑی تقریباً"
"Happy families drive this car" اس نے تقریباً چھپن بار یہ جملہ اس جوڑے کے سامنے دہرایا تھا جو ٹیسٹ ڈرائیو کے لیے وہاں موجود تھے اور اس کے ساتھ اس نے ایک سو چھپن بار یہ جھوٹ بھی بولا تھا کہ کس طرح خود بھی اس کار کو ذاتی استعمال میں رکھنے کی وجہ سے اس کا اور اس کی گرل فرینڈ کا ریلیشن شپ مضبوط ہوا تھا۔ اس کے بوائے فرینڈ کو مار کھانے پر اتنا شاک نہیں لگا تھا۔ چار سالہ کورٹ شپ میں وہ اپنی گرل فرینڈ کے ہاتھوں اس شہر کی تقریباً" ہر مشہور پبلک پلیس پر پٹ چکا تھا اور یہ تو بہرحال اس کا اپنا شوروم تھا۔ جتنا اسے اپنی گرل فرینڈ کے الزام سن کر شاک لگا تھا۔

اس کے چیخنے چلانے اور صفائیاں دینے کے باوجود اس کی گرل فرینڈ کو یقین تھا کہ اس نے شراب کے نشے میں حرکت کی ہوگی۔ ورنہ اس کی ذاتی لیپ ٹاپ میں موجود تصویریں اس کے ای میل ایڈریس کے ساتھ کون اپ لوڈ کر سکتا تھا۔

اس بریک اپ کے ایک ہفتے کے بعد وہ نائٹ کلب میں اس سے ملا تھا۔ چند دن ان کی ملاقاتیں اسی بے مقصد انداز میں ہوتی رہی تھیں۔ وہ میڈیکل ٹیکنیشن تھی اور اس نے اپنا تعارف پینٹر کے طور پر کروایا تھا۔ وہ ہر بار اس لڑکی کی اور محبت کی خود ادا کرتا رہا تھا۔ چند دن کی ملاقاتوں کے بعد اس نے اسے پروپوز کیا تھا اور اس کے بعد وہاں اس کا آنا جانا روز ہونے لگا تھا۔ وہ اس بلڈنگ کے افراد کو ایک ریگولر وزیٹر کا تاثر دینا چاہتا تھا اور دو ماہ کے اس عرصے میں وہ اس اپارٹمنٹ کی دوسری چابی بنوا چکا تھا اور ایک ہفتہ پہلے وہ اس لڑکی کی عدم موجودگی میں اس کے اپارٹمنٹ پر وہ سنائپر رائفل اور کچھ دوسری چیزیں بھی منتقل کر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا اس تقریب سے ایک ہفتہ پہلے اس علاقے کی تمام عمارتوں پر سیکورٹی چیک ہوگی۔ وہ تب ایسا کوئی بیگ اسکریننگ کے بغیر عمارت میں منتقل نہیں کر سکے گا اور اس وقت بھی اس علاقے کی تمام بلڈنگز بے حد ٹائٹ سیکورٹی میں تھیں۔ وہ ایک ریگولر وزیٹر نہ ہوتا تو اس وقت اس بلڈنگ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

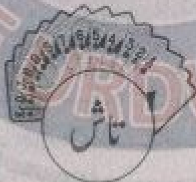
اس بلڈنگ سے پچاس میل دور اس کی گرل فرینڈ کو اسپتال میں کسی ایمرجنسی کی وجہ سے روک لیا گیا تھا۔ ورنہ اس وقت وہ اپنے اپارٹمنٹ پر ہوتی۔ پارکنگ میں کھڑی اس کی کار کے چاروں ٹائر پنکچر تھے اور اگر وہ ان دونوں چیزوں سے کسی طرح بچ کر پھر بھی گھر روانہ ہو جاتی تو راستے میں اس کو چیک کرنے کے لیے کچھ اور بھی انتظامات کیے گئے تھے۔

لنچ کرتے دو منٹ ہو رہے تھے۔ وہ اپنی رائفل کے ساتھ مہمان کے استقبال کے لیے بالکل تیار تھا۔ جس کھڑکی کے سامنے وہ تھا ہوٹل کے اس بینکوئٹ ہال کی وہ کھڑکی بلٹ پروف شیشے کی بنی تھی۔ ڈبل گلیزڈ بلٹ پروف شیشہ۔ یہی وجہ تھی کہ ان دو کھڑکیوں کے سامنے کوئی سیکورٹی اہلکار تعینات نہیں تھے۔ تعینات ہوتے تو اسے نشانہ باندھنے میں یقیناً" دقت ہوتی لیکن اس وقت اسے پہلی بار یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اس سے پہلے کسی کو مارنے کے لیے اتنی جامع سہولیات نہیں ملی تھیں۔ مہمان کو کوریڈور میں چلتے ہوئے آنا تھا۔ ایلیویٹر سے نکل کر کوریڈور میں چلتے ہوئے بینکوئٹ ہال کے داخلی دروازے تک اس مہمان کو شوٹ کرنے کے لیے اس کے پاس پورے دو منٹ کا وقت تھا۔ ایک بار وہ بینکوئٹ ہال میں اپنی ٹیبل کی طرف چلا جاتا تو اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا لیکن دو منٹ کا وقت اس جیسے پروفیشنل کے لیے دو گھنٹے کے برابر تھا۔

اس بینکوئٹ ہال کی تمام کھڑکیاں بلٹ پروف تھیں۔ صرف اس کھڑکی کے سوا جس کے سامنے وہ تھا۔ تین ہفتے پہلے بظاہر ایک اتفاقی حادثے میں اس کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ اسے تبدیل کروانے میں ایک ہفتہ لگا تھا اور تبدیل کیا جانے والا شیشہ ناقص تھا۔ یہ صرف وہی لوگ جانتے تھے جنہوں نے یہ سارا منصوبہ بنایا تھا۔ اسٹیج تیار تھا اور اس پر وہ فنکار آنے والا تھا جس کے لیے یہ ڈراما کھیلا جا رہا تھا۔

عمیرہ احمد

آبِ حیات



3



"مجھے ہاتھ دکھانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" اس نے دوٹوک انکار کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن مجھے ہے۔" وہ اصرار کر رہی تھی۔



"یہ سب جھوٹ ہوتا ہے۔" اس نے بچوں کی طرح اسے بہلایا۔
"کوئی بات نہیں دکھانے میں کیا حرج ہے۔" اس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔
"تم کیا جاننا چاہتی ہو اپنے مستقبل میں کے بارے میں۔ مجھ سے پوچھ لو۔"
وہ اسے اس پامسٹ کے پاس لے جانے کے موڈ میں نہیں تھا، جو اس فائیو اسٹار ہوٹل کی لابی میں تھا جہاں وہ کچھ دیر پہلے کھانا کھانے کے لیے آئے تھے اور کھانے کے بعد اس کی بیوی کو پتا نہیں کہاں سے وہ پامسٹ یاد آگیا تھا۔
"ویری فنی!" اس نے مذاق اڑایا تھا۔ "اپنے مستقبل کا تو تمہیں پتا نہیں میرے کا کیسے ہوگا؟"
"کیوں تمہارا اور میرا مستقبل ساتھ ساتھ نہیں ہے کیا؟" اس نے مسکرا کر اسے جتایا تھا۔
"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں پامسٹ کے پاس چلتے ہیں، اس سے پوچھتے ہیں۔" اس کا اصرار بڑھا تھا۔
"دیکھو! ہمارا۔ "آج" ٹھیک ہے۔ بس کافی ہے۔" تمہیں "کل" کا مسئلہ کیوں ہو رہا ہے؟" وہ اب بھی رضامند نہیں ہو رہا تھا۔
"مجھے ہے کل کا مسئلہ۔" وہ کچھ جھلا کر بولی تھی، اسے شاید یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس کی فرمائش پر اس طرح کے ردعمل کا اظہار کرے گا۔
"کتنے لوگ ہاتھ دکھا کر جاتے ہیں اس پامسٹ کو۔ تمہیں پتا ہے۔ میری کولیگز کو اس نے ان کے فیوچر کے بارے میں کتنا کچھ ٹھیک بتایا تھا۔ بھابھی کی بھی کتنی کزنز گئی تھیں اس کے بارے میں۔"
وہ اب اسے قائل کرنے کے لیے مثالیں دے رہی تھی۔

"بھابھی آئی تھیں اس کے پاس؟" اس نے چونک کر پوچھا تھا۔
"نہیں۔" وہ اٹکی۔
"تو؟"
"تو یہ کہ ان کو انٹرسٹ نہیں ہوگا۔ مجھے تو ہے۔ اور تم نہیں لے کر جاؤ گے تو میں خود چلی جاؤں گی۔" وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی تھی۔
"کب؟"
"ابھی۔"
وہ بے اختیار ہنسا اور اس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے اس سے کہا۔
"پامسٹ کو ہاتھ دکھانا دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہے اور میں تم سے ایسی کسی حماقت کی توقع نہیں کرتا تھا' لیکن اب تم ضد کر رہی ہو تو ٹھیک ہے۔ تم دکھاؤ ہاتھ۔"
"تم نہیں دکھاؤ گے؟" اس کے ساتھ لابی کی طرف جاتے ہوئے اس نے کہا۔
"نہیں۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔
"چلو کوئی بات نہیں۔ خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ میرا اور تمہارا مستقبل ایک ہے تو جو کچھ میرے بارے میں بتائے گا پامسٹ وہ تمہارے بارے میں بھی تو ہوگا۔" وہ اب اسے چھیڑ رہی تھی۔
"مثلاً؟" اس نے بھنویں اچکاتے ہوئے اس سے پوچھا۔
"مثلاً۔۔۔ اچھی خوشگوار ازدواجی زندگی اگر میری ہوگی تو تمہاری بھی تو ہوگی۔"
"ضروری نہیں ہے۔" وہ اسے تنگ کر رہا تھا۔
"ہوسکتا ہے شوہر کے طور پر میری زندگی بری گزرے تمہارے ساتھ۔"
"تو مجھے کیا؟ میری تو اچھی گزر رہی ہوگی۔" اس نے کندھے اچکا کر اپنی بے نیازی دکھائی۔
"تم مرد بڑے سیلفش (خود غرض) ہوتے ہو۔" اس نے ساتھ چلتے ہوئے جیسے اس کے رویے کی مذمت کی۔
"تو نہ کیا کرو پھر ہم سے شادی۔ نہ کیا کرو ہم سے محبت۔ ہم کون سا مری جا رہی ہوتی ہیں تم مردوں کے لیے؟" اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ وہ اس پر چند لمحوں کے لیے واقعی لاجواب ہو گیا تھا۔
"ہاں۔ ہم ہی مرے جا رہے ہوتے ہیں تم لوگوں پر۔ عزت کی زندگی راس نہیں آتی شاید اس لیے۔" وہ چند لمحوں بعد بڑبڑایا۔
"تمہارا مطلب ہے تم شادی سے پہلے عزت کی زندگی گزار رہے تھے؟" وہ یک دم برا مان گئی تھی۔
"ہم شاید جنرلائز کر رہے تھے۔" وہ اس کا بدلتا موڈ دیکھ کر گڑبڑایا۔
"نہیں۔ تم صرف اپنی بات کرو۔"
"تم اگر ناراض ہو رہی ہو تو چلو پھر پامسٹ کے پاس نہیں جاتے۔" اس نے بے حد سہولت سے اسے موضوع سے ہٹایا تھا۔
"نہیں میں کب ناراض ہوں' ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔" اس کا موڈ ایک لمحہ میں بدلا تھا۔
"ویسے تم پوچھو گی کیا پامسٹ سے؟" اس نے بات کو مزید گھمایا۔

"بڑی چیزیں ہیں۔" اس نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا، مگر تب تک وہ پامسٹ کے پاس پہنچ چکے تھے۔

ایک طرف رکھی کرسی پر بیٹھا وہ غیر دلچسپی سے اپنی بیوی اور پامسٹ کی ابتدائی گفتگو سنتا رہا، لیکن اسے اپنی بیوی کی دلچسپی اور سنجیدگی دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

پامسٹ اب اس کا ہاتھ پکڑے عدسے کی مدد سے اس کی لکیروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے بے حد سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔

"لکیروں کا علم نہ تو حتمی ہوتا ہے، نہ ہی الہامی۔۔۔ ہم صرف وہی بتاتے ہیں جو لکیریں بتا رہی ہوتی ہیں۔۔ بہر حال مقدر بنانا، سنوارنا اور بگاڑنا صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔"

وہ بات کرتے کرتے چند لمحوں کے لیے رکا، پھر اس نے جیسے اس کے ہاتھ پر حیرانی سے کچھ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کا چہرہ دیکھا اور پھر برابر کی کرسی پر بیٹھے اس کے شوہر کو جو اس وقت اپنے بلیک بیری پر کچھ میسجز دیکھنے میں مصروف تھا۔

"بڑی حیرانی کی بات ہے۔" پامسٹ نے دوبارہ ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" اس نے کچھ بے تاب ہو کر پامسٹ سے پوچھا۔

"آپ کی یہ پہلی شادی ہے؟"

بلیک بیری پر اپنے میسج چیک کرتے کرتے اس نے چونک کر پامسٹ کو دیکھا۔ اس کا خیال تھا، یہ سوال اس کے لیے ہے لیکن پامسٹ کی مخاطب اس کی بیوی تھی۔

"ہاں۔" اس کی بیوی نے کچھ حیران ہو کر پہلے پامسٹ اور پھر اسے دیکھ کر کہا۔

"اوہ اچھا۔" پامسٹ پھر کسی غور و خوض میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"آپ کے ہاتھ پر دوسری شادی کی لکیر ہے۔ ایک مضبوط لکیر۔ ایک خوش گوار کامیاب دوسری شادی۔" پامسٹ نے اس کا ہاتھ دیکھتے ہوئے جیسے حتمی انداز میں کہا۔ اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر بالکل ساکت تھا۔



آدمؑ و حواؑ

اس کے پیروں کے نیچے وہ زمین جیسے سبز مخمل کی تھی۔۔۔ مخمل۔۔۔ یا کچھ اور تھا۔۔۔ تاحد نظر زمین پر سبزے کی طرح پھیلا ہوا۔۔۔ درختوں پر اگنے والی پہلی کونپلوں جیسا سبز۔۔۔ اور پھر ایک دم سمندر کے اندر پیدا ہونے والی کائی جیسی رنگت لیے۔۔۔ نمی کے ننھے ننھے قطرے اپنے وجود پہ لیے سبزے کی پتیاں معطر ہوا کے جھونکوں سے ہلتی جیسے کسی رقص میں مصروف تھیں۔۔۔ پانی کے ننھے شفاف موتی سبز پتیوں کے وجود پر پھسل رہے تھے، سنبھل رہے تھے یوں جیسے مخمور ہو کر بہک رہے ہوں۔ پتیوں کے وجود سے لپٹتے، ڈگمگاتے، جھنجھلاتے، پھسلتے۔۔۔ پھر ہوا کا ایک جھونکا چلتا، سبزے میں ایک لہر اٹھتی، سمندر میں جوار بھاٹا کی پہلی لہر کی طرح اٹھتی، رقص کرتی، لہراتی وہ سبزے کو

سہلاتی بہلاتی ایک عجیب سی سرشاری میں مبتلا کرتی ایک طرف سے دوسری طرف گزر جاتی۔ زمین جیسے رقص کرنے میں مصروف تھی۔

سبزے کا وجود ننھے ننھے پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ ہر رنگ کے پھولوں سے۔ اتنے رنگ اور ایسے رنگ جو نظر کو ششدر کردیں۔ سبزے کے وجود پر بکھرے وہ ننھے ننھے پھول یہاں سے وہاں ہر جگہ تھے۔ سبزے میں ہوا سے پیدا ہونے والی ہر لہر اور ہر موج کے ساتھ وہ بھی عجیب مستی اور سرشاری سے رقص کرنے لگتے۔

آسمان صاف تھا۔ آنکھوں کو سکون دینے والا ہلکا نیلا اور اب بھی کسی گنبد کی طرح پھیلا ہوا۔ گہرا اونچا۔ بہت اونچا۔ یہاں سے وہاں تک ہر طرف۔

ہوا معطر تھی، مخمور تھی گنگنا رہی تھی۔ وہاں موجود ہر شے کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ ہنستی، چھیڑ کر جاتی پھر پلٹ کر آتی۔ کبھی سہلاتی۔ کبھی تھپکتی۔ کبھی ٹھٹکتی۔ پھر چلتی۔ پھر گنگناتی۔ پھر لہراتی۔ وہاں تھی، نہیں تھی۔ کہاں تھی؟

وہ کسی راستے پر تھا۔ کیا راستہ تھا۔! وہ کسی انتظار میں تھا۔ کیا انتظار تھا۔! اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس راستے کے دونوں طرف دو رویہ درختوں کی قطار کے ایک درخت کے ساتھ وہ ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ سہارا لیے یا سہارا دیے۔

وہ آگئی تھی۔ اس نے بہت دور اس راستے پر اسے نمودار ہوتے دیکھ لیا۔

وہ سفید لباس میں ملبوس تھی۔ بہت مہین بہت نفیس۔ وہ ریشم تھا۔؟ اطلس تھا۔؟ کمخواب یا وہ کچھ اور تھا؟ اتنا ہلکا۔ اتنا نازک کہ ہوا کا ہلکا سا جھونکا اس سفید گاؤن نما لباس کو اڑانے لگتا۔ اس کی دودھیا پنڈلیاں نظر آنے لگتیں۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور سبزے پر دھرے اس کے خوب صورت پاؤں جیسے سبزے کی نرمی کو برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ پاؤں رکھتی چند لمحوں کے لیے لڑکھڑاتی۔ جیسے مخمور ہو کر ہنستی۔ پھر سنبھل جاتی۔ پھر بڑے اشتیاق سے ایک بار پھر قدم آگے بڑھا دیتی۔

اس کے سیاہ بال ہوا کے جھونکوں سے اس کے شانوں اور اس کی کمر تک ہلکورے کھا رہے تھے۔ اس کے گالوں اور چہرے کو چومتے آگے پیچھے جا رہے تھے۔ اس کے چہرے پر آتے۔ اس کے سینے سے لپٹتے۔ اس کے کندھے پر بکھرے ہوا میں لہرا کر ایک بار پھر پیچھے چلے جاتے۔ وہ خوب صورت سیاہ چمک دار ریشمی زلفیں جیسے اس کے سفید لباس کے ساتھ مل کر اس کے وجود کے ساتھ رقص کرنے میں مصروف تھیں۔

اس کے مرمریں وجود پر وہ سفید لباس جیسے پھسل رہا تھا۔ سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ وہ اس کے جسم کے خدوخال کو نمایاں کرتا۔ اس کے پیروں سے کندھوں تک چومتا۔ اس کے وجود کے لمس سے مخمور ہوتا۔ ہوش کھوتا۔ دیوانہ وار اس کے وجود کے گرد گھومتا۔ کسی بھنور کی طرح اس کے جسم کو اپنی گرفت میں لیتا اس سے لپٹ رہا تھا۔ ہوا کا دوسرا جھونکا اس کی سیاہ ریشمی زلفوں کو بھی اس رقص میں شامل کر دیتا۔ وہ اس کے کندھوں اور کمر پر والہانہ انداز میں پھسلتیں۔ ہوا میں ہلکا سا اڑتیں پھر نرمی اور ملائمت سے اس کے چہرے اور سینے پر گرتیں۔ اس کے وجود سے پھوٹتی خوشبو سے یک دم سرشار ہوتیں۔ پھر اس کے جسم کو جیسے اپنے وجود سے چھپانے کی کوشش کرنے لگتیں۔ ہوا کا ایک اور جھونکا انہیں ہولے سے اٹھا کر پھر پیچھے پھینک دیتا۔

اس رقص میں اب پھر اس کے سفید لباس کی باری تھی۔ وہ آگے بڑھ آیا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ عجیب سی حیرت میں مبتلا وہاں کی ہر شے کو سحر زدہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔ بچوں جیسی حیرت اور اشتیاق کے

ساتھ۔

اس راستے پر چلتے چلتے اس نے اسے دیکھ لیا۔ اس کے قدم تھمے' دونوں کی نظریں ملیں پھر اس کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ آئی۔ پہلے مسکراہٹ پھر ہنسی۔ اس نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہاں موجود وہ واحد وجود تھا جسے وہ پہچانتی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کے قریب آگئی۔ دونوں ایک عجیب سی سرشاری میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔

اس کی گہری سیاہ' مسکراتی ہوئی آنکھیں ہیرے کی کنیوں کی طرح چمک رہی تھیں اور یہ چمک اسے دیکھ کر بڑھ گئی تھی۔ اس کے خوب صورت گلابی ہونٹوں پر نمی کی ہلکی سی تہہ تھی یوں جیسے وہ ابھی کچھ پی کر آئی ہو۔ اس کی ٹھوڑی ہمیشہ کی طرح اٹھی ہوئی تھی۔ اس کی صراحی دار گردن کو دیکھتے ہوئے اس نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ وہ جیسے اس لمس سے واقف تھی' پھر وہ دونوں بے اختیار ہنسے۔

"تم میرا انتظار کر رہے تھے؟"

"ہاں۔"

"بہت دیر کر دی؟"

"نہیں۔ بہت زیادہ نہیں۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے اس راستے پر چلنے لگا۔

ہوا ابھی بھی ان دونوں کے وجود کے ساتھ اور وہاں موجود ہر شے کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرنے میں مصروف تھی۔

وہ اب بھی بچوں جیسی حیرت اور خوشی کے ساتھ وہاں موجود ہر شے کو کھوجنے میں مصروف تھی۔ اس کی کھلکھلاہٹ اور شفاف ہنسی وہاں فضا کو ایک نئے رنگ سے سجانے لگے تھے۔ فضا میں یک دم ایک عجیب دلفریب سا ساز بجنے لگا تھا۔ وہ ٹھٹھکی' پھر بے اختیار کھلکھلائی۔ اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے اس نے اس راستے پر قدم آگے بڑھائے' پھر ہوا نے اسے دونوں بازو ہوا میں پھیلائے رقص کے انداز میں گھومتے دیکھا۔ وہ بے اختیار ہنسا۔ وہ اس راستے پر کسی ماہر بیلے رینا کی طرح رقص کرتی دور جا رہی تھی۔ اس کے جسم پر موجود سفید لباس اس کے گھومتے جسم کے گرد ہوا میں اب کسی پھول کی طرح رقصاں تھا۔ وہ اب آہستہ آہستہ ہوا میں اٹھنے لگی تھی۔ ہوا کے معطر جھونکے بڑی نرمی سے اسے جیسے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ وہ اب بھی اسی طرح ہنستی' رقص کے انداز میں بازو پھیلائے گھوم رہی تھی۔ وہ سحر زدہ اسے دیکھتا رہا۔ وہ اب کچھ گنگنا رہی تھی'

فضا میں یک دم کوئی ساز بجنے لگا تھا۔ پہلے ایک۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا۔ پھر بہت سارے۔ پوری کائنات یک دم جیسے کسی سمفنی میں ڈھل گئی تھی اور وہ اب بھی ہوا میں رقصاں تھی۔ کسی تتلیں پر کی طرح ہوا کے دوش پر اوپر نیچے جاتے' وہ سحر زدہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ساتھی رقص کرتے ہوئے ایک بار پھر اسے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنسی' پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ بڑھایا یوں جیسے اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دے رہی ہو۔ وہ ہنس پڑا

وہ ہاتھ بڑھاتی اور وہ کھنچا نہ چلا آتا۔

وہ بھی اس کا ہاتھ پکڑے اب فضا میں رقصاں تھا۔ زمین سے دور۔ اس کے قریب۔ اس کے ساتھ۔ یک دم وہ رکی جیسے کائنات ٹھہر گئی ہو۔ وہ اب آسمان کو دیکھ رہی تھی پھر یک دم آسمان تاریک ہو گیا۔ دن رات میں

بدل گیا تھا۔ اور رات دن سے بڑھ کر خوبصورت تھی۔۔۔ سیاہ آسمان خوب صورت چمکتے ہوئے ستاروں سے سجا ہوا تھا۔ ہر رنگ کے ستاروں سے۔۔۔ اور ان سب کے درمیان چاند تھا۔۔۔ کسی داغ کے بغیر' روشنی کا منبع۔

دن کی روشنی اجلی تھی۔۔۔ سکون آور تھی۔۔۔ مدہوش کردینے والی تھی۔ رات کی روشنی میں بے شمار رنگ تھے' کائنات میں ایسے رنگ انہوں نے کب دیکھے تھے۔۔۔ کہاں دیکھے تھے۔ زمین جیسے ہر رنگ کی روشنی میں نہا رہی تھی۔ ایک ستارہ ٹمٹماتا۔۔۔ پھر دوسرا۔۔۔ پھر تیسرا۔۔۔ اور زمین پر کبھی ایک رنگ بڑھتا' کبھی دوسرا' کبھی تیسرا۔۔۔ آسمان کو جیسے کسی نے روشنیوں میں پرو دیا تھا۔

وہ اس کا ہاتھ پکڑے جیسے سرشاری کی انتہا پر پہنچی ہوئی تھی۔۔۔ اس کی حیرت اس کی سرشاری جیسے اسے محظوظ کررہی تھی۔۔۔ گدگدا رہی تھی۔

وہ اب پھر زمین پر آگئے تھے۔ رات ایک بار پھر دن میں بدل گئی تھی۔۔۔ سبزہ' پھول' پتے' مہکتی معطر ہوا' سب وہیں تھے۔

اس کے ساتھ چلتے چلتے اس نے اپنے پیروں کے نیچے آتے مخملیں سبزے پر سجے پھولوں کو دیکھا پھر ہاتھ بڑھایا۔ اس کے ہاتھ میں وہ پھول آگیا' پھر دوسرا' پھر تیسرا۔ پھر دور دور تک پھیلے سبزے کے سارے پھول جیسے کسی مقناطیس کی طرح اس کی طرف آرہے تھے۔ سینکڑوں' ہزاروں' لاکھوں۔۔۔ لاتعداد۔ بے شمار گنتے کہ اس کے ہاتھ سنبھال میں پائے تھے۔ وہ اب اس کے ہاتھوں پر۔ اب اس کے بالوں پر' اب اس کے لباس پر' اب اس کے جسم پر۔ وہ خوشی سے بے خود ہورہی تھی' سرشار ہورہی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں ہوا میں اچھالا۔۔۔ وہ پلک جھپکتے میں آسمان کی طرف گئے۔۔۔ پورا آسمان پھولوں سے بھر گیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے پھر پھولوں کی بارش ہونے لگی تھی۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ پھولوں کو بارش کے قطروں کی طرح مٹھیوں میں بھرتے اور چھوڑتے بھاگتے' کھلکھلاتے وہ سب پھول زمین پر گر کر ایک بار پھر سبزے میں اپنی اپنی جگہ سج گئے تھے۔۔۔ وہاں جہاں وہ تھے۔۔۔ وہیں جہاں انہیں ہونا چاہیے تھا۔

وہ ایک بار پھر آسمان کو دیکھ رہے تھے' وہاں اب بادل نظر آرہے تھے۔ روئی کے گالوں جیسے حرکت کرتے بادل' وہ سب بادل وہاں جمع ہورہے تھے' جہاں وہ کھڑے تھے۔۔۔ پھر اس نے آسمان پر بارش کا پہلا قطرہ دیکھا' اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی ہتھیلی پر لیا۔ اس قطرے کو دیکھ کر دوبارہ ہنستے ہوئے آسمان کی طرف اچھال دیا۔ اس بار وہ قطرہ اوپر جاکر اکیلا واپس نہیں آیا تھا۔ وہ بہت سارے دوسرے قطروں کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ بہت سارے نرم لمس گدگدانے والے قطرے۔۔۔ بارش برس رہی تھی اور وہ دونوں بچوں کی طرح ہنستے' کھلکھلاتے پانی کے ان قطروں کو ہاتھوں سے پکڑ کر ایک دوسرے پر اچھال رہے تھے۔۔۔ وہ بارش کا پانی تھا مگر وہ قطرے ان کے بالوں' ان کے جسم کو گیلا نہیں کررہے تھے۔۔۔ وہ جیسے شفاف موتیوں کی بارش تھی' جو ان کے ہاتھ اور جسم کی ایک جنبش پر ان کے بالوں اور لباس سے الگ ہوکر دور جاگرتے۔۔۔ سبزے اور پھولوں کے اوپر اب بارش کے شفاف موتی جیسے قطروں کی ایک تہہ سی آگئی تھی یوں جیسے کسی نے زمین پر کوئی شیشہ پھیلا دیا ہو۔۔۔ اور وہ اس شیشے پر چل رہے تھے۔ ان کو اپنے سائے میں لیے وہ رکتے' ہاتھ ہلاتے' آسمان پر بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجتے' پھر اپنی طرف بلاتے۔ وہ آسمان پر جیسے پانی سے مصوری کررہے تھے۔

پھر جیسے وہ اس کھیل سے تھک گئی۔۔۔ وہ رکی۔۔۔ بارش تھمی۔۔۔ زمین سے پانی کے قطرے غائب ہونے لگے پھر بادل۔۔۔ چند ساعتوں میں آسمان صاف تھا۔ یوں جیسے وہاں کبھی بادل نام کی کوئی شے آئی ہی نہ ہو۔

وہ اب اس کا ہاتھ پکڑ رہا تھا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تمہیں کچھ دکھانا ہے۔" وہ مسکرایا۔
"کچھ اور بھی؟" اس کی خوشی کچھ اور بڑھی۔
"ہاں' کچھ اور بھی۔" اس نے اثبات میں سرہلایا۔
"کیا؟" اس نے بے ساختہ اس سے پوچھا تھا۔ وہ خاموشی سے مسکرادیا۔
"کیا...؟" اس نے بچوں کی طرح اصرار کیا۔
وہ پہلے سے زیادہ پُراسرار انداز میں مسکرایا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑے اسی نئے راستے کی طرف جارہا تھا۔
پھران دونوں کو دور سے کچھ نظر آنے لگا تھا۔



سالار نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی۔ کمرے میں مکمل تاریکی تھی۔ وہ فوری طور پر سمجھ نہیں سکا کہ وہ کہاں ہے۔ اس کی سماعتوں نے دور کہیں کسی مسجد سے سحری کے آغاز کا اعلان سنا۔ اس کمرے کے گھپ اندھیرے کو کھلی آنکھوں سے کھوجتے ہوئے اسے اگلا خیال اس خواب اور امامہ کا آیا تھا۔ وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا جس سے وہ بیدار ہوا تھا۔
مگر خواب میں وہ امامہ کو کیا دکھانے والا تھا' اسے کچھ یاد نہیں آیا۔ "امامہ!" اس کے دل کی دھڑکن جیسے ایک لمحے کے لیے رکی تھی۔ وہ کہاں تھی؟ کیا پچھلی رات ایک خواب تھی؟
وہ یک دم جیسے کرنٹ کھا کر اٹھا۔ اپنی رکی سانس کے ساتھ اس نے دیوانہ وار اپنے بائیں جانب بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ کا سوئچ آن کیا۔ کمرے کی تاریکی جیسے یک دم چھٹ گئی۔ اس نے برق رفتاری سے پلٹ کر اپنی داہنی جانب دیکھا اور پُرسکون ہو گیا۔ اس کی رکی سانس چلنے لگی۔ وہ وہیں تھی۔ وہ "ایک خواب" سے کسی "دوسرے خواب" میں داخل نہیں ہوا تھا۔
یک دم آن ہونے والے بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ کی تیز روشنی چہرے پر پڑنے پر امامہ نے نیند میں بے اختیار اپنے ہاتھ اور بازو کی پشت سے اپنی آنکھوں اور چہرے کو ڈھک دیا۔
سالار نے پلٹ کر لیمپ کی روشنی کو ہلکا کر دیا۔ وہ اسے جگانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس سے چند فٹ کے فاصلے پر تھی۔ گہری پُرسکون نیند میں۔ اس کا ایک ہاتھ تکیے پر اس کے چہرے کے نیچے دبا ہوا تھا اور دوسرا اس وقت اس کی آنکھوں کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ اس کی ادھ کھلی ہتھیلی اور کلائی پر مہندی کے خوب صورت نقش و نگار تھے۔ مٹتے ہوئے نقش و نگار لیکن اب بھی اس کے ہاتھوں اور کلائیوں کو خوب صورت بنائے ہوئے تھے۔
سالار کو یاد آیا' وہ مہندی کسی اور کے لیے لگائی گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آئی۔ اس نے بے اختیار چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کیں۔
کسی اور کے لیے؟
پچھلی ایک شام ایک بار پھر کسی فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں گزر گئی تھی۔ اس نے سعیدہ اماں کے صحن میں اس چہرے کو نو سال کے بعد دیکھا تھا اور نو سال کہیں غائب ہو گئے تھے۔
وہ ذرا سا آگے جھکا اس نے بڑی نرمی سے اس کے ہاتھ کو اس کے چہرے سے ہٹا دیا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ کی زرد روشنی میں اس سے چند انچ دور وہ اس پر جھکا' اسے مبہوت دیکھتا رہا۔ وہ گہرے سانس لیتی جیسے اسے زندگی دے رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے وہ جیسے کسی طلسم میں پہنچا ہوا تھا۔ بے حد غیر محسوس انداز میں اس نے امامہ کے

چہرے پر آئے کچھ بالوں کو اپنی انگلیوں سے بڑی احتیاط سے ہٹایا۔



"میں لائٹ آف کر کے نہیں سو سکتا۔" امامہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس نے سالار کو سونے سے پہلے لائٹ آف کرنے کے لیے کہا تھا۔

فوری طور پر امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ اگر وہ لائٹ آف کر کے نہیں سو سکتا تھا تو وہ لائٹ آن رکھ کر نہیں سو سکتی تھی لیکن وہ یہ بات اسے اتنی بے تکلفی سے نہیں کہہ سکتی تھی جتنے اطمینان سے وہ اسے کہہ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" الارم سیٹ کر کے سیل فون کو بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔ وہ کمبل لپیٹے اسی طرح بیڈ پر بیٹھی جیسے کچھ سوچ رہی تھی۔ یہ سالار کے گھر اس کی پہلی رات تھی۔

"کچھ نہیں۔" وہ کمبل لپیٹتے ہوئے اپنا تکیہ سیدھا کرنے لگی۔

"تم شاید لائٹ آف کر کے سوتی ہو۔" سالار کو اچانک خود ہی احساس ہو گیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹتے لیٹتے رک گئی۔

"ہمیشہ۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

"پھر کچھ کرتے ہیں۔" سالار نے بے ساختہ گہرا سانس لے کر سر کھجاتے ہوئے کچھ سوچنے والے انداز میں کمرے کی لائٹس کا جائزہ لیا۔

"میں دیکھتا ہوں، دوسرے بیڈ روم میں زیرو کا بلب ہے اگر وہ۔" وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ امامہ کے تاثرات سے اسے لگا کہ یہ حل بھی اس کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔

"زیرو کے بلب کی کتنی روشنی ہوتی ہے!" سالار نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھ کر کہا۔

"کمرے میں تھوڑی سی بھی روشنی ہو تو میں نہیں سو سکتی۔ میں "اندھیرے" میں سوتی ہوں۔" اس نے پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنا مسئلہ بتایا۔

"عجیب عادت ہے۔" وہ بے ساختہ کہہ کر ہنسا۔

اس کی بات سے زیادہ اس کی ہنسی امامہ کو کھلی۔

"ٹھیک ہے لائٹ آن رہنے دو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں۔ نو پرابلم میں اسے آف کر رہا ہوں۔"

دونوں بیک وقت اپنے اپنے موقف سے دست بردار ہوئے تھے۔

سالار نے لائٹ آف کر دی اور پھر سونے کے لیے خود بھی بستر پر لیٹ گیا لیکن وہ جانتا تھا، یہ اس کے لیے مشکل ترین کام تھا۔ مارگلہ کی پہاڑی پر آٹھ سال پہلے گزاری ہوئی اس ایک رات کے بعد وہ کبھی کمرے کی لائٹ بند کر کے نہیں سو سکا تھا، لیکن اس وقت اس نے مزید بحث نہیں کی۔ چند گھنٹوں کے بعد اسے دوبارہ سحری کے لیے اٹھ جانا تھا۔ وہ یہ چند گھنٹے بستر میں چپ چاپ لیٹ کر گزار سکتا تھا۔ ویسے بھی "اندھیرا" تھا، پر آج رات وہ "اکیلا" نہیں تھا۔

کچھ دیر دونوں کے درمیان مکمل خاموشی رہی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کا آغاز کیسے کریں۔ سالار کے لیے خاموشی کا یہ وقفہ زیادہ تکلیف دہ تھا۔

تاریکی میں امامہ نے سالار کو گہرا سانس لے کر کہتے سنا۔

"اب اگر اتنی بڑی قربانی دے رہا ہوں میں لائٹ آف کر کے تو "کوئی" ہاتھ ہی پکڑ لے۔" امامہ کو بے اختیار ہنسی آئی۔ وہ اندھیرے میں اس کے کچھ قریب ہوئی اور سالار کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تمہیں ڈر لگ رہا ہے کیا؟" اس کے لہجے میں نرمی اور اپنائیت تھی۔

"اگر ہاں کہوں گا تو کیا کرو گی؟" سالار نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا۔

"تسلی دوں گی اور کیا کروں گی۔" وہ محجوب ہوئی تھی۔

"جیسے اب دے رہی ہو؟" اسے امامہ کو تنگ کرنے میں مزا آرہا تھا لیکن یہ جملہ کہنے سے پہلے اس نے اپنے سینے پر دھرے اس کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس کے متوقع جوابی عمل کو سالار سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ امامہ واقعی ہاتھ ہٹانے ہی والی تھی۔

"ڈر کیوں لگتا ہے تمہیں؟" امامہ نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"ڈر نہیں لگتا بس صرف سو نہیں سکتا۔"

"کیوں؟" وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

وہ فوری جواب نہیں دے سکا۔ مارگلہ کی وہ رات سالار کی نظروں میں گھومنے لگی تھی۔ امامہ چند لمحے اس کے جواب کا انتظار کرتی رہی پھر بولی۔

"بتانا نہیں چاہتے۔" سالار کو حیرانی ہوئی۔ وہ کیسے اس کا ذہن پڑھ رہی تھی؟

"اور ایسا کب سے ہے؟" امامہ نے اپنے سوال کو بدل دیا تھا۔

"آٹھ سال سے۔" سالار نے جواب دیا۔

وہ مزید کوئی سوال نہیں کر سکی۔ اسے بھی بہت کچھ یاد آنے لگا تھا۔ آٹھ سال "آٹھ سال"۔ وہ آٹھ سال سے اندھیرے سے خوف زدہ تھا اور وہ نو سال سے روشنی سے خوف کھاتی پھر رہی تھی۔ دنیا سے چھپتی پھر رہی تھی۔ اس نے سالار سے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ ایک دوسرے کے وجود میں پیوست کانٹوں کو نکالنے کے لیے ایک رات ناکافی تھی۔ وہ اب اس کے ہاتھ کی پشت کو چوم کر اسے اپنی بند آنکھوں پر رکھ رہا تھا۔ امامہ بے اختیار رنجیدہ ہوئی۔

"میں لائٹ آن کر دیتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"نہیں۔ اندھیرا اچھا لگنے لگا ہے مجھے۔" وہ اسی طرح اس کا ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھے بڑبڑایا تھا۔



بہت نرمی سے جھک کر اس نے امامہ کے چہرے کو اپنے ہونٹوں سے چھوا۔ وہ اس سے باتیں کرتا کس وقت سویا تھا' اسے اندازہ نہیں ہوا اور اب وہ جاگا تھا تو اسے حیرت ہو رہی تھی۔ اندھیرے میں سونا اتنا مشکل اور اتنا ہولناک ثابت نہیں ہوا تھا' جتنا وہ سمجھتا رہا تھا۔

کمبل کو کچھ اوپر کھینچتے ہوئے اس نے اسے گردن تک ڈھانپ دیا اور پھر لیمپ آف کرتے ہوئے بڑی احتیاط سے بستر سے اٹھ گیا۔ ڈرائنگ روم کی طرف جاتے جاتے وہ اپنے سیل فون پر لگا الارم آف کر گیا۔

واش روم میں اس نے واش بیسن پر امامہ کے ہاتھ سے اتری کانچ کی کچھ چوڑیاں اور اس کے ایئر رنگز دیکھے۔ اس نے ایئر رنگز اٹھا لیے۔ وہ دیر تک انہیں اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھے دیکھتا رہا۔ وہ بہت خوب صورت تھے مگر اب پرانے ہو رہے تھے۔

جس وقت وہ نہا کر باہر نکلا' وہ تب بھی گہری نیند میں تھی۔ کمرے کی لائٹ آن کیے بغیر وہ دبے پاؤں بیڈ روم سے

باہر آ گیا۔ بہت دور کسی مسجد میں کوئی نعت پڑھ رہا تھا یا حمد۔ آواز اتنی مدھم تھی کہ سمجھنا مشکل تھا۔ اس نے سٹنگ ایریا کی لائٹ آن کر دی۔ لائٹ آن کرتے ہی اس کی نظر سینٹر ٹیبل پر پڑے کافی کے دو مگز پر پڑی۔

وہ دونوں رات کو وہیں بیٹھے کافی پیتے ہوئے باتیں کرتے رہے تھے۔ صوفے پر اس کی اونی شال پڑی تھی جس میں وہ اپنے پاؤں چھپائے بیٹھی رہی تھی۔ رات ایک بار پھر جیسے کسی خواب کا قصہ لگنے لگی تھی۔ بے یقینی تھی کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ خوش قسمتی تھی کہ اب بھی گمان بنی ہوئی تھی۔

وہ بھول گیا کہ وہ بیڈ روم سے یہاں کیا کرنے آیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے وہ واقعی سب کچھ بھول گیا تھا۔ بس "وہ" تھی اور "وہ" تھی تو سب کچھ تھا۔

اس کے سیل پر آنے والی فرقان کی کال نے یک دم اسے چونکایا تھا۔ کال ریسیو کیے بغیر وہ بیرونی دروازے کی طرف گیا۔ وہ اسے سحری دینے آیا تھا۔



اس کی آنکھ الارم کی آواز سے کھلی تھی۔ مندھی آنکھوں کے ساتھ اس نے لیٹے لیٹے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑے اس الارم کو بند کرنے کی کوشش کی لیکن الارم کلاک بند ہونے کے بجائے نیچے کارپٹ پر گر گیا۔ امامہ کی غنودگی یک دم غائب ہوئی تھی۔ الارم کی آواز جیسے اس کے اعصاب پر سوار ہونے لگی تھی۔ وہ کچھ جھلا کر اٹھی تھی۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کر کے وہ کمبل سے نکلی اور بے اختیار کپکپائی۔ سردی بہت تھی۔ اس نے کمبل ہٹاتے ہوئے بیڈ کی پائنتی کی طرف اپنی اونی شال ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے جھک کر کارپٹ پر دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ شال رات کو صوفے پر رکھی تھی لیکن اس وقت وہ بیڈ روم سے نکلنے کی ہمت نہیں کر پائی۔ الارم اب بھی بج رہا تھا۔ مگر نظر اب بھی نہیں آ رہا تھا۔ اس کی جھنجلاہٹ بڑھ گئی تھی۔ تب ہی اس نے اچانک کوئی خیال آنے پر سالار کے بستر کو دیکھا۔ وہ خالی تھا۔ اسے جیسے یک دم یاد آیا کہ وہ "کہاں" تھی۔ جھنجلاہٹ یک دم غائب ہوئی اور ساتھ ہی الارم کی آواز بھی۔ یہ سحری کا وقت تھا۔

امامہ سالار کے گھر پر تھی اور یہ اس کی نئی زندگی کا پہلا دن تھا۔

وہ دوبارہ اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ کمبل کے ایک کونے سے اس نے اپنے کندھے ڈھانپنے کی کوشش کی۔ اس کے جسم کی کپکپاہٹ کچھ کم ہوئی۔ اس نے پہلی بار اپنے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی چیزوں کو غور سے دیکھا۔ وہاں رات کو سالار نے گھڑی رکھی تھی۔ لیکن اب وہاں نہیں تھی۔ ایک چھوٹا رائٹنگ پیڈ اور پین بھی تھا۔ پاس ہی کارڈلیس فون تھا۔ پانی کی ایک چھوٹی بوتل بھی وہیں تھی اور اس کے پاس اس کا سیل پڑا تھا۔ اسے ایک بار پھر الارم کلاک کا خیال آیا۔ اسے یاد تھا کہ اس نے الارم نہیں لگایا تھا۔ یہ کام سالار کا تھا۔ شاید اس نے اپنے لیے الارم لگایا تھا۔

پھر جیسے اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ بیڈ کی وہ سائیڈ جو رات کو اس نے سونے کے لیے منتخب کی تھی، وہ سالار کا بستر تھا۔ وہ عادتاً "دائیں" طرف گئی تھی اور سالار اسے روک نہیں سکا۔ وہ کچھ دیر چپ چاپ بیٹھی رہی، پھر اس نے بے حد ڈھیلے انداز میں اپنا سیل فون اٹھا کر ٹائم دیکھا اور جیسے کرنٹ کھا کر اس نے کمبل اتار پھینکا۔ سحری ختم ہونے میں صرف دس منٹ باقی تھے اور سالار وہ الارم یقیناً "اسے" بیدار کرنے کے لیے لگا کر گیا تھا۔ اسے بے ساختہ غصہ آیا، وہ اسے خود بھی جگا سکتا تھا۔

جب تک وہ کپڑے تبدیل کر کے لاؤنج میں گئی اس کا غصہ غائب ہو چکا تھا۔ کم از کم آج وہ اس سے خوش گوار موڈ میں ہی سامنا چاہتی تھی۔ سٹنگ ایریا کے ڈائننگ ٹیبل پر سحری کے لیے کھانا رکھا تھا۔ وہ بہت تیزی سے کچن میں کھانے کے برتن لینے کے لیے گئی تھی لیکن سنک میں دو افراد کے استعمال شدہ برتن دیکھ کر اسے جیسے دھچکا لگا

تھا۔ وہ کھانا یقیناً" فرقان کے گھر سے آیا تھا اور وہ فرقان کے ساتھ ہی کھا چکا تھا۔ اسے خوامخواہ خوش فہمی ہوئی تھی کہ آج اس کے گھر میں پہلی سحری تو وہ ضرور اسی کے ساتھ کرے گا۔ بوجھل دل کے ساتھ ایک پلیٹ لے کر وہ ڈائننگ ٹیبل پر آ گئی، لیکن چند لقموں سے زیادہ نہیں لے سکی۔ اسے کم از کم آج اس کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ اس کے ساتھ کھانا کھانا چاہیے تھا۔ امامہ کو واقعی بہت رنج ہوا تھا۔

چند لقموں کے بعد ہی وہ بڑی بے دلی سے ٹیبل سے برتن اٹھانے لگی۔

برتن دھوتے دھوتے اذان ہونے لگی تھی جب اسے پہلی بار خیال آیا کہ سالار گھر میں نظر نہیں آ رہا۔

اپنے ہاتھ میں موجود پلیٹ دھوتے دھوتے وہ اسے اسی طرح سنک میں چھوڑ کر باہر آ گئی۔ اس نے سارے گھر میں دیکھا۔ وہ گھر میں نہیں تھا۔

پھر کچھ خیال آنے پر وہ بیرونی دروازے کی طرف گئی۔ دروازہ مقفل تھا لیکن ڈور چین ہٹی ہوئی تھی۔ وہ یقیناً" گھر پر نہیں تھا۔ کہاں تھا؟ اس نے نہیں سوچا تھا۔

اس کی رنجیدگی میں اضافہ ہوا۔ وہ اس کی شادی کے دوسرے دن اسے گھر پر اکیلا چھوڑ کر کتنی بے فکری سے غائب ہو گیا تھا۔ اسے پچھلی رات کی ساری باتیں جھوٹ کا پلندہ لگی تھیں۔ واپس کچن میں آ کر وہ کچھ دیر بے حد دل شکستگی کی کیفیت میں سنک میں پڑے برتنوں کو دیکھتی رہی۔ وہ "محبوبہ" سے "بیوی" بن چکی تھی، مراعات جلدی تو نہیں... ناز برداری... کسی خیال تو کرنا چاہیے۔ اس کی آزردگی میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا۔ چند گھنٹوں کے اندر کوئی اتنا بدل سکتا ہے مگر رات کو تو وہ..." اس کی رنجیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔

"یقیناً" سب کچھ جھوٹ ہی کہہ رہا ہو گا ورنہ میرا کچھ تو خیال کرتا۔" وہ رنجیدگی اب صدمے میں بدل رہی تھی۔

وہ نماز پڑھ چکی تھی اور سالار کا ابھی بھی کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ اسے تھوڑی سی تشویش ہوئی۔ اگر وہ فجر کی نماز کے لیے بھی گیا تھا تو اب تک تو اسے آ جانا چاہیے تھا۔ پھر اس نے اس تشویش کو سر سے جھٹک دیا۔



سالار جس وقت دوبارہ اپارٹمنٹ میں آیا وہ گہری نیند میں تھی۔ بیڈ روم کی لائٹ آف تھی اور ہیٹر آن تھا۔ وہ اور فرقان فجر کی نماز سے بہت دیر پہلے مسجد میں چلے جاتے اور قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد وہ دونوں وہیں سے بلڈنگ کے جم میں چلے جاتے اور تقریباً" ایک گھنٹے کے ورک آؤٹ کے بعد وہاں سے آتے اور آج یہ دورانیہ "آمنہ" کے امامہ ہونے کی وجہ سے کچھ لمبا ہو گیا تھا۔ فرقان سحری کے وقت ان دونوں کے لیے کھانا لے کر آیا تھا اور وہ بھونچکا بیٹھا رہ گیا تھا۔ وہ رات کو سالار کے جس بیان کو صدمے کی وجہ سے ذہنی حالت میں ہونے والی کسی خرابی کا نتیجہ سمجھ رہا تھا' وہ کوئی ذہنی خرابی نہیں تھی۔

وہ اطمینان سے اس کے سامنے بیٹھا سحری کر رہا تھا اور فرقان اسے رشک سے دیکھ رہا تھا۔ رشک کے علاوہ کوئی اس پر کر بھی کیا سکتا تھا۔

"کیا ہوا؟" سالار نے سحری کرتے ہوئے اس کی اتنی لمبی خاموشی پر اسے کچھ حیرانی سے دیکھا۔ فرقان اس کے سامنے بیٹھا یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم آج اپنی نظر اتروانا۔" فرقان نے بالآخر اس سے کہا۔

"اچھا۔ ؟" وہ ہنس پڑا۔ اس سے زیادہ احمقانہ بات کم از کم اس گفتگو کے بعد کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا۔" فرقان نے اپنے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

جو کچھ ہوا تھا، اسے سمجھنے سے زیادہ اسے ہضم کرنے میں اسے وقت ہو رہی تھی۔ کسی کو بھی ہو سکتی تھی۔ سوائے سامنے بیٹھے ہوئے اس شخص کے، جو اس وقت کانٹے کے ساتھ آملیٹ کا آخری ٹکڑا اپنے منہ میں رکھ رہا تھا۔

"اور اگر کوئی صدقہ وغیرہ دے سکو تو اور بھی بہتر ہے۔" فرقان نے اس کے رد عمل کو مکمل طور پر نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ سالار اب بھی خاموش رہا۔

"امامہ سحری نہیں کرے گی؟" فرقان کو یک دم خیال آیا۔

"سو رہی ہے وہ ابھی۔۔۔ میں الارم لگا آیا ہوں، ابھی کافی وقت ہے سحری کا ٹائم ختم ہونے میں۔" سالار نے کچھ لاپروائی سے اس سے کہا۔

"فرقان! اب بس کرو۔" اس سے بات کرتے کرتے وہ ایک بار پھر فرقان کی نظروں سے جھنجلایا۔ وہ پھر اسے ویسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"مجھے اس طرح آنکھیں پھاڑ کے دیکھنا بند کرو۔" اس نے اس بار کچھ خفگی سے فرقان سے کہا۔

"تم بہت نیک آدمی ہو سالار۔۔۔ اللہ تم سے بہت خوش ہے۔" وہ آملیٹ کا ایک اور ٹکڑا لیتے لیتے فرقان کی بات پر ٹھٹک گیا۔

اس کی بھوک یک دم ختم ہو گئی تھی۔ مزید ایک لفظ کہے بغیر اس نے پلیٹ پیچھے ہٹا دی اور اپنے برتن اٹھا کر اندر کچن میں لے گیا۔ وہ خوشی، سرشاری، اطمینان اور سکون جو کچھ دیر پہلے جیسے اس کے پورے وجود سے چھلک رہا تھا، فرقان نے پلک جھپکتے اسے دھواں بن کر غائب ہوتے دیکھا۔

مسجد کی طرف جاتے ہوئے فرقان نے بالآخر اس سے پوچھا تھا۔

"اتنے چپ کیوں ہو گئے ہو؟" وہ اسی طرح خاموشی سے چلتا رہا۔

"میری کوئی بات بری لگی ہے؟"

وہ اب بھی خاموش رہا۔ مسجد کے دروازے پر اپنے جوگرز اتار کر اندر جانے سے پہلے اس نے فرقان سے کہا۔

"مجھے تم سب کچھ کہہ لینا فرقان! لیکن کبھی نیک آدمی مت کہنا۔"

فرقان کچھ بول نہیں سکا۔ سالار مسجد میں داخل ہو گیا تھا۔



امامہ کی آنکھ گیارہ بجے سیل فون پر آنے والی ایک کال سے کھلی تھی، وہ ڈاکٹر سبط علی تھے۔ ان کی آواز سنتے ہی اس کا دل بھر آیا تھا۔

"میں نے آپ کو نیند سے جگا دیا؟"

وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولے۔ انہوں نے اس کی رندھی ہوئی آواز پر غور نہیں کیا تھا۔

"نہیں میں اٹھ گئی تھی۔" اس نے بستر سے اٹھتے ہوئے جھوٹ بولا۔

وہ اس کا حال احوال پوچھتے رہے۔ وہ بڑے بوجھل دل کے ساتھ تقریباً خالی الذہنی کے عالم میں ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی۔

چند منٹ اور بات کرنے کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا۔ کال ختم کرتے ہوئے اس کی نظر اپنے سیل فون میں چمکتے اس کے نام پر پڑی تھی۔ وہ چونک اٹھی۔ اسے فوری طور پر یاد نہیں آیا کہ اس نے سالار کا نام اور فون نمبر کب محفوظ کیا تھا۔ یقیناً یہ بھی اسی کا کارنامہ ہو گا۔ اس نے اس کا ایس ایم ایس پڑھنا شروع کیا۔

"پلیز جاگنے کے بعد مجھے میسج کرنا۔ مجھے ضروری بات کرنا ہے۔" اسے نجانے کیوں اس کا میسج پڑھ کر غصہ آیا۔

"بڑی جلدی یاد آگئی میں۔" وہ میسج کا ٹائم چیک کرتے ہوئے بڑبڑائی۔ وہ شاید دس بچاس پر آیا تھا۔

"اگر آفس جاتے ہوئے اسے میں یاد نہیں آئی تو آفس میں بیٹھ کر کیسے آسکتی ہوں۔" وہ اس وقت اس سے جی بھر کر بدگمان ہو رہی تھی اور شاید ٹھیک ہی ہو رہی تھی۔ وہ پچھلی رات اس کے لیے "چیف گیسٹ" تھی اور اگلی صبح وہ اس کے ساتھ بن بلائے مہمان جیسا سلوک کر رہا تھا۔ کم از کم امامہ اس وقت یہی محسوس کر رہی تھی وہ اس وقت وہ باتیں سوچ رہی تھی جو سالار کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھیں۔

وہ کچھ عجیب انداز میں خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی۔ اس نے کمبل تہہ کرتے ہوئے بستر ٹھیک کیا اور بیڈ روم سے باہر نکل آئی۔ اپارٹمنٹ کی خاموشی نے اس کی اداسی میں اضافہ کیا تھا۔ کھڑکیوں سے سورج کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ کچن کے سنک میں وہ برتن ویسے ہی موجود تھے، جس طرح وہ چھوڑ کر گئی تھی۔

"ہاں، وہ بھلا کیوں دھوتا، یہ سارے کام تو ملازماؤں کے ہوتے ہیں۔ لیکن میں تو نہیں دھوؤں گی، چاہے ایک ہفتہ ہی پڑے رہیں۔ میں ملازمہ نہیں ہوں۔" ان برتنوں کو دیکھ کر اس کی خفگی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ اس وقت وہ ہر بات منفی انداز میں لے رہی تھی۔

وہ بیڈ روم میں آئی تو اس کا سیل فون بج رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کو خیال آیا کہ شاید سالار کی کال ہو، لیکن وہ مریم کی کال تھی۔ امامہ کا حال احوال پوچھنے کے بعد اس نے بڑے اشتیاق کے عالم میں امامہ سے پوچھا۔

"سالار نے منہ دکھائی میں کیا دیا تمہیں؟" امامہ چند لمحے بول نہیں سکی۔ اس نے تو کوئی تحفہ نہیں دیا تھا اسے۔ سالار کے نامۂ اعمال میں ایک اور گناہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" امامہ نے کچھ دل شکستہ انداز میں کہا۔

"اچھا...؟ چلو کوئی بات نہیں بعد میں دے دے گا شاید اسے خیال نہیں آیا۔" مریم نے بات بدل دی تھی، لیکن اس کا آخری جملہ امامہ کو چبھا۔ اسے خیال نہیں آیا۔ ہاں واقعی اسے خیال نہیں آیا ہو گا۔ وہ بے حد خفگی کے عالم میں سوچتی رہی۔

سالار سے اس کے گلے شکوے اس گھر میں آنے کے دوسرے دن ہی شروع ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ لاشعوری طور پر اس کی کال کی منتظر تھی۔ کہیں نہ کہیں اسے اب بھی امید تھی کہ وہ کم از کم دن میں ایک بار تو اسے کال کرے گا۔ کم از کم ایک بار... ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ اسے میسج کر کے اسے اپنے ہونے کا احساس تو دلانا چاہیے... لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

وہ بے حد بے دلی سے اپنے کپڑے نکال کر نہانے کے لیے چلی گئی۔ واش روم سے باہر نکلتے ہی اس نے سب سے پہلے سیل فون چیک کیا تھا وہاں کوئی میسج تھا اور نہ کوئی مسڈ کال۔

چند لمحے وہ سیل فون پکڑے بیٹھی رہی پھر اس نے اپنی ساری انا اور سارے غصے کو بالائے طاق رکھ کر اسے میسج کر دیا۔

اس کا خیال تھا وہ اسے فوراً "کال کرے گا" لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا پانچ منٹ... دس منٹ... پندرہ منٹ... اس نے اپنی انا کو کچھ اور مٹی کرتے ہوئے اسے میسج کیا۔ بعض دفعہ میسج پہنچتے بھی تو نہیں ہیں، اس نے اپنی عزت نفس کی ملامت سے بچنے کے لیے بے حد کمزور تاویل تلاش کی۔

"آج کل ویسے بھی نیٹ ورک اور سگنلز کا اتنا زیادہ مسئلہ ہے۔"

"عزت نفس" نے اسے جواباً "ڈوب مرنے" کے لیے کہا تھا۔ فون اب بھی نہیں آیا تھا لنچ بریک کے بعد جو ساڑھے

رمضان نہ ہوتا تو شاید وہ اس وقت اپنی "عزت نفس" کو اس کے لنچ میں مصروف ہونے کا بہانہ پیش کرتی۔
اب وہ واقعی ناخوش تھی بلکہ ناخوش سے بھی زیادہ اب اس کا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔
کچھ دیر بعد اس نے سالار کے سیل پر کال کی۔ دو بیلز کے بعد کال کسی لڑکی نے ریسیو کی۔ ایک لمحے کے لیے امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ سالار کے بجائے کسی لڑکی کی آواز کی توقع نہیں کر رہی تھی۔
"میں آپ کی کیا ہیلپ کر سکتی ہوں میم؟" لڑکی نے بڑی شائستگی کے ساتھ اس سے پوچھا۔
"مجھے سالار سے بات کرنی ہے۔" اس نے کچھ تذبذب سے کہا۔
"سالار سکندر صاحب تو ایک میٹنگ میں ہیں۔ اگر آپ کوئی کلائنٹ ہیں اور آپ کو بینک سے متعلقہ کوئی کام ہے تو میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں یا آپ میسج چھوڑ دیں ان کے لیے... میٹنگ میں بریک آئے گی تو میں انہیں انفارم کروں گی۔" اس لڑکی نے بے حد پروفیشنل انداز میں کہا۔ امامہ خاموش رہی۔
"ہیلو... مس امامہ!" اس لڑکی نے یقیناً سالار کے سیل پر اس کی آئی ڈی پڑھ کر اس کا نام لیا تھا۔ وہ اب اسے متوجہ کر رہی تھی۔
"میں بعد میں کال کروں گی۔" اس نے بددلی کے ساتھ فون بند کر دیا۔
"تو وہ میٹنگ میں ہے اور اس کا سیل تک اس کے پاس نہیں... اور مجھے کہہ رہا تھا کہ میں جاگنے کے بعد اسے انفارم کروں... کس لیے؟" وہ دل برداشتہ ہو گئی تھی۔



"ارے بیٹا! میں تو کب سے تمہارے فون کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔ تمہیں اب یاد آئی سعیدہ اماں کی۔" سعیدہ اماں نے اس کی آواز سنتے ہی گلہ کیا۔
اس نے جواباً بے حد کمزور بہانے پیش کیے۔ سعیدہ اماں نے اس کی وضاحتوں پر غور نہیں کیا۔
"سالار ٹھیک تو ہے نا تمہارے ساتھ؟"
انہوں نے اس سوال کے مضمرات کا اس صورت حال میں سوچے بغیر پوچھا اور امامہ کے صبر کا جیسے پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ وہ یک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ سعیدہ اماں بری طرح گھبرا گئی تھیں۔
"کیا ہوا بیٹا؟... ارے اس طرح کیوں رو رہی ہو...؟ میرا تو دل گھبرانے لگا ہے... کیا ہو گیا آمنہ؟" سعیدہ اماں کو جیسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔
"سالار نے کچھ کہہ دیا ہے کیا؟" سعیدہ اماں کو سب سے پہلا خیال یہی آیا تھا۔
"مجھے اس سے شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔" امامہ نے ان کے سوال کا جواب دیے بغیر کہا۔
سعیدہ اماں کی حواس باختگی میں اضافہ ہوا۔
"میں نے کہا بھی تھا آپ سے۔" وہ روتی جا رہی تھی۔
"کیا وہ اپنی پہلی بیوی کی باتیں کرتا رہا ہے تم سے؟"
سعیدہ اماں نے سالار کے حوالے سے لاحق واحد خدشے کا بے اختیار ذکر کیا۔
"پہلی بیوی...؟" امامہ نے روتے روتے کچھ حیرانی سے سوچا۔
لیکن سالار کے لیے اس وقت اس کے دل میں اتنا غصہ بھرا ہوا تھا کہ اس نے بلا سوچے سمجھے سعیدہ اماں کے خدشے کی تصدیق کی تھی۔
"جی!" اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

سعیدہ اماں کے سینے پر جیسے گھونسا لگا۔ یہ خدشہ تو انہیں تھا لیکن ان کا خیال تھا کہ اپنے گھر لے جاتے ہی پہلے دن تو وہ کم از کم اپنی اس کئی سال پرانی منکوحہ کا ذکر نہیں کرے گا۔ امامہ کو سالار پر کیا غصہ آنا تھا جو سعیدہ اماں کو آیا تھا' انہیں یک دم پچھتاوا ہوا تھا۔ واقعی کیا ضرورت تھی یوں راہ چلتے کسی بھی دو ٹکے کے آدمی کو پکڑ کر یوں اس کی شادی کر دینے کی۔ انہوں نے پچھتاتے ہوئے سوچا۔

"تم فکر نہ کرو۔۔۔ میں خود سبط علی بھائی سے بات کروں گی۔" سعیدہ اماں نے بے حد غصے میں کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں اماں! بس میری قسمت ہی خراب ہے۔"

سعیدہ اماں کے پاس آنے والی عورتوں کے منہ سے کئی بار سنا ہوا گھسا پٹا جملہ کس طرح اس کی زبان پر آگیا' اس کا اندازہ امامہ کو نہیں ہوا لیکن اس جملے نے سعیدہ اماں کے دل پر جیسے آری چلا دی۔

"ارے کیوں قسمت خراب ہے۔۔۔ کوئی ضرورت نہیں ہے وہاں رہنے کی۔۔۔ تم ابھی آجاؤ اس کے گھر سے۔ ارے میری معصوم بچی پر اتنا ظلم۔۔۔ ہم نے کوئی جہنم میں تھوڑا دھکیلنا ہے تمہیں۔"

امامہ کو ان کی باتوں پر اور رونا آیا۔ خود ترسی کا اگر کوئی ماؤنٹ ایورسٹ ہوتا تو وہ اس وقت اس کی چوٹی پر جھنڈا گاڑ کر بیٹھی ہوتی۔

"بس! تم ابھی رکشہ لو اور میری طرف آجاؤ۔ کوئی ضرورت نہیں ہے ادھر بیٹھے رہنے کی۔"

سعیدہ اماں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔

یہ گفتگو مزید جاری رہتی تو شاید امامہ بغیر سوچے سمجھے روتے ہوئے اسی طرح وہاں سے چل بھی پڑتی۔ وہ اس وقت بھی اتنی ہی جذباتی ہو رہی تھی لیکن سالار کے ستاروں کی گردش اس دن صرف چند لمحوں کے لیے اچھی ثابت ہوئی۔ سعیدہ اماں سے بات کرتے کرتے کال کٹ گئی تھی' اس کا کریڈٹ ختم ہو گیا تھا۔ امامہ نے لینڈ لائن سے کال کرنے کی کوشش کی لیکن کال نہیں ملی۔ شاید سعیدہ اماں نے فون کا ریسیور کریڈل پر ٹھیک سے نہیں رکھا تھا۔ وہ بری طرح جھنجلائی۔

سعیدہ اماں سے بات کرتے ہوئے وہ اتنی دیر میں پہلی بار بہت اچھا محسوس کر رہی تھی' یوں جیسے کسی نے اس کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا ہو۔ اسے اس وقت جس "متعصب" جانب داری کی ضرورت تھی' انہوں نے اسے وہی دی تھی۔ ان سے بات کرتے ہوئے روانی اور فراوانی سے بہنے والے آنسو اب یک دم خشک ہو گئے تھے۔

وہاں سے دس میل کے فاصلے پر اپنے بینک کے بورڈ روم میں بیٹھی ایویلیوایشن ٹیم کو دی جانے والی پریزنٹیشن کے اختتامیہ سوال و جواب کے سیشن میں کریڈیبلٹی اینڈ ٹرسٹ فیکٹر سے متعلق کسی سوال کے جواب میں بولتے ہوئے سالار کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کے گھر پر موجود اس کی ایک دن کی بیوی اور نو سالہ "محبوبہ" گھر پر بیٹھی اس کی "ساکھ" اور "نام" کا تیا پانچہ کرنے میں مصروف تھی۔ جس کو اس وقت اس وضاحت کی اس ایویلیوایشن ٹیم سے زیادہ ضرورت تھی۔

سونا ہو گیا۔ رونا بھی ہو گیا۔ اب اور کیا رہ گیا تھا۔ امامہ نے ٹشو پیپر سے آنکھیں اور ناک رگڑتے ہوئے بالآخر ریسیور رکھتے ہوئے سوچا۔ اسے کچن کے سنک میں پڑے برتنوں کا خیال آیا' بڑی بے دلی سے وہ کچن میں گئی اور ان برتنوں کو دھونے لگی۔

وہ شام کے لیے اپنے کپڑے نکالنے کے لیے ایک بار پھر بیڈ روم میں آگئی اور تب ہی اس نے اپنا سیل فون بجتے سنا۔ جب تک وہ فون کے پاس پہنچی فون بند ہو چکا تھا۔ وہ سالار تھا اور اس کے سیل پر یہ اس کی چوتھی مسڈ کال تھی۔ وہ سیل ہاتھ میں لیے اس کی اگلی کال کا انتظار کرنے لگی۔ کال کے بجائے اس کا میسج آیا۔ وہ اسے اپنے پروگرام میں تبدیلی کے بارے میں بتا رہا تھا کہ ڈاکٹر سبط علی کا ڈرائیور ایک گھنٹے تک اسے وہاں سے ڈاکٹر صاحب

کے گھر لے جائے گا اور وہ افطار کے بعد آفس سے سیدھا ڈاکٹر صاحب کے گھر آنے والا تھا۔

چند لمحوں کے لیے اس کا دل چاہا وہ فون کو دیوار پر دے مارے لیکن وہ اس کا اپنا فون تھا۔ سالار کو کیا فرق پڑتا۔

وہ اس سے رات کو اتنا لمبا چوڑا اظہار محبت نہ کرتا تو وہ آج اس سے توقعات کا یہ انبار لگا کر نہ بیٹھی ہوتی لیکن سالار کے ہر جملے پر اس نے لاشعوری طور پر پچھلی رات اپنے دامن کے ساتھ ایک گرہ باندھ لی تھی اور گرہوں سے بھرا وہ دامن اب اسے بری طرح تنگ کرنے لگا تھا۔

ڈاکٹر سبط علی گھر پر نہیں تھے۔ آنٹی کلثوم نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور وہ بھی جس حد تک مصنوعی جوش و خروش اور اطمینان کا مظاہرہ کر سکتی تھی کرتی رہی۔ آنٹی کے منع کرنے کے باوجود وہ ان کے ساتھ مل کر افطار اور ڈنر کی تیاری کرواتی رہی۔

ڈاکٹر سبط علی افطار سے کچھ دیر پہلے آئے تھے اور انہوں نے امامہ کی سنجیدگی نوٹ کی تھی۔ مگر اس کی سنجیدگی کا تعلق سالار سے نہیں جوڑا تھا۔ وہ جوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔

سالار افطار کے "تقریباً" دو گھنٹے کے بعد آیا تھا۔

اور امامہ سے پہلی نظر ملتے ہی سالار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اس کی خیر مقدمی مسکراہٹ کے جواب میں مسکرائی تھی نہ ہی اس نے ڈاکٹر سبط علی اور ان کی بیوی کی طرح گرم جوشی سے اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔ وہ بس نظریں چرا کر لاؤنج سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے سالار کو لگا کہ شاید اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ آخر وہ اس سے کس بات پر ناراض ہو سکتی ہے۔

وہ ڈاکٹر سبط علی کے پاس بیٹھا ان سے باتیں کرتا ہوا اپنے ذہن میں پچھلے چوبیس گھنٹوں کے واقعات کو دہراتا اور کوئی ایسی بات ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا جو امامہ کو خفا کر سکتی تھی۔ اسے ایسی کوئی بات یاد نہیں آئی۔ ان کے درمیان آخری گفتگو رات کو ہوئی تھی۔ وہ اس کے بازو پر سر رکھے باتیں کرتی سوئی تھی۔ خفا ہوتی تو۔ وہ الجھ رہا تھا

"ہوں کم از کم میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جو اسے برا لگا ہو شاید یہاں کوئی ایسی بات ہوئی ہو۔" سالار نے خود کو بری الذمہ قرار دیتے ہوئے سوچا۔ "لیکن یہاں کیا بات ہوئی ہو گی۔۔۔؟۔۔۔ شاید میں کچھ ضرورت سے زیادہ حساس ہو کر سوچ رہا ہوں غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے مجھے۔"

وہ اب خود کو تسلی دے رہا تھا لیکن اس کی چھٹی حس اسے اب بھی اشارہ دے رہی تھی۔ بے شک وہ اس سے نو سال بعد ملا تھا مگر نو سال پہلے دیکھے جانے والا اس کا ہر موڈ اس کے ذہن پر جسٹرڈ تھا اور وہ امامہ کے اس موڈ کو بھی جانتا تھا۔

ڈنر ٹیبل پر بھی زیادہ تر گفتگو ڈاکٹر سبط علی اور سالار کے درمیان ہی ہوئی۔ وہ آنٹی کے ساتھ وقفے وقفے سے سب کو ڈشز سرو کرتی رہی۔ خاموشی اب بھی برقرار تھی۔

وہ ڈاکٹر سبط علی کے ساتھ مسجد میں تراویح پڑھنے گیا اور حفظ قرآن کے بعد آج پہلی بار تراویح کے دوران اٹکا۔ ایک بار نہیں دو بار۔۔۔ اس نے خود کو سنبھال لیا تھا لیکن وہ بار بار ڈسٹرب ہو رہا تھا۔

وہ ساڑھے دس بجے کے قریب ڈاکٹر سبط علی کے گھر سے سعیدہ اماں کے گھر جانے کے لیے نکلے تھے اور سالار نے بالآخر اس سے پوچھ ہی لیا۔

"تم مجھ سے خفا ہو؟"

کھڑکی سے باہر دیکھتے وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہوئی پھر اس نے کہا۔

"میں تم سے کیوں خفا ہوں گی؟" وہ بدستور کھڑکی کی طرف گردن موڑے باہر دیکھ رہی تھی۔ سالار کچھ مطمئن

ہوا۔

"ہاں میں بھی سوچ رہا تھا کہ ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی جس پر تمہارا موڈ آف ہوتا۔" کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے امامہ نے اس کی بات سنی اور اس کی برہمی کچھ اور بڑھی۔

"یعنی میں عقل سے پیدل ہوں جو بلاوجہ اپنا موڈ آف کرتی پھر رہی ہوں۔۔۔ اور اس نے میرے رویے اور حرکتوں کا نوٹس ہی نہیں لیا۔"

"میں تمہیں آج فون کرتا رہا لیکن تم نے فون ہی نہیں اٹھایا۔" وہ ڈرائیو کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

امامہ کو سوچتے ہوئے عجیب سی تسلی ہوئی۔

"اچھا ہوا نہیں اٹھایا یعنی اس نے محسوس تو کیا کہ میں جان بوجھ کر اس کی کال نہیں لیتی رہی۔"

"پھر میں نے گھر کے نمبر پر فون کیا۔ وہ بھی انگیجڈ تھا تم یقیناً" اس وقت مصروف تھیں اس لیے کال نہیں لے سکیں۔" وہ بے حد عام سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ہاں بے نیازی کی انتہا تھی۔

امامہ کے رنج میں اضافہ ہوا۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس کے فون کا بیلنس ختم ہو چکا تھا۔

"مجھے اپنے فون کے لیے کارڈ خریدنا ہے۔"

سالار نے اسے یک دم کہتے سنا۔ وہ اپنا ہینڈ بیگ کھولے اس میں سے کچھ نکال رہی تھی اور جو چیز اس نے نکال کر سالار کو پیش کی تھی اس نے چند لمحوں کے لیے سالار کو ساکت کر دیا تھا۔ وہ ہزار روپے کا ایک نوٹ تھا۔ وہ اس کے تاثرات سے بے خبر ونڈ سکرین سے باہر کسی ایسی شاپ کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی جہاں پر وہ کارڈز دستیاب ہوتے۔ سالار نے اپنی طرف بڑھے ہوئے اس کے ہاتھ کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"واپسی پر لیتے ہیں۔۔۔ اور اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

امامہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تمہیں آنکھیں بند کر کے اپنا سیل فون تھما دیا تھا جب تم میری کچھ نہیں تھیں تو اب کیا پیسے لوں گا تم سے!"

گاڑی میں کچھ عجیب سی خاموشی در آئی تھی۔ دونوں کو بیک وقت کچھ یاد آیا تھا اور جو یاد آیا تھا اس نے یک دم وقت کو وہیں روک دیا تھا۔

بہت غیر محسوس انداز میں امامہ نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ کے اس ٹکڑے کو بہت سی تہوں میں لپیٹنا شروع کر دیا۔ اس نے اس کی ساری رقم لوٹا دی تھی' بلکہ اس سے زیادہ ہی' جتنی اس نے فون بلوں کے بل اور اس کے لیے خرچ کی ہوگی۔ مگر احسان۔۔۔ یقیناً" اس کے احسانوں کا وزن بہت زیادہ تھا۔ اس نے کاغذ کی لپٹی تہوں کو دوبارہ بیگ میں ڈال لیا۔ صبح سے اکٹھی کی ہوئی بدگمانیوں کی دھند یک دم چھٹ گئی تھی یا کچھ دیر کے لیے امامہ کو ایسا ہی محسوس ہوا۔

باہر سڑک پر دھند تھی اور وہ بڑی احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔ امامہ کا دل چاہا' وہ اس سے کچھ بات کرے لیکن وہ خاموش تھا۔ شاید کچھ سوچ رہا تھا یا لفظ ڈھونڈ رہا تھا۔

"آج سارا دن کیا کرتی رہیں تم؟"

اس نے بالآخر گفتگو کا دوبارہ آغاز کرنے کی کوشش کی تھی۔ پورا دن فلیش کی طرح امامہ کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔ امامہ کو ندامت ہوئی' وہ جو کچھ کرتی رہی تھی' اسے بتا نہیں سکتی تھی۔

"میں سوتی رہی۔" اس نے پورے دن کو تین لفظوں میں سمیٹ دیا۔

"ہاں مجھے اندازہ تھا' جاگ رہی ہوتیں تو میری کال ضرور ریسیو کرتیں۔" ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

"پاپا' ممی اور انیتا آرہے ہیں کل شام۔" سالار نے کچھ دیر کے بعد کہا۔

امامہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تم سے ملنے کے لیے؟" اس نے مزید اضافہ کیا اور بالآخر سسرال کے ساتھ اس کا پہلا رابطہ ہونے والا تھا۔

امامہ کو اپنے پیٹ میں گرہیں لگتی محسوس ہوئیں۔

"تم نے انہیں میرے بارے میں بتایا ہے؟" اس نے بے حد نپے تلے الفاظ میں پوچھا۔

"نہیں فی الحال نہیں' لیکن آج بتاؤں گا پاپا کو فون پر۔" وہ ونڈ سکرین سے باہر دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

امامہ نے اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی۔ کوئی پریشانی' تشویش' اندیشہ' خدشہ' خوف' پچھتاوا۔۔۔ وہ کچھ بھی پڑھنے میں ناکام رہی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا اور اگر اس کے دل میں کچھ تھا بھی تو وہ اسے بڑی مہارت سے چھپائے ہوئے تھا۔

سالار نے اس کی کھوجتی نظروں کو اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ اس نے امامہ کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ امامہ نے بے اختیار نظریں ہٹائیں۔

"انیتا کی فلائٹ ساڑھے پانچ بجے اور پاپا کی سات بجے ہے۔۔۔ میں کل بینک سے جلدی ایئرپورٹ چلا جاؤں گا' پھر ممی اور پاپا کو لے کر میرا خیال ہے نو یا ساڑھے نو بجے تک گھر پہنچوں گا۔"

"یہ تم نے کیا پہنا ہوا ہے؟" سالار نے یک دم اس کے لباس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

تین گھنٹے پینتالیس منٹ کے بعد بالآخر اسے یاد آگیا کہ میں نے کچھ پہنا ہوا ہے۔ یہ سوچ کر امامہ کی خفگی میں کچھ اضافہ ہوا۔

"کپڑے۔" امامہ نے جواب دیا۔

سالار اس کی بات پر بے اختیار ہنسا۔ "جانتا ہوں کپڑے پہنے ہیں' اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔"

امامہ گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی کہ اب وہ تعریف کرے گا۔ اس نے سوچا۔ دیر سے سہی لیکن اسے میرے کپڑے نظر تو آئے۔ اس کی خفگی میں کچھ اور کمی ہوئی۔

"کون سا کلر ہے یہ؟" سالار نے اپنے پیروں پر پہلی کلہاڑی ماری۔

کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے امامہ کا دل چاہا وہ چلتی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر کود جائے۔ پونے چار گھنٹے میں وہ اس کے کپڑوں کا رنگ بھی نہیں پہچان سکا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے اسے غور سے دیکھا نہیں تھا۔

"پتا نہیں۔" اس نے اسی طرح کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے بے حد سرد مہری سے کہا۔

"ہاں میں بھی اندازہ نہیں کر سکا۔ آج کل خواتین پہنتی بھی تو بڑے عجیب عجیب کلرز ہیں۔" سالار نے اس کے لہجے پر غور کیے بغیر عام سے انداز میں کہا۔

وہ پنک اور کاپر کے سب سے زیادہ اِن شیڈ کو "عجیب" کہہ رہا تھا امامہ کو رنج سا رنج ہوا۔ سالار شوہروں کی تاریخی غلطیاں دہرا رہا تھا اس بار امامہ کا دل تک نہیں چاہا کہ وہ اس کی بات کا جواب دے وہ اس قابل نہیں تھا۔ اسے یاد آیا اس نے کل بھی اس کے کپڑوں کی تعریف نہیں کی تھی۔ کپڑے۔۔۔؟ اس نے تو اس کی بھی تعریف نہیں کی تھی۔۔۔ اظہار محبت کیا تھا اس نے۔۔۔ لیکن تعریف۔۔۔ ہاں تعریف تو نہیں کی تھی اس نے۔۔۔ وہ جیسے پچھلی رات کو یاد کرتے ہوئے تصدیق کر رہی تھی۔ اسے دکھ ہوا۔ کیا وہ اسے اتنی بھی خوب صورت نہیں لگی تھی کہ وہ ایک بار ہی کہہ دیتا۔ کوئی ایک جملہ' ایک لفظ' کچھ بھی نہیں' وہ ایک بار پھر خود ترسی کا شکار ہونے لگی۔ عورت اظہار محبت اور ستائش کو بھی "ہم معنی" نہیں سمجھتی۔ یہ کام مرد کرتا ہے اور غلط کرتا ہے۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے سالار کو اندازہ نہیں ہوا کہ گفتگو کے لیے موضوعات کی تلاش میں ادھر ادھر کی باتیں

کرتے اس نے کس قدر سنگین موضوع کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے جیسے ایک بارودی سرنگ کے اوپر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا تھا جو اس کے پاؤں اٹھاتے ہی پھٹ جاتی۔

سعیدہ اماں کی گلی میں گاڑی پارک کرنے کے بعد سالار نے ایک بار پھر امامہ کے موڈ میں تبدیلی محسوس کی۔ اس نے ایک بار پھر اسے اپنا وہم گردانا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر سبط علی کے گھر پہ بھی غلط فہمی کا شکار رہا۔ آخر ہو کیا گیا ہے مجھے۔۔۔؟ وہ بھلا کیوں صرف چوبیس گھنٹے میں مجھ سے ناراض ہوتی پھرے گی۔ اس نے اطمینان سے سوچا۔

سعیدہ اماں دروازہ کھولتے ہی امامہ سے لپٹ گئی تھیں۔ چند لمحوں بعد وہ آنسو بہا رہی تھیں۔ سالار جز بز ہوا۔ آخر اتنے عرصے سے وہ اکٹھے رہ رہی تھیں۔ یقیناً" دونوں ایک دوسرے کو مس کر رہی ہوں گی۔ اس نے بالآخر خود کو سمجھایا۔

سعیدہ اماں نے سالار کے سلام کا جواب دیا۔ ہمیشہ کی طرح اسے گلے لگا کر پیار کیا۔ انہوں نے امامہ کو گلے لگایا' اس سے لپٹ کر آنسو بہائے اور پھر اسے لے کر اندر چلی گئیں۔ وہ ہکا بکا دروازے میں ہی کھڑا رہ گیا تھا۔ انہیں کیا ہوا؟ وہ پہلی بار بری طرح کھٹکا تھا۔ اپنے احساس کو وہم سمجھ کر جھٹکنے کی کوشش اس بار کامیاب نہیں ہوئی۔ کچھ غلط تھا مگر کیا۔۔۔؟ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر اس نے پلٹ کر بیرونی دروازہ بند کیا اور اندر چلا آیا۔

وہ دونوں کچھ باتیں کر رہی تھیں اسے دیکھ کر یک دم چپ ہو گئیں۔ سالار نے امامہ کو اپنے آنسو پونچھتے دیکھا۔ وہ ایک بار پھر مشتبہ ہوا۔

"میں چائے لے کر آتی ہوں۔ بادام اور گاجر کا حلوہ بنایا ہے آج میں نے۔" سعیدہ اماں یہ کہتے ہوئے کھڑی ہوئیں۔ سالار نے بے اختیار انہیں ٹوکا۔

"سعیدہ اماں! کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم لوگ کھانا کھا کر آئے ہیں اور چائے بھی پی لی ہے۔ صرف آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔"

وہ کہتے کہتے رک گیا اسے احساس ہوا کہ وہ پیشکش سرے سے اسے کی ہی نہیں گئی تھی۔ سعیدہ اماں مکمل طور پر امامہ کی طرف متوجہ تھیں اور امامہ اسے کچھ کھانے پینے میں متامل نظر نہیں آئی۔

"میں کھاؤں گی اور میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں آپ کس طرح اٹھائیں گی برتن۔" امامہ نے سعیدہ اماں سے کہا اور پھر ان کے ساتھ ہی کچن میں چلی گئی۔ سالار ہونقوں کی طرح وہاں بیٹھا رہ گیا۔

اگلے پندرہ منٹ وہ اس صورت حال پر غور کرتا وہیں بیٹھا کمرے کی چیزوں کو دیکھتا رہا۔

بالآخر پندرہ منٹ کے بعد امامہ اور سعیدہ اماں کی واپسی ہوئی۔ اسے امامہ کی آنکھیں پہلے سے کچھ زیادہ سرخ اور متورم لگیں' یہی حال کچھ اس کی ناک کا تھا۔ وہ یقیناً" کچن میں روتی رہی تھی مگر کس لیے؟ وہ اب الجھ رہا تھا۔ کم از کم اب وہ آنسو اسے سعیدہ اماں اور اس کی باہمی محبت و یگانگت کا نتیجہ نہیں لگ رہے تھے۔ سعیدہ اماں کے چہرے اور آنکھوں میں اسے پہلے سے بھی زیادہ سرد مہری نظر آئی۔

اسے اس وقت چائے میں دلچسپی تھی نہ کسی حلوے کی طلب۔۔۔ کچھ بھی کھانا اس کے لیے بدہضمی کا باعث ہوتا لیکن جو ماحول یک دم وہاں بن گیا تھا' اس نے اسے ضرورت سے زیادہ محتاط کر دیا تھا۔ کسی انکار کے بغیر اس نے خاموشی سے پلیٹ میں تھوڑا سا حلوہ نکالا۔ امامہ نے ڈاکٹر سبط علی کے گھر کی طرح یہاں بھی اس سے پوچھے بغیر اس کی چائے میں دو چمچ چینی ڈال کر اس کے سامنے رکھ دی پھر اپنی پلیٹ میں لیا حلوہ کھانے لگی۔

چند منٹوں کی خاموشی کے بعد بالآخر سعیدہ اماں کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ اپنے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ ایک طرف رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی عینک کو ناک پر ٹھیک کرتے ہوئے تیز نظروں سے سالار کو گھورا۔

"بیویوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں۔"

اپنی پلیٹ میں ڈالے حلوے کو چمچ سے ہلاتے سالار ٹھٹکا۔ اس نے پہلے سعیدہ اماں کو دیکھا پھر امامہ کو۔ وہ بھی ٹھٹکی تھی۔ اور کچھ گڑبڑائی بھی۔ سالار کے پیٹھ پیچھے اس کی برائی اور اس کے گلے شکوے کرنا اور بات تھی مگر اس کے سامنے بیٹھ کر وہی کچھ دہرانا' خاص طور پر جب ان الزامات کا کچھ حصہ کسی جھوٹ پر مبنی ہو۔ وہ واقعی گھبرائی تھی۔

سالار کو یہ سوال نہیں' تبصرہ لگا۔

"جی۔" اس نے ان کی تائید کی۔

"وہ مرد دوزخ میں جاتے ہیں' جو اپنی بیویوں کو تنگ کرتے ہیں۔" سعیدہ اماں نے اگلا جملہ بولا۔

اس بار سالار فوری طور پر تائید نہیں کر سکا۔ وہ خود مرد تھا اور شوہر بھی لاکھ وہ امامہ پر مرتا ہو لیکن "بیوی" کی موجودگی میں اس تبصرے کی تائید اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مصداق تھا۔ وہ شادی کے دوسرے ہی دن اتنی فرماں برداری نہیں دکھا سکتا تھا جس پر وہ بعد میں ساری عمر پچھتاتا۔

اس بار کچھ کہنے کے بجائے اس نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس کی خاموشی نے سعیدہ اماں کو کچھ اور سیخ پا کیا۔

"دوسروں کے دل دکھانے والے کو اللہ کبھی معاف نہیں کرتا۔" سالار نے حلوہ کھاتے کھاتے اس جملے پر غور کیا پھر تائید میں سر ہلا دیا۔

"جی بالکل۔" سعیدہ اماں کو اس کی ڈھٹائی پر غصہ آیا۔

"شریف گھرانے کے مردوں کا تو یہ شیوہ نہیں ہے کہ دوسروں کی بیٹیوں کو پہلے بیاہ کر لے جائیں اور پھر انہیں پہلی بیویوں کے قصے سنانے بیٹھ جائیں۔"

امامہ کی جیسے جان پر بن گئی۔ یہ کچھ زیادہ ہی ہو رہا تھا۔

"آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے اماں!" اس نے صورت حال سنبھالنے کی کوشش کی۔

سالار نے باری باری ان دونوں کو دیکھا' اسے اس جملے کا سر پیر سمجھ میں نہیں آیا تھا اور پہلے جملوں سے ان کا کیا تعلق تھا وہ بھی سمجھ نہیں پایا لیکن تائید کرنے میں کوئی برائی نہیں تھی کیونکہ بات مناسب تھی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ" اس نے بالآخر کہا۔

اس کی سعادت مندی نے سعیدہ اماں کو مزید تپا دیا۔ شکل سے کیسا شریف لگ رہا ہے۔ اسی لیے تو سبط بھائی بھی دھوکا کھا گئے۔ انہوں نے ڈاکٹر سبط علی کو غلطی کرنے پر چھوٹ دی۔

"آمنہ کے لیے بہت رشتے تھے۔" سعیدہ اماں نے سلسلہ کلام جوڑا۔

انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایک غلط آدمی کو امامہ کی قدر و قیمت کے بارے میں غلط لیکچر دے رہی تھیں۔

حلوے کی پلیٹ ہاتھ میں لیے سالار نے ایک نظر امامہ کو دیکھا پھر سعیدہ اماں کو' جو بے حد جوش و خروش سے کہہ رہی تھیں۔

"یہ سامنے والے ظہور صاحب کے بڑے بیٹے نے آمنہ کو کہیں دیکھ لیا تھا۔ ماں باپ کو صاف صاف کہہ دیا اس نے کہا کہ شادی کروں گا تو اسی لڑکی سے۔ خالہ کی بیٹی کے ساتھ بچپن کی منگنی بھی توڑ دی۔"

اس بار سالار نے حلوے کی پلیٹ میبل پر رکھ دی۔ وہ کم از کم امامہ کے کسی ایسے رشتے کی تفصیلات مزے سے حلوہ کھاتے ہوئے نہیں سن سکتا تھا۔ امامہ نے اس بار سعیدہ اماں کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بڑی ہی عامیانہ بات تھی لیکن وہ بھی جیسے چاہتی تھی کہ کوئی سالار کو بتائے کہ وہ "قابل قدر" ہے' وہ اسے صرف "بیوی"

سمجھ کر رہ تو نہیں کرسکتا۔
"جوتے گھس گئے لڑکے کی ماں کے یہاں کے چکر لگا کر۔ محلے کے ہر معزز آدمی سے کہلوایا اس نے میرے بیٹوں تک کو انگلینڈ فون کرایا اس رشتے کے لیے۔" سعیدہ اماں بول رہی تھیں۔
سالار اب بے حد سنجیدہ تھا اور امامہ قدرے لاتعلقی کے انداز میں سر جھکائے حلوے کی پلیٹ میں چمچ ہلا رہی تھی۔
"اس کے ماں باپ نے کہا کہ جو چاہیں حق مہر میں لکھوا لیں بس اپنی بچی کو ہماری بیٹی بنا دیں۔"
سالار نے بے حد جتانے والے انداز میں اپنی رسٹ واچ یوں دیکھی جیسے اسے دیر ہو رہی تھی۔ سعیدہ اماں کو اس کی اس حرکت پر بری طرح تاؤ آیا۔ اس گفتگو کے جواب میں کم از کم وہ اس سے اس بے نیازی کی توقع نہیں کر رہی تھیں۔
"ابھی آج بھی اس کی ماں آئی ہوئی تھی۔ بے حد افسوس سے کہہ رہی تھی کہ بڑی زیادتی کی ان کے بیٹے کے ساتھ میں نے۔ ایک بار نہیں بتایا۔ کہہ رہی تھی کہ ہمیں چھوڑ کر کسی ایرے غیرے کے ساتھ پکڑ کر بیاہ دیا۔ میرا بیٹا کیوں نظر نہیں آیا آپ کو۔ رانیوں کی طرح رکھتا آمنہ کو۔ دیکھو کر جیتا اسے۔"
سعیدہ اماں اب مبالغہ آمیزی کی آخری حدود کو چھونے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھیں۔ سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے چہرے پر اب بھی مرعوبیت نام کی کوئی چیز نمودار نہیں ہوئی تھی۔ وہ سنجیدہ چہرے کے ساتھ انہیں یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ سعیدہ اماں کو لگا انہوں نے اس کے ساتھ شادی کر کے واقعی آمنہ کی قسمت پھوڑی تھی۔
بے حد خفگی کے عالم میں انہوں نے سردی کے موسم میں بھی پانی کا گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ میں پیا تھا۔ اس کی یہ خاموشی امامہ کو بھی بری طرح چبھی تھی۔ وہ رات کو اس سے کیا کچھ کہہ رہا تھا اور اب یہاں سعیدہ اماں کو بتانے کے لیے اس کے پاس ایک لفظ بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے لیے اہم ہے۔ یا وہ اس کا خیال رکھے گا۔ یا کوئی اور وعدہ۔ کوئی اور تسلی۔ کوئی اور بات۔ کچھ تو کہنا چاہیے تھا اسے سعیدہ اماں کے سامنے۔ اسے عجیب بے قدری اور بے وقعتی کا احساس ہوا تھا۔ رنج کچھ اور سوا ہوا۔ فاصلہ کچھ اور بڑھا تھا۔ اس نے کسی دوسرے کے سامنے بھی اسے تعریف کے دو لفظوں کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ اکیلے میں تعریف نہ کرے لیکن یہاں ہی کچھ کہہ دیتا۔ کچھ تو۔ اس کا دل ایک بار پھر بھر آیا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ سالار اس سے روایتی شوہروں والا رویہ رکھے لیکن خود وہ اس سے روایتی بیوی والی ساری توقعات لیے بیٹھی تھی۔
"بہت دیر ہو گئی میرا خیال ہے ہمیں اب چلنا چاہیے۔ مجھے صبح آفس جانا ہے۔ آج کل کام کچھ زیادہ ہے۔"
سالار کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تھا۔
اس نے بڑے تحمل کے ساتھ سعیدہ اماں سے کہا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اب امامہ کے کھڑے ہونے کا منتظر تھا لیکن امامہ نے ٹیبل پر رکھے برتن اٹھا کر ٹرے میں رکھتے ہوئے اسے دیکھے بغیر بڑی سرد مہری کے ساتھ کہا۔
"میں آج یہیں رہوں گی سعیدہ اماں کے پاس۔"
سالار چند لمحوں کے لیے بالکل ہونق رہ گیا۔ اس نے پچھلے کئی گھنٹوں میں ایک بار بھی ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ سعیدہ اماں کے پاس رات گزارنے کا ارادہ رکھتی ہے اور اب یک دم بیٹھے بٹھائے یہ فیصلہ۔
"ہاں، بالکل یہیں چھوڑ جاؤ اسے۔" سعیدہ اماں نے فوری تائید کی۔ امامہ اس کے انکار کی منتظر تھی۔
"ٹھیک ہے، یہ رہنا چاہتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" سالار نے بڑی سہولت سے کہا۔
برتن سمیٹتی امامہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ اس نے ایک منٹ کے لیے بھی اسے ساتھ لے جانے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ وہ اتنا تنگ آیا ہوا تھا اس سے۔

اس سے پہلے کہ سالار کچھ اور کہتا' وہ ایک جھپاکے کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔ سعیدہ اماں نے بے حد قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا' سالار نے جیسے امامہ کے ہر الزام کی تصدیق کردی تھی۔ سالار کو امامہ کے یوں جانے کی وجہ سمجھ میں آئی' نہ سعیدہ اماں کی ان ملامتی نظروں کا مفہوم سمجھ سکا وہ۔ وہ گفتگو جتنی اپ سیٹ کرنے والی تھی اتنا ہی امامہ کا یک دم کیا جانے والا یہ اعلان تھا کہ وہ آج وہیں رہے گی۔ اسے برا لگا تھا لیکن اتنا برا نہیں لگا تھا کہ وہ اس پر اعتراض یا خفگی کا اظہار کرتا اور وہ بھی سعیدہ اماں کے سامنے۔

"اوکے۔۔۔ میں چلتا ہوں پھر۔" وہ سعیدہ اماں کے ساتھ باہر صحن میں نکل آیا۔

اس کا خیال تھا' امامہ کچن میں برتن رکھ کر اسے خدا حافظ کہنے تو ضرور آئے گی لیکن وہ نہیں آئی تھی۔ وہ کچھ دیر سعیدہ اماں سے بے مقصد باتیں کرتا صحن میں کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا۔ سعیدہ اماں کے لہجے میں اتنی سرد مہری نہ ہوتی تو ان سے امامہ کو بلوانے کا کہتے ہوئے اسے جھجک محسوس نہ ہوتی۔

سعیدہ اماں کے گھر سے نکلتے ہوئے اس نے پہلی بار اس محلے میں ان کے سامنے والے گھر کو سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ وہاں سے اکیلے واپس آنا اسے کھل رہا تھا۔ وہ اتنے سال اس کے بغیر ہی رہا تھا۔ اسے کبھی تنہائی نہیں چبھی تھی۔ اس نے ایک رات اس کے ساتھ گزاری تھی اور تنہائی کا مفہوم اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ وہاں سے واپسی کی ڈرائیو اس کی زندگی کی سب سے طویل ڈرائیو تھی۔



"کل بھائی صاحب کے ہاں چلیں گے۔ انہیں بتائیں گے یہ سب کچھ۔۔۔ وہی بات کریں گے سالار سے۔"

سعیدہ اماں اس کے پاس بیٹھی کہہ رہی تھیں۔ وہ بے حد پریشان تھیں۔

امامہ نے ان کی بات کی تائید کی نہ تردید۔ اب اس کا دل کچھ بھی کہنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ بس اپنے بیڈ پر کمبل اوڑھے چپ چاپ بیٹھی سعیدہ اماں کی باتیں سنتی رہی۔

"اچھا' چلو اب سو جاؤ بیٹا! صبح سحری کے لیے بھی اٹھنا ہوگا۔"

سعیدہ اماں کو اچانک خیال آیا۔ بیڈ سے اٹھ کر کمرے سے نکلتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"لائٹ آف کردوں؟"

پچھلی رات ایک جھماکے کے ساتھ اسے یاد آئی تھی۔

"نہیں۔۔۔ رہنے دیں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے لیٹ گئی۔

سعیدہ اماں دروازہ بند کرکے چلی گئیں۔ کمرے کی خاموشی نے اسے سالار کے بیڈ روم کی یاد دلائی۔

"ہاں' اچھا ہے نا۔۔۔ میں نہیں ہوں' آرام سے لائٹ آن کرکے سو تو سکتا ہے۔ یہی تو چاہتا تھا وہ۔۔۔" وہ پھر سے رنجیدہ ہونے لگی اور تب ہی اس کا سیل فون بجنے لگا۔ امامہ کے خون کی گردش پل بھر کے لیے تیز ہوئی' وہ اسے بالآخر کال کررہا تھا۔ اس نے بے حد خفگی کے عالم میں فون بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پھینک دیا۔

وہ اسے ساتھ لے کر نہیں گیا اور اب اسے اس کی یاد آرہی تھی۔ اس کی رنجیدگی غصے میں بدل رہی تھی۔ وہ اس طرح کیوں کررہی تھی کہ رائی کا پہاڑ بنا رہی تھی۔

اس نے جیسے اپنا تجزیہ کیا اور اس تجزیے نے بھی اسے اذیت دی۔ میں زود رنج ہوگئی ہوں یا وہ مجھے جان بوجھ کر بری طرح اگنور کررہا ہے۔ یہ جتانا چاہتا ہے کہ میں اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس کے دوست' اس کا آفس' اس کی فیملی۔۔۔ بس یہ اہم ہیں اس کے لیے۔۔۔ دوبارہ کال نہیں آئی' چند سیکنڈ کے بعد اس کا میسج آیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ یقیناً "اس سے کہے گا کہ وہ اسے مس کررہا تھا۔

ٹیکسٹ میسج میں اس کے لیے ایک ری لوڈ کارڈ کا نمبر تھا اور اس کے نیچے دو لفظ۔ "گڈ نائٹ سویٹ ہارٹ!"

پہلے اسے شدید غصہ آیا پھر بری طرح رونا۔ اسے پہلے بھی زندگی میں سالار سکندر سے برا کوئی نہیں لگا تھا اور آج بھی اس سے برا کوئی نہیں لگ رہا تھا۔



"آمنہ سے بات کرواؤ۔ میں اور طیبہ بھی اس سے بات کرلیں۔ شادی کرلی۔ اسے گھر بھی لے آؤ۔ اب کسی کام میں ہمارا ابھی کچھ حصہ ہے یا نہیں۔" سکندر نے ابتدائی سلام و دعا کے ساتھ چھوٹتے ہی اس سے کہا۔

"وہ آج اپنے میکے میں ہے۔" سالار نے کچھ سوچ کر کہا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی سعیدہ اماں کے گھر سے واپس آیا تھا۔

"تو برخوردار! تم بھی اپنے سسرال میں ہی ٹھہرتے تم منہ اٹھا کر اپنے اپارٹمنٹ کیوں آگئے؟" سکندر نے اسے ڈانٹا۔ وہ جواباً ہنسا۔

"ممی پاس ہی ہیں؟" اس نے موضوع بدلا۔

"ہاں۔ کیوں بات کرنی ہے؟"

"نہیں فی الحال تو آپ ہی سے بات کرنی ہے۔ بلکہ کچھ زیادہ سیریس بات کرنی ہے۔"

سکندر یک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ "یہ سالار سکندر" تھا وہ اگر سیریس کہہ رہا تھا تو بات یقیناً "بہت سیریس" تھی۔

"کیا بات ہے؟"

"مجھے۔ اصل میں آمنہ کے بارے میں آپ کو کچھ بتانا ہے۔"

سکندر الجھ گئے۔ وہ آمنہ کے بارے میں انہیں نکاح کے بعد بتا ہی چکا تھا۔ ڈاکٹر سبط علی کی بیٹی جس کے ساتھ اس نے اپنی کچھ ذاتی وجوہات کی بنا پر ایمرجنسی میں نکاح کیا تھا۔ سکندر عثمان، ڈاکٹر سبط علی کو جانتے تھے اور سالار کے توسط سے دو تین بار ان سے مل بھی چکے تھے۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کی بیٹی کے بجائے کسی بھی لڑکی سے اس طرح اچانک ان لوگوں کو مطلع کیے بغیر نکاح کرتا تب بھی انہیں اعتراض نہ ہوتا۔ اور ان کی فیملی بھی اتنی ہی لبرل تھی اور سالار تو بہرحال "اسپیشل کیس" تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ شادی "انسانوں" کی طرح کرتا۔ یہ تبصرہ طیبہ کا تھا جو انہوں نے اس کے نکاح کی خبر ملنے پر قدرے خفگی لیکن اطمینان کے ساتھ کیا تھا اور اب وہ کہہ رہا تھا کہ اسے آمنہ کے بارے میں کچھ بتانا تھا۔

"کیا بتانا ہے آمنہ کے بارے میں؟"

سالار نے گلا صاف کیا۔ بات کیسے شروع کرے، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"آمنہ اصل میں امامہ ہے۔" تمہید اس نے زندگی میں کبھی نہیں باندھی تھی پھر اب کیسے باندھتا۔ دوسری طرف یک دم خاموشی چھا گئی۔ سکندر کو لگا انہیں سننے میں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔

"کیا۔ کیا مطلب؟" انہوں نے جیسے تصدیق چاہی۔

"امامہ کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ وہ اتنے سالوں سے ان ہی کے پاس تھی۔ انہوں نے اس کا نام چینج کر دیا تھا اس کے تحفظ کے لیے۔ مجھے نکاح کے وقت یہ پتا نہیں تھا کہ وہ امامہ ہے، لیکن وہ امامہ ہی ہے۔"

آخری جملے کے علاوہ اسے باقی کی تفصیل احمقانہ نہیں لگی۔

سکندر عثمان نے رکتی ہوئی سانس کے ساتھ برابر کے بیڈ پر بیٹھی بیوی کو دیکھا جو اسٹار پلس پر کوئی ٹاک شو دیکھنے میں مصروف تھی اور یہ اچھا ہی تھا۔

وہ اسی طرح رکتی ہوئی سانس کے ساتھ ننگے پاؤں اپنے بستر سے اتر کر بیڈ روم کا دروازہ کھول کر بے حد عجلت کے عالم میں باہر نکل گئے۔ طیبہ نے کچھ حیرت سے انہیں اس طرح اچانک جاتے دیکھا۔

"ایک تو ان باپ بیٹے کا رومانس ہی ختم نہیں ہوتا' اب وہ گھنٹے لگا کر آئیں گے۔" طیبہ نے قدرے خفگی سے سوچا اور دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

باہر لاؤنج میں سکندر عثمان کے چودہ طبق روشن ہو رہے تھے۔ وہ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی طیبہ کے ساتھ اپنے آخری اولاد کے "سیٹل" ہو جانے پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اس کا ولیمہ پلان کر رہے تھے اور انہیں وقتی طور پر یہ بھول گیا تھا کہ وہ آخری اولاد "سالار سکندر" تھا۔

وہ گھنٹے تک لاؤنج میں اس کے ساتھ طویل گفت و شنید کے بعد جب بالآخر واپس بیڈ روم میں آئے تو طیبہ سو چکی تھیں لیکن سکندر عثمان کی نیند اور اطمینان دونوں رخصت ہو چکے تھے۔



سکندر عثمان اس سے ناراض نہیں ہوئے تھے لیکن وہ ان تمام خدشات کو سمجھ سکتا تھا جو یک دم ان کے ذہن میں جاگ اٹھے تھے۔ اتنے سال سے ہاشم مبین کی فیملی کے ساتھ ان کے تمام تعلقات مکمل طور پر منقطع تھے لیکن اس کے باوجود سب کچھ پر سکون تھا۔ امامہ کی اس فوری گمشدگی کے بعد شروع کے چند مہینے وہ انہیں تنگ کرتے رہے تھے لیکن جوں جوں انہیں یقین ہوتا گیا کہ سکندر عثمان اور سالار کا واقعی امامہ کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے تو ساری گرد جیسے آہستہ آہستہ بیٹھتی گئی۔ اس کے باوجود ہاشم مبین کو اب بھی یقین تھا کہ رابطہ نہ ہونے کے باوجود امامہ کو بھگانے میں سالار کا کسی نہ کسی طرح ہاتھ ضرور تھا مگر یہ بات ثابت کرنا مشکل تھا اور اب نو سال بعد یک دم جیسے "ثبوت" سامنے آ گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ہاشم مبین اور اس کی فیملی کیا طوفان اٹھاتی اس کے بارے میں سکندر کو کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ وہ اگر پریشان تھے تو سالار ان کی پریشانی سمجھ سکتا تھا۔

ان سے بات کرنے کے بعد وہ سونے کے لیے بیڈ پر آ کر لیٹ گیا اور اس وقت اسے ایک بار پھر امامہ یاد آئی۔ اس نے گردن موڑ کر اس خالی بستر اور تکیے کو دیکھا۔ اسے پچھلی رات اس تکیے پر بکھری زلفیں یاد آئیں۔ چند لمحوں کے لیے اسے یوں لگا جیسے وہ وہیں تھی۔ اس تکیے سے اس کے کندھے اور اس کے کندھے سے اس کے سینے تک آتی ہوئی وہ سیاہ ریشمی زلفیں ایک بار پھر اس سے لپٹنے لگی تھیں۔

اس نے لائٹ آف کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ پچھلی رات نہیں تھی کہ اسے تاریکی میں بھی نیند آ جاتی۔



وہ ساری رات نہیں سوئی۔ غصہ' رنج' افسوس اور آنسو۔ وہ ایک کیفیت سے نکلتی' دوسری میں داخل ہوتی رہی۔

سحری کے وقت بھی اس کا دل بستر سے نکل کر سعیدہ اماں کا سامنا کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ انہیں اپنی اتری ہوئی شکل دکھانا نہیں چاہتی تھی لیکن مجبوری تھی۔ سعیدہ اماں اسے مجبور نہ کرتیں تو وہ سحری کھائے بغیر روزہ رکھتی۔ واپس کمرے میں آنے پر اس نے ایک بار پھر اپنے سیل پر سالار کی مسڈ کال دیکھی۔ اس نے سیل آف کیا اور کمبل لپیٹ کر سو گئی۔

سالار نے دس بجے کے قریب آفس سے اسے کال کی سیل آف تھا۔ گیارہ بجے کال کرنے پر ایک بار پھر سیل

آف ملا۔ اس بار اس نے سعیدہ اماں کی لینڈ لائن پر کال کی۔

"امامہ سو رہی ہے۔" انہوں نے چھوٹتے ہی سرد مہری سے اسے اطلاع دی۔

"اچھا جب وہ اٹھے تو آپ اس سے کہیں کہ مجھے کال کرلے۔" اس نے پیغام دیا۔

"دیکھوں گی اگر اس کے پاس فرصت ہوئی تو کرلے گی۔"

سعیدہ اماں نے یہ کہہ کر کھٹاک سے فون بند کردیا۔ وہ سیل ہاتھ میں پکڑے رہ گیا۔ اگلے پانچ منٹ وہ اسی پوزیشن میں بیٹھا سعیدہ اماں کے جواب پر غور کرتا رہا۔

امامہ کو اس کا پیغام مل گیا تھا اور سعیدہ اماں نے سالار کو دیا جانے والا جواب بھی اسے سنادیا۔ وہ خاموش رہی۔

"آج بھائی صاحب کی طرف چلیں گے۔" سعیدہ اماں نے اسے چپ دیکھ کر کہا۔

"آج رہنے دیں، سالار کے گھر والے آرہے ہیں بعد میں بات کریں گے۔" امامہ نے سعیدہ اماں سے کہا۔

سالار نے ڈیڑھ بجے کے قریب فون کیا اور اس کی آواز سنتے ہی کہا۔

"تھینک گاڈ! تمہاری آواز تو سننا نصیب ہوا مجھے۔" وہ جواباً خاموش رہی۔

"ڈاکٹر صاحب کا ڈرائیور پہنچنے ہی والا ہوگا، تم تیار ہوجاؤ۔" سالار نے اس کی خاموشی نوٹس کیے بغیر اسے اطلاع دی۔

"ڈنر کے لیے کیا بنانا ہے؟" امامہ نے جواباً کہا۔

"کون سا ڈنر؟"

"تمہارے پیرنٹس کھانا نہیں کھائیں گے کیا؟"

"نہیں، ڈنر فرقان کے گھر پر ہے۔"

"میں ڈنر خود تیار کرواں گی۔" اس نے اس اطلاع پر دوٹوک انداز میں کہا۔

"یہ ڈنر وہ ہم دونوں کے لیے نہیں بلکہ ممی، پاپا اور انیتا کے لیے کررہا ہے۔" وہ کچھ خفیف سی ہوگئی۔

"لیکن سحری کے لیے تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔"

"میری فیملی میں روزے وغیرہ کوئی نہیں رکھتا، لیکن پوچھ لوں گا اور کرلیں گے کچھ نہ کچھ۔ فریج میں بہت کچھ ہے۔ تم اس جھنجھٹ میں نہ پڑو۔"

"ہیلو!" سالار نے جیسے لائن پر اس کی موجودگی کو چیک کیا۔

"میں سن رہی ہوں۔" اس نے جواباً کہا۔

"امامہ! تم اور سعیدہ اماں کل رات کو رو کیوں رہی تھیں۔۔۔؟"

سالار نے بالآخر وہ سوال کیا جو پچھلی رات سے اسے تنگ کررہا تھا۔

"ایسے ہی۔" وہ کچھ دیر کے لیے جواب نہیں دے سکی۔

"اور سعیدہ اماں کا موڈ بھی کچھ آف تھا؟"

"پتا نہیں۔۔۔ تم پوچھ لیتے۔" اس نے اب بھی اسی انداز سے کہا۔

"میں پوچھنا چاہتا تھا مگر مجھے لگا کہ ابھی مناسب نہیں۔" سالار نے کہا۔ امامہ جواباً خاموش رہی۔

"چلو تم اب تیار ہوجاؤ، گھر پہنچ جاؤ تو مجھے ٹیکسٹ میسج کرنا۔ اگر میں فری ہوا تو تمہیں کال کرلوں گا۔" امامہ نے جواباً خدا حافظ کہہ کر فون بند کردیا۔ اس کا دل چاہا تھا اس سے کہے۔ "ضرورت نہیں۔"



وہ تقریباً اڑھائی بجے ڈاکٹر صاحب کے ڈرائیور کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ پر پہنچی تھی اور اس نے آتے ہی

سب سے پہلے دونوں بیڈ رومز چیک کیے تھے۔ بیڈ رومز یا باتھ رومز میں کچھ رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سالار آفس جانے سے پہلے یقیناً "ہر کام خود ہی کر کے گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے وجود کو "بے مصرف" محسوس کیا۔

ایک بیڈ روم شاید پہلے ہی گیسٹ روم کے طور پر استعمال ہو رہا تھا جبکہ دوسرا بیڈ روم وہ اسٹڈی کے طور پر بھی استعمال کر رہا تھا۔ وہاں ایک ریک پر کتابوں کے ڈھیر کے علاوہ اسی طرح کے ریکس پر سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز کے انبار بھی نظر آئے۔ سٹنگ روم میں موجود ریکس پر بھی ڈی وی ڈیز اور سی ڈیز تھیں لیکن ان کی تعداد اس کمرے کی نسبت بہت کم تھی۔ کمرے میں کچھ میوزیکل انسٹرومنٹس بھی پڑے ہوئے تھے اور ایک اسٹڈی ٹیبل پر جس ایک ڈیسک ٹاپ تھا۔ وہ اسٹڈی ٹیبل اس کمرے کی وہ واحد چیز تھی جس پر پڑے کاغذ، فائلز اور ڈیسک آرگنائزر اسے بے ترتیب نظر آئے۔ وہ اٹھنے سے پہلے اسے ٹھیک کرنا بھول گیا تھا یا شاید اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا کہ وہ ان پیپرز کو ٹھیک کر دے، اگلے ہی لمحے اس نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اسے خدشہ تھا وہ یہ کام سالار جیسی پرفیکشن کے ساتھ نہیں کر سکتی تھی اور اگر کوئی پیپر ادھر ادھر ہو گیا تو۔۔۔؟

وہ دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی۔ فریج اور فریزر میں واقعی کھانے کا بہت سا سامان تھا اور اس کو یقین تھا کہ ان میں سے نوے پرسنٹ اشیاء فرقان اور نوشین کی مرہون منت تھیں۔ جو چیزیں سالار کی اپنی خریداری کا نتیجہ تھیں ان میں پھلوں کے علاوہ ڈرنکس اور ٹن پیکڈ فوڈ آئٹمز کی ایک محدود تعداد تھی۔ اس نے چند ٹن نکال کر دیکھے وہ تقریباً سب کے سب سی فوڈ تھے۔

امامہ کو کھانے میں صرف ایک چیز ناپسند تھی۔ سی فوڈ۔ روزے کی وجہ سے اس کا معدہ خالی نہ ہوتا تو ان ڈبوں پر بنے ہوئے کریبز اور پرانز دیکھ کر اسے وومٹنگ شروع ہو جاتی۔ اس نے بڑی مایوسی کے عالم میں ان ٹنز کو واپس فریج میں رکھ دیا۔ یقیناً وہ ڈیکوریشن کے مقصد سے خرید کر نہیں رکھے گئے تھے۔ وہ خرید کر لاتا تھا تو یقیناً "کھاتا بھی ہو گا۔ اس کا خراب موڈ کچھ اور ابتر ہوا۔ ابھی اور کیا کیا پتا چلنا تھا اس کے بارے میں۔۔۔

اس نے کچن کے کیبنٹس کھول کر دیکھے اور بند کر دیے۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کچن میں فریج کے علاوہ صرف کال کیبنٹس اور برتنوں کے ریکس کے علاوہ کہیں کچھ نہیں۔ وہ کچن صرف ناشتے اور سینڈوچ والے میلز کے علاوہ صرف چائے یا کافی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ وہاں اسے چند فرائنگ پینز کے علاوہ کسی قسم کے پکانے کے برتن نظر نہیں آئے۔ کچن میں موجود کراکری بھی ایک ڈنر سیٹ اور چند واٹر اور ایک مشتمل تھی یا اس کے علاوہ کچھ مگز تھے یا پھر بریک فاسٹ سیٹ۔ یقیناً "اس کے گھر آنے والے افراد کی تعداد بھی زیادہ نہیں تھی۔

وہ کچن سے نکل آئی۔

اپارٹمنٹ کا واحد غیر دریافت شدہ حصہ بالکونی تھا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور وہ پہلی جگہ تھی جہاں آتے ہی اس کا دل خوش ہوا تھا۔ چھ فٹ چوڑی اور بارہ فٹ لمبی وہ ٹیرس نما بالکونی کو ٹیرس گارڈن کہنا زیادہ مناسب تھا۔ مختلف شکلوں اور سائزز کے گملوں میں مختلف قسم کے پودے اور بیلیں لگی ہوئی تھیں اور شدید سرد موسم میں بھی ان کی حالت بتا رہی تھی کہ ان پر خاصی محنت اور وقت لگایا گیا تھا۔ وہاں آس پاس کی بالکونیوں سے بھی ایسے سبز رنگ کے پودے اور بیلیں جھانکتی نظر آ رہی تھیں لیکن یقیناً "سالار کی بالکونی کی حالت سب سے بہتر تھی۔

لاؤنج کی قد آدم کھڑکیاں بھی اسی بالکونی میں تھیں اور بالکونی میں ان کھڑکیوں کے پاس دیوار کے ساتھ زمین پر ایک میٹ موجود تھا۔ وہ شاید یہاں آ کر بیٹھتا ہو گا یا دھوپ میں لیٹتا ہو گا۔ شاید ویک اینڈ پر۔۔۔ ورنہ سردی کے

موسم میں اس میٹ کی وہاں موجودگی کا مقصد اسے سمجھ میں نہیں آیا۔ بالکونی کی منڈیر کے قریب ایک اسٹول پڑا ہوا تھا۔ وہ یقیناً" وہاں آکر بیٹھتا تھا۔ نیچے دیکھنے کے لیے۔ منڈیر پر مگ کے چند نشان تھے۔ چائے یا کافی پیتا ہے یہاں بیٹھ کر۔ مگر کس وقت۔ یقیناً" رات کو۔ اس نے سوچا اور آگے بڑھ کر نیچے جھانکا۔ وہ تیسری منزل تھی اور نیچے بلڈنگ کا لان اور پارکنگ تھے۔ کچھ فاصلے پر کمپاؤنڈ سے باہر سڑک بھی نظر آرہی تھی۔ وہ ایک پوش ایریا تھا اور سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ وہ واپس اندر آگئی۔

وہ کپڑے تبدیل کرکے ابھی اپنے بال بنا ہی رہی تھی جب اسے ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ فوری طور پر اسے نوشین ہی کا خیال آیا تھا۔

لیکن دروازے پر ایک ریسٹورنٹ کا ڈیلیوری بوائے چند پیکٹس لیے کھڑا تھا۔

"میں نے آرڈر نہیں کیا۔" اسے لگا شاید وہ کسی غلط اپارٹمنٹ میں آگیا ہے۔

اس نے جواباً" سالار سکندر کا نام ایڈریس کے ساتھ دہرایا۔ چند لمحوں کے لیے وہ چپ سی ہوگئی۔ وہ کم از کم اتنا لاپروا نہیں تھا اس کے بارے میں کہ اس کے افطار کے لیے کچھ انتظام کرنا بھول جاتا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اپنے پیرنٹس کو لینے کے لیے آفس سے نکل چکا ہوگا اور ایئرپورٹ پہنچنے کی بھاگ دوڑ میں اسے شاید وہ یاد بھی نہیں ہوگی۔

کچن میں ان پیکٹس کو رکھتے ہوئے اس کا غصہ اور رنجیدگی کچھ کم ہوئی اور یہ شاید اس کا ہی اثر تھا کہ اس نے کال کرکے سالار کو مطلع کرنا اور اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔ وہ اس وقت ایئرپورٹ کی طرف جارہا تھا۔ اس نے فوراً" کال ریسیو کی تھی۔

امامہ نے اسے کھانے کے بارے میں بتایا۔

"میں رات کا کھانا اکثر اس ریسٹورنٹ سے منگواتا ہوں۔ کھانا اچھا ہوتا ہے ان کا۔۔۔" اس نے جواباً" بڑے معمول کے انداز میں کہا۔ "میں نے سوچا' میں جب تک ان لوگوں کو لے کر گھر آؤں گا تم تب تک بھوکی بیٹھی رہوگی۔"

وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی مگر یک دم اسے احساس ہوا کہ یہ بہت مشکل کام ہے۔ سالار سے یہ دو لفظ کہنا' ایک عجیب سی جھجک تھی جو اسے محسوس ہورہی تھی۔



وہ تقریباً" سوا نو بجے کے قریب آیا اور ڈور بیل کی آواز پر وہ بے اختیار نروس ہوگئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سالار کی فیملی کے ردعمل سے خائف تھی۔ ایک ہمسائے کے طور پر بھی دونوں فیملیز کے درمیان بے حد رسمی تعلقات تھے اور بعد میں ہونے والے واقعات نے تو یہ فارمیلٹی بھی ختم کردی تھی۔ اسے کئی سال پہلے سکندر عثمان سے فون پر ہونے والی گفتگو یاد تھی اور شاید اس کے خدشات کی وجہ بھی وہی کال تھی۔

بیرونی دروازہ کھولتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔

سکندر عثمان سمیت تینوں افراد اس سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ملے تھے۔ وہ ان کے رویوں میں جس روکھے پن اور خفگی کو ڈھونڈ رہی تھی' وہ فوری طور پر اسے نظر نہیں آئی۔ امامہ کی نروس نیس میں کچھ کمی آئی۔

فرقان کے گھر ڈنر کے دوران اس کی یہ نروس نیس اور بھی کم ہوئی۔

انیتا اور طیبہ دونوں بڑے دوستانہ انداز میں نوشین اور اس سے باتیں کرتی رہیں۔ نوشین اور فرقان سالار کے والدین سے پہلے بھی مل چکے تھے لیکن نوشین انیتا سے پہلی بار مل رہی تھی اور دونوں کا موضوع گفتگو ان کے بچے

تھے۔ وہ بے حد پر سکون انداز میں ایک خاموش سامع کی طرح ان لوگوں کی باتیں سنتی رہی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ فرقان کے گھر میں اس کی شادی یا اس کی ذات موضوع گفتگو بنے۔

اپنے اپارٹمنٹ میں واپسی کے بعد پہلی بار سکندر اور طیبہ نے سٹنگ روم میں بیٹھے اس سے بات کی اور تب امامہ نے ان کے لہجے میں چھپی اس تشویش کو محسوس کیا جو امامہ کی فیملی کے متوقع رد عمل سے انہیں تھی۔ اس کا اعتماد ایک بار پھر غائب ہو گیا۔ اگرچہ انہوں نے کھلے عام امامہ کے سامنے ہاشم مبین یا ان کے خاندان کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی لیکن وہ لوگ اب ولیمہ کا فنکشن اسلام آباد کے بجائے لاہور میں منعقد کرنا چاہتے تھے۔ وہ سالار کی رائے سننا چاہتی تھی لیکن وہ گفتگو کے دوران خاموش رہا۔ جب گفتگو کے دوران خاموشی کے وقفوں کی تعداد بڑھنے لگی تو یک دم امامہ کو احساس ہوا کہ گفتگو میں آنے والی اس بے ربطی کی وجہ وہ تھی۔ وہ چاروں اس کی وجہ سے کھل کر بات نہیں کر پا رہے تھے۔

"بالکل بیٹا! تم سو جاؤ، تمہیں سحری کے لیے اٹھنا ہو گا۔ ہم لوگ تو ابھی کچھ دیر بیٹھیں گے۔"

اس کے نیند آنے کے بہانے پر سکندر عثمان نے فوراً کہا تھا۔

وہ اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔ نیند آنا بہت مشکل تھی۔ دو دن پہلے جن خدشات کے بارے میں اس نے سوچا بھی نہیں تھا اب وہ ان کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

اسے اندازہ تھا کہ سکندر عثمان ان دونوں کی شادی کو خفیہ ہی رکھنا چاہتے ہیں تاکہ اس کی فیملی کو اس کے بارے میں پتا نہ چلے۔

وہ بہت دیر تک اپنے بیڈ پر بیٹھی ان خدشات اور خطرات کے بارے میں سوچتی رہی جو انہیں محسوس ہو رہے تھے۔ اس وقت وہاں اکیلے بیٹھے پہلی بار اس نے سوچا کہ اس سے شادی کر کے سالار نے کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ جو بھی اس سے شادی کرتا وہ کسی نہ کسی حد تک خود کو غیر محفوظ ضرور کر لیتا لیکن سالار سکندر کی صورت میں صورت حال اس لیے زیادہ خراب ہوتی کیونکہ اس کے ساتھ اس کے اس رشتے کا انکشاف ہونے کے چانسز زیادہ تھے۔

وہ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتے تھے۔ اس نے سوچا۔ مجھے یا سالار کو جان سے تو نہیں ماریں گے۔ اسے اب بھی اندھا اعتماد تھا کہ کہیں نہ کہیں اس کی فیملی اتنا لحاظ ضرور کرے گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کریں گے اور پھر سالار سے طلاق دلوا کر کہیں اور شادی کرنا چاہیں گے۔

اس کے اضطراب میں یک دم مزید اضافہ ہوا۔ سب کچھ شاید اتنا سیدھا نہیں تھا جتنا وہ سمجھ رہی تھی یا سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ اپنی مرضی سے کہیں شادی کرنے کا مسئلہ نہیں تھا، یہ مذہب میں تبدیلی کا معاملہ تھا۔ اسے اپنے پیٹ میں گرہیں پڑتی محسوس ہوئیں۔ وہ واپس بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔ اس وقت پہلی بار سالار سے شادی کرنا اسے ایک غلطی لگی۔ وہ ایک بار پھر اسی کھائی کے کنارے آ کھڑی ہوئی تھی، جس سے وہ اتنے سالوں سے بچتی پھر رہی تھی۔



"اب کیا ہو گا؟" طیبہ نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔

"اب ہونے کو رہ کیا گیا ہے؟" سکندر عثمان نے جواباً کہا۔ وہ جانتے تھے طیبہ کا اشارہ کس طرف تھا۔

"ہاشم مبین کو پتا چل گیا تو۔۔۔؟"

"اسی لیے تو اس سے کہا ہے کہ امامہ کو وہیں رکھے لاہور میں۔ اسلام آباد نہیں لائے۔ ویسے بھی پی ایچ ڈی کے لیے تو اسے اگلے سال چلے ہی جانا ہے۔ تب تک تو کور ہو سکتا ہے یہ سب کچھ۔" سکندر عثمان نے اپنے گلاسز اتارتے ہوئے کہا۔ وہ بھی سونے کے لیے لیٹنے والے تھے۔

طیبہ کچھ دیر خاموش رہیں پھر انہوں نے کہا "مجھے تو بڑی عام سی لگی ہے امامہ۔"

"تمہارے بیٹے سے بہتر ہے۔" سکندر عثمان نے ترکی بہ ترکی کہا۔ طیبہ کچھ ناراض ہوئیں۔

"کیوں۔ سالار سے کس طرح بہتر ہے' وہ اس کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ آپ خود ایمان داری سے بتائیں' ایسی کوئی بات ہے اس میں کہ نو سال بیٹھا رہا وہ اس کے لیے۔"

سکندر ہنس پڑے۔

"اتنی ہنسی کس بات پر آرہی ہے آپ کو؟" وہ چڑیں۔

سکندر واقعی بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔

"میں واقعی بہت خوش ہوں کیونکہ میرا بیٹا بڑا خوش ہے۔ اتنے سالوں بعد اس طرح باتیں کرتے دیکھا ہے اسے۔ میں نے زندگی میں کبھی اس کے چہرے پر ایسی رونق نہیں دیکھی۔ امامہ کے ساتھ اس کی شادی ہو گئی ہے میرے تو کندھوں سے بوجھ اتر گیا ہے۔ اس کے سامنے کتنا شرمندہ رہتا تھا میں' تمہیں اندازہ بھی ہے۔"

طیبہ خاموشی سے ان کی بات سن رہی تھیں۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہے ہیں۔



نیند میں وہ اس کے ہاتھوں میں رسیاں باندھ کر اسے کھینچ رہے تھے۔ رسیاں اتنی سختی سے باندھی ہوئی تھیں کہ اس کی کلائیوں سے خون رسنے لگا تھا اور ان کے ہر جھٹکے کے ساتھ وہ درد کی شدت سے بے اختیار چلائی۔ وہ کسی بازار میں لوگوں کی بھیڑ کے درمیان کسی قیدی کی طرح لے جائی جارہی تھی۔ دونوں اطراف میں کھڑے ہوئے لوگ بلند آواز میں قہقہے لگاتے ہوئے اس پر آوازے کس رہے تھے۔ پھر ان لوگوں میں سے ایک مرد نے جو اس کی کلائیوں میں بندھی رسیوں کو کھینچ رہا تھا۔۔۔۔ پوری قوت سے رسی کو جھٹکا دیا۔ وہ گھٹنوں کے بل اس پتھریلے راستے پر گری۔

"امامہ۔ امامہ۔ اٹھ جاؤ۔ سحری ختم ہونے میں تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے۔"

وہ ہڑبڑا کر اٹھی' بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کیا۔ سالار اس کے پاس کھڑا نرمی سے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے اسے جگا رہا تھا۔

"سوری۔ میں نے شاید تمہیں ڈرا دیا۔" سالار نے معذرت کی۔

وہ کچھ دیر تک خالی ذہن کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ گزرے ہوئے سالوں میں ایسے خواب دیکھنے کی عادی ہو گئی تھی اور خوابوں کا یہ سلسلہ اب بھی نہیں ٹوٹا تھا۔

"کوئی خواب دیکھ رہی تھیں؟"

سالار نے جھک کر گود میں رکھے اس کے ہاتھ کو ہلاتے ہوئے پوچھا۔ اسے یوں لگا تھا' وہ ابھی بھی نیند میں تھی۔ امامہ نے سر ہلا دیا۔ وہ اب نیند میں نہیں تھی۔

"تم کمبل لیے بغیر سو گئیں؟" سالار نے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے کہا۔ امامہ نے چونک کر بیڈ پر پڑے کمبل کو دیکھا۔ وہ واقعی اسی طرح پڑا تھا۔ یقیناً" وہ بھی رات کو کمرے میں سونے کے لیے نہیں آیا تھا۔ کمرے کا ہیٹر آن

رہا تھا ورنہ وہ سردی لگنے کی وجہ سے ضرور اٹھ جاتی۔
"جلدی آجاؤ بس دس منٹ رہ گئے ہیں۔"
وہ اسے پانی کا گلاس تھماتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔
منہ ہاتھ دھونے کے بعد جب وہ سٹنگ ایریا میں آئی تو وہ سحری کر چکا تھا اور چائے بنانے میں مصروف تھا۔ لاؤنج یا کچن میں اور کوئی نہیں تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس کے لیے پہلے ہی سے برتن لگے ہوئے تھے۔
"میں چائے بناتی ہوں۔" وہ سحری کرنے کے بجائے مگ نکالنے لگی۔
"تم آرام سے سحری کرو' ابھی اذان ہو جائے گی۔ میں اپنے لیے چائے خود بنا سکتا ہوں' بلکہ تمہارے لیے بھی بنا سکتا ہوں۔" سالار نے مگ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اسے واپس بھیجا۔
وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔
"یہ سب لوگ سو رہے ہیں؟"
"ہاں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سوئے ہیں۔ ساری رات تو باتیں کرتے رہے ہم لوگ اور شاید ہماری آوازوں کی وجہ سے تم بھی سو نہیں سکیں۔"
"نہیں' میں سو گئی تھی۔" اس کا لہجہ بہت بجھا ہوا تھا۔ سالار نے محسوس کیا' وہ اسے بہت اپ سیٹ لگی۔
"کیا کوئی زیادہ برا خواب دیکھا ہے؟"
وہ چائے کے مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کرسی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔
"خواب۔" وہ چونکی۔ "نہیں۔ ایسے ہی۔" وہ کھانا کھانے لگی۔
"صبح ناشتا کتنے بجے کریں گے یہ لوگ۔" اس نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔
وہ بے اختیار ہنسا۔
"یہ لوگ۔ کون سے لوگ۔ یہ تمہاری دوسری فیملی ہے اب۔ ممی' پاپا کہو انہیں اور انیتا کو انیتا۔" وہ اس کی بات پر بے اختیار شرمندہ ہوئی۔ وہ ابھی کل رات سے ان کے لیے یہی دو لفظ استعمال کر رہی تھی۔
"ناشتا تو نہیں کریں گے ابھی گھنٹہ' ڈیڑھ گھنٹہ تک اٹھ جائیں گے۔ دس بجے کی فلائٹ ہے۔" سالار نے اس کی شرمندگی کو بھانپتے ہوئے بات بدل دی۔
"صبح نو بجے کی۔ اتنی جلدی کیوں جا رہے ہیں؟" وہ حیران ہوئی۔
"صرف تم سے ملنے کے لیے آئے تھے یہ لوگ' پاپا کی کوئی میٹنگ ہے آج دوپہر اور انیتا تو اپنے بچوں کو ملازمہ کے پاس چھوڑ کر آئی ہے۔ چھوٹی بیٹی تو صرف چھ ماہ کی ہے اس کی۔" وہ بتا رہا تھا۔ "چائے پینی ہے ناشتے کے بجائے' وہ تم بنا دینا۔ میں ابھی نماز پڑھ کر آجاؤں' پھر ان کے ساتھ ہی آفس کے لیے تیار ہوں گا اور انہیں ایئرپورٹ چھوڑ کر پھر آفس چلا جاؤں گا۔" سالار نے جمائی روکتے ہوئے چائے کا خالی مگ اٹھایا اور کھڑا ہو گیا۔ امامہ نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا۔
"تم سوؤ گے نہیں؟"
"نہیں' شام کو آفس سے آنے کے بعد سوؤں گا۔"
"تم چھٹی لے لیتے۔" امامہ نے روانی سے کہا۔
سنک کی طرف جاتے ہوئے سالار نے پلٹ کر امامہ کو دیکھا اور پھر بے اختیار ہنسا۔ "سونے کے لیے آفس سے چھٹی لے لیتا؟ میرے پروفیشن میں ایسا نہیں ہوتا۔"

"تم سوئے نہیں رات کو، اس لیے کہہ رہی ہوں۔" وہ اس کی بات پر جھنجی تھی۔
"میں اڑتالیس، اڑتالیس گھنٹے بغیر سوئے یو این کے لیے کام کرتا رہا ہوں۔ وہ بھی شدید گرمی اور سردی میں۔ ڈیزاسٹر اسٹریکن ایریاز میں اور رات کو تو ماں، باپ کے پاس بیٹھا پرفیکٹ کنڈیشنز میں باتیں کرتا رہا ہوں، تھکتا کیوں؟"
اذان ہو رہی تھی۔
"آپ پلیز مگ مت دھونا، مجھے ابھی اپنے برتن دھونے ہیں۔" امامہ نے چائے کا مگ خالی کرتے ہوئے اسے روکا۔ وہ بیگ نکال کر ویسٹ باسکٹ میں پھینکنے لگی تھی۔
"ٹھیک ہے۔۔۔ دھوئیے۔"
سالار نے بڑی خوش دلی کے ساتھ مگ سنک میں رکھا اور پلٹا۔ وہ کوڑے دان کا ڈھکن ہٹائے ہوئے فق ہوتی رنگت کے ساتھ ٹی بیگ ہاتھ میں پکڑے کسی بت کی طرح کھڑی تھی۔ سالار نے ایک نظر اسے دیکھا پھر کوڑے دان کے اندر پڑی اس چیز کو جس نے اسے یوں شاکڈ کر دیا تھا۔
"نان الکحولک ڈرنک۔" وہ مدھم آواز میں کہتے ہوئے کچن سے باہر نکل گیا تھا۔
وہ بے اختیار شرمندہ ہوئی۔ اسے یقین تھا۔ وہ اس کوڑے دان کے اندر پڑے جنجر بیئر کے اس خالی کین کو وہاں سے نہیں دیکھ سکتا تھا جہاں وہ کھڑا تھا، اس کے باوجود اس کو پتا تھا کہ وہ کیا چیز دیکھ کر سکتے میں آئی تھی۔
اس نے جنجر بعد میں پڑھا تھا، بیئر پہلے۔۔۔ اور یہ سالار سکندر کا گھر نہ ہوتا تو اس کا ذہن پہلے نان الکحولک ڈرنکس کی طرف جاتا، مگر یہاں اس کا ذہن بے اختیار دوسری طرف گیا تھا۔ جھک کر ٹی بیگ پھینکتے ہوئے اس نے نان الکحولک کے لفظ بھی کین پر دیکھ لیے تھے۔ کچھ دیر وہیں کھڑی وہ اپنی ندامت ختم کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہا ہو گا میرے بارے میں اور سالار کو بھی واقعی کرنٹ لگا تھا۔ وہ دونوں اپنے درمیان اعتماد کا جو پل بنانے کی کوشش کر رہے تھے وہ کبھی ایک طرف سے ٹوٹ رہا تھا، کبھی دوسری طرف سے۔
اس نے آخری بار شراب آٹھ سال پہلے پی تھی، لیکن وہ انرجی اور نان الکحولک ڈرنکس تقریباً ہر رات کام کے دوران پیتا تھا۔ امامہ کو ویسٹ باسکٹ کے پاس شاکڈ دیکھ کر اسے یہ جاننے میں سیکنڈز بھی نہیں لگے تھے کہ ویسٹ باسکٹ میں پڑی کون سی چیز اس کے لیے شاکنگ ہو سکتی ہے۔
وہ کارپوریٹ سیکٹر سے تعلق رکھتا تھا اور جن پارٹیز میں جاتا تھا وہاں ڈرنکس ٹیبل پر شراب بھی موجود ہوتی تھی اور ہر بار اس "مشروب" سے انکار پر کسی نے پچھلے آٹھ سال کے دوران شاید ایک بار بھی یہ نہیں سوچا ہو گا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی نو سال پہلے والے سالار سکندر سے واقف نہیں تھا۔ لیکن وہ ایک فرد جو دو دن پہلے اس کے گھر میں آیا تھا، اس کے پاس سالار کی کسی بھی بات اور عمل پر شبہ کرنے کے لیے بڑی ٹھوس وجوہات موجود تھیں۔
"یہ سب تو ہو گا ہی۔۔۔ ایسی حرکتیں نہ کرتا تب قابل اعتبار ہوتا۔ اب جبکہ ماضی کچھ اتنا صاف نہیں ہے تو اس پر اپنا اعتبار قائم کرنے میں کچھ وقت تو لگے گا ہی۔" بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے اس نے بڑی آسانی کے ساتھ سارا الزام اپنے سر لے کر امامہ کو بری الذمہ قرار دے دیا تھا۔
"تمہارے کپڑے پریس کروں؟" اس نے بیڈ روم میں آ کر پوچھا۔ وہ ڈریسنگ روم میں وارڈ روب کھولے اپنے کپڑے نکال رہا تھا۔
"نہیں، میرے کپڑے تو پریس ہو کر آتے ہیں۔" ایک ہینگر نکالتے ہوئے وہ پلٹ کر مسکرایا تھا۔

امامہ کو یک دم اپنے کانوں کے بندے یاد آئے۔
"تم نے میرے ایر رنگز کہیں دیکھے ہیں میں نے واش روم میں رکھے تھے وہاں نہیں ملے مجھے۔"
"ہاں میں نے اٹھائے تھے وہاں سے۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل پر ہیں۔" سالار دو قدم آگے بڑھا اور ایر رنگز اٹھا کر امامہ کی طرف بڑھا دیے۔
"یہ پرانے ہو گئے ہیں۔ تم آج میرے ساتھ چلنا میں تمہیں نئے لے دوں گا۔"
وہ ایر رنگز کانوں میں پہنتے ہوئے ٹھٹکی۔
"یہ میرے ابو نے دیے ہیں، جب مجھے میڈیکل میں ایڈمیشن ملا تھا۔ میرے لیے پرانے نہیں ہیں۔ تمہیں ضرورت نہیں ہے اپنے پیسے ضائع کرنے کی۔"
اس کا رد عمل دیکھنے کے لیے امامہ نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت تک نہیں کی۔ وہ بیڈ روم کا دروازہ کھول کر باہر چلی گئی تھی۔ وہ اگلے کچھ سیکنڈز وہیں کھڑا رہا۔ وہ محبت سے کی ہوئی آفر تھی، جسے وہ اس کے منہ پر مار کر گئی تھی۔ کم از کم سالار نے یہی محسوس کیا تھا۔ اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ محبت سے کی جانے والی اس آفر کو اس نے ضرورت پوری کرنے والی چیز بنا دیا تھا۔ وہ مرد تھا، ضرورت اور محبت میں فرق نہیں کر پاتا تھا۔ وہ عورت تھی ضرورت اور محبت میں فرق رکھتے رکھتے مر جاتی۔

ڈاکٹر سبط علی کو اس دن صبح ہی سعیدہ اماں سے طویل گفتگو کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ دو یا تین دن بعد ان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے فون کیا کرتے تھے اور آج بھی انہوں نے سعیدہ اماں کی طبیعت پوچھنے کے لیے ہی فون کیا تھا۔ وہ ان کی آواز سنتے ہی پھٹ پڑی تھیں۔ ڈاکٹر سبط علی بے یقینی سے ان کی باتیں سنتے رہے۔ انہیں سعیدہ اماں کی کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔
"آمنہ نے آپ سے یہ کہا کہ سالار اپنی پہلی بیوی کی باتیں کرتا رہا ہے؟" انہیں لگا کہ انہیں سعیدہ اماں کی بات سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔
"وہ بے چاری تو روتی رہی ہے۔۔۔ فون پر بھی۔۔۔ اور میرے پاس بیٹھ کر بھی۔۔۔ سالار نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس سے ٹھیک طرح سے بات تک نہیں کرتا وہ۔ بھائی صاحب! آپ نے بڑا ظلم کیا ہے بچی پر۔" سعیدہ اماں ہمیشہ کی طرح جذباتی ہو رہی تھیں۔
"مجھے لگتا ہے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، وہ دونوں تو پرسوں میرے پاس آئے ہوئے تھے۔ بالکل ٹھیک ٹھاک اور خوش تھے۔" ڈاکٹر سبط علی پریشان کم اور حیران زیادہ ہو رہے تھے۔
"اور آپ کے گھر سے واپسی پر وہ اسے یہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ بے چاری ساری رات روتی رہی۔"
"آمنہ آپ کے ہاں رہی پرسوں؟" وہ پہلی بار چونکے تھے۔
"تو اور کیا۔۔۔؟ سالار تو اس کو لے کر جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو اس کے ماں باپ آ رہے تھے کل۔۔۔ تو اس لیے مجبوراً لے گیا اسے۔ اور آمنہ بھی بڑی پریشان ہے سارا دن چپ بیٹھی رہی۔ آپ تو بھائی صاحب بڑی تعریفیں کیا کرتے تھے 'بڑا نیک، صالح بچہ ہے' لیکن یہ تو بڑا خراب نکلا۔ ابھی سے تنگ کرنا شروع کر دیا ہے اس نے۔"
اس وقت ڈاکٹر سبط علی کے چودہ طبق روشن ہو رہے تھے۔ امامہ اس رات ان کے گھر پر بھی خاموش بیٹھی رہی تھی، لیکن انہیں یہ شائبہ تک نہیں ہوا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی اختلاف ہوا ہے۔

اور سالار کی پہلی بیوی۔۔۔؟ کون سی پہلی بیوی نکل آئی تھی جس کا حوالہ اس نے سعیدہ اماں کو دیا تھا۔ وہ اب پہلی بار سالار کے بارے میں پریشان ہونے لگے تھے۔ کیا انہوں نے کوئی غلطی کر دی تھی؟

بے حد پریشانی کے عالم میں انہوں نے امامہ کو فون کیا۔ امامہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سعیدہ اماں، ڈاکٹر سبط علی سے واقعی سب کچھ کہہ دیں گی اور وہ بھی اتنی جلدی۔۔۔ ڈاکٹر سبط علی نے اس کا حال احوال پوچھتے ہی اس سے اگلا سوال یہی کیا تھا۔

"سعیدہ بہن نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کو سالار سے کچھ شکایتیں ہیں۔" وہ بے حد پریشان لگ رہے تھے۔

امامہ کا حلق یک دم خشک ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اقرار کرے یا انکار۔ اس کی خاموشی نے ڈاکٹر سبط علی کو مزید پریشان کیا۔

"اور سالار آپ سے کون سی پہلی بیوی کے بارے میں باتیں کرتا رہا ہے؟"

وہ بے اختیار ہونٹ کاٹنے لگی۔ اس کا ذہن اس وقت بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔ وہ سالار کے خلاف تمام شکایات کو الزامات کے طور پر دہرانا چاہتی تھی لیکن اس وقت مسئلہ یہ تھا کہ وہ ڈاکٹر سبط علی سے اتنی بے تکلفی کے ساتھ وہ سب کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس نے سعیدہ اماں سے کہا تھا۔ سعیدہ اماں سے شکایتیں کرتے ہوئے اس نے مبالغے سے بھی کام لیا تھا اور اسے یہ اندازہ نہیں ہوا کہ سعیدہ اماں نے اس کی کون سی بات کس طرح انہیں بتائی ہے۔ اس کی مسلسل خاموشی نے ڈاکٹر سبط علی کی پریشانی میں اضافہ کیا۔

"بیٹا! جو بھی بات ہے، آپ مجھے بتا دیں۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"وہ! وہ مجھے بہت اگنور کرتا ہے، ٹھیک سے بات نہیں کرتا مجھ سے۔" اس نے ہمت کر کے کہنا شروع کیا۔

دو جملوں کے بعد اسے سب کچھ بھول گیا۔ جو یاد تھا اسے وہ ڈاکٹر سبط علی کو نہیں بتا سکتی تھی کہ اس نے اتنے دنوں میں اس کی یا اس کے کپڑوں کی تعریف نہیں کی۔ اس کے ساتھ سحری نہیں کی۔ افطاری نہیں کی۔ آفس سے دیر سے آتا ہے۔ صبح اس کو بتائے بغیر گھر سے چلا جاتا ہے۔ اسے اتنے دنوں سے فرقان کے گھر کا کھانا کھلا رہا ہے۔ اور اسے شادی کے دوسرے دن سعیدہ اماں کے پاس چھوڑ گیا۔ ڈاکٹر سبط علی نے اس کی دونوں شکایات پر غور کیے بغیر اس سے کہا۔

"اس نے آپ سے کسی اور شادی کا ذکر کیا ہے؟"

وہ چند لمحوں کے لیے ہونٹ کاٹتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے سعیدہ اماں سے جھوٹ بولا ہے اور یہی وہ جھوٹ تھا جس نے سعیدہ اماں کو اس قدر ناراض کر رکھا تھا۔

"نہیں، سعیدہ اماں کو کچھ غلط فہمی ہو گئی ہوگی۔ ایسا تو کچھ نہیں ہے۔" اس نے سرخ چہرے کے ساتھ تردید کی۔ دوسری طرف فون پر ڈاکٹر سبط علی نے بے اختیار سکون کا سانس لیا۔

"آپ کو پرسوں سعیدہ اماں کے پاس کیوں چھوڑ گیا؟"

انہوں نے دوسرے الزام کے بارے میں کوئی تبصرہ کیے بغیر کہا۔

"جب آپ دونوں ہمارے گھر پر تھے تب تو آپ کا وہاں ٹھہرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ راستے میں آپ لوگوں کا کوئی جھگڑا ہوا؟" انہوں نے اپنے آخری جملے سے امامہ کو جیسے بنا بنایا جواب دیا۔

"جی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ۔۔۔" ڈاکٹر سبط علی بات کرتے کرتے رک گئے۔ وہ سالار کے جس رویے کی منظر کشی کر رہی تھی وہ ان کے لیے نیا تھا۔

"خیر میں ڈرائیور کو بھیجتا ہوں' آپ میری طرف آ جائیں۔ سالار کو بھی افطار پر بلوا لیتے ہیں' پھر میں اس سے بات کرلوں گا۔"

امامہ نے بے اختیار آنکھیں بند کیں۔ اس وقت یہی ایک چیز تھی جو وہ نہیں چاہتی تھی۔

"وہ آج کل بہت دیر سے آفس سے آ رہا ہے۔ کل رات بھی نو بجے آیا' شاید آج نہ آسکے۔" اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"میں فون کر کے پوچھ لیتا ہوں اس سے۔" ڈاکٹر سبط علی نے کہا۔

"جی۔" اس نے بمشکل کہا۔ وہ ان کے کہنے پر آنکھیں بند کر کے کسی سے بھی شادی کرنے پر تیار ہو گیا تھا' وہ افطار کی دعوت پر نہ آنے کے لیے کس مصروفیت کو جواز بناتا؟

وہ جانتی تھی کہ ڈاکٹر سبط علی کو کیا جواب ملنے والا ہے۔ فون بند کر کے وہ بے اختیار اپنے ناخن کاٹنے لگی۔ یہ درست تھا کہ اسے سالار سے شکایتیں تھیں' لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ شادی کے چوتھے ہی دن اس طرح کی کوئی بات ہوتی۔

"ہیلو سویٹ ہارٹ۔" پانچ منٹ بعد اس نے اپنے سیل پر سالار کی چہکتی ہوئی آواز سنی اور اس کے ضمیر نے اسے بری طرح ملامت کیا۔

"بندہ اٹھتا ہے تو کوئی میسج ہی کر دیتا ہے۔ فون کر لیتا ہے۔ یہ تو نہیں کہ اٹھتے ہی میکے جانے کی تیاری شروع کر دے۔" وہ بے تکلفی سے حالات کی نوعیت کا اندازہ لگائے بغیر اسے چھیڑ رہا تھا۔

امامہ کے احساس جرم میں مزید اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر سبط علی نے یقیناً اس سے فی الحال کوئی بات کیے بغیر اسے افطار پر بلایا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب ابھی افطار کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں آج آفس سے جلدی آ جاؤں گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے آؤں گا۔" وہ اسے بتا رہا تھا۔

امامہ کو یک دم کچھ امید بندھی۔ وہ اگر پہلے گھر آ جاتا تو وہ اس سے کچھ بات کر لیتی' کچھ معذرت کر کے اسے ڈاکٹر صاحب کے گھر متوقع صورت حال کے بارے میں آگاہ کر سکتی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہاں' یہ ہو سکتا تھا۔

"لیکن اگر تم جانا چاہو تو میں تمہیں بھجوا دیتا ہوں۔" سالار نے اگلے ہی جملے میں اسے آفر کی۔

"نہیں۔ نہیں میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی۔" امامہ نے بے اختیار کہا۔

"اوکے۔ میں پھر تمہیں بتا دیتا ہوں۔ اور تم کیا کر رہی ہو؟"

اس کا دل چاہا' وہ اس سے کہے کہ وہ اس گڑھے سے نکلنے کی کوشش کر رہی ہے' جو اس نے سالار کے لیے کھودا تھا۔

"فرقان کی ملازمہ آئے گی آج صفائی کرنے کے لیے' عام طور پر تو وہ صبح میرے جانے کے بعد آ کر صفائی کرتی ہے' لیکن تم اس وقت سو رہی ہوتی ہو تو میں نے اسے فی الحال اس وقت آنے سے منع کیا ہے۔ تم بھابھی کو کال کر کے بتا دو' تاکہ وہ اسے کب بھیجیں۔"

وہ شاید اس وقت آفس میں فارغ تھا' اس لیے لمبی بات کر رہا تھا۔

"کچھ تو بولو یار۔ اتنی چپ کیوں ہو؟"

"نہیں۔ وہ۔ میں۔ ایسے ہی۔" وہ اس کے سوال پر بے اختیار گڑبڑائی۔ "تم فری ہو اس وقت؟" اس نے بے

حد محتاط لہجے میں پوچھا۔

اگر وہ فارغ تھا تو وہ ابھی اس سے بات کر سکتی تھی۔

"ہاں! ایویلیو ایشن ٹیم چلی گئی ہے..... کم از کم آج کا دن تو ہم سب بہت ریلیکسڈ ہیں۔ اچھے کمنٹس دے کر گئے ہیں وہ لوگ۔" وہ بڑے مطمئن انداز میں اسے بتا رہا تھا۔

وہ اس کی باتوں پر غور کیے بغیر اس ادھیڑبن میں لگی ہوئی تھی کہ بات کیسے شروع کرے۔

"آج اگر ڈاکٹر صاحب انوائیٹ نہ کرتے تو میں سوچ رہا تھا رات کو کہیں باہر کھانا کھاتے۔ فورٹریس میں انڈسٹریل ایگزیبیشن لگی ہوئی ہے۔ وہاں چلتے۔ بلکہ یہ کریں گے کہ ان کے گھر سے ڈنر کے بعد فورٹریس چلے جائیں گے۔"

چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا محاورہ آج پہلی بار امامہ کی سمجھ میں آیا تھا۔ یہ محاورتاً نہیں کہا گیا تھا۔ واقعی بعض سچویشنز میں چلو بھر پانی بھی ڈوبنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ وہ بات شروع کرنے کے جتن کر رہی تھی اور یہ کیسے کرے یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر میں ذرا ڈاکٹر صاحب کو بتا دوں۔ وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔" اس سے پہلے کہ وہ اسے کچھ کہتی سالار نے بات ختم کرتے ہوئے کال بند کر دی۔ وہ فون ہاتھ میں پکڑے بیٹھی رہ گئی۔



وہ تقریباً چار بجے گھر آیا تھا اور وہ اس وقت تک یہ طے کر چکی تھی کہ اسے اس سے کس طرح بات کرنی ہے۔ سالار اوپر نہیں آیا تھا۔ اس نے فون پر اسے نیچے آنے کے لیے کہا۔ وہ جب گاڑی کے کھلے دروازے سے اندر بیٹھی تو اس نے مسکرا کر سر کے اشارے سے اس کا استقبال کیا۔ وہ فون پر اپنے آفس کے کسی آدمی سے بات کر رہا تھا۔

ہینڈز فری کان سے لگائے ڈاکٹر سبط علی کے گھر کی طرف ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ مسلسل اسی کال میں مصروف رہا۔ امامہ کی جیسے جان پر بن آئی تھی۔ اگر وہ سارے راستے بات کرتا رہا تو۔ ایک سگنل پر رکنے پر اس نے سالار کا کندھا تھپتھپایا اور بے حد خفگی کے عالم میں اسے کال ختم کرنے کا اشارہ کیا۔ نتیجہ فوری طور پر آیا۔ چند منٹ مزید بات کرنے کے بعد سالار نے کال ختم کر دی۔

"سوری۔ ایک کلائنٹ کو کوئی پرابلم ہو رہا تھا۔" اس نے کال ختم کرنے کے بعد کہا۔

"اسلام آباد چلو گی؟" اس کے اگلے جملے نے امامہ کے ہوش اڑا دیے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ہو سکتا تھا۔ کیبنٹ کے چھ ممبرز کے ساتھ پانچ گھنٹے کی طویل نشست کے بعد اسے پندرہ منٹ کا وقفہ لینا پڑا تھا۔ فیصلے کی ذمہ داری اس کے سر تھی۔ آخرکار وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

10۔ الزائمر کے مریض باپ کو وہ اپنے ہاتھوں سے یخنی پلا رہا تھا۔ اس کے انداز میں اپنے باپ کے لیے نہایت پیار، احترام اور تحمل ہے۔ اس کے باپ کو معلوم نہیں کہ وہ اس کے ہاتھ سے آخری بار کھانا کھا رہا ہے۔ اس کا سامان ایئرپورٹ پر جا چکا ہے اور وہ گاڑی کا انتظار کر رہا ہے۔

Q۔ وہ نیلے رنگ کی شفاف جھیل پر اس کے ہمراہ ہے۔ خوب صورت حسین مناظر میں گھری جھیل میں وہ صندل کی لکڑی کی کشتی میں سوار ہے۔

K۔ وہ تیسری منزل پر بنے اپارٹمنٹ کے بیڈ روم کی کھڑکی سے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے ساٹھ فٹ کے فاصلے پر اس بینکوئٹ ہال پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ٹائم ٹو ج کرو منٹ ہو رہے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد وہ مہمان بینکوئٹ ہال میں داخل ہوگا۔ وہ ایک پروفیشنل شوٹر ہے۔ اسے مہمان کو نشانہ بنانے کے لیے ہائر کیا گیا ہے۔

3۔ وہ اس سے اصرار کر رہی ہے کہ نجومی کو ہاتھ دکھایا جائے۔ وہ مسلسل انکار کرتا ہے مگر اس کی خوشی کی خاطر مان لیتا ہے نجومی لڑکی کا ہاتھ دیکھ کر بتاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر شادی کی دو لکیریں ہیں۔ دوسری لکیر مضبوط اور خوشگوار شادی کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ دونوں ساکت رہ جاتے ہیں۔

آدم و حوا

ایک خوب صورت اتفاق نے سالار اور امامہ کو یکجا کر دیا۔ اس نے امامہ کو سال بعد دیکھا تھا۔ ان کی ازدواجی زندگی کا پہلا اختلاف لائٹ پر ہوا۔ سالار کو لائٹ آن کر کے سونے کی عادت تھی جبکہ امامہ کو روشنی میں نیند نہیں آتی تھی۔ لیکن سالار نے امامہ کی بات مان لی۔ صبح وہ امامہ کو جگائے بغیر سحری کر کے نماز پڑھنے چلا جاتا ہے۔ امامہ سحری کے لیے اٹھتی ہے تو فرقان کے گھر سے کھانا آیا رکھا ہوتا ہے۔ امامہ اسے سالار کی بے اعتنائی سمجھتی ہے۔ سعیدہ اماں سے فون پر بات کرتے ہوئے وہ رو پڑتی ہے اور وجہ پوچھنے پر اس کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ سالار کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔ سعیدہ اماں کو سالار پر سخت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کو بھی بتاتی ہیں کہ سالار نے امامہ کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ سالار ڈاکٹر سبط علی کے گھر امامہ کا روکھا رویہ محسوس کرتا ہے سعیدہ اماں بھی سالار کے ساتھ ناراضی سے پیش آتی ہیں۔ پھر امامہ اس رات سعیدہ اماں کے ہی گھر رہ جاتی ہے۔ سالار کو اچھا نہیں لگتا مگر وہ منع نہیں کرتا۔ امامہ کو یہ بھی برا لگتا ہے کہ اس نے ساتھ چلنے پر اصرار نہیں کیا۔ اس کو سالار سے یہ بھی شکوہ ہوتا ہے کہ اس نے اسے منہ دکھائی نہیں دی۔ سالار اپنے باپ سکندر عثمان کو بتا دیتا ہے کہ اس کی شادی آمنہ نامی جس لڑکی سے ہوئی ہے وہ دراصل امامہ ہے۔ سکندر عثمان اور طیبہ سخت پریشان ہو جاتے ہیں۔ امامہ کو فرقان کے گھر روزانہ کھانا کھانے پر بھی اعتراض ہوتا ہے اور سالار کے سی فوڈ کھانے پر بھی۔ سکندر عثمان، طیبہ اور انیتا ان دونوں سے ملنے آتے ہیں اور امامہ سے بہت پیار سے ملتے ہیں۔ وہ سالار کا ولیمہ اسلام آباد میں کرنے کے بجائے اب لاہور میں کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ ڈاکٹر سبط امامہ سے سالار کے ناروا سلوک کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو وہ شرمندہ ہی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنی اس نے بنا ڈالی تھی۔ سالار امامہ سے اسلام آباد چلنے کو کہتا ہے۔ تو امامہ خوف زدہ ہو جاتی ہے۔

تیسری قسط

"اسلام آباد چلوگی؟" اس کے اگلے جملے نے امامہ کے ہوش اڑا دیے۔
وہ سب کچھ، جو وہ سوچ کر آئی تھی اس کے ذہن سے غائب ہو گیا۔

"اسلام آباد؟" اس نے بے حد بے یقینی سے سالار کو دیکھا۔
"ہاں میں اس ویک اینڈ پر جا رہا ہوں۔" سالار نے بڑے نارمل انداز میں کہا۔
"لیکن میں... میں کیسے جا سکتی ہوں؟" وہ بے اختیار اٹکی۔ "تمہارے پاپا تو تمہیں منع کر کے گئے ہیں کہ مجھے اپنے ساتھ اسلام آباد نہ لے کر آنا۔" "پھر؟" سالار نے اس کی بات کاٹی۔
"ہاں... اور اب وہی کہہ رہے ہیں کہ اگر میں تمہیں ساتھ لانا چاہوں تو لے آؤں۔" اس نے بڑی روانی سے کہا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔
"میری فیملی کو پتا لگ سکتا ہے۔" اس نے لمبی خاموشی کے بعد بالآخر کہا۔
"آج یا کل تو پتا لگنا ہی ہے۔" سالار نے اسی انداز میں کہا۔ "یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں ساری عمر تمہیں چھپا کر رکھوں۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ "تمہاری فیملی نے تمہارے بارے میں لوگوں سے کہا ہے کہ تم شادی کے بعد بیرون ملک سیٹل ہو گئی ہو۔ اب اتنے سالوں کے بعد تمہارے حوالے سے کچھ کریں گے تو خود انہیں بھی ایمبیرسمنٹ ہو گی۔ اس لیے مجھے نہیں لگتا کہ وہ کچھ کریں گے۔" وہ مطمئن تھا۔
"تم انہیں نہیں جانتے' انہیں پتا چل گیا تو وہ چپ نہیں بیٹھیں گے۔" وہ پریشان ہونے لگی تھی۔
"وہاں ہم کبھی کبھار جایا کریں گے' خاموشی سے جائیں گے اور آ جایا کریں گے۔ یار! اتنا سوشلائز نہیں کریں گے وہاں۔" وہ اس کی بے فکری سے چڑی۔
"انہیں پتا چلا تو وہ مجھے لے جائیں گے... وہ مجھے مار ڈالیں گے۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔
"فرض کرو امامہ! اگر انہیں اتفاقاً تمہارے بارے میں پتا چلتا ہے یا یہاں لاہور میں تمہیں کوئی دیکھ لیتا ہے' تمہیں کوئی نقصان پہنچاتے ہیں تو...؟"
"نہیں پتا چلے گا' میں کبھی باہر جاؤں گی ہی نہیں۔" اس نے بے ساختہ کہا۔
"تمہارا دم نہیں گھٹے گا اس طرح...؟" اس نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔
اس کی آنکھوں میں مسیحا جیسی ہمدردی تھی۔
"مجھے عادت ہو گئی ہے سالار... اتنا ہی سانس لینے کی... مجھے فرق نہیں پڑتا۔ جب میں جاب نہیں کرتی تھی تو مہینوں گھر سے نہیں نکلتی تھی... میں اتنے سالوں سے لاہور میں ہوں لیکن میں نے یہاں بازاروں' پارکس اور ریسٹورنٹس کو صرف سڑک پر سفر کرتے ہوئے باہر سے دیکھا ہے یا ٹی وی اور نیوز پیپرز میں۔ میں اگر اب ان جگہوں پر جاؤں تو میری سمجھ میں ہی نہیں آئے گا کہ مجھے وہاں کرنا کیا ہے۔ جب ملتان میں تھی تو بھی ہاسٹل اور کالج کے علاوہ دوسری کوئی جگہ نہیں تھی میری زندگی میں۔ اب لاہور آئی تو یہاں بھی پہلے یونیورسٹی اور گھر... اور اب گھر... مجھے ان کے علاوہ دوسری ساری جگہیں عجیب سی لگتی ہیں۔ مہینے میں ایک بار میں سعیدہ اماں کے گھر کے پاس ایک چھوٹی سی مارکیٹ میں ان کے ساتھ جاتی تھی' وہ میری واحد آؤٹنگ ہوتی تھی۔ وہاں ایک بک شاپ تھی... میں پورے مہینے کے لیے بکس لے لیتی تھی وہاں سے... کتاب کے ساتھ وقت گزارنا آسان ہوتا ہے۔"
وہ پتا نہیں اسے کیوں بتاتی گئی۔
"ہاں' وقت گزارنا آسان ہوتا ہے' زندگی گزارنا نہیں۔"
اس نے ایک بار پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا' وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔
"مجھے فرق نہیں پڑتا سالار..."
"مجھے فرق پڑتا ہے... اور بہت فرق پڑتا ہے۔" سالار نے بے اختیار اس کی بات کاٹی۔ "میں ایک نارمل

زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔۔۔ جیسی کبھی تمہاری زندگی تھی۔ تم نہیں چاہتیں یہ سب کچھ ختم ہو جائے۔۔۔؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"ابنارمل لائف ہی سہی لیکن میں سیف ہوں۔"

سالار نے بے اختیار اس کے کندھوں پر اپنا بازو پھیلایا۔

"تم اب بھی سیف رہو گی۔۔۔ ٹرسٹ می۔۔۔ کچھ نہیں ہوگا۔۔۔ میری فیملی تمہیں پروٹیکٹ کر سکتی ہے اور اگر تمہاری فیملی کو اب یہ پتا چلتا ہے کہ تم میری بیوی ہو تو اتنا آسان نہیں ہوگا ان کے لیے تمہیں نقصان پہنچانا۔ جو بھی ہونا ہے ایک بار کھل کر ہو جائے۔ تمہیں اس طرح چھپا کر رکھوں اور انہیں کسی طرح علم ہو جائے تو وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں ایسی صورت میں، میں پولیس کے پاس جا کر بھی کچھ نہیں کر سکوں گا۔ وہ صاف انکار کر دیں گے کہ تم تو سال سے غائب ہو اور وہ تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" وہ خاموش رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" سالار نے بولتے بولتے اس کی خاموشی نوٹس کی۔

"مجھے تمہارے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔۔۔ کسی کے ساتھ بھی نہیں کرنا چاہیے تھی۔۔۔ میں نے اپنے ساتھ تمہیں بھی مصیبت میں ڈال دیا۔ یہ ٹھیک نہیں ہوا۔" وہ بے حد اپ سیٹ ہو گئی۔

"ہاں اگر تم کسی اور کے ساتھ شادی کرتیں تو یہ واقعی ان فیئر ہوتا لیکن میری کوئی بات نہیں۔ میں نے تو خیر پہلے بھی تمہاری فیملی کی بہت گالیاں اور بددعائیں لی ہیں اب پھر سہی۔" وہ بڑی لاپروائی سے کہہ رہا تھا۔

"تو پھر سیٹ بک کروا دوں تمہاری؟" وہ واقعی ڈھیٹ تھا۔ وہ چپ بیٹھی رہی۔

"کچھ نہیں ہوگا امامہ۔۔۔ مارک مائی ورڈز۔" سالار نے اسٹیئرنگ سے ایک ہاتھ اٹھا کر اس کے کندھوں پر پھیلاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"تم کوئی ولی نہیں ہو۔" اس نے خفگی سے کہا۔

اس کے کندھوں سے بازو ہٹاتے ہوئے وہ بے اختیار ہنسا۔

"اچھا میں نے کب کہا کہ میں ولی ہوں۔ میں تو شاید انسان بھی نہیں ہوں۔"

اس کے اس جملے پر اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اب ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے اپنے چہرے پر امامہ کی نظریں محسوس کیں۔ "ویسے ہی پاپا چاہتے ہیں ہم وہاں آئیں۔"

امامہ نے اس بار جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔

* * *

اس شام سالار کو ڈاکٹر سبط علی اور ان کی بیوی کچھ سنجیدہ لگے تھے اور اس سنجیدگی کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ امامہ بھی کھانے کے دوران بالکل خاموش رہی تھی لیکن اس نے اس کی خاموشی کو گاڑی میں ہونے والی گفتگو کا نتیجہ سمجھا۔

وہ لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے جب ڈاکٹر سبط علی نے اس موضوع کو چھیڑا۔

"سالار! امامہ کو کچھ شکایتیں ہیں آپ سے۔" وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے ٹھٹکا۔ یہ بات اگر ڈاکٹر سبط علی نے نہ کہی ہوتی تو وہ اسے مذاق سمجھتا۔ اس نے کچھ حیرانی کے عالم میں ڈاکٹر سبط علی کو دیکھا پھر اپنے برابر میں بیٹھی امامہ کو۔ وہ چائے کا کپ اپنے گھٹنے پر رکھے چائے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال گاڑی

میں ہونے والی گفتگو کا آیا لیکن امامہ نے کس وقت ڈاکٹر صاحب کو گاڑی میں ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا تھا۔۔۔؟ وہ بے حد حیران ہوا۔

"جی۔۔۔!" اس نے کپ واپس پرچ میں رکھ دیا۔

"امامہ آپ کے رویے سے ناخوش ہیں۔" ڈاکٹر سبط علی نے اگلا جملہ بولا۔

سالار کو لگا اسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔

"جی۔۔۔" اس نے بے اختیار کہا۔ "میں سمجھا نہیں۔"

"آپ امامہ پر طنز کرتے ہیں۔۔۔؟" وہ پلکیں جھپکے بغیر ڈاکٹر سبط علی کو دیکھتا رہا۔ بمشکل سانس لے کر چند لمحوں بعد اس نے امامہ کو دیکھا۔

"یہ آپ سے امامہ نے کہا؟" اس نے اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے ڈاکٹر سبط علی سے کہا۔

"ہاں' آپ اس سے ٹھیک سے بات نہیں کرتے۔"

سالار نے گردن موڑ کر ایک بار پھر امامہ کو دیکھا۔ وہ اب بھی نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

"یہ بھی آپ سے امامہ نے کہا؟" اس کے لوجیسے چودہ طبق روشن ہو رہے تھے۔

ڈاکٹر سبط علی نے سر ہلایا۔ سالار نے بے اختیار اپنے ہونٹ کا ایک کونا کاٹتے ہوئے چائے کا کپ سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس کا ذہن بری طرح چکرا گیا تھا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے پریشان کن صورت حال میں سے ایک تھی۔

امامہ نے چائے کے کپ سے اٹھتی بھاپ پر نظریں جمائے بے حد شرمندگی اور پچھتاوے کے عالم میں اس کو گلا صاف کرتے ہوئے کہتے سنا۔ "اور۔۔۔؟"

جو کچھ ہو رہا تھا' یہ امامہ کی خواہش نہیں تھی حماقت تھی' لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

"اور یہ کہ آپ نہیں جانتے ہوئے اسے انفارم نہیں کرتے پر سوں آپ جھگڑا کرنے کے بعد اسے سعیدہ بہن کی طرف چھوڑ گئے تھے۔" اس بار سالار نے پہلے کلثوم آنٹی کو دیکھا پھر ڈاکٹر سبط علی کو۔۔۔ پھر امامہ کو۔۔۔ اگر آسمان اس کے سر پر آگرتا تب بھی اس کی یہ حالت نہ ہوتی جو اس وقت ہوئی تھی۔

"جھگڑا۔۔۔ ہمارا تو کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔" اس نے بمشکل اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہنا شروع کیا تھا۔

"اور امامہ نے خود مجھ سے کہا تھا کہ وہ سعیدہ اماں کے گھر رہنا چاہتی ہے اور میں تو پچھلے چار دنوں سے نہیں۔" وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔

اس نے امامہ کی سسکی سنی تھی۔ اس نے بے اختیار گردن موڑ کر امامہ کو دیکھا' وہ اپنی ناک رگڑ رہی تھی۔

کلثوم آنٹی اور ڈاکٹر صاحب بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ سالار بات جاری نہیں رکھ سکا۔ کلثوم آنٹی اٹھ کر اس کے پاس آکر اسے دلاسا دینے لگیں۔ وہ ہکا بکا بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر سبط علی نے ملازم کو پانی لانے کے لیے کہا۔

سالار کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا لیکن اس وقت وہاں اپنی صفائیاں دینے اور وضاحت کرنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا' وہ الو کا پٹھا ہے کیونکہ پچھلے چار دن سے اس کی چھٹی حس جو سگنلز بار بار دے رہی تھی' وہ بالکل ٹھیک تھے۔ صرف اس نے خوش فہمی اور لاپروائی کا مظاہرہ کیا تھا۔

پانچ دس منٹ کے بعد سب کچھ نارمل ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب تقریباً آدھے گھنٹے تک سالار کو سمجھاتے رہے۔ وہ خاموشی سے سر ہلاتے ہوئے ان کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے برابر بیٹھی امامہ کو بے حد ندامت ہو رہی تھی۔ اس کے بعد سالار کا اکیلے میں سامنا کرنا کتنا مشکل تھا' یہ اس سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ دونوں وہاں سے رخصت ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی ڈاکٹر سبط علی کے گھر کے گیٹ

سے باہر نکلتے ہی امامہ نے اسے کہتے سنا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا۔ میں یقین نہیں کر سکتا۔"

اسے اس سے اسی رد عمل کی توقع تھی۔ وہ ونڈ اسکرین سے نظر آتی ہوئی سڑک پر نظریں جمائے بیٹھی اس وقت بے حد نروس ہو رہی تھی۔

"میں تم پر طنز کرتا ہوں۔۔۔ تم سے ٹھیک سے بات نہیں کرتا۔۔۔ تمہیں بتائے بغیر جاتا ہوں۔۔۔ تمہیں سعیدہ اماں کے گھر چھوڑ گیا تھا۔۔۔ جھگڑا کیا۔۔۔ تم نے ان لوگوں سے جھوٹ بولا؟"

امامہ نے بے اختیار اسے دیکھا۔ وہ جھوٹ کا لفظ استعمال نہ کرتا تو اسے اتنا برا نہ لگتا۔

"میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔" اس نے بے حد خفگی سے کہا۔

"میں تم پر طنز کرتا ہوں؟" سالار کی آواز میں تیزی آگئی۔

"تم نے اس رات میری اندھیرے میں سونے کی عادت کو "عجیب" کہا۔" وہ بے یقینی سے اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

"وہ طنز تھا؟ وہ تو بس ایسے ہی ایک بات تھی۔"

"مگر مجھے اچھی نہیں لگی۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

"تم نے بھی تو جواباً میری روشنی میں سونے کی عادت کو عجوبہ کہا تھا۔" وہ اس بار چپ رہی۔ سالار واقعی بہت زیادہ ناراض ہو رہا تھا۔

"اور میں تم سے ٹھیک سے بات نہیں کرتا۔۔۔؟" وہ اگلے الزام پر آیا۔

"مجھے لگا تھا۔" اس نے اس بار مدافعانہ انداز میں کہا۔

"لگا تھا۔۔۔؟" وہ مزید خفا ہوا۔ "تمہیں صرف "لگا" اور تم نے سیدھا ڈاکٹر صاحب سے جا کر کہہ دیا۔"

"میں نے ان سے کچھ نہیں کہا، سعیدہ اماں نے سب کچھ کہا تھا۔" اس نے وضاحت کی۔

وہ چند لمحے صدمے کے مارے کچھ بول ہی نہیں سکا۔

"یعنی تم نے ان سے بھی یہ سب کچھ کہا ہے؟" وہ چپ رہی۔

وہ ہونٹ کاٹنے لگا۔ اسے اب سعیدہ اماں کی اس رات کی بے رخی کی وجہ سمجھ میں آرہی تھی۔

"اور میں کہاں جاتا ہوں جس کے بارے میں میں نے تمہیں نہیں بتایا۔۔۔؟" سالار کو یاد آیا۔

"تم سحری کے وقت مجھے بتا کر گئے؟" سالار اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔

"امامہ! میں مسجد جاتا ہوں اس وقت فرقان کے ساتھ۔ اس کے بعد جم اور پھر واپس گھر آجاتا ہوں۔ اب میں مسجد بھی تمہیں بتا کر جایا کروں؟" وہ جھنجلایا تھا۔

"مجھے کیا پتا تم اتنی صبح کہاں جاتے ہو۔۔۔ مجھے تو اپ سیٹ ہونا ہی تھا۔" امامہ نے کہا۔

اس کی وضاحت پر وہ مزید تپ گیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں رمضان میں سحری کے وقت کہاں جا سکتا ہوں۔۔۔؟ کسی نائٹ کلب۔۔۔؟ یا کسی گرل فرینڈ سے ملنے۔۔۔؟ کوئی احمق بھی جان سکتا ہے کہ میں کہاں جا سکتا ہوں۔" وہ احمق کے لفظ پر بری طرح تلملائی۔

"ٹھیک ہے، میں واقعی احمق ہوں۔۔۔ بس۔"

"اور سعیدہ اماں کے گھر میں رہنے کا تم نے کہا تھا۔۔۔ کہا تھا نا۔۔۔ اور کون سا جھگڑا ہوا تھا تمہارا؟"

وہ خاموش رہی۔

"اتنے زیادہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی تمہیں؟" وہ اس بار اس کی بات پر روہانسی ہو گئی۔
"بار بار مجھے جھوٹا مت کہو۔"
"امامہ! جو جھوٹ ہے' میں اسے جھوٹ ہی کہوں گا۔ تم نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ کیا سوچ رہے ہوں گے وہ میرے بارے میں..." وہ واقعی بری طرح اپ سیٹ تھا۔
"اچھا اب یہ سب ختم کرو۔" اس نے امامہ کے گالوں پر یک دم بہنے والے آنسو دیکھ لیے تھے اور وہ بری طرح جھنجلایا تھا۔ "ہم جس ایشو پر "بات" کر رہے ہیں امامہ! اس میں رونے دھونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ روتی رہی۔
"یہ ٹھیک نہیں ہے امامہ!... تم نے ڈاکٹر صاحب کے گھر بھی یہی کیا تھا میرے ساتھ۔"
اس کا غصہ ٹھنڈا پڑنے لگا تھا لیکن جھنجلاہٹ بڑھ گئی تھی۔ وہ جو بھی تھا' وہ اس کی شادی کا چوتھا دن تھا اور وہ ایک گھنٹے میں دوسری بار یوں زارو قطار رو رہی تھی۔ اس کی جگہ کوئی بھی لڑکی یوں رو رہی ہوتی تو وہ پریشان ہوتا' یہ تو خیر امامہ تھی۔ وہ بے اختیار نرم پڑا۔ اس کے کندھے پر اپنا بازو پھیلا کر اس نے جیسے اسے چپ کروانے کی کوشش کی۔ امامہ نے ڈیش بورڈ پر پڑے ٹشو باکس سے ایک ٹشو پیپر نکال کر اپنی سرخ ہوتی ہوئی ناک کو رگڑا اور سالار کی صلح کی کوششوں پر پانی پھیرتے ہوئے کہا۔
"میں اسی لیے تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی' مجھے پتا تھا' تم میرے ساتھ اسی طرح کا سلوک کرو گے۔"
وہ اس کے جملے پر ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا پھر اس نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔
"کیسا سلوک... تم وضاحت کرو گی؟" اس کے لہجے میں پھر خفگی اتر آئی "میں نے آخر کیا کیا ہے تمہارے ساتھ۔"
وہ ایک بار پھر ہچکیوں سے رونے لگی۔ سالار نے بے بسی سے اپنی آنکھیں بند کیں۔ وہ ڈرائیونگ نہ کر رہا ہوتا تو یقیناً "سر" بھی پکڑ لیتا۔ باقی راستے دونوں میں کوئی بھی بات نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد وہ بالآخر چپ ہو گئی۔ سالار نے سکون کا سانس لیا۔
اپارٹمنٹ میں آکر بھی دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ بیڈ روم میں جانے کے بجائے لاؤنج کے ایک صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ سالار بیڈ روم میں چلا گیا۔ وہ کپڑے بدل کر بیڈ روم میں آیا' وہ تب بھی اندر نہیں آئی تھی۔ "اچھا ہے' اسے بیٹھ کر اپنے رویے کے بارے میں کچھ دیر سوچنا چاہیے...." اس نے اپنے بیڈ پر لیٹتے ہوئے سوچا۔ وہ سونا چاہتا تھا اور اس نے بیڈ روم کی لائٹس آف نہیں کی تھیں لیکن بیڈ روم اس کی آنکھوں سے غائب ہو گئی تھی۔ اب ٹھیک ہے' بندہ سوچے لیکن اتنا بھی کیا سوچنا۔ مزید پانچ منٹ گزرنے کے باوجود اس کے نمودار نہ ہونے پر وہ بے اختیار جھنجلایا۔ دو منٹ مزید گزرنے کے بعد وہ بیڈ روم سے نکل آیا۔
وہ لاؤنج کے صوفے کے ایک کونے میں دونوں پاؤں اوپر رکھے' کشن گود میں لیے بیٹھی تھی۔ سالار نے سکون کا سانس لیا۔ کم از کم وہ اس وقت رو نہیں رہی تھی۔ سالار کے لاؤنج میں آنے پر اس نے سر اٹھا کر بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بس اسی طرح کشن کو گود میں لیے اس کے دھاگے کھینچتی رہی۔ وہ اس کے پاس صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ کشن کو ایک طرف رکھتے ہوئے امامہ نے بے اختیار صوفے سے اٹھنے کی کوشش کی۔ سالار نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روکا۔
"یہیں بیٹھو۔" اس نے تحکمانہ انداز میں اس سے کہا۔
اس نے ایک لمحے کے لیے بازو چھڑانے کا سوچا' پھر ارادہ بدل دیا۔ وہ دوبارہ بیٹھ گئی لیکن اس نے اپنے بازو سے سالار کا ہاتھ ہٹا دیا۔

"میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ لیکن آئی ایم سوری۔" اس نے مصالحت کی پہلی کوشش کا آغاز کیا۔
امامہ نے خفگی سے اسے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ وہ کچھ دیر اس کے بولنے کا منتظر رہا لیکن پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ فی الحال اس کی معذرت قبول کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔
"تمہیں یہ کیوں لگا کہ میں تم سے ٹھیک سے بات نہیں کر رہا۔۔۔؟ امامہ! میں تم سے بات کر رہا ہوں۔" اس نے اس کے خاموش رہنے پر کہا۔
"تم مجھے اگنور کرتے رہے۔" ایک لمحے توقف کے بعد اس نے بالآخر کہا۔
"اگنور؟" وہ بھونچکا رہ گیا۔ "میں؟ تمہیں۔۔۔ تمہیں "اگنور" کرتا رہا۔۔۔ میں کر سکتا ہوں؟" اس نے بے یقینی سے کہا۔ امامہ نے اس سے نظریں نہیں ملائیں۔
"تم سوچ بھی کیسے سکتی ہو یہ۔۔۔؟ تمہیں "اگنور" کرنے کے لیے شادی کی تھی میں نے تم سے؟ تمہیں اگنور کرنے کے لیے اتنے سالوں سے خوار ہوتا پھر رہا ہوں میں؟"
"لیکن تم کرتے رہے۔" وہ اپنی بات پر مصر تھی۔ "تم زبان سے ایک بات کہتے ہو لیکن تم۔" وہ بات کرتے کرتے رکی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ "تمہاری زندگی میں میری کوئی۔۔۔ کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔"
"رکو مت کہتی رہو۔۔۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ میں ایسا کیا کر رہا ہوں جس سے تمہیں میرے بارے میں اتنی غلط فہمیاں ہو رہی ہیں۔" اس نے اس کی آنکھوں کی نمی کو نظر انداز کرتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔
"میں نے تمہیں میسج جاتے ہوئے نہیں بتایا۔۔۔ آفس جاتے ہوئے بھی نہیں بتایا۔ اور؟" اس نے گفتگو شروع کرنے کے لیے اسے کیو دی۔
"تم نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ تم افطار پر دیر سے آؤ گے۔ تم چاہتے تو جلدی بھی آ سکتے تھے۔" وہ رکی۔
"اور۔۔۔؟" سالار نے کوئی وضاحت کیے بغیر کہا۔
"میں نے تمہارے کہنے کے مطابق تمہیں میسج کیا لیکن تم نے مجھے کال نہیں کی۔ اپنے پیرنٹس کو ریسیو کرنے یا چھوڑنے کے لیے تم مجھے بھی ایئرپورٹ لے جا سکتے تھے لیکن تم نے مجھ سے نہیں کہا۔ ٹھیک ہے میں نے کہا تھا کہ مجھے سعیدہ اماں کے گھر چھوڑ دو لیکن تم نے ایک بار بھی مجھے ساتھ چلنے کے لیے نہیں کہا۔ میری کتنی بے عزتی ہوئی ان کے سامنے۔"
وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔
وہ پلک جھپکے بغیر یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ پانی اب اس کی آنکھوں سے ہی نہیں ناک سے بھی بہنے لگا تھا۔ وہ پوری دل جمعی سے رو رہی تھی۔ سالار نے سینٹر ٹیبل کے ٹشو باکس سے ایک ٹشو پیپر نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے اس کا ہاتھ جھٹک کر خود ایک ٹشو پیپر نکال لیا۔ اس نے ناک رگڑتی تھی۔ "تمہیں نہیں۔"
"اور۔۔۔؟" سالار نے بڑے تحمل کے ساتھ ایک بار پھر کہا۔
وہ کہنا چاہتی تھی کہ اس نے اسے شادی کا کوئی گفٹ تک نہیں دیا۔ اس کی ایک دکھتی رگ یہ بھی تھی لیکن اس سے تحفے کا ذکر کرنا اسے اپنی توہین لگی۔ اس نے تحفے کا ذکر نہیں کیا۔ کچھ دیر وہ اپنی ناک رگڑتی سسکیوں کے ساتھ روتی رہی۔ سالار نے بالآخر اس سے پوچھا۔
"بس یا ابھی کچھ اور بھی جرم ہیں میرے؟"
"مجھے پتا تھا کہ تم شادی کے بعد میرے۔۔۔"
سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔
"ساتھ یہی کرو گے۔۔۔ مجھے پتا ہے، تمہیں میرے بارے میں سب کچھ پہلے سے ہی پتا چل جاتا ہے۔" وہ اس

کے جملے پر بری طرح چڑا تھا۔ "اس کے باوجود اب تم مجھے کچھ کہنے کا موقع دو گی۔۔۔؟" وہ چپ بیٹھی اپنی ناک رگڑتی رہی۔

"اگر میں شادی کے اگلے دن آفس سے جلدی آسکتا تو آجاتا' آج آیا ہوں نا جلدی۔"

"تم اپنے پیرنٹس کے لیے تو آگئے تھے۔" امامہ نے مداخلت کی۔

"اس دن میری پریزنٹیشن نہیں تھی اور میں نے تمہیں کال کی تھی۔ ایک بار نہیں کئی بار۔۔۔ تم اپنا سیل فون دیکھو یا میں دکھاؤں۔" سالار نے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔

"میرے میسج کرنے پر تو نہیں کی تھی نا؟"

"اس وقت میں میٹنگ میں تھا' میرا سیل میرے پاس نہیں تھا۔ بورڈ روم سے نکل کر پہلی کال میں نے تمہیں ہی کی تھی' ریسیو کرنا تو ایک طرف تم نے توجہ تک نہیں دی۔ میں نے سعیدہ اماں کے گھر بھی تمہیں کالز کیں' تم نے وہاں بھی یہی کیا بلکہ سیل ہی آف کر دیا۔ تو مجھے بھی ناراض ہونا چاہیے تھا' مجھے کہنا چاہیے تھا کہ تم مجھے اگنور کر رہی ہو لیکن میں نے تو ایسا نہیں کیا۔ میں نے تو سوچا تک نہیں اس چیز کے بارے میں۔" وہ اب اسے سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا۔

"تمہیں اپنے ساتھ ایئرپورٹ لے کر جانا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ ایئرپورٹ ایک طرف ہے۔۔۔ بیچ میں میرا آفس ہے۔۔۔ اور دوسری طرف گھر۔۔۔ میں پہلے یہاں آتا۔۔۔ تمہیں لے کر پھر ایئرپورٹ جاتا' کتنا ٹائم لگتا۔۔۔ اور تمہارے لیے انہیں ایئرپورٹ جا کر ریسیو کرنا ضروری بھی نہیں تھا۔" وہ ایک لمحہ کے لیے رکا پھر بولا۔

"اب میں شکایت کروں تم سے؟"

امامہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تم نے سعیدہ اماں کے گھر پر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا' مجھ سے پوچھنے کی زحمت تک نہیں کی۔" اس کی آنکھوں میں سیلاب کا ایک نیا ریلا آیا۔

"میرا خیال تھا' تم مجھے وہاں رہنے ہی نہیں دو گے' لیکن تم تو تنگ آئے ہوئے تھے مجھ سے۔۔۔ تم نے مجھے ایک بار بھی ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔"

سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

"مجھے کیا پتا تھا۔ میں نے سوچا کہ تمہاری خواہش ہے' مجھے پوری کرنی چاہیے۔ چلو ٹھیک ہے' میری غلطی تھی۔ مجھے کہنا چاہیے تھا تمہیں چلنے کے لیے' لیکن تم از کم تمہیں مجھے خدا حافظ کہنے کے لیے باہر تک تو آنا چاہیے تھا۔ میں پندرہ منٹ صحن میں کھڑا انتظار کرتا رہا لیکن تم نے ایک منٹ کے لیے بھی باہر آنے کی زحمت نہیں کی۔

"میں ناراض تھی اس لیے نہیں آئی۔"

"ناراضی میں بھی کوئی فارمیلٹی تو ہوتی ہے نا۔۔۔؟" وہ خاموش رہی۔

"تم نے فرقان کے حوالے سے ضد کی کہ مجھے وہاں نہیں جانا۔ خواہ مخواہ کی ضد تھی۔ مجھے برا لگا تھا لیکن میں نے تمہیں اپنی بات ماننے پر مجبور نہیں کیا۔" وہ ایک لمحہ کے لیے رکا۔ "فرقان میرا سب سے زیادہ کلوز فرینڈ ہے۔ فرقان اور بھابھی نے ہمیشہ میرا بہت خیال رکھا ہے اور یہ میرے لیے قابل قبول نہیں ہے کہ میری وائف اس فیملی کی عزت نہ کرے۔"

اس کی آنکھوں میں امڈتے سیلاب کے ایک اور ریلے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے کہا۔ امامہ نے اس بار کوئی وضاحت نہیں دی تھی۔

"میں نے تم سے یہ گلہ بھی نہیں کیا کہ تم نے میرے پیرنٹس کو ایک دفعہ بھی کال کر کے یہ نہیں پوچھا کہ وہ ٹھیک سے پہنچ گئے یا ان کی فلائٹ ٹھیک رہی۔" وہ بڑے تحمل سے کہہ رہا تھا۔ وہ جز بز ہوئی۔
"میرے پاس ان کا نمبر نہیں ہے۔"
"تم مجھ سے لے لیتیں اگر تم واقعی ان سے بات کرنے میں انٹرسٹڈ ہوتیں۔ وہ تمہارے لیے یہاں آئے تھے تو تمہاری اتنی ذمہ داری تو بنتی تھی ناکہ تم ان کی فلائٹ کے بارے میں ان سے پوچھتیں یا ان کے جانے کے بعد ان سے بات کرتیں۔"
"تو تم مجھ سے کہہ دیتے۔ کیوں نہیں کہا...؟"
"میں نے اس لیے نہیں کہا کیونکہ یہ میرے نزدیک کوئی ایشوز نہیں ہیں، یہ معمولی باتیں ہیں۔ یہ ایسے ایشوز نہیں ہیں کہ جن پر میں تم سے ناراض ہوتا پھروں یا جھگڑا کروں۔" وہ بول نہیں سکی۔
"لیکن تم نے یہ کیا کہ میرے خلاف کیس تیار کرتی رہیں... ہر چھوٹی بڑی بات دل میں رکھتی رہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں کی... لیکن سعیدہ اماں کو سب کچھ بتایا... اور ڈاکٹر صاحب کو بھی... کسی دوسرے سے بات کرنے سے پہلے تمہیں مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی... کرنی چاہیے تھی نا...؟"
اس کے آنسو تھمنے لگے۔ وہ اسے بڑے تحمل سے سمجھا رہا تھا۔
"اگر میں تمہاری بات نہ سنتا تو اور بات تھی۔ پھر تم کہیں کسی سے بھی، مجھے اعتراض نہ ہوتا۔" وہ خاموش رہی۔ اس کی بات کچھ غلط بھی نہیں تھی۔
"تم سو نہ رہی ہوتیں تو میں یقیناً تمہیں بتا کر ہی گھر سے نکلتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں، لیکن ایک سوئے ہوئے بندے کو صرف یہ بتانے کے لیے اٹھاؤں کہ میں جا رہا ہوں، یہ تو میں کبھی نہیں کر سکتا۔"
وہ کچھ بول نہ سکی۔
"اگنور...؟ میں حیران ہوں امامہ کہ یہ خیال تمہارے دماغ میں کیسے آ گیا۔ میں چار دن سے ساتویں آسمان پر ہوں اور تم کہہ رہی ہو میں تمہیں اگنور کر رہا ہوں۔"
"لیکن تم نے ایک بار بھی میری تعریف نہیں کی۔" امامہ کو ایک اور "خطا" یاد آئی۔
سالار نے چونک کر اسے دیکھا۔
"کس چیز کی تعریف...؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ یہ ایک بے حد احمقانہ سوال تھا لیکن اس سوال نے امامہ کو شرمندہ کیا تھا۔
"اب یہ بھی میں بتاؤں؟" وہ بری طرح بگڑی تھی۔
"تمہاری خوب صورتی کی؟" سالار نے کچھ الجھ کر اندازہ لگایا۔ وہ مزید خفا ہوئی۔
"میں کب کہہ رہی ہوں خوب صورتی کی کرو... کسی بھی چیز کی تعریف کر دیتے، میرے کپڑوں کی کر دیتے۔"
اس نے کہہ تو دیا لیکن وہ یہ شکایت کرنے پر پچھتائی۔ سالار کے جوابی سوالوں نے اسے بری طرح شرمندہ کیا تھا۔ سالار نے ایک نظر اسے، پھر اس کے کپڑوں کو دیکھ کر ایک گہرا سانس لیا اور بے اختیار ہنسا۔
"امامہ! تم مجھے اپنے منہ سے اپنی تعریف کرنے کے لیے کہہ رہی ہو۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ جیسے اس کے لیے مذاق تھا۔ وہ بری طرح جھینپ گئی۔
"مت کرو، میں نے کب کہا ہے۔"
"نہیں یو آر رائٹ۔ میں نے واقعی ابھی تک تمہیں کسی بھی چیز کے لیے نہیں سراہا، مجھے کرنا چاہیے تھا۔" وہ یک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے امامہ کی شرمندگی محسوس کر لی تھی۔

اس کے کندھے پر بازو پھیلاتے ہوئے اس نے امامہ کو اپنے قریب کیا۔ اس بار امامہ نے اس کا ہاتھ نہیں جھٹکا تھا۔ اس کے آنسو اب تھم چکے تھے۔ سالار نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ اس کے ہاتھ کو بڑی نرمی کے ساتھ سہلاتے ہوئے بولا۔

"ایسی شکایتیں وہاں ہوتی ہیں، جہاں صرف چند دن کا ساتھ ہو لیکن جہاں زندگی بھر کی بات ہو وہاں یہ سب کچھ بہت سیکنڈری ہو جاتا ہے۔" اسے اپنے ساتھ لگائے وہ بہت نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

"تم سے شادی میرے لیے بہت معنی رکھتی "تھی" اور معنی رکھتی "ہے"۔ لیکن آئندہ بھی کچھ معنی رکھے گی" اس کا انحصار تم پر ہے۔ مجھ سے جو گلہ ہے اسے مجھ سے کرو، دوسروں سے نہیں۔ میں صرف تم کو جوابدہ ہوں امامہ! کسی اور کے سامنے نہیں۔" اس نے بڑے نپے تلے لفظوں میں اسے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"ہم کبھی دوست نہیں تھے لیکن دوستوں سے زیادہ بے تکلفی اور صاف گوئی رہی ہے ہمارے تعلق میں۔ شادی کا رشتہ اسے کمزور کیوں کر رہا ہے؟"

امامہ نے نظر اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ اسے اس کی آنکھوں میں بھی وہی سنجیدگی نظر آئی جو اس کے لفظوں میں تھی۔ اس نے ایک بار پھر سر جھکا لیا۔ "وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا" اس کے دل نے اعتراف کیا۔

"تم میری زندگی میں ہر شخص اور ہر چیز سے، بہت زیادہ امپورٹینس رکھتی ہو۔" سالار نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ ایک جملہ میں تمہیں ہر روز نہیں کہہ پاؤں گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرے لیے تمہاری امپورٹنس کم ہو گئی ہے۔ میری زندگی میں تمہاری امپورٹنس اب میرے ہاتھ میں نہیں، تمہارے ہاتھ میں ہے۔ یہ تمہیں طے کرنا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ تم اس امپورٹنس کو بڑھاؤ گی یا کم کرو گی۔"

اس کی بات سنتے ہوئے امامہ کی نظر اس کے اس ہاتھ کی پشت پر پڑی۔ جس سے وہ اس کا ہاتھ سہلا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پشت بے حد صاف ستھری تھی۔ ہاتھ کی پشت اور کلائی پر بال نہ ہونے کے برابر تھے۔ ہاتھ کی انگلیاں کسی مصور کی انگلیوں کی طرح لمبی اور عام مردوں کے ہاتھوں کی نسبت پتلی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کی پشت پر سبز اور نیلی رگیں بہت نمایاں طور پر نظر آ رہی تھیں۔ اس کی کلائی پر رسٹ واچ کا ہلکا سا نشان تھا۔ وہ یقیناً بہت باقاعدگی سے رسٹ واچ پہنتا تھا۔ وہ آج پہلی بار اس کے ہاتھ کو اتنے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسے اس کے ہاتھ بہت اچھے لگے۔ اس کا دل کچھ اور موم ہوا۔

اس کی توجہ کہاں تھی سالار کو اندازہ نہیں ہو سکا۔ وہ اسے اسی طرح سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا۔

"محبت یا شادی کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دونوں پارٹنرز ایک دوسرے کو اپنے اپنے ہاتھ کی مٹھی میں بند کر کے رکھنا شروع کر دیں۔ اس سے رشتے مضبوط نہیں ہوتے دم گھٹنے لگتا ہے۔ ایک دوسرے کو سپیس دینا' ایک دوسرے کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنا' ایک دوسرے کی آزادی کے حق کا احترام کرنا بہت ضروری ہے۔" امامہ نے گردن موڑ کر اس کا چہرہ دیکھا' وہ اب بے حد سنجیدہ تھا۔

"ہم دونوں اگر صرف ایک دوسرے کے عیب اور کوتاہیاں ڈھونڈتے رہیں گے تو بہت جلد ہمارے دل سے ایک دوسرے کے لیے عزت اور لحاظ ختم ہو جائے گا۔ کسی رشتے کو کتنی بھی محبت سے باندھا گیا ہو' اگر عزت اور لحاظ چلا جائے تو محبت بھی چلی جاتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں محبت کے گھر کی چار دیواری ہیں' چار دیواری ختم ہو جائے تو گھر کو بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔"

امامہ نے بڑی حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں حیرانی دیکھ کر مسکرایا۔

"اچھی فلاسفی ہے نا؟"

امامہ کی آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ بیک وقت آئی تھی۔ اس نے اثبات میں سرہلایا۔
سالار نے اسے اپنے کچھ اور قریب کرتے ہوئے کہا۔
"میں اللہ کا پرفیکٹ بندہ نہیں ہوں تو تمہارا پرفیکٹ شوہر کیسے بن سکتا ہوں امامہ! شاید اللہ میری کوتاہیاں نظر انداز کردے تو تم بھی معاف کردیا کرو۔"
وہ حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی' وہ واقعی اس سالار سکندر سے ناواقف تھی۔ سالار نے بڑی نرمی کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سوجے ہوئے پپوٹوں کو اپنی پوروں سے چھوا۔
"کیا حال کرلیا ہے تم نے اپنی آنکھوں کا۔۔۔؟ تمہیں مجھ پر ترس نہیں آتا؟"
وہ بڑی ملائمت سے کہہ رہا تھا۔
امامہ نے جواب دینے کے بجائے اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ وہ اب بے حد پرسکون تھی۔ اس کے گرد اپنا ایک بازو حمائل کرتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے اور گردن پر آئے ہوئے بالوں کو ہٹاتے ہوئے اس نے پہلی بار نوٹس کیا کہ وہ رونے کے بعد زیادہ اچھی لگتی ہے لیکن اس سے یہ بات کہنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے والی بات تھی۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ اس کے نائٹ ڈریس کی شرٹ پر بنے پیٹرن پر غیر محسوس انداز میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔
"موو کلر اچھا لگتا ہے تم پر۔" اس نے بے حد رومانٹک انداز میں اس کے کپڑوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
اس کے سینے پر حرکت کرتا اس کا ہاتھ یک دم رکا۔ امامہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ سالار نے اس کی آنکھوں میں خفگی دیکھی، وہ مسکرایا۔
"تعریف کررہا ہوں تمہاری۔"
"یہ پنک ہے۔"
"او، اچھا۔" سالار نے گڑبڑا کر اس کے کپڑوں کو دوبارہ دیکھا۔
"پنک ہے؟ میں نے اصل میں موو کلر بہت عرصے سے کسی کو پہنے نہیں دیکھا۔" سالار نے وضاحت کی۔
"کل موو پہنا ہوا تھا میں نے۔" امامہ کی آنکھوں کی خفگی بڑھی۔
"لیکن میں تو اسے پرپل سمجھا تھا۔" سالار مزید گڑبڑایا۔
"وہ جو سامنے دیوار پر پینٹنگ ہے نا، اس میں ہیں پرپل فلاورز۔" امامہ نے بمشکل تحمل کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔
سالار اس پینٹنگ کو گھورتے ہوئے اسے یہ نہیں بتا سکا کہ وہ ان فلاورز کو بلیو کلر کا کوئی شیڈ سمجھ کر آیا تھا۔ امامہ اب اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ سالار نے کچھ بے چارگی کے انداز میں گہرا سانس لیا۔
"میرا خیال ہے اس شادی کو کامیاب کرنے کے لیے مجھے اپنی جیب میں ایک شیڈ کارڈ رکھنا پڑے گا۔" وہ پینٹنگ کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا تھا۔



وہ پہلی صبح تھی جب اس کی آنکھ سالار سے پہلے کھلی تھی الارم سیٹ ٹائم سے بھی دس منٹ پہلے چند منٹ وہ اسی طرح بستر میں پڑی رہی۔ اسے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ رات کا کون سا پہر ہے۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑا الارم کلاک اٹھا کر اس نے ٹائم دیکھا پھر ساتھ ہی الارم آف کردیا۔ بڑی احتیاط سے وہ اٹھ کر بستر میں بیٹھی۔ سائیڈ ٹیبل

کا لیمپ بڑی احتیاط سے آن کرتے ہوئے اس نے سلیپرز ڈھونڈے' پھر اس نے کھڑے ہوتے ہوئے سائیڈ ٹیبل کا لیمپ آف کیا۔ تب اس نے سالار کی سائیڈ کے لیمپ کو آن ہوتے دیکھا۔ وہ کس وقت بیدار ہوا تھا' امامہ کو اندازہ نہیں ہوا تھا۔

"میں سمجھی تم سو رہے ہو۔" اس نے سالار کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی اٹھا ہوں کمرے میں آہٹ کی وجہ سے۔"

وہ اسی طرح لیٹے لیٹے اب اپنا سیل فون دیکھ رہا تھا۔

"لیکن میں نے تو کوئی آواز نہیں کی۔ میں تو کوشش کر رہی تھی کہ تم ڈسٹرب نہ ہو۔" امامہ کچھ حیران ہوئی تھی۔

"میری نیند زیادہ گہری نہیں ہے امامہ! کمرے میں ہلکی سے ہلکی آہٹ بھی ہو تو میں جاگ جاتا ہوں۔" اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے سیل سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

"میں آئندہ احتیاط کروں گی۔" اس نے کچھ معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"ضرورت نہیں' مجھے عادت ہے اسی طرح کی نیند کی۔ مجھے اب فرق نہیں پڑتا۔" اس نے بیڈ پر پڑا ایک اور تکیہ اٹھا کر اپنے پیچھے رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ واش روم میں جانے سے پہلے چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ ہر انسان ایک کتاب کی طرح ہوتا ہے۔ کھلی کتاب جسے کوئی بھی پڑھ سکتا ہے۔ سالار بھی اس کے لیے ایک کھلی کتاب تھا لیکن جانے کس زبان میں لکھی ہوئی کتاب۔

اس دن اس نے اور سالار نے سحری اکٹھے کی اور ہر روز کی طرح سالار' فرقان کے ساتھ نہیں گیا۔ وہ شاید پچھلے کچھ دنوں کی شکایتوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ امامہ کا موڈ رات کو ہی بہت اچھا ہو گیا تھا اور اس میں مزید بہتری اس کی اس "توجہ" نے کی۔

مسجد میں جانے سے پہلے آج پہلی بار اس نے اسے مطلع کیا۔

"امامہ! تم میرا انتظار مت کرنا۔ نماز پڑھ کر سو جانا' میں کافی لیٹ آؤں گا۔"

اس نے جاتے ہوئے اسے تاکید کی لیکن وہ اس کی تاکید کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے انتظار میں بیٹھی رہی۔

وہ ساڑھے آٹھ بجے اس کے آفس جانے کے بعد سوئی تھی۔ دوبارہ اس کی آنکھ گیارہ بجے ڈور بیل کی آواز پر کھلی۔ نیند میں اپنی آنکھیں مسلتے ہوئے اس نے بیڈ روم سے باہر نکل کر اپارٹمنٹ کا داخلی دروازہ کھولا۔ چالیس پینتالیس سالہ ایک عورت نے اسے بے حد متجسس نظروں سے دیکھتے ہوئے سلام کیا۔

"مجھے نوشین باجی نے بھیجا ہے۔" اس نے اپنا تعارف کروایا۔

امامہ کو یک دم یاد آیا کہ اس نے نوشین کو صفائی کے لیے ملازمہ کو کل کے بجائے اگلے دن بھیجنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اسے راستہ دیتی ہوئی دروازے سے ہٹ گئی۔

"اتنی خوشی ہوئی جب نوشین باجی نے مجھے بتایا کہ سالار صاحب کی بیوی آ گئی ہے۔ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ کب شادی کر لی سالار صاحب نے۔" امامہ کے پیچھے اندر آتے ہوئے ملازمہ کی باتوں کا آغاز ہو گیا تھا۔

"کہاں سے صفائی شروع کرنی ہے تم نے؟"

امامہ کی فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے صفائی کے بارے میں کیا ہدایات دے۔

"باجی! آپ فکر نہ کریں۔ میں کر لوں گی' آپ چاہے آرام سے سو جاؤ۔" ملازمہ نے اسے فوری آفر کی۔ یہ شاید اس نے اس کی نیند سے بھری ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر کہا تھا۔

"نہیں، تم لاؤنج سے صفائی شروع کرو میں ابھی آتی ہوں۔"
آفریدی نہیں تھی اُسے واقعی بہت نیند آرہی تھی لیکن وہ۔ اس طرح اسے گھر میں کام کرتا چھوڑ کر سو نہیں سکتی تھی۔
واش روم میں آکر اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، کپڑے تبدیل کرکے بال سمیٹے اور لاؤنج میں نکل آئی۔ ملازمہ ڈسٹنگ میں مصروف تھی۔ لاؤنج کی کھڑکیوں کے بلائنڈز اب ہٹے ہوئے تھے۔ سورج ابھی پوری طرح نہیں نکلا تھا لیکن اب دھند نہ ہونے کے برابر تھی۔ لاؤنج کی کھڑکیوں سے باہر پودے دیکھ کر اسے انہیں پانی دینے کا خیال آیا۔
ملازمہ ایک بار پھر گفتگو کا آغاز کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اسے بالکونی کی طرف جاتے دیکھ کر چپ ہو گئی۔
جب وہ پودوں کو پانی دے کر فارغ ہوئی تو ملازمہ لاؤنج صاف کرنے کے بعد اب سالار کے اس کمرے میں جا چکی تھی جسے وہ اسٹڈی روم کی طرح استعمال کرتا تھا۔
"سالار صاحب بڑے اچھے انسان ہیں۔"
تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں اپارٹمنٹ کی صفائی کرنے کے بعد امامہ نے اس سے چائے کا پوچھا تھا۔ چائے پیتے ہوئے ملازمہ نے ایک بار پھر اس سے باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ امامہ اس کے تبصرے پر صرف مسکرا کر خاموش ہو گئی۔
"آپ بھی ان کی طرح بولتی نہیں ہیں؟" ملازمہ نے اس کے بارے میں اپنا پہلا اندازہ لگایا۔
"اچھا، سالار بھی نہیں بولتا۔" امامہ نے جان بوجھ کر اسے موضوع گفتگو بنایا۔
"کہاں جی۔ حمید بھی یہی کہتا ہے صاحب کے بارے میں۔"
ملازمہ نے شاید سالار کے ملازم کا نام لیا تھا۔
"لیکن باجی! بڑی حیا ہے آپ کے توہی کی آنکھ میں۔"
اس نے ملازمہ کے جملے پر جیسے بے حد حیران ہو کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ ملازمہ بڑی سنجیدگی سے بات کر رہی تھی۔
"جیسے فرقان صاحب ہیں، ویسی ہی عادت سالار صاحب کی ہے۔ فرقان صاحب تو خیر سے بال بچوں والے ہیں لیکن سالار صاحب تو اکیلے رہتے تھے ادھر۔ میں تو کبھی بھی اس طرح اکیلے مردوں والے گھروں میں صفائی نہ کروں۔ بڑی دنیا دیکھی ہے جی میں نے، لیکن یہاں کام کرتے ہوئے بھی نظر اٹھا کے نہیں دیکھا صاحب نے مجھے۔ میں کئی بار سوچتی تھی کہ بڑے ہی نصیب والی عورت ہو گی جو اس گھر میں آئے گی۔"
ملازمہ فراٹے سے بول رہی تھی۔
ہیٹر کے سامنے صوفے پر نیم دراز امامہ اس کی باتیں سنتی کسی سوچ میں گم رہی۔ ملازمہ کو حیرت ہوئی تھی کہ باجی اپنے شوہر کی تعریف پر خوش کیوں نہیں ہوئی۔ "باجی" کیا خوش ہوتی، کم از کم اسے اتنی توقع تو تھی اس سے کہ وہ گھر میں کام کرنے والی کسی عورت کے ساتھ بھی انوالو نہیں ہو سکتا۔ وہ مردوں کی کوئی بڑی ہی بدترین قسم ہوتی ہو گی جو گھر میں کام کرنے والی ملازمہ پر بھی نظر رکھتے ہوں گے اور سالار کم از کم اس قسم کے مردوں میں شمار نہیں ہو سکتا تھا۔
ملازمہ اس کی مسلسل خاموشی سے کچھ بیزار ہو کر جلد ہی چائے پی کر فارغ ہو گئی۔ امامہ اس کے پیچھے دروازہ بند کرنے گئی تو ملازمہ نے باہر نکلنے سے پہلے مڑ کر اس سے کہا۔
"باجی! کل ذرا جلدی آجاؤں آپ کے گھر؟"

امامہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کے چہرے پر یقیناً "کوئی ایسا تاثر تھا جس نے ملازمہ کو کچھ بوکھلا دیا تھا۔

"باجی! مجھے چھوٹے بچے کو ہسپتال لے کر جانا ہے اس لیے کہہ رہی تھی۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" امامہ نے بمشکل جیسے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ کل جلدی آنے کے مطالبے نے اسے ساکت نہیں کیا تھا بلکہ اسے ساکت کیا تھا اس کے تین لفظوں نے۔ "آپ کے گھر" "یہ" اس کا گھر "تھا" جس کے لیے وہ اتنے سالوں سے خوار ہوتی پھر رہی تھی۔ جس کی آس میں وہ کتنی بار جلال انصر کے پیچھے گڑگڑانے گئی تھی۔ وہ بے یقینی سے لاؤنج میں آکر ان دیواروں کو دیکھ رہی تھی جنہیں دنیا "اس کے گھر" کے نام سے شناخت کر رہی تھی، وہ واقعی اس کا گھر تھا۔ وہ پناہ گاہیں نہیں تھیں جہاں وہ اتنے سال سر جھکا کر ممنون و احسان مند بن کر رہی تھی۔ آنسوؤں کا ایک ریلا آیا تھا اس کی آنکھوں میں...... بعض اوقات انسان سمجھ نہیں پاتا کہ وہ روئے یا ہنسے...... روئے تو کتنا روئے...... ہنسے تو کتنا ہنسے...... وہ بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ وہ بچوں کی طرح ہر کمرے کا دروازہ کھول کھول کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہی تھی۔ وہ جا سکتی تھی وہاں...... جو چاہے کر سکتی تھی...... یہ اس کا گھر تھا۔ یہاں کوئی جگہ اس کے لیے "علاقہ غیر" نہیں تھی۔ اسے بس اتنی سی دنیا ہی چاہیے تھی اپنے لیے...... کوئی ایسی جگہ، جہاں وہ استحقاق کے ساتھ رہ سکتی ہو۔ سالار یک دم جیسے کہیں پیچھے چلا گیا تھا۔ گھر کے معاملے میں عورت کے لیے ہر مرد پیچھے رہ جاتا ہے۔

سالار نے اسے دوبارہ وقفے وقفے سے سیل پر کال کی لیکن امامہ نے ریسیو نہیں کی۔ سالار نے تیسری بار پھر پی سی ایل پر کال کی۔ اس بار امامہ نے ریسیو کی لیکن اس کی آواز سنتے ہی سالار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ رو رہی تھی۔ اسے اس کی آواز بھرائی ہوئی لگی۔ وہ بہت پریشان ہوا۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔"

دوسری طرف جیسے اپنے آنسوؤں اور آواز پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کیوں رو رہی ہو؟"

سالار کی واقعی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ رات ہر جھگڑے کا اختتام بے حد خوشگوار انداز میں ہوا تھا۔ وہ صبح دروازے تک مسکرا کر اسے رخصت کرنے آئی تھی۔ پھر اب......؟ وہ الجھ رہا تھا۔

دوسری طرف امامہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے اپنے رونے کا کیا جواز پیش کرے۔ اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اس لیے رو رہی ہے کہ کسی نے اسے "بیگم گھر والی" کہا ہے۔ سالار یہ بات نہیں سمجھ سکتا تھا...... کوئی بھی مرد نہیں سمجھ سکتا۔

"مجھے امی اور ابو یاد آ رہے ہیں۔" سالار نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔

یہ وجہ سمجھ میں آتی تھی...... وہ ایک دم پرسکون ہوا اور وہ بالکل خاموش تھی۔ ماں باپ کا ذکر کیا تھا جھوٹ بولا تھا لیکن اب رونے کی جیسے ایک اور وجہ مل گئی تھی۔ جو آنسو پہلے تھم رہے تھے وہ ایک بار پھر سے برسنے لگے تھے۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ فون پر اس کی سسکیاں اور ہچکیاں سنتا رہا۔

وہ اس غیر ملکی بینک میں انویسٹمنٹ بینکنگ کو ہیڈ کرتا تھا۔ چھوٹے سے چھوٹا انویسٹمنٹ scam پکڑ سکتا تھا۔ خسارے میں جاتی بڑی سے بڑی کمپنی کے لیے بیل آؤٹ پلان تیار کر سکتا تھا۔ کمپنیز کے مرجر پیکجز تیار کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ وہ پوائنٹ ون پرسنٹ کی پریسیشن کے ساتھ ورلڈ اسٹاک مارکیٹس کے ٹرینڈز کی پیشن گوئی کر سکتا تھا۔ مشکل سے مشکل سرمایہ کار کے ساتھ سودا طے کرنے میں اسے ملکہ حاصل تھا لیکن شادی کے اس ایک ہفتے کے دوران ہی اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ امامہ کو روتے ہوئے چپ نہیں کرا سکتا، نہ وہ ان

آنسوؤں کی وجہ ڈھونڈ سکتا تھا' نہ انہیں روکنے کے طریقے اسے آتے تھے۔ وہ کم از کم اس میدان میں بالکل اناڑی تھا۔

"ملازمہ نے گھر صاف کیا تھا آج؟" ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے امامہ کی توجہ رونے سے ہٹانے کے لیے جس موضوع اور جملے کا انتخاب کیا وہ احمقانہ تھا۔ امامہ کو جیسے یقین نہیں آیا کہ یہ جتانے پر کہ اسے اپنے ماں باپ یاد آرہے ہیں' سالار نے اس سے یہ پوچھا ہے۔ پچھلی رات کے سالار کے سارے لیکچرز کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور فون منقطع ہوتے ہی سالار کو اپنے الفاظ کے غلط انتخاب کا احساس ہوگیا تھا۔ اپنے سیل کی تاریک اسکرین کو دیکھتے ہوئے اس نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

اگلے پانچ منٹ وہ سیل ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ اسے پتا تھا اس نے اب کال کی تو وہ ریسیو نہیں کرے گی۔ پانچ منٹ کے بعد اس نے دوبارہ کال کی۔ خلاف توقع امامہ نے کال ریسیو کی۔ اس بار اس کی آواز میں خفگی تھی لیکن وہ بھرائی ہوئی نہیں تھی۔ وہ یقیناً "رونا بند کرچکی تھی۔"

"آئی ایم سوری۔" سالار نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔

امامہ نے جواب نہیں دیا۔ وہ اس وقت اس کی معذرت نہیں سن رہی تھی۔ وہ صرف ایک ہی بات کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی' اسے سالار پر غصہ کیوں آجاتا تھا۔ کیوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر۔ اتنے سالوں میں جس ایک احساس کو وہ مکمل طور پر بھول گئی تھی' وہ غصے کا احساس ہی تھا۔ یہ احساس اس کے لیے اجنبی ہوچکا تھا۔ اتنے سالوں سے اس نے اللہ کے علاوہ کسی سے بھی کوئی گلہ' کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ کسی سے ناراض ہونا یا کسی کو خفگی دکھانا تو بہت دور کی بات ہے۔ پھر اب یہ احساس اس کے اندر کیوں جاگ اٹھا تھا۔ سعیدہ اماں' ڈاکٹر سبط علی اور ان کی فیملی... اس کے کلاس فیلوز... کولیگز... ان میں سے بھی کسی پر اسے غصہ نہیں آیا تھا۔ ہاں' کبھی کبھار شکایت ہوئی تھی لیکن وہ شکایت بھی لفظوں کی شکل اختیار نہیں کرسکی پھر اب کیا ہو رہا تھا اسے؟

"امامہ پلیز بولو... کچھ کہو۔" وہ چونکی۔

"نماز کا وقت نکل رہا ہے' مجھے نماز پڑھنی ہے۔" اس نے اسی الجھے ہوئے انداز میں اس سے کہا۔

"تم خفا تو نہیں ہو؟" سالار نے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے مدھم آواز میں کہا۔

وہ نماز کے بعد دیر تک اسی ایک سوال کا جواب ڈھونڈتی رہی اور اسے جواب مل گیا۔ نو سال میں اس نے پہلی بار اپنے لیے کسی کی زبان سے محبت کا اظہار سنا تھا۔ وہ احسان کرنے والوں کے ہجوم میں تھی' پہلی بار کسی محبت کرنے والے کے حصار میں آئی تھی۔ گلہ' شکوہ' ناز' نخرہ' غصہ' خفگی' یہ سب کیسے نہ ہوتا اسے۔ "یہ" تھا کہ جب وہ روٹھے گی تو وہ اسے منانے کا خواہاں ہوگی تو وہ اسے رضا حتمی دے گا' مان تھا یا گمان... لیکن جو کچھ بھی تھا غلط نہیں تھا۔ اتنے سالوں میں جو کچھ اس کے اندر جمع ہوگیا تھا' وہ کسی لاوے کی طرح نکل رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ نارمل ہو رہی تھی۔



شام کو سالار اسے خوشگوار موڈ میں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ یہ خلاف توقع تھا' خاص طور پر دوپہر والے واقعہ کے بعد۔ لیکن... اس رات وہ اسے ڈنر کے لیے باہر لے گیا۔ وہ بے حد نروس تھی لیکن بے حد ایکسائٹڈ بھی۔ وہ کتنے سالوں کے بعد یوں کسی ریسٹورنٹ کے اوپن ایئر حصہ میں بیٹھی باربی کیو کھا رہی تھی۔

کھانے کے بعد وہ دونوں ونڈو شاپنگ کی نیت سے مارکیٹ چلے آئے... سالار نے بڑی نرمی اور توجہ سے اسے

خود کو سنبھالنے کا موقع دیا تھا۔ وہ اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا کھانا ختم کرنے تک وہ نارمل ہو چکی تھی۔
عید کی خریداری کی وجہ سے مارکیٹ میں اس وقت بھی بڑی گہما گہمی تھی۔ وہ بہت عرصہ کے بعد وہاں آئی تھی' مارکیٹ کی شکل ہی بدل چکی تھی۔ وہ بے حد حیرت سے ان نیو برانڈز اور دکانوں کو دیکھتے ہوئے گزر رہی تھی جو آٹھ نو سال پہلے وہاں نہیں تھیں۔ ڈاکٹر سبط علی کی بیٹیاں یا سعیدہ اماں کے بیٹے اپنی فیملیز کے ساتھ جب بھی آؤٹنگ کے لیے باہر نکلتے' وہ اسے بھی ساتھ لے جانے کی کوشش کرتے' لیکن ان کے ساتھ باہر نہ جانے کا فیصلہ اس کا اپنا ہوتا تھا۔ وہ ان میں سے کسی کے لیے مزید کسی مصیبت کا باعث نہیں بننا چاہتی تھی۔ شادی کو وہ صرف رہنے کی جگہ کی تبدیلی سمجھ رہی تھی' حالات کی تبدیلی کے بارے میں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن معجزات ہوتے ہیں۔ شاذ و نادر سہی لیکن ہوتے ضرور ہیں۔
"کچھ لوگی؟" سالار کی آواز پر وہ بے اختیار چونکی۔
"ہاں۔ کافی۔" اس نے جھجک کر کہا۔
"میں شاپنگ کی بات کر رہا تھا۔" اس نے کہا۔
"نہیں' میرے پاس سب کچھ ہے۔" امامہ نے مسکرا کر کہا۔
"وہ تو اب میرے پاس بھی ہے۔" اس کے چہرے پر بے اختیار سرخی دوڑی تھی۔
"تمہیں میری تعریف اچھی لگی۔۔۔؟"
"سالار! باز آؤ میں نے تمہیں یہاں تعریف کرنے کو کہا تھا؟" وہ بے ساختہ جھینپی۔
"تم نے جگہ نہیں بتائی تھی' صرف یہ کہا تھا کہ مجھے تمہاری تعریف کرنی چاہیے۔" وہ اسے چھیڑتے ہوئے محظوظ ہو رہا تھا۔
امامہ نے اس بار گردن موڑ کر اسے نظر انداز کیا۔ اس کے ساتھ چلتے چلتے ایک شوکیس میں ڈسپلے پر لگی ایک ساڑھی دیکھ کر وہ بے ساختہ رکی۔ کچھ دیر ستائشی نظروں سے وہ اس کاہی رنگ کی ساڑھی کو دیکھتی رہی۔ وہاں شوکیس میں لگی یہی وہ شے تھی' جس کے سامنے وہ یوں ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ سالار نے ایک نظر اس ساڑھی کو دیکھا پھر اس کے چہرے کو اور بڑی سہولت کے ساتھ کہا۔
"مجھے لگتا ہے یہ ساڑھی تم پر بہت اچھی لگے گی' آؤ لیتے ہیں۔" وہ گلاس ڈور کھولتے ہوئے بولا۔
"نہیں' میرے پاس بہت سے فینسی کپڑے ہیں۔" امامہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔
"لیکن میں نے تو کچھ نہیں دیا تمہیں شادی پر' اس لیے کچھ دینا چاہتا ہوں۔"
وہ اس بار بول نہیں سکی۔ وہ ساڑھی اسے واقعی بہت اچھی لگی تھی۔
اس بوتیک سے انہوں نے صرف وہ ساڑھی ہی نہیں خریدی بلکہ چند اور سوٹ بھی لیے تھے۔ دوسری بوتیک سے گھر میں پہننے کے لیے کچھ ریڈی میڈ ملبوسات' کچھ سویٹرز اور جوتے۔
"مجھے پتا ہے تمہارے پاس کپڑے ہیں لیکن تم میرے خریدے ہوئے پہنو گی تو مجھے زیادہ اچھا لگے گا۔ یہ سب میں اپنی خوشی کے لیے کر رہا ہوں' تمہیں خوش کرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔"
اس کے پہلے اعتراض پر سالار نے بے حد رسانیت سے کہا تھا۔
امامہ نے اس کے بعد اعتراض نہیں کیا۔ اسے کچھ جھجک تھی لیکن تھوڑی دیر میں یہ جھجک بھی ختم ہو گئی۔ پھر اس نے ساری چیزیں اپنی پسند سے لی تھیں۔
"مجھے تم پر ہر چیز اچھی لگتی ہے۔ سو تم مجھ سے مت پوچھو۔" اس نے سالار کی پسند پوچھی تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"لاؤنج کی کھڑکیوں پر کرٹنز (پردے) لگالیں۔" امامہ کو یاد آیا۔
"بلائنڈز سے کیا ایشو ہے تمہیں؟" وہ چونکا۔
"کوئی نہیں لیکن مجھے کرٹنز اچھے لگتے ہیں۔ خوب صورت سے۔"
"کیوں نہیں۔" سالار نے اپنے دلی تاثرات چھپاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ وہ اس سے کہہ نہیں سکا کہ اسے پردوں سے چڑ تھی۔
رات پونے بارہ بجے ایک کیفے میں کافی اور تیرامیسو کیک کھانے کے بعد وہ تقریباً ساڑھے بارہ بجے گھر واپس آئے۔ لاہور تب تک ایک بار پھر دھند میں ڈوب چکا تھا لیکن زندگی کے راستے سے دھند چھٹنے لگی تھی۔
گھر آنے کے بعد بھی وہ بے مقصد ان چیزوں کو کھول کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ کتنے سالوں بعد وہ ملنے والی کسی چیز کو تشکر اور احسان مندی کے بوجھ کے ساتھ نہیں بلکہ استحقاق کے احساس کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔
عورت کے لیے بہت ساری نعمتوں میں سے ایک نعمت اس کے شوہر کا اس کی ذات پر پیسہ خرچ کرنا بھی ہے اور یہ نعمت کیوں تھا وہ اسے آج سمجھ پائی تھی۔
ڈاکٹر سبط علی اور ان کی بیوی ہر سیزن کے آغاز میں اسے کپڑے اور دوسری چیزیں خرید کر دیتے تھے۔ سعیدہ اماں بھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ لاتی رہتی تھیں۔ ان کے بیٹے اور ڈاکٹر سبط علی کی بیٹیاں بھی اسے کچھ نہ کچھ بھیجتی رہتی تھیں لیکن ان میں سے کسی چیز کو ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے ایسی خوشی یا سکون محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ خیرات نہیں تھی لیکن وہ حق بھی نہیں تھا' وہ احسان تھا اور وہ اتنے سالوں میں بھی اپنے وجود کو احسانوں کا عادی نہیں بنا سکی تھی۔ بے شک وہ اس کی زندگی کا حصہ ضرور بن گئے تھے۔
کیسا احساس تھا جو ان چیزوں کو گود میں لیے اسے ہو رہا تھا۔ خوشی؟ آزادی؟ اطمینان؟ سکون۔۔۔؟ یا کوئی ایسی شے تھی جس کے لیے اس تک اس کے پاس لفظ نہیں تھے۔
"کیا ڈھونڈ رہی ہو تم؟"
سالار کپڑے تبدیل کر کے واش روم سے نکلا تھا اور ڈریسنگ روم کی لائٹ آف کر کے کمرے میں آتے ہوئے اس نے امامہ کو اسی طرح صوفے پر وہ ساری چیزیں پھیلائے بیٹھے دیکھا۔ وہ حیران سا ہوا۔ وہ جب سے آئی تھی' اس وقت سے ان چیزوں کو لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔
"کچھ بھی نہیں بس رکھنے ہی لگی تھی۔" امامہ نے ان چیزوں کو سمیٹنا شروع کر دیا۔
"ایک وارڈ روب میں نے خالی کر دی ہے' تم اپنے کپڑے اس میں رکھ لو۔ اگر کچھ اور جگہ کی ضرورت ہو تو گیسٹ روم کی ایک وارڈ روب بھی خالی ہے۔ تم اسے استعمال کر سکتی ہو۔"
وہ اپنے کمرے سے کچھ ڈھونڈتا ہوا اس سے کہہ رہا تھا۔
"مجھے سعیدہ اماں کے گھر سے اپنا سامان لانا ہے۔" امامہ نے ساری چیزوں کو دوبارہ ڈبوں اور بیگز میں ڈالتے ہوئے کہا۔
"کیسا سامان؟" وہ ابھی تک دراز میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔
"میرے جہیز کا سامان۔" امامہ نے بڑی رسانیت سے کہا۔
"مثلاً؟" وہ دراز سے نکالے گئے کچھ پیپرز دیکھتے ہوئے چونکا۔
"برتن ہیں' الیکٹرونکس کی چیزیں ہیں۔ فرنیچر بھی ہے لیکن وہ شوروم پر ہے۔ اور بھی کچھ چھوٹی چیزیں ہیں۔"
وہ ان پیپرز کو دراز میں رکھ کر اس کی بات سنتا رہا۔

"تمہارے ذاتی استعمال کی کوئی چیز ہے وہاں۔۔۔؟" اس نے پوچھا۔

"وہ سب میری ذاتی چیزیں ہیں۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

"وہ جہیز کا سامان ہے۔" سالار نے اسے جتانے والے انداز میں کہا۔

"اب تم کہو گے، تمہیں جہیز نہیں چاہیے۔" وہ کچھ جزبز ہو کر بولی۔

"مجھے کسی بھی قسم کا سامان نہیں چاہیے۔" سالار نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "تمہیں لگتا ہے اس اپارٹمنٹ میں پہلے ہی کسی چیز کی کمی ہے۔۔۔؟۔۔۔ تم جانتی ہو یہاں ہر چیز دو دو کی تعداد میں ہو۔ رکھیں گے کہاں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ امامہ سوچ میں پڑ گئی۔

"اتنے سالوں سے چیزیں میں خریدتی رہی ہوں اپنے لیے، لیکن زیادہ سامان ابو کے پیسوں سے آیا ہے۔ وہ ناراض ہوں گے۔" وہ اب بھی تیار نہیں تھی۔

"ڈاکٹر صاحب نے اپنی تینوں بیٹیوں کو جہیز دیا؟" وہ اب پوچھ رہا تھا۔ "نہیں دیا نا؟"

"تمہیں کیسے پتا؟" وہ چند لمحے بول نہیں سکی۔

"انہوں نے مجھے خود بتایا تھا۔" اس نے کہا۔

"ان کی تینوں بیٹیوں کی شادیاں فیملی میں ہوئی ہیں اس لیے۔" امامہ نے کہا۔

"رائٹ۔۔۔ میں بھی جہیز نہ لانے پر تم سے برا سلوک نہیں کروں گا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا تحفہ ہوتا تو میں ضرور رکھتا لیکن یہ انہوں نے تمہاری سیکیورٹی کے لیے دیا تھا کیونکہ تمہاری شادی کسی ایسی فیملی میں ہو رہی تھی جس کے بارے میں وہ مکمل طور پر نہیں جانتے تھے لیکن میرے بارے میں تو وہ بھی جانتے ہیں اور تم بھی۔" سالار نے اس سے کہا۔

"میرے برتن، بیڈ شیٹس اور کپڑے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کتنی چیزیں ہیں جو میں اتنے سالوں سے جمع کر رہی ہوں۔ اب کیسے دے دوں یہ سب کچھ؟" وہ ناخوش تھی۔

"اوکے، جو چیز تم نے اپنی پے سے لی ہے، وہ لے آؤ، باقی چھوڑو سب کچھ۔ وہ کسی خیراتی ادارے کو دے دیں گے۔" سالار نے ایک اور حل نکالا۔ وہ اس بار کچھ سوچنے لگی۔

"میں صبح آفس جاتے ہوئے تمہیں سعیدہ اماں کی طرف چھوڑ دوں گا اور آفس سے آج ذرا جلدی آ جاؤں گا۔ تمہاری پیکنگ بھی کروا دوں گا۔"

وہ ہاتھ میں کچھ پیپرز لیے ہوئے اس کی طرف آیا۔ صوفے پر اس کے پاس پڑی چیزوں کو ایک طرف کرتے ہوئے وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"یہ جس جگہ پر کراس کا نشان ہے اس پر اپنے سائن کر دو۔"

اس نے کچھ پیپرز اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک پین اسے تھمایا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے کچھ حیران ہو کر ان پیپرز کو دیکھا۔

"میں اپنے بینک میں تمہارا اکاؤنٹ کھلوا رہا ہوں۔"

"لیکن میرا اکاؤنٹ تو پہلے ہی کھلا ہوا ہے۔"

"چلو، ایک اکاؤنٹ میرے بینک میں بھی سہی۔ برے نہیں ہیں ہم، اچھی سروس دیتے ہیں۔" اس نے مذاق کیا۔ امامہ نے پیپرز پر سائن کرنا شروع کر دیا۔

"پھر وہ اکاؤنٹ بند کر دوں؟" امامہ نے سائن کرنے کے بعد کہا۔

"نہیں، اسے وہیں رہنے دو۔" سالار نے پیپرز اس سے لیتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اکاؤنٹ کھولنے کے لیے کتنی رقم کا چیک دوں؟"
امامہ کا خیال تھا کہ وہ غیر ملکی بینک ہے۔ یقیناً "اکاؤنٹ کھولنے کے لیے ملکی بینک کی نسبت کچھ زیادہ رقم کی ضرورت ہوگی۔
"تمہارا حق مہر پے کرنا ہے مجھے۔ اسی رقم سے کھول دوں گا۔"
سالار نے پیپرز ایک لفافے میں رکھتے ہوئے اس سے کہا۔
"اس پر ایک فگر لکھو۔"
امامہ نے حیرانی سے اس رائٹنگ پیڈ کو دیکھا جو اس نے اس کی طرف بڑھایا تھا۔ "کیسی فگر؟" وہ الجھی۔
"کوئی بھی فگر، اپنی مرضی کے کچھ ڈیجٹس (ہندسے)۔" سالار نے کہا۔
"کیوں؟" وہ مزید الجھی۔
سالار نے اس کے ہاتھ میں پین تھمایا۔ اس نے دوبارہ پین پکڑ تو لیا لیکن اس کا ذہن مکمل طور پر خالی تھا۔
"کتنے ڈیجٹس کا فگر۔" امامہ نے چند لمحے بعد اس کی مدد چاہی۔
وہ یک دم سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔
"اگر تم اپنی مرضی سے کوئی فگر لکھو گی تو کتنے ڈیجٹس لکھو گی۔۔۔؟"
"سیون ڈیجٹس۔" امامہ سوچ میں پڑ گئی۔
"آل رائٹ۔۔۔ لکھو پھر۔" سالار کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ آئی۔
امامہ چند لمحے اس صاف کاغذ کو دیکھتی رہی پھر اس نے لکھنا شروع کیا۔ 3752960۔۔۔ اس نے رائٹنگ پیڈ سالار کی طرف بڑھا دیا۔ کاغذ پر نظر ڈالتے ہی وہ چند لمحوں کے لیے جیسے سکتہ میں آیا پھر کاغذ کو پیڈ سے الگ کرتے ہوئے بے اختیار ہنسا۔
"کیا ہوا؟" وہ اس کے رد عمل سے کچھ اور الجھی۔
"کچھ نہیں۔۔۔ کیا ہونا تھا؟" کاغذ کو تہہ کرتے ہوئے اس نے امامہ کے چہرے کو مسکراتے ہوئے بے حد گہری لیکن عجیب نظروں سے دیکھا۔
"اس طرح کیوں گھور رہے ہو مجھے؟" وہ اس کی نظروں سے الجھی۔
"تمہارا شوہر ہوں، دیکھ سکتا ہوں تمہیں۔"
امامہ کو احساس نہیں ہوا وہ بڑی صفائی سے بات بدل رہا تھا۔ اس سے بات کرتے ہوئے وہ غیر محسوس انداز میں کاغذ بھی اس لفافے میں ڈال چکا تھا۔
"تم نے مجھے ساڑھی پہن کر نہیں دکھائی؟"
"رات کے اس وقت میں تمہیں ساڑھی پہن کر دکھاؤں؟" وہ بے اختیار ہنسی۔
وہ اس کے پاس سے اٹھتے اٹھتے رک گیا۔ وہ پہلی بار اس طرح کھلکھلا کر ہنسی تھی یا پھر شاید وہ اتنے قریب سے پہلی بار اسے ہنستے دیکھ رہا تھا۔ ایک بیگ کے اندر ڈبے رکھتے ہوئے امامہ نے اپنے چہرے پر اس کی نظریں محسوس کیں۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا، وہ واقعی اسے دیکھ رہا تھا۔
"اب کیا ہے؟"
"میں ایک بات سوچ رہا تھا۔" وہ سنجیدہ تھا۔
"کیا؟"
"کہ تم صرف روتے ہوئے ہی نہیں ہنستے ہوئے بھی اچھی لگتی ہو۔"

اس کی آنکھوں میں پہلے حیرت آئی' پھر چمک اور پھر خوشی۔ سالار نے ہر تاثر کو پہچانا تھا' یوں جیسے کسی نے اسے فلیش کارڈ دکھائے ہوں۔ پھر اس نے اسے نظریں چراتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا پہلے اس کے کان کی لوئیں سرخ ہوئیں پھر اس کے گال' ناک۔۔ اور شاید اس کی گردن بھی۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی عورت یا مرد کو اتنے واضح طور پر رنگ بدلتے نہیں دیکھا تھا جس طرح اسے۔۔ نو سال پہلے بھی دو تین بار اس نے اسے غصے میں اسی طرح سرخ ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے لیے عجیب سہی لیکن یہ منظر دلچسپ تھا۔ اور اب وہ اسے محجوب ہوتے ہوئے بھی اسی انداز میں سرخ ہوتے دیکھ رہا تھا' یہ منظر اس سے زیادہ دلچسپ تھا۔ "یہ کسی بھی مرد کو پاگل کر سکتی ہے۔" اس کے چہرے پر نظریں جمائے اس نے اعتراف کیا' اس نے اپنی زندگی میں آنے والی کسی عورت کو اتنے "بے ضرر" جملے پر اتنا شرماتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور اس کو شکایت تھی کہ وہ اس کی تعریف نہیں کرتا۔ سالار کا دل چاہا' وہ اسے کچھ اور چھیڑے۔ وہ بظاہر بے حد سنجیدگی سے اسے نظر انداز کیے ہوئے چیزیں بیگ میں ڈال رہی تھی لیکن اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ وہ اس کی نظروں سے یقیناً کنفیوز ہو رہی تھی۔

"کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں گھر میں لانے کے بعد آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ انہیں کہاں رکھیں' کیونکہ آپ انہیں جہاں بھی رکھتے ہیں' اس چیز کے سامنے وہ جگہ بے حد بے مایہ سی لگتی ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں گھر میں لانے کے بعد انہیں جہاں بھی رکھیں' وہی جگہ سب سے انمول اور قیمتی ہو جاتی ہے۔"

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' امامہ اس کے لیے ان چیزوں میں سے کون سی چیز تھی۔ اس کے چہرے پر نظریں جمائے وہ کچھ بے اختیار ہو کر اس کی طرف جھکا اور اس نے بڑی نرمی کے ساتھ اس کے دائیں گال کو چھوا' وہ کچھ حیا سے سمٹی۔ اس نے اسی نرمی کے ساتھ اس کا دایاں کندھا چوما اور پھر امامہ نے اسے ایک گہرا سانس لے کر اٹھتے ہوئے دیکھا۔

وہ وہیں بیٹھی رہی' سالار نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ ان پیپرز کو اب اپنی بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ رہا تھا۔ پلٹ کر دیکھتا تو شاید امامہ کی نظریں اسے حیران کر دیتیں۔ اس نے پہلی بار اس کے کندھے کو چوما تھا اور اس لمس میں محبت نہیں تھی۔۔۔ "احترام" تھا۔۔۔ اور کیوں تھا' یہ وہ سمجھ نہیں سکی۔



وہ اگلے دن تقریباً دس بجے سعیدہ اماں کے گھر آئے۔ امامہ کا مسکراتا' مطمئن چہرہ دیکھ کر فوری رد عمل یہ ہوا کہ انہوں نے نہ صرف سالار کے سلام کا جواب دیا بلکہ اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے اس کا ماتھا بھی چوما۔

"یہ سب لے کر جانا ہے۔" وہ اسے اپنے کمرے میں لائی تھی وہاں کتابوں کی دو الماریاں تھیں اور ان میں تقریباً تین چار سو کتابیں تھیں۔

"یہ بکس؟" سالار نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔

"نہیں' یہ ایزل' کینوس اور پینٹنگ کا سارا سامان بھی۔" امامہ نے کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ پڑے پینٹنگ کے سامان اور کچھ ادھوری پینٹنگز کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ سب کچھ زیادہ نہیں ہے بکس ہی تقریباً دو کارٹن میں آ جائیں گی۔" سالار نے ان کتابوں کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔

"نہیں' یہ اتنی ہی بکس نہیں ہیں اور بھی ہیں۔" امامہ نے کہا۔

اس نے اپنا دوپٹا اتار کر بیڈ پر رکھ دیا اور پھر گھٹنوں کے بل کارپٹ پر بیٹھتے ہوئے بیڈ کے نیچے سے ایک کارٹن کھینچنا شروع کیا۔

"ٹھہرو! میں نکالتا ہوں۔" سالار نے اسے روکا اور خود جھک کر اس کارٹن کو کھینچنے لگا۔
"بیڈ کے نیچے جتنے بھی ڈبے ہیں وہ سارے نکال لو۔ ان سب میں بکس ہیں۔" امامہ نے اسے ہدایت دی۔
سالار نے جھک کر بیڈ کے نیچے دیکھا۔ وہاں مختلف سائز کے کم از کم سات آٹھ ڈبے موجود تھے۔ وہ ایک کے بعد ایک ڈبا نکالتا گیا۔
"بس....؟" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے امامہ سے پوچھا۔
وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ کمرے میں موجود کپڑوں کی الماری کے اوپر ایک اسٹول پر چڑھی کچھ ڈبے اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سالار نے ایک بار پھر اسے ہٹا کر خود وہ ڈبے نیچے اتارے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کتابوں کی آخری کھیپ ہے کیونکہ کمرے میں اسے ڈبا رکھنے کی کوئی اور جگہ نظر نہیں آئی' یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ وہ اب الماری کو کھولے اس کے اندر موجود ایک خانے سے کتابیں نکال کر بیڈ پر رکھ رہی تھی۔ وہ کم از کم سو کتابیں تھیں جو اس نے الماری سے نکالی تھیں وہ کھڑا دیکھتا رہا۔ الماری کے بعد بیڈ سائیڈ ٹیبلز کی درازوں کی باری تھی' ان میں بھی کتابیں تھیں۔ بیڈ سائیڈ ٹیبلز کے بعد ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں اور خانوں کی باری تھی۔ کمرے میں موجود کپڑے کی جس باسکٹ کو وہ لانڈری باسکٹ سمجھا تھا' وہ بھی کتابیں اسٹور کرنے کے لیے استعمال ہو رہی تھی۔
وہ کمرے کے وسط میں کھڑا' اسے کمرے کی مختلف جگہوں سے کتابیں برآمد کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ بیڈ پر موجود کتابوں کا ڈھیر اب شیلف پر لگی کتابوں سے بھی زیادہ ہو چکا تھا لیکن وہ اب بھی بڑی شدومد کے ساتھ کمرے کی مختلف جگہوں پر رکھی ہوئی کتابیں نکال رہی تھی۔ اس نے ان کھڑکیوں کے پردے ہٹائے جو صحن میں کھلتی تھیں۔ اس کے بعد سالار نے اسے باری باری ساری کھڑکیاں کھول کر ان میں سے بھی کچھ کتابیں نکالتے ہوئے دیکھا' جو پلاسٹک کے شاپرز میں بند تھیں۔ شاید یہ احتیاط کتابوں کو مٹی اور نمی سے بچانے کے لیے کی گئی تھی۔
"بس اتنی ہی کتابیں ہیں۔" اس نے بالآخر سالار کو مطلع کیا۔
سالار نے کمرے میں چاروں طرف بکھرے ڈبوں اور ڈبل بیڈ پر پڑی کتابوں کے ڈھیر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بڑے تحمل سے پوچھا۔
"کوئی اور سامان بھی ہے....؟"
"ہاں! امی کے گھر اور کینوس اور پینٹنگز بھی ہیں میں لے کر آتی ہوں۔"
وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے نکل گئی۔
سالار نے ڈبل بیڈ پر پڑی کتابوں کے ڈھیر سے ایک کتاب اٹھائی' وہ ایک ناول تھا۔ گھٹیا رومانس لکھنے والے ایک بہت ہی مشہور امریکن رائٹر کا ناول۔ اس نے ٹائٹل پر نظر ڈالی اور بے اختیار اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آئی۔ اگر وہ اس ناول کا نام امامہ کے سامنے لیتا تو وہ سرخ ہو جاتی۔ اس نے ناول کھولا۔ کتاب کے اندر پہلے ہی خالی صفحے پر امامہ نے اپنا نام لکھا تھا۔ جس تاریخ کو وہ کتاب خریدی گئی' وہ تاریخ۔ جس جگہ سے خریدی گئی وہ جگہ۔ جس تاریخ کو کتاب پڑھنا شروع کیا اور جس تاریخ کو کتاب ختم کی۔ وہ حیران ہوا۔ اس طرح کے ناول کو وہ فضول سمجھتا تھا۔ وہ شاید یہ کبھی پسند نہ کرتا کہ اس رائٹر کے کسی ناول کو کوئی اس کے ہاتھ میں دیکھے مگر اس نے اس ناول پر اتنی سنجیدگی سے اپنا نام اور ڈیٹس لکھی ہوئی تھیں جیسے وہ بے حد اہم کتاب ہو۔ اس نے ناول کے چند اور صفحے پلٹے اور پھر کچھ بے یقینی کے عالم میں پلٹتا ہی چلا گیا۔ ناول کے اندر جگہ جگہ رنگین مارکرز کے ساتھ مختلف لائنز ہائی لائٹ کی گئی تھیں۔ بعض لائنز کے سامنے اسٹار اور بعض کے سامنے ڈبل اسٹار بنائے گئے تھے۔
وہ بے اختیار ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

ان لائنز میں بے ہودہ رومانس' بے حد پلے ٹونگ' سوپی باتیں' ذو معنی ڈائیلاگز تھے۔ ان پر لشار بنے ہوئے تھے اور وہ نشان زدہ تھے۔

سالار نے وہ ناول رکھتے ہوئے دوسرا ناول اٹھایا۔ پھر تیسرا۔ پھر چوتھا۔ پانچواں۔ چھٹا۔ ساتواں۔ وہ سب کے سب رومانٹک تھے۔ ایک ہی طرح کے رومانٹک ناولز اور وہ سب بھی اسی طرح ہائی لائیٹڈ تھے۔ وہ زندگی میں پہلی بار رومانٹک اور وہ بھی مڑائیڈ بونز اور بار براکارٹ لینڈ کی ٹائپ کے رومانس کے اتنے "سنجیدہ قاری" سے مل رہا تھا اور کتابوں کے اس ڈھیر کو دیکھتے ہوئے اس پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ وہ "کتابیں" نہیں پڑھتی تھی بلکہ صرف یہی ناولز پڑھتی تھی۔ کمرے میں موجود ان ڈیڑھ دو ہزار کتابوں میں اسے صرف چند پینٹنگز' تمگری اور شاعری کی کتابیں نظر آئی تھیں' باقی سب انگلش ناولز تھے۔

"اور یہ لے کر جانی ہیں۔" ایک ناول دیکھتے ہوئے وہ امامہ کی آواز پر بے اختیار چونکا۔

وہ کمرے میں دو تین چکروں کے دوران کچھ مکمل اور کچھ ادھوری پینٹنگز کا ایک چھوٹا سا ڈھیر بھی بنا چکی تھی۔ سالار اس دوران ان کتابوں کے جائزے میں مصروف رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ناول واپس کتابوں کے اس ڈھیر پر رکھ دیا جو بیڈ پر پڑا تھا۔ کارپٹ پر پڑی ان پینٹنگز پر نظر ڈالتے ہوئے سالار کو احساس ہوا کہ سعیدہ اماں کے گھر میں جا بجا لگی ہوئی پینٹنگز بھی اسی کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہیں اور یقیناً "ان پینٹنگز کے" کسی دیوار پر لٹکا نہ ہونے کا سبب مزید خالی جگہ کا دستیاب نہ ہونا تھا۔

"بیٹا! یہ سارا کاٹھ کباڑ کیوں اکٹھا کر لیا' یہ لے کر جاؤ گی ساتھ؟"

سعیدہ اماں کمرے میں آتے ہی کمرے کی حالت دیکھ کر چونکیں۔

"اماں! یہ ضروری چیزیں ہیں میری۔"

امامہ' سالار کے سامنے اس سامان کو کاٹھ کباڑ قرار دیے جانے پر کچھ جز بز ہوئی۔

"کیا ضروری ہے ان میں' یہ کتابیں تو ردی میں دے دیتیں۔ اتنا ڈھیر لگا لیا ہے اور تصویریں وہیں رہنے دیتیں' جہاں پڑی تھیں۔ چھوٹا سا گھر ہے تم لوگوں کا' وہاں کہاں پورا آئے گا یہ سب کچھ۔" سعیدہ اماں کتابوں کے اس ڈھیر کو دیکھ کر ہول ہو رہی تھیں۔ یقیناً انہوں نے بھی امامہ کی ساری کتابوں کو پہلی بار اکٹھا دیکھا تھا اور یہ ان کے لیے کوئی خوشگوار نظارہ نہیں تھا۔

"نہیں' آجائے گا پورا یہ سب کچھ۔ تین بیڈ رومز ہیں' ان میں سے ایک کو استعمال کریں گے یہ سامان رکھنے کے لیے' لیکن دوسری چیزوں کو بھی رکھنا پڑے گا۔ کمبل' کوئلٹس' رگز اور کشنز وغیرہ کو۔" وہ ایک سیکنڈ میں تیار ہو گئی تھی۔

"لیکن بیٹا! یہ سارا سامان تو کام کا ہے' گھر سجانا اس سے ہے' پر کتابوں کے ڈھیر اور تصویروں کا کیا کرو گی تم؟"

سعیدہ اماں اب بھی معترض تھیں۔

"کوئی بات نہیں' ان کی کتابیں ضروری ہیں۔ ابھی کچھ اور کارٹن یا شاپرز ہیں' جنہیں پیک کرنا ہے۔" سالار نے اپنے سویٹر کی آستینوں کو موڑتے ہوئے آخری جملہ امامہ سے کہا۔

تین بجے کے قریب وہ سارا سامان سالار کے گھر پر گیسٹ روم میں بکھرا ہوا تھا۔ فرقان نے اس دن بھی انہیں افطاری کے لیے اپنی طرف مدعو کیا ہوا تھا لیکن سالار نے معذرت کر لی۔ فی الحال اس سامان کو ٹھکانے لگانا زیادہ اہم تھا۔

ایک اسٹور میں سالار نے کچھ عرصے پہلے ایلومینیم اور شیشے کے ریکس والی کچھ الماریاں دیکھی تھیں۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ وہاں لگایا ہوا چکر بے کار نہیں گیا۔ چھ فٹ اونچی اور تین فٹ چوڑی ایک ہی طرح کی تین الماریوں نے

گیسٹ روم کی ایک پوری دیوار کو کور کر کے یک دم اسے اسٹڈی روم کی شکل دے دی تھی لیکن امامہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ ان تین الماریوں میں اس کی تقریباً" ساری کتابیں سما گئی تھیں۔ ان کتابوں کو اتنے سالوں میں پہلی بار کوئی ڈھنگ کی جگہ نصیب ہوئی تھی۔ اس کے ایزل اور ریکس لانڈری کی دیوار پر بنی ریکس پر سمیٹے گئے تھے۔

وہ جہیز کے سامان میں برتنوں اور بیڈ شیٹس کے علاوہ اور کچھ نہیں لائی تھی تب اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی قسمت میں اس سامان میں سے صرف ان ہی دو چیزوں کا استعمال لکھا تھا۔

سالار کا کچن ایریا اب پہلی بار ایک آباد جگہ کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ برتنوں کے لیے بنے ریکس کے شیشوں سے نظر آتی نئی کراکری اور کاؤنٹر کی سلیب پر کچن کے استعمال کی چھوٹی موٹی نئی چیزوں نے کچن کی شکل کو بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔

وہ لوگ رات کے دس بجے جب فارغ ہوئے تو اپارٹمنٹ میں آنے والا نیا سامان سمیٹا جا چکا تھا۔ ان کے لیے فرقان کے گھر سے کھانا آیا تھا لیکن اس رات امامہ نے اسے بڑے اہتمام کے ساتھ نئی کراکری میں سرو کیا تھا۔

"اچھا لگ رہا ہے نا یہ؟" امامہ نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ اس سے پوچھا۔

سالار نے اپنے سامنے موجود نئی برانڈڈ پلیٹ اور اس کے اطراف میں تھی چمکتی ہوئی کٹلری کو دیکھا اور پھر کانٹا اٹھا کر اسے بغور دیکھتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم کسی ریسٹورنٹ کی اوپننگ والے دن سب سے پہلے اور اکلوتے کسٹمرز ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے امامہ! کہ یہ کراکری اور کٹلری اتنی نئی ہے کہ اس میں کھانا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ ہم پرانے برتنوں میں نہیں کھا سکتے؟"

امامہ کا موڈ بری طرح آف ہوا۔ کم از کم یہ وہ جملہ نہیں تھا جو وہ اس موقع پر اس سے سننا چاہتی تھی۔

"لیکن یہ بہت خوب صورت ہیں۔" سالار نے فوراً" اپنی غلطی کی تصحیح کی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ فی الحال وہ مذاق کو سراہنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ امامہ کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

اپنی پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے سالار نے کہا۔ "کھانے کے بعد ہم کافی پینے چلیں گے۔" اس بار اس کے چہرے پر کچھ نرمی آئی۔

"کچن کا سامان لینا ہے۔" اس نے فوراً" کہا۔

وہ چاول کا چمچ منہ میں ڈالتے ڈالتے رک گیا۔ "ابھی بھی کوئی سامان لینا باقی ہے؟" وہ حیران ہوا۔

"گروسری چاہیے۔"

"کیسی گروسری۔۔۔؟ کچن میں سب کچھ تو ہے۔"

"آٹا، چاول، دالیں، مسالے کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔" امامہ نے جواباً" پوچھا۔

"ان کو میں نے کیا کرنا ہے؟ میں نے کبھی کھانا نہیں پکایا۔" سالار نے کندھے اچکا کر لاپروائی سے کہا۔

"لیکن میں تو پکاؤں گی نا۔ ہمیشہ تو دوسروں کے گھر سے نہیں کھا سکتے ہم۔" امامہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"جارز اور کنٹینرز بھی چاہئیں۔" امامہ کو یاد آیا۔

"فی الحال آج میرا اس طرح کی خریداری کرنے کا موڈ نہیں ہے۔ مجھے تھکن محسوس ہو رہی ہے۔" سالار کراہا۔

"اچھا ٹھیک ہے کل خرید لیں گے۔" امامہ نے کہا۔

اس رات وہ کافی کے لیے قریبی مارکیٹ تک ہی گئے تھے۔ گاڑی فورٹریس کے گرد گھماتے ہوئے انہوں نے

وہیں گاڑی میں بیٹھے ہوئے کافی پی۔
"شکر ہے کتابوں کو تو جگہ مل گئی۔"
سالار کافی پیتے ہوئے چونکا۔ وہ کھڑکی سے باہر دور شاپس کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائی تھی۔ اس کے لاشعور میں اب بھی کہیں وہ کتابیں ہی اٹکی ہوئی تھیں۔
"وہ کتابیں نہیں ہیں۔" سالار نے سنجیدگی سے کہا۔
کافی کا گھونٹ بھرتے اس نے چونک کر سالار کو دیکھا۔
"پچانوے فیصد ناولز ہیں۔۔۔ وہ بھی چیپ رومانس۔۔۔ پانچ دس میں سمجھ سکتا ہوں۔۔۔ چلو اتنے سالوں میں سو دو سو بھی ہو سکتے ہیں۔۔۔ لیکن ڈیڑھ دو ہزار اس طرح کے ناولز۔۔۔؟ تمہارا کتنا اسٹیمنا ہے اس طرح کی ربش پڑھنے کے لیے اور تم نے باقاعدہ مارک کر کے پڑھا ہے ان ناولز کو۔ میرا خیال ہے پاکستان میں چیپ رومانس کی سب سے بڑی کلیکشن اس وقت میرے گھر پر ہے۔"
وہ خاموش رہی۔ کافی پیتے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔
سالار کچھ دیر اس کی طرف سے کسی ردعمل کا انتظار کرتا رہا پھر اس کی لمبی خاموشی پر اسے خدشہ ہوا کہ کہیں وہ برا نہ مان گئی ہو۔ اپنا بایاں بازو اس کے کندھوں پر پھیلاتے ہوئے اس نے جیسے خاموش معذرت پیش کی۔
"ٹھیک ہے چیپ رومانس ہے، لیکن اچھا لگتا ہے مجھے یہ سب کچھ۔" وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کچھ دیر بعد بولی۔
"وہاں لوگ ہمیشہ مل جاتے ہیں۔۔۔ کوئی کسی سے بچھڑتا نہیں ہے۔۔۔ میرے لیے ونڈر لینڈ ہے یہ۔" وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے جیسے کہیں اور پہنچی ہوئی تھی۔
وہ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا اور اسے سنتا رہا۔
"جب اپنی زندگی میں کچھ بھی اچھا نہ ہو رہا ہو تو کسی ایسی دنیا میں جانا اچھا لگتا ہے، جہاں سب کچھ پرفیکٹ ہو۔ وہاں وہ کچھ ہو رہا ہو، جو آپ چاہتے ہیں۔۔۔ وہ مل رہا ہو، جو آپ سوچتے ہوں۔۔۔ جھوٹ ہے یہ سب کچھ لیکن کوئی بات نہیں، اس سے میری زندگی کی کڑواہٹ تھوڑی کم ہوتی تھی۔۔۔ جب میں جاب نہیں کرتی تھی تب زیادہ پڑھتی تھی ناولز۔۔۔ کبھی کبھار سارا دن اور ساری رات۔۔۔ جب میں یہ ناولز پڑھتی تھی تو مجھے کوئی بھی یاد نہیں آتا تھا۔ امی ابو، بہن بھائی، بھتیجے بھتیجیاں، بھانجے بھانجیاں۔۔۔ کوئی نہیں۔۔۔ ورنہ بہت مشکل تھا سارا دن یا رات کو سونے سے پہلے اپنی فیملی کے علاوہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچنا، اپنی زندگی کے علاوہ کسی اور کے بارے میں پریشان ہونا، میں خوف ناک خواب دیکھتی تھی اور پھر میں نے ان ناولز کے ذریعے خوابوں کی ایک دنیا بسالی۔ میں ناول کھولتی تھی اور یک دم زندگی بدل جاتی تھی۔ میری فیملی ہوتی تھی اس میں۔۔۔ میں ہوتی تھی۔۔۔ جلال ہوتا تھا۔"
سالار کافی کا گھونٹ نہیں لے سکا۔ اس کے لبوں پر اس وقت اس "شخص" کا نام سن کر کتنی اذیت ہوئی تھی اسے۔۔۔ نہیں 'اذیت' بہت ہی چھوٹا سا لفظ ہے۔ ایسی تکلیف انسان کو شاید مرتے وقت ہوتی ہوگی۔ یہاں اگر یہ ناولز اس کی "کامل دنیا" اور اس کا ونڈر لینڈ تھے تو اس میں جلال انصر ہی ہوتا ہوگا، سالار سکندر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ "مذہباً" اور "قانوناً" ایک رشتے میں بندھی تھی 'دل کے رشتے میں کہاں بندھی تھی۔ دل کے رشتے میں تو شاید ابھی تک۔۔۔ اور وہ تو ماضی تھا جہاں جلال انصر کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے وہ رنجیدگی سے سوچ رہا تھا اور امامہ کو بولتے ہوئے شاید احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے جلال کا نام لیا اور کس دائرے میں لیا تھا، احساس ہوتا تو وہ ضرور اٹکتی یا کم از کم ایک بار سالار کا چہرہ ضرور دیکھ لیتی۔ وہ ابھی بھی کھڑکی سے

باہر دیکھ رہی تھی۔ ابھی بھی کہیں "نور" تھی۔ ابھی بھی "کسی" کا صبر آزما رہی تھی۔

"اچھا لگتا تھا مجھے اس دنیا میں رہنا۔ وہاں امید تھی۔ روشنی تھی۔ انتظار تھا لیکن لاحاصل نہیں" تکلیف تھی مگر ابدی نہیں" آنسو تھے مگر کوئی پونچھ دیتا تھا اور واحد کتابیں تھیں جن میں امامہ ہاشم ہوتی تھی" آمنہ نہیں۔ ہر بار ان کتابوں پر اپنا نام لکھتے ہوئے میں جیسے خود کو یاد دلاتی تھی کہ میں کون ہوں۔ دوبارہ کتاب کھولنے پر جیسے کتاب مجھے بتاتی تھی کہ میں کون ہوں۔ وہ مجھے میرے پرانے نام سے بلاتی تھی۔ اس نام سے جس سے اتنے سالوں میں مجھے کوئی اور نہیں بلاتا تھا۔ تاریکی میں بعض دفعہ اتنی روشنی بھی بہت ہوتی ہے۔ جس سے انسان بے شک اپنے آپ کو نہ دیکھ پائے لیکن اپنا وجود محسوس کرنے کے تو قابل ہو جائے۔"

اس کی آواز اب بھیگنے لگی تھی۔ وہ خاموش ہو گئی۔ دونوں کے ہاتھوں میں پکڑے کپوں میں کافی ٹھنڈی ہو گئی تھی اور وہ اسے اب پینا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ اب ڈیش بورڈ پر پڑے ٹشو باکس سے ٹشو پیپر نکال کر اپنی آنکھیں خشک کر رہی تھی۔ سالار نے کچھ کہے بغیر اس کے ہاتھ سے کافی کا کپ لے لیا۔ ایک ڈسٹ بن میں دونوں کپ پھینکنے کے بعد وہ دوبارہ گاڑی میں آکر بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے امامہ سے پوچھا۔

"اور کافی چاہیے؟"

"نہیں۔" واپسی کا راستہ غیر معمولی خاموشی میں طے ہوا تھا۔



"مجھے آفس کا کچھ کام ہے تم سو جاؤ۔" وہ کپڑے تبدیل کر کے سونے کے بجائے کمرے سے نکل گیا۔

"میں انتظار کروں گی۔" امامہ نے اس سے کہا۔

"نہیں مجھے ذرا دیر ہو جائے گی۔" اس نے امامہ کے ہاتھ میں پکڑے ناول کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا جو وہ رات کو پڑھنے کے لیے کر آئی تھی۔

اسے واقعی آفس کے کچھ کام نمٹانے تھے مگر اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ آخری کام جو وہ آج کرنا چاہتا تھا وہ یہ تھا۔ کچھ دیر وہ لیپ ٹاپ آن کیے اپنی ٹیبل پر بیٹھا رہا' پھر یک دم اٹھ کر گیسٹ روم میں آ گیا۔ لائٹ آن کرتے ہی کتابوں سے بھری ہوئی سامنے دیوار کے ساتھ لگی الماریاں اس کی نظروں کے سامنے آ گئیں۔ اس نے ان کتابوں کو وہاں کچھ گھنٹے پہلے ہی رکھا تھا' بڑی احتیاط اور نفاست کے ساتھ۔ مصنف کے نام کے اعتبار سے ان کی مختلف ریکس پر گروپنگ کی تھی۔ تب تک وہ اس کے لیے صرف "امامہ کی کتابیں" تھیں لیکن اب وہ ان تمام کتابوں کو اٹھا کر بحیرۂ عرب میں ڈبو دینا چاہتا تھا یا کم از کم راوی میں تو پھینک ہی سکتا تھا۔ وہ اب کتابیں نہیں ردی تھی۔

امامہ کی وہ تصوراتی پرفیکٹ زندگی جو وہ جلال انصر کے ساتھ گزارتی رہی تھی۔ وہ ڈیڑھ دو ہزار رومانس ان کرداروں کے رومانس نہیں تھے جو ان ناولز میں تھے۔ وہ صرف دو کرداروں کا رومانس تھا۔ امامہ اور جلال کا۔ اعلا ظرف بننے کے لیے کھلے دل یا برداشت کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ دماغ کا کام نہ کرنا زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ وہ ریکس پر لگی ان کتابوں کو برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ امامہ کے اس اعتراف کے بعد کوئی شوہر بھی برداشت نہ کرتا۔ وہ بھی اس کا شوہر تھا۔ وہ ان کتابوں کو گھر میں نہیں رکھنا چاہتا تھا اور وہ ایسا کر سکتا تھا۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ روتی دھوتی' ناراض ہوتی لیکن اتنی بااختیار نہیں تھی کہ اس کی مرضی کے بغیر ان کتابوں کو وہاں رکھ سکتی۔ وہ عورت تھی۔ ضد کر سکتی تھی' منوا نہیں سکتی تھی۔ وہ مرد تھا اسے اپنی مرضی کے لیے ضد جیسے کسی حربے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ اس کا گھر تھا' یہ اس کی دنیا تھی۔ وہ شرائط کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا نہ ہی ایسے جی سکتا ہے۔ وہ

مراعات کے ساتھ دنیا میں آتا ہے اور اسی کے ساتھ دنیا میں رہتا ہے۔

تو آسان حل یہ تھا جو اسے معاشرہ اور اس کا ذہن بتا رہا تھا۔ مشکل حل وہ تھا جو اس کا دل اس سے کہہ رہا تھا اور دل کہہ رہا تھا۔ "چھوڑو، جانے دو یار! یہ زہر کا گھونٹ ہے لیکن پی جاؤ۔" اور دل نہ بھی کہتا تب بھی وہ اس چیز کو اپنے گھر سے نکال کر نہیں پھینک سکتا تھا جو امامہ کی ملکیت تھی۔ جو بھی اس کے دکھوں کے لیے مرہم بنی تھی۔ ان کتابوں کے کرداروں میں وہ جس کسی کو بھی سوچتی رہی تھی لیکن ان کتابوں پر لکھا ہوا نام اس کا اپنا تھا اور یہ وہ نام تھا جو اس کی روح کا حصہ تھا۔ صبر کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اور کوئی بھی قسم آسان نہیں ہوتی، وہاں کھڑے اس نے سوچا اور لائٹ آف کر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

وہ رمضان میں کبھی سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن اسٹڈی روم میں واپس آ کر اس نے سگریٹ سلگایا تھا۔ اس وقت خود کو نارمل کرنے کے لیے یہی واحد حل اس کی سمجھ میں آیا۔ ایک سگریٹ پینے کی نیت سے بیٹھے ہوئے اسے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کتنے سگریٹ پی چکا ہے۔

"سالار!" امامہ کی آواز پر وہ راکنگ چیئر پر بیٹھے بیٹھے چونکا۔ غیر محسوس انداز میں بائیں ہاتھ میں پکڑا سگریٹ اس نے ایش ٹرے میں مسلا۔ وہ دروازے میں ہی کھڑی تھی اور یقیناً اس کے ہاتھ میں سگریٹ دیکھ چکی تھی۔ نہ بھی دیکھتی تب بھی کمرے میں پھیلی سگریٹ کی بو اسے بتا دیتی۔

"تم اسموکنگ کرتے ہو؟" وہ جیسے کچھ پریشان اور شاکڈ انداز میں آگے بڑھی۔

"نہیں، بس کبھی کبھار۔ جب اپ سیٹ ہوتا ہوں تو ایک آدھ سگریٹ پی لیتا ہوں۔"

کہتے ہوئے سالار کی نظر ایش ٹرے پر پڑی۔ وہ سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی۔

"آج کچھ زیادہ ہی پی گیا۔"

وہ بڑبڑایا پھر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اپنا لہجہ ہموار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تم سوئیں نہیں ابھی تک؟"

"تم میری وجہ سے اپ سیٹ ہو؟" اس نے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا۔

تو اس نے محسوس کر لیا؟ سالار نے اس کا چہرہ دیکھا اور سوچا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا خوف اور اضطراب تھا۔ وہ نائٹی میں ملبوس اونی شال اپنے گرد لپیٹے ہوئے تھی۔ سالار جواب دینے کے بجائے راکنگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگائے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے کرسی کو ہلانا بند کر دیا تھا۔ اس کی خاموشی نے جیسے اس کے اضطراب میں اور اضافہ کیا۔

"تمہاری فیملی نے کچھ کہا ہے... یا میری فیملی نے کچھ کیا ہے؟"

وہ کیا سوچ رہی تھی؟ سالار نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔ کاش "یہ" وجہ ہوتی "وہ" نہ ہوتی، جو تھی۔

"کیا کہے گی میری فیملی... یا کیا کرے گی تمہاری فیملی...؟" اس نے مدھم آواز میں اس سے پوچھا۔ وہ اسی طرح الجھی ہوئی یوں چپ کھڑی رہی جیسے اسے خود بھی اس سوال کا جواب معلوم نہیں تھا لیکن وہ خاموش اسے دیکھتی رہی، یوں جیسے اسے یقین ہو کہ وہ سچ نہیں بول رہا۔ وہ حیران تھا کہ وہ کیسے کیسے خدشات ذہن میں لیے بیٹھی ہے۔

وہ راکنگ چیئر پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے اس وقت امامہ پر جیسے ترس آیا تھا۔

"یہاں آؤ!" اس نے سیدھے ہوتے ہوئے اس کا بایاں ہاتھ پکڑا۔ وہ جھجکی، ٹھٹکی پھر اس کی آغوش میں آ گئی۔

سالار نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اس کی شال کے اندر کرتے ہوئے اس کی شال کو اس کے گرد اور اچھی طرح سے لپیٹتے ہوئے، کسی ننھے بچے کی طرح اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے تھپکا اور اس کا سر چوما۔

”کوئی کچھ نہیں کہہ رہا۔ اور کوئی کچھ نہیں کر رہا۔ ہر کوئی اپنی زندگی میں مصروف ہے اور اگر کچھ ہو گا تو میں دیکھ لوں گا سب کچھ۔ تم اب ان چیزوں کے بارے میں پریشان ہونا چھوڑ دو۔“

وہ اسے گود میں لیے اب دوبارہ راکنگ چیئر پر جھول رہا تھا۔

”پھر تم اپ سیٹ کیوں ہو؟“

”میں ...؟ ... میرے اپنے بہت سے مسئلے ہیں۔“ وہ بڑبڑایا۔

امامہ نے گردن اوپر کرتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ اتنے دنوں میں وہ پہلی بار اسے اتنا سنجیدہ لگا تھا۔

”سالار! تم ...“

”میں پریشان نہیں ہوں اور اگر ہوں بھی تو تم اس کی وجہ نہیں ہو۔ اب دوبارہ مجھ سے یہ سوال مت کرنا۔“ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے اس نے بے حد سخت لہجے میں جھڑکنے والے انداز میں اس کی بات کاٹ کر سوال سے پہلے جواب دیا۔ وہ جیسے اس کا ذہن پڑھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے کچھ بول نہیں سکی۔ اس کا لہجہ بہت سخت تھا اور سالار کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا۔

”تم کیا کہہ رہی تھیں مجھ سے کہ کچن کے لیے کچھ چیزوں کی ضرورت ہے۔؟“ اس نے اس بار بے حد نرمی کے ساتھ موضوع بدلا۔

امامہ نے ایک بار پھر اسے ان چیزوں کے نام بتائے۔

”کل چلیں گے رات کو گروسری کے لیے۔“

امامہ نے اس بار کچھ نہیں کہا۔ اس کے سینے پر سر رکھے وہ دیوار پر اس سوفٹ بورڈ پر لگے بہت سے نوٹس ڈیڈ لائنز اور کچھ عجیب سے انڈیکسز والے چارٹس دیکھتی رہی پھر اس نے سالار سے پوچھا۔

”تم بینک میں کیا کرتے ہو؟“

وہ ایک لمحے کے لیے چونکا پھر اس نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے بورڈ پر نظر ڈالی۔

”میں بے کار کام کرتا ہوں۔“ وہ بڑبڑایا۔

”مجھے بینکرز بھی اچھے نہیں لگے۔“ امامہ کو اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے کتنے غلط وقت پر یہ تبصرہ کیا ہے۔

”جانتا ہوں، تمہیں ڈاکٹرز اچھے لگتے ہیں۔“ سالار کے لہجے میں خفگی آئی تھی۔

”ہاں، مجھے ڈاکٹرز اچھے لگتے ہیں۔“ امامہ نے سادہ لہجے میں بورڈ کو دیکھتے ہوئے کچھ بھی محسوس کیے بغیر اس کے سینے پر سر رکھے اس کی تائید کی۔ یہ کہتے ہوئے اسے جلال کا خیال نہیں آیا تھا لیکن سالار کو آیا تھا۔

”تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تم بینک میں کیا کرتے ہو؟“ امامہ نے دوبارہ پوچھا۔

”میں پبلک ریلیشننگ میں ہوں۔“ اس نے یہ جھوٹ کیوں بولا، وہ خود بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ امامہ نے بے اختیار اطمینان بھرا سانس لیا۔

”یہ پھر بھی بہتر ہے۔ اچھا ہے تم ڈائریکٹ بینکنگ میں نہیں ہو۔ تم نے کیا پڑھا تھا سالار؟“

”ماس کمیونیکیشنز۔“ وہ ایک کے بعد ایک جھوٹ بول رہا تھا۔

”مجھے یہ سبجیکٹ بہت پسند ہے۔ تمہیں کچھ اور پڑھنا چاہیے تھا۔“

”یعنی ڈاکٹر؟“ سالار سلگا تھا لیکن امامہ کھلکھلا کر ہنسی۔

”ماس کمیونیکیشنز پڑھ کر تو ڈاکٹر نہیں بن سکتے۔“ سالار نے جواب نہیں دیا۔ اگر وہ اس کا چہرہ دیکھ لیتی تو اتنی بے تکلفی کے ساتھ یہ سارے تبصرے نہ کر رہی ہوتی۔

"میں ڈاکٹروں سے نفرت کرتا ہوں۔" سالار نے سرد لہجے میں کہا وہ بے اختیار سالار سے الگ ہوئی۔

"کیوں؟" اس نے حیرت سے سالار کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کا چہرہ بے تاثر تھا، کم از کم امامہ اسے پڑھ نہیں سکی۔

"ایسے ہی۔" سالار نے کندھے اچکاتے ہوئے بڑی سرد مہری سے کہا۔

"ایسے ہی کیسے۔۔۔؟ کوئی وجہ تو ضرور ہو گی۔" وہ جز بز ہوئی۔

"تمہیں کیوں ناپسند ہیں بینکرز؟" سالار نے ترکی بہ ترکی جواب کہا۔

"بددیانت ہوتے ہیں۔" امامہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"بینکرز؟" سالار نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں۔" اس بار وہ سنجیدہ تھی۔

وہ سالار کا بازو اپنے گرد سے ہٹاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سالار نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اب قریب جا کر بورڈ کو دیکھ رہی تھی۔ اس پر لگائے ہوئے نوٹس اور ڈیڈ لائنز پڑھ رہی تھی۔

"بینکرز لوگوں کا پیسہ، اثاثے محفوظ رکھتے ہیں۔"

اس نے اپنے عقب میں سالار کو بڑے جتانے والے انداز میں کہتے سنا۔

"اور پیسہ لوگوں کا ایمان خراب کر دیتا ہے۔" اس نے مڑے بغیر جواب دیا۔

"اس کے باوجود لوگ ہمارے پاس آتے ہیں۔" سالار نے اسی انداز میں کہا۔ اس بار امامہ پلٹی۔

"لیکن وہ آپ پر بھروسا نہیں کرتے۔"

وہ مسکرا رہی تھی مگر سالار نہیں۔ اس نے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھا، پھر اثبات میں سر ہلایا۔

"ایک بددیانت بینکر صرف آپ کا پیسہ لے سکتا ہے لیکن ایک بددیانت ڈاکٹر آپ کی جان لے سکتا ہے تو پھر زیادہ خطرناک کون ہوا؟"

اس بار امامہ بول نہیں سکی۔ اس نے چند منٹ تک جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن اسے جواب نہیں ملا، پھر اس نے یک دم سالار سے کہا۔

"اگر میں ڈاکٹر ہوتی تو پھر بھی تمہیں ڈاکٹرز سے نفرت ہوتی۔۔۔؟"

وہ اب اسے جذباتی بلیک میل کر رہی تھی۔ یہ غلط تھا لیکن اب وہ اور کیا کرتی؟

"میں ممکنات پر کوئی نتیجہ نہیں نکالتا، زمینی حقائق پر نکالتا ہوں۔ جب "اگر" ایگزسٹ نہیں کرتا تو میں اس پر رائے بھی نہیں دے سکتا۔" اس نے کندھے اچکا کر صاف جواب دیا۔

امامہ کا رنگ کچھ پھیکا پڑ گیا۔ جواب غیر متوقع تھا، کم از کم سالار کی زبان سے۔

"زمینی حقائق یہ ہیں کہ تم میری بیوی ہو اور تم ڈاکٹر نہیں ہو۔ میں بینکر ہوں اور میں ڈاکٹرز سے نفرت کرتا ہوں۔"

اس کے لہجے کی ٹھنڈک پہلی بار امامہ تک پہنچی تھی، لہجے کی ٹھنڈک یا پھر آنکھوں کی سرد مہری۔ وہ بول نہیں سکی اور نہ ہی ہل سکی۔ ایک ہفتے میں اس نے اس طرح تو کبھی اس سے بات نہیں کی تھی۔

"رات بہت ہو گئی ہے، سونا چاہیے ہمیں۔"

وال کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے وہ اسے دیکھے بغیر کرسی سے اٹھ کر چلا گیا۔

وہ دیوار کے ساتھ لگی جھولتی ہوئی کرسی کو دیکھتی رہی، وہ اس کے بدلتے موڈ کی وجہ سمجھ نہیں سکی تھی۔ وہ کوئی ایسی بات تو نہیں کر رہے تھے جس پر وہ اس طرح کے الفاظ کا استعمال کرتا۔ وہ وہاں کھڑی اپنی اور اس کے درمیان

ہونے والی گفتگو کو شروع سے یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید اسے پینٹرز کے بارے میں میرے کمنٹس اچھے نہیں لگے۔ وہ جیسے تجزیہ کر رہی تھی۔

جب وہ دوبارہ کمرے میں آئی تو کمرے کی لائٹ آن تھی لیکن وہ سو چکا تھا۔ وہ اپنے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ سارا دن کام کرتی رہی تھی لیکن بری طرح تھک جانے کے باوجود اس وقت اس کی نیند یک دم غائب ہو گئی تھی۔ سالار کے بارے میں سارے اندیشے جو اس کے ساتھ گزارے ہوئے ایک ہفتے نے سلا دیے تھے یک دم پھر سے جاگ اٹھے تھے۔ وہ اس کی طرف کروٹ لیے ہوئے سو رہا تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ اس سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا۔ کم از کم نیند کی حالت میں پرسکون لگ رہا تھا۔

"آخر مرد اتنی جلدی کیوں بدل جاتے ہیں؟ اور اتنے ناقابل اعتبار کیوں ہوتے ہیں؟" اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس نے سوچا اس کی رنجیدگی میں اضافہ ضرور ہوا تھا۔ زندگی اتنی محفوظ نہیں ہوئی تھی جتنی وہ کچھ گھنٹے پہلے تک سمجھ رہی تھی۔

"آج لائٹ آن کر کے سو گئی کیا؟" سالار کروٹ لیتے ہوئے بڑبڑایا۔

وہ یقیناً "گہری نیند" میں نہیں تھا۔ امامہ نے ہاتھ بڑھا کر لائٹس آف کر دیں لیکن وہ سونے کے لیے نہیں لیٹی تھی۔ اندھیرے میں سالار نے دوبارہ اس کی طرف کروٹ لی۔

"تم سو کیوں نہیں رہیں؟"

"ابھی سو جاؤں گی۔"

سالار نے ہاتھ بڑھا کر اپنا بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کر دیا۔ امامہ نے کچھ کہے بغیر کمبل خود پر کھینچا اور سیدھے لیٹتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ سالار چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے لیمپ دوبارہ آف کر دیا۔ امامہ نے دوبارہ آنکھیں کھول لیں۔

"تمہیں سحری کے وقت بھی اٹھنا ہے امامہ!"

اسے حیرت ہوئی اس نے اسے اندھیرے میں آنکھیں کھولتے ہوئے کیسے دیکھ لیا تھا۔

گردن موڑ کر اس نے سالار کی طرف دیکھنے کی کوشش کی اسے کچھ نظر نہ آیا۔

"تمہیں پتا ہے سالار! دنیا کا سب سے بے ہودہ کام کون سا ہے؟" اس نے سالار کی طرف کروٹ لے کر کہا۔

"کیا ۔۔۔؟"

"شادی۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

چند لمحے خاموشی کے بعد اس نے سالار کو کہتے سنا۔

"I agree"

امامہ کو بے اختیار دکھ ہوا۔ کم از کم سالار کو اس بات سے اتفاق نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے سالار کا بازو اپنے گرد حائل ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ اب اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"گڈ نائٹ۔" یہ اسے سلانے کی ایک اور کوشش تھی۔

وہ چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے کچھ بے چین ہو کر کہا۔

"سالار!"

سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا اور آنکھیں کھول دیں۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" جھوٹ "ضروری" تھا لیکن سچ بے حد "مضر" تھا۔

"تم میرے ساتھ اتنے روڈ ہوئے۔" اس نے بالآخر شکایت کی۔

"آفس کے کسی پرابلم کی وجہ سے میں کچھ اپ سیٹ تھا شاید اسی لیے روڈ ہو گیا۔" اس نے معذرت کی' وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

"کیسا پرابلم؟"

"ہوتے رہتے ہیں امامہ۔ you just don't worry اگر آئندہ کبھی بھی میرا ایسا موڈ ہو تو تم پریشان مت ہونا' نہ ہی مجھ سے زیادہ سوال جواب کرنا۔ میں خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

امامہ کی سمجھ میں اس کی توجیہہ نہیں آئی تھی لیکن وہ پرسکون ہو گئی تھی۔

"میں اس لیے پریشان ہو رہی تھی کیونکہ مجھے لگا کہ شاید تمہیں میری کوئی بات بری لگی ہے۔ میں نے پینٹرز کو برا کہا تھا اس لیے۔"

"تمہیں تو سات خون معاف کر سکتا ہوں میں' یہ تو کوئی بات ہی نہیں۔"

اس نے ایک بار پھر گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو' ڈاکٹرز میں بھی بہت سی برائیاں ہوتی ہیں لیکن مجھے بس اچھے لگتے ہیں وہ۔ بس محبت ہے مجھے ڈاکٹرز سے۔ میں بھی ان کی ساری خامیاں اگنور کر سکتی ہوں۔" سالار کی آنکھوں سے نیند یک دم غائب ہو گئی۔ وہ کسی اور حوالے سے وضاحت دے رہی تھی' اس نے اسے کسی اور پیرائے میں لیا۔

"تمہیں واقعی ڈاکٹرز سے نفرت ہے؟" وہ اب بے یقینی کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

"جو چیز تمہیں پسند ہو' میں اس سے نفرت کر سکتا ہوں۔ مذاق کر رہا تھا میں۔" امامہ کے ہونٹوں پر مطمئن مسکراہٹ آ گئی۔

اس نے بھی سالار کے گرد اپنا بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔

"اب مجھے نیند آ رہی ہے' تم بھی سو جاؤ۔"

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ محبوب کی دو خصوصیات یونیورسل ہوتی ہیں۔ وہ بے نیاز ہوتا ہے۔ اور اور اپنی بے نیازی سے بے خبر بھی۔ اور یہ دونوں خصوصیات اس کے محبوب میں بھی تھیں۔ جلال انصر سے ایک بار پھر شدید قسم کا حسد محسوس ہوا۔ لیکن رشک اسے اپنے آپ پر آیا کہ وہ اس کے "پاس" تھی۔ اور اس کی تھی۔



"صاحب نے نیوز پیپرز کا کہا تھا کہ آپ سے پوچھ لوں اور یہ میگزین ہیں' ان میں سے جو پسند ہیں' بتا دیں' میں لے آیا کروں گا۔"

نیوز ہاکر نے اسے ایک کاغذ تھماتے ہوئے کہا جس پر اخبارات اور میگزینز کی ایک لسٹ تھی۔ وہ نیند میں بیل بجنے کی آواز پر اٹھ کر آئی تھی۔ کچھ دیر تک تو سمجھ ہی نہیں پائی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ سالار کے گھر اس نے صرف اتوار کو اخبار دیکھا تھا' وہ بھی سالار نے ہاکر سے خود لیا تھا۔ وہ خود آفس میں ہی اخبار دیکھتا تھا۔ اب وہ یقیناً اس کی وجہ سے اخبار لگوا رہا تھا۔ ایک نظر اس لسٹ پر ڈال کر اس نے ہاکر کو ایک اخبار اور ایک میگزین کا بتایا۔ وہ اخبار اسے تھما کر چلا گیا۔ وہ جمائیاں لیتے ہوئے اخبار اندر لائی اور رکھ دیا۔ دس بجنے والے تھے' کھڑکی سے باہر دھند چھٹ رہی تھی لیکن ابھی بھی کچھ تھی۔

جتنی دیر میں ملازمہ آئی' وہ اخبار دیکھ چکی تھی۔ ملازمہ آج اکیلی نہیں تھی اس کے ساتھ مالی بھی تھا۔ وہ فرقان کے پودے دیکھنے آیا تھا۔ وہ سالار کے پودے اتوار کے دن دیکھنے آتا تھا یا پھر نوشین خود اس کے ساتھ وہاں آتی تھی۔ سالار کے اپارٹمنٹ کی ایک چابی ان کے پاس بھی تھی۔ آج نوشین نے یہاں امامہ کی موجودگی کی وجہ سے اسے بھیج دیا تھا۔

وہ اس کے ٹیرس پر جانے کے کچھ دیر کے بعد خود بھی باہر نکل آئی۔ مالی کے پاس کھڑے خاموشی سے اسے دیکھتے رہنے کے دوران اسے احساس ہوا کہ اسے کسی قسم کی ہدایات کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ماہرانہ انداز میں اپنا کام کر رہا تھا' وہ واپس اندر آگئی۔ ملازمہ نے بڑے پرجوش انداز میں کچن میں رکھے ہوئے برتنوں کو نوٹس کرنے کے بعد تعریف کی۔ امامہ بے اختیار خوش ہوئی۔

"باجی! اب یہ گھر گھر لگ رہا ہے۔" اس نے امامہ سے کہا۔ وہ سالار کی اسٹڈی کو ویکیوم کر رہی تھی۔ امامہ مسکراتی ہوئی سالار کی اسٹڈی ٹیبل پر پڑی ڈسٹ صاف کرنے لگی۔

"باجی! میں کرتی ہوں' آپ رہنے دو۔" ملازمہ نے اسے روکا۔

"نہیں' تم باقی سب کرلینا۔ میں ابھی فارغ ہوں' اس لیے کر رہی ہوں۔" وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکی کہ وہ نہیں چاہتی کہ سالار کا کوئی کاغذ ادھر ادھر ہو جائے لیکن یہ سوچتے ہوئے وہ یہ بھول گئی تھی کہ اس گھر میں اس اسٹڈی ٹیبل کو اتنے عرصے سے وہ ملازمہ ہی صاف کر رہی ہے۔

میل ٹرے دعوتی کارڈز کے بند اور کھلے لفافوں سے تقریباً بھری ہوئی تھی۔ امامہ نے ایک لفافہ کھول کر دیکھا۔ وہ کسی افطار پارٹی کا انویٹیشن تھا۔ ایک کے بعد ایک' وہ سارے لفافے کھول کر دیکھتی گئی۔ سب کارڈ کسی نہ کسی افطار پارٹی یا تقریب سے متعلق تھے اور بعض کارڈز میں تو وہ دو یا تین جگہوں پر بھی انوائٹڈ تھا۔ وہ یقیناً "بے حد سوشل زندگی گزار رہا تھا۔ یہ اس کا اندازہ تھا یقیناً" وہ اس کے گھر آجانے کی وجہ سے پچھلے ایک ہفتے سے ان پارٹیز میں نہیں جا رہا تھا۔ یہ اس کا ایک اور تجزیہ تھا۔ پندرہ بیس کارڈز دیکھنے کے بعد اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ اس نے کارڈز اٹھا کر واپس رکھ دیے۔ کچھ اور کارڈز دیکھتی یا نیچے میل کے کسی لفافے کے ایڈریس پر نظر ڈال لیتی تو شاید اسے سالار کا شعبہ نظر آجاتا کہ وہ انویسٹمنٹ میں تھا' آر میں نہیں۔ کم از کم وہ یہ جھوٹ تو ضرور پکڑ سکتی تھی۔

"باجی! رات کو کوئی مہمان آئے تھے؟" وہ ملازمہ کی آواز پر چونکی۔ وہ ایش ٹرے ہاتھ میں لیے کچھ حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں۔" امامہ نے سوال سمجھے بغیر کہا۔

"تو یہ سگریٹ کس نے پیے ہیں؟ سالار صاحب تو سگریٹ نہیں پیتے۔" ملازمہ بے حد حیران تھی۔

امامہ کچھ دیر بول نہیں سکی۔ ملازمہ جیسے سالار کے بیان کی تصدیق کر رہی تھی۔ یعنی وہ واقعی عادی نہیں تھا جو ایک آدھ سگریٹ وہ بھی کبھار پیتا ہوگا' اسے ملازمہ کسی مہمان کا پیا ہوا سگریٹ سمجھ لیتی ہوگی۔

"اوہ! ہاں... اس کے کچھ دوست آئے تھے' مجھے یاد نہیں تھا۔" امامہ نے چند لمحوں کے بعد کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی ڈور بیل بجی۔

"میں دیکھتی ہوں۔" امامہ اس سے کہہ کر باہر نکل آئی۔

"لانڈری کولیکٹ کرنے آئے ہیں۔"

دروازے پر ایک لڑکا سالار کے کچھ ڈرائی کلینڈ اور دھلے ہوئے کپڑوں کے ہینگرز لیے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کی طرف ایک بل کے ساتھ بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔

"کپڑے چیک کر لیں۔"

بل کے ساتھ لانڈری کے لیے بھیجے گئے کپڑوں کی لسٹ بھی تھی۔ امامہ نے ڈینگرز لاؤنج میں لانے کے بعد باری باری لسٹ اور کپڑوں کو ملانا شروع کیا۔ کپڑے پورے تھے۔

ملازمہ تب تک باہر نکل آئی تھی۔ امامہ بل کے پیسے لینے اندر چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو اس نے ملازمہ کو دروازے پر لانڈری بوائے کو ایک لانڈری بیگ تھماتے ہوئے دیکھا۔ جس کے اوپر ایک لسٹ چسپاں تھی۔ یقیناً وہ ان کپڑوں کی لسٹ تھی جو لانڈری کے لیے دیے جا رہے تھے۔ لانڈری بوائے ایک رائٹنگ پیڈ پر کچھ اندراج کر رہا تھا۔

"باجی! آپ نے بھی دینے ہیں کپڑے؟" ملازمہ نے اسے آتے دیکھ کر کہا۔

"نہیں' میں یہ بل دینے آئی ہوں۔" امامہ نے بل کی رقم اس لڑکے کی طرف بڑھائی۔ اس نے جواباً ایک رسید اس کی طرف بڑھا دی۔

"بل تو مہینے کے شروع میں اکٹھا ہی جاتا ہے۔" ملازمہ نے اسے روکا۔

وہ دروازہ بند کرتے ہوئے اندر آ گئی۔ امامہ نے رسید پر نظر ڈالی۔ وہ سالار کے کپڑوں کی لسٹ تھی جو وہ لے کر گیا تھا۔

"تم نے لانڈری کے کپڑے کہاں سے لیے ہیں؟" امامہ نے اس لسٹ کو پڑھتے ہوئے ملازمہ کو روکا۔

"سالار صاحب کپڑے بیگ میں ڈال کر اوپر لسٹ رکھ جاتے ہیں۔ لانڈری میں ہی رکھتے ہیں بیگ۔" ملازمہ یہ کہہ کر دوبارہ اندر چلی گئی۔

امامہ نے بل پر نظر ڈالی۔ لانڈری تو وہ خود بھی کر سکتی تھی۔ ہر ہفتے اتنے پیسے اس پر خرچ کرنا فضول خرچی تھی' اس نے سوچا۔

ملازمہ ابھی وہیں تھی جب ایک آدمی وہ پردے لے کر آیا تھا جو اس نے بننے کے لیے دیے تھے۔

"باجی! آپ نے کوئی پردے بننے کے لیے دیے ہیں؟"

ملازمہ نے انٹر کام کی بیل بجنے پر ریسیور اٹھا کر ان سے پوچھا۔

امامہ کچھ حیران ہوئی۔ "ہاں... کیوں؟"

"وہ نیچے گیٹ پر ایک آدمی لے کر آیا ہے' گارڈ انٹر کام پر پوچھ رہا ہے۔ ہاں! بھیج دو' باجی نے پردے بنوائے ہیں۔" ملازمہ نے اس کو جواب دے کر ریسیور پر گارڈ سے کہا۔ ریسیور رکھ کر وہ دوبارہ لاؤنج صاف کرنے میں لگ گئی تھی۔

کچن کاؤنٹر پر گلاس سیٹ کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے امامہ کو عجیب طرح کا احساس کمتری ہوا۔ اس نے اتنے دنوں وہاں چلتے پھرتے کئی بار انٹر کام کو دیکھا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس انٹر کام کی وہاں کیا افادیت ہے' جبکہ دروازہ اتنا قریب تھا۔ ملازمہ اس گھر کی ہر چیز کو اس سے زیادہ مہارت' پھرتی اور سہولت کے ساتھ استعمال کر رہی تھی۔



"سالار! لاؤنج اب اچھا لگ رہا ہے نا؟"

سالار نے لاؤنج کی کھڑکیوں پر لگے نئے پردوں پر ایک نظر ڈالی۔ وہ ابھی چند لمحے پہلے گھر آیا تھا۔ امامہ نے بے حد خوشی کے عالم میں آتے ہی اسے اطلاع دی۔ وہ نہ بھی دیتی تب بھی لاؤنج میں پہلا قدم رکھتے ہی وہ اس "واضح" تبدیلی کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

"بہت۔" اس نے اپنی مایوسی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ امامہ نے فخریہ انداز میں پردوں کو دیکھا۔

وہ آج بھی افطاری راستے میں ہی کر آیا تھا۔ امامہ نے افطاری فرقان کے گھر پر کی تھی اور اب وہ دونوں ایک ساتھ ڈنر کر رہے تھے۔

"تو جناب کا آج کا دن کیسا گزرا؟"
کھانا شروع کرتے ہوئے سالار نے اس سے پوچھا۔ وہ اسے پورے دن کی ایکٹیوٹیز بتانے لگی۔ آج ان دونوں کے درمیان ہونے والی یہ پہلی تفصیلی گفتگو تھی۔ سالار نے اسے دن میں دو بار ایک یا ڈیڑھ منٹ کے لیے کال کی تھی مگر بات صرف حال احوال تک ہی رہی تھی۔
"یعنی آج بہت کام کرنا پڑا۔" سالار نے اس کے دن کی تفصیل سن کر کہا۔
"کیا کام... ؟ میں نے کیا کیا... ؟ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" امامہ نے اس کی بات پر کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔
"جتنا بھی کیا ہے، بہت ہے۔"
"میں تمہاری لانڈری خود کر دیا کروں گی اگلے ہفتے سے۔" امامہ نے سالار کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
"اور پریس بھی کر دیا کروں گی۔"
"میں تمہیں کپڑے دھونے کے لیے نہیں لے کر آیا۔" سالار نے اس کی بات کاٹی۔
"مجھے پتا ہے لیکن میں فارغ ہوتی ہوں سارا دن اور پھر مجھے اپنے کپڑے بھی تو دھونے ہیں تو تمہارے بھی دھو سکتی ہوں۔"
"تم اپنے کپڑے بھی کیوں دھوؤ گی۔ لانڈری وین ہر ہفتے آتی ہے۔ تم اپنے بھی دے دیا کرو۔" سالار نے کھانا کھاتے کھاتے رک کر کہا۔
"پیسے ضائع ہوں گے۔" اس نے بے اختیار کہا۔
"کوئی بات نہیں۔" سالار نے اسی انداز میں کندھے اچکا کر کہا۔
امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔
"اور میں سارا دن کیا کروں؟"
"وہی جو دوسری عورتیں کرتی ہیں۔ سیر کرو، ٹی وی دیکھو، فون پر دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگاؤ۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"میرے کوئی دوست نہیں ہیں۔" وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی۔
سالار نے کچھ حیران ہو کر اس کا چہرہ دیکھا۔ "کوئی تو ہو گا... ؟"
"نہیں کوئی بھی نہیں ہے۔"
"کیوں؟"
وہ کھانا کھاتے کھاتے کچھ سوچنے لگی تھی پھر اس نے کہا۔
"کالج اور یونیورسٹی میں تو میں اتنی خوف زدہ رہتی تھی کہ کسی کو دوست بنانے کا خیال ہی نہیں آیا۔ دوستی ہوتی تو پھر سوال ہوتے... میرے بارے میں... فیملی کے بارے میں... پھر اگر کوئی گھر آتا اور ابو کی فیملی کو کوئی پہلے سے جانتا ہوتا تو... یا سعیدہ اماں کو ہی... دوستی اس وقت بڑی مہنگی چیز تھی میرے لیے... میں افورڈ نہیں کر سکتی تھی... پھر آفس جاب میں کولیگز کے ساتھ تھوڑی بہت گپ شپ ہوئی تھی لیکن مجھے اکیلے رہنے کی اتنی عادت ہو گئی تھی کہ میں لوگوں کے ساتھ بھی کمفرٹیبل نہیں رہتی تھی۔ میں ان کے ساتھ گھوم پھر نہیں سکتی تھی... ان کے گھر نہیں جا سکتی تھی... اپنے گھر نہیں بلا سکتی تھی... کیسے دوستی ہوتی پھر... اسی لیے مجھے کتابیں پڑھنا اچھا لگتا تھا... پینٹ کرنا اچھا لگتا تھا۔"
"لوگوں سے میل جول ہونا چاہیے، دوست ہونے چاہئیں۔ پہلے کی بات اور تھی لیکن اب تمہیں تھوڑا

سوشلائز کرنا چاہیے۔ اب تمہارا گھر ہے تم کولیگز کو انوائٹ کرو یا کم از کم ان سے فون پر ہی بات کر لیا کرو۔" وہ اسے بڑی سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا۔

"تم خود سوشل ہو اس لیے کہہ رہے ہو۔" امامہ نے جواباً کہا۔

"ہاں میری جاب کی ضرورت ہے سوشل ہونا۔ ماہ رمضان کے بعد کچھ فنکشنز ہیں۔ ڈنرز بھی ہیں کچھ... تمہیں ملواؤں گا کچھ دوستوں سے بھی۔ اچھا لگے گا تمہیں۔" وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

"میں نے تمہارے ڈیسک پر دیکھے ہیں 'افطار ڈنرز کے کارڈز۔' تم میری وجہ سے نہیں جا رہے؟" امامہ نے کہا۔

"نہیں میں افطار پارٹیز یا ڈنرز میں نہیں جاتا۔" سالار نے سرسری انداز میں کہا۔

"کیوں؟" وہ حیران ہوئی۔

"کیونکہ میں سمجھتا ہوں یہ پارٹیز ماہ رمضان کی اسپرٹ کا مذاق اڑاتی ہیں۔ میں ماہ رمضان میں کسی کے گھر افطار پر نہیں جاتا۔"

"لیکن تم فرقان کے گھر تو جاتے ہو۔" امامہ نے بے ساختہ کہا' وہ مسکرا دیا۔

وہ اس وقت بھی فرقان کے گھر سے آیا ہوا کھانا کھا رہے تھے۔

"میں فرقان کے گھر ماہ رمضان سے پہلے بھی کھانا کھاتا رہا ہوں اور اگر وہ مجھے افطار یا ڈنر کے لیے بلاتا ہے تو کھانے میں کوئی اہتمام نہیں کرتا۔ ہم وہی کھاتے ہیں جو اس کے گھر میں عام دنوں میں پکتا ہے لیکن عام دنوں میں اس کے گھر میں یہ نہیں پکتا۔" سالار نے ٹیبل پر پڑی تین چار چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔

"پھر...؟" وہ مزید حیران ہوئی۔

"یہ سارا اہتمام فرقان اور بھابھی تمہارے لیے کر رہے ہیں کیونکہ ہماری نئی نئی شادی ہوئی ہے تو تمہارے لیے سحری اور افطاری میں بھی اہتمام ہو رہا ہے' ورنہ تو ہم سادہ کھانا کھاتے ہیں۔ ماہ رمضان میں ہم لوگ اپنے کچن کے لیے گروسری پر عام مہینوں کی نسبت آدھا خرچا کرتے ہیں اور آدھے پیسوں سے ہم کسی اور فیملی کو پورے مہینے کا راشن منگوا دیتے ہیں۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے تمہارا۔" سالار نے اسے متوجہ کیا' وہ خود کھانا ختم کرکے اب میٹھا کھا رہا تھا۔

یہ ڈاکٹر سبط علی کے گھر کی روایت تھی۔ ماہ رمضان میں ان کے گھر آنے والا راشن آدھا ہو جاتا تھا۔ گھر کے دو ملازموں کے ماہ رمضان کا راشن اس باقی راشن کی قیمت سے آتا تھا۔

"امامہ!" سالار نے پھر اسے کھانے کی طرف متوجہ کیا۔

وہ کھانا کھانے لگی۔ سالار میٹھا بھی ختم کر چکا تھا اور اب منتظر تھا۔ وہ کھانا ختم کرے۔ وہ خود ساتھ ساتھ سیل پر مسلسل میسجز کرنے میں مصروف تھا۔ وہ کس حد تک بدل گیا تھا اور اس کے اندر آنے والی تبدیلی کس حد تک ڈاکٹر صاحب کی مرہون منت تھی اور کس حد تک اس کی اپنی سوچ کی' اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے ہمیشہ اس کے کھانا شروع کرنے کا انتظار کرتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے کچھ نہ کچھ اس کی پلیٹ میں ضرور رکھتا تھا اور اس کے کھانا ختم کرنے کے بعد ہی کھانے کی ٹیبل سے اٹھتا۔ وہ یہ باتیں نوٹس نہیں کرنا چاہتی تھی' لیکن وہ یہ نوٹس کیے بغیر بھی رہ نہیں سکتی تھی۔ وہ عجیب تھا۔ "عجیب؟" اس کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ امامہ کے ذہن میں نہیں آیا۔

ڈنر کے بعد وہ رات کو کچن کا سودا سلف خریدنے کے لیے گئے تھے۔ امامہ نے اگر سالار کی یہ گفتگو نہ سنی ہوتی تو یقیناً وہ کچن کے لیے ایک لمبی چوڑی لسٹ بنائے بیٹھی تھی' لیکن اس نے خریداری کرتے ہوئے بہت احتیاط

سے کام لیا۔ خریدی جانے والی زیادہ تر اشیا کنٹینرز اور جارز ہی تھے' کھانے پکانے کا سامان اس نے بہت کم خریدا تھا۔

آج انہوں نے ایک اور جگہ سے کافی پی تھی۔

"تمہارا وہ پرابلم حل ہو گیا؟" امامہ کو گاڑی میں اچانک یاد آیا۔

"کون سا پرابلم؟" سالار نے چونک کر اسے دیکھا۔

"وہ جس کی وجہ سے تم کل رات پریشان تھے۔" امامہ نے اسے یاد دلایا۔

وہ بے اختیار بڑبڑایا۔ "کاش ہو جائے۔"

"یعنی نہیں ہوا۔" امامہ متفکر ہوئی۔

"ہو جائے گا۔" سالار نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھا۔

"پرسوں میں کراچی جا رہا ہوں۔" سالار نے بات بدلی۔

"کتنے دن کے لیے؟" وہ چونکی۔

"صبح جاؤں گا اور رات کو آجاؤں گا۔ میں مہینے میں دو تین بار جاتا ہوں کراچی۔ تم چلو گی ساتھ۔" وہ ہنسا۔

امامہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"ایک دن کے لیے؟"

"ہاں۔"

"تم آفس کے کام سے جا رہے ہو میں کیا کروں گی وہاں؟"

"تم انیتا کے ساتھ شاپنگ کے لیے چلی جانا' وہ تمہیں گھمائے پھرائے گی کراچی۔ کبھی گئی ہو پہلے وہاں؟" سالار پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔" وہ کچھ ایکسائیٹڈ ہونے لگی تھی۔ سمندر اسے پسند تھا اور زندگی میں پہلی بار اسے سمندر دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔

"انیتا سے بات کرتا ہوں پروگرام۔ میں آفس میں تم میری بہن کے ساتھ بازاروں میں۔ ہم تو اسی طرح کا ہنی مون منا سکتے ہیں فی الحال۔" وہ اسے پھر چھیڑ رہا تھا۔

وہ ہنس پڑی۔ وہ اس سے کہہ نہیں سکی کہ جس زندگی کو وہ گزار کر آئی تھی اس کے مقابلے میں یہ آزادی اسے جنت جیسی محسوس ہو رہی ہے۔



"یہ کیا ہے؟"

وہ خریدا ہوا سودا سلف' جارز اور کنٹینرز میں ڈالنے میں مصروف تھی جب سالار اپنے اسٹڈی روم سے ایک لفافہ لے کر کچن ایریا میں آیا۔

"اس میں تمہاری چیک بک ہے۔" سالار نے اسے بتایا اور لفافہ کاؤنٹر پر رکھ کر چلا گیا۔

امامہ نے لفافہ کھول کر اندر موجود چیک بک نکالی۔ اس کے ساتھ ایک پے سلپ بھی نکل آئی۔ وہ تیس لاکھ کی تھی۔ امامہ کو لگا کہ اسے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس نے سلپ کو دوبارہ دیکھا۔ وہ واقعی تیس لاکھ ہی کی تھی۔ اس نے اس کے اکاؤنٹ میں تیس لاکھ کیوں جمع کروائے؟ یقیناً اس سے کوئی غلطی ہو گئی تھی۔

وہ لفافہ پکڑے اسٹڈی روم میں آگئی۔ سالار اپنے کمپیوٹر پر کوئی کام کر رہا تھا۔

"سالار! تمہیں پتا ہے تم نے کتنا بڑا بلنڈر کیا ہے؟" امامہ نے اندر آتے ہوئے کہا۔
"کیسا بلنڈر؟" وہ چونکا۔
امامہ نے اس کے قریب آکر پے سلپ اس کے سامنے کی۔
"اسے دیکھو ذرا۔۔۔ یہ کیا ہے؟"
"پے سلپ ہے۔" سالار نے ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے دوبارہ ڈیسک ٹاپ پر نظر دوڑانا شروع کردی۔
"کتنی رقم جمع کروائی ہے تم نے میرے اکاؤنٹ میں؟"
"تیس لاکھ۔" وہ حیران ہوئی۔
"ابھی کچھ رہتی ہے، سات لاکھ اور کچھ۔۔۔ چند ماہ میں وہ بھی دے دوں گا۔"
وہ کچھ ٹائپ کرتے ہوئے سرسری انداز میں کہہ رہا تھا۔
"لیکن کیوں دو گے مجھے۔۔۔؟ کس لیے؟" وہ حیران تھی۔
"تمہارا حق مہر ہے۔" سالار نے اسی انداز میں کہا۔
"میرا حق مہر دو لاکھ روپے ہے۔" امامہ کو لگا کہ شاید وہ بھول گیا ہے۔
"وہ آمنہ کا تھا۔ میں تمہیں زیادہ حق مہر دینا چاہتا ہوں۔" سالار نے کندھے اچکا کر کہا۔
"لیکن یہ تو بہت ہی زیادہ ہے سالار۔" وہ یک دم سنجیدہ ہوئی۔ "تم سے کس نے کہا ہے مجھے اتنی رقم دو۔۔۔؟"
"تم نے خود مجھے لکھ کر دی تھی یہ رقم۔"
سالار نے اس بار مسکراتے ہوئے اسکرین سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔
"میں نے کب۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ "وہ فگر تم اس لیے لکھوا رہے تھے۔۔۔؟" اسے یاد آگیا۔
"ہاں۔" اس کی لاپروائی اب بھی برقرار تھی۔
"تم پاگل ہو۔" امامہ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔
"شاید۔" سالار نے بے ساختہ کہا۔
"اچھا میں ایک ارب لکھ دیتی تو کیا کرتے؟" وہ اب طنز کر رہی تھی۔
"تو ایک ارب بھی دے دیتا۔" کیا فیاضی تھی۔
"کہاں سے دیتے۔۔۔؟ فراڈ کرتے؟" وہ بے ساختہ ناراض ہوئی۔
"کیوں کرتا۔۔۔؟ کما کر دیتا۔" سالار نے اس کی بات کا برا مانا۔
"ساری عمر کماتے ہی رہتے پھر؟"
"اچھا ہوتا، ساری عمر تمہارا قرض دار رہتا۔ واقعی اچھا ہوتا تو ایک ارب چاہیے کیا۔۔۔؟"
وہ عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ امامہ کو کئی سال پہلے والے سالار کی جھلک نظر آئی۔
"کیوں دے رہے ہو؟" اس نے سنجیدگی سے کچھ دیر اسے دیکھ کر کہا۔
"بیوی ہو تم اس لیے۔"
"اتنے پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟"
"امامہ! میری سیونگز ہیں یہ۔" سالار نے بے حد تحمل سے کہا۔
"سیونگز ہیں تو مجھے کیوں دے رہے ہو؟" وہ کچھ خفا ہوئی۔
"میرا دل چاہتا ہے میں تمہیں دوں۔ اگر یہ پوری دنیا میری ہوتی تو میں یہ ساری دنیا تمہیں دے دیتا۔ میں کما رہا

ہوں اور روپیہ آجائے گا میرے پاس۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" کیا شاہانہ انداز تھا۔
"لیکن اتنی زیادہ رقم۔" سالار نے اس کی بات کاٹی۔
"میں اتنی زیادہ رقم نہیں دینا چاہتا تھا لیکن تمہاری مرضی کا حق مہر دینا چاہتا تھا اس لیے تم سے ایک فگر لکھنے کو کہا۔ تمہیں پتا ہے جو فگر تم نے لکھی تھی' اس دن میرے اکاؤنٹ میں ایگزیکٹ اتنی ہی اماؤنٹ تھی۔" وہ اب رقم دہراتے ہوئے ہنس رہا تھا۔
"اب اس کو تم کیا کہو گی اتفاق۔۔۔؟ مجھے اتفاق نہیں لگا' مجھے لگا وہ رقم میرے پاس تمہاری امانت تھی۔۔۔ یا حق تھا۔۔۔ اس لیے تمہیں دے رہا ہوں۔۔۔ تیس لاکھ دیا ہے کچھ رقم کا ادھار کر لیا ہے تم سے۔۔۔ ورنہ اگلے دو تین ماہ ادھر ادھر سے مانگ رہا ہوتا۔ اس لیے تم آرام سے رکھو یہ پیسے' مجھے اگر کبھی ضرورت ہوئی تو تم سے مانگ لوں گا۔ اب میں تھوڑا سا کام کر لوں؟"
امامہ نے کچھ نہیں کہا تھا' وہ دروازہ بند کرکے باہر نکل گئی۔ ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ کر وہ ایک بار پھر اس پے سلپ کو دیکھنے لگی۔ وہ اس شخص کو کبھی نہیں سمجھ سکی تھی۔ کبھی نہیں۔۔۔ وہ لاابالی نہیں تھا۔ کم از کم اتنے دن میں اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا۔ لیکن وہ سمجھدار بھی نہیں تھا۔ کم از کم وہ سلپ اسے یہی بتا رہی تھی ۔۔۔ وہ اگر اسے خوش کرنا چاہتا تھا۔۔۔ تو وہ نہیں ہوئی تھی۔۔۔ احسان مند وہ کرنا چاہتا تھا تو ہاں اس کے کندھے جھکنے لگے تھے۔۔۔ ایسی چاہ اس نے زندگی میں کسی اور شخص سے چاہی تھی۔۔۔ ایسی نوازشات کی طلب اسے کہیں اور سے تھی۔۔۔ اس کے وجود کو گیلی لکڑی وہ پیسہ نہیں بنا رہا تھا' بلکہ وہ فیاضی بنا رہی تھی جو وہ دکھا رہا تھا۔ وہ اس سے برابری چاہ رہی تھی۔۔۔ برابر نہیں ہو پا رہی تھی۔۔۔ اس شخص کا قد لمبا نہیں ہو رہا تھا' بلکہ اس کا اپنا ہی وجود سکڑنے لگا تھا۔



"امامہ! ہم کل صبح کے بجائے' آج شام کو جا رہے ہیں۔ رات کراچی میں رکیں گے اور پھر کل رات کو ہی واپس آجائیں گے۔ سات بجے کی فلائٹ ہے۔ میں شام ساڑھے پانچ بجے تمہیں پک کروں گا' تم پیکنگ کر لو۔"
اس نے بارہ بجے کے قریب فون کرکے آفس سے کراچی کا نیا پروگرام بتایا تھا۔ وہ یک دم نروس ہونے لگی۔ اتنی جلدی پیکنگ ٹھیک ہے وہ ایک رات کے لیے جا رہے تھے۔ پھر بھی۔۔۔ وہ اب اسے اپنے ان کپڑوں کے بارے میں بتا رہا تھا جو وہ ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ وہ پیکنگ کرتے ہوئے بے حد الجھی ہوئی تھی۔
وہ ساڑھے پانچ بجے وہاں موجود تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے گاڑی میں روزہ افطار کر لیا ہوگا' لیکن پھر بھی وہ ایک باکس میں اس کے لیے کھانے کی چند چیزیں اور جوس لے کر آئی تھی۔ ایئرپورٹ تک کی ڈرائیو میں وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ساتھ وہ چیزیں بھی کھاتے رہے۔
وہ ساڑھے چھ بجے ایئرپورٹ پر پہنچے' بورڈنگ شروع ہو چکی تھی۔ وہ فرسٹ کلاس سے سفر کر رہے تھے۔ اسی لیے ٹریفک کی وجہ سے کچھ لیٹ ہونے کے باوجود سالار مطمئن تھا۔
ایگزیکٹو لاؤنج سے جہاز میں سوار ہوتے ہوئے سالار کی فرسٹ کلاس کے کچھ اور پسنجرز سے سلام دعا ہوئی۔ چند ایک سے اس نے امامہ کا بھی تعارف کروایا۔ وہ سب کارپوریٹ سیکٹر سے تعلق رکھتے تھے یا پھر سالار کے کسٹمرز تھے۔
جہاز کے ٹیک آف کے چند منٹوں کے بعد کسی دوسری کمپنی کا کوئی ایگزیکٹو سالار سے کوئی معاملہ ڈسکس کرنے کے لیے اس کے پاس آیا۔ چند لمحے اس سے باتیں کرنے کے بعد سالار اس سے معذرت کرکے اس

ایگزیکٹو کے ساتھ اس کی سیٹ پر چلا گیا۔ وہ کچھ دیر اس کے انتظار میں بیٹھی رہی پھر کچھ بور ہو کر اس نے ایک میگزین اٹھا لیا۔

سالار کی واپسی لینڈنگ کے اعلان کے پانچ منٹ بعد ہوئی۔ وہ ”سوری“ کہتا ہوا اس کے پاس بیٹھ کر سیٹ بیلٹ باندھنے لگا۔

”تم بور تو نہیں ہو گئیں؟“

”نہیں۔۔۔ مجھے تو بہت مزہ آ رہا تھا۔“ اس نے بے حد خفگی سے جواب دیا۔

اس نے میگزین سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ سالار نے بڑے آرام سے اس کے ہاتھ سے میگزین لے کر پاس سے گزرتی ایئر ہوسٹس کو تھما دیا۔ وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے چلی گئی۔

”یہ بدتمیزی ہے۔“ امامہ نے اس کے جانے کے بعد کچھ دبی ہوئی آواز میں احتجاج کیا۔

”ہاں۔۔۔ ہے تو سہی لیکن تم مجھے دیکھ نہیں رہی تھیں۔“ اس نے اطمینان اور ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس سے خفا ہو یا ہنسے۔

”جتنی باتیں تم ان لوگوں سے کر رہے تھے، تم نے مجھ سے کبھی نہیں کیں۔“

وہ اس کے شکوے پر ہنسا۔ ”بینک کے کسٹمرز ہیں۔ یہ ان باتوں کے پیسے دیتے ہیں۔“

اس نے کچھ ملامت بھری نظروں سے سالار کو دیکھا۔ ”تم کتنے materialistic (مادہ پرست) ہو۔“

”ہاں وہ تو ہوں۔“ اس نے آرام سے جواب دیا۔

”میں بھی تو کسٹمر ہوں تمہیں پیسے۔۔۔“ وہ اس کے جملے پر چونکا۔

”ارے میں تو بھول ہی گیا تھا فی الحال تو تم مجھ سے زیادہ امیر ہو۔ میرے بینک کی کسٹمر بھی ہو اور میں تمہارا قرض دار بھی ہوں تو تم سے باتیں کرنا تو فرض ہے میرا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”بینکرز۔۔۔“ وہ کچھ کہنے لگی تھی۔ سالار نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے اسے روکا اور کہا۔

”میں اپنا ٹرپ خراب نہیں کرنا چاہتا امامہ! تم سے واپسی پر سنوں گا کہ بینکرز کیسے ہوتے ہیں۔“ اس نے یک دم کچھ سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

امامہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ اس میں سنجیدہ ہونے والی کیا بات تھی اس نے سوچا۔ ایئرپورٹ پر ہوٹل کی گاڑی نے انہیں پک کیا تھا۔

”میں نے سوچا تھا کہ ہم انیتا کے گھر ٹھہریں گے۔“ امامہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں بھی انیتا کے گھر نہیں ٹھہرا۔ میں ہوٹل میں رہتا ہوں۔“ سالار نے اسے بتایا۔ ”کراچی اکثر آتا جاتا ہوں میں۔“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔ ”بعض دفعہ تو یہاں آ کر انیتا سے بات تک نہیں ہو پاتی۔“

امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ وہ مسلسل سیل پر کچھ میسجز کرنے میں مصروف تھا۔ وہ ساتھ ساتھ اسے سڑک کے دونوں اطراف آنے والے علاقوں کے بارے میں بھی بتا رہا تھا۔

”پھر مجھے تمہارے ساتھ نہیں آنا چاہیے تھا۔ میری وجہ سے۔۔۔“

سالار نے اس کے اچانک اس طرح کہنے پر اسے ٹوکا۔

”تمہیں ساتھ لے کر آنا مجھے اچھا لگ رہا ہے اور تمہیں انیتا کی فیملی سے ملوانے کے لیے یہاں لے کر آنا ہی تھا مجھے۔“ امامہ نے اس کا چہرہ غور سے پڑھنے کی کوشش کی۔

"سچ کہہ رہا ہوں۔" اس نے امامہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "تمہیں میرے ساتھ آنا اچھا نہیں لگا؟" سالار نے یک دم اس سے پوچھا وہ مسکرا دی۔

"آپ اپنی وائف کے ساتھ پہلی بار یہاں ٹھہر رہے ہیں۔"

ہوٹل میں چیک ان کرتے ہوئے ریسپشن پر موجود لڑکے نے مسکراتے ہوئے سالار سے کہا۔

اس فائیو اسٹار ہوٹل کے چند کمرے مستقل طور پر سالار کے بینک نے بک کیے ہوئے تھے اور ان کمروں میں باقاعدگی سے ٹھہرنے والوں میں سے ایک وہ بھی تھا لیکن آج وہ پہلی بار اس کی بیوی کو دیکھ رہے تھے۔

سالار نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور سائن کرنے لگا۔ وہ لڑکا اب امامہ سے کچھ خوشگوار جملوں کا تبادلہ کر رہا تھا۔ جیسے کوئی آہستہ آہستہ اس کے گرد موجود ساری سلاخیں گرا رہا ہو۔ وہ باہر کی اس دنیا سے مسحور ہو رہی تھی جس سے وہ سالار کی وجہ سے متعارف ہوئی تھی۔

بیچ لگژری پر انیتا اور اس کی فیملی نے ان کے لیے ڈنر ارینج کر رکھا تھا۔ وہ لوگ آدھے گھنٹے میں تیار ہونے کے بعد تقریباً" ساڑھے گیارہ بجے وہاں پہنچے۔ انیتا اور اس کے شوہر کے علاوہ اس کے سسرال کے بھی کچھ لوگ وہاں موجود تھے۔ یہ سالار اور اس کی بیوی کے لیے ایک فیملی ڈنر تھا۔ اس کا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا گیا۔ اس کی گھبراہٹ ابتدائی چند منٹوں کے بعد ختم ہونا شروع ہو گئی۔ وہ کافی لبرل فیملی تھی اور ان دونوں کی شادی کے حوالے سے ہونے والی رسمی گفتگو کے بعد گفتگو کے موضوعات بدل گئے تھے۔ امامہ چیف گیسٹ تھی لیکن وہاں کسی نے اسے پیڈسٹل پر نہیں رکھا تھا اور اس چیز نے امامہ کے اعتماد میں اضافہ کیا تھا۔ ابھی موسم ہوا تھا۔ وہ ڈرنکس لیتے ہوئے گپ شپ کر رہے تھے۔ امامہ گفتگو میں ایک مسکراتے ہوئے خاموش سامع کا رول ادا کر رہی تھی۔ اس کی زیادہ توجہ بیچ لگژری ویو کے گرد نظر آنے والے سمندر اور شہر کی روشنیوں پر تھی۔ وہ لوگ اوپن ایئر میں تھے۔ کراچی میں لاہور جیسی سردی نہیں تھی لیکن یہاں اسے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ سالار نے آنے سے پہلے اسے گرم شال لینے کا نہ کہا ہوتا تو یقیناً" اس وقت اس کے دانت بج رہے ہوتے۔ وہاں موجود تمام خواتین سویٹرز کے بجائے اسی طرح کی شالیں اپنے کندھوں پر ڈالے ہوئے تھیں۔

"سالار! میں وہاں آگے جا کر نیچے سمندر دیکھنا چاہتی ہوں۔" اس نے ساتھ بیٹھے ہوئے سالار کی طرف جھکتے ہوئے مدھم آواز میں سرگوشی کی۔

"تو جاؤ۔" سالار نے اطمینان سے کہا۔

"میں کیسے جاؤں۔۔۔ اس طرح اکیلے۔۔۔؟ تم ساتھ آؤ میرے۔" اس نے اس کے مشورے پر جز بز ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں! تم خود جاؤ۔۔۔ دیکھو۔۔۔ اور بھی لوگ کھڑے ہیں، تم بھی جا کر دیکھ آؤ۔" سالار نے اس سے کہا۔ وہ اب اس کی گود میں پڑا بیگ اٹھا کر نیچے زمین پر رکھتے ہوئے بلند آواز میں اس سے کہہ رہا تھا۔

امامہ نے کچھ جھجکتے ہوئے اس لمبی ٹیبل کے گرد موجود افراد پر نظر ڈالی وہ سب گفتگو میں مصروف تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ کچھ ہمت پاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے بائیں طرف بیٹھی انیتا اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"وہاں سے جا کر دیکھو وہاں سے زیادہ اچھا ویو ہے۔" انیتا نے اشارے سے اسے گائیڈ کیا۔ امامہ نے سر ہلایا۔

وہاں اس وقت ان کے علاوہ اور بھی کچھ فیملیز موجود تھیں اور سالار ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کوئی نہ کوئی وقتاً" فوقتاً" اٹھ کر اسی طرح اس عرشہ نما جگہ کے کنارے کھڑے ہو کر سمندر کو دیکھنے لگتا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے نروس تھی لیکن پھر وہ نارمل ہونا شروع ہو گئی۔

سالار وہیں بیٹھا کولڈ ڈرنک پیتے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ امامہ نے دوبارہ پلٹ کر کچھ نروس ہو کر اسے دیکھا تھا۔ وہ دونوں بار مسکرا دیا۔ یہ نو سال پہلے کی وہ پراعتماد لڑکی نہیں تھی جو آدھی رات کو اپنے گھر کی دیوار کود کر اس کے کمرے میں آگئی تھی۔ اس سے شادی کی تھی پھر گھر سے چلی گئی تھی۔

وہ وسیم کی اس بہن کے بارے میں وسیم سے بہت کچھ سن چکا تھا لیکن پچھلے دس دنوں سے وہ جس لڑکی کو دیکھ رہا تھا، یہ وہ لڑکی نہیں تھی۔ وقت نے جتنی توڑ پھوڑ اس کی زندگی میں پیدا کی تھی اس سے زیادہ توڑ پھوڑ اس نے عرشے کی طرف جاتی ہوئی اس لڑکی کی زندگی میں پیدا کی تھی۔ اس کی انداز و اطوار ہی تبدیل ہو گئے تھے۔ نو سال اگر کسی شخص کو اس کے گھر والوں سے الگ کر دیا جائے خوف اور دباؤ کے ساتھ چند جگہوں تک محدود کر کے باقی دنیا سے کاٹ دیا جائے تو وہ کس حد تک کنفیوزڈ ڈبل مائنڈڈ غیر محفوظ اور ڈیپینڈنٹ ہو سکتا ہے۔ وہ اس کا عملی مظاہرہ امامہ کی اس حالت میں دیکھ رہا تھا اور یہ چیز اسے تکلیف پہنچا رہی تھی۔ وہ کم از کم اسے اس حالت میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

”سالار۔۔۔ سالار۔۔۔“ وہ امامہ کی آواز پر بے اختیار چونکا۔

اس نے پوری قوت سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا تھا۔

”یا تو اسے وہاں بھیجتے نہ۔ اب بھیج ہی دیا ہے تو دو چار منٹوں کے لیے کسی اور چیز کو بھی دیکھ لو۔“ وہ اب اسے ڈانٹ رہی تھی۔ وہ مسکرا کر سیدھا ہو گیا اس کا بھتیجا عفران اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔

ہوا امامہ کے بالوں کو بکھیر رہی تھی۔ وہ انہیں بار بار کانوں کے پیچھے کر کے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن انہیں کھلا چھوڑ کر آنے پر پچھتا بھی رہی تھی۔ اس تیز ہوا میں وہ شیفون کے دوپٹے کو سر پر ٹکانے کی کوشش چھوڑ چکی تھی ہاں وہ پشمینہ شال اس کی مہین شیفون کی قمیص کو اڑنے سے تو روک نہیں پا رہی تھی لیکن اس کے جسم کو اچھی طرح ڈھانپے رکھنے میں موثر تھی۔ وہ کئی سالوں میں آج پہلی بار کسی پبلک پلیس پر سر ڈھانپے بغیر کھڑی تھی۔ اسے بے حد عجیب لگ رہا تھا۔ اگر وہ سالار کے ساتھ نہ ہوتی تو کبھی بھی ایسی حالت میں کسی کھلی جگہ پر کھڑے ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ دس دن پہلے تک تو وہ گھر سے باہر نکلتے ہوئے اپنا چہرہ بھی چھپاتی تھی۔ وہ واحد گیٹ اپ تھا جس میں وہ خود کو بے حد محفوظ سمجھتی تھی۔ سالار سے شادی کے بعد اس نے چہرہ چھپانا چھوڑ دیا تھا اور اب اس کے ساتھ خود کو محفوظ سمجھتی تھی۔

تاریک سمندر میں نظر آتی روشنیوں کے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر گردن کے گرد لپٹے دوپٹے کو سر پر لینے کی کوشش شروع کی۔ یہاں اس کوشش کو نوٹس کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہ کام اس ہوا میں شال، دوپٹے اور کھلے بالوں کے ساتھ آسان نہیں تھا۔

”میں بال سیٹ دوں تمہارے؟“ وہ جیسے کرنٹ کھا کر پلٹی پھر جیسے اطمینان کا سانس لیا۔

”تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔“ اس نے سالار کو اپنے عقب میں دیکھ کر بے اختیار کہا۔ وہ کس وقت آیا تھا اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔

”تم میرا دوپٹا پکڑو گے؟“ اس نے سالار کی اوٹ میں آتے ہوئے اپنا دوپٹا اسے پکڑا دیا۔ وہ اب وہاں کھڑی دوسروں کو نظر نہیں آ رہی تھی۔

”تمہیں مجھ کو بتانا چاہیے تھا کہ یہاں اتنی تیز ہوا ہو گی میں بال تو کھلے چھوڑ کر نہ آتی۔“ وہ اپنے بالوں کو ڈھیلے جوڑے کی شکل میں لپیٹتے ہوئے اس سے شکایتی انداز میں کہہ رہی تھی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ اب اپنی شال اتار کر اسے دیتے ہوئے دوپٹا اس سے لے رہی تھی۔

”یہ کون سا شہر ہے؟“ وہ دوپٹے کو اپنے سر اور گردن کے گرد لپیٹتے ہوئے اس کے سوال پر ٹھٹکی۔

"کرمزن... کیوں؟"
سالار نے شال اس کے کندھوں کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں بتانا چاہتا تھا تم اس کلر میں بہت اچھی لگتی ہو۔" اس نے اس کے بائیں گال کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے بہت آہستہ سے چھوا تھا۔
امامہ کی آنکھوں میں حیرت امڈ آئی۔ اگلے لمحے سالار کو یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ اس کا لباس زیادہ قرمزی تھا یا اس کا چہرہ وہ بے اختیار گہرا سانس لے کر رہ گیا۔
"اب تم اتنی سی بات پر بھی یوں بلش ہوا کرو گی تو معاملہ جان لیوا ہو جائے گا۔ مار دو گی تم بڑی جلدی مجھے۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔
وہ تقریباً ڈھائی بجے واپس اپنے ہوٹل میں آئے تھے۔ امامہ کو اتنی نیند آ رہی تھی کہ اس نے جیولری اتار دی چہرہ بھی دھو لیا لیکن کپڑے تبدیل کیے بغیر سو گئی تھی۔



سالار صبح کب آفس کے لیے نکلا، امامہ کو پتا ہی نہیں چلا۔ وہ تقریباً دس بجے اٹھی۔ جب تک وہ اپنا سامان پیک کر کے تیار ہوئی تب تک انیتا اسے لینے کے لیے آ چکی تھی۔
وہ لوگ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے ہوٹل سے چیک آؤٹ کر کے نکلے، اس کے بعد وہ انیتا کے ساتھ کراچی کے مختلف مالز میں گھومتی پھرتی رہی۔ انیتا نے اسے سالار کے دیے ہوئے کریڈٹ کارڈ کو استعمال کرنے ہی نہیں دیا۔ اس دن وہی اس کو شاپنگ کرواتی رہی۔
شاپنگ کے بعد انیتا اسے اپنے گھر لے گئی، اس نے وہاں افطار کیا۔ ساڑھے سات بجے وہ گھر سے ایئرپورٹ کے لیے نکلی اور اسی وقت سالار سے اس کی فون پر بات ہوئی۔ وہ بھی ایئرپورٹ کی طرف جا رہا تھا۔
وہ سالار کی نسبت جلدی ایئرپورٹ پہنچی۔ بورڈنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ایگزیکٹو لاؤنج میں پہنچتے ہی ایک بار پھر وہ کسی نہ کسی سے ہیلو ہائے کرنے لگا۔ وہ فلائٹ تھی جس سے وہ عام طور پر کراچی سے واپس آیا کرتا تھا اور اس کی طرح باقی لوگ بھی ریگولر ٹریولر تھے لیکن وہ اس وقت اتنی خوش تھی کہ اس نے سالار کی توجہ کسی اور طرف ہونے پر بھی اعتراض نہیں کیا۔
وہ خوش تھی یہ اس کے چہرے پر لکھا تھا اور سالار کو اس کی یہ خوشی حیران کر رہی تھی۔
"یہ تمہارا کریڈٹ کارڈ اور پیسے۔"
اس نے لاؤنج میں بیٹھنے کے کچھ دیر بعد ہی اپنے بیگ سے دونوں چیزیں نکال کر سالار کو تھما دیں۔
"انیتا نے مجھے بل پے کرنے نہیں دیے، اسی نے سارے خرچے کیے ہیں۔ تم اسے پے کر دینا۔" امامہ نے اسے بتایا۔
"کیوں... کوئی بات نہیں اگر اس نے کیے ہیں... اسے ہی کرنے چاہیے تھے۔"
سالار نے کریڈٹ کارڈ اپنے والٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیسے اس نے واپس امامہ کے بیگ میں ڈال دیے تھے۔
"لیکن ہم نے تو اسے یا اس کی فیملی کو کچھ بھی..."
سالار نے اس کی بات کاٹی۔ "تم نیکسٹ ٹائم آؤ گی تو لے آنا کچھ اس کے لیے۔ دو چار ہفتے تک وہ ویسے بھی اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو رہی ہے۔ تو تمہیں اچھا لگا کراچی آ کے...؟" سالار نے موضوع بدلا۔
امامہ کا چہرہ ایک بار پھر چمکنے لگا۔ وہ اسے ان جگہوں کے بارے میں بتا رہی تھی جہاں وہ انیتا کے ساتھ گئی تھی۔

سالار مسکراتے ہوئے اسے سنتا رہا۔ وہ بچوں جیسے جوش و خروش کے ساتھ اپنی شاپنگ کی تفصیل بتا رہی تھی۔
"میں نے ابو' آنٹی اور سعیدہ اماں کے لیے بھی کچھ گفٹس لیے ہیں۔" وہ بتا رہی تھی۔
"اچھا!" سالار نے دلچسپی لی لیکن گفٹس کی نوعیت نہیں پوچھی۔
"فرقان بھائی کی فیملی۔ اور تمہارے پیرنٹس کے لیے بھی۔"
"امامہ! صرف میرے پیرنٹس نہیں ہیں وہ تمہارا بھی کوئی رشتہ ہے ان سے۔" سالار نے اعتراض کیا۔
وہ اب بھی اس کے ماں باپ کا ذکر اسی طرح کرتی تھی۔ اس وقت یک دم امامہ کو احساس ہوا کہ اس نے سالار کے لیے کچھ بھی نہیں خریدا۔ یہ بھول تھی یا لاپروائی' لیکن اسے شاپنگ کے دوران سالار کا خیال تک نہیں آیا۔
اسے بے حد ندامت ہوئی۔
"کیا ہوا؟" سالار نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔
وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کچھ شرمندگی سے کہا۔
"سالار! مجھے تمہارے لیے کچھ خریدنا یاد نہیں رہا۔"
"کوئی بات نہیں' تم نے اپنے لیے شاپنگ کی ہے تو سمجھو' تم نے میرے لیے ہی خریدا ہے۔" سالار نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا کندھا تھپک کر جیسے تسلی دی۔
"پھر بھی مجھے تمہارے لیے کچھ لینا چاہیے تھا۔" امامہ مطمئن نہیں ہوئی۔ "لیکن مجھے تمہارا خیال ہی نہیں آیا۔"
اس کا محبوب ظالم تھا' وہ جانتا تھا۔ "کوئی بات نہیں' جب خیال نہیں آیا تو کیسا تحفہ۔ تحفہ تو ان کو دیا جاتا ہے جن کا خیال آتا ہو۔" سالار کے لہجے میں گلہ نہیں تھا لیکن امامہ کو گلہ لگا۔ وہ نادم سی ہو کر خاموش بیٹھ گئی۔
"اور کیا کیا لیا؟" اس کی ندامت محسوس کرتے ہوئے سالار نے دوبارہ اس سے بات شروع کی۔
"مجھے انبنا اچھی لگی ہے۔" امامہ نے اس کا سوال نظر انداز کیا۔
"چلو اچھا ہے' کوئی تو اچھا لگا تمہیں۔ میں نہ سہی' میری بہن ہی سہی۔"
امامہ نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ سالار کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی' وہ سنجیدہ نہیں تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔
"اور پتا ہے میں نے کیا کیا لیا ہے؟" وہ پھر بولنے لگی۔
سالار بے اختیار مسکرایا۔ اگر اسے اس سے اپنے لیے کسی اظہار کی توقع تھی تو غلط تھی۔



اگلے دو دن امامہ بہت اچھے موڈ میں رہی' اسے ہر بات پر کراچی یاد آ جاتا۔ اس کی یہ خوشی سالار کو حیران کرتی رہی۔ اس کا خیال تھا اسے وہ شہر پسند آیا ہے لیکن اسے یہ اندازہ نہیں ہوا کہ بات شہر کی نہیں تھی' وہ اگر امامہ کو نواب شاہ بھی لے جاتا تو بھی وہ اسی ٹرانس میں واپس آتی۔ وہ کھلی فضا میں سانس لینے کے قابل ہو رہی تھی اور ایک لمبے عرصے کے بعد گھٹی ہوئی سانسوں کے ساتھ جینے کے بعد کچھ دیر تک تو انسان ایسے ہی گہرے سانس لیتا ہے جیسے وہ لے رہی تھی۔
اگلے دن وہ لوگ ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے۔ وہ سالار کے ساتھ خوش تھی' یہ بات اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی البتہ سعیدہ اماں نے پھر بھی کچھ احتیاطی تدابیر کے تحت سالار کو سامنے والوں کے لڑکے کی آمنہ کے لیے دیوانہ وار محبت کا ایک اور قصہ سنانا ضروری سمجھا' جسے سالار نے بے حد تحمل سے سنا۔ اس بار امامہ نے دوران گفتگو سعیدہ اماں کو ٹوکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ناکام رہی' سعیدہ اماں کا خیال تھا' سالار کو ایک اچھا' تابع دار شوہر

بتانے کے لیے اس طرح کے لیکچرز ضروری ہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں جب وہ ماضی میں کسی عورت کے ساتھ وابستہ رہ چکا ہو' امامہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ سعیدہ اماں کو اپنے اور سالار کے تعلق کے بارے میں کیسے بتائے' اسے خدشہ تھا کہ اس انکشاف کے بعد سعیدہ اماں خود اسی سے ہی ناراض نہ ہو جائیں۔ سے فی الحال اس صورت حال سے نکلنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔



"اسلام آباد جانا ضروری ہے؟"
وہ جمعہ کی رات ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ وہاں جانا نہیں چاہتی تھی' وہ جانا چاہتی تھی لیکن ساتھ ہی وہ ایک عجیب سے خوف کا شکار بھی تھی۔
"بہت زیادہ ضروری ہے۔" سالار بیڈ پر بیٹھا اپنے لیپ ٹاپ پر ای میل چیک کرنے میں مصروف تھا۔
"تمہیں کیا کام ہے وہاں.....؟" امامہ نے ہاتھ میں پکڑا ناول بند کرتے ہوئے کہا۔ وہ کہنی کے بل ٹیک لگائے اس کی طرف کروٹ لیتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔
"مجھے گاؤں جانا ہے۔" وہ اسکرین پر نظریں جمائے اپنا کام کرتے ہوئے بولا۔
"کون سے گاؤں.....؟" وہ چونکی۔
"اسلام آباد سے دو گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔" اس نے نام بتاتے ہوئے کہا۔ "میں وہاں ایک اسکول اور چند دوسرے پروجیکٹس چلا رہا ہوں۔ اسکول کی بلڈنگ میں کچھ ایکس ٹینشن ہو رہی ہے' اسی کو دیکھنے جانا ہے مجھے۔ جانا تو لاسٹ ویک تھا لیکن جا نہیں سکا۔"
وہ عجیب نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی طویل خاموشی اور خود پر جمی نظروں کو محسوس کرتے ہوئے سالار نے اسے دیکھا۔ امامہ سے نظریں ملنے پر اس نے کہا۔
"تم ساتھ چلنا اور دیکھ لینا۔" وہ دوبارہ اسکرین کو دیکھنے لگا۔
"تم اکیلے چلے جاؤ۔" امامہ نے کہا۔
"میں تو تمہارے ساتھ ہی جاؤں گا۔" اس نے اصرار کیا۔
"ویسے بھی پاپا نے کہا ہے آنے کے لیے۔ ہاں اگر تم گاؤں نہیں جانا چاہتیں تو مت جاؤ لیکن اسلام آباد تو چلنا ہے تمہیں۔" سالار نے جیسے قطعی انداز میں کہا۔
امامہ نے دوبارہ تکیے پر سر رکھتے ہوئے کچھ خفگی کے عالم میں ناول کھول لیا۔
"کیا اسٹوری ہے اس ناول کی؟"
سالار کو اس کے بگڑتے موڈ کا اندازہ ہو رہا تھا۔ امامہ نے جواب نہیں دیا۔
"ہیرو ہیروئن کے کپڑوں کی زیادہ تعریف کرتا ہے اس میں یا خوب صورتی کی؟" وہ اب اسے چھیڑ رہا تھا۔
امامہ نے اسے نظر انداز کیا۔ یہ اتفاق تھا کہ جو صفحہ وہ پڑھ رہی تھی اس میں ہیرو ہیروئن کی خوب صورتی ہی کی تعریف کر رہا تھا۔ امامہ کو ہنسی آگئی تھی۔ ناول سے اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے اس نے دوسری طرف کروٹ لے لی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کے تاثرات دیکھے۔ سالار نے اسے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا' وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔



"خواتین و حضرات توجہ فرمایئے' ہم اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر لینڈ کر چکے ہیں۔ اس وقت یہاں شام کے

سات بج رہے ہیں اور یہاں کا درجہ حرارت ...ہے۔"

جہاز کے کیبن عملہ میں سے کوئی انگلش کے بعد اب اردو میں رسمی الوداعی کلمات دہرا رہا تھا۔ جہاز ٹیکسی کرتے ہوئے ٹرمینل کے سامنے جا رہا تھا۔ بزنس کلاس کی ایک سیٹ پر بیٹھے سالار نے اپنا سیل فون آن کرتے ہوئے اپنی سیفٹی بیلٹ کھولی۔ امامہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے گم صم تھی۔

"کہاں گم ہو؟" اس نے امامہ کا کندھا تھپکا۔

اس نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر اپنی سیفٹی بیلٹ کھولنے لگی۔ سالار اب لگیج کمپارٹمنٹ سے اپنے بیگز نکال رہا تھا۔ ایک فلائٹ اسٹیورڈ نے اس کی مدد کی۔ دونوں کے درمیان چند خوشگوار جملوں کا تبادلہ ہوا۔ وہ اس فلائٹ پر آنے والے ریگولر پیسنجرز میں سے ایک تھا اور فلائٹ کا عملہ اسے پہچانتا تھا۔

جہاز کی سیڑھیوں کی طرف جانے سے پہلے سالار نے مڑ کر اس سے کہا۔

"تمہیں کوئی کوٹ وغیرہ لے کر آنا چاہیے تھا، سوئٹر میں سردی لگے گی تمہیں۔"

"یہ تمہارا ہی نہیں، میرا بھی شہر ہے۔ میں یہیں پیدا ہوئی ہوں، بیس سال یہیں گزارے ہیں میں نے یہاں۔ مجھے پتا ہے کتنی سردی ہوتی ہے، یہ سوئٹر کافی ہے۔" امامہ نے بڑے جتانے والے انداز میں اس سے کہا۔ وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔

جہاز کی سیڑھیوں سے باہر آتے ہی سرد ہوا کے پہلے جھونکے نے ہی اسے احساس دلا دیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اسے اپنے دانت بجتے ہوئے محسوس ہوئے۔ سالار نے کچھ کہے بغیر اپنے بازو پر پڑی جیکٹ اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے بڑی فرماں برداری سے کچھ نادم ہو کر جیکٹ پہن لی۔ اسلام آباد بدل گیا تھا۔ اس نے خجل ہو کر سوچا۔

ارائیول لاؤنج کی ایگزٹ کی طرف بڑھتے ہوئے سالار چند لمحوں کے لیے ٹھٹکا۔

"ایک بات میں تمہیں بتانا بھول گیا امامہ۔" اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"کیا بات ہے؟" وہ مسکرائی۔

"پاپا کو یہ پتا نہیں ہے کہ ہم آج اسلام آباد آ رہے ہیں۔" امامہ کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ سالار نے اسے رکتے دیکھا تو وہ بھی رک گیا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سالار نے اپنے کندھے پر اس کے بیگ کی بیلٹ ٹھیک کی۔ شاید ٹائمنگ غلط ہو گئی، ٹیکسی میں بتانا زیادہ بہتر تھا اور اب اگر اس نے یہاں سے جانے سے انکار کر دیا تو... وہ دل ہی دل میں فکرمند ہوا۔

وہ پلکیں جھپکے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی اسی طرح دیکھتا رہا۔ یہ ڈھٹائی تھی لیکن اب وہ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس نے بالآخر امامہ کی آنکھوں کی بے یقینی کو غصے میں بدلتے دیکھا، پھر اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔ وہ مسلسل دو ہفتوں سے اسے سکندر عثمان کے اسلام آباد بلانے کا کہہ رہا تھا۔ یہ سکندر عثمان کا بلاوا نہ ہوتا تو وہ صرف سالار کے کہنے پر تو کبھی وہاں نہ جاتی اور اب وہ کہہ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ سکندر عثمان کے نہ بلانے کے باوجود وہاں جانے کا کیا مطلب تھا، اس کا اندازہ وہ کر سکتی تھی اور اس وقت وہ بری طرح پریشان ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو اس کا دل چاہا تھا کہ وہ لاؤنج سے باہر نکلنے سے ہی انکار کر دے۔ اسے سالار پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

"سوری!" سالار نے اطمینان سے کہا۔

وہ چند لمحے مزید اسے دیکھتی رہی، پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا، پھر سالار نے اسے جیکٹ اتارتے ہوئے دیکھا۔ وہ وہاں کھڑی بے بسی کے عالم میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ سالار کو اندازہ تھا کہ وہ یہی کر سکتی ہے۔ اس نے جیکٹ اتار کر تقریباً "پھینکنے" والے انداز میں سالار کو دی۔

"تھینک یو۔" سالار نے جیکٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔
اس نے شکر ادا کیا کہ جیکٹ اس نے اس کے منہ پر نہیں دے ماری۔ وہ اب بے حد غصے میں ایگزٹ ڈور کی طرف جا رہی تھی۔ سالار کو حیرت ہوئی اس نے اس سے اپنا بیگ کیوں نہیں لیا تھا۔ اصولی طور پر یہ اس کا دوسرا رد عمل ہونا چاہیے تھا۔
"میرا بیگ دو۔" ایگزٹ ڈور سے نکلنے سے پہلے ہی امامہ نے پلٹ کر تقریباً "غراتے ہوئے" اس سے کہا تھا۔
سالار نے آرام سے بیگ اسے پکڑا دیا۔
ٹیکسی میں بیٹھنے تک دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ پورا راستہ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی، سالار نے بھی اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس وقت غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اسے مخاطب نہ کرنا مناسب تھا۔ وہ اب گھر پر سکندر عثمان اور طیبہ کے رد عمل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگلی بجلی ان پر گرنے والی تھی۔
گاڑی ان کے گھر کی بائی روڈ کا موڑ مڑ رہی تھی۔ امامہ کو اپنا پورا جسم سرد ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ سردی نہیں تھی، یہ خوف بھی نہیں تھا، یہ کچھ اور تھا۔ وہ نو سال کے بعد اپنے گھر کو اس سڑک کو اور اس موڑ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپانے لگے تھے، آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ سالار سے ساری ناراضی، سارا غصہ جیسے دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ خوشی تھی یا کیا تھا جو وہ گاڑی کو اپنے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔
اس کے گھر کا گیٹ سالار کے گھر کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر تھا اور وہ صرف یہ اندازہ کر پائی تھی کہ گیٹ بند تھا، گھر کی بیرونی لائٹس آن تھیں۔
گاڑی کے ہارن پر گارڈ نے باہر دیکھا پھر اس نے گارڈ روم سے باہر نکل کر گیٹ کھول دیا۔ سالار تب تک اس کے ساتھ گاڑی سے نکل کر ڈگی سے بیگز نکال رہا تھا۔ امامہ نے اس بار اپنا بیگ خود تھامنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ گارڈ نے سامان لینے کی کوشش نہیں کی۔ سالار اپنا سامان خود اٹھانے کا عادی تھا لیکن اس نے سالار کے ساتھ آنے والی اس لڑکی کو بڑی حیرت اور دلچسپی سے دیکھا تھا جو گیٹ سے گھر کے اندر آنے تک ان ہمسایوں کے گھر کو دیوانہ وار دیکھتی آ رہی تھی جن کے ساتھ سکندر عثمان کا میل ملاپ بند تھا۔
دھند کے باوجود امامہ نے گھر کی بالائی منزل کے کچھ بیڈ رومز کی کھڑکیوں سے آتی روشنی کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے اپنے بیڈ روم میں بھی روشنی تھی۔ اب وہاں کوئی اور رہتا ہوگا۔ وسیم... یا سعد... یا اس کا کوئی بھتیجا بھتیجی۔ اس نے آنکھوں میں امڈتے سیلاب کو صاف کرتے ہوئے ان کھڑکیوں میں جیسے کسی سائے، کسی ہیولے کو ڈھونڈنے کی سعی کی۔
"اندر چلیں...؟" اس نے اپنے بازو پر اس کے ہاتھ کی نرم گرفت محسوس کی۔ امامہ نے آنکھیں رگڑتے ہوئے سر ہلایا اور قدم آگے بڑھائے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ رو رہی ہے لیکن اس نے اسے رونے سے روکا نہیں تھا، اس نے بس اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔
سکندر عثمان اس وقت لاؤنج میں فون پر کسی دوست کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہوئے طیبہ کا انتظار کر رہے تھے جو اپنے بیڈ روم میں کوئی چیز لینے کے لیے گئی تھیں۔ اگر سکندر کو آفس سے آنے میں دیر نہ ہو گئی ہوتی تو وہ دونوں اس وقت کسی افطار ڈنر میں جا چکے ہوتے۔
لاؤنج میں سالار اور امامہ کا سامنا سب سے پہلے انہیں سے ہوا تھا۔ کسی بھوت کو دیکھ کر سکندر عثمان کا وہ حال نہ ہوتا جو اس وقت ان دونوں کو دیکھ کر ان کا ہوا تھا۔ وہ فون پر بات کرنا بھول گئے تھے۔
"جبار! میں بعد میں فون کرتا ہوں تمہیں۔" انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے اپنے دوست سے کہا اور سیل بند

کریاں غصہ بے حد معمولی لفظ تھا جو انہوں نے اس وقت سالار کے لیے محسوس کیا۔ وہ لاہور میں اس الو کے پٹھے کو صرف اسلام آباد امامہ کے ساتھ نہ آنے کی تاکید کر کے آئے تھے، بلکہ پچھلے کئی دن سے مسلسل فون پر ہر بار بات کرنے کے دوران یہ بات دہرانا نہیں بھولے اور وہ ہر بار فرماں برداری سے "او کے" کہتا رہا۔ نہ یہ فرماں برداری ان سے ہضم ہوئی تھی، نہ اتنا سیدھا او کے۔ ان کی چھٹی حس اس کے بارے میں سگنل دے رہی تھی۔ وہ پچھلے کئی سالوں میں بہت بدل گیا تھا، بے حد فرماں بردار ہو گیا تھا۔ ان کے سامنے سر جھکائے بیٹھا رہتا تھا بہت کم ان کی کسی بات سے اختلاف کرتا یا اعتراض کرتا لیکن وہ "سالار سکندر" تھا، ان کی وہ "چوتھی اولاد" جس کے بارے میں وہ سوتے میں بھی محتاط رہتے تھے۔

صرف سالار ہی نے نہیں، بلکہ امامہ نے بھی سکندر عثمان کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو دور ہی سے بھانپ لیا تھا۔

"ڈونٹ وری۔ پاپا مجھے کچھ ڈیل کریں گے لیکن تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔" دور سے اپنی طرف آتے، سکندر کی طرف جاتے ہوئے، وہ خود سے چند قدم پیچھے چلتی امامہ کی طرف دیکھے بغیر بے حد مدھم آواز میں بڑبڑایا تھا۔

امامہ نے سر اٹھا کر اپنے "شوہر" کا "اطمینان" دیکھا، پھر تقریباً" دس میٹر کے فاصلے پر آتے اپنے "سسر" کا "انداز"۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے اس وقت کیا کرنا چاہیے۔ وہ یہ سوچ کر زیادہ خوف زدہ ہوئی تھی کہ سکندر عثمان، سالار کی انسلٹ کرنے والے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ہوتی ہے اور وہ انہیں تلف کرنے کا سوچتا ہے۔ مگر امامہ کی وجہ سے رک جاتا ہے۔ سالار اپنے بینک میں امامہ کا اکاؤنٹ کھلوا کر تیس لاکھ روپے اس کا حق مہر جمع کرواتا ہے۔ وہ امامہ کو لے کر اسلام آباد جاتا ہے اور ایئر پورٹ پر اسے بتاتا ہے کہ سکندر عثمان نے منع کیا تھا۔ امامہ کو شدید غصہ آتا ہے۔ گھر پہنچنے پر سکندر عثمان اس سے شدید غصہ کرتے ہیں۔

۴
چوتھی قسط

"السلام علیکم پاپا!" اپنے ہاتھ میں پکڑے بیگز رکھتے ہوئے اس نے پاس آتے ہوئے سکندر عثمان سے ہمیشہ کی طرح یوں گلے ملنے کی کوشش کی تھی جیسے وہ ان ہی کی دعوت اور ہدایت پر وہاں آیا ہے۔

سکندر عثمان نے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں منع کیا تھا نا؟"

"جی۔" سالار نے بے حد تابعداری سے اس سوال کا جواب دیا۔

سکندر عثمان کا دل چاہا کہ وہ اس کا گلا دبا دیں۔

"کیسے آئے ہو؟" چند لمحوں کے بعد انہوں نے اس سے اگلا سوال کیا۔

"ٹیکسی پر۔" جواب کھٹاک سے آیا تھا۔

"ٹیکسی اندر لائے تھے؟"

"نہیں گیٹ پر ہی اترے ہیں۔" وہ نظریں جھکائے بے حد سعادت مندی سے کہہ رہا تھا۔

"تو سسرال والوں کو بھی سلام کر آتے۔" وہ اس بار چپ رہا۔ جانتا تھا نہ یہ سوال ہے نہ مشورہ۔

"بیٹا! آپ کیسی ہیں؟" بے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے وہ اب امامہ کی طرف بڑھ آئے تھے۔ ان کا لہجہ اب بدل گیا تھا۔ وہ بری طرح گھبرائی ہوئی باپ بیٹے کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی اور سکندر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ وہ سکندر کے سوال کا فوری طور پر جواب نہیں دے سکی۔

"سفر ٹھیک رہا؟" انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بے حد شفقت سے پوچھا تھا۔ "اور طبیعت ٹھیک ہے چہرہ کیوں اتنا سرخ ہو رہا ہے؟"

سکندر نے بھی اس کی آنکھوں کی نمی اور پریشانی کو محسوس کیا تھا۔

"جی... جی۔" وہ اٹکی۔

"سردی کی وجہ سے۔ السلام علیکم ممی۔ کیسی ہیں آپ؟" سالار نے بیگ دوبارہ کھینچتے ہوئے پہلا جملہ سکندر سے کہا اور دوسرا دور سے آتی ہوئی طیبہ کو دیکھ کر جو اسے دیکھ کر جیسے کراہی تھیں۔

"سالار! کیا ضرورت تھی یہاں آنے کی کچھ تو احساس کیا کرو۔" وہ اب ان سے گلے مل رہا تھا۔

"کچھ نہیں ہوتا ممی!" اس نے جواباً کہا۔

"طیبہ! امامہ کو چائے کے ساتھ کوئی میڈیسن دیں اور اب اس ڈنر کو تو رہنے ہی دیں۔" سکندر اسے ساتھ لگائے ہوئے اب طیبہ سے کہہ رہے تھے۔ طیبہ اب سالار کو ایک طرف کرتے ہوئے اس کی طرف بڑھ آئیں۔

"کیا ہوا امامہ کو؟"

"کچھ نہیں... میں... ٹھیک ہوں۔" اس نے مدافعانہ انداز میں طیبہ سے ملتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگ ڈنر پر جائیں ہماری پروا نہ کریں۔ ہم لوگ کھالیں گے جو بھی گھر میں ہے۔" سالار نے سکندر سے

کہا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اس وقت نہیں انوائٹڈ ہیں یقیناً گھر میں اس وقت ڈنر کی کوئی تیاری نہیں کی گئی ہوگی۔

سکندر نے اس کی بات سننے کی زحمت نہیں کی۔ انہوں نے پہلے انٹرکام پر گارڈز کو سیکیورٹی کے حوالے سے کچھ ہدایات کیں اس کے بعد ڈرائیور کو کسی قریبی ریسٹورنٹ سے کھانے کی کچھ ڈشز لکھوائیں اور خانساماں کو چائے کے لیے بلوایا۔

"پلیز پاپا! آپ ہماری وجہ سے اپنا پروگرام کینسل نہ کریں۔ آپ جائیں۔" سالار نے سکندر عثمان سے کہا۔

"تاکہ تم پیچھے سے ہمارے لیے کوئی اور مصیبت کھڑی کر دو۔"

وہ سکندر کے جملے پر ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی نے سکندر کو کچھ اور برہم کیا۔ امامہ اگر اس کے پاس نہ بیٹھی ہوتی تو سکندر عثمان اس وقت اس کی طبیعت اچھی طرح صاف کر دیتے۔

"جب میں نے تم دونوں سے کہا تھا کہ فی الحال یہاں مت آنا تو پھر... امامہ! کم از کم تمہیں اسے سمجھانا چاہیے تھا۔"

سکندر نے اس بار امامہ سے کہا تھا جو پہلے ہی بے حد شرمندگی اور حواس باختگی کا شکار ہو رہی تھی۔

"پاپا! امامہ تو مجھے منع کر رہی تھی، میں زبردستی لایا ہوں اسے۔" امامہ کی وضاحت سے پہلے ہی سالار نے کہا۔

سکندر نے بے حد خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا۔ ان کی اولاد میں سے کسی نے آج تک ان کے منہ پر بیٹھ کر اتنے فخریہ انداز میں ان کی بات نہ ماننے کا اعلان نہیں کیا تھا۔

سالار سے مزید کچھ کہنے کے بجائے انہوں نے ملازم سے سامان ان کے کمرے میں رکھنے کے لیے کہا۔ اس سارے معاملے پر سالار سے سنجیدگی سے بات کرنا ضروری تھا لیکن اکیلے میں۔

سالار کے کمرے میں آتے ہی امامہ مقناطیس کی طرح کھڑکی کی طرف گئی تھی اور پھر جیسے سحرزدہ سی کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہاں سے اس کے گھر کا بایاں حصہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے کمرے کا اور پروالا حصہ۔ اس کے کمرے کی کھڑکیاں... وسیم کے کمرے کی کھڑکیاں... دونوں کمروں میں روشنی تھی لیکن دونوں کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے تھے۔ کوئی ان پردوں کو ہٹا کر اس وقت اس کی طرح آ کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو جاتا تو اسے آرام سے دیکھ لیتا۔ پہچاننا بھی یا نہیں... وہ اتنی تو نہیں بدلی تھی کہ کوئی اسے پہچان ہی نہ پاتا... اس کے اپنے خونی رشتے تو... پانی سیلاب کے ریلے کی طرح سب بند توڑ کر اس کی آنکھوں سے بہنے لگا تھا۔ یہ کب سوچا تھا اس نے کہ کبھی اپنی زندگی میں وہ دوبارہ اس گھر کو دیکھ سکے گی۔ کیا ضروری تھا کہ یہ سب کچھ اس کی زندگی میں اس کے ساتھ ہوتا۔

وہ بے حد خاموشی کے ساتھ اس کے برابر میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے کھڑکی سے نظر آنے والے اس گھر کو دیکھا اور پھر امامہ کی آنکھوں سے بہنے والے پانی کو۔ اسی خاموشی کے ساتھ اس نے امامہ کے کندھے پر اپنا بازو پھیلاتے ہوئے جیسے اسے دلاسا دینے کے لیے اس کے سر کو چوما۔

"وہ میرا کمرا ہے۔" بہتے آنسوؤں کے ساتھ امامہ نے اسے بتایا۔

"جہاں سے تم مجھے دیکھا کرتی تھیں؟" وہ بہتے آنسوؤں کے بیچ ہنس پڑی۔

"میں تمہیں نہیں دیکھتی تھی سالار!" اس نے احتجاج کیا تھا۔

سالار نے اس کے کمرے کی کھڑکی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور مجھے پتا تک نہیں تھا کہ یہ تمہارا کمرا ہے۔ میں سمجھتا تھا یہ وسیم کا کمرا ہے۔ میں تو کپڑے بھی یہیں بدلا

کرتا تھا۔" سالار کو کچھ تشویش ہوئی۔
"مجھے کیا پتا تم کیا کرتے تھے۔ میرے کمرے کی کھڑکیاں تو بند ہوتی تھیں۔"
"کیوں؟" سالار نے کچھ حیرانی سے پوچھا۔
"تم شارٹس میں پھرتے تھے بیڈ روم میں اس لیے۔ اور تمہارے خیال میں میں کھڑکیاں کھلی رکھ سکتی تھی۔ تمہیں کوئی شرم ہی نہیں تھی۔ تم کیسے اس طرح اپنے بیڈ روم میں پھرتے تھے۔"
وہ اب آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس پر خفا ہو رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے کتنے آرام سے اس کی توجہ اس طرف سے ہٹائی تھی۔
"تم کس طرح کے انسان تھے؟"

سالار نے اس بار کچھ نہیں کہا۔ وہ اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔
"تمہیں کھانے کا کہنے آیا تھا۔ تم چینج کر لو تو چلتے ہیں۔" اس نے یک دم بات بدلتے ہوئے امامہ سے کہا۔ اس نے سالار کے تاثرات نہیں دیکھے۔ وہ ایک بار پھر کھڑکی سے نظر آنے والا گھر دیکھ رہی تھی۔



وہ تقریباً" دو بجے کمرے میں آیا اور اس کا خیال تھا کہ امامہ سو چکی ہوگی مگر وہ ابھی بھی کھڑکی کے سامنے بیٹھی ہوئی باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کے گھر کی لائٹس اب آف تھیں۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے گردن موڑ کر سالار کو دیکھا تھا۔
"سو جانا چاہیے تھا تمہیں امامہ!" اس سے نظریں ملنے پر سالار نے کہا۔
وہ کھڑکیوں کے آگے ایک کرسی رکھے دونوں پاؤں اوپر کیے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی تھی۔
"سو جاؤں گی۔"
"وہاں سب سو چکے ہیں' دیکھو لائٹس آف ہیں سب بیڈ رومز کی۔"
وہ دوبارہ گردن موڑ کر باہر دیکھنے لگی۔
سالار چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر واش روم میں چلا گیا۔ دس منٹ بعد کپڑے تبدیل کر کے وہ سونے کے لیے بیڈ پر لیٹ گیا۔
"امامہ! اب بس کرو اس طرح دیکھنے سے کیا ہوگا؟" بیڈ پر لیٹے لیٹے اس نے امامہ سے کہا۔
"میں نے کب کہا کہ کچھ ہوگا' تم سو جاؤ۔"
"تم وہاں بیٹھی رہو گی تو مجھے بھی نیند نہیں آئے گی۔"
"لیکن میں یہیں بیٹھوں گی۔" اس نے ضدی انداز میں کہا۔
سالار کو اس کی ضد نے کچھ حیران کیا۔ چند لمحے اسے دیکھنے کے بعد اس نے پھر کہا۔
"امامہ! تم اگر بیڈ پر آ کر لیٹو گی تو یہاں سے بھی تمہارا گھر نظر آتا ہے۔" سالار نے ایک بار پھر کوشش کی تھی۔
"یہاں سے زیادہ قریب ہے۔"
وہ اس بار بول نہیں سکا۔ اس کے لہجے میں موجود کسی چیز نے اس کے دل پر اثر کیا تھا۔ چند گز کا فاصلہ اس کے لیے بے معنی تھا۔ وہ اس کا گھر نہیں تھا۔ چند گز کی نزدیکی اس کے لیے بہت تھی۔ وہ نو سال بعد اس گھر کو دیکھ رہی تھی۔

"ہمارے گھر کے اوپر والے فلور میں ایک کمرا ہے' اس کمرے کی کھڑکیوں سے تمہارے گھر کا لان اور پورچ تک نظر آتا ہے۔" وہ لیٹے لیٹے چھت کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

امامہ یک دم کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔

"کون سا کمرا...؟ مجھے دکھاؤ۔" اس کے بیڈ کے قریب کھڑے ہو کر اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"دکھا سکتا ہوں اگر تم سو جاؤ' پھر صبح میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔" سالار نے آنکھیں کھول کر کہا۔

"میں خود بھی جا سکتی ہوں۔" وہ بے حد خفگی سے سیدھی ہو گئی۔

"اوپر والا فلور لاکڈ ہے۔" امامہ جاتے جاتے رک گئی۔ وہ یک دم مایوس ہوئی تھی۔

"سالار! مجھے لے کر جاؤ اوپر۔" وہ پھر اس کا کندھا ہلانے لگی۔

"اس وقت تو نہیں لے کر جاؤں گا۔" اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"تمہیں ذرا سی بھی محبت نہیں ہے مجھ سے؟" وہ اسے جذباتی دباؤ میں لے رہی تھی۔

"ہے' اسی لیے تو تمہیں لے کر جا رہا' صبح وہاں جانا۔ تمہاری فیملی کے لوگ گھر سے نکلیں گے۔ تم انہیں دیکھ سکتی ہو۔ اس وقت کیا نظر آئے گا تمہیں؟" سالار نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"ویسے بھی مجھے نہیں پتا کہ کمرے کی چابیاں کس کے پاس ہیں' صبح ملازم سے پوچھ لوں گا۔" سالار نے جھوٹ بولا۔

اوپر کا فلور مقفل نہیں تھا لیکن امامہ کو روکنے کا اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ کچھ مایوس ہو کر دوبارہ کھڑکی کی طرف جانے لگی۔ سالار نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اور فلور میں تب ان لاک کرواؤں گا' اگر تم ابھی سو جاؤ۔"

وہ چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں بیڈ کے اس طرف سوؤں گی۔"

سالار نے ایک لفظ کہے بغیر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اس نے کمبل ہٹا کر اس کے لیے جگہ بنا دی تھی۔

"اور میں لائٹس بھی آن رکھوں گی۔" وہ اس کی خالی کی ہوئی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

وہ اب کراؤن سے ٹیک لگائے دونوں گھٹنے سکیڑے بیڈ پر بیٹھی کھڑکی کو دیکھنے لگی تھی۔

"مجھے روشنی میں نیند نہیں آئے گی۔" سالار نے کمبل سے اس کے پاؤں اور ٹانگیں ڈھانپتے ہوئے کہا۔

"تمہیں تو روشنی میں ہی نیند آتی تھی۔" وہ کچھ جز بز ہو کر بولی۔

"اب اندھیرے میں آتی ہے۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تو پھر مجھے روشنی میں ہی نیند آتی ہے۔" سالار نے اپنی مسکراہٹ روکی۔

"تمہیں ایک اچھی بیوی کی طرح اپنے شوہر کی نیند کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔" مصنوعی غصے کے ساتھ سالار نے کچھ آگے جھکتے ہوئے سائیڈ ٹیبل لیمپ اور دوسری لائٹس آف کرنی شروع کر دیں۔

امامہ خفگی سے بیٹھی رہی لیکن اس نے سالار کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ کمرا اب نیم تاریک تھا لیکن بیرونی روشنیوں کی وجہ سے امامہ کا گھر زیادہ نمایاں ہو گیا تھا۔

"اس طرح دیکھنے سے کیا ہو گا؟" سالار اب کچھ جھلا گیا تھا۔

"ہو سکتا ہے کوئی پردے ہٹا کر کھڑکی میں کھڑا ہو۔"

وہ خواہش نہیں تھی' آس تھی اور وہ اس کی آس کو توڑ نہیں سکتا تھا۔

"صبح گاؤں جانا ہے ہمیں۔" وہ اب اس کی توجہ اس کھڑکی سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مجھے نہیں جانا، مجھے یہیں رہنا ہے۔" امامہ نے دوٹوک انکار کیا۔ سالار کو اس کی توقع تھی۔

"تمہیں گاؤں لے جانے کے لیے لے کر آیا تھا۔" سالار نے کچھ خفگی سے کہا۔

"تم جاؤ، مجھے کسی گاؤں میں دلچسپی نہیں ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

سالار یک دم کمبل ہٹاتے ہوئے بیڈ سے اٹھا اور اس نے پردے برابر کر دیے۔ باہر سے آنے والی روشنی بند ہوتے ہی کمرا ایک دم تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ امامہ نے بے حد خفگی کے عالم میں لیٹتے ہوئے کمبل اپنے اوپر کھینچ لیا۔

دوبارہ اس کی آنکھ سالار کے جگانے سے کھلی۔ سحری ختم ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ اس نے اٹھ کر سب سے پہلے کھڑکی کے پردے ہٹائے تھے۔ سالار نے اسے کچھ ہمدردی سے دیکھا۔ وہ انٹرکام اٹھا کر خانساماں کو کھانا کمرے میں لانے کا کہہ رہا تھا۔ امامہ کے کمرے میں لائٹ آن تھی لیکن کھڑکیوں کے آگے اب بھی پردے گرے ہوئے تھے۔

اسے جیسے کچھ مایوسی ہوئی۔ جب تک وہ کپڑے تبدیل کر کے اور منہ ہاتھ دھو کر آئی تب تک خانساماں کھانے کی ٹرالی کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔ انہوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ کھانا کھایا اور کھانا ختم کرتے ہی امامہ نے کہا۔

"اب چابیاں لے لو، اوپر چلیں۔"

"مجھے نماز پڑھ کر آنے دو۔"

"نہیں، مجھے اپنا گھر دیکھنا ہے۔"

اس بار سالار نے جیسے امامہ کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ اسے لے کر وہ اوپر کے فلور پر آ گیا۔ کمرا کھلا دیکھ کر امامہ نے اسے بے حد خفگی سے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ وہ اس وقت اتنی خوش تھی کہ سالار کی کسی بات پر ناراض نہیں ہو رہی تھی۔

اس کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوتے ہی وہ جیسے سانس لینا بھول گئی تھی۔ وہاں سے اس کے گھر کا پورا لان اور پورچ نظر آ رہا تھا۔ لان بالکل بدل گیا تھا۔ وہ ویسا نہیں رہا تھا جیسا کبھی ہوتا تھا جب وہ یہاں تھی۔ تب وہاں وہ کرسیاں بھی نہیں تھیں، جو پہلے ہوتی تھیں۔ لان میں لگی بیلیں اب پہلے سے بھی زیادہ بڑی اور پھیل چکی تھیں۔ آنسوؤں کا ایک نیا ریلا اس کی آنکھوں میں آیا تھا۔ سالار نے اس دفعہ اسے کچھ نہیں کہا۔ کہنا بے کار تھا۔ اسے فی الحال رونا تھا، وہ جانتا تھا۔

وہ مسجد میں نماز اور کچھ دیر قرآن پاک کی تلاوت کرنے کے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس آیا تھا اور حسب توقع تب بھی امامہ کمرے میں نہیں آئی تھی۔

وہ گاؤں جانے کے لیے تیار ہونے کے بعد اسے خدا حافظ کہنے اوپر آیا تھا۔ اسے ساتھ لے جانے کا ارادہ وہ پہلے ہی ترک کر چکا تھا۔

اڑھائی گھنٹے کے بعد بھی وہ کھڑکی کے سامنے اسی طرح کھڑی تھی۔ سالار کے اندر آنے پر بھی اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ سالار نے اسے مخاطب کرنے کے بجائے کمرے میں دور پڑے صوفے کو کچھ جدوجہد کے ساتھ کھڑکی کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا تھا۔

"یہاں بیٹھ جاؤ، تم کب تک اس طرح کھڑی رہو گی۔"

صوفہ دھکیل کر اس کے قریب لانے کے بعد سالار نے اس کو مخاطب کیا اور تب ہی اس نے امامہ کا چہرہ دیکھا۔

"ہمارے گھر کے اوپر والے فلور میں ایک کمرا ہے" اس کمرے کی کھڑکیوں سے تمہارے گھر کا لان اور پورچ تک نظر آتا ہے۔" وہ لیٹے لیٹے چھت کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔
امامہ یک دم کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس آگئی۔
"کون سا کمرا.....؟ مجھے دکھاؤ۔" اس کے بیڈ کے قریب کھڑے ہو کر اس نے بے چینی سے پوچھا۔
"دکھا سکتا ہوں اگر تم سو جاؤ پھر صبح میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔" سالار نے آنکھیں کھول کر کہا۔
"میں خود بھی جا سکتی ہوں۔" وہ بے حد خفگی سے سیدھی ہو گئی۔
"اوپر والا فلور لاکڈ ہے۔" امامہ جاتے جاتے رک گئی۔ وہ یک دم مایوس ہوئی تھی۔
"سالار! مجھے لے کر جاؤ اوپر۔" وہ پھر اس کا کندھا ہلانے لگی۔
"اس وقت تو نہیں لے کر جاؤں گا۔" اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔
"تمہیں ذرا سی بھی محبت نہیں ہے مجھ سے؟" وہ اسے جذباتی دباؤ میں لے رہی تھی۔
"ہے" اسی لیے تو تمہیں لے کر جا رہا ہوں صبح وہاں جانا۔ تمہاری فیملی کے لوگ گھر سے نکلیں گے۔ تم انہیں دیکھ سکتی ہو۔ اس وقت کیا نظر آئے گا تمہیں؟" سالار نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔
"ویسے بھی مجھے نہیں پتا کہ کمرے کی چابیاں کس کے پاس ہیں صبح ملازم سے پوچھ لوں گا۔" سالار نے جھوٹ بولا۔
اوپر کا فلور مقفل نہیں تھا لیکن امامہ کو روکنے کا اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ کچھ مایوس ہو کر دوبارہ کھڑکی کی طرف جانے لگی۔ سالار نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"اور فلور میں تب ان لاک کرواؤں گا" اگر تم ابھی سو جاؤ۔"
وہ چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔
"میں بیڈ کے اس طرف سوؤں گی۔"
سالار نے ایک لفظ کہے بغیر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اس نے کمبل ہٹا کر اس کے لیے جگہ بنا دی تھی۔
"اور میں لائٹس بھی آن رکھوں گی۔" وہ اس کی خالی کی ہوئی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
وہ اب کراؤن سے ٹیک لگائے دونوں گھٹنے سکیڑے بیڈ پر بیٹھی کھڑکی کو دیکھنے لگی تھی۔
"مجھے روشنی میں نیند نہیں آئے گی۔" سالار نے کمبل سے اس کے پاؤں اور ٹانگیں ڈھانپتے ہوئے کہا۔
"تمہیں تو روشنی میں ہی نیند آتی تھی۔" وہ کچھ چڑ کر بولی۔
"اب اندھیرے میں آتی ہے۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔
"تو پھر مجھے روشنی میں ہی نیند آتی ہے۔" سالار نے اپنی مسکراہٹ روکی۔
"تمہیں ایک اچھی بیوی کی طرح اپنے شوہر کی نیند کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔" مصنوعی غصے کے ساتھ سالار نے کچھ آگے جھکتے ہوئے سائیڈ ٹیبل لیمپ اور دوسری لائٹس آف کرنی شروع کر دیں۔
امامہ خفگی سے بیٹھی رہی لیکن اس نے سالار کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ کمرا اب نیم تاریک تھا لیکن بیرونی روشنیوں کی وجہ سے امامہ کا گھر زیادہ نمایاں ہو گیا تھا۔
"اس طرح دیکھنے سے کیا ہو گا؟" سالار اب کچھ جھلا گیا تھا۔
"ہو سکتا ہے کوئی پردے ہٹا کر کھڑکی میں کھڑا ہو۔"
وہ خواہش نہیں تھی "آس" تھی اور وہ اس کی آس کو توڑ نہیں سکتا تھا۔

"صبح گاؤں جانا ہے ہمیں۔" وہ اب اس کی توجہ اس کھڑکی سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مجھے نہیں جانا مجھے یہیں رہنا ہے۔" امامہ نے دو ٹوک انکار کیا۔ سالار کو اس کی توقع تھی۔

"تمہیں گاؤں لے جانے کے لیے لے کر آیا تھا۔" سالار نے کچھ خفگی سے کہا۔

"تم جاؤ مجھے کسی گاؤں میں دلچسپی نہیں ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

سالار یک دم کمبل ہٹاتے ہوئے بیڈ سے اٹھا اور اس نے پردے برابر کر دیے۔ باہر سے آنے والی روشنی بند ہوتے ہی کمرا یک دم تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ امامہ نے بے حد خفگی کے عالم میں لیٹتے ہوئے کمبل اپنے اوپر کھینچ لیا۔

دوبارہ اس کی آنکھ سالار کے جگانے سے کھلی۔ سحری ختم ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ اس نے اٹھ کر سب سے پہلے کھڑکی کے پردے ہٹائے تھے۔ سالار نے اسے مجھ ہو بڑی سے دیکھا۔ وہ انٹر کام اٹھا کر خانساماں کو کھانا کمرے میں لانے کا کہہ رہا تھا۔ امامہ کے کمرے میں لائٹ آن تھی لیکن کھڑکیوں کے آگے اب بھی پردے گرے ہوئے تھے۔

اسے جیسے کچھ مایوسی ہوئی۔ جب تک وہ کپڑے تبدیل کر کے اور منہ ہاتھ دھو کر آئی تب تک خانساماں کھانے کی ٹرالی کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔ انہوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ کھانا کھایا اور کھانا ختم کرتے ہی امامہ نے کہا۔

"اب چابیاں لے لو اوپر چلیں۔"

"مجھے نماز پڑھ کر آنے دو۔"

"نہیں مجھے اپنا گھر دیکھنا ہے۔"

اس بار سالار نے جیسے امامہ کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ اسے لے کر وہ اوپر کے فلور پر آگیا۔ کمرا کھلا دیکھ کر امامہ نے اسے بے حد خفگی سے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ وہ اس وقت اتنی خوش تھی کہ سالار کی کسی بات پر ناراض نہیں ہو رہی تھی۔

اس کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوتے ہی وہ جیسے سانس لینا بھول گئی تھی۔ وہاں سے اس کے گھر کا پورا لان اور پورچ نظر آ رہا تھا۔ لان بالکل بدل گیا تھا۔ وہ ویسا نہیں رہا تھا جیسا کبھی ہوتا تھا جب وہ وہاں تھی۔ تب وہاں وہ کرسیاں بھی نہیں تھیں، جو پڑی ہوئی تھیں۔ لان میں لگی بیلیں اب پہلے سے بھی زیادہ بڑی اور پھیل چکی تھیں۔ آنسوؤں کا ایک نیا ریلا اس کی آنکھوں میں آیا تھا۔ سالار نے اس دفعہ اسے کچھ نہیں کہا۔ کہنا بے کار تھا۔ اسے فی الحال رونا تھا، وہ جانتا تھا۔

وہ مسجد میں نماز اور کچھ دیر قرآن پاک کی تلاوت کرنے کے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس آیا تھا اور حسب توقع تب بھی امامہ کمرے میں نہیں آئی تھی۔

وہ گاؤں جانے کے لیے تیار ہونے کے بعد اسے خدا حافظ کہنے اوپر آیا تھا۔ اسے ساتھ لے جانے کا ارادہ وہ پہلے ہی ترک کر چکا تھا۔

اڑھائی گھنٹے کے بعد بھی وہ کھڑکی کے سامنے اسی طرح کھڑی تھی۔ سالار کے اندر آنے پر بھی اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ سالار نے اسے مخاطب کرنے کے بجائے کمرے میں دور پڑے صوفے کو کچھ جدوجہد کے ساتھ کھڑکی کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا تھا۔

"یہاں بیٹھ جاؤ تم کب تک اس طرح کھڑی رہو گی۔"

صوفہ دھکیل کر اس کے قریب لانے کے بعد سالار نے اس کو مخاطب کیا اور تب ہی اس نے امامہ کا چہرہ دیکھا۔

اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اور ناک سرخ تھی۔ سالار نے گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہاں ایک گاڑی میں کچھ بچے سوار ہو رہے تھے اور ایک عورت ان کو خدا حافظ کہہ رہی تھی۔

"رضوان کے بچے ہیں؟" سالار نے گاڑی کو اسٹارٹ ہوتے دیکھ کر امامہ سے کہا۔

امامہ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر کانپتے ہونٹوں کے ساتھ بس انہیں دیکھ رہی تھی۔ سالار نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ نو سال لمبا عرصہ تھا۔ پتا نہیں مزید ان میں سے کس کو وہ پہچان سکی تھی اور کس کو نہیں اور ان میں سے کس کو وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ وہ عورت اب اندر چلی گئی تھی۔

اس کے کندھوں پر ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے سالار نے اس سے کہا "بیٹھ جاؤ!"

امامہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں اور ناک رگڑنے کی کوشش کی۔ صرف چند لمحوں کے لیے اس کا چہرہ خشک ہوا تھا، بر سات پھر ہونے لگی تھی۔ سالار پنجوں کے بل اس کے سامنے چند لمحوں کے لیے بیٹھا۔ اس نے امامہ کے دونوں ہاتھ تسلی دینے والے انداز میں اپنے ہاتھ میں لیے۔ اس کے دونوں ہاتھ بے حد سرد تھے۔ وہ اس کے ہاتھ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے کی سردی کو اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ ہیٹر آن کرنے کے بعد اس نے کمرے کی الماری میں کوئی کمبل ڈھونڈنے کی کوشش کی اور ایک کمبل اسے نظر آ ہی گیا تھا۔

"میں گاؤں کے لیے نکل رہا ہوں۔ شام تک واپس آؤں گا۔ دس گیارہ بجے کے قریب پاپا اور ممی آ جائیں گے، تب تم نیچے آ جانا۔" اس کی ٹانگوں پر کمبل ڈالتے ہوئے اس نے امامہ سے کہا۔

وہ اب بھی اسی طرح دوپٹے سے آنکھیں اور ناک رگڑ رہی تھی لیکن اس کی نظریں اب بھی کھڑکی سے باہر تھیں۔ سالار اور یہ کمرا جیسے اس کے لیے اہم نہیں رہا تھا۔ وہ اس سے کیا کہہ رہا تھا اس نے نہیں سنا تھا اور سالار یہ جانتا تھا۔ وہ اسے خدا حافظ کہتے ہوئے چلا گیا۔

وہ اگلے چار گھنٹے اسی طرح صوفے پر بیٹھی رہی۔ اس دن اس نے نو سال کے بعد باری باری اپنے تینوں بھائیوں کو بھی گھر سے جاتے دیکھا تھا۔ وہ وہاں بیٹھی انہیں دیکھتی ہچکیوں سے روتی رہی تھی۔ وہاں بیٹھے ہوئے اسے لگ رہا تھا کہ اس نے یہاں آ کر غلطی کی ہے۔ اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اتنے سال سے صبر کے جو بند وہ باندھتی چلی آ رہی تھی اب وہ بند باندھنا مشکل ہو رہے تھے۔ وہ پہلے اسلام آباد آنا نہیں چاہتی تھی اور اب یہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی۔ ایسا بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ اسی طرح چوری چھپے اس گھر میں رہتی۔ اسی طرح روز اپنے گھر والوں کو دیکھتی رہتی۔ اس کے لیے تو یہ بھی بہت تھا، وہ احمقانہ سوچ تھی لیکن وہ سوچ رہی تھی۔ وہ ہر بات سوچ رہی تھی جس سے وہ یہاں اپنے باپ کے گھر کے پاس رہ سکتی ہو۔

سالار نے گاؤں پہنچنے کے چند گھنٹے کے بعد سکندر کو فون کیا۔

"میں بھی حیران تھا جب ملازم نے مجھے بتایا کہ وہ اوپر گیسٹ روم میں ہے۔ میں سوچ رہا تھا پتا نہیں وہ وہاں کیا کر رہی ہے۔"

سالار نے انہیں امامہ کو وہاں سے بلوانے کے لیے کہا تھا اور سکندر نے اسے جواباً کہا۔

"کیا ضرورت تھی اسے خوامخواہ وہاں لے جانے کی۔ گھر تو اس کا تمہارے کمرے سے بھی نظر آتا ہے۔"

"لیکن گھر والے اسے گیسٹ روم سے ہی نظر آ سکتے تھے۔" سالار نے کہا۔

سالار سے بات ختم کرنے کے بعد سکندر اٹھ کر اوپر والے فلور پر چلے گئے۔ دروازے پر دستک دے کر وہ اندر آئے تھے۔

"بیٹا! نیچے آنا تھا ہم لوگوں کے پاس آ کر بیٹھیں کچھ دیر۔"

سکندر یہ کہتے ہوئے اندر آئے اور امامہ کچھ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔
وہ ان کے وہاں آنے کی توقع نہیں کر رہی تھی اور اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی سکندر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے تھے اس کی آنکھیں بری طرح سوجی ہوئی تھیں۔
"رونے والی کیا بات ہے بیٹا۔۔۔؟" سکندر نے اس کے سر کو تھپکتے ہوئے کہا۔
"نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ میں۔۔۔" وہ بے حد ندامت سے ان سے نظریں ملائے بغیر بولی۔
"چلیں! نیچے آئیں' طیبہ بھی پوچھ رہی ہیں آپ کا۔" سکندر نے ایک بار پھر اس کا سر تھپکا۔
یہ سالار نہیں تھا' جسے وہ جھڑکنے سے انکار کر دیتی۔ "جی۔" اس نے یہ کہتے ہوئے صوفے پر پڑا کمبل اٹھانے کی کوشش کی۔ سکندر نے اسے روک دیا۔
"ملازم اٹھا لے گا۔۔۔ آپ آ جائیں۔"
اس کا چہرہ دیکھ کر طیبہ بھی بے چین ہو گئیں۔ جیسے بھی حالات میں شادی ہوئی' بہرحال وہ ایک ایسی فیملی تھی جسے وہ طویل عرصے سے جانتے تھے اور جن کی دیوار کے ساتھ ان کی دیوار جڑی تھی۔ اس رشتے کا پاس بہو ہونے کے ناتے ان پر کچھ زیادہ ذمہ داری عائد کرتا تھا۔ خود وہ بھی امامہ کو بچپن سے دیکھتے آئے تھے۔ کسی نہ کسی حد تک وہ ان کے لیے بے حد شناسا تھی۔
وہ لوگ اسے تسلیاں دیتے اس سے باتیں کرتے رہے۔ پھر سکندر نے اسے آرام کرنے کے لیے کہا۔ وہ کمرے میں آ کر کچھ دیر کے لیے کھڑکی کے پاس بیٹھی رہی پھر کچھ تھکی ہوئی آ کر بیڈ پر لیٹ کر سو گئی۔
ساڑھے چار بجے اسے ملازم نے انٹرکام پر اٹھایا تھا۔ افطار کا وقت قریب تھا' سکندر اور طیبہ بھی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ سالار بھی افطار سے چند منٹ پہلے ہی پہنچا تھا۔ سکندر اور طیبہ اس رات بھی کہیں مدعو تھے۔ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر وہ انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے چلے گئے۔ رات کو وہ بارہ بجے کے قریب واپس آئے' گیارہ بجے سالار اور اس کی فلائٹ تھی۔ طیبہ جانے سے پہلے امامہ کو کچھ تحائف دینے آئیں تو امامہ کو وہ تحائف یاد آ گئے جو وہ کراچی سے ان دونوں کے لیے لے کر آئی تھی۔
امامہ کو حیرت ہوئی جب سالار طیبہ سے ملنے کے بعد سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔
"تم مجھے دس بجے اٹھا دینا۔" اس نے امامہ کو ہدایت دی تھی۔
"گیارہ بجے فلائٹ ہے دیر تو نہیں ہو جائے گی۔۔۔؟" امامہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"نہیں' پہنچ جائیں گے۔" اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔
وہ کچھ دیر بیٹھی اسے دیکھتی رہی پھر وہ دوبارہ اوپر کے فلور سے اسی کمرے میں آ گئی۔
اس کے گھر کے پورچ میں کوئی گاڑی بھی نہیں کھڑی تھی۔ وہ ویک اینڈ تھا اور وہ یقیناً گھر پر نہیں تھے۔ کہاں ہو سکتے تھے۔ امامہ نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ نو سال کے بعد یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ اسے امید یہ تھی کہ وہ وہاں بیٹھی انہیں واپس آتے دیکھ سکتی ہے۔ لیکن دس بجے تک کوئی گاڑی واپس نہیں آئی۔ وہ بوجھل دل اور نم آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر نیچے آ گئی۔ سالار کو جگانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ جانے کے لیے سامان سمیت کھڑا تھا۔ امامہ کا دل مزید بوجھل ہوا تو بالآخر ایک بار پھر سب کچھ چھوڑ کر جانے کا وقت آ گیا تھا۔
باہر پورچ میں ڈرائیور ایک گارڈ کے ساتھ گاڑی میں انتظار کر رہا تھا۔ سکندر عثمان نے گارڈ کو ایئرپورٹ تک ساتھ جانے کی ہدایت کی تھی۔ وہ ہر طرح کی احتیاطی تدابیر کر رہے تھے۔ سالار نے سامان گاڑی میں رکھنے کے بعد چابی ڈرائیور سے لی۔ امامہ نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔

"ہم لوگ بائی روڈ جا رہے ہیں' پاپا آئیں تو انہیں بتا دینا۔"
ڈرائیور نے کچھ احتجاج کرنے کی کوشش کی۔ شاید سکندر اسے ضرورت سے زیادہ ہدایات کر گئے تھے' لیکن سالار کی ایک جھاڑ نے اسے خاموش کر دیا۔
"اور اب اتنی وفاداری دکھانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میرے گھر سے نکلتے ہی پاپا کو فون کر دو۔"
وہ گاڑی میں بیٹھتا ہوا اس سے کہہ رہا تھا۔ اسے یقین تھا وہ اس کے گھر سے نکلتے ہی یہی کام کرے گا۔ اس لیے گیٹ سے نکلتے ہی اس نے سکندر کے فون پر کال کی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے سکندر کا فون انگیج کرنا چاہتا تھا۔
"پاپا! ہم لوگ نکل رہے تھے تو سوچا آپ سے بات کر لوں۔" سالار نے سکندر سے کہا۔
"اچھا کیا۔"
"ذرا ممی سے بات کرا دیں۔" اس نے سکندر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سکندر سے کہا۔ اسے خدشہ تھا کہ سکندر ڈرائیور کی ان کمنگ کال دیکھ کر جو سمجھ لیں گے' وہ اگر گاڑی میں ان سے بات کر رہا ہے تو ڈرائیور انہیں کیوں کال کر رہا تھا۔ البتہ طیبہ اس سے بات کرتے ہوئے کسی ان کمنگ کال کو چیک نہ کرتیں اور اگر کرتیں بھی تو ان کو شک نہیں ہوتا۔ اگلے پندرہ منٹ وہ طیبہ کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ ساتھ بیٹھی ہوئی امامہ کچھ حیران تھی۔ لیکن اس نے اسے نظر انداز کیا تھا۔ وہ اتنی لمبی باتیں کرنے کا عادی نہیں تھا۔ جتنا وہ اب یک دم باتونی ہو گیا تھا۔
ادھر یہی حیرانی طیبہ کو بھی ہو رہی تھی۔ سکندر روٹر ٹیبل پر چند دوسرے افراد کے ساتھ مصروف تھے۔ پندرہ منٹ لمبی گفتگو کے بعد جب سالار کو یقین ہو گیا کہ ڈرائیور اب تک سکندر کو کئی کالز کرنے کے بعد تنگ آ کر کالز کرنا چھوڑ چکا ہو گا یا کم از کم دوبارہ کرنے کی اگلی کوشش کچھ دیر بعد ہی کرے گا تو اس نے خدا حافظ کہتے ہوئے فون آف کر دیا۔ طیبہ اور سکندر کی واپسی بارہ بجے سے پہلے متوقع نہیں تھی اور اب اگر ڈرائیور سے پانچ دس منٹ بعد بھی ان کی بات ہوتی تو وہ بہت فاصلہ طے کر چکے ہوتے۔
"بائی روڈ آنے کی کیا ضرورت تھی؟" اس کا فون بند ہوتے دیکھ کر امامہ نے اس سے پوچھا۔
"ایسے ہی دل چاہ رہا تھا۔ کچھ یادیں تازہ کرنا چاہتا ہوں۔" سالار نے سیل فون رکھتے ہوئے کہا۔
"کیسی یادیں؟" وہ حیران ہوئی۔
"تمہارے ساتھ پہلے سفر کی یادیں۔" وہ کچھ دیر اس سے نظریں نہیں ہٹا سکی۔
وہ اس شخص سے کیا کہتی کہ وہ اس سفر کو یاد نہیں کرنا چاہتی۔ وہ اس کے لیے سفر نہیں تھا' خوف اور بے یقینی میں گزارے چند گھنٹے تھے جو اس نے گزارے تھے۔ مستقل اس وقت ایک جیتا جاگتا بھوت بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا اور اس راستے میں وہ بھوت مسلسل اسے ڈراتا رہا تھا۔
"میرے لیے خوشگوار نہیں تھا وہ سفر۔" اس نے تھکے سے لہجے میں سالار سے کہا۔
"میرے لیے بھی نہیں تھا۔" سالار نے بھی اسی انداز میں کہا۔
"کئی سال ہانٹ کرتا رہا مجھے' دیکھنے آیا ہوں کہ اب بھی ہانٹ کرتا ہے۔" وہ بات ختم کرتے ہوئے اسے دیکھ کر بہت مدھم انداز میں مسکرایا۔
امامہ خاموش رہی۔ کئی سال پہلے کی وہ رات ایک بار پھر سے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگی تھی اور آنکھوں کے سامنے صرف رات ہی نہیں بلکہ جلال بھی آیا تھا۔ اس رات کی تکلیف کا ایک سرا اس کی ذات کے ساتھ بندھا تھا۔ وہ سرا اس کی فیملی کے ساتھ۔ اس نے دونوں کو کھویا تھا۔ اگلی صبح کا سورج لاکھ ہمیشہ جیسا ہوتا' اس کی زندگی ویسی نہیں رہی تھی۔ کبھی وہ سوچ سکتی تھی کہ وہ کبھی اس رات کو صرف تکلیف سمجھ کر سوچے گی'

تقدیر سمجھ کر نہیں۔۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ برابر میں بیٹھا شخص آج اس کے آنسوؤں سے بے خبر نہیں تھا، لیکن اس وقت بے خبر تھا۔ اس نے کچھ کہے بغیر ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ امامہ آنکھیں پونچھنے لگی تھی۔ وہ سارا نقشہ جو اس نے اپنی زندگی کا کھینچا تھا اس میں یہ شخص کہیں نہیں تھا۔ زندگی نے کس کو کس کے ساتھ جوڑا۔۔ کس تعلق کو کہاں سے توڑا تھا۔۔ پتا ہی نہیں چلا۔۔ سفر خاموشی سے ہو رہا تھا، لیکن طے ہو رہا تھا۔

"اب بہت احتیاط سے گاڑی چلا رہے ہو۔" امامہ کو کئی سال پہلے کی اس کی رش ڈرائیونگ یاد تھی۔ "زندگی کی قدر ہو گئی ہے اب؟" اس نے سالار سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری وجہ سے احتیاط کر رہا ہوں۔" وہ بول نہیں سکی۔ خاموشی کا ایک اور وقفہ آیا۔

وہ شہر کی حدود سے باہر نکل آئے تھے اور سڑک پر دھند محسوس ہونے لگی تھی۔ یہاں دھند گہری نہیں تھی، لیکن موجود تھی۔

"کبھی دوبارہ سفر کیا اکیلے اس روڈ پر۔" امامہ نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"موٹروے سے جاتا ہوں اب اگر گاڑی میں جانا ہو تو۔ بس ایک بار آیا تھا کچھ ماہ پہلے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "جب پاپا نے مجھے تمہارے ہاتھ کا لکھا ہوا نوٹ دیا۔ کیا رات تھی؟"

وہ جیسے تکلیف سے کراہا اور پھر ہنس پڑا۔

"امید تھی جس کو اس رات میں نے مجسم فنا ہوتے دیکھا۔ سمجھ میں آیا مجھے کہ تب اس رات تم کس حالت سے گزری ہو گی۔ اذیت سے بہت زیادہ۔۔ موت سے ذرا سی کم۔۔ لیکن تکلیف اس کو کوئی نہیں کہہ سکتا۔" ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے، وہ جو کچھ اس تک پہنچانا چاہ رہا تھا، پہنچ رہا تھا۔ اس کانچ سے وہ بھی گزری تھی۔ نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ گردن سیٹ کی پشت سے ٹکائے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں سارا راستہ بس یہی سوچتا رہا کہ میں اب کروں گا کیا۔ کیا کروں گا میں زندگی میں سوچ رہا تھا۔ اللہ نے مجھے ضرورت سے زیادہ زندگی دے دی ہے۔۔ تمہارے ساتھ برا کیا تھا۔۔ برا تو ہونا ہی تھا میرے ساتھ۔۔ یاد ہے نا میں نے تمہارے ساتھ سفر میں کیسی باتیں کی تھیں۔"

اس نے عجیب سے انداز میں ہنس کر ایک لمحہ کے لیے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ایک لمحہ کے لیے دونوں کی نظریں ملی تھیں، پھر سالار نے نظریں چراتے ہوئے گردن سیدھی کر لی۔ سفر پھر خاموشی سے طے ہونے لگا تھا۔ وہ تعلق جو ان کے بیچ تھا، وہ جیسے خاموشی کو بھی گفتگو بنا رہا تھا۔ لفظ اس وقت خاموشی سے زیادہ بامعنی نہیں ہو سکتے تھے۔

امامہ بھی گردن سیدھی کر کے سڑک کو دیکھنے لگی۔ دھند اب گہری ہو رہی تھی۔ جیسے وہ سڑک پر نہیں بلکہ اپنے ماضی کی دھند میں داخل ہو رہے تھے۔ گہری، معدوم نہ ہونے اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والی گہری دھند۔۔ کیا کیا اپنے اندر چھپائے ہوئے تھی، لیکن جو کچھ تھا وہ او جھل ہو گیا تھا، فراموش نہیں ہوا تھا۔

سیل فون کی رنگ ٹون نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ سیل پر سکندر کا نمبر چمک رہا تھا۔ سالار ہنس پڑا۔ امامہ اس کی بے مقصد ہنسی کو نہیں سمجھی۔

"ہیلو!" سالار نے کال ریسیو کرتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ اسے حیرت تھی، سکندر عثمان کی کال اتنی دیر سے نہیں آنی چاہیے تھی۔ شاید ڈرائیور نے ان کے گھر پہنچتے ہی انہیں سالار کے ایڈونچر کے بارے میں مطلع کیا تھا۔ سالار نے آواز کچھ کم کر دی تھی۔ جو کچھ سکندر اسے فون پر کہہ رہے تھے وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ امامہ تک

پہنچتا۔

"جی۔۔۔ جی۔" وہ اب تابع داری سے کہہ رہا تھا۔ سکندر اس پر بری طرح برس رہے تھے اور کیوں نہ برستے وہ، انہیں بے وقوف بنانا جیسے سالار کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور یہ احساس سکندر کے غصے میں اضافہ کر رہا تھا۔ انہوں نے کچھ دیر پہلے طیب کے پرس میں پڑے اپنے سیل پر ڈرائیور کی مسڈ کالز دیکھی تھیں اور اس سے بات کر کے وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے تھے۔ بائی روڈ لاہور جانا، اس وقت ان کے لیے اس کی حماقت کا اعلا ترین مظاہرہ تھا لیکن اس نے جتنے اطمینان سے ان کی آنکھوں میں دھول جھونکی تھی، وہ ان کے لیے زیادہ اشتعال انگیز تھا۔

"اب غصہ ختم کر دیں پاپا! ہم دونوں بالکل محفوظ ہیں اور آرام سے سفر کر رہے ہیں۔" اس نے بالآخر سکندر سے کہا۔

"تم ظفر کو دھمکیاں دے کر گئے تھے کہ وہ مجھے انفارم نہ کرے؟"

"دھمکی۔۔۔ میں نے ایک مؤدبانہ درخواست کی تھی اس سے کہ وہ آپ کو فی الحال انفارم نہ کرے۔ آپ ڈنر چھوڑ کر خوامخواہ پریشان ہوتے۔" وہ بڑی رسانیت سے ان سے کہہ رہا تھا۔

"میری دعا ہے سالار! کہ تمہاری اولاد بالکل تمہارے جیسی ہو اور تمہیں اتنا ہی خوار کرے، جتنا تم ہمیں کرتے ہو پھر تمہیں ماں باپ کی پریشانی کا احساس ہو گا۔" وہ ہنس پڑا۔

"پاپا! اس طرح کی باتیں کریں گے تو میں اولاد ہی پیدا نہیں کروں گا۔"

امامہ نے اس کے جملے پر چونک کر اسے دیکھا۔

"پاپا دعا کر رہے ہیں کہ ہماری اولاد جلد پیدا ہو۔"

امامہ کو چونکتے دیکھ کر سالار نے فون پر بات کرتے ہوئے اسے بتایا۔ وہ بے اختیار سرخ ہوئی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ اس طرح کی دعا کا کون سا وقت اور طریقہ ہے۔ دوسری طرف سکندر فون پر اس کا جملہ سن کر کچھ بے بسی سے ہنس پڑے تھے۔ ان کا غصہ کم ہونے لگا تھا۔ کئی سالوں کے بعد انہیں سالار سے اس طرح بات کرنا پڑی تھی۔ وہ اب اس سے پوچھ رہے تھے کہ وہ کہاں ہے۔ سکندر کو اپنے حدود اربعہ کے بارے میں بتا کر سالار نے فون بند کر دیا۔

"پاپا ناراض ہو رہے تھے؟" امامہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"خوش ہونے والی تو کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے جواباً کہا۔

"تم جھوٹ کیوں بولتے ہو؟" امامہ نے جیسے اسے شرم دلانے کی کوشش کی تھی۔

"کیونکہ اگر میں سچ بولوں تو لوگ مجھے وہ نہیں کرنے دیتے جو میں کرنا چاہتا ہوں۔" کمال کی منطق تھی اور بے حد سنجیدگی سے پیش کی گئی تھی۔

"چاہے تمہارے جھوٹ سے کسی کو دکھ پہنچے۔"

"میرے جھوٹ سے کسی کو دکھ نہیں پہنچتا، بلکہ غصہ آتا ہے۔"

اسے سمجھانا بے کار تھا، وہ سالار تھا۔ وہ اب اندازہ لگا سکتی تھی کہ سکندر نے اسے فون پر کیا کہا ہو گا۔

رات کے تقریباً پچھلے پہر وہ اس سروس اسٹیشن پر پہنچے تھے۔

"یہ جگہ یاد ہے تمہیں؟" سالار نے گاڑی روکتے ہوئے اس سے پوچھا۔ امامہ نے دھند زدہ اس جگہ کو دیکھا جہاں کچھ لائٹس دھند اور اندھیرے کا مقابلہ کرنے میں مصروف تھیں۔

"نہیں۔" اس نے سالار سے کہا۔

"یہ وہ جگہ ہے جہاں تم نے رک کر نماز پڑھی تھی۔" وہ دروازہ کھولتے ہوئے نیچے اتر گیا۔

امامہ نے قدرے حیران نظروں سے اس جگہ کو دوبارہ دیکھنا شروع کیا۔ اب وہ اسے کسی حد تک شناخت کر پا رہی تھی۔ وہ بھی دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ ایک کپکپی اس کے جسم میں دوڑی۔ وہ آج بھی ایک سوئٹر اور چادر میں ملبوس تھی۔

وہ کمرا بدل چکا تھا جہاں انہوں نے بیٹھ کر بھی چائے پی تھی۔

"چائے اور چکن برگر۔" سالار نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس آدمی سے کہا، جو جمائیاں لیتے ہوئے انہیں اندر لے کر آیا تھا اور اب آرڈر کے انتظار میں کھڑا تھا۔ امامہ اس کے آرڈر پر اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"اب کھا لو گے؟" وہ جانتا تھا اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر مسکرا دیا۔

"لاسٹ ٹائم ہم وہاں بیٹھے تھے۔ تم نے وہاں نماز پڑھی تھی۔"

وہ ہاتھ کے اشارے سے اس کمرے کی مختلف اطراف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ امامہ کو یاد نہیں تھا، کمرے میں جگہ جگہ ٹیبلز اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔

فجر کی اذان میں ابھی بہت وقت تھا اور فی الحال اس جگہ پر کام کرنے والے چند آدمیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

اب اس جگہ پر چائے اور برگر اتنے برے نہیں تھے جتنے اس وقت تھے۔ پریزنٹیشن بھی بہت بہتر تھی، لیکن ان دونوں میں سے کوئی نہ ذائقے کو دیکھ رہا تھا نہ پریزنٹیشن کو۔ وہ دونوں اپنے اپنے ماضی کو زندہ کر رہے تھے۔ یہ چند گھونٹ اور چند لقموں کی بات نہیں تھی، زندگی کی بات تھی جو نجانے ریل کی پٹڑیوں کی طرح کہاں کہاں سے گزر کر ایک اسٹیشن پر لے آئی تھی۔ وہ اس مقام پر کھڑے تھے، جہاں ان پٹڑیوں کا کانٹا بدلا تھا۔ دور قریب۔ ایک دوسرے میں مدغم۔ اور اب ایک دوسرے کے ساتھ۔

اس راستے پر کچھ ہی یادیں بنی تھیں۔ ان کی شادی کے بعد سڑک کے راستے ان کا پہلا سفر اور ان نئی یادوں نے پرانی یادوں کو دھندلانے کے عمل کا آغاز کر دیا تھا۔

ٹیبل پر بل کے پیسے رکھنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ امامہ نے بھی اس کی پیروی کی۔ سالار نے چلتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک نرم سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

"امامہ! وہ پسٹل کہاں ہے؟"

وہ عمارت سے باہر آتے ہوئے اس کے سوال پر چونکی۔ اسے کیا یاد آیا تھا، وہ ہنس پڑی۔

"ابو کے پاس ہے۔" اس نے سالار سے کہا۔

"تم واقعی چلا سکتی تھیں؟" سالار نے پتا نہیں کیا یقین دہانی چاہی۔

"ہاں۔" امامہ نے سر ہلایا۔

"لیکن اس میں گولیاں نہیں تھیں۔" وہ اس کے اگلے جملے پر بے اختیار ٹھٹکا۔ "میرے پاس بس پسٹل ہی تھا۔" وہ اطمینان سے کہہ رہی تھی۔

اس نے بے اختیار سانس لیا۔ اس کی آنکھوں میں دھول اس نے جھونکی تھی یا اللہ نے، وہ اندازہ نہیں کر سکا۔ اس پسٹل نے اسے جتنا شاک اور غصہ دلایا تھا اگر اسے اندازہ ہو جاتا کہ وہ بلٹس کے بغیر تھا تو سالار اس دن امامہ کو پولیس کے ہاتھوں ضرور اریسٹ کروا کر آتا۔ وہ پسٹل ہاتھ میں لیے کیوں اتنی پر اعتماد نظر آئی تھی اسے۔ یہ

اسے اب سمجھ میں آیا تھا۔
"تم ڈر گئے تھے؟" امامہ ہنس رہی تھی۔
"نہیں۔ ڈرا تو نہیں تھا مگر شاکڈ رہ گیا تھا۔ تم سارا راستہ روتی رہی تھیں۔ میں توقع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ تم مجھ پر پسٹل نکال لوگی۔ تمہارے آنسوؤں نے دھوکا دیا مجھے۔"
وہ اب کچھ خفگی سے کہہ رہا تھا۔ امامہ کھلکھلا کر ہنسی۔
وہ دونوں اب گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ بیٹھنے کے بعد بھی جب وہ گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بجائے ونڈ سکرین سے باہر دیکھتا رہا تو امامہ نے اس سے کہا۔
"گاڑی کیوں نہیں اسٹارٹ کررہے؟"
"مجھے کیوں یہ خیال نہیں آیا کہ تمہارا پسٹل خالی بھی ہو سکتا ہے۔ کیوں خیال نہیں آیا۔؟" وہ جیسے بڑبڑاتا ہوا ایک بار پھر کراہا۔
"اب رونا مت۔" امامہ نے اسے چھیڑا۔ "ویسے کیا کرتے تم اگر تمہیں یہ پتا چل جاتا؟"
"میں سیدھا جا کر پولیس کے حوالے کرتا تمہیں۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔
"تمہیں شرم نہیں آتی؟" امامہ بگڑی۔
"تمہیں آئی تھی جب تم نے مجھ پر پسٹل نکال لیا تھا میں محسن تھا تمہارا۔" سالار نے بھی اسی انداز میں کہا۔
"محسن تھے۔ تم مجھے دھمکا رہے تھے۔"
"مجھے بھی تھا کم از کم میں یہ ڈیزرو نہیں کرتا تھا کہ تم گن پوائنٹ پر رکھ لیتیں مجھے۔"
"لیکن میں نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا۔" امامہ نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔
"تو میں نے کون سا نقصان پہنچایا تھا؟" گاڑی اب دوبارہ مین روڈ پر تھی۔
لاہور کی حدود میں داخل ہونے تک امامہ اس سے ایک بار پھر خفا ہو چکی تھی۔



وہ اگلے دو تین دن تک اسلام آباد کے ٹرانس میں ہی رہی۔ وہ وہاں جانے سے جتنی خوفزدہ تھی اب وہ خوف یک دم کچھ ختم ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور اس کا حتمی نتیجہ یہ نکلا تھا کہ وہ اب اسلام آباد کے اگلے دورے کی منتظر تھی۔ اس گیسٹ روم کی کھڑکی میں کھڑے سارا دن کس کو کس وقت دیکھا تھا وہ اگلے دو تین دن سالار کو بھی بتاتی رہی اور تیسرے دن اس کی ماں ایک جملے پر آکر ٹوٹی تھی۔
"سالار! ہم اسلام آباد میں نہیں رہ سکتے؟"
سالار بیڈ پر بیٹھا لیپ ٹاپ گود میں رکھے کچھ ای میلز کرنے میں مصروف تھا جب امامہ نے اس سے پوچھا۔ وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے اس سے صرف اسلام آباد کی ہی باتیں کر رہی تھی اور سالار بے حد تحمل سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور اس کا جواب بھی دے رہا تھا۔
"نہیں۔" اپنے کام میں مصروف سالار نے کہا۔
"کیوں؟"
"کیونکہ میری جاب یہاں ہے۔"
"تم جاب بدل لو۔"

"نہیں بدل سکتا۔" وہ چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

"میں اسلام آباد میں نہیں رہ سکتی؟"

اس بار سالار نے بالآخر اسکرین سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

"اس بات کا کیا مطلب ہے؟" اس نے بے حد سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے کہ میں وہاں رہ لوں گی تم ویک اینڈ پر آجایا کرنا۔"

ایک لمحہ کے لیے سالار کو لگا کہ وہ مذاق کر رہی ہے۔ لیکن وہ مذاق نہیں تھا۔

"میں ہر ویک اینڈ پر اسلام آباد نہیں جا سکتا۔" اس نے بے حد تحمل سے اسے بتایا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی۔

سالار دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تو تم مہینے میں ایک دفعہ آجایا کرو۔"

وہ اس کے جملے سے زیادہ اس کے اطمینان پر ششدر تھا۔

"بعض دفعہ میں مہینے میں ایک بار بھی نہیں آسکتا۔" اس نے کہا۔

"تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"یعنی تمہیں فرق نہیں پڑتا؟" وہ ای میل کرنا بھول گیا تھا۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔" امامہ نے بے ساختہ کہا۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے احساسات کو اتنی صفائی سے زبان دے گا۔

"پاپا اور ممی اکیلے ہوتے ہیں وہاں اس۔" سالار نے اس کی بات کاٹی۔

"وہ وہاں اکیلے نہیں ہوتے۔ عمار اور یسریٰ ہوتے ہیں ان کے پاس' وہ دونوں آج کل پاکستان سے باہر ہیں۔ دوسری بات یہ کہ پاپا اور ممی بڑی سوشل لائف گزار رہے ہیں۔ ان کو تمہاری سروسز کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی مجھے ہے۔" سالار نے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔

وہ کچھ دیر خاموش اس کی گود میں پڑے لیپ ٹاپ کی اسکرین کو گھورتی رہی پھر بڑبڑائی۔

"میں اسلام آباد میں خوش رہوں گی۔"

"یعنی میرے ساتھ خوش نہیں ہو؟" وہ جزبز ہوا۔

"وہاں زیادہ خوش رہوں گی۔" وہ اب بالآخر صاف صاف اپنی ترجیحات بتا رہی تھی۔

"پاپا ٹھیک کہتے تھے مجھے تمہیں اسلام آباد نہیں لے کر جانا چاہیے تھا۔ ماں باپ کی بات سننی چاہیے۔" وہ بے اختیار پچھتایا۔ "دیکھو! اگر میں تمہیں اسلام آباد بھیج دوں تو تم تھوڑی دیر رہ سکتی ہو تم وہاں' ہمیں اگلے سال پاکستان سے چلے جانا ہے۔" وہ اسے پیار سے سمجھانے کی ایک اور کوشش کر رہا تھا۔

"تو کوئی بات نہیں تم پاکستان تو آیا کرو گے نا۔"

سالار کا دل خون ہوا۔ زندگی میں آج تک کسی نے اس کی ذات میں اتنی عدم دلچسپی نہیں دکھائی تھی۔

"میں امریکا میں رہوں اور میری بیوی یہاں ہو' اتنا ابنارمل لائف اسٹائل نہیں رکھ سکتا میں۔"

اس نے اس بار دو ٹوک انداز میں کہا۔ وہ کچھ دیر چپ رہی پھر چند لمحوں کے بعد سالار نے اس کے کندھے پر بے حد محبت اور ہمدردی سے اپنا ہاتھ رکھا۔

"سالار! تم دوسری شادی کر لو اور دوسری بیوی کو ساتھ لے جانا۔"

اس بار جیسے اس کے حواس غائب ہوئے۔ اگر یہ مذاق تھا۔ تو بے ہودہ تھا اور اگر واقعی تجویز تھی تو بے حد

سنگدلانہ تھی۔ وہ کئی لمحے بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ شادی کے تیسرے ہفتے اسے دوسری شادی کا مشورہ دے رہی تھی تاکہ وہ اپنے ماں باپ کے قریب رہ سکے۔

"سنو! میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔" امامہ نے اس کے تاثرات سے کچھ نروس ہوتے ہوئے اس سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ سالار نے بڑی بے رخی سے اپنے کندھے سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"خبردار! آئندہ میرے سامنے تم نے اسلام آباد کا نام بھی لیا اور اپنے احمقانہ مشورے اپنے پاس رکھو۔ اب میرا دماغ چاٹنا بند کرو اور سو جاؤ۔" وہ بری طرح بگڑا تھا۔

اپنا لیپ ٹاپ اٹھا کر وہ بے حد خفگی کے عالم میں بیڈ روم سے نکل گیا تھا۔ امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں اتنا ناراض ہونے والی کیا بات ہے۔ اس وقت اسے واقعی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اپنے ماں باپ کی محبت میں وہ کتنے احمقانہ انداز میں سوچنے لگی تھی۔

لائٹس آف کرکے اس نے کچھ دیر کے لیے سونے کی کوشش کی لیکن اسے نیند نہیں آئی۔ اسے بار بار اب سالار کا خیال آرہا تھا۔ چند لمحے لیٹے رہنے کے بعد وہ ایک دم اٹھ کر کمرے سے نکل آئی۔ وہ لاؤنج کا ہیٹر آن کیے قریب پڑے صوفے پر بیٹھا کام کر رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر ٹھٹکا تھا۔

"اب کیا ہے؟" امامہ کو دیکھتے ہی اس نے بے حد خفگی سے کہا۔

"کچھ نہیں۔ میں تمہیں دیکھنے آئی تھی۔" وہ اس کے خفگی سے پوچھنے پر کچھ بز بز ہوئی۔

"کافی بنا دوں تمہیں؟" وہ مصالحانہ انداز میں بولی۔

"مجھے ضرورت ہوگی تو میں خود بنا لوں گا۔" وہ اسی انداز میں بولا۔

وہ اس کے قریب صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔ کچھ کہے بغیر اس نے سالار کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کے کندھے پر سر ٹکا دیا۔ یہ ندامت کا اظہار تھا۔ سالار نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اسے مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے وہ لیپ ٹاپ پر اپنا کام کرتا رہا لیکن یہ بڑا مشکل تھا۔ وہ اس کے کندھے پر سر ٹکائے اس کے اتنے قریب بیٹھی ہو اور وہ اسے نظر انداز کردے۔ کر بھی اگر صرف اس کی بیوی ہوتی۔ یہ "امامہ" تھی۔ لیپ ٹاپ کے کی بورڈ پر چلتی اس کی انگلیاں تھمنے لگیں پھر ایک گہرا سانس لے کر وہ بڑبڑایا۔

"اب اس طرح بیٹھو گی تو میں کام کیسے کروں گا؟"

"تم مجھے جانے کا کہہ رہے ہو؟" امامہ نے برا مانا۔

"میں تمہیں جانے کا کہہ سکتا ہوں؟" اس نے اس کا سر چوما۔ "بہت احمقانہ بات کہی تھی تم نے مجھے۔"

"ایسے ہی کہا تھا، مجھے کیا پتا تھا تم اتنی بدتمیزی کرو گے میرے ساتھ؟" وہ ہکا بکا رہ گیا۔

"بدتمیزی۔۔۔ کیا بدتمیزی کی ہے میں نے۔۔۔؟ تمہیں ایکسکیوز کرنا چاہیے جو کچھ تم نے مجھ سے کہا۔"

وہ سمجھا وہ ندامت کا اظہار کرنے آئی ہے لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ امامہ نے بے حد خفگی سے اس کے کندھے سے اپنا سر اوپر اٹھاتے ہوئے اس سے کہا۔

"اب میں ایکسکیوز کیا کروں تم سے۔۔۔"

سالار نے اس کی اٹھی ہوئی تھوڑی دیکھی۔ کیا مان تھا۔۔۔ کیا غرور تھا۔۔۔؟ جیسے وہ اس سے یہ تو کروا ہی نہیں سکتا تھا۔

"ایکسکیوز کروں تم سے؟" خفا سی آنکھوں اور اٹھی تھوڑی کے ساتھ وہ پھر پوچھ رہی تھی۔

سالار نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جھک کر اس کی تھوڑی کو چوما' یہ مان اسے ہی رکھنا تھا۔ وہ اس کا سر جھکا

دیکھنے کا خواہش مند نہیں تھا۔

"نہیں' تم سے ایکسکیوز کروا کر کیا کروں گا میں۔"

وہ بے حد نرمی سے اس کی ٹھوڑی کو دوبارہ چومتے ہوئے بولا۔

امامہ کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آئی۔ کیا غرور تھا جو اس کی آنکھوں میں جھلکا تھا۔ ہاں' وہ کیسے اس سے یہ کہہ سکتا تھا۔ اس سے الگ ہوتے ہوئے اس نے سالار سے کہا۔

"اچھا اب تم ایکسکیوز کرو مجھ سے' کیونکہ تم نے بدتمیزی کی ہے۔"

وہ اب اطمینان سے مطالبہ کر رہی تھی' وہ مسکرا دیا۔ وہ معترف سے اعتراف چاہتی تھی۔

"آئی ایم سوری۔" سالار نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں' اب آئندہ تم یہ نہ کہنا کہ میں اسلام آباد کی بات نہ کروں۔" وہ بے حد فیاضانہ انداز میں اس کی معذرت قبول کرتے ہوئے بولی۔

سالار کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیلی تو سارا مسئلہ اسلام آباد کا تھا۔ اسے شاید یہ خدشہ ہو گیا تھا کہ وہ دوبارہ اسے وہاں نہیں لے کر جائے گا اور وہ اسی خدشے کے تحت اس کے پاس آئی تھی۔ کیا انداز دلبری تھا' وہاں اس کے لیے کچھ نہیں تھا۔ جو بھی تھا' کسی کے طفیل تھا۔ وہ ہنس پڑا۔

"کیا ہوا؟" اس نے الجھ کر سالار کو دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" سالار نے ذرا سا آگے جھکتے ہوئے بڑی نرمی اور محبت سے اسے اس طرح گلے لگا کر اس کا سر اور ماتھا چوما جس طرح وہ روز آفس سے آنے کے بعد دروازے پر اسے دیکھ کر کرتا تھا۔

"گڈ نائٹ۔" وہ اب اسے خدا حافظ کہہ رہا تھا۔

"گڈ نائٹ" وہ اپنی شال لپیٹتے ہوئے صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

بیڈروم کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے گردن موڑ کر سالار کو دیکھا' وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ الوداعیہ انداز میں مسکرا دی' وہ بھی جواباً" مسکرا دیا تھا۔ امامہ نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ بہت دیر تک اس بند دروازے کو دیکھتا رہا۔

یہ عورت جس مرد کی زندگی میں بھی ہوتی' وہ خوش قسمت ہوتا لیکن وہ خوش قسمت نہیں تھا۔ "خوش قسمتی" کی ضرورت کہاں رہ گئی تھی اسے!



"حبیب صاحب کی بیوی نے کئی چکر لگائے میرے گھر کے۔ ہر بار کچھ نہ کچھ لے کر آتی تھیں آمنہ کے لیے۔ کہتی تھیں ہمیں جہیز نہیں چاہیے' بس آمنہ کا رشتہ دے دیں۔ کہتی کیا تھیں بلکہ منتیں کرتی تھیں۔ امامہ کے دفتر اپنے بیٹے کو بھی لے گئیں ایک دن۔ بیٹا بھی خود آیا ماں کے ساتھ ہمارے گھر۔ بچپن سے پلا بڑھا تھا میری نظروں کے سامنے۔"

وہ صحن میں چارپائی پر بیٹھا سر جھکائے' سرخ اینٹوں کے فرش پر نظریں جمائے سعیدہ اماں کی گفتگو پچھلے آدھے گھنٹے سے اسی خاموشی کے ساتھ سن رہا تھا۔ اس کی خاموشی سعیدہ اماں کو بری طرح تپا رہی تھی۔ کم بخت نہ ہوں نہ ہاں' کچھ بولتا ہی نہیں۔ مجال ہے ایک بار ہی کہہ دے کہ آپ نے اپنی بچی کی شادی میرے ساتھ کر کے میری بڑی عزت افزائی کی یا یہی کہہ دے کہ بہت گنوں والی ہے آپ کی بچی۔ وہ باتوں کے دوران مسلسل کھول رہی تھیں۔

اتوار کا دن تھا اور وہ امامہ کے ساتھ صبح باقی کا سامان ٹھکانے لگانے آیا تھا۔ وہ الیکٹرونکس اور دوسرے سامان کو کچھ چیریٹی اداروں میں بھجوانے کا انتظام کرکے آیا تھا۔ امامہ نے اس بار اعتراض نہیں کیا تھا لیکن سعیدہ اماں کو ان دونوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ سامان ان کے گھر نہیں، کہیں اور بھجوایا جا رہا ہے۔

سہ پہر ہو رہی تھی اور وہ ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر وہیں دھوپ میں صحن میں بچھی ایک چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔ امامہ اندر کچن میں افطاری اور کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ انہیں آج افطاری وہیں کرنی تھی۔

دھوپ کی وجہ سے سالار نے اپنا سویٹر اتار کر چارپائی کے ایک کونے پہ رکھ دیا تھا۔ جینز کی جیب میں رکھا ایک رومال نکال کر اس نے چہرے پر آئی ہلکی سی نمی کو پونچھا۔ یہ امامہ کے رشتے کی چوتھی داستان تھی جو وہ سن رہا تھا۔

بیسن کو برتن میں گھولتے ہوئے امامہ نے صحن میں کھلنے والی کچن کی کھڑکی سے سالار کو دیکھا۔ اسے اس پر ترس آیا۔ وہ کچن میں سعیدہ اماں کی ساری گفتگو سن سکتی تھی اور وہ گفتگو کس حد تک "قابل اعتراض" ہو رہی تھی وہ اس کا اندازہ کر رہی تھی۔ تین دفعہ اس نے مختلف بہانوں سے سعیدہ اماں کو اندر بلانے کی کوشش کی تھی۔ گفتگو کا موضوع بدلا لیکن جیسے ہی وہ کچن میں آتیں باہر صحن میں پھر وہی گفتگو شروع ہو جاتی۔

"اونچا لمبا جوان ہے۔ قد تم سے کچھ آدھ فٹ زیادہ ہی ہوگا۔"

حبیب صاحب کے بیٹے کا حلیہ بیان کرتے ہوئے سعیدہ اماں مبالغے کی آخری حدوں کو چھو رہی تھیں۔ سالار کا اپنا قد چھ فٹ دو انچ کے برابر تھا اور آدھ فٹ ہونے کا مطلب تقریباً "پونے سات فٹ" تھا جو کم از کم لاہور میں پایا جانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

"اماں! زیرہ نہیں مل رہا مجھے۔" امامہ نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے سعیدہ اماں کو کہا۔

اس کے علاوہ اب اور کوئی بھی چارہ نہیں تھا کہ وہ انہیں اندر بلا لیتی۔

"ارے بیٹا! ادھر ہی ہے جدھر ہمیشہ ہوتا ہے۔ زیرے نے کہاں جانا ہے۔" سعیدہ اماں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

امامہ نے زیرے کی ڈبیا کو سبزی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر اس نے سعیدہ اماں کو زیرے کی تلاش میں مصروف رکھنا تھا، پھر بعد میں کچھ اور کام سونپ دیتی انہیں، وہ پلان کر رہی تھی۔

"مولوی صاحب سے دم والا پانی لا کر دوں گی تمہیں۔۔۔ وہی پلانا۔ اس سے دل موم ہوگا اس کا۔"

سعیدہ اماں نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے جو کچھ کہا، وہ نہ صرف امامہ نے بلکہ باہر صحن میں بیٹھے سالار نے بھی سنا تھا۔

"کیوں۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔؟" امامہ نے چونک کر پوچھا۔ وہ آلو کاٹ کر بیسن میں ڈال رہی تھی۔

"کیسا پتھر دل ہے اس کا۔۔۔ مجال ہے کسی بھی بات میں ہاں میں ہاں ملائے۔" وہ دل گرفتہ ہو رہی تھیں۔

"اماں! اب آپ اس طرح کی باتیں کریں گی تو وہ کیسے ہاں میں ہاں ملائے گا۔ آپ نہ کیا کریں اس طرح کی باتیں، اسے برا لگتا ہوگا۔" امامہ نے دبی آواز میں سعیدہ اماں کو منع کیا۔

"کیوں نہ کروں۔ اسے بھی تو پتا چلے کوئی فالتو چیز نہیں تھی ہماری بچی۔۔۔ لاکھوں میں ایک، جسے ہم نے بیاہا ہے اس کے ساتھ۔۔۔ یہ زیرہ کہاں گیا۔۔۔؟" سعیدہ اماں بات کرتے ہوئے ساتھ زیرے کی ڈبیا کی گمشدگی پر پریشان ہونے لگیں۔

"میں نے آپ سے کہا ہے نا! اب وہ ٹھیک ہے میرے ساتھ۔" امامہ نے اماں کو سمجھایا۔

"تو بڑی صابر ہے بیٹا۔۔۔ میں جانتی نہیں ہوں کیا۔۔۔ بات تو کرتا نہیں میرے سامنے تجھ سے۔۔۔ بعد میں کیا کرتا ہوگا۔" سعیدہ اماں قائل نہیں ہوئی تھیں۔

تھی۔

"شراب کبھی نہیں پی تم نے؟"

اس نے ہاتھ میں پکڑا گلاس میز پر رکھتے ہوئے کچھ آگے جھکتے ہوئے پوچھا۔ اس شخص کی نظریں ایک لمحہ کے لیے گلاس سے الجھی تھیں پھر اس نے جیکی کو دیکھا۔

"بہت عرصہ پہلے۔" اس نے جیسے اعتراف کیا۔

"تمہیں؟" جیکی نے مصنوعی حیرت کے ساتھ کہا۔

"یہ بھی..." بے تاثر چہرے کے ساتھ اس نے ڈانس فلور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

گلاس دوبارہ اٹھاتے ہوئے سامنے بیٹھے ہوئے مرد کے چہرے پر نظریں جمائے جیکی نے اپنی زندگی میں آنے والے پرکشش ترین مردوں کی فہرست میں اس کا شمار کیا تھا۔ وہ اس فہرست میں سب سے اوپر تھا۔ یہ اس کے جسمانی خدوخال نہیں تھے جو اسے سب میں ممتاز کرتے تھے۔ اس کی زندگی میں شکل وصورت کے اعتبار سے اس سے زیادہ خوب صورت مرد آئے تھے۔ سامنے بیٹھے ہوئے شخص میں کچھ اور تھا جو اسے بے حد منفرد سب سے الگ بنا رہا تھا۔ اس کی بھاری مردانہ آواز، شائستہ رویہ، ذہین تیز اور گہری آنکھیں، اس کی مسکراہٹ یا پھر اس کی تمکنت اور رکھ رکھاؤ، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف ملتفت ہو رہی تھی اور بری طرح ہو رہی تھی اور اس میں اس کا قصور نہیں تھا۔ وہ دعوے سے کہہ سکتی تھی کہ وہ مرد کسی بھی عورت کو متوجہ کر سکتا تھا۔ اس نے اس کے کریکٹر پروفائل میں پڑھا تھا کہ وہ عیاش نہیں تھا۔ اسے حیرت تھی وہ کیوں نہیں تھا۔ اسے ہونا چاہیے تھا۔

اس پر نظریں جمائے اس نے سوچا اور بالکل اسی لمحے اس شخص نے ڈانس فلور سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔ جیکی کی مسکراہٹ بے اختیار گہری ہوئی تھی۔ وہ بھی بے مقصد مسکرا دیا تھا۔ وہ بہت عرصے کے بعد کسی عورت کی کمپنی کو اتنا انجوائے کر رہا تھا۔ وہ خوب صورت تھی، اسمارٹ تھی اور وہ الجھا ہوا تھا، نہ ہوتا تو یہاں اس وقت وہ کبھی ایک اجنبی عورت کے ساتھ کبھی نہ بیٹھا ہوتا۔

"تمہاری صحت!" جیکی نے اسے ایک بار پھر یاد دلایا۔

"تم لے سکتی ہو۔" اس نے جواباً گلاس کو اس کی طرف بڑھا دیا۔

"تم پہلے پیتے تھے تو اب اس میں کیا برائی نظر آئی تمہیں؟" جیکی اس بار سنجیدہ ہوئی تھی۔

"لطف حاصل کرنے کے لیے پیتا تھا، جب لطف ملنا ختم ہو گیا تو شراب چھوڑ دی میں نے۔"

وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنسی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ جیکی دونوں ہاتھ ٹیبل پر رکھتے ہوئے آگے جھکی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

"کیا تم جانتے ہو مجھے تم میں ایک ساحرانہ کشش محسوس ہوتی ہے۔"

وہ مسکرا دیا تھا یوں جیسے اس کے جملے سے محظوظ ہوا ہو۔

"زہے نصیب۔" اس نے جواباً کہا تھا۔

جیکی نے بڑے غیر محسوس انداز میں میز پر رکھے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ ہاتھ ہٹانا چاہتا تھا لیکن چاہتے ہوئے بھی نہیں ہٹا سکا۔ وہ اس کے ہاتھ کی پشت پر بظاہر غیر محسوس انداز میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑا سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دیا۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے پھر جیکی نے کہا۔

"کیا تم ایک رات کے تعلق پر یقین رکھتے ہو؟"

جواب فوری آیا تھا۔ "بالکل..."

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

بھی تھا ساتھ والوں کی نبیلہ کو بلالو۔" امامہ نے سعیدہ اماں کو ٹوکتے ہوئے کہا جو کچن میں کھانے کے سامان کو تیار ہوتا دیکھ کر چونکیں۔ وہاں مہمان داری کے کوئی انتظامات نظر نہیں آرہے تھے۔

"اماں! سالار نے منع کیا ہے۔ وہ نہیں کھاتا یہ چیزیں۔" امامہ نے چاول نکالتے ہوئے کہا۔

"پہلے اس کو کوئی پکا کر دینے والا نہیں تھا لیکن اب ہے نا۔"

"پکا کر دینے والا ہوتا تو تب بھی نہ کھاتا۔ اماں وہ کھانے پینے کا شوق نہیں ہے۔"

"کسی بھی چیز کا شوق نہیں ہے اسے؟"

"کسی بھی چیز۔۔۔؟" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"اماں، جھینگے وغیرہ پسند ہیں اسے لیکن اب اس وقت وہ تو نہیں کھلا سکتی نا میں اسے۔ آپ کو تو پتا ہے مجھے کتنی گھن آتی ہے اس طرح کی چیزوں سے۔" امامہ نے اماں کو بتایا۔

"لیکن اگر اسے پسند ہے تو [illegible] بیٹا۔" امامہ [illegible] نہیں کہا۔ "ہاں" آسان نہیں تھی اور "نہ" کا مطلب سعیدہ اماں کو [illegible] سمجھانا تھا۔



خون کہاں سے نکل رہا تھا، وہ اندازہ نہیں کر سکا لیکن اس کے ہاتھوں پر خون لگا ہوا تھا۔ وہ ہتھیلیوں کو تکلیف اور خوف کے عالم میں دیکھ رہا تھا، پھر اس نے جھک کر اپنے سفید لباس کو دیکھا۔ اس [illegible] داغ تھا۔ پھر ہاتھوں پر لگا ہوا خون۔۔۔ اور جسم میں ہونے والی یہ تکلیف۔۔۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس کی ہتھیلیوں سے خون کے چند قطرے اس کی سفید قمیص کے دامن پر گرے۔

"سالار! عصر کا وقت جا رہا ہے، نماز پڑھ لو۔" وہ ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔

امامہ اس کے پاس کھڑی اس کا کندھا ہلاتے ہوئے اسے جگا رہی تھی۔

سالار نے چاروں طرف دیکھا، پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو۔ اس کی ہتھیلیاں صاف تھیں۔ اس کا سانس بے ترتیب تھا۔ امامہ اس کا کندھا ہلا کر چلی گئی تھی۔ سالار اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ خواب تھا، جو وہ [illegible] چارپائی پر بیٹھے اس [illegible] ہوئے کچھ آیات کی تلاوت شروع کر دی۔ وہ بہت عرصہ [illegible] ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا۔

صحن کی دھوپ ڈھل چکی تھی۔ اس نے بے اختیار اپنی گھڑی [illegible] عصر کی جماعت کا وقت نکل چکا تھا۔ اس نے [illegible] نماز پڑھی [illegible] اپنی جرابیں اتارتے [illegible] خواب کے بارے میں سوچ کر پریشان ہوتا رہا۔ امامہ [illegible] سو [illegible] لے آئی تھی۔

"طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟" [illegible] پہلی بار اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ اسے کچھ سرخ لگا تھا۔ اس نے سالار کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اس کا ٹمپریچر چیک کیا۔

"بخار نہیں ہے، دھوپ میں سونے کی وجہ سے لگا ہو گا۔"

سالار نے سویٹر پہنتے ہوئے اس سے کہا۔ امامہ کو وہ کسی گہری سوچ میں لگا۔



بیت العنکبوت

وہ اس ہفتے پھر اسے اپنے ساتھ کراچی لے کر گیا لیکن اس بار وہ رات کی فلائٹ سے واپس آگئے تھے۔ پہلے کی

طرح اس بار بھی وہ اسی ہوٹل میں رہے۔ سالار اپنے آفس میں مصروف رہا جبکہ وہ انیتا کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی۔

سالار سے اس کی دوبارہ ملاقات اسی طرح رات فلائٹ سے پہلے ہوئی تھی' وہ کچھ چپ تھی۔ سالار نے نوٹس کیا تھا مگر اس کے ساتھ اس فلائٹ میں اس کے بینک کے کچھ غیر ملکی عہدے داران بھی سفر کر رہے تھے۔ وہ لاؤنج میں ان کے ساتھ مصروف رہا۔ فلائٹ میں بھی وہ سیٹ بدل کر ان کے پاس چلا گیا۔

امامہ سے اس کو بات کرنے کا موقع ایئرپورٹ سے واپسی پر ملا تھا۔ کار پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے امامہ سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

"تم اتنی خاموش کیوں ہو؟"

"کس سے باتیں کروں۔ اپنے آپ سے؟ تم تو مصروف تھے۔" امامہ نے جواباً کہا۔

"چلو اب بات کرو۔" سالار نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"کیسا رہا آج کا دن؟"

"بس ٹھیک تھا۔"

"بس ٹھیک تھا۔ کہاں گئی تھیں آج تم؟"

اس نے سالار کو ان دو تین جگہوں کے نام بتائے' جہاں وہ انیتا کے ساتھ گئی تھی مگر سالار کو اس کے انداز میں جوش کا وہ عنصر نظر نہیں آیا تھا جو پچھلی بار تھا۔

"تمہاری پے کتنی ہے سالار؟" وہ چند لمحوں کے لیے ٹھٹکا۔

وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ وہ بے اختیار ہنس دیا۔ فوری طور پر اس سوال کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"نو کمنٹس۔"

"میں سیریس ہوں۔"

"میں بھی سیریس ہوں۔ میں شوہر ہوں تمہارا لیکن بے وقوف نہیں ہوں۔"

"جس اپارٹمنٹ میں ہم رہ رہے ہیں' وہ تمہارا ذاتی ہے؟"

اگلے سوال نے سالار کو اور حیران کیا تھا۔ وہ اب بھی بے حد سنجیدہ تھی۔

"نہیں' یہ رینٹڈ ہے لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو یہ سب کچھ...؟"

اپنے جواب پر اسے امامہ کے چہرے پر مایوسی اتنی صاف نظر آئی کہ وہ بھی یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔ میں سمجھ رہی تھی تمہارا اپنا ہو گا۔"

وہ اب اسے کچھ سوچتی ہوئی لگی۔ سالار بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ تم نے مجھے جو پیسے دیے ہیں' اس سے کوئی پلاٹ لے لیں۔"

"امامہ۔ کیا پرابلم ہے؟" سالار نے اس بار اس کے کندھوں کے گرد اپنا بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔

"کوئی پرابلم نہیں ہے' اپنا گھر تو بنانا چاہیے نا ہمیں۔" وہ اب بھی سنجیدہ تھی۔

"تم انیتا کا گھر دیکھ کر آئی ہو؟" ایک جھماکے کی طرح سالار کو ایک خیال آیا تھا۔ انیتا کچھ عرصے تک اپنے نئے گھر میں شفٹ ہونے والی تھی اور ان دنوں اس کے گھر کا انٹیریئر ہو رہا تھا۔

"ہاں۔" امامہ نے سر ہلایا' سالار نے گہرا سانس لیا۔ اس کا اندازہ ٹھیک نکلا تھا۔

"بہت اچھا گھر ہے نا اس کا؟" وہ اب سالار سے کہہ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں بے حد اشتیاق تھا۔

"ہاں، اچھا ہے۔" سالار نے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔
چار کنال پر محیط انیتا کے گھر کو کراچی کے ایک معروف آرکیٹیکچر نے ڈیزائن کیا تھا اس کے برے ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"تم نے سوئمنگ پول کی بوٹ دیکھی ہے؟"
"نہیں میں نے کافی مہینوں پہلے اس کا گھر دیکھا تھا تب انٹیریر شروع نہیں ہوا تھا۔"
"ویسے سوئمنگ پول میں بوٹ کا کیا کام؟"
"اصلی والی نہیں ہے، چھوٹی سی ہے، لکڑی کی لگتی ہے لیکن کسی اور مٹیریل کی ہے۔ اس پر ایک چھوٹی سی ونڈمل ہے اور وہ ہوا سے اس سارے سوئمنگ پول میں حرکت کرتی رہتی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھتا اس کی بات سنتا رہا۔ وہ اسے اس کشتی کی ایک ایک چیز بتا رہی تھی۔
"انیتا نے بڑا ظلم کیا ہے مجھ پر۔" اس کے خاموش ہونے پر سالار نے کہا۔
"کیوں؟" وہ چونکی۔
"میری شادی کے تیسرے ہی ہفتے میری بیوی کو اپنا گھر دکھا دیا۔" وہ بڑبڑایا۔
"کہیں زمین خرید لیتے ہیں سالار!" امامہ نے اس کی بات نظرانداز کی۔
"امامہ! میرے پاس دو پلاٹ ہیں، پاپا نے دیے ہیں۔ اسلام آباد میں تو گھر بنانا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ جب بنانا ہوگا بنا لیں گے۔" سالار نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔
وہ یک دم پرجوش ہوئی۔ "کتنے بڑے پلاٹ ہیں؟"
"دس دس مرلے کے ہیں۔"
"بس۔۔۔ کم از کم ایک، دو کنال تو ہونا چاہیے۔" وہ مایوس سی ہوئی تھی۔
"ہاں دس مرلے کم ہے، دو کنال تو ہونا ہی چاہیے۔" سالار نے تائید کی۔
"نہیں دو نہ ہو، ایک ہی ہو جائے، ایک بھی بہت ہے۔ اس میں ایک سبزیوں کا فارم بنائیں گے، جانور بھی رکھیں گے، ایک سرہاؤس بنائیں گے، ایک گزیبو بنائیں گے اور ایک فش فارم بھی بنا لیں گے۔"
سالار کو لگا کہ امامہ کو جگہ کا اندازہ کرنے میں غلطی ہوئی تھی۔
"ایک کنال میں یہ سب کچھ نہیں بن سکتا امامہ!" اس نے مدھم آواز میں اس سے کہا۔ وہ چونکی۔
"لیکن میں تو ایکڑز کی بات کر رہی تھی۔"

وہ چند لمحے بول نہیں سکا۔
"اسلام آباد میں تمہیں ایکڑز میں زمین کہاں سے ملے گی؟" چند لمحوں کے بعد اس نے سنبھل کر کہا۔
"اسلام آباد سے باہر تو مل سکتی ہے نا؟" امامہ سنجیدہ تھی۔
"تم پھر گھر نہ کہو، یہ کہو کہ فارم ہاؤس بنانا چاہتی ہو تم۔"
"نہیں، فارم ہاؤس نہیں، ایک بڑی سی کھلی سی جگہ پر ایک چھوٹا سا گھر۔ جیسے کوئی وادی۔۔۔ اس طرح کی وادی میں گھر۔"
"پاپا کا بھی ایک فارم ہاؤس ہے، کبھی کبھار جاتے ہیں ہم لوگ۔۔۔ تمہیں بھی لے جاؤں گا وہاں۔" سالار نے اسے پھر ٹالا۔
"میں فارم ہاؤس کی بات نہیں کر رہی ہوں، اصلی والے گھر کی بات کر رہی ہوں۔" امامہ اب بھی اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

"جس طرح کا میرا پروفیشن ہے امامہ! اس میں فارم ہاؤس یا شہر سے باہر رہائش رکھنا افورڈ نہیں کر سکتا۔ کم از کم جب تک میں کام کر رہا ہوں، تب تک مجھے بڑے شہروں میں رہنا ہے اور بڑے شہروں میں اب بہت مشکل ہے ایکڑز میں شہر کے اندر کوئی گھر بنانا۔ یہ تمہارے ان رومانٹک ناولز میں ہو سکتا ہے لیکن رئیل لائف میں نہیں، جو چیز ممکن اور پریکٹیکل ہے وہ یہ ہے کہ چند سالوں کے بعد کوئی لگژری فلیٹ لے لیا جائے یا دو چار کنال کا کوئی گھر بنا لیا جائے یا چلو پانچ چھ کنال بھی ہو سکتا ہے لیکن کسی اچھی جگہ پر اس سے بڑا گھر افورڈ ایبل نہیں ہو گا۔ ہاں! یہ ضرور کر سکتا ہوں کہ پانچ دس سال بعد لاہور یا اسلام آباد سے باہر کہیں ایک فارم ہاؤس بنا لیا جائے لیکن میں جانتا ہوں بیس یا تیس سال میں ہم دو یا تین بار سے زیادہ نہیں جا پائیں گے وہاں وہ بھی چند دنوں کے لیے لیکن وہ ایک سفید ہاتھی ثابت ہو گا ہمارے لیے جس پر ہر ماہ ہمارے اخراجات ہوں گے۔"

سالار کو اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی صاف گوئی کا مظاہرہ کر دیا ہے۔ امامہ کا رنگ کچھ پھیکا سا پڑ گیا تھا۔ وہ حقیقت تھی جو وہ اسے دکھا رہا تھا۔ سالار نے اسے دوبارہ بولتے نہیں دیکھا۔ گھر پہنچنے تک وہ خاموش رہی اور پورا راستہ اس کی خاموشی اسے چبھتی رہی۔

"اچھا تم گھر کا ایک اسکیچ بناؤ میں دیکھوں گا اگر فیزیبل ہوا تو بنایا جا سکتا ہے۔"

یہ اس نے سونے سے پہلے سرسری انداز میں امامہ سے کہا تھا اور ایک سیکنڈ میں امامہ کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوتے دیکھا۔ ایک چھوٹی سی بات اسے اتنا خوش کر دے گی، اسے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ سحری کے وقت وہ جب الارم کی آواز پر اٹھا تو وہ بستر میں نہیں تھی۔

"تم آج پہلے اٹھ گئیں؟"

وہ کچن میں کام کر رہی تھی جب سالار سحری کے لیے وہاں گیا۔ وہ جواب دینے کے بجائے مسکرائی تھی۔ سالار کو حیرت ہوئی۔ آج اس نے سحری ختم کرنے میں بڑی عجلت دکھائی تھی اور کیوں دکھائی تھی، یہ راز زیادہ دیر تک راز نہیں رہا تھا۔ کھانا ختم کرتے ہی وہ اپنی اسکیچ بک اٹھا لائی تھی۔

"یہ میں نے اسکیچ کر لیا ہے، جس طرح کا گھر میں کہہ رہی تھی۔"

سحری کرتے ہوئے سالار بری طرح چونکا تھا۔ وہ اپنی کسی ہدایت پر اتنے فوری عمل درآمد کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ وہ اسکیچ بک اس کے سامنے کھولے بیٹھی تھی۔ ٹشو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس اسکیچ بک کو تھامتے سالار نے ایک نظر اس پر ڈالی اور دوسری اس گھر پر جو سامنے اسکیچ میں نظر آ رہا تھا۔ گھر سے زیادہ اسے ایک اسٹیٹ کہنا زیادہ بہتر تھا۔ اس نے گھر میں ہر وہ چیز شامل کی تھی جس کا ذکر اس نے اس سے رات کو کیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ پہلے وہ زبانی بتا رہی تھی اب وہی سب کچھ ایک ڈرائنگ کی شکل میں اس کے سامنے تھا۔

پہاڑوں کے دامن میں کھلے سبزے میں "ایک چھوٹا سا گھر" جس کے سامنے ایک جھیل تھی اور اس کے اردگرد وہ چھوٹے چھوٹے اسٹرکچرز تھے جس کا وہ ذکر کر رہی تھی "گیسٹ ہاؤس اور سمر ہاؤس"۔ اس نے اپنے اسکیچز کو کلر بھی کیا ہوا تھا۔

"اور یہ آگے بھی ہے۔" اس نے سالار کو اسکیچ بک بند کرتے دیکھ کر جلدی سے اگلا صفحہ پلٹ دیا۔

وہ اس کے گھر کا یقیناً "عقبی حصہ" تھا جہاں پر ایک اصطبل اور پرندوں کی مختلف قسم کی رہائش گاہیں بنائی گئی تھیں۔ اس میں وہ فش فارم بھی تھا جس کا وہ رات کو ذکر کر رہی تھی۔

"تم رات کو سوئی نہیں؟" اسکیچ بک بند کرتے ہوئے سالار نے اس سے پوچھا۔

وہ اسکیچز گھنٹوں کی محنت کے بغیر نہیں بن سکتے تھے۔ امامہ کو اس تبصرے نے جیسے مایوس کیا۔ وہ اسکیچز دیکھنے پر سالار سے کسی اور بات کے سننے کی توقع کر رہی تھی۔

"اچھا ہے نا؟" اس نے سالار کے سوال کا جواب دیے بغیر کہا۔
کانٹا ہاتھ میں لیے وہ بہت دیر تک اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ جو اس کے لیے گھر تھا' وہ اس کے لیے اب بھی فارم ہاؤس ہی تھا اور آسان نہیں تھا لیکن وہ ایک بار پھر اس بات پر بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"بہت اچھا ہے۔" ایک لمبی سی خاموشی کے بعد کہے جانے والے اس جملے پر وہ بے اختیار کھل اٹھی تھی۔

"تمہارے دونوں پلاٹس بیچ کر ہم کسی جگہ پر ذرا بڑی جگہ..."

"ذرا بڑی جگہ...؟ ایک ایکڑ کی بات کر رہی ہو کم از کم تم... اور زمین تو چلو کسی نہ کسی طرح آ ہی جائے گی لیکن اس گھر کی مینٹیننس کے اخراجات... ویل... مجھے کم از کم کروڑ پتی ہو کر مرنا پڑے گا اگر ارب پتی نہیں تو..." سالار نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

امامہ نے بے حد خفگی سے اسکیچ بک بند کر دی۔

"ٹھیک ہے میں نہیں کروں گی اب گھر کی بات۔"

وہ پلک جھپکتے میں اٹھ کر اپنی اسکیچ بک کے ساتھ غائب ہو گئی تھی۔

وہ کانٹا ہاتھ میں پکڑے بیٹھا رہا۔ یہ ایک بے حد مضحکہ خیز صورت حال تھی جس کا وہ سامنا کر رہا تھا۔ سالار سحری ختم کر کے بیڈ روم میں آ گیا۔ امامہ صوفے پر اسکیچ بک کھولے بیٹھی تھی۔ سالار کو دیکھ کر اس نے اسکیچ بک بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

"اگر تمہیں فوری طور پر گھر چاہیے تو میں خرید دیتا ہوں تمہیں۔"

اس نے بے حد سنجیدگی سے اس کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس طرح کا گھر چاہیے۔" اس نے پھر اسکیچ بک اٹھائی۔

"ایک ایکڑ ہو یا نہ ہو لیکن ایسا ایک بنا دوں گا میں تمہیں... وعدہ۔ لیکن اب یہ ہوم ہما کو اپنے سر سے اتار دو۔"

وہ امامہ کا کاندھا تھپکتے ہوئے اٹھ گیا۔

وہ بے اختیار مطمئن ہو گئی... وعدہ کا لفظ کافی تھا فی الحال اس کے لیے... "وعدہ" کو "گھر" بنانا زیادہ مشکل نہ ہوتا اس کے لیے۔



ماہ رمضان کے باقی دن بھی اسی طرح گزرے تھے۔ عید کے فوراً بعد سالار کا بینک کوئی نیا انویسٹمنٹ پلان لانچ کرنے والا تھا اور وہ ان دنوں اسی سلسلے میں بے حد مصروف رہا تھا۔ امامہ کے لیے مصروفیت کا دائرہ گھر سے شروع ہو کر گھر پر ہی ختم ہو جاتا تھا۔ وہ اسے دن میں دو تین بار بینک سے چند منٹ کے لیے کال کر کے حال احوال پوچھتا اور فون رکھ دیتا۔

امامہ کا خیال تھا' وہ وقتی طور پر مصروف ہے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ وقتی طور پر اپنی مصروفیت کو حتی الامکان کم کیے ہوئے تھا۔

بازاروں میں عید کی تیاریوں کی وجہ سے رش بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی مصروفیت کے باوجود اسے رات کو ایک آدھ گھنٹے کے لیے باہر لے جایا کرتا تھا۔ وہ دونوں کافی پیتے' بعض دفعہ گاڑی میں بیٹھے رہتے یا ونڈو شاپنگ کرتے' بے مقصد باتیں کرتے۔ وہ روزانہ رات کو اس ایک گھنٹے کا انتظار کرتی تھی۔ وہ ایک گھنٹہ اس کی زندگی کی وہ کھڑکی تھی جس سے باہر جھانکنا اسے پسند تھا اور سالار اس سے واقف تھا۔

وہ دنیا جس پر وہ سرسری نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتا تھا' وہ امامہ کے لیے اتنے سالوں کے بعد ایک فینٹسی ورلڈ کی

حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ لاہور کی سڑکوں چوکوں اور مارکیٹوں میں پہلے کیا تھا اور اب کیا نہیں ہے۔ سالار نے اس پر کبھی غور نہیں کیا تھا اور وہ ہر بار کسی نئی چیز کو دیکھ کر بڑے نوسٹیلجک انداز میں اس کو بتاتی کہ کئی سال پہلے جب وہ وہاں آئی تھی تو وہاں کون سی چیز کیسے ہوا کرتی تھی۔

وہ اس کا چہرہ دیکھتا' خاموشی سے اس کی باتیں سنتا تھا۔ وہ جیسے اس سے زیادہ خود کو بتا رہی ہوتی تھی۔ کولمبس کی طرح وہ پہلے سے موجود دنیا کو پھر سے دریافت کر رہی تھی اور وہ خوش تھی کہ کہیں نہ کہیں خوشی کا ایک احساس اب اس کے ہمراہ رہنے لگا ہے۔ اسے حیرت ہوتی تھی کہ وہ سالار کے ساتھ کیونکر خوش ہے اور وہ بھی اتنی آسانی کے ساتھ؟

اس کے لیے اسے اتنی جلدی قبول کرنا' اتنا آسان کیسے ہو گیا تھا۔ اتنی جلدی سب کچھ بھول جانا اور اس سے آگے وہ اپنی سوچ کے سارے دروازے بند کر لیتی تھی۔ جو کچھ وہ پیچھے چھوڑ آئی تھی وہ اب اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم ابھی کچھ عرصے کے لیے تو نہیں۔ کچھ عرصہ وہ زندگی کو بے بسی کے ساتھ نہیں بلکہ صرف خوشی کے احساس کے ساتھ جینا چاہتی تھی۔

وہ عید سے دو دن پہلے اسلام آباد آ گئے تھے۔ کامران اور معیز اپنی فیملیز کے ساتھ عید کے لیے پاکستان آئے تھے۔ عمار اور اس کی فیملی بھی واپس آ چکی تھی۔ وہ ان سے فون پر بات کر چکی تھی لیکن سالار کی بیوی کے طور پر ان سب سے یہ اس کی پہلی ملاقات تھی۔ وہ جتنی پریشان سالار کے والدین سے پہلی ملاقات کے وقت تھی' اب اتنی نہیں تھی۔ وہ سب بھی اس سے بے حد دوستانہ انداز میں ملے تھے۔ وہ کون تھی؟ وہ سب پہلے ہی سے جانتے تھے' لہٰذا اس پر سوالات کی بوچھاڑ نہیں ہوئی تھی۔ ہر ایک فی الحال محتاط تھا۔

وہ سکندر عثمان کے وسیع و عریض سٹنگ ایریا میں بیٹھی' وہاں موجود تمام لوگوں کی گپ شپ سن رہی تھی اور ادھر ادھر بھاگتے' دوڑتے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ سالار کے تینوں بھائیوں کی سسرال اسلام آباد میں ہی تھی اور اس وقت موضوع گفتگو تینوں بھائیوں کی سسرال کی طرف سے آئے ہوئے وہ قیمتی سسرالی تحائف تھے' جو عید پر ان کے لیے بھیجے گئے تھے۔ ان کی سسرال کی طرف سے نہ صرف بیٹی' داماد اور ان کے بچوں کے لیے تحائف بھیجے گئے تھے بلکہ سکندر اور طیبہ کے لیے بھی چیزیں بھیجی گئی تھیں۔ وہ لوگ ڈنر کے بعد وہاں بیٹھے ہوئے تھے اور گفتگو کا موضوع فی الحال وہی تحائف ہی تھے۔ وہاں بیٹھے ان باتوں کو سنتے ہوئے امامہ کو شدید احساس کمتری ہوا۔ اس کے اور سالار کے پاس وہاں کسی دوسرے سے کسی تحفے کی تفصیلات شیئر کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

اسلام آباد آنے سے پہلے ڈاکٹر سبط علی' سعیدہ اماں اور فرقان کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی بیٹیوں نے بھی اس کے لیے کچھ کپڑے بھجوائے تھے' لیکن ان میں سے کوئی بھی چیز اس کے اپنے ماں باپ کے گھر سے نہیں آئی تھی' وہ دوسروں کی طرف سے آنے والے تحائف تھے۔ کچھ چیزوں کی کمی اس کی زندگی میں ہمیشہ رہنی تھی اور یہ ان ہی میں سے ایک چیز تھی۔ معمولی تھی لیکن بھول جانے والی نہیں تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس طرح کے شدید احساس کمتری کا شکار ہو رہی تھی اور اس احساس کو یہ خیال اور بھی بڑھا رہا تھا کہ سالار بھی اسی طرح کی باتیں سوچ رہا ہوگا۔ اگر وہ کسی اور لڑکی سے شادی کرتا تو آج اس کے پاس بھی بات کرنے کے لیے تحائف کی لمبی لسٹ ہوتی یا ان چیزوں کی تفصیلات ہوتیں' جو اس نے سسرال سے آنے والی عید کی رقم سے خریدی ہوتیں۔ سالار چائے پیتے ہوئے خاموش بیٹھا وہاں ہونے والی گفتگو سن رہا تھا اور وہ اس کی خاموشی کو اپنی مرضی کا مفہوم دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تم نے کیا بنوایا ہے عید کے لیے؟'' کامران کی بیوی زوبا نے اچانک اس سے پوچھا۔

''میں نے.....؟'' وہ گڑبڑائی۔

چند لمحوں کے لیے سب کی نظریں اس پر جم گئی تھیں۔
"سالار نے کپڑے لے کر دیے ہیں مجھے۔ قمیص شلوار ہی ہے۔"
وہ خود نہیں سمجھ پائی کہ اسے یہ بتاتے ہوئے اتنی ندامت کیوں ہوئی تھی۔
"امامہ کے لیے تو عید کے کپڑے میں نے بھی بنوائے ہیں۔ یہ پہلی عید ہے اس کی۔ تم عید پر تو میرے والے کپڑے ہی پہننا۔" طیبہ نے مداخلت کرتے ہوئے اسے بتایا۔
امامہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے کندھوں کے بوجھ میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔



"صبح تم چل رہی ہو میرے ساتھ؟"
سالار نائٹ ڈریس میں ملبوس چند لمحے پہلے واش روم سے نکلا تھا۔ پہلے کی طرح اس بار بھی وہ اسی کھڑکی کے آگے کھڑی تھی۔
"ہاں۔" اس نے سالار کو دیکھے بغیر کہا۔
"طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟" اپنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے امامہ کو غور سے دیکھا۔ اسے اس کا لہجہ بے حد بجھا ہوا لگا تھا۔
"ہاں۔" اس نے اسی انداز میں جواب دیا۔
سالار کمبل کھینچتے ہوئے بیڈ پر لیٹ گیا۔ امامہ نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ اپنے سیل پر الارم سیٹ کر رہا تھا۔ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ سوچے سمجھے بغیر اس کی طرف آگئی۔ بیڈ کے قریب آنے پر الارم سیٹ کرتے ہوئے سالار نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ کچھ کہے بغیر اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی۔ سیل فون سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ حیران ہوا تھا۔ وہ پریشان تھی یہ پوچھنے کے لیے اب اسے اس سے تصدیق کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کا چہرہ سب کچھ بتا رہا تھا۔ وہ پہلے کی طرح اب بھی اس کی اداسی کو اسلام آباد آنے کا نتیجہ سمجھا تھا۔ لیٹے لیٹے سالار نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ اس کے ہاتھ کی گرفت میں اپنے ہاتھ کو دیکھتی رہی پھر اس نے نظریں اٹھا کر سالار کو دیکھا۔
"تمہیں مجھ سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔" وہ چند لمحوں کے لیے بھونچکا سا رہ گیا تھا۔
"پھر کس سے شادی کرنی چاہیے تھی؟" وہ حیران ہوا۔
"کسی سے بھی... میرے علاوہ کسی سے بھی۔"
"اچھا مشورہ ہے لیکن دیر سے ملا ہے۔" اس نے بات مذاق میں اڑانے کی کوشش کی۔ امامہ نے ہاتھ چھڑا لیا۔
"تم پچھتا رہے ہو نا اب؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔
"میں کیوں پچھتاؤں گا؟" وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔
"تمہیں پتا ہو گا۔" اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو سالار نے اسے روکا۔
"تمہیں... مجھے نہیں پتا، تم بتا دو۔" وہ واقعی حیرت زدہ تھا۔
"تمہارا بھی دل چاہتا ہو گا کہ کوئی تمہیں بھی کپڑے دے... تحائف دے اور..." وہ بات مکمل نہیں کر سکی۔ اس کی آواز پہلے بھرائی پھر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔
وہ ہکا بکا اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ جو بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی وہ اس کے لیے احساس جرم بن

رہی تھی۔

"میرے خدایا امامہ! تم کیا کیا سوچتی رہتی ہو؟" وہ واقعی ششدر رہ گیا تھا۔

وہ اپنی آنکھوں کو رگڑ کر صاف کرنے کی کوشش کرتی ہوئی بری طرح ناکام ہو رہی تھی۔

"آنکھیں آنسو بہانا جانتی ہیں' آنسوؤں کو روکنا نہیں جانتیں۔"

"بس تمہیں مجھ سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

اس نے آنسو روکنے اور آنکھیں رگڑنے کی جدوجہد میں کہا تھا۔ وہ بہت دل برداشتہ تھی۔ بات تحفوں کی نہیں تھی ہتک کے اس احساس کی تھی جو لاؤنج میں سب کے درمیان بیٹھے اس نے ان چند گھنٹوں میں محسوس کیا تھا۔ سالار نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اسے گلے لگا کر تسلی دینے والے انداز میں تھپکا۔ اسے تسلی نہیں ہوئی' وہ اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے اٹھ کر چلی گئی۔ آدھے گھنٹے تک واش روم میں آنسو بہاتے رہنے کے بعد اس کے دل کا بوجھ تو ہلکا نہیں ہوا' البتہ اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ جب واپس کمرے میں آئی تو وہ کمرے کی لائٹ آن کیے اسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ امامہ کو کچھ شرمندگی ہوئی۔ وہ اس سے کچھ نہ ہی کہتی تو ٹھیک تھا۔ وہ اس سے نظریں ملائے بغیر بیڈ کی دوسری طرف جا کر لیٹ گئی۔ وہ بھی لائٹس آف کر کے لیٹ گیا۔ اس نے امامہ کو مخاطب نہیں کیا تھا اور یہ جیسے اس کے لیے نعمت مترقبہ تھی۔



"امامہ بی بی! آپ اتنی عقل مند نہیں' جتنا میں آپ کو سمجھتا تھا۔ بہت ساری چیزیں ہیں' جن میں آپ خاصی حماقت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔"

اگلی صبح گھر جاتے ہوئے ڈرائیونگ کے دوران وہ بے حد سنجیدگی سے اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ سامنے سڑک کو دیکھتی رہی۔ اسے فی الحال خود کو عقل مند ثابت کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"کیا ہو جاتا ہے تمہیں بیٹھے بٹھائے؟ کیوں اس طرح کی الٹی سیدھی باتیں سوچتی رہتی ہو؟"

وہ واقعی جاننا چاہتا تھا۔ امامہ کا رویہ اسے بعض دفعہ واقعی حیران کر دیتا تھا۔

"تم اب مجھ سے اس طرح کی باتیں نہ کرو۔ تم مجھے اپ سیٹ کر رہے ہو۔"

اس نے سالار کی بات کا جواب دینے کے بجائے بے حد بے زاری سے اس سے کہا۔

"میں بات کروں گا۔" اس نے جواباً" اسے ڈانٹا تھا۔

"مجھے سسرال کے کپڑوں اور تحائف میں دلچسپی نہیں ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ میں عید پر اپنے خریدے ہوئے کپڑوں کے بجائے بیوی کے گھر سے آئے ہوئے کپڑے پہنوں گا؟ کامران' معیز اور عمار' ان میں سے کوئی بھی نہیں پہنتا سسرال کی طرف سے آئے ہوئے کپڑے۔ اپنے کپڑے خود لیتے ہیں وہ سب یہاں' البتہ تمہیں اگر اس بات کا دکھ ہے کہ تمہیں تحائف نہیں ملے تو..."

امامہ نے بے حد خفگی کے عالم میں اس کی بات کاٹی۔

"ہاں ہے مجھے اس بات کا دکھ۔ پھر؟"

"تو پھر یہ ہے کہ میں لے دیتا ہوں تمہیں یہ سب کچھ' پہلے بھی لے کر دیے ہیں' اب اور لے دیتا ہوں۔" سالار کا لہجہ اس بار کچھ نرم پڑا تھا۔

"تم یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکتے۔" امامہ نے اسی انداز میں کہا۔

"ہاں ہو سکتا ہے' لیکن تم بھی یہ بات سمجھ لو کہ کچھ چیزیں تم نہیں بدل سکتیں' تمہیں انہیں قبول کرنا ہے۔"

"کیا تو ہے۔"

"تو پھر اتنا رونا کیوں؟"

"سب نے محسوس کیا ہو گا کہ میری فیملی نے۔۔۔" اس نے رنجیدہ ہوتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"تم سے کسی نے کچھ کہا؟"

"نہیں۔"

"تو پھر۔۔۔؟"

"کہا نہیں، پھر بھی دل میں تو انہوں نے سوچا ہو گا؟"

"تم ان کے دلوں تک مت جاؤ، جو بات میں کہہ رہا ہوں تم صرف وہ سنو۔" سالار نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "یہ بے معنی چیزیں ہیں۔ ایک نارمل ارینج میرج ہوئی ہوتی تو بھی میں سسرال سے کوئی تحائف لینا پسند نہ کرتا۔ میں جن کسٹمز (رواج) کو پسند نہیں کرتا، ان کی وجہ سے کوئی حسرت اور پچھتاوے بھی نہیں ہیں مجھے۔"

"تم سے زیادہ قیمتی کوئی تحفہ ہو سکتا ہے میرے لیے؟" وہ اسے اب بڑی رسانیت سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کی بات سے متاثر نہیں ہو رہی ہوگی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا اس کے لیے بھی بات تحائف کی نہیں تھی۔ اس احساس محرومی کی تھی جو اسے ہو رہا تھا اور جس کے لیے فی الحال وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے امامہ سے مزید کچھ نہیں کہا تھا۔



اس وسیع و عریض کمپاؤنڈ اور اس کے اندر موجود چھوٹی بڑی عمارتوں نے چند لمحوں کے لیے امامہ کو حیران کر دیا تھا۔ اس نے سالار سے اس اسکول اور دوسرے پروجیکٹس کے بارے میں سرسری سا تذکرہ سنا تھا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کام اتنا منظم اور اس سطح پر ہو رہا ہے۔

کمپاؤنڈ میں آج صرف ڈسپنسری کھلی تھی اور اس وقت بھی وہاں مریضوں کی ایک خاصی تعداد موجود تھی۔ باقی عمارتوں میں لوگ نظر نہیں آ رہے تھے۔ یہ عید کی تعطیلات تھیں۔

سالار کی گاڑی کو کمپاؤنڈ میں داخل ہوتے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے کمپاؤنڈ میں ہلچل سی مچی تھی۔ کیئر ٹیکر اسٹاف یکدم الرٹ ہو گیا تھا۔ وہاں کام کرنے والے افراد کی اکثریت آج چھٹی پر تھی اور جو وہاں موجود تھے انہوں نے کمپاؤنڈ کے آخری کونے میں انیکسی کے سامنے گاڑی رکنے کے بعد سالار کے ساتھ گاڑی سے نکلنے والی چادر میں

ملبوس اس لڑکی کو بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا۔

انیکسی کا چوکیدار وہ پہلا فرد تھا جسے سالار نے اپنی "بیوی" سے متعارف کرتے ہوئے اپنی شادی کے بارے میں مطلع کیا تھا اور ایسا کرتے ہوئے سالار جانتا تھا کہ جب تک وہ عمارت کے دوسرے حصوں کی طرف جائیں گے تب تک اس کی شادی کی خبر ہر طرف پھیل چکی ہو گی۔

انیکسی کے سامنے موجود لان سے گزرتے ہوئے امامہ نے بڑی دلچسپی سے اپنے قرب و جوار میں نظر دوڑائی۔ انیکسی مرکزی عمارت سے بہت فاصلے پر تھی اور وہاں بیٹھے ہوئے شاید عام دنوں میں بھی دوسری عمارتوں کے شور سے بچا جا سکتا تھا۔ ایک چھوٹی سی باڑ کے ساتھ لان اور انیکسی کی حد بندی کی گئی تھی۔ لان کا ایک حصہ سبزیوں کی کاشت کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ دھوپ پوری طرح نہیں پھیلی تھی اور خنکی کا احساس بے حد شدید ہونے کے باوجود امامہ کا دل کچھ دیر کے لیے کھلتی ہوئی دھوپ والے اس لان میں پڑی کرسیوں پر بیٹھنے کو چاہا تھا جو رات کی اوس سے بھیگی ہوئی تھیں۔

بہت عرصے کے بعد وہ ایسی کھلی فضا میں سانس لے رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے اداسی کی ہر کیفیت کو اس نے غائب ہوتے ہوئے محسوس کیا۔

"ہم یہاں بیٹھ جاتے ہیں۔"

انیکسی کے برآمدے میں پہنچتے ہی اس نے سالار سے کہا جو چوکیدار سے دروازہ کھلوا رہا تھا۔

"نہیں، یہاں کچھ دیر بعد تمہیں سردی لگنے لگے گی۔ اندر لاؤنج میں بیٹھ کر بھی تمہیں باہر سب کچھ اسی طرح نظر آئے گا۔ فی الحال میں ذرا ڈسپنسری کا ایک راؤنڈ لوں گا، تمہیں اگر یہاں بیٹھنا ہے تو بیٹھ جاؤ۔" سالار نے اس سے کہا۔

"نہیں میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔" اس نے فوراً کہا تھا۔

انیکسی فرنشڈ تھی اور اس کے اندر داخل ہونے پر چند لمحوں کے لیے امامہ کو جیسے اس کے ساؤنڈ پروف ہونے کا احساس ہوا۔ اندر کچھ ایسی ہی خاموشی اسے محسوس ہوئی تھی۔

"کبھی ہم بھی یہاں رہنے کے لیے آئیں گے۔" اس نے بے اختیار کہا تھا۔

"اچھا۔" امامہ کو لگا وہ اسے سلا رہا تھا، اس کا انداز کچھ اتنا ہی عدم دلچسپی لیے ہوئے تھا۔

دس منٹ بعد وہ اسے مرکزی عمارت اور اس سے منسلک دوسرے حصے دکھا رہا تھا۔ وہ عمارت اسے دکھانے کے ساتھ ساتھ وہاں موجود اسٹاف کو کچھ ہدایات بھی دے رہا تھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اس جگہ کے بارے میں معلومات اس کی انگلیوں پر ہیں۔

"وہ سب لوگ کہہ رہے ہیں مٹھائی کھلائیں جی۔" چوکیدار نے سالار کو دوسرے لوگوں کی فرمائش پہنچائی۔

"چلیں! ٹھیک ہے، آج افطار اور افطار ڈنر کا انتظام کریں۔ میں اکاؤنٹنٹ کو بتا دیتا ہوں۔" سالار نے مسکرا کر اسے کہا۔

امامہ نے نوٹس کیا تھا کہ وہ وہاں کام کرنے والے ہر شخص کے نام کے ساتھ صاحب لگا کر مخاطب کر رہا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ اس کا رویہ ان لوگوں کے ساتھ سنجیدہ لیکن قابل احترام بھی تھا۔ یہ تبدیلی عمر نے کر آئی تھی یا سوچ نے اسے اندازہ نہیں ہوا۔

دو گھنٹے وہاں گزارنے کے بعد وہ جب اس کے ساتھ وہاں سے نکلی تو پہلی بار وہ اپنے دل میں اس کے لیے عزت کے کچھ جذبات بھی لیے ہوئے تھی۔

"یہ سب کیوں کر رہے ہو تم؟" اس نے راستے میں اس سے پوچھا تھا۔

"اپنی بخشش کے لیے۔" جواب غیر متوقع تھا مگر جواب دینے والا بھی تو سالار سکندر تھا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے رحم دل ہو۔" چند لمحے خاموش رہ کر امامہ نے اس سے کہا۔

"نہیں، رحم دل نہیں ہوں نہ ترس کھا کر کسی کے لیے کچھ کر رہا ہوں، ذمہ داری سمجھ کر کر رہا ہوں۔ رحم دل ہوتا تو مسئلہ ہی کیا تھا۔" آخری جملہ جیسے اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"کیسے شروع کیا یہ سب کچھ؟"

وہ اسے فرقان سے اپنی ملاقات اور اس پروجیکٹ کے آغاز کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔

اس کے خاموش ہونے پر اس نے جیسے سراہنے والے انداز میں کہا "بہت مشکل کام تھا۔"

"نہیں وہ لائف اسٹائل بدلنا زیادہ مشکل تھا جو میرا تھا۔ اس کے مقابلے میں یہ سب کچھ آسان تھا۔"

وہ چند لمحے بول نہیں سکی۔ اس کا اشارہ جس طرف تھا، وہ سب کچھ یاد کرنا تکلیف دہ تھا۔

"ہر کوئی اس طرح کا کام نہیں کر سکتا۔" وہ مدھم آواز میں بولی۔

"ہر کوئی کر سکتا ہے لیکن کرنا نہیں چاہتا۔ سروس آف ہیومینٹی کسی کی چیک لسٹ پر نہیں ہوتی' میری چیک لسٹ پر بھی نہیں تھی۔ میں خوش قسمت تھا کہ آگئی۔" وہ ہنسا۔

"تم بہت بدل گئے ہو۔" امامہ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا' وہ مسکرا دیا۔

"زندگی بدل گئی تھی میں کیسے نہ بدلتا۔ نہ بدلتا تو سسرال سے آنے والے عید کے تحائف کے انتظار میں بیٹھا ہوتا۔" اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

امامہ نے اس کے طنز کا برا نہیں مانا۔

"میں مانتی ہوں کہ میں بہت بے کار ہوں۔" اس نے اعتراف کیا تھا۔

"بے کار نہیں ہو' زندگی کو دیکھا نہیں ہے ابھی تم نے۔" وہ سنجیدہ ہوا۔

"کم از کم یہ تو نہ کہو' مجھے زندگی نے بہت کچھ دکھا اور سکھا دیا ہے۔" امامہ نے کچھ رنجیدگی سے اس کی بات کاٹی تھی۔

"مثلا" کیا؟" سالار نے اس سے پوچھا۔

"کیا نہیں سکھایا زندگی نے؟ تھوڑی سی عمر میں بہت سبق سکھائے ہیں زندگی نے مجھے۔"

"سبق سکھائے ہوں گے' پڑھے نہیں۔"

امامہ نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا تھا۔ وہ سیدھی باتیں کبھی بھی نہیں کرتا تھا لیکن وہ ایسی پُراسرار باتیں کرنے والوں میں سے بھی نہیں تھا۔

"اچھا لگ رہا ہوں کیا؟" سڑک پر نظریں جمائے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"کیا؟" وہ اسے دیکھتے ہی بری طرح گڑبڑائی۔

"تم مجھے دیکھ رہی ہو' اس لیے پوچھ رہا ہوں۔" امامہ نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا پھر بے اختیار ہنس پڑی۔ اس شخص میں کوئی بات ایسی تھی جو سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ نہ کئی سال پہلے آتی تھی' نہ اب آرہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے وہ اسے واقعی بے حد اچھا لگا تھا۔



عید کے چاند کا اعلان عشاء سے کچھ دیر پہلے ہوا تھا اور اس اعلان کے فورا" بعد سکندر نے ان دونوں کو ایک گھنٹے کے اندر اندر اپنی شاپنگ مکمل کرکے واپس آنے کے لیے کہا تھا۔ ان کا خیال تھا' چند گھنٹوں کے بعد کی نسبت اس وقت شاپنگ کرنا ان دونوں کے لیے زیادہ محفوظ رہے گا۔ انہوں نے شاپنگ نہیں کی تھی بلکہ ایک ریسٹورنٹ سے ڈنر کیا اس کے بعد مہندی لگوا کر اور چوڑیاں خرید کر وہ واپس آگئی تھی۔ سالار کم از کم آج رات واقعی محتاط تھا اور سکندر کی ہدایات کو نظرانداز نہیں کر رہا تھا کیونکہ امامہ کے گھر میں مسلسل گاڑیوں کا آنا جانا تھا اور وہ لوگ بھی ان ہی مارکیٹس میں جاتے تھے' جہاں پر سالار کی فیملی جاتی تھی۔

ساڑھے دس بجے کے قریب وہ گھر پر تھے اور اس وقت گھر پر کوئی موجود نہیں تھا۔ سکندر طیبہ کے ساتھ اپنے بھائی کے گھر پر تھے اور باقی سب لوگ اپنی فیملیز کے ساتھ باہر نکلے ہوئے تھے۔

سالار پچھلے دو گھنٹے سے مسلسل مختلف لوگوں کی فون کالز سن رہا تھا۔ یہ سلسلہ گھر آنے تک جاری تھا۔ امامہ بے زار ہونے لگی تھی۔ اس نے خود گھر سے نکلنے سے پہلے ڈاکٹر سبط علی ان کی بیٹیوں اور سعیدہ اماں کو کال کی تھی اور اس کے بعد اس کی کالز آنا بند ہوگئی تھیں۔ سالار نے البتہ فرقان اور انیتا سے بات کرتے ہوئے اس کی بات ان لوگوں سے کروائی تھی۔

"چلو کافی بناتے ہیں اور پھر فلم دیکھتے ہیں۔" سالار نے بالآخر اس کی بے زاری کو محسوس کر لیا تھا۔
"میں ہاتھ دھولوں؟" امامہ نے ہاتھوں پر لگی مہندی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"نہیں۔۔۔ میں بناؤں گا کافی تم بس میرے ساتھ کچن میں آجاؤ۔"
"تم بنالو گے؟"
"بہت اچھی۔" اس نے اپنا سیل آف کرتے ہوئے ٹیبل پر رکھا۔
مہندی لگے ہوئے دونوں ہاتھ کچن کی ٹیبل پر کہنیاں ٹکائے' وہ اسے کافی بناتے ہوئے دیکھتی رہی۔ کچن میں رکھے بلیک کرنٹ اور چاکلیٹ فج کیک کے دو ٹکڑے لے کر وہ کافی ٹرے میں رکھنے لگا تو امامہ نے کہا۔ "کچھ فائدہ ہوا میرے کچن میں آنے کا؟"
"ہاں تم نے مجھے کمپنی دی۔" اس نے ٹرے اٹھا کر اس کے ساتھ کچن سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔
"تم اکیلے بھی بنا سکتے تھے خوامخواہ مجھے ساتھ لائے۔"
"تمہیں دیکھتے ہوئے زیادہ اچھی بنی ہے۔" وہ اس کی بات پر ہنسی۔
"یہ بڑی چیپ بات ہے۔"
"اور رنگین۔۔۔ وہ تمہارے رومانٹک ناولز میں بھی تو ہیرو ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔" اس نے امامہ کے چہرے پر غائب ہوتی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھ کر فوراً" اپنے جملے کی تصحیح کی۔
"تم میری بکس کی بات کیوں کرتے ہو؟" وہ بگڑی۔
"اوکے۔۔۔ اوکے سوری۔" سالار نے ساتھ چلتے ہوئے ٹرے سے ایک ہاتھ ہٹا کر اس کے گرد ایک لمحے کے لیے حمائل کیا۔
"کون سی مووی لی تھیں تم نے؟" بیڈ روم میں آکر امامہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس سے پوچھا۔
سالار نے مارکیٹ سے آتے ہوئے ایک مووی شاپ سے کچھ سی ڈیز لی تھیں۔ سی ڈی پلیئر پر مووی لگاتے ہوئے سالار نے ان موویز کے نام دہرائے۔ ریموٹ کنٹرول پکڑے وہ بیڈ سے کمبل اٹھا کر خود بھی صوفے پر آگیا تھا اس کی اور اپنی ٹانگوں پر کمبل پھیلا کر اس نے کارنر ٹیبل پر پڑا کافی کا مگ اٹھا کر امامہ کی طرف بڑھایا۔
"تمہیں پکڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے امامہ کو مہندی والے ہاتھوں سے مگ پکڑنے کی کوشش سے روکا۔
اسکرین پر فلم کے کریڈٹس چل رہے تھے امامہ نے کافی کا گھونٹ لیا۔
"کافی اچھی ہے۔" اس نے ستائشی انداز میں مسکراتے ہوئے سرہلایا۔
"تھینک یو!" سالار نے کہتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اپنا مگ اٹھالیا۔
وہ اب اسکرین کی طرف متوجہ تھا۔ جہاں چارلیز تھیرن نظر آرہی تھی۔ امامہ نے اس کا انہماک محسوس کیا تھا۔ وہ کچھ بے چین ہوئی۔ وہ اس ایکٹریس کے نام سے واقف نہیں تھی۔
"یہ کون ہے؟" امامہ نے اپنا لہجہ حتی المقدور نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔
"تم نہیں جانتیں؟" سالار اب کانٹے کے ساتھ کیک کا ٹکڑا اس کے منہ میں ڈال رہا تھا۔
"نہیں۔"
"چارلیز تھیرن ہے۔ میرے نزدیک دنیا کی سب سے خوب صورت عورت ہے۔" کیک امامہ کو کڑوا لگا تھا۔ وہ پھر اسکرین کی طرف متوجہ تھا۔
"خوب صورت ہے نا؟" کیک کھاتے ہوئے اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر اس نے امامہ سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ بس۔" اس نے سرد مہری سے کہا۔
"مجھے تو خوب صورت لگتی ہے۔" اسکرین پر نظریں جمائے وہ بڑبڑایا۔
امامہ کی دلچسپی اب فلم سے ختم ہو گئی تھی۔
"خوب صورت ہے، لیکن بری ایکٹریس ہے۔" چند سین گزرنے کے بعد اس نے کہا۔
"آسکر جیت چکی ہے۔" ابھی تک اس کی نظریں اسکرین پر ہی جمی تھیں۔ امامہ کو چار لیٹرز اور بری لگی۔
"مجھے اس کی ناک اچھی نہیں لگ رہی۔" چند لمحے مزید گزرنے پر امامہ نے کہا۔
"ناک کو کون دیکھتا ہے؟" وہ اسی انداز میں بڑبڑایا۔ امامہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ سالار سنجیدہ تھا۔
"پھر۔۔۔؟"
"مجھے بال پسند ہیں اس کے۔" امامہ دوبارہ اسکرین کو دیکھنے لگی۔
سالار کو بے اختیار ہنسی آئی۔ اس نے ہنستے ہوئے امامہ کو ساتھ لگایا۔
"تم ذرا بھی ذہین نہیں ہو۔"
"کیا ہوا؟" امامہ کو اس کے ہنسنے کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔
"کچھ نہیں ہوا۔۔۔ مووی دیکھو۔" کیک کا آخری ٹکڑا اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے وہ دوبارہ اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔
امامہ نے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر سی ڈی پلیئر بند کر دیا۔
"کیا ہوا؟" وہ چونکا۔
"فضول مووی ہے بس تم باتیں کرو مجھ سے۔" امامہ نے جیسے اعلان کیا۔
"باتیں ہی تو کر رہا ہوں۔۔۔ مہندی خراب ہوئی ہو گی۔" سالار نے اس کا ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔
"نہیں سوکھ گئی ہے۔ میں ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔" وہ ریموٹ کنٹرول رکھتے ہوئے چلی گئی۔
چند منٹوں کے بعد جب وہ واپس آئی تو مووی دوبارہ آن تھی۔ امامہ کو آتے دیکھ کر اس نے مووی آف کر دی۔
وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کافی پیتے ہوئے سالار نے اس کی مہندی والے ہاتھ باری باری پکڑ کر دیکھے۔
مہندی کا رنگ گہرا تو نہیں تھا، لیکن بہت کھلا ہوا تھا۔
"تمہارے ہاتھوں پر مہندی بہت اچھی لگتی ہے۔"
اس کی ہتھیلی اور کلائی کے نقش و نگار پر انگلی پھیرتے ہوئے اس نے کہا۔ وہ بلاوجہ مسکرا دی۔
"چوڑیاں کہاں ہیں؟" سالار کو یاد آیا۔
"پہنوں۔۔۔؟" وہ پرجوش ہوئی۔
"ہاں۔" وہ ڈریسنگ ٹیبل پر کچھ دیر پہلے بازار سے خرید کر رکھی چوڑیاں دونوں کلائیوں میں پہن کر دوبارہ اس کے پاس آ گئی۔ اس کی کلائیاں یک دم سرخ چوڑیوں کے ساتھ سج گئی تھیں۔ اپنی کلائیاں سالار کے سامنے کر کے اس نے اسے چوڑیاں دکھائیں۔
"پرفیکٹ۔" وہ نرمی سے مسکرا دیا۔
کمرے میں چھائی ہوئی خاموشی کو چوڑیوں کی ہلکی سی کھنک پانی کے ارتعاش کی طرح توڑنے لگی تھی۔ وہ اب اس کی چوڑیوں پر انگلی پھیر رہا تھا۔
"معجزہ لگتا ہے یہ!" چند لمحوں بعد اس نے گہری سانس لے کر کہا۔
اپنا بازو اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے اس نے امامہ کو خود سے قریب کیا۔ سویٹر سے نکلے اس کی سفید شرٹ

کے کالر کو ٹھیک کرتے ہوئے امامہ نے اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ وہ اس شخص سے محبت نہیں کرتی تھی لیکن بار بار اس کی قربت میں ایسے ہی سکون اور تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ وجہ وہ رشتہ تھا جو ان دونوں کے درمیان تھا یا وہ زندگی جو وہ گزار کر آئی تھی یا کچھ اور۔۔۔؟ وہ نہیں جانتی تھی، لیکن ہر بار اپنے گرد اس کا بازو اسے دیوار کی طرح محسوس ہوتا تھا جو وہ اس کے گرد کھڑی کر دیتا تھا۔

"ایک بات مانو گی؟" سالار نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ملائمت سے کہا۔

"کیا؟" اس کے سینے پر سر رکھے امامہ نے سر اونچا کر کے اسے دیکھا۔

"وعدہ کرو پہلے۔"

"اوکے۔" امامہ نے بے اختیار وعدہ کیا۔

"فلم دیکھنے دو مجھے۔" وہ بے حد خفا ہو کر اس سے الگ ہوئی۔

"میں دیکھنے کے لیے لے کر آیا ہوں امامہ!" وہ سیدھا ہوتا ہوا بولا۔

"تم دوسری مووی بھی لے کر آئے ہو، ان میں سے دیکھ لو کوئی۔"

"اوکے ٹھیک ہے۔" امامہ حیران ہوئی کہ وہ اتنی جلدی کیسے مان گیا تھا۔

سی ڈی پلیئر میں مووی تبدیل کر کے وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اب خوش؟" اس نے امامہ سے پوچھا۔

وہ مطمئن انداز میں مسکا کر دوبارہ اس کے قریب ہو گئی۔ اس کے سینے پر سر لگائے اس نے فلم کے کریڈٹس چلتے دیکھے۔ وہ کریڈٹس پر غور کیے بغیر دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے بہت آہستہ آہستہ تھپک رہا تھا۔ امامہ کو نیند آنے لگی اور اس کی آنکھ لگ جاتی اگر تیسرے سین میں اسے چارلیز تھیرن اسکرین پر نظر نہ آجاتی۔

کچھ کہے بغیر اس نے سر اٹھا کر سالار کو دیکھا۔

"آئی ایم سوری تینوں موویز اسی کی ہیں۔" اس نے ایک شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"دیکھنے دو یار۔" اس نے جیسے التجا کی تھی۔

امامہ نے چند لمحے اسے دیکھنے کے بعد اسکرین کو دیکھا۔

"تعریف نہیں کرو گے تم اس کی۔"

"آئی پرامس۔" سالار نے بے ساختہ کہا۔

"وہ خوب صورت نہیں ہے۔" امامہ نے جیسے اسے یاد دلایا۔

"بالکل بھی نہیں۔" سالار نے سنجیدگی سے تائید کی۔

"اور بری ایکٹریس ہے۔"

"بے حد۔" امامہ کو اس کی تائید سے تسلی ہوئی۔

"اور تم اسے اس طرح اب کبھی نہیں دیکھو گے جیسے پہلے دیکھ رہے تھے۔" اس بار سالار ہنس پڑا۔

"کس طرح دیکھتا ہوں میں اسے؟"

"تم دیکھتے نہیں گھورتے ہو اسے۔"

"کون ایسا نہیں کرے گا؟ وہ اتنی۔۔۔" سالار روانی میں کہتے کہتے رک گیا۔

"کہہ دو ناکہ خوب صورت ہے۔" امامہ نے اس کی بات مکمل کی۔

"میں تمہارے لیے اس کو بس نہیں بنا سکتا۔"

"تو صرف ایکٹریس سمجھو اسے۔"

وہ ایکسٹرلیس ہی تو سمجھ رہا ہوں یار۔ چھوڑو۔ میں نہیں دیکھتا۔ آدھی مووی تو ویسے ہی گزر گئی ہے۔" سالار نے اس بار کچھ خفا ہو کر ریموٹ کنٹرول سے مووی آف کی۔
امامہ بے حد مطمئن انداز میں صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اب صوفے سے چیزیں سمیٹ رہا تھا۔
"کمبل لے آؤ گے نا تم؟" واش روم کی طرف جاتے ہوئے امامہ نے پوچھا۔
"جی لے آؤں گا میں۔ کوئی اور حکم ہو تو وہ بھی دے دیں۔"
وہ کمبل اٹھاتے ہوئے خفگی سے بڑبڑایا تھا۔



سکندر نے عید کے تحفے کے طور پر اسے ایک بریسلٹ دیا تھا اور سوائے سالار کے تقریباً سب نے ہی اسے کچھ نہ کچھ دیا تھا۔ امامہ کا خیال تھا' وہ اس بار ضرور اسے زیور میں کوئی چیز تحفے میں دے گا۔ اسے لاشعوری طور پر جیسے انتظار تھا کہ وہ اسے کچھ دے۔ اس نے اس بار بھی اسے کچھ رقم دی تھی۔ وہ کچھ مایوس ہوئی' لیکن اس نے سالار سے شکایت نہیں کی۔ اسے عجیب لگ رہا تھا کہ وہ خود اس سے کوئی تحفہ مانگے اور اسے حیرانی تھی کہ سالار کو خود اس کا خیال کیوں نہیں آیا۔
عید کی رات شہر کے نواح میں واقع سکندر عثمان کے فارم ہاؤس میں ایک فیملی ڈنر تھا۔ وہاں سالار کی بیوی کی حیثیت سے پہلی بار وہ متعارف ہوئی تھی اور طیبہ کے تیار کرائے ہوئے سرخ لباس میں وہ واقعی ایک نئی نویلی دلہن لگ رہی تھی۔ ڈیڑھ' دو سو کے قریب وہ سب افراد سالار کی ایکسٹینڈڈ فیملی تھے۔ امامہ کو اب احساس ہوا تھا کہ سالار کا اسے اسلام آباد لانے اور اس کی شناخت کو نہ چھپانے کا فیصلہ ٹھیک تھا۔ اسے اس عزت و احترام کی اشد ضرورت تھی' جو اسے وہاں مل رہی تھی۔
اوپن ایئر میں پارٹی کو ڈنر کے دوران اپنی پلیٹ لے کر وہ کچھ دیر کے لیے فارم ہاؤس کے برآمدے میں لکڑی کی سیڑھیوں میں بیٹھ گئی تھی۔ ایک ہٹ کی طرح بنا ہوا فارم ہاؤس کا وہ حصہ اس وقت نسبتاً خاموش تھا۔ باقی افراد ٹولیوں کی صورت میں سامنے کھلے سبزے میں ڈنر کرتے ہوئے مختلف سرگرمیوں میں مصروف تھے۔
"تم یہاں کیوں آکر بیٹھ گئیں؟" امامہ کے قریب آتے ہوئے اس نے دور سے کہا۔
"ویسے ہی۔ شال لینے آئی تھی۔ پھر یہیں بیٹھ گئی۔" وہ مسکرائی۔ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سالار نے سوفٹ ڈرنک کا گلاس اپنی ٹانگوں کے درمیان نچلی سیڑھی پر رکھ دیا۔ امامہ لکڑی کے ستون سے ٹیک لگائے ایک گھٹنے پر کھانے کی پلیٹ ٹکائے کھانا کھاتے ہوئے دور لان میں ایک کینوپی کے نیچے اسٹیج پر بیٹھے گلوکار کو دیکھ رہی تھی جو غزل شروع کرنے سے پہلے سازندوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ سالار نے اس کا کانٹا اٹھا کر اس کی پلیٹ سے کباب کا ایک ٹکڑا اپنے منہ میں ڈالا۔ وہ اب گلوکار کی طرف متوجہ تھا جو اپنی غزل شروع کر چکا تھا۔
"انجوائے کر رہی ہو؟" سالار نے اس سے پوچھا۔
"ہاں" اس نے مسکرا کر کہا۔ وہ غزل سن رہی تھی۔

کسی کی آنکھ پرنم ہے' محبت ہو گئی ہو گی
زباں پہ قصہ غم ہے' محبت ہو گئی ہو گی

وہ بھی سوفٹ ڈرنک پیتے ہوئے غزل سننے لگا تھا

کبھی ہنسنا' کبھی رونا' کبھی ہنس ہنس کر رو دینا
عجب دل کا یہ عالم ہے' محبت ہو گئی ہو گی

"اچھا گا رہا ہے۔" امامہ نے ستائشی انداز میں کہا۔
سالار نے کچھ کہنے کے بجائے سر ہلا دیا۔

خوشی کا حد سے بڑھ جانا بھی اب اک بے قراری ہے
نہ غم ہونا بھی اک غم ہے محبت ہو گئی ہو گی

سالار سوفٹ ڈرنک پیتے ہوئے ہنس پڑا۔ امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا وہ جیسے کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔
"تمہیں کچھ دینا چاہ رہا تھا میں۔"
وہ جیکٹ کی جیب میں سے کچھ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔
"بہت دنوں سے دینا چاہتا تھا میں لیکن۔۔۔" وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔
اس کے ہاتھ میں ایک ڈبیا تھی۔ امامہ کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ آئی تو بالآخر اسے اس کا خیال آ ہی گیا تھا۔ اس نے ڈبیا لیتے ہوئے سوچا اور اسے کھولا۔ وہ ساکت رہ گئی۔ اندر ایئر رنگز تھے۔ ان ایئر رنگز سے تقریباً ملتے جلتے جو وہ اکثر اپنے کانوں میں پہنے رکھتی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر سالار کو دیکھا۔
"میں جانتا ہوں یہ اتنے ویلیو ایبل تو نہیں ہوں گے جتنے تمہارے فادر کے ہیں۔۔۔ لیکن مجھے اچھا لگے گا اگر کبھی کبھار تم انہیں بھی پہنو۔"
ان ایئر رنگز کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
"تم نہیں پہننا چاہتیں تو بھی ٹھیک ہے۔ میں ریپلیس کرنے کے لیے نہیں دے رہا ہوں۔"
سالار نے اس کی آنکھوں میں نمودار ہوتی نمی دیکھ کر بے ساختہ کہا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بہت ساری چیزیں پہلے ہی اپنی جگہ بدل چکی ہیں۔ اس کی خواہش اور ارادے کے نہ ہونے کے باوجود۔
کچھ کہنے کے بجائے امامہ نے اپنے دائیں کان میں لٹکتا ہوا جھمکا اتارا۔
"میں پہنا سکتا ہوں؟"
سالار نے ایک ایئر رنگ نکالتے ہوئے پوچھا۔ امامہ نے سر ہلا دیا۔ سالار نے باری باری اس کے دونوں کانوں میں وہ ایئر رنگز پہنا دیے۔
وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔ وہ بہت دیر تک مبہوت سا اسے دیکھتا رہا۔
"اچھی لگ رہی ہو۔"
وہ اس کے کانوں میں لٹکتے ہلکورے کھاتے موتی کو چھوتے ہوئے مدھم آواز میں بولا۔
"مجھ سے زیادہ کوئی تم سے محبت نہیں کر سکتا، کوئی بھی۔ مجھ سے زیادہ تمہاری پروا نہیں کر سکتا۔ مجھ سے زیادہ خیال نہیں رکھ سکتا تمہارا۔ میرے پاس تمہارے علاوہ کوئی قیمتی چیز نہیں ہے۔"
اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ وعدہ کر رہا تھا یا دہائی کرا رہا تھا، کچھ جتا رہا تھا۔ وہ جھک کر اب اس کی گردن چوم رہا تھا۔
"مجھے نواز آ گیا ہے۔" سیدھا ہوتے ہوئے اس نے امامہ سے کہا۔
"رومانس ہو رہا ہے؟" اپنے عقب میں آنے والی کامران کی آواز پر وہ ٹھٹکے تھے۔ وہ شاید شارٹ کٹ کی وجہ سے برآمدے کے اس دروازے سے نکلا تھا۔
"کوشش کر رہے ہیں۔" سالار نے پلٹے بغیر کہا۔
"گڈ لک۔" وہ کہتا ہوا ان کے پاس سے سیڑھیاں اترتا ہوا انہیں دیکھے بغیر چلا گیا۔
امامہ کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ وہ جھینپ گئی تھی۔ سالار اور اس کی فیملی کم از کم ان معاملات میں بے

آزاد خیال تھے۔

کسی کو سامنے پاکر، کسی کے سرخ ہونٹوں پر
انوکھا سا تبسم ہے، محبت ہو گئی ہوگی

امامہ کو لگا کہ وہ زیر لب گلوکار کے ساتھ گنگنا رہا ہے۔

جہاں ویران راہیں تھیں، جہاں حیران آنکھیں تھیں
وہاں پھولوں کا موسم ہے، محبت ہو گئی ہوگی

لکڑی کی ان سیڑھیوں پر ایک دوسرے کے پاس بیٹھے، وہ خاموشی کو توڑتی آس پاس کے پہاڑوں میں گونج کی طرح پھیلتی گلوکار کی سریلی آواز کو سن رہے تھے۔ زندگی کے وہ لمحے یادیں بن رہے تھے، دوبارہ نہ آنے کے لیے گزر رہے تھے۔

ان کے اپارٹمنٹ کی دیوار پر لگنے والی ان دونوں کی پہلی اکٹھی تصویر اسی فارم ہاؤس کی سیڑھیوں ہی کی تھی۔ سرخ لباس میں گولڈن کڑھائی والی سیاہ پشمینہ شال اپنے بازوؤں کے گرد اوڑھے کھلے سیاہ بالوں کو کانوں کی لوؤں کے پیچھے کیے، خوشی اس کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک میں نہیں جھلک رہی تھی، بلکہ اس قرب میں بھی جو اس کے اور سالار کے درمیان نظر آرہا تھا۔ سفید شرٹ اور سیاہ جیکٹ میں اسے اپنے ساتھ لگائے سالار کی آنکھوں کی چمک جیسے اس فوٹوگراف میں موجود ہر شے کو مات کر رہی تھی۔ کوئی بھی کیمرے کے لیے بنائے ہوئے اس ایک پوز میں نظر آنے والے کپل کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ضرور ٹھٹکتا۔

سکندر نے اس فوٹوگراف کو فریم کروا کر انہیں ہی نہیں بھیجا تھا، بلکہ انہوں نے اپنے گھر کی فیملی وال فوٹوز میں بھی اس تصویر کا اضافہ کیا تھا۔



لاہور واپسی پر عید ڈنرز کا ایک لمبا سلسلہ تھا، جو شروع ہو گیا۔ وہ امامہ کو اپنے سوشل اور بزنس سرکل میں متعارف کروا رہا تھا اور وہ اس سرکل میں اچانک بہت حواس باختہ ہونے لگی تھی۔ وہ کارپوریٹ سیکٹر ٹائیکونز اور بزنس ٹائیکونز کی فیملیز پر مشتمل تھا۔ پاکستان کی امیر ترین اور شاید گمراہ ترین کلاس، ہائی کلاس پروفیشنلز۔ جو ایک کو دو اور دو کو چار نہیں کرتے تھے، بلکہ ایک کو سو اور سو کو لاکھ کرنے کے گر سے آگاہ تھے اور بینکنگ سیکٹر کی کریم۔ جن کی بیوی، فیانسی، گرل فرینڈ اور سیکرٹری میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ صرف دوسروں کے لیے ہی نہیں خود ان کے اپنے لیے بھی، اپنے ساتھ لے کر آنے والی عورت سے اس کا رشتہ جو بھی ہوتا، ان فنکشنز میں ان عورتوں کا کام ایک ہی ہوتا تھا۔ وہ اپنی خوب صورتی، بے تکلفی اور گرم جوشی سے، نیم عریاں لباس، اونچی زبان اور آواز کی کھنک سے، اپنے بلند و بانگ قہقہوں سے اور اپنی اداؤں سے اپنے شوہر، منگیتر، بوائے فرینڈ یا باس کے بزنس کانٹیکٹس میں اضافہ کرتی تھیں۔ **Trophy Wife** والے شوہر کامیابی کی سیڑھیاں تیزی سے طے کرتے تھے۔

عید کے چوتھے دن وہ اسے پہلی بار اپنے ہی بینک کی طرف سے دیے گئے عید کے ڈنر میں لے کر گیا تھا اور ایک بڑے ہوٹل میں ہونے والے اس ڈنر میں جاتے ہی امامہ کو پسینہ آنے لگا تھا۔ گیدرنگ کا ایک بڑا حصہ غیر ملکی مردوں اور عورتوں پر مشتمل تھا اور وہ اگر ایوننگ گاؤنز اور اسکرٹس میں ملبوس تھیں تو وہ حیرت کا شکار نہیں ہوئی تھی لیکن اسے نروس کرنے والی چیز ان دوسری خواتین اور بیگمات کا حلیہ تھا جو پاکستانی تھیں۔ وہ فیملی ڈنر تھا۔ کم از

کم سالار اسے یہ ہی بتا کر وہاں لایا تھا، لیکن وہاں آنے والی فیملیز کون تھیں یہ اس نے اسے نہیں بتایا تھا۔ گہرے گلے والے اور بغیر آستین والے مختصر بلاؤزز، بیک لیس گاؤنز، سٹرنگ ٹاپس اور آف شولڈر ڈریسز میں ملبوس پاکستان کی خاندانی خوب صورت عورتوں کا اتنا بڑا مجمع اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

چند لمحوں کے لیے اسے لگا تھا جیسے وہ مس ورلڈ کے مقابلہ حسن میں آگئی ہو۔ وہاں موجود عورتیں بیس سے ساٹھ سال تک کی عمر کے درمیان تھیں اور یہ ہی طے کرنا اب سے زیادہ مشکل تھا کہ کون عمر کی کس سیڑھی پر کھڑی ہے۔ سگریٹ پیتے ہوئے ہاتھ میں ڈرنکس لیے وہ گرم جوشی اور بے تکلفی کے ساتھ مختلف مردوں سے گلے ملتے ہوئے گفتگو میں مصروف تھیں۔ شیفون کے لباس کے اوپر دوپٹا اوڑھے امامہ کو اپنا آپ اوپرا لگا۔

وہاں کھڑے اس نے جیسے خود کو جانچنا شروع کر دیا تھا اور وہیں کھڑے اس نے پہلی بار سالار اور اپنے حلیے کے فرق کو بھی کونوٹس کیا تھا۔ ایک براعڈ سیاہ ڈنر سوٹ میں سرخ دھاری دار ٹائی کے ساتھ وہ بالکل اس ماحول کا حصہ لگ رہا تھا گرومڈ اور پولشڈ۔ وہاں کھڑے اس پر یہ ہولناک انکشاف بھی ہوا کہ اس کا حلیہ سالار کی اس لک سے ساتھ میچ نہیں کرتا۔

وہ اوڈ ون آؤٹ تھی۔ اسے احساس کمتری کا دوسرا دورہ بڑی غلط جگہ اور بڑے ہی غلط وقت پر پڑا تھا۔

وہ اس کا تعارف باری باری مختلف لوگوں سے کروا رہا تھا اور امامہ اس پذیرائی اور گرم جوشی پر حیران تھی جو اسے مل رہی تھی۔ پھر یک دم اسے احساس ہونے لگا کہ اس گرم جوشی کی وجہ بھی سالار سکندر تھا۔ یہ پروٹوکول مسز سالار سکندر کے لیے تھا، امامہ ہاشم کے لیے نہیں۔ یہ ٹیگ جس کے گلے میں بھی لٹکا ہوتا اسے یہ ہی پروٹوکول ملتا، چاہے اس کا حلیہ اس سے بھی بدتر ہوتا۔ اس کا احساس کمتری پارے کی طرح اوپر جا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پی آر میں ہونے کی وجہ سے اتنا سوشل ہے۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کا شوہر پاکستان میں بینک کے چند کلیدی عہدوں میں سے ایک پر براجمان تھا اور اس کے پاس آنے والے لوگوں کی خوش اخلاقی اور گرم جوشی دکھانے کی وجوہات کچھ اتنی فطری نہیں تھیں۔

سالار کے ساتھ کھڑے اسے اپنے ہی حلیے کی چند اور خواتین بھی بالآخر اس مجمع میں نظر آگئی تھیں اور ان کی موجودگی نے اسے کچھ حوصلہ دیا کہ اس جیسے اور بھی اوڈ پیلپلز وہاں موجود تھے۔

"ڈرنکس پلیز!" مشروبات کی ٹرے پکڑے ویٹر نے بالکل ان کے پاس آکر اس سے کہا۔ وہ چونکی اور اس نے ٹرے پر نظر دوڑائی۔ وائن گلاس میں ایپل جوس تھا۔ اس نے ایک گلاس اٹھا لیا۔ ویٹر اب ان کے اردگرد کھڑے چند غیر ملکی افراد کو ڈرنکس پیش کر رہا تھا۔

اپنے سامنے کھڑے ایک غیر ملکی جوڑے سے باتیں کرتے ہوئے سالار نے بے حد غیر محسوس انداز میں امامہ کو دیکھے بغیر اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔ وہ چونک گئی۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا کہ وہ شاید خود پینا چاہتا ہے لیکن اس کا گلاس ہاتھ میں لیے وہ اسی طرح اس جوڑے سے باتیں کرتا رہا۔ ویٹر وائن ٹرے میں کھڑے تمام افراد کو سرو کرتے ہوئے سالار کے پاس گیا۔ سالار نے امامہ کا گلاس اس بے حد غیر محسوس انداز سے ٹرے میں واپس رکھتے ہوئے ویٹر سے کہا۔

"سوفٹ ڈرنکس پلیز!"

امامہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔ ٹرے میں رکھا اپنا گلاس اس نے دور جاتے دیکھا، پھر اس نے سالار کو دیکھا۔ وہ اب بھی ان کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا۔ ویٹر چند لمحوں کے بعد ایک دوسری ٹرے لیے موجود تھا۔ اس بار اس کے گلاس اٹھانے سے پہلے ہی سالار نے ایک گلاس اٹھا کر اسے دیا اور دوسرا خود پکڑ لیا۔

"اوہ، ہیلو، سالار!" وہ چالیس، پینتالیس سال کی ایک عورت تھی جس نے سالار کے قریب آتے ہوئے

اس سے ہاتھ ملایا اور پھر بے حد دوستانہ انداز میں بے تکلفی کے ساتھ اس کے بازو پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ وہاں موجود دوسرے مردوں کی طرح عورتوں سے گلے نہیں مل رہا تھا لیکن ان میں سے کچھ عورتوں سے ہاتھ ملا رہا تھا اور کچھ عورتیں اس سے بات کرتے ہوئے اسی طرح بے تکلفی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیتی تھیں۔ امامہ کے لیے فی الحال اتنا کچھ ہضم کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ یہ سب وہ ہضم کر لیتی اگر ان کا لباس اتنا قابل اعتراض نہ ہوتا۔

"مجھے کسی نے تمہاری بیوی کے بارے میں بتایا۔ یہ میرے لیے ایک بڑی خبر ہے۔ کب شادی کی تم نے؟"

وہ عورت اب اس سے کہہ رہی تھی۔ سالار نے جواباً بے حد شائستگی سے امامہ سے اس کا تعارف کروایا۔ مسز لیتھ نے اس سے ملتے ہوئے اسے ڈنر پر مدعو کیا۔ سالار نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کوئی دن طے کیے بغیر دعوت قبول کر لی۔ وہ پچھلے پندرہ منٹ سے ایسے ہی کئی دعوتیں اسی طرح قبول کرتے دیکھ چکی تھی۔ مسز لیتھ اب گروپ میں کھڑے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہیلو ہائے میں مصروف تھیں۔ تب اس نے اپنے عقب میں کسی کو دیکھ کر سالار کو مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہائے رمشا!"

امامہ نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔

"ہو ہائے۔" رمشا بھی مسکراتے ہوئے اس کی طرف آئی۔

سالار نے دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کروایا۔ رمشا بڑی خوش دلی سے اس سے ملی۔

"بہت لکی ہیں آپ۔ اگر آپ اسے پہلے نہ ملی ہوتیں تو اس بندے سے میں نے شادی کر لینی تھی۔" رمشا نے بڑی بے تکلفی سے امامہ سے کہا۔

"بس۔ بس۔ کچھ دیر ہو گئی مجھے سالار سے ملنے میں۔"

وہ بھی جواباً خوش دلی سے ہنسا تھا۔

"ولیمہ کب ہے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"بیس تاریخ کو اسلام آباد میں۔" وہ سالار سے کہہ رہی تھی۔

امامہ نے اس بار سالار کو اسے ٹالتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ملاقات طے کر رہا تھا۔ اس کے پاس آنے والی وہ پہلی لڑکی تھی جس کے ساتھ سالار کا رویہ کچھ زیادہ بے تکلفی لیے ہوئے تھا۔ رمشا گروپ میں موجود دوسرے لوگوں سے ملنے کے بعد ہال میں موجود دوسرے لوگوں کی طرف جا رہی تھی۔ امامہ اس پر سے نظریں نہیں ہٹا سکی۔

⁂ ⁂ ⁂

"کوئی بات کرو۔" وہاں سے واپسی پر سالار نے اس کی خاموشی محسوس کی۔

"کیا بات کروں؟"

"کوئی بھی۔" وہ پھر خاموش ہو گئی۔

"عجیب لوگ تھے سارے۔" کچھ دیر بعد سالار نے اسے بڑبڑاتے ہوئے سنا۔ وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"عجیب کیوں؟"

"تمہیں عورتیں اس طرح کے لباس میں یہ سب کرتی ہوئی اچھی لگتی ہیں؟" اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔

"تم نے وہ پہنا جو تمہیں اچھا لگا اور انہوں نے بھی وہی پہنا جو انہیں پسند تھا۔"

اس نے بے یقینی سے سالار کو دیکھا۔ کم از کم وہ [illegible] کچھ برا

نہیں لگا؟"

"میرے لیے وہ سب رسپکٹ ایبل لوگ تھے۔ کچھ میرے کلائنٹس تھے کچھ کو میں ویسے ہی جانتا ہوں۔"

"تمہیں برا کیوں لگے گا سالار۔ تم مرد ہو تمہیں تو بہت اچھا لگے گا اگر تمہیں عورتیں اس طرح کے کپڑوں میں نظر آئیں گی۔"

بات کرتے ہوئے اسے اندازہ نہیں ہوا کہ اس کا جملہ کتنا سخت تھا۔ سالار کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"میں ایسی گیدرنگز میں مرد بن کر نہیں جاتا مہمان بن کر جاتا ہوں اور مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں ہے کہ کس نے کیا پہنا ہے اور کیا نہیں۔ میرے لیے ہر عورت بغیر اپنے پہناوے کے قابل احترام ہے۔ میں لباس کی بنا کسی کا کردار نہیں جانچتا۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم نے دوپٹہ لیا ہوا ہے تو تم قابل عزت ہو۔ اور وہ عورت جو ایک قابل اعتراض لباس پہنے ہوئے ہے وہ قابل عزت نہیں ہے۔ تو تم بالکل غلط ہو۔"

وہ بول نہیں سکی۔ سالار کے لہجے میں اتنے دنوں میں اس نے پہلی بار ترشی محسوس کی تھی۔

"تمہیں کیسا لگے گا اگر کوئی تمہارے پردے کی وجہ سے تمہارے بارے میں یہی بات کہے جیسی تم ان کے بارے میں کہہ رہی ہو۔"

"تم ان کی حمایت کیوں کر رہے ہو؟" وہ جھنجلائی۔

"میں کسی کی حمایت نہیں کر رہا صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ دوسرے لوگ کیا کرتے ہیں اور کیا نہیں کرتے یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔"

"تمہیں یہ سب پسند ہے؟" وہ اس کے سوال پر ہنسا تھا۔

"یہ ایشو نہیں ہے۔ مجھے یہ سب اپنی زندگی کے لیے پسند نہیں ہے لیکن مجھے ایسے ڈنرز میں اس لیے جانا پڑتا ہے کیونکہ مجھے اپنی جاب کی وجہ سے کسی حد تک سوشل رہنا ہے لیکن میں کسی گیدرنگ میں جا کر یہ طے نہیں کرتا پھرتا کہ ان میں سے کتنے لوگ دوزخ میں جائیں گے اور کتنے جنت میں۔ مجھے جن سے ملنا ہوتا ہے ملتا ہوں کھانا کھاتا ہوں اور آجاتا ہوں۔ میں اپنے سر پر دوسروں کے اعمال کا بوجھ لے کر نہیں آتا۔" وہ اپنی زندگی کی فلاسفی سے اسے پھر حیران کر رہا تھا۔

"ایک بات پوچھوں؟" سالار نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔

"اگر میں تمہاری زندگی میں نہ آتی اور تمہیں شادی کرنی ہوتی تو اس طرح کی لڑکیوں سے کرتے؟ جو آج وہاں تھیں؟"

وہ رمشا کا نام لینا چاہتی تھی لیکن اس نے نہیں لیا۔ وہ خود بھی جان نہیں پائی کہ اس نے یہ سوال سالار سے کیا سننے کے لیے کیا تھا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ میں پردہ کرنے والی یا پردہ نہ کرنے والی لڑکی میں کس سے شادی کرتا۔" سالار نے براہ راست سوال کر دیا۔

وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی، وہ واقعی یہی پوچھنا چاہتی تھی۔

"آنسٹلی تمہیں ایک بتاؤں۔ میں کسی عورت کا صرف پردہ دیکھ کر اس سے شادی نہ کرتا۔ کسی عورت کا پردہ کرنا یا نہ کرنا شاید میرے لیے اتنا اہم نہیں ہے جتنا اس میں کچھ دوسری خوبیوں کا ہونا۔" اسے آج شاک پر شاک لگ رہے تھے۔

"اگر ایک عورت اللہ کے احکامات پر عمل کرتی ہے، سر اور جسم چھپاتی ہے، اچھی بات ہے لیکن میں اس ایک چیز کے علاوہ بھی اس عورت میں کچھ اور خوبیاں چاہتا جس سے میں نے شادی کرنی ہوتی۔"

"کیسی خوبیاں؟" اسے تجسس ہوا تھا۔
"صبر، برداشت اور اطاعت۔" وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔
"یہ دونوں نادر کوالٹیز ہیں۔ باقی سب کچھ ہوتا ہے لڑکیوں میں۔ ڈگریز اور لک۔ اور مینرز م اور پردہ بھی۔ لیکن یہ دو کوالٹیز ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔" اگر اسے کوئی زعم تھا تو ختم ہو گیا تھا۔ وہ جن دو خوبیوں کو اپنی ترجیح بتا رہا تھا وہ اس میں بھی نہیں تھیں۔ یا کم از کم سالار کے لیے فی الحال نہیں تھیں۔ وہ وہاں بیٹھے بیٹھے جیسے اپنا تجزیہ کر رہی تھی۔
"میں کیوں اچھی لگی تمہیں؟" اس نے بالآخر اس سے پوچھ ہی لیا۔
"خالی پردہ تمہیں امپریس نہیں کرتا۔ تحمل اور اطاعت تو میں نے بھی تمہیں کبھی نہیں دکھائی۔ پھر۔۔۔؟"
"پتا نہیں، یہ وہ سوال ہے، جس کا جواب مجھے بھی نہیں ملا۔ ایک بار نہیں کئی بار میں نے اپنے آپ سے یہی ایک بات پوچھی ہے۔ تمہیں ناپسند کرنے کی بے شمار وجوہات بتا سکتا ہوں، لیکن پسند کرنے کے لیے میرے پاس کوئی ایک بھی وجہ نہیں۔ میرا مطلب ہے کوئی منطقی جواز۔" وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"پہلے تم مجھے intrigue کرتی تھیں۔ پھر تم مجھے irritate کرنے لگیں۔ اس کے بعد تم مجھے haunt کرنے لگیں۔ پھر میں تم سے جیلس ہونے لگا۔ پھر envy کرنے لگا۔ اور پھر محبت۔۔۔" وہ جیسے قدرے بے بسی سے ہنسا۔
"ان ساری اسٹیجز میں صرف ایک چیز کامن تھی۔ میں تمہیں کبھی بھی اپنے ذہن سے نکال نہیں سکا۔ مجھے تمہارا خیال آتا تھا اور آتا رہتا تھا اور بس میرا دل تمہاری طرف کھنچتا تھا، خوار ہوتا تھا اللہ نے مجھے میری اوقات بتا کر۔ بس اور کوئی بات نہیں تھی۔ اس لیے یہ تو کبھی پوچھو ہی مت کہ کیوں اچھی لگی تھیں تم مجھے۔" وہ محبت سے زیادہ بے بسی کا اظہار تھا اور اظہار سے زیادہ اعتراف۔
"اور اگر یہ سب نہ ہوا ہوتا تو پھر تم میرے بجائے کسی اور لڑکی سے شادی کرتے؟ مثلاً رمشا سے۔"
سالار نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر بے اختیار ہنسا۔
"تو یہ سوال رمشا کی وجہ سے ہو رہے تھے۔ یو آر سلی۔"
"تمہیں پسند ہے نا وہ؟" وہ اس کی ہنسی اور جملہ نظرانداز کر کے سنجیدہ ہی رہی۔
"ایک دوست اور کولیگ کے طور پر۔" سالار نے کہا۔
امامہ نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ سالار کو لگا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔
"کیا ہوا؟" سالار نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
"کچھ نہیں۔ تمہارے ساتھ کھڑی بہت اچھی لگی تھی مجھے وہ رمشا۔"
"بعض دفعہ ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے بہت سے لوگ اچھے لگتے ہیں حتیٰ کہ دو دشمن بھی ساتھ ساتھ کھڑے اچھے لگتے ہیں۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟" سالار نے اس کی بات کاٹی۔
"کچھ نہیں۔ ایسے ہی خیال آیا تھا۔"
"میں تمہارے ساتھ بہت خوش ہوں امامہ! یہ میری زندگی کا سب سے اچھا وقت ہے۔ فی الحال دنیا میں اور کوئی ایسی شے نہیں ہے، جس کی مجھے کمی محسوس ہو رہی ہو۔ اس لیے تم اپنے اندیشوں اور خیالوں سے باہر آ جاؤ۔ ڈنرز میں جاؤ، کھانا کھاؤ، لوگوں سے گپ شپ کرو اور اینڈ آف اٹ۔ اس دنیا کو اپنے ساتھ گھر لے کر مت آؤ۔"
اس رات سونے سے پہلے ناول پڑھتے ہوئے وہ سالار کے ساتھ ہونے والی اسی گفتگو کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھا لیپ ٹاپ پر کچھ کام کر رہا تھا۔ ناول سے نظریں ہٹا کر وہ سالار کو دیکھنے لگی۔ وہ اپنے کام میں

منہمک تھا۔

"سالار۔" اس نے کچھ دیر کے بعد اسے مخاطب کیا۔

"ہاں۔" اسی طرح کام کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"تم اچھے انسان ہو ویسے۔" اس کی تعریف کرتے ہوئے وہ عجیب سی شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

"اچھا۔" وہ اسی طرح مصروف تھا۔ کسی ردعمل کے اظہار کے بغیر ای میل کرتے ہوئے امامہ کو لگا کہ شاید اس نے اس کی بات غور سے نہیں سنی تھی۔ "میں نے تمہاری تعریف کی ہے۔" اس نے دہرایا۔

"بہت شکریہ۔" اس کا لہجہ اب بھی اتنا ہی سرسری تھا۔

"تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔" اس کا اتنا نارمل رہنا امامہ سے ہضم نہیں ہوا تھا۔

"کس چیز سے؟" وہ چونکا۔

"میں نے تمہاری تعریف کی۔"

"اور میں نے تمہارا شکریہ ادا کر دیا۔"

"لیکن تمہیں اچھا نہیں لگا؟" وہ کچھ متجسس تھی۔

"بہت اچھا لگا مجھے۔ میری باتیں سن کر اچھا تو ہی کہہ رہی ہو، عمل دیکھ کر کہتیں تب خوشی ہوتی مجھے اور فی الحال میں ایسا کوئی عمل تمہیں پیش نہیں کر سکا۔"

امامہ بول نہیں سکی وہ پھر اپنے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ تھا۔

وہ کچھ دیر چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

"تم نے میرے ہاتھ سے وہ ڈرنک کیوں لے لی تھی؟" اسے اچانک یاد آیا تھا۔

"کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم مجھے شوٹ کرو۔" وہ اس کے بے تکے جواب پر حیران ہوئی۔

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"شراب تھی وہ۔" وہ بول نہیں سکی۔

"سوری۔" سالار نے اسکرین سے نظریں ہٹاتے ہوئے اس سے معذرت کی۔ امامہ کا رنگ اڑ گیا تھا۔

"ان پارٹیز میں ہارڈ ڈرنکس بھی ہوتے ہیں، سوشل ڈرنک بھی جاتی ہے وہاں۔" وہ سنجیدگی سے اسے بتاتے ہوئے دوبارہ اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔

امامہ کا دل یک دم جیسے ہر چیز سے اچاٹ ہوا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار شراب دیکھی تھی۔ اس نے شراب ہاتھ میں لی تھی۔ اگر وہ سالار کے ساتھ کھڑی نہ ہوتی تو شاید پی بھی لیتی۔ اس کا شوہر ان پارٹیز میں جانے کا عادی تھا اور ان پارٹیز میں وہ کہاں تک ایسی چیزوں سے اجتناب کرتا تھا یا کر پاتا تھا۔ اس کا اعتماد پھر ٹوٹنے لگا تھا۔

وہ چند ہفتوں میں کسی کا کردار نہیں جانچ سکتی تھی۔ وہ بھی تب جب وہ اسے شادی کے اس پہلے مہینے میں مکمل طور پر متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

چند لمحے پہلے دل میں سالار کے لیے نمودار ہونے والا احترام سیکنڈز میں غائب ہوا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ہوتی ہے اور وہ انہیں تلف کرنے کا سوچتا ہے۔ مگر امامہ کی وجہ سے رک جاتا ہے۔ سالار اپنے بینک میں امامہ کا اکاؤنٹ کھلوا کر تیس لاکھ روپے اس کا حق مہر جمع کرواتا ہے۔ وہ امامہ کو لے کر اسلام آباد جاتا ہے اور ایئرپورٹ پر اسے یاد آتا ہے کہ سکندر عثمان نے منع کیا تھا۔ امامہ کو شدید غصہ آتا ہے۔ گھر پہنچنے پر سکندر عثمان اس سے شدید غصہ کرتے ہیں۔

پانچویں قسط

وہ جس شیشے سے اسے دیکھ رہی تھی' وہ پھر دھندلا گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ سالار سے اگلا جملہ کیا کہے۔ وہ دوبارہ اپنی ای میل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ کتاب میں امامہ کی دلچسپی مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

ڈپریشن کے دورے کا آغاز نئے سرے سے ہوا تھا۔ دوسرے بیڈ روم کے باتھ روم میں آ کر وہ بے مقصد اپنا دایاں ہاتھ رگڑ رگڑ کر دھوتی رہی۔ یہ احمقانہ حرکت تھی اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا' لیکن وہ اس وقت اپنی ذہنی پریشانی لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ واقعی بہت اپ سیٹ تھی۔ وہ شراب کا ایک گلاس نہیں تھا' بلکہ اس کی ازدواجی زندگی میں آنے والی پہلی کھائی تھی' پہلی اور سب سے بڑی۔ اس کے لیے یہ یقین کرنا ناممکن ہو رہا تھا کہ وہ اسی کمپنی کے ہوتے ہوئے شراب سے مکمل اجتناب کرتا ہو گا اور شراب پینے کا کیا مطلب تھا۔ ؟ یہ کسی کو سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بے مقصد گھر کے ہر کمرے میں پھرتی رہی۔ نیند مکمل طور پر اس کی آنکھوں سے غائب ہو گئی تھی۔

"اللہ سکون کے آسمان کو اندیشوں کی زمین کے بغیر کیوں نہیں کھڑا کرتا؟" اس نے ٹیرس سے بے مقصد نیچے جھانکتے ہوئے سوچا تھا۔

وہ اس تاریکی اور سردی میں کتنی ہی دیر ٹیرس کی ریلنگ کے پاس کھڑی نیچے دیکھتی رہی' اسے وقت کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔

"تم کیا کر رہی ہو یہاں؟" اپنے عقب میں سالار کی آواز نے اس کی سوچوں کے تسلسل کو توڑا۔ وہ کمرے سے اس کی طویل عدم موجودگی کی وجہ سے اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں آیا تھا۔

"میں۔۔۔؟" امامہ نے چونک کر پلٹ کر اسے دیکھا۔ "میں نیچے دیکھ رہی تھی۔"

"نیچے کیا ہے؟" سالار نے اس کے قریب آ کر نیچے جھانکا۔

"نیچے۔۔۔؟" امامہ کو خود بھی پتا نہیں چلا کہ اس نے نیچے کیا دیکھا تھا۔

"نیچے۔۔۔؟۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔" سالار نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ اسے غائب دماغ لگی تھی غائب دماغ یا پھر پریشان۔

"اندر چلیں؟" وہ کوئی جواب دینے کے بجائے اپنی شال ٹھیک کرتی ہوئی اس کے ساتھ اندر آ گئی۔

"تم سو جاؤ میں تھوڑی دیر بعد آؤں گی۔" اس نے اندر آتے ہوئے سالار سے کہا۔

"میں کچھ دیر ٹی وی دیکھوں گی۔" سالار ٹھٹک گیا۔

امامہ ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لیے اب ٹی وی آن کر رہی تھی۔ شادی کے بعد پہلی مرتبہ وہ ٹی وی میں اتنی دلچسپی ظاہر کر رہی تھی۔

"ٹی وی پر کوئی خاص پروگرام آ رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، ویسے ہی دیکھوں گی۔" امامہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ چلا جائے۔
وہ جانے کے بجائے صوفے پر اس کے برابر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے امامہ کے ہاتھ سے ریموٹ کنٹرول لے کر ٹی وی آف کیا اور ریموٹ کنٹرول سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔
امامہ نے کچھ جزبز ہو کر اسے دیکھا۔
"میں شراب نہیں پیتا امامہ! میں یہ پھل چکھ چکا ہوں، اس کا ذائقہ کیسا ہے، اس کا اثر کیا ہے۔ میں دونوں سے واقف ہوں، مجھے شراب میں کوئی غم ڈبونا ہے نہ کسی سرور کی تلاش ہے۔ میرے لیے یہ ان گناہوں میں سے ایک ہے جن کو میں چھوڑ چکا ہوں۔ تم ہر روز اللہ تعالیٰ سے بس یہ دعا کیا کرو کہ وہ مجھے سیدھے راستے سے نہ بھٹکائے۔" وہ اس سے سوال کی توقع کر رہی تھی، جواب کی نہیں۔ وہ جیسے کسی سائیکالوجسٹ کی طرح اس کا ذہن پڑھ رہا تھا۔
"اب تمہیں ٹی وی دیکھنا ہے تو دیکھو، ورنہ آکر سو جاؤ۔ گڈ نائٹ۔"
اس نے ٹی وی آن کرتے ہوئے امامہ کے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول دیا اور بیڈروم میں چلا گیا۔ وہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔
"انسان کو کون سی چیز بدل دیتی ہے؟ وقت؟ حالات؟ زندگی؟ تجربہ؟ تکلیف؟ تلاش؟ محبت؟... یا پھر اللہ؟"
اس نے ٹی وی آف کرتے ہوئے سوچا۔



سالار کے ساتھ اس گفتگو نے اس کے لیے بہت آسانی پیدا کردی تھی۔ دوبارہ ڈنر پر جاتے ہوئے امامہ نے وہاں آنے والے لوگوں کو اس طرح نہیں جانچا تھا جس طرح پچھلی بار جانچا تھا۔ اس بار وہ اسے اتنے برے نہیں لگے تھے جتنے پہلی بار لگے تھے، پہلے کی طرح اسے احساس کمتری کا دورہ پڑا تھا نہ ہی احساس برتری کا اور نہ ہی نیم عریاں لباس میں عورتوں کو دیکھ کر اس نے کسی احساس برتری کی ٹوپی پہنی تھی اور ان تعصبات کے بغیر اس کے لیے وہاں جانا قدرے آسان ہو گیا تھا۔
"تم کسی سے کوئی بات کیوں نہیں کرتیں؟"
وہ شاید چوتھا ڈنر تھا، جب واپسی پر رات کو سونے سے پہلے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد سالار نے اس سے پوچھا۔ وہ ناول پڑھتے ہوئے چونکی تھی۔
"کیسی بات؟"
"کوئی بھی بات...؟" وہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
"جب کوئی مجھ سے کچھ پوچھتا ہے تو میں جواب دیتی ہوں۔"
"لیکن تم بھی تو کسی سے کچھ پوچھا کرو۔" وہ ان پارٹیز میں اس کی مسلسل خاموشی کو نوٹس کر رہا تھا۔
"کیا پوچھا کروں؟"
سالار اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ وہ واقعی سنجیدہ تھی۔
"تم حال چال پوچھو، پھر تم فیملی کے بارے میں پوچھ سکتی ہو، بچوں کے بارے میں بات کر سکتی ہو۔ فار گاڈ سیک امامہ! عورتوں کو تو یہ نہیں بتانا پڑتا کہ انہیں آپس میں کیا باتیں کرنی ہے۔" وہ اسے بتاتے بتاتے کچھ سپٹا سا گیا۔
"اچھا میں کوشش کروں گی۔" اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

"میرا یہی سوشل سرکل ہے' یہی لوگ بار بار ملیں گے تمہیں' ان ہی میں سے تم نے دوست بنانے ہیں۔"
"لیکن میں نے دوست بنا کر کیا کرنا ہے؟" اس نے دوبارہ ناول کھولتے ہوئے کہا۔ سالار نے ہاتھ بڑھا کر ناول اس کے ہاتھ سے لے لیا۔
"کتابیں اچھی ہوتی ہیں' لیکن ایک دنیا ان کے باہر ہے' وہ بھی اچھی ہے۔" وہ سنجیدہ تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔
"لوگوں سے چھپ چھپ کر بھاگ بھاگ کر اب بہت مشکل ہو گیا ہے دوبارہ ان کے ساتھ چلنا۔" وہ خود بھی سمجھ نہیں پائی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔
"اسی لیے چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کے ساتھ انٹرایکٹ کرو۔ اب ضرورت نہیں رہی چھپنے کی' جہاں میں تمہیں لے کر جاتا ہوں' وہاں تم میری فیملی ہو۔ وہاں کوئی تم سے تمہاری فیملی کے بارے میں انویسٹی گیٹ نہیں کرے گا۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔
"اچھا میں کوشش کروں گی۔"
اس نے غیر محسوس انداز میں سالار کے ہاتھ سے کتاب لیتے ہوئے کہا۔
"بھابھی کے ہاں بھی جایا کرو۔" وہ اسے نوشین کے بارے میں کہہ رہا تھا۔
"جاتی ہوں۔" اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔
وہ اسے چپ چاپ کچھ دیر دیکھتا رہا۔
"اب اس طرح مت دیکھو مجھے۔" امامہ نے اس کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے گردن موڑ کر کہا۔ "میں نے کہا ہے نا میں کوشش کروں گی۔"
وہ کچھ کہنے کے بجائے کمبل کھینچتا ہوا چت لیٹ گیا تھا۔ وہ دوبارہ کتاب پڑھنے لگی' لیکن کچھ دیر بعد اسے سالار کی نظریں پھر خود پر محسوس ہوئی تھیں۔
"اب کیا ہے؟" اس نے کچھ جھنجلا کر سالار کو دیکھا تھا۔
"کچھ نہیں۔" امامہ نے اس کی نظروں میں کوئی بے حد عجیب سا تاثر محسوس کیا تھا۔ وہ بہت سنجیدگی سے کچھ سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

عید کے دو ہفتے کے بعد اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں ان کے ولیمے کی تقریب منعقد ہوئی تھی۔ اگر سالار کی ضد نہ ہوتی تو سکندر کبھی اس تقریب کے لیے اسلام آباد کا انتخاب نہ کرتے' لیکن سالار کی ضد کے سامنے سکندر نے بالآخر گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ سکندر کے دوسرے بچوں کے برعکس ولیمہ کی یہ تقریب خاصی سادگی سے ہوئی تھی۔ میوزک کا وہ اہتمام جو سکندر کے گھر کی تقریبات کا حصہ سمجھا جاتا تھا' وہ اس تقریب سے غائب تھا۔ مینو اتنا لیوش نہیں تھا' جتنا پہلے ہوتا تھا' لیکن مہمانوں کی تعداد تقریباً" اتنی ہی تھی' جتنی عام طور پر سکندر کی تقریبات میں ہوا کرتی تھی۔
دو ہزار کے قریب افراد کی موجودگی میں امامہ' اتنا ہی غیر آرام دہ محسوس کر رہی تھی' جتنا اسے کرنا چاہیے تھا۔ مہمانوں کی ایک بڑی تعداد سے وہ پہلے ہی سالار کی عید ملن پارٹیز اور دوسرے ڈنرز میں چند دن پہلے واقف ہو چکی تھی۔ اب تعارف کچھ نئے طریقے سے اور دوبارہ ہو رہا تھا۔ ان کمفرٹیبل ہونے کے باوجود وہ خوش تھی اور

طمانیت کا احساس لیے ہوئے تھی۔ وہ باقاعدہ طور پر سالار کی فیملی کا حصہ بن کر جیسے کسی چھت کے نیچے آ گئی تھی۔
وہ ولیمہ کے بعد دو ہفتے کے لیے بھمباس گئے تھے۔ پاکستان سے باہر سالار کے ساتھ امامہ کا یہ پہلا سفر تھا۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ زندگی میں دوبارہ کبھی ان پندرہ دنوں جیسے پرسکون اور بے فکری کے دن ان کی زندگی میں دوبارہ کبھی نہیں آنے والے تھے۔ وہ زندگی میں اس سے زیادہ خوب صورت جگہوں پر اس سے زیادہ سہولت کے ساتھ جاتے، تب بھی زندگی کے ان دنوں کو واپس نہیں لا سکتے تھے۔ جب ان دونوں کے درمیان رشتہ نیا تھا لیکن تعلق پرانا، جب ایک دوسرے پر اعتماد زیادہ نہیں تھا لیکن توقعات اور امیدیں بہت تھیں اور جب ان دونوں کے درمیان ابھی شکایتوں اور تلخیوں کی دیواریں کھڑی نہیں ہوئی تھیں، زندگی ایک دوسرے سے شروع ہو کر ایک دوسرے پر ہی ختم ہو رہی تھی۔
سالار کا فون انٹرنیشنل رومنگ پر تھا، لیکن دن کا زیادہ وقت وہ آف رہتا تھا۔ بینک اور اس سے متعلقہ کاموں کو پندرہ دنوں کے لیے اس نے اپنی زندگی سے نکال دیا تھا اور ایک سیل کے آف رہنے سے ان کی زندگی میں حیران کن تبدیلی آئی تھی۔ ان کے پاس ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے بہت زیادہ وقت تھا اور اس وقت میں سیل فون مداخلت نہیں کر پا رہا تھا۔
ایک دوسرے سے کہی جانے والی ساری باتیں بے معنی تھیں، ساری باتیں بے مقصد تھیں اور ساری باتیں ”ضروری“ تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنے بچپن، اپنے ماضی کے سارے قصے، ساری خوشگوار یادیں بتاتے رہے تھے جو ایسے ہی ٹرپس اور resorts سے جڑی ہوئی تھیں۔
سمندر کے پانی کے اس جھیل نما حصے پر بنے، بہت سے رانچز میں سے ایک پر بیٹھے شفاف پانی میں نظر آتی مختلف قسم کی آبی مخلوق کو دیکھتے اور ایک دوسرے کو دکھاتے انہیں پتا نہیں کیا کیا یاد آتا رہتا، پھر انہیں ہنسی کے دورے پڑتے۔ بے وجہ ہنسی جس کا تعلق کسی چیز سے نہیں، صرف اس ذہنی کیفیت سے تھا جس میں وہ ان دنوں تھے۔
سالار بھمباس پہلے بھی دوبارہ آ چکا تھا اور اس کے لیے وہ جگہ نئی نہیں تھی۔ وہ اسے ان تمام جگہوں پر جا رہا تھا جو سی فوڈز کے لیے مشہور تھیں اور امامہ کو پہلی بار اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کس حد تک سی فوڈ پسند ہے۔ خود اس نے سالار کے اصرار اور دباؤ کے باوجود مچھلی کے علاوہ کسی دوسری چیز کو چکھنے تک کی ہمت نہیں کی تھی۔
”ہم اپنے گھر میں اس طرح کا ایک رانچ بھی بنوائیں گے۔“
وہ اس صبح پھر لکڑی کے تختے پر آ کر پانی میں ٹانگیں ڈبوئے بیٹھے تھے جب امامہ نے کہا۔
سالار نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ اسے مذاق سمجھا تھا لیکن وہ بے حد سنجیدہ جھکی ہوئی پانی کو مٹھی میں لیے اچھال رہی تھی۔
”کس پر بنائیں گے؟“ سالار نے جیسے اسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی۔
”جھیل پر۔“ وہاں بلا کی سنجیدگی تھی۔
”اور جھیل کہاں سے آئے گی؟“ وہ ہکا بکا تھا۔
”وہ تم بناؤ گے نا۔“ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔
”اور اس جھیل میں پانی کہاں سے آئے گا؟“
امامہ نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔
”نہر کے ذریعے۔“ وہ ہنس پڑا لیکن امامہ نہیں ہنسی۔

"پانی کی نہر نکالنا دودھ کی نہر سے زیادہ مشکل ہے' سویٹ ہارٹ!"
اس نے امامہ کے کندھوں پر بازو پھیلایا۔ امامہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
"تم نہیں بنا کرو گے؟" وہ سوال نہیں تھا' دھمکی تھی۔
"ہم یہاں آجایا کریں گے' بلکہ اگلے سال میں تمہیں ماریشس لے کر جاؤں گا' پھر اس سے اگلے سال مالدیپ۔"
امامہ نے اس کی بات کاٹی۔
"تم نہیں بنا کرو گے جھیل؟"
"امامہ! جھیل کیسے بنا کروں میں تمہیں۔۔۔؟ ہاں' یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی ایسی جگہ پر گھر بنائیں جہاں قدرتی طور پر آس پاس اس طرح پانی ہو۔" سالار نے اسے ٹالنے کی کوشش کی تھی۔
فی الحال وہ اسے صاف لفظوں میں اس رانچ پر بیٹھ کر اپنے ہنی مون ٹرپ کے دوران اور غیر رومانوی باتوں کے درمیان یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ عقل سے پیدل ہے اور جاگتے میں خواب دیکھ رہی ہے اور وہ بھی احمقانہ۔
"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔" اس پر بروقت اثر ہوا تھا اور سالار نے جیسے اطمینان کا سانس لیا۔
"سالار! تم بہت اچھے ہو۔" امامہ نے اب اس کا ہاتھ پیار سے پکڑتے ہوئے کہا۔
"امامہ! یہ بلیک میلنگ ہے۔" سالار نے ہاتھ چھڑائے بغیر گہرا سانس لے کر احتجاج کیا۔ وہ اس کے بھوت کو اس کے گلے کی ہڈی بنا رہی تھی۔
"ہاں' ہے تو۔" اس نے بڑے آرام سے کندھے اچکا کر ہنستے ہوئے کہا۔
وہاں باقی دن امامہ نے اس رانچ کا دوبارہ ذکر نہیں کیا تھا اور سالار نے اس پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ اسے امید تھی وہ اس رانچ کے بارے میں بھول گئی ہوگی لیکن ایسا نہیں تھا۔
واپس آنے کے چوتھے دن بعد اس نے فخریہ انداز میں سالار کو اس گھر کے نئے ڈیزائنز دکھائے تھے۔ وہ جھیل اور رانچ بھی اس کا حصہ بن چکے تھے۔ وہ اب اس پر کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ ہنی مون اسے بہت مہنگا پڑا تھا۔ وہ دنیا کی پہلی بیوی تھی جس نے اپنے ہنی مون ٹرپ پر ایک جھیل اور رانچ کی شاپنگ کی تھی۔ اور وہ دنیا کا پہلا شوہر تھا جس نے اس شاپنگ پر اعتراض نہیں کیا تھا۔
ان کے اپارٹمنٹ کی دیوار پر اب کچھ اور تصویروں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ کچھ اور یادوں اور خوشگوار لمحوں کا۔ ان کے ولیمہ کا فوٹو شوٹ۔ پنچ کلر کے شرارے میں بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس سالار کے ساتھ وہ پہلی بار دلہن کے روپ میں تھی۔۔۔ وہ سالار کی فیورٹ تصویر تھی۔ اور ان کے ہنی مون کی تصویریں جس میں تقریباً "ایک جیسی سفید ٹی شرٹس میں' وہ ایک بیچ پر کھڑے نظر آ رہے تھے۔ ان ساری تصویروں میں صرف ایک چیز کامن تھی' ان کے چہرے اور آنکھوں میں نظر آنے والی خوشی اور چمک' ان کے ہونٹوں پر موجود وہ مسکراہٹ' جو ان تصویروں پر نظر ڈالنے والی کسی بھی پہلی نظر کو ایک لمحہ کے لیے مسکرانے پر مجبور کر دیتی تھی۔

They were made for each other

(وہ ایک دوسرے کے لیے بنے تھے)

کم از کم وہ تصویریں ہر لحاظ سے یہ ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔



زندگی آہستہ آہستہ اپنے معمول پر آرہی تھی۔ سالار واپس آنے کے بعد مصروف ہوگیا۔ وہ بینک سے تقریباً" دس بجے گھر آرہا تھا اور پہلے کی طرح گھر سے کافی کے لیے باہر نکلنے کا سلسلہ کچھ عرصے کے لیے منقطع ہوگیا تھا۔ ان کے درمیان بات چیت صبح ناشتے کی میز پر ہو رہی تھی یا رات کے کھانے کی میز پر۔ سالار کے اصرار کے باوجود وہ کھانے پر اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ اسے کھانے سے زیادہ وہ اس کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے "ان باتوں میں دلچسپی تھی" جو وہ اس کے ساتھ کیا کرتی تھی اور سالار کو بہت جلد اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اس نے بالآخر اسے اکیلے کھانا کھالینے پر مجبور کرنا چھوڑ دیا تھا۔

وہ نوشین کے ساتھ اب وقتاً "فوقتاً" گھر سے نکلنے لگی تھی۔ اس کی زندگی کا دائرہ اب گھر سے باہر تک بڑھنے لگا تھا اور سالار اس چیز کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ وہ واقعی چاہتا تھا کہ وہ اس کی انگلی پکڑ کر چلنا چھوڑ دے اور یہ تب ہی ممکن تھا اگر اسے اس کے علاوہ پکڑنے کے لیے کچھ اور ہاتھ نظر آتے۔



وہ اس دن چینل سرفنگ کر رہی تھی جب اس کی نظریں ایک چینل پر ٹھہر گئیں۔ چند لمحوں کے لیے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ اسٹاک مارکیٹ کے حوالے سے کوئی پروگرام تھا اور اس میں شامل دو شرکا میں سے ایک سالار بھی تھا۔ ایک لمحہ کے لیے امامہ کو یقین نہیں آیا تھا کہ وہ اسکرین پر سالار کو دیکھ رہی ہے۔ لیکن چند لمحوں کے بعد سالار کا نام اور اس کا عہدہ اسکرین پر چند لمحوں کے لیے فلیش ہوا۔

"تو وہ مجھ سے جھوٹ بول رہا تھا۔۔۔؟" امامہ نے اس کا عہدہ دیکھ کر سوچا۔ وہ پی آر سے منسلک نہیں تھا، لیکن اس وقت اسے اسکرین پر دیکھتے ہوئے وہ اتنی ایکسائیٹڈ تھی کہ اس نے سالار کے جھوٹ اور اس کی وجوہات پر غور ہی نہیں کیا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے فنانس سے متعلق کوئی پروگرام اتنے شوق اور لگن سے دیکھا تھا۔ وہ سالار کو اکثر اسی طرح کی گفتگو فون پر کرتے سن چکی تھی اور اس نے کبھی اس پر غور بھی نہیں کیا تھا، لیکن اسکرین پر آدھا گھنٹہ اس پروگرام میں اسے سنتے اور دیکھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ بہت امپریسیو تھا۔ کمپوزڈ۔۔۔ کانفیڈنٹ۔۔۔ بے حد شارپ ایک مکمل پروفیشنل۔۔۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس کی شکل و صورت اور پرسنالٹی پر غور کر رہی تھی اور پہلی بار ہی اسے احساس ہوا کہ اس کی آواز بہت اچھی ہے۔ شادی کے تقریباً" دو مہینے کے بعد پہلی بار ٹی وی پر اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے وہ اس سے بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔

سالار کسی پوسٹ لنچ میٹنگ میں تھا جب امامہ نے اسے فون کیا۔ میٹنگ تقریباً" ختم ہو رہی تھی اس لیے وہ کال لیتے ہوئے بورڈ روم سے نکل گیا۔

"سالار! تم ٹی وی پر آئے ہو؟" امامہ نے چھوٹتے ہی اس سے کہا۔

ایک لمحے کے لیے سالار کچھ نہیں سکا۔

"کیا؟"

"تم ٹی وی چینل پر آئے تھے ایک پروگرام میں اور تم نے مجھے بتایا نہیں؟"

"وہ دو ماہ پہلے ریکارڈ کیا تھا انہوں نے 'ریپیٹ' کیا ہوگا۔" سالار کو یاد آگیا۔

"تم کیا کر رہی ہو؟" اس نے موضوع بدلا، لیکن امامہ کس حد تک اس پروگرام سے متاثر تھی" اس کا اندازہ اسے رات کو گھر آکر ہوا تھا۔

"میں نے اسے ریکارڈ کر لیا ہے۔" وہ کھانا کھا رہے تھے جب امامہ نے اچانک اسے بتایا۔

"کسے؟" وہ چونکا کیونکہ وہ کوئی اور بات کر رہے تھے۔
"تمہارے اس پروگرام کو۔"
"اس میں ریکارڈ کرنے والی کیا بات تھی؟" وہ حیران ہوا۔
"تم ٹی وی پر بہت اچھے لگ رہے تھے۔" امامہ نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔
"اور تم انویسٹمنٹ بینکنگ میں ہو۔ پی آر میں نہیں؟" امامہ نے اسے جتایا۔
وہ مسکرایا لیکن اس نے جواباً اسے کچھ نہیں کہا۔
"تم نے دیکھا ہے اپنا پروگرام؟"
سالار نے کانٹا ہاتھ سے رکھتے ہوئے اس سے کہا۔
"سویٹ ہارٹ! ایسے بہت سارے پروگرامز ہوتے ہیں جن میں ہر روز بہت سارے ایکسپرٹس بلائے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے کہ اسے ریکارڈ کرکے بیوی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھا جائے۔ اس سے پہلے بھی میں ایسے کئی پروگرامز میں آچکا ہوں اور آئندہ بھی کہیں نہ کہیں نظر آتا رہوں گا۔ میرے بینک کی اس سیٹ پر جو بھی بیٹھا ہو گا وہ تمہیں بزنس چینلز یا ایسے پروگرامز میں کہیں نہ کہیں ضرور نظر آئے گا۔ یہ بھی میری جاب کا ایک حصہ ہے۔"
وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر اب دوبارہ کانٹا اٹھا رہا تھا۔ امامہ چند لمحے کچھ نہیں بول سکی۔ اس نے جیسے ٹھنڈے پانی کا بھرا ہوا گلاس اس پر انڈیلا تھا۔ اس نے اسے کچھ ایسے ہی شرمندہ کیا تھا۔
"سالار! سود حرام ہے نا؟"
وہ خود سمجھ نہیں پائی کہ اس نے سالار کی بات کے جواب میں یہ کیوں کہا۔ شاید یہ اس شرمندگی کا رد عمل تھا جو اس نے کچھ دیر پہلے اٹھائی تھی۔
"ہاں۔" وہ کانٹے سے کباب کا ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے صرف ایک لمحہ کے لیے ٹھٹکا تھا۔
"بالکل اسی طرح جس طرح جھوٹ حرام ہے... غصہ حرام ہے... غیبت حرام ہے... بددیانتی حرام ہے... منافقت حرام ہے... تہمت لگانا حرام ہے... ملاوٹ حرام ہے۔" وہ اطمینان سے کہہ رہا تھا۔
"میں ان چیزوں کی بات نہیں کر رہی۔" امامہ نے اس کی بات کاٹی۔ اس نے جواباً امامہ کی بات کاٹی۔
"کیوں... کیا ان ساری چیزوں سے انسان اور معاشرے کو کم نقصان پہنچتا ہے؟"
امامہ کو جواب نہیں سوجھا۔
وہ صرف ٹی وی کے پروگرام میں بیٹھا ایسی گفتگو کرتا امپریسو نہیں لگ رہا تھا، حقیقی زندگی میں اس طرح لاجواب ہونا کچھ زیادہ خوش گوار تجربہ نہیں تھا امامہ کے لیے۔
"تم جسٹی فائی کر رہے ہو سود کو...؟" اس نے بالآخر کہا۔
"نہیں میں جسٹی فائی نہیں کر رہا۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ہم "جز" کو "کل" سے الگ نہیں کر سکتے۔ اسلامی معاشرے کو سود اتنا نقصان نہیں پہنچا رہا جتنا دوسری خرابیاں۔" وہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔
"میں اگر پاکستانی معاشرے میں پائی جانے والی پانچ خرابیاں بتاؤں اور کہوں کہ ان میں سے کوئی ایک ختم کر دو جس سے معاشرہ بہتر ہو جائے۔ کرپشن کو...؟ غربت کو...؟ ناانصافی کو...؟ بددیانتی کو...؟ یا سود کو...؟ میں شرط لگاتا ہوں امامہ کہ یہ پانچواں آپشن کبھی کسی کی پہلی ترجیح نہیں ہو گی۔"
وہ چیلنج کر رہا تھا اور یہ چیلنج جیت بھی سکتا تھا کیونکہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ بھی پہلی چار میں سے ہی کسی ایک

خرابی کو ختم کرنا چاہے گی' امامہ نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔

"اور سود صرف بینکنگ میں تو نہیں ہے۔ کوئی یوٹیلیٹی بل لیٹ ہوتا ہے تو اس پر سرچارج لگ جاتا ہے، اسکول کالج کی فیس لیٹ ہو جاتی ہے تو فائن لگ جاتا ہے۔ یہ بھی تو سود کی قسمیں ہیں۔"

اس کے پاس اس کی توجیہات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"تو تم بینکنگ میں اس لیے ہو کیونکہ تم سود کو دوسری برائیوں جیسی ایک عام برائی سمجھتے ہو؟" امامہ نے بحث سمیٹنے کی کوشش کی۔

"نہیں میں اسے بہت بڑی لعنت سمجھتا ہوں تو پھر میری سوچ سے کیا تبدیلی آ جائے گی؟ یہ سوچ لے کر ہماری دنیا کے مسلمان بینک میں کام کرنا بند کر دیں ...؟ اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لیے راستے کھلے چھوڑ دیں کہ وہ آئیں اور ٹیک اوور کر لیں۔ ہماری اکانومی کو اپنی مٹھی میں لے لیں، جب چاہیں جیسے چاہیں ہمارا گلا دبا دیں۔ یا اور اس کی جس کے پاس کیپٹل ہے۔ یہ جو فنانشل سسٹم پوری دنیا میں چل رہا ہے ویسٹ کا قائم کردہ ہے' دوسرے مذاہب کے لوگوں کا ہے' انھوں نے اسے بنایا' پاپولرائز کیا اور پوری دنیا میں پھیلا دیا۔ ہم کہاں سو رہے تھے اس وقت' ہمیں اتنی ہی کھجلی تھی تو پھر دو تین سو سال پہلے کھاتے۔ سود سے پاک ایک متوازی سسٹم بناتے اور چلاتے اس کو' یہ کرتے ویسٹ کی تقلید یا پھر اب کوشش کریں اس سب کو تبدیل کرنے کی' لیکن اس کے لیے بینکوں میں کام کرنا پڑے گا۔ دنیا میں آج تک جو بھی جنگ جیتی گئی ہے' وہ اس نے جیتی ہے جو میدان میں تلوار لے کر اترا ہے۔

میدان سے باہر کھڑے لوگوں نے بڑی سے بڑی گالیاں بھی دی ہوں تو بھی' جنگ ملامتوں اور مذمتوں سے کبھی نہیں جیتی جاتی تو میں اپنی مہارت سے تلوار کا کام لینا چاہوں گا' میری زبان شاید اتنی موثر نہ ہو۔"

امامہ الجھی نظروں سے اسے دیکھتی رہی' سود کے بارے میں یہ ان کی پہلی بحث تھی۔



رمضان میں اور اس کے فوراً بعد امامہ کو کھانا پکانے کا کوئی خاص اتفاق نہیں ہوا تھا' لیکن اب وہ اس کے لیے باقاعدہ طور پر گھر کا کھانا بنانے لگی تھی۔ وہ سی فوڈ کے علاوہ کسی خاص کھانے کا شوقین نہیں تھا۔ سی فوڈ کو شدید ناپسند کرنے کے باوجود وہ بادل نخواستہ اس کے لیے ہفتے میں ایک' دو بار ڈبوں میں بند سی فوڈ کے بجائے' بازار سے تازہ سی فوڈ لا کر پکانے لگی تھی۔

صرف پہلی بار ان تازہ پرانز' کریبز اور لوبسٹرز کو پکانے کے لیے صاف کرتے ہوئے اسے اتنی شدید کراہت محسوس ہوئی تھی کہ اسے رونا آ گیا تھا۔ اتوار کا دن تھا اور وہ لنچ کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ سٹنگ ایریا میں ٹی وی دیکھتے اور کسی دوست سے فون پر بات کرتے ہوئے سالار کو وہم سا ہوا تھا کہ وہ سنک کے سامنے کھڑی رو رہی ہے اور یہ وہم اس لیے ہوا کیونکہ اس کال کے آنے سے پہلے' وہ دونوں آپس میں بے حد خوشگوار انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ وہاں رونے والی کوئی بات نہیں ہوئی تو پھر؟

ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی آف کرتے اور دوست کو خدا حافظ کہتے ہوئے وہ صوفے سے اٹھ کر کچن میں آ گیا تھا۔ سنک کے سامنے کھڑی وہ صرف رو نہیں رہی تھی بلکہ زار و قطار رو رہی تھی۔ سالار کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

"کیا ہوا؟"

سنک میں رکھے برتن سے لوبسٹرز دھو دھو کر شیلف پر رکھے ایک دوسرے برتن میں رکھتے ہوئے اس نے

سالار کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ نفی میں سر ہلا کر وہ اسی طرح اپنے دونوں کاموں میں مصروف رہی۔ سالار نے ہاتھ بڑھا کر سنک کا نل بند کر دیا۔

"کیوں رو رہی ہو تم؟" وہ واقعی سمجھنے سے قاصر تھا۔ "امامہ..."

"اپنے ماں باپ کے گھر میں نے ان چیزوں کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا جنہیں اب مجھے دھونا پڑ رہا ہے۔" پانی دوبارہ کھولتے ہوئے اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کے گھر میں بھی سی فوڈ اتنے ہی شوق سے کھائے جاتے تھے' لیکن وہ ان سے شدید قسم کی کراہت رکھتی تھی اور ان چیزوں کے پاس بھی نہیں پھٹکتی تھی' نہ ہی کوئی اس سے کہتا تھا۔ معلوم نہیں انسان کو ماں باپ کا گھر کیوں ہر بات پر یاد آتا ہے۔

سالار کو کچھ دیر سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا کہے۔

"میں نے تمہیں کب کہا ہے کہ تم مجھے یہ بنا کر دو۔"

"تم نے خود کہا تھا کہ میں تمہیں سی فوڈ لا کر دوں گا اور تم آج یہ بنانا۔"

سالار نے کچھ خفگی سے پانی بند کیا۔

"چھوڑ دو مت بناؤ۔" اس نے سختی سے کہتے ہوئے وہ برتن سنک سے اٹھا کر شلف پر رکھ دیا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ میں سوچ رہی تھی جب شوہر کو بنا کر کھلا سکتی ہوں تو ماں باپ کو بھی بنا کر کھلا دیتی۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

کیا رنج تھا کیا پچھتاوا تھا؟ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

اس کے منع کرنے کے باوجود اس نے اس دن سی فوڈ ہی تیار کیا تھا۔ لیکن اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر سالار کو اس قدر احساس جرم ہوا تھا کہ وہ ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھا سکا۔

"میں آہستہ آہستہ یہ سی فوڈ کھانا چھوڑ دوں گا' تمہیں دوبارہ یہ گھر پر نہیں بنانا پڑے گا۔"

اس نے کھانے کے دوران اسی احساس جرم کے ساتھ کہا تھا۔

"نہیں تمہیں پسند ہے تو کیوں چھوڑو گے؟ پتا نہیں مجھے ایسے ہی خیال آ گیا تو... آہستہ آہستہ میری ناپسندیدگی کم ہو جائے گی۔" وہ اب اس ساری صورت حال پر کچھ شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

"نہیں..."

امامہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "رہنے دو بس... اگر کچھ چھوڑنا ہے تو یہ جو تم انرجی ڈرنکس وغیرہ پیتے رہتے ہو انہیں چھوڑ دو۔ میں تمہیں کچھ فریش جوسز وغیرہ بنا دیا کروں گی۔"

وہ ہنس پڑا تھا۔ وہ ان ڈرنکس کا واقعی بہت زیادہ عادی تھا اور اس کی بنیادی وجہ اس کا لائف اسٹائل اور پروفیشن تھا۔ ان انرجی ڈرنکس کے سہارے وہ ساری ساری رات بے حد آرام سے کام کرتا رہتا تھا اور فی الحال اس عادت نے اس کی صحت پر کسی قسم کے مضر اثرات نہیں ڈالے تھے۔ سی فوڈ کی نسبت انہیں چھوڑنا زیادہ مشکل تھا۔

اسے کھانے میں کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی' نہ کبھی اس کی یہ خواہش رہی تھی کہ کوئی اس کے لیے کھانے کے لوازمات کا اہتمام کرے یا اسے پیش کرتا پھرے' لیکن اسے اندازہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا کہ کتنے غیر محسوس انداز میں وہ امامہ کے ہاتھ کے کھانے کا عادی ہونے لگا تھا۔ امامہ اس کے رات کو بہت دیر سے گھر آنے پر بھی اسے تازہ چپاتی بنا کر دینے کی عادی ہو گئی تھی' اور سالار نے زندگی میں کبھی کہیں ایسی چپاتی نہیں کھائی تھی۔ کسی کے گھر پر بھی نہیں' نرم' خوشبودار' ذائقہ دار اور تازہ۔ کسی بھی ڈنر ٹیبل پر ——— چپاتی کا پہلا لقمہ منہ

میں ڈالتے ہی اسے امامہ یاد آتی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چپاتی، کسی سالن، چٹنی یا سلاد کے بغیر بھی بڑی خوشی کے ساتھ کھا سکتا تھا۔

وہ ناشتے میں دو سلائس ایک انڈا کھا کر اور چائے کافی کے ایک کپ کے ساتھ بھاگ جانے والا آدمی تھا اور اب زندگی میں پہلی دفعہ ناشتے کا کوئی "مینیو" ہونے لگا تھا۔ انڈا تلے ہوئے یا ابلے ہوئے کے بجائے مختلف قسم کے آملیٹ کی شکل میں ملنے لگا تھا۔ بعض دفعہ پراٹھا ہوتا۔ ڈبے کے جوس کی جگہ تازہ جوس کے گلاس نے لے لی تھی۔ لنچ کے لیے گھر کے بنے ہوئے سینڈوچز اور سلاد ہوتے۔ وہ آفس میں سب کی طرح ایک فاسٹ فوڈ سے آنے والے لنچ پیک کا عادی تھا اور وہ اس کے ساتھ "کمفرٹیبل" تھا۔

شروع شروع میں وہ امامہ کے اصرار پر کچھ بے دلی سے اس لنچ پیک کو گھر سے لاتا تھا جو امامہ اس کے لیے تیار کرتی تھی، مگر آہستہ آہستہ اس کی ناخوشی ختم ہونے لگی تھی۔ وہ "گھر کا کھانا" تھا، بے حد "ویلیو ایبل" تھا۔ کیونکہ اسے بنانے کے لیے صبح سویرے اٹھ کر اس کی بیوی اپنا کچھ وقت صرف کرتی تھی۔ "بھوک" وہ بازار سے خریدے گئے چند لقموں سے بھی مٹا لیتا، لیکن وہ لقمے اس کے دل میں گھر میں بیٹھی ایک عورت کے لیے شکر کا احساس پیدا نہ کرتے، جسے وہ ہر روز اس وقت محسوس کرتا، جب بینک کے کچن سے کوئی اس کے لنچ کو گرم کر کے اس کے ٹیبل پر لا کر رکھتا تھا۔

وہ پانی کے اس گلاس کا بھی اسی طرح عادی ہونے لگا تھا، جو وہ ہر روز اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی اسے لا کر دیتی تھی۔ کافی یا چائے کے اس کپ کا بھی، جو وہ دونوں رات کے کھانے کے بعد ٹیرس پر بیٹھ کر پیتے تھے اور گرم دودھ کے اس گلاس کا بھی، جو وہ رات کو سونے سے پہلے اسے دیا کرتی تھی اور جسے وہ شروع میں ناگواری سے گھورا کرتا تھا۔

"میں دودھ نہیں پیتا۔" جب اس نے پہلی بار گرم دودھ کا گلاس اسے دیا تو اس نے بے حد شائستگی سے بتایا تھا۔

"کیوں؟" جواباً اس نے اتنی حیرت کا اظہار کیا تھا کہ وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا تھا۔

"مجھے پسند نہیں ہے۔"

"مجھے تو بڑا پسند ہے، تمہیں کیوں نہیں پسند؟"

"مجھے اس کا ذائقہ اچھا نہیں لگتا۔" وہ ایک لمحہ کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔

"تو میں اس میں اوولٹین ڈال دوں۔" سالار نے اس کے جواب کو مکمل ہونے سے پہلے ہی گلاس اٹھا کر پی لیا تھا۔ وہ زہر پی سکتا تھا، لیکن اوولٹین نہیں اور یہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دودھ پیتی ہے، اس لیے اسے بھی دودھ پینا تھا۔ دودھ کے فوائد سے بہر حال اسے دلچسپی نہیں تھی۔

اس کے اپنے گھر میں مردوں کا جس طرح خیال رکھا جاتا تھا، وہ بھی اس کا اسی طرح خیال رکھ رہی تھی۔ یہ "عادتاً" تھا، "خصوصاً" نہیں اور اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ "خیال" کہیں "رجسٹر" ہو رہا تھا۔ ہر عورت کی طرح وہ بھی یہ سمجھتی تھی کہ اس کے ان تمام کاموں کو حق سمجھ کر لیا جا رہا ہے، کیونکہ ہر مرد کی طرح سالار بھی تعریف نہیں کر پا رہا تھا، ہر مرد کی طرح اس کے لیے بھی آئی لو یو کہنا آسان تھا بجائے یہ کہنے کے کہ جو تم میرے لیے کرتی ہو اس کی مجھے بہت قدر ہے اور ہر مرد کی طرح وہ بھی اس احساس تشکر کو تحائف اور پیسے سے ریلیز کر رہا تھا۔



امامہ کے لیے زندگی بدل گئی تھی... بدل گئی تھی یا بہت عرصے کے بعد پھر شروع ہوئی تھی؟ مارکیٹوں میں سالار یا نوشین کے ساتھ پھرتے' چیزوں کو دیکھتے' وہ عجیب سے احساسات کا شکار ہوتی رہتی۔ یہ احساس کہ وہ جن چیزوں کو دیکھ رہی ہے' وہ انہیں اب خریدنے کے قابل ہے اور یہ احساس کہ اب ایک ایسی جگہ ہے جہاں وہ ان چیزوں کو اپنے لیے رکھ سکتی تھی۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کا گھر نہیں تھا' ہاسٹل نہیں تھا' نہ ہی سعیدہ اماں کا گھر تھا' یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ تشکر' خوشی' آسودگی اور پھر بے یقینی اور حیرانی۔ نو سال کی مشقت کے بعد جو ملا تھا' وہ اس کی اوقات سے بہت زیادہ تھا اور یہ سب ہر کسی کو کہاں ملتا تھا۔ نو سال بے نام' بے خاندان رہنے کے بعد اب جب کہ وہ ایک خاندان کا حصہ بنی تھی تو حیرانی کیسے نہ ہوتی... ؟ خواری اور بے سرو سامانی کا سفر جہاں جا کر ختم ہوا تھا' وہ نعمتوں کی معراج تھی۔ اپنے گھر سے نکلنے کے بعد اس نے اتنے عرصے میں صرف ایک چیز سیکھی تھی۔ اپنے نفس پر قابو پانا' اپنی خواہشات اور ضروریات کو کم سے کم کرنا' قناعت کرنا اور یہ بڑا مشکل تھا۔ وہ آسائشوں سے نکل کر آئی تھی۔ ریت کا ذرہ اسے تھور کے کانٹے کی طرح چبھتا تھا۔ پیسوں کو گن کر خرچ کرنا اور پھر بچانے کی کوشش کرنا' وہ کہاں عادی تھی ان چیزوں کی۔ لیکن وقت اور حالات نے اسے عادی بنا دیا تھا اور اب جب اتنے سالوں کے بعد اسے آسائش ملی تو یہ ناممکن تھا کہ اسے بات بات پر وہ نو سال یاد نہ آتے۔ وہ ضرورت پڑنے پر سالار کی دراز میں پڑے پیسوں کو نکالتے ہوئے ٹھٹک جایا کرتی تھی' جن کو کمانے میں اس کی محنت شامل تھی نہ ہی ان کی بچت میں اس کا کوئی حصہ تھا۔ اسے صحیح اندازہ نہیں تھا کہ دراز میں کتنی رقم موجود ہے' کیونکہ وہ انہیں کبھی گن نہیں پائی تھی۔ وہ ہر روز اس دراز میں کچھ رقم کا اضافہ کرنے کا عادی تھا۔ اگر وہ اس دراز کو پورے کا پورا بھی خالی کر دیتی تب بھی اگلے دن وہ خالی نہیں ہوتا تھا۔ اس روپے کو خرچ کرنا اس کا ''استحقاق'' تھا اور اس رقم کے خرچ ہونے پر سالار نے کبھی اس سے سوال نہیں کیا تھا۔ وہ اس گھر کے سیاہ و سفید کی مالک تھی۔

وہ چیزوں کو پرائس ٹیگ دیکھ کر خریدا کرتی تھی' ''اپنی خواہش دیکھ کر نہیں' اور اب یک دم پرائس ٹیگ دیکھ کر خریداری کرنا اس کے لائف اسٹائل کا حصہ نہیں رہا تھا۔ سالار زندگی میں خود بھی کبھی بارگیننگ یا سستی چیزوں کے استعمال کا عادی نہیں رہا تھا اور وہ اتنا ہی فیاض اس کے معاملے میں بھی تھا۔ ناممکن تھا کہ اسے جو چیز اچھی لگتی وہ اسے نہ ملتی اور یہ صرف بازار میں نظر آنے والی چیزوں تک ہی محدود نہیں تھا' بلکہ اسے کسی میگزین یا ٹی وی پر بھی کوئی چیز اچھی لگ جاتی اور وہ سالار سے اس کا ذکر کرتی تو وہ چیز اگلے چند دنوں میں اس کے گھر پر ہوتی تھی اور وہ کس قیمت پر آئی تھی' سالار کو پروا نہیں ہوتی تھی۔ وہ رات کے تین بجے بھی اگر کسی چیز کے کھانے کی فرمائش کرتی تو وہ اسے لے جایا کرتا تھا۔

''میرا دل چاہ رہا ہے۔''

وہ اب اس جملے کو بولنے کی عادی ہو رہی تھی' کیونکہ کوئی تھا جو آدھی رات کو بھی آئس کریم کے دو اسکوپس' چاٹ کی ایک پلیٹ' پزا کے ایک سلائس' کافی کے ایک کپ' ہاٹ اینڈ ساور کی خواہش ہونے پر اسے ملامت یا صبر کی تلقین کرنے کے بجائے' اسے ساتھ لیے مطلوبہ چیز کی تلاش میں' ایک بھی شکایتی لفظ کے بغیر خالی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا پھرتا تھا۔

شادی کے اس مختصر عرصے میں بھی لاہور کی کوئی ایسی جگہ نہیں تھی' جہاں کھانے کی کسی مشہور چیز کا اس نے سنا ہو اور سالار اسے وہاں نہ لے گیا ہو۔ گوالمنڈی میں فجر کے بعد حلوہ پوری کے سستے ناشتے سے لے کر پی سی کے چوبیس گھنٹے کھلے رہنے والے کیفے میں رات کے پچھلے پہر کھائے جانے والے لیمن ٹارٹس تک جن کو کھاتے ہوئے دیر ہو جانے پر' اس نے دبئی کی وہ فلائٹ بھی مس کر دی تھی جو ایک گھنٹہ بعد تھی۔

یہ ناممکن تھا کہ ایسا شخص کسی کی دعاؤں کا حصہ نہ بنے۔ اسے بھی نماز کے بعد دعا کرتے ہوئے سالار کو یاد

نہیں کرنا پڑا تھا' وہ اسے ہمیشہ خود بخود یاد آجاتا تھا۔ اس سے نکاح ہو جانے کے بعد پہلی نماز پڑھنے پر بھی' جب وہ ناخوش تھی اور اس سے رشتہ ختم کرنا چاہتی تھی اور ڈاکٹر سبط علی کے گھر پر اسے دیکھنے اور سننے کے بعد بھی' جب اس نے پہلی بار "اپنے شوہر" کے لیے اجر کی دعا کی تھی اور رخصتی کے بعد اس گھر میں پہلی نماز کے دوران بھی' جب اس نے سالار کے لیے اپنے دل میں محبت پیدا ہونے کی دعا کی تھی' وہ اسے یاد آتا تھا یا د رہتا تھا۔
دن کی کوئی نماز ایسی نہیں ہوتی تھی جب وہ سالار کے لیے اللہ سے نعمتوں اور اجر کی طالب نہیں ہوتی تھی' تب بھی جب وہ اس سے شاکی یا خفا ہوتی تھی۔ وہ اللہ کے بعد اس دنیا میں واقعی اس کا "آخری سہارا" تھا اور "سہارے" کا "مطلب" اور "اہمیت" کوئی امامہ سے پوچھتا۔



"آر یو شیور۔ تم اکیلے رہ لوگی؟" سالار اب بھی جیسے یقین دہانی چاہتا تھا۔
وہ دو ہفتوں کے لیے نیویارک اپنے بینک کی کسی ورکشاپ کے سلسلے میں جا رہا تھا اور امامہ اس بار اپارٹمنٹ میں ہی رہنا چاہتی تھی۔ عام طور پر سالار کراچی یا کہیں اور جاتے ہوئے اسے سعیدہ اماں یا ڈاکٹر سبط علی کے ہاں چھوڑ جایا کرتا تھا' لیکن اس بار وہ بضد تھی کہ وہ وہیں رہے گی۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ وہاں اکیلی رہ سکتی ہے۔
"میں رہ لوں گی۔ ویسے بھی فرقان بھائی اور بھابھی تو پاس ہی ہیں۔ کچھ نہیں ہوتا۔" اس نے سالار کو تسلی دی۔ اس کی فلائٹ صبح گیارہ بجے تھی اور وہ اس وقت پیکنگ سے فارغ ہوا تھا۔
"میرے بغیر رہ لوگی تم؟" اس نے امامہ کی بات سننے کے بعد کہا۔ وہ اب اپنے بریف کیس میں کچھ پیپرز رکھ رہا تھا۔
"ہاں۔ دو ہی ہفتوں کی تو بات ہے۔" امامہ نے بے حد اطمینان سے اسے کہا۔
"دو ہفتوں میں پندرہ دن ہوتے ہیں۔" سالار نے بریف کیس بند کرتے ہوئے کہا۔
"تو کوئی بات نہیں گزر جائیں گے۔"
سالار نے گہرا سانس لیا۔ "ہاں تمہارے تو گزر جائیں گے' میرے نہیں گزریں گے۔ میں تو ابھی سے تمہیں مس کرنے لگا ہوں یار۔" وہ ہنس پڑی۔
"پہلے بھی تو جاتے ہو تم۔ دو ہفتے پہلے دبئی گئے تھے۔ پھر پچھلے مہینے سنگاپور۔" اس نے تسلی دینے والے انداز میں اسے یاد دلایا۔
"دو دن کے لیے دبئی گیا تھا اور چار دن کے لیے سنگاپور۔ یہ تو دو ہفتے ہیں۔"
"ہاں تو دو ہفتے ہی ہیں ناں دو مہینے یا دو سال تو نہیں ہیں۔" اس نے کمال اطمینان کے ساتھ کہا۔
سالار اسے دیکھ کر رہ گیا۔
"چلو اچھا ہے یہ بھی۔ نہ میں یاد آؤں گا نہ نظر آؤں گا۔ نہ میرا کوئی کام ہو گا' وقت ہی وقت ہو گا تمہارے پاس۔" وہ نجانے اس سے کیا سننا چاہتا تھا۔
"ہاں کافی وقت ہو گا' میں ایک دو پینٹنگز مکمل کروں گی۔ گھر کے کچھ اور کام ہیں' وہ بھی کروں گی۔ سعیدہ اماں کے بھی ایک دو کام ہیں' وہ بھی نمٹاؤں گی۔ میں نے بہت کچھ پلان کیا ہوا ہے۔"
اس نے ناول پکڑے اپنی جماہی روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ ہنس پڑا تھا۔
"تمہارے لیے تو blessing in disguise ہو گیا ہے میرا ٹرپ' میں نے تو سوچا ہی نہیں تھا' میری وجہ سے تمہارے اتنے کام پینڈنگ ہو رہے ہیں۔"

اگر اس کے لہجے میں گلہ تھا تو امامہ نے نوٹس نہیں کیا۔
"چلو یہ بھی اچھا ہے۔" وہ بڑبڑایا تھا۔
"ورنہ اگر لگا ہوتا تو میں تمہیں لے جاتا۔" اسے پھر کچھ خیال آیا تھا۔
"تم پریشان مت ہو میں یہاں پر بالکل ٹھیک رہوں گی۔" امامہ نے فوراً سے پیشتر کہا۔
سالار جواب دینے کے بجائے چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔
"کیا دیکھ رہے ہو؟" امامہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔
"تمہارا اطمینان۔"
"میں فلمی ہیروئنز کی طرح ڈائیلاگ نہیں بول سکتی۔"
"صرف فلمی ہیروئنز ہی ڈائیلاگ بولتی ہیں؟"
"نہیں ہیرو بھی بولتے ہیں۔" وہ اطمینان سے ہنسی۔ سالار مسکرایا نہیں تھا۔ وہ پھر سنجیدہ ہوگئی۔
"مت جاؤ پھر۔ اگر اتنا مس کرو گے، ہو تو۔" اس نے جیسے اسے چیلنج کیا۔
"بیچارے کہتیں تو نہ جاتا لیکن میں تمہارا کوئی چیلنج قبول نہیں کروں گا۔ مجھے تم سے ہارنا پسند ہے۔" وہ ہنسی۔
"تم بات بدل رہے ہو؟"
"نہیں خود کو تسلی دے رہا ہوں۔ چلو آؤ! تمہیں کافی پلوا کر لاؤں۔"
وہ یک دم بستر سے اٹھتے ہوئے بولا۔
"اس وقت۔" رات کو اس وقت امامہ تیار نہیں تھی۔
"ہاں۔ اتنے دن تک تو نہیں پلوا سکوں گا کافی۔" وہ دراز سے والٹ اور کار کی چابیاں نکال رہا تھا۔
"لیکن اب میں پھر کپڑے بدلوں۔۔۔؟"
"مت بدلو چادر لے لو۔ یہی ٹھیک ہے۔"
سالار نے اس کی بات کاٹی۔ وہ اب سیل فون اٹھا رہا تھا۔
فورٹریس سے کافی پینے کے بعد وہ اسٹیڈیم کے گرد بے مقصد ڈرائیو کرتا رہا۔
"اب گھر چلیں تمہیں آرام کرنا چاہیے۔" امامہ کو اچانک خیال آیا۔
"میں پلین میں آرام کروں گا۔"
امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اتنا سنجیدہ اور کسی گہری سوچ میں کیوں ڈوبا ہوا تھا۔ واپس آتے ہوئے اس نے راستے میں ایک دکان سے بہت سا پھل خریدا۔
"تم یہاں نہیں ہو گے تو اتنا پھل خریدنے کی کیا ضرورت ہے؟" امامہ حیران ہوئی تھی۔
"تمہارے لیے خریدا ہے شاید پھل کھاتے ہوئے ہی میں تمہیں یاد آجاؤں۔" اس نے مسکرا کر کہا تھا۔
"یہ پھل کھانے کے لیے شرط ہے۔" وہ بے اختیار ہنسی۔
"نہیں امید۔" امامہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔
واقعی اس کی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ ہفتے کا ٹرپ اتنا لمبا تو نہیں تھا کہ اس پر کسی قسم کی اداسی کا اظہار کیا جائے۔ کم از کم سالار سے وہ اس طرح کی جذباتیت کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسے واقعی سالار کے جانے کے بعد پہلے دو دن کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ وہ معمول کے کام کرتی رہی۔ اس نے



نامکمل تصویروں پر کام شروع کیا اور ساتھ ہی ایک نیا ناول بھی شروع کر دیا۔
سالار کی عدم موجودگی میں رات کا کھانا وہ فرقان کے ہاں کھایا کرتی تھی۔ دو دن تک تو وہ اطمینان سے ان کے ہاں کھانا کھانے اور کچھ دیر گپ شپ کرنے کے بعد گھر واپس آجاتی' پھر کوئی ناول نکال لیتی اور سونے تک پڑھتی رہتی' لیکن مسئلہ تیسری رات کو ہوا تھا۔ اس دن سالار نے اسے دن بھر کال نہیں کی تھی' اور اتنے مہینوں میں وہ پہلا دن تھا' جب ان کے درمیان کسی قسم کا رابطہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی طرف سے نہ میسج' نہ کال' اور نہ ہی کوئی ای میل آئی تھی۔ وہ پچھلی رات سے بہت مصروف تھا۔ اس نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ شاید اگلے چند دن وہ اس سے بات نہ کر سکے۔ نیویارک پہنچنے کے بعد سالار سے اس کی صرف پانچ منٹ کے لیے بات ہوئی تھی' لیکن پچھلے دو دن وہ وقفے وقفے سے مختصر ہی سہی' اس کو ای میلز بھیجتا رہا تھا اور اب وہ بھی یک دم آنا بند ہو گئی تھیں۔
وہ اس رات فرقان کے ہاں کھانے پر نہیں گئی' اس کی بھوک غائب ہو گئی تھی۔ اس نے اس دن کمپیوٹر مسلسل آن رکھا ہوا تھا' اس آس میں کہ شاید وہ اسے ای میل کرے' حالانکہ وہ ورکشاپ کے دوران اسے ای میل نہیں کرتا تھا۔
رات کو اس نے کافی کے لیے کریم نکالنے کے لیے فریج کھولا تو اسے کیک کا وہ ٹکڑا دکھا' جو دو دن پہلے وہ ایئرپورٹ جانے سے پہلے کھاتے کھاتے چھوڑ گیا تھا اور امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے کیک کا وہ بچا ہوا ٹکڑا فریج میں کیوں رکھ چھوڑا تھا۔ نہ صرف وہ ٹکڑا' بلکہ وہ کین بھی جس میں بچا ہوا جوس تھا۔ کچھ دیر وہ ان دونوں چیزوں کو دیکھتی رہی' پھر اس نے فریج بند کر دیا۔
کافی بنا کر وہ ٹیرس پر نکل آئی تھی' جہاں وہ ویک اینڈز پر اکثر بیٹھا کرتے تھے۔
منڈیر سے نیچے جھانکتے ہوئے اس نے سرخ اینٹوں کی اس منڈیر پر دو مگز کے نشان دیکھے تھے' ایک ذرا گہرا' دوسرا بہت ہلکا۔ وہ رات کو اکثر یہاں کھڑے' نیچے دیکھتے ہوئے کئی بار یہیں پر اپنے مگز رکھ دیا کرتے تھے۔ نیچے بلڈنگ کے لان میں کچھ بچے اور لوگ چہل قدمی کر رہے تھے۔
"تمہیں بچے اچھے لگتے ہیں؟" اس نے ایک دن وہاں کھڑے نیچے کھیلتے اور شور مچاتے ہوئے بچوں کو دیکھتے ہوئے سالار سے پوچھا تھا۔
"ہاں۔ لیکن اس طرح کے نہیں۔" اس نے جواباً چائے پیتے ہوئے اپنے کندھے اچکا کر مگ سے ان بچوں کی طرف اشارہ کیا۔
وہ ہنس پڑی۔ اس کا اشارہ شور کی طرف تھا۔
"مجھے تو ہر طرح کے بچے اچھے لگتے ہیں۔ شور کرنے والے بھی۔" اس نے نیچے جھانکتے ہوئے کہا تھا۔
Good for you but
I can't stand them
سالار نے لاپروائی سے کہا۔
"دوسروں کے بچے ہیں' اس لیے شور کرتے ہوئے برے لگتے ہیں۔ اپنے بچوں کا شور کبھی برا نہیں لگے گا تمہیں۔" اس نے روانی سے کہا۔
"بچے؟ ایک بچہ کافی ہے۔" وہ چائے پیتے پیتے اٹکا۔
امامہ نے کچھ چونک کر نیچے جھانکتے ہوئے اسے دیکھا۔
"ایک کیوں؟"
"تو کتنے ہونے چاہئیں؟" وہ سنجیدہ ہوا۔ اس نے ایک لمحہ کے لیے سوچا۔

"کم سے کم چار۔"

"اور زیادہ سے زیادہ بارہ۔" سالار نے ہنستے ہوئے اس کے جملے میں اضافہ کیا تھا۔ وہ اسے مذاق سمجھا تھا۔

"میں سیریس ہوں۔" اس کی ہنسی رکنے پر اس نے کہا۔

"چار بچے... تم حواسوں میں ہو۔" سالار نے مگ منڈیر پر رکھ دیا۔

"کون پالے گا انہیں؟" اسے بے اختیار تشویش ہوئی۔

"تم اور میں۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"میں ایک بچہ پال سکتا ہوں' چار نہیں۔"

سالار نے دونوں ہاتھ اٹھا کر جیسے اسے حتمی انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے تم ایک پال لینا' تین میں پال لوں گی۔" وہ اطمینان سے کہہ کر دوبارہ نیچے جھانکنے لگی۔

"امامہ! میں سنجیدہ ہوں۔"

"اور میں بھی۔"

"ہم چار بچے افورڈ نہیں کر سکتے۔" اسے لگا کہ اسے امامہ کو منطقی انداز میں سمجھانا چاہیے۔

"میں تو کر سکتی ہوں۔ میرے پاس وہ پیسے ہیں جو۔۔۔"

"وہ میں نے اس لیے نہیں دیے کہ تم انہیں بچوں کی فوج پر انویسٹ کرو۔" سالار نے جھنجلا کر اس کی بات کاٹی۔

امامہ کو برا لگا۔ وہ کچھ کہنے کے بجائے بے حد خفگی کے عالم میں پھر نیچے دیکھنے لگی تھی۔

"سوئٹ ہارٹ! ہم کو۔۔۔" سالار نے اس کے کندھے کے گرد بازو پھیلا کر اسے منانے کی کوشش کی تھی۔

"ہاتھ ہٹاؤ۔" امامہ نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" وہ جھنجلایا۔ "تم چاہتی ہو میں گھر' آفس' اسکول' ڈاکٹرز اور مارکیٹوں کے چکر لگاتے لگاتے بوڑھا ہو جاؤں۔"

"تو تم کیا کرتے ہوئے بوڑھا ہونا چاہتے ہو؟" تڑ سے جواب آیا تھا' وہ لاجواب ہو گیا۔ وہ خفگی بھری سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ رات کے وقت اپنے بچوں کو گھر میں کیوں نہیں رکھتے' دوسروں کو دکھانے کے لیے باہر کیوں لے آتے ہیں۔" وہ اس کے سوال کا جواب دیے بغیر منڈیر سے اپنا مگ اٹھا کر کچھ جھنجلاہٹ کے عالم میں اندر چلا گیا تھا۔ امامہ کو بے اختیار ہنسی آئی تھی۔

وہ اب بھی ہنس پڑی تھی۔ منڈیر کے اس نشان کو دیکھتے ہوئے نجانے کیا کیا یاد آیا تھا۔ نیچے لان میں پھر وہی شور برپا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیوار کے ساتھ لگے اس رگ کو دیکھا جس پر وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کبھی کبھار بیٹھ کر گٹار بجایا کرتا تھا۔ اسے اس کے گٹار میں دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس سے باتیں کرنے کے لیے اس کے پاس بیٹھا کرتی تھی۔ گٹار بجاتے ہوئے وہ خود نہیں بولتا تھا' صرف اس کی باتیں سنتا رہتا اور وہ میکانکی انداز میں وقفے وقفے سے اس کے منہ میں کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز ڈالا کرتی تھی۔ وہ اسے دیکھتا رہتا اور گٹار پر باری باری اپنی پسند کی کوئی ٹیون بجاتا رہتا یا اپنے۔ انسٹرومنٹس کو نکال کر ان کی صفائی کرتا رہتا۔ یہ ویک اینڈ پر اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

اسے احساس نہیں ہوا کہ کافی کا مگ ہاتھ میں لیے اس رگ کو دیکھتے اس کی کافی کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ وہ اسی طرح بھرا ہوا مگ لے کر واپس اندر آ گئی۔

بعض دفعہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کسی کو کیوں یاد کرتے ہیں۔ یاد کرتے ہیں تو کوئی یاد آتا ہے۔ یا یاد آتا ہے' تو یاد کرتے ہیں... ؟دل یہ معمہ کہاں حل کرپاتا ہے۔



فجر کے بعد وہ مسلسل کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی تھی۔ کال نہیں تو کوئی ای میل سہی۔ اس نے وقفے وقفے سے اسے چار پانچ ای میلز کی تھیں پھر وہ مایوس ہو گئی۔ جواب نہ آنے کا مطلب تھا کہ وہ ای میلز چیک نہیں کر رہا تھا۔

اگلے دن اداسی کا دورہ پہلے سے بھی شدید تھا۔ اس دن وہ پینٹنگ کر سکی نہ کوئی کتاب پڑھ سکی اور اس نے کھانا بھی نہیں پکایا۔ فریج میں پچھلے چند دنوں کا پڑا ہوا کھانا کھالیا۔ شام تک وہ اگلے دن سعیدہ اماں کے ہاں جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کا خیال تھا یہ تنہائی تھی جو اسے مضمحل کر رہی ہے۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ نو سال تنہا ہی رہی تھی۔ اس سے زیادہ تنہا' اس سے زیادہ برے حالات میں۔

اس دن اسے سالار کی تین لائنوں کی ایک ای میل ملی تھی اور ان تین لائنوں کو اس نے رات تک کم از کم تین سو بار پڑھا تھا۔

"Hi Sweet heart! How are you?This work shop has really nailed me down' How is your painting going?Love you."

"ہائی سویٹ ہارٹ!
کیا حال ہے؟ اس ورک شاپ نے تو جیسے مجھے جکڑ لیا ہے۔ تمہاری پینٹنگ کیسی چل رہی ہیں گوہو۔"

ان تین جملوں کی ایک میل کے جواب میں اس نے اسے ایک لمبی ای میل کی تھی جس میں اسے اپنی ہر ایکٹویٹی بتائی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا' دوسرے کے بعد تیسرا جھوٹ۔ وہ اس سے یہ کیسے کہہ دیتی کہ وہ اداس ہے پھر وجہ پوچھتا تو اسے وہ اپنی اداسی کی کیا وجہ بتاتی...؟



"بیٹا! چہرہ کیوں اترا ہوا ہے تمہارا؟ کوئی پریشانی ہے... ؟ جھگڑا کر کے تو نہیں گیا سالار تمہارے ساتھ؟" سعیدہ اماں نے اس کے چہرے پر پہلی نظر ڈالتے ہی تھے سوالوں سے اسے بوکھلا دیا تھا۔ وہ بری طرح متفکر ہوئی تھیں۔
"نہیں' نہیں کچھ بھی نہیں ہوا۔ بس ایسے ہی گھر میں اکیلی تھی شاید اس لیے۔"
اس نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں بہلایا لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئیں۔
امامہ نے کپڑوں کا بیگ کمرے میں رکھنے کے فوراً بعد ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو دیکھا' پانچ دنوں میں پہلی بار' اس نے اپنے عکس پر غور کیا تھا۔ وہ واقعی بہت پریشان لگ رہی تھی۔ سعیدہ اماں اگر پریشان ہوئی تھیں تو کوئی حیرانی کی بات نہیں تھی کوئی بھی اس کا چہرہ آسانی سے پڑھ سکتا تھا۔
اگلے دس منٹ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ اپنے چہرے کے اعصاب اور تاثرات کو ریلیکس کرنے کی پریکٹس کرتی رہی۔ مسکرا کر گہرے سانس لے کر' چہرے کے تاثرات کو نرم رکھ کر' پھر جیسے زچ ہو کر اس نے شکست مان لی۔
"جہنم میں جائے اب لگتی ہوں پریشان تو میں کیا کروں... ؟ کتنا مسکراؤں میں... ؟"
پھر وہ باہر نکل آئی۔ سو وہاں بھی مشکل تھا اور اداسی یہاں بھی ویسی ہی تھی۔

''اتنی چپ تم پہلے تو کبھی نہیں رہیں بیٹا! اب کیا ہو گیا ہے تمہیں۔۔۔؟'' اگلی شام تک سعیدہ اماں حقیقتاً فکر مند ہو چکی تھیں، حالانکہ اس دن صبح سالار سے اس کی بات بھی ہوئی تھی۔

''تم سالار کے ساتھ خوش تو ہو نا؟'' وہ تشویش سے پوچھ رہی تھیں اور وہ ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اداسی بری طرح بڑھی تھی۔ مسئلہ خوشی کا نہیں تھا۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ خوش ہے یا نہیں۔ بات صرف اس کے ساتھ رہنے کی تھی۔ خوش یا اداس جیسے بھی لیکن اس کے ساتھ ہی۔

اس نے سعیدہ اماں کو جواب دینے کے بجائے موضوع بدل دیا تھا۔ دو دن وہاں رہ کر وہ پھر اسی بے چینی کے عالم میں واپس آ گئی تھی۔

''لیکن تم نے تو کہا تھا کہ تم میرے آنے تک وہیں رہو گی؟'' سالار اس کی واپسی پر حیران ہوا تھا۔

''میری مرضی۔'' وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن معلوم نہیں اس نے یہ کیوں کہا۔

''اوکے۔۔۔'' وہ جواب پر حیران ہوا تھا، لیکن اس نے کوئی مزید سوال نہیں کیا۔

''مجھے نیویارک سے ورکشاپ کے ختم ہونے کے بعد وہیں سے دو ہفتے کے لیے کینیڈا جانا ہے۔''

سالار نے اسے اگلی خبر سنائی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

''کیا مطلب؟''

''جو کولیگ مانٹریال والی کانفرنس اٹینڈ کر رہا تھا، اسے کوئی میڈیکل ایمرجنسی ہو گئی ہے۔ فوری طور پر مجھے کانفرنس میں جانے کے لیے کہا گیا ہے۔ کیونکہ میرے پاس ویزا بھی ہے اور میں قریب بھی ہوں۔''

وہ صدمے سے بول ہی نہیں سکی۔ دو ہفتے اور باہر ٹھہرنے کا مطلب تھا کہ وہ عید کے ایک ہفتے کے بعد واپس پاکستان آتا۔

''ہیلو!'' سالار نے اس کی لمبی خاموشی پر لائن پر اس کی موجودگی چیک کی۔

''یعنی عید کے بعد آؤ گے تم؟''

اس نے اپنے لہجے کی مایوسی پر قابو کرتے ہوئے سالار کو یاد دلانے کی کوشش کی کہ عید قریب ہے۔

''ہاں۔'' یک حرفی جواب آیا۔ یقیناً اسے یاد تھا۔

''اور میں عید پر کیا کروں گی؟''

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرے۔ مایوسی کی انتہا تھی جس کا وہ اس وقت شکار ہو رہی تھی۔ ایک ہفتہ کا انتظار تین ہفتوں میں تبدیل ہو گیا تھا اور تین ہفتوں کے لیے اس اپارٹمنٹ میں اکیلے رہنا۔۔۔

اسے سالار پر غصہ آنے لگا تھا۔

''تم اسلام آباد چلی جانا عید پر۔'' سالار نے کہا۔

''نہیں میں یہیں رہوں گی۔'' اس نے بلاوجہ ضد کی۔

''ٹھیک ہے یہیں رہ لینا۔'' سالار نے بآسانی گھٹنے ٹیک دیے۔

''تمہیں کیوں بھیج رہے ہیں۔۔۔؟ بھیجنا تھا تو پہلے کہنا چاہیے تھا نہیں۔''

اسے اب بینک والوں پر غصہ آ رہا تھا۔

''ایمرجنسی ہو جاتی ہے کبھی کبھار، وہ کسی اور کو اتنے شارٹ نوٹس پر پاکستان سے نہیں بھیج سکتے، ورنہ مجھے کہاں بھیجنا تھا انہوں نے۔'' سالار نے وضاحت کی۔

''پھر بھی۔۔۔ تم کہہ دیتے کہ تم مصروف ہو، تمہیں ان دنوں پاکستان میں کچھ کام ہے۔'' وہ ہنس پڑا۔

''لیکن مجھے تو کوئی کام نہیں ہے۔ میں جھوٹ بولتا۔۔۔؟''

امامہ کو غصہ آگیا۔ "زندگی میں بھی جھوٹ نہیں بولا کیا؟"

"نیور! اپنے کام میں؟ ضرورت ہی نہیں پڑی۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ امامہ کچھ بول نہیں سکی۔

"تم ایسا کرو ڈاکٹر صاحب کے گھر چلی جاؤ۔ اتنے دن اکیلے رہو گی تو بور ہو جاؤ گی۔"

اس نے اسے مشورہ دیا۔

"نہیں میں بور نہیں ہوں گی۔ مجھے یہاں بڑے کام ہیں۔" وہ اس کے مشورے پر کچھ چڑ سی گئی۔

سالار کو اس کی ٹون نے حیران کیا تھا۔ وہ اس طرح کبھی بات نہیں کرتی تھی اور ابھی کچھ دیر پہلے تک تو وہ بے حد خوشگوار اور پرجوش انداز میں اس سے باتیں کر رہی تھی پھر یک دم اسے کیا ہوا تھا۔ کم از کم وہ یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ اس کے کینیڈا میں مزید رکنے کی وجہ سے وہ اپ سیٹ ہو رہی ہے۔ وہ امامہ سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن فوری طور پر اس نے موضوع کو بدلنا بہتر سمجھا۔

اپ سیٹ شاید ایک بہت چھوٹا لفظ تھا اس کیفیت کے لیے جو وہ اس وقت محسوس کر رہی تھی۔ وہ بے حد غم اور غصے میں تھی۔ اسے یہ "ایکسٹینشن" ڈھونگ لگ رہا تھا۔ آخر وہ اسے چار ہفتے کا کہہ کر تو باہر نہیں گیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اگر چار ہفتے کا بھی کہہ کر جاتا تو اسے کیا اعتراض ہوتا تھا اس نے تب بھی اسے اسی طرح خوشی خوشی روانہ کر دینا تھا یہ اندازہ لگائے بغیر کہ وہ بعد میں ان تیس دنوں کے ایک ایک گھنٹے کو گنے گی۔

"میں بھی اب اسے ای میل نہیں کروں گی' نہ ہی کال کروں گی' نہ ہی اس سے پوچھوں گی کہ اسے کب آنا ہے اور کب نہیں۔ آنا ہے تو آئے' نہیں تو نہ آئے۔ جہنم میں جائے' میرا ہی قصور ہے' بار بار اس سے نہ پوچھتی تو وہ اس طرح نہ کرتا۔"

اس رات بستر میں لیٹے ہوئے وہ بے حد رنجیدگی کے عالم میں ان تمام چیزوں کی فہرست بناتی رہی جن میں اب اسے سالار کی نافرمانی کرنی تھی۔ بستر پر لیٹے چھت کو گھورتے ہوئے اس کی فہرست ابھی دو سو پچپن اینٹریز تک پہنچی تھی کہ اسے بیڈ کے بالکل اوپر چھت پر چھپکلی نظر آئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اکیلا گھر اور چھپکلی' یہ فی الحال اس کے لیے بدترین تھا۔ وہ چھپکلی کو دیکھتے ہی بیڈ سے اٹھ کر صوفے پر چلی گئی اور اسے پھر سالار پر غصہ آنے لگا تھا۔

ایک چھوٹی سی چھپکلی دو ہفتے پہلے اپارٹمنٹ میں نمودار ہوئی تھی اور وہ بھی سیدھا ان کے بیڈ روم میں۔ شاید کسی دن ٹیرس کا دروازہ کھلا رہنے کی وجہ سے اندر آگئی تھی۔

وہ اس وقت بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کیے رات کو ناول پڑھ رہی تھی' جو بے حد دلچسپ موڑ پر تھا' جب بستر میں نیم دراز اپنی ٹانگیں سکیڑے ہوئے' اس کی نظریں اچانک چھت پر اپنے بیڈ کے بالکل اوپر موجود چھپکلی پر پڑی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے اسے یہ وہم لگا۔ اس نے کمرے کی لائٹ آن کر کے دیکھا' وہ چھپکلی ہی تھی۔ سالار برابر والے بستر میں گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ عام حالات میں بھی اسے نہ جگاتی' لیکن یہ عام حالات نہیں تھے۔ اس نے اوندھے لیٹے ہوئے سالار کا کندھا جھنجوڑا۔

"سالار... سالار۔" وہ اس کی آواز پر نیند میں ہڑبڑا گیا۔

"کیا ہوا...؟"

"وہ اوپر دیکھو' میرے بیڈ کے اوپر چھت پر چھپکلی ہے۔"

امامہ نے حواس باختہ ہو کر اسے کہا۔ سالار نے مندی ہوئی آنکھوں کو ملتے' لیٹے لیٹے ایک نظر چھت کو دیکھا' پھر امامہ کو اور دوبارہ اوندھے منہ لیٹ گیا۔

"سالار!" امامہ نے دوبارہ اس کا کندھا ہلایا۔

اس کا خیال تھا شاید وہ نیند میں اس چھپکلی کو دیکھ نہیں پایا۔

"دیکھ لی ہے میں نے امامہ۔۔۔ سونے دو۔" وہ لیٹے لیٹے بڑبڑایا۔

"دیکھ لی ہے تو کچھ کرو اس کا۔" وہ اس کی بے توجہی پر ناراض ہوئی۔

"چلی جائے گی خود ہی۔۔۔ تم لائٹ آف کر کے سو جاؤ۔" وہ پھر بڑبڑایا۔

"میں کیسے سوؤں۔۔۔؟ وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔" اس کی خفگی بڑھی۔

"لائٹ بند کر دو نہ تم اسے دیکھو نہ وہ تمہیں دیکھے۔"

اسے اس کے مشورے سے زیادہ اس کی بے حسی پر غصہ آیا۔

"تم میرے لیے ایک چھپکلی نہیں مار سکتے؟"

"میں رات کے اڑھائی بجے چھپکلی نہیں مار سکتا۔۔۔ جسٹ اگنور اٹ۔"

"میں نہیں اگنور کر سکتی اسے۔ یہ اگر گرے تو سیدھا میری ٹانگوں پر گرے گی۔"

اس نے چھت کو دیکھتے ہوئے بے بسی سے کہا۔ وہ واقعی اس کی ٹانگوں پر ہی گرتی۔

"یار میں تمہاری سائیڈ پر آجاتا ہوں، تم میری سائیڈ پر آجاؤ۔"

وہ کروٹ لیتے کہتا ہوا اسی طرح اس کی سائیڈ پر چلا گیا۔ وہ اس کے ایثار سے زیادہ اس کی دلیری سے متاثر ہوئی

تھی۔ کمرے کی بڑی لائٹ دوبارہ بند کرتے ہوئے وہ اپنا ناول لیے سالار کا بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کر کے اس کے بستر میں بیٹھ گئی۔ سالار تب تک اسی طرح اوندھے منہ لیٹے لیٹے اس کا سائیڈ لیمپ آف کر چکا تھا۔ خود کو قدرے محفوظ پاتے ہوئے کچھ پرسکون انداز میں اس نے ناول کے چند جملے پڑھے پھر دوبارہ چھپکلی کو دیکھا۔ وہ پہلے اسی جگہ پر چپک کر رہ گئی تھی۔ امامہ نے سالار کو دیکھا۔ وہ اس چھپکلی کے عین نیچے بے حد اطمینان سے اسی طرح کمبل اوڑھے اوندھے منہ لیٹا تھا۔

"سالار تم مرد کتنے بہادر ہوتے ہو۔" اس نے مردوں کو سراہنا ضروری سمجھا۔

"اور سمجھدار بھی۔" اسے جواباً بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

"سمجھدار کیسے؟" وہ صفحہ پلٹتے پلٹتے چونکی۔

"چھپکلی گرتی تمہارے بیڈ پر، لیکن بھاگتی میرے بیڈ کی طرف۔ اس کا منہ میرے بیڈ کی طرف ہے۔" جمائی لیتے اسی طرح آنکھیں بند کیے سالار نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔

امامہ نے سر اٹھا کر چھت کو دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہ بیڈ سے باہر تھی۔ چھپکلی کا رخ واقعی سالار کے بیڈ کی طرف تھا۔

"تم سارے مرد بے حد خود غرض ہوتے ہو اور ایک جیسے ہوتے ہو۔"

وہ بیڈ روم سے باہر نکلتے ہوئے جھنجلا کر بلند آواز میں یہ کہہ سکتی تھی، اس نے کہا۔

سالار نے بالآخر آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اسے تنگ کر رہا تھا لیکن اب اسے اندازہ ہوا تھا کہ تنگ کرنے کے لیے یہ موقع شاید غلط ہے۔

دس منٹ کے بعد اسے چھپکلی کا صفایا کرنے کی اطلاع دے کر وہ اسے منا کر لاؤنج سے واپس لے گیا تھا۔ اس نے اگلے کئی دن یہ چھپکلی نہیں دیکھی تھی اور آج یہ چھپکلی پھر آگئی تھی۔ یقیناً اس نے جھوٹ بولا تھا، اس نے اس چھپکلی کو نہیں مارا تھا۔ وہ احمقانہ بات اس وقت اس کے لیے ایک اور پوائنٹ ہو گیا تھا۔

اگلے دن فون پر اس نے سالار کو اس چھپکلی کے دوبارہ نمودار ہونے کے بارے میں بتایا۔

"تم نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ تم نے اسے مار دیا تھا۔" اس نے چھوٹتے ہی سالار سے کہا۔

"میں نے اسے واقعی مار دیا تھا، یہ کوئی اور چھپکلی ہو گی۔" سالار نے لاپروائی سے کہا۔

"نہیں' یہ وہی چھپکلی تھی تم نے اگر اسے مارا ہوتا تو تم مجھے دکھاتے۔" وہ اپنی بات پر مصر تھی۔
سالار کا سر گھوم کر رہ گیا۔ وہ امامہ سے اس سے زیادہ احمقانہ گفتگو کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔
"تم اگر کہتیں تو میں تمہیں وہ مری ہوئی چھپکلی بھی دکھا دیتا۔" اس نے تحمل کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی۔
"نہیں یہ وہی تھی میں اسے پہچانتی ہوں۔"
"اگر یہ وہی تھی تو اتنے دن سے کہاں تھی...؟"
اس نے ایک ال لوجیکل چیز پر لاجک دینے کی کوشش کی۔
"جہاں بھی تھی مجھے نہیں پتا' لیکن تم یہی چاہتے تھے کہ میں پریشان ہوں۔"
سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا' وہ اس الزام کے جواب میں کیا کہتا۔ امامہ کو کچھ ہوا تھا' لیکن کیا ہوا تھا' یہ اسے سمجھ میں نہیں آیا۔
"تمہیں پتا ہے مجھے چھپکلی سے ڈر لگتا ہے' لیکن تم پھر بھی اسے یہاں چھوڑ کر گئے' کیونکہ تمہیں احساس نہیں ہے میرا' تم مجھے پریشان دیکھ کر خوش ہوتے ہو' تمہارے لیے ہر چیز مذاق ہے۔" اس کی کسی بات کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ کم از کم سالار نہیں ڈھونڈ سکا لیکن وہ اس کی "گفتگو" سنتا رہا۔
"تم ہمیشہ میرے ساتھ اس طرح کرتے ہو اور مجھے پتا ہے تم نے ہمیشہ اسی طرح کرنا ہے۔ کیونکہ تمہارے لیے صرف تمہاری اپنی اہمیت ہے اور میں تمہارے گھر کی نوکرانی ہوں یا ہاؤس کیپر۔ تم جہاں مرضی پھرو' لیکن میں ہمیشہ گھر پر رہوں' جیسے غلام رہتے ہیں۔ میں سارا دن کام کروں اور تم میرے لیے ایک چھپکلی نہیں مار سکتے۔" وہ اس بے ربط گفتگو کے اختتام پر ہچکیوں سے رو رہی تھی۔
ساری گفتگو میں ایشو کیا تھا' چھپکلی کا نہ مارا جانا' اس کی خود غرضی' اس کا گھر پر نہ ہونا یا گھر کے وہ کام جو اسے کرنے پڑ رہے تھے۔ وہ سمجھ نہیں سکا۔ وہ اے سے زیڈ تک جانے والی گفتگو نہیں تھی۔ X سے ½ تک جانے والی گفتگو تھی جس کو سمجھنے کے لیے جس فارمولے کی ضرورت تھی وہ فی الحال سالار کو نہیں آتا تھا۔
اگلے پانچ منٹ' وہ بے حد تحمل سے اس کی ہچکیوں کے تھمنے کا انتظار کرتا رہا اور پھر جب بالآخر طوفان کچھ تھما تو اس نے کہا۔
"آئی ایم سوری' میرا قصور ہے۔ میں فرقان سے کہتا ہوں' ملازم کو بھیجے' وہ چھپکلی کو مار دے گا۔" فی الحال معذرت کے علاوہ اسے اس صورت حال سے نمٹنے کا کوئی اور راستہ نظر نہیں آیا۔
"نہیں اب میں چھپکلی کے ساتھ رہوں گی تاکہ تمہیں پتا چلے۔" اس نے ناک رگڑتے ہوئے اسے کہا۔
سالار کو بے اختیار ہنسی آئی اور اس نے کھانس کر اس ہنسی پر قابو پایا۔ وہ جلتی پر تیل نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ امامہ کا مسئلہ کیا تھا' وہ اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا' لیکن وہ حیران تھا اگر یہ موڈ سوئنگز تھے تو یہ بدترین قسم کے تھے اور اگر یہ tantrums تھے تو سمجھ میں نہ آنے والے' لیکن پاکستان سے اتنی دور بیٹھے وہ سوچنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔
فرقان کے ملازم نے آکر اس دن وہ چھپکلی مار دی تھی' لیکن اس چیز نے بھی امامہ کے دل میں کسی ممنونیت کو پیدا نہیں کیا تھا۔
اگلے دن کھانا پکاتے ہوئے اس کے ہاتھ پر چھری سے کٹ لگ گیا۔ سنک میں پانی کے نیچے انگلی رکھے اسے پھر وہ یاد آنے لگا۔
"یہ کیا ہوا ہے؟"
وہ اس دن آفس سے آنے کے بعد لاؤنج میں ٹہلتے ہوئے' فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ امامہ ڈنر کے لیے

برتن لگا رہی تھی۔ وہ بات کرتے ٹہلتے ہوئے، کچن کاؤنٹر پر پڑے پیالے سے کچھ چنز کھا رہا تھا جب امامہ نے آ کر وہاں رکھے چاول اٹھائے۔ سالار نے اس کے ہاتھ کی پشت پر چند آبلے دیکھے۔ فون پر بات سنتے سنتے اس نے بے اختیار اس سے کہا "یہ کیا ہوا؟"

"یہ۔۔؟" امامہ نے چونک کر اس کی نظروں کے تعاقب میں اپنا ہاتھ دیکھا۔

"وہ کچھ نہیں کھانا بنا رہی تھی تو آئل کے کچھ چھینٹے گر گئے۔" اس نے لاپروائی سے بتایا۔

وہ اسی طرح فون پر بات سنتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھنے لگا۔ پھر اس کا ہاتھ چھوڑ کر وہ اسی طرح فون پر بات کرتے لاؤنج سے غائب ہو گیا۔ وہ فریج سے پانی نکال رہی تھی، جب وہ دوبارہ نمودار ہوا۔ اسی طرح فون پر اسٹاک مارکیٹ کے کسی ایشو پر بات کرتے ہوئے اس نے امامہ کا ہاتھ پکڑ کر چند لمحوں میں اس پر مرہم لگایا اور پھر اسی طرح دوبارہ چلا گیا۔ وہ ہل نہیں سکی تھی۔ اتنے سالوں میں اس کے کسی زخم پر رکھا جانے والا وہ پہلا مرہم تھا۔ وہ اتنے سالوں میں شاید بے حس ہو گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی تکلیفوں اور چوٹوں پر رونا اور ان کی پروا کرنا اس نے چھوڑ دیا تھا۔ اسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ کسی زخم کو مندمل کرنے کے لیے بھی کچھ کیا جاتا تھا۔ مرہم دوسرے رکھتے ہیں اور اس کی زندگی میں کوئی دوسرا رہا ہی نہیں تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے سالار کی نظر ایک بار پھر اس کے ہاتھ پر پڑی تھی اور اس نے قدرے خفگی کے عالم میں اس سے کہا۔

"اگر اسی وقت ہاتھ پر کچھ لگا لیتیں تو یہ آبلے نہ پڑتے۔"

"مجھے اس سے تکلیف نہیں ہوئی۔"

"مگر مجھے تکلیف ہو رہی ہے سویٹ ہارٹ!"

وہ اس سے نظریں ملا کر جواب نہیں دے سکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اسے تکلیف ہو رہی ہوگی اور اس مرہم سے زیادہ ٹھنڈک اس کے اس جملے نے پہنچائی تھی اسے "تو اب کوئی تھا" جسے اس کے ہاتھ پر آنے والے ایک معمولی زخم پر بھی تکلیف ہوتی تھی۔

اس کے ہاتھ پر چھوٹے موٹے زخموں کے کئی نشان تھے۔ وہ ان میں سے ان زخموں کو بڑی آسانی سے پہچان سکتی تھی جو اس گھر میں آنے کے بعد لگے تھے۔ ان زخموں میں اسے تکلیف ہوئی تھی اور یہ تکلیف اس لیے ہوئی تھی کیونکہ ہر بار کسی نے بڑے پیار سے ان پر کچھ لگایا تھا یا لگانے کو کہا تھا۔

جیل، مرہم، پلاسٹر، اسپرٹ، اینٹی سیپٹک کریم۔ وہ درد کے احساس سے جیسے دوبارہ آشنا ہو رہی تھی اور اب اتنے مہینوں کے بعد یہ پہلا کٹ تھا جس کے بارے میں اس سے پوچھنے والا کوئی نہیں تھا اور اسے وہ "پوچھنے والا" ایک بار پھر بری طرح یاد آیا تھا۔

دوسرے ہفتے کے اختتام تک وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی بری طرح جھنجلانے لگی تھی۔ ملازمہ کے ساتھ، مالی کے ساتھ، اس گھر میں آنے والے فرقان کے بچوں کے ساتھ اور خود سالار کے ساتھ۔

"امامہ! کیا ہو رہا ہے تمہیں ۔۔۔؟ سب ٹھیک ہے نا؟" سالار کو بالآخر اس سے بہت ڈائریکٹ ہو کر پوچھنا پڑا تھا۔

"کیا ہونا ہے مجھے؟" وہ اس کے سوال پر بری طرح چڑی۔

"وہی تو پوچھ رہا ہوں میں۔" اس نے تحمل سے کہا۔

"کچھ نہیں ہو رہا مجھے۔۔۔"

"پھر تم۔" وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ یہ کہنا ذرا مشکل تھا کہ وہ اس کے ساتھ تلخ ہو رہی تھی۔

"پھر میں کیا ۔۔۔؟" امامہ نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔
"کچھ نہیں میں ابھی دو تین دن تک تم کو فون نہیں کر سکوں گا۔"
"کیوں؟" وہ بری طرح بگڑی۔ "اتنا بھی کیا کام ہے کہ تم مجھے چند منٹ کے لیے بھی کال نہیں کر سکتے۔"
"میں تمہیں ای میل کر دیا کروں گا' اگر وقت ملا تو کال بھی کر لوں گا۔۔۔ لیکن شاید نہ کر سکوں۔" وہ تحمل سے اسے سمجھا رہا تھا۔
"تم ای میل بھی نہ کرو مجھے' اس سے اور بھی وقت بچے گا تمہارا۔"
اس نے بے حد خفگی کے عالم میں فون بند کر دیا۔ اسے سالار پر بری طرح غصہ آ رہا تھا۔ چند منٹوں کے بعد دوبارہ کال آنے لگی تھی۔ وہ کال ریسیو نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اسے ریسیو کرنا پڑی۔
"تم نے فون بند کیا تھا؟" وہ دوسری طرف حیرانی سے اس سے پوچھ رہا تھا۔
"ہاں۔"
"کیوں؟"
"تاکہ تمہارا وقت ضائع نہ ہو۔ میں نے کل ایک میگزین میں پڑھا تھا کہ جن مردوں کو احساس کمتری ہوتا ہے وہ اپنی بیویوں کو اپنی جھوٹی مصروفیات کے قصے سناتے رہتے ہیں۔" سالار نے کچھ ہکا بکا ہو کر اس کا جملہ سنا تھا۔ اسے اس بات کا کوئی سر پیر سمجھ میں نہیں آیا۔ "تاکہ ان کی بیویوں کو یہ امپریشن ملے کہ وہ بہت اہم ہیں اور دنیا ان کے بغیر نہیں چل سکتی۔" سالار نے اسی الجھن میں اس کے باقی جملے بھی سنے تھے۔ "اس سے ان کی self esteem بڑھتی ہے۔"
اس نے آخری جملہ کہہ کر کچھ دیر سالار کے رد عمل کا انتظار کیا۔ وہ خاموش تھا۔
"ہیلو۔" امامہ کو خدشہ ہوا کہ شاید کال ڈراپ ہو گئی ہے۔
"میں سن رہا ہوں' اس میگزین میں بس اتنا ہی لکھا تھا؟"
وہ سنجیدہ لگ رہا تھا لیکن بات سنجیدہ نہیں تھی۔
"ہاں۔"
"کل ڈینٹسٹ کے پاس گئی تھیں تم؟" اس نے کسی رد عمل کا اظہار کیے بغیر بات بدل دی تھی۔
امامہ کی جھنجلاہٹ میں اضافہ ہوا۔ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی' وہ اس سے بحث کرنا چاہتی تھی۔
گھنٹے کے بعد اس نے ان دو ہفتوں پر پروگرام چارٹ اسے ای میل کر دیا۔ کانفرنس کی آرگنائزنگ باڈی کی طرف سے شرکا کو بھیجے ہوئے اس ڈاکومنٹ کو پڑھنے میں اسے کم سے کم پندرہ منٹ لگے۔ اس کے پندرہ دن کا شیڈول واقعی بہت hectic تھا۔ یہ ای میل اسے اس کے کس جملے کی وجہ سے کی گئی تھی' وہ اندازہ کر سکتی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے جوابی ای میل میں اس شیڈول کے بارے میں ایک لفظ کہا' نہ ہی اپنی شرمندگی کا اظہار کیا۔
"تم نے فرقان کے گھر ڈنر پر جانا کیوں چھوڑ دیا؟" سالار نے اس دن اس سے پوچھا۔
"میری مرضی۔"
وہ کہنا چاہتی تھی کہ ڈنر ٹیبل پر فرقان کو یا اس کی بیٹی کو دیکھتے ہوئے اسے وہ یاد آتا تھا اور وہ ہر روز ڈنر کے بعد کچھ زیادہ اپ سیٹ ہو رہی تھی' اس لیے اس نے وہاں جانا چھوڑ دیا تھا لیکن وہ یہ سب نہیں کہہ سکتی تھی۔
"میں جانتا ہوں تم بہت بہادر ہو' اکیلے رہ سکتی ہو' ڈنر کرنا بھی تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پھر بھی ان کے گھر چلی جاتیں تو کوئی ایکٹویٹی ہوتی تمہارے پاس ان بے کار ناولز کو پڑھنے کے علاوہ۔"

"تمہیں کیا پروا ہے؟" اس نے سالار کے جملے پر جز بز ہو کر کہا تھا۔
"مجھے تمہاری پروا ہے۔ یہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر بیٹھنا چھوڑ دو۔" وہ سنجیدہ تھا۔
"تم نے مجھے نصیحتیں کرنے کے لیے فون کیا ہے؟" وہ جھنجلائی۔
"ہاں۔"
"تو کرتے رہو۔"
"تم پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔ یہی کہنا چاہتی ہو تم؟"
"تم باہر جا کر مجھ سے مس بی ہیو کرنے لگے ہو۔"
"کیا؟" سالار کو لگا اسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔
"میں بار بار نہیں دہرا سکتی اپنی بات۔" اس نے سرد مہری سے کہا۔
"میں مس بی ہیو کر رہا ہوں تمہارے ساتھ؟" اس نے بے یقینی سے اس سے پوچھا۔
"ہاں۔" جواب بالکل دو ٹوک تھا۔ سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔
"میں اگر تمہیں کوئی عقل کی بات سمجھاتا ہوں تو میں مس بی ہیو کرتا ہوں تمہارے ساتھ؟"

"اب تم کہنا چاہ رہے ہو کہ میں بے وقوف ہوں؟" سالار کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔
"میں نے کب کہا تم بے وقوف ہو؟"
"اب تم مجھ کو جھوٹا کہہ رہے ہو؟" وہ بے بسی سے ہنس پڑا۔
"کیا ہوا ہے تمہیں امامہ؟"
"اب تم کہہ دو میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"
"پانی پیو۔"
"کیوں پیوں؟"
"اچھا مت پیو۔ موسم کیسا ہے باہر کا؟"
وہ اب موضوع بدلنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ امامہ کے رد عمل پر بری طرح حیران تھا۔
"امامہ! کوئی پریشانی ہے تمہیں؟" وہ اگلے دن نوشین کے ساتھ اس کے کہنے پر فوڈ سٹریٹ گئی تھی جب ساتھ چلتے چلتے نوشین نے اچانک اس سے پوچھا۔ وہ بری طرح چونکی، پھر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔
"نہیں۔ نہیں تو۔ کیوں؟"
"پھر اس طرح گم صم کیوں ہو؟" نوشین کے لہجے میں تشویش تھی۔
"نہیں میں۔ میں کچھ سوچ رہی تھی۔"
"سالار کے ساتھ تو بات ہوئی ہے تمہاری۔ کوئی جھگڑا تو نہیں ہے؟"
"نہیں تو۔ روز بات ہوتی ہے۔" اس نے بے اختیار مسکرانے کی کوشش کے ساتھ ہی ڈسپلے پر لگے ایک سوٹ کی طرف نوشین کو متوجہ کیا۔ وہ اسے یہ کیسے بتاتی کہ یہاں اس کے ساتھ پھرتے ہوئے اسے سالار بری طرح یاد آ رہا ہے۔ وہ ہفتے میں دو یا تین بار اس کے ساتھ وہاں آ کر کافی یا چائے پیتے ہوئے اسی طرح ونڈو شاپنگ کرتے تھے جس طرح اب وہاں سے گزرتے ہوئے کچھ دوسرے جوڑے کر رہے تھے۔ وہ اسے کیسے نہ یاد آتا؟



"میگزین میں آج تم نے کچھ نہیں پڑھا ان مردوں کے بارے میں جو احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہیں اور اپنی بیویوں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟" سالار نے اگلے دن فون پر اس سے بات کرتے ہوئے اسے چھیڑا۔ امامہ کا موڈ بری طرح آف ہوا۔

"تم کیا کہنا چاہ رہے ہو کہ ایسے مرد نہیں ہوتے اور میں نے فضول بات کی ہے۔"

"میں مذاق کر رہا تھا امامہ۔" وہ کچھ محتاط ہوا۔

"ایک سنجیدہ بات کو مذاق میں لے رہے ہو تم۔"

"کون سی سنجیدہ بات۔۔۔؟ امامہ! تم آج کل کون سے میگزین پڑھ رہی ہو؟" وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

"تمہیں اس سے کیا؟" وہ مزید بگڑی۔

"اگر تم مجھے اس طرح کے اسٹوپڈ ایکسرپٹس سناؤ گی تو میں پوچھوں گا تو سہی نا؟"

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ بحث کرنے لگا تھا۔ اب تقریباً ہر روز ہی کچھ ہو رہا تھا۔ پچھلے چار دن سے فون کال کے اختتام پر اسے معذرت کر کے فون بند کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ بھی صرف اس لیے تھا کیونکہ وہ یہاں اپنی عدم موجودگی میں اس سے کوئی جھگڑا کر کے فون بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خود اس کے لیے بہت مشکل کا باعث ہوتا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ امامہ کو کیا ہوا ہے۔ وہ ناراض پہلے بھی ہوتی تھی مگر اس طرح کی باتوں پر کبھی نہیں ہوتی تھی۔



سالار اگر اس کے بنتے بگڑتے موڈ کو نہیں سمجھ پا رہا تھا تو وہ خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ وہ سارا دن اس کے بارے میں سوچ سوچ کر اداس ہوتی رہتی اور اس سے بات کرتے ہوئے وہ بلاوجہ اس سے جھگڑتی۔ اسے اس پر شدید غصہ آتا تھا اور کیوں آتا تھا، یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

وہ کئی سالوں بعد اتنے لمبے ڈپریشن کا شکار ہوئی تھی اور زندگی میں پہلی بار تین ہفتوں میں وہ ایک ناول بھی مکمل نہیں کر پائی تھی، پینٹنگ تو خیر دور کی بات تھی۔

وہ سارا دن ٹی وی آن کیے اس کی کال کے انتظار میں بیٹھی رہتی یا پھر کمپیوٹر آن کیے پرانی ای میلز پڑھتے ہوئے کسی نئی ای میل کے لیے بیٹھی رہتی۔ چند لائنز کی وہ ای میلز جن میں وہ اس کا حال پوچھتا تھا اور اپنی ایکٹوٹی بتاتے ہوئے اس سے پوچھتا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ وہ ان ای میلز کو درجنوں بار پڑھتی۔ ایک لمبا چوڑا جواب لکھ کر اس کی ای میل کے انتظار میں ساری ساری رات اس کی چیزیں نکال کر صاف کر کے ری ارینج کرتی رہتی یا پھر اس کی کولیکشن میں موجود چارلیز تھیرون کی موویز دیکھتی رہتی۔ یہ واقعی بے بسی کی حد تھی کہ اسے وہ ایکٹریس بھی اب بری لگنا بند ہو گئی تھی جس کو وہ پہلے سالار کے سامنے دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔

ہر روز کھانے کی ٹیبل پر وہ اس کے برتن بھی لگا دیتی، یہ جیسے کھانے کی ٹیبل پر اپنی تنہائی دور کرنے کی کوشش تھی۔

رات کو سونے کے لیے اپنے بستر میں لیٹے، وہ لائٹ آف کرنے کے بعد بھی کروٹ لیے، کتنی کتنی دیر اس کے بستر اور سرہانے کو دیکھتی رہتی۔ وہ سونے سے پہلے لائٹ آف کرنے کے بعد بھی اس سے کچھ دیر باتیں کیا کرتا تھا اور اب یہ خاموشی اس کے اعصاب کو بری طرح مضمحل کر رہی تھی۔

عید کے لیے اسلام آباد جانے تک گھر کی اس خاموشی اور تنہائی نے اسے مکمل طور پر حواس باختہ کر دیا تھا۔

اسلام آباد سے آنے کے بعد بھی اس نے خود کو بہتر محسوس نہیں کیا تھا۔ سالار کی پوری فیملی میں سے صرف عمار اور یسریٰ عید منانے کے لیے وہاں موجود تھے' باقی افراد بیرون ملک تھے۔ پچھلی عید جیسی رونق اس بار وہاں نہیں تھی۔

سالار نے طیبہ کو اس کی عید کی شاپنگ کروانے کے لیے کہا تھا۔ وہ بڑے بجھے دل کے ساتھ ان کے ساتھ چلی گئی تھی' لیکن پچھلی عید جیسا اشتیاق اس بار اسے کپڑوں کے لیے نہیں تھا۔ اسلام آباد آکر یہ بھی پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے گیسٹ روم کی کھڑکی سے لگ کر اپنے گھر والوں میں سے کسی کے نظر آنے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔

عید کی صبح پہلے کی طرح اس بار بھی وہ سالار کی کال پر ہی اٹھی تھی۔ وہ مانٹریال میں اپنا سیشن ختم کرکے کچھ دیر پہلے ہوٹل آیا تھا۔

"کون سے کپڑے پہن رہی ہو تم آج؟" اس نے مبارک باد دینے کے بعد اس سے پوچھا۔

"تمہیں بتانے کا فائدہ؟" اس نے بیڈ کے کراؤن کے ساتھ پشت ٹکاتے ہوئے کہا۔

"میں تصور کرنا چاہ رہا ہوں کہ تم کیسی لگ رہی ہو گی؟"

"میرے سامنے تم نے کبھی میرے کپڑوں کو غور سے دیکھا تک نہیں' اب وہاں بیٹھ کر کیا تصور کرو گے؟"

"امامہ! ہم کم از کم آج کوئی آرگیو نہیں کریں گے۔" سالار نے مداخلت کرتے ہوئے جیسے پیشگی جنگ بندی کا اعلان کیا۔ "تمہیں کیا چاہیے آج؟ عیدی اور ریک تو ممی سے میں نے کہا ہے تمہارے لیے' کچھ اور چاہیے؟"

"نہیں۔" وہ بے حد اداس تھی۔

"مجھے مس تو نہیں کر رہیں تم؟" سالار نے مذاق کیا تھا لیکن اس نے جیسے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ اس نے اپنی آستین کے ساتھ آنکھوں کو رگڑ کر صاف کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس کی خاموشی پر غور کیے بغیر بات کر رہا تھا۔ کینیڈا میں عید پہلے ہی ہو چکی تھی اور وہ عید کے دن بھی کانفرنس اٹینڈ کرتا رہا۔ وہ زندگی میں کئی عیدیں اسی طرح گزار چکا تھا۔ پچھلی عید اسے کم از کم اس عید والے دن اپنی مصروفیات کی وجہ سے یاد نہیں آسکی تھی' لیکن پچھلی عید امامہ کو پچھلے دو دن سے تنگ کر رہی تھی۔

"کب کی فلائٹ ہے تمہاری؟" اس نے کوشش کی تھی کہ اس کی آواز بات کرتے ہوئے نہ بھرائے' یہ احمقانہ چیز تھی' باقی چیزوں پر رونا ٹھیک تھا۔ لیکن کم از کم وہ اس کے سامنے اس کے نہ ہونے کے لیے نہیں رو سکتی تھی۔ وہ بڑی شرمندگی محسوس کرتی اگر وہ یہ جان جاتا کہ...

وہ اب اسے فلائٹ کا بتا رہا تھا۔

"تم نے مجھے کپڑوں کا کلر نہیں بتایا؟" سالار کو بات کرتے کرتے یاد آیا۔ "تم نے ممی کے ساتھ جا کر کپڑے لیے تھے؟"

"ہاں لیے ہیں میں نے۔ جو آج پہنوں گی وہ ہیزل گرین ہے۔"

"ہیزل گرین؟" وہ بے اختیار اٹکا۔ "وہ تو آنکھیں ہوتی ہیں۔"

"آنکھوں کا کلر ہوتا ہے۔" ہمیشہ کی طرح اس نے تصحیح کی۔

"اوہ... آج میں جیفر کی آنکھوں کو غور سے دیکھوں گا۔" اس نے ڈنر پر اپنی کسی ساتھی کا نام لیا۔

"کیوں؟"

"اس کی آنکھوں میں مجھے اپنی وائف کے کپڑوں کا کلر نظر آئے گا۔" وہ سنجیدہ تھا۔ وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

"امامہ! جب سے میں یہاں آیا ہوں' آج پہلی بار تم ہنسی ہو۔" سالار نے اس کی ہنسی کو نوٹس کیا تھا۔

"اور شادی کے بعد اتنے مہینوں میں یہ پہلا کلر ہے جسے تم نے Identify کیا تھا اور وہ بھی کسی عورت کی آنکھوں کی وجہ سے۔"
"تم جیلس ہو رہی ہو؟" وہ بھی ہنس پڑا تھا۔
"ہاں اب بس یہی تو ایک کام رہ گیا ہے میرے کرنے کے لیے۔"
اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔
"یعنی نہیں ہو رہیں یا نہیں ہو سکتیں؟"
وہ پوچھ رہا تھا اور وہ جواب نہ دے سکی۔ اس کی خاموشی پر وہ ہنسا تھا۔
"اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے؟" وہ کچھ جزبز ہوئی تھی۔
"اپنی خوش فہمی پر ہنسا ہوں کم از کم کسی عورت سے میرے لیے تو جیلس نہیں ہو سکتیں۔"
وہ اسے تنگ کر رہا تھا اور وہ جانتی تھی اس کا اشارہ رمشہ کی طرف تھا۔
"تم مجھے صرف یہ بتاؤ کب آ رہے ہو؟"
اس نے بات بدلنا بہتر سمجھا تھا اور وہی گھسا پٹا سوال کیا جو وہ اس سے کرتی آ رہی تھی۔



وہ عید کے دوسرے دن رات کی فلائٹ سے واپس لاہور آ گئی تھی۔ کیونکہ اگلی رات آٹھ بجے کی فلائٹ سے وہ واپس آ رہا تھا۔ وہ رنجیدگی اور حساسیت جو پچھلے چار ہفتوں سے اسے ناخوش رکھے ہوئے تھی وہ یک دم جیسے کہیں غائب ہو گئی تھی۔
اور چار ہفتے کے بعد بالآخر اس نے کیک کا وہ ٹکڑا اور وہ کیس ڈسپوز آف کر دیے۔
اگر فرقان کو سیدھا ہاسپٹل سے ایئرپورٹ نہ جانا ہوتا تو وہ خود اسے ریسیو کرنے چلی جاتی، وہ کچھ اتنی ہی ایکسائیٹڈ ہو رہی تھی۔
نو بج کر پینتالیس منٹ پر بالآخر ڈور بیل بجی، اسے دروازے تک پہنچنے میں سیکنڈز لگے تھے۔
"خدایا! کیا خوشی اس کو کہتے ہیں جو اس شخص کے چہرے پر پہلی نظر ڈالتے میں نے محسوس کی ہے؟" اس نے دروازہ کھول کر ڈور ہینڈل پر اپنا کپکپاتا ہاتھ رکھے سالار کو دیکھ کر الجھتے ہوئے سوچا تھا۔
فرقان سے باتیں کرتا دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ سیدھا ہوا اور ان دونوں کی نظریں ملیں۔ وہی گرم جوش مسکراہٹ جس کی وہ عادی تھی اور ہمیشہ کی طرح سلام میں بھی پہل اسی نے کی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی چند لمحوں کے لیے جیسے ساکت ہو گئی تھی۔
"امامہ! سامان کی ڈلیوری دینے آیا ہوں، چیک کر لو کوئی بریکیج یا ڈیمیج تو نہیں ہے۔" فرقان نے ایک سوٹ کیس کھینچ کر اندر لے جاتے ہوئے اس کو چھیڑا۔ سالار مسکرایا تھا۔
امامہ نے سلام کا جواب دینے کی کوشش کی تھی، لیکن اس کے گلے میں کوئی گرہ لگنے لگی تھی۔ بات گلے کی گرہ تک رہتی تو ٹھیک تھی، لیکن آنکھوں میں پانی کیسے اور کیوں آ گیا تھا؟ وہ آگے بڑھا اور اس نے ہمیشہ کی طرح اسے گلے لگایا جیسے وہ آفس سے آنے کے بعد لگایا کرتا تھا۔ بے اختیار، بے ساختہ آنسوؤں کا ایک اور ریلا آیا۔ یہی چیز تو وہ ڈھونڈتی پھر رہی تھی پچھلے چار ہفتوں سے، یہی نرم لمس، اپنے گرد بازوؤں کا یہی حصار۔ اس کے ساتھ لگے اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کے جسم سے اٹھتی کلون کی مہک ڈریسنگ ٹیبل پر کلون کی شیشی سے اٹھتی

سے بالکل الگ تھی۔ وہ اس کے جسم پر لگنے کے بعد زیادہ مسحور کن تھی' زیادہ جان لیوا بھی۔
"کیسی ہو تم؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ گلے کی گرہیں اور بڑھ گئی تھیں۔ اس نے اب اسے خود سے الگ کیا اور اس کا چہرہ اور آنسو دیکھے۔
"کیا ہوا؟" وہ بیگ اور سوٹ کیس اندر لے جاتے ہوئے فرقان نے پلٹ کر دیکھا۔
"میں ابھی... ابھی سلاد کے لیے پیاز کاٹ رہی تھی۔" اس نے کچھ گھبراہٹ میں مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ پھر شاید اسے خود ہی یہ بہانہ کمزور لگا۔ "وہ سر میں بھی کچھ درد تھا۔ اور فلو تھا۔" وہ فرقان کی مسکراتی ہوئی نظروں سے کچھ گڑبڑائی تھی۔
سالار نے فرقان کو نظر انداز کیا اور اسے ایک بار پھر ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔
"تو یار! کوئی میڈیسن لینی چاہیے تھی۔"
"وہ کنگ رینج پر کچھ رکھ کر آئی ہوں۔" وہ رکے بغیر کچن میں چلی آئی۔
اس کے سامنے کھڑے رہ کر اس سے نظریں ملا کر جھوٹ بولنا بڑا مشکل ہو گیا تھا۔ سنک میں چہرے پر پانی کے چھپاکے مارنے کے بعد اس نے کچھ پانی پیا۔ آواز کی تھرتھراہٹ صرف اسی طرح ختم ہو سکتی تھی۔ وہ دونوں اب اس کے عقب' لاؤنج میں' کچن کاؤنٹر کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے اور ان میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اپنا چہرہ کچن رول سے تھپتھپا کر اس نے چند گہرے سانس لے کر خود کو نارمل کیا۔
"بیٹھو! کھانا کھا کر جاؤنا۔" وہ جب لاؤنج میں آئی تو سالار' فرقان سے کہہ رہا تھا۔
"نہیں' اس وقت نہیں' کھانے پر انتظار کر رہے ہوں گے بچے۔ کچھ دنوں کے بعد چلیں گے کہیں ڈنر کے لیے۔" وہ بیرونی دروازہ کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ سالار دروازے تک اسے چھوڑنے گیا۔ وہ کچن میں آ کر کھانے کے برتن نکالنے لگی۔
وہ دروازے سے واپسی پر کچن میں سیل فون پر بات کرتے ہوئے آیا تھا' فون پر سکندر تھے۔ امامہ نے اسے کچن کاؤنٹر پر رکھی پانی کی بوتل کو کھولتے دیکھا۔ فون کندھے اور کان کے بیچ دبائے اس نے بوتل کا ڈھکن کھولا۔ امامہ نے اس کے گلاس کی طرف جانے سے پہلے ایک گلاس لا کر اس کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ سالار نے ہاتھ سے بوتل لے کر اس نے گلاس میں اس کے لیے پانی ڈالا۔ سالار نے سکندر سے بات کرتے ہوئے سر کے اشارے سے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔
"پاپا خیریت پوچھ رہے ہیں تمہاری۔"
فریج کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ مسکرائی۔
"میں اب ٹھیک ہوں۔" سالار نے اس کے جملے پر غور کیے بغیر سکندر تک اس کا جملہ پہنچا دیا۔
کاؤنٹر پر پڑے سلاد میں سے سیب کا ایک ٹکڑا کانٹے سے اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے' وہ اسی طرح فون پر سکندر سے بات کرتے ہوئے کچن سے نکلا۔ امامہ نے اسے ٹیرس کا دروازہ کھول کر ٹیرس کے پودوں پر نظر دوڑاتے دیکھا۔ ٹیبل پر برتن رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی آنے لگی۔ ایک مہینے کے بعد یہ جگہ اسے "گھر" لگی تھی اور اس کی وجہ گھر میں گونجتی وہ "آواز" اور ادھر سے ادھر جاتا اس کا وجود تھا۔ برتن رکھنے کے باوجود وہ جیسے بے اختیاری کے عالم میں ٹیبل کے پاس کھڑی' فون کان سے لگائے' سالار کو ٹیرس پر ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ بات محبت کی نہیں' عادت کی تھی۔ اسے اس کی عادت ہو گئی تھی اور عادت بعض دفعہ محبت سے بھی زیادہ جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔

اسے اچانک خیال آیا کہ وہ کھانا کھانے سے پہلے کپڑے تبدیل کرے گا۔ بیڈروم میں جا کر وہ اس کے لیے کپڑے نکال کر واش روم میں لٹکا کر آئی۔

وہ واش روم سے نکل رہی تھی جب وہ بیڈروم میں داخل ہوا۔

"میں شاور لے کر کھانا کھاؤں گا۔" اس نے جیسے اعلان کیا تھا۔

وہ نہ بھی کہتا پھر بھی وہ جانتی تھی وہ سفر سے واپسی پر ہمیشہ نہا کر ہی کھانا کھاتا تھا۔

"میں نے تمہارے کپڑے اور ٹاولز رکھ دیے ہیں اور یہ میں تمہارے لیے نئے سلیپرز لے کر آئی تھی۔" سلیپرز کا ڈبا شوریک سے نکالتے ہوئے بولی۔

"رہنے دو امامہ! میں خود ہی نکال لوں گا۔"

رسٹ واچ اتارتے ہوئے اس نے امامہ کو منع کیا۔ اسے کبھی بھی کسی دوسرے کا اپنا جوتے اٹھانا پسند نہیں تھا، وہ جانتی تھی۔ لیکن اس کے منع کرنے کے باوجود وہ سلیپرز نکال لائی تھی۔

"کچھ نہیں ہوتا۔" اس نے سلیپرز اس کے پاس رکھ دیے۔

وہ اب بیڈ پر بیٹھا اپنے جوتے اور جرابیں اتار رہا تھا اور وہ بے مقصد اس کے پاس کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ شادی کے ان چھ مہینوں میں آج پہلی بار وہ اس طرح بے مقصد اس کے پاس کھڑی تھی۔ سالار نے کچھ حیرانی سے نوٹس کیا تھا۔

"یہ بلو کپڑے تم نے میرے انتظار میں پہنے ہیں؟" اس نے جرابیں اتارتے ہوئے امامہ کو چھیڑا۔ وہ بے وجہ ہنسی۔ وہ مسٹرڈ کو بلو کہہ رہا تھا لیکن آج اس نے اس کی تصحیح نہیں کی اور اس نے آج بھی اس کی تعریف نہیں کی تھی مگر اسے یہ بھی برا نہیں لگا تھا۔

"تھینکس سلیپرز!" اپنی جرابیں اور جوتے اٹھاتے ہوئے اس نے سلیپرز پہنے اور امامہ سے کہا۔

"میں رکھتی ہوں۔" امامہ نے جوتے اور جرابیں اس سے لینے کی کوشش کی۔

"کیوں یار! پہلے کون رکھتا ہے؟" سالار نے کچھ حیرانی سے اسے روکا۔ امامہ رک گئی۔ وہ واقعی وہ اپنے جوتے خود اٹھانے کا عادی تھا۔ جوتے شوریک میں رکھتے ہوئے اس نے لانڈری باسکٹ میں جرابیں ڈالیں اور واش روم میں گھس گیا۔

امامہ نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی اس کی رسٹ واچ اور سیل فون کو دیکھا۔ ہر خالی جگہ بھرنے لگی تھی۔

وہ جب تک نہا کر آیا امامہ کھانا لگا چکی تھی۔ سالار نے ڈائننگ ٹیبل پر نظر ڈالتے ہی بے اختیار کہا۔

"امامہ! کیا کیا پکا رکھا ہے یار!"

"جو جو تمہیں اچھا لگتا ہے۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"مجھے...؟" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے ٹیبل پر پھیلی ہوئی ڈشز دیکھ کر جیسے کسی سوچ میں پڑا۔

"تم نے اپنا وقت ضائع کیا۔"

کوئی اور وقت ہوتا تو وہ پورے دن کی محنت پر بولے جانے والے اس جملے پر بری طرح ناراض ہوتی لیکن آج اسے کچھ برا نہیں لگ رہا تھا۔ کسی بات پر غصہ نہیں آ رہا تھا، وہ اتنی ہی سرشار تھی۔

"میں نے اپنا وقت تمہارے لیے استعمال کیا۔" اس نے مدھم آواز میں سالار کی تصحیح کی۔

"لیکن تم تھک گئی ہو گی...؟"

"نہیں... کیوں تھکوں گی میں؟" اس نے چاولوں کی ڈش سالار کی طرف بڑھائی۔

سالار نے اس کی پلیٹ میں ہمیشہ کی طرح پہلے چاول ڈالے' اپنی پلیٹ کے ایک کونے میں پڑے ان چاولوں کو دیکھ کر اس کا دل بھر آیا تھا۔ تو اتنے دنوں سے یہ ایک چیز تھی جو وہ مس کر رہی تھی کھانے پر' اور یہ "ایک" چیز نہیں تھی۔ وہ اب اپنی پلیٹ میں چاول ڈال رہا تھا۔ ایک مہینے کے بعد وہ اس کے اتنے قریب بیٹھی تھی۔ کھانا سرو کرتے اس کے ہاتھ دیکھ رہی تھی۔ سفید شرٹ کی آستینیں موڑے' اس کے ہاتھوں نے ہمیشہ کی طرح اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس کا دل بے اختیار اس کے ہاتھ چھونے کو چاہا' اس نے بمشکل نظر ہٹائی' خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے یہ یک دم بہت مشکل ہو رہا تھا کہ وہ اس کے قریب ہو' اور وہ صرف کھانے کی طرف متوجہ رہے۔

"پینٹنگز مکمل ہو گئی ہیں تمہاری؟"

وہ کھانا شروع کرتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔ امامہ نے چونک کر ٹیبل پر پڑا کانٹا اور چمچ اٹھایا۔

"کون سی پینٹنگز؟" اس نے بے خیالی میں کہا' وہ ٹھٹکا۔

"تم بنا رہی تھیں نا' کچھ؟" اس نے یاد دلایا۔

"یہ بھی لو۔" جواب دینے کے بجائے اس نے ایک اور ڈش اس کی طرف بڑھائی۔

"ڈر تو نہیں لگا تمہیں یہاں اکیلے رہتے ہوئے؟" سالار نے اس سے پوچھا۔

"کھانا اچھا ہے؟" امامہ نے ایک بار پھر جواب گول کیا۔ وہ مزید جھوٹ نہیں بول سکتی تھی' بالکل ویسے ہی جیسے وہ سچ نہیں بول سکتی تھی۔

"ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔

"کتنے ناولز پڑھے تم نے؟" وہ اب پوچھ رہا تھا۔

"یہ چوپس بھی ہیں۔" اس نے ایک اور ڈش سرو کی۔

"تمہاری فلائٹ ٹھیک رہی؟"

اس سے پہلے کہ وہ اس سے کوئی مشکل سوال کرتا' اس نے پوچھنا ضروری سمجھا تھا۔

"ہاں' اور آل' کچھ bumpy رہی۔۔۔ لیکن ٹھیک ہی تھی۔" اس نے بتایا۔

"اور کانفرنس بھی اچھی رہی؟"

"ایکسی لینٹ۔" اس نے بے اختیار کہا۔

"کیا روٹین تھی تمہاری؟" وہ اسے موضوع سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

"میری روٹین۔۔۔" وہ سوچ میں پڑی۔

"ہاں! کیا کیا کرتی تھیں سارا دن؟" وہ اب چپاتی کا ٹکڑا توڑتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"جو پہلے کیا کرتی تھی۔" اس نے نظریں چرا کر ایک اور ڈش اس کی طرف بڑھائی۔

"لیکن تب تو بہت زیادہ وقت ہوتا ہو گا تمہارے پاس۔" اس نے کریدا تھا۔

"بالکل' ساری شام' ساری رات۔"

"پھر تو بہت فنش ہو گئے ہوں گے تمہارے؟" اپنی پلیٹ میں قورمہ نکالتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا۔

امامہ نے جواب دینے کے بجائے اپنی پلیٹ کو دیکھا جس میں چیزوں کا ڈھیر بالکل اسی طرح پڑا تھا۔ اس سے کچھ کھایا نہیں جا رہا تھا۔ سالار کو اتنی رغبت کے ساتھ کھاتے دیکھ کر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا پیٹ بھر رہا ہو۔

"تم سعیدہ اماں کو یہاں لے آتیں۔" سالار نے یک دم اس سے کہا۔ اسے جانے کیا خیال آیا تھا۔

"میں نے کہا تھا ان سے لیکن تمہیں تو پتا ہے وہ اتنے دنوں کے لیے اپنا گھر نہیں چھوڑ سکتیں۔"
اس نے جواب دیا۔

"That's understandable"۔" سالار نے کھانا کھاتے ہوئے بے اختیار ایک نوالہ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ آخری لقمہ ہمیشہ اسے ہی کھلاتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ ٹھٹکی پھر اس نے لقمہ منہ میں لے لیا لیکن اسے چبا نہیں سکی۔ وہ لقمہ جیسے آخری حد ثابت ہوا' وہ بے اختیار رو پڑی۔ وہ پانی پیتے پیتے ایک دم رک گیا۔

"کیا ہوا؟" وہ ہکا بکا تھا۔ ہونٹوں پر ہاتھ رکھے وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے امامہ؟" وہ بری طرح بدحواس ہوا۔ کم از کم اس وقت اس طرح کی گفتگو کے دوران آنسو...؟ وہ ان کی وجہ تلاش نہیں کر سکا۔

ایک دفعہ آنسو بہہ جانے کے بعد سب کچھ آسان ہو گیا تھا۔ مزید رونا' بے بسی کا اظہار اور کمزوری کا اعتراف۔ اب مزید دیوار میں کھڑی رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

"فار گاڈ سیک... مجھ کل کر رو رہی مجھے کیا ہوا ہے...؟ سب کچھ ٹھیک رہا میرے بعد؟ کسی نے تمہیں پریشان تو نہیں کیا؟" وہ اب مکمل طور پر حواس باختہ تھا۔ ٹشو پیپر سے آنکھیں رگڑتے ہوئے امامہ نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلایا۔

"تو پھر کیوں رو رہی ہو؟" سالار مطمئن نہیں ہوا تھا۔

"ویسے ہی بس میں تمہیں بہت مس کرتی رہی اس لیے۔" وہ کہتے کہتے پھر رو پڑی۔

کیا شرمندگی سی شرمندگی تھی جو اس نے یہ اعتراف کرتے ہوئے محسوس کی تھی۔ سالار کو لگا اسے سننے میں کچھ غلطی ہوئی تھی۔

"کس کو مس کیا؟"

"تمہیں۔" اس نے سر جھکا کر روتے ہوئے کہا۔ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گیا۔

"مجھے کس لیے؟" یہ بے یقینی کی انتہا تھی۔

وہ روتے روتے ٹھٹکی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا' پھر بے حد خفگی کے عالم میں ٹیبل سے اپنی ڈنر پلیٹ اٹھاتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"میرا دماغ خراب ہو گیا تھا اس لیے۔" وہ کچھ بول نہیں سکا۔

شادی کے تقریباً چار ماہ میں اس نے پہلی بار یہ جملہ اس سے کہا تھا' ورنہ وہ آئی لو یو کے جواب میں بھی تھینک یو کہنے کی عادی تھی۔

وہ اب برتن اٹھا اٹھا کر اندر لے جا رہی تھی اور سالار بالکل ہونق سا پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے' اسے اپنے سامنے سے برتن ہٹاتے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے رونے سے بھی اتنا حواس باختہ نہیں ہوا تھا' جتنا اس کے اس معمولی سے اعتراف سے ہو گیا تھا۔

وہ شاکڈ نہ ہوتا تو کیا کرتا۔ وہ چار ہفتے پہلے بڑے دھڑلے سے اسے کہہ رہی تھی کہ۔ اور پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے بت کی طرح کرسی پر بیٹھے کوئی اس کے سامنے جیسے کسی معمہ کے ٹکڑے ترتیب دینے لگا تھا۔ وہ چار ہفتے باہر رہ کر اس جس رویے کو سمجھنے کی کوشش میں ناکام ہو گیا تھا' وہ اب سمجھ میں آ رہا تھا۔ یہ ناقابل یقین تھا کم از کم اس کے لیے کہ امامہ اسے۔

اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ کچن میں ادھر سے ادھر جاتے ہوئے' اسی طرح آنکھیں رگڑتے ہوئے چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

وہ گلاس ٹیبل پر رکھ کر کچن میں آگیا' وہ فریج سے سویٹ ڈش نکال رہی تھی۔ سالار نے اس کے ہاتھ سے ڈونگا پکڑ کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ کچھ کہے بغیر اس نے اسے گلے لگایا تھا۔ بڑی نرمی سے یوں جیسے تلافی کر رہا ہو' معذرت کر رہا ہو۔ وہ خفگی سے الگ ہونا چاہتی تھی' اس کا ہاتھ جھٹکنا چاہتی تھی لیکن بے بس تھی۔ فی الحال دنیا میں وہ واحد شخص تھا جو اسے اس طرح گلے لگاتا تھا۔ برسات پھر ہونے لگی تھی۔ وہ اس کی عادتیں خراب کر رہا تھا کسی پیراسائٹ کی طرح اسے اپنا محتاج کر رہا تھا۔

وہاں کھڑے دونوں کے درمیان ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہیں ہوا تھا کوئی معذرت' کوئی اظہار محبت' کچھ نہیں۔ زندگی کے اس کھیل میں لفظ فالتو تھے' جس میں وہ لیڈ کر رہے تھے۔

برسات تھمنے لگی تھی۔ وہ ہاتھ سے گال اور آنکھیں خشک کرتی اس سے الگ ہو گئی۔

"دراصل میں گھر میں اکیلی تھی اس لیے مس کرتی رہی۔"

انکار' اقرار' اعتراف' پھر انکار... یہ مشرقی عورت کی زندگی کا دائرہ تھا' وہ بھی اسی دائرے میں گھومنے لگی تھی۔ جھوٹ کی ضرورت پھر آن پڑی تھی' اپنے گرد کھڑی دیوار کے شگاف کو اس نے پھر سے بھرنا شروع کر دیا۔

"ہاں' اکیلے ہوں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" سالار نے اس جھوٹ کو سچ بنانے میں اس کی مدد کی۔ امامہ کا حوصلہ بڑھا۔

"دانت میں درد تھا تو... تو اس لیے مجھے رونا آگیا۔" وہ اٹکی پھر اس نے کہا۔

"ہاں' مجھے اندازہ ہے دانت کا درد بہت تکلیف دہ ہوتا ہے' ایک دفعہ ہوا تھا مجھے... میں جانتا ہوں کیا حالت ہوتی ہے۔" ایک دوسرے کے سامنے کھڑے' وہ نظریں ملائے بغیر جھوٹ بول رہے تھے۔

"آ... آ..." وہ اٹکی' اب تیسرا جھوٹ ذہن میں نہیں آرہا تھا۔ جو سوال آرہا تھا اس نے وہی پوچھا "تم نے مجھے مس نہیں کیا؟" وہ پھر گلی کے اسی موڑ پر آکر کھڑے ہو گئے تھے۔

"ہر دن' ہر گھنٹہ' ہر منٹ' ہر سیکنڈ۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہا تھا اور امامہ کی آنکھوں میں جیسے ستارے جھلملانے لگے تھے۔ بعض دفعہ ہم کوئی فلاسفی' کوئی حقیقت نہیں سننا چاہتے' بس وہی روایتی باتیں سننا چاہتے ہیں' جنہیں فلم کے پردے اور کتاب کے صفحے پر ہم ہزاروں بار پڑھتے ہوئے سنتے ہیں تو وہ بھی روایتی باتیں کر رہا تھا' وہی جملے جو اس وقت اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔

"چار ہفتے تمہارے ساتھ نہیں تھا۔ اگر تمہارا خیال ساتھ نہ ہوتا تو میں مر جاتا۔"

"تم جھوٹے ہو۔" وہ بھرائی آواز میں روتے ہوئے ہنسی تھی۔

"تم بھی۔" سالار نے بے ساختہ جتایا۔

وہ روتے ہوئے ہنس رہی تھی یا ہنستے ہوئے رو رہی تھی لیکن چار ماہ میں پہلی بار سالار کے لیے وہ برسات قابل اعتراض نہیں تھی۔ اتنے عرصے میں پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ "برسات" اسے بھی ڈبو سکتی ہے۔



وہ اس رات بیڈ پر اس سے چند انچ دور کروٹ کے بل لیٹے' کہنی تکیے پر ٹکائے اس سے باتیں کرتی رہی تھی۔ ایک مہینے کے دوران اکٹھی ہو جانے والی ساری باتیں... بے مقصد' بے معنی چیزوں اور واقعات کی تفصیلات' کس کی کال آئی' کس سے اس کی کیا بات ہوئی' ملازمہ نے اس سے کیا کہا' ٹی وی پر چلنے والے کسی پروگرام میں اس نے کیا دیکھا' کون سے میگزین میں اس نے کیا پڑھا۔ ٹیرس پر رکھے کتنے پودوں پر نئے پھول نکلے ہیں' فرقان اور

نوشین کے بچے کتنی بار اس کے گھر آئے' وہ نوشین کے ساتھ کتنی بار بازار گئی' کیا خریدا' کیا پسند نہیں آیا۔

اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ صرف وہ بول رہی تھی۔ سالار بالکل خاموش چت لیٹا اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے سن رہا تھا۔ ایک ہاتھ پر سر ٹکائے' وہ دوسرے ہاتھ سے غیر محسوس انداز میں اس کے بازو پر انگلی سے چھوٹے بڑے دائرے بناتے ہوئے اس سے باتیں کرتی رہی۔ وہ "خاموش سامع" پلکیں جھپکائے بغیر صرف اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

اس کی آنکھوں کے تاثرات' اس کے چہرے پر جھلکنے والے رنگ' اس کے ہونٹوں کی حرکت' بات کرتے ہوئے اس کی ہنسی کی کھلکھلاہٹ' اس کے چہرے پر کھلنے والے رنگ' وہ جیسے سینما کی فرنٹ رو میں بیٹھا ہوا ایک سحر زدہ ناظر تھا۔ کہنی کے بل نیم دراز' جب وہ تھک جاتی تو پھر اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہتی "اچھا' چلو' اب سو جاتے ہیں۔"

یہ جملہ وہ شاید پچیس دفعہ کہہ چکی تھی۔

اس کے کندھے پر سر رکھے اسے پھر کچھ یاد آتا تو وہ یک دم سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھتی "میں نے تمہیں یہ بتایا ہے کہ...؟"

سالار نفی میں سر ہلا دیتا' گفتگو پھر دوبارہ وہیں سے شروع ہو جاتی۔ خاموش سامع پھر "وہی" نظر دیکھنے لگتا۔

"یہ کون سی اذان ہو رہی ہے؟" وہ بات کرتے کرتے چونکی۔

دور کہیں سے اس نے اذانوں کی آوازیں سنی تھیں۔

"فجر کی۔" سالار نے پرسکون انداز میں کہا۔ وہ بری طرح گڑبڑائی۔

"او مائی گاڈ! فجر ہو گئی۔ اور میں... تمہیں تو سونا چاہیے تھا' تم تو تھکے ہوئے تھے۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ تم مجھ سے کہہ دیتے۔" وہ اب بری طرح نادم ہو رہی تھی۔ "مجھ سے کہنا چاہیے تھا تمہیں۔ کیوں نہیں کہا تم نے؟"

"کیا کہتا؟" وہ اب پرسکون تھا۔

"یہی کہ تم سونا چاہتے ہو۔"

"لیکن میں تو سونا نہیں چاہتا تھا۔"

"لیکن مجھے تو وقت کا پتا نہیں چلا' کم از کم تمہیں بتانا چاہیے تھا مجھے۔" وہ واقعی شرمندہ ہو رہی تھی۔

"تمہارا خیال ہے' مجھے وقت کا احساس تھا؟"

"تم سو جاؤ اب اور آئی ایم سوری... کتنی فضول باتیں کیں میں نے' تم بھی کیا سوچ رہے ہو گے؟" اسے اب احساس ہوا تھا کہ وہ کتنی دیر سے اکیلی ہی بول رہی تھی۔ وہ ہوں ہاں تک نہیں کر رہا تھا۔

"میں تو نماز پڑھ کر سوؤں گا اب اور میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ آج تم نے مجھ سے اتنی باتیں کیسے کرلیں۔"

"تم نے تو غور سے سنی بھی نہیں ہوں گی میری باتیں۔" وہ کچھ شرمندگی سے مسکرائی۔

"ایک ایک بات سنی ہے۔ چاہو تو شروع سے دہرا دیتا ہوں۔ آج تک تم نے جب جب' جو جو کہا ہے' مجھے یاد ہے۔ ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

اس کا لہجہ ہموار تھا لیکن آنکھوں میں کوئی تاثر تھا جس نے چند لمحوں کے لیے امامہ کو باندھا تھا۔

"اسی طرح باتیں کرو گی تو ہر رات جاگ سکتا ہوں تمہارے لیے۔" امامہ نے نظریں چرا لیں۔

بعض دفعہ اس سے نظریں ملانا' اس کی باتوں پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اور بعض دفعہ اس زندگی کے بارے میں بھی کچھ کہنا مشکل ہو جاتا تھا جو وہ اس کے ساتھ گزار رہی تھی۔

اس سے کچھ دور ہٹتے ہوئے اس نے تکیے پر سر رکھ دیا۔ وہ اب سیدھی لیٹی چھت کو دیکھ رہی تھی۔
سائیڈ ٹیبل پر پڑے سیل فون کے یکدم بجتے الارم کو بند کرتے ہوئے سالار نے اس کی طرف کروٹ لی۔ کہنی کے بل نیم دراز اس نے امامہ سے کہا۔
"کچھ اور رہتا ہے تم نے؟" امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سنجیدہ تھا۔
"نہیں۔" اس نے مدھم آواز میں کہا۔
"آئی لو یو۔" جواباً "سالار کے جملے نے چند لمحوں کے لیے اسے ساکت کیا۔ وہ اس کے پاس تھا" اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا جیسے جواباً" اس سے کچھ سننے کی خواہش رکھتا ہو۔ امامہ نے کبھی اس کی آنکھوں کو اتنی آسانی سے نہیں پڑھا تھا۔ شاید وہ اتنے قریب تھا اس لیے... وہ جیسے اپنی آنکھوں سے اسے ہپناٹائز کیے ہوئے تھے۔
"تھینک یو۔"
وہ بے اختیار ہنسا۔ ایک گہرا سانس لے کر ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کرتے ہوئے" اس نے جیسے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ بعض خواہشیں کوشش سے پوری نہیں ہوتیں اور بعض سوالوں کا کوئی جواب نہیں مل پاتا۔
وہاں اس کے اتنے قریب کوئی اور عورت ہوتی تو اسے "اظہار محبت" ہی ملتا۔ یہ امامہ ہاشم تھی۔ اس کا "اظہار تشکر" ہی کافی تھا۔ اس پر جھکتے ہوئے اس نے بہت نرمی سے اس کے ہونٹ چھوئے پھر اس کا ماتھا پھر وہ بیڈ سے اٹھ گیا۔



"یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔" وہ دس بجے کے قریب اس کے ساتھ ناشتہ کرنے کے بعد ٹیبل صاف کر رہی تھی' جب وہ بیڈ روم سے ایک خوب صورت پیکنگ میں ایک باکس لے کر اس کے پاس آیا تھا۔
"یہ کیا ہے؟" وہ ٹیبل صاف کرتے کرتے رک گئی۔
"دیکھ لو۔" سالار نے باکس اس کی طرف بڑھایا۔
"جیولری ہے؟" اس کو ———— لیبل اور باکس کے دیکھ اس سے کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ سالار جواب دینے کے بجائے کندھے اچکا کر خاموش رہا۔ امامہ نے بڑے تجسس اور احتیاط سے اس باکس کی بے حد نفیس اور خوب صورت پیکنگ کو ہٹا کر باکس کھول لیا۔ سرخ مخمل جیسے ایک بے حد قیمتی اور چمک دار کپڑے کی تہوں کے درمیان ایک کرسٹل رنگ کیس تھا اور اس کیس سے نظر آنے والی رنگ نے کچھ دیر کے لیے اسے ساکت کر دیا تھا۔ اسکوائر ڈائمنڈز کے بینڈ کے ساتھ وہ ایک پلاٹینم ٹیولپ ڈائمنڈ رنگ تھی۔ چودہ قیراط کے اس ڈائمنڈ کے گرد ننھے ننھے نیلم کے گول گول نگینوں کا ایک دائرہ تھا۔ بہت دیر... مسمرائز وہ اس رنگ پر نظریں جمائے" اس نے بے اختیار گہرا سانس لے کر اپنا پہلا رد عمل دیا۔ یہ صرف ڈائمنڈ ہی نہیں تھے جو اس کی نظروں کو خیرہ کر رہے تھے' بلکہ وہ پیچیدہ ڈیزائن بھی جس میں وہ سارے جیولز جڑے تھے۔
"یہ بہت خوب صورت ہے۔" اس نے بمشکل کہا۔ سالار نے ہاتھ بڑھا کر کرسٹل کا کیس کھول کر رنگ کو نکال لیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے وہ رنگ اس کی انگلی میں پہنا دی۔
"ہاں یہ اب خوب صورت لگ رہی ہے۔"
رنگ پہنانے کے بعد اس نے اس کے ہاتھ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کہا۔
"اور دیکھو! یہ بالکل میری انگلی کے سائز کے مطابق ہے۔" وہ جیسے کچھ اور ایکسائیٹڈ ہوئی تھی۔
"تمہاری انگلی کا سائز لے کر بنائی گئی ہے کیونکہ تمہاری ایک رنگ لے کر گیا تھا میں۔"

اس نے اس ہاتھ کو چومتے ہوئے کہا جس میں وہ رنگ تھی۔ اس رنگ نے اس کے ہاتھ کو سجا دیا تھا۔ وہ جس ہاتھ میں بھی ہوتی دیکھنے والے پر ایسا ہی تاثر چھوڑتی۔

"یہ ویڈنگ گفٹ ہے تمہارے لیے۔" سالار نے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ اس نے کچھ حیران ہو کر سالار کو دیکھا۔

"ویڈنگ گفٹ ہے۔؟ چار ماہ ہو گئے ہیں شادی کو۔"

"ہاں! میں نے تمہیں ویڈنگ گفٹ نہیں دیا تھا۔ پہلے یاد نہیں تھا بعد میں پیسے نہیں تھے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"اور اب کہاں سے آئے پیسے؟"

"آ گئے کہیں سے۔" اس نے ٹالا۔ امامہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کوئی غلط کام نہیں کیا میں نے۔" وہ بے اختیار شرمندہ ہوئی۔

"میں نے کب کہا کہ۔"

"چلو! ڈاکٹر صاحب کے ہاں چلتے ہیں اور سعیدہ اماں سے بھی مل کر آتے ہیں۔ میرے بیگ میں کچھ گفٹس ہیں ان کے لیے وہ نکال لو۔" سالار نے اسے بات مکمل کرنے نہیں دی تھی۔

"تھینک یو سالار!" وہ جاتے جاتے ٹھٹکا۔

"کس لیے؟"

"ہر چیز کے لیے۔"

"یہ سب تمہارا ہی ہے۔" امامہ نے نظریں چرائیں۔

"میں نے سوچا تمہیں یاد بھی نہیں ہو گا کہ تم نے مجھے شادی پر کوئی گفٹ نہیں دیا۔" اپنے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے خوشی سے سرشار ہو رہی تھی۔ وہ واحد گلہ تھا جو وہ اپنے دل میں سالار کے لیے رکھے ہوئے تھی۔

"نہیں بھولا نہیں تھا۔"

امامہ کو لگا کہ وہ کچھ اور کہنا چاہتا ہے۔ سالار نے بات ادھوری چھوڑی تھی یا بدل دی تھی؟ یہ وہ کچھ نہیں سکی۔



"مائی گاڈ... دیکھو۔" وہ واک وے پر چلتے چلتے بے اختیار ٹھٹکی تھی۔

سالار نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ وہ دونوں ریس کورس میں لگنے والے ایک میلے کو دیکھنے آئے تھے۔ اب بے مقصد میلے کی جگہ سے کچھ دور چہل قدمی میں مصروف تھے جب امامہ اس واک وے کے داہنی طرف درختوں کے اطراف پانی میں ڈوبی ہوئی گھاس میں نظر آنے والے عکس کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ وہ پچھلی رات کی بارش کا پانی تھا جو ابھی پوری طرح ڈرین آؤٹ نہیں ہو سکا تھا۔ دیو قامت درختوں کے تنوں اور شاخوں پر لگے رنگین برقی قمقموں اور ٹیوب لائٹس کا عکس نیچے جمع شدہ پانی میں پڑ رہا تھا۔

اس عکس کو دیکھتے ہوئے وہ بھی کچھ دیر کے لیے اسی طرح سحر زدہ سا ہو کر رہ گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی رنگ و نور سے بھری کسی وادی کے کنارے کھڑے اس میں چمکتے ہوئے رنگین ہیرے جواہرات کے درخت دیکھ رہے ہوں یا الف لیلیٰ کا کوئی منظر دیکھ رہے ہوں۔ ہوا کے جھونکوں سے پانی میں بہت ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا اور ان روشنیوں اور درختوں کا عکس منعکس ہو کر جیسے محو رقص تھا۔ طلسم ہوشربا جیسے پانی کی لہروں پر ڈول رہی تھی۔

"یوں لگ رہا ہے جیسے جنت میں رات ہو گئی ہے۔"
طویل خاموشی کے بعد اس نے امامہ کی آواز سنی۔ اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ پلکیں جھپکے بغیر ابھی تک اس پانی کو دیکھ رہی تھی جس کی روشنیوں کا عکس اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔
"ایسی ہوتی ہو گی جنت؟" سالار نے اسے کہتے سنا۔
وہ کچھ کہنے کے بجائے دوبارہ اس پانی کو دیکھنے لگا۔ اس وسیع و عریض پارک کی روشنیوں سے بقعہ نور بنے ہوئے حصے میں گھومتے لوگوں کو اندازہ بھی نہیں ہو پا رہا ہو گا کہ وہاں سے بہت دور ایک نیم تاریک روش پر کھڑے وہ لوگ پانی میں نظر آنے والے ایک عکس میں جنت ڈھونڈ رہے تھے۔
"جنت میں ستارے ہوں گے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔
"ہاں! بہت سارے ہوں گے۔" اس نے اندازہ لگایا۔
"اتنے رنگوں کے؟" اس نے ان روشنیوں کے رنگ گنے۔
"کائنات میں موجود ہر رنگ۔" وہ بے اختیار محظوظ ہو کر ہنسی اسے جواب پسند آیا تھا۔
"رات ایسے ہی منور ہوتی ہو گی؟" عکس پر نظریں جمائے وہ جیسے بے خود ہو رہے تھے۔
"اس سے زیادہ روشن، اس سے زیادہ منور۔" سالار نے بے اختیار کہا۔ وہ جھکی اور اس نے اپنی انگلیوں سے عکس کو چھونے کی کوشش کی۔ سالار نے بروقت اسے کھینچا۔
"درختوں پر لائٹس ہیں، پانی میں کرنٹ بھی ہو سکتا ہے۔" وہ ناراض ہوا تھا۔
"میں اسے چھونا چاہتی تھی۔"
"یہ عکس جنت نہیں ہے۔"
"جنت میں اور کیا ہو گا؟"
"تم؟" اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا وہ عکس کو دیکھ رہا تھا۔
"صرف میں اور تم نہیں ہو گے؟" پتا نہیں اس نے گردن موڑ کر بے حد عجیب مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔
"تو پھر تم کیسے جانتے ہو کہ میں وہاں ہوں گی؟" اس نے اسے تنگ کیا۔
"جنت کے علاوہ تمہیں اور رکھا جا سکتا ہے؟" اس نے جواباً سوال کیا۔ اس کے لہجے میں رشک تھا، وہ ہنس پڑی۔
"اتنی آسانی سے مل جاتی ہے جنت؟" اس نے جیسے سالار کو جتایا۔
"مجھے آسانی سے نہیں ملے گی، تمہیں آسانی سے مل جائے گی۔" اس کا لہجہ پھر عجیب سا تھا۔
"کیوں؟" وہ حیران ہوئی۔
"تم جتنی آسانی سے ہر چیز میں "جنت" ڈھونڈ لیتی ہو میں آج تک نہیں ڈھونڈ سکا۔ اس لیے کہہ رہا ہوں۔"
وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔
دو دن پہلے وہ گھر کے لیے لیمپ خریدنے گئے تھے انہوں نے بیڈ روم کے لیے لیمپس کا ایک سیٹ خریدا اور وہ رات کو ناول پڑھتے پڑھتے لیمپ شیڈ کو دیکھنے لگی۔ وہ ای میل چیک کرنے کے بعد اپنا لیپ ٹاپ بند کرنے لگا تو اس نے امامہ کو دیکھا۔ وہ اب بھی اسی طرح لیمپ شیڈ پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔
"کیا دیکھ رہی ہو تم؟" وہ حیران ہوا۔
"بیوٹی فل۔" اس نے جواباً بے ساختہ اسی طرح لیمپ شیڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

سالار نے قدرے حیرانی سے اپنے سائیڈ ٹیبل پر پڑے لیمپ شیڈ کو دیکھا۔
"ہاں! اچھا ہے؟" اس نے سرسری انداز میں کہا۔ وہ خوب صورت لیمپس تھے لیکن اتنے بھی نہیں تھے کہ وہ ان پر یوں نظریں گاڑ کر بیٹھ جاتا۔
"یہ کون سے پھول ہیں؟" وہ ابھی بھی لیمپ شیڈ پر نظریں جمائے کہہ رہی تھی۔
"پھول؟" سالار نے حیرانی سے لیمپ شیڈ کو دوبارہ دیکھا۔ اس نے پہلی بار اس پرل کلر کے شیڈ پر بنے پیٹرن کو دیکھا۔ اس شیڈ کا ٹیکسچر کچھ عجیب تھا۔ کاغذ نما اس کپڑے پر سنہری مائل پیلے پھولوں کا ایک بے حد مہین اور نفیس پیٹرن تھا جو صرف لیمپ کے آن ہونے پر نظر آرہا تھا۔ ان پھولوں میں کہیں کہیں کرمزن کلر کی کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آتی' مدھم پڑتی پھر چند لمحوں کے بعد وہی چیز چمکتی۔
"نہ یہ گلاب ہیں اور نہ ہی ٹیولپ ہیں' تھوڑا سا بلوبیل سے ملتا جلتا ہے لیکن وہ بھی نہیں۔" وہ جیسے پھولوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی' پھر جیسے اس نے ہتھیار ڈال دیے۔
"ایسے پھول جنت میں ہوں گے۔" وہ ہنس پڑا۔
"ہم اچھا۔"
"دیکھو یہ پھول رنگ بدل رہے ہیں۔۔۔ لیکن یہ رنگ نہیں بدل رہے بلکہ یہ کھل رہے ہیں۔" وہ لیمپ شیڈ پر بنے پھولوں پر اب انگلی پھیر رہی تھی۔ سالار جیسے کسی سحر میں آیا تھا۔ وہ پھول واقعی بار بار کھلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔
"Lovely" وہ سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ انہیں اب سمجھ آیا تھا کہ وہ لیمپ اتنے مہنگے کیوں تھے۔ ان کی روشنی میں سیلز مین بھی انہیں وہ پیٹرن نہیں دکھا سکتا تھا۔ شاید اسی لیے اس نے انہیں صرف ڈیزائن اور روشنی ہی کے حوالے سے بتایا تھا۔
اور ایک ہفتہ پہلے اس کی دراز صاف کرتے ہوئے' سالار کی ویسٹ پیپر باسکٹ میں سے وہ ایک پوسٹ کارڈ اس کے پاس لے کر آئی۔
"ہاں' اسے پھینک دیا ہے میں نے' بے کار ہے۔" اس نے ٹی وی دیکھتے ہوئے امامہ کے ہاتھ میں وہ پوسٹ کارڈ دیکھ کر کہا تھا۔ وہ اس کارڈ کو لیے اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔
"سالار' یہ دیکھو کتنی خوب صورت جھیل ہے اور دیکھو کتنا سکون ہے اس جگہ پر۔" سالار نے اس کے ہاتھ سے پوسٹ کارڈ لے کر اس پر ایک نظر دوڑائی۔ وہ کسی پینٹنگ کا پوسٹ کارڈ تھا۔ کسی پینٹر کا بنایا ہوا لینڈ اسکیپ' ایک بہت چھوٹی سی کم گہرے کنارے والی جھیل' جس کے کنارے جنگلی پھولوں سے بھرے ہوئے تھے اور ان پھولوں کا عکس جھیل کے پانی میں نظر آرہا تھا۔ کچھ پھول ٹوٹ کر پانی کی سطح پر تیر رہے تھے۔ جھیل کے کنارے ایک چھوٹی سی لکڑی کی کشتی تھی' جس میں صرف ایک چپو پڑا تھا اور وہ کشتی صرف دو افراد کے لیے تھی۔ جھیل کی سطح پر کچھ آبی پرندے تیرتے نظر آرہے تھے۔
"یہ صندل کی لکڑی سے بنی ہوئی ہے اس کشتی کا رنگ دیکھو' یہ صندل کا رنگ ہے۔"
وہ پوسٹ کارڈ پر انگلی پھیرتے ہوئے اسے بتانے لگی تھی۔
"ایسا لگتا ہے جیسے صبح سویرے کوئی اس کشتی میں بیٹھ کر کہیں جاتا ہو۔۔۔ ایک مہکتی' خوشبودار بھیگی ہوئی کشتی میں۔۔۔ اور ہوا چل رہی ہو۔۔۔ اور جھیل میں اس کشتی میں بیٹھے خوشبودار ہوا کے جھونکے۔۔۔ ذرا تصور کرو۔" اس نے بے اختیار گہرا سانس لیا یوں جیسے اپنی فرضی تصویر سے خود محظوظ ہوئی ہو۔
"کتنی Screnity ہے اس سین میں۔۔۔ ایسے جیسے یہ جنت ہو۔۔۔ میں نہ بتاتی تو تم تو اسے پھینک رہے تھے۔"

وہ بے اختیار اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ واقعی اس کی زندگی میں نہ آتی تو وہ جنت کو۔۔۔
"اس کی پکچر بنالو سیل فون کے ساتھ۔" امامہ کی آواز نے یک دم اسے چونکا دیا۔ وہ اب بھی اسی عکس کو دیکھنے میں مصروف تھی۔ سالار نے سیل فون نکال کر چند تصویریں کھینچیں اور سیل اسے تھما دیا۔ اس نے باری باری ان تصویروں کو دیکھا اور پھر مطمئن ہو گئی۔

"چلیں؟" سالار نے کہا۔

"ہاں۔" ان دونوں نے ایک آخری نظر اس عکس پر ڈالی اور پھر آگے چل پڑے۔

سالار نے چلتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"خاموش کیوں ہو گئے۔۔۔؟ کوئی بات کرو۔" امامہ نے چند قدم چلنے کے بعد اس سے کہا۔

"تم کرو میں سن رہا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے تمہیں مجھ سے پہلے جنت مل جائے۔" امامہ نے اپنے جملے کا مفہوم سمجھے بغیر اسے تسلی دی۔ وہ ہنس پڑا تھا۔

"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں۔" وہ مدھم آواز میں بڑبڑایا۔

"تم سے پہلے مرنا چاہتا ہوں میں۔" اسے چلتے ہوئے ٹھوکر لگی۔ کوئی چیز جیسے اس کے جسم سے ایک لمحے کے لیے اسے تھراتی ہوئی گزری تھی۔ وہ جو جنت ڈھونڈتی پھر رہی تھی "اس سے پہلے جو" "مجھے" سامنے کھڑی تھی وہ اسے بھول گئی تھی۔ ان کا ساتھ سالوں کا تھا اور ان کا ساتھ مہینوں کا تھا۔ اس نے سالوں میں کبھی جدائی محسوس نہیں کی تھی لیکن وہ ان ہفتوں کا ساتھ ختم ہونے کا سوچ کر بھی لرز گئی تھی۔

"تم کیوں کہہ رہے ہو اس طرح؟" وہ رک گئی اور اس نے سالار سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"تم نے ہی تو کہا تھا کہ شاید مجھے تم سے پہلے جنت مل جائے۔"

"لیکن میں نے مرنے کا نہیں کہا۔"

"کیا اس کے بغیر مل سکتی ہے؟" وہ بول نہیں سکی۔ نیم تاریکی میں اس روش پر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے وہ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے۔ پھر سالار نے اس کی آنکھوں میں پانی اُمڈتے دیکھا تھا۔

"ٹھیک ہے جو مرضی کرو۔" اس کی آواز میں خفگی تھی۔

سالار نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے جیسے معذرت خواہانہ انداز میں دبایا۔

"میں نے صرف تمہاری بات دہرائی تھی۔"

"اور میرا وہ مطلب نہیں تھا جو تم نے نکالا ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" وہ دونوں پھر چلنے لگے۔

"کیا تم جنت میں مجھے اپنا پارٹنر منتخب کرو گی؟"

چند قدم چلنے کے بعد اس نے سالار کو نرم آواز میں کہتے سنا۔ وہ بول نہیں سکی۔ وہ ہنس پڑا۔

"یعنی نہیں۔"

"میں نے یہ کب کہا؟" وہ رک گئی۔

"لیکن تم نے کچھ بھی کب کہا؟"

"میں سوچ رہی تھی۔"

"سوچ لیا؟ پھر اب بتاؤ۔" وہ ہنس پڑی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"جنت کی بات تم نے شروع کی تھی۔" اس نے سالار کا چہرہ دیکھا۔
"شاید۔" وہ خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔
"تمہیں یقین نہیں ہے؟" اس نے ہنس کر اس سے پوچھا۔
"یقین کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"
"اگر تم جنت میں پہنچ گئے تو پھر تمہیں ہی چننا پڑے گا۔" اس نے مذاق کیا۔
"اور اگر کوئی اور بھی پہنچ گیا تو؟" اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔
دونوں کے درمیان خاموشی کا لمبا وقفہ آیا تھا۔ اس "اور" کا تعارف نہ امامہ نے مانگا تھا نہ سالار نے کروایا تھا مگر اس "اور" نے اس کو سالار سے نظریں چرانے پر مجبور کیا تھا۔ وہ نظریں نہ چراتی تو اتنی تکلیف نہ ہوتی سالار کو جتنی اب ہوئی تھی۔ وہ اس سے کہہ نہیں سکی' بات اس کے انتخاب پر بھی نہیں رہی تھی' بات جلال کے انتخاب پر تھی۔ اس کا انتخاب جنت میں بھی شاید وہ بھی نہ ہوتی لیکن یہ اعتراف کرنے میں کوڑے کھانے جیسی ذلت تھی۔ چپ بہتر تھی لیکن اسے یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس کی چپ سالار کو اس وقت کوڑے کی طرح لگی تھی۔
اس روش سے روشنیوں تک کا باقی فاصلہ خاموشی میں طے ہوا تھا۔



سکندر عثمان کو چند لمحوں تک اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔
"آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے وہ پلاٹ تو بک ہی نہیں سکتا۔ سالار کے نام ہے وہ۔"
انہوں نے احتشام الدین سے کہا۔ وہ ان کے ایک کاروباری دوست تھے' اور چند منٹ پہلے انہوں نے سکندر عثمان کو فون کر کے ایک پلاٹ کی فروخت کے بارے میں شکایت کی تھی۔ ان کے کسی دوست نے ان ہی کے وکیل کے ذریعے ایک ایسا پلاٹ کچھ دن پہلے خریدا تھا جو سکندر عثمان کا تھا' اور جس کو ایک ڈیڑھ سال پہلے احتشام الدین نے خریدنے کی آفر کی تھی' لیکن سکندر نے تب انہیں یہ بتایا تھا کہ وہ پلاٹ جائیداد کی تقسیم کے دوران سالار کے نام کر چکے تھے۔ البتہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر کبھی اس پلاٹ کو فروخت کرنے کی ضرورت پڑی تو وہ احتشام الدین کو ترجیح دیں گے۔
"میرے وکیل کے ذریعے سارا پیپر ورک ہوا ہے۔ آپ کہیں تو آپ کو تھوڑی دیر میں پلاٹ کی منتقلی کا ایڈ بھی بھجوا دیتا ہوں۔ آپ کے بیٹے نے یہ پلاٹ ڈیڑھ کروڑ میں بیچا ہے۔ مجھے تو افسوس اس بات کا ہے کہ میرے وکیل نے منتقلی کے بعد بتایا مجھے' وہ بھی اتفاقاً۔ کچھ دیر پہلے بتا دیتا تو میں کبھی یہ پلاٹ کسی اور کو خریدنے نہ دیتا۔"
چند لمحوں کے لیے سکندر عثمان کا سر گھوم کر رہ گیا۔ پچھلے سال انہوں نے اپنی جائیداد کی تقسیم کر دی تھی۔ یہ ان دو پلاٹس میں سے ایک تھا جو سالار کے حصے میں آیا تھا۔
"میں ابھی سالار سے بات کر کے دوبارہ آپ سے بات کرتا ہوں۔" سکندر عثمان نے یکدم کہا۔
انہیں ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان کو بتائے بغیر پلاٹ بیچ سکتا ہے۔
سالار اس دن اسلام آباد میں تھا اور اس وقت اپنے کسی کام سے مارکیٹ کی طرف جا رہا تھا جب اسے سکندر کی کال ملی۔
"سالار! تم نے اپنا پلاٹ بیچ دیا ہے؟"
وہ اس وقت ایک سگنل پر رکا تھا اور اس کے ہیلو کہتے ہی سکندر نے دوسری طرف سے کہا۔

چند لمحے سالار کچھ بول نہیں سکا۔ پلاٹ کی فروخت کا سکندر کو اتنی جلدی پتا چل جائے گا' اسے اندازہ نہیں تھا۔ اس کی چند لمحوں کی خاموشی نے سکندر کے بدترین خدشات کی تصدیق کردی تھی۔

"تم میرے آفس آؤ۔" انہوں نے بے حد سرد مہری سے کہہ کر فون بند کردیا۔

"کب بیچا تھا پلاٹ؟" اس کے آفس پہنچ کر کرسی پر بیٹھتے ہی سکندر نے اس سے کہا۔ ان کا لہجہ قطعی خوشگوار نہیں تھا۔ وہ اس کی جائیداد تھی لیکن وہ بیچنے کے لیے نہیں دی گئی تھی۔

"پچھلے مہینے۔" اس نے لہجہ ہموار رکھنے کی کوشش کی۔

"کیوں؟"

"مجھے کچھ رقم کی ضرورت تھی۔"

"کس لیے؟" سالار اس بار جواب دیتے ہوئے جھجکا۔

"کس لیے رقم کی ضرورت تھی؟"

"مجھے امامہ کو ایک رنگ خرید کر دینی تھی۔" سکندر کو لگا کہ انہیں سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

"کیا؟"

"امامہ کے لیے ایک رنگ خریدنی تھی۔" اسی نارمل انداز میں اس نے اپنا جواب دہرایا تھا۔

"لاکھ دو لاکھ کی رنگ کے لیے تم نے پلاٹ بیچ دیا؟"

سکندر نے اس کے جواب سے بالکل غلط نتیجہ نکالا۔

"اپنا کریڈٹ کارڈ استعمال کرتے' بینک سے پرسنل لون لے لیتے یا مجھ سے کہتے۔"

"میں لون لے کر اسے گفٹ نہیں کرنا چاہتا تھا اور ایک دو لاکھ کی انگوٹھی نہیں تھی' کچھ زیادہ مہنگی تھی آپ اتنے پیسے کبھی نہ دیتے مجھے۔" وہ بڑی رسانیت سے کہہ رہا تھا۔

"کتنی مہنگی ہوتی' چار یا پانچ لاکھ کی ہوتی۔ چلو دس لاکھ کی ہوتی۔ دے دیتا میں تمہیں۔"

سکندر بے حد خفا تھے۔ وہ پلاٹ پونے دو کروڑ کا تھا جسے وہ ڈیڑھ کروڑ میں بیچ آیا تھا۔

"دس لاکھ کی بات نہیں تھی۔" سکندر نے اسے کہتے سنا۔

"پھر؟" سکندر کے ماتھے پر بل آئے۔ سالار نے اپنا گلا صاف کیا۔

"13.7" یہ واحد طریقہ تھا جس سے وہ اس انگوٹھی کی قیمت تین ہندسوں میں کہہ پایا تھا۔

"کیا۔؟" سکندر کو کچھ سمجھ نہیں آئی۔

"13.7" سالار نے ایک بار پھر گلا صاف کر کے اگلا لفظ کہا۔ سکندر کو چند لمحے سانس نہیں آیا۔ انہیں پہلی بار اس کی بات سمجھ میں آئی تھی۔

"13.7 ملین کی رنگ دی ہے تم نے اسے؟" ان کا ذہن جیسے بھک سے اڑ گیا تھا۔ سالار سر جھکائے ٹیبل پر پڑے پیپر ویٹ پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔ فی الحال وہ اس کمرے میں کچھ اور نہیں کرسکتا تھا۔

"سالار ایک کروڑ سینتیس لاکھ روپے کی رنگ خرید کردی ہے تم نے اسے؟"

سکندر عثمان کی خود بھی سمجھ نہیں آیا کہ انہوں نے اس سے دوبارہ یہ کیوں پوچھا تھا۔

"جی۔" اس بار سالار نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

سکندر بے یقینی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ سالار نے نظریں چرالیں' وہ اب ان کے عقب میں دیوار پر لگی پینٹنگ دیکھ رہا تھا' اس کے علاوہ وہ اور کیا کرتا؟ اس کے چہرے پر نظریں جمائے سکندر نے ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگائی۔ وہ اگر اسے الو کا پٹھا کہتے تھے تو ٹھیک ہی کہتے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ہوتی ہے اور وہ انہیں تلف کرنے کا سوچتا ہے۔ مگر امامہ کی وجہ سے رک جاتا ہے۔ سالار اپنے بینک میں امامہ کا اکاؤنٹ کھلوا کر تیس لاکھ روپے اس کا حق مہر جمع کرواتا ہے۔ وہ امامہ کو لے کر اسلام آباد جاتا ہے اور ایئرپورٹ پر اسے بتاتا ہے کہ سکندر عثمان نے منع کیا تھا۔ امامہ کو شدید غصہ آتا ہے۔ گھر پہنچنے پر سکندر عثمان اس سے شدید غصہ کرتے ہیں۔

سکندر عثمان سالار کی اسلام آباد آمد پر پریشان ہو جاتے ہیں۔ امامہ کو اس گھر میں آکر شدید ڈپریشن ہوتا ہے۔ وہ نو سال بعد سالار کے گھر سے اپنے گھر کو دیکھتی ہے۔ دو دن رہ کر وہ واپس آجاتے ہیں۔ امامہ کہتی ہے کہ وہ اسلام آباد میں رہنا چاہتی ہے۔ سالار کی جاب یہاں ہے تو وہ مہینے میں ایک دفعہ آجایا کرے۔ اس کی اس بات سے سالار کو دکھ ہوتا ہے پھر جب وہ کہتا ہے کہ اسے امریکہ چلے جانا ہے تو امامہ کہتی ہے کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ یہ تجویز سالار کے لیے شاکنگ ہوتی ہے۔ وہ امامہ سے اس کی توقع نہیں کرتا تھا۔

سالار، امامہ کو کراچی لے کر جاتا ہے تو وہ انیتا کے گھر جاتی ہے۔ وہ سالار سے کہتی ہے کہ وہ بھی ایسا شاندار گھر چاہتی ہے جس میں سبزیوں کا فارم، فش فارم ہو اور وہ کم از کم ایک ایکڑ کا ہو۔ سالار حیران رہ گیا تھا۔ عید کے موقع پر اس کو سکینے کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ سالار کے ساتھ ایک پارٹی میں شراب کی موجودگی پر اس کے دل میں سالار کے لیے بدگمانی آجاتی ہے۔ جس کو سالار دور کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اب ان چیزوں سے بہت دور جا چکا ہے۔ سالار بینک میں کام کرتا ہے۔ امامہ اس سے سود کے مسئلے پر بحث کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے سود حرام ہے۔

امامہ سالار کا خیال رکھتی ہے۔ اس کی سالار کے دل میں قدر تھی لیکن وہ زبان سے اظہار نہیں کرتا۔ سالار البتہ جلال کے لیے اس کے دل میں جو نرم گوشہ ہے اس سے بری طرح ہرٹ ہوتا ہے۔

سالار اپنا پلاٹ بیچ کر تقریباً ڈیڑھ کروڑ کی انگوٹھی خرید کر دیتا ہے۔ سکندر عثمان کو جب یہ بات پتا چلتی ہے تو وہ حیران رہ جاتے ہیں پھر وہ اس سے پوچھتے ہیں۔ "کہاں سے لی تھی یہ رنگ؟"

میں غارت گر (حصہ دوم)

چھٹی قسط

"کہاں سے لی تھی رنگ؟" بالآخر انہوں نے لمبی خاموشی کو توڑا۔

" Tiffany سے۔" "نہیں ایسے ہی کسی نام کی توقع تھی۔"

"ڈیزائن کرایا ہوگا؟" اس مالیت کی انگوٹھی نادر ہی ہو سکتی تھی۔

"جی" Jewellery statement "۔"

اس نے Tiffany کی سب سے مہنگی رینج میں آنے والی جیولری کی کولیکشن کا نام لیا۔ وہ زندگی میں ہمیشہ قیمتی چیزیں خریدنے اور استعمال کرنے کا عادی تھا۔ سکندر یہ جانتے تھے لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ انہیں اس کی اس عادت پر اعتراض ہوا تھا۔

"تو کوئی اس سے زیادہ مہنگی رنگ نہیں تھی؟ ابھی دوسرا پلاٹ پڑا تھا، چار ہیرے اور لگوا دیتے اس میں۔" سکندر نے ٹیبل پر پڑے سگار کیس سے ایک سگار نکالتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا تھا۔ سالار کے دائیں گال میں ڈمپل پڑا۔ اس نے یقیناً "اپنی" مسکراہٹ ضبط کی تھی۔ سکندر کا خیال تھا، یہ مسکراہٹ شرمندگی کی تھی۔ ان کے پاؤں تلے سے یقیناً "زمین" کھسک جاتی اگر انہیں یہ پتا چلتا کہ اس نے پہلے دونوں پلاٹس بیچ کر اسے ایک نیکلس دینے کا سوچا تھا، لیکن پھر یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اسے ایک انگوٹھی دینے کا خیال آیا جو امامہ مستقل طور پر پہن سکتی تھی۔

سگار سلگائے ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگائے وہ اب بھی اسی پر نظریں جمائے ہوئے تھے اور خود پر مسلسل جمی ان کی نظروں نے سالار کو کڑبڑانا شروع کر دیا تھا۔

"میں کتابوں میں جب رانجھا' فرہاد' رومیو' مجنوں وغیرہ کے بارے میں پڑھتا تھا تو میں سوچتا تھا کہ یہ ساری لفاظی ہے کوئی مرد اتنا الو کا پٹھا نہیں ہو سکتا لیکن تم نے یہ ثابت کیا ہے' مجھ پر کہ ہو سکتا ہے۔ کسی بھی زمانے میں کوئی بھی مرد کسی بھی عورت کے لیے عقل سے پیدل ہو سکتا ہے۔" سالار نے اس بے عزتی کو سر جھکائے شہد کے گھونٹ کی طرح پیا۔ اس کی اتنی بے عزتی کرنا تو سکندر کا حق تھا۔

"لیکن ان میں سے کسی کے باپ نے انہیں Yale میں پڑھانے کے بعد یہ سب کچھ کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہو گا اور ان میں سے ہر ایک محبوبہ کے لیے پاگل تھا۔ بیوی کے لیے تو صرف ایک شاہ جہاں نے پیسے لٹائے تھے' وہ بھی اس کے مرنے کے بعد۔ تمہیں کیا ہو گیا تھا؟" سکندر نے جیسے اسے شرم دلائی تھی۔

"میں نے دراصل امامہ کو ابھی تک شادی کا کوئی گفٹ نہیں دیا تھا۔" اس کے لہجے میں بلا کا اطمینان تھا۔

سکندر زندگی میں پہلی بار اس کی ڈھٹائی سے متاثر ہوئے تھے۔ انسان اگر ڈھیٹ ہو تو پھر اتنا ڈھیٹ ہو۔

"تو اپنے پیسوں سے اسے گفٹ دیتے۔" انہوں نے طنزیہ کہا تھا۔

"وہ بھی دے دیے ہیں اسے۔" اس نے طنز کا جواب سنجیدگی سے دے کر انہیں حیران کر دیا۔

وہ اس "بادشاہ" کی شکل دیکھ کر رہ گئے جو اپنی بیوی پر اپنی سلطنت لٹانے پر تلا ہوا تھا۔

اپنا سگار ایش ٹرے میں رکھتے ہوئے وہ ٹیبل پر کچھ آگے جھکے اور انہوں نے جیسے ایک ہمراز کی طرح اس سے کہا۔ "سالار! ایسا بھی کیا ہے امامہ میں کہ تم عقل سے پیدل ہو گئے ہو؟"

یہ طنز نہیں تھا' وہ واقعی جاننا چاہتے تھے۔

سالار نے چند لمحوں کے لیے سوچا پھر بے حد سادہ لہجے میں کہا۔

"بس' وہ اچھی لگتی ہے مجھے۔"

وہ اس وقت سکندر کو تیس سال کا مرد نہیں بلکہ تین سال کا ایک معصوم سا بچہ لگا تھا۔ جس کے لیے دنیا کی مہنگی ترین چیز کے حصول کی خواہش کی وجہ صرف اس کا "اچھا" لگنا تھا۔ اس اچھے لگنے میں سو پرسنٹو' کمپیوٹو' پاز بیٹو کوئی ڈگری نہیں ہوتی۔

ایک طویل سانس لیتے ہوئے وہ سیدھے ہو گئے۔ "اسے پتا ہے رنگ کی پرائس کا؟"

"نہیں۔"

سکندر کچھ اور حیران ہوئے۔ تو یہاں اپنی محبوبہ کو متاثر اور مرعوب کرنے کا کوئی جذبہ بھی کارفرما نہیں تھا۔

"آپ بھی ممی یا کسی دوسرے سے بات نہ کریں۔ میں نہیں چاہتا امامہ کو پتا چلے۔"

وہ اب ان سے کہہ رہا تھا۔ سکندر جواب دینے کے بجائے دوبارہ سگار کا کش لینے لگے۔

"باقی تیرہ لاکھ کا کیا کیا؟"

وہ اب کچھ اور "کارناموں" کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔

"سات لاکھ تو امامہ کو حق مہر کا دیا۔ وہ ڈیو تھا۔" اس نے انہیں حق مہر کی اصل رقم بتائے بغیر کہا۔

"اور باقی چھ لاکھ میں نے کچھ خیراتی اداروں میں دے دیا' کیونکہ امامہ کی رنگ پر اتنے پیسے خرچ کیے تھے تو میں نے سوچا کچھ خیرات بھی کرنا چاہیے۔"

سکندر عثمان کا غصہ دھوئیں کے مرغولوں میں تحلیل ہو رہا تھا' غصے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ اسے فیاضی کہتے'

بے وقوفی کہتے یا فضول خرچی، لیکن سامنے بیٹھی ہوئی اپنی اس اولاد کے لیے ان کے دل میں نرم گوشہ ذرا کچھ اور وسیع ہوا تھا۔ وہ اس کے کوڈ آف لائف کو نہ کبھی سمجھے تھے نہ کبھی بدل سکے تھے، لیکن اختلاف رکھنے کے باوجود کہیں نہ کہیں وہ احترام کا ایک احساس بھی رکھتے تھے اس کے لیے۔

سالار نے باپ کے ہونٹوں پر ایک مشفقانہ، لیکن بے حد معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوتے دیکھی۔

"اور حق مہر صرف سات لاکھ تو نہیں ہوگا۔ ہے نا سالار؟ تو وہ کتنے ملین دیا گیا ہے؟"

انہوں نے بے حد پچکارتی ہوئی آواز میں اس سے کہا۔

سالار بے اختیار ہنسا۔ سکندر عثمان اس کے سیدھے جملوں میں چھپے پھندوں کو ڈھونڈنے میں ماہر تھے۔

"جانے دیں پاپا۔" اس نے ٹالا تھا۔

"یعنی millions میں ہے؟" ان کا اندازہ ٹھیک تھا۔

"اب میں جاؤں؟" سالار نے جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ سکندر نے سر ہلا دیا۔

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر ان کی طرف آیا اور اس نے جھکتے ہوئے کرسی پر بیٹھے سکندر کو ساتھ لگایا پھر وہ سیدھا ہو گیا۔

"سالار! جو دوسرا پلاٹ ہے اس کے پیپرز مجھے لاہور پہنچ کر بھجوا دینا۔"

سکندر نے بڑے معمول کے لہجے میں اسے جاتے دیکھ کر اس سے کہا تھا۔

"پاپا! ٹرسٹ می۔" سالار نے کہا۔

"شٹ اپ۔"

"اوکے۔" وہ ہنس پڑا تھا۔

وہ سگار پیتے ہوئے اس کے جانے کے بعد بھی اسی کے بارے میں سوچتے رہے تھے۔



"Oh Tiffany Statement." وہ اس رات کسی ڈنر پر تھے، جب اس کی رنگ مسز زویئرز نے نوٹس کی تھی۔

وہ بزنس کلاس کا ایک بڑا نام تھیں اور خود اپنے لباس اور جیولری کے لیے بھی بے حد شہرت رکھتی تھیں۔ ان کا کسی چیز کو نوٹس کرنا خاص اہمیت رکھتا تھا۔

"مائی ویڈنگ رنگ۔" امامہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ اس کا ہاتھ پکڑے اس رنگ کو بے حد مرعوب انداز میں دیکھ رہی تھیں اور ان کا یہ انداز اس ٹیبل پر بیٹھی تمام خواتین میں اس رنگ کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا کر رہا تھا۔

The most beautiful and expensive picec of jewellary under this roof to night

(آج رات اس چھت کے نیچے یہ سب سے خوب صورت اور سب سے مہنگی جیولری ہے) مسز زویئرز نے جیسے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

Lucky woman your husband's taste is class a part

(لکی وومن! تمہارے شوہر کا ذوق بہت اعلا ہے۔)

امامہ ان ستائشی جملوں پر قدرے فخریہ انداز میں مسکرائی۔ وہ رنگ جب سے اس کے ہاتھ کی زینت بنی تھی اسی طرح نوٹس ہو رہی ہے۔

"کیا قیمت ہوگی؟" بائیں جانب بیٹھی مسز زبیر نے بھی اس کی رنگ کو ستائشی انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں پتا۔ شاید چار یا پانچ لاکھ۔" امامہ نے گلاس اٹھا کر پانی کا گھونٹ لیتے ہوئے اندازہ لگایا۔

ایک لمحہ کے لیے اس نے ٹیبل پر چھا جانے والی خاموشی کو محسوس کیا پھر خود پر جمی نظروں کو۔

"ڈالرز یا پاؤنڈز؟"

اس نے بے حد حیرانی سے مسز زبیر کی شکل دیکھی پھر ہنس پڑی۔ اس نے اسے مذاق سمجھا تھا۔

"میرا شوہر اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

مسز زبیر نے دوبارہ یہ سوال نہیں کیا۔ وہ بھی نہیں امامہ قیمت بتانا نہیں چاہتی۔

"سالار! اس رنگ کی کیا قیمت ہے؟" اس رات بیڈ پر بیٹھے ناول پڑھتے امامہ کو یک دم مسز زبیر کا سوال یاد آیا۔ اپنا ہاتھ سالار کے سامنے پھیلاتے ہوئے اس نے کہا۔

"کیوں؟" وہ بھی کوئی کتاب پڑھتے ہوئے چونکا تھا۔

"مسز زبیر نے اور سب لوگوں نے بھی بہت تعریف کی۔" اس نے بے حد فخریہ انداز میں کہا۔

"دیٹس گڈ۔" وہ مسکرا کر دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"مسز زبیر نے قیمت پوچھی تھی میں نے کہا چار یا پانچ لاکھ ہوگی۔ انہوں نے پوچھا ڈالرز یا پاؤنڈز۔ میں نے کہا میرا شوہر اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا۔" وہ بے اختیار کتاب پر نظریں جمائے ہنس پڑا۔

"کیا ہوا؟" وہ چونکی۔

"کچھ نہیں۔۔۔ کچھ پڑھ رہا تھا۔" سالار نے بے ساختہ کہا۔

"تو کیا قیمت ہے اس کی؟" امامہ نے دوبارہ پوچھا۔

"یہ انمول ہے۔" سالار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"کوئی بھی چیز جو تمہارے ہاتھ میں ہو انمول ہے۔"

"پھر بھی۔" اس نے اصرار کیا۔

"Two hundred and fifty six." سالار نے ڈالرز ساتھ نہیں لگایا۔

"اوہ اچھا' میں زیادہ ایکسپینسو رنگ سمجھ رہی تھی۔" وہ کچھ مطمئن ہوئی اور دوبارہ ناول دیکھنے لگی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اسے فریب دینا' بہلانا بے حد آسان تھا اور یہ آسانی بعض دفعہ اسے بڑی مشکل میں ڈال دیتی تھی۔

امامہ نے چند لمحے بعد اس کی نظروں کو اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا' وہ کتاب گود میں الٹائے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ مسکرا دی۔ وہ ان نظروں کی عادی تھی۔ وہ بعض دفعہ اسے اسی طرح بے مقصد دیکھتا رہتا تھا۔

"تمہیں کچھ بتانا چاہتا تھا۔"

"کیا؟"

"You are the best thing ever happened to me"

وہ ایک لمحہ کے لیے حیران ہوئی پھر ہنس پڑی۔ اس کمپلیمنٹ دینے کی اس وقت کیا وجہ تھی وہ سمجھ نہیں پائی۔

"آئی لو یو۔" وہ پھر ہنس پڑی۔ وہ اس بار بلش ہوئی تھی۔

"تھینک یو۔" جواب وہی تھا جو ہمیشہ آتا تھا۔ اس بار وہ ہنس پڑا۔



"امامہ۔" وہ گاڑی کے دروازے کو بند کرتی کرنٹ کھا کر پلٹی تھی۔
وہ جلال تھا۔ پارکنگ میں اس کے برابر والی گاڑی سے اسے نکلتے ہوئے دیکھ کر ٹھٹکا تھا۔
"او مائی گاڈ! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آج تم سے یہاں ملاقات ہوگی۔"
"ہاؤ آر یو۔" وہ بے حد ایکسائیٹڈ انداز میں اس کی طرف آیا تھا۔
وہ بت بنی اسے دیکھ رہی تھی۔ بعض چیزیں بلاؤں کی طرح انسان کے تعاقب میں رہتی ہیں۔ جہاں بھی ملتی ہیں، انسان کا خون خشک کر دیتی ہیں۔ گاڑی کی چابی مٹھی میں دبائے، وہ بھی زرد چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا وہ اب بھی اس کا خون نچوڑ لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔
"مگر نہیں ملے تو سالوں نہیں ملے اور اب ایک ہی سال میں دوبارہ ملاقات ہو رہی ہے۔"
وہ اس کی اڑی ہوئی رنگت پر غور کیے بغیر، بے تکلف دوستوں کی طرح کہہ رہا تھا۔
امامہ نے بالآخر مسکرانے کی کوشش کی۔ یہ ضروری تھا۔ بے حد ضروری تھا۔ جلال انصر سے زیادہ خود اس کے لیے۔ اسے نہ وہ "پرانا دوست" سمجھ سکتی تھی نہ بے تکلف ہو سکتی تھی۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے صرف ایک ہی رشتے اور تعلق کا خیال آیا۔ ایک ہی خیال آسکتا تھا۔
"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟"
اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ نظریں تو وہ اب بھی اس سے نہیں ملا سکتی تھی۔ وہ ویسا ہی تھا جیسا اس نے اس کے کلینک پر آخری ملاقات میں دیکھا تھا۔ وزن پہلے سے کچھ بڑھ گیا تھا اور ہیئر لائن کچھ اور پیچھے چلی گئی تھی، لیکن اپنی زندگی میں وہ اس کا جو امیج لیے بیٹھی تھی اس کو ان دونوں چیزوں سے فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔
"میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ میں نے چند ماہ پہلے شادی کر لی ہے۔"
اس کی سمجھ میں نہیں آیا، اس نے اسے یہ خبر دینا کیوں ضروری سمجھا، کیا اس کا اس سے کوئی تعلق تھا؟ یا وہ اسے اس انفارمل چیٹ سے پہلے ہی جتا دینا چاہتا تھا کہ وہ "available" نہیں ہے۔ اس آخری ملاقات میں جو کچھ وہ اس سے کہہ چکا تھا اس کے بعد وہ دستیاب — ہوتا بھی تو کم از کم اتنی عزت نفس تو وہ رکھتی تھی یا وہ اسے "ضرورت مند" سمجھ رہا تھا اور کچھ بھی رہا تھا تو کیا غلط کر رہا تھا۔ میری ہی غلطی تھی اگر یوں

بھیک لینے اس کے پاس نہ گئی ہوتی تو کم از کم اس کے سامنے سر تو اونچا رکھ سکتی تھی۔ وہ خود کو ملامت کرنے لگی تھی۔
اور اس کی خاموشی نے جلال کو کچھ اور محتاط کیا۔
"بہت اچھی ہے میری بیوی' وہ بھی ڈاکٹر ہے۔ برٹش نیشنل ہے' اسپیشلائزیشن بھی اس نے وہیں سے کی ہے۔ امیزنگ وومن۔" اس نے چار جملوں میں اس پر اپنی بیوی کی حیثیت واضح کر دی تھی۔
ایک لمحے کے لیے وہ بھول گئی تھی کہ وہ بھی کسی کی بیوی ہے۔ اپنے پیروں کے نیچے زمین لیے کھڑی تھی۔ اس کے منہ سے کسی دوسری عورت کے لیے "میری بیوی" کے الفاظ نے چند لمحوں کے لیے اسے اسی طرح ادھیڑا تھا۔

"مبارک ہو۔" اس نے بالآخر وہ لفظ کہے' جو اسے کہنے چاہیے تھے۔
"تھینکس' میں تم کو ضرور بلاتا اگر میرے پاس تمہارا کانٹیکٹ نمبر ہوتا۔ پہلی بار تو نہیں بلا سکا تھا' لیکن دوسری بار تو بلا سکتا تھا۔" جلال نے بات کرتے کرتے جیسے مذاق کیا تھا۔ وہ مسکرا نہیں سکی۔ وہ بھی اس کے اس مذاق پر مسکرا نہیں سکتی تھی۔
"تم نے تو اس کے بعد کوئی رابطہ ہی نہیں کیا۔ کوئی فون' کوئی وزٹ' کچھ نہیں۔ میں تو انتظار ہی کرتا رہا۔" وہ اب اس کا جائزہ لے رہا تھا اور اسے اس میں ہونے والی تبدیلیوں کا بھی احساس ہو رہا تھا۔
یہ امامہ سات آٹھ ماہ پہلے والی امامہ سے بے حد مختلف تھی۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح ایک چادر میں ملبوس تھی' لیکن اس کی چادر اور لباس بے حد نفیس اور مہنگے تھے باوجود اس کے کہ وہ Casual Dress میں تھی۔ اس کے ہاتھوں اور کانوں میں پہنی ہوئی جیولری نے جلال کو ایک لمحہ کے لیے چونکایا تھا۔ اس کی ویڈنگ فنگر میں ایک رنگ تھی' لیکن یہ وہ وہم تھا جس کی وہ تصدیق نہیں چاہتا تھا۔ کیوں۔؟ پتا نہیں کیوں یہ وہ چہرہ نہیں تھا جسے اس نے اپنے کلینک پر دیکھا تھا۔ میک اپ سے عاری چہرے کے ساتھ وہ امامہ اسے ڈری' سہمی' کنفیوزڈ اور بہت بجھی ہوئی لگی تھی۔ سامنے کھڑی امامہ کے چہرے پر بھی میک اپ نہیں تھا اور اس کے بال بھی بے حد عام انداز میں ڈھیلے جوڑے کی شکل میں لپٹے ہوئے اس کی گردن کی پشت پر نظر آ رہے تھے۔ یوں جیسے وہ اتفاقاً" کسی کام سے گھر سے نکلی ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے اور آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ اس کی باڈی لینگویج دس بارہ سال پہلے کی امامہ کی طرح تھی' وہ امامہ جس سے پہلی بار مل کر وہ انٹریکٹ ہوا تھا۔ کیئرلیس' بے نیاز' لیکن بے حد پُراعتماد اور پُرسکون۔ ایک نظر میں ہی جلال کو احساس ہو گیا تھا کہ امامہ ہاشم بہت بدل چکی ہے' کیسے اور کیوں؟ اسے تھوڑی سی بے چینی ہوئی۔
اس کے عقب میں کھڑی ایک قیمتی گاڑی کو بظاہر سرسری دیکھتے ہوئے' جلال نے اس سے پوچھا۔
"تم اب بھی اسی فارماسیوٹیکل کمپنی میں کام کرتی ہو؟" اس کا جی چاہا تھا کہ کاش اس میں آنے والی ساری تبدیلیاں کسی بوگس' کسی ہینڈسم پے پیکیج کی مرہون منت ہوں۔ کمینی خواہش تھی' لیکن جلال انصر کی اس وقت یہی خواہش تھی۔ مرد کو اپنی متروکہ عورت کو Moved on دیکھ کر جو جھٹکا لگتا ہے وہ اس احساس سے بچنا چاہتا تھا۔
"نہیں' میں نے جاب چھوڑ دی تھی۔" اس نے مدھم آواز میں کہا۔
"اوہ اچھا۔" وہ بڑبڑایا۔
"تو تم کچھ نہیں کر رہیں آج کل؟"
امامہ چند لمحے خاموش رہی۔ اگلا جملہ کہنا مشکل تھا مگر بے حد ضروری تھا۔
"میری شادی ہو گئی ہے۔" وہ اب بھی یہ نہیں کہہ سکی کہ میں نے شادی کر لی۔ جلال کے چہرے سے ایک لمحہ

کے لیے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"اوہ! اچھا! کانگریچولیشنز۔" وہ بروقت سنبھلا تھا۔ امامہ نے اس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ نوٹس نہیں کی۔

"تم نے بتایا ہی نہیں۔ نہ انوائٹ کیا۔ کیا کرتا ہے وہ؟"

"آپ جانتے ہیں اسے۔ سالار سکندر۔" اس نے گلا صاف کر کے کہا۔

"اوہ۔" ایک لمحے کے لیے جلال کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا۔

"وہ بینکر ہے میں جانتا ہوں۔" جلال اس کی بات کاٹ کر اسے سالار کا بینک اور اس کی ڈیزگنیشن بتانے لگا۔

"آپ کو کیسے پتا ہے؟" وہ حیران ہوئی۔

"آدھے شہر کو تمہارے شوہر کے بارے میں پتا ہو گا۔ بزنس کمیونٹی سے میرا کافی ملنا جلنا ہے تو اس کے بارے میں پتا چلتا رہتا ہے۔ دو چار بار گیدرنگز میں دیکھا بھی ہے۔ میں نے لیکن ملاقات نہیں ہوئی۔" وہ اب نارمل ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

"تو لنچ کرتے ہیں۔ گپ شپ لگائیں گے اتنے عرصے بعد ملے ہیں۔ بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔" اس نے بے تکلفی اور گرمجوشی سے کہا۔

وہ شہر کے مصروف اور مہنگے ترین ڈاکٹرز میں سے ایک تھا۔ پرانی محبوبہ کے لیے وقت نکالنا مشکل ہوتا لیکن شہر کے سب سے زیادہ بااثر بینکر کی بیوی کے لیے وقت نکالنا مشکل نہیں تھا۔ امامہ ہاشم ایک دم اس کی سوشل نیٹ ورکنگ کے ایک مضبوط ترین امیدوار کے طور پر سامنے آگئی تھی۔

"نہیں میں گروسری کے لیے آئی ہوں۔ ڈنر کے لیے کچھ چیزیں چاہیے تھیں مجھے۔"

امامہ نے اسے ٹالنا چاہا' اسے یقین تھا وہ اصرار نہیں کرے گا۔ جلال کے بارے میں اس کے اندازے آج بھی غلط تھے۔

"یار! گروسری بھی ہو جائے گی میں خود کروا دوں گا لیکن لنچ کے بعد۔ وہ سامنے ریسٹورنٹ ہے ایک گھنٹے میں فارغ ہو جائیں گے ہم۔" جلال نے اسے بات مکمل کرنے نہیں دی۔

"نہیں۔" اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن جلال کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ بادل نخواستہ اس کے ساتھ ریسٹورنٹ میں چلی آئی۔

"تو کیسی گزر رہی ہے تمہاری لائف اپنے شوہر کے ساتھ؟" مینیو آرڈر کرتے ہی جلال نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ اس سے پوچھا۔ امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا' وہ صرف سوال نہیں تھا' جلال جیسے یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے یا نہیں۔

"بہت اچھی گزر رہی ہے میں بہت خوش ہوں سالار کے ساتھ۔"

اسے حیرت ہوئی اس سوال کا جواب دینا کتنا آسان کر دیا تھا سالار نے۔ کچھ کھوجنا' ٹٹولنا یا چھپانا نہیں پڑا تھا۔ وہ اس کے ساتھ "خوش" تھی۔

"لَو' ارینج میرج تو نہیں ہو گی۔؟ سالار اور تم نے اپنی مرضی سے کی ہو گی۔" اس نے جلال کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔ وہ اس سوال سے کیا جاننا چاہتا تھا؟

"ہاں! سالار نے اپنی مرضی سے مجھ سے شادی کی ہے۔ اس نے اپنی فیملی سے پوچھا نہیں تھا بلکہ بتایا تھا۔ سالار کا خیال تھا کہ مرد کو شادی کرتے وقت اپنی مرضی دیکھنی چاہیے' فیملی کی نہیں۔"

جلال کے چہرے کا رنگ بدلا تھا اور خود وہ بھی چند لمحے تک کوئی اگلا جملہ نہیں بول سکی۔ اس نے وہ آخری بات کس حوالے سے اور آخر کیوں کہی تھی' اس کی وجہ اس وقت وہ خود بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ نہ اسے کوئی طعنہ

دینے آئی تھی نہ گلہ کرنے پھر ایسی بات؟

"بہت زیادہ انڈیپینڈنٹ سوچ رکھتا ہے وہ۔" اس نے چند لمحوں بعد جلال کو جیسے کچھ تاویل دینے کی کوشش کی۔ تاویل پچھلے جملے سے بھی زیادہ چبھی تھی۔

"ظاہر ہے' سالانہ لاکھوں کمانے والے شوہر کی تعریف بیوی پر فرض ہوتی ہے۔"

اس بار اس کا ہنس کر کہا ہوا جملہ امامہ کو چبھا تھا۔

"لاکھوں کا تو مجھے نہیں پتا لیکن اچھے شوہر کی تعریف بیوی پر فرض ہوتی ہے۔"

جلال نے اس کے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "تو پتا رکھا کرو نا اس کے لاکھوں کا۔ کیسی بیوی ہو تم؟ ڈیڑھ دو کروڑ تو بنا ہی لیتا ہوگا سال میں۔ بہت بڑے بڑے mergers کروا رہا ہے تمہارا شوہر' تمہیں بتاتا نہیں؟"

"نہیں' ہم اور چیزوں کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ "ضروری" چیزوں کے بارے میں۔"

اس کا لہجہ بے حد سادہ تھا لیکن جلال کے پیٹ میں گرہیں پڑی تھیں۔ اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ بعض دفعہ ہنسی کی شدید ضرورت پڑجاتی ہے۔

"چالاک مردوں کو ایسی ہی بیویوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم لوگوں کی رہائش کہاں ہے؟"

اس نے جو سامارا بھر معصومیت سے سوال کیا۔

امامہ نے اس کے تبصرے پر کچھ کہنے کے بجائے اسے اپنا ایڈریس بتایا۔ وہ اس کے ساتھ سالار کو مزید ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"وہ اپارٹمنٹ۔ وہ بھی رینٹڈ۔ کوئی گھر ور لینا چاہیے تھا تم لوگوں کو۔ اگر تم لوگ انٹرسٹڈ ہو تو میرے دو تین گھر ہیں اچھے پوش ایریا میں۔ تم لوگ رینٹ کرلو۔" جلال نے فیاضانہ آفر کی۔

"نہیں' نہیں' ضرورت نہیں ہے۔ ہم کمفرٹیبل ہیں وہاں۔" امامہ نے کہا۔

وہ اب اسے اپنے گھر کی تفصیلات بتانے لگا۔ اس کا رقبہ' اس کا نقشہ اور دنیا جہاں کا وہ سامان جو اس نے اپنے گھر کے اندر اکٹھا کیا تھا۔

"تم سالار کے ساتھ آؤ نا کسی دن کھانے پر۔" بات کرتے کرتے اس نے یوں کہا کہ جیسے وہ واقعی صرف "دوست" ہی تھے اور دوست ہی "رہے" تھے۔ وہ بول نہیں سکی۔ اگر وہ بے حس تھا تو بہت ہی زیادہ تھا' اگر ظالم تھا تو انتہا کا تھا۔

"اوہ جلال صاحب۔ دیکھیں' کہاں ملاقات ہو رہی ہے۔"

وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا جو ریسٹورنٹ کے اندر اپنی بیوی کے ساتھ ان کی ٹیبل کے پاس سے گزرتے ہوئے جلال سے ملنے لگا۔ امامہ چونک کر اس آدمی کی طرف متوجہ ہوئی۔

"یہ بھابی ہیں؟" وہ آدمی اب جلال سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں' یہ میری ایک پرانی دوست ہیں۔" جلال نے فوراً" سے بیشتر کہا۔

امامہ نے اس آدمی کی آنکھوں میں عزت کا ایک تاثر آتے اور پھر جلال کے تعارف پر اسے غائب ہوتے دیکھا۔ ایک رسمی ہیلو کے بعد وہ آدمی دوبارہ جلال سے گفتگو میں مصروف ہوگیا۔ اس نے اور اس کی بیوی نے امامہ کی طرف دوسری نظر بھی نہیں ڈالی تھی' وہ بے چین ہوئی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ جلال کے اس ادھورے تعارف سے کیا سمجھے ہوں گے۔ جلال کی کوئی گرل فرینڈ۔ کوئی ٹائم پاس۔ کوئی ڈیٹ۔ یا پھر اس کے اسپتال میں کام کرنے والی کوئی ڈاکٹر یا نرس جسے جلال وقت گزاری کے لیے لنچ پر وہاں لے آیا تھا۔

"جلال! میں اب چلتی ہوں۔ بہت دیر ہو رہی ہے۔"

اسے پتا نہیں اچانک کیا ہوا تھا وہ اپنا بیگ اٹھا کر یک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ جلال کے ساتھ وہ کپل بھی چونکا۔

"نہیں کھانا آنے والا ہے' کھا کر نکلتے ہیں۔" جلال نے کہا۔

"نہیں مجھے گروسری کر کے پھر کوکنگ بھی کرنی ہے اور میرے شوہر کو تو گھر آتے ہی کھانا تیار ملنا چاہیے۔ آج ویسے بھی اس نے کچھ خاص ڈشز کہی ہیں۔"

مسٹر اور مسز فاروق نے اس بار مسکرا کر اسے دیکھا تھا' وہ بھی جواباً" مسکرائی تھی۔ اس نے "شوہر" کا لفظ کیوں استعمال کیا تھا؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ شاید اس کپل کی آنکھوں میں عزت کی اس نظر کو دوبارہ دیکھنے کے لیے جو چند لمحے پہلے جلال کی بیوی سمجھنے پر ان کی آنکھوں میں جھلکی تھی۔ اس کا انداز اتنا حتمی تھا کہ جلال اس بار اس سے اصرار نہیں کر سکا۔

"اچھا' سالار کا کوئی وزیٹنگ کارڈ اور اپنا کانٹیکٹ نمبر تو دے دو۔" اس نے امامہ سے کہا۔ اس کے بیگ میں سالار کے چند کارڈز تھے' اس نے ایک کارڈ نکال کر جلال کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔

"اپنا فون نمبر بھی لکھ دو۔"

وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچائی پھر اس نے اسی کارڈ کی پشت پر اپنا سیل فون نمبر لکھ دیا۔

جلال کے پاس بیٹھا آدمی تب تک اس کارڈ پر نام پڑھ چکا تھا۔

"اوہ! آپ سالار سکندر کی بیوی ہیں؟" وہ اس کے سوال پر بری طرح چونکی۔

"فاروق صاحب بھی بینکر ہیں' سالار کو جانتے ہوں گے۔" جلال نے فوراً" سے پیشتر کہا۔

"بہت اچھی طرح سے۔" اس آدمی کا انداز اب مکمل طور پر بدل چکا تھا۔ وہ ایک مقامی انویسٹمنٹ بینک کے ایگزیکٹوز میں سے تھا۔ اس نے امامہ کو اپنی بیوی سے متعارف کروایا۔

"آپ کے شوہر بہت بریلینٹ بینکر ہیں۔"

وہ مسز فاروق سے ابھی ہاتھ ملا رہی تھی جب فاروق نے سالار کے لیے ستائشی کلمات ادا کیے۔

"ہمیں انوائٹ کیا تھا' اس نے کچھ ماہ پہلے ویڈنگ ریسپشن پر' لیکن ہم امریکہ میں تھے۔" مسز فاروق اب بڑی گرم جوشی سے کہہ رہی تھیں اور امامہ کی جان پر بن آئی تھی۔ وہ اندازہ نہیں کر پائی تھی کہ وہ سالار کے کتنے قریب تھے یا صرف سوشل سرکل کا حصہ تھے۔

جو کچھ بھی تھا' وہاں جلال کے پاس بیٹھ کر اپنے شوہر کے کسی شناسا سے ملنا' اس کی زندگی کے سب سے ایمبیرسنگ لمحات میں سے ایک تھا۔

"بہت کلوز فرینڈشپ ہے امامہ اور سالار کے ساتھ میری' بلکہ فیملی ٹائیز ہیں۔ بس درمیان میں کچھ عرصہ آؤٹ آف ٹچ رہے ہیں' ہم دس بارہ سال تو ہو گئے ہوں گے ہماری فرینڈشپ کو' امامہ؟" اس کی کچھ میں نہیں آیا' وہ کیا کہہ رہا تھا۔ اس نے کچھ حیرانی سے جلال کو دیکھا۔

"ویری نائس۔ آپ سالار کے ساتھ آئیں کسی دن ہماری طرف۔" فاروق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شیور۔ بس' سالار کچھ مصروف ہے آج کل۔" امامہ نے قدرے گڑبڑا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے وہاں سے نکل آئی تھی' لیکن وہ بے حد اپ سیٹ تھی۔ وقت ایک بار پھر گیارہ سال پیچھے چلا گیا تھا' اسی میڈیکل کالج میں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا پھر کئی سال کے بعد جلال کے ساتھ ہونے والی پہلی ملاقات اور پھر آج اس کا سامنا۔

وہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں کیا خریدنے آئی تھی بھول گئی تھی۔ وہ ٹرالی لیے ایک شیلف سے دوسرے شیلف کو

دیکھتے گزرتی رہی' پھر خالی ٹرالی پر نظر پڑنے پر اس نے ہڑبڑاہٹ میں سوچا کہ وہ کیا خریدنے آئی تھی' لیکن ذہن کی اسکرین پر کچھ بھی نمودار نہیں ہوا تھا۔ اس نے بے مقصد چند چیزیں اٹھائیں اور پھر باہر آگئی۔ جلال کی گاڑی اب وہاں نہیں تھی۔ اس کی گاڑی کے برابر والی جگہ خالی تھی۔ معلوم نہیں اسے کیوں یہ توقع تھی کہ وہ ریسٹورنٹ سے باہر آکر اس کے لیے وہاں بیٹھا ہو گا۔ کم از کم اتنا انتظار تو کرتا کہ اسے خود رخصت کرتا۔ اسے خوش فہمی نہیں رہی تھی پھر بھی اسے اتنی کرٹسی کی تو اس سے توقع تھی۔

پارکنگ سے گاڑی نکالنے کے بعد اسے ایک دم احساس ہوا کہ وہ گھر نہیں جانا چاہتی' پھر اسے وہ ساری چیزیں یاد آنے لگیں' جنہیں وہ خریدنے کے لیے آئی تھی لیکن اب وہ دوبارہ کہیں گروسری کے لیے جانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ بے مقصد دوپہر میں سڑک پر ڈرائیو کرتے ہوئے اسے خود اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ اس کا خیال تھا اس نے کچھ غلط ٹرن لیے تھے اور وہ راستہ بھول گئی ہے۔ بہت دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ لاشعوری طور پر اس روڈ پر جا رہی تھی جس طرف سالار کا آفس تھا۔ یہ بے حد احمقانہ حرکت تھی۔ وہ مال روڈ پر تھی اور اب ون وے کی وجہ سے واپس نہیں پلٹ سکتی تھی۔ جب تک وہ یوٹرن لیتی تب تک وہ اس کے آفس کو کراس کر چکی ہوتی۔ ایک سگنل پر ایک لمبے چوڑے ٹریفک جام میں پھنسے' اسے وہ سڑک اور اپنی زندگی ایک جیسا لگنے لگی تھی۔ دو گھنٹے پہلے سالار کے ساتھ خوش تھی لیکن اب وہ خوش نہیں تھی۔

اے سی کی کولنگ یک دم خراب ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے اے سی بند کر دیا' وہ کچھ دیر اپنی زندگی میں گرمی بھی چاہتی تھی۔ جلال انصر جیسے اس کے جسم کا وہ زخم تھا جو ہر بار ہاتھ لگنے سے رسنے لگتا تھا اور ہر بار ہی اس کا یہ وہم باطل ہو جاتا تھا کہ وہ "زخم" بھر گیا ہے۔

گاڑی بند ہو گئی اور سگنل کھل گیا تھا۔ بے تحاشا ہارن کی آوازوں پر اس نے چونک کر گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔ وہ ناکام رہی اور بری طرح نروس ہوئی۔ گاڑی کوشش کے باوجود اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ایکسپرٹ ڈرائیور نہیں تھی اور اپنے پیچھے گاڑیوں کی لمبی قطار کے ہارن کسی بھی ایکسپرٹ ڈرائیو کو اسی طرح بوکھلا دیتے۔ ایک ٹریفک وارڈن اس کے قریب آگیا۔

"گاڑی خراب ہو گئی ہے' اسٹارٹ نہیں ہو رہی۔" امامہ نے اس سے کہا۔

"پھر لفٹر سے اسے ہٹانا پڑے گا' ورنہ ٹریفک جام ہو جائے گا۔" اس نے اسے بتایا۔

سگنل تب تک دوبارہ بند ہو چکا تھا۔ وہ وائرلیس پر لفٹر کو بلانے لگا اور وہ بے حد ہڑبڑائے ہوئے انداز میں گاڑی کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگی' وہ ناکام رہی تھی۔ لفٹر آنے پر وہ گاڑی سے باہر نکل آئی۔ لفٹر میں بیٹھا آدمی اس کو قریبی پارکنگ میں پہنچانے کے بارے میں اسے بتاتے ہوئے کسی رکشہ یا ٹیکسی میں اسے وہاں تک جانے کا کہہ کر غائب ہو گیا۔ مال روڈ پر اس ٹریفک کے درمیان اسے کوئی رکشہ یا ٹیکسی نہیں مل سکتی تھی۔ ہاں' واحد کام جو وہ کر سکتی تھی' وہ سڑک کراس کر کے کچھ فاصلے پر سالار کے آفس تک جانا تھا۔ اسی خالی الذہنی کے عالم میں مال روڈ عبور کر کے اس نے سیل نکال کر سالار کو فون کرنا شروع کر دیا۔ سالار کا فون آف تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے اس کے آفس ہی جانا تھا۔ چند منٹ اور چلنے کے بعد اس کے جوتے کا اسٹریپ نکل گیا۔ آج برا دن نہیں تھا بلکہ بدترین دن تھا۔ پسینے سے شرابور ٹوٹے ہوئے جوتے کے ساتھ وہاں کھڑے اس نے ایک بار پھر کسی رکشہ یا ٹیکسی کو ڈھونڈا۔ وہ اس ٹوٹے ہوئے جوتے کے ساتھ اس کے آفس نہیں جانا چاہتی تھی' لیکن فی الحال اسے اس کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہیں آیا تھا۔ اسے اپنی حالت پر رونا آنے لگا تھا' لیکن اس رونے کا تعلق اس کی اس حالت سے زیادہ اس کی ذہنی کیفیت سے تھا۔ وہ اس وقت کچھ ایسی ہی دلبرداشتہ تھی۔

اس کے بینک کی اس شاندار عمارت کے سامنے جوتا گھسیٹتے' وہ ایک لمحہ کے لیے ہچکچائی لیکن پھر اس کے ذہن

میں آیا کہ وہ سیدھی اس کے آفس چلی جائے۔
گارڈز کو اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس نے ان کی آنکھوں میں اتنی حیرانی اور بے یقینی دیکھی تھی کہ اس کی عزت نفس میں کچھ اور کمی آئی تھی لیکن مین ریسپشن میں داخل ہوتے ہی اس کی عزت نفس مکمل طور پر ختم ہو گئی تھی۔ شاندار انٹیریر والا وسیع و عریض ماربلڈ ہال اس وقت سوٹڈ بوٹڈ کورپوریٹ کلائنٹس سے بھرا ہوا تھا۔ آفس کا یہ لے آؤٹ کبھی اس کے تصور میں آجاتا تو وہ وہاں کبھی نہ آتی لیکن اب وہ آچکی تھی۔ ٹوٹی ہوئی چپل فرش پر گھسیٹتے ہوئے اسے اپنا آپ واقعی معذور لگ رہا تھا۔ ریسپشن کاؤنٹر پر اس نے سالار سکندر سے اپنا رشتہ ظاہر کرنے کی حماقت نہیں کی تھی۔
"مجھے سالار سکندر سے ملنا ہے۔"
اس نے ریسپشنسٹ سے پوچھنے پر کہا۔ پہلے اگر پسینہ تپتی دھوپ کی وجہ سے آرہا تھا تو اب یہاں اس ماحول کی وجہ سے اسے ٹھنڈا پسینہ آرہا تھا۔
"کیا آپ نے اپائنٹمنٹ لیا ہے میڈم!"
ریسپشنسٹ نے بے حد پروفیشنل انداز میں مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس کا ذہن ایک لمحہ کے لیے بلینک ہو گیا۔
"اپائنٹمنٹ۔" وہ حیران ہوئی تھی۔ اس نے جواب دینے کے بجائے ہاتھ میں پکڑے سیل پر ایک بار پھر اس کا نمبر ڈائل کیا۔ اس بار کال ریسیو نہیں ہوئی تھی لیکن بیل بجی تھی۔
"میں اس کی دوست ہوں۔" اس نے کال ختم کرتے ہوئے بے ربطی سے کہا۔
"ابھی وہ ایک میٹنگ میں ہیں۔ انہیں تھوڑی دیر میں انفارم کر دیتی ہوں۔ آپ کا نام؟"
ریسپشنسٹ نے کہا۔
"امامہ۔" وہ اپنا نام بتا کر ہال میں پڑے صوفوں میں سے ایک صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔
اسے تقریباً پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے ہوئے آتے جاتے لوگوں کو دیکھتے اسے یہ لمحے بہت طویل لگے تھے۔
پندرہ منٹ بعد اس نے چند افراد کے ساتھ سالار کو بات چیت کرتے ریسپشن پر نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ اس سے کافی فاصلے پر تھا اور ادھر ادھر نظر دوڑائے بغیر وہ ان لوگوں کے ہمراہ ریسپشن کی انٹرنس تک گیا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے امامہ کو خدشہ ہوا کہ وہ کہیں ان کے ساتھ باہر نہ نکل جائے لیکن وہ دروازے سے کچھ پہلے ان لوگوں سے ہاتھ ملانے لگا تھا۔ وہ یقیناً انہیں چھوڑنے کے لیے وہاں آیا تھا۔
چند منٹ دروازے پر ان لوگوں کے ساتھ بات کرنے کے بعد وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دوبارہ واپس جانے لگا' ریسپشنسٹ نے اسے روکا۔ اس نے یقیناً دور صوفے سے کھڑی ہوئی امامہ کو دیکھ لیا تھا ورنہ وہ سالار کو کبھی وہاں روک کر اس کے کسی وزیٹر کے بارے میں انفارم نہ کرتی۔ امامہ نے سالار کو ریسپشنسٹ کی بات سنتے اور پھر ٹھٹکتے دیکھا' وہ اپنی ایڑیوں پر گھوم گیا تھا۔ وہ بہت فاصلے پر تھی لیکن اتنے فاصلے پر نہیں تھی کہ وہ اسے دیکھ یا پہچان نہ پاتا۔ اسے سالار کے چہرے پر اتنی دور سے بھی حیرت نظر آئی' پھر وہ مسکرایا تھا۔ اس نے پلٹ کر ریسپشن سے یقیناً اس کا تعارف کروایا' پھر وہ رکے بغیر اس کی طرف بڑھ آیا۔ اگر وہ اس سے گھر میں سامنا کر رہی ہوتی تو اس وقت وہ سالار سے لپٹ کر بچوں کی طرح رو رہی ہوتی۔ وہ کچھ ایسی ہی ذہنی حالت میں تھی لیکن وہ یہاں یہ نہیں کر سکتی تھی۔
"what a pleasant surprise"

اس نے قریب آتے ہوئے کہا۔ وہ بے حد خوشگوار موڈ میں تھا۔

"میرا جوتا ٹوٹ گیا ہے۔" اس نے بے ربطی سے جواب دیا۔ اس نے سالار سے نظریں ملائے بغیر سر جھکائے ہوئے کہا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کی آنکھیں پڑھے کیونکہ وہ جانتی تھی' وہ اس کی آنکھوں کو کھلی کتاب کی طرح پڑھ سکتا تھا۔

"سامنے سگنل پر میری گاڑی خراب ہو گئی۔ اور لطف اللہ اسے کہیں لے گیا ہے۔ اور یہاں تمہارا آفس تھا تو میں یہاں آ گئی۔ لیکن شاید نہیں آنا چاہیے تھا کیونکہ تم مصروف ہو۔ بس تم مجھے گھر بھجوا دو۔" اس نے جواباً "ایک کے بعد ایک مسئلہ بتاتے ہوئے اسے بے حد بے ڈھنگے انداز میں کہا۔

"نو پرابلم۔" سالار نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"سوری میم' آپ مجھے اپنا تعارف کرا دیتیں تو میں آپ کو آفس میں بٹھا دیتی۔"

ڈیسک پر بیٹھی لڑکی نے اس کے قریب آ کر معذرت کی تھی۔

"اٹس او کے۔ کسی کو بھیج کر یہاں قریب کسی شو اسٹور سے اس سائز کا جوتا منگوا دیں۔"

اس نے اس لڑکی سے کہا اور پھر اگلا جملہ امامہ سے کہا۔

"امامہ' یہ ٹوٹا ہوا جوتا اتار دو۔"

"اتار دوں؟" وہ ہچکچائی۔

"ہاں۔ کوئی حرج نہیں۔ میرے باتھ روم میں وضو کے لیے سلیپرز ہیں' وہ پہن کر پاؤں دھو لینا تب تک نیا جوتا آ جائے گا تمہارے لیے۔ اور کس سگنل سے گاڑی لے کر گئے ہیں؟"

امامہ نے اسے اندازے سے بتایا۔

اس نے ڈیسک سے آنے والی لڑکی کو گاڑی کا نمبر بتاتے ہوئے کچھ ہدایات دیں۔ وہ تب تک ٹوٹے ہوئے جوتے سے اپنا پاؤں نکال چکی تھی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے' وہ اسے وہاں سے لے آیا۔ اپنے ہاتھ پر اس کی گرفت سے امامہ نے محسوس کیا کہ اسے اس وقت اس سہارے کی بے حد ضرورت تھی۔ ایک پاؤں میں جوتا نہ ہونے کے باوجود وہ بڑی سہولت سے چلتے ہوئے اس کے آفس میں آ گئی تھی۔ وہ راستے میں ملنے والے افراد سے اسی ریلیکسڈ اور عام سے انداز میں اسے متعارف کرواتا کوریڈور سے اپنے آفس آ گیا تھا۔

"ویسے تم اس طرف آ کیسے گئیں؟" اپنے آفس کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے امامہ سے پوچھا۔

"میں۔" اسے کوئی بہانہ یاد نہیں آیا۔ اس کا ذہن اس وقت کچھ اتنا ہی خالی ہو رہا تھا۔ سالار چند لمحے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر اس نے بات بدل دی۔

"تم کھڑی کیوں ہو' بیٹھ جاؤ۔" اپنے ٹیبل کی طرف جاتے ہوئے اس نے انٹر کام کا ریسیور اٹھاتے ہوئے اس سے کہا۔

اس کے سائیڈ ڈیسک پر رکھی اپنی ایک فریمڈ تصویر سے نظریں ہٹاتے ہوئے' وہ کمرے کے ایک کونے میں پڑے صوفوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ وہ انٹر کام پر اس کے لیے کوئی جوس لانے کا کہہ رہا تھا' جب اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے اپنا سیل فون اٹھا کر کال ریسیو کی' چند لمحے وہ فون پر بات کرتا رہا پھر اس نے امامہ سے کہا "امامہ! تمہارا کریڈٹ کارڈ کہاں ہے؟"

وہ اس کے سوال پر چونک گئی۔ اس کے پاس ایک سپلیمنٹری کارڈ تھا۔

"میرے بیگ میں۔"

"ذرا چیک کرو۔" اس نے بیگ سے والٹ نکالا اور پھر باری باری اس کے تمام حصے چیک کیے' وہاں کارڈ نہیں

تھا۔اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔
"اس میں نہیں ہے۔" اس نے اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ سالار سے کہا۔
اس نے جواب دینے کے بجائے فون پر کہا۔
"بالکل، میری بیوی چھوڑ آئی تھیں وہاں۔ میں منگوا لیتا ہوں۔ تھینک یو۔" اس نے فون بند کر دیا۔ امامہ کی جیسے جان میں جان آئی۔
"کہاں ہے کارڈ؟" امامہ نے پوچھا۔
"کہاں شاپنگ کی ہے تم نے؟" سالار نے اس کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔
اسے ڈیپارٹمنٹل اسٹور یاد آیا۔
"وہاں چھوڑ دیا تھا میں نے؟" اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا۔
"ہاں، اسٹور کے مینیجر نے پولیس لائن کو انفارم کیا۔ وہ تمہارے سیل پر ٹرائی کرتے رہے، لیکن تم نے کال ریسیو نہیں کی۔ اب انہوں نے مجھے کال کیا ہے۔"
وہ بیگ سے اپنا سیل نکال کر دیکھنے لگی۔ اس پر واقعی بہت ساری مسڈ کالز تھیں، لیکن یہ کب آئی تھیں۔؟ شاید جب وہ ریسٹورنٹ میں بیٹھی اپنی سوچوں میں غرق تھی۔
ایک آدمی ایک ٹرے میں پانی اور جوس کا گلاس لے کر آگیا۔ اسے اس وقت اس کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ پیاس کی وجہ سے نہیں بلکہ شرمندگی کی وجہ سے۔
سالار دوسرے صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ اس دوران انٹر کام دوبارہ بجا اور وہ اٹھ کر گیا۔ گاڑی کا پتا چل گیا تھا۔
"امامہ، گاڑی کے پیپرز کہاں ہیں؟" اس نے ایک بار پھر فون ہولڈ پر رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔
امامہ کو اپنی اگلی حماقت یاد آئی۔ پیپرز گاڑی میں ہی تھے۔ وہ پیپرز اور لائسنس دونوں وہاں چھوڑ کر آئی تھی۔ اس برانڈ نیو گاڑی پر اگر کوئی ہاتھ صاف کرتا تو اس خوش قسمت کو گاڑی کے ساتھ یہ دونوں چیزیں بھی انعام میں ملتیں۔ کیونکہ لفٹر اسے مطلوبہ پارکنگ میں چھوڑ کر وہاں سے جا چکا تھا۔ اس پر اسٹیکر لگا ہوتا تو شاید وہ اسے کہیں اور لے کر جاتا، لیکن اب وہ اسے قریبی پارکنگ میں چھوڑ گئے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا مالک گاڑی کے پیچھے آرہا ہوگا۔
جوس یک دم اس کے حلق میں اٹکنے لگا تھا۔
"گاڑی میں۔" اس نے نظریں ملائے بغیر کہا۔ جواباً اسے ملامت نہیں کی گئی جس کی وہ توقع کر رہی تھی۔
"آئی ڈی کارڈ کی کاپی ہے؟" وہ کسی کو گاڑی لانے کے لیے بھیجنا چاہتا تھا اور حفظ ماتقدم کے طور پر آئی ڈی کارڈ یا گاڑی کے پیپرز ساتھ دینا چاہتا تھا، کہ اگر اسے پارکنگ میں چیک کیا جائے تو گاڑی لانے میں دقت نہ ہو۔ وہ گلاس رکھ کر ایک بار پھر آئی ڈی کارڈ اپنے بیگ میں ڈھونڈنے لگی۔ وہاں بھی اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اسے یاد آیا کہ وہ دوسرے بیگ میں تھا۔ اس کا دل وہاں سے بھاگ جانے کو چاہا۔ اسے خود پر شدید غصہ آرہا تھا۔ اس دفعہ سالار نے اس کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔
"میرے پیپرز میں دیکھو، میری وائف کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی ہوگی، وہ ڈرائیور کو دے دو اور کار کی چابیاں بھی بھجوا دیتا ہوں۔" اس نے فون پر کہا۔
"تمہیں اگر فریش ہونا ہو تو میرے سلیپرز یہاں پڑے ہیں۔"
یہ آفر بے حد بروقت آئی تھی۔ اسے واقعی اس وقت کوئی ایسی جگہ چاہیے تھی جہاں وہ اپنا منہ چھپا لیتی۔ اس نے زندگی میں کبھی خود کو اتنا ناکارہ اور احمق محسوس نہیں کیا تھا۔
باتھ روم کا دروازہ بند کیے، وہ اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتی گئی۔ پانی کچھ بہا نہیں پا رہا تھا، نہ شرمندگی، نہ وہ

ہتک نہ اس کا رنج۔
"سنا ہے تمہاری کوئی گرل فرینڈ آئی ہے؟"
اس نے باہر رمشہ کی آواز سنی۔ وہ سالار کو چھیڑ رہی تھی اور وہ جواباً ہنسا تھا۔
"ہاں آج کی Disasterous میٹنگ کے بعد بھی گرل فرینڈ کا ایک وزٹ تو ڈیزرو کرتا تھا میں۔" وہ آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے ان کی گفتگو سنتی رہی۔ دونوں اب کسی کلائنٹ اور آج کی میٹنگ کو ڈسکس کر رہے تھے۔
اس کا دل چاہا تھا وہ واپس کمرے میں نہ جائے وہ اس سین سے غائب ہونا چاہتی تھی۔
باتھ روم کا دروازہ کھلنے پر رمشہ خیر مقدمی انداز میں اس کی طرف آئی۔
"چلو کسی بہانے تمہاری بیگم تو یہاں آئیں۔" رمشہ نے اس سے ملتے ہوئے کہا تھا۔
سالار جواب دینے کے بجائے صرف مسکرایا۔ چند منٹ وہ کھڑی باتیں کرتی رہی پھر اس نے کہا۔
"اب اگلی میٹنگ سے تو تم آرہے ہو کیا؟"
"ہاں میں آتا ہوں۔ تم اسٹارٹ کرو میٹنگ میں دس پندرہ منٹ میں آجاتا ہوں۔"
اس نے کہا۔ رمشہ امامہ کو خدا حافظ کہتے ہوئے نکل گئی۔
"تم چلے جاؤ گاڑی آئے گی تو میں چلی جاؤں گی۔" اس نے کمرے میں پڑے جوتے کے ڈبے سے نیا جوتا نکالتے ہوئے سالار سے کہا۔ اسے لگ رہا تھا وہ اس وقت ایک خواہ مخواہ کی لائبیلیٹی بن کر آئی تھی۔
"تم سینڈوچ کھاؤ۔ تم نے ہی منع کر دیے تھے "آج کلائنٹس کے ساتھ لنچ کیا ہے، یہ کھا نہیں سکا۔" وہ ٹیبل پر پڑے سینڈوچ کا ایک ٹکڑا کھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس وقت حلق سے کچھ اتارنا بہت مشکل تھا۔
"کیوں بھوک نہیں ہے؟ لنچ کیا ہے تم نے؟"
"نہیں لیکن بھوک نہیں ہے۔"
"پھر کھاؤ صرف ایک کھالو" وہ اسے بہلا رہا تھا۔ امامہ کے ساتھ کوئی مسئلہ تھا اور اس وقت پوچھنا بے کار تھا۔ جب بھی وہ پریشان ہوتی اسی طرح چیزیں بھولتی تھی اور اتنے مہینوں میں سالار اس چیز کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ اس کے لیے اب کوئی غیر معمولی بات نہیں رہی تھی۔
وہ اب سر جھکائے سینڈوچ کھانے لگی تھی جو اس نے پلیٹ میں اس کے سامنے رکھا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ اب اس کی ان تمام حرکات پر کوئی تبصرہ کرے گا مگر وہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ سینڈوچ ختم ہونے کے بعد اس نے امامہ سے چائے کا پوچھا اور اس کے انکار پر اس نے انٹرکام پر کسی سے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کے لیے کہا۔
"میں تمہیں اپنی گاڑی میں بھجوا رہا ہوں۔ تمہاری گاڑی جب آئے گی تو میں بھجوا دیتا ہوں۔"
"میں خود ڈرائیو کر کے چلی جاتی ہوں۔" اس نے کہا۔
"نہیں ڈرائیور تمہیں ڈراپ کرے گا۔ تم اپ سیٹ ہو اور میں نہیں چاہتا تم ڈرائیو کرو۔" وہ بول نہیں سکی، یہ جاننے کے باوجود کہ وہ بڑی آسانی سے جان گیا ہو گا کہ اس وقت اسے کوئی پریشانی تھی۔
"میں خود چلی جاتی ہوں۔" اس نے بینک کی ایگزٹ پر سالار سے کہا۔
"یار کلائنٹس کو بھی یہاں تک چھوڑنے آجاتا ہوں تم تو بیوی ہو میری۔" وہ مسکرایا تھا۔
ڈرائیور پارکنگ میں کھڑی گاڑی دروازے کے سامنے لے آیا تھا۔ ڈرائیور گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لیے آیا مگر اس سے پہلے سالار اس کے لیے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول چکا تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھنے کے بجائے اسے رک کر دیکھنے لگی۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی مگر اس کے حلق میں ایک بار پھر سے گرہیں پڑنے لگی تھیں۔

"Anything else Ma'am" سالار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ سمجھا کہ وہ اسے کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔

"تھینک یو۔" اس نے بالآخر کہا۔

"Always at your disposal ma'am"

اس نے اپنا بازو اس کے گرد پھیلاتے ہوئے اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ گاڑی میں بیٹھ گئی' سالار نے دروازہ بند کر دیا۔ چلتی ہوئی گاڑی میں سے امامہ نے ایک لمحے کے لیے مڑ کر دیکھا۔ وہ ابھی وہیں کھڑا تھا' وہ یقیناً" گاڑی کے مین روڈ پر جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا تھا۔

جس کی ذمہ داری تھی وہ شخص اس کے لیے کھڑا تھا۔ وہ جلال کی ذمہ داری نہیں تھی' پھر وہ کیوں یہ توقع کر رہی تھی کہ وہ اس کے لیے اتنی کرٹسی دکھاتا۔ اس نے ٹھیک کیا تھا' اسے ڈرائیور کے ساتھ بھیجا تھا۔ وہ واقعی اس وقت گاڑی ڈرائیو کرنے کے قابل نہیں تھی۔ وہ اپنی گاڑی میں ہوتی تو گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کر کے اندر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی۔ نہ وہ اتنی بے وقعت تھی جتنی ہر بار جلال کے سامنے جا کر ہو جاتی تھی' نہ وہ اتنی انمول تھی جتنا یہ شخص اسے سمجھ رہا تھا۔ ایک اسے کوئلہ سمجھ کر رہا تھا' اور دوسرا کوہ نور۔ وہ بے وقعتی کانچ کی طرح لگتی تھی اور یہ وقعت خنجر کی طرح۔ لیکن دونوں چیزیں زخمی کرتی تھیں اسے۔

وہ گھر آ کر بھی بہت دیر تک لاؤنج میں بے مقصد بیٹھی رہی تھی۔ آج کا دن بے حد برا تھا' بے حد۔ کوئی چیز اسے پرسکون نہیں کر پا رہی تھی۔ تکلیف دہ یادوں کا ایک سلسلہ تھا جو ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟" سالار نے رات کو کھانے کی ٹیبل پر اس سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" جواب حسب توقع تھا۔

سالار نے کھانا کھاتے کھاتے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔

"کوئی پریشانی نہیں ہے مجھے۔ بس اپنی فیملی کو مس کر رہی ہوں۔" اس نے جھوٹ بولا۔

یہ واحد طریقہ تھا جس سے اس گفتگو کا موضوع اس کی ذات سے ہٹ سکتا تھا۔

سالار نے اسے کریدا نہیں تھا۔ وہ بعض دفعہ اسی طرح پریشان ہوتی تھی۔ اور وہ اسے صرف بہلانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ آج بھی اس نے یہی کیا۔ وہ ڈنر کے بعد کام کے لیے اپنے اسٹڈی روم میں چلا گیا۔ امامہ نے سونے کی کوشش کی' لیکن وہ سو نہیں سکی۔ ایک بار پھر سب کچھ فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگا' وہ فلم جو آج بار بار چلتی رہی تھی۔

کتنا وقت اس نے اندھیرے میں بستر میں چت لیٹے' چھت کو گھورتے ہوئے گزارا تھا' اسے اندازہ ہی نہیں ہوا۔ اس کی سوچوں کا تسلسل تب ٹوٹا تھا جب کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ سالار سونے کے لیے حتی الامکان آہستگی سے دروازہ کھولتے ہوئے اندر آیا تھا۔ پھر دروازہ بند کر کے' وہ لائٹ آن کیے بغیر اسی طرح احتیاط سے دبے پاؤں واش روم کی طرف چلا گیا تھا۔

امامہ نے آنکھیں بند کر لیں' نیند اب بھی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے سونے کے لیے بیڈ پر آ کر لیٹا تھا۔ اس نے امامہ کی طرف کروٹ لی اور پھر امامہ نے اس کی آواز سنی۔

"تم جاگ رہی ہو؟" اس نے اپنی کمر کے گرد سالار کا بازو حمائل ہوتے ہوئے محسوس کیا۔

"تمہیں کیسے پتا چل جاتا ہے؟" وہ کچھ جھلائی تھی۔

"پتا نہیں کیسے؟ بس پتا چل ہی جاتا ہے۔ کیا پریشانی ہے؟" ایک لمحہ کے لیے اس کا دل چاہا وہ اسے بتا دے اپنی اور جلال کی ملاقات کے بارے میں لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے اس خیال کو جھٹک دیا تھا۔ اس سارے واقعے میں بتانے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ کوئی ایسی چیز جو کسی کے لیے بھی قابل اعتراض ہوتی' وہ سالار کو بھی یہ نہیں سمجھا سکتی تھی کہ وہ جلال کی کن باتوں پر تکلیف محسوس کر رہی تھی تو پھر بتانے کا فائدہ کیا ہوتا۔

"کچھ نہیں بس میں ڈپریسڈ تھی۔"

"اسی لیے تو کہا تھا کہ باہر چلتے ہیں۔" وہ اب اس کے بازو پر سہلانے والے انداز میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں اب۔" امامہ نے یکدم۔۔۔ کسی ننھے بچے کی طرح اس کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے اس سے کہا۔ اس کے سر کو چومتے ہوئے وہ اسے تھپکنے لگا' امامہ کا دل بھر آیا۔ اگر اس کی زندگی میں جلال انصر کے نام کا کوئی باب نہ آیا ہوتا تو کیا ہی اچھا تھا۔ وہ اس شخص کے ساتھ بہت خوش رہ سکتی تھی' جس کے سینے میں منہ چھپائے' وہ اس وقت ماضی کو کھوجنے میں مصروف تھی۔ زندگی میں وہ لوگ کیوں آتے ہیں' جو ہمارا مقدر نہیں ہوتے' وہ مقدر نہیں بنتے تو ابدی کا کانٹا کیوں بن جاتے ہیں؟



جلال کے ساتھ ہونے والی وہ ملاقات اس کے لیے ایک اتفاق تھا' ایک ایسا اتفاق جسے وہ دوبارہ نہیں چاہتی تھی۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتفاقی ملاقات اس کے لیے بہت خطرناک اثرات لے کر آنے والی تھی' مہینوں یا سالوں میں نہیں بلکہ دنوں میں۔

دو دن بعد وہ ایک ڈنر میں مدعو تھے۔ وہ اس وقت سالار کے ساتھ کھڑی چند لوگوں سے مل رہی تھی جب اس نے پہلو کی ایک شناسا سی آواز سنی۔ امامہ نے گردن موڑ کر دیکھا اور پھر ہل نہیں سکی۔ وہ فاروق تھا۔ جو بے حد گرم جوشی کے ساتھ سالار سے مل رہا تھا۔

"میری بیوی۔" سالار اب اس کا تعارف کروا رہا تھا۔

"تعارف کی ضرورت نہیں ہے' میں پہلے ہی ان سے مل چکا ہوں۔" فاروق نے بے حد گرم جوشی سے کہا۔

سالار نے کچھ حیران سا ہو کر فاروق کو دیکھا۔

"آپ پہلے مل چکے ہیں امامہ سے؟"

"بالکل ابھی پرسوں ہی تو ملاقات ہوئی ہے۔ ڈاکٹر جلال انصر کے ساتھ لنچ کر رہی تھیں۔ دراصل جلال ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں' انہوں نے بتایا کہ یہ ان کی پرانی کلاس فیلو ہیں اور جب انہوں نے آپ کا وزیٹنگ کارڈ انہیں دیا تب مجھے پتا چلا کہ یہ آپ کی وائف ہیں۔" فاروق بڑے خوش گوار انداز میں کہہ رہا تھا۔

"میں نے اور میری مسز نے تو کھانے پر انوائٹ کیا تھا لیکن انہوں نے کہا کہ آپ آج کل مصروف ہیں۔"

فاروق نے نہ امامہ کی فق ہوتی رنگت کو دیکھا' نہ سالار کے بے تاثر چہرے کو۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا' سالار کو اس پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن یقین نہ کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس کے کان جیسے سن ہو رہے تھے۔ اس نے گردن موڑ کر اپنے بائیں طرف کھڑی امامہ کو دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ وہ فی الحال اس کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جلال انصر کے ساتھ مل رہی تھی۔۔۔ اور کب سے؟

فاروق کی بات سنتے ہوئے امامہ نے خشک ہوتے ہوئے حلق کے ساتھ سالار کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ بغور فاروق کی بات سن رہا تھا اور اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ اس نے اس کے بے تاثر چہرے کو دیکھ کر غلط اندازہ لگایا تھا۔

میں اسے سب کچھ بتادوں گی وہ میری بات سمجھ لے گا اس کے بے تاثر چہرے نے امامہ کو عجیب سی خوشی فہمی کا شکار کیا تھا۔ وہ ابتدائی شاک سے نکلنے لگی تھی۔ مجھے پرسوں ہی سالار کو بتا دینا چاہیے تھا تب اسے یہ شرمندگی نہ ہوتی۔ اسے ذرا پچھتاوا ہوا۔ وہاں کھڑے فاروق کی بات سنتے اور سالار کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے ان حالات میں سالار کے ردعمل کو بالکل غلط سمجھا تھا اور کیوں نہ سمجھتی اتنے مہینوں سے وہ جس شخص کے ساتھ رہ رہی تھی وہ اس کے ناز نخرے اٹھانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر رہا تھا۔ اس نے اسے کبھی یہ تاثر نہیں دیا تھا کہ وہ اس سے ناراض ہو سکتا تھا یا اس کی کسی غلطی پر اسے معاف نہیں کر سکتا تھا۔

"آپ ظہیر صاحب سے ملے ہیں؟" اس نے یک دم سالار کو فاروق کی بات کاٹتے دیکھا۔

"آئے ہوئے ہیں کیا؟"

"ہاں، ابھی ہم لوگ آپ ہی کی بات کر رہے تھے۔ آئیں میں آپ کو ملواتا ہوں۔" سالار فاروق کو لیے ایک طرف چلا گیا۔

امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے موضوع بدلا تھا یا وہ فاروق کو واقعی کسی ظہیر صاحب سے ملوانا چاہتا تھا۔ وہ دوبارہ پلٹ کر اس کی طرف نہیں آیا۔ وہ ڈنر کے دوران بھی مردوں کے ایک گروپ کے پاس کھڑا رہا۔ وہ خود بھی اپنی کچھ دوسری شناسا خواتین کے ساتھ کھڑی رہی۔ ایسا پہلی بار ہو رہا تھا کہ کسی پارٹی میں وہ اس کے پاس ہی نہ آیا ہو۔ اسے پریشانی ہونے لگی لیکن اسے ابھی بھی یقین تھا سالار اس چیز کو بہت بڑا ایشو نہیں بنائے گا۔

پارٹی کے ختم ہونے پر میزبانوں سے رخصت ہو کر وہ ہوٹل کی لابی کے دروازے پر اپنی کار کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ امامہ نے ایک بار پھر اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔ اس کا چہرہ اتنا ہی بے تاثر تھا جتنا پہلے تھا۔ لیکن اس کی خاموشی اور سنجیدگی بے حد معنی خیز تھی۔ امامہ نے بات کا آغاز کرنے کا سوچا اور تب ہی ہوٹل کا ایک ملازم ان کی گاڑی ڈرائیو وے میں لے آیا تھا۔ سالار اسے مخاطب کیے بغیر باہر نکل گیا۔ اسے اب شبہ نہیں رہا تھا۔ کہ اس کی اس اچانک خاموشی اور بے اعتنائی کی وجہ کیا تھی۔

گاڑی میں بیٹھے ہوئے بھی اس کی خاموشی اسی طرح تھی۔ گاڑی کے مین روڈ پر آنے کے چند منٹوں کے بعد امامہ نے اس طویل خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی۔

"تم ناراض ہو مجھ سے؟"

"Will you please shut up" وہ فریز ہو گئی تھی۔

"میں اس وقت گاڑی ڈرائیو کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری بکواس سننا نہیں چاہتا۔" وہ اس پر چلایا نہیں تھا لیکن جو کچھ اس کی نظروں اور اس کے ٹھنڈے لہجے میں تھا، وہ امامہ کو مارنے کے لیے کافی تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا، کہ بات اتنی معمولی نہیں جتنی وہ سمجھ رہی تھی۔ وہ اسے دوبارہ مخاطب کرنے کی ہمت نہیں کر سکی۔ اتنے مہینوں میں اس نے پہلی بار اسے اندھا دھند گاڑی ڈرائیو کرتے دیکھا تھا۔

اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے بعد وہ اپنی جیکٹ لاؤنج میں صوفے پر پھینکتے ہوئے سیدھا کچن میں گیا۔ امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کچن میں جائے یا اس کے بیڈ روم میں آنے کا انتظار کرے۔ اپنی چادر اتارتے ہوئے وہ کچھ دیر اپارٹمنٹ کے بیرونی دروازے کے پاس ہی کھڑی رہی۔ اس کا ذہن اب ماؤف ہونے لگا تھا۔ وہ اتنے مہینوں سے ایک "عاشق" اور "دوست" کے ساتھ رہ رہی تھی اور آج پہلی بار ایک "شوہر" کا سامنا کر رہی تھی۔

کوریڈور میں کھڑے کھڑے اس نے اپنے سینڈلز اتارے۔ تب ہی اس نے سالار کو کچن ایریا سے پانی کا گلاس لے جاتے اور پھر ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھتے دیکھا۔ اب اس کی پشت امامہ کی طرف تھی۔ پانی کا گلاس خالی کر کے ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ اب اپنے گلے سے ٹائی اتار رہا تھا۔ وہ چند لمحے کھڑی اسے دیکھتی رہی، پھر آگے بڑھ

آئی۔ کرسی کھینچ کر وہ بیٹھی ہی تھی کہ وہ کرسی دھکیلتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"سالار! میری بات تو سنو!"
"ابھی کچھ اور رہ گیا ہے، جو تم نے مجھے بتانا ہے؟"
اس نے سالار کی آنکھوں میں اپنے لیے کبھی تحقیر نہیں دیکھی تھی، لیکن آج دیکھ رہی تھی۔
"مجھے وضاحت کا موقع تو دو۔"
"وضاحت۔۔۔؟ کس چیز کی وضاحت۔۔۔؟ تم مجھے یہ بتانا چاہتی ہو کہ تم نے اپنے ایکس بوائے فرینڈ کے لیے اپنے شوہر کو دھوکا دینا کیوں ضروری سمجھا؟" اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔
"یا تم مجھے یہ بتاؤ گی کہ تمہارے ایکس بوائے فرینڈ کی وہ کون سی خوبی ہے، جو تمہیں اپنے شوہر میں نظر نہیں آئی۔" وہ اپنے لہجے سے اسے کاٹ رہا تھا۔
"اس سے بہتر یہ ہے کہ تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم کب سے اس سے مل رہی ہو؟"
"میں اتفاقاً اس سے ملی تھی۔ صرف ایک بار۔"
اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کچھ کہنے کی کوشش کی۔ سالار نے ڈائننگ ٹیبل پر پوری قوت سے ہاتھ مارا تھا۔
"Stop befooling me woman!"
وہ پوری قوت سے چلایا تھا۔ امامہ کی آواز بند ہو گئی۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے یوں جیسے ختم ہو رہا تھا۔
"تم سمجھتی ہو میں اب تم پر اعتبار کروں گا۔ تم نے میری نظروں میں آج اپنی عزت ختم کر لی ہے۔"
"You are nothing but a bloody cheater."
وہ کہتے ہوئے وہاں رکا نہیں تھا۔ بیڈ روم میں جانے کی بجائے وہ اسٹڈی روم میں چلا گیا تھا۔
امامہ نے مٹھیاں بھینچ کر جیسے اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے الفاظ اس کے کانوں میں بار بار گونج رہے تھے۔ وہ بے حد تکلیف دہ تھے، لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ اس کی کاٹ دار نظریں تھیں۔

بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنی سالار نے بنالی تھی، لیکن بات اتنی چھوٹی بھی نہیں تھی جتنی اس نے سمجھی تھی۔ وہ اس کے اور جلال کے ماضی کے تعلق سے واقف نہ ہوتا تو کبھی بھی کسی کلاس فیلو کے ساتھ کھانا کھانے پر اتنا ہنگامہ کھڑا کرنے والا مرد وہ نہیں تھا۔
اسے خود ہی جلال سے ملاقات کے بارے میں بتا دینا چاہیے تھا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے آنسوؤں کے ساتھ اب وہ خود کو ملامت کر رہی تھی۔
وہ اٹھ کر بیڈ روم میں آگئی۔ سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ ماؤف ذہن اور حواس کے ساتھ صرف سالار کے الفاظ ذہن سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سوال یہ نہیں تھا کہ وہ اسے غلط سمجھ رہا تھا، سوال یہ تھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیا وہ بھی اسے اسی طرح ناقابل اعتبار سمجھتا ہے، جس طرح وہ اسے سمجھتی ہے۔
وہ ساری رات جاگتی رہی۔ سالار بیڈ روم میں نہیں آیا تھا۔ اسے یقین تھا، صبح تک اس کا غصہ ختم نہیں تو کم ضرور ہو جائے گا اور وہ اس سے دوبارہ بات کرنا چاہتی تھی۔
وہ فجر کے وقت کمرے میں آیا تھا۔ اس پر ایک نظر ڈالے بغیر وہ کپڑے تبدیل کر کے نماز پڑھنے کے لیے چلا گیا تھا۔
اس کی واپسی ہمیشہ کی طرح جم اور جاگنگ کے بعد آفس جانے سے کچھ دیر پہلے ہوئی تھی۔ اس نے امامہ کو تب بھی مخاطب نہیں کیا تھا۔ امامہ کے نکالے ہوئے کپڑوں کے بجائے، وہ اپنے نکالے ہوئے کپڑے لے کر واش روم

میں گیا تھا۔

وہ کچھ دل برداشتہ سی ہو کر کچن میں ناشتا تیار کرنے لگی۔ سالار تیار ہو کر لاؤنج میں آیا لیکن ناشتے کی ٹیبل پر جانے کی بجائے وہ اسٹڈی روم میں چلا گیا۔ اسے پتا تھا کہ وہ اپنا لیپ ٹاپ لینے وہاں گیا تھا' لیکن یہ وہ ناشتا کرنے کے بعد کیا کرتا تھا' آج پہلے لینے کا مطلب تھا کہ۔

"سالار! ناشتا لگا دیا ہے میں نے۔" اس کے اسٹڈی روم سے نکلنے پر امامہ نے اسے کہا تھا۔

"اس کے لیے تم جلال کو بلالو۔" اس نے بات نہیں کی تھی' اسے کوڑا مارا تھا وہ سفید پڑ گئی۔ وہ ایک لمحہ رکے بغیر اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر نکل گیا۔ اسے احساس نہیں ہوا کہ وہ کتنی دیر وہیں ڈائننگ ٹیبل کے قریب کھڑی رہی۔ اس کے لفظ کسی خاردار تار کی طرح اس کے وجود کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھے۔

وہ سارا دن کچھ نہیں کھا سکی تھی۔ اس نے دو بار سالار کو کال کی' لیکن اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ اسے یہی توقع تھی۔ اس نے ٹیکسٹ میسج کے ذریعے اس سے معافی مانگی۔ اس نے ٹیکسٹ میسج کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ روزانہ سات یا آٹھ بجے کے قریب گھر آجاتا تھا۔ اگر کبھی اسے دیر سے آنا ہوتا تو وہ اسے مطلع کر دیا کرتا تھا' لیکن اس دن وہ رات کو تقریباً دس بجے کے قریب گھر آیا تھا۔

"آج بہت دیر ہو گئی؟" امامہ نے دروازہ کھولنے پر پوچھا۔ سالار نے جواب نہیں دیا۔

وہ کھڑی صرف اسے دیکھتی رہ گئی۔ لاؤنج میں ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی آن کرتے ہوئے وہ بیڈ روم میں چلا گیا۔ یہ جیسے اشارہ تھا کہ وہ دوبارہ ٹی وی دیکھنے کے لیے وہاں آئے گا۔ امامہ کو یقین تھا کہ وہ کھانا نہیں کھائے گا' لیکن بوجھل دل کے ساتھ اس نے کھانا لگانا شروع کر دیا تھا۔

وہ دس پندرہ منٹ کے بعد کپڑے تبدیل کر کے لاؤنج میں آگیا تھا۔ فریج سے ایک انرجی ڈرنک نکال کر وہ لاؤنج کے صوفہ پر بیٹھ کر چینل سرفنگ کرنے لگا۔

"کھانا تیار ہے!" امامہ نے اسے انفارم کیا۔ وہ ٹی وی دیکھتا رہا۔

"تم کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟" وہ آگے بڑھی۔ اس نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر اسے کہا۔

"یہ میرا گھر ہے' یہاں موجود ہر چیز میری ہے اور کھانا کھاؤں یا نہ کھاؤں میرا مسئلہ ہے تمہارا نہیں۔" اس کی آنکھوں میں بے رخی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

"میں نے تمہارے انتظار میں ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔" اس نے بھی اس شخص کے سامنے اپنا ایسا لہجہ رکھنے کا سوچا تک نہیں تھا۔ وہ "محبت" نہیں بلکہ "رشتہ" تھا جو اس کو کمزور کر رہا تھا۔

"Stop this bullshit." وہ چینل تبدیل کرتے ہوئے عجیب سے انداز میں ہنسا تھا۔

"میں تمہارے ہاتھوں بے وقوف ضرور بن گیا ہوں لیکن بے وقوف ہوں نہیں۔"

"سالار! تم جو سمجھ رہے ہو ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔" وہ اس کے سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

"بالکل ٹھیک کہا تم نے جو میں تمہیں سمجھ رہا تھا' وہ واقعی غلط تھا۔"

امامہ کے حلق میں پھر گرہیں پڑنے لگی تھیں۔

"تم میری بات کیوں نہیں سن لیتے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"امامہ! آج میرے سامنے رونا مت' تم مجھے استعمال کر رہی ہو' ایکسپلائٹ کر رہی ہو۔ کرو' لیکن ایموشنلی بلیک میل مت کرو مجھے۔"

وہ اس کی آنکھوں میں نمودار ہوتے آنسوؤں کو دیکھ کر بری طرح مشتعل ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے، تم بات نہیں سننا چاہتے مت سنو، لیکن معاف کر دو مجھے... میں تم سے ایکسکیوز کرتی ہوں۔ میری غلطی تھی، مجھے اس سے نہیں ملنا چاہیے تھا۔" اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ دنیا کا سب سے مشکل کام اپنے ناکردہ گناہ کے لیے معذرت کرنا تھا، اسے اب احساس ہو رہا تھا۔

"اس طرح ملنے کے بجائے، تمہیں اس سے شادی کر لینی چاہیے۔" اس نے اس کی بات کاٹ کر کہا تھا۔

"سالار! وہ شادی شدہ ہے۔" وہ بات مکمل نہیں کر سکی، اس کے آنسو بہنے لگے تھے اور اس کے بات ادھورا چھوڑنے پر وہ سلگا تھا۔

"بہت دکھ ہے تمہیں اس کے شادی شدہ ہونے کا؟ تو کہو اسے، تم سے سیکنڈ میرج کر لے یا بیوی کو طلاق دے، لیکن اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے، تم تو ویسے ہی اسے available ہو۔"

وہ سانس نہیں لے سکی، کم از کم اسے اس کی زبان سے یہ سننے کی توقع نہیں تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے بے یقینی سے کہا۔

"تم جو مطلب نکالنا چاہتی ہو نکال لو۔" اس نے سامنے پڑی ٹیبل پر انرجی ڈرنک کا کین اور ریموٹ کنٹرول دونوں رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے کریکٹر پر بات کر رہے ہو تم؟" اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

"کریکٹر ہے تمہارا؟" اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"کریکٹر دیکھ کر تو شادی کی تھی تم نے۔" اسے اپنی بھرائی ہوئی آواز سے خود جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی۔

"شادی نہیں، غلطی کی تھی... And I regret it۔" وہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آیا تھا، پھر اس نے اپنے حلق میں پھنسا آنسوؤں کا گولہ نگلتے ہوئے کہا۔

"میری فیملی ہوتی تو میں تم سے اس طرح کی ایک بات بھی نہ سنتی، لیکن اب اور کچھ مت کہنا ورنہ میں تمہارا گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔"

سالار نے جواب میں ٹیبل پر پڑا اپنا سیل اٹھایا۔ اس نے فرقان کو کال کی۔

"تمہارا ڈرائیور سو تو نہیں گیا؟"

"نہیں۔" دوسری طرف سے فرقان نے کہا۔

"تمہیں ضرورت ہے؟"

"ہاں۔"

"اچھا میں اسے بتاتا ہوں۔" سالار نے سیل فون بند کر دیا۔

"ڈرائیور تمہیں چھوڑ آتا ہے، تم پیکنگ کر کے جا سکتی ہو، لیکن مجھے کبھی یہ دھمکی مت دینا کہ تم گھر چھوڑ کر چلی جاؤ گی، جو کچھ تم میرے گھر میں بیٹھ کر کر رہی ہو، بہتر ہے تم یہاں سے چلی جاؤ۔" وہ اٹھ کر بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔

وہ بت کی طرح وہیں بیٹھی رہی۔ اس نے اسے دھکے دے کر گھر سے نہیں نکالا تھا، لیکن وہ یہی محسوس کر رہی تھی۔ چند منٹ وہ وہیں بیٹھی رہی پھر وہ یک دم اٹھ کر اپارٹمنٹ سے باہر نکل آئی۔ لفٹ میں اس نے اپنے دوپٹے سے بھیگی آنکھوں اور چہرے کو رگڑ کر خشک کرنے کی کوشش کی۔ وہ ڈرائیور کے سوالوں سے بچنا چاہتی تھی۔

"مجھے سعیدہ اماں کی طرف چھوڑ دو۔" اس کے نیچے پہنچنے تک ڈرائیور فرقان کی گاڑی نکالے ہوئے تھا۔ اس نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اسے کہا۔

رات کے سوا گیارہ بجے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر وہ پورے راستے آنسو بہاتی اور آنکھوں کو رگڑتی رہی۔ اس نے

زندگی میں ایسی بے عزتی کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اسے ایک بار پھر اپنے ماں باپ بری طرح یاد آرہے تھے۔
سعیدہ اماں نے نیند سے اٹھ کر دروازہ کھولا اور اسے دروازے پر دیکھ کر وہ بری طرح پریشان ہوئی تھیں مگر اس سے زیادہ پریشان وہ اسے اندر آکر بلک بلک کر روتے دیکھ کر ہوئی تھیں۔
"سالار نے گھر سے نکال دیا؟" وہ سن کر حواس باختہ ہوگئی تھیں۔ وجہ کیا تھی' وہ سعیدہ اماں کو تو کیا' کسی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی۔
"بھائی جان کو فون ملا کر دو' میں ان سے بات کرتی ہوں ایسے کیسے گھر سے نکال سکتا ہے وہ۔" سعیدہ اماں کو غصہ آنے لگا تھا۔
اس نے ان کے اصرار کے باوجود آدھی رات کو ڈاکٹر سبط علی کو فون نہیں کیا۔ یہ مصیبت اس کی تھی' وہ اس کے لیے لوگوں کی نیندیں خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔
وہ خود پچھلی رات نہیں سوئی اور اب اسی طرح روتے ہوئے اس کا سر درد سے پھٹنے لگا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ نیند مشکل سے آئی' لیکن آئی تھی۔
دوبارہ اس کی آنکھ دوپہر کو کھلی اور آنکھ کھلنے پر اسے یہ سب کچھ بھیانک خواب کی طرح لگا تھا۔
"سالار نے کوئی فون تو نہیں کیا؟" اس نے سعیدہ اماں کے کمرے میں آنے پر پوچھا۔
"نہیں' تم نماز پڑھ لو' میں کھانا لگا رہی ہوں' پھر بھائی صاحب کی طرف چلتے ہیں۔" سعیدہ اماں کہہ کر کمرے سے نکل گئیں۔ پتا نہیں اسے کیوں امید تھی کہ وہ اب پچھتا رہا ہو گا' شاید اس کے چلے جانے کے بعد اسے احساس ہو گیا ہو گا کہ اس نے زیادتی کی ہے۔ بارہ گھنٹے غصہ ختم ہونے کے لیے کافی تھے' اگر یہ سب کچھ اس نے غصے میں کیا تھا تو۔
اس نے بوجھل دل کے ساتھ شاور لیا اور سعیدہ اماں کے گھر پڑے ہوئے اپنے کپڑوں میں سے ایک جوڑا نکال کر پہن لیا۔ وہ پچھلے کئی مہینوں سے اتنے قیمتی کپڑے پہننے کی عادی ہو گئی تھی کہ اپنے جسم پر وہ جوڑا اسے خود ہی عجیب سا لگ رہا تھا۔ اسے بہت بھوک لگ رہی تھی' لیکن کھانے کے دو لقمے لیتے ہی اس کی بھوک مر گئی۔ سعیدہ اماں نے زبردستی اسے کھانا کھلایا۔ وہ کھانے کے فوراً بعد ڈاکٹر صاحب کی طرف جانا چاہتی تھیں' لیکن امامہ ڈاکٹر صاحب کو ان کے آفس فون پر اس طرح کی گفتگو سے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سالار ہفتے میں دو دن ڈاکٹر صاحب کے پاس رات کو جایا کرتا تھا اور آج بھی وہی دن تھا جب اسے وہاں جانا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے اس کے بارے میں جو کہنا چاہتا ہے' اس سے پہلے ہی کہہ دے۔ کم از کم اسے بیٹھے بٹھائے شرمندگی کا وہ بوجھ نہ اٹھانا پڑے جو اس سارے معاملے کے بارے میں انہیں بتا کر اسے اٹھانا پڑتا' لیکن سعیدہ اماں اس پر تیار نہیں تھیں۔ وہ زبردستی اسے ساتھ لے کر ڈاکٹر صاحب کے گھر آ گئی تھیں۔ کلثوم آنٹی سب کچھ سن کر سعیدہ اماں کی طرح حواس باختہ ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب ابھی آفس سے نہیں آئے تھے۔
"لیکن بیٹا! جھگڑا کس بات پر ہوا؟" امامہ کے پاس اس ایک سوال کا جواب نہیں تھا۔
سعیدہ اماں اور کلثوم آنٹی کے ہر بار پوچھنے پر اسے احساس ہوتا کہ اس سوال کا جواب اس کی نیت صاف ہونے کے باوجود اس کو مجرم بنا رہا تھا۔ اگر وہ سعیدہ اماں اور کلثوم آنٹی کو یہ بتاتی کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ کھانے پر گئی تھی یا کسی پرانے کلاس فیلو کے ساتھ تھی تو دونوں صورتوں میں وہ کبھی بھی اچھے ردِعمل کا اظہار نہ کرتیں۔ وہ یہ سب کچھ ڈاکٹر صاحب کو بھی نہیں بتا سکتی تھی جو گھر آتے ہی اسے اس طرح دیکھ کر پریشان ہوئے تھے۔
"اسے میرے کریکٹر پر شک ہے۔" اس نے ان کے بار بار پوچھنے پر سر جھکائے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر سبط علی کو جیسے

شاک لگا تھا۔ سعیدہ اماں اور کلثوم آنٹی بھی بول نہیں سکی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعد اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

"وہ رات کو آئے گا تو میں اس سے بات کروں گا۔ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ۔" انہوں نے امامہ کو تسلی دی۔

"میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ میں جاب کر لوں گی' لیکن میں اب اس کے گھر نہیں جاؤں گی۔"

ڈاکٹر سبط علی نے اس کی کسی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اب بھی جیسے شاک میں تھے۔ سالار سکندر کے بارے میں جو تاثر وہ آج تک بنائے بیٹھے تھے' وہ بری طرح مسخ ہوا تھا۔ وہ خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ یہ سب کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہو سکتا ہے' ورنہ سالار اس لڑکی کو آدھی رات کو اپنے گھر سے اس طرح کے الزام لگا کر خالی ہاتھ نہیں نکال سکتا تھا' جسے وہ اپنی بیٹی کہتے تھے۔

فرقان اس رات اکیلا آیا' سالار اس کے ساتھ نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے لیکچر کے بعد اسے روک لیا اور سالار کے بارے میں پوچھا۔

"وہ کچھ مصروف تھا اس لیے نہیں آسکا۔" فرقان نے اطمینان سے کہا۔

"آپ کو اس نے بتایا ہے کہ اس نے امامہ کو گھر سے نکال دیا ہے۔" فرقان چند لمحے بول نہیں سکا۔

"امامہ کو؟" اس نے بے یقینی سے کہا۔

"آپ کے ڈرائیور کے ذریعے ہی اس نے امامہ کو کل سعیدہ بہن کے گھر بھجوایا تھا۔"

فرقان کو پچھلی رات سالار کی کال یاد آگئی۔

"مجھے یقین نہیں آرہا۔ کیسے... ہمطلب..."

فرقان کا دماغ واقعی چکرا گیا تھا۔ سالار' امامہ پر جس طرح جان چھڑکتا تھا' کم از کم اس کے لیے یہ بات ماننا ممکن نہیں تھا کہ وہ اسے گھر سے نکال سکتا ہے اور وہ بھی اس طرح آدھی رات کو۔ وہ اسے کل جم میں بہت خاموش سا لگا اور آج وہ جم میں آیا ہی نہیں تھا' لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ اس خاموشی کا کوئی تعلق امامہ سے ہو سکتا ہے۔

"میں اسے ابھی فون کرتا ہوں' میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

فرقان نے پریشان ہوتے ہوئے سالار کو اپنے سیل سے کال کی' سالار کا سیل آف تھا۔ اس نے دوبارہ گھر کے نمبر پر ٹرائی کیا' کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ اس نے کچھ حیران ہو کر ڈاکٹر صاحب کو دیکھا۔

"فون نہیں اٹھا رہا۔ سیل آف ہے۔ میں گھر جا کر بات کرتا ہوں اس سے۔ آپ امامہ کو میرے ساتھ بھیج دیں۔" فرقان واقعی پریشان ہو گیا تھا۔

"نہیں' امامہ آپ کے ساتھ نہیں جائے گی۔ اس نے نکالا ہے' وہ معذرت کر کے خود لے کر جائے۔" ڈاکٹر سبط علی نے بے حد دوٹوک انداز میں کہا۔

"آپ اسے جا کر میرا پیغام دے دیں۔" فرقان نے کبھی ڈاکٹر سبط علی کو اتنا سنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔



سالار نے بیل کی آواز کو چند بار نظرانداز کرنے کی کوشش کی' لیکن پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ فرقان جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور اس کا یہ ارادہ کیوں تھا' وہ جانتا تھا۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا اور پھر دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر آگیا۔

"تم نے امامہ کو گھر سے نکال دیا ہے؟" فرقان نے اندر آتے ہوئے اپنے عقب میں دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے نہیں نکالا وہ خود گھر چھوڑ کر گئی ہے۔" سالار نے پیچھے دیکھے بغیر اسٹڈی روم میں جاتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے جھوٹ مت بولو۔ تم نے خود مجھے ڈرائیور کو بھیجنے کے لیے کہا تھا۔"

فرقان اس کے پیچھے اسٹڈی روم میں آ گیا۔

"ہاں کہا تھا کیوں کہ اس نے مجھے گھر چھوڑنے کی دھمکی دی تھی تو میں نے کہا ٹھیک ہے، تمہیں کل جانا ہے، تم آج چلی جاؤ، لیکن میں نے اسے نہیں نکالا۔"

اس نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بے تاثر چہرے کے ساتھ کہا۔ فرقان نے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھرے ایش ٹرے کو دیکھا اور پھر اس سلگتے ہوئے سگریٹ کو جو وہ دوبارہ اٹھا رہا تھا۔

"بیویاں گھر چھوڑنے کی دھمکیاں دیتی ہی رہتی ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہیں اس طرح گھر سے نکال دو۔" فرقان نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"دیتی ہوں گی۔ But she dare not do that to me"

اس نے فرقان کی بات کاٹ کر کہا۔

"ڈاکٹر صاحب کتنے پریشان ہیں، تمہیں اس کا اندازہ ہے؟"

"یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے وہ ڈاکٹر صاحب کو درمیان میں کیوں لے کر آئی ہے؟" وہ سلگا تھا۔

"وہ کیسے نہ لے کر آتی۔ تم اسے گھر سے نکالو گے اور ڈاکٹر صاحب کو پتا نہیں چلے گا؟"

"وہ چاہتی تو نہ پتا چلتا، اگر اتنی جرأت تھی کہ گھر سے چلی گئی تو پھر اتنا حوصلہ بھی ہونا چاہیے تھا کہ منہ بند رکھتی۔" اس نے سگریٹ کا ٹکڑا ایش ٹرے میں پھینک دیا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"کس بات پر جھگڑا ہوا ہے تم دونوں کا؟"

"بس ہو گیا کسی بات پر۔" وہ کم از کم وجہ بتانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ فرقان آدھے گھنٹے کے سوال و جواب اور بحث کے باوجود اس سے وجہ نہیں پوچھ سکا تھا، پھر جیسے اس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب تم اسے لے آؤ۔"

"یہ میں نہیں کروں گا۔ نہ میں نے اسے نکالا ہے، نہ میں اسے لے کر آؤں گا۔ وہ خود آنا چاہتی ہے تو آ جائے۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"اور ڈاکٹر صاحب یہ سب نہیں ہونے دیں گے۔ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے یا تم نے اسے نکالا ہے، ڈاکٹر صاحب کا پیغام یہی ہے کہ تم جا کر معذرت کر کے اسے لے کر آؤ۔" سالار خاموش رہا۔

"میرے ساتھ چلو ابھی اسے لے آتے ہیں۔"

"میں نہیں جاؤں گا، ڈاکٹر صاحب سے میں خود بات کر لوں گا۔"

"تو ابھی کر و بات۔"

"میں ابھی بات نہیں کرنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں وہ کچھ دن وہاں رہے، یہ اس کے لیے اچھا ہو گا۔"

فرقان اگلے دو گھنٹے وہیں بیٹھا اسے سمجھاتا رہا، لیکن وہ اس کے انکار کو اقرار میں بدل نہیں سکا۔ وہ بے حد ناخوش سالار کے اپارٹمنٹ سے گیا اور اس کی خفگی نے سالار کی فرسٹریشن میں اضافہ کیا۔
اس نے فرقان سے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ واقعی امامہ کو گھر سے بھیجنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس نے اسے دھمکانے کی کوشش کی تھی اور اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ واقعی اٹھ کر چلی جائے گی۔ اس کے اس طرح چلے جانے سے سالار کے اشتعال میں اضافہ ہوا۔ اس سے شادی کے بعد وہ پہلی بار ضد میں آیا تھا اور یہ صحیح تھا یا غلط ایک مرد کی طرح اب اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ فرسٹریٹڈ تھا، اپ سیٹ تھا، لیکن اب ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔



ڈاکٹر سبط علی اگلے چار دن اس کا انتظار کرتے رہے۔ وہ نہیں آیا، نہ ہی اس نے انہیں فون کیا۔ انہیں خود اسے فون کرنے میں عار تھا۔ انہیں کہیں نہ کہیں یہ توقع تھی کہ وہ ان کا اتنا احترام ضرور کرتا تھا کہ ان کا پیغام ملنے پر آجائے گا، لیکن اس کی مکمل خاموشی نے جیسے انہیں ذہنی دھچکا پہنچایا تھا۔ امامہ اس دن سے انہیں کے گھر پر تھی۔ انہوں نے یہ بہتر سمجھا تھا کہ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو جاتا وہ انہیں کے گھر رہے۔ فرقان ڈاکٹر سبط علی کے گھر اور سالار کے اپارٹمنٹ کے درمیان گھن چکر بنا ہوا تھا۔ وہ ہر روز ڈاکٹر صاحب کے پاس آرہا تھا، یہ جیسے اس کی طرف سے اس شرمندگی کو ظاہر کرنے کی ایک کوشش تھی، جو وہ سالار کے اس رویے پر محسوس کر رہا تھا۔
اس صورت حال میں سب سے زیادہ ابتر ذہنی حالت امامہ کی تھی۔ اسے یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ سالار اس کے معاملے میں اس طرح کا رویہ دکھا سکتا ہے۔ وہ گھر میں ڈاکٹر صاحب اور کلثوم آنٹی کی پریشانی دیکھ کر خود کو اور بھی زیادہ مجرم محسوس کر رہی تھی اور اسی ذہنی تناؤ کی وجہ سے اسے بخار رہنے لگا تھا۔
چوتھے دن ڈاکٹر سبط علی نے سالار کو فون کر دیا۔ وہ آفس میں بیٹھا ہوا تھا، اور سیل پر ڈاکٹر صاحب کا نمبر دیکھتے ہوئے وہ چند لمحے بل نہیں سکا۔ یہ ایک ایسی کال تھی جس سے وہ بچنا بھی چاہتا تھا اور جسے وہ اٹینڈ نہ کرنے کی جرات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رسمی سلام دعا کے بعد ڈاکٹر سبط علی نے کسی تمہید کے بغیر اس سے کہا۔
"آپ آج شام کو میری طرف آسکتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں آجاتا ہوں۔ اگر معاملہ حل ہو سکا تو بہتر ہوگا ورنہ معاملہ ختم کر لیں گے۔"
ان کے الفاظ میں اس کے لیے کسی قسم کا ابہام نہیں تھا۔
"میں آجاؤں گا۔"
"مہربانی ہوگی آپ کی۔" انہوں نے کسی مزید بات کے بغیر سلام کرکے فون بند کر دیا۔
وہ فون ہاتھ میں پکڑے بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر سبط علی کا یہ لہجہ اس کے لیے نیا تھا، لیکن غیر متوقع نہیں تھا۔ غیر متوقع صرف وہ جملہ تھا جو انہوں نے آخر میں کہا۔ معاملہ ختم کرنے تک کی نوبت کیسے آگئی تھی اس کے نزدیک یہ صرف ایک جھگڑا تھا۔ پہلی بار اس کے پیٹ میں گرہیں پڑی تھیں۔
اس شام کو ڈاکٹر سبط علی نے ہمیشہ کی طرح اسے دروازے پر ریسیو نہیں کیا تھا، نہ اس سے مصافحہ کیا اور نہ ہی وہ اس کے لیے اٹھے تھے۔ وہ ملازم کے ساتھ اندر آیا۔ ڈاکٹر سبط علی لاؤنج میں کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ اس کے آنے پر انہوں نے وہ کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔ سالار سلام کرنے کے بعد سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔
"میں تم سے بہت لمبی چوڑی بات نہیں کروں گا، سالار!" سالار نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

وہ پہلی بار ان کے منہ سے تم کا طرز تخاطب سن رہا تھا اور وہ بھی اپنے لیے' ورنہ وہ اپنے ملازم کو بھی آپ کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔

"میں پچھلے چار دن سے صرف اس بات پر شرمندہ ہوں کہ میں نے امامہ کی شادی تم سے کیوں کروائی... تم اس قابل نہیں تھے۔ محبت کے دعوے کرنا اور بات ہوتی ہے' لیکن کسی عورت کو اپنے گھر میں عزت سے رکھنا' ایک بالکل الگ بات... تم صرف پہلا کام کر سکتے تھے۔"

لاؤنج سے منسلک کمرے میں وہ ڈاکٹر صاحب کی آواز اور اس کی خاموشی دونوں کو سن رہی تھی۔

"اپنی بیوی کو اس طرح گھر سے نکالنے والے مرد کو میں مرد تو کیا انسان بھی نہیں سمجھتا۔ تمہیں اگر اس بات کا پاس نہیں تھا کہ وہ تمہاری بیوی ہے' تو اس بات کا پاس ہونا چاہیے تھا کہ وہ میری بیٹی ہے۔ میری بیٹی کو تم نے اس طرح خالی ہاتھ آدھی رات کو گھر سے نکالا ہے۔"

"میں نے اسے گھر سے نہیں نکالا وہ خود..." سالار نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تم نے گاڑی ارینج کی تھی۔" اندر بیٹھی امامہ کانپنے لگی تھی۔ اس نے ڈاکٹر صاحب کو کبھی اتنی بلند آواز میں بات کرتے نہیں سنا تھا۔

"تمہیں جرأت کیسے ہوئی کہ تم اس کے کریکٹر کے بارے میں بات کرو؟"

سالار نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا' اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"آپ نے اس سے پوچھا کہ یہ بات میں نے کیوں کی تھی؟" اندر بیٹھی امامہ کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ صرف یہی ایک بات تھی جس پر وہ ٹھٹکی تھی اور جس کا اعتراف وہ اتنے دن سے کسی سے نہیں کر پائی تھی۔

"میں اس سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ میں تمہارے کردار کو نہیں جانتا' لیکن وہ نو سال سے میرے پاس ہے وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتی' جس پر تم اس کے کردار پر انگلی اٹھاتے۔"

اسے یقین تھا وہ اب جلال کا نام لے گا۔ اب لے گا۔ اس کا پورا جسم سرد پڑ رہا تھا۔ ایک' دو' تین' چار' پانچ۔ اس کا دل سیکنڈز سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔ سالار کا ایک جملہ اس وقت ڈاکٹر صاحب کی نظروں میں اسے ہمیشہ کے لیے گرانے والا تھا' لیکن اس طرف خاموشی تھی۔

پھر امامہ نے اس کی آواز سنی' ایک لمحے کے لیے اسے لگا' اس کا دل رک جائے گا۔

"آئی ایم سوری۔" اسے یقین نہیں آیا' یہ وہ جملہ نہیں تھا جسے سننے کی اسے توقع تھی۔ اس کی معذرت نے اسے شاک دیا تھا تو ڈاکٹر صاحب کو کچھ اور مشتعل کیا۔

"ایک بات یاد رکھنا تم سالار... جو کچھ تمہیں زندگی میں ملتا ہے' اس عورت کے مقدر سے ملتا ہے۔ یہ تمہاری زندگی سے نکل گئی تو خواری کے سوا اور کچھ نہیں آئے گا تمہارے۔ ہاتھ ملو گے ساری عمر تم۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اللہ نے تمہیں امامہ کا کفیل بنایا ہے۔ کبھی رازق بننے کی کوشش بھی مت کرنا تم رازق نہیں ہو اس کے... اللہ تم سے بہتر کفیل دے دے گا اسے... تم سے زیادہ مہربان تم سے زیادہ خیال رکھنے والا۔"

وہ "کاٹو تو لہو نہیں" کے مصداق بنا بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر سبط علی نے کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔ کبھی بھی نہیں... شرم ساری سی شرم ساری تھی جو وہ محسوس کر رہا تھا اور اندر بیٹھی امامہ بھی ندامت کے ایک ایسے ہی سمندر میں غرق تھی۔

"اسے گھر میں رکھنا ہے تو عزت سے رکھو' ورنہ ابھی اور اسی وقت اس کو چھوڑ دو۔ تم سے کئی گنا اچھے انسان کے ساتھ بیاہ دوں گا جو اسے تم سے زیادہ اچھے طریقے سے اپنے گھر کی عزت بنا کر رکھے گا۔"

"میں، آپ سے اور اس سے، بہت شرمندہ ہوں۔ آپ اسے بلائیں' میں اس سے معذرت کر لیتا ہوں۔"
اسے گھٹنے ٹیکنے میں دیر نہیں لگی تھی۔
اندر بیٹھی امامہ زمین میں جیسے گڑ کر رہ گئی تھی۔ یہ آخری چیز تھی جس کی توقع اسے سالار سے تھی۔
کلثوم آنٹی اسے بلانے آئی تھیں اور اس کا دل چاہا تھا کہ وہ کہیں بھاگ جائے۔ زندگی میں اپنے شوہر کا جھکا ہوا سر دیکھنے سے بڑی ندامت کا سامنا اس نے آج تک نہیں کیا تھا' کیا ملامت تھی جو لاؤنج میں آکر بیٹھتے ہوئے اس نے خود کو کی تھی۔ یہ سب کچھ اس کی غلطی سے شروع ہوا تھا۔
"میں بہت زیادہ معذرت خواہ ہوں' جو کچھ ہوا' نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جو کچھ کیا غلط کیا میں نے' مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اس نے سر یا نظریں اٹھائے بغیر اس کے بیٹھتے ہی کہا تھا۔ امامہ کے رنج میں کچھ اور اضافہ ہوا۔ آج سالار کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی اور اس کا ذمہ دار وہ اپنے آپ کو ٹھہرا رہی تھی۔
"بیٹا! آپ جانا چاہ رہی ہیں تو چلی جائیں اور نہیں جانا چاہتیں تو..." ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا۔
"نہیں میں جانا چاہتی ہوں۔" اس نے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے پھر اپنا سامان پیک کر لیں۔" ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا' وہ اٹھ کر کمرے میں آگئی۔ دو دن پہلے کلثوم آنٹی نے اسے کچھ کپڑے اور ضرورت کی چیزیں لا کر دی تھیں' اس نے انہیں ایک بیگ میں رکھ لیا۔ ڈاکٹر صاحب امامہ کے اٹھتے ہی اسٹڈی روم میں چلے گئے اور وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔
"بیٹا کھانا لگواؤں۔" کلثوم آنٹی نے جیسے ماحول کو بہتر کرنے کی کوشش کی۔
"نہیں' میں کھانا کھا کر آیا تھا۔"
اس نے اب بھی نظریں نہیں اٹھائیں۔ وہ نظریں اٹھانے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔
ملازم سوفٹ ڈرنک کا ایک گلاس اسے دے کر گیا۔ سالار نے کچھ کہے بغیر گلاس اٹھا کر چند گھونٹ لے کر رکھ دیا۔
اسے اپنی چیزیں پیک کر کے باہر آنے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ سالار نے کھڑے ہو کر خاموشی سے اس سے بیگ لے لیا۔ ڈاکٹر صاحب بھی تب تک اسٹڈی روم سے نکل آئے تھے۔ وہ ان دونوں کو گاڑی تک چھوڑنے آئے تھے مگر ہمیشہ کی طرح وہ سالار سے بغل گیر نہیں ہوئے۔
گاڑی کے سڑک پر آنے تک دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی' پھر سالار نے کہا۔
"میں تم سے بہت شرمندہ ہوں' "I mis behaved with you
وہ دوبارہ اس سے معذرت کی توقع نہیں کر رہی تھی۔
"سالار' میں تم سے بہت شرمندہ ہوں' مجھے نہیں پتا تھا کہ ابو کو اتنا غصہ آئے گا۔ انہوں نے تمہارے ساتھ..."
سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔ "نہیں' ٹھیک کیا انہوں نے جو بھی کیا' غلط تو کچھ بھی نہیں کیا انہوں نے' لیکن میں نے تمہارے کیریکٹر کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔"
"تمہارا مطلب ہے' تم یہ سب کچھ کہو گے اور میں یہ نہ سمجھوں کہ تم میرے کیریکٹر پر انگلی اٹھا رہے ہو؟"
سالار خاموش رہا تھا۔
"وہ مجھے اتفاقاً" اس دن پارکنگ میں مل گیا تھا۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ سالار نے اس بار اسے نہیں ٹوکا۔
"اس نے بھی چند ماہ پہلے اس نے دوسری شادی کی ہے۔ اس نے لنچ کے لیے اصرار کیا۔ مجھے خیال بھی نہیں آیا کہ

تمہیں بُرا لگ سکتا ہے اور میں نے تو لنچ بھی نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر ریسٹورنٹ میں بیٹھے رہے پھر وہ نوید اور اس کی مسز آ گئیں۔ مجھے دیر ہو رہی تھی تو میں وہاں سے گھر آ گئی بس اتنی سی بات تھی۔ میری غلطی بس یہ تھی کہ میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ میں اس سے ملی تھی۔"

"اور میری غلطی یہ تھی کہ میں نے تمہاری بات نہیں سنی' سن لینی چاہیے تھی' I over reacted۔"

وہ اب مدھم آواز میں اعتراف کر رہا تھا۔

"بے عزتی کروائی تھی اس لیے۔" وہ بڑبڑایا تھا۔

وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ اس وقت اس کی کس قدر احسان مند ہو رہی تھی' لیکن وہ کہہ نہیں پا رہی تھی۔ اس کی ایک لمحے کی خاموشی نے اس کی عزت رکھی تھی اور پچھلے تمام دن کے رویوں کا جیسے کفارہ ادا کر دیا تھا۔ وہ احسان مندی کے علاوہ اس وقت اس شخص کے لیے کچھ محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اس وقت تشکر اور شرمندگی' کے سوا کوئی تیسری چیز اس کے پاس نہیں تھی۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ تمہیں کسی آدمی کے ساتھ میرا ملنا اتنا بُرا لگے گا' ورنہ میں تو کبھی۔" کچھ دیر کے بعد اس نے کہا تھا۔

سالار نے اس کی بات کاٹی۔ "وہ "کوئی" آدمی نہیں تھا امامہ!"

"وہ اب میرے لیے صرف "کوئی" آدمی ہے۔" سالار نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس نے ناک رگڑتے ہوئے آنکھوں کو ایک بار پھر صاف کرنے کی کوشش کی۔

"طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟"

"ہاں' ٹھیک ہے۔" اس نے امامہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر جیسے ٹمپریچر چیک کیا۔

"بخار ہے؟"

"تھوڑا سا ہے۔"

"ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔"

"نہیں میڈیسن لے رہی ہوں میں۔ بیگ میں ہے۔" وہ خاموش ہو گیا۔

انہوں نے ایسی خاموشی میں پہلے کبھی سفر نہیں کیا تھا۔ اس ایک واقعے نے اعتماد کے اس رشتے میں کچھ عجیب دراڑیں ڈالی تھیں جو پچھلے چند ماہ میں ان کے درمیان بن گیا تھا۔

اس رات گھر آ کر بھی ان کے درمیان بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ امامہ میڈیسن لے کر سونے کے لیے لیٹ گئی اور سالار تقریباً" ساری رات اسٹڈی روم میں بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ وہ پچھلی تین چار راتوں سے یہی کچھ کر رہا تھا' لیکن آج وہ بہت زیادہ پریشان تھا۔ آخری چیز جس کی وہ کبھی توقع نہیں کر سکتا تھا' وہ ڈاکٹر سبط علی کا ایسا ہتک آمیز رویہ تھا۔ یہ سب اس کی اپنی غلطی کا نتیجہ تھا اور اسے یہ ماننے میں عار نہیں تھا۔

غصیل

اس کو اتنا غصہ کیوں آیا؟ اور اس طرح کا غصہ؟ وہ خود بھی یہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ وہ نہیں تھا۔ کم از کم پچھلے دس سالوں میں ایسے بہت کم مواقع آئے تھے جن پر کسی سے اس کی خفگی اتنی طویل ہوئی' جتنی امامہ سے ہوئی تھی۔ وہ جلال سے جیلس نہیں تھا' وہ ان سیکیور تھا۔ وہ اس کے معاملے میں کس طرح بے اختیار تھی' اس کا مظاہرہ وہ دس سال پہلے بہت اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ جلال کا ایک دم دوبارہ ان کی زندگی کے منظر نامے میں اس طرح نمودار ہونا سالار کو ایک مرد کے طور پر بے حد ہتک محسوس ہوئی تھی۔

وہ پچھلے کئی مہینوں سے اسے خوش کرنے کے لیے آخری حد تک جا رہا تھا۔ اس نے اس کے ناز نخرے اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ شعوری اور لاشعوری طور پر ایک مرد کی طرح وہ ہر وہ چیز کر رہا تھا جو امامہ کو خوش

کرتی۔ اسے یقین تھا' وہ سب کچھ امامہ کے دل سے جلال انصر نامی شخص سے متعلقہ ہر طرح کے جذبات نکال دے گا اور اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ ایسا ہو بھی رہا ہے۔ وہ اس کے قریب آرہی تھی، لیکن جلال انصر کسی بھوت کی طرح یک دم دوبارہ نمودار ہو گیا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے اتنی خوب صورتی سے دھوکا دے رہی تھی۔

وہ دو دن پہلے ہونے والی ایک ایک بات کو یاد کرکے سلگتا رہا۔ وہ اگر اتفاقی ملاقات بھی تھی تو اس کے بعد اس نے امامہ کی جو حالت دیکھی تھی' وہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ چار دن تک وہ آفس، گھر، جم ہر جگہ صرف ایک ہی بات کے بارے میں سوچ سوچ کر جیسے پاگل ہو رہا تھا۔ وہ ایسا کیسے کر سکتی تھی؟

اس دن اس کے آفس میں جو آخری چیز امامہ بھولی تھی' وہ باتھ روم بیسن کی سل پر اس کی شادی کی رنگ تھی۔ وہ رنگ اس کے جانے کے بعد سالار کو وہاں ملی تھی۔ اس کا خیال تھا اسے گھر پہنچ کر رنگ یاد آجائے گی، لیکن اس دن تو کیا اگلے دو دن تک امامہ کو وہ رنگ یاد نہیں آئی تھی۔ یہ بات سالار کے لیے حیران کن تھی۔ وہ مسلسل انگلی میں رہنے والی کسی قیمتی چیز کو اس طرح کیسے فراموش کر سکتی تھی۔

جلال انصر سے ہونے والی اس ملاقات کے بعد اس نے اس رنگ کے اتارے جانے کو جیسے نیا مفہوم پہنا دیا تھا۔ اس کی زندگی میں سالار سکندر کے ساتھ باندھے ہوئے اس رشتے کی شاید وقتی اہمیت تھی دلی نہیں۔ سالار کو ایک نیا مفہوم ڈھونڈنے میں دیر نہیں لگی تھی مگر اس اشتعال میں بھی وہ کوئی ایسا ارادہ نہیں رکھتا تھا کہ امامہ کے ساتھ ہونے والے اس جھگڑے کو' جلال کے نام کا ٹیگ لگا کر سب کے سامنے رکھ دیتا۔ اس کے حوالے سے یہ ایک آخری چیز تھی جو وہ کرتا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ چند دن مزید اسے اسی طرح وہاں رہنے دے گا اور پھر آنے کے لیے کہہ دے گا، لیکن ڈاکٹر سبط علی کے گھر جانے کے بعد معاملات نے جو رخ اختیار کیا تھا' وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔



"باجی! آپ کہاں تھیں؟"

اگلی صبح وہ ملازمہ کے بیل دینے پر جاگی تھی۔ دروازہ کھولنے پر اسے دیکھتے ہی ملازمہ نے پوچھا۔

"میں چند دن اپنے گھر رہنے کے لیے گئی ہوئی تھی۔" اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟" ملازمہ نے اس کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں' نہیں بس تھوڑا سا بخار ہے اور کچھ نہیں۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"کوئی خوش خبری تو نہیں ہے باجی؟"

وہ بیڈ روم کی طرف جاتے جاتے ملازمہ کے جوش پر ٹھٹکی اور پھر بری طرح شرمندہ ہوئی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے' تم صفائی کرو۔"

منہ ہاتھ دھو کر اور کپڑے تبدیل کرکے جب وہ واپس آئی تو ملازمہ اسٹڈی روم کی صفائی کر رہی تھی۔ سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھرے ایش ٹرے نے اسے چونکا دیا تھا۔

"مجھے لگتا ہے باجی! سالار صاحب سگریٹ پینے لگے ہیں۔ ہر روز اسی طرح ایش ٹرے بھرا ہوتا ہے سگریٹوں سے۔ اب روز روز تو کوئی مہمان نہیں آتا ہوگا۔" ملازمہ نے ایش ٹرے خالی کرتے ہوئے اس پر جیسے انکشاف کیا۔

وہ جواب دیے بغیر وہاں سے نکل آئی۔ کچن کے فریج میں ہر چیز اسی طرح پڑی تھی جس طرح وہ چھوڑ کر گئی تھی۔

وہ یقیناً "پچھلے کچھ دنوں میں گھر پر کھانا نہیں کھا رہا تھا ورنہ فریز کی ہوئی چیزوں میں سے کچھ نہ کچھ استعمال ہوا ہوتا۔
فون کی بیل ہونے پر وہ کچن میں اپنے لیے ناشتا بناتے ہوئے باہر نکل آئی۔ وہ سالار تھا جو عام طور پر اسی وقت اسے کال کیا کرتا تھا۔ اتنے دنوں کے وقفے کے بعد فون پر اس کی آواز اسے بے حد عجیب لگی تھی۔
"کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" وہ پوچھ رہا تھا۔
"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے کہا تھا۔
"ناشتا کر کے گئے تھے آفس؟" اسے کچن میں کوئی استعمال شدہ برتن نظر نہیں آیا تھا۔
"نہیں لیٹ ہو گیا تھا۔ ناشتے کے لیے ٹائم نہیں تھا۔"
"مجھے جگا دیا ہوتا میں بنا دیتی۔" اس نے کہا۔
"نہیں مجھے بھوک بھی نہیں تھی۔" رسمی جملوں کے بعد اب وہ خندق آگئی تھی جس سے دونوں بچنا چاہ رہے تھے اور بچ نہیں پا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے کچھ کہنے کے لیے ان کے پاس یک دم الفاظ نہیں رہے تھے۔
"اور؟" وہ خود کوئی بات ڈھونڈنے میں ناکام رہنے کے بعد اس سے پوچھنے لگا۔
"کچھ نہیں۔" وہ بھی اتنی ہی خالی تھی۔
"رات کو کہیں باہر کھانا کھانے چلیں گے۔" اس نے کہا۔
"اچھا۔" گفتگو پھر اسکوائرون پر آگئی۔ سالار نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔
وہ بہت دیر ریسیور پکڑے بیٹھی رہی۔ بہت فرق تھا اس گفتگو میں جو وہ ایک ہفتہ پہلے فون پر کرتے تھے اور اس گفتگو میں جو وہ اب کر رہے تھے۔ دراڑیں بھرنا زیادہ مشکل تھا کیوں کہ نشان کبھی نہیں جاتے' وہ بھی یہی وقت محسوس کر رہے تھے۔
اس نے زندگی میں اس ایک ہفتے میں جو کچھ سیکھا تھا وہ شادی کے اتنے مہینوں میں نہیں سیکھا تھا۔ کسی انسان کی محبت بھی "غیر مشروط" نہیں ہو سکتی۔ خاص طور پر تب' جب کوئی محبت' شادی نام کے رشتے میں بھی بندھی ہو۔ سالار کی محبت بھی نہیں تھی۔ ایک ناخوش گوار واقعہ اسے آسمان سے زمین پر لے آیا تھا۔ وہ زمینی حقائق اسے پہلی بار نظر آئے تھے' جو پہلے اس کی نظروں سے اوجھل تھے۔ وہ صرف محبوبہ نہیں تھی' بیوی بن چکی تھی۔ ایک مرد کے لیے اسے اب زندگی' دل اور ذہن سے نکالنا زیادہ آسان تھا۔ سالار نے دوسروں کی نظروں میں اس کی عزت ضرور رکھ لی تھی' لیکن اس کی اپنی نظروں میں اسے بہت بے وقعت کر دیا تھا۔ خوش فہمیوں اور توقعات کا پہاڑ آہستہ آہستہ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔
وہ شام کو جلدی گھر آگیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ یہ ارادی طور پر تھا۔ اس کے لیے بیرونی دروازہ کھولنے پر اس نے ہمیشہ کی طرح گرم جوشی سے اسے اپنے ساتھ نہیں لگایا تھا۔ اس سے نظر ملانا' مسکرانا اور اس کے قریب آنا شاید اس کے لیے بھی بہت مشکل ہو گیا تھا۔ پہلے سب کچھ بے اختیار ہوتا تھا اب کوشش کے باوجود بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔
کھانے کے لیے باہر جاتے ہوئے بھی گاڑی میں ویسی ہی خاموشی تھی۔ دونوں وقفے وقفے سے کچھ پوچھتے پھر یک حرفی جواب کے بعد خاموش ہو جاتے۔
وہ پہلا ڈنر تھا جو انہوں نے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے اپنی ڈنر پلیٹ کو دیکھتے ہوئے کیا تھا اور دونوں نے کھانا کسی دلچسپی کے بغیر کھایا تھا۔
واپسی بھی اسی خاموشی کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ ایک بار پھر سونے کے لیے بیڈ روم میں اور وہ اسٹڈی روم میں چلا گیا۔



اگلی صبح اس نے ایش ٹرے پھر سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھرا ہوا دیکھا۔ وہ فجر کے بعد اسٹڈی روم میں گئی جب وہ جم میں تھا۔ وہ بھرا ہوا ایش ٹرے اس کی ذہنی حالت کو کسی دوسری چیز سے زیادہ بہتر طریقے سے بیان کر رہا تھا۔ وہ اس بات سے پریشان ہوئی کہ وہ اسموکر نہیں تھا لیکن عادی بن رہا تھا۔ پوچھنے کا فائدہ نہیں تھا اس کے پاس کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی۔

اگلے دن وہ تقریباً ایک ہفتے کے بعد ناشتے کی ٹیبل پر تھے۔ بات کرنا نظر ملانے سے زیادہ آسان تھا اور وہ بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ شرمندگی اور ان تکلیف دہ احساسات کو ختم کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے جو اس ٹیبل پر بن بلائے مہمانوں کی طرح موجود تھے لیکن وہ مہمان ٹیبل چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔

ایک ہفتے کے بعد ہی وہ گھر کا بنا ہوا لنچ آفس لے کر جا رہا تھا۔ وہ امامہ سے کہہ نہیں سکا کہ اس نے پورا ہفتہ گھر پر ناشتے سمیت کھانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ گھر اتنے دن اس کے لیے بھوت بنگلہ بنا رہا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے امامہ سے کہا۔

"میری دراز میں تمہاری رنگ ہے' وہ لے لینا۔" امامہ نے جیسے کرنٹ کھا کر اپنا ہاتھ دیکھا۔

"میری رنگ۔۔۔؟" وہ رنگ اسے پہلی بار یاد آئی تھی۔

"وہ میں نے کہاں رکھ دی؟"

"میرے آفس کے واش روم میں۔" اس نے باہر نکلتے ہوئے بے تاثر لہجے میں کہا' وہ کھڑی رہ گئی۔



کئی دنوں کے بعد اس رات سالار نے رغبت سے کھانا کھایا تھا۔ وہ عام طور پر ایک چپاتی سے زیادہ نہیں کھاتا تھا لیکن آج اس نے دو چپاتیاں کھائی تھیں۔

"اور دوں؟" امامہ نے اسے دوسری چپاتی لیتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔ وہ خود چاول کھا رہی تھی۔

"نہیں میں پہلے ہی اوور ایٹنگ کر رہا ہوں۔" اس نے منع کر دیا۔

امامہ نے اس کی پلیٹ میں کچھ سبزی ڈالنے کی کوشش کی' اس نے روک دیا۔

"نہیں' میں ویسے ہی کھانا چاہ رہا ہوں۔" امامہ نے کچھ حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ بے حد گہری سوچ میں ڈوبا اس چپاتی کے لقمے لے رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے اس کے ہاتھ کی چپاتی پسند ہے لیکن اس نے اسے صرف چپاتی کھاتے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس دن پہلی بار اس نے آخری لقمہ اسے نہیں دیا۔ وہ کھانا کھانے کے بعد ٹیبل سے اٹھ گیا۔ وہ برتن اکٹھے کر رہی تھی' جب وہ کچھ پیپرز لیے آیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" امامہ نے کچھ حیرانی سے ان پیپرز کو دیکھا جو وہ اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔

"بیٹھ کر دیکھ لو۔" وہ خود بھی کرسی کھینچتے ہوئے بیٹھ گیا۔

وہ بھی کچھ الجھے انداز میں پیپرز لے کر بیٹھ گئی۔

پیپرز پر ایک نظر ڈالتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

"طلاق کے پیپرز ہیں یہ؟" وہ بمشکل بول سکی۔

"نہیں' میں نے اپنے وکیل سے ایک divorce deed تیار کروایا ہے۔ اگر کبھی خدانخواستہ ایسی صورت حال ہو گئی کہ ہمیں الگ ہونا پڑا تو یہ تمام معاملات کو پہلے سے کچھ خوش اسلوبی سے طے کرنے کی ایک

کوشش ہے۔"

"مجھے تمہاری بات سمجھ نہیں آئی۔" وہ اب بھی حواس باختہ تھی۔

"درست۔۔۔ یہ کوئی دھمکی نہیں ہے۔ میں نے یہ پیپرز تمہارے تحفظ کے لیے تیار کروائے ہیں۔" سالار نے اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔

"کیسا تحفظ؟" اسے اب بھی ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔

"میں نے علیحدگی کی صورت میں فنانشل سیکورٹی اور بچوں کی کسٹڈی تمہیں دی ہے۔"

"لیکن میں تو طلاق نہیں مانگ رہی۔" اس کی ساری گفتگو اس کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھی۔

"میں بھی تمہیں طلاق نہیں دے رہا' صرف قانونی طور پر خود کو پابند کر رہا ہوں کہ میں علیحدگی کے کیس کو کورٹ میں نہیں لے جاؤں گا۔ فیملی کے ذریعے معاملات کو طے کرنے کی کوشش کریں گے اور اگر نہ ہوئے تو میں تمہیں علیحدگی کا حق دے دوں گا اور ایسی صورت میں اگر ہمارے بچے ہوئے تو ان کی کسٹڈی تمہیں دے دوں گا۔ ایک گھر اور کچھ رقم بھی تمہیں دوں گا۔ جو بھی چیزیں اس سارے عرصے میں حق مہر' تحائف' جیولری یا روپے اور پراپرٹی کی صورت میں تمہیں دوں گا' وہ سب خلع یا طلاق' دونوں صورتوں میں تمہاری ملکیت ہوں گی۔ میں ان کا دعویٰ نہیں کروں گا۔"

"یہ سب کیوں کر رہے ہو تم؟" اس نے بے حد خائف انداز میں اس کی بات کاٹی۔

"میں اپنے آپ سے ڈر گیا ہوں امامہ۔" وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"میں کبھی سوچ نہیں سکتا تھا کہ مجھے تم پر اتنا غصہ آسکتا ہے۔ میں نے تمہیں گھر سے نہیں نکالا' لیکن میں نے اس رات یہ پروا نہیں کی کہ تم گھر سے جا رہی ہو تو کیوں جا رہی ہو اور کہاں جا رہی ہو؟ میں اتنا مشتعل تھا کہ مجھے کوئی پروا نہیں تھی کہ تم بحفاظت کہیں پہنچی بھی ہو یا نہیں۔" وہ بے حد صاف گوئی سے کہہ رہا تھا۔

"اور پھر اتنے دن میں نے ڈاکٹر صاحب کی بھی بات نہیں سنی۔

I just wanted to punish you" وہ ایک لمحہ کے لیے رکا۔

"اور اس سب نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ میرا غصہ ختم ہوا تو مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اتنا گر سکتا ہوں' میں تمہارے ساتھ اس طرح بی ہیو کر سکتا ہوں' لیکن میں نے کیا۔ بہرحال میں انسان ہی ہوں' ہم کو ساتھی کے بجائے حریف سمجھوں گا تو شاید آئندہ بھی کبھی ایسا کروں۔ ابھی شادی کو تھوڑا وقت ہوا ہے۔ مجھے بہت محبت ہے تم سے' میں بہت خوشی خوشی یہ سارے وعدے کر سکتا ہوں تم سے' سب کچھ دے سکتا ہوں تمہیں' لیکن کچھ عرصے بعد کوئی ایسی سچویشن آئی تو پتا نہیں ہمارے درمیان کتنی تلخی ہو جائے۔ تب شاید میں اتنی سخاوت نہ دکھا سکوں اور ایک عام مرد کی طرح خود غرض بن کر تمہیں تنگ کروں۔ اس لیے ابھی ان دنوں' جب میرا دل بہت بڑا ہے تمہارے لیے' تو میں نے کوشش کی ہے کہ یہ معاملات طے ہو جائیں۔ صرف زبانی وعدے نہ کروں تمہارے ساتھ۔ میری طرف سے میرے والد کے سگنیچرز ہیں اس پر' تم ڈاکٹر صاحب سے بھی اس پر سائن کروالو۔ ڈاکٹر صاحب چاہیں تو یہ پیپرز وہ اپنے پاس رکھ لیں یا تم اپنے لاکر میں رکھوا دو۔" وہ آنکھوں میں آنسو لیے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"میں نے تو تم سے کوئی سیکورٹی نہیں مانگی۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"لیکن مجھے تو دینی چاہیے نا۔ میں یہ پیپرز جذبات میں آکر نہیں دے رہا ہوں تمہیں' یہ سب کچھ بہت سوچ سمجھ کر رہا ہوں۔ تمہارے بارے میں بہت پوزیسو ہوں' بہت ان سیکور ہوں امامہ۔"

وہ ایک لمحہ کے لیے ہونٹ کاٹتے ہوئے رکا۔

"اور اگر کبھی ایسا ہوا کہ تم مجھے چھوڑنا چاہو تو میں تمہیں کتنا تنگ کر سکتا ہوں، تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے، لیکن مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔" وہ پھر رک کر ہونٹ کاٹنے لگا تھا۔

"تم میرا ایسا واحد اثاثہ ہو، جسے میں پاس رکھنے کے لیے فیئر اور فاؤل کی تمیز کے بغیر کچھ بھی کر سکتا ہوں اور یہ احساس بہت خوف ناک ہے میرے لیے۔ میں تمہیں تکلیف پہنچانا چاہتا ہوں، نہ تمہاری حق تلفی چاہتا ہوں۔ ہم جب تک ساتھ رہیں گے بہت اچھے طریقے سے رہیں گے اور اگر کبھی الگ ہو جائیں تو میں چاہتا ہوں ایک دوسرے کو تکلیف دیے بغیر الگ ہوں۔"

وہ اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ وہ پیپر زہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔



پودوں کو پانی کب سے نہیں دیا؟" اگلی صبح اس نے ناشتے کی ٹیبل پر سالار سے پوچھا۔

"پودوں کو؟" وہ چونکا۔

"پتا نہیں۔ شاید کافی دن ہو گئے۔" وہ بڑبڑایا تھا۔

"سارے پودے سوکھ رہے تھے۔" وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے حیران ہوئی تھی۔ وہ جم سے آنے کے بعد روز صبح پودوں کو پانی دیا کرتا تھا۔ اس سے پہلے کبھی امامہ نے اسے اپنی روٹین بھولتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ سلائس کھاتے کھاتے یک دم اٹھ کر ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ چند منٹوں کے بعد وہ کچھ پریشان سا واپس آیا تھا۔

"ہاں مجھے خیال ہی نہیں رہا۔" اس صبح وہ پودوں کو پانی دے کر آئی تھی۔

"تمہاری گاڑی فی الحال میں استعمال کر رہا ہوں۔ دو چار دن میں میری گاڑی آجائے گی تو تمہاری چھوڑ دوں گا۔" اس نے دوبارہ بیٹھتے ہوئے امامہ سے کہا۔

"تمہاری گاڑی کہاں ہے؟"

"ورکشاپ میں ہے لگ گئی تھی۔" اس نے عام سے لہجے میں اسے کہا، وہ چونک گئی۔

"کیسے لگ گئی؟"

"پتا نہیں کیسے لگ گئی، میں نے کسی گاڑی کے پیچھے ماردی تھی۔" وہ کچھ معذرت خواہانہ انداز میں اسے بتا رہا تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی، وہ سلائس پر مکھن لگا رہا تھا۔ وہ ایکسپرٹ ڈرائیور تھا اور یہ ناممکن تھا کہ وہ کسی گاڑی کو پیچھے سے ٹکر مار دے۔

گھر میں آنے والی دراڑیں مرد اور عورت پر مختلف طریقے سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ عورت کی پریشانی آنسو بہانے، کھانا چھوڑ دینے اور بیمار ہو جانے تک ہوتی ہے۔ مرد ان میں سے کچھ بھی نہیں کرتا۔ اس کا ہر رد عمل اس کے آس پاس کی دنیا پر اثر انداز ہوتا ہے، مگر وہ ایک رشتے دونوں کے وجود پر اپنا عکس چھوڑتا ہے۔ مضبوط ہو تب بھی کمزور ہو تب بھی، ٹوٹ رہا ہو تب بھی دونوں اپنی مرضی سے اس رشتے سے نکلنا چاہ رہے ہوں تب بھی۔

امامہ نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔



اس رات وہ ڈاکٹر صاحب کے گھر اس واقعے کے بعد پہلی بار ان کے لیکچر کے لیے گیا تھا۔ امامہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ عام طور پر لیکچر والے دن وہاں آتے ہوئے امامہ کو ساتھ لے آیا کرتا تھا یا سعیدہ اماں کی طرف چھوڑ دیتا تھا جن کا گھر وہاں سے دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ جتنی دیر وہ لیکچر سنتا امامہ، سعیدہ اماں یا آنٹی کے پاس بیٹھی رہتی پھر وہ وہاں سے کھانا کھا کر آجاتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے آج بھی سالار کا استقبال کسی گرم جوشی کے بغیر صرف ہاتھ ملا کر کیا تھا۔ لیکچر کے بعد ڈنر پر بھی انہوں نے سالار کے لیے وہ پرانی توجہ نہیں دکھائی۔ ڈنر پر فرقان بھی تھا اور ڈاکٹر صاحب فرقان سے گفتگو میں مصروف رہے۔ سالار سے ہونے والی تھوڑی سی بات چیت آنٹی نے کی تھی۔ سالار سے زیادہ اس رات اس رویے کو امامہ نے محسوس کیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر سبط علی کی کسی کے لیے ایسی خفگی پہلی بار دیکھی تھی۔ وہ خفگی اس کی وجہ سے اور اس کے لیے تھی اس کے باوجود امامہ کو ان کا رویہ سالار کو نظر انداز کرنا بری طرح چبھا تھا۔ واپس آتے ہوئے وہ پریشان تھی۔

اس رات وہ سونے کے لیے نہیں گئی تھی' ایک ناول لے کر وہ اسٹڈی روم میں آگئی تھی۔ وہ کام کرنے کے بجائے سگریٹ سلگائے بیٹھا تھا' اسے دیکھ کر اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔

"کمرے میں اکیلے بیٹھی بور ہوتی' اس لیے سوچا یہاں آجاؤں۔"

اس نے سگریٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے سالار کو تاویل دی۔

"تم ڈسٹرب تو نہیں ہوگے؟" اس نے سالار سے پوچھا۔

"نہیں بالکل نہیں۔" وہ کچھ حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

وہ راکنگ چیئر پر جا کر بیٹھ گئی اور اس نے ناول کھول لیا۔ وہ سگریٹ پینا چاہتا تھا' لیکن وہ اس کے سامنے سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ امامہ یہ جانتی تھی اور وہ اسی لیے وہاں آکر بیٹھی تھی۔

کچھ دیر وہ بے مقصد اسے دیکھتا رہا' پھر اپنا لیپ ٹاپ نکال کر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کام کرنے لگا تھا۔ کافی دنوں کے بعد اس رات اس نے پریشان ہو کر سگریٹ پینے کے بجائے کام کیا تھا۔ بے حد ان کمفرٹیبل ہونے کے باوجود بھی وہ پچھلے ایک ہفتے میں صرف گھر آکر ہی نہیں' آفس میں بھی اسی طرح چین اسموکنگ کر رہا تھا اور اب اسے عادتاً طلب ہو رہی تھی۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اس نے بالآخر امامہ کو مخاطب کیا۔

"تم سو جاؤ۔ کافی رات ہو گئی ہے۔" امامہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تم فارغ ہو گئے ہو؟"

"نہیں مجھے ابھی کافی کام ہے۔"

"تو پھر میں بیٹھی ہوں ابھی تم کام ختم کرلو میرا بھی ایک چیپٹر رہتا ہے۔"

سالار بے اختیار گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

یعنی وہ آج رات مزید کوئی سگریٹ نہیں پی سکتا تھا۔ اس نے ایش ٹرے میں سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑے کو دیکھتے ہوئے قدرے مایوسی سے سوچا۔

مزید ایک گھنٹے کے بعد جب وہ فارغ ہوا تو وہ تب تک اسی راکنگ چیئر پر سو چکی تھی۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا بے مقصد اسے دیکھتا رہا۔

اگلے چند دن اسی طرح ہوتا رہا' وہ اس کے کام کے وقت آکر اسٹڈی روم میں بیٹھ جاتی اور وہ پھر مجبوراً" کام ہی کرتا رہتا۔ ان کے درمیان آہستہ آہستہ گفتگو ہونے لگی اور اس کا آغاز امامہ ہی کرتی تھی۔ سالار بے حد شرمندہ تھا اور اس کی خاموشی کی بنیادی وجہ یہی تھی۔ وہ اس پورے واقعے سے بری طرح ہرٹ ہونے کے باوجود اسے بھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

ڈاکٹر سبط علی نے اگلے ہفتے بھی سالار کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا تھا۔ اس بار امامہ کو پہلے سے بھی زیادہ رنج ہوا۔

✲ ✲ ✲

"ابو! آپ سالار سے اچھی طرح بات کیوں نہیں کرتے؟"
امامہ اگلے دن سہ پہر کو ڈاکٹر سبط علی کے آفس سے آنے کے بعد ان کے گھر آئی تھی۔
"کیسے بات کرنی چاہیے؟" وہ بے حد سنجیدہ تھے۔
"جیسے آپ پہلے بات کرتے تھے۔"
"پہلے سالار نے یہ سب کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے بڑی خوش گمانیاں تھیں۔" وہ مدھم آواز میں بولے۔
"ابو! وہ برا نہیں ہے' وہ بہت اچھا ہے۔ میری غلطی تھی ورنہ شاید بات اتنی نہ بڑھتی۔ وہ بہت عزت کرتا ہے میری' بہت خیال رکھتا ہے' لیکن اب یہ سب ہونے کے بعد وہ بہت پریشان ہے۔" وہ سر جھکائے وضاحتیں دے رہی تھی۔
"آپ جب اسے اس طرح اگنور کرتے ہیں تو مجھے بہت ہتک محسوس ہوتی ہے' وہ یہ سلوک تو ڈیزرو نہیں کرتا۔ فرقان بھائی کے سامنے کتنی بے عزتی محسوس ہوتی ہوگی اسے۔" وہ بے حد رنجیدہ تھی۔
ڈاکٹر سبط علی بے ساختہ ہنس پڑے۔ امامہ نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔
"میں جانتا ہوں سالار برا آدمی نہیں ہے' وہ پریشان اور نادم ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ قصور اس کا زیادہ نہیں ہے اور میرا اس کے ساتھ رویہ آپ کو برا لگتا ہوگا۔" وہ حیرانی سے ڈاکٹر سبط علی کا چہرہ دیکھنے لگی۔
"بیٹا! میں آپ کو اسی بات کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ مرد جب غصے میں گھر چھوڑ کر جاتا ہے تو وہ جیسے جاتا ہے' ویسے ہی آجاتا ہے۔ اس کے گھر سے جانے پر اس کی اپنی عزت پر حرف آتا ہے نہ اس کی بیوی کی عزت پر حرف آتا ہے' لیکن عورت جب غصے میں گھر سے نکلتی ہے تو اپنی اور مرد دونوں کی عزت لے کر باہر آجاتی ہے۔ وہ واپس آجائے' تب بھی مرد کی اور عورت' دونوں کی عزت کم ہو جاتی ہے۔ جھگڑا ہوا تھا کوئی بات نہیں' اس نے غصے میں برا بھلا کہا' جانے کا کہہ دیا۔ آپ گھر کے کسی دوسرے کمرے میں چلی جاتیں وہ ہاتھ پکڑ کر تو نہیں نکال رہا تھا۔ صبح ہوتی اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا۔ ایک آدھ دن میں بات ختم ہو جاتی' اتنا بڑا مسئلہ نہ بنتا۔" وہ ملائمت سے اسے سمجھا رہے تھے۔
"مرد کے دل میں اس عورت کی عزت کبھی نہیں ہوتی' جسے چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھر کی دہلیز پار کرنے کی عادت ہو اور یہ دوسری بار ہوا ہے۔" اس نے چونک کر ڈاکٹر صاحب کو دیکھا وہ مسکرا رہے تھے۔
"یاد ہے شادی کے دوسرے دن بھی آپ ناراض ہو کر سعیدہ اماں کے پاس رہ گئی تھیں۔"
امامہ نے نادم ہو کر سر جھکا لیا۔ اسے یہ واقعہ یاد نہیں رہا تھا۔
"مرد کے ساتھ انا کا مقابلہ کرنے والی عورت بے وقوف ہوتی ہے۔ وہ اسے اپنا دشمن بنا لیتی ہے۔ اکڑ پن اور ضد کر کے مرد سے بات منوائی جا سکتی ہے' اس کے دل میں اپنی محبت اور عزت نہیں بڑھائی جا سکتی۔ اللہ نے آپ کو بہت محبت کرنے والا اور بہت سی خوبیوں والا شوہر دیا ہے۔ اس نے آپ کی عیب جوئی نہیں کی بلکہ معذرت کر کے آپ کو ساتھ لے گیا۔ بہت کم مردوں میں یہ صفت ہوتی ہے تو اگر کبھی کوئی کوتاہی ہو جائے اس سے یا کوئی گلہ ہو تو اس کی مہربانیاں یاد کر لیا کریں۔" وہ سر جھکائے خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔
"اگر میں یہ سب باتیں اس وقت آپ کو سمجھاتا جب آپ یہاں آئی تھیں تو آپ میری بات کبھی نہ سمجھتیں۔ آپ کو لگتا آپ کے اپنے والدین ہوتے تو وہ اس سچویشن میں آپ کو سمجھاتے نہیں صرف سپورٹ کرتے۔ اس

لیے یہ باتیں تب نہیں سمجھائیں میں نے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ وہ اسے اس وقت یہ سب کچھ کہتے تو وہ بری طرح دل برداشتہ ہوتی۔ اس نے کچھ کہے بغیر وہ پیپرز نکال کر انہیں دیے جو سالار نے اسے دیے تھے۔

"یہ سالار نے دیے ہیں مجھے' لیکن مجھے ضرورت نہیں ہے ان کی' آپ اسے بتادیں۔"

ڈاکٹر سبط علی بے حد گہری مسکراہٹ کے ساتھ وہ پیپرز پڑھتے رہے' پھر ہنس پڑے۔

"اس نے یہ بہت مناسب اور حکمت والا کام کیا ہے۔ اپنے پاس آنے والے اکثر مردوں کو میں ان معاملات کے حوالے سے اسی طرح کے تصفیے کا کہتا ہوں اور کئی مردوں نے کیا بھی ہے۔ سالار کے ذہن میں بھی وہی چیز ہے' لیکن اس نے آپ کے لیے کچھ زیادہ کردیا ہے۔"

وہ پیپرز پر نظر ڈالتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔

"لیکن میں..." وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ جب ڈاکٹر صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ بھی اس کا بھرپور خیال رکھا کریں۔"

وہ اسے پیپرز لوٹا رہے تھے' یہ جیسے گفتگو ختم کرنے کا اشارہ تھا۔



اس دن وہ پورا راستہ ڈاکٹر صاحب کی باتوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ انہوں نے اسے کبھی نصیحتیں نہیں کی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح کی باتیں کی تھیں۔ کوئی نہ کوئی غلطی انہوں نے اس کی بھی محسوس کی تھی کہ اس طرح اسے سمجھانے لگے تھے۔ وہ کھانا پکاتے ہوئے بھی ان کی باتوں کے بارے میں سوچتی رہی۔

"تم ڈاکٹر صاحب کے پاس گئی تھیں؟" سالار نے شام کو گھر آتے ہی اس سے سوال کیا۔

"ہاں۔ تمہیں کیسے پتا چلا؟" وہ کھانے کے برتن ٹیبل پر لگا رہی تھی۔

"انہوں نے مجھے فون کیا تھا۔" وہ گردن سے ٹائی نکالتے ہوئے بولا۔

"اوہ' کچھ کہا انہوں نے تم سے؟" اس نے سالار کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں... بس ویسے ہی کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔"

امامہ کو محسوس ہوا وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح کپڑے تبدیل کرنے کے لیے بیڈ روم میں جانے کے بجائے' ٹائی نکال کر بے مقصد کچن کاؤنٹر کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا ڈش میں پڑا ساؤ کھانے میں مصروف تھا۔

"آج کیا ہے کھانے میں؟" شادی کے اتنے مہینوں میں آج پہلی دفعہ اس نے یہ سوال کیا تھا۔

امامہ نے اسے بتایا' لیکن وہ حیران ہوئی تھی۔

"اور سویٹ ڈش؟" یہ سوال پہلے سے بھی زیادہ اچھالے کر آیا تھا۔ وہ میٹھے کا شوقین نہیں تھا۔

"کل چائنیز بنانا۔" وہ ایک بار پھر اس کا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ کھانے کے معاملے میں فرمائشیں کرنے کا کہاں عادی تھا۔

"کل بھی چائنیز تھا۔" فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے' اس نے سادہ لہجے میں سالار کو یاد دلایا۔ وہ گڑبڑا گیا۔

"ہاں' کل بھی چائنیز تھا' کوئی بات نہیں' کل پھر چائنیز سہی۔"

آئی مین۔ اس میں کوئی ہرج نہیں۔" امامہ نے صرف سر ہلا دیا۔

وہ اب فریج سے چپاتیاں بنانے کے لیے آٹا نکال رہی تھی۔

"Aqua Blue کلر تم پر اچھا لگتا ہے۔" وہ فریج کا دروازہ کھولے جیسے کرنٹ کھا کر پلٹی تھی۔ اس نے بے حد

حیرت سے سالار کو دیکھا۔
"آ۔ آ۔ ایکوا بلیو نہیں ہے یہ؟" اس کی آنکھوں کے تاثر نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔
"سالار! تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟" امامہ نے کہا۔
"کیوں کیا ہوا؟ مجھے لگا یہ Aqua blue ہے۔"
"یہ ایکوا بلیو ہی ہے۔ اسی لیے تو پوچھ رہی ہوں کہ مسئلہ کیا ہے؟"
وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنس پڑا۔ پھر کچھ کہے بغیر وہ آگے بڑھا اور اسے ساتھ لگا لیا۔
"Just Wanted to thank you" (صرف تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا) امامہ نے اسے کہتے سنا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کس چیز کے لیے شکریہ ادا کر رہا تھا۔
"And I am realy realy sorry I mean it"
(اور آئی ایم رئیلی سوری۔ آئی مین اٹ)
وہ اب دوبارہ معذرت کر رہا تھا۔
"آئی نو۔" اس نے مدھم آواز میں کہا۔
"I Love You" امامہ کا دل بھر آیا۔
ان کی شادی شدہ زندگی میں صرف پچھلے دس دن ایسے تھے جس میں اس نے ایک بار بھی سالار سے یہ جملہ نہیں سنا تھا۔ پہلے ڈاکٹر سبط علی کے گھر پر ہونے کی وجہ سے دونوں کے درمیان رابطہ نہیں تھا اور بعد میں شاید سالار اس سے یہ کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ اگر اس سے فون پر یہ نہیں کہہ پاتا تھا تو پھر ایس ایم ایس پر کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیجتا رہتا تھا۔
"Wife" "Woman" "Sweetheart" "Darling" "Honey" "Dear" "Mine" "Yours" "You" "Best" "Waiting" "Missing" "Betterhalf" "Hoping" "Thinking" "Mrs" "Partner" "Friend" "Beauty"۔
ڈیر ہنی ڈارلنگ، سویٹ ہارٹ، ویٹنگ، مسنگ، بیٹر ہاف، وائف، وومن، تھنکنگ، مسز، پارٹنر، فرینڈ، ہوپنگ۔
وہ ایک لفظی ایس ایم ایس شروع میں اسے بری طرح جھنجلا دیتے تھے۔
"مجھے کیا پتا تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ پورا جملہ کیوں نہیں لکھ سکتے تم؟ یقیناً کوئی کلائنٹ ہوتا ہو گا تمہارے پاس اور تم وقت بچانے کے لیے ایسے میسجز بھیجتے ہو۔"
"اگر کلائنٹ کے سامنے بیٹھ کر مسنگ لکھ سکتا ہوں تو مسنگ یو بھی لکھ سکتا ہوں۔" اس نے کہا تھا۔ "تو پھر کیوں نہیں لکھتے؟"
"اس طرح تم میرے ایس ایم ایس کو کچھ زیادہ دھیان سے پڑھتی ہو گی۔" اس نے لوجک دی۔ اس نے دل میں اعتراف کیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اس ایک لفظ کے بارے میں ضرور سوچتی تھی۔ صرف ایک جملہ تھا جو وہ ہمیشہ پورا لکھتا تھا۔
"آئی لو یو۔"
"خالی لو کیوں نہیں لکھ دیتے تم؟ یہ کیوں پورا لکھتے ہو؟" امامہ نے نوٹس کیا تھا۔
"بتاؤں گا تمہیں کبھی۔" سالار نے اسے ٹالا تھا وہ اسے بتا نہیں سکا کہ وہ لو کے لفظ پر خائف تھا۔ اس کے ذہن میں اگر امامہ ابھرتی تھی تو امامہ کے ذہن میں "کون" ابھرتا ہو گا۔

اور اب وہ one-word riddles غائب ہو گئی تھیں تو اسے ان کی قدر و قیمت کا احساس ہوا تھا۔ لاشعوری طور پر وہ اس سے اس ستائش اور اظہار محبت کی توقع رکھنے لگی تھی اور جب وہ سب کچھ غائب ہوا تو وہ فنی اور سلی باتیں اس کے لیے بہت سنجیدہ ایشو ہو گئی تھیں۔

وہ اس سے الگ ہو گیا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ Aqua Blue ہے؟"

اپنی پوروں سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے امامہ نے بات بدلنے کی کوشش کی تھی۔

"تم ہمیشہ عجیب نام لیتی ہو کلرز کے۔ Aqua Blue واحد عجیب نام تھا جو مجھے Blue کلر کے لیے اس وقت یاد آیا۔" اس نے سادہ لہجے میں کہا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی وہ کلر بلائنڈ تھا اسے اب اندازہ ہو چکا تھا۔

"Very Smart!" اس نے جیسے اسے داد دی۔

"You thing so"

وہ ہنسا۔

"Yes I do"

"Thank You Then" ________ وہ کہتا ہوا کچن سے نکل گیا تھا۔

کچن کے وسط میں کھڑی وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ دنیا کا سب سے عجیب رشتہ تھا۔ دور ہوں تو دیواروں کا جنگل اگ آئے، پاس ہوں تو کاغذ جیسی دیوار بھی نہ رہ جائے۔ ناراض ہو تو گلوں کے لیے سمندر بھی کم پڑ جائے اور محبت ہو تو گمنام کی ہر چیز صحرا میں پانی بن جائے۔ غصہ ہو تو ایک دوسرے کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہ ہو اور غصہ ختم ہو تو ایک دوسرے کے بغیر قرار مشکل ہو جائے۔ وہ بھی شوہر اور بیوی کے رشتے میں منسلک ہو جانے کے بعد اس تعلق کے سارے نشیب و فراز سے گزر رہے تھے اور پچھلے دس دن اس کی زندگی کا پہلا نشیب تھا۔



"کیا لو گی تم؟" سالار نے مینیو کارڈ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں تو Shrimps کی ڈشز میں سے کوئی ٹرائی کروں گی۔ تم دیکھ لو، تم کو کیا چاہیے؟" وہ اسلام آباد میں دوسری بار باہر کھانا کھانے نکلے تھے اور احتیاطاً انہوں نے ایک نئے بنے ہوئے چائنیز ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کی تمام احتیاط کم از کم آج ان کے کام نہیں آئے گی۔

پندرہ منٹ بعد کھانا سرو ہو گیا اور وہ کھانا کھانے لگے تھے۔ کھانا کھانے کے دوران ویٹر نے ایک چٹ لا کر سالار کو دی۔ اس نے کچھ حیرانی سے اس چٹ پر نظر ڈالتے ہوئے اس پر لکھی تحریر پڑھی۔

"آپ یہ جگہ فوراً چھوڑ دیں۔"

سالار نے کچھ حیرانی سے سر اٹھا کر ویٹر کو دیکھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے ویٹر سے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا ایک کرنٹ جیسے اسے چھو گزرا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ وہ کیا تھا۔

بے حد برق رفتاری سے چند کرنسی نوٹ والٹ سے نکال کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے ویٹر کو بل کلیئر کرنے کا کہا۔ امامہ حیرانی سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"کھانا چھوڑ دو۔ ہمیں جانا ہے۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیوں؟" وہ کچھ نہ سمجھی تھی کیونکہ انہیں کھانا شروع کیے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے۔

"امامہ! یہ تمہیں باہر جا کر بتاتا ہوں بیگ لے لو اپنا۔" وہ کرسی دھکیلتا ہوا پلٹا اور پھر ساکت ہو گیا۔ انہیں نکلنے

میں دیر ہو گئی تھی۔ اس نے کچھ فاصلے پر ہاشم مبین کے ساتھ وسیم اور امامہ کے بڑے بھائی کو دیکھا اور وہ ان ہی کی طرف آرہے تھے۔

وہ برق رفتاری سے امامہ کی کرسی کی طرف آیا۔ امامہ ٹیبل کے نیچے اپنے قدموں کے قریب رکھا ہوا اپنا بیگ اٹھا رہی تھی۔ اس نے ابھی انہیں آتے نہیں دیکھا تھا۔ سالار کے اپنے قریب آنے پر بیگ اٹھاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور کھڑا ہونے پر اس نے بھی اپنی فیملی کے افراد کو اپنی طرف آتے دیکھ لیا۔ ایک لحہ میں اس کا خون خشک ہو گیا۔ سالار نے کچھ کہنے کے بجائے اسے اپنی اوٹ میں کیا تھا۔ ان کی ٹیبل کھڑکی کے پاس تھی اور امامہ کے عقب میں اب کھڑکیاں تھیں۔

"سامنے سے ہٹو!" ہاشم مبین نے پاس آتے ہی بلند آواز میں اس سے کہا تھا۔

آس پاس ٹیبلز پر بیٹھے لوگ یک دم ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ نہ صرف کسٹمرز بلکہ دوسری ٹیبلز پر سرو کرنے والے ویٹرز بھی۔

آخری چیز جو سالار وہاں توقع کر سکتا تھا وہ ایک پبلک پلیس پر ایسا ہی سین تھا۔

"آپ ہمارے ساتھ گھر چلیں وہاں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔"

سالار نے بے حد تحمل کے ساتھ ہاشم سے کہا تھا۔

اس نے جواباً ایک گالی دیتے ہوئے اسے گریبان سے پکڑا اور کھینچ کر ایک طرف ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے وسیم اور عظیم سے امامہ کو وہاں سے لے جانے کے لیے کہا۔ ہاشم کے برعکس وسیم اور عظیم دونوں کچھ متامل تھے۔ وہ جانتے تھے اس طرح زبردستی اس ریسٹورنٹ سے کسی کو ہال سے باہر نہیں لے جا سکتے کیونکہ سیکیورٹی کا سامنا کیے بغیر امامہ کو بحفاظت وہاں سے لے جانا مشکل تھا۔

وہ سالار کے عقب میں اس کی شرٹ پکڑے تھر تھر کانپتی ہوئی تقریباً اس سے چپکی ہوئی تھی جب ہاشم نے سالار کا گریبان پکڑتے ہوئے اسے کھینچا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

امامہ سالار کے ساتھ کھانا کھانے ریسٹورنٹ میں جاتی ہے۔ ایک ویٹر سالار کو ایک چٹ لا کر دیتا ہے۔ "آپ یہ جگہ فوراً چھوڑ دیں۔" سالار جانے لگتا ہے لیکن تب ہی امامہ کے باپ اور بھائی وہاں آجاتے ہیں۔ وہ سالار پر حملہ کرتے ہیں۔

ساتویں قسط

سالار نے اپنا دفاع کرتے ہوئے اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے ہاشم مبین کو ذرا سا پیچھے دھکیلا۔ ان کے لیے یہ دھکا کافی ثابت ہوا۔ وہ پیر پھسلنے پر بے اختیار پیچھے گرے۔ ریسپشن تب تک باہر موجود سیکیورٹی کو انفارم کرچکا تھا۔ ہال میں دوسری میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ کچھ متوحش انداز میں یہ سب دیکھ رہے تھے۔ جبکہ میزوں پر سرو کرتے ہوئے ویٹرز بے حد برق رفتاری سے ان کی طرف بڑھنے لگے۔ اس دھکے نے عظیم کو بھی یکدم مشتعل کردیا۔ وہ بھی بلند آواز میں اسے گالیاں دیتے ہوئے جوش میں آگے آیا اور بے حد غیر متوقع انداز میں اس نے سالار کے جبڑے پر گھونسا دے مارا۔ چند لمحوں کے لیے سالار کی آنکھوں کے سامنے واقعی اندھیرا چھا گیا۔ وہ اس گھونسے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ ذرا سا ایک طرف جھکا اور عظیم اس کے پیچھے کھڑی امامہ تک جا پہنچا۔ اس نے کانپتے ہوئے سالار کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی، لیکن عظیم نے اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے نہ صرف سالار سے الگ کرنے کی کوشش کی بلکہ اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ بھی رسید کیا۔ سالار تب تک سنبھل کر سیدھا ہوتے ہوئے اسے چھڑانے کے لیے پلٹا تھا۔ جب اس کے بائیں کندھے کی پشت پر درد کی تیز لہر اٹھی۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر اپنی چیخ روکی۔ وہ ہاشم مبین تھے جنہوں نے ٹیبل پر پڑا چاقو اس کی پشت میں مارنے کی کوشش کی، لیکن آخری لمحے میں ہٹنے کی وجہ سے وہ اس کے بائیں کندھے میں جا لگا تھا۔

سیکیورٹی اور دوسرے ویٹرز تب تک قریب پہنچ چکے تھے۔ سالار نے اپنے کندھے کی پشت سے وہ چاقو نکال لیا۔ سیکیورٹی والے اب ان تینوں کو پکڑ چکے تھے۔ وہ چاقو نوک دار ہوتا تو زخم بے حد خطرناک ہوتا، لیکن اب بھی اس چاقو کا اگلا سرا اس کے کندھے کے گوشت میں دھنسا ہوا تھا۔ امامہ نے نہ تو ہاشم مبین کو سالار کو وہ چاقو مارتے دیکھا تھا، نہ ہی اس نے سالار کو وہ چاقو نکالتے دیکھا۔ سیکیورٹی والوں نے سالار کو عظیم سے چھڑاتے ہوئے عظیم کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ تب تک سالار اپنی جینز کی جیب سے سیل نکال کر سکندر کو فون پر وہاں آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے، لیکن وہ اس کے باوجود اپنے لہجے کو حتی المقدور نارمل رکھتے ہوئے سکندر سے بات کر رہا تھا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے اپنی پشت کے اس زخم کو دبائے ہوئے تھا۔ اس کے دبانے اور محسوس کرنے کے باوجود اس کے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اپنے کندھے سے کمر تک خون کی نمی محسوس کر رہا تھا لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ خون کتنی مقدار میں نکل رہا تھا۔

سیکیورٹی والے اس گفتگو کے دوران ہاشم مبین، وسیم اور عظیم کو وہاں سے لے جاچکے تھے۔ ریسٹورنٹ کے پورے ہال میں بے حد سراسیمگی کا عالم تھا۔ کچھ لوگ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے تھے اور جو ابھی وہاں موجود تھے وہ ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

"آپ کو فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہوگی، آپ آجائیں۔" منیجر نے اس کی پشت پر بہنے والے خون کو دیکھتے ہوئے کچھ تشویش کے عالم میں اس سے کہا۔ اس نے یقیناً یہ سوچا ہوگا کہ ہال کا ماحول ان کی موجودگی میں نارمل نہیں ہو سکتا تھا۔

امامہ نے مینیجر کی اس بات پر کچھ حیران ہو کر سالار کو دیکھا' وہ اب فون پر بات ختم کر رہا تھا۔ امامہ نے اس کے اس ہاتھ کو پہلی بار نوٹس کیا جو وہ کندھے کے اوپر سے پیچھے کیے ہوئے تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" امامہ نے قدرے سراسیمگی کے عالم میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" سالار نے اپنا بازو سیدھا کیا۔ امامہ نے اس کی خون آلود انگلیاں دیکھیں۔ اس نے سمجھا کہ شاید اس کا ہاتھ زخمی تھا۔

"اسے کیا ہوا؟" اس نے کچھ حواس باختہ ہو کر پوچھا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے ایک قریبی ٹیبل سے نیپکن اٹھا کر اپنا ہاتھ صاف کرتے ہوئے امامہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔ مینیجر اور سیکیورٹی کے چند لوگوں کے ساتھ چلتے ہوئے وہ مینیجر کے کمرے میں آگئے۔ وہ پولیس کو کال کر چکا تھا اور اب وہ پولیس کے آنے تک انہیں وہاں روکنا چاہتا تھا لیکن سالار زخمی تھا اور اسے فرسٹ ایڈ دینا ضروری تھی۔

مینیجر کے کمرے میں پہنچ کر ہی امامہ نے پہلی بار سالار کی خون آلود پشت دیکھی اور وہ دھک سے رہ گئی تھی۔ ایک قریبی کلینک سے پہنچنے والی ایمبولینس کے آنے تک انہوں نے اس کی شرٹ اتار کر اس کا خون روکنے کی کوشش کی۔ مگر زخم گہرا تھا اور ٹانکوں کے بغیر ٹھیک ہونا مشکل تھا۔

وہ اس قدر شاکڈ تھی کہ وہ ریسٹورنٹ کے عملے کے افراد کی فرسٹ ایڈ اور سالار کو گم صم دیکھتی رہی۔ وہ کیا کچھ کر سکتی تھی یا اسے کیا کرنا چاہیے تھا؟ اسے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

اگلے پانچ سات منٹ میں پولیس' ایمبولینس اور سکندر آگے پیچھے ہی پہنچے تھے۔

سکندر کے آتے ہی سالار نے امامہ کو گھر کے بجائے فوری طور پر کہیں اور بھیجنے کے لیے کہا۔ سکندر خود سالار کو ہاسپٹل لے کر جا رہے تھے۔ چاہنے کے باوجود وہ سالار سے یہ نہیں کہہ سکی کہ وہ اس کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔

سکندر نے اسے فوری طور پر اپنے بڑے بھائی شاہنواز کے گھر ڈرائیور اور پولیس کی سیکیورٹی میں بھجوایا تھا۔ شاہنواز کی فیملی گھر پر نہیں تھی۔ عجلت میں انہوں نے نوکروں کو امامہ کا خیال رکھنے کی تاکید کی اور سکندر کی طرف چلے گئے۔

وہ بت کی طرح آکر گیسٹ روم میں بیٹھ گئی۔ اسے سب کچھ ایک بھیانک خواب کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ سالار کو کسی نے چاقو سے زخمی کیا تھا' یہ اس نے سن لیا تھا مگر یہ اس کے باپ نے کیا تھا یا بھائیوں میں سے کسی نے کسی بھی ۔۔۔ یہ وہ نہیں جان سکی۔ ریسٹورنٹ کی سیکیورٹی نے ہاشم' وسیم اور عظیم کو پولیس کے آنے تک ایک کمرے میں بند کر دیا تھا اور اس کے بعد اب آگے کیا ہونے والا تھا' اسے سوچتے ہوئے بھی اسے اپنا وجود مفلوج ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

اسے ابھی آئے ہوئے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ سالار کی کال آگئی۔

"تم پہنچ گئی ہو؟" اس نے امامہ کی آواز سنتے ہی کہا۔

"ہاں۔۔۔ تم کہاں ہو؟"

"ابھی کلینک پر ہوں۔" سالار نے اسے کہا۔

"اور ابو۔۔۔؟"

"پاپا ساتھ ہیں میرے۔" سالار نے اس کے لفظوں پر غور نہیں کیا تھا۔

"میں اپنے ابو کا پوچھ رہی ہوں؟" امامہ نے بے ساختہ کہا۔ وہ چند لمحے کچھ بول نہیں سکا۔

اسے نا چاہتے ہوئے بھی اس وقت امامہ کی ہاشم کے بارے میں تشویش بری لگی۔

"وہ تینوں پولیس کسٹڈی میں ہیں۔۔۔ یہاں سے فارغ ہو کر اب ہم وہیں جائیں گے۔" امامہ کا دل ڈوبا۔ باپ اور بھائیوں کے حوالات میں ہونے کے تصور نے چند لمحوں کے لیے اسے سالار کے زخمی ہونے کے بارے میں بالکل لاپروا کر دیا۔

"سالار! پلیز! انہیں معاف کر دو اور ریلیز کروا دو۔"

سکندر اس وقت اس کے پاس تھے۔ وہ امامہ سے کچھ کہہ نہیں سکا لیکن وہ خفا ہوا تھا۔ وہ اس سے زیادہ اپنی فیملی کے لیے پریشان تھی۔ وہ زخمی تھا لیکن اس نے یہ تک پوچھنے کی زحمت نہیں کی کہ وہ اب کیسا ہے اور اس کی بینڈیج ہو گئی یا زخم گہرا تو نہیں تھا؟

"میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔" اس نے کچھ کہنے کے بجائے فون بند کر دیا تھا۔

کلینک میں اس کے چیک اپ اور بینڈیج میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ خوش قسمتی سے اس کی۔۔۔ کسی رگ یا شریان کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔

کلینک میں ہی سکندر کی فیملی کے افراد نے پہنچنا شروع کر دیا اور سالار کو سکندر کے اشتعال سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ معاملہ بہت سنجیدہ نوعیت اختیار کر گیا تھا۔ وہ خود بے حد ناراض ہونے کے باوجود اس معاملے کو ختم کرنے کا خواہش مند تھا لیکن سکندر نہیں۔

شاہنواز کی بیوی اور دونوں بہوئیں آدھے گھنٹے کے بعد گھر آ گئی تھیں اور تب تک طیبہ بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ سکندر نے فی الحال اپنے گھر میں نہ رہنا بہتر سمجھا تھا۔

شاہنواز کی بیوی اور بہوؤں نے اگرچہ امامہ سے اس ایشو پر زیادہ بات نہیں کی تھی لیکن وہ لاؤنج میں طیبہ اور ان لوگوں کی بلند آواز میں ہونے والی باتیں سنتی رہی۔ طیبہ بری طرح برہم تھیں۔ وہ شاہنواز کے گھر آنے کے باوجود امامہ کے پاس نہیں آئیں۔ وہ خود بھی اتنی ہمت نہیں کر سکی کہ باہر نکل کر ان کا سامنا کرتی۔ وہ بے حد غصے میں ہاشم مبین اور اس کے بھائیوں کو برا بھلا کہتی رہیں اور وہ گیسٹ روم میں بیٹھی ہچکیوں سے روتے ہوئے یہ سب کچھ سنتی رہی۔ یہ طیبہ کے کڑوے کسیلے جملے یا خاندان کے سامنے ہونے والی سبکی نہیں تھی، یہ احساس تھا کہ ہاشم اور اس کے بھائی اس وقت حوالات میں بند تھے اور نجانے ان کے ساتھ وہاں کیا سلوک ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی فیملی بے حد بارسوخ تھی اور حوالات میں کوئی ان کے ساتھ عام مجرم کی طرح کا رویہ نہیں رکھ سکتا تھا مگر وہ جانتی تھی اس کی فیملی کا حوالات میں رہنا ہی بے حد بے عزتی کا باعث ہے۔

اس نے دو بار سالار سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے پہلی بار اس کی کال نہیں لی اور دوسری بار اس کا سیل بند تھا۔ وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ اس نے اسی کی کال سے بچنے کے لیے فون بند کیا ہو گا۔ یہ دوسری بار ہوا تھا کہ اس نے اپنا سیل فون اس کی وجہ سے آف کیا ہوا تھا۔

"کیوں persue (پیروی) نہ کروں اس کیس کو۔۔۔؟ انہیں چھوڑ دوں تاکہ اگلی بار وہ تمہیں شوٹ کر دیں۔"

اس نے ہسپتال سے پولیس اسٹیشن جاتے ہوئے گاڑی میں سکندر سے کہا تھا۔ "میں بات بڑھانا نہیں چاہتا۔"

"بات بڑھ چکی ہے اور اس سب کی ابتدا ابھی انہوں نے کی ہے۔" سکندر بے حد مشتعل تھے۔

"پاپا! وہ امامہ کی فیملی ہے۔" اس نے بالآخر کہا۔

"نہیں، وہ امامہ کی فیملی تھی، انہیں اگر امامہ کی پروا ہوتی تو وہ اس کے شوہر پر کبھی ہاتھ نہ اٹھاتے اور اگر انہیں امامہ کی پروا نہیں ہے تو امامہ کو بھی ان کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔"

انہوں نے مین السطور کیا کہا تھا' سالار کو سمجھنے میں کوئی وقت نہیں ہوئی۔
"یہ ایک حد تھی جو میں کبھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ پار کریں 'لیکن انہوں نے یہ حد پار کرلی ہے۔ میری فیملی میں سے کسی کو تکلیف پہنچے گی تو میں ہاشم فیملی کو کسی سیف ہیون میں نہیں رہنے دوں گا۔

I'll pay them in the same coin .

(میں انہیں ان ہی کی زبان میں جواب دوں گا)
یہ بات تم اپنی بیوی کو بتا بھی دو اور سمجھا بھی دو۔"
"پاپا! پلیز اس ایشو کو حل ہونا چاہیے۔" سالار نے باپ سے کہا۔
سکندر کا مشتعل رویہ اسے خائف کرنے لگا تھا۔ وہ بے حد متحمل مزاج تھے لیکن اس وقت سالار ان کا ایک نیا روپ دیکھ رہا تھا۔

"یہ خواہش ان کو کرنی چاہیے۔ صرف تب یہ مسئلہ حل ہوگا۔

How dare he touch my son

(اسے میرے بیٹے کو ہاتھ لگانے کی ہمت بھی کیسے ہوئی) اس کا خیال ہے میں برداشت کروں گا یہ غنڈہ گردی۔۔۔۔؟ اب وہ مجھے پولیس انٹیلیجنس سے نکل کر دکھائے۔"
انہیں ٹھنڈا کرنے کی اس کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔ معاملہ کس حد تک بڑھ جائے گا اس کا اندازہ سالار کو نہیں تھا۔ اگلے دو گھنٹوں میں جہاں اس کی فیملی پولیس اسٹیشن میں آگئی تھی' وہاں ہاشم مبین کی بھی پوری فیملی وہاں موجود تھی۔
یہ صرف دو بارسوخ فیملیز کا مسئلہ نہیں رہا تھا' یہ کمیونٹیز کا مسئلہ بن گیا تھا۔ اسلام آباد پولیس کے تمام اعلا افسران اس معاملے کو حل کرانے کے لیے وہاں موجود تھے۔ ہاشم مبین کو سب سے بڑی مشکل اس ریسٹورنٹ کی انتظامیہ کی وجہ سے ہو رہی تھی جہاں یہ سب کچھ ہوا تھا۔ یہ سب کہیں اور ہوتا تو وہ بھی جواباً" سالار اور اس کی فیملی کے خلاف دس بارہ ایف آئی آر رجسٹر کروا چکے ہوتے 'لیکن ہال میں لگے سیکیورٹی کیمروں کی ریکارڈنگ ہاشم مبین کو ایک لمبے عرصے کے لیے جیل میں رکھنے کے لیے کافی تھی۔
ابتدائی غصے اور اشتعال کے دورے کے بعد بالآخر ہاشم فیملی نے واقعے کی سنگینی کو محسوس کرنا شروع کردیا 'مگر مسئلہ یہ ہو رہا تھا کہ سکندر فیملی کسی قسم کی لچک دکھانے پر تیار نہیں تھی۔
فجر تک وہاں بیٹھے رہنے کے بعد بھی مسئلے کا کوئی حل نہیں نکلا اور وہ بالآخر گھر واپس آگئے۔
وہ واپسی پر سارے راستے سکندر کو کیس واپس لینے پر قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا اور اس میں ناکام رہا تھا۔ سکندر اب اس معاملے میں اپنے بھائیوں کو شامل کرنے کے بعد سب کچھ اتنے آرام سے ختم کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔
وہ شاہنواز کے گھر آنے سے پہلے اپنے گھر سے' اپنے اور امامہ کے کچھ کپڑے لے آیا تھا۔ شاہنواز کے گھر گیسٹ روم میں داخل ہوتے ہی امامہ نے اس سے پوچھا تھا۔
"ابو اور بھائی ریلیز ہوگئے؟" اس کا دماغ گھوم گیا تھا' تو واحد چیز جس کی اسے پروا تھی وہ صرف اتنی تھی کہ اس کے باپ اور بھائی رہا ہوجائیں۔ اس کا زخم کیسا تھا؟ اس کی طبیعت ٹھیک تھی؟ اسے ان میں سے جیسے کسی بات میں دلچسپی ہی نہیں تھی۔
"نہیں۔۔۔ اور ہوں گے بھی نہیں۔" وہ بے حد خفگی سے کہتے ہوئے کپڑے تبدیل کرنے کے لیے واش روم میں

گیا تھا۔ پین کلرز لینے کے باوجود اس وقت تک جاگتے رہنے کی وجہ سے اس کی حالت واقعی خراب تھی اور رہی سہی کسر امامہ کی عدم توجہی نے پوری کر دی تھی۔

"وہ پولیس اسٹیشن میں ہیں؟" اس کے واش روم سے نکلتے ہی اس نے سرخ سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس سے پوچھا تھا۔ وہ جواب دیے بغیر بیڈ پر کروٹ کے بل لیٹ گیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔

وہ اٹھ کر اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"کیس واپس لے لو سالار۔ انہیں معاف کر دو۔" اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے ملتجیانہ انداز میں اس سے کہا۔ سالار نے آنکھیں کھول دیں۔

"امامہ! میں اس وقت سونا چاہتا ہوں' تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"میرے ابو کی کتنی عزت ہے شہر میں' وہ وہاں کیسے ہوں گے اور کیسے برداشت کر رہے ہوں گے یہ سب کچھ۔" وہ رونے لگی تھی۔

"عزت صرف تمہارے ابو کی ہے؟ میری' میرے باپ' میری فیملی کی کوئی عزت نہیں ہے؟"

وہ بے ساختہ کہہ گیا تھا۔ وہ سر جھکائے ہونٹ کاٹتے ہوئے روتی رہی۔

"یہ سب میرا قصور ہے' میری وجہ سے ہوا ہے یہ سب کچھ' مجھے تم سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"تمہارے پاس ہر چیز کی وجہ صرف شادی ہے۔ تم مجھ سے شادی کر کے جہنم میں آگئی ہو' شادی نہ ہوئی ہوتی تو جنت میں ہوتیں تم؟ ہے نا۔" وہ بری طرح برہم ہوا تھا۔

"میں تمہیں تو الزام نہیں دے رہی میں تو۔" اس نے خائف ہوتے ہوئے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"Show me some loyalty Imama"

(کچھ میرے ساتھ بھی وفاداری کا مظاہرہ کرو) ویسی وفاداری جیسی تم اپنے باپ اور بھائیوں کے لیے دکھا رہی ہو۔" وہ بول نہیں سکی تھی۔ اس نے جیسے اسے جوتا کھینچ مارا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا وہ اسے بھی اتنی ہرٹ کرنے والی بات کہہ سکتا تھا لیکن وہ اسے کہہ رہا تھا۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر اس کے بستر سے اٹھ گئی۔ سالار نے اس کو روکنے کے بجائے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

دوبارہ اس کی آنکھ دوپہر ساڑھے بارہ بجے کندھے میں ہونے والی تکلیف کی وجہ سے کھلی تھی۔ اسے ٹمپریچر بھی ہو رہا تھا۔ کندھے کو حرکت دینا مشکل ہو رہا تھا اور بستر سے اٹھتے ہی اس کی نظر امامہ پر پڑی تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس سے کچھ کہے بغیر اٹھ کر واش روم میں چلا گیا۔

نہا کر تیار ہونے کے بعد وہ باہر نکلا اور امامہ سے کوئی بات کیے بغیر وہ بیڈ روم سے چلا گیا۔ اسے اپنا آپ وہاں اجنبی لگنے لگا تھا۔ وہ واحد شخص تھا جو اس کی سپورٹ تھا اور وہ بھی اس سے برگشتہ ہو رہا تھا۔

"میں کیس واپس لے رہا ہوں۔" لنچ ٹیبل پر بیٹھے اس نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔ پورے ٹیبل پر ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ وہاں سکندر کے ساتھ ساتھ شاہنواز اور ان کی فیملی بھی تھی۔

"میں نے اس پورے معاملے کے بارے میں سوچا ہے اور۔۔۔"

طیبہ نے بے حد تلخی سے اس کی بات کاٹی تھی۔

"تم سوچنا کب کا چھوڑ چکے ہو' یہ تمہاری بیوی کی پڑھائی ہوئی پٹی ہو گی۔"

"ممی! امامہ کو اس پوری equation میں سے نکال دیں۔"

"اچھا۔ تو پھر تم اسے طلاق دے دو' یہ سارا معاملہ ہی ختم ہو جائے گا۔"

وہاں کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے ہاتھ میں پکڑا کاغذ رکھ دیا۔

"یہ میں نہیں کر سکتا اور یہ میں کبھی نہیں کروں گا۔"

"تو پھر ہم بھی وہ نہیں کریں گے جو تم چاہتے ہو۔ امامہ کا باپ اور بھائی جیل میں ہی رہیں گے۔" طیبہ نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔

"تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ سارا معاملہ کتنا بڑھ چکا ہے۔ کیس واپس لینے کا مطلب ان کو شہ دینا ہے۔ تم پوری فیملی کو خطرے میں ڈال رہے ہو۔" شاہنواز نے مداخلت کی۔

"رسک تو کیس چلنے کی صورت میں بھی ہوگا' بلکہ زیادہ ہوگا۔ یہ کیس تو مسئلہ حل نہیں کرے گا۔"

وہ جانتا تھا جو کچھ وہ کہہ رہا تھا' اس سے پوری فیملی کی کتنی لعنت ملامت اسے ملنے والی تھی۔ وہ سب کچھ اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ امامہ کو خوش کر سکتا تھا یا اپنی فیملی کو اور اپنی فیملی کو ناخوش کرنا اس کے لیے بہتر تھا۔

وہ اندر کمرے میں بیٹھی باہر سے آنے والی آوازیں سن رہی تھی لیکن اب وہ لوگ کیا کہہ رہے تھے' وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ ملازم بالآخر اسے کھانے کے لیے پوچھنے آیا اور وہ شدید بھوک کے باوجود نہیں گئی۔ وہ لنچ ٹیبل پر

بیٹھنے کی اس وقت ہمت نہیں رکھتی تھی اس سے بھوکا مرنا زیادہ بہتر تھا۔

وہ رات کے نو بجے تک اسی طرح کمرے میں بیٹھی رہی۔ سالار کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ کوئی کال' کوئی میسج نہیں۔ وہ صوفے پر بیٹھی تھکن کے عالم میں کب سو گئی اسے اندازہ نہیں ہوا۔

رات گئے اس کی آنکھ سالار کے کندھا ہلانے پر کھلی تھی۔ وہ ہڑبڑا گئی تھی۔

"اٹھ جاؤ' ہمیں جانا ہے۔" وہ کمرے سے اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا۔

وہ کچھ دیر بیٹھی اپنی آنکھیں رگڑتی رہی۔

"کیس واپس لے لیا ہے میں نے' تمہاری فیملی ریلیز ہو گئی ہے۔" وہ ٹھٹکی تھی۔

وہ بیگ کی زپ بند کر رہا تھا۔ کسی نے جیسے امامہ کے کندھوں سے منوں بوجھ ہٹایا تھا۔ اس کے چہرے پر آنے والا اطمینان وہ بھی نوٹس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

اس کے پیچھے باہر لاؤنج میں آتے ہوئے اس نے ماحول میں موجود تناؤ اور کشیدگی محسوس کی تھی۔ شاہنواز اور سکندر دونوں بے حد سنجیدہ تھے اور طیبہ کے ماتھے پر شکنیں تھیں۔ وہ نروس ہوئی تھی۔ وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے اس نے صرف اپنے لیے نہیں' شاہنواز کے رویے میں سالار کے لیے بھی سرد مہری محسوس کی تھی۔

وہ سالار کے ساتھ جس گاڑی میں تھی اسے ڈرائیور چلا رہا تھا۔ سکندر اور طیبہ دوسری گاڑی میں تھے۔ سالار پورا راستہ کھڑکی سے باہر دیکھتا کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ وہ وقفے وقفے سے اسے دیکھنے کے باوجود اسے مخاطب کرنے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔

گھر پہنچنے کے بعد بھی سب کی خاموشی اور سرد مہری ویسی ہی تھی۔ سالار' سکندر اور طیبہ کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھ گیا اور وہ کمرے میں چلی آئی تھی۔

آدھے گھنٹے کے بعد ملازم اسے کھانے پر بلانے آیا تھا۔

"تم مجھے یہیں پر کھانا دے دو۔" بھوک اس قدر شدید تھی کہ اس بار وہ کھانے سے انکار نہیں کر سکی۔ ملازم کی واپسی دو منٹ بعد ہی ہو گئی تھی۔

"سالار صاحب کہہ رہے ہیں' آپ باہر سب کے ساتھ آکر کھانا کھائیں۔"

وہ کچھ دیر بیٹھی رہی' یہ بلاوا کچھ غیر متوقع تھا۔ ٹیبل پر سکندر' طیبہ اور گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ بیٹھ کر

کھانا کھانا اس وقت بہت مشکل تھا۔ وہ کھانا اندر لانے کے لیے نہ کہہ چکی ہوتی تو اس وقت بھوک نہ ہونے کا بہانا کر دیتی لیکن اب یہ مشکل تھا۔

ہمت کرتے ہوئے جب وہ بالآخر ڈائننگ روم میں آئی تو سب ٹیبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کامران کی بیوی زوبا طیبہ سے کچھ بات کر رہی تھی' اس کی آمد پر کوئی خاص رد عمل نہیں ہوا۔ صرف سالار اپنی پلیٹ میں کچھ ڈالے بغیر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے بیٹھنے پر اسی نے اس سے پوچھتے ہوئے چاول کی ڈش اس کی طرف بڑھائی تھی اور پھر کھانے کے دوران وہ بغیر پوچھے کچھ نہ کچھ اس کی طرف بڑھاتا گیا۔ وہ ٹیبل پر ہونے والی بات چیت خاموشی سے سنتی رہی اور شکر ادا کرتی رہی کہ وہ اس سے متعلقہ نہیں تھی۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایشو اب اس لیے زیر بحث نہیں تھا کیونکہ وہ پہلے ہی اس حوالے سے ان سب کی لعنت و ملامت سمیٹ چکا تھا۔

ماحول آہستہ آہستہ نارمل ہو رہا تھا۔ طوفان گزرنے کے بعد اب اس کے اثرات بھی معدوم ہونے لگے تھے۔

وہ کھانے کے بعد بیڈ روم میں سالار کے ساتھ ہی آئی۔ وہ ایک بار پھر بات چیت کیے بغیر بیڈ پر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ وہ اندھیرے میں کچھ دیر بستر پر بیٹھی رہی پھر اس نے جیسے مصالحت کی پہلی کوشش کی۔

"سالار!" آنکھیں بند کیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کا جواب دے یا نہ دے۔

"سالار!"

"بولو۔" بالآخر اس نے کہا۔

"زخم گہرا تو نہیں تھا؟" نرم آواز سے اس نے پوچھا۔

"کون سا والا؟" ٹھنڈے لہجے میں کیا ہوا سوال اسے لاجواب کر گیا تھا۔

"تمہیں درد تو نہیں ہو رہا؟" اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے سوال بدلا تھا۔

"اگر ہو بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میرا زخم ہے۔ میرا درد ہے۔"

اب جواب نے اسے لاجواب کیا تھا۔

"بخار ہو رہا ہے تمہیں کیا؟" اس کا ہاتھ کندھے سے ہٹ کر پیشانی پر گیا تھا۔ بات بدلنے کے لیے وہ اور کیا کرتی۔ اس کا ہاتھ پیشانی سے ہٹاتے ہوئے سالار نے اسی ہاتھ سے سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کیا۔

"امامہ! تم وہ کیوں نہیں پوچھتیں' جو پوچھنا چاہتی ہو۔" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس نے کہا تھا۔ وہ چند لمحے اسے کچھ بے بسی سے دیکھتی رہی پھر اس نے جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"ابو سے کیا بات ہوئی تمہاری؟"

"وہ بتاؤں جو میں نے ان سے کہا یا وہ جو انہوں نے مجھ سے؟" ہموار لہجہ اب بھی تیکھا تھا۔

"انہوں نے کیا کہا تم سے؟" اس نے جواب میں ہاشم مبین کی گالیوں کو بے حد بلنٹ انداز میں انگلش میں ٹرانسلیٹ کیا تھا۔ امامہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"میں گالیوں کا نہیں پوچھ رہی' انہوں نے ویسے کیا کہا تھا تم سے؟"

اس نے کچھ خفگی اور سرخ چہرے کے ساتھ اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"اوہ! سوری' ان کی گفتگو میں ستر فیصد گالیاں تھیں' اگر میں بہت مختصر بھی کروں تو بھی کتنا ایڈٹ کر سکتا ہوں۔ بہر حال باقی باتوں میں انہوں نے مجھے کہا کہ میں سور ہوں' لیکن کتے کی موت مروں گا اور جو کچھ میں نے ان کی بیٹی کے ساتھ کیا ہے' وہ میری بیٹی اور بہن کے ساتھ ہو۔ اس کے لیے وہ خصوصی طور پر دعا یا بددعا فرمائیں گے۔ تمہارے لیے بھی ان کے کچھ پیغام ہیں لیکن وہ اس قابل نہیں ہیں کہ میں تمہیں دوں۔ یہ تھی ان کی گفتگو۔"

وہ نم آنکھوں کے ساتھ گنگ بیٹھی اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔
وہ اپ سیٹ تھا اس کا اندازہ لگانا آسان تھا لیکن وہ کتنا ہرٹ ہوا تھا' یہ بتانا مشکل تھا۔
"انہوں نے تم سے ایکسکیوز نہیں کی؟" بھرائی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا تھا۔
"کی تھی انہوں نے' انہیں بڑا افسوس تھا کہ ان کے پاس اس وقت کوئی پسٹل کیوں نہیں تھا یا کوئی اچھا والا چاقو' کیونکہ وہ مجھے صحیح سلامت دیکھ کر بے حد ناخوش تھے۔" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔
"پھر تم نے کیس کیوں ختم کیا؟"
"تمہارے لیے کیا۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ وہ سر جھکا کر رونے لگی تھی۔
"میں تم سے اور تمہاری فیملی سے کتنی شرمندہ ہوں میں نہیں بتا سکتی تمہیں... اس سے تو اچھا تھا کہ وہ مجھے مار دیتے۔"
"میں نے تم سے کوئی شکایت کی ہے؟" وہ سنجیدہ تھا۔
"نہیں' لیکن تم مجھ سے ٹھیک سے بات نہیں کر رہے' کوئی بھی نہیں کر رہا۔"
"میں کل رات سے خوار ہو رہا ہوں' پریشان تھا۔ مجھے تو تم رہنے دو' مجھے تم سے اس حوالے سے کوئی شکایت نہیں ہے لیکن جہاں تک میری فیملی کا تعلق ہے تو تھوڑا بہت تو ری ایکٹ کریں گے۔
That's but natural... (یہ فطری بات ہے) دو چار ہفتے گزریں گے' سب ٹھیک ہو جائیں گے۔"
اس نے رسانیت سے کہا تھا۔
امامہ نے بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھا' وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
"میری کوئی عزت نہیں کرتا..."
سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟ کسی نے تم سے کچھ کہا؟ پاپا نے؟ ممی نے یا کسی اور نے؟"
"کسی نے کچھ نہیں کہا لیکن..."
سالار نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔ "اور کوئی کچھ کہے گا بھی نہیں تم سے' جس دن کوئی تم سے کچھ کہے' تم تب کہنا کہ تمہاری کوئی عزت نہیں کرتا۔" وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھا۔
"میں تمہیں کبھی اپنے باپ کے گھر میں بھی لے کر نہ آتا اگر مجھے یہ خدشہ ہوتا کہ یہاں تمہیں عزت نہیں ملے گی۔ تم سے شادی چھپے بھی ہوئی ہے' تم میری بیوی ہو اور ہمارے سرکل میں کوئی ایسا نہیں ہے جسے یہ پتا نہیں ہے۔ اب یہ رونا دھونا بند کرو۔"
اس نے قدرے جھڑکنے والے انداز میں اس سے کہا۔
"ساڑھے چھ بجے کی فلائٹ ہے۔ سو جاؤ اب۔" اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔
وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ اسے بتا نہیں سکتی تھی کہ اس نے ڈیڑھ دن میں جان لیا تھا کہ وہ دنیا میں کتنی محفوظ اور غیر محفوظ تھی۔ اس کے پاؤں کے نیچے زمین اس کے وجود کی وجہ سے تھی۔ اس کے سر پر سایہ دینے والا آسمان بھی اسی کی وجہ سے تھا۔ اس کا نام اس کے نام سے ہٹ جاتا تو دنیا میں کوئی اور اس کے لیے کھڑا ہونے والا نہیں تھا۔
زندگی میں اس سے کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود' وہ ہمیشہ اس کی مدد اور سہارے کے لیے محتاج رہی تھی اور اس تعلق کے بعد یہ محتاجی بہت بڑھ گئی تھی۔ کچھ بھی کہے بغیر وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر لیٹ گئی تھی یہ پرواہ کیے

بغیر کہ اس کے سر رکھنے سے اس کے کندھے میں تکلیف ہو سکتی ہے۔ وہ جانتی تھی' وہ اسے کبھی نہیں ہٹائے گا اور سالار نے اسے نہیں ہٹایا تھا۔ بازو اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے لائٹ آف کر دی۔

"ممی ٹھیک کہتی ہیں۔" اس کے سینے پر سر رکھے اس نے سالار کو بڑبڑاتے سنا۔

"کیا؟" وہ چونکی تھی۔

"تم نے مجھ پر جادو کیا ہوا ہے۔" وہ ہنس پڑی تھی۔



اس واقعے کے بعد اگلے چند ہفتے وہ لاہور میں بھی کچھ محتاط رہے' لیکن آہستہ آہستہ جیسے ہر ڈر' خوف ختم ہونے لگا۔ امامہ کی فیملی کی طرف سے اس بار اس طرح کی دھمکیاں بھی نہیں ملی تھیں' جیسی امامہ کے گھر سے چلے جانے پر سکندر کی فیملی کو ملتی رہی تھیں۔ فوری اشتعال میں آکر ہاشم اور ان کے بیٹیان پر حملہ کرنے کی غلطی تو کر بیٹھے تھے' لیکن بہت جلد ہی انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ امامہ کو زبردستی واپس لے جانا اب ان کے مسائل کو بڑھا سکتا تھا' کم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جھوٹ جو امامہ کے حوالے سے انہوں نے اپنے حلقہ احباب میں بول رکھے تھے' ان کے کھل جانے کا مطلب رسوائی اور جگ ہنسائی کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔ ایک پردہ پڑا ہوا تھا' کے پڑا رہنے میں ہی زیادہ سمجھ داری تھی۔ ان کا واسطہ سکندر جیسی فیملی سے نہ پڑتا تو وہ اس معاملے پر اپنی انا کو اتنا نیچے نہ لاتے' لیکن یہاں اب مجبوری تھی۔

پولیس اسٹیشن میں تصفیے کے دوران سکندر نے ہاشم مبین کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ سالار اور امامہ کو کسی بھی طرح پہنچنے والے نقصان کی ذمہ داری وہ ہاشم کے خاندان کے علاوہ کسی دوسرے پر نہیں ڈالیں گے۔ عام حالات میں ہاشم اس بات پر مشتعل ہوتے' لیکن ایک رات حوالات سے نکلنے کے لیے ہر طرح کے اثر و رسوخ استعمال کر کے ناکام ہونے کے بعد ان کا جوش' ہوش میں تبدیل ہونے لگا تھا۔

جہاں تک سالار اور امامہ کا تعلق تھا' ان کے لیے یہ سب کچھ blessing in disguise تھا۔ (شر میں سے خیر) وہ خدشات جن کا شکار وہ اسلام آباد میں قیام کے دوران ہوتے تھے' وہ آہستہ آہستہ غائب ہونے لگے تھے اور یہ خاص طور پر امامہ کے لیے معجزے سے کم نہیں تھا۔ اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ کبھی اتنی آزادی کے ساتھ رہ سکے گی۔

سالار نے ٹھیک کہا تھا۔ چند ہفتوں میں اس کی فیملی کا رویہ پھر پہلے جیسا ہی ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ طیبہ کی تلخی بھی ختم ہو گئی تھی اور اس میں زیادہ ہاتھ امامہ کا ہی تھا۔ وہ فطرتاً صلح جو اور فرمانبردار تھی' رہی سہی کسر اس کے حالات نے پوری کر دی تھی۔ پیچھے میکہ ہوتا تو شاید کوئی بات بری لگنے پر وہ بھی اسی طرح موڈ آف کرتی جس طرح سکندر کی دوسری بہوئیں کبھی کبھار کرتی تھیں' مگر پیچھے کیچڑ کے سوا کچھ نہیں تھا اور احسان مند ہونے کے لیے اتنا بھی بہت تھا کہ وہ اس شخص کی فیملی تھی جو اسے سر اٹھائے پھرتا تھا۔



"کوئی وسیم ہاشم صاحب ملنا چاہ رہے ہیں آپ سے؟" اپنے آفس کی کرسی میں جھولتا سالار کچھ دیر کے لیے ساکت ہو گیا تھا۔

"کہاں سے آئے ہیں؟" اس نے ایک لمحہ میں اپنے کانٹیکٹس کی لسٹ کھنگالی تھی اور وہاں صرف ایک وسیم ہاشم تھا۔

"اسلام آباد سے... کہہ رہے ہیں کہ آپ کے دوست ہیں۔" ریسپشنسٹ نے مزید بتایا۔

"بھیج دو۔" اس نے انٹرکام رکھ دیا اور خود سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ آج کے دن وہ ایسے کسی وزٹ کے لیے تیار نہیں تھا... وسیم کے وہاں آنے کا مقصد کیا تھا۔ دونوں خاندانوں کے درمیان ہونے والے جھگڑے کو چند ہفتے گزر چکے تھے۔

وہ چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر اپنی کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا تب ہی وسیم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے دونوں ساکت ہوئے تھے پھر سالار نے ہاتھ بڑھایا۔ وسیم نے بھی ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد ان دونوں کے درمیان ہونے والی وہ پہلی ملاقات تھی۔

"کیا لو گے؟ چائے کافی؟" سالار نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں... میں صرف چند منٹ کے لیے آیا ہوں۔" وسیم نے جواباً کہا۔ وہ دونوں کسی زمانے میں بہت گہرے دوست تھے لیکن اس وقت ان کو اپنے درمیان موجود تکلف کی دیوار کو ختم کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔

سالار نے دوبارہ کچھ پوچھنے کے بجائے انٹرکام اٹھا کر چائے کا آرڈر دے دیا۔

"امامہ کیسی ہے؟" اس کے ریسیور رکھتے ہی وسیم نے پوچھا۔

"شی از فائن۔" سالار نے نارمل انداز میں جواب دیا۔

"میں اس سے ملنا چاہتا تھا' ایڈریس تھا میرے پاس تمہارے گھر کا لیکن میں نے سوچا پہلے تم سے پوچھ لوں۔" وسیم نے بے حد جتانے والے انداز میں کہا۔

"ظاہر ہے' تمہیں یہ پتا چل سکتا ہے کہ میں کہاں کام کر رہا ہوں تو ہوم ایڈریس جاننا زیادہ مشکل تو نہیں ہے۔" سالار نے بے حد معمول کے لہجے میں اس سے کہا۔

"میں ملنا چاہتا ہوں اس سے۔" وسیم نے کہا۔

"مناسب تو شاید نہ ہو لیکن پھر بھی پوچھوں گا تم سے... کس لیے؟" سالار نے جواباً بڑے فرینک انداز میں کہا۔

"کوئی وجہ نہیں ہے میرے پاس۔" وسیم نے جواباً کہا۔ "اس دن ریسٹورنٹ میں تو چٹ..."

"وہ تم نے بھیجی تھی' میں جانتا ہوں۔" سالار نے اس کی بات کاٹی تھی وسیم ایک لمحے کے لیے بول نہیں سکا پھر اس نے کہا۔

"تم نے اور امامہ نے جو کچھ کیا' وہ بہت غلط کیا۔" وسیم چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولنے لگا تھا۔ سالار نے اس کی گفتگو میں مداخلت نہیں کی تھی۔

"لیکن اب جو بھی ہوا' وہ ہو چکا۔ میں امامہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تمہاری فیملی کو پتا ہے؟" سالار نے پوچھا۔

"نہیں' انہیں پتا چلے گا تو وہ مجھے بھی گھر سے نکال دیں گے۔" سالار اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ اس کا سچ اور جھوٹ نہیں جانچ سکتا تھا' اس کی نیت کیا تھی۔ وہ یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ اور امامہ ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ وہ یہ ضرور جانتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس رات وسیم نے اسے امامہ کے ساتھ دیکھ کر اسے باپ

بھائی کے دیکھے جانے سے پہلے متنبہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن سالار کے لیے پھر بھی یہ مشکل تھا کہ وہ اسے امامہ سے ملنے کی اجازت دے دیتا۔ اس میل جول کا پتا چلنے پر امامہ کی فیملی کے لیے اسے نقصان پہنچانا بہت آسان ہو جاتا۔ وہ اگر اس کے اپارٹمنٹ تک پہنچ سکتے تھے تو وہاں سے امامہ کو کہیں اور لے جانا بھی مشکل نہیں تھا۔ وہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ وسیم کسی غلط ارادے سے اس کے پاس نہیں آیا تھا لیکن وہ پھر بھی رسک نہیں لے سکتا تھا۔

"وسیم! میں نہیں سمجھتا کہ اب اس کا کوئی فائدہ ہے۔" اس نے بالآخر بہت صاف الفاظ میں اس سے کہا۔ "امامہ میرے ساتھ خوش ہے۔ اپنی زندگی میں سیٹلڈ ہے۔ میں نہیں چاہتا' وہ اپ سیٹ ہو یا اسے کوئی نقصان پہنچے۔"

"میں نہ تو اس کو اپ سیٹ کرنا چاہتا ہوں نہ ہی نقصان پہنچانا چاہتا ہوں۔ میں بس کبھی کبھی اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" وسیم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کچھ بے تابی سے کہا۔

"میں اس پر سوچوں گا وسیم! لیکن یہ بڑا مشکل ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں استعمال کر کے کوئی..." وسیم نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں بھی نہیں چاہتا کہ اس کو کوئی نقصان پہنچے۔ ایسی کوئی خواہش ہوتی تو اتنے سالوں میں تم سے پہلے رابطہ کرتا۔ میں جانتا تھا وہ تم سے شادی کر کے گھر سے گئی ہے۔ تم انوالوڈ تھے پورے معاملے میں لیکن میں نے اپنی فیملی کو کبھی یہ نہیں بتایا۔"

سالار ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر اس نے کہا۔ "وہ اتنے عرصے سے میرے ساتھ نہیں تھی۔"

"نہیں ہوگی۔ لیکن وہ تم سے شادی کر کے گئی تھی۔ یہ میں جانتا تھا۔" اس کا لہجہ حتمی تھا۔

سالار اسے دیکھ کر رہ گیا۔ ان کے دوستوں کا سرکل تقریباً ایک ہی تھا اور اس میں اگر کسی نے امامہ اور اس کی شادی کے حوالے سے کچھ حقیقی اطلاعات وسیم کو دے دی تھیں تو یہ کوئی اتنی حیرت انگیز بات نہیں تھی۔

"میں سوچوں گا وسیم!" سالار نے بحث کرنے کے بجائے پھر وہی جملہ دہرایا' وسیم مایوس ہوا تھا۔

"میں دو دن کے لیے ہوں لاہور میں۔ اور یہ میرا کارڈ ہے۔ میں اس سے واقعی ملنا چاہتا ہوں۔" وسیم نے مزید کچھ کہے بغیر جیب سے ایک کارڈ نکال کر ٹیبل پر اس کے سامنے رکھ دیا۔

اس رات وہ خلاف معمول کچھ زیادہ خاموش تھا۔ یہ امامہ نے نوٹس کیا تھا لیکن اسے وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اس میں کام کے پریشر کو ذمہ دار گردانا تھا۔

وہ کھانے کے بعد کام کرنے کے لیے معمول کے مطابق اسٹڈی میں جانے کے بجائے اس کے پاس لاؤنج کے صوفہ پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ دونوں کے درمیان نگاہوں کا تبادلہ ہوا پھر وہ بھی ٹی وی دیکھنے لگا۔ پانچ دس منٹ کی خاموشی کے بعد امامہ نے بالآخر ایک گہرا سانس لے کر اسے کہتے سنا۔

"امامہ! اگر تم وعدہ کرو کہ تم خاموشی سے تحمل سے میری بات سنو گی۔ آنسو بہائے بغیر۔ تو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"کیا کہنا ہے؟" وہ کچھ حیران تھی۔

"وسیم تم سے ملنا چاہتا ہے۔" اس نے بلا تمہید کہا۔ وہ ہل نہیں سکی۔

"وسیم... میرا بھائی؟" امامہ نے بالآخر کہا۔ اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ سالار نے سر ہلایا پھر وہ اسے اپنی اور اس کی آج کی ملاقات کی تفصیلات بتانے لگا تھا۔ اور ان تفصیلات کے دوران "برسات" شروع ہو چکی تھی۔

سالار نے بے حد تحمل کا مظاہرہ کیا۔ تحمل کے علاوہ وہ اور کس چیز کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔

"تم نے کیوں اسے یہاں آنے نہیں دیا؟ تم اسے ساتھ لے کر آتے۔" اس نے ہچکیوں اور سسکیوں کے ساتھ روتے ہوئے گفتگو کے درمیان میں ہی اس کی بات کاٹی۔

"مجھے پتا تھا وسیم مجھے معاف کر دے گا۔ وہ بھی مجھے اتنا ہی مس کرتا ہو گا جتنا میں اسے کرتی ہوں۔ میں تم سے کہتی تھی نا کہ وہ۔" سالار نے اس کی بات کاٹی۔

"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے امامہ! میں نہیں جانتا وہ کیوں ملنا چاہتا ہے تم سے... لیکن اس کے تمہارے ساتھ ملنے کے بڑے نقصان دہ نتائج بھی ہو سکتے ہیں۔" سالار اس کے آنسوؤں سے متاثر ہوئے بغیر بولا تھا۔ وہ وسیم کے حوالے سے واقعی کچھ خدشات کا شکار تھا۔

"کچھ نہیں ہو گا... مجھے پتا ہے کچھ نہیں ہو گا۔ وہ بہت اچھا ہے۔ تم اسے فون کر کے ابھی بلا لو۔"

"میں کل اسے بلواؤں گا لیکن وہ اگر کبھی اکیلے یہاں آنا چاہے یا تمہیں کہیں بلائے تو تم نہیں جاؤ گی۔" سالار نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اور میں ایک بار پھر دہرا رہا ہوں... نہ وہ یہاں اکیلا آئے گا نہ تم اس کے فون کرنے پر کہیں جاؤ گی۔" سالار نے بڑی سختی سے اسے تاکید کی۔

"میں اس کے بلانے پر کہیں نہیں جاؤں گی' لیکن اس کے یہاں آنے پر کیوں اعتراض ہے تمہیں؟" اس نے احتجاج کیا۔

"وہ میرے گھر پر ہوتے ہوئے آئے' مجھے کوئی اعتراض نہیں' لیکن وہ اکیلا یہاں نہ آئے۔ وہ تو خیر میں نیچے سیکیورٹی والوں کو بھی بتا دوں گا۔"

"وہ میرا بھائی ہے سالار!" امامہ کو بے عزتی محسوس ہوئی۔

"جانتا ہوں' اسی لیے تم سے یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں۔ میں تمہارے حوالے سے اس پر یا کسی پر بھی اعتبار نہیں کر سکتا۔"

"لیکن..."

"تم مجھے صرف یہ بتاؤ تمہیں اس سے ملنا ہے یا نہیں... اگر تمہیں بحث کرنی ہے اس ایشو پر تو بہتر ہے وسیم آئے ہی نہ۔" سالار نے اسے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں اسے اکیلے نہیں بلاؤں گی یہاں۔" اس نے آنکھیں رگڑتے ہوئے "فوراً" سے پیشتر گھٹنے ٹیکے تھے۔

"مجھے اس سے فون پر بات کرنی ہے۔" سالار نے کچھ کہنے کے بجائے وسیم کا وزٹنگ کارڈ لا کر اسے دے دیا۔ وہ خود اسٹڈی میں چلا گیا تھا۔

چند بار بیل ہونے پر وسیم نے فون اٹھایا تھا اور اس کی آواز سننے پر امامہ کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا لگا تھا۔

"ہیلو۔ میں امامہ ہوں۔"

وسیم دوسری طرف کچھ دیر بول نہیں سکا تھا اور پھر جب بولنے کے قابل ہوا تب تک اس کی آواز بھی بھرانے لگی تھی۔ وہ دو گھنٹے ایک دوسرے کے ساتھ بات کرتے رہے تھے۔ بے ہنگم' بے ربط۔ بے مقصد۔ خاموشی کے لمبے وقفوں والی گفتگو... لیکن اس گفتگو میں کوئی گلے شکوے نہیں ہوئے تھے' کوئی ملامت' مذمت نہیں ہوئی تھی۔ وقت اب اتنا آگے آ گیا تھا کہ یہ سب کہنا بے کار تھا۔ وسیم شادی کر چکا تھا اور اس کے تین بچے تھے۔ فیملی میں اور بھی بہت سے افراد کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ اضافے کی تفصیلات سنتی رہی۔

سالار دو گھنٹے کے بعد اسٹڈی سے نکلا تھا اور وہ اس وقت بھی لاؤنج میں فون کان سے لگائے سرخ آنکھوں اور ناک کے ساتھ فون پر وسیم سے گفتگو میں مصروف تھی۔ وہ اس کے پاس سے گزر کر بیڈ روم میں گیا تھا اور اسے یقین تھا امامہ نے اسے ایک بار بھی سر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔

وہ سونے کے لیے بیڈ پر لیٹنے کے بعد بھی بہت دیر تک اس نئی ڈیولپمنٹ (development) کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ پتا نہیں یہ ٹھیک ہو رہا تھا یا غلط۔ وہ امامہ کا کوئی دوسرا بھائی ہوتا تو وہ کبھی امامہ سے اس کا رابطہ نہ کرواتا لیکن وسیم کے حوالے سے وہ تحفظات رکھنے کے باوجود کسی حد تک کچھ نرم گوشہ رکھنے پر مجبور تھا۔ اگر اس کی فیملی کا ایک فرد بھی اس کے ساتھ کچھ رابطہ رکھتا تو وہ جانتا تھا کہ امامہ ذہنی طور پر بہت بہتر محسوس کرے گی۔ اپنے پیچھے اپنی فیملی کی عدم موجودگی کا جو احساس کمتری وہ لیے ہوئے تھی وہ اتنے مہینوں کے بعد کم از کم سالار سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔

وہ اس کا انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔ فجر کی نماز کے لیے جب وہ مسجد جانے کے لیے اٹھا تو وہ اس وقت بھی بستر میں نہیں تھی۔ لاؤنج میں آتے ہی وہ کچھ دیر کے لیے ہل نہیں سکا تھا۔ وہاں کا انٹیریر راتوں رات بدل گیا تھا۔ فرنیچر کے بہت سے چھوٹے موٹے آئٹمز کی سیٹنگ تبدیل ہونے کے ساتھ ساتھ دیواروں پر کچھ نئی آرائشی اشیا بھی آ گئی تھیں۔ صوفہ اور فلور کشنز کے کور بدلے جا چکے تھے اور کارپٹ پر چند نئے رگز (Rugs) بھی نظر آ رہے تھے اور وہ اس وقت کچن ایریا کے کاؤنٹر کے پار ایک اسٹول پر چڑھی کچن کیبنٹ کو اسپنج کے ساتھ رگڑنے میں مصروف تھی۔

"تم ساری رات یہ کرتی رہی ہو؟" سالار پانی پینے کے لیے کچن میں گیا تھا تو اس نے کچن کے فرش کو کیبنٹ سے نکالی گئی چیزوں سے بھرا ہوا دیکھا۔ اس کا دماغ گھوم کر رہ گیا تھا۔

"کیا؟" وہ اسی اطمینان سے کام میں مصروف بولی تھی۔

"تمہیں پتا ہے کیا کرتی رہی ہو تم!" سالار نے پانی کا گلاس خالی کرتے ہوئے کاؤنٹر پر رکھا اور باہر نکل گیا۔ بیرونی دروازے تک پہنچ کر وہ کسی خیال کے تحت واپس آیا تھا۔

"امامہ! آج سنڈے ہے اور میں ابھی مسجد سے آ کر سوؤں گا۔ خبردار تم نے بیڈ روم کی صفائی اس وقت شروع کی۔"

"پھر میں کس وقت صفائی کروں گی۔ بیڈ روم کی ___ میں نے وسیم کو لنچ پر بلوایا ہے۔" امامہ نے پلٹ کر کہا۔ سالار کی چھٹی حس نے بروقت کام کیا تھا۔

"بیڈ روم کی صفائی کا وسیم کے لنچ سے کیا تعلق ہے؟" وہ حیران ہوا تھا۔ "تم نے اسے بیڈ روم میں بٹھانا ہے؟"

"نہیں، لیکن ___" وہ اٹکی تھی۔

"امامہ! بیڈ روم میں کچھ نہیں ہو گا۔ مجھے سونا ہے آ کر ابھی۔" اس نے امامہ کو ایک بار پھر یاددہانی کرائی تھی۔

"یہ سامان لا دینا مجھے سونے سے پہلے کھانے کی تیاری کرنی ہے مجھے۔" امامہ نے کاؤنٹر پر پڑی ایک لسٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"میں فجر کی نماز پڑھنے جا رہا ہوں اور یہ سامان تمہیں سو کر اٹھنے کے بعد لا کر دوں گا۔" وہ لسٹ کو ہاتھ لگائے بغیر چلا گیا تھا۔

تمام خدشات کے باوجود واپسی پر اس نے اپنے بیڈ روم کو اسی حالت میں دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ اس نے دس بجے اس کی مطلوبہ اشیا لا کر دی تھیں۔ کچن تب تک کسی ہوٹل کے کچن کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ وہ پتا نہیں کون کون سی ڈشز بنانے میں مصروف تھی۔ وہ کم از کم 25 افراد کا کھانا تھا جو وہ اپنے بھائی کے لیے

تیار کر رہی تھی۔ اور سالار کو یقین تھا کہ آدھے سے زیادہ کھانا انہیں بلڈنگ کے مختلف اپارٹمنٹس میں بھیجنا پڑے گا۔ لیکن امامہ اتنے جوش اور لگن سے ملازمہ کے ساتھ کچن میں مصروف تھی کہ سالار نے اسے کوئی نصیحت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ لاؤنج میں بیٹھا انگلش لیگ کا کوئی میچ دیکھتا رہا۔

وسیم دو بجے آیا تھا اور دو بجے تک امامہ کو گھر میں کسی "مرد" کی موجودگی کا احساس تک نہیں تھا۔ وہ ملازمہ کے ساتھ کھانا تیار کرتے ہوئے اس سے اپنی فیملی کی باتوں میں مصروف تھی جس تازہ ترین اپ ڈیٹ کے ساتھ جو اسے رات کو وسیم سے ملی تھی۔ اس نے پہلی بار اسے ملازمہ کے ساتھ اتنے جوش و جذبے سے بات کرتے ہوئے سنا تھا اور وہ حیران تھا۔ حیرانی اس کیفیت کو اتنے موثر طریقے سے بیان نہیں کر پائی۔

وسیم کا استقبال اس نے سالار سے بھی پہلے دروازے پر کیا تھا۔ بہن اور بھائی کے درمیان ایک جذباتی سین ہوا تھا۔ جس میں سالار نے دونوں سے تسلی کے چند الفاظ کہہ کر کچھ کردار ادا کیا تھا۔

اس کے بعد ساڑھے چھ بجے وسیم کی موجودگی تک وہ ایک خاموش تماشائی کا رول ادا کرتا رہا تھا۔ وہ کھانے کی ٹیبل پر موجود ضرور تھا مگر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا وہاں ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔ امامہ کو بھائی کے علاوہ کوئی اور نظر آ رہا تھا نہ کسی اور کا ہوش تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ٹیبل پر موجود ہر ڈش اپنے ہاتھوں سے وسیم کو کھلائے۔ اتنے مہینوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ امامہ نے کھانے کی ٹیبل پر اسے کچھ سرو نہیں کیا تھا۔ وہ اس کا بچپن کا دوست تھا لیکن یہ بھی پہلا موقع تھا کہ وہاں اس کے ہوتے ہوئے بھی وسیم اور اس کے درمیان صرف چند رسمی سے جملوں کا تبادلہ ہوا تھا پھر وہ امامہ آپس میں گفتگو کرتے رہے تھے۔

سالار نے اس دن ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے زندگی میں پہلی بار کسی مہمان کی موجودگی میں ٹی وی پر کھانا کھاتے ہوئے انگلش لیگ دیکھی۔ اور ٹیبل پر موجود دوسرے دونوں افراد اپنی باتوں میں مصروف رہے۔

ساڑھے چھ بجے اس کے جانے کے بعد سالار کی توقع کے مطابق بچا ہوا تقریباً سارا کھانا ملازمہ، فرقان اور چند دوسرے گھروں میں بھیجا گیا۔

وہ عشاء کی نماز پڑھ کر آیا تو وہ اس کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا کر خود بیڈ روم میں سو رہی تھی۔ وہ ویک اینڈ پر رات کا کھانا ہمیشہ باہر کھاتے تھے اور نہ بھی کھاتے تب بھی باہر ضرور جاتے تھے۔

اس نے پہلی بار امامہ کی گھر پر موجودگی کے باوجود اکیلے ڈنر کیا اور وہ بری طرح پچھتایا تھا وسیم کو امامہ سے ملنے کی اجازت دے کر۔



"امامہ! یہ وسیم نامہ بند ہو سکتا ہے اب۔" وہ تیسرا دن تھا جب بالآخر سالار کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ تین دنوں سے مسلسل ناشتے، ڈنر اور رات سوتے سے پہلے صرف وسیم کی باتیں بار بار سن رہا تھا۔ امامہ بری طرح وسیم پر فدا تھی۔ سالار کو اندازہ تھا کہ وہ وسیم سے ملنے کے بعد خوش ہوگی لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کی خوشی اس انتہا کو پہنچے گی کہ خود اسے مسئلہ ہونا شروع ہو جائے گا۔

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہوئی تھی۔

"مطلب یہ کہ دنیا میں وسیم کے علاوہ بھی بہت سے لوگ ہیں جن کی تمہیں پرواہ کرنی چاہیے۔" سالار نے اسے ان ڈائریکٹ انداز میں کہا۔

"مثلاً کون؟" اس نے جواباً اتنی سنجیدگی سے پوچھا تھا کہ وہ کچھ بول نہیں سکا۔

"اور کون ہے۔ جس کی مجھے پرواہ کرنی چاہیے؟" وہ اب بڑبڑاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"میرے کہنے کا مطلب تھا کہ تم گھر پر توجہ دو اب!"
وہ اب اس کے علاوہ اور کیا کہتا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ "مجھ" پر توجہ دو۔
"گھر کو کیا ہوا؟" وہ مزید حیران ہوئی۔ وہ اس بار مزید کوئی تاویل نہیں دے سکا تھا۔ گھر کو واقعی کچھ نہیں ہوا تھا۔
"تمہیں میرا وسیم کے بارے میں باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا؟" اس نے یک دم جیسے کوئی اندازہ لگایا اور اس کے لہجے میں ایسی بے یقینی تھی کہ وہ "ہاں" نہیں کہہ سکا۔
"میں نے کب کہا کہ مجھے برا لگتا ہے۔ ویسے ہی کہہ رہا ہوں تمہیں۔" وہ بے ساختہ بات بدل گیا۔
"ہاں میں بھی سوچ رہی تھی تم کیسے یہ کہہ سکتے ہو، وہ تمہارا بیسٹ فرینڈ ہے۔" وہ یک دم مطمئن ہوئی۔
سالار اس سے یہ نہیں کہہ سکا کہ وہ اس کا بیسٹ فرینڈ ہے، نہیں بھی تھا۔
"تمہارے بارے میں بہت کچھ بتاتا تھا وہ۔"
سالار کھانا کھاتے کھاتے رکا۔ "میرے بارے میں کیا...؟"
"سب کچھ۔" وہ اسی روانی سے بولی۔
سالار کے پیٹ میں گرہیں سی پڑیں۔ "سب کچھ کیا؟"
"مطلب جو بھی تم کرتے تھے۔"
سالار کی بھوک اڑ گئی تھی۔
"مثلاً...؟" وہ پتا نہیں اپنے کن خدشات کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ وہ سوچ میں پڑی۔
"جیسے تم جن سے دوستی کرتے تھے ان کے بارے میں... اور جب تم لاہور میں اپنے کچھ دوسرے دوستوں کے ساتھ ریڈ لائٹ ایریا گئے تھے تو تب بھی۔"
وہ بات مکمل نہیں کر سکی۔ پانی پیتے ہوئے سالار کو اچھو لگا تھا۔
"تمہیں اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ میں...." سالار خود بھی اپنا سوال پورا نہیں دہرا سکا۔
"جب بھی جاتے تھے تو بتاتا تھا۔"
سالار کے منہ سے بے اختیار وسیم کے لیے زیر لب گالی نکلی تھی اور امامہ نے اس کے ہونٹوں کی حرکت کو پڑھا تھا۔ وہ بری طرح اپ سیٹ ہوئی۔
"تم نے اسے گالی دی ہے؟" اس نے جیسے شاکڈ ہو کر سالار سے کہا۔
"ہاں وہ سامنے ہوتا تو میں اس کی دو چار ہڈیاں بھی توڑ دیتا۔ وہ اپنی بہن سے یہ باتیں جا کر کرتا تھا۔ اور میری باتیں....
I can't imagine (میں تصور بھی نہیں کر سکتا) وہ واقعی بری طرح برہم ہوا تھا۔ "سب کچھ" کی دو جھلکیوں نے اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیے تھے۔ امامہ اس کے بارے میں کیا کچھ جانتی تھی اس کا صحیح اندازہ اسے آج ہوا تھا کیونکہ وسیم اس کے بے حد بے تکلف اور قریبی دوستوں میں سے تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنے دوستوں کے کرتوت اپنی چھوٹی بہن کو جا کرتا سکتا تھا۔
"تم میرے بھائی کو دوبارہ گالی مت دینا۔"
امامہ کا موڈ بھی آف ہو گیا تھا، وہ کھانے کے برتن سمیٹنے لگی تھی۔ سالار جواباً کچھ کہنے کے بجائے بے حد خفگی سے کھانے کی میز سے اٹھ گیا تھا۔
یہ اس کی زندگی کے کچھ بے حد پریشان کن لمحوں میں سے ایک تھا۔ اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ امامہ کو اس کی کسی بات پر یقین کرنا یا اسے اچھا سمجھنا کیوں اتنا مشکل تھا۔ وہ اس کی کیس ہسٹری کو اتنا تفصیل اور اتنا قریب

سے نہ جانتی ہوتی تو اسے اپنی شادی شدہ زندگی میں ان مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑ رہا ہوتا جن کا سامنا وہ اب کر رہا تھا۔

وہ تقریباً" دو گھنٹے کے بعد بیڈ روم میں سونے کے لیے آئی تھی۔ وہ اس وقت معمول کے مطابق اپنی ای میلز چیک کرنے میں مصروف تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے بیڈ پر آ کر کمبل خود پر کھینچتے ہوئے لیٹ گئی تھی۔

سالار نے ای میل چیک کرتے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اسے اسی ردعمل کی توقع تھی۔ وہ روز سونے سے پہلے کوئی ناول پڑھتی تھی اور کتاب پڑھنے کے دوران اس سے باتیں بھی کرتی تھی۔ یہ خاموشی اس دن ہوتی تھی جس دن وہ اس سے خفا ہوتی تھی۔ اس نے اپنا بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ بھی آف کر لیا تھا۔

"میں نے وسیم کو ایسا کچھ نہیں کہا جس پر تم اس طرح ناراض ہو کر بیٹھو۔"

سالار نے مفاہمت کی کوششوں کا آغاز کیا۔ وہ اسی طرح کروٹ دوسری طرف لیے بے حس و حرکت لیٹی رہی۔

"امامہ! تم سے بات کر رہا ہوں میں۔" سالار نے کمبل کھینچا تھا۔

"تم اپنے چھوٹے بھائی عمار کو وہی گالی دے کر دکھاؤ۔" اس کے تیسری بار کمبل کھینچنے پر وہ بے حد خفگی سے اس کی طرف کروٹ لیتے ہوئے بولی۔

سالار نے بلاتوقف وہی گالی عمار کو دی۔ چند لمحوں کے لیے امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے کیا کہے۔ اگر دنیا میں ڈھٹائی کی کوئی معراج تھی تو وہ وہ تھا۔

"میں پاپا کو بتاؤں گی۔" امامہ نے بالآخر سرخ چہرے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم نے کہا تھا عمار کو گالی دینے کو۔" وہ ویسے ہی اطمینان سے بولا تھا۔ "ویسے تمہارے بھائی کو اس سے زیادہ خراب گالیاں میں اس کے منہ پر دے چکا ہوں اور اس نے کبھی مائنڈ نہیں کیا اور اگر تم چاہو تو اگلی بار جب وہ یہاں آئے گا تو میں تمہیں دکھا دوں گا۔"

وہ جیسے کرنٹ کھا کر اٹھ کر بیٹھی تھی۔

"تم وسیم کو یہاں میرے سامنے گالیاں دو گے؟" اسے بے حد رنج ہوا تھا۔

"جو کچھ اس نے کیا ہے، میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو اسے گالیاں ہی دیتا اور اس سے زیادہ بری۔" سالار نے لگی لپٹی کے بغیر کہا۔

"لیکن چلو آئی ایم سوری۔" وہ اس بار پھر اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھی۔

سکندر عثمان ٹھیک کہتے تھے۔ ان کی وہ اولاد سمجھ میں نہ آنے والی چیز تھی۔

"لیکن پاپا! وہ میرا بہت خیال رکھتا ہے۔ وہ میری ہر خواہش پوری کرتا ہے۔ میری تو کوئی بات نہیں ٹالتا۔"

اس نے ایک بار سکندر کے پوچھنے پر کہ وہ اس کا خیال رکھتا تھا کہ جواب میں سالار کی تعریف کی تھی۔

"امامہ! یہ جو تمہارا شوہر ہے یہ دنیا میں اللہ نے صرف ایک پیس پیدا کیا تھا۔ تیس سال میں نے باپ کے طور پر جس طرح اس کے ساتھ گزارے ہیں، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اب باقی کی زندگی تمہیں گزارنی ہے اس کے ساتھ۔ یہ تمہارے سامنے بیٹھ کر تمہاری آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے اور تمہیں کبھی پتا نہیں چل سکتا۔ اس نے جو کرنا ہوتا ہے، وہ کرنا ہوتا ہے۔ چاہے ساری دنیا ختم ہو جائے اسے سمجھا سمجھا کر اور کبھی اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ یہ تمہاری بات مان کر اپنی مرضی نہیں کرے گا۔"

سالار سر جھکائے مسکراتا باپ کی باتیں سنتا رہا تھا اور وہ کچھ الجھی نظروں سے باری باری اسے اور سکندر کو دیکھتی رہی تھی۔

"آہستہ آہستہ پتا چل جائے گا تمہیں کہ سالار چیز کیا ہے۔ یہ پانی میں آگ لگانے والی گفتگو کا ماہر ہے۔"

سالار نے کسی ایک بات کے جواب میں بھی کچھ نہیں کہا تھا' سکندر کے پاس سے واپسی کے بعد امامہ نے سالار سے کہا۔

"تمہارا امپریشن بہت خراب ہے پاپا پر۔ تمہیں کوئی وضاحت کرنی چاہیے تھی۔"

"کیسی وضاحت؟ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ تمہیں ان کی باتیں غور سے سننا چاہیے تھیں۔"

وہ تب بھی اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔

اور وہ اب بھی اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔

"آئی ایم سوری۔" وہ پھر کہہ رہا تھا۔

"تم شرمندہ تو نہیں ہو۔" اس نے اسے شرمندہ کرنے کی ایک آخری کوشش کی۔

"ہاں وہ تو میں نہیں ہوں۔ لیکن چونکہ تمہیں میرا سوری کہنا اچھا لگتا ہے' اس لیے آئی ایم سوری۔"

اس نے تپانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ امامہ نے جواب دینے کے بجائے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑا پانی کا پورا گلاس پیا اور دوبارہ کمبل کھینچ کر لیٹ گئی۔

"پانی اور لا دوں؟" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ امامہ نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔



وہ نیند میں سیل فون کی آواز پر ہڑبڑائی تھی۔ وہ سالار کا سیل فون تھا۔

"ہیلو!" سالار نے نیند میں کروٹ لیتے ہوئے سائیڈ ٹیبل سے فون اٹھا کر کال ریسیو کی۔ امامہ نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔

"ہاں بات کررہا ہوں۔" اس نے سالار کو کہتے سنا پھر اسے محسوس ہوا جیسے وہ یک دم بستر سے نکل گیا تھا۔ امامہ نے آنکھیں کھولتے ہوئے نیم تاریکی میں اسے دیکھنے کی کوشش کی' وہ لائٹ آن کیے بغیر اندھیرے میں ہی کمرے سے نکل کر لاؤنج میں چلا گیا تھا۔

وہ کچھ حیران ہوئی تھی۔ وہ کس کا فون ہو سکتا تھا' جس کے لیے وہ رات کے اس پہر یوں اٹھ کر کمرے سے گیا تھا۔ آنکھیں بند کیے وہ کچھ دیر اس کی واپسی کا انتظار کرتی رہی لیکن جب وہ کافی دیر تک نہیں آیا تو وہ کچھ بے چین سی اٹھ کر کمرے سے لاؤنج میں آگئی تھی۔ وہ لاؤنج کے صوفہ پر بیٹھا فون پر بات کررہا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے وہ فون پر بات کرتے کرتے رکا۔

"ایک جینز اور شرٹ پیک کردو میری۔ مجھے اسلام آباد کے لیے نکلنا ہے ابھی۔"

"کیوں؟ خیریت تو ہے؟" وہ پریشان ہوئی تھی۔

"اسکول میں آگ لگ گئی ہے۔"

اس کی نیند پلک جھپکتے میں غائب ہوئی تھی۔

سالار اب دوبارہ فون پر بات کررہا تھا۔ بے حد تشویش کے عالم میں کمرے میں واپس آکر اس نے اس کا بیگ تیار کیا' وہ تب تک کمرے میں واپس آچکا تھا۔

"آگ کیسے لگی؟"

"یہ تو وہاں جا کر پتا چلے گا۔" وہ بے حد عجلت میں اپنے لیے نکالے ہوئے کپڑے لیتا واش روم میں چلا گیا۔ وہ بیٹھی رہی۔ وہ اس کی پریشانی کا اندازہ کرسکتی تھی۔

شادی کے شروع کے چند مہینے چھوڑ کر اب اوپر نیچے کچھ نہ کچھ ایسا ہو رہا تھا جو انہیں بری طرح تکلیف پہنچا رہا

تھا۔

دس منٹ میں وہ تیار ہو کر نکل گیا تھا لیکن وہ دوبارہ بستر میں نہیں جا سکی تھی۔ اس نے باقی کی ساری رات اسی پریشانی میں دعائیں کرتے ہوئے کاٹی تھی۔

سالار سے اس کی ایک دوبار چند منٹ کے لیے بات ہوئی لیکن وہ فون پر مسلسل مصروف تھا امامہ نے اسے ڈسٹرب کرنے سے گریز کیا۔

اس کے گاؤں پہنچنے کے بعد بھی آگ پر قابو نہیں پایا جا سکا تھا۔ وجہ بروقت فائر بریگیڈ کا دستیاب نہ ہونا تھا۔ اور آگ کا اتنے گھنٹوں بعد بھی نہ بجھانے کا مطلب کیا تھا وہ امامہ اچھی طرح سے سمجھ سکتی تھی۔

وہ پورا دن جلے پاؤں کی بلی کی طرح گھر میں پھرتی رہی تھی۔ سالار نے بالآخر اسے آگ پر قابو پانے کی اطلاع دے دی تھی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ اسے رات کو کال کرے گا اور وہ اس رات اسلام آباد ہی میں رہنے والا تھا۔

اس دن وہ سارا دن کچھ کھا نہیں سکی تھی۔ عمارت کو کتنا نقصان پہنچا تھا یہ اسے نہیں پتا تھا لیکن کئی گھنٹے لگی رہنے والی آگ کیا کر سکتی تھی۔ اس کا احساس اسے تھا۔

سالار سے بالآخر آدھی رات کے قریب اس کی بات ہوئی تھی۔ وہ آواز سے اتنا تھکا ہوا لگ رہا تھا کہ امامہ نے اس سے زیادہ دیر بات کرنے کے بجائے سونے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ لیکن وہ خود ساری رات سو نہیں سکی تھی۔ آگ عمارت میں لگائی گئی تھی۔ وہاں پولیس کو ابتدائی طور پر ایسے شواہد ملے تھے اور یہ معمولی سی بات امامہ کی نیند اور حواس کو معطل کرنے کے لیے کافی تھی۔

وہ صرف سالار کا اسکول نہیں تھا۔ وہ پورا پروجیکٹ اب ایک ٹرسٹ کے تحت چل رہا تھا جس کی مین ٹرسٹی سالار کی فیملی تھی۔

اور اس پروجیکٹ کو یک دم اس طرح کا نقصان کون پہنچا سکتا تھا؟

یہی وہ سوال تھا جو اسے ہولا رہا تھا۔

سب کچھ پھر جیسے چند ہفتے پہلے والی اسٹیج پر آگیا تھا۔

وہ اگلے دن رات کو گھر پہنچا تھا اور اس کے چہرے پر تھکن کے علاوہ دوسرا کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ اگر کچھ اور دیکھنا چاہتی تھی تو مایوس ہوئی تھی وہ نارمل تھا اسے جیسے حوصلہ ہوا تھا۔

”بلڈنگ کے اسٹرکچر کو نقصان پہنچا ہے۔ جس کمپنی نے بلڈنگ بنائی ہے۔ وہ کچھ ایگزامن کر رہے ہیں۔ اب دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ شاید بلڈنگ گرا کر دوبارہ بنانی پڑے۔“

کھانے کی ٹیبل پر اس کے پوچھنے پر اس نے امامہ کو بتایا تھا۔

”بہت نقصان ہوا ہو گا؟“ یہ احمقانہ سوال تھا لیکن امامہ حواس باختہ تھی۔

”ہاں!“ جواب مختصر تھا۔

”اسکول بند ہو گیا؟“ ایک اور احمقانہ سوال۔

”نہیں۔ گاؤں کے چند گھر فوری طور پر خالی کروائے ہیں اور کرائے پر لے کر اسکول کے مختلف بلاکس کو شفٹ کیا ہے وہاں پر۔ Luckily ابھی کچھ دنوں میں سمر بریک آجائے گی تو بچوں کا زیادہ نقصان نہیں ہو گا۔“ وہ کھانا کھاتے ہوئے بتاتا رہا۔

”اور پولیس نے کیا کہا؟“ ادھر ادھر کے سوال کے بعد امامہ نے بالآخر وہ سوال کیا جو اسے پریشان کیے ہوئے تھا۔

”ابھی تو انویسٹی گیشن اسٹارٹ ہوئی ہے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

سالار نے گول مول بات کی تھی۔ اس نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ دن اسلام آباد میں وہ اپنی فیملی کے ہر فرد سے اس کیس کے Suspects(مشتبہ افراد) میں امامہ کی فیملی کو شامل کرنے کے لیے دباؤ کا سامنا کرتا رہا تھا۔ وہ بہت مشکل صورت حال تھی۔ اس پروجیکٹ کو چلانے میں بہت سے لوگوں کے عطیات استعمال ہو رہے تھے اور اس نقصان کے متاثرین بہت سے تھے۔

کئی سال سے آرام سے چلنے والے اس اسکول کا کوئی دشمن پہلے کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور اب...

امامہ سے زیادہ وہ خود یہ دعا کر رہا تھا کہ یہ آگ اتفاقی حادثہ ہو... مگر چند گھنٹوں میں ہی آگ کے اسکیل اور صورت حال سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پلان شدہ آتش زدگی تھی اور اگلے چند گھنٹوں میں کچھ اور شواہد بھی مل گئے تھے۔ امامہ سے یہ سب شیئر کرنا حماقت تھی۔ وہ پچھلے تجربے کے بعد اس طرح کی کسی دوسری پریشانی میں کم از کم اسے نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

"اب کیا ہو گا؟" تیسرا احمقانہ سوال۔

"سب کچھ دوبارہ بنانا پڑے گا اور بس۔" جواب اتنا ہی سادہ تھا۔

"اور فنڈز... وہ کہاں سے آئیں گے؟" یہ پہلا سمجھدارانہ سوال تھا۔

"endowment fund ہے اسکول کا... اس کو استعمال کریں گے۔ کچھ انویسٹمنٹ کی ہے میں نے وہاں سے رقم نکلواؤں گا۔ وہ اسلام آباد کا پلاٹ بیچ دوں گا... فوری طور پر تو تھوڑا بہت کر ہی لوں گا۔ اتنا کہ اسکول کی بلڈنگ دوبارہ کھڑی ہو جائے۔"

"پلاٹ کیوں؟" وہ بری طرح بدکی تھی۔ امامہ نے نوٹس نہیں کیا تھا کہ وہ پلاٹس نہیں پلاٹ کہہ رہا تھا۔

"اس سے فوری طور پر رقم مل جائے گی مجھے... بعد میں لے لوں گا۔ ابھی تو فوری طور پر اس میں سے نکلنا ہے مجھے۔"

"تم وہ حق مہر کی رقم لے لو، آٹھ دس لاکھ کے قریب ویڈنگ پر ملنے والی گفٹ کی رقم بھی ہو گی اور اتنے ہی میرے اکاؤنٹ میں پہلے سے بھی ہوں گے... پچاس ساٹھ لاکھ تو یہ ہو جائے گا اور..." سالار نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"یہ میں کبھی نہیں کروں گا۔"

"قرض لے لو مجھ سے... بعد میں دے دینا۔"

"نو۔" اس کا انداز حتمی تھا۔

"میرے پاس بے کار پڑے ہیں سالار! تمہارے کام آئیں گے تو..." اس نے پھر امامہ کی بات کاٹ دی۔

"I said no" (میں نے کہا نا نہیں) اس نے اس بار کچھ ترشی سے کہا تھا۔

"میرے پیسے اور تمہارے پیسے میں کوئی فرق ہے؟"

"ہاں ہے۔" اس نے اسی انداز میں کہا تھا۔

"وہ حق مہر اور شادی پر گفٹ میں ملنے والی رقم ہے... میں کیسے لے لوں تم سے...؟ میں بے شرم ہو سکتا ہوں، بے غیرت نہیں ہو سکتا۔"

"اب تم خوامخواہ جذباتی ہو رہے ہو اور..."

سالار نے اس کی بات کاٹی "کون جذباتی ہو رہا ہے؟ کم از کم میں تو نہیں ہو رہا۔"

وہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی "میں تمہیں قرض دے رہی ہوں سالار۔"

"Thank you very much but I don't need" (بہت شکریہ، مگر مجھے اس کی ضرورت

"نہیں بے بی! مجھے قرض لینا ہوگا تو بڑے دوست ہیں میرے پاس۔"
"دوستوں سے قرض لو گے بیوی سے نہیں؟"
"نہیں۔"
"میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں سالار۔"
"ایموشنلی کرو فنانشلی نہیں۔"
وہ اسے دیکھتی رہ گئی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کس طرح قائل کرے۔
"اور اگر میں یہ رقم ڈونیٹ کرنا چاہوں تو۔" اسے بالآخر ایک خیال آیا۔
"ضرور کرو اس ملک میں بہت سی charities (خیراتی ادارے) ہیں۔ تمہارا پیسہ ہے' چاہے آگ لگا دو۔ لیکن میں یا میرا ادارہ نہیں لے گا۔" اس نے صاف لفظوں اور حتمی انداز میں کہا۔
"تم بھی مجھے کچھ ڈونیٹ کرنے نہیں دو گے؟"
"ضرور کرنا۔ لیکن فی الحال مجھے ضرورت نہیں ہے۔"
وہ ٹیبل سے اٹھ گیا تھا۔
وہ بے حد اپ سیٹ اسے جاتا دیکھتی رہی تھی۔ اس کے لیے وہ پلاٹ اس کے گھر کی پہلی دو اینٹیں تھیں اور وہ پہلی دو اینٹیں اس طرح جانے والی تھیں۔ یہ چیز اس کے لیے تکلیف دہ تھی۔ تکلیف کا باعث یہ احساس جرم بھی تھا جو وہ اس سارے معاملے میں اپنی فیملی کے انوالو ہونے کی وجہ سے محسوس کر رہی تھی۔ وہ کہیں نہ کہیں اس رقم سے جیسے اس نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش کرنا چاہتی تھی جو اس کی فیملی نے کیا تھا۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ سالار نے اس کی اس سوچ کو اس سے پہلے پڑھا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ کیا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
آنے والے دنوں میں بھی وہ سالار کو وہ رقم لینے پر مجبور کرتی رہی لیکن وہ ایک بار بھی یہ جرات نہیں کر سکی تھی کہ پولیس کی انویسٹی گیشن کے حوالے سے سالار سے کچھ پوچھتی۔۔۔ وہ دونوں جانتے بوجھتے اس حساس ایشو پر گفتگو سے اجتناب کر رہے تھے اور یہ امامہ کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔



"جو کچھ ہوا اس میں میرا کوئی قصور نہیں نہ ہی کوئی انوالومنٹ ہے؟"
اس کے سامنے بیٹھا وسیم بڑی سنجیدگی سے اسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا "اور میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ سب ابو کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے بھی ایسا کچھ نہ کیا ہو میں نے گھر میں ایسا کچھ نہیں سنا۔"
وسیم نے ہاشم مبین کا بھی دفاع کرنے کی کوشش کی تھی۔ امامہ قائل نہیں ہوئی۔ وہ سالار کے سامنے اپنی فیملی کا دفاع کرنے کی کوشش کر سکتی تھی۔ وسیم کے سامنے نہیں۔ اسے یقین تھا' یہ جو بھی کچھ ہوا تھا۔ اس میں اس کے اپنے باپ کا ہی ہاتھ تھا۔
"ابو سے کہنا' یہ سب کرنے سے کچھ نہیں ملے گا۔ سالار کو کیا نقصان ہوگا یا مجھے کیا نقصان ہوگا۔ ایک اسکول ہی جلا ہے پھر بن جائے گا۔ ان سے کہنا' وہ کچھ بھی کر لیں ہمیں فرق نہیں پڑتا۔"
وسیم اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس کی باتیں سنتا رہا پھر اس نے امامہ سے مدھم آواز میں کہا۔
"میں ابو سے یہ سب نہیں کہہ سکتا۔ میں بہت بزدل ہوں' تمہاری طرح بہادر نہیں ہوں۔"
چند لمحوں کے لیے وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے' جب سے وہ دوبارہ ملنا شروع ہوئے تھے' آج پہلی بار وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے سراہ رہا تھا یا اعتراف کر رہا تھا۔

"تمہارے جانے کے بعد اتنے سالوں میں بہت دفعہ کمزور پڑا ہیں، بہت دفعہ کشش و بیچ کا بھی شکار ہوا اور شک و شبہ کا بھی۔ بہت دفعہ دل چاہتا تھا۔ زندگی کے اس غبار کو میں بھی ختم کرنے کی کوشش کروں جس نے میری بینائی دھندلائی ہوئی ہے لیکن میں بہت بزدل ہوں۔ تمہاری طرح سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔"

"اب آجاؤ۔" امامہ کو خود احساس نہیں ہوا اس نے یہ بات اس سے کیوں کہہ دی اور کہنی چاہیے تھی کہ نہیں۔

وسیم نے اس سے نظریں نہیں ملائیں پھر سہلاتے ہوئے کہا۔

"اب اور بھی زیادہ مشکل ہے جب اکیلا تھا تو اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکا تھا اب تو بیوی اور بچے ہیں۔"

"ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں... میں اور سالار۔ کچھ بھی نہیں ہوگا تمہیں... تمہاری فیملی کو تم ایک بار کوشش تو کرو۔"

امامہ بھول گئی تھی اس نے وسیم کو کیا ڈسکس کرنے کے لیے بلایا تھا اور وہ کیا ڈسکس کرنے بیٹھ گئی تھی۔

"انسان بہت خود غرض اور بے شرم ہوتا ہے امامہ۔ اسے جو ضرورت ہوتی ہے یہ صحیح اور غلط کی سب تمیز ختم کر دیتی ہے کاش میں زندگی میں مذہب کو پہلی Priority (ترجیح) بنا سکتا... مگر مذہب پہلی Priority (ترجیح) نہیں ہے میری۔" وسیم نے گہرا سانس لیا تھا جیسے کوئی رنج تھا جس نے بگولہ بن کر اسے اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔

"میں تمہاری طرح فیملی نہیں چھوڑ سکتا مذہب کے لیے... تمہاری قربانی بہت بڑی ہے۔"

"تم جانتے ہو جہنم کا انتخاب کر رہے ہو صرف دنیا کے لیے؟ اپنے بیوی بچوں کو بھی اسی راستے پر لے جاؤ گے کیونکہ تم میں صرف جرأت نہیں ہے۔ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہہ دینے کی۔"

وہ اب بھائی کو چیلنج کر رہی تھی۔ وہ یک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا یوں جیسے بے قرار تھا۔

"تم مجھے بہت بڑی آزمائش میں ڈالنا چاہتی ہو؟"

"آزمائش سے بچانا چاہتی ہوں... آزمائش تو وہ ہے جس میں تم نے خود کو ڈال رکھا ہے۔"

اس نے اپنی گاڑی کی چابی اٹھائی۔ "میں صرف اسی لیے تم سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔"

وہ کہتے ہوئے اس کے روکنے کے باوجود اپارٹمنٹ سے نکل گیا تھا امامہ بے چینی اور بے قراری کے عالم میں اپنے اپارٹمنٹ کی بالکونی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ وسیم کو پارکنگ میں اپنی گاڑی کی طرف جاتے دیکھ کر اسے جیسے پچھتاوا ہو رہا تھا۔ وہ وسیم سے تعلق توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اور وہ اسے اس اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"وسیم میرا فون نہیں اٹھا رہا۔" امامہ نے اس رات کھانے پر سالار سے کہا تھا۔ سالار کو وہ بہت پریشان لگی تھی۔

"ہو سکتا ہے مصروف ہو۔" سالار نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں، وہ ناراض ہے۔"

اس بار سالار چونکا تھا۔ "ناراض کیوں ہوگا؟"

امامہ نے اسے اپنی اور وسیم کی گفتگو سنا دی۔ سالار گہرا سانس لے کر رہ گیا تھا۔

"تمہیں ضرورت کیا تھی اس سے اس طرح کی گفتگو کرنے کی... بالغ آدمی ہے وہ... بزنس کر رہا ہے۔ بیوی بچوں والا ہے۔ اسے اچھی طرح پتا ہے اس نے زندگی میں کیا کرنا ہے اور اس کے لیے کیا صحیح ہے۔ تم لوگ

تم میں ملتے رہنا چاہتے ہو تو پھر سب کو ڈسکس کیے بغیر لو۔" سالار نے اسے بڑی سنجیدگی کے ساتھ سمجھایا۔
"بات اس نے شروع کی تھی وہ نہ کرتا تو میں بھی نہ کرتی۔" امامہ نے جیسے اپنا دفاع کیا۔
"اور خود بات شروع کرنے کے بعد اب وہ تمہاری فون کال نہیں لے رہا تو بہتر ہے اب تم انتظار کرو سکون سے'
جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو کرے گا وہ تمہیں کال۔"
سالار کھانا دوبارہ کھانا کھانے لگا۔ امامہ اسی طرح بیٹھی رہی۔
"اب کیا ہوا؟" سالار نے سلاد کا ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے اس کی خاموشی نوٹس کی۔
"میری خواہش ہے وہ بھی مسلمان ہو جائے اس گمراہی کی دلدل سے نکل آئے۔"
سالار نے ایک لمحہ رک کر اسے دیکھا پھر بڑی سنجیدگی سے اسے کہا۔
"تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ اس کی زندگی ہے اس کا فیصلہ ہے۔ تم اپنی خواہش اس پر impose (لاگو) نہیں کر سکتیں۔"
"impose تو کر بھی نہیں رہی میں۔" وہ پلیٹ میں چمچ بے مقصد ہلاتے ہوئے دل گرفتہ ہوئی تھی۔
"کبھی کبھی دل چاہتا ہے انسان کا وہ چیزوں کو جادو کی طرح ٹھیک کرنے کی کوشش کرے۔" سالار نے اس کی دل گرفتی محسوس کی پھر جیسے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔ "زندگی میں جادو نہیں چلتا۔ عقل چلتی ہے یا قسمت۔ اس کی عقل کام کرے گی اور قسمت میں لکھا ہو گا تو وہ اپنے لیے کوئی اسٹینڈ لے گا ورنہ میں یا تم کوئی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔" وہ اسے نرمی سے سمجھاتا جا رہا تھا۔
"اور تم دوبارہ کبھی اس سے اس مسئلے پر خود بات نہیں کرو گی نہ ہی اسکول کے حوالے سے کسی گلے شکوے کے لیے اسے بلاؤ گی۔ میں اپنے مسئلوں کو ہینڈل کر سکتا ہوں اور وہ ہیم کچھ نہیں کر سکتا۔"
وہ کھانا کھا کر کھانے کی ٹیبل سے اٹھ گیا۔ امامہ اسی طرح خالی پلیٹ لیے بیٹھی رہی تھی۔ پتا نہیں زندگی میں اچانک اتنی بے سکونی کہاں سے آ گئی تھی۔ وہ fairytale (پریوں کی کہانی) جو چند ماہ پہلے سالار کے ساتھ شروع ہوئی تھی اور جو اس کے پیروں کو زمین پر ٹکنے نہیں دیتی تھی۔ اب وہ پریوں کی کہانی کیوں نہیں رہی تھی۔ اس میں پریشانیوں کا جنگل کیسے اگ آیا تھا۔ یا شاید یہ اس کے ستارے تھے جو ایک بار پھر گردش میں آئے ہوئے تھے۔



اسکول کی بلڈنگ کے اسٹرکچر کو واقعی نقصان پہنچا تھا۔ سب کچھ جیسے square one پر آ گیا تھا۔ یہ سالار کے لیے حالیہ زندگی کا پہلا بڑا ذاتی مالیاتی نقصان تھا۔ چند گھنٹوں میں سب کچھ راکھ ہو جانے کا مطلب اسے زندگی میں پہلی بار سمجھ میں آیا تھا اور اس پر سب سے بدترین بات یہ تھی کہ اس سارے ایشو میں اس کے سسرال کے ملوث ہونے پر کم از کم اس کی فیملی میں سے کسی کو شبہ نہیں تھا۔ لیکن اسے ثابت کرنا مشکل نہیں تقریباً ناممکن تھا' گاؤں کا کوئی فرد ملوث ہوتا تو پولیس ابتدائی تفتیش کے بعد کسی نہ کسی کو ضرور پکڑ لیتی مگر اس آتش زدگی میں وہاں کے کسی شخص کی انوالومنٹ ظاہر نہیں ہوئی تھی اور جتنے پروفیشنل طریقے سے ایک ہی وقت میں مختلف کیمیکلز کے استعمال سے عمارت کے مختلف حصوں میں وہ آگ لگائی گئی تھی' وہ کسی عام چور اچکے کا کام نہیں تھا۔ اگر مقصد اسے نقصان پہنچانا تھا تو اسے بے حد نقصان ہوا تھا اگر مقصد اسے چوٹ پہنچانا تھا تو یہ پیٹ پر ضرب لگانے جیسا تھا۔ وہ برا ہوا تھا منہ کے بل نہیں گرا تھا۔
"اسے چھوڑ دو سالار!" وہ دوسرے ویک اینڈ پر پھر اسلام آباد میں تھا اور طیبہ اس بار جیسے گڑگڑا رہی تھیں۔ وہ اس سب سے اس بار مزید خائف ہو گئی تھیں۔
"تمہیں شادی کا شوق تھا۔ وہ پورا ہو گیا ہے اب چھوڑ دو اسے۔"

"آپ کو اندازہ ہے کہ آپ مجھے کتنی تکلیف پہنچاتی ہیں جب آپ مجھ سے اس طرح کی بات کرتی ہیں۔"
سالار نے ان کو بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔
"تم نے دیکھا نہیں انہوں نے کیا کیا ہے؟"
"ابھی کچھ ثابت نہیں ہوا۔" اس نے پھر ماں کی بات کاٹی تھی۔
"تم عقل کے اندھے ہو سکتے ہو ہم نہیں۔۔۔ اور کون ہے دشمن تمہارا امامہ کی فیملی کے سوا؟" طیبہ برہم ہو گئی تھیں۔
"اس سب میں امامہ کا کیا قصور ہے؟"
"یہ سب اس کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی یہ بات؟"
"نہیں آتی۔۔۔ اور نہیں آئے گی۔ میں نے کل بھی آپ سے کہا تھا آج بھی کہہ رہا ہوں اور آئندہ بھی یہی کہوں گا۔ میں امامہ کو ڈی وورس نہیں کروں گا۔ کم از کم اس وجہ سے تو نہیں کہ اس کی فیملی مجھے نقصان پہنچا سکتی ہے۔ آپ کو کوئی اور بات کرنی ہے تو میں بیٹھتا ہوں ورنہ اس ایشو پر مجھے نہ آج نہ دوبارہ بات کرنی ہے۔"
طیبہ کچھ بول نہیں سکی تھیں۔ وہ وہی کچھ کہہ رہا تھا جو سکندر کی زبانی وہ پہلے سن چکی تھیں لیکن انہیں ذرا سی خوش فہمی تھی کہ وہ شاید اس بار کسی نہ کسی طرح اس کو اس بات پر تیار کر لیں جس کے بارے میں سکندر کو کوئی امید نہیں تھی۔ سکندر اس وقت وہاں نہیں تھے۔ وہ آدھ گھنٹہ وہاں بیٹھنے کے بعد واپس بیڈ روم میں آیا تو امامہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے گاؤں لے کر نہیں گیا تھا لیکن اسلام آباد میں ویک اینڈ کے بعد اگلے دو دن ہونے والی کانفرنس کی وجہ سے ساتھ ہی لے آیا تھا۔
وہ اپنا لیپ ٹاپ نکال کر کچھ کام کرنے لگا تھا جب اسے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ وہ جس چینل پر تھی وہاں مسلسل اشتہار چل رہے تھے اور وہ صوفہ پر بیٹھی انہیں بے حد یکسوئی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ عام طور پر چینل سرفنگ میں مصروف رہتی تھی۔ اشتہارات کو وہ کتنا بے حد حیران کن تھا۔ سالار نے وقتاً فوقتاً دو تین بار اسے اور ٹی وی کو دیکھا تھا اس نے دس منٹ کے دوران اسے ایک بار بھی چائے کا مگ اٹھاتے نہیں دیکھا تھا جو اس کے سامنے ٹیبل پر پڑا تھا اور جس میں سے اب بھاپ اٹھنا بند ہو گئی تھی۔
اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور بیڈ سے اٹھ کر اس کے پاس صوفہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ امامہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔ سالار نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ پکڑ کر ٹی وی آف کر دیا۔
"تم نے میری اور ممی کی باتیں سنی ہیں کیا؟" وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔ وہ جن یا جادوگر نہیں تھا شیطان تھا اور اگر شیطان نہیں تھا تو شیطان کا سینئر منسٹر ضرور تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے دیکھتے ہوئے جھوٹ بولنا بے کار تھا۔ اس نے گردن سیدھی کر لی۔
"ہاں۔ چائے بنانے گئی تھی میں اور تم دونوں لاؤنج میں بات کر رہے تھے میں نے کچن میں سنا سب کچھ۔"
اس نے سر جھکائے کہا وہ اسے یہ نہیں بتا سکی تھی کہ طیبہ کے مطالبے نے چند لمحوں کے لیے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔ آخری چیز جو وہ تصور کر سکتی تھی وہ یہی تھی کہ کوئی سالار سے اسے چھوڑنے کے لیے کہہ سکتا تھا اور وہ بھی اتنے صاف الفاظ میں اتنے ہتک آمیز انداز میں۔
"تم جب یہاں آتے ہو وہ یہ کہتی ہیں تم سے؟"
ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے سالار سے پوچھا جو اسے تسلی دینے کے لیے کچھ الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔
"نہیں۔ ہر بار نہیں کہتیں۔ کبھی کبھی وہ اوور ری ایکٹ کر جاتی ہیں۔" اس نے ہموار لہجے میں کہا۔
"میں اب اسلام آباد کبھی نہیں آؤں گی۔" اس نے یک دم کہا۔

"لیکن میں تو آؤں گا اور میں آؤں گا تو تمہیں بھی آنا پڑے گا۔" الفاظ سیدھے تھے لہجہ نہیں۔ اس نے سالار کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی تھی۔

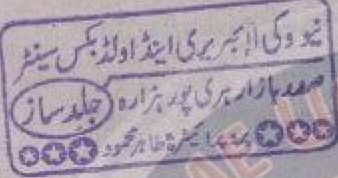
"تم اپنی ممی کی سائیڈ لے رہے ہو؟"

"ہاں۔ جیسے میں نے ان کے سامنے تمہاری سائیڈ لی۔"

وہ اس کے جواب پر چند لمحوں کے لیے بول نہیں سکی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

خاموشی کا ایک اور لمبا وقفہ آیا تھا پھر سالار نے کہا۔

"زندگی میں اگر کبھی میرے اور تمہارے درمیان علیحدگی جیسی کوئی چیز ہوئی تو اس کی وجہ میرے پیرنٹس یا میری فیملی نہیں بنے گی کم از کم یہ ضمانت میں تمہیں دیتا ہوں۔"



وہ پھر بھی خاموش رہی تھی۔

"کچھ بولو۔"

"کیا بولوں؟"

"جب تم خاموش ہوتی ہو تو بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔"

امامہ نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"مجھے لگتا ہے تم پتا نہیں اس بات کو کیسے استعمال کرو گی میرے خلاف۔۔۔"

"کبھی" اس نے جملہ مکمل کرنے کے بعد کچھ توقف سے ایک آخری لفظ کا اضافہ کیا۔ وہ اسے دیکھتی رہی، لیکن خاموش رہی۔ سالار نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

"تم میری بیوی ہو امامہ۔ وہ میری ماں ہیں۔۔۔ میں تمہیں شٹ اپ کہہ سکتا ہوں' انہیں نہیں کہہ سکتا۔ وہ ایک ماں کی طرح سوچ رہی ہیں اور ماں کی طرح ری ایکٹ کر رہی ہیں' جب تم ماں ہو گی تو تم بھی اسی طرح ری ایکٹ کرنے لگو گی۔ انہوں نے تم سے کچھ نہیں کہا' مجھ سے کہا۔ میں نے اگنور کر دیا۔ جس چیز کو میں نے اگنور کر دیا اسے تم سیریسلی لو گی تو یہ حماقت ہو گی۔"

وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ وہ سن رہی تھی جب وہ خاموش ہوا تو اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"میرے لیے سب کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ جب سے شادی ہوئی ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ تمہارے لیے ایک کے بعد ایک مسئلہ آ جاتا ہے۔ مجھ سے شادی اچھی نہیں ثابت ہوئی تمہارے لیے۔ ابھی سے اتنے مسئلے ہو رہے ہیں تو پھر بعد میں پتا نہیں۔"

سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔

"شادی ایک دوسرے کی قسمت سے نہیں کی جاتی۔ ایک دوسرے کے وجود سے کی جاتی ہے' اچھے دنوں کے ساتھ کے لیے لوگ فرینڈشپ کرتے ہیں شادی نہیں۔

ہم دونوں کا Future' Past' Present "(حال' ماضی' مستقبل) جو بھی ہے جیسا بھی ہے ایک ساتھ ہی ہے اب۔ اگر تم کو یہ لگتا ہے کہ میں یہ expect (توقع) کر رہا تھا کہ تم سے شادی کے بعد پہلے میرا پرائز بانڈ نکلے گا پھر مجھے کوئی بونس ملے گا پھر میری پروموشن ہو گی۔ اور پھر میں لوگوں کے درمیان بیٹھ کر بڑی خوشی سے یہ بتاؤں گا کہ میری لائف میرے لیے بڑی لکی ہے۔ تو سوری مجھے ایسی کوئی expectatians (توقعات) نہیں تھیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ untimely (بے وقت) ہو سکتا ہے میرے لیے۔ unexpected (غیر متوقع) نہیں ہے۔ میں تمہارے لیے کس حد تک جا سکتا ہوں' کتنا سنجیدہ ہوں۔ وہ وقت بتا سکتا ہے اس لیے تم خاموشی سے وقت کو گزرنے دو۔ یہ چائے تو ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ جاؤ دوبارہ چائے بنا لاؤ' پیتے ہیں۔"

وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ کوئی چیز اس کی آنکھوں میں امڈنے لگی تھی۔ اللہ تعالیٰ انسان کو زندگی میں کہاں کہاں سے تحفظ دیتا ہے۔ کہاں کہاں سے دیواریں لا کر کھڑی کر دیتا ہے انسان کے گرد۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کے سائے میں رہتی تھی تو اسے یقین تھا اس سے زیادہ عزت، زیادہ تحفظ کوئی اسے دے ہی نہیں سکتا کم از کم شادی جیسے رشتے سے وہ ذمہ داری کے علاوہ کسی چیز کی توقع نہیں رکھے ہوئے تھی۔ اب اگر وہ اس شخص کے ساتھ وابستہ ہوئی تھی تو وہ تحفظ کے نئے مفہوم سے آگاہ ہو رہی تھی۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے امامہ!" سالار نے اس کے چہرے پر پھسلتے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے اس سے نرمی سے کہا۔ وہ سر ہلاتے اور اپنی ناک رگڑتے ہوئے اٹھ گئی اس کی واقعی ضرورت نہیں تھی۔



سالار نے اس مسئلے کو کیسے حل کیا تھا۔ یہ امامہ نہیں جانتی تھی۔ اسکول کی تعمیر دوبارہ کیسے شروع ہوئی تھی اسے یہ بھی نہیں پتا تھا، لیکن اسکول دوبارہ بن رہا تھا، سالار پہلے سے زیادہ مصروف تھا اور اس کی زندگی میں آنے والا ایک اور طوفان کسی تباہی کے بغیر گزر گیا تھا۔



"مجھے ہاتھ دکھانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" سالار نے دو ٹوک انکار کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن مجھے ہے۔" امامہ اصرار کر رہی تھی۔

"یہ سب جھوٹ ہوتا ہے۔" سالار نے اسے بچوں کی طرح بہلایا۔

"کوئی بات نہیں، ایک بار دکھانے سے کیا ہوگا؟" اس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"تم کیا جاننا چاہتی ہو اپنے مستقبل کے بارے میں...؟ مجھ سے پوچھ لو۔"

سالار اسے اس پامسٹ کے پاس لے جانے کے موڈ میں نہیں تھا جو اس فائیو اسٹار ہوٹل کی لابی میں تھا، جہاں وہ کچھ دیر پہلے کھانا کھانے کے لیے آئے تھے اور کھانے کے بعد امامہ کو پتا نہیں وہ پامسٹ کہاں سے یاد آ گیا تھا۔

"ویری فنی۔" اس نے مذاق اڑایا تھا۔ "اپنے مستقبل کا تو تمہیں پتا نہیں میرے کا کیسے ہوگا؟"

"کیوں تمہارا اور میرا مستقبل ساتھ ساتھ نہیں ہے کیا؟" سالار نے مسکرا کر اسے جتایا تھا۔

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں پامسٹ کے پاس چلتے ہیں اس سے پوچھتے ہیں۔" امامہ کا اصرار بڑھا تھا۔

"دیکھو ہمارا "آج" ٹھیک ہے۔ کافی ہے۔ تمہیں "کل" کا مسئلہ کیوں ہو رہا ہے؟" وہ اب بھی رضامند نہیں ہو رہا تھا۔

"مجھے ہے کل کا مسئلہ۔" وہ کچھ جھلا کر بولی تھی، اسے شاید یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس کی فرمائش پر اس طرح کے ردعمل کا اظہار کرے گا۔

"کتنے لوگ ہاتھ دکھا کر جاتے ہیں اس پامسٹ کو۔ تمہیں پتا ہے میری کولیگز کو اس نے ان کے فیوچر کے بارے میں کتنا کچھ ٹھیک بتایا تھا، بھابھی کی بھی کتنی کزنز آئی تھیں اس کے پاس۔" امامہ اب اسے قائل کرنے کے لیے مثالیں دے رہی تھی۔

"بھابھی آئی تھیں اس کے پاس؟" سالار نے جواباً پوچھا تھا۔

"نہیں۔" وہ اٹکی۔

"تو؟"

"تو یہ کہ ان کو انٹرسٹ نہیں ہوگا... مجھے تو ہے... اور تم نہیں لے کر جاؤ گے تو میں خود چلی جاؤں گی۔" وہ یک

دم سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"کس دن؟" سالار نے جیسے ٹالا۔

"ابھی۔"

وہ بے اختیار ہنسا اور اس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"پامسٹ کو ہاتھ دکھانا دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہے اور میں تم سے ایسی کسی حماقت کی توقع نہیں کرتا تھا' لیکن اب تم ضد کر رہی ہو تو ٹھیک ہے۔ تم دکھالو ہاتھ۔"

"تم نہیں دکھاؤ گے؟" اس کے ساتھ لابی کی طرف جاتے ہوئے امامہ نے پوچھا۔

"نہیں۔" سالار نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ میرا اور تمہارا مستقبل ایک ہے تو جو کچھ میرے بارے میں بتائے گا وہ پامسٹ۔ وہ تمہارے بارے میں بھی تو ہو گا۔" امامہ اب اسے چھیڑ رہی تھی۔

"مثلاً؟" سالار نے بھنویں اچکاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"مثلاً اچھی خوش گوار ازدواجی زندگی۔ اگر میری ہوئی تو تمہاری بھی تو ہو گی۔"

"ضروری نہیں ہے۔" وہ اسے تنگ کرنے لگا۔

"ہو سکتا ہے شوہر کے طور پر میری زندگی بڑی بری گزرے تمہارے ساتھ۔"

"تو مجھے کیا؟ میری تو اچھی گزر رہی ہو گی۔" امامہ نے کندھے اچکا کر بے نیازی دکھائی۔

"تم عورتیں بڑی سیلفش (خود غرض) ہوتی ہو۔" سالار نے ساتھ چلتے ہوئے جیسے اس کے رویے کی مذمت کی۔

"تو نہ کیا کرو پھر ہم سے شادی۔ نہ کیا کرو ہم سے محبت۔ ہم کون سا مری جا رہی ہوتی ہیں تم مردوں کے لیے؟"

امامہ نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ وہ ہنس پڑا۔ چند لمحوں کے لیے وہ جیسے واقعی لاجواب ہو گیا تھا۔

"ہاں ہم ہی مرے جا رہے ہوتے ہیں تم عورتوں پر۔ عزت کی زندگی راس نہیں آتی شاید اس لیے۔" وہ چند لمحوں بعد بڑبڑایا تھا۔

"تمہارا مطلب ہے تم شادی سے پہلے عزت کی زندگی گزار رہے تھے؟" امامہ ہمیشہ کی طرح فوراً برا مان گئی تھی۔

"ہم شاید جنرلائز کر رہے تھے۔" سالار اس کا بدلتا موڈ دیکھ کر گڑبڑایا۔

"نہیں۔ تم صرف اپنی بات کرو۔"

"تم اگر ناراض ہو رہی ہو تو چلو پھر پامسٹ کے پاس نہیں جاتے۔" سالار نے بے حد سہولت سے اسے موضوع سے ہٹایا۔

"نہیں میں کب ناراض ہوں ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔" امامہ کا موڈ ایک لمحہ میں بدلا تھا۔

"ویسے تم پوچھو گی کیا پامسٹ سے؟" سالار نے بات کو مزید گھمایا۔

"بڑی چیزیں ہیں۔" امامہ نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔

وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر تب تک وہ پامسٹ کے پاس پہنچ چکے تھے۔

کرسی ایک طرف رکھے اس پر بیٹھا وہ بغیر دلچسپی سے اپنی بیوی اور پامسٹ کی ابتدائی گفتگو سنتا رہا' لیکن اسے امامہ کی دلچسپی اور سنجیدگی دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

پامسٹ اب امامہ کا ہاتھ پکڑے عدسے کی مدد سے اس کی لکیروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے بے حد سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔

"لکیروں کا علم نہ تو حتمی ہوتا ہے نہ ہی الہامی۔ ہم صرف وہی بتاتے ہیں جو لکیریں بتا رہی ہوتی ہیں، بہرحال مقدر بنانا، سنوارنا اور بگاڑنا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔"

وہ بات کرتے کرتے چند لمحوں کے لیے رکا، پھر اس نے جیسے حیرانی سے اس کے ہاتھ پر کچھ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کا چہرہ دیکھا اور پھر برابر کی کرسی پر بیٹھے اس کے شوہر کو جو اس وقت اپنے بلیک بیری پر کچھ میسجز دیکھنے میں مصروف تھا۔

"بڑی حیرانی کی بات ہے۔" پامسٹ نے دوبارہ ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" امامہ نے کچھ بے تاب ہو کر پامسٹ سے پوچھا۔

"آپ کی یہ پہلی شادی ہے؟" بلیک بیری پر میسج چیک کرتے کرتے سالار نے نظر اٹھا کر پامسٹ کو دیکھا۔ اس کا خیال تھا یہ سوال اس کے لیے تھا لیکن پامسٹ کی مخاطب اس کی بیوی تھی۔

"ہاں!" امامہ نے کچھ حیران ہو کر پہلے پامسٹ کو اور پھر اسے دیکھ کر کہا۔

"اوہ۔ اچھا۔" پامسٹ پھر کسی غور و خوض میں مصروف ہو گیا تھا۔

"آپ کے ہاتھ پر دوسری شادی کی لکیر ہے۔ ایک مضبوط لکیر۔ ایک خوش گوار کامیاب۔ دوسری شادی۔"

پامسٹ نے امامہ کا ہاتھ پکڑے اسے دیکھتے ہوئے جیسے حتمی انداز میں کہا۔ امامہ کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر سالار کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت تھا۔

"آپ کو یقین ہے؟" امامہ کو لگا جیسے پامسٹ نے کچھ غلط پڑھا تھا اس کے ہاتھ پر۔

"جہاں تک میرا علم ہے اس کے مطابق تو آپ کے ہاتھ پر شادی کی دو لکیریں ہیں اور دوسری لکیر پہلی لکیر کی نسبت زیادہ واضح ہے۔"

پامسٹ اب بھی اس کے ہاتھ پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ سالار نے امامہ کے کسی اگلے سوال سے پہلے جیب سے والٹ اور والٹ سے ایک کرنسی نوٹ نکال کر پامسٹ کے سامنے میز پر رکھا، پھر بڑی شائستگی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تھینک یو۔ بس اتنی انفارمیشن کافی ہے۔ ہم لیٹ ہو رہے ہیں، ہمیں جانا ہے۔"

اسے اٹھ کر وہاں سے چلتے دیکھ کر امامہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر اس کے پیچھے آ گئی تھی۔

"مجھے ابھی اور بہت کچھ پوچھنا تھا اس سے۔" اس نے خفگی سے سالار کے برابر میں آتے ہوئے کہا۔

"مثلاً؟" سالار نے کچھ تیکھے انداز میں کہا۔ وہ فوری طور پر اس کے سوال کا جواب نہیں دے سکی۔

"اس نے مجھے اور پریشان کر دیا ہے۔" امامہ نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا، لیکن جب وہ پارکنگ میں آ گئے تو اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی سالار سے کہا۔

"It was your choice" (یہ تمہارا اپنا انتخاب تھا) سالار نے کچھ بے رخی سے کہا تھا۔ "اس نے تمہیں نہیں بلایا تھا، تم خود گئی تھیں اس کے پاس اپنا مستقبل دیکھنے۔"

"سالار! تم مجھے چھوڑ دو گے کیا؟" امامہ نے اس کی بات کے جواب میں یک دم کہا۔

"یہ نتیجہ اگر تم نے پامسٹ کی پیش گوئی کے بعد نکالا ہے تو مجھے تم پر افسوس ہے۔" سالار کو غصہ آیا تھا اس پر۔ امامہ کچھ خفیف سی ہو گئی۔

"ویسے ہی پوچھا ہے میں نے۔"
"تمہیں پہلے کم وہم تھے میرے بارے میں کہ کسی پامسٹ کی مدد کی ضرورت پڑتی۔" سالار کی خفگی کم نہیں ہوئی تھی۔
"دوسری شادی تو وہ تمہاری Predict (پیش گوئی) کر رہا ہے۔ ایک کامیاب خوش گوار ازدواجی زندگی اور تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ کیا میں تمہیں چھوڑ دوں گا؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے تم مجھے چھوڑ دو۔"
سالار نے اس بار چبھتے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ ان کی گاڑی اب مین روڈ پر آچکی تھی۔
"میں تو تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔" امامہ نے سالار کو دیکھے بغیر بے ساختہ کہا۔
"پھر ہو سکتا ہے میں مر جاؤں اور اس کے بعد تمہاری دوسری شادی ہو۔" سالار کو یک دم اسے چڑانے کی سوجھی۔
امامہ نے اس بار اسے خفگی سے دیکھا۔
"تم بے وقوفی کی بات مت کرو۔"
"ویسے تم کر لینا شادی اگر میں مر گیا تو۔ اکیلی مت رہنا۔" امامہ نے کچھ اور برا مانا۔
"میں کچھ اور بات کر رہی ہوں تم کچھ اور بات کرنا شروع ہو جاتے ہو۔ اور تمہیں اتنی ہمدردی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔"
سالار کے مشورے نے اسے ڈسٹرب کیا تھا اور یہ اس کے جملے کی بے ربطی میں جھلکا تھا۔ سالار خاموش ہوا۔ امامہ بھی خاموش تھی۔
"تم اصل میں یہ چاہتے ہو کہ میں تم سے کہوں کہ اگر میں مر جاؤں تو تم دوسری شادی کر لینا۔" وہ کچھ لمحوں کے بعد یک دم بولی تھی۔ وہ اس کی ذہانت پر عش عش کر اٹھا تھا۔
"تو کیا میں نہ کروں؟" سالار نے جان بوجھ کر اسے بڑی سنجیدگی سے چھیڑا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے اسے بڑے پریشان انداز میں دیکھا۔
"مجھے پامسٹ کے پاس جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔" وہ پچھتائی تھی۔
"تم مجھ سے سود کے بارے میں سوال کرتی ہو اور خود یہ یقین رکھتی ہو کہ اللہ کے علاوہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کی قسمت کا حال پتا ہو سکتا ہے؟" وہ صاف گو تھا اور ہمیشہ سے تھا مگر اس کی صاف گوئی نے امامہ کو کبھی اس طرح شرمندہ نہیں کیا تھا جس طرح اب کیا تھا۔ گھڑوں پانی پڑنے کا مطلب اسے اب سمجھ آیا تھا۔
"انسان ہوں، فرشتہ تو نہیں ہوں میں۔" اس نے مدھم آواز میں کہا تھا۔
"جانتا ہوں اور تمہیں فرشتہ کبھی سمجھا بھی نہیں میں نے۔ مارجن آف error دیتا ہوں تمہیں، لیکن تم مجھے نہیں دیتیں۔"
وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اور وہ بہت کم کوئی غلط بات کرتا تھا۔ امامہ کو یہ اعتراف تھا۔
"زندگی اور قسمت کا پتا اگر زائچوں، پانسوں، اعداد، لکیروں اور ستاروں سے لگنے لگتا تو پھر اللہ انسان کو عقل نہ دیتا بس صرف یہی چیزیں دے کر دنیا میں اتار دیتا۔"
وہ گاڑی چلاتے ہوئے کہہ رہا تھا اور وہ شرمندگی سے سن رہی تھی۔
"جب مستقبل بدل نہیں سکتے تو اسے جان کر کیا کریں گے۔ بہتر ہے غیب غیب ہی رہے۔ اللہ سے اس کی خبر کے بجائے اس کا رحم اور کرم مانگنا زیادہ بہتر ہے۔"
وہ بول ہی نہیں سکی تھی۔ سالار بعض دفعہ اسے بولنے کے قابل نہیں چھوڑتا تھا، یہ یقین اور یہ اعتماد تو اس کا

اثاثہ تھا۔ یہ اس کے پاس کیسے چلا گیا تھا۔
اس رات امامہ کو پہلی بار یہ بے چینی ہوئی تھی۔ وہ ساتھی تھے۔ رقیب نہیں تھے مگر اسے چند لمحوں کے لیے سالار سے رقابت ہوئی تھی۔ وہ ایمان کے درجوں میں اس سے بہت پیچھے تھا۔ وہ اسے پیچھے کیسے چھوڑنے لگا تھا۔



وہ سالار کے ساتھ خانہ کعبہ کے صحن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سالار اس کے دائیں جانب تھا وہ وہاں ان کی آخری رات تھی۔ وہ پچھلے پندرہ دن سے وہاں تھے اور اپنی شادی کے سات ماہ بعد وہاں عمرہ کے لیے آئے تھے۔
احرام میں ملبوس سالار کے برہنہ کندھے کو دیکھتے ہوئے امامہ کو ایک لمبے عرصے کے بعد وہ خواب یاد آیا تھا۔ سالار کے دائیں کندھے پر کوئی زخم نہیں تھا، لیکن اس کے بائیں کندھے کی پشت پر اب اس ڈنر نائف کا نشان تھا جو ہاشم مبین نے اسے مارا تھا۔
"تم نے پہلے کبھی مجھے اس خواب کے بارے میں نہیں بتایا۔" وہ امامہ کے منہ سے اس خواب کا سن کر شاکڈ رہ گیا تھا۔ "کب دیکھا تھا تم نے یہ خواب؟"
امامہ کو تاریخ، مہینہ، دن، وقت، سب یاد تھا۔ کیسے بھول سکتا تھا؟ وہ اس دن جلال سے ملی تھی۔ اتنے سالوں کے لاحاصل انتظار کے بعد۔۔۔۔۔
سالار گنگ تھا، وہ وہی رات تھی جب وہ یہاں امامہ کے لیے گڑگڑا رہا تھا۔ اس آس میں کہ اس کی دعا قبول ہو جائے۔ یہ جانے بغیر کہ اس کی دعا قبول ہو رہی تھی۔
"اس دن میں یہاں تھا۔" اس نے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے امامہ کو بتایا تھا۔ اس بار وہ ساکت ہوئی۔
"عمرہ کے لیے؟"
سالار نے سر ہلایا۔ وہ سر جھکائے اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ وہ کچھ بول ہی نہیں سکی، صرف اسے دیکھتی رہی۔
"اس دن تم یہاں نہ ہوتے تو شاید۔۔۔۔۔"
ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر بات مکمل نہیں کر سکی تھی۔
"شاید؟" سالار نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ یوں جیسے چاہتا تھا وہ بات مکمل کرے۔ وہ کیسے کرتی۔ اس سے کہتی یہ کہ وہ اس دن یہاں نہ ہوتا تو شاید جلال اس سے ایسی سرد مہری، ایسی بے رخی نہ برتتا۔ وہ سب کچھ نہ کہتا جو اس نے کہا تھا۔ وہ اس کے اور جلال کے بیچ میں اللہ کو لے آیا تھا اور اس کے لیے سالار کو یقیناً "اللہ نے ہی چنا تھا۔
ایک گہرا سانس لے کر اس نے سب کچھ جیسے سر سے جھٹکنے کی کوشش کی تھی، لیکن سالار کی باتیں اس کی سماعتوں سے چپک گئی تھیں۔
"اتنے سالوں میں جب بھی یہاں آیا، تمہارے لیے بھی عمرہ کیا تھا میں نے۔"
وہ بڑے سادہ لہجے میں امامہ کو بتا رہا تھا۔ اسے رلا رہا تھا۔
"تمہاری طرف سے ہر سال عید پر قربانی بھی کرتا رہا ہوں میں۔"
"کیوں؟" امامہ نے بھرائی ہوئی آواز میں اس سے پوچھا تھا۔
"تم منکوحہ تھیں میری۔ دور تھیں، لیکن میری زندگی کا حصہ تھیں۔"
وہ رو لی گئی تھی۔ اس کے لیے سب کچھ اسی شخص نے کرنا تھا کیا؟
اسے سالار کے حافظ قرآن ہونے کا پتا بھی اسی وقت چلا تھا، وہ جلال کی نعت سن کر مسحور ہو جاتی تھی اور اب

وہاں حرم میں سالار کی قرات سن کر گنگ تھی۔
"ایسی قرات کہاں سے سیکھی تم نے؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔
"جب قرآن پاک حفظ کیا تب۔ اب تو پرانی بات ہو گئی ہے۔" اس نے بڑے سادہ لہجے میں کہا۔
امامہ کو چند لمحوں کے لیے جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔
"تم نے قرآن پاک حفظ کیا ہوا ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے کبھی نہیں بتایا۔" وہ شاکڈ تھی۔
"تم نے بھی کبھی نہیں بتایا اتنے مہینوں میں۔"
"پتا نہیں کبھی خیال نہیں آیا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس آنے والے زیادہ تر لوگ حفاظ ہی ہیں۔ میرا حافظ قرآن ہونا ان کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں ہو گی۔" وہ کہہ رہا تھا۔
"تم اتنا حیران کیوں ہو رہی ہو؟"
آنسوؤں کا ایک ریلا آیا تھا امامہ کی آنکھوں میں۔ جلال کو پیڈسٹل پر بٹھائے رکھنے کی ایک وجہ اس کا حافظ قرآن ہونا بھی تھا۔ اور آج وہ جس کی بیوی تھی حافظ قرآن وہ بھی تھا۔ کتنی ہی نعمتیں تھیں جو اللہ کس نیکی کے عوض عطا کرتا ہے۔ کچھ میں نہیں آتا۔ وہ دلوں میں کیسے رہتا ہے۔ وہ سنتی آئی تھی وہ دلوں کو کیسے بوجھ لیتا ہے وہ دیکھ رہی تھی۔ بس سب کچھ "کن" تھا اللہ کے لیے۔ بس ایسے۔ اتنا ہی سہل۔ آسان۔ پلک جھپکنے سے پہلے۔ سانس آنے سے پہلے۔
اللہ سامنے ہوتا تو وہ اس کے قدموں میں گر کر روتی۔ بہت کچھ "مانگا" تھا اس نے اور یہ تو صرف "چاہا" تھا۔
وہ اتنا کچھ دے رہا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا وہ ایک بار پھر بھاگ کر حرم میں پہنچ جائے جہاں سے کچھ دیر پہلے آئی تھی۔
"رو کیوں رہی ہو؟"
وہ اس کے آنسوؤں کی وجہ نہیں جان پایا۔ وہ روتے روتے ہنسی۔
"بہت خوش ہوں اس لیے۔ تمہاری احسان مند ہوں اس لیے۔ نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر پا رہی اس لیے۔"
وہ روتی ہنستی اور کہتی جا رہی تھی۔
"بے وقوف ہو اس لیے۔" سالار نے جیسے خلاصہ کیا۔
"ہاں وہ بھی ہوں۔" اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے شاید پہلی بار سالار کی زبان سے اپنے لیے بے وقوف کا لفظ سن کر خفگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔
ایک لمحے کے لیے امامہ نے آنکھیں بند کیں پھر آنکھیں کھول کر حرم کے صحن میں خانہ کعبہ کے بالکل سامنے برابر میں بیٹھے سالار کو دیکھا جو بہت خوش الحانی سے قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔
فبای آلاء ربکما تکذبٰن۔
"اور تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟"
"تم جو کچھ کر رہی ہو امامہ۔ تم اس پر بہت پچھتاؤ گی تمہارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔"
نو سال پہلے ہاشم مبین نے اس کے چہرے پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا تھا۔
"تمہاری دنیا کی ذلت، رسوائی، بدنامی اور بھوک تمہارا مقدر بن جائے گی۔" انہوں نے اس کے چہرے پر ایک اور تھپڑ مارا تھا۔
"تمہارے جیسی لڑکیوں کو اللہ ذلیل و خوار کرتا ہے۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑتا۔"
امامہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"ایک وقت آئے گا جب تم دوبارہ ہماری طرف لوٹو گی۔۔۔ منت سماجت کرو گی۔۔۔ گڑگڑاؤ گی۔۔۔ تب ہم تمہیں دھتکار دیں گے۔۔۔ تب تم چیخ چیخ کر اپنے منہ سے اپنے گناہ کی معافی مانگو گی۔۔۔ کہو گی کہ میں غلط تھی۔"

امامہ اشک بار آنکھوں سے مسکرائی۔

"میری خواہش ہے بابا۔" اس نے زیرلب کہا۔ "کہ زندگی میں ایک بار میں آپ کے سامنے آؤں اور آپ کو بتا دوں کہ دیکھ لیجئے۔ میرے چہرے پر کوئی ذلت کوئی رسوائی نہیں ہے۔ میرے اللہ نے میری حفاظت کی۔ مجھے دنیا کے لیے تماشا نہیں بنایا۔ نہ دنیا میں بنایا ہے نہ ہی آخرت میں کسی رسوائی کا سامنا کروں گی۔ اور میں آج اگر یہاں موجود ہوں تو صرف اس لیے کیونکہ میں سیدھے راستے پر ہوں اور یہاں بیٹھ کر میں ایک بار پھر اقرار کرتی ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں۔ ان کے بعد کوئی پیغمبر آیا ہے نہ ہی کبھی آئے گا۔ میں اقرار کرتی ہوں کہ وہی پیر کامل ہیں میں اقرار کرتی ہوں کہ ان سے کامل ترین انسان کوئی دوسرا نہیں۔ ان کی نسل میں بھی کوئی ان کے برابر آیا ہے نہ ہی کبھی آئے گا اور میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے میری آنے والی زندگی میں بھی کبھی اپنے ساتھ شرک کروائے نہ ہی مجھے اپنے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کسی کو لاکھڑا کرنے کی جرات ہو۔ میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ زندگی بھر مجھے سیدھے راستے پر رکھے۔ بے شک میں اس کی کسی نعمت کو نہیں جھٹلا سکتی۔"

سالار نے سورۂ رحمٰن کی تلاوت ختم کر لی تھی۔ چند لمحوں کے لیے وہ رکا، پھر سجدے میں چلا گیا۔ سجدے سے اٹھنے کے بعد وہ کھڑا ہوتے ہوتے رک گیا۔ امامہ آنکھیں بند کیے دونوں ہاتھ پھیلائے دعا کر رہی تھی۔ وہ اس کی دعا ختم ہونے کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ امامہ نے دعا ختم کی۔ سالار نے ایک بار پھر اٹھنا چاہا اور اٹھ نہیں پایا۔ امامہ نے بہت نرمی سے اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"یہ جو لوگ کہتے ہیں نا کہ جس سے محبت ہوئی' وہ نہیں ملا۔ ایسا پتا ہے کیوں ہوتا ہے؟" رات کے پچھلے پہر نرمی سے اس کا ہاتھ تھامے وہ بھیگی آنکھوں اور مسکراتے چہرے کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

"محبت میں صدق نہ ہو تو محبت نہیں ملتی۔ نو سال پہلے جب میں نے جلال سے محبت کی تو پورے صدق کے ساتھ کی۔ دعائیں' وظیفے' منتیں۔ کیا تھا جو میں نے نہیں کیا مگر وہ مجھے نہیں ملا۔"

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔ سالار کا ہاتھ اس کے ہاتھ کی نرم گرفت میں تھا اس کے گھٹنے پر دھرا تھا۔

"پتا ہے کیوں؟ کیونکہ اس وقت تم بھی مجھ سے محبت کرنے لگے تھے اور تمہاری محبت میں میری محبت سے زیادہ صدق تھا۔"

سالار نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ اس کی تھوڑی سے ٹپکنے والے آنسو اب اس کے ہاتھ پر گر رہے تھے' سالار نے دوبارہ امامہ کے چہرے کو دیکھا۔

"مجھے اب لگتا ہے کہ مجھے اللہ نے بڑے پیار سے بنایا ہے۔ وہ مجھے ایسے کسی شخص کو سونپنے پر تیار نہیں تھا جو میری قدر نہ کرتا ناقدری کرتا مجھے ضائع کرتا اور جلال وہ میرے ساتھ یہی سب کرتا۔ وہ میری قدر کبھی نہ کرتا۔ نو سال میں اللہ نے مجھے ہر حقیقت بتا دی۔ ہر شخص کا اندر اور باہر دکھا دیا اور پھر اس نے مجھے سالار سکندر کو سونپا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تم وہ شخص ہو جس کی محبت میں صدق ہے۔ تمہارے علاوہ اور کون تھا جو مجھے یہاں لے آتا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ تم نے مجھ سے پاک محبت کی تھی۔"

وہ بے حس و حرکت سا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس اعتراف اس اظہار کے لیے کون سی جگہ چنی تھی۔ وہ اب اس کے ہاتھ کو نرمی اور احترام سے چومتے ہوئے باری باری اپنی آنکھوں سے لگا رہی تھی۔

"مجھے تم سے کتنی محبت ہو گی۔ میں یہ نہیں جانتی۔ دل پر میرا اختیار نہیں ہے مگر میں جتنی زندگی بھی تمہارے

ساتھ گزاروں گی۔ تمہاری وفادار اور فرماں بردار رہوں گی۔ یہ میرے اختیار میں ہے میں زندگی کے ہر مشکل مرحلے، ہر آزمائش میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ میں اچھے دنوں میں تمہاری زندگی میں آئی ہوں۔ میں برے دنوں میں بھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔"

اس نے جتنی نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا تھا اسی نرمی سے چھوڑ دیا۔ وہ اب سر جھکائے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو صاف کر رہی تھی۔

سالار کچھ کہے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ خانہ کعبہ کے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ اسے زمین پر اتاری جانے والی صالح اور بہترین عورتوں میں سے ایک دی گئی تھی۔ وہ عورت جس کے لیے سالار نے ہر وقت اور ہر جگہ دعا کی تھی۔

کیا سالار سکندر کے لیے نعمتوں کی کوئی حد رہ گئی تھی؟ اور اب جب وہ عورت اس کے ساتھ تھی۔ تو اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کیسی بھاری ذمہ داری اپنے لیے بیٹھا تھا۔ اسے اس عورت کا کفیل بنا دیا گیا تھا جو نیکی اور پارسائی میں اس سے کہیں آگے تھی۔

امامہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سالار نے کچھ کہے بغیر اس کا ہاتھ تھام کر وہاں سے جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ اسے اس عورت کی حفاظت سونپ دی گئی تھی جس نے اپنے اختیار کی زندگی کو اس کی طرح کسی آلائش اور غلاظت میں نہیں ڈبو دیا جس نے اپنی تمام جسمانی اور جذباتی کمزوریوں کے باوجود اپنی روح اور جسم کو اس کی طرح نفس کی بھینٹ نہیں چڑھایا۔

اس کا ہاتھ تھامے قدم بڑھاتے ہوئے اسے زندگی میں پہلی بار پارسائی اور تقویٰ کا مطلب سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ اپنی پوری زندگی کو جیسے فلم کی کسی اسکرین پر چلتا دیکھ رہا تھا اور اسے بے تحاشا خوف محسوس ہو رہا تھا۔

"سالار! تم سے ایک چیز مانگوں؟"

امامہ نے جیسے اس کی سوچ کے تسلسل کو روکا تھا۔ وہ اس وقت حرم کے صحن سے باہر نکلنے ہی والے تھے۔ سالار نے رک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ جانتا تھا وہ اس سے کیا مانگنے والی تھی۔

"تم ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ پڑھو۔" سالار کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس سے یہ مطالبہ کرنے والی تھی۔ وہ حیران ہوا تھا۔

"آخری خطبہ؟" وہ بڑبڑایا۔

"ہاں وہی خطبہ جو انہوں نے جبل رحمت کے دامن میں دیا تھا، اس پہاڑ پر جس پر چالیس سال بعد حضرت آدم علیہ السلام اور حوا بچھڑ کر ملے تھے اور بخشے گئے تھے۔"

امامہ نے مدھم آواز میں کہا۔ ایک جھماکے کے ساتھ سالار کو پتا چل گیا تھا، وہ اسے آخری خطبہ کیوں پڑھوانا چاہتی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



امامہ سالار کے ساتھ کھانا کھانے ریسٹورنٹ میں جاتی ہے۔ ایک ویٹر سالار کو ایک چٹ لا کر دیتا ہے "آپ یہ جگہ فوراً چھوڑ دیں۔" سالار جانے لگتا ہے لیکن تب ہی امامہ کے باپ اور بھائی وہاں آجاتے ہیں۔ وہ سالار پر حملہ کرتے ہیں۔

آٹھویں قسط

حاصل و محصول

اس نے سالار سے آخری خطبہ کے بارے میں ایک دن پہلے بھی پوچھا تھا۔ تب وہ جبل رحمت پر کھڑے تھے۔
"تمہیں آخری خطبہ کیوں یاد آگیا؟" سالار نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔ وہ دونوں ابھی کچھ دیر پہلے جبل رحمت پر نوافل ادا کرکے فارغ ہوئے تھے۔
"یہیں پر آخری حج کے اجتماع سے خطاب کیا تھا نا انہوں نے؟" وہ جبل رحمت کی چوٹی کے دامن کو دیکھ رہی تھی۔
"ہاں۔" سالار نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے نیچے جھانکا۔ ان دونوں کے کپڑے اب ہوا سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ تیز دھوپ اور لو جیسی ہوا کے تھپیڑوں میں وہ اس سے خون جما دینے والے سوال کرنے والی تھی۔
"تمہیں ان کا خطبہ یاد ہے؟" امامہ نے اس سے پوچھا۔
"سارا تو نہیں۔" سالار یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اٹکا۔ "بس چند احکامات یاد ہوں گے۔" اس نے بات مکمل کی تھی۔
"جیسے؟" امامہ نے مدھم آواز میں دل گروہ نکال دینے والی بے رحمی کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا تھا۔ سالار اس کی نظروں سے نظریں ہٹا نہیں سکا۔ وہ بڑی نازک جگہ پر کھڑا کرکے اس سے اس کی زندگی کا مشکل ترین سوال پوچھ رہی تھی اور سوال کا جواب۔ ان کے درمیان آنے والی خاموشی کے وقفے میں بھی تھا۔
"مجھے ٹھیک سے وہ احکامات بھی یاد نہیں، میں ایک بار آخری خطبے کو دوبارہ پڑھوں گا، پھر تم پوچھ لینا۔ جو پوچھنا چاہتی ہو۔" سالار نے بچنے کی ایک آخری کوشش کی تھی اور ناکام رہا۔
"مجھے پورا یاد ہے اور آج یہاں کھڑی ہوں تو اور بھی یاد آرہا ہے۔ میں سوچ رہی ہوں" آخری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ خطبہ یہیں کیوں دیا تھا۔ اس پہاڑ کے دامن میں کھڑے ہو کر جس پر حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا رضی اللہ تعالیٰ عنہ چالیس سال کے بعد آپس میں ملائے اور بخشے گئے۔" وہ اب کچھ سوچنے والے انداز میں بول رہی تھی۔
"شاید اس لیے کیونکہ دنیا کا آغاز انہیں دو انسانوں سے ہوا اور دین مکمل ہونے کا اعلان بھی اسی میدان میں ہوا اور اسی میدان میں ایک دن دنیا کا خاتمہ ہوگا۔" سالار لقمہ دیے بغیر نہیں رہ سکا۔
امامہ ہنس پڑی تھی۔
"تم ہنسیں کیوں؟" سالار الجھا۔
"تم تو کہہ رہے تھے تم کو وہ چند احکامات بھی یاد نہیں۔ اب یہ کیسے یاد آگیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

اس میدان میں دین مکمل ہونے کا اعلان کیا تھا۔"

سالار لاجواب ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ امامہ کو کوئی توجیہہ ڈھونڈ کر پیش کرتا اس نے اسی پرسوچ انداز میں اس سے کہا۔

"مجھے لگتا ہے وہ آخری خطبہ دنیا کے ہر انسان کے لیے تھا۔ ہم سب کے لیے۔ آج کے آدم اور حوا کے لیے۔ اگر وہ سارے احکامات جو اس آخری خطبہ کا حصہ تھے ہم سب نے اپنائے ہوتے یا اپنا لیں تو دنیا اس بے سکونی اور بگاڑ کا شکار نہ ہوتی۔ جہاں ہم آج کھڑے ہیں۔ اگر وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی امت کے لیے آخری وصیت تھی تو ہم بہت بدقسمت ہیں کہ ان کی سنت تو ایک طرف ان کی وصیت تک نہیں یاد نہیں۔ عمل کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔"

وہ کچھ جذباتی انداز میں بولتی گئی تھی اور سالار کو پتا تھا گفتگو کہاں جارہی تھی۔ وہ عورت ساڑھے نو سال پہلے بھی اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکال سکتی تھی اور اب بھی نکال رہی تھی۔

"تم کو سود کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات پتا ہیں نا اس آخری خطبے کے؟" وہ تلوار اس کی گردن پر آخری تھی جس سے وہ اب تک بچنے کی کوشش کرتا آیا تھا۔ وہ کس جگہ پر کھڑی اس سے کیا پوچھ رہی تھی۔ ایسی ندامت تو کبھی خانہ کعبہ میں اللہ کے سامنے کھڑا ہو کر اسے نہیں ہوئی تھی جتنی اس وقت جبل رحمت پر اس جگہ کھڑے ہو کر اسے ہوئی تھی جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کے بارے میں احکامات دیے تھے۔ سالار کو چند لمحوں کے لیے لگا جیسے جبل رحمت پر پڑے ہر پتھر نے اس پر لعنت بھیجی تھی۔ پسینہ ماتھے پر نہیں۔ پیروں کے تلووں تک آیا تھا۔ اسے لگا تھا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا تھا اور بس وہ تھے جن کی نظروں میں اس کے لیے ملامت نہیں افسوس تھا۔ پھر وہ وہاں ٹھہر نہیں سکا، سر جھکائے تیز قدموں سے امامہ کا انتظار کیے بغیر جبل رحمت سے اترتا چلا گیا۔ وہ رحمت کا حق دار نہیں تھا تو جبل رحمت پر کیسے کھڑا ہو پاتا۔ اسے نیچے اتر کر محسوس ہوا تھا۔

اور آج امامہ نے وہ سوال حرم میں کر دیا تھا۔ سالار نے اس سے اس بار یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ اس سے کیا مانگے گی۔ اس نے اس کے بالمقابل کھڑے ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حرم کے صحن سے نکلنے سے پہلے امامہ سے کہا تھا۔

"میں سود جب بھی چھوڑوں گا، تمہارے لیے نہیں چھوڑوں گا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چھوڑوں گا۔" امامہ نے اس کے اعلان کو سنا اور پھر بڑی ٹھنڈی آواز میں کہا۔

"تو پھر انہی کے لیے چھوڑ دو۔"

سالار بول نہیں سکا۔ یہ عورت اس کی زندگی میں پتا نہیں کس لیے آگئی یا لائی گئی تھی۔ اس کو اکنامکس اور حساب کے ہر سوال کا جواب آتا تھا۔ سوائے اس ایک جواب کے۔

"تم تو حافظ قرآن ہو سالار۔ پھر بھی اتنی بڑی Violation (خلاف ورزی) کر رہے ہو' قرآن پاک اور اللہ کے احکامات کی۔" امامہ نے اس کے ساتھ حرم سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

"تم جانتی ہو میں انویسٹمنٹ بینکنگ کروا رہا ہوں لوگوں کو اور۔۔۔"

امامہ نے سالار کی بات کاٹ دی۔ "تم کو یقین ہے کہ تم انویسٹمنٹ بینکنگ میں جو بھی کر رہے ہو اس میں سود کا ذرہ تک شامل نہیں ہے؟"

سالار کچھ دیر تک بول نہیں سکا پھر اس نے کہا۔

"تم بینکنگ کے بارے میں میرا موقف (stance) جانتی ہو۔ چلو میں چھوڑ بھی دیتا ہوں یہ۔ بالکل ہر مسلم

پھوڑ دے بیٹوں کو۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔ حرام حلال میں تبدیل ہو جائے گا؟" اس نے بڑی سنجیدگی سے اس سے کہا تھا۔

"ابھی تو ہم حرام کام ہی سہی مگر اس سسٹم کے اندر رہ کر اس سسٹم کو سمجھ رہے ہیں' ایک وقت آئے گا جب ہم ایک متوازی اسلامک اکنامک سسٹم لے آئیں گے اور وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے نہیں آئے گا۔"

"اور ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔" امامہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کم سے کم میری اور تمہاری زندگی میں تو نہیں۔"

"تم ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟"

"سود جن لوگوں کے خون میں رزق بن کر دوڑنے لگ جائے' وہ سود کو مٹانے کا کبھی نہیں سوچیں گے۔"

سالار کو ایک لمحہ کے لیے لگا۔ امامہ نے اس کے چہرے پر طمانچہ دے مارا تھا۔ بات کڑوی تھی۔ پر بات سچی تھی۔ تھوک سکتا تھا۔ پر کڑواہٹ زائل نہیں کر سکتا تھا۔

"میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اگر چیزوں کو بدل نہیں سکتے تو اپنی قابلیت ایک غلط کام کو عروج پر پہنچانے کے لیے مت استعمال کرو۔"

وہ اسی امامہ کی محبت میں گرفتار ہوا تھا' اور آج وہ بیوی بن کر ویسی ہی باتیں دہرا رہی تھی تو سالار کو خفگی ہو رہی تھی یا شاید وہ شرمندگی تھی' جو اسے امامہ سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہنے دے رہی تھی۔ اس نے کیا کیا نہیں کیا تھا۔ اس عورت کو مطیع اور فرماں بردار کرنے کے لیے۔ اور ابھی کچھ دیر پہلے حرم میں وہ اس سے اپنی محبت اور اطاعت کا اعلان بھی کر رہی تھی۔ اپنی غیر مشروط اور دائمی محبت اور وابستگی کا۔ اور اس اعلان کے بعد بھی وہ صحیح اور غلط کی واضح تمیز لیے بیٹھی تھی' جو صحیح تھا وہ محبت اور اطاعت بھی غلط نہیں کہلوا سکتی تھی۔ امامہ ہاشم کی زبان سے۔

سالار سکندر کو اس سے ایک بار پھر حسد ہوا تھا۔ کیا اس کی زندگی میں ایسا کوئی وقت آنا تھا جب وہ امامہ ہاشم کے سامنے وہ بنتا اور بنا ہی رہتا' جو نہ بنتا۔ فرشتہ دکھتا اور دکھتا ہی رہتا' شیطان نہ دکھتا؟

"میں آخری خطبہ پڑھوں گا۔" کہنا وہ کچھ اور چاہتا تھا اور کہہ کچھ اور دیا تھا۔

"مجھے سنوگے؟" امامہ نے اس کا ہاتھ تھامتے حرم سے باہر نکلتے ہوئے بڑے اشتیاق سے کہا۔

"تمہیں زبانی یاد ہے؟" سالار نے بغیر حیران ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

"اتنی بار پڑھا ہے کہ لگتا ہے زبانی دہرا سکتی ہوں۔" وہ اب جیسے کچھ یاد کر رہی تھی۔

"سناؤ۔" سالار نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔" مکہ کی زمین پر کئی سو سال بعد اس خطبہ کو حوا کی زبان سے سننے کی تیاری کر رہا تھا جو کئی سو سال پہلے آخری نبی الزماںؐ نے دین کی تکمیل کا اعلان کرتے ہوئے دنیا بھر کے انسانوں کے لیے دیا تھا۔ صرف مسلمانوں کے لیے نہیں۔



سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں' ہم اسی کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور اسی سے مدد و مغفرت چاہتے ہیں اور اسی کے سامنے توبہ کرتے ہیں اور اسی کے دامن میں اپنے نفس کی خرابیوں اور برے اعمال سے پناہ چاہتے ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے دے' اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو وہ گمراہ کر دے' اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور وہ اکیلا ہے اور

اس کا کوئی شریک نہیں اور میں اعلان کرتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کا بندہ اور رسول ہے۔
اے لوگو! میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں اور تمہیں اس کی اطاعت کا حکم دیتا ہوں اور اپنے خطبے کا آغاز نیک بات سے کرتا ہوں۔ لوگو! سنو میں تمہیں وضاحت سے بتاتا ہوں کیونکہ شاید اس کے بعد کبھی تم سے اس جگہ مل نہ سکوں۔
اچھی طرح سن لو ہم میں سے جو حاضر نہیں، وہ یہ باتیں غیر حاضر لوگوں تک پہنچا دے، ممکن ہے اگلے لوگ یہاں موجود لوگوں کی نسبت ان باتوں کو زیادہ اچھی طرح یاد رکھیں اور ان کی حفاظت فرمائیں۔
اے لوگو۔ اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے اور میں آج سے تمام سود کالعدم قرار دیتا ہوں اور سب سے پہلے وہ سود معاف کرتا ہوں جو لوگوں نے میرے چچا عباس بن عبدالمطلب کو ادا کرنا ہے۔
البتہ تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے۔ جس میں نہ اوروں کا نقصان ہے نہ تمہارا۔



پینتیس سالہ غلام فرید ذات کا کمہار اور پیشے کے لحاظ سے ایک اسکول کا چوکیدار تھا۔ گاؤں میں رہتا تھا لیکن شہر میں بسنے کے خواب دیکھتا تھا اور خواب صرف شہر میں آباد ہونے کا نہیں تھا جو وہ اپنی آنکھوں میں سجائے پھرتا تھا۔ اسے راتوں رات امیر ہونے کا بھی بڑا شوق اور شوق سے زیادہ حسرت تھی۔ ویسا امیر ہونے کا جیسے اس کے کئی دوست گاؤں سے دبئی یا سعودی عرب جا کر ہو گئے تھے۔ اس کے پاس وسائل نہیں تھے۔ ورنہ وہ انہیں دوستوں میں سے کسی کی منت سماجت کر کے خود بھی سعودی عرب یا دبئی جا کر ہی امیر ہوتا۔ وسائل ہوتے تو شاید وہ کسی نہ کسی طرح پیدا کر ہی لیتا مگر اس کی شادی بائیس سال میں ہی اس کی ماں نے اپنے بھائی کی بیٹی سے نہ کر دی ہوتی۔
وہ سات بہنوں کا اکلوتا اور سب سے بڑا بھائی تھا جس کی شادی کا خواب ماں نے اس کے پیدا ہوتے ہی سجایا تھا۔ دھوم دھام کی شادی نے اگلے کئی سال غلام فرید کو وہ قرض اتارنے میں مصروف رکھا۔ جو اس کی شادی پر ماں باپ نے خاندان والوں سے چھوٹی بڑی رقمیں کر کے لیا تھا اور جب وہ قرض ختم ہوا تو اسے بہنوں کی شادی پر قرض لینا پڑا اور اس بار خاندان والوں سے قرض نہ ملنے پر اس نے سود پر قرض لیا تھا۔ سات بہنیں تھیں اور ہر سال کسی نہ کسی کی شادی آ جاتی۔ پچھلا قرضہ وہیں کھڑا رہتا۔ مزید قرضہ سر پر چڑھ جاتا اور پھر ایک کے بعد ایک بچے کی پیدائش۔۔۔
غلام فرید کو کبھی کبھار لگتا اس کا نام غلام قرض ہونا چاہیے تھا غلام فرید کے بجائے۔
شادی کے تیرہ سالوں میں قرض کی ہر رقم تو اس نے اتار دی تھی لیکن سود کی رقم اس کے سر پر اس کے سر کے بالوں سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ اس کی بیوی بھی اسی اسکول کی عمارت میں صفائی کا کام کرتی تھی۔ جس اسکول میں وہ چوکیدار تھا۔ دو بڑے بچے بھی گاؤں کی دو دکانوں پر کام کرتے تھے۔
ایک چائے کے ایک کھوکھے پر کام کرتا تھا۔ دوسرا ایک ورکشاپ میں موٹر سائیکلیں دھونے کا کام۔ دس گیارہ سال کی عمر میں وہ دو بچے یہ ہی کر سکتے تھے۔ انہیں تنخواہ نہیں دیہاڑی ملتی تھی اور اسی دیہاڑی سے گھر کی دال روٹی چلتی تھی کیونکہ نسیمہ اور غلام فرید کی تو ساری کی ساری تنخواہ ہر ماہ سود میں چلی جاتی تھی۔ کئی سالوں سے سود کی وہ سل پھر بھی ان کے سینے سے ہٹتی ہی نہ تھی۔ بوجھ تھا کہ بڑھتا ہی گیا تھا۔
غلام فرید کو دن میں چوکیداری کرنی ہوتی تھی، پر عجیب بات تھی کہ نیند اسے راتوں کو بھی نہیں آتی تھی۔ وہ صرف اتنا پڑھا لکھا تھا کہ جمع تفریق اور جوڑ توڑ کر کے قرآن پاک پڑھ لیتا۔ اور اس کی زندگی بس جمع تفریق ہی رہ گئی تھی اور اس جمع تفریق نے قرآن پاک کو جوڑ توڑ کر کے پڑھنے کا وقت بھی کھا لیا تھا۔
پینتیس سال کی عمر میں بھی کئی بار اسے لگتا وہ پچاس سال کا تھا۔ کئی بار اسے لگتا وہ سو سال کا ہو گیا تھا اور کئی بار

اسے لگتا وہ مر گیا ہے۔ مرنے والا ہے' مر رہا ہے' پتا نہیں وہ عمر کا کون سا سال ہوتا ہے، جو ایسی کیفیت کے ساتھ گزرتا ہے۔

کئی بار وہ سوچتا تھا' وہ ایک رات چپکے سے بیوی بچوں کے ساتھ گاؤں سے بھاگ جائے۔ کسی دوسرے شہر۔ دنیا کے کسی دوسرے کونے پہ۔ جہاں پر وہ اس سود سے آزاد ہوتے۔ غلام فرید جی بھر کر رات کو سوتا اور پھر وہ اس کی۔ بیوی اور بچے جو کماتے خود پر خرچ کرتے۔ تین وقت کا ڈھیر سارا کھانا پکاتے اور کھاتے پیٹ بھر کے۔ اور جو بچتا وہ کسی کو دے دیتے۔ برتن چاٹ چاٹ کر اور روٹی کے آخری لقمے سے پلیٹیں پونچھنے کے بجائے۔

سال میں دس بیس نہیں تو دو چار تو اچھے سے جوڑے سلواتے اپنے اور سب بچوں کے لیے۔ گاؤں کے امیر خاندانوں کے بچوں اور افراد کی اترن پہننے کے بجائے۔ اور لنڈا بازار سے خریدے ہوئے کپڑے پہن کر عیدیں گزارنے کے بجائے۔

اور پھر ایک گھر بناتے۔ اپنا گھر۔ پکی اینٹوں اور پلستر والا پکی چھت والا گھر۔ شاید ڈبل اسٹوری ہی بنوا لیتے۔ اور صحن کے فرش میں چپس ڈلواتے۔ پانی کی موٹر لگواتے۔ شاید اے سی بھی۔ اور فریج۔ ٹی وی۔ اچھا سا فرنیچر۔ اور لش پش کرتے پردے۔ اور چینی کے برتن اور پھر وہ اس کے بچے زمین کے بجائے میز اور کرسیوں پر بیٹھ کر کانٹے اور چمچے سے ان چینی کے برتنوں میں کھانا کھاتے۔

غلام فرید کے خوابوں کی ریل گاڑی ساری رات چھکا چھک چلتی رہتی۔ ہر اسٹیشن پر رکتی کچھ اور خواب اٹھاتی اور پٹری پر پھر دوڑنے لگتی اور پھر دوڑتے دوڑتے وہیں آ کر رک جاتی' جہاں سے وہ چلی تھی۔ رات گزر جاتی۔ زندگی بھی گزر رہی تھی اور غلام فرید کو پتا تھا وہ اپنی رات کو خوابوں میں گزار سکتا ہے' زندگی کو نہیں۔

گاؤں سے بھاگ جانا آسان تھا۔ مگر ان لوگوں سے چھپ جانا نہیں۔ جن سے وہ قرضہ لیے بیٹھا تھا اور قرضہ ادا ہونے کے باوجود سود میں گاؤں میں کھڑا تھا۔ وہ لوگ اس کی چمڑی ادھیڑنے پر قادر تھے اور اس کو کتوں کے سامنے بھی پھنکوا دیتے۔ اور غلام فرید بچوں اور ایک بیوی کے ساتھ ساری عمر کے لیے کہاں چھپ جاتا کہ دوبارہ کسی کو نظر نہ آتا۔ اپنے اور اپنی بیوی کے خاندان والوں کو ہمیشہ کے لیے کیسے چھوڑ دیتا کہ دوبارہ کبھی رابطہ ہی نہ کرتا۔

راہ فرار غلام فرید کے پاس نہیں تھی اور اگر کوئی تھی تو صرف ایک۔ وہ امیر ہو جاتا اور پتا نہیں کیوں' لیکن غلام فرید کو لگتا تھا کہ وہ امیر ہو سکتا تھا۔

امیر ہونا اس وقت غلام فرید کی زندگی کی واحد ترجیح تھی۔ حالات اور ہوتے اور اس کا بال بال سود میں نہ بندھا ہوتا تو شاید غلام فرید اس وقت اپنی زندگی کو مختلف ترجیحات کے ساتھ گزار رہا ہوتا۔ وہ اس اسکول کے دوسرے نچلے درجے کے ملازمین کی طرح تنخواہ اور چھوٹی موٹی محنت مزدوری میں بڑی اچھی زندگی گزار رہا ہوتا' اپنے بچوں کے بارے میں سوچ رہا ہوتا' کس کو کیا پڑھانا ہے اور کیا مستقبل بنانا ہے' مگر غلام فرید کو اس سود نے کسی قابل نہیں چھوڑا تھا جو اسے ورثے میں ملا تھا اور جس نے اسے عمر سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔



اے لوگو! میں نے تمہارے پاس ایسی چیز چھوڑی ہے کہ تم اسے مضبوطی سے تھامے رہو گے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ یعنی اللہ کی کتاب اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور تم لوگ غلو سے بچو کیونکہ تم سے پہلے لوگ اسی کے باعث ہلاک ہوئے۔



چنی غلام فرید کی آخری اولاد تھی۔ اگر نسیمہ کی زندگی رہتی اور وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہو گیا تو شاید وہ آخری اولاد

نہ ہوئی بیچ کی اولاد ہوتی اور اس کا نمبر کیا ہوتا اس کا اندازہ کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر وہ غلام فرید کی آخری اولاد زندگی کی ایک اسٹیج پر اس کی واحد اولاد رہ جانے والی تھی' یہ غلام فرید کو نہیں پتا تھا' پتا ہوتا تو شاید وہ واحد اولاد بھی زندہ نہ رہ پاتی۔

ڈیڑھ سالہ چنی کو اس کی پیدائش سے پہلے کئی بار مارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ نسیمہ کو جب اپنے نویں بار حاملہ ہونے کا اندازہ ہوا تو اس نے گاؤں میں دائی سے ملنے والی ہر اس چیز کا استعمال کیا تھا' جس سے اسقاط حمل ہو جاتا۔ چنی کو تو کچھ نہیں ہوا' لیکن خود نسیمہ ان مضر صحت ادویات کے استعمال سے کئی قسم کی بیماریوں کا شکار ہو گئی۔

چنی کو مارنے کی ایک کوشش تب بھی کی گئی' جب ساتویں مہینے طبیعت زیادہ خراب ہونے پر نسیمہ کو شہر جانا پڑا اور وہاں الٹرا ساؤنڈ میں اپنے ہونے والے بچے کی جنس کا اسے پتا چل گیا تھا۔ نویں اولاد لڑکی ہونے کا مطلب تھا کہ اس کی بیٹیوں کی تعداد چھ ہو جاتی۔ نسیمہ کو جیسے غش آ گیا تھا۔ سات بہنیں بیاہتے بیاہتے غلام فرید اور اس کا یہ حال ہو گیا تھا۔ چھ بیٹیاں بیاہتے ہوئے انہیں اب کون سے دوزخ سے گزرنا تھا۔ نسیمہ نے سوچا تھا اور اس خیال نے آخری دو مہینے میں ہر وہ بد احتیاطی کرنے پر اسے اکسایا تھا جس سے وہ بچی جان سے چلی جاتی۔

یہ نسیمہ کی خوش قسمتی تھی کہ ان سب بے احتیاطیوں میں وہ خود جان سے ہاتھ نہیں دھو بیٹھی۔

چنی صحت مند پیدا ہوئی تھی۔ یعنی صحت کے اس معیار کے مطابق صحت مند تھی جس پر اس کے سب بہن بھائی اور ماں باپ پورا اترتے تھے۔ اس کا پیدا ہونا جیسے اس کی اپنی ذمہ داری بن گئی تھی۔ (اس کی ماں کی لاتعداد اسقاط حمل کی کوششوں کے بعد) اور جیسے اس کا پلنا بھی اس کی اپنی ہی ذمہ داری ہو گیا تھا۔ ماں کو ہفتے بعد ہی واپس ڈیوٹی پر جانا تھا۔ یہ کوئی شہر نہیں تھا کہ میٹرنیٹی لیو جیسی سہولت سے اسے نوازا جاتا اور وہ بھی نویں بچے کی پیدائش پر۔ باپ کے پاس پہلے ہی اپنے بچوں کے لیے وقت نہیں تھا۔ وقت شاید ایک بہت بڑا حق تھا اور ایسا حق جس سے کوئی وہاں واقف ہی نہیں تھا۔ غلام فرید کو اگر احساس ہوا تھا تو صرف یہ کہ اس کے سر اور کندھوں کا بوجھ ایک بچی کی پیدائش نے بڑھا دیا تھا۔

دو کمروں کا وہ گھر جو غلام فرید کا واحد خاندانی ترکہ تھا۔ چنی کی پیدائش کے چند ہفتوں بعد سود میں گروی رکھا گیا تھا۔ اسکول نے غلام فرید کی اس مشکل وقت میں مدد کی اور اسے ایک کوارٹر مل گیا رہائش کے لیے' جس میں صرف ایک کمرہ تھا' مگر وہ بھی غنیمت تھا۔ فی الحال غلام فرید کو۔ پر چنی' ماں باپ کو اس حوالے سے خوب یاد رہی کہ اس کی پیدائش نے انہیں بے گھر کیا تھا۔ چنی کی خوش قسمتی یہ تھی کہ روایتی انداز میں اس پر منحوس کا لیبل نہیں لگا اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ غلام فرید کو اپنے ہر بچے کی پیدائش پر کوئی نہ کوئی بڑی خبر ملتی رہی تھی۔ اسے کوئی بھی ایسی اولاد یاد نہیں تھی جس کے دنیا میں آنے سے غلام فرید کی زندگی میں کوئی آسانی پیدا ہوئی تھی۔

نحیف و نزار اور سانولی رنگت والی چنی سارا دن گرمی میں بان کی ایک چارپائی پر ایک کپڑے پر پڑی رہتی۔ روتی' کلبلاتی' پھر خود ہی انگوٹھا چوستی اور سو جاتی۔ کسی بہن کو خیال آ جاتا تو چنی کو اس کے سستے سے پلاسٹک کے اس فیڈر میں دودھ مل جاتا' جس میں اس کے ہر بہن بھائی نے دودھ پیا تھا اور جو اتنے سالوں میں اتنا گدلا میلا اور گھس گیا تھا کہ اس میں ڈالا ہوا دودھ بھی میلا دکھنے لگتا۔ وہ بلاشبہ جراثیم کی آماجگاہ تھا' لیکن چنی کی خوش قسمتی یہ تھی کہ وہ غریب کی اولاد تھی اور غریب کی اولاد بھوک سے مرجاتی ہے۔ گندگی سے نہیں۔

پورے دن میں ایک آدھ بار ملنے والا دودھ کا فیڈر وہ واحد غذا تھا جس پر چنی سارا دن گزارتی تھی۔ اس سے زیادہ خوراک غلام فرید کے گھر میں کسی بچے کو نہیں ملی تھی۔ سوائے اس کے پہلے دو بیٹوں کے' نسیمہ شام کو تھکی ہاری آتی اور جو بھی روکھی سوکھی ملتی وہ کھا کر کمرے کے ایک کونے میں اپنے کسی بچے سے ٹانگیں دبواتی لیٹتی اور وہیں سو

جاتی اسے خیال ہی نہیں آتا تھا کہ اس کمرے میں اس کی ایک نوزائیدہ اولاد بھی تھی۔ ہاں کبھی کبھار وہ اس وقت چنی کو ضرور دیکھنے بیٹھ جاتی تھی۔ جب بڑی بچیوں میں سے کسی کو اچانک وہم ہوتا کہ چنی شاید مر گئی تھی کیونکہ وہ کبھی سانس نہیں لے پاتی اور کبھی اس کا جسم اتنا ٹھنڈا اور نیلا ہو جاتا کہ نسیمہ کو لگتا شاید اس کا بوجھ واقعی کم ہو گیا تھا۔ لیکن۔۔۔ لیکن چنی اپنے ماں باپ کے سب ارمانوں پر پانی پھیرتے ہوئے پھر سانس لینا شروع کر دیتی۔ پتا نہیں یہ اس کی ڈھٹائی تھی یا غلام فرید اور اس کی بیوی کی وہ بدقسمتی جس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

بھوک واحد مسئلہ نہیں تھا جس کا سامنا چنی کو تھا۔ ایک اور مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ سارا سارا دن پیشاب اور پاخانہ میں لتھڑی پڑی رہتی اور اس کی بہنیں ماں کی ہدایات کے باوجود اسے صاف نہیں کرتیں۔ ان کا قصور نہیں تھا۔ سات اور نو سال کی بچیوں کو اگر چنی سے کراہت محسوس ہوتی تھی تو ٹھیک ہی ہوتی تھی۔ نسیمہ گھر آتی پہلے ان دونوں کو پیٹتی پھر چنی کو دھوتی اور بچوں میں اسے کسی کو پکڑا دیتی۔ چنی کے جسم پر کھجلی ہوئی اور پھر اس حد تک ہوئی کہ اس کی جلد جیسے عادی ہو کر خود ہی ٹھیک ہو گئی تھی شاید چنی کی یادداشت کام کرتی تو وہ بتا سکتی کہ اسے سب سے زیادہ تکلیف کس چیز سے ہوتی تھی بھوک سے جسم پر پھیلے ہوئے ان کربی دانوں سے جو جلدی خارش میں تبدیل ہو گئے تھے اور ان سے کئی بار پانی بھی رسنے لگتا تھا یا پھر اس گندگی سے جس میں وہ سارا دن اور ساری رات لتھڑی پڑی رہتی تھی اور کوئی اس کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں ہر جگہ سب رات کو بے سدھ آڑھے ٹیڑھے سوئے ہوئے ہوتے تھے صرف غلام فرید تھا جو باہر چارپائی ڈال کر کبھی بیٹھا اور کبھی لیٹا رہتا تھا۔

کئی ہفتوں تک کسی کو یہ خیال ہی نہیں آیا کہ چنی کی پیدائش رجسٹر کروانی چاہیے۔ اس کا کوئی نام ہونا چاہیے۔ چنی نام اسے اس کی ماں نے اس کی جسامت دیکھ کر دیا تھا اور سب اسے اسی نام سے پکارنے لگے تھے پھر گاؤں میں حفاظتی ٹیکوں کی مہم والے آئے تو غلام فرید کو چنی کا نام اور پیدائش رجسٹر کروانی پڑی۔ غلام فرید نے اس کی پیدائش رجسٹر کروانے کے لیے بھی تین سو روپے کسی سے ادھار لیے تھے اور وہ ادھار بھی گاؤں کی مسجد کے امام سے۔۔۔ اور ان تین سو روپے نے غلام فرید کی زندگی میں کیا کردار ادا کرنا تھا۔ اس کا اندازہ نہ غلام فرید کو تھا نہ ہی اس کی اس نویں اولاد کو جسے رجسٹر میں کنیز کا نام دیا گیا تھا۔ یہ نام چنی کے لیے کس نے چنا تھا کسی کو یاد نہیں۔ شاید محلے کی کسی بوڑھی عورت نے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ انسان پر نام کا اثر آتا ہے اور عورت کے لیے سب سے اچھی صفت اطاعت اور فرماں برداری ہے جو کنیز نام رکھے جانے پر چنی میں بھی کوٹ کوٹ کر بھر جائے گی۔

گاؤں میں کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ کنیز ولد غلام فرید عرف چنی کو نہ اس نام کی ضرورت تھی نہ اس صفت کی۔ اسے اللہ تعالیٰ نے کسی اور کام کے لیے چنا تھا۔



"دیکھو میں نے حق پہنچا دیا ہے۔ بس اگر کسی کے پاس امانت رکھوائی گئی ہے تو وہ اس بات کا پابند ہے کہ امانت رکھوانے والے کو امانت پہنچا دے اور بے شک تم سب کو اللہ کی طرف لوٹنا اور حساب دینا ہے۔"



امام صاحب سے تین سو روپے کا وہ قرض ہی تھا جس نے غلام فرید کو پہلی بار یہ احساس دلایا کہ امیر بننا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا وہ سمجھتا تھا اور اس گاؤں کے اور بہت سے لوگ تھے جو اسی کی طرح کئی سال یہ خواب پالنے کے بعد بالآخر وہ آسان راستے یا راستہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے تھے جن سے امیر بنا جا سکتا تھا۔

امام مسجد بھی ان ہی لوگوں میں شامل تھے' جو صرف آخرت میں ہی جنت نہیں چاہتے تھے' بلکہ اس دنیا میں بھی انہیں جنت کا عیش و آرام چاہیے تھا۔ انہوں نے غلام فرید کو تین سو روپے کا قرض تو دے دیا تھا' مگر ساتھ اس کی یہ ذمہ داری بھی لگادی تھی کہ وہ اس اسکول کے مالکان سے مسجد کے لیے چندہ لے کر انہیں دے۔

غلام فرید نے جہاں مولوی صاحب کو یہ یقین دلایا تھا کہ اسکول کے مالکان بڑے فیاض ہیں' وہاں یہ جھوٹ بھی بولا تھا کہ وہ غلام فرید کو بہت مانتے تھے' اور وہ گاؤں میں کسی کو کچھ بھی دینے دلانے کے لیے غلام فرید سے اکثر مشورہ کرتے تھے اور مسجد کے لیے چندہ تو غلام فرید کے لیے ویسے ہی بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

مولوی صاحب نے غلام فرید کی باتوں پر اندھا اعتماد تو یقیناً ''نہیں کیا تھا' ورنہ ایک ہزار روپے کی وہ رقم جو اس نے قرض مانگی تھی' اس کے بجائے صرف تین سو روپے اسے نہ دیتے۔ لیکن انہوں نے پھر بھی کسی نہ کسی حد تک غلام فرید کی بات پر یقین ضرور کیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ اسکول کے مالکان غلام فرید کو شکل سے تو پہچانتے ہوں گے' لیکن اس کا نام کوئی نہیں جانتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسکول میں کوئی ایک چوکیدار نہیں تھا۔ اسکول کی وسیع و عریض عمارت میں مختلف اوقات میں تین' چار چوکیدار پہرہ دیتے تھے اور غلام فرید ان میں سے ایک تھا اور غلام فرید کو اپنی حیثیت اور اوقات کے بارے میں پتا بھی تھا۔

مولوی صاحب سے تو غلام فرید نے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن مولوی صاحب کے بار بار اصرار پر حیلے بہانے بنانے کے بعد اس نے بالآخر اسکول کے مالکان سے مسجد کے لیے چندے کی بات کر ہی لی تھی۔ اسکول کے اس مالک نے مولوی صاحب کو بلوا کر اس چندے کے حوالے سے یہ تفصیلات معلوم کی تھیں کہ انہیں چندہ کس لیے چاہیے تھا اور مولوی صاحب نے چھوٹے موٹے اخراجات کی ایک لمبی تفصیل اسکول کے مالک کے سامنے رکھ دی تھی۔ اسکول کے مالک نے ان اخراجات کی تفصیلات جاننے کے بعد مسجد کے لیے نہ صرف اس وقت کچھ رقم مہیا کی تھی بلکہ ہر مہینے اسکول کے اخراجات کے لیے ایک معقول رقم دینے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ مولوی صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ ان کا تین سو روپے کا دیا قرض ہزاروں میں تبدیل ہو کر ان کی طرف لوٹا تھا۔ غلام فرید جیسے معمولی آدمی کی حیثیت ان کی نظر میں ایک دم بڑھ گئی تھی اور غلام فرید کو اس گاؤں میں پہلی دفعہ کسی نے عزت دی تھی' وہ بھی گاؤں کی مسجد کے امام نے۔ جس نے نہ صرف اس جمعے کے خطبے میں لاؤڈ اسپیکر پر اسکول کی انتظامیہ اور مالکان کی دردمندی کے قصیدے پڑھے تھے بلکہ غلام فرید کی کوششوں کو بھی سراہا تھا۔ جس کی کوششوں سے مسجد کے پاس یہ رقم آئی تھی۔

مسجد میں جمعے کے خطبے کے دوران بیٹھے ہوئے غلام فرید کا سینہ خوامخواہ میں چوڑا ہو گیا تھا اس دن۔

اسکول کے مالک نے یہ رقم ہر ماہ غلام فرید کے ذریعے ہی مولوی صاحب کو پہنچانے کا وعدہ کیا تھا اور اس کے ساتھ غلام فرید کو یہ ذمہ داری بھی سونپ دی تھی کہ وہ مسجد میں اس رقم کے صحیح استعمال پر نظر رکھے اور یہ دیکھتا رہے کہ وہ رقم ان چیزوں پر خرچ ہو رہی ہے۔ جن اخراجات کا ذکر اس فہرست میں تھا جو مولوی صاحب نے اسکول کے مالک کو دی تھی۔ غلام فرید کو سونپی جانے والی اس ذمہ داری نے مولوی صاحب کے لیے اس کی اہمیت کو دوگنا کر دیا تھا۔ اگر مولوی صاحب نے یہ رقم واقعی مسجد کے انتظام و انصرام پر لگانی ہوتی تو انہیں غلام فرید کی اس طرح عزت و قدر کرنے اور جتانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ مگر مولوی صاحب کو یہ رقم اپنے لیے چاہیے تھی

———— گاؤں کے دوسرے زمین دار اور صاحب حیثیت لوگوں سے وصول پائے جانے والے چندوں کی طرح جن کے بارے میں کوئی مولوی صاحب سے استعمال کے حوالے سے سوال جواب نہیں کرتا تھا۔ البتہ ان سب لوگوں کو جمعہ کی نماز کے خطبے کے دوران لاؤڈ اسپیکر پر اس چندے کا اعلان چاہیے ہوتا تھا اور مولوی

صاحب اس اعلان کو قصیدوں کے تزکے کے ساتھ پیش کرنے کے ماہر تھے۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ کسی نے مسجد کے لیے دیے جانے والے پیسوں کے حوالے سے جواب دہی کا سسٹم بنانے کی کوشش کی تھی جو مولوی صاحب کو قابل قبول نہیں تھا، لیکن چندے کی ماہانہ رقم کو ٹھکرانے کا حوصلہ بھی ان میں نہیں تھا۔

اسکول کا مالک وہاں دوسرے مہینے گیا تھا اور مولوی صاحب نے غلام فرید کے ساتھ مل کر مسجد میں ہونے والی تمام مرمتیں اسے دکھائی تھیں۔ وہ مطمئن ہو کر لوٹا تھا۔ مگر یہ صرف اسی مہینے ہوا تھا۔ دوسرے مہینے غلام فرید کے ہاتھ سے وصول پائی جانے والی رقم کا مولوی صاحب نے کیا کیا تھا اس کا غلام فرید کو اندازہ بھی نہیں ہو سکا۔ وہ مسجد میں دو چار بار گیا تھا اور اس کا خوب اچھی طرح استقبال کیا تھا مولوی صاحب نے اپنے گھر سے کھانا، پانی، چائے بھی اسے دی۔ تھی، لیکن اس ماہانہ چندے کے استعمال کے بارے میں صرف آئیں بائیں شائیں ہوتا رہا تھا۔ غلام فرید کو چندے کے صحیح استعمال میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی اس کے لیے عام حالات میں اتنا ہی کافی ہوتا کہ مولوی صاحب اسے گوشت کھلا رہے تھے مگر اصل مسئلہ یہ تھا کہ غلام فرید اپنے ہاتھ سے ہر مہینے بیس ہزار کی رقم جس مشکل سے مولوی صاحب کو دے رہا تھا وہ غلام فرید ہی جانتا تھا۔ مگر اسے خوف تھا تو صرف اللہ کا۔ کہ وہ مسجد کا پیسہ تھا اور وہ اس کا امانت دار بن گیا تھا، مگر اس پیسے کا مولوی صاحب کے ہاتھوں غائب ہونا اس سے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

مولوی صاحب نے اس کے دل سے مسجد کے پیسے کے لیے اللہ کے خوف کو ختم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ اگر مولوی صاحب چندے کے پیسے کو لوٹ کے مال کی طرح استعمال کر سکتے تھے تو پھر غلام فرید کو بھی حق تھا۔ اس کی بھی ضروریات تھیں۔ وہ بھی مجبور تھا۔ اس کے سر پر تو قرضہ بھی تھا۔ غلام فرید چار مہینے اپنے دل میں یہ ہمت پیدا کرتا رہا کہ وہ مولوی صاحب سے اس سلسلے میں بات کرے اسے ابھی اس پیسے کا مسجد میں صحیح استعمال نہیں چاہیے تھا اور نہ ہی اسے مولوی صاحب کے اس مرغ مسلم میں دلچسپی رہ گئی تھی جو وہ اس کی اپنے گھر آمد پر اس کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ اسے ان پیسوں میں سے اپنا حصہ چاہیے تھا۔ وہ رقم آدھی تو بھی ہونی چاہیے تھی اور اگر آدھی نہیں ہو سکتی تھی تو کم از کم پانچ ہزار تو اسے ملنا ہی چاہیے تھا۔ اسکول کے مالک نے پہلے مہینے کے بعد کسی مہینے مسجد میں جا کر مولوی صاحب سے ان چیزوں کو دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی جن پر اس کی رقم خرچ ہوئی تھی۔ مسجد میں صفوں کے بجائے قالین، رنگ روغن اور باتھ روم میں ٹائلز لگوا کر اسے یہ اطمینان ہو گیا تھا۔ کہ اس نے مسجد کو اب بہتر کر دیا تھا اور اس کے ہر ماہ بھیجے گئے پیسوں سے مسجد میں قرآن پاک کی تعلیم کے لیے آنے والے بچوں اور مسجد کے اور دوسرے بنیادی قسم کے اخراجات پورے ہوتے رہیں گے۔

غلام فرید نگران تھا کہ وہ یہ دیکھے کہ مسجد میں آنے والے بچوں کو قرآن پاک، قاعدے اور سپارے مسجد ہی مہیا کرے اور اسی طرح کی دوسری چیزیں غلام فرید کو دوسرے مہینے ہی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ مسجد میں آنے والے کسی بچے کو مسجد سے کچھ نہیں مل رہا تھا اور اگر کچھ مل رہا تھا تو بالکل مفت تو نہیں مل رہا تھا۔ یہ اس کے اضطراب اور بے چینی کا آغاز تھا اور یہ دونوں کیفیات انتہا پر تب پہنچ گئی تھیں، جب چوتھے مہینے مولوی صاحب نے نیا موٹر سائیکل خرید لیا تھا۔

غلام فرید انہیں اگلے مہینے کے پیسے دینے گیا تھا اور ان کی نئی موٹر سائیکل کو دیکھ کر وہ اس قدر حسد اور خفگی کا شکار ہوا تھا کہ وہ ان پیسوں کا ذکر کیے بغیر صرف موٹر سائیکل کی مٹھائی کھا کر آ گیا تھا۔ مولوی صاحب نے ماہانہ چندے کا پوچھا تھا کیونکہ وہ مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ غلام فرید نے مسجد میں بیٹھ کر اس دن پہلا جھوٹ بولا تھا اور کہا تھا کہ اسکول کا مالک ملک سے باہر چلا گیا ہے اور ابھی واپس نہیں آیا۔ مولوی صاحب کو یک دم فکر ہوئی تھی

کہ اسکول کا مالک فوری طور پر واپس نہ آیا تو پھر اس مہینے کے پیسے کون دے گا؟ غلام فرید کے پاس سوال کا جواب نہیں تھا۔ البتہ اس نے مولوی صاحب کو اسکول کے مالک کا فون نمبر دے دیا تھا جو غلط تھا۔ مولوی صاحب مطمئن ہو گئے تھے کہ اگر کچھ دن تک وہ چندہ نہ پہنچا تو وہ اسکول کے مالک سے خود بات کر لیں گے۔

غلام فرید بیس ہزار کی رقم جیب میں لیے اس دن ایک عجیب سی کیفیت کے ساتھ مسجد سے نکلا تھا۔ یوں جیسے اس کی لاٹری نکلی تھی۔ اسے پتا تھا مولوی صاحب ہر سال مختلف چیزوں سے اکٹھی ہونے والی رقم کو اپنی رقم کے طور پر گاؤں کے انہیں سود خوروں کو بزنس میں سرمایہ کاری کرنے کے لیے دیتے تھے جو سود خور غلام فرید جیسے ڈھیروں ضرورت مندوں کو وہ رقم دے کر انہیں ساری عمر کے لیے چوپایہ بنا دیتے تھے۔ مولوی صاحب بظاہر یہ ظاہر کرتے تھے کہ انہیں یہ پتا ہی نہیں کہ وہ جن لوگوں کے بزنس میں مسجد کی رقم کی سرمایہ کاری کر کے ماہانہ ایک فکسڈ رقم وصول کر رہے ہیں ان کا اصلی اور بنیادی بزنس کیا تھا۔ وہ اس ماہانہ فکسڈ رقم کو بھی سود نہیں منافع کہتے تھے، کیونکہ انہوں نے کچھ امیر لوگوں کے منافع بخش بزنس میں شراکت داری کی تھی اور کیونکہ ان لوگوں کو بھی بزنس میں نقصان نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے مولوی صاحب کو بھی نہیں ہوتا تھا۔ مولوی صاحب یہ توجیہہ نہ بھی پیش کرتے تب بھی گاؤں میں کوئی کمی کمین کسی امام مسجد سے جا کر یہ سوال و جواب نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مسجد کے پیسے کو اپنی ذاتی رقم ظاہر کر کے کسی سود خور کے بزنس میں کیسے لگا اور اس کا منافع کھا رہے تھے۔

یہ سوال کوئی چندہ دینے والا کرتا تو شاید مولوی صاحب کو قرآن و حدیث میں سے اپنے مطلب کی کوئی چیز رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرنی پڑ جاتی اور وہ اس میں ماہر تھے۔ دین میں اپنی مرضی کا ردوبدل ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لیکن اب ان کی بد قسمتی یہ ہوئی تھی کہ سود میں جکڑے ہوئے ایک شخص کو مولوی صاحب کو چندے کی رقم سونپنے کی ذمہ داری دے دی گئی تھی۔

مولوی صاحب نے ایک ڈیڑھ ہفتہ مزید رقم کا انتظار کیا اور پھر کچھ بے صبری میں وہ نمبر گھما دیا جو غلام فرید نے دیا تھا۔ نمبر آف تھا۔ دو دن وقفے وقفے سے کئی بار فون کرنے پر بھی جب وہ نمبر آف ہی ملا تو مولوی صاحب غلام فرید کے پاس جانے کے بجائے اسکول پہنچ گئے تھے اور وہاں پہنچ کر انہیں یہ خبر مل گئی تھی کہ اسکول کا مالک کئی دن پہلے اسکول سے ہو کر جا چکا تھا۔ مولوی صاحب کا پارہ اب ہائی ہو گیا تھا۔ انہوں نے غلام فرید کو اس کے کوارٹر پر جا لیا تھا اور جب غلام فرید نے انہیں ایک بار پھر پہلے کی طرح یہ کہہ کر ٹرخانے کی کوشش کی کہ مالک ابھی تک نہیں آیا تو مولوی صاحب نے اس کے جھوٹ کی پول کھول دی تھی اور اسے کہا تھا کہ وہ اسکول سے ہو کر آئے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔ مالک ہمیشہ کی طرح مہینے کے شروع میں ہو کر جا چکا تھا۔ غلام فرید نے جوابا" مولوی صاحب سے کہا کہ "ہو سکتا ہے وہ آیا ہو لیکن اس دن غلام فرید کی چھٹی تھی اور اس کی ملاقات مالک سے نہیں ہوئی۔"

مولوی صاحب اس پر کچھ زیادہ بگڑے تھے اور انہوں نے غلام فرید سے کہا کہ اس نے انہیں مالک کا نمبر بھی غلط دیا ہے وہ اس کو فون کرتے ہیں مگر وہ نمبر آف ہے اور وہ اب مالک کا نمبر اسکول کی انتظامیہ سے ہی لیں گے اور پھر خود اس سے بات کریں گے۔

غلام فرید کو اب اندازہ ہو گیا کہ وہ مولوی صاحب سے مزید جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اسے ان سے اب دو ٹوک لیکن صاف صاف بات کرنی تھی۔ اور پھر اس نے بالآخر مولوی صاحب کو یہ جتا ہی دیا تھا کہ اسے اس رقم میں سے ہر مہینے اپنا حصہ چاہیے تھا۔ کچھ لمحوں کے لیے مولوی صاحب کو جیسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ گاؤں کا ایک کمی کمین گاؤں کی مسجد کے "امام صاحب" سے کیا مطالبہ کر رہا تھا اور جب انہیں یقین آیا تو ان کے منہ سے جیسے غصے سے جھاگ نکلنے لگا تھا۔ ان کے ساتھ ایسی جسارت پہلی بار کسی نے کی تھی۔

"تم اللہ کے گھر کے لیے ملنے والے ہدیے سے اپنا حصہ مانگ رہے ہو دوزخی انسان!"

انہوں نے غلام فرید کو ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ غلام فرید دوزخ جیسی زندگی گزارتے گزارتے اب موت کے بعد دوزخ سے کیا ڈرتا۔

"اللہ کے گھر کے پیسے اگر اللہ کے گھر پر لگتے تو کبھی نہ مانگتا مولوی صاحب!" اس نے بھی تن کر ان سے کہہ دیا تھا۔ مولوی صاحب نے جواباً" اسے دھمکایا کہ وہ اسکول کے مالک سے بات کریں گے اور اسے اس کا کچا چٹھا سنا دیں گے۔

جواباً" غلام فرید نے انہیں دھمکایا کہ وہ بھی اسکول کے مالک کو یہ بتادے گا کہ مولوی صاحب چندے والی رقم کو خود استعمال کررہے ہیں اور انہوں نے مسجد کے پیسوں کو ایک سود خور کو دے رکھا ہے اور وہ اس کا سود کھا رہے ہیں بلکہ وہ پورے گاؤں میں انہیں بدنام کرے گا۔ ان کے پول کھول کھول کر۔ مولوی صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ ان کا بس چلتا تو غلام فرید کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے کتوں کے سامنے ڈال دیتے۔ انہیں یہ علم ہی نہیں تھا کہ وہ کمینہ ان کے اتنے بڑے راز سے واقف تھا۔ وہ کچھ دیر اسے جی بھر کے برا بھلا کہتے رہے۔

اس دن مولوی صاحب نے غلام فرید کو دنیا بھر کی ہر وہ گالی دے ڈالی جو انہوں نے بھی کہیں سنی تھی، لیکن غلام فرید ڈھٹائی سے اپنے پیلے دانتوں کے ساتھ منہ کھول کر ان کے سامنے ہنستا رہا۔

"ٹھیک ہے مولوی صاحب مجھے تو کیڑے ہی پڑیں گے، سانپ اور بچھو قبر میں میری لاش نوچیں گے اور مجھے مرتے دم کلمہ بھی نصیب نہیں ہوگا۔ میرے ساتھ جو بھی مرنے کے بعد ہوگا لیکن آپ کے بیس ہزار تو آپ کی زندگی میں ہی بند ہوجائیں گے۔ اسی مہینے سے۔ میں مالک کو کہہ دیتا ہوں کہ میں نے اس لیے آپ کو پیسے نہیں دیے کیونکہ آپ تو مسجد میں پیسے لگا ہی نہیں رہے تو سوچیں زیادہ نقصان دوزخی کا ہوا کہ جنتی کا؟"

غلام فرید نے خود زندگی میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس جیسا کمین مسجد کے امام کے ساتھ بھی اس طرح بات کرے گا۔ لیکن کسی نے ٹھیک کہا ہے۔ پیسہ بڑی کتی چیز ہوتی ہے۔ اچھے اچھوں کو کتا بنا دیتی ہے۔ بڑے بڑوں کو بھونکنے پر مجبور کردیتی ہے۔

سب گالم گلوچ اور لعنت ملامت کے بعد اس دن مولوی صاحب نے واپس گھر پہنچ کر اپنی بیوی سے مشورہ کیا تھا اور پھر اگلے دن بڑے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ مولوی صاحب نے غلام فرید کے ساتھ پندرہ ہزار وصول کرنے پر اتفاق کرلیا تھا اور اس سے بھی بڑی اعلا ظرفی کا مظاہرہ انہیں اس وقت کرنا پڑا، جب غلام فرید نے انہیں بتایا کہ وہ اس مہینے کے بیس ہزار پہلے ہی خرچ کرچکا تھا۔ یہ پچھلے چار مہینوں کے پیسوں سے اس کا کمیشن تھا۔ مولوی صاحب کا دل چاہا وہ غلام فرید نامی اس۔۔۔ کو اپنے ہاتھوں سے گاؤں کے بیچ کھیتوں میں اسی طرح پھانسی پر لٹکادیں، جس طرح لوگ کھیتوں میں پرندوں کو ڈرانے والے بجوکا لٹکاتے ہیں۔ مگر پھر انہیں یاد آیا تھا کہ سال کے آخر میں انہیں اپنی بیٹی کی شادی کرنی تھی اور وہ زمین بھی خریدنی تھی جس کا بیعانہ وہ کچھ دن پہلے دے کر آئے تھے۔ اس لیے وہ بھی چند گالیوں کے بعد بے حد ٹھنڈے مزاج کے ساتھ وہاں سے چلے گئے تھے۔

غلام فرید کو یقین نہیں آیا تھا کہ بیٹھے بٹھائے اس کو ہر ماہ تنخواہ سے کچھ ہی تھوڑی رقم ملنے لگے گی اور وہ رقم اگر وہ سود والوں کو دیتا رہتا تو بہت جلدی اس کا سب سود ختم ہونے والا تھا۔

غلام فرید کے خوابوں کی گاڑی اس دن پہلی بار دن کے وقت بھی چھکا چھک چلنے لگی تھی۔ مگر اسے اس وقت اندازہ نہیں تھا کہ وہ مولوی صاحب سے دشمنی پال کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر بیٹھا تھا۔ سود لینے سے بھی بڑی غلطی۔



"اے لوگو! عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ تم نے اللہ کو گواہ بنا کر ان کو خود پر حلال کیا اور انہیں اپنی امان میں لیا ہے۔ تمہیں اپنی عورتوں پر حقوق حاصل ہیں بالکل ویسے ہی جیسے تمہاری عورتوں کو تم پر حقوق حاصل ہیں۔ ان پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کے ساتھ دوستی نہ کریں جسے تم پسند نہیں کرتے اور تمہاری حرمت کی نگہبانی کریں اور اگر وہ تمہاری فرماں بردار رہتی ہیں تو پھر یہ ان کا حق ہے کہ تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور ان کے نان نفقے کی ذمہ داری اٹھاؤ۔"



احسن سعد نے تین سال کی عمر میں اپنی ماں کو اپنے باپ کے ہاتھوں پہلی بار پٹتے دیکھا تھا۔ اس نے کوئی "بے حیائی" کا کام کیا تھا، وہ بے حیائی کا کام کیا تھا، وہ تین سال کی عمر میں جان نہیں سکا تھا لیکن اپنے باپ کی زبان سے بار بار ادا ہونے والا وہ لفظ اس کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔

اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کے چہرے پر دو تھپڑ مارے تھے۔ اس کا بازو مروڑا تھا اور پھر اسے دھکا دے کر زمین پر گرا دیا تھا۔ اسے وہ چاروں غلیظ گالیاں بھی یاد تھیں جو اس کے باپ نے اس کی ماں کو دی تھیں۔ اپنی ماں کا رونا بھی اور اس پر باپ کا چلانا بھی۔

وہ خوف کے مارے کمرے میں موجود صوفے کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ کیونکہ اسے پہلا خیال یہ آیا تھا کہ اس کا باپ اب اسے پیٹے گا۔ اس کے باپ نے اسے چھپتے دیکھا تھا۔ اس نے شادی کے پانچ سال میں کئی بار اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھایا تھا لیکن آج اس دن اس نے پہلی بار اپنی اولاد کے سامنے اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔

مار کٹائی کے اس سین کے فوراً بعد اس کے باپ نے اسے صوفے کے پیچھے سے بڑے پیار سے پچکارتے ہوئے نکالا تھا۔ پھر وہ اسے گود میں اٹھائے گھر سے باہر لے گیا تھا۔ اگلے دو گھنٹے وہ باپ کے ساتھ اپنی پسند کی جگہوں پر پھرتا اور پسند کی چیزیں کھاتا رہا تھا۔ لیکن اس کا ذہن صرف ان دو تھپڑوں، ایک دو مکے اور چار گالیوں میں پھنسا رہا تھا۔ اور اس کے بعد اس کی ماں کا اس طرح رونا جس طرح وہ کوئی ضد پوری نہ ہونے پر روتا تھا۔

"تم تو میرے پیارے بیٹے ہو۔ سب سے زیادہ پیارے ہو مجھے۔" اس کا باپ اسے ان دو گھنٹوں کے دوران مسلسل بہلاتا، پچکارتا رہا تھا۔ وہ باپ کے گلے بھی لگتا رہا، باپ کے کہنے پر اس نے باپ کے چہرے کو چوما بھی اور وہ باپ کی باتوں کا جواب دینے کی بھی کوشش کرتا رہا۔ لیکن وہ اس دن پہلی بار اپنے باپ سے خوف زدہ ہوا تھا۔

دو گھنٹے کے بعد گھر واپسی پر اس نے اپنی ماں کو معمول کے کاموں میں مصروف پایا تھا۔ وہ کھانا پکا رہی تھی۔ جیسے روز پکاتی تھی۔ اس کے باپ کو چائے پلا رہی تھی۔ جیسے روز دیتی تھی۔ اور اس سے اور اس کی بڑی اور چھوٹی بہن سے بات کر رہی تھی جیسے روز کرتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ آج اس کے چہرے پر انگلیوں کے چند نشان تھے، اور اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ اور وہ اس سے آنکھیں نہیں ملا رہی تھی۔ اس دن اس کا دل اپنی ماں کے پاس سونے کو نہیں چاہا۔ اور اس کا دل ان کھلونوں سے کھیلنے کو بھی نہیں چاہا جو اس کے باپ نے اسے دلائے تھے۔ وہ اپنی پانچ سالہ بہن کے بستر میں سونے کے لیے گیا تھا اور بہت دیر تک نہیں سو سکا تھا۔ اس نے کسی بڑے کو کسی دوسرے بڑے کو پہلی بار "مارتے" دیکھا تھا اور اس دوسرے "بڑے" کو کسی مزاحمت کے بغیر مار کھاتے دیکھا تھا۔ یہ بچوں کے جھگڑے میں تو نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ لڑتا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو پیٹتے تھے یہ ون سائیڈڈ مقابلہ۔

اگلے چند دن وہ پریشان رہا تھا اور خاموش بھی۔ اس کی ماں نے اس کی خاموشی نوٹس کی یا نہیں لیکن اس کے باپ نے کی تھی اور وہ اس کی وجہ سے واقف تھا۔ وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا اور

اب وہ باپ سے ہلکا سا کھنچا تھا تو اس کے لیے اسے نظر انداز کرنا ناممکن تھا۔ اگلے کئی دن اس کا باپ اس پر معمول سے زیادہ توجہ دیتا رہا' اس کے زیادہ نخرے اٹھاتا رہا' زیادہ فرمائشیں پوری کرتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ نارمل ہو گیا تھا۔ اور وہ پہلی اور آخری بار تھا جب اس کے باپ نے اس کی ماں کو مارنے کے بعد اس کے اتنے نخرے اٹھائے تھے۔ بعد کے سالوں میں اس کی ماں کئی بار اس کے سامنے پٹی تھی۔ (آنسو بہائے بغیر۔ وہ جیسے اب عادی ہو گئی تھی۔) اس نے ان غلیظ گالیوں کو معمول کے الفاظ میں تبدیل ہوتے دیکھا تھا جب بھی اس کے باپ کو غصہ آتا تو وہ ان الفاظ کا بے دریغ استعمال کرتا۔ اور وہ اب صوفے کے پیچھے نہیں چھپتا تھا۔ وہ ایک خاموش تماشائی کی طرح اپنی بہنوں کے ساتھ یہ سارا منظر دیکھا کرتا تھا۔ اور ایسے ہر منظر کے بعد اس کا باپ اسے شام کی سیر کے لیے لے جایا کرتا تھا۔ اور اس سیر کے دوران وہ اسے بتایا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ بے حیائی کے کاموں کو کتنا ناپسند کرتا ہے اور عورت سب سے زیادہ بے حیائی کے کاموں میں ملوث ہے۔ اور بے حیائی کے کام کرنے والوں کو سزا دینی چاہیے۔

پانچ سال کی عمر میں اسے قرآن پاک کی بہت ساری آیات اس کے باپ نے یاد کروائی تھیں۔ بہت ساری دعائیں بھی۔ اور اس کے ساتھ بے حیائی کے کاموں کی وہ فہرست بھی جس کے کرنے پر کسی عورت کو سزا دینا واجب ہو جاتا تھا اور بے حیائی کے ان کاموں میں شوہر کی نافرمانی' پردے کی پابندی نہ کرنا' کسی نامحرم سے ملنا یا بات کرنا' گھر سے اجازت کے بغیر جانا' کسی قسم کا فیشن یا سنگھار کرنا' شوہر سے اونچی آواز میں بات کرنا' کھانا دیر سے بنانا یا بدمزہ بنانا' ٹی وی دیکھنا' میوزک سننا' نماز روزے کی پابندی نہ کرنا' اس کے دادا دادی کی خدمت نہ کرنا اور بہت سے دوسرے کام تھے جو اسے مکمل طور پر ازبر تھے کیونکہ بے حیائی کے ان سارے کاموں پر اس نے کبھی نہ کبھی اپنی ماں کو پٹتے دیکھا تھا۔

وہ جن قاری صاحب سے قرآن پاک پڑھتا تھا ان سے ماں باپ کے ادب اور خدمت کے بارے میں قرآنی احکامات بھی سنتا تھا' خاص طور پر ماں کے حوالے سے۔ مگر اس کا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ عورت جو بے حیائی کے بہت سارے کام کرتی ہے اور اسے سزا ملتی ہے وہ اس کی عزت کیسے کرے۔ آخر کیسے کر سکتا تھا۔ سوال اس کے پاس اور بھی بہت سے تھے' لیکن ان کے جواب ایک پانچ سال بچہ اپنے باپ کے ساتھ واک کرتے ہوئے اور اسلام کے حوالے سے لمبی لمبی تقریریں سنتے ہوئے نہیں پوچھ سکتا تھا۔ آسان تشریح وہی تھی جو اس نے کی تھی۔ وہ بڑا ہو کر مرد بننے والا تھا' ایک ایسا مرد جسے کسی بھی عورت کو بے حیائی کے کاموں سے منع کرنے کے لیے اس پر ہاتھ اٹھانے اور اسے وہ گالیاں دینے کا حق تھا جو اس کا باپ اسے عام زندگی میں اپنے ساتھ کھیلنے یا پڑھنے والے کسی بچے کو دینے سے سختی سے منع کرتا تھا۔ اور اس کا آئیڈیل اس کا باپ تھا۔ باریش داڑھی کے ساتھ اسلامی شعائر پر سختی سے کاربند' پانچ وقت نماز پڑھنے والا ایک بے حد خوش اخلاق' نرم خو' خوش گفتار انسان اور سعادت مند بیٹا۔ جو اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ مغرب میں گزارنے کے باوجود ایک "مثالی" اور "عملی" مسلمان تھا۔ وہ بھی بڑا ہو کر ویسا ہی مثالی اور عملی مسلمان بننا چاہتا تھا۔



"اے لوگو تمہارے خون' تمہارے مال ایک دوسرے کے لیے اسی طرح محترم ہیں جیسے آج کا یہ دن (عرفہ کا دن) یہ مہینہ (ذی الحجہ) اور یہ شہر (مکہ)
خبردار زمانہ جاہلیت کی ہر رسم اور طریقہ آج میرے قدموں کے نیچے ہے اور جاہلیت کے خون معاف کر دیے گئے ہیں اور پہلا خون جو میں اپنے خونوں سے معاف کرتا ہوں وہ ابن ربیعہ حارث کا خون ہے۔
دیکھو میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ پھر سے ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

✺ ✺ ✺

غلام فرید کی زندگی میں صرف چند اچھے مہینے آئے تھے۔ ایسے مہینے جن میں پہلی بار اس نے راتوں کو سکون سے سونا سیکھا تھا۔ مہینے کے آخر میں سود کی قسط جمع کرانے کے لیے پیسوں کی جمع تفریق کیے بغیر۔ اور وہی چند مہینے تھے، جن میں شادی کے ابتدائی دنوں کے بعد پہلی بار نسیمہ اور غلام فرید نے مل کر کچھ خواب بنے تھے اچھے دنوں کے خواب جب ان کے سر سے وہ سود ختم ہو جائے گا۔ پانچ ہزار کی وہ اضافی رقم جیسے ایک نعمت مترقبہ تھی ان کے لیے۔ اور وہی کچھ دن تھے جب غلام فرید اور اس کی بیوی نے اپنے بچوں کے بارے میں بھی سوچا تھا کہ وہ جب بڑے ہوں گے تو ان کے سر پر قرض کی وہ تلوار نہیں لٹک رہی ہوگی جو اب لٹک رہی تھی۔

غلام فرید بہت معصوم تھا یا شاید بہت بے وقوف۔ سو یہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے زندگی میں پہلی بار کوئی بہت بڑی کامیابی حاصل کرلی تھی۔ جیسے امیر بننے کی طرف پہلا قدم اٹھا لیا تھا اس نے۔ وہ پانچ ہزار کی رقم کو پنشن بنا بیٹھا تھا، جو ساری عمر کسی رکاوٹ کے بغیر اسے ملتی رہتی۔

مولوی صاحب کے ساتھ غلام فرید نے جو کچھ کیا تھا اس کے بعد مولوی صاحب کی نیندیں کئی دن اڑی رہی تھیں۔ بیس ہزار کی رقم بیٹھے بٹھائے پندرہ ہزار رہ گئی تھی اس کا صدمہ تو تھا ہی تھا لیکن ساتھ اس بات کا بھی اندیشہ انہیں ہو گیا تھا کہ مسجد کی رقم کو سود خوری کے کاروبار میں لگانے کی خبر اگر گاؤں میں کسی طرح پھیل گئی تو اور کچھ ہو گا یا نہیں انہیں مستقبل میں چندے ملنا بند ہو جائیں گے۔

بدنامی کی تو خیر انہیں زیادہ فکر نہیں تھی۔ بدنامی ہو بھی جاتی تو بھی کوئی انہیں امامت سے اور اس مسجد سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ مسجد انہیں باپ دادا کی جاگیر کی طرح ورثے میں ملی تھی اور گاؤں کے لوگوں کو صحیح طرح سے وضو کرنا تو آتا نہیں تھا۔ وہ امام مسجد کو دینی لحاظ سے کیا جانچتے اور اگر ہٹا بھی دیتے تو ان کی جگہ پر لاتے کس کو۔

بیوی مولوی صاحب کو سودی کاروبار میں لگائی رقم واپس لینے نہیں دے رہی تھی۔ یہ وہ پہلا خیال تھا جو غلام فرید کی دھمکی کے بعد مولوی صاحب کو آیا تھا کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے اپنی رقم واپس لے لیں تاکہ کم از کم غلام فرید کی ایسی دھمکی کو سچ ثابت کرنے پر وہ اسے جھوٹا تو ثابت کر دیتے۔

بیوی کا کہنا تھا اور کون سی ایسی جگہ ہے جہاں پیسہ لگانے پر 25 فی صد منافع مل جائے۔ بینک والے تو آٹھ یا نو فی صد بھی رو رو کر دیتے تھے۔ اور وہ یہ رقم کاروبار سے نکال لیں گے تو اس منافع کی کمی کہاں سے پوری کریں گے۔ بیٹیوں کے جہیز کہاں سے بنیں گے۔ ان کی شادی کے اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے۔ مسجد کی امامت سے تو تین وقت کی روٹی ہی پوری ہو سکتی تھی۔ باقی اخراجات کے لیے وہ آمدنی ناکافی تھی۔

مولوی صاحب کو بیوی کی باتیں تو سمجھ میں آرہی تھیں اور وہ اس کے خدشات سے بھی واقف تھے، لیکن خود اب ان کو شدید دھڑکا لاحق ہو گیا تھا کہ کسی دن غلام فرید پندرہ ہزار کی باقی رقم بھی دینے سے انکاری نہ ہو جائے اور ان کا یہ خدشہ بالکل ٹھیک نکلا تھا۔

دو ماہ بعد غلام فرید نے اپنے گھر کے کچھ ناگزیر اخراجات کی وجہ سے مولوی صاحب کو بیس ہزار کی رقم دینے سے معذرت کرلی تھی اور ان سے اگلے ماہ کی مہلت مانگ لی تھی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب مولوی صاحب نے گالم گلوچ اور لعنت ملامت نہیں کی تھی اسے۔ انہوں نے اسے جہنم سے ڈرانے کے بجائے اس کی زندگی خود جہنم بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی کو بتائے بغیر گاؤں کے اس شخص سے اپنی رقم کا مطالبہ یہ کہہ کر کیا تھا کہ مسجد کی تزئین و آرائش کے لیے فوری طور پر ایک بڑی رقم چاہیے اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ اپنی رقم نکال کر اس میں سے کچھ مسجد میں چندہ کر دیں۔ جو جواب انہیں ملا تھا وہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

اس آدمی نے انہیں رقم واپس کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ فی الحال رقم کاروبار میں لگی ہوئی ہے اور وہ اگلے دو تین سال تک اس کا منافع تو دے سکتا ہے لیکن اصل رقم واپس نہیں کر سکتا۔ مولوی صاحب کو وہاں کھڑے کھڑے دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ انہوں نے پانچ لاکھ کی رقم اس آدمی کو دی ہوئی تھی، اور وہ کچھ کمیشن وغیرہ کٹوانے کے بعد تقریباً "ستر اسی ہزار روپیہ ہر ماہ وصول کر رہے تھے اور اب ایک دم اس آدمی کے انکار نے ان کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔

وہ پچھلے کئی سالوں سے اس آدمی کے پاس یہ سرمایہ کاری کر رہے تھے شروع میں دس بیس ہزار سے شروع ہونے والا یہ بزنس آہستہ آہستہ پانچ لاکھ رقم تک چلا گیا تھا۔ اور اب وہ آدمی کہہ رہا تھا کہ وہ اصل رقم نہیں دے سکتا تھا' صرف سود دے سکتا تھا۔

اس دن غلام فرید سے مولوی صاحب کی نفرت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ گھر جا کر انہوں نے بیوی کو یہ قصہ بھی سنایا تھا' وہ بھی ان ہی کی طرح دل تھام کے رو ئی تھی۔ مگر پھر اس نے مولوی صاحب کو یہ کہتے ہوئے تسلی دی۔

"چلیں مولوی صاحب دو تین سال بعد ہی دے گا' روے تو دے گا نا۔ اور شکر ہے اس نے منافع دینے سے انکار نہیں کیا۔ میں تو پہلے ہی آپ کو روک رہی تھی۔ کہ ابھی اپنی رقم واپس لینے کی ضرورت نہیں ہے لیکن پتا نہیں آپ کو کیا سوجھی کہ لگی لگائی روزی پر لات مارنے چل پڑے۔" اسے مولوی صاحب سے یہ بات کہتے ہوئے یہ پتا نہیں تھا کہ وہ لگی لگائی روزی خود ہی انہیں لات مار دینے والی تھی۔

اگلے مہینے ایک بار پھر مولوی صاحب کو غلام فرید سے پیسے نہیں ملے اور اس مہینے انہیں اس ساہوکار نے منافع کی رقم بھی نہیں دی۔ ایک ماہ پہلے مولوی صاحب کے رقم کے مطالبے نے جیسے اسے چوکنا کر دیا تھا کہ وہ پارٹی ٹوٹنے والی تھی اور جب وہ پارٹی ٹوٹنے والی تھی تو وہ اس کو منہ بھر بھر کے منافع کیوں کھلاتا۔ اب اس کی باری تھی' دیا گیا سارا منافع واپس وصول کرنے کی۔ لیکن اس نے مولوی صاحب سے یہ باتیں نہیں کی تھیں اس نے مولوی صاحب سے بس فی الحال چھ ماہ کی مہلت مانگی تھی اور یہ کہا تھا کہ چھ ماہ کے بعد وہ چھ ماہ کا منافع اکٹھا انہیں لوٹا دے گا لیکن فی الحال اس پر شدید مالی بحران آیا تھا اور اس نے مولوی صاحب سے نہ صرف دعا کی درخواست کی تھی بلکہ کوئی قرآنی وظیفہ بھی مانگا تھا اپنے کاروبار میں برکت کے لیے۔

مولوی صاحب کو ٹھنڈے پسینے آ گئے تھے اس کی باتیں سن کر۔ اور کچھ بعید نہیں تھا کہ ہارٹ فیل ہی ہو جاتا ان کا۔ وہ پل بھر میں لکھ پتی سے ککھ پتی ہوئے تھے۔ اور وہ بھی دن دہاڑے۔ یہ غلام فرید نہیں تھا۔ گاؤں کا کمی کمین جسے وہ اس کے دروازے پر منہ بھر بھر کر گالیاں دیتے رہتے اور وہ ڈھیٹوں کی طرح دانت نکال کر کھڑا رہتا۔ یہ گاؤں کا "ساہوکار" تھا۔ ایک بزنس مین۔ جو مالی بحران کے باوجود شان دار گھر میں بیٹھا تھا اور اس کے آگے پیچھے نوکر پھر رہے تھے۔ مولوی صاحب چوں بھی کرتے تو وہ انہیں اٹھوا کر گھر سے باہر پھنکوا دیتا اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ گاؤں کی مسجد کے امام صاحب تھے۔

مولوی صاحب چپ چاپ وہاں سے تو اٹھ کر آ گئے تھے لیکن انہوں نے اپنے اس مالی نقصان کا سارا کا سارا غصہ غلام فرید پر اتارا تھا۔ وہی تھا جو ان کی تباہی کا ذمہ دار تھا تو اب ضروری تھا کہ وہ بھی تباہ و برباد ہوتا۔

انہوں نے اسکول سے اس کے مالک کا نمبر لیا تھا اور پھر اسے فون کر کے غلام فرید کے اوپر جی بھر کے الزامات لگائے تھے۔ مالک کا ردعمل فوری تھا اور متوقع تھی۔ وہ پہلی فرصت میں گاؤں آیا تھا اور مولوی صاحب سے ملاقات کے بعد غلام فرید کی صفائیاں اور وضاحتیں' معافیاں سننے کے باوجود اس نے اسے نوکری سے فارغ کر دیا تھا۔

غلام فرید کے سر پر جیسے پہاڑ آ گرا تھا۔ صرف اسے نوکری سے فارغ نہیں کیا گیا تھا' اس کی بیوی کو بھی نوکری

سے نکال دیا گیا تھا اور ان سے کوارٹر بھی خالی کروا لیا گیا تھا۔
گیارہ لوگوں کا وہ خاندان چھت سے بے چھت ہو گیا تھا۔ وسائل اتنے نہیں تھے کہ وہ گاؤں میں بھی کوئی جگہ کرائے پر لے سکتے۔ شاید لے ہی لیتے اگر انہیں زندگی کی گاڑی کے ساتھ قرضے کی ریل گاڑی نہ کھینچنی پڑتی۔ وہ گاؤں تھا وہاں نوکریاں نہیں ملتی تھیں۔ لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے یا اپنا کاروبار یا پھر محنت مزدوری۔
غلام فرید اور اس کی بیوی کو لوگ خوش قسمت سمجھتے تھے کہ ان پڑھ ہونے کے باوجود انہیں ایک اسکول میں اتنے اچھے پیسوں پر کام بھی ملا ہوا تھا اور کوارٹر بھی۔ مگر اس گاؤں میں اور ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں پر کام کرنا خوش قسمتی قرار پاتا۔ مولوی صاحب کے طفیل غلام فرید پورے گاؤں میں اپنی بیوی سمیت بدنام ہو چکا تھا۔ وہ ایک چور تھا جس نے اللہ کے پیسوں کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ گاؤں والوں نے مولوی صاحب کے بار بار دہرائے گئے قصے سن سن کر غلام فرید کا جیسے سوشل بائیکاٹ ہی کر دیا تھا۔ غلام فرید نے بھی مولوی صاحب کے کارنامے لوگوں کو بتانے کی کوشش کی تھی لیکن کسی نے ایک چور پر یقین نہیں کیا تھا۔ یقین کرتے بھی کیسے وہ ”مولوی صاحب“ پر الزام لگا رہا تھا۔ ”مولوی صاحب“ پر۔ اور وہ بھی غبن اور بددیانتی کے الزام میں بیوی سمیت نوکری سے نکالے جانے کے بعد۔ مولوی صاحب بری الذمہ اور معصوم قرار پائے تھے۔
پتا نہیں وہ کون سا لمحہ تھا جب غلام فرید نے اپنا ذہنی توازن کھونا شروع کیا تھا۔ بھوک اور تنگ دستی نے اس کا دماغ خراب کیا تھا۔ گاؤں والوں کی باتوں اور طعنوں نے لڑکپن میں داخل ہوتی بیٹیوں پر پڑتی گاؤں کے لڑکوں کی گندی نظروں اور اپنی بے بسی نے۔ یا پھر ان سود خوروں کی دھمکیوں اور چکروں نے جو غلام فرید کو سود کی قسطیں ادا کرنے کے قابل نہ رہنے پر بار بار اس احاطے کے ٹوٹے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر مارپیٹ کرتے جہاں جانوروں کے ایک باڑے کے برابر غلام فرید نے بھی لکڑی کی چھت ڈال کر وقتی طور پر اپنے خاندان کو پناہ دی تھی۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا غلام فرید کو۔ اور یہ واقعی پتا نہیں چلتا کہ انسانوں کو ہو کیا جاتا ہے جب وہ اپنے خونی رشتوں کو اپنے ہی ہاتھ سے ختم کر دیتے ہیں۔
چنی ایک سال کی تھی جب غلام فرید نے ایک رات اپنے خاندان کے نو کے نو افراد کو ذبح کر دیا تھا۔ چنی واحد تھی جو بچ گئی تھی اور وہ بھی شاید اس لیے بچ گئی تھی کیونکہ پاگل پن کے اس لمحے میں غلام فرید اپنی اولاد کی گنتی ہی بھول گیا تھا۔ چنی کو کبھی اس نے گود میں اٹھا کر دیکھا نہیں تھا تو وہ اسے یاد آتی بھی تو کیسے۔ پھر اسے کبھی اپنے بہن بھائیوں کا اتنا خون لگ گیا تھا کہ ان کے برابر بے سدھ سوئے ہوئے بھی غلام فرید کو وہ مری ہوئی ہی لگی ہو گی۔
نو انسانوں کو مارنے کے بعد غلام فرید نے اپنی جان نہیں لی تھی۔ وہ زندہ تھا لیکن کب۔ زندہ تو انسان عزت نفس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جو غلام فرید کی کب کی چھن چکی تھی۔ خاندان کو مار دینا جیسے وہ حل تھا جو ایک ان پڑھ شخص نے غربت اور قرض سے نجات کے لیے نکالا تھا جب کوئی حل ہی باقی نہیں رہا تھا۔
ایک سال کی چنی کو کچھ یاد نہیں تھا۔ نہ قاتل نہ مقتول۔ اس کو یاد تھا تو بس ایک چہرہ جو اسے وہاں سے لے گیا تھا۔



”اے لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی نیا پیغمبر یا نبی آئے گا نہ تمہارے بعد کوئی نئی امت۔ میں تمہارے پاس اللہ کی کتاب اور اپنی سنت چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اگر تم ان پر عمل کرو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔“



وہ رات ہاشم مبین کی زندگی کی مشکل ترین راتوں میں سے ایک تھی۔ صرف انہیں کی نہیں کسی بھی باپ کے

لیے مشکل ترین ہوتی' انہیں لگ رہا تھا' انہوں نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا کچھ دیر پہلے۔ مگر خواب انسان جاگتی آنکھوں سے کیسے دیکھ سکتا ہے اور خواب میں بھی انسان کی اپنی اولاد اپنے والدین کے ساتھ ایسی بے رحمی کا سلوک کیسے کر سکتی ہے کہ انسان ایک لمحے کے لیے اس کے اپنی سگی اولاد ہونے پر شبہ کرے۔

وہ اپنی اسٹڈی میں بیٹھے اپنی جائیداد اور بینک اکاؤنٹس اور دوسرے اثاثہ جات کی فائلز اپنے سامنے میز پر ڈھیر لیے صرف یہ سوچ رہے تھے کہ یہ سب ان کے ساتھ کیوں ہو رہا تھا انہوں نے تو اپنی اولاد کو ہمیشہ "حلال" کھلایا تھا۔ پھر ایسی کون سی غلطی یا گناہ ہوا تھا کہ وہ آج وہاں کھڑے تھے۔

اولاد ماں باپ کے مرنے کے بعد ترکے پر لڑے تو سمجھ میں آتا ہے مگر اولاد ماں باپ کی زندگی میں ہی ان کے سامنے اسی طرح جائیداد کے حصوں اور پائی پائی پر لڑے جیسے ماں باپ مر گئے ہوں تو ماں باپ کو کون سی صلیب پر چڑھنا پڑتا ہے۔ ہاشم مبین آج کل اسی صلیب پر چڑھے ہوئے تھے۔

بڑھاپا بڑی ظالم چیز ہوتا ہے۔ اور تخت پر بیٹھے بوڑھے بادشاہ کو تخت پر بیٹھے ہوئے اپنا ولی عہد بھی اچھا نہیں لگتا' اپنی اولاد سے بھی خوف آتا ہے۔ ہاشم مبین نے بھی ساری زندگی ایک بادشاہ ہی کی طرح گزاری تھی۔ وہ سب پر حاوی رہے تھے اور ان کی کسی بھی اولاد کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ ہاشم مبین کے سامنے سر بھی اٹھا سکے۔ اور اب اسی ہاشم مبین پر وہی فرماں بردار اولاد انگلیاں بھی اٹھا رہی تھی اور گستاخانہ باتیں بھی کر رہی تھی۔ انہوں نے ساری زندگی اس اولاد کو ایک بہترین لائف اسٹائل دینے کے لیے بہت سارے سمجھوتے کیے تھے۔ اور سمجھوتے کرتے ہوئے وہ صحیح اور غلط کی تمیز ہی بھول گئے تھے۔ آج بیٹھے تھے تو سب کچھ یاد آ رہا تھا پوری زندگی جیسے ایک فلم کی طرح ان کے سامنے چل رہی تھی۔ زندگی میں کب کب انہوں نے ضمیر کا سودا کیا تھا وہ بھی یاد آ رہا تھا۔ کب کب انسانیت کا اور کب اپنے مذہب کا۔

وہ بے چین ہو کر اٹھ کر کمرے میں پھرنے لگے۔ مال و زر کا وہ ڈھیر جو انہوں نے اپنا مذہب بیچ اور بدل کر اکٹھا کیا تھا وہ شاید اسی قابل تھا کہ ان کی اپنی اولاد ہی اسے لوٹ لیتی۔

وہ کھڑکی کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ پچھتاوے کی ایک اسٹیج وہ ہوتی ہے جب انسان پچھتاوا نام کا لفظ بھی نہیں سننا چاہتا۔ یہ اسے گالی کی طرح لگتا ہے۔ انہیں بھی لگ رہا تھا۔ پچھتاوا کیسا؟ ایسا کیا ہی کیا تھا' جس پر پچھتاوا ہوتا۔۔؟ جو بھی کیا تھا سوچ سمجھ کر ہی کیا تھا غلطی کہاں ہوئی۔؟ ساری زندگی بہترین آسائشوں میں گزری' اگر کچھ غلط ہوتا تو کہیں تو ٹھوکر لگتی۔؟ وہ ایک کے بعد ایک سوال سے جیسے اپنی زندگی غلطیوں اور گناہوں کی چھان پھٹک کر رہے تھے۔ چیک لسٹ میں اپنی ٹھوکریں نظر انداز کر کے خود کو درست قرار دے رہے تھے آنکھیں بند کیے۔

اور پھر زندگی کے اس لمحے پر انہیں ایک غلطی اور اس ایک غلطی کے ساتھ امامہ یاد آئی تھی۔ انہوں نے اسے ذہن سے جھٹکا۔ پھر جھٹکا پھر جھٹکا۔ اور پھر وہ رک گئے۔ فائدہ کیا تھا اس کوشش کا۔ پہلے بھی اس میں کامیاب ہوئے تھے جو آج ہو جاتے۔

کتنے سال ہوئے تھے انہیں اسے دیکھے۔ اس سے ملے۔ آخری بار۔ آخری بار انہوں نے اسے اس ہوٹل میں دیکھا تھا سالار کے ساتھ۔ اور آخری بار انہوں نے اس کی آواز کب سنی تھی۔ اس سے کب بات کی تھی۔؟ انہیں یہ بھی یاد تھا۔ یہ کیسے بھول جاتا۔؟ وسیم کی موت پر۔

کتنے سال۔۔۔ کتنے سال گزر گئے تھے۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔ آنکھوں میں آنے والی نمی صاف کی۔ پتا نہیں یہ نمی کس کے لیے آئی تھی وسیم کے لیے۔؟ یا امامہ کے لیے۔؟

آنے والے ہفتے میں سب کچھ بکنا اور بٹنا تھا۔ یہ گھر۔ فیکٹری۔ زمین۔ پلاٹ' اکاؤنٹس میں پڑا پیسہ۔ گاڑیاں۔

سب اثاثے اگر کچھ بٹنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ تو وہ ہاشم مبین اور ان کی بیوی تھیں' جنہیں کوئی بھی اثاثہ نہیں سمجھ رہا تھا اور کوئی بھی ساتھ رکھنے پر تیار نہیں تھا۔ وہ اکیلے رہ سکتے تھے امامہ کے بعد بھی رہے تھے اور وسیم کے بعد بھی رہ رہے تھے۔ نوکر رکھ سکتے تھے اپنے لیے۔ بڑا گھر نہ سہی کوئی چھوٹا گھر لے سکتے تھے' جائیداد کی تقسیم کے بعد ان کے اور ان کی بیوی کے حصے میں اتنا کچھ تو ضرور آجاتا۔ لیکن پریشانی اب پیسے کی نہیں تھی زندگی کی تھی۔ آخر زندگی اتنی لمبی کیوں ہو جاتی ہے؟۔ انسان بڑھاپے کی سیڑھی پر قدم رکھے یہ سب دیکھ کر اور سہہ کر ہی کیوں مرتا ہے۔ پہلے ہی کیوں نہیں مر جاتا۔ ہاشم مبین نے اس وقت جو سوچا تھا۔ وہ کبھی پہلے نہیں سوچا تھا۔

صدمہ یہ نہیں تھا کہ اپنا سب کچھ اولاد کو سونپ کر ہاتھ جھاڑ کر الگ ہوتا تھا۔ اور ان میں بیٹے اور بیٹیاں سب شامل تھے۔ صدمہ یہ تھا کہ یہ تقسیم ایسے ہو رہی تھی۔۔ اس ذلت آمیز انداز میں۔

یہ وہی رات تھی جب انہوں نے ایک بار امامہ سے ملنے کا سوچا تھا۔ یہ وہی رات تھی جب انہوں نے سوچا تھا' کہ شاید انہیں باقی اولادوں کی طرح امامہ کو بھی اپنی جائیداد میں سے حصہ دینا چاہیے۔ اور وہ یہ جانتے تھے وہ اس سوچ پر عمل کبھی نہیں کر سکتے۔ وہ امامہ کو اپنی جائیداد کا وارث نہیں بنا سکتے تھے کیونکہ اس کے لیے انہیں نے بہت سارے اعتراف کرنے پڑتے۔ عمر کے اس حصے میں ہاشم مبین نے پہلی دفعہ یہ بھی سوچا کہ وہ کچھ اعتراف کرلیں۔ شاید ضمیر کا کچھ بوجھ کم ہو جائے۔ گناہ کا بوجھ گھٹتا تو اب ممکن نہیں رہا تھا۔



"اور شیطان سے خبردار رہو۔ وہ اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ اس زمین پر اس کی پرستش کی جائے گی لیکن وہ اس بات پر راضی ہے کہ تمہارے درمیان فتنہ و فساد پیدا کرتا رہے اس لیے تم اس سے اپنے دین وایمان کی حفاظت کرو۔"



مویشیوں کے اس احاطے میں اپنے خاندان کی لاشوں کے پاس چند گھنٹے بیٹھے رہنے کے بعد غلام فرید اس رات پہلی بار جا کر جانوروں کے باڑے میں سویا تھا۔ زمین پر پڑی روئی جو جانوروں کے بول و براز سے اٹی ہوئی تھی۔ اس پر گائے بھینسوں کے قریب۔ اسے جس آدمی نے اس احاطے میں خاندان سمیت رہائش دی تھی اس آدمی نے جانوروں کی چوکیداری اور دیکھ بھال کے کام کے عوض دی تھی۔ اور غلام فرید اب ان کی چوکیداری کر رہا تھا۔ یا پھر شاید وہ بھی ایک جانور تھا جسے جانوروں کے ساتھ ہی رہنا چاہیے تھا۔

اس کے خاندان کی لاشیں صبح سویرے دودھ لینے والے کچھ لوگوں نے دیکھی تھیں اور اس کے بعد گاؤں میں کہرام مچ گیا تھا۔ غلام فرید اس کہرام کے دوران بھی جانوروں کے باڑے میں ہی وہ چھری پاس رکھے بیٹھا اسے گھور رہا تھا۔ جو آلۂ قتل تھی۔ مگر غلام فرید کی نظر میں وہ آلۂ رہائی تھی۔

پورا گاؤں اس احاطے میں آگیا تو لوگوں نے غلام فرید کو بھی دیکھ لیا۔ اس کے کپڑوں اور ہاتھوں پر لگے خون کو بھی۔ اور اس خون آلود چھری کو بھی۔ وہ پہلا موقع تھا جب گاؤں میں سے کوئی غلام فرید کو گالی نہیں دے سکا تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔ وہ اس سے دہشت زدہ ہو گئے تھے اس کے قریب تک آنے کی جرات بھی نہیں کر پائے تھے۔ بس گم صم اس کو دور دور سے دیکھ کر یوں سرگوشیاں کر رہے تھے جیسے وہ چڑیا گھر میں رکھا ہوا پنجرے میں بند کوئی جنگلی جانور ہو جو کسی بھی وقت ان میں سے کسی پر بھی حملہ کر سکتا تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ وہ پنجرے کی سلاخوں کے پیچھے نہیں تھا اس لیے زیادہ خطرناک تھا۔

اس دن پوری زندگی میں پہلی بار گاؤں میں سے کسی نے غلام فرید کو ماں' بہن' بیوی' بیٹی کی کوئی فحش گالی دے کر

غائب کیا تھا۔ نہ ہی اس نے اس کے دانت کے ... نہ ہی اس نے اس پر لعنت

ملامت کی تھی نہ گالم گلوچ۔ نہ ڈرایا دھمکایا تھا۔ نہ گریبان سے پکڑا تھا نہ تھوکا تھا نہ ہاتھ اٹھایا تھا۔ اور نہ ہی یہ یاد کرایا تھا کہ اسے سود کی قسط ادا کرنی ہے اس تاریخ تک اور اگر ادا نہ کی تو اس کے ٹکڑے کرنے کے بعد اس کی بیوی اور بیٹیوں کے ساتھ کیا کیا جائے گا۔

زندگی میں پہلی بار اس دن غلام فرید نے جیسے چند لمحوں کے لیے جانور بننے کے بعد انسان جیسا درجہ حاصل کیا تھا۔

پولیس کے آنے سے کچھ دیر پہلے مولوی صاحب بھی موقع واردات پر پہنچ گئے تھے۔ وہ رستے میں سن چکے تھے کہ غلام فرید نے کیا کیا تھا لیکن اس کے باوجود نو لاشوں اور ان نو لاشوں کے درمیان بلکتی ایک بچی نے ان پر چند لمحوں کے لیے لرزہ طاری کر دیا تھا۔ انہیں لگا تھا جیسے غلام فرید کو اللہ نے اس کے کیے کی سزا دی تھی۔ اس برائی کی جو اس نے مولوی صاحب کے ساتھ کی تھی اور یہ بات وہ اگلے کئی مہینے وقتاً فوقتاً جمعے کے خطبے میں دہراتے بھی رہے۔ اپنی موذنیت رجسٹر کروانے کا اس سے اچھا موقع کہاں مل سکتا تھا مولوی صاحب کو۔ کم علم جاہل لوگوں کے دل پر اللہ اور مولوی صاحب کی ہیبت قائم کرنے کا۔

پولیس کے پہنچنے پر مولوی صاحب نے ہی اس کا استقبال کیا تھا اور وہ "شیطان" دکھایا تھا جو پھانسی کا حق دار تھا۔ اس "شیطان" نے کسی مزاحمت کے بغیر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔

"ہاں میں نے ہی مارا ہے سب کو۔ اور صرف اس لیے کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا وہ ویسی زندگی گزاریں جو غلام فرید جی رہا تھا۔ میں کچھ بھی کر لیتا کسی جائز طریقے سے اپنا قرض نہیں اتار سکتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا وہ بھی کینچوؤں کی طرح جئیں۔" غلام فرید نے پولیس کے سامنے اپنے اعترافی بیان میں کہا تھا۔

غلام فرید نے ٹھیک کہا تھا وہ کسی بھی حلال طریقے کی آمدنی سے سود جیسی حرام چیز کو اپنے سر سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اس حرام چیز سے نجات کے لیے کوئی اس سے بھی زیادہ حرام کام کرنا تھا اسے۔ اور وہ حرام کام اس نے کر ہی لیا تھا۔

حلال برکت پیدا کرتا ہے۔ حرام بدی کو جنم دیتا ہے۔



"جان جاؤ کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان ایک امت ہیں۔ کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے کچھ لے۔ سوائے اس کے جسے اس کا بھائی رضامندی اور خوشی سے دے۔ اور اپنے نفس پر اور دوسرے پر زیادتی نہ کرو۔"



بھوک سے روتی بلکتی اور خون میں لتھڑی ہوئی چنی کو سب سے پہلے جس نے دیکھا تھا اس نے اسے بھی زخمی سمجھا تھا لیکن جب اس کی مدد کرنے اور اسے طبی امداد دینے کے لیے اٹھایا گیا تو یہ پتا چل گیا تھا کہ وہ صحیح سلامت تھی۔ گاؤں والوں کے لیے یہ ایک معجزہ تھا کہ اتنی لاشوں میں ایک بچی زندہ رہ گئی تھی۔ غلام فرید کی بے رحمی اور پاگل پن کے باوجود۔ گاؤں والوں کے لیے معجزوں کی تشریح بس وہی تھی۔

غلام فرید کا کوئی بھائی نہیں تھا اور بہنوں میں سے صرف ایک اس بات پر تیار ہوئی تھی کہ وہ چنی کو اپنے پاس رکھے گی۔ نسیمہ کے خاندان میں سے کوئی بھی اس پر تیار نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک قاتل باپ کی بیٹی کو اپنے گھر پالیں۔ لیکن فوری طور پر چنی کی دیکھ بھال صلہ رحمی کے جذبے کے تحت ان کے ایک پرانے ہمسائے نے کرنا

شروع کی تھی۔ چنی کو پیدائش کے بعد زندگی میں پہلی بار پیٹ بھر کر خوراک اور اچھے صاف ستھرے کپڑے اور بستر اس دن نصیب ہوا تھا جس دن اس کا خاندان قتل ہوا تھا۔ وہ چنی جس کو کبھی ماں باپ نے بھی غور سے نہیں دیکھا تھا اسے دیکھنے کے لیے پورا گاؤں امڈ آیا تھا اس کے ددھیالی اور ننھیالی خاندانوں کے سوا۔ جنہیں یہ خدشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو۔ وہ ذمہ داری انہیں کے گلے پڑ جائے۔ غربت اتنی بڑی لعنت ہوتی ہے کہ وہ انسان کے اندر سے خونی رشتوں کی محبت اور انسانیت کی بنیادی صفات بھی نکال دیتی ہے۔ چنی کے ددھیالی اور ننھیالی خاندانوں کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ وہ سب چھوٹی موٹی مزدوریاں کرتے اور بڑے بڑے خاندانوں کو پال رہے تھے۔ چھ' آٹھ بچوں والے خاندان میں ایک اور بچہ اور وہ بھی کسی دوسرے کا پالنا بہت مشکل تھا۔ وسائل اور آمدنی کے محدود ہونے کی وجہ سے۔

صرف غلام فرید کی ایک بہن تھی جس کے صرف چار بچے تھے۔ اور ان میں سے بھی تین بیٹے تو دونوں خاندانوں کا دباؤ اسی پر پڑا تھا کہ چونکہ اس کی ذمہ داریاں کم ہیں اس لیے چنی کو وہی رکھے۔ صدمے اور غم سے بے حالی کی کیفیت میں وہ اپنے اکلوتے بھائی کے خاندان کی آخری نشانی کو اپنے پاس رکھنے پر تیار تو ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے شوہر اور سسرال والوں نے اپنا وہ صدمہ اس حادثے کے دوسرے ہی دن اپنے تیوروں اور ناراضی سے ختم کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھی باقی رشتہ داروں کی طرح چنی کی ذمہ داری سے ہاتھ اٹھاتی۔ اس علاقے میں انتظامی عہدے داران اور سیاست دانوں اور سماجی شخصیات کی آمد شروع ہو گئی تھی اور جو بھی آرہا تھا وہ چنی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ساتھ کچھ نہ کچھ مالی امداد بھی کر کے جارہا تھا۔

مالی امداد کے لیے دیے جانے والے چیکوں اور کیش رقومات کے سلسلے نے ایک دم چنی کے رشتہ داروں کے اندر صلہ رحمی اور خونی رشتوں کی چاہ جگا دی تھی۔ چنی بوجھ نہیں تھی بلکہ بوجھ بٹانے والی تھی اس کا اندازہ سب ہی کو ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی چنی کی کفالت کے لیے جھگڑوں کا آغاز بھی ہو گیا۔

دونوں سائیڈوں سے پورے کے پورے خاندان والے چنی کی دیکھ بھال کرنے والے اس ہمسائے کے گھر میں دھرنا دے کر بیٹھ گئے تھے۔ آپس میں گالم گلوچ اور مارکٹائی تک نوبت آنے پر ہمسائے کو پولیس کو طلب کرنا پڑا اور پولیس نے اس بچی کو اسی ہمسائے کی کفالت میں دیتے ہوئے فریقین سے کہا کہ وہ چنی کی کسٹڈی کے لیے عدالت سے رابطہ کریں اور جب تک عدالت کوئی فیصلہ نہیں کرتی وہ بچی اسی گھر میں رہے گی۔

وہ چنی کی زندگی کے اچھے دنوں کا آغاز تھا۔ ہمسائے نے اگرچہ چنی پر وقتی طور پر رحم کھا کر ہی اس کی دیکھ بھال کا ذمہ اٹھایا تھا لیکن چنی کو ملنے والی چھوٹی بڑی نقد رقومات جیسے اس کے لیے لاٹری لگنے کے مصداق ہو گئی تھیں۔ چنی کو حکومتی ذرائع سے ملنے والے چیکس کو کیش کرانے پر تو عدالت نے اس کے رشتہ داروں کی طرف سے درج کرائے والے کیس کی وجہ سے حکم امتناعی دے کر روک دیا تھا مگر کیش رقومات کا حساب کتاب رکھنا اور ان پر کوئی پابندی مکمل طور پر لگانا ناممکن تھا۔

چنی کو اپنے پاس رکھنے والے ہمسائے نے اس کے لیے ملنے والی نقد رقومات کو چنی پر خرچ کرنے کے بہانے کھل کر خرچ کرنا شروع کر دیا۔ وہ جیسے ایک بہتی گنگا تھی جس سے ہر کوئی ہاتھ دھو رہا تھا۔ اس رقم کے ثمرات چنی تک بھی خوراک کپڑوں، کھلونوں اور طبی سہولیات کی شکل میں پہنچ رہے تھے مگر وہ بہت معمولی تھے ان ثمرات کے مقابلے میں جو اس ہمسائے کے خاندان کو ملنا شروع ہو گئے تھے۔

کیش رقوم کا وہ سلسلہ بہت جلد ہی ختم ہو گیا تھا۔ ایک ڈیڑھ مہینہ میں۔ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والی ہمدردیاں ان کی یادداشت کے ساتھ ساتھ کم ہوتی گئیں اور پھر ایک وقت آیا تھا جب چنی ہمسایوں کے لیے ایک بوجھ بن گئی تھی۔ سرکاری امداد کا وہ چیک جس کو استعمال کرنے پر فی الحال پابندی تھی اور وہ صرف اس کو مل سکتا تھا

جسے چنی کی کسٹڈی ملتی۔ اور چنی کی کسٹڈی رشتہ داروں ہی میں سے کسی کو ملنا تھی۔ ہمسائے کو نہیں۔ سو اس سے پہلے کہ عدالت کیس کا فیصلہ کرتی۔ ہمسائے چنی کے سب سے بڑے ماموں کو کچھ رقم کے عوض چنی تھما گئے تھے اور ساتھ انہوں نے عدالت میں یہ بیان بھی دے دیا تھا کہ چنی اسی ماموں کے گھر سب سے زیادہ اچھی پرورش پاسکتی تھی۔

تین مہینے کے بعد باقی تمام رشتہ داروں کی آہ و بکا کے باوجود چنی کا وہ ماموں چنی کی کسٹڈی اور دس لاکھ روپے کی رقم کا چیک عدالت سے حاصل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سونے کی چڑیا اب ماموں کے سر پر بیٹھ گئی تھی جو اس سے پہلے ایک ' ریڑھا چلا کر پھل سبزیاں ادھر سے ادھر ڈھوتا تھا' دس لاکھ روپے سے اس نے فوری طور پر زمین کا ایک ٹکڑا خرید کر کاشت کاری کا آغاز کر دیا تھا۔ چنی اس کے گھر میں اس کے سات بچوں کے ساتھ احسان کے طور پر پلنے لگی تھی۔ مگر یہاں اس کی اس طرح کی ناز برداری نہیں کی گئی تھی جو وقتی طور پر ہی سہی لیکن اس ہمسائے نے کی تھی۔

ماموں کے بچوں نے پہلی بار زندگی میں اپنے باپ کے پاس اتنا پیسہ دیکھا تھا جس سے وہ انہیں وہ سب کچھ لے کر دے سکتا تھا جو پہلے ان کے لیے خواب اور حسرت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جیسے معجزاتی طور پر ان کی زندگی بدلی تھی' اور اس معجزے کا سہرا کوئی بھی چنی کے سر نہیں باندھ سکتا تھا۔ چنی اب ڈیڑھ سال کی ہو گئی تھی اور ایک بار پھر نہلانے دھلانے اور صاف کپڑوں کے ساتھ ساتھ وقت پر کھانے اور زندگی کی بنیادی ضروریات کے لیے ترسنا شروع ہوئی تھی۔ مگر چنی کی صحیح خوش قسمتی کا آغاز اس دن ہوا تھا جب چنی کے خاندان کے ساتھ ہونے والے حادثے کے تقریباً چھ مہینے کے بعد اس اسکول کا مالک چنی کو دیکھنے آیا تھا جہاں غلام فرید کام کرتا رہا تھا اور جہاں سے ایک سزا کے طور پر نکالے جانے نے چنی سے اس کا خاندان چھین لیا تھا۔



" تم سب آدم اور حوا کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ کسی عرب کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر' کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ برتری اگر ہے تو صرف تقویٰ کو۔ اور اپنے غلاموں کا خیال رکھو اور جو تم کھاؤ اس میں سے ان کو کھلاؤ اور جو تم پہنو اسی میں سے ان کو پہناؤ اور اگر وہ ایسی خطا کریں جو تم معاف نہ کرنا چاہو تو انہیں فروخت کر دو لیکن کوئی سزا نہ دو۔



بیرونی گیٹ ہمیشہ کی طرح گھر میں کام کرنے والی میڈ نے کھولا تھا۔ ڈرائیو وے پر گاڑی کھڑی کرتے ہوئے سالار نے ابھی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ ہی کھولا تھا جب ہر روز کی طرح لان میں کھیلتے اس کے دونوں بچے بھاگتے ہوئے اس کے پاس آگئے تھے۔ چار سالہ جبریل پہلے پہنچا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے بیٹے کا چہرہ چوما تھا۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔

"السلام علیکم!" گاڑی میں پڑے ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر اس نے جبریل کا ماتھا اور چہرہ صاف کیا۔ جو اس نے بڑی فرماں برداری سے کروایا تھا۔ دو سالہ عنایہ تب تک ہانپتی کانپتی' شور مچاتی گرتی پڑتی اس کے پاس آگئی تھی۔ دور سے پھیلے اس کے بازوؤں کو دیکھ کر وہ کچھ اور کھلکھلائی تھی۔

اس نے ہمیشہ کی طرح اسے گود میں لیا تھا بہت زور سے اسے بھینچنے کے بعد اس نے باری باری بیٹی کے دونوں گال چومے تھے۔ جبریل تب تک ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ بند کر چکا تھا۔

اس نے عنایہ کو نیچے اتار دیا۔ وہ دونوں باپ سے ملنے کے بعد دوبارہ لان میں بھاگ گئے تھے جہاں وہ میڈ کی دو

بیٹیوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھے۔ وہ چند لمحے ڈرائیو وے پر کھڑا اپنے بچوں کو دیکھتا رہا۔ پھر گاڑی کے پچھلے حصے سے اپنا بریف کیس اور جیکٹ نکالتے ہوئے وہ گھر کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

امامہ تب تک اس کے استقبال کے لیے دروازے تک آچکی تھی۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں۔ وہ حیرانی سے اس کے پاس آتے ہوئے مسکرائی۔

"تم جلدی آگئے آج؟"

اس نے ہمیشہ کی طرح اسے گلے لگاتے ہوئے اس کے بالوں کو ہولے سے سہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں آج زیادہ کام نہیں تھا۔"

"تو ڈھونڈ لیتے۔" وہ جواباً اس کے ہاتھ سے جیکٹ لیتے ہوئے ہنسی، وہ جواب دینے کے بجائے مسکرا دیا۔

اپنے بیڈ روم میں بیٹھے اس نے جب تک اپنا بریف کیس رکھا اور جوتے اتارے، وہ اس کے لیے پانی لے آئی تھی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟" وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے سے گلاس اٹھا رہا تھا جب امامہ نے اچانک پوچھا تھا۔ اس نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

"ہاں بالکل۔ کیوں؟"

"نہیں مجھے تھکے ہوئے لگے ہو، اس لیے پوچھ رہی ہوں۔" سالار نے جواب دینے کے بجائے گلاس منہ سے لگالیا۔ وہ ٹرے لے کر چلی گئی۔

کپڑے تبدیل کر کے وہ سٹنگ ایریا میں آگیا تھا۔ لان میں اس کے دونوں بچے ابھی بھی اس فٹ بال کے پیچھے بھاگتے پھر رہے تھے۔ وہ سٹنگ ایریا کی کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ کانگو کا موسم اسے کبھی پسند نہیں رہا تھا اور اس کی وجہ وہ بارش تھی جو کسی وقت بھی شروع ہو سکتی تھی اور جو شاید ابھی کچھ دیر میں پھر شروع ہونے والی تھی۔ کنشاسا میں پچھلے کئی دن سے ہر روز اسی وقت بارش ہوتی تھی۔ سہ پہر کے آخری چند گھنٹے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی بارش اور اس کے بعد مطلع صاف۔

"چائے۔" وہ امامہ کی آواز پر باہر لان میں دیکھتے بے اختیار پلٹا۔ وہ ایک ٹرے میں چائے کے دو مگ اور ایک پلیٹ میں چند بسکٹ لیے کھڑی تھی۔

"تھینکس۔" وہ مگ اور ایک بسکٹ اٹھاتے ہوئے مسکرایا۔

"باہر چلتے ہیں بچوں کے پاس۔" وہ باہر جاتے ہوئے بولی۔

"میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں، کسی کال کا انتظار کر رہا ہوں۔"

وہ سر ہلاتے ہوئے باہر چلی گئی۔ چند منٹوں کے بعد اس نے امامہ کو لان میں نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ لان کے ایک کونے میں پڑی کرسی پر بیٹھتے وہ کھڑکی میں اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہ بھی جواباً مسکرا دیا تھا۔

چائے کا مگ اور بسکٹوں کی پلیٹ اب لان میں اس کے سامنے پڑی ٹیبل پر رکھی تھی۔ اس نے باری باری جبریل اور عنایہ کو اس کے پاس آکر بسکٹ لیتے دیکھا۔ جبریل نے بسکٹ لے جا کر نو اور لویا کو دیے تھے چاروں بچے ایک بار پھر سے فٹ بال کھیلنے لگے تھے امامہ اب مکمل طور پر بچوں کی طرف متوجہ تھی۔ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے دائیں کندھے پر پڑی شال سے اپنے جسم کا وہ حصہ چھپائے جہاں ایک نئی زندگی پرورش پا رہی تھی (ان کے ہاں تیسرے بچے کی آمد متوقع تھی) وہ فٹ بال کے پیچھے بھاگتے بچوں کو دیکھتے ہوئے وقتاً فوقتاً ہنس رہی تھی اور پھر انہیں ہدایات دینے لگتی۔

سٹنگ ایریا کی کھڑکی کے سامنے کھڑے باہر دیکھتے ہوئے وہ جیسے ایک فلم دیکھ رہا تھا ایک مکمل فلم۔ اس کے

ہاتھ میں پکڑی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی ایک گہرا سانس لے کر اس نے مگ پاس پڑی ٹیبل پر رکھ دیا۔

اسامہ کا اندازہ "ٹھیک" تھا۔ وہ "ٹھیک" نہیں تھا۔ وہ کھڑکی کے شیشے سے باہر لان میں نظر آنے والی ایک خوش حال فیملی کو دیکھ رہا تھا۔ آئیڈیل پرفیکٹ لائف کا ایک منظر اس کے بچوں کے بچپن کے کیسی لگے۔ اپنے اندر ایک اور تھا وجود لیے اس کی بیوی کا مطمئن و مسرور چہرہ۔

چند پیپرز کو چاڑ کر پھینک دینے سے یہ زندگی ایسے ہی خوب صورت رہ سکتی تھی۔

وہ ایک لمحہ کے لیے بری طرح کمزور پڑا۔ اولاد اور بیوی واقعی انسان کی آزمائش ہوتے ہیں ان کے لیے جنہیں "مال" آزمانے سے قاصر رہتا ہے انہیں دیکھتے ہوئے وہ بھی اسی آزمائش کا شکار ہو رہا تھا ایک مرد ایک شوہر ایک باپ کے طور پر لان میں موجود اس کی فیملی اس کی ذمہ داری تھی۔ وہ ان سے "خون" اور "محبت" کے رشتوں سے بندھا ہوا تھا۔

ایک لمحہ کے لیے اس کی نظر عکس کر جبریل اور حنایہ کے ساتھ کھیلنے والی چار اور چھ سال کی ان دو سیاہ فام کاغر بچیوں پر گئی تھی۔ اس کے خوب صورت گورے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ اور بھی زیادہ بدصورت لگ رہی تھیں۔ ہیڈی کی وہ دونوں بیٹیاں اگر اس وقت مناسب لباس اور جوتوں میں ملبوس تھیں تو اس کی وجہ ہیڈی کا ان کے گھر کام کرنا تھا۔ ورنہ وہ کومبے کے بدحالی کے شکار ہزاروں بچوں کی طرح اپنا بچپن کسی آسائش کے بغیر محنت مشقت کرتے گزار رہی ہوتیں۔ اور ان کے وہاں سے چلے جانے کے بعد ان کا مستقبل بھی کسی بے یقینی کا شکار ہو جاتا بالکل اسی طرح جس طرح اس مغربی نو آبادی کے وہاں آجانے سے پورا افریقہ بے یقینی اور عدم استحکام کا شکار ہو رہا تھا۔ وہ اسی مغربی نو آبادیات کے ایک نمائندے کے طور پر وہاں موجود تھا۔

اس نے اپنی تمیں سالہ ملازمہ کو ڈرائیو وے پر کھڑے اپنی بچیوں کے کسی شاٹ پر تالیاں بجاتے دیکھا بالکل ویسے ہی جیسے لان کے ایک کونے میں کرسی پر بیٹھی اس کی بیوی اپنے دونوں بچوں کو کھیلتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ ہیڈی نے خود بھی "بچپن" نہیں دیکھا تھا وہ پیدا ہونے کے فوراً "بعد" بالغ "ہو گئی تھی۔ افریقہ کے نوے فی صد بچوں کی طرح جنہیں "بچپن" یا "بقائے زندگی" میں سے کوئی ایک چیز ہی مل سکتی تھی۔

بچپن بہرحال ان آپشن میں سے تھا جو پریمیم کی لسٹ میں آتے تھے اور ایسا ہی ایک option اپنے بچوں کو دینے کے لیے ہیڈی سنگل پیرنٹ کے طور پر جان توڑ محنت کر رہی تھی۔ وہ ان کے ساتھ "انسانیت" کے رشتے میں منسلک تھا۔

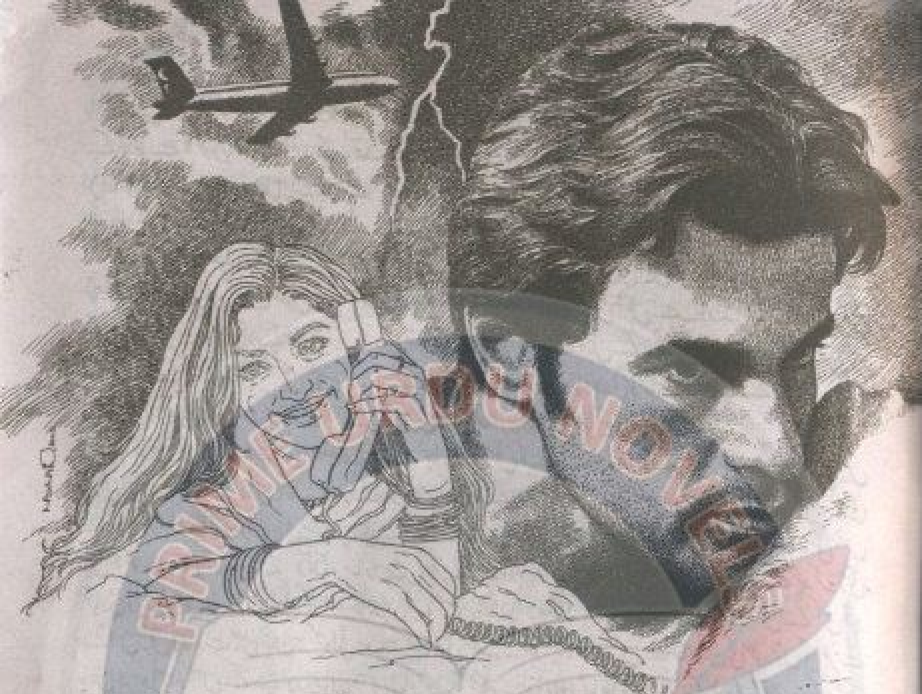
ایک لمبے عرصہ کے بعد وہ پہلی بار وہاں کھڑا اپنی اولاد کا اس عورت کی اولاد سے موازنہ کر رہا تھا۔ اپنی بیوی کی زندگی اور اس عورت کی زندگی کا مقابلہ کر رہا تھا حالانکہ وہ آج وہاں اس کام کے لیے نہیں کھڑا تھا۔

اس کا فون بجنے لگا تھا۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے فون کرنے والے کی آئی ڈی دیکھی۔ کال ریسیو کرتے ہوئے اسے اندازہ تھا اس وقت دوسری طرف وہ کس سے بات کرنے والا تھا اسے اپنی فیملی کی زندگی اور استعفے میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔



"خوب سن لو۔ اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ پانچ وقت کی نماز قائم کرو۔ رمضان کے روزے رکھو۔ اپنے مال کی زکوٰۃ خوشی سے ادا کرو۔ اپنے حاکم کی اطاعت کرو۔ چاہے وہ ایک ناک کٹا حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس طرح اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ۔"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)



J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے۔ بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ ہجے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آ جاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال میں موجود مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے ڈرنک کی آفر کی مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

نویں قسط

افریقہ کا دوسرا سب سے بڑا ملک کانگو پچھلی کئی دہائیوں سے دنیا میں صرف پانچ چیزوں کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ خانہ جنگی۔۔۔ جس میں اب تک 45 لاکھ لوگ جان گنوا چکے تھے۔ غربت کے لحاظ سے یو این کے اکنامک انڈیکیٹرز میں کانگو یو این کے 188 ممالک کی فہرست میں 187 ویں نمبر پر تھا۔ معدنی وسائل کے ذخائر کے لحاظ سے کانگو دنیا کا امیر ترین ملک تھا۔ گھنے جنگلات سے بھرا ہوا جہاں پر کثرت سے بارشیں ہوتی تھیں۔ اور (Pygmy people) پست قامت' سیاہ فام لوگ کانگو کے ان جنگلات میں صدیوں سے پائے جانے والی انسانوں کی ایک ایسی نسل جو مہذب زمانے کے واحد غلام جنہیں غلام بنانا قانوناً "جائز" تھا۔

اور یہ پہچان صرف کانگو کی نہیں تھی افریقہ کے ہر ملک کی پہچان کم و بیش ایسی ہی چیزیں بن چکی ہیں۔ ایک چھٹی شناخت جو ان سب ملکوں میں مشترک ہے وہ مغربی استعماریت کی نئی شکل ہے۔ ورلڈ بینک۔ جو ان تمام ملکوں میں غربت کو ختم کرنے اور بنیادی انسانی ضروریات کی فراہمی کے کھیل کے نیچے ان تمام ممالک میں امریکا اور یورپی ممالک کو اپنی ملٹی نیشنل کمپنیز کے ذریعے افریقہ کے قدرتی اور معدنی وسائل کو گنے کے رس کی طرح نچوڑنے کا موقع فراہم کر رہا ہے۔ کانگو میں بھی یہی ہو رہا تھا اور پچھلی کئی دہائیوں سے ہو رہا تھا۔

1960 میں بیلجیئم کی استعماریت سے نجات حاصل کرنے کے بعد کانگو نے تیس سال میں کم از کم تین بار اپنا نام بدلا تھا۔ ساری جنگ نام رکھنے اور نام بدلنے کے بڑے مقصد کے حصول تک ہی محدود رہی اور بڑی عالمی طاقتوں امریکا اور فرانس کی پشت پناہی سے خانہ جنگی میں تبدیل ہو گئی۔ ایک ایسی ہولناک خانہ جنگی جس میں کانگو نے اپنی آزادی کے 55 سالوں میں تقریباً 45 لاکھ لوگوں کی جان گنوائی۔ ساڑھے چھ کروڑ کی آبادی والے اس ملک میں کوئی گھر اور خاندان ایسا نہیں بچا جو اس خانہ جنگی سے متاثر نہ ہوا ہو جس کے کسی فرد نے اس قتل و غارت میں جان نہ گنوائی ہو یا جسم کا کوئی حصہ نہ کھو بیٹھا ہو یا جس کے خاندان کی عورتوں کی عزت پامال نہ ہوئی ہو جس کے بچے اور بچیاں جنسی زیادتیوں کا شکار نہ ہوئی ہوں یا چائلڈ سولجر کے طور پر محارب گروپس کے ہاتھوں ایک دوسرے کے خلاف استعمال نہ ہوئے ہوں۔ یہ دنیا کی مہذب تاریخ کی وہ پہلی خانہ جنگی تھی جس میں ایک دوسرے سے لڑنے والے قبیلے "لڑائی" کے دوران انسانوں کو قتل کرتے اور ان کا گوشت خوراک کے متبادل کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ خانہ جنگی' دریائے کانگو کے گرد بسنے والے اس ملک کے لوگوں کا "کلچر" تھا۔ ایک ایسا "کلچر" جو مہذب دنیا کے مہذب لوگوں نے ان پر تھوپا تھا۔ خانہ جنگی کے ذریعے عالمی طاقتیں کانگو کی زمین اور معدنی وسائل پر قبضہ کر کے وہاں سے اربوں روپے کی معدنیات اپنے ملکوں اور اپنے معاشروں کی ترقی و فلاح و بہبود کے لیے لے جا رہی تھیں اور انہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ افریقہ میں انسانیت کی تذلیل کس کس طرح کر رہے تھے اور اس کو فروغ دینے کا بھی ذریعہ بن رہے تھے۔

اگر 45 لاکھ لوگ خانہ جنگی کا شکار ہوئے تھے تو تقریباً اتنی ہی تعداد بھوک' بیماری اور بنیادی انسانی ضروریات کی عدم فراہمی کی وجہ سے لقمہ اجل بن چکی تھی اور یہ سب کچھ اس ملک میں ہو رہا تھا جو معدنی وسائل کے ذخائر کے حساب سے دنیا کا سب سے امیر ترین ملک تھا۔ جس کی زمین کوبالٹ' پلاٹینم' یورینیم جیسی دنیا کی مہنگی ترین دھاتوں سے نہ صرف بھری ہوئی تھی بلکہ بہت ساری کمپنیز مقامی لوگوں کو خشک دودھ' مسالے اور کھانے پینے کی روزمرہ کی اشیا فراہم کر کے یہ ساری دھاتیں نکال بھی رہی تھیں۔

کانگو صرف ان دھاتوں سے مالا مال نہیں تھا بلکہ اس وقت دنیا بھر میں سب سے زیادہ خام ڈائمنڈ بھی پیدا کر رہا تھا دنیا بھر میں دوسرا سب سے بڑا بارانی جنگلات رکھنے کا اعزاز بھی کانگو کو ہی حاصل تھا جو نہ صرف اربوں ڈالرز کی قیمتی لکڑی کا مالک تھا بلکہ ان ہی جنگلات سے دنیا بھر میں ربر بھی بھیجا جا رہا تھا۔

اور یہ سارے اعزازات کانگو کے سینے پر بالکل اسی طرح لگے ہوئے تھے جس طرح افریقہ کے کسی فوجی ڈکٹیٹر

جنرل کے سینے پر لٹکے ہوئے میڈلز اور رنگ برنگی پٹیوں کی قطار اور اس کے ہولسٹر میں لٹکا خالی ریوالور اور شاندار وردی کے ساتھ دنیا کے کسی بڑے ملک میں امدادی بھیک کے لیے اس کا وہ دورہ جس میں ملنے والی زیادہ تر رقم اس کے بیرون ملک اکاؤنٹس میں ٹرانسفر ہوجاتی اور اس کے بدلے کانگو کی زمین کا سینہ کچھ اور خالی ہوجاتا۔

اور کانگو کی اسی زمین پر دنیا کے دوسرے بڑے بارانی جنگلات میں تقریباً" پانچ لاکھ کے قریب وہ خستہ حال آبادی رہتی تھی جو اپنی گزر بسر شکار کرکے کرتی تھی جن کے افراد آج بھی اپنے جسم درختوں کی چھالوں پتوں یا جانوروں کی کھالوں سے ڈھانپتے تھے یا پھر وہ برہنہ رہتے تھے۔ پانچ لاکھ کی وہ آبادی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں فرانس سے دوگنا رقبے پر پھیلے ہوئے ان بارانی جنگلات میں پھیلی ہوئی تھی اس لیے عددی اعتبار سے وہ کہیں بھی اس جنگلات کے قریبی آباد قصبوں میں آباد بانٹو قبیلے کے افراد پر غالب نہیں آسکتی تھی جو ہر لحاظ سے ان سے برتر تھے وہ کانگو کے آئینی اور قانونی شہری تھے جن کے پاس حقوق بنیادی ضروریات کا سامان اور بہتر زندگی کے وسائل تھے۔

ان بے مایہ پست قامت کے پاس کچھ بھی نہیں تھا ان کے پاس صرف وہ جنگل تھا جس میں وہ رہتے تھے شکار کرکے پیٹ بھر لیتے تھے۔ نالوں اور جھیلوں میں جمع بارش کے پانی سے پیاس بجھا لیتے تھے۔ درختوں کی لکڑیوں اور خشک پتوں سے جھونپڑیاں بنا کر چھت بنا لیتے تھے یا پھر گھنے درختوں پر مچان بنا کر رہ لیتے تھے۔ آپس میں شادیاں کرلیتے تھے اور ڈائریا ملیریا جیسی چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا شکار ہوکر مر جاتے۔ ان کی زندگی کا چکر بس یہیں تک تھا۔

جو لوگ زیادہ گھنے جنگلات کے بجائے قصبوں کے قریب جنگلات میں رہتے تھے۔ وہ بانٹو قبیلے کے افراد کے غلاموں کے طور پر جنگل میں کام کرتے۔ ان کے لیے لکڑی کاٹتے، شکار کرتے، کان کنی کرکے مختلف قسم کی دھاتیں بانٹو قبیلے کے اپنے مالکوں کو پہنچاتے جو ان کے لیے بےکار تھیں اور بدلے میں ان کے مالک انہیں روٹی، کپڑا اور ضروریات کی وہ چھوٹی موٹی چیزیں دیتے تھے جو ان لوگوں کے لیے ضرورت سے زیادہ حیرت اور فخر کا باعث ہوتیں۔۔۔ انہیں دنیا سے جنگل کے علاوہ اور کچھ چاہیے بھی نہیں تھا، لیکن دنیا کو جنگل نہیں چاہیے تھے۔

2002 میں کانگو کی قائم مقام حکومت نے کچھ عالمی طاقتوں کے دباؤ میں جنگلات سے لکڑی کی کٹائی کا ایک نیا قانون وضع کیا اور اس قانون کے تحت، کانگو کی حکومت کے پاس یہ اختیار آگیا کہ وہ جنگلات میں رہنے والے قبیلوں اور آبادیوں کو مکمل طور پر نظر انداز کرکے اپنی مرضی سے جنگل کا کوئی بھی حصہ کسی بھی طریقے سے استعمال کرسکتی تھی۔ ورلڈ بینک اور دوسرے بین الاقوامی مالیاتی اداروں نے نہ صرف اس فریم ورک کو سپورٹ کیا بلکہ کانگو کی حکومت کو مالی وسائل فراہم کیے تاکہ کانگو کے جنگلات کو مختلف زونز میں تقسیم کرکے نشان دہی کی جائے کہ کس زون میں درخت کاٹے جائیں گے اور کس حصے کو صنعتی مقاصد کے لیے جنگلی حیات کی بقا کے لیے استعمال کیا جائے گا اور نیشنل پارک کی صورت میں تبدیل کرکے انسانی رہائش کے لیے ممنوع قرار دے دیا جائے گا۔ ورلڈ بینک نے یو این کی خوراک کے عالمی ادارے کے ساتھ مل کر کانگو میں ان جنگلات کی تباہی کے ایک دو عظیم الشان "پروجیکٹ" کا آغاز کردیا تھا۔

سالار سکندر جس وقت اس پروجیکٹ کے ہیڈ کے طور پر کانگو پہنچا تب تک اس منصوبے کو تین سال ہوچکے تھے۔ سالار سکندر کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ ورلڈ بینک اسے کس طرح استعمال کرنے والا تھا، لیکن اسے یہ اندازہ بہت جلد ہوگیا تھا۔ ایباکا سے پہلی ملاقات کے بعد۔



پیٹرس ایباکا سے سالار سکندر کی پہلی ملاقات بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ اسے کانگو میں آئے تقریباً"

ایک سال ہونے والا تھا جب لاموکو نامی جگہ کو اپنی ٹیم کے ساتھ وزٹ کرتے ہوئے پیٹرس ایباکا تقریباً "دو درجن کے قریب Pygmies (پستہ قد لوگوں) کے ساتھ اچانک وہاں آگیا تھا جہاں سالار اور اس کی ٹیم کے لوگ اپنی گاڑیوں سے اتر کر اس علاقے کا جائزہ لے رہے تھے جسے کچھ عرصہ پہلے ہی ایک یورپین ٹمبر کمپنی کو لیز پر دیا گیا تھا۔ ان کے پاس پرائیویٹ اور گورنمنٹ دونوں کی طرف سے دی جانے والی سیکورٹی موجود تھی اور ان گارڈز نے ایباکا اور اس کے گروپ کے لوگوں کو یک دم وہاں نمودار ہوتے دیکھ کر حواس باختگی کے عالم میں بے دریغ فائرنگ شروع کر دی تھی۔

سالار نے دو پگمیز کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا اور باقیوں کو درختوں کی اوٹ میں چھپتے اور پھر بلند آواز میں ایباکا کو کسی درخت کی اوٹ سے انگریزی زبان میں یہ پکارتے سنا تھا کہ وہ حملہ کرنے نہیں آئے بات کرنے آئے ہیں۔

سالار اس وقت اپنی گاڑی کی اوٹ میں تھا اور اس نے سب سے پہلے ایباکا کی پکار سنی تھی۔ چند لمحوں کے لیے وہ حیران رہ گیا تھا کسی پگمیز کا انگریزی بولنا اس کے لیے یقیناً "حیران کن تھا لیکن اس سے زیادہ حیران کن وہ امریکن لب و لہجہ تھا جس میں ایباکا چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ اسے ان سے بات کرنی ہے وہ صرف ملنا چاہتا ہے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا اور اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہیں۔

سالار کی ٹیم کے ساتھ موجود گارڈز اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے تب تک ٹیم کے تمام افراد کو گاڑیوں میں پہنچا چکے تھے سوائے سالار سکندر کے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے گارڈز کی رہنمائی میں گاڑی میں سوار ہوتا اور پھر اس کی گاڑی بھی وہاں سے تیز رفتاری سے غائب ہو جاتی' سالار نے گارڈز سے وہاں کی مقامی زبان لنگالا میں کہا تھا' کہ وہ اس پکارنے والے آدمی سے بات کرنا چاہتا ہے وہ فائرنگ بند کر دیں کیوں کہ یہ یک طرفہ ہے دوسری طرف سے نہ تو فائرنگ ہو رہی ہے نہ ہی کسی اور ہتھیار کا استعمال۔

اس کے گارڈز کچھ دیر تک اس سے بحث کرتے رہے اور اس بحث کو ختم کرنے کا واحد حل سالار نے وہ نکالا تھا جو اس کی زندگی کی سب سے بڑی بے وقوفی ثابت ہو سکتی تھی اگر دوسرا گروپ واقعی مسلح ہوتا۔ وہ یک دم زمین سے اٹھ کر گاڑی کی اوٹ سے باہر نکل آیا تھا اس کی سیکورٹی پر تعینات گارڈز ان پگمیز کے سامنے آنے پر اس طرح حواس باختہ نہیں ہوئے تھے جتنے اس کے اس طرح بالکل سامنے آجانے پر ہوئے تھے۔

سالار ان کی حواس باختگی سمجھ سکتا تھا۔ وہ پاکستان نہیں تھا' خانہ جنگی کا شکار کانگو تھا' جہاں کسی کی جان لینا مچھر مارنے کے برابر تھا اور یہ قتل و غارت کسی قانونی عدالت میں کسی کو کوئی سزا نہیں دلوا سکتی تھی۔ جب جان لے لینا اتنا آسان ہو تو کوئی بھی حواس باختہ ہو کر خوف کی حالت میں وہی کرتا ہے جو اس کے گارڈز کر رہے تھے۔ سالار و بہرحال خود مر جانے سے زیادہ بہتر انتخاب تھا اور اس وقت وہ کچھ فاصلے پر دو پگمیز کی لاشیں دیکھ سکتا تھا اور وہ دور سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ زندہ نہیں تھے۔

فائرنگ اب ختم ہو گئی تھی اس کی تقلید میں اس کی سیکورٹی کے افراد بھی باہر نکل آئے تھے وہاں اب صرف دو گاڑیاں تھیں ٹیم کے باقی سب افراد وہاں سے اپنے اپنے گارڈز کی حفاظت میں نکل چکے تھے

فائرنگ کے تھمتے ہی ایباکا بھی باہر نکل آیا تھا۔ سالار نے چلا کر اپنے گارڈز کو گولی چلانے سے منع کیا تھا پھر وہ اس ساڑھے چار فٹ قد کے بے حد سیاہ چپٹی ناک والے اور موٹی موٹی سیاہ آنکھوں والے آدمی کی طرف متوجہ ہوا' جو اپنے ساتھیوں کے برعکس جینز اور شرٹ میں تھا ان ننگے پاؤں والے پست قامت لوگوں کے درمیان جا کر زینے بے حد عجیب لگ رہا تھا۔

اسے اب یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ حملہ آور گروپس کے افراد نہیں تھے۔ ورلڈ بینک اور دوسرے بین الاقوامی مالیاتی ادارے اپنی ٹیمز کو ان جنگلات میں کہیں بھی بھیجنے سے پہلے اس گروپ سے اپنی ٹیم کے افراد کے تحفظ اور

سیکورٹی کی ضمانت لیتے تھے جو گروپ اس علاقے پر قابض ہوتا تھا اور اس کے بدلے وہ اس متحارب گروپ کو کچھ نہ کچھ مالی امداد فراہم کرتے تھے۔ اگرچہ وہ علاقہ جس میں سالار کی ٹیم گئی تھی، وہ خانہ جنگی سے متاثرہ علاقوں میں سے نہیں تھا اس کے باوجود اس ٹیم کے وزٹ کے لیے بھی تحفظ کی یقین دہانی کرائی گئی تھی اور اس کے باوجود یہ واقعہ ہو گیا تھا۔

”پیٹرس ایباکا!“ اس پست قامت شخص نے آگے بڑھ کر تعارف کرواتے ہوئے سالار سے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا جسے تھامنے سے پہلے سالار نے بڑے نپے تلے انداز میں ایباکا کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا تھا وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ بھی ان مفلوک حال لوگوں ہی کی طرح ہوگا جو غیر ملکیوں کی گاڑیاں سامنے آنے پر امداد کے لیے ان کے سامنے آجاتے تھے۔ مالی امداد نہ سہی ٹین پیک خشک خوراک کے ڈبے، دودھ، جوسز بھی ان کے لیے ایک عیاشی ہوتی۔ سالار بھی ایباکا سے ایسی ہی کسی ڈیمانڈ کا انتظار کر رہا تھا لیکن جواباً ایباکا کی زبان سے اپنا نام سن کر وہ حیران ہو گیا تھا۔

اس نے ایباکا سے اپنا تعارف نہیں کروایا تھا پھر بھی وہ اسے نام سے کیسے جانتا تھا۔ وہ ایباکا سے یہ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے جواباً اسے بتایا کہ وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ لوموکا میں ہونے والے وزٹ کے بارے میں بھی اسے بینک کے آفس میں کام کرنے والے کسی مقامی آدمی نے بتایا تھا جس نے ایباکا کی سرتوڑ کوشش کے باوجود سالار سے ملاقات کے لیے اپائنٹ منٹ کے حصول میں اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا اور یہ چند دنوں یا چند ہفتوں کی بات نہیں تھی۔ ایباکا ورلڈ بینک کے کنٹری ہیڈ سے ملاقات کے لیے کئی مہینوں سے کوشش کر رہا تھا۔ وہ سالار کے آفس نمبرز پر ہر روز ڈھیروں کالز کرتا رہتا تھا۔ ویب سائٹ پر موجود اس کے ای میل ایڈریس پر اس نے سینکڑوں ای میلز کی تھیں جن کا جواب ہر بار صرف موصولی ہی کا آیا تھا۔ اس کے بعد آگے کچھ نہیں۔ فون کالز ریسیو کرنے والے سالار کے عملے کے افراد کے پاس بھی ایباکا کے لیے صرف ایک جواب تھا۔ وہ میٹنگ میں ہیں آپ کا پیغام پہنچا دیا جائے گا۔

ایباکا کی ملاقات کا مقصد جان کر اسے جواباً“۔۔ بڑے نارمل انداز میں ٹالا جاتا۔ اس کی گفتگو سنتے ہوئے سالار اس کی زبان و بیان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اسے اب شبہ نہیں رہا تھا کہ یہ لب و لہجہ کی کاپی ہونے کی وجہ سے جس ملک کی قومی زبان فرنچ ہو وہاں اس امریکن لب و لہجے میں انگریزی میں اتنی روانی سے بات کرنے والا جنگلات کا باسی ہونے کے باوجود بیرون ملک کا تعلیم یافتہ ہوگا۔

یہ ناقابل یقین بات تھی لیکن اس کے بعد جو کچھ سالار سکندر نے سنا تھا اس نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ پیٹرس ایباکا ہارورڈ بزنس اسکول کا گریجویٹ تھا اور وال اسٹریٹ میں جے پی مارگن گروپ کے ساتھ پانچ سال کام کرنے کے بعد کانگو آیا تھا۔

اپنے والٹ سے نکالے ہوئے کچھ وزیٹنگ کارڈز اس نے سالار سکندر کی طرف بڑھائے تھے اس نے بے حد بے یقینی سے انہیں پکڑا تھا۔ وہ فقیر پست قامت بے مایہ شخص تھا۔ کانگو کے جنگلات میں تیروں، نیزوں اور پتھروں سے شکار کر کے پیٹ کی بھوک مٹانے والا ایک جنگلی۔ وہ ہارورڈ کے کینیڈی بزنس اسکول کہاں سے پہنچ گیا تھا اور پھر جے پی مارگن گروپ کے ساتھ منسلک رہتا۔ تو پھر وہ یہاں کیا کر رہا تھا؟

اور یہ وہ سوال تھا جس کا جواب پیٹرس ایباکا نے سالار سکندر کو اس کے آفس میں دوسرے دن اپنی دوسری ملاقات میں کاغذات کے ایک انبار کے ساتھ دیا تھا جو وہ اس ملاقات میں سالار سکندر کو دینے آیا تھا۔

پیٹرس ایباکا دس سال کی عمر میں لوموکا میں ایک بچہ کے طور پر ایک مشنری سے متعارف ہوا تھا جو اسے اپنے ساتھ کانگو کے جنگلات میں وہاں کے لوگوں سے رابطہ اور کمیونیکیشن کے لیے ساتھ لے کر پھرتا رہا اور پھر اسے

اس حد تک اس بچے کے ساتھ لگاؤ ہو گیا کہ بیماری کی وجہ سے کانگو چھوڑنے پر وہ ایاکا کو بھی اپنے ساتھ امریکا لے گیا تھا جہاں اس نے اسے پیٹرس کا نام دیا۔ ایک نیا مذہب بھی۔۔۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے ایاکا کو تعلیم دلوائی۔ تعلیم کے لیے خیرات سے فنڈنگ دلوائی۔ ایاکا بے حد ذہین تھا اور ریورنڈ جانسن نے اس کی اس ذہانت کو جانچ لیا تھا' وہ ایاکا کو اس کے بعد ہر سال کانگو لاتا رہا جہاں ایاکا کا خاندان آج بھی اسی طرح جی رہا تھا۔

دس سالہ ایاکا نے اگلے پچیس سال امریکا میں گزارے تھے مگر اس کے بعد وہ امریکا چھوڑ آیا تھا۔

وہ اپنے لوگوں کے پاس رہنا چاہتا تھا کیوں کہ انہیں اس کی ضرورت تھی اور انہیں اس کی ضرورت اس لیے تھی کیونکہ ورلڈ بینک کے مالی تعاون سے ہونے والے بہت سے منصوبوں میں سے ایک منصوبہ جنگل کے اس حصے میں شروع ہو گیا تھا جہاں ایاکا کا قبیلہ آباد تھا۔ اس کا خاندان اور خاندان سے بھی بڑھ کر وہ دس ہزار لوگ جو اب جنگل کے اس حصے سے بے دخل کیے جا رہے تھے جس میں وہ صدیوں سے رہ رہے تھے۔ جنگل کٹنے جا رہا تھا' وہ ساری زمین صاف ہوتی پھر اس کے بعد وہاں ان معدنیات کی تلاش شروع ہوتی جو اس منصوبے کا دوسرا حصہ تھا' اور ایاکا کا مسئلہ' اس کا اپنا خاندان نہیں تھا۔ ایاکا کا مسئلہ وہ پورا جنگلات کا حصہ تھا جو اب جگہ جگہ زونز بنا کر کاٹا جا رہا تھا اور نیشنل پارک بنا کر ان لوگوں کو وہاں سے بے دخل کیا جا رہا تھا۔

''ہم پانچ لاکھ لوگ ہیں مگر یہ جنگل تو کانگو کے ساڑھے تین کروڑ لوگوں کو روزگار دے رہا ہے۔ ورلڈ بینک ٹمبر انڈسٹری کو معاونت دے رہا ہے کیونکہ اس سے ہماری غربت ختم ہو گی۔ جب چند دہائیوں میں جنگل ہی غائب ہو کر یورپ اور امریکہ کی فیکٹریز اور شو رومز میں مہنگے داموں بکنے والی لکڑی کی اشیاء میں تبدیل ہو جائیں گے تو کانگو کے لوگ کیا کریں گے۔ تم لوگ ہم سے وہ بھی چھیننا چاہتے ہو جو اللہ نے ہمیں دیا ہے۔ اگر کبھی ہم ویسٹ میں ان سے سب کچھ چھیننے پہنچ گئے تو تمہیں کیسا لگے گا؟'' ایاکا نے اپنا کیس بہت تہذیب سے پیش کیا تھا مگر بات کے اختتام تک اس کی بے چینی اس کے لب و لہجہ سے جھلکنے لگی تھی۔

سالار سکندر کے پاس اس کے سوالوں کے رٹے رٹائے جوابات تھے۔ اس پروجیکٹ کی طرح کانگو میں ہونے والے اور بہت سے پراجیکٹس کی تفصیلات اس کی انگلیوں پر تھیں وہ وہاں ورلڈ بینک کا کنٹری ہیڈ تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ ان پروجیکٹس کی اہمیت اور فزیبلٹی رپورٹس کے بارے میں اسے پتا نہ ہوتا۔ مگر ایسا پہلی بار ہوا تھا' کہ پیٹرس ایاکا کے انکشافات اور سوالات اسے پریشان کرنے لگے تھے۔ بہت کچھ ایسا تھا جو اس کی ناک کے نیچے ہو رہا تھا اور اسے پتا نہیں تھا لیکن وہ اس سب کا حصہ دار تھا کیونکہ وہ سب کچھ اس کے دستخطوں کے ساتھ منظور ہو رہا تھا۔ کانگو میں وہ پہلی بار نہیں آیا تھا نہ ہی افریقہ اور اس کے مسائل اس کے لیے نئے تھے نہ ہی وہاں کے وسائل پر مغرب کی ٹپکتی ہوئی رال اس کے لیے کوئی پوشیدہ بات تھی۔ لیکن وہ ہمیشہ یہ سمجھتا رہا تھا کہ ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں اور کوئی بھی فلاحی کام کرنے والی بین الاقوامی مالیاتی تنظیم اپنے مفادات کو بالائے طاق رکھ کر کسی ملک اور قوم کے لیے کچھ نہیں کر سکتی اور وہ انہیں اتنی چھوٹ دے رہا تھا مگر ایاکا کے اعتراضات اور انکشافات نے اسے ہولا دیا تھا۔ جو کچھ وہاں ہو رہا تھا' وہ ورلڈ بینک کے اپنے چارٹر کے خلاف تھا لیکن یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور ورلڈ بینک کی دلچسپی اور مرضی سے ہو رہا تھا۔

ایاکا کی دی ہوئی فائلوں کے انبار وہ کئی ہفتے پڑھتا رہا تھا۔ کئی ہفتے وہ اپنے آپ سے جنگ کرتا رہا تھا۔ ورلڈ بینک کے ایماء پر وہاں ایسی کمپنیوں کو لکڑی استعمال کرنے کی اجازت دی گئی تھی جن کا ٹریک ریکارڈ افریقہ کے دوسرے بہت سے ممالک میں اسی حوالے سے قابل اعتراض رہا تھا۔ لکڑی کٹ رہی تھی۔ جنگل صاف ہو رہا تھا۔ آبادی بے دخل ہو رہی تھی اور جن شرائط پر ان کمپنیز کو وہاں لائسنس دیا گیا تھا وہ کمپنیز ان شرائط کو بھی پورا نہیں کر رہی تھیں۔ انہیں لکڑی کے عوض اس علاقے کے لوگوں کی معاشی حالت سدھارنے کا فریضہ دیا گیا تھا اور وہ کمپنیاں

کروڑوں ڈالرز کی لکڑی لے جانے کے عوض چند عارضی نوعیت کے اسکولز اور ڈسپنسریز لوگوں کو فراہم کر رہی تھیں۔ خوراک۔ خشک دودھ نمک اور مسالاجات کی شکل میں دی جا رہی تھی۔

اور یہ سب ورلڈ بینک آفیشلز کے نگرانی کے باوجود ہو رہا تھا کیونکہ پگمیز کو اس ملک میں اچھوت کا درجہ حاصل تھا' وہ ان کمپنیز کے خلاف عدالت میں نہیں جا سکتے تھے۔ حکومتی عہدے داران کے پاس نہیں جا سکتے تھے۔ صرف ایک کام کر سکتے تھے۔ احتجاج۔ این جی اوز کے ذریعے یا پھر میڈیا کے ذریعے۔ اور یہ کام بہت مشکل تھا۔ وہ مہذب دنیا کا حصہ نہیں تھا جہاں پر کسی کے ساتھ ہونے والی زیادتی' چار گھنٹے میں ہر بڑے نیوز چینل کی ہیڈ لائن بن جاتی تھی۔ وہ افریقہ تھا جہاں پر ایسی زیادتی' تشدد کے ذریعے ہی دبا دی جاتی تھی۔

اگلے دو ماہ سالار کو ایبا کا کے ساتھ اور انفرادی حیثیت میں ان جگہوں کو خود جا کر دیکھنے میں لگے جن کے بارے میں ایبا کا نے اسے دستاویزات دی تھیں۔ اور پھر اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دستاویزات اور ان میں پائی جانے والی معلومات بالکل ٹھیک تھیں۔ ضمیر کا فیصلہ بہت آسان تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ غلط تھا اور وہ اس کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ اب کیا کرے۔ ایک استعفیٰ دے کر اس ساری صورت حال کو اسی طرح چھوڑ کر نکل جاتا۔ اور اسے یقین تھا ایسی صورت میں جو کچھ وہاں چل رہا تھا' وہ چلتا ہی رہتا۔ یا پھر وہ وہاں ہونے والی بے ضابطگیوں پر آواز بلند کرتا۔ بے ضابطگی ایک بہت چھوٹا لفظ تھا۔ جو کچھ ورلڈ بینک وہاں کر رہا تھا وہ اخلاقیات اور انسانیت کی دھجیاں اڑانے کے برابر تھا۔

افریقہ میں ایبا کا سے ملنے کے بعد' زندگی میں پہلی بار سالار سکندر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کے ان الفاظ کو سمجھا تھا کہ "کسی کالے کو گورے پر اور کسی گورے کو کالے پر کوئی سبقت حاصل نہیں۔" وہ ہمیشہ ان الفاظ کو صرف ذات' برادری اور اونچ نیچ کے حوالے سے دیکھتا رہا تھا۔ وہ پہلی دفعہ اس سیاہ فام آبادی کا حال اور استحصال دیکھ رہا تھا جو دنیا کے ایک بڑے خطے پر بستی تھی۔ معدنیات اور قدرتی وسائل سے مالا مال خطہ۔ اور پھر اس گوری آبادی کی ذہنی پسماندگی' ہوس دیکھ رہا تھا جس کا وہ بھی حصہ تھا۔ اور اسے خوف محسوس ہوا تھا۔ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ "آنے والے زمانوں کے حوالے سے اسی خطے اور اسی سیاہ فام آبادی کے حوالے سے کوئی پیش گوئی تھی۔ یا کوئی تنبیہہ جسے صرف سفید فام لوگ ہی نہیں مسلمان بھی نظر انداز کیے ہوئے تھے۔ صدیوں پہلے غلامی کا جو طوق سیاہ فاموں کے گلے سے ہٹایا گیا تھا 21 ویں صدی کے مہذب زمانے میں افریقہ میں استعماریت نے وہ طوق ایک بار پھر ڈال دیا تھا۔

اور انہیں سیاہ فام پست قامت لوگوں میں سے ایک پیٹرس ایبا کا تھا۔ جو امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں اپنی زندگی کے 25 سال گزارنے کے بعد بھی وہاں سے "اس سیاہ دور" میں لوٹ آیا تھا۔ صرف اپنے لوگوں کی "بقا" کے لیے۔ "بقا" کے لفظ کا مفہوم سالار سکندر نے پیٹرس ایبا کا سے سیکھا تھا اور اس بقائے باہمی کے لیے کیا کیا قربان کیا جا سکتا تھا وہ بھی وہ ایبا کا سے ہی سیکھ رہا تھا۔

زندگی میں اسے تقویٰ کا مطلب بھی اسی شخص نے سمجھایا تھا جو مسلمان نہیں تھا۔ وہ تقویٰ جس کا ذکر آخری خطبے میں تھا اور جس کو فضیلت حاصل تھی رنگ' نسل' ذات' پات ہر اس دنیاوی شے پر جسے برتر سمجھا جاتا تھا۔

پیٹرس ایبا کا کو اللہ کا خوف تھا۔ لادین سے کیتھولک اور کیتھولک سے پھر لادین ہونے کے باوجود وہ اللہ سے ڈرتا تھا۔ اسے مانتا تھا۔ اس کی عبادت بھی کرتا تھا اور اس سے مانگتا بھی تھا لیکن وہ یہ کام کسی گرجے' مندر یا مسجد میں نہیں کرتا تھا کانگو میں اپنے لوگوں کے ساتھ انسانیت سے گرا ہوا سلوک ہونے کے باوجود وہ انسانیت کا درد رکھتا تھا۔ ایمان دار تھا۔ اخلاقی برائیوں سے بچا ہوا تھا۔ مگر پیٹرس ایبا کا کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ترغیبات کو خدا خوفی کی وجہ سے چھوڑتا تھا۔ وہ نفس پرست نہیں تھا۔ وہ طمع زدہ بھی نہیں تھا اور سالار سکندر بہت

بار اسے سمجھ نہیں پاتا تھا۔ ایبا کا بلاشبہ غیر معمولی انسان تھا اور وہ اگر سالار سکندر کو متاثر کر رہا تھا تو وہ کسی بھی انسان کو کر سکتا تھا۔

وہ دنیا کے ووذہین ترین انسانوں کا آمنا سامنا تھا یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک متاثر ہوتا دوسرا نہیں۔

"سالار سکندر! میں اپنی زندگی میں تم سے زیادہ قابل اور ذہین انسان سے نہیں ملا۔"

ایبا کا نے ایک مہینے کے بعد سالار کے ساتھ ہونے والی کئی ملاقاتوں کے بعد جیسے اس کے سامنے اعتراف کیا تھا۔ سالار صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔

"میں خود انٹرنیشنل آرگنائزیشنز میں کام کر چکا ہوں اور ان میں کام کرنے والے بہت افراد سے ملتا بھی رہا ہوں لیکن تم ان سب میں مختلف ہو مجھے یقین ہے تم میری مدد کرو گے۔"

"تعریف کا شکریہ لیکن اگر تم اس خوشامد کا سہارا میری مدد کے لیے لے رہے ہو اور تمہارا خیال ہے کہ میں تمہارے منہ سے یہ سب سننے کے بعد تمہیں ہیرو بنا کر تمہاری خاطر اس صلیب پر چڑھ جاؤں گا تو میرے بارے میں تمہارا اندازہ غلط ہے۔ میں جو بھی قدم اٹھاؤں گا سوچ سمجھ کر اٹھاؤں گا۔"

ایبا کا کی اس فیاضانہ تعریف کو خوشامد قرار دینے کے باوجود سالار جانتا تھا ایبا کا کو اس کی شکل میں اور اس پوزیشن پر واقعی ایک مسیحا مل گیا تھا۔ مسیحا بھی وہ جو ورلڈ بینک میں کام کرنے کے باوجود اپنا ضمیر زبردستی بے ہوش تو کر سکتا تھا مسلا نہیں سکتا تھا۔

"تمہارا سینس آف ہیومر بہت اچھا ہے۔" ایبا کا نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا تھا "یہ چیز مجھ میں نہیں پائی جاتی۔"

سالار نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "اور جس صورت حال میں تم مجھے ڈال بیٹھے ہو اس کے بعد تو اگلے کئی سالوں بھی اس کے پیدا ہونے کے کوئی امکانات نہیں۔"

"میں بہت سارے مسلمانوں کے ساتھ پڑھتا رہا ہوں' کام کرتا رہا ہوں' ملتا رہا ہوں مگر تم ان سے مختلف ہو۔"

وہ عجیب ہیرو تھا یا کم از کم سالار کو لگا تھا۔

"میں کس طرح مختلف ہوں؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"تم ایک اچھے مسلمان ہونے کے ساتھ اچھے انسان بھی ہو۔ جن سے میرا واسطہ پڑا وہ یا اچھے مسلمان ہوتے تھے یا اچھے انسان۔"

سالار کچھ دیر تک بول نہیں سکا بولنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا تھا افریقہ کے اس بے دین انسان نے۔

"اچھا مسلمان تمہاری نظر میں کیا ہے؟" سالار نے بہت دیر خاموش رہنے کے بعد اس سے پوچھا تھا۔

تمہیں میری بات بری تو نہیں لگی؟" ایبا کا یک دم محتاط ہوا تھا۔

"نہیں۔ مجھے تمہاری بات انٹرسٹنگ لگی مگر تمہاری زبان سے ادا ہونے والا یہ پہلا جملہ تھا جس میں تمہاری کم علمی جھلکی۔"

اس بار ایبا کا الجھا۔ وہ مذہب ڈسکس کرنے کے لیے نہیں ملے تھے لیکن مذہب ڈسکس ہو رہا تھا۔ وہ مذہب پر بحث نہیں کرنا چاہتے تھے اور مذہب پر بحث ہو رہی تھی۔

"اچھا مسلمان۔؟ جو بہت Practising (باعمل) ہے۔ ساری عبادات کرتا ہے۔ پورک نہیں کھاتا۔ شراب نہیں پیتا۔ نائٹ کلب میں نہیں جاتا۔ میرے نزدیک وہ ایک اچھا مسلمان ہے جیسے ایک اچھا عیسائی یا ایک اچھا یہودی۔"

ایبا کا کو اندازہ نہیں تھا' وہ اپنی کم علمی میں بھی جو باتیں کہہ رہا تھا۔ وہ سالار سکندر کو شرمسار کرنے کے لیے کافی

تھیں۔ رنج اپنے لیے نہیں ہو رہا تھا اپنے مذہب کے پیروکاروں کے تعارف پر ہو رہا تھا۔ یعنی کوئی فرق ہی نہیں رہا تھا صرف عبادات اور باعمل ہونے پر ایک کم علم شخص کے ذہن میں مسلمان کو اور عیسائی یا یہودی میں۔ وہ لمحہ ذاتی حیثیت میں سالار کے لیے سوچنے کا تھا۔ ایبا کا اسے اچھا انسان بھی مان رہا تھا اور اچھا مسلمان بھی۔ مگر کیا واقعی وہ اس معیار پر پورا اترتا تھا کہ ایک باعمل یہودی یا عیسائی سے اپنی شناخت الگ رکھ پاتا۔

کانگو کے اس جنگل میں ایبا کا کے ساتھ بیٹھے سالار نے کبھی مذہب کو اس زاویے سے نہیں دیکھا تھا جس زاویے سے پیٹرس ایبا کا دیکھ رہا تھا۔

"یہ بدقسمتی کی بات ہے یا صرف اتفاق کہ مجھے اپنی زندگی میں کبھی اچھے مسلمان، اچھے عیسائیوں یا اچھے یہودیوں سے اچھے تجربات نہیں ہوئے۔ وہ مجھے کبھی متاثر نہیں کر سکے اور جنہوں نے متاثر کیا اور جنہیں میں آج تک اچھے انسانوں کی فہرست میں رکھتا ہوں وہ بھی مذہبی نہیں تھے۔ باعمل نہیں تھے۔"

"ریورنڈ جانسن کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" سالار نے بے ساختہ کہا۔

"ویل!" ایبا کا کہہ کر مسکرایا تھا۔ "ان کے مجھ پر بہت احسانات ہیں لیکن وہ کبھی میرے آئیڈیل نہیں بن سکے۔"

"کیوں؟" وہ سوال و جواب سالار کو عجیب لطف دے رہے تھے۔

"ان احسانوں کی ایک قیمت تھی وہ مجھے کرسچن بنانا چاہتے تھے۔ جب میں نے وہ مذہب اختیار کر لیا تو پھر انہوں نے وہ سارے احسانات ایک کرسچن بچے پر کیے۔ ایک انسان کے طور پر صرف انسان سمجھ کر تو انہوں نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔ مذہب کسی کے دل اور دماغ میں زبردستی نہیں ڈالا جا سکتا۔ میں یونیورسٹی جانے تک چرچ جاتا رہا پھر نہیں گیا۔"

ایبا کا مدھم آواز میں کہہ رہا تھا۔ شاید اسے ریورنڈ جانسن کو مایوس کرنے پر افسوس بھی تھا اور پچھتاوا بھی۔

"میں نے تھوڑا بہت سب مذاہب کا مطالعہ کیا ہے۔ سب اچھے ہیں۔ لیکن پتا نہیں جو انسان ان مذاہب کا پیروکار ہو جاتا ہے وہ اپنی اچھائیاں کیوں کھو بیٹھتا ہے۔ تمہیں لگ رہا ہو گا میں فلاسفر ہوں۔"

ایبا کا کو بات کرتے کرتے احساس ہوا تھا۔ سالار بہت دیر سے خاموش تھا۔ اسے لگا وہ شاید اس کی گفتگو میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔

"نہیں اتنا فلاسفر تو میں بھی ہوں۔" سالار نے مسکرا کر کہا۔ "تم امریکہ سے یہاں واپس کیسے آ گئے؟" سالار نے اس سے وہ سوال کیا جو اسے الجھا رہا تھا۔

"ایک چیز جو میں نے ریورنڈ جانسن سے سیکھی تھی۔ وہ اپنے لوگوں کے لیے ایثار تھا۔ اپنی ذات سے آگے کسی دوسرے کے لیے سوچنا۔ امریکہ بہت اچھا تھا وہاں میرے لیے مستقبل تھا۔ لیکن صرف میرا مستقبل تھا۔ میری قوم کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں کانگو کا پست قامت حقیر سیاہ فام تھا اور میں امریکہ میں بھی کانگو کا وہی رہا لیکن میں کانگو میں کچھ اور بننے کا خواب لے کر آیا ہوں۔" ایبا کا کہہ رہا تھا۔

"اور وہ کیا؟" سالار کو پھر تجسس ہوا تھا۔

"کانگو کا صدر بننے کا۔" سالار کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

"تم ہنسے نہیں؟" ایبا کا نے جواباً کہا تھا۔

"تم نے ایسی کوئی بات نہیں کی کہ میں ہنس پڑوں۔ ہارورڈ کینیڈی اسکول سے پڑھنے کے بعد تمہیں اتنے ہی بڑے خواب دیکھنے چاہئیں۔" ایبا کا اس کی بات پر مسکرا دیا تھا۔

وہ مہینے سالار کے لیے بے حد پریشانی کے تھے۔ کیا کرنا چاہیے اور کیا کر سکتا تھا کے درمیان بہت فاصلہ تھا۔

وہ ایباکا کی مدد نہ بھی کرتا تب بھی۔ وہ جتنی جانفشانی سے وہ اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہا تھا۔ سالار کو یقین تھا جلد یا بدیر ورلڈ بینک کے چہرے پر کالک ملنے والا ایک بہت بڑا اسکینڈل آنے والا تھا۔ حفاظتی اقدامات کا وقت اب گزر چکا تھا۔ پیٹرس ایباکا صرف کنگالا یا سواحلی بولنے والا ایک پست قد سیاہ فام نہیں تھا جسے کانگو کے جنگلات تک محدود کیا جا سکتا۔ وہ امریکہ میں اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارنے والا شخص تھا جس کے کانٹیکس تھے۔ وہ رابطے وقتی طور پر اگر اس کے کام نہیں بھی آرہے تھے تو بھی اس سے ایباکا کمزور نہیں پڑا تھا بلکہ کئی حوالوں سے وہ زیادہ طاقت ور بن کر ابھرا تھا۔ وہ صرف پگمیز کی آواز نہیں رہا تھا بلکہ باتنو قبیلے کے بہت سے افراد کی آواز بھی بن چکا تھا جو پگمیز کی طرح جنگلات پر انحصار کرتے تھے۔

اگلا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہی ایباکا کے ساتھ اس کا میل جول ان لوگوں کی نظروں میں آگیا تھا جن کے مفادات ورلڈ بینک کے ذریعے پورے ہو رہے تھے۔

سالار پر نظر رکھی جانے لگی تھی اور اس سے پہلے کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی ہوتی۔ انگلینڈ کے ایک اخبار نے پیٹرس ایباکا کی فراہم کی گئی معلومات کی تحقیق کرنے کے بعد کانگو کے پگمیز اور ورلڈ بینک کے کانگو کے بارانی جنگلات میں ہونے والے پراجیکٹس کے بارے میں ایک کور سٹوری کی تھی جس میں ورلڈ بینک کے کردار کے حوالے سے بہت سارے اعتراضات اٹھائے گئے تھے۔

واشنگٹن میں ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر میں جیسے ہلچل مچ گئی تھی۔ ورلڈ میڈیا میں اس معاملے کی رپورٹنگ اور کوریج کو دبانے کی کوشش کی گئی تھی مگر اس سے پہلے ہی یورپ اور ایشیا کے بہت سارے ممالک کے ممتاز اخبارات اس آرٹیکل کو ری پرنٹ کر چکے تھے اور ورلڈ بینک کے اندر بھی وہ ہلچل اس وقت اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی جب سالار سکندر کی طرف سے ہیڈ آفس کو کانگو میں چلنے والے ان پروجیکٹس کے حوالے سے ایک تفصیلی ای میل کی گئی جس میں اس نے مختلف ماحولیاتی اداروں سے ملنے والا ڈیٹا بھی منسلک کیا تھا جو اس جنگلات کی اس طرح کٹائی کو ایک بڑے ماحولیاتی عدم توازن کا پیش خیمہ قرار دے چکے تھے ایک انسانی المیہ کے علاوہ اس کا وہ خط بینک کے اعلا عہدے داران کے لیے شدید پریشانی کا باعث بنا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب سالار سکندر کو نامعلوم ذرائع کی طرف سے دھمکیوں کا آغاز ہوا تھا۔ وہ پروجیکٹس جو انہیں چلانے والی کمپنیوں کو اربوں ڈالرز کی آمدنی دے رہے تھے بینک کے اپنے کنٹری ہیڈ کی مخالفت کا باعث بنتے تو وہ کمپنیز اور ان کے پیچھے کھڑی بین الاقوامی طاقتیں خاموش تماشائی نہیں بنی رہ سکتی تھیں۔ کوئی عام صورت حال ہوتی تو اس وقت تک سالار سکندر سے استعفیٰ لے کر اسے بڑے ہتک آمیز طریقے سے ملازمت سے فارغ کیا جا چکا ہوتا مگر اس وقت اس کا استعفیٰ انٹر نیشنل میڈیا کے تجسس کو اور ابھار دیتا۔ وہ طوفان جو ابھی چائے کے کپ میں آیا تھا وہ اس سے باہر آجاتا۔

اس ای میل کا جواب سالار سکندر کو ایک تنبیہہ کی صورت میں دیا گیا تھا جو سادہ لفظوں میں خاموش ہو جانے کی تاکید تھی اور سالار کے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔

بینک نے نہ صرف اس ای میل میں ہونے والے اس کے تجزیے کو ناپسند کیا تھا بلکہ پیٹرس ایباکا کی فراہم کی جانے والی بنیاد پر گارڈین میں شائع ہونے والی کور اسٹوری کا ملبہ بھی اس کے سر ڈالتے ہوئے اسے ایباکا اور اس کور اسٹوری میں استعمال ہونے والی معلومات کا ذریعہ قرار دیا گیا تھا۔

یہ الزام سالار سکندر کے پروفیشنل کام پر ایک دھبے کے مترادف تھا۔ پیٹرس ایباکا سے ہمدردی رکھنے، متاثر ہونے اور میل جول کے باوجود سالار نے اس سے بینک کی کسی انفارمیشن یا دستاویز کی بات کبھی نہیں کی تھی ایباکا نے ساری معلومات یا دستاویزات کہاں سے لی تھیں وہ ایباکا کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس تنبیہہ کے جواب میں سالار نے بینک کو اپنے استعفیٰ کی پیش کش کی تھی۔ اسے اب یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اسے مانیٹر کیا جاتا

تھا۔ اس کی فون کالز ٹیپ ہو رہی تھیں اور اس کی ای میلز ہیک ہو رہی تھیں۔ دنوں میں اس کے آفس کا ماحول تبدیل ہو گیا تھا۔ اس نے بینک کی ناراضی اور ہدایات کے باوجود ایباکا سے نہ تو اپنا میل جول ختم کیا تھا نہ ہی رابطہ ختم کیا تھا۔ استعفیٰ کی پیشکش کے ساتھ اس نے بینک کو کانگو میں چلنے والے جنگلات پروجیکٹ کے خلاف اپنی تفصیلی رپورٹ بھی بھیج دی تھی جو سالار سکندر کی اپنی تحقیقات اور معلومات کی بنیاد پر تھی۔ اور توقع کے مطابق اسے واشنگٹن طلب کر لیا گیا تھا۔

امامہ کو اس ساری صورت حال کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ وہ امید سے تھی اور سالار اسے اس ٹینشن کا حصہ دار بنانا نہیں چاہتا تھا جس سے وہ خوف گھر رہا تھا۔ وہ صرف ایباکا کے بارے میں جانتی تھی اور اس کی جدوجہد کے بارے میں۔ جنگلات کے حوالے سے انٹرنیشنل الیکٹرانک میڈیا پر ہونے والی تنقید اس کی نظر میں بھی آئی تھی اور اس نے سالار سے اس کے بارے میں پوچھا بھی تھا لیکن سالار نے بڑے سرسری انداز میں اس کا ذکر کیا۔ وہ اسے تفصیلات بتانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

امامہ کو صحیح معنوں میں تشویش تب ہوئی تھی۔ جب اس نے اسی میڈیا میں سالار سکندر کا نام بھی نمودار ہوتے دیکھا جس کے بارے میں انٹرنیشنل میڈیا یہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس پروجیکٹ کے حوالے سے ہیڈ آفس کو اختلافی رپورٹ دے چکا تھا۔ اس رپورٹ کے مندرجات ابھی کسی رپورٹنگ تک نہیں پہنچے تھے۔

اور ان ہی حالات میں واشنگٹن سے اچانک اس کا بلاوا آیا تھا اور وہ یہ وزٹ تھا جس پر امامہ نے بالآخر اس سے پوچھ ہی لیا تھا۔

"سب کچھ ٹھیک ہے سالار؟" وہ اس رات سالار کی پیکنگ کر رہی تھی جب پیکنگ کرتے اس نے اچانک سالار سے پوچھا تھا۔ وہ اپنا بریف کیس تیار کر رہا تھا۔

"ہاں یار۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" سالار نے اس سے جواباً پوچھا۔

"تم واشنگٹن کیوں جا رہے ہو؟" وہ اپنے خدشوں کو کسی مناسب سوال کی شکل میں نہیں ڈھال سکی تھی۔

"میٹنگ ہے اور میں تو اکثر آتا جاتا رہتا ہوں کہیں نہ کہیں۔ اس بار تمہیں اس طرح کے سوال کیوں پوچھنے پڑ رہے ہیں؟" اپنا بریف کیس بند کرتے ہوئے اس نے امامہ سے کہا تھا۔

"پہلے کبھی تم اتنے پریشان نہیں لگے۔" وہ اس کی بات پر چند لمحے بول نہیں سکا۔ کوشش کے باوجود اس کا چہرہ اس کی ذہنی کیفیت کو امامہ سے پوشیدہ نہیں رکھ سکا تھا۔

"نہیں۔ کوئی ایسی بڑی پریشانی نہیں ہے۔ بس شاید یہ ہو گا کہ مجھے اپنی جاب چھوڑنی پڑے گی۔"

امامہ کے کندھے پر ہاتھ رکھے اس نے اپنے الفاظ اور لہجے کو ممکن حد تک نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ اس بار بھونچکا ہونے کی باری امامہ کی تھی۔

"جاب چھوڑنی پڑے گی؟ تم تو اپنی جاب سے بہت خوش تھے۔" وہ حیران نہ ہوتی تو کیا ہوتی۔

"تھا۔ لیکن اب نہیں ہوں۔" سالار نے مختصراً کہا تھا۔ "کچھ مسئلے ہیں۔ تمہیں واپس آکر بتاؤں گا۔ تم اپنا اور بچوں کا خیال رکھنا۔ کہاں ہیں وہ دونوں؟"

سالار نے بات بڑی سہولت سے بدل دی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے اسی وقت اسے خیال آیا تھا کہ ان حالات میں اسے اپنے بچوں اور امامہ کو کنشاسا میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔ لیکن حل کیا تھا اس کے پاس۔ امامہ کی پریگننسی کے آخری مہینے چل رہے تھے۔ وہ ہوائی جہاز کا سفر نہیں کر سکتی تھی اور وہ واشنگٹن میں ہونے والی اس میٹنگ کو موخر یا کینسل کرنے کی صوابدید نہیں رکھتا تھا۔

"تم اپنا اور بچوں کا بہت خیال رکھنا۔ میں صرف تین دن کے لیے جا رہا ہوں، جلدی واپس آجاؤں گا۔" وہ اب

بچوں کے کمرے میں بستر پر سوئے ہوئے جبریل اور عنایہ کو پیار کر رہا تھا۔ اس کی فلائٹ چند گھنٹوں بعد تھی۔
"ملازمہ کو اپنے پاس گھر پر رکھنا میری غیر موجودگی میں" اس نے امامہ کو ہدایت کرتے ہوئے کہا تھا۔
"تم ہماری فکر مت کرو۔ تین دن ہی کی تو بات ہے۔ تم صرف اپنی میٹنگ کو دیکھو۔ آئی ہوپ' وہ ٹھیک رہے۔" امامہ کو واقعی اس وقت تشویش اس کی میٹنگ کی ہی تھی۔
سالار اس دن آفس سے خلاف معمول جلدی آیا تھا اور پھر وہ سارا دن گھر میں ہی رہا تھا۔ اس دن معمول کی طرح شام کے لیے بھی کوئی مصروفیات نہیں رکھی تھیں اور نہ ہی گھر آکر لیپ ٹاپ لے کر بیٹھا تھا' نہ کارڈلیس فون ہاتھ میں لیے آفس کے معاملات گھر میں نپٹاتا پھرا تھا۔
وہ بس لان میں ان سب کو کھیلتے دیکھ کر خود بھی وہاں آگیا تھا۔ اس کال کو ریسیو کرنے کے بعد۔ اس نے امامہ کو بتایا تھا کہ اسے ایمرجنسی میں تقریباً" دس گھنٹے کے بعد رات کے پچھلے پہر واشنگٹن کی فلائٹ پکڑنی تھی۔ یہ بھی ایک معمول کی بات تھی۔ سالار کی مصروفیات اور سفر اسی طرح آتے تھے اچانک۔ بن بتائے۔
پھر وہ بچوں کے ساتھ لان میں کھیلتا رہا تھا' امامہ کے ساتھ گپ شپ لگاتا رہا تھا۔ یہ خلاف معمول تھا۔ معمول میں ایسا صرف ویک اینڈز پر ہوتا تھا وہ بھی ہر ویک اینڈ پر نہیں۔
سالار گھڑی دیکھ کر زندگی گزارنے والا شخص تھا۔ آج اگر وہ وقت کو بھولا تھا تو کہیں کچھ تو غلط تھا۔ اس کی پریشانی کی نوعیت کیا تھی اور اس کا لیول کیا تھا۔ امامہ اس کا اندازہ تو نہیں لگا پائی تھی' لیکن اسے یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ سب کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ شادی کے چھ سال کے بعد وہ سالار کو اتنا تو پڑھ ہی سکتی تھی۔ اور اب یک دم اس کا یہ اطلاع دینا کہ مسئلہ جو بھی تھا اسے شاید اپنی جاب چھوڑنی پڑے۔ وہ پریشان ہوئی تھی تو اس لیے کیونکہ ایک جمی جمائی زندگی پھر منتشر ہو رہی تھی۔ امامہ ہاشم کی زندگی میں ہمیشہ یہی ہوتا تھا جب سب کچھ ٹھیک ہونے لگتا تو سب کچھ خراب ہو جاتا تھا۔ اسے زندگی میں بہت تبدیلیاں پسند نہیں تھیں سالار سکندر کی طرح' اور دونوں بچوں نے جیسے اس کی اس عادت کو کچھ اور پختہ کر دیا تھا۔
اسے آدھے گھنٹے میں نکلنا تھا۔ اس کا سامان پیک تھا۔ وہ دونوں چائے کا ایک آخری کپ پینے کے لیے لاؤنج میں ساتھ بیٹھے تھے اور اس وقت چائے کا پہلا گھونٹ پینے سے پہلے سالار نے اس سے کہا تھا۔
"میں تم سے محبت کرتا ہوں اور میں تم سے ہمیشہ محبت کرتا رہوں گا۔"
امامہ اپنی چائے اٹھاتے ہوئے ٹھٹکی پھر ہنسی۔ "آج بہت عرصے کے بعد تم نے کہیں جانے سے پہلے ایسی کوئی بات کہی ہے۔ خیریت ہے؟"
وہ اب اس کا ہاتھ تھپک رہی تھی۔ سالار نے مسکرا کر چائے کا کپ اٹھا لیا۔
"ہاں خیریت ہے' لیکن تمہیں اکیلا چھوڑ کر جا رہا ہوں اس لیے فکر مند ہوں۔"
"اکیلی تو نہیں ہوں میں۔ جبریل اور عنایہ ہیں میرے ساتھ۔ تم پریشان مت ہو۔"
سالار چائے کے گھونٹ بھرتا رہا امامہ بھی چائے پینے لگی لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔
"تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی وہ چائے پیتے ہوئے چونکا پھر مسکرایا۔ وہ ہمیشہ اسے بوجھ لیتی تھی۔ ہمیشہ۔
"ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں لیکن ابھی نہیں کروں گا' واپس آکر کروں گا۔" اس نے چائے کا کپ رکھتے ہوئے کہا۔
"مجھے تمہاری یہ عادت سخت ناپسند ہے' ہر دفعہ کہیں جاتے ہوئے مجھے الجھا جاتے ہو میں سوچتی رہوں گی کہ کیا

نہیں کیا اعتراف کرتا ہے۔"

امامہ نے ہمیشہ کی طرح برا مانا تھا اور اس کا گلہ غلط نہیں تھا وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔ اور جان بوجھ کر کرتا تھا۔

"اچھا دوبارہ کبھی نہیں کروں گا۔" وہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ بازو پھیلائے وہ ہمیشہ کی طرح جانے سے پہلے امامہ سے آخری بار مل رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح ایک ایک گرم جوش معانقہ۔

"آئی ول مس یو جلدی آنا۔" وہ ہمیشہ کی طرح جذباتی ہوئی تھی اور وہی کلمات دہرائے تھے جو وہ ہمیشہ دہراتی تھی۔

پورچ میں کھڑے ایک آخری بار اس کو خدا حافظ کہنے کے لیے اس نے الوداعیہ انداز میں سالار کی گاڑی کے چلتے ہی ہاتھ ہلایا تھا۔ گاڑی تیز رفتاری سے طویل پورچ کو عبور کرتے ہوئے کھلے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گئی تھی۔

امامہ کو لگا تھا زندگی اور وقت دونوں تھم گئے تھے۔ وہ جب کہیں چلا جاتا تو وہ اسی کیفیت سے دوچار ہوتی تھی آج بھی ہو رہی تھی گارڈ نے اب گیٹ بند کر دیا تھا۔

شادی کے چھ سال کے بعد بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ زندگی جیسے ایک پٹری پر چلنے لگتی ہے۔ روز مرہ کے معمول کی پٹڑی پر۔ نہ چاہتے ہوئے بھی انسان دائروں میں سفر کرنے لگتا ہے۔

دو بچوں کی آمد سالار اور امامہ کی زندگی کو بھی بڑی حد تک ایک دائرے کے اندر لے آئی تھی۔ جہاں اپنی ذات پیچھے چلی جاتی ہے۔ سینٹر اسٹیج بچوں کے پاس چلا جاتا ہے۔ وہ خدشات توقعات اور غلط فہمیوں کا وہ جال جس میں ایک نیا شادی شدہ جوڑا شادی کے شروع کے کچھ عرصہ میں جکڑا رہتا ہے۔ وہ ٹوٹنے لگتا ہے۔ اعتماد لمحہ بھر میں بد اعتمادی میں نہیں بدلتا۔ بے اعتباری پل بھر میں غائب ہونا سیکھ جاتی ہے۔ گلہ گو نگا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ بندھن عادت میں بدلنے لگتا ہے اور زندگی معمول بنتے ہوئے یوں گزرنے لگتی ہے کہ انسان دنوں ہفتوں مہینوں کی نہیں سالوں کی گنتی بھول جاتا ہے۔

امامہ بھی بھول گئی تھی۔ پیچھے پلٹ کر وہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ پیچھے یادیں تھیں اور یادیں آکٹوپس بن کر لپٹ جانے کی خاصیت رکھتی ہیں۔ پیچھے اب کچھ رہا بھی کہاں تھا اور جو رہ گئے تھے ان کے لیے وہ کب کی مر چکی تھی۔



کسی اپنے کی موت انسان کو پل بھر میں کس طرح خاک کر دیتی ہے یہ کوئی امامہ سے پوچھتا۔

بیس سال کی عمر میں گھر سے نکلتے ہوئے اس کو یہی لگا تھا وہ تو مر ہی گئی تھی جیتے جی۔ کسی کا کوئی تعلق ایک رشتہ ختم ہوتا ہے اس کے تو سارے ہی تعلقات ایک ہی وقت میں ختم ہوئے تھے۔ اسے لگا تھا ایسا صدمہ ایسی تکلیف تو کوئی اور شے اسے پہنچا ہی نہیں سکتی تھی۔

جلال انصر کو کھونا اس کی زندگی کا دوسرا سب سے بڑا صدمہ تھا۔ وہ نو عمری کی محبت تھی۔ محبت نہیں پاگل پن تھا جس میں وہ مبتلا ہوئی تھی۔ عشق نہیں تھا عقیدت تھی جو وہ اس شخص کے لیے پال بیٹھی تھی۔ ساری زندگی اس کے ساتھ گزارنے کے خواب، خواہش اور امید ایک ہی وقت چکنا چور ہوئے تھے اور ایسے چکنا چور ہوئے تھے کہ اس کا پور اوجود کئی سال انہیں کرچیوں سے اٹا رہا تھا۔ تب اسے لگا تھا یہ تکلیف موت جیسی تھی ایسی بے بسی اور بے توقیری زندگی میں بس ایک ہی بار محسوس کرتا ہے انسان اور صرف محبت کے کھو دینے پر ہی کرتا ہے۔

کوئی اور چیز کہاں ایسے مارتی ہے انسان کو۔

وسیم اور سعد کی موت نے اسے بتایا تھا کہ مارتی تو موت ہی ہے اور جیسی مار وہ انسان کو دیتی ہے کوئی اور تکلیف نہیں دیتی۔ آب حیات پی کر بھی انسان اپنی موت ہی روک سکتا ہے پر ان کو جانے سے کیسے روک سکتا ہے جو جان سے بھی پیارے ہوتے ہیں۔

وہ اس وقت نیویارک میں تھی۔ اس کے ہاں پہلا بچہ ہونے والا تھا۔ وہ ساتویں آسمان پر تھی کیونکہ جنت پاؤں کے نیچے آنے والی تھی۔ نعمتیں تھیں کہ گنی ہی نہیں جا رہی تھیں۔ تیسرا مہینہ تھا اس کی پریگننسی کا۔ جب ایک رات سالار نے اسے نیند سے جگایا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ اسے نیند سے جگا کر کیا جتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور شاید ایسی ہی کیفیت سالار کی تھی کیونکہ اس کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کن الفاظ میں اتنے بڑے نقصان کی اطلاع دے۔ اس سے پہلے سکندر عثمان اور وہ یہ ڈسکس کرتے رہے تھے کہ امامہ کو اطلاع دینی چاہیے یا اس حالت میں اس سے یہ خبر چھپا لینی چاہیے۔

سکندر عثمان کا خیال تھا امامہ کو یہ خبر ابھی نہیں پہنچانی چاہیے لیکن سالار کا فیصلہ تھا کہ وہ اس سے اتنی بڑی خبر چھپا کر ساری عمر کے لیے اسے کسی رنج میں مبتلا نہیں کر سکتا۔ وہ وسیم سے فون اور میسج کے ذریعے بھی رابطے میں تھی۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اسے ایک آدھ دن میں اس کے بارے میں اطلاع نہ مل جاتی۔

وہ دونوں قادیانیوں کی ایک عبادت گاہ پر ہونے والی فائرنگ میں درجنوں دوسرے لوگوں کی طرح مارے گئے تھے اور امامہ چند گھنٹے پہلے ایک پاکستانی چینل پر یہ نیوز دیکھ چکی تھی۔ وہ اس جانی نقصان پر رنجیدہ بھی ہوئی تھی ایک انسان کے طور پر۔ مگر اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان لوگوں میں اس کے دو اتنے قریبی لوگ بھی شامل تھے۔ اسے شبہ ہوتا بھی کیسے۔ وہ اسلام آباد کی عبادت گاہ نہیں تھی ایک دوسرے شہر کی تھی۔ سعد اور وسیم وہاں کیسے پہنچ سکتے تھے اور وسیم تو بہت کم اپنی عبادت گاہ میں جاتا تھا۔

بے یقینی اس لیے بھی تھی کیونکہ ایک ہفتے کے بعد وہ اور سعد نیویارک آنے والے تھے اس کے پاس "تقریباً" دس سالوں کے بعد وہ سعد سے ملنے والی تھی۔ بے یقینی اس لیے بھی تھی کیونکہ وسیم نے اس سے وعدہ کیا تھا وہ اپنے عقائد سے تائب ہو جائے گا۔ اور وہ سعد کو بھی سمجھائے گا جو اس سے زیادہ کٹر تھا اپنے مذہبی عقائد میں اور بے یقینی اس لیے بھی تھی کیونکہ ایک دن پہلے تو اس نے وسیم سے بات کی تھی اسے ان چند چیزوں کی فہرست ای میل کی تھی جو اسے پاکستان سے چاہیے تھیں۔

اور سالار۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ کیا وہ پاگل ہو گیا تھا۔ یا وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی۔ ایک بار پھر سے۔ جیسے وہ نو سال ڈاکٹر سبط علی کے گھر دیکھتی رہی تھی۔

وہ صبر نہیں تھا وہ شاک بھی نہیں تھا۔ وہ بے یقینی تھی۔ سالار کو اندازہ تھا مگر وہ یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ وہ اب اس انکشاف کے بعد اس سے کیسے نکالے۔

وہ اگلے کئی گھنٹے گم صم آنسو بہائے بغیر سالار کے کسی سوال اور بات کا جواب دیے بغیر ایک بت کی طرح وہیں بستر پر بیٹھی رہی تھی۔ یوں جیسے انسان نہیں برف کی سل بن گئی تھی۔ اور برف کی سل نہیں جیسے ریت کی دیوار تھی جو ڈھے گئی تھی۔ اسے لگا تھا وہ اب کبھی زندگی میں اپنی انگلی تک نہیں ہلا سکے گی۔ پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکے گی۔ سانس نہیں لے سکے گی۔ جی نہیں سکے گی۔ کوئی ایسے تو نہیں جاتا۔ ایسے۔ اس کی حالت دیکھ کر سالار کو شدید پچھتاوا ہوا تھا اس نے سکندر عثمان کی بات نہ مان کر کتنی بڑی غلطی کی تھی اسے اب سمجھ میں آیا تھا۔ سالار نے اپنے ایک ڈاکٹر کزن کو بلایا تھا گھر پر ہی اسے دیکھنے کے لیے۔

اس کے بعد کیا ہوا تھا امامہ کو ٹھیک سے یاد نہیں تھا۔ سالار کو لمحہ لمحہ یاد تھا۔ وہ کئی ہفتے اس نے اسے پاگل پن

کی سرحد پر جاتے اور وہاں سے پلٹتے دیکھا تھا۔ وہ چپ ہوتی تو کئی کئی دن چپ ہی رہتی یوں جیسے اس گھر میں موجود ہی نہیں تھی۔ روتی تو گھنٹوں روتی۔ سوتی تو پورا دن اور رات آنکھیں نہیں کھولتی اور جاگتی تو دو دو دن بستر پر چند لمحوں کے لیے بھی لیٹے بغیر لاؤنج سے بیڈ روم اور بیڈ روم سے لاؤنج کے چکر کاٹتے کاٹتے اپنے پاؤں سجا لیتی۔ یہ صرف ایک معجزہ تھا کہ اس ذہنی حالت اور کیفیت میں بھی جبریل کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ جیسے یہ فراموش ہی کر بیٹھی تھی کہ اس کے اندر ایک اور زندگی پرورش پا رہی تھی۔ ذہن یادوں سے نکل پاتا تو جسم کو محسوس کرتا۔

اور وحشت جب کچھ کم ہوئی تھی تو اس نے سالار سے پاکستان جانے کا کہا تھا۔ اسے اپنے گھر جانا تھا۔ سالار نے اس سے یہ سوال نہیں کیا تھا کہ وہ کس گھر کو اپنا گھر کہہ رہی تھی۔ اس نے خاموشی سے دو سیٹیں بک کروالی تھیں۔

"مجھے اسلام آباد جانا ہے۔" اس نے سالار کے پوچھنے پر کہا تو سالار نے بحث نہیں کی تھی۔ اگر اس کے گھر والوں سے ملاقات اس کو نارمل کر دیتی تو وہ اس ملاقات کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔

ہاشم مبین ان کے ہمسائے تھے۔ ان کے گھر میں آنے والی قیامت سے سالار سکندر کا خاندان بے خبر نہیں تھا۔ مذہب کا فرق تھا۔ خاندانی اختلافات تھے' دشمنی تھی۔ اور نفرت بھی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی یہ خواہش کبھی نہیں تھی کہ ہاشم مبین کے ساتھ وہ ہوتا جو ہوا تھا۔ بڑھاپے میں جوان اولاد اور وہ بھی دو بیٹوں کو گنوانا کیسا صدمہ تھا' سکندر عثمان اندازہ کر سکتے تھے۔ وہ خود باپ تھے۔ انہوں نے ہاشم مبین کے گھر جا کر ان سے دوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ تعزیت کی تھی۔ اس صدمے میں بھی ہاشم مبین نے بے حد سرد مہری کے ساتھ ان کی تعزیت قبول کی تھی۔

سکندر عثمان کو امید نہیں تھی کہ وہ امامہ سے ملیں گے۔ انہوں نے سالار سے اپنے خدشات کا ذکر ضرور کیا تھا' لیکن امامہ کو جس حالت میں انہوں نے دیکھا تھا' وہ سالار کو ایک کوشش کر لینے سے روک نہیں سکے تھے۔ انہیں امامہ کو دیکھ کر دلی رنج ہوا تھا۔

ہاشم مبین نے نہ صرف فون پر سکندر عثمان سے بات کرنے سے انکار کیا تھا' بلکہ سالار کو ان کے گھر پر گیٹ سے اندر جانے نہیں دیا گیا۔ سکندر عثمان اور وہ دونوں مایوسی کے عالم میں واپس آگئے تھے۔ امامہ کی سمجھ میں ان کی مایوسی اور بے بسی نہیں آئی تھی۔ وہ ماں باپ کے گھر کے برابر والے گھر میں بیٹھ کر سب حالات سے واقف ہونے کے باوجود یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اگر وہ اس کے گھر جا سکتے تھے تو وہ کیوں نہیں جا سکتی تھی۔ گیٹ کے اندر نہ جا سکتی' گیٹ تک تو چلی جاتی۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا تھا۔ وہ اس کی جان لے لیتے۔ بس جان ہی تو جاتی نا۔ وہ تکلیف اور اذیت تو ختم ہو جاتی' جس میں وہ تھی۔

سالار اس کے سامنے بے بس تھا' لیکن وہ پہلا موقع تھا جب اس نے امامہ کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ اس نے امامہ کو اس کے گھر جانے کی کوشش بھی نہیں کرنے دی تھی۔

"تمہیں اگر گھر جانا ہے تو پہلے اپنے باپ سے بات کرو۔ وہ اجازت دیں تو پھر میں تمہارے ساتھ چلوں گا' لیکن میں تمہیں بغیر اجازت کے وہاں گیٹ پر گارڈز کے ہاتھوں ذلیل ہونے کے لیے نہیں بھیج سکتا۔"

اس کے رونے اور گڑگڑانے کے باوجود سالار نہیں پگھلا تھا۔ امامہ نے اپنے باپ سے فون پر بات کر کے اجازت لینے کی ہامی بھرلی تھی۔ مگر اس فون کال نے سب کچھ بدل دیا تھا۔ جو چیز سالار اسے نہیں سمجھا سکا تھا وہ اس فون کال میں ہاشم مبین نے سمجھا دی تھی۔

"یہ جو کچھ ہوا ہے تمہاری وجہ سے ہوا۔ تم جن لوگوں کے ساتھ جا بیٹھی ہو ان ہی لوگوں نے جان لی ہے میرے دونوں بیٹوں کی۔ اور تم اب میرے گھر آنا چاہتی ہو۔ قاتلوں کے ساتھ میرے گھر آنا چاہتی ہو۔" وہ ہذیانی انداز میں

چلاتے اور اسے گالیاں دیتے رہے تھے۔

"تم لوگ۔" اور "ہم لوگ" فرق کتنا بڑا تھا امامہ کو یاد آ گیا تھا۔ آج بھی۔ اس سب کے بعد بھی اس غم کے ساتھ بھی اسے پچھتاوا نہیں تھا کہ اس نے وہ مذہب چھوڑ دیا تھا۔ اسے یاد آیا تھا ایک بار اس کے باپ نے کہا تھا وہ ایک دن گڑگڑاتے ہوئے اس کے پاس آ کر معافی مانگے گی۔ اور وہ آج یہی کرنے جا رہی تھی۔ پر کیوں کرنے جا رہی تھی؟۔

خون کا رشتہ تھا۔ تڑپ تھی۔ وہ کھنچی تھی ان کی طرف۔ اب جب اسے ان سے پہلے کی طرح جان کا خوف نہیں رہا تھا۔ پر خون کا رشتہ صرف اسی کے لیے کیوں تھا۔ تڑپ تھی تو صرف اس کو کیوں تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کے پاس ان لوگوں کے سوا اور کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ ان لوگوں کے پاس تھے۔ اس کے پاس سالار تھا۔ لیکن وہ خونی رشتہ نہیں تھا محبت کا رشتہ تھا۔ خون جیسی تڑپ پیدا ہونے کے لیے ابھی اس کو کئی سال چاہیے تھے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ماؤف ہونے کے باوجود اسے پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ جو غم اسے وہاں کھینچ کر لایا تھا۔ وہ غم اس گھر میں جا کر پچھتاوے میں بدل جاتا۔

ہاشم مبین کی مزید کوئی بات سننے کے بجائے اس نے فون رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد وہ بلک بلک کر روئی تھی۔ اس گھر میں اور اس دنیا میں اب اس کا خونی رشتہ کوئی نہیں رہا تھا۔ اس گھر میں صرف وسیم اس کا تھا۔ اور وسیم جا چکا تھا۔ وہ ایک کھڑکی جو پچھواڑے میں کھلی تھی ٹھنڈی ہوا کے لیے۔ وہ آندھی کے زور سے بند ہو گئی تھی۔ اب اس کھڑکی کو دوبارہ کبھی نہیں کھلنا تھا۔

وہ سالار سکندر کے ساتھ واپس نیویارک لوٹ آئی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا وہ نارمل ہو رہی تھی آہستہ آہستہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ کچھ وقت لگتا تھا۔ امامہ بھی ایسا ہی سمجھتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا وہاں موجود تنہائی نے امامہ کے اعصاب کو ایک بار پھر مفلوج کرنا شروع کر دیا تھا۔ سالار پی ایچ ڈی کر رہا تھا اور ساتھ ایک آرگنائزیشن میں ہفتے میں تین دن کے لیے پارٹ ٹائم کام کرتا تھا۔ وہ صبح پانچ بجے گھر سے نکلتا تھا۔ اور رات کو کہیں آٹھ نو بجے اس کی واپسی ہوتی تھی اور واپسی پر وہ اتنا تھکا ہوا ہوتا تھا کہ ایک دو گھنٹے ٹی وی دیکھ کر کھانا کھا کر وہ دوبارہ سو جاتا تھا۔

امامہ بارہ چودہ گھنٹے ایک بیڈ روم کے آٹھویں منزل کے اس اپارٹمنٹ میں بالکل تنہا ہوتی تھی اور تنہائی کا یہ دورانیہ سالار کے گھر آ جانے کے بعد اس کے سو جانے پر اور بڑھ جاتا تھا۔ ایک بیڈ روم، ایک لاؤنج اور کچن ایریا کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہیں تھا جہاں وہ جا کر کچھ وقت گزار سکتی۔ گھر کا کام بھی بہت مختصر تھا کیونکہ گھر چھوٹا تھا۔ نیند اسے آتی نہیں تھی۔ اور گھر میں کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ صرف سوچنے کے علاوہ۔ کوئی ٹی وی کہاں تک دیکھ سکتا تھا۔ کتابیں کتنی پڑھ سکتا تھا۔ جب ذہن صرف اپنی زندگی کے سارے برے دنوں کو سوچتے ہوئے وہیں اٹکا رہتا تھا۔ کیا ہو سکتا تھا؟۔ کیا کرنا چاہیے تھا؟۔ کیا کرتی تو کس چیز سے بچ جاتی۔ کس چیز سے بچ جاتی تو کون سا صدمہ اسے نہ ہوتا۔ زندگی میں کون کون سی غلطیاں ہوئی تھیں اس سے؟ کون سے غلطی زیادہ بڑی تھی۔ کون سی چھوٹی؟۔ کس کو نہ کرنے سے کس سے بچ سکتی تھی وہ۔

وہ سارا دن اسی حساب کتاب میں لگی رہتی تھی۔ وسیم اس کے ذہن سے نہیں نکلتا تھا وہ روز اپنے فون میں موجود اس کے اور اپنے میسجز کو جو سینکڑوں کی تعداد میں ہوتے بیٹھ کر پڑھنا شروع کرتی اور پھر گھنٹوں اسی میں گزار دیتی اسے وہ سینکڑوں میسجز اب جیسے زبانی حفظ ہو چکے تھے لیکن پتا نہیں خود اذیتی کی وہ کون سی سیڑھی تھی جس پر بیٹھی وہ ہر روز ایک ہی کام بھیگی آنکھوں کے ساتھ کرتی رہتی تھی۔ اسے دن میں کب کیا کھانا تھا اسے یاد نہیں رہتا تھا۔ کب کپڑے بدلے تھے اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔ اس کا ذہن جیسے کسی نے قید کر دیا تھا۔ لاکھ کوشش پر بھی وہ اس پنجرے سے آزاد نہیں ہوتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ کوشش نہیں کرتی تھی۔

وہ بے پناہ کوشش کرتی تھی اپنے ذہن کو ان سب چیزوں اور یادوں سے ہٹانے کی۔ وہ قرآن پڑھتی تھی نماز پڑھتی تھی۔ مگر اس کے بعد وہ وحشت کے اسی جنگل میں ایک بار پھر پہنچ جاتی تھی۔ بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ وہاں اس سے کوئی بات کرنے والا نہیں تھا۔ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے وہ گونگوں کی طرح چلتی پھرتی اپنے کام میکانیکی انداز میں کرتی تھی۔ سالار کہتا تھا وہ پاکستان فون کر لے۔ وہ پاکستان کس کو فون کرتی وہ یہ نہیں بتا پاتا تھا وہاں کون تھا ایسا جو اپنے کام چھوڑ کر گھنٹوں فون پر بات کرتا۔ وسیم کے علاوہ۔ بات جہاں سے شروع ہوتی تھی پھر وہیں آ کر رک جاتی تھی۔ اپنے وجود کے ناکارہ پن اور زندگی کی بے معنویت امامہ ہاشم نے جیسے اس دور میں محسوس کی تھی اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ اس کا اپنا وجود اس کے لیے سب سے بڑا بوجھ بن گیا تھا۔ اسے وہ کہاں پھینک آتی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بستر پر صبح نیند سے آنکھ کھلتے ہی اسے یہ خیال آتا تھا۔ ایک اور دن۔ پھر وہی روٹین۔ پھر وہی تنہائی۔ وہی ڈپریشن۔ وہ آہستہ آہستہ ڈپریشن کی طرف جانا شروع ہو گئی تھی اور سالار ایک بار پھر اپنے آپ کو بے حد بے بس محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اس کے لیے کیا کرتا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جس سے وہ پھر پہلے جیسی ہو جاتی۔ وہ اپنی ورک روٹین نہیں بدل سکتا تھا۔ وہ نیویارک میں رہ رہے تھے اور ان کے جو اخراجات تھے انہیں پورا کرنے کے لیے اسے کام کرنا ہی تھا۔ وہ پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ اسے گھنٹوں لائبریری میں بیٹھنا پڑتا تھا اپنی ریسرچ کے لیے۔ اور وہ یہ کام بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

چودہ گھنٹے تک اپنے کاموں اور سفر سے خوار ہونے کے بعد وہ تھکا ہارا گھر آنے پر بھی امامہ کے کہنے پر کہیں بھی چلنے کے لیے تیار رہتا تھا اور کہیں نہیں تو اپارٹمنٹ کے باہر پارک تک۔ لیکن وہ اس سے کہیں جانے کا کہتی ہی نہیں تھی وہ اس سے معمول کی گپ شپ کرنے کی بھی کوشش کرتا تھا۔ مگر وہ چند جملے بول کر چپ ہو جاتی تھی یوں جیسے اب وہ سالار سے مزید کیا بات کرے اسے یہی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ہونے والی اولاد جو ان کی زندگی کا شادی کے بعد سب سے بڑا واقعہ تھا۔ دونوں ہی کے لیے جیسے غیر اہم ہو گیا تھا۔ دونوں کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ وہ بچے کے بارے میں بھی بات کریں تو کیا بات کریں۔ چند جملوں کے بعد ان کے پاس اس کے بارے میں بھی بات کرنے کو لفظ نہیں رہتے تھے۔

تسلی دلاسا اور دل جوئی کے لیے سالار جو کر سکتا تھا کر چکا تھا۔ وہ اب وسیم کے بارے میں کسی سے بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ صبح سویرے گھر سے اس کے بارے میں سوچتے ہوئے نکلتا اور رات کو جب گھر واپس آنے کے لیے ٹرین میں بیٹھتا تو بھی اس کے بارے میں سوچ رہا ہوتا تھا۔ امامہ کی ذہنی کیفیت نے جیسے اس کے اعصاب شل کرنے شروع کر دیے تھے۔ جبریل کی پیدائش میں ابھی بہت وقت تھا اور وہ اسے اس جہنم سے نکالنا چاہتا تھا جس میں وہ ہر وقت نظر آتی تھی۔

سائیکاٹرسٹ اس کی پریگننسی کی وجہ سے اسے تیز دوائیں نہیں دے رہے تھے مگر اس کا خیال تھا باقاعدہ علاج کے بغیر وہ بہت جلد نارمل نہیں ہو سکتی تھی۔ فیملی کا خیال تھا وہ اگر اسے ساتھ لے جانے کے بجائے کچھ دیر پاکستان میں ان کے پاس رہنے دیتا تو وہ اب تک نارمل ہو چکی ہوتی۔ وہاں فیملی سپورٹ ہوتی ذہن اور دل کو بہلانے کے لیے وہ اس کے لیے بہت کچھ کر سکتے تھے۔ سات سمندر پار بیٹھے وہ اس کے لیے کیا کرتے۔ سالار کو ان کی بات بھی ٹھیک لگتی تھی لیکن وہ امامہ کے بارے میں خائف تھا کہ اسے اکیلا پاکستان چھوڑ جانے پر وہ کسی نقصان کا شکار نہ ہو جائے۔ لیکن جو کچھ اب ہو رہا تھا وہ بھی اس سے برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔

اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے سے پہلے ہی ایک رات امامہ نے کہا تھا۔

''مجھے پاکستان جانا ہے۔''

"کیوں؟" سالار کو اپنا سوال خود بے تکا لگا۔
وہ بہت دیر چپ رہی یوں جیسے اپنے الفاظ جمع کر رہی ہو پھر اس نے جو کہا تھا اس نے سالار کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔
"کل میں نے وسیم کو دیکھا۔ وہاں کچن کاؤنٹر کے پاس وہ پانی پی رہا تھا۔ دو دن پہلے بھی میں نے اسے دیکھا تھا' وہ اس کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔" بات کرتے ہوئے اس کی آواز بھرائی اور وہ شاید اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کے لیے رکی تھی۔
"مجھے لگتا ہے میں کچھ عرصہ اور یہاں رہی تو پاگل ہو جاؤں گی۔ یا شاید ہونا شروع ہو چکی ہوں لیکن میں یہ نہیں چاہتی۔"
اس نے چند لمحوں کے بعد دوبارہ بات کرنی شروع کی تھی۔ وہ اگر واہموں کا شکار ہو رہی تھی تو وہ اس بات سے واقف بھی تھی اور اس سے فرار چاہتی تھی تو جیسے ایک مثبت علامت تھی۔
"ٹھیک ہے ہم واپس چلے جاتے ہیں مجھے صرف چند ہفتے دے دو سب کچھ وائنڈ اپ کرنے کے لیے۔"
سالار نے جیسے لمحوں میں فیصلہ کیا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے امامہ نے نفی میں سر ہلایا۔
"تم پی ایچ ڈی کر رہے ہو تم کیسے میرے ساتھ جا سکتے ہو؟"
"میں پی ایچ ڈی چھوڑ دوں گا۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری ضروری نہیں ہے۔ تم اور تمہاری زندگی ضروری ہے۔"
سالار نے جواباً اس سے کہا۔ کچھ کہنے کی کوشش میں امامہ کی آواز بھرائی وہ کچھ نہیں پائی۔ اس نے دوبارہ بولنے کی کوشش کی اور اس بار وہ بلک بلک کر رونے لگی تھی۔
"نہیں تم ساتھ نہیں آؤ گے۔ یہ کیوں ضروری ہے کہ ساری زندگی تم قربانیاں ہی دیتے رہو میرے لیے۔ اب پی ایچ ڈی چھوڑ دو۔ اپنا کیریئر چھوڑ دو۔ تمہاری زندگی ہے۔ قیمتی ہے تمہارا وقت تم کیوں اپنی زندگی کے اتنے قیمتی سال میرے لیے ضائع کرو۔"
سالار نے کچھ کہنے کی کوشش کی کوئی اور موقع ہوتا تو اس کا یہ اعتراف اس کو خوشی دیتا لیکن اب اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ روتے ہوئے اسی طرح کہہ رہی تھی۔
"I am not suitable for you میں جتنا سوچتی ہوں مجھے یہی احساس ہوتا ہے تمہارا ایک برائٹ فیوچر ہے تم زندگی میں بہت کچھ حاصل کر سکتے ہو لیکن میرا وجود تمہاری ترقی کے راستے میں رکاوٹ بن گیا ہے۔ مجھے احساس جرم ہوتا ہے کہ بار بار میری وجہ سے تمہیں پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔"
وہ چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی اور بول رہی تھی۔ اور وہ چاہتا تھا وہ روئے اور بولے۔ وہ غبار جو اس کے اندر سے نکلتا ہی نہیں تھا وہ کسی طرح تو نکلے۔
"میں تم سے بہت شرمندہ ہوں لیکن میں بے بس ہوں میں کوشش کے باوجود بھی اپنے آپ کو نارمل نہیں کر پا رہی۔ اور اب۔ اب وسیم کو دیکھنے کے بعد تو میں اور بھی۔ اور بھی۔" وہ بولتے بولتے رک گئی صرف اس کے آنسو اور ہچکیاں تھیں جو نہیں تھمی تھیں۔
"سالار تم بہت اچھے انسان ہو۔ بہت قابل ہو تم بہت قابل ہو۔ تم مجھ سے بہتر عورت ڈیزرو کرتے ہو۔ میں نہیں۔

Im a worthless woman

I m a nobody

تمہیں ایسی عورت ملنی چاہیے جو تمہارے جیسی ہو۔ تمہیں زندگی میں آگے بڑھنے میں سپورٹ کرے۔

میری طرح تمہارے پاؤں کی بیڑی نہ بن جائے۔"
"اور یہ سب کچھ تم آج کہہ رہی ہو جب ہم اپنا پہلا بچہ expect کر رہے ہیں۔۔۔؟"
"مجھے لگتا ہے یہ بچہ بھی مر جائے گا۔" اس نے عجیب بات کی تھی۔۔۔ سالار نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔
"تم کیوں اس طرح سوچ رہی ہو۔۔ اسے کچھ نہیں ہو گا۔" سالار پتا نہیں کس کو تسلی دینا چاہتا تھا لیکن اس وقت امامہ سے زیادہ اس کی اپنی حالت قابل رحم ہو رہی تھی۔
"تم بس مجھے پاکستان بھیج دو۔" امامہ نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر وہی مطالبہ دہرایا تھا۔
"میں تمہیں اسلام آباد نہیں بھیجوں گا۔" سالار نے دو ٹوک انداز میں کہا۔
"میں وہاں جانا بھی نہیں چاہتی مجھے سعیدہ اماں کے پاس جانا ہے میں وہاں رہ لوں گی۔" وہ اس کی بات پر حیران ہوا تھا۔ "سعیدہ اماں نہیں تم ڈاکٹر صاحب کے پاس چلی جاؤ۔ اگر وہاں رہنے پر تیار ہو تو میں تمہیں بھیج دیتا ہوں۔" سالار نے یک دم کچھ سوچ کر کہا تھا۔
"ٹھیک ہے مجھے انہیں کے پاس بھیج دو۔" وہ ایک لمحے کے بھی تامل کے بغیر تیار ہو گئی تھی۔ "اگر تم وہاں جا کر خوش رہ سکتی ہو تو ٹھیک ہے میں تمہیں بھیج دیتا ہوں واپس کب آؤ گی؟"
وہ پہلا موقع تھا ساری گفتگو میں جب امامہ نے اس سے نظر ملائی تھی۔۔۔ یہ دل بس خواری کا نام ہے عزت یوں اتار کر رکھتا ہے جیسے عزت کوئی شے ہی نہیں۔۔۔ بے عزتی کو اتنا معمولی کر دیتا ہے کہ انسان آنکھ میں پانی بھا کر بھی پی جانے لگتا ہے۔۔۔ وہ ساری دنیا کو اپنی ٹھوکر پر رکھنے والا مرد تھا اور رسی ڈالی تھی تو اللہ نے اس کے گلے میں محبت کی رسی ڈالی تھی۔۔۔ رسی تھی زنجیر نہیں تھی لیکن بیڑی سے زیادہ بڑی اور کڑی تھی۔
امامہ کو لگا تھا وہ اس سے نظر ملانے کے قابل بھی نہیں رہی تھی اور نظریں ملا کے کر تا ہی کیا تھا۔۔۔ کچھ کہنے کے لیے لفظ ہی نہیں تھے۔۔۔ جو بھی گلے تھے اسے اپنی ذات سے تھے۔۔۔ ساری خامیاں اپنے اندر تھیں۔۔۔ سالار کو وہ جیسے بدقسمتی کے اس چنگل سے آزاد کر دینا چاہتی تھی۔ جس میں وہ خود سالوں سے پھنسی ہوئی تھی اور شاید پھنسا ہی رہنا تھا اسے۔۔۔ اس کی بے لوث۔۔۔ بے مول محبت کا وہ اتنا صلہ تو دیتی اسے۔۔۔ کہ اس بدقسمتی میں اسے نہ گھسیٹتی اسے آگے بڑھ جانے دیتی۔
"واپس آ جانا۔" اس کی لمبی خاموشی کو سالار نے مختصر زبان دی تھی۔۔۔ مشورہ نہیں تھا منت تھی۔۔۔ خواہش نہیں تھی بے بسی تھی۔۔۔ جو ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔۔۔ امامہ نے اس کی بات خاموشی سے سن کر خاموشی سے ہی جواب دیا تھا۔
وہ ایک ہفتے کے بعد پاکستان واپس چلی آئی تھی اور جیسے کسی قید سے چھوٹ آئی تھی۔ امریکہ سے واپس آنے سے پہلے وہ گھر میں پڑی ہوئی اپنی ایک ایک چیز وہاں سے ہٹا آئی تھی یوں جیسے رگڑ رگڑ کر سالار کے گھر اور زندگی سے اپنے وجود اور یادوں کے سارے نقوش کو مٹا دینا چاہتی ہو۔ جیسے سالار کی زندگی کو ہر اس نحوست سے پاک صاف کر دینا چاہتی ہو جو اس کے ساتھ اس کے گھر اور زندگی میں داخل ہوئی تھی۔
وہ واپس نہ آنے کے لیے جا رہی تھی سالار کو اس کا احساس اس کی ایک ایک حرکت سے ہو رہا تھا لیکن وہ پھر بھی اسے جانے دینا چاہتا تھا۔ اگر فاصلہ اور اس سے دوری اسے صحت یاب کر سکتی تھی تو وہ چاہتا تھا وہ دور ہو جائے لیکن ٹھیک ہو جائے۔۔۔ چار مہینے اور گزرتے تو ان کی اولاد اس دنیا میں آ جاتی اور وہ اس کی بقا بھی چاہتا تھا اور وہ اپنی ہمت بھی جانتا تھا جو اب آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی تھی۔۔۔ وہ ڈپریشن امامہ کے وجود سے جیسے اس کے وجود میں

ٹرانسفر ہونے لگا تھا۔

جس شام اس کی فلائٹ تھی وہ ایک بار پھر دل گرفتہ ہو رہا تھا۔ اسے لگا تھا اب وہ گھر ٹوٹنے والا تھا جو اس نے بڑی مشکل سے بنایا تھا۔ امامہ بھی خاموش تھی مگر پتا نہیں سالار کو کیوں وہ پر سکون لگی تھی۔ پر سکون... مطمئن خوش وہ اس کے چہرے کی کتاب پر اس دن یہ نہیں پڑھنا چاہتا تھا۔

"مت جاؤ۔" وہ ٹیکسی کے آنے پر اس کا بیگ اٹھا کر بیڈ روم سے لاؤنج میں لایا تھا۔ وہ اپنا ہینڈ کیری کھینچتے ہوئے اس کے پیچھے آئی تھی اور اس نے ہینڈ کیری بھی دوسرے سامان کے ساتھ سالار کو تھمانے کی کوشش کی تھی جب سالار نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس نے خلاف توقع ہاتھ نہیں کھینچا تھا بس ہاتھ اس کے ہاتھوں میں رہنے دیا تھا۔ بہت دیر سالار اس کا ہاتھ یونہی پکڑے رہا تھا پھر اس نے بہت دل گرفتگی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

وہ لمس امامہ کے ساتھ آیا تھا۔ اس قید سے آزاد ہونے کے بعد بھی اسے بے قرار کرتا رہا تھا۔ کئی سال بعد وہ ایک بار پھر ڈاکٹر سبط علی کے گھر رہنے کے لیے آئی تھی۔ اور اسے اس بار بھی پناہ مل گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور اس کی بیوی اس کی ذہنی حالت سے واقف تھے اور وہاں ان کے پاس آ کر کم از کم کچھ دنوں کے لیے امامہ نے یونہی محسوس کیا تھا جیسے وہ اس قید تنہائی سے نکل آئی تھی۔ مگر یہ کیفیت بھی وقتی تھی۔ وہ جس سکون کی تلاش میں تھی وہ یہاں بھی نہیں تھا۔ بے چینی اور بے قراری یہاں بھی ویسی ہی تھی اور ڈاکٹر سبط علی ان کی بیوی اور سعیدہ اماں کی محبت بھی اس کے لیے مرہم ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ سالار اسے روز فون کرتا تھا۔ کبھی وہ کال ریسیو کر لیتی کبھی نہیں۔ کبھی وہ اس سے لمبی بات کرتی کبھی مختصر بات کر کے فون رکھ دیتی وہ پاکستان آ کر بھی کسی سے رابطے میں نہیں تھی۔ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لمبی بے مقصد خوش گپیاں جن کی وہ عادی تھی... فرق اگر صرف پڑا تھا تو یہ کہ یہاں وہ پابندی سے اور وقت پر اچھا کھانا کھانے کی عادی ہوگئی تھی کیونکہ یہ اس کی مجبوری تھی ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی اس کا خیال رکھتے تھے اور اتنا خیال رکھتے تھے کہ کبھی کبھی اسے احساس جرم ہونے لگتا کہ اسے ان کے پاس نہیں آنا چاہیے تھا اس نے اس بڑھاپے میں ان کی ذمہ داری بڑھا دی تھی۔

پتا نہیں کتنے دن تھے جو اس نے اسی طرح گزارے تھے... سوتے جاگتے یا پھر بھی وہ گھر سے بے مقصد نکل پڑتی۔ ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں اور سارے شہر میں گھومتی پھرتی... چلتی ہوئی گاڑی سے نظر آنے والے منظر اس کے ذہن کو وقتی طور پر بھٹکا دیتے تھے اس کی سوچ کو اس کی زندگی سے دوسروں کی زندگی پر لے جاتے تھے۔

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ گھر سے نکلی تھی اور نہر کے ساتھ سڑک پر چلتے چلتے وہ شہر سے ہی باہر نکل آئے تھے۔ ایک جگہ گاڑی رکوا کر وہ نیچے اتر آئی تھی اور نہر کے ساتھ نہر کے پانی پر بہتی بے کار چیزوں کو دیکھتے دیکھتے وہ اس کے ساتھ چلنے لگی تھی یوں جیسے وہ بھی پانی پر بہنے والی کوئی بے کار چیز تھی پتا نہیں وہ کتنی دیر چلتی رہی تھی پھر ایک جگہ ٹھہر کے بہتے ہوئے پانی کو دیکھنے لگی... درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں موسم سرما میں نہر میں بہتا ہوا وہ پانی برسات کے پانی کی طرح تیز رفتار نہیں تھا نہ ہی پانی اتنا زیادہ تھا لیکن اس لمحے وہ اسے عجیب انداز میں اپنی طرف کھینچ رہا تھا یوں جیسے وہ اسے اپنے اندر اترنے کے لیے پکار رہا ہو... چند لمحوں کے لیے وہ اس خنکی کو بھی بھول گئی تھی جو اس کے سویٹر اور شال کے باوجود اس کے جسم کو شل کرنے لگی تھی۔ نہر کے دونوں کناروں پر لگے ہوئے اونچے لمبے درخت ہوا سے ہلتے تو ان کے پتوں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر نہر کے پانی پر پڑتیں... لحظہ بھر کے لیے اسے روشن کرتیں غائب ہو جاتیں۔

بس صرف ایک لمحہ تھا جس نے اس سے کہا تھا کہ اسے اس پانی میں اترنا چاہیے۔ دیکھنا تو چاہیے وہاں آگے نیچے کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ قدم بڑھا دیتی کسی عورت کی آواز پر وہ ٹھٹک گئی تھی۔

"یہ ذرا گٹھا تو بندھوا دے میرے ساتھ بیٹی!"

وہ ایک ستر اسی سالہ دبلی پتلی سانولی رنگت اور جھریوں سے بھرے چہرے والی ایک بوڑھی عورت تھی۔ جو ایندھن کے لیے وہاں درختوں کی گری ہوئی خشک لکڑیاں چننے کے بعد اب اسے ایک چادر نما کپڑے میں باندھنے کی کوشش میں اسے مخاطب کر رہی تھی۔ وہاں دور دور تک ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور وہ بھی کب اور کہاں سے یک دم نمودار ہوئی تھی امامہ کو اس کا اندازہ بھی نہیں ہوا۔ اس نے کچھ کہے بغیر نہر کے کنارے سے اٹھتے ہوئے اماں کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔ گٹھا اتنا بڑا بنا تھا کہ اسے یقین تھا کہ وہ بوڑھی عورت کبھی بھی اس گٹھے کو سر پر نہیں اٹھا پائے گی۔ لیکن اس بڑھیا نے امامہ کی مدد سے بڑے آرام سے وہ گٹھا سر پر اٹھا لیا تھا۔

"ذرا میری بکری کی رسی مجھے پکڑانا۔" اس بوڑھی عورت نے اب دور ایک درخت کے دامن میں اگی گھاس چرتی ہوئی ایک بکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امامہ سے کہا تھا۔ امامہ کو ایک لمحے کے لیے تامل ہوا لیکن پھر اس نے جا کر تھوڑی بہت جدوجہد کے بعد اس بکری کی رسی پکڑ ہی لی تھی۔

"آپ چلیں میں ساتھ چلتی ہوں کہاں جانا ہے آپ کو؟"

امامہ کو خیال آیا تھا کہ وہ اتنے بڑے لکڑیوں کے گٹھڑ کے ساتھ بکری کو کیسے تھامے گی۔

"وہ بس یہیں آگے ہی جانا ہے ادھر سڑک پار کر کے دوسری طرف۔" بوڑھی عورت نے نہر کے سبزے سے نکل کر سڑک کی طرف جاتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے سمجھایا تھا۔

امامہ بکری کی رسی کھینچتی ہوئی چپ چاپ اس عورت کے پیچھے چل پڑی تھی جس کے پاؤں ننگے تھے اور ایڑیاں، کھردری اور پیدل چل چل کر پھٹ چکی تھیں۔ امامہ اونی جرابوں کے ساتھ، بہت آرام دہ کورٹ شوز پہنے ہوئے بھی اس کے باوجود وہ اس بوڑھی عورت کی سبک رفتاری کا سامنا نہیں کر پا رہی تھی جو یوں چل رہی تھی جیسے ٹائلز کے فرش یا کسی مخملیں قالین پر چل رہی ہو۔

سڑک پار کرتے ہی امامہ کو دس بیس کے قریب وہ جھگیاں نظر آ گئی تھیں جنہیں اماں اپنا گھر کہہ رہی تھی۔ وہ جھگیاں بس ٹینٹوں پر مشتمل نہیں تھیں۔ لوگوں نے اپنی جھگی کے گرد سرکنڈوں کی دیواریں کھڑی کر کے جیسے احاطے سے بنا لیے تھے جن کے فرش کو مٹی اور گارے سے لیپا ہوا تھا۔ وہ کچھ تامل کے ساتھ ایسی ہی ایک جھگی کے احاطے میں بکری کی رسی پکڑے اماں کے پیچھے چلتی ہوئی داخل ہوئی تھی۔

اس بوڑھی عورت نے احاطے کے ایک کونے میں سر پر لادا ہوا گٹھڑ اتار پھینکا تھا اور پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھے جیسے اس نے گہرے سانس لیتے ہوئے اپنی سانس بحال کی تھی۔ بکری تب تک امامہ کے ہاتھ سے رسی چھڑا کر سرکنڈوں کی دیوار کے ساتھ اس جگہ پہنچ گئی تھی جہاں اسے باندھا جاتا تھا اور جہاں زمین پر کچھ مرجھائی ہوئی گھاس پھوس پڑی تھی وہ اب اس پر منہ مارنے لگی تھی۔

احاطے کے ایک دوسرے حصے میں مٹی کے ایک چولہے پر مٹی کی ایک ہنڈیا چڑھی ہوئی تھی جس سے اٹھنے والی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی احاطہ روشن دھوپ سے روشن اور گرمایا ہوا تھا۔ وہاں نہر والی ٹھنڈک نہیں تھی ایک آسودہ سی حرارت تھی۔ وہ جیسے کسی گرم آغوش میں آ گئی تھی۔

بوڑھی عورت تب تک لکڑیوں کا گٹھڑ کھول کر اس میں سے کچھ لکڑیاں نکال کر چولہے کی طرف آ گئی تھی۔

"ارے تو کھڑی کیوں ہے اب تک۔ بیٹھ کر دم تو لے۔ میری خاطر کتنا چلنا پڑ گیا تجھے۔ میں نے کہا بھی تھا میں لے جاتی ہوں بکری کو۔ میرا تو روز کا کام ہے۔ پیدا ہوتے سے کرتی آئی ہوں محنت مشقت۔ پر تو شہری کڑی ہے۔ تجھ سے کہاں ہوتی ہے کوئی مشقت۔"

اس نے کہتے ہوئے چولہے سے کچھ فاصلے پر پڑی ایک چوکی کو جیسے اس کے لیے آگے کھسکا دیا تھا۔

"میں بھی مشقت ہی کاٹتی آئی ہوں اماں! یہ مشقت تو کچھ بھی نہیں۔"

امامہ اس سے کہتے ہوئے آگے بڑھ آئی تھی۔ اس کا خیال تھا بوڑھی عورت نے اس کی بات نہیں سنی ہوگی لیکن وہ بوڑھی عورت ہنس پڑی تھی۔

"بس مجھے مشقت نہیں لگتی تجھے لگتی ہے 'یہی تو فرق ہے۔۔۔ پر تیرا قصور نہیں سارا فرق جوانی کا ہے۔ جوانی میں ہر چیز مشقت لگتی ہے۔ بڑھاپا خود ایسی مشقت ہے کہ باقی مشقتیں چھوٹی بنا دیتا ہے۔"

اس عورت نے اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر کہا تھا امامہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی وہ اس حلیے اور اس جگہ رہنے والی عورت سے ایسی بات کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔

"آپ پڑھی لکھی ہیں؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

"بہت زیادہ۔" وہ عورت اس بار بھی چولہے ہی کی طرف متوجہ تھی اور اس بار بھی اس نے بات ہنس کر ہی کہی تھی مگر لہجے میں تمسخر تھا اپنے لیے۔ جو امامہ تک پہنچ گیا تھا۔ امامہ نے اگلا سوال نہیں کیا تھا وہ اب اس ہانڈی اور چولہے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی جس کے پاس وہ بوڑھی عورت بیٹھی تھی 'اینٹوں سے بنے مٹی کے چولہے پر رکھی گھسی ہوئی پرانی مٹی کی ہنڈیا۔ میں ساگ اپنے پانی میں گل رہا تھا۔ اس بوڑھی عورت نے نہر کے کنارے سے چنی ہوئی جھاڑیاں توڑ توڑ کر چولہے میں پھینکنا شروع کر دیا۔ وہ آگ کو اسی طرح بھڑکائے رکھنے کی کوشش تھی۔

امامہ مٹی سے لیپے ہوئے گرم فرش پر چولہے کے قریب آکر بیٹھ گئی تھی۔ پاؤں سے جرابیں اور جوتے اتار کر اس نے اپنے سرد اور سوجے ہوئے پیروں کو دھوپ سے گرم فرش پر جیسے کچھ حدت پہنچانے کی کوشش کی تھی۔

اماں اس عمر میں بھی پنجوں کے بل بیٹھی لکڑیوں کو توڑ مروڑ کر چولہے میں جھونک رہی تھی۔ آگ میں لکڑیوں کے تڑخنے اور چٹخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ساگ کی ہانڈی سے اٹھتی بھاپ اور اس میں پڑتے ابال دیکھتی رہی۔

"تو بندہ کیا کرتا ہے تیرا؟" وہ اماں کے اس اچانک کیے ہوئے سوال پر چونکی پھر بڑبڑائی۔

"کیا کرتا ہے؟" اس نے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی تھی پھر کہا۔ "کام کرتا ہے۔"

"کیا کام کرتا ہے؟" اماں نے پھر پوچھا۔

"باہر کام کرتا ہے۔" وہ ساگ کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

"پردیس میں ہے؟" بوڑھی عورت نے جواباً" کہا۔ وہ بھی اب اسی کی طرح زمین پر بیٹھ گئی تھی اور اس نے اپنے گھٹنوں کے گرد اس کی طرح بازو لپیٹ لیے تھے۔

"ہاں پردیس میں ہے۔" وہ اسی طرح ساگ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"تو تو یہاں کس کے پاس ہے؟ سسرال والوں کے پاس؟"

"نہیں۔"

"پھر؟"

"میں کسی کے پاس نہیں ہوں۔" ساگ پر نظریں جمائے اس نے بے ربط جواب دیا۔

"بندے نے گھر سے نکال دیا ہے کیا؟" اس نے چونک کر اس عورت کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں!"

"پھر تو لڑ کے آئی ہے کیا؟"

"نہیں۔" اس نے بے ساختہ سر ہلایا۔

"تو پھر یہاں کس لیے آئی ہے؟"

"سکون کے لیے۔" اس نے بے اختیار کہا۔

"سکون کہیں نہیں ہے۔" وہ اس عورت کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"تو جو چیز دنیا میں ہے ہی نہیں اسے دنیا میں کیا ڈھونڈنا؟" اس نے حیرت سے اس عورت کو دیکھا۔ وہ گہری بات تھی اور اس عورت کے منہ سے سن کر اور بھی گہری لگی تھی اسے جو اس جھگی میں بیٹھی آگ میں لکڑیاں جھونک رہی تھی۔

"پھر بندہ رہے کیوں دنیا میں اگر بے سکون رہنا ہے؟" وہ اس سے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہتی تھی جو اس نے پوچھا تھا۔

"تو پھر کہاں رہے؟" لکڑیاں جھونکتی اس عورت نے ایک لحظہ کے لیے رک کر اسے دیکھتے ہوئے ڈائریکٹ پوچھا۔ وہ کچھ لاجواب ہوتے ہوئے دوبارہ ساگ کو دیکھنے لگی۔

"تیرا آدمی کہتا نہیں واپس آنے کو؟"

"پہلے کہتا تھا۔ اب نہیں کہتا۔" اس نے خود بھی لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے آگ میں پھینکنے شروع کر دیے تھے۔

"بے چارہ اکیلا ہے وہاں؟"

وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی۔ "ہاں۔" اس نے اس بار مدھم آواز میں کہا۔

وہ بوڑھی عورت اب پلاسٹک کے ایک شاپر میں پڑا ہوا آٹا ایک تھالی میں ڈال رہی تھی۔

"تو کیا اسے چھوڑ کر آگئی ہے؟" دھوپ میں پڑے ایک گھڑے سے ایک گلاس میں پانی نکالتے ہوئے اماں نے جیسے افسوس کیا تھا۔ وہ بے مقصد آگ میں لکڑیاں پھینکتی رہی۔

"تجھ سے پیار نہیں کرتا تھا؟"

وہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہوئی۔

"کرتا تھا۔" اس کی آواز بے حد مدھم تھی۔

"خیال نہیں رکھتا تھا؟" ساگ سے اٹھتی بھاپ اس کی آنکھوں میں اترنے لگی تھی اسے بڑے عرصے کے بعد پتا نہیں کیا کیا یاد آیا تھا۔

"رکھتا تھا۔" آواز اور بھی مدھم ہو گئی تھی۔

اماں اب اس کے پاس بیٹھی اس تھالی میں دو روٹیوں کا آٹا گوندھ رہی تھی۔

"روٹی کپڑا نہیں دیتا تھا؟" اس نے چادر سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

"دیتا تھا۔" وہ اپنی آواز خود بھی بمشکل سن پائی تھی۔

"تو نے پھر بھی چھوڑ دیا اسے؟ تو نے بھی اللہ سے بندے والا معاملہ کیا اس کے ساتھ۔ سب کچھ لے کر بھی دور ہو گئی اس سے۔"

اماں نے آٹا گوندھتے ہوئے جیسے ہنس کر کہا تھا۔ وہ بول نہیں سکی تھی۔ بولنے کے لیے کچھ تھا نہیں۔ پلکیں جھپکے بغیر وہ صرف اماں کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"تجھے یہ ڈر بھی نہیں لگا کہ کوئی دوسری عورت لے آئے گا وہ؟"

"نہیں۔" اس بار آٹا گوندھتے اماں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

"تجھے پیار نہیں ہے اس سے؟" کیا سوال آیا تھا وہ نظریں چرا گئی۔ اس کی چپ نے اماں کو جیسے ایک اور سوال دیا۔

"کبھی پیار کیا ہے؟" آنکھوں میں سیلاب آیا تھا۔ کیا کیا یاد نہیں آگیا تھا۔

"کیا تھا۔" اس نے آنسوؤں کو بہنے دیا تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" اماں نے اس کے آنسوؤں کو نظرانداز کر دیا تھا۔

"وہ نہیں ملا۔" سر جھکائے اس نے آگ میں کچھ اور لکڑیاں ڈالیں۔
"ملا نہیں یا اس نے چھوڑ دیا؟" اس کے منہ میں جیسے ہری مرچ آ گئی تھی۔
"اس نے چھوڑ دیا۔" پتا نہیں ساگ ہانڈی میں زیادہ پانی چھوڑ رہا تھا۔ یا اس کی آنکھیں پر آگ دونوں جگہ تھی۔
"پیار نہیں کرتا ہو گا۔" اماں نے بے ساختہ کہا۔
"پیار کرتا تھا لیکن انتظار نہیں کر سکتا تھا۔" اس نے پتا نہیں کیوں اس کی طرف سے صفائی دی تھی۔
"جو پیار کرتا ہے وہ انتظار کرتا ہے۔" جواب کھٹاک سے آیا تھا اور اس کی ساری وضاحتوں دلیلوں کے پرخچے اڑا گیا تھا۔ وہ روتے ہوئے ہنسی تھی یا پھر شاید ہنستے ہوئے روئی تھی۔ کیا سمجھا دیا تھا اس عورت نے جو دل دماغ کبھی سمجھا نہیں سکے تھے اسے۔
"اس آدمی کی وجہ سے گھر چھوڑ آئی اپنا؟" اماں نے پھر پوچھا۔
"وہ نہیں۔۔۔ بس وہاں بے سکونی تھی مجھے اس لیے آ گئی۔" اس نے بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔
"کیا بے سکونی تھی؟" وہ برستی آنکھوں کے ساتھ بتا گئی۔
اماں چپ چاپ آٹا گوندھتی رہی اس کے خاموش ہونے پر بھی اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ خاموشی کا وہ وقفہ بڑا طویل ہو گیا تھا۔ بے حد طویل اماں آٹا گوندھنے کے بعد رکھ کر ساگ میں ڈوئی چلانے لگی تھی۔ وہ ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹے ساگ کو پکتے دیکھتی رہی۔
"وہاں نہر کے کنارے کیوں کھڑی تھی؟" اماں نے یک دم ساگ گھونٹتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس نے سر اٹھا کر اماں کو دیکھا۔
"بہت بزدل ہوں اماں۔۔۔ مرنے کے لیے نہیں کھڑی تھی۔"
نم آنکھوں کے ساتھ اس نے جیسے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اس بوڑھی عورت سے پوچھا تھا۔ اسے جیسے اب سمجھ میں آیا تھا وہ وہاں سے اسے یہاں تک کیوں لے آئی تھی۔ اس کے ہنسنے پر جیسے وہ بھی مسکرائی تھی اس کے خستہ حال بوسیدہ دانت دکھے تھے۔
"یعنی تو تو بڑی بہادر ہے۔ میں نے بزدل سمجھا۔ تو تو میرے سے بھی بہادر ہے پھر۔"
"نہیں آپ بہادر ہیں۔ میں تو بے حد کمزور ہوں۔ اس بکری سے بھی کمزور جس کو گھیر کے لائی ہوں۔" امامہ نے کہا تھا۔
"تجھے اپنی ہونے والی اولاد کا بھی خیال نہیں آتا؟ پیار نہیں آتا اس پر؟" اس کی آنکھیں ایک بار پھر برسنے لگی تھیں۔
"کوئی اس طرح گھر چھوڑتا ہے جیسے تو چھوڑ آئی۔ مرجاتے ہیں بڑے بڑے پیارے مرجاتے ہیں پر کوئی ایک پیارے کے مرنے پر باقیوں کو چھوڑ دیتا ہے؟"
برستی آنکھوں کے ساتھ امامہ نے اس کی باتیں سنیں وہ وہی کچھ کہہ رہی تھی جو اس سے کوئی بھی پوچھتا کوئی بھی کہہ دیتا مگر وہ کسی کو وہ جواب نہیں دیتی تھی جو اس نے اس وقت اس عورت کو دیا تھا جس سے اس کی جان پہچان تک نہ تھی۔ بعض دفعہ انسان دل کا وہ بوجھ جو اپنوں کے سامنے ہلکا نہیں کرتا غیروں کے سامنے کرتا ہے۔ وہ بھی وہاں جہاں اسے یقین ہو وہ راز دیا رہے گا۔ کبھی نکل کر نہیں آئے گا۔
"میں اب کسی سے پیار نہیں کرنا چاہتی اماں۔"
بوڑھی عورت نے ساگ کا ڈھکنا اٹھا کر پھر ڈوئی چلائی۔
"مجھے لگتا ہے جس سے بھی میں پیار کرتی ہوں وہ مجھ سے چھن جاتا ہے۔ وہ چیز میرے پاس نہیں رہتی۔ تو پھر

کیوں اس تکلیف سے گزروں میں بار بار کیوں میں زندگی میں ایسے رشتے رکھوں جن سے بچھڑنا مجھے اتنی تکلیف دے۔"

اس نے جیسے روتے ہوئے اس بوڑھی عورت کے سامنے سینے کی وہ پھانس نکالی تھی جس نے اس کا سانس روک رکھا تھا۔

"بار بار پیار کروں۔۔۔ بار بار گنوا دوں۔۔۔ میں اب اس تکلیف سے نہیں گزر سکتی۔"

وہ روئی جا رہی تھی۔ آنسو یوں نکل رہے تھے جیسے آبلوں کا پانی پتا نہیں بوڑھی عورت کی آنکھوں میں ساگ کی بھاپ نے پانی چھوڑا تھا یا اس کے درد نے لیکن اس نے بھی اپنی خستہ حال میلی کچیلی چادر کے پلو سے اپنی آنکھیں رگڑنا شروع کر دی تھیں۔

"یہ تو نہیں کر سکتی' یہ کوئی انسان بھی نہیں کر سکتا کہ اپنوں کو اس لیے چھوڑ دے تاکہ ان کے بچھڑنے کی تکلیف سے بچ جائے ایک ایک کر کے بچھڑ رہے ہیں تو درد جھیل نہیں پا رہی۔ سب کو اکٹھا چھوڑ کر درد جھیل لے گی؟" اس نے جو بات اس سے پوچھی تھی اس کا جواب امامہ کے پاس نہیں تھا۔ اور اگر تھا بھی تو وہ اس جواب کو دہرانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

"اس جھگی کے اندر میرا 38 سال کا جوان بیٹا ہے۔ تھوڑا میں لے کر آتی ہوں اسے تمہاری باتوں میں تو بھول ہی گئی تھی میں اسے۔"

وہ بوڑھی عورت یک دم اٹھ کر اندر چلی گئی تھی چند منٹوں کے بعد وہ ایک ریڑھی نما گاڑی کو دھکیلتی ہوئی باہر لائی جس میں ایک دبلا پتلا مرد ایک بستر پر لیٹا ہوا قہقہے لگا رہا تھا یوں جیسے وہ ماں کی توجہ ملنے پر خوش تھا۔ اس عورت نے اگر اسے یہ نہ بتایا ہوتا کہ اس کی عمر 38 سال تھی تو امامہ اسے 20-18 سال کا کوئی لڑکا سمجھتی۔ وہ ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے معذور تھا۔ بات بھی ٹھیک سے نہیں کر پاتا تھا بس اس بوڑھی عورت کو دیکھ کر ہنستا تھا اور وہ اسے دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

اس نے ریڑھی لا کر امامہ کے قریب کھڑی کر دی تھی اور خود روٹی پکانے بیٹھ گئی تھی۔

"میرا اکلوتا بیٹا ہے یہ۔ 38 سال میں نے اس کے سہارے گزارے ہیں اللہ کے سہارے کے بعد۔" وہ پیڑا بناتے ہوئے اسے بتانے لگی تھی۔ "کوئی اور اولاد نہیں آپ کی؟" اس کے آنسو تھمنے لگے تھے۔

"پانچ بیٹے پیدا ہوئے تھے سب صحت مند۔ پر دنوں میں ختم ہو گئے پھر یہ پیدا ہوا تو شوہر نے کہا اسے کسی درگاہ پر چھوڑ آتے ہیں میں نہیں پال سکتا ایسی اولاد کو۔ بڑی ذمہ داری ہے پر میں کیسے چھوڑتی اپنی اولاد مجھے تو پیار ہی بڑا تھا اس سے۔"

بوڑھی عورت نے روٹی اب اس توے پر ڈال دی تھی جس سے کچھ دیر پہلے اس نے ساگ کی ہنڈیا اتاری تھی۔ وہ اب اپنے بیٹے کو یوں پچکار رہی تھی جیسے وہ اڑتیس سال کا نہیں آٹھ ماہ کا تھا اور وہ بھی اس ریڑھی کے اندر ماں کے پچکارنے پر اپنے نحیف' نزار اعضا کو اسی طرح سکیڑ رہا تھا کھلکھلاتے ہوئے جیسے واقعی کوئی ننھا بچہ تھا۔

"شوہر دو چار سال سمجھاتا رہا مجھے پر میں نہیں مانی۔ اللہ نے دی تھی اولاد۔ اللہ کی دی چیز کیسے پھینک آتی۔ انسان کی دی ہوئی چیز ہوتی تو پھینک آتی۔ کوئی اور بچہ نہیں ہوا اس کے بعد میرے ہاں۔ شوہر کو بڑا پیار تھا مجھ سے پر اسے اولاد بھی چاہیے تھی۔ میرا بھی دل چاہتا تھا خود ہی نکل آؤں اس کی زندگی سے۔ پر میرے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اس لیے وہیں بیٹھی رہی' دوسری شادی سے دس دن پہلے کھیتوں میں اسے سانپ لڑ گیا۔ لوگ کہتے تھے میری تو پڑی ہے۔ پر میں نے تو کوئی بددعا بھی نہیں دی اس کو۔ میں تو خوش ہی رہی جب تک اس کے ساتھ رہی۔"

اماں کی آنکھوں میں پانی آیا تھا پر وہ دوپٹے سے رگڑ کر۔۔۔ توے پر پھولتی ہوئی روٹی سینکنے لگی۔

"وہ مر گیا تو ساری زمین جائیداد رشتہ داروں نے چھین لی۔ بس بیٹا میرے پاس رہنے دیا۔ یہ ٹھیک ہوا تو یہ بھی چھین لیتے وہ۔ پر مولا کا کرم تھا یہ ایسا تھا۔ اڑتیس سال سے اس کا اور میرا ساتھ ہے اس کو شوہر کے کہنے پر درگاہ پر چھوڑ آئی ہوتی تو میرا کیا ہوتا۔"

اماں نے روٹی عجیب خوشی اور سرشاری کے عالم میں اس کے سامنے رکھی تھی۔ کوئی بوجھ تھا جو امامہ کے کندھوں سے ہٹ رہا تھا کوئی قفل تھا جو کھل رہا تھا کوئی سحر تھا جو ٹوٹ رہا تھا۔

"جو چھوڑ اللہ دے اس پر صبر کر اور خود کسی کو چھوڑا نہ دے۔ اللہ پسند نہیں کرتا یہ۔"

اس عورت نے روٹی پر ساگ ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"غم بہت بڑا تھا میرا اماں۔" اس نے کہے بغیر سر جھکائے پہلا لقمہ توڑا۔

"اللہ نے تجھے غم دیا تو نے اپنے آدمی کو۔ تو نے اپنا غم کون سا اپنے اندر رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔"

وہ لقمہ ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی منہ میں نہیں ڈال سکی آنکھیں پھر دھندلائی تھیں۔ اسے سالار یاد آیا تھا۔ ہاتھ پر اس کا محبت بھرا لمس یاد آیا تھا۔ اس کی محبت اس کی عنایات یاد آئی تھیں۔ اور اس اولاد کا خیال آیا تھا جسے اس نے بھی بڑی دعائیں کر کر کے مانگا تھا اور جب دعا پوری ہو گئی تھی تو وہ کسی بھی چیز کی قدر نہیں کر رہی تھی۔

اس بوڑھی عورت کے احاطے میں بیٹھے اسے پہلی بار وسیم پر صبر آیا تھا۔ سعد پر صبر آیا تھا وہ اس دن وہاں سے اٹھ کر بھاگی تھی۔ اسے اب گھر جانا تھا سالار کے پاس اور واپس گھر آ کر اس نے خود سالار کو فون کر کے واپس آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ حیران ہوا تھا شاید حیران سے زیادہ پریشان ہوا تھا مگر اس نے اس کی علت ختم کروا دی تھی۔

وہ جانے سے پہلے ایک بار پھر اس بوڑھی عورت سے ملنے آئی تھی اس کے لیے کچھ چیزیں لے کر اسے بے حد کوشش کے باوجود وہ جگہ نہیں ملی تھی۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ آدھا دن نہر کے اس کنارے اس جھگیوں والے علاقے کو ڈھونڈتی رہی تھی۔ ڈرائیور نے وہ علاقہ خود نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ اس دن وہ اسے بہت پیچھے چھوڑ کے نہر کنارے اتری تھی اور پھر وہاں سے پیدل ہی واپس آئی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ جگہ وہیں ہونی چاہیے تھی۔ اسی سڑک پر کہیں۔ مگر وہاں وہ جھگیاں نہیں تھیں نہ وہ بوڑھی عورت جس کے ہاتھ کی روٹی اور ساگ کا سواد اسے ابھی بھی اپنی زبان پر محسوس ہوتا تھا۔ نہ وہ اڑتیس سال کی اولاد کی مشقت جس نے اس بوڑھی عورت کے لیے ہر بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔ اور نہ اس بہت زیادہ پڑھی لکھی عورت کی باتیں۔ جس نے چابیوں کی طرح اس کے وجود کے قفل اور گتھیاں کھول کر اسے آزاد کر دیا تھا۔

جبرئیل سکندر اپنی پیدائش سے بھی پہلے اپنی ماں کے بہت سے رازوں کا امین تھا۔

امریکہ کے اس اسپتال کی نیورو سرجری ڈیپارٹمنٹ کے آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹر جس شخص کا دماغ کھولے بیٹھے تھے۔ وہ آبادی کے اس 2.5 فیصد سے تعلق رکھتا تھا جو 150 آئی کیو لیول رکھتے تھے اور اس آئی کیو لیول کے ساتھ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔

وہ آپریشن آٹھ گھنٹے سے ہو رہا تھا اور ابھی مزید کتنی دیر جاری رہنا تھا یہ کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ ڈاکٹرز کی اس ٹیم کو لیڈ کرنے والا ڈاکٹر دنیا کے قابل ترین سرجن میں سے ایک مانا جاتا تھا۔ آپریشن تھیٹر سے منسلک ایک کلاس روم میں نیورو سرجری کے ایڈ پرنٹس اس وقت جیسے سحر زدہ معمول کی طرح اس ڈاکٹر کے چلتے ہوئے ہاتھوں کو بڑی اسکرین پر دیکھ رہے تھے جو اس کھلے ہوئے دماغ پر یوں کام کر رہا تھا جیسے کوئی پیانسٹ کی انگلیاں ایک پیانو پر۔ وہ اپنی مہارت سے سب کو مسمرائز کیے ہوئے تھا سوائے اس ایک شخص کے جس کی زندگی اور موت اس وقت اس کے ہاتھ میں تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں ان شاء اللہ)

حاصل و محصول

واشنگٹن میں ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں وہ سالار سکندر کی پہلی میٹنگ اور پریزنٹیشن نہیں تھی۔ وہ سینکڑوں بار نہیں تو درجنوں بار وہاں آچکا تھا مگر اپنی زندگی میں وہ کبھی کسی بورڈ روم میں دماغ پر اتنا بوجھ لے کر نہیں بیٹھا تھا جتنا اس دن بیٹھا تھا۔

وہ جہاز میں اپنی فلائٹ کے دوران دو گھنٹے سویا تھا اور باقی کا وقت اس نے لیپ ٹاپ پر اس پریزنٹیشن کو بار بار دیکھنے اور اس میں تبدیلیاں اور اضافے کرتے گزارا تھا جو وہ اس میٹنگ میں پیش کرنے آیا تھا۔ وہ اس پریزنٹیشن کے شاندار ہونے کے باوجود یہ جانتا تھا وہ ایک ہارا ہوا کیس ایک ایسی جیوری کے سامنے پیش کرنے جا رہا تھا جو اس کیس کے حوالے سے تصویر کا کوئی دوسرا رخ دیکھنے پر تیار نہیں ہونے والی تھی کیونکہ تصویر کا وہ دوسرا رخ بے حد بھیانک تھا لیکن بھیانک ہونا اس سے نظریں چرانے کی وجہ نہیں تھی بلکہ اس بھیانک رخ میں نظر آنے والا اپنا عکس تھا جو ان عالمی طاقتوں کے نمائندوں کے ضمیر کو سلانے کا باعث بن رہا تھا۔ سالار سکندر کو سانپوں کے بل میں بیٹھ کر ان کا زہر نکالنے کی تجویز پیش کرنی تھی اور اسے اپنی کامیابی کے بارے میں کوئی خوش فہمی یا غلط فہمی نہیں تھی۔

اس کی فلائٹ واشنگٹن میں جس وقت پہنچی اس کے ٹھیک چار گھنٹے کے بعد ورلڈ بینک کے "دربار" میں اس کی حاضری تھی۔ وہ ایک بار پھر ہوٹل کے کمرے میں سوئے بغیر کاغذات کا وہ پلندہ دیکھتا رہا جو اسے اس پریزنٹیشن کے ساتھ بورڈ روم میں تقسیم کرنا تھے۔ ان کاغذات کے ڈھیر کو وہ اگر کسی کورٹ میں پیش کر دیتا تو وہ کیس جیت جاتا۔" لیکن سوال وہاں یہ تھا کہ دنیا میں ایسی کون سی عدالت تھی جو اس کیس کو سنتی۔ کانگو کی عدالتیں ریڑھیاں تھیں جن سے کچھ بھی خریدا جا سکتا تھا۔ انصاف کے سوائے۔ ایباکا عالمی عدالت انصاف میں جانے کے وسائل نہیں رکھتا تھا۔ انصاف ملنا نہ ملنا تو خیر دور کی بات تھی۔ اور سالار سکندر ورلڈ بینک میں کام کرتا تھا۔ وہ اپنے پروفیشنل معاملات کو خفیہ رکھنے کا پابند تھا۔ اور ان سب حالات میں صرف ایک میڈیا تھا جس کا گلا گھونٹنے کی ورلڈ بینک کوشش میں تھا کیونکہ وہ پیٹرس ایباکا کی آخری امید تھا اور سالار کو پتا تھا ایباکا کسی بھی حد تک جا سکتا تھا ان جنگلات کی تباہی کو روکنے کے لیے جو اس کے قبیلے کی بقا کے ضامن تھے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ پیٹرس ایباکا کو اس کام سے روکنے کے لیے "مہذب دنیا" بھی کسی حد تک جا سکتی تھی۔ اسے یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ پیٹرس ایباکا اس وقت نیویارک کے ایک اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔



اس بورڈ روم کا ماحول ویسا نہیں تھا جیسا اس نے ہمیشہ دیکھا تھا۔ سنجیدگی ہر بورڈ کا حصہ ہوتی تھی لیکن جو اس نے اس دن وہاں دیکھی تھی وہ سنجیدگی نہیں تھی وہ سرد مہری تھی اور وہ سرد مہری بورڈ روم میں بیٹھے صرف کسی ایک یا دو لوگوں کے انداز اور حرکات و سکنات سے نہیں جھلک رہی تھی۔ وہاں اس بورڈ روم میں بیٹھے سات کے سات لوگوں کے چہروں اور آنکھوں میں ایک جیسی ٹھنڈک اور سرد مہری تھی۔ ایسی سرد مہری جو کسی کمزور اعصاب کے انسان کو حواس باختہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ بے تاثر چہرے دوسرے کے اوسان خطا کر دینے والی نظریں۔ کسی دوستانہ مسکراہٹ سے عاری بھنچے ہوئے لب۔ جن پر اگر کبھی کوئی مسکراہٹ آتی بھی تو وہ ایک تضحیک آمیز اور توہین آمیز خم سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا تھا جو پل بھر رہ کر غائب ہو جاتا تھا۔

ایک بیضوی شکل کی میز کے گرد ٹانگوں پر ٹانگیں رکھے وہ پانچ مرد اور دو عورتیں اس کام کے ماہر تھے جو اس وقت کر رہے تھے۔ وہ ورلڈ بینک کے سالار سکندر [illegible] زندگی میں

تحفظ فراہم کبھی بیٹھے بٹھائے ورلڈ بینک میں کام کرتے کرتے پروفیشنل ethics (اخلاقیات) کا دورہ پڑتا' انسانیت یاد آنا شروع ہو جاتی۔ سالار سکندر ان کے سامنے کیا شے تھا۔ کم از کم اس میٹنگ کے آغاز سے پہلے وہ یہی سوچ کر آئے تھے۔ اجتماعی طور پر ان کی حکمت یہ نہیں بھی تھی تو بھی انفرادی طور پر ان کا طریقہ کار یہی تھا۔

وہ واشنگٹن ڈی سی میں ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں بیٹھے وہ لوگ تھے جو سمجھتے تھے وہ سرخاب کے پروں کے ساتھ پیدا ہوئے تھے اور ورلڈ بینک کے ساتھ ان کی کئی سالوں پر مشتمل ایسوسی ایشن اور ان کا کام ان کے اس ذہنی خلل کو اگر بڑھاتا جاتا تھا تو غلط بھی نہیں تھا۔ سالار سکندر اس آرگنائزیشن میں واحد ذہین اور قابل شخص نہیں تھا وہاں بڑے بڑے طرم خان بیٹھے تھے جو اپنے کئی دہائیوں کے تجربے اور قابلیت سے کسی کے بھی پرخچے اڑا سکتے تھے۔ واشنگٹن آنے سے پہلے سالار سکندر کو اندازہ تھا وہ کیا بھگتنے جا رہا تھا۔ اس بورڈ روم کے اندر لیکن جس کے بارے میں اسے اندازہ نہیں تھا وہ بورڈ روم سے باہر پیش آنے والے حالات اور واقعات تھے۔

وہ سات لوگ سالار سکندر کے کیریئر کے حوالے سے ایک ایک چیز جانتے تھے اور اتنی ہی معلومات وہ ان کے بارے میں رکھتا تھا۔ ان میں سے کسی کو کسی کے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ سالار سکندر نے میٹنگ کے آغاز میں اس میٹنگ کی سربراہی کرنے والے ہیڈ کے ابتدائی کلمات بڑے تحمل سے سنے تھے۔ وہ سالار سکندر کی نااہلی، کوتاہیوں اور ناکامیوں کو ڈسکس کر رہا تھا۔ سالار نے باقی چھ لوگوں کی نظریں خود پر جمی محسوس کیں۔ وہ ایک چارج شیٹ تھی جو اس پروجیکٹ کا ذکر کرتے ہوئے وہ مائیکل فرینک اس پر لگا رہا تھا۔ سالار بھی اتنے ہی بے تاثر چہرے کے ساتھ ان الزامات کو سنتا رہا۔ اس میٹنگ کا ایجنڈا یہ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود سالار کے لیے وہ سب الزامات غیر متوقع نہیں تھے۔

"میں ان میں سے کسی بھی بات کا جواب دینے سے پہلے اس پروجیکٹ کے حوالے سے ایک پریزنٹیشن دینا چاہتا ہوں کیوں کہ میرا خیال ہے یہ پریزنٹیشن ان میں سے بہت سارے سوالات اور اعتراضات کا جواب دے دے گی جو آپ لوگ مجھ پر کر رہے ہیں۔"

سالار نے مائیکل کے ابتدائی کلمات کے بعد اس کے کسی الزام کا جواب دینے کے بجائے کہا تھا۔ ان سات افراد میں سے کسی نے اسے اس پریزنٹیشن کو پیش کرنے سے روکا نہیں تھا لیکن ان میں سے کسی نے اس پریزنٹیشن کی نوعیت اور مقصد جاننے میں دلچسپی بھی نہیں لی تھی۔

سالار ایک کے بعد ایک سلائیڈ پروجیکٹر پر دکھاتا گیا۔ اس میں بہت سارے حقائق اور اعداد و شمار تھے اور اس کی اپنی ذاتی تحقیق بھی۔ وہ ان تمام چیزوں کو ان سلائیڈز کے ذریعے دکھا رہا تھا۔ ورلڈ بینک کے تعاون سے اگر وہ منصوبہ تو چڑھ جاتا تو افریقہ کی جنگلی حیاتیات کے ساتھ ساتھ پگمیز کی ممکنہ تباہی کے حوالے سے ہولناک اعداد و شمار۔ ورلڈ بینک کے چارٹر کی کون کون سی شقوں کی خلاف ورزی اس پروجیکٹ کے ذریعے ہو رہی تھی۔ ان جنگلات میں کام کرنے والے کمپنیز کی طرف سے کانگو کی مقامی آبادی کے استحصال کے ڈاکومینٹری ثبوت۔ اور انٹرنیشنل ڈونر کمپنیز اور این جی اوز کے خدشات پر مشتمل رپورٹس کے حوالے۔ اس کی پریزنٹیشن مکمل تھی، اور وہ اگر کسی اخبار یا نیوز نیٹ ورک کے ہاتھ لگ جاتی تو افریقہ میں وہ ورلڈ بینک کا سب سے بڑا اسکینڈل ہوتا۔ ان سات لوگوں نے وہ پریزنٹیشن بے تاثر چہروں کے ساتھ اپنی اپنی کرسیوں پر ساکت بیٹھے دم سادھے دیکھی تھی۔

لیکن آدھ گھنٹہ کی اس پریزنٹیشن کے ختم ہونے کے بعد ان ساتوں کے ذہن میں جو خدشہ ابھرا تھا وہ ایک ہی تھا۔ سالار سکندر کے ہاتھ میں وہ گرینیڈ تھا جس کی پن وہ نکال کر اسے ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ گرینیڈ دوسرے کی طرف پھینک دیتے سے ان کی جان چھوٹ جاتی۔ وہ جہاں بھی پھٹتا دہر جا بجا پھیلاتا۔

پروجیکٹر کی [illegible] کے چہروں

پر نظر ڈالی۔ مائیکل کے چہرے کو دیکھا جو اس کی صدارت کر رہا تھا۔ اتنے سالوں کی پبلک ڈیلنگ کے بعد وہ اتنا اندازہ تو لگا ہی پایا تھا کہ اس نے پریزنٹیشن تیار کرنے اور اسے یہاں پیش کرنے میں اپنا وقت "ضائع" کیا تھا۔

"تو تم اس پروجیکٹ پر کام نہیں کرنا چاہتے؟"

مائیکل نے اپنی خاموشی توڑتے ہوئے اس سے جو سوال کیا تھا اس نے بورڈ روم میں موجود لوگوں کے حوالے سے سالار کے خدشات کی جیسے تصدیق کی تھی۔

"میں یہ چاہتا ہوں کہ ورلڈ بینک کانگو میں اس پروجیکٹ کو ختم کردے۔" تمہید اگر مائیکل نے نہیں باندھی تھی تو سالار نے بھی اس پر اپنا وقت ضائع نہیں کیا تھا۔

"تم مضحکہ خیز باتیں کر رہے ہو۔ اتنے سالوں سے شروع کیے جانے والے ایک پروجیکٹ کو ورلڈ بینک ایک چھوٹے سے عہدے دار کے کہنے پر ختم کردے کیوں کہ اسے بیٹھے بٹھائے یہ فوبیا ہو گیا ہے کہ بینک کانگو میں بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے والے پروجیکٹس کو سپورٹ کر رہا ہے۔"

وہ جولیا پرڈو تھی جس نے بے حد تضحیک آمیز انداز میں 'سلگا دینے والی' مسکراہٹ کے ساتھ سالار سے کہا تھا۔ وہ اس کمرے میں مائیکل کے بعد سب سے سینئر تھی۔

"اگر میں فوبیا کا شکار ہوں یا یہ میرا دماغی خلل ہے اس حوالے سے تو یہ بیماری اس وقت ان جنگلات میں بسنے والے لاکھوں لوگوں کو لاحق ہو چکی ہے۔" سالار سکندر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

"تم کیا ہو۔۔۔؟ کس حیثیت میں کانگو میں بیٹھے ہو؟ ورلڈ بینک کے ایک ایمپلائی کے طور پر یا ایک ہیومن رائٹس ایکٹیوسٹ کے طور پر؟ کانگو کے لوگ یا پگمیز تمہارا مسئلہ نہیں ہیں۔ تمہاری ترجیح صرف ایک ہونی چاہیے کہ تم مقررہ وقت پر اس پروجیکٹ کو مکمل کرو اور تمام اہداف کے حصول کے ساتھ۔"

اس بار بات کو ترشی سے کاٹنے والا الیگزینڈر رافیل تھا جو ورلڈ بینک کے صدر کے قریب ترین معاونین میں سے ایک تھا۔

"تم نے اپنا کانٹریکٹ پڑھا ہے وہ شرائط و ضوابط پڑھی ہیں جو اس کانٹریکٹ میں ہیں اور جن سے تم نے اتفاق کرتے ہوئے سائن کیے ہیں؟ تم اپنے کانٹریکٹ کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔۔۔ اور بینک تمہیں جاب سے نکالنے کا پورا اختیار رکھتا ہے اس کے بدلے میں۔"

اس کے لہجے کی رکھائی اس کا شناختی نشان تھی وہ اسی رکھائی اور بے مہری کے لیے جانا جاتا تھا۔۔۔ سالار وہاں موجود تمام لوگوں کو ان کی قابلیت کے علاوہ ان کی خصوصیات کے حوالے سے بھی جانتا تھا۔

"میں نے اپنا کانٹریکٹ پڑھا ہے اور صرف ایک بار نہیں کئی بار پڑھا ہے۔ میں نے ورلڈ بینک کا چارٹر بھی پڑھا ہے اور نہ میرے کانٹریکٹ میں نہ ورلڈ بینک کے چارٹر میں کہیں یہ تحریر ہے کہ مجھے کوئی ایسا کام کرنا پڑے گا جو بنیادی انسانی حقوق اور کسی ملک کے قوانین و ضابطوں کی دھجیاں اڑا رہا ہو سکے۔۔۔ اگر ایسی کوئی شق میرے کانٹریکٹ میں شامل تھی اور میں اسے نظر انداز کر بیٹھا ہوں تو آپ مجھے ریفرنس دیں۔۔۔ میں ابھی اپنے کانٹریکٹ میں اسے پڑھ لیتا ہوں۔ ای میل کی صورت میں میرا کانٹریکٹ میرے پاس موجود ہے۔" اس نے لیپ ٹاپ ایک بار پھر آن کیا تھا۔

الیگزینڈر رافیل چند لمحوں کے لیے بول نہیں سکا۔ اس کے ماتھے پر بل تھے اور مسلسل تناؤ میں رہنے کی وجہ سے وہ مستقل جھریوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ وہ صرف اس وقت چہرے سے خوش گوار لگتا جب اس کے چہرے پر بھولے بھٹکے ہوئے مسکراہٹ آتی ورنہ کرختگی اس کے مزاج کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کا بھی ایک نمایاں حصہ تھی۔ اپنی کرنجی آنکھوں کو موڑتے ہوئے اس نے سالار سے کہا۔

"تم اپنے آپ کو ان لوگوں سے زیادہ قابل سمجھتے ہو جنہوں نے یہ پروجیکٹ کئی سال کی تحقیق کے بعد شروع کیا تھا۔ تم سمجھتے ہو جنہوں نے فزی بلٹی بنائی تھی۔ وہ ایڈیٹس تھے؟" وہ اب تضحیک آمیز انداز میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ وہ ایڈیٹس نہیں تھے اور نہ ہی میں ایڈیٹ ہوں۔۔۔ وہ جینئس نہیں تھے اور میں ہوں' بات صرف اس دیانت کی ہے جو اس پروجیکٹ کی فزی بلٹی رپورٹ تیار کرتے ہوئے نظرانداز کی گئی ہے' ورنہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اس پروجیکٹ کی فزیبلٹی رپورٹ تیار کرنے والے اتنے عقل کے اندھے اور نااہل ہوں کہ انہیں وہ سب نظر نہ آیا ہو جو مجھے نظر آرہا ہے اور میرے علاوہ اور لاکھوں مقامی لوگوں کو نظر آرہا ہے۔ ورلڈ بینک کو اس پروجیکٹ کے حوالے سے دوبارہ انویسٹی گیشن کرنی چاہیے ایک انکوائری کمیٹی بنا کر۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ اس کمیٹی نے دیانت داری سے کام کیا تو انہیں بھی یہ سب نظر آجائے گا جو مجھے نظر آرہا ہے۔" سالار سکندر نے رائیل کے ہتک آمیز جملوں کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میرے خیال میں بہتر ہے کہ اس ڈیڈ لاک کو ختم کرنے کے لیے ایک کام کیا جائے جو واشنگٹن اور گومبے میں تمہارے آفس میں اس پروجیکٹ کے حوالے سے پیدا ہو گیا ہے۔"

اس بار بولنے والا مل جاوئر تھا۔ وہ واشنگٹن میں ورلڈ بینک کی میڈیا کو آرڈی نیشن کو مانیٹر کرتا تھا اور اس پروجیکٹ کے حوالے سے انٹرنیشنل میڈیا میں آنے والی خبروں کو دبانے میں اس کی قابلیت اور اثر و رسوخ کا بڑا عمل دخل تھا۔ "تم ریزائن کر دو جیسے تم نے پریزنٹیشن اور بینک کے ساتھ ہونے والی آفیشل خط و کتابت میں بھی آفر کیا تھا کہ اس پروجیکٹ کو تم اس طرح نہیں چلا سکتے۔"

وہ بڑے تحمل اور ملائمت سے سالار سکندر کو جیسے صلاح دے رہا تھا۔

"اگر یہ آپشن ورلڈ بینک کو زیادہ مناسب لگتا ہے تو مجھے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مجھے بھی اس مسئلے کا حل صرف میرا استعفیٰ نظر آرہا ہے' لیکن میں اپنے استعفے کی وجوہات میں اس پریزنٹیشن میں دیے جانے والے سارے اعداد و شمار شامل کروں گا اور اپنے تحفظات بھی لکھوں گا اور میں اس استعفے کو پبلک کروں گا۔"

بورڈ روم میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چھائی تھی۔ وہ بالآخر اس ایک نکتے پر آگئے تھے جس کے لیے سالار سکندر کو کانگو سے واشنگٹن طلب کیا گیا تھا اور جو ورلڈ بینک کے گلے میں ہڈی بن کر پھنسا ہوا تھا۔ بورڈ روم میں بیٹھے ان سات لوگوں کے پاس صرف دو ٹاسک تھے یا سالار سکندر کو اس پروجیکٹ کو جاری رکھنے کے لیے تیار کیا جائے اور اس سے کہا جائے کہ وہ وہ رپورٹ واپس لے لے جو اس نے ورلڈ بینک کو اس حوالے سے ارسال کی تھی یا پھر اس سے خاموشی سے استعفیٰ لیا جائے اور یہ استعفیٰ ذاتی وجوہات کی بنا پر ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ اور کوئی وجہ اس کے تحریری استعفے میں بیان نہیں ہونی چاہیے اور اب مسئلہ اس سے بڑھ گیا تھا۔ وہ نہ صرف استعفے میں یہ سب کچھ لکھنا چاہتا تھا بلکہ اس استعفے اور اس رپورٹ کو پبلک بھی کرنا چاہتا تھا۔

اگلے تین گھنٹے تک وہ بورڈ روم میں بیٹھے ہوئے سات افراد اس کے ساتھ بحث کر کے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ انہوں نے اس پر ہر حربہ استعمال کر لیا تھا۔ جب دلیلوں سے کام نہیں بنا تھا تو انہوں نے بینک کے کانٹریکٹ میں استعفے کے حوالے سے کچھ شقوں کو اٹھا کر اسے دھمکی دی تھی کہ وہ جاب کے دوران اپنے علم میں لائے گئے تمام پروفیشنل معاملات کو صیغہ راز میں رکھنے کا پابند ہے اور اس استعفے کو پبلک کرنے اور اس رپورٹ کو میڈیا پر لانے پر اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جا سکتی تھی اور اسے نہ صرف مالی طور پر لمبا چوڑا ہرجانہ بھرنا پڑتا' بلکہ وہ آئندہ ورلڈ بینک یا اس سے منسلک کسی بھی چھوٹے بڑے ادارے کی جاب کرنے کے لیے نااہل قرار دے دیا جاتا۔ [illegible]

تھے کہ وہ اس کے پروفیشنل کیریئر کو کم از کم صرف ورلڈ بینک میں ہی نہیں بلکہ ان تمام انٹرنیشنل آرگنائزیشنز میں ختم کر دیتے جو امریکا کی سرپرستی میں چلتی تھیں اور اسے پتا تھا وہ یہ کر سکتے تھے۔

وہ اب بین الاقوامی طور پر جس سطح پر کام کر رہا تھا وہاں اس کے حوالے سے ایک چھوٹی سی قانونی چارہ جوئی بھی ایک اکنامسٹ فنانشل تجزیہ کار کے طور پر اس کی ساکھ تباہ کر کے رکھ دیتی۔ کوئی نامور ادارہ اس کے خلاف اس طرح کے الزامات پر ہونے والی قانونی چارہ جوئی کے بعد اسے کبھی نہ رکھتا کہ اس نے اپنے کانٹریکٹ میں موجود رازداری کی شق کی خلاف ورزی کی تھی۔ یہ اس کی ساکھ پر لگنے والا ایسا دھبا ہوتا جسے وہ کبھی بھی مٹا نہیں سکتا تھا۔ ان سات لوگوں نے اسے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ ورلڈ بینک اس کے ماتحت کانگو میں چلنے والے پروجیکٹس کو نئے سرے سے آڈٹ کروائے گا اور وہاں اور دوسری بے ضابطگیوں کے بہت سے ثبوت نکال کر اسے بہت بے عزت کر کے اس عہدے سے فارغ کیا جا سکتا تھا جس پر وہ کام کر رہا تھا پھر اگر وہ اس پروجیکٹ کے حوالے سے اپنی رپورٹ لے کر میڈیا کے پاس بھی جاتا تب بھی اس کے الزامات اور رپورٹ اپنی حیثیت کھو دیتے کیونکہ بینک کے پاس جوابی طور پر اس کے خلاف کہنے کے لیے بہت کچھ ہوتا اور میڈیا اس کی اس رپورٹ کو ذاتی عناد اور بغض کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھتا۔ وہ نچلے درجے کی بلیک میلنگ تھی جس پر وہ اتر آئے تھے۔ سالار جانتا تھا وہ یہ کر بھی سکتے تھے اس کی فنانشل اور پروفیشنل دیانت داری پر ورلڈ بینک میں کبھی انگلی نہیں اٹھائی گئی تھی اور اس کا پروفیشنل ریکارڈ اس حوالے سے قابل رشک تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا اگر ورلڈ بینک کانگو میں اس کے آفس کے ذریعے چلنے والے پروجیکٹس میں کوئی سقم یا نقص تلاش کرنے پر مصر تھا تو وہ یہ ڈھونڈ ہی لیتے۔ دنیا کا کوئی بندہ ورلڈ بینک کی آڈٹ ٹیم کی چھری سے نہیں بچ سکتا تھا اگر انہیں اس مقصد کے ساتھ بھیجا گیا ہو کہ انہیں کسی جگہ پر ہر صورت میں کوئی مالی بے ضابطگی تلاش کرنا ہی تھی۔

عام حالات میں سالار اس طرح کے کسی معاملے پر اپنے آپ کو اتنی مشکل صورت حال میں کبھی نہ ڈالتا" خاص طور پر اب جب اس کی ایک فیملی تھی۔ ایک بیوی تھی۔ کم سن بچے تھے۔ جو اس پر انحصار کرتے تھے لیکن یہ عام حالات نہیں تھے۔ پیٹرس ایباکا نے اسے ان سارے معاملات کے معاملے میں بے حس نہیں رہنے دیا تھا یہ اس کی بدقسمتی تھی۔ وہ افریقہ اور پگمیز کے بارے میں جذباتی ہو کر سوچنے لگا تھا اور اس کی یہ ہی جذباتیت اس وقت اس کے آڑے آ رہی تھی۔ خاموشی سے اس معاملے پر استعفیٰ دے کر اس سارے معاملے سے الگ ہو جانے کا مطلب صرف ایک تھا۔ وہ بھی اس جرم کا شریک کار ہوتا جو اکیسویں صدی کی اس دہائی میں کانگو میں پگمیز کے ساتھ کیا گیا ہوتا۔ وہ رونے والوں اور احتجاج کرنے والوں میں شامل ہو کر تاریخ کا حصہ نہ بنتا مگر اس کا مسئلہ تاریخ کا حصہ بننے کی خواہش نہیں تھی صرف ضمیر کی چبھن سے بچنے کی خواہش تھی جو زندگی کے کسی نہ کسی اسٹیج پر اسے احساس جرم کا شکار کر دیتی۔

دباؤ اور دھمکیاں جتنی بڑھتی گئی تھیں، سالار سکندر کی ضد بھی اتنی ہی بڑھتی گئی تھی۔ اگر سکندر عثمان اس کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ ڈھٹائی میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں تو وہ ٹھیک کہتے تھے اس کا ایک عملی مظاہرہ اس نے واشنگٹن ڈی سی میں ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں سات لوگوں کے اس گروپ کے سامنے بھی پیش کر دیا تھا جو سالار سکندر جیسے عہدے داران کو چٹکی بجاتے میں موم کی ناک کی طرح موڑ لیتے تھے۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" تین گھنٹے کے بعد بالآخر مائیکل نے اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے جیسے اس سے پوچھا تھا۔

"ایک غیر جانب دارانہ انکوائری ٹیم جو اس پروجیکٹ کا نئے سرے سے جائزہ لے اور اس کے بعد پگمیز اور ان بارانی جنگلات [illegible] جنگلات میں

رہنے والے لوگوں کے لیے قابل قبول ہو اور میں مقامی لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔ وہاں کی مقامی حکومت اور اس کے عہدے داران کی بات نہیں کر رہا۔"

سالار سکندر نے جواباً وہی مطالبہ دہرایا تھا جو اس کی پریزنٹیشن کی بنیاد تھا۔

"تمہاری قیمت کیا ہے؟" الیگزینڈر نے جواباً جو سوال اس سے کیا تھا اس نے سالار سکندر کو جیسے بات کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس ہیڈ کوارٹرز میں ہر نرم گرم گفتگو کی توقع کر سکتا تھا لیکن معاملات کو نمٹانے کے لیے اس جملے کی نہیں۔ "کوئی تو ایسی چیز ہو گی جس کے لیے تم اپنے اس مطالبے سے ہٹ جاؤ۔ ہمیں بتاؤ وہ کون سی ایسی چیز ہے جس پر تم ہم سے سودا کر لو۔" رافیل نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ سالار نے ٹیبل پر رکھی اپنی چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں۔

"میری کوئی قیمت نہیں ہے اور میں نے ورلڈ بینک کو اسی غلط فہمی میں جوائن کیا تھا کہ میں ایسے لوگوں کے ساتھ کام کروں گا جو دنیا میں اپنی پروفیشنل مہارت اور قابلیت سے جانے جاتے ہیں۔ اگر بروکرز کے ساتھ کام کرنا ہوتا، بیچنے، خریدنے اور قیمت لگانے والا تو اسٹاک ایکسچینج میں کرتا یا کسی بینک میں انویسٹمنٹ بینکنگ۔"

وہ نرم لہجے میں ان کے منہ پر جوتا مار گیا تھا اور اس جوتے کی چوٹ ان ساتوں لوگوں نے ایک ہی شدت کے ساتھ محسوس کی تھی۔ وہ سادہ زبان میں انہیں دلال کہہ رہا تھا اور وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سالار سکندر کے ساتھ تو معاملات طے کرنے کے لیے انہیں جن لوگوں نے بھیجا تھا وہ سالار سکندر کے ساتھ معاملات طے ہونے کے بعد انہیں ان کا کمیشن مختلف شکلوں میں ادا کرتے۔ وہ ورلڈ بینک کے اندر بنی ہوئی لابیز کے نمائندے تھے، جو بظاہر مختلف ملکوں اور قوموں کی نمائندگی کرتے تھے لیکن در حقیقت وہ ان بڑے کارپوریٹ سیکٹرز کے مفادات کا تحفظ کرتے تھے جو اپنی حکومتوں کے عقب میں کار فرما ہوتے تھے۔

ان ساتوں لوگوں میں سے کسی نے مزید کچھ نہیں کہا تھا۔ تُنتے ہوئے اور تنے ہوئے چہروں کے ساتھ وہ سب بھی اپنے کاغذات اور لیپ ٹاپ سنبھالنے لگے تھے۔ میٹنگ کسی نتیجے کے بغیر ختم ہو گئی تھی اور سالار کو اندازہ تھا کہ اس میٹنگ میں کی جانے والی باتوں کے بعد ورلڈ بینک میں اس کا کیریئر بھی ختم ہو گیا تھا۔

وہ میٹنگ ہیڈ کوارٹرز میں ہونے والی ہر میٹنگ کی طرح ریکارڈ ہوئی ہو گی۔ سالار کو اس کا اندازہ تھا لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ میٹنگ براہ راست کسی دوسری جگہ پر بیٹھ کر بھی کی جا رہی تھی۔ سالار سکندر کے اس بورڈ روم سے باہر آنے سے پہلے اس سے نمٹنے کے لیے دوسری حکمت عملی طے ہو گئی تھی۔

الیگزینڈر رافیل بورڈ روم سے سالار کے پیچھے آیا تھا اور اس نے چند منٹوں کے لیے اس سے علیحدگی میں بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ سالار کچھ الجھا لیکن پھر آمادہ ہو گیا تھا۔ وہ کون سی بات تھی جو بورڈ روم میں نہیں کی جا سکتی تھی اور اب اس ون ٹو ون میٹنگ میں کی جاتی۔ وہاں وہ باتیں بھی کہہ دی گئی تھیں جو ورلڈ بینک جیسی معتبر آرگنائزیشن کے کسی فرد سے سالار انفرادی طور پر بھی سننے کی توقع نہیں رکھتا تھا چہ جائیکہ یہ کہ وہ اجتماعی طور پر اس سے کہی جائیں۔ وہ صرف مایوس نہیں ہوا تھا اس کی ہمت ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے ورلڈ بینک کو اس لیے اور ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے جوائن نہیں کیا تھا۔

الیگزینڈر رافیل کے آفس میں وہ اسی پیرائے کی کوئی مزید گفتگو سننے کی توقع کے ساتھ گیا تھا مگر اپنے آفس میں الیگزینڈر رافیل کا رویہ اس کے ساتھ حیران کن طور پر مختلف تھا۔

"مجھے یہ ماننے میں کوئی شبہ نہیں کہ میں تمہاری رپورٹ سے بہت متاثر ہوا ہوں اور صرف میں نہیں پریذیڈنٹ بھی۔"

اس کے پہلے ہی جملے نے اس کو حیران کر دیا تھا۔ [illegible] اپنی

سیٹ کی طرف چلا گیا تھا۔ پریذیڈنٹ سے مراد رالف ایڈگر تھا جو اس وقت ورلڈ بینک کا پریذیڈنٹ تھا اور رائیل اس کے قریب ترین معاونین میں سے تھا بلکہ کئی اعتبار سے اس کو پریذیڈنٹ کا دست راست سمجھا جاتا تھا۔ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے رائیل کا انداز بدل چکا تھا۔ اس کے چہرے کی کرختگی ہونٹوں کے اس خم کی وجہ سے کچھ کم ہو چکی تھی جسے صرف ڈکشنری میں مسکراہٹ کہا جاتا تھا لیکن اس کا مقصد وہ نہیں تھا جو مسکراہٹ کا مطلب ہوتا تھا۔ الیگزینڈر رائیل اگر دنیا میں کسی کے ساتھ وفادار اور دوست تھا تو وہ اس کا کتا تھا اور صرف اس کتے کو دیکھ کر اس کے چہرے پر کبھی بھی مسکراہٹ آئی ہوگی، ورنہ دوست نظر آنے کی کوشش ہر اس بندے پر ناکام رہتی جو الیگزینڈر کو جانتا تھا اور سالار الیگزینڈر رائیل کو نہ صرف جانتا تھا بلکہ اس وقت اس کے اور اس کے کتے کے بارے میں کچھ اس طرح کی باتیں سوچ رہا تھا جنہیں وہ رائیل کے سامنے دہرا نہیں سکتا تھا، لیکن اس کے اس بدلے ہوئے رویے اور انداز نے اسے چوکنا کر دیا تھا۔ کافی کا گھونٹ لیے بغیر اور پلکیں جھپکائے بغیر وہ رائیل کی گفتگو سنتا رہا جو کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے بڑے نرم دوستانہ انداز میں اس سے بات کر رہا تھا۔

"پریذیڈنٹ ہمیشہ سے تم سے بہت زیادہ توقعات رکھتے تھے۔ افریقہ کے لیے جو وژن ان کا ہے اسے جو عملی جامہ پہنا سکتا ہے، وہ صرف تم ہو اور یہ پروجیکٹ تو ان سینکڑوں پروجیکٹس میں سے صرف ایک پروجیکٹ ہے، بہت چھوٹا پروجیکٹ۔ جو وہ تمہارے لیے سوچتے ہیں، وہ بہت بڑی شے ہے۔ تمہارے ذریعے افریقہ کی تقدیر بدلی جا سکتی ہے اور میں تمہیں یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ پریذیڈنٹ افریقہ کے بارے میں بہت سنجیدہ ہیں۔ وہ مخلص ہیں اور وہاں سے بھوک، غربت اور بیماری کو واقعی مٹانا چاہتے ہیں۔ پیٹرس ایباکا ایک بے وقوف آدمی ہے، وہ کچھ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے جو افریقہ کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔"

سالار کو گفتگو میں پیٹرس ایباکا کا حوالہ سن کر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ واشنگٹن میں بیٹھے لوگ مکمل طور پر اس بات سے باخبر تھے کہ اس کی ہدایت قلب کے پیچھے کون تھا۔

"تم نے کوئی سوال نہیں کیا؟" رائیل کو اچانک اس کی خاموشی چبھی۔ اگر وہ سالار کو اس کے بارے میں پریذیڈنٹ کے تعریفی کلمات پہنچا کر اسے جوش دلانا چاہتا تھا تو وہ ناکام ہو رہا تھا۔ سالار کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"میرے پاس جو بھی سوال تھے وہ میں اپنی رپورٹ میں اٹھا چکا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ پریذیڈنٹ افریقہ میں میرے کام اور اس رپورٹ سے متاثر ہیں لیکن میں زیادہ خوش تب ہوں گا جب اس رپورٹ پر مجھے ورلڈ بینک کا کوئی پازیٹو ریسپانس آئے۔"

"بینک تمہیں وائس پریذیڈنٹ کا عہدہ دینا چاہتا ہے اور یہ پریذیڈنٹ کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس مہینے کے آخر تک دو وائس پریذیڈنٹس اپنی Tenure (مدت ملازمت) پوری کر کے اپنے عہدوں سے الگ ہو رہے ہیں اور ان میں سے ایک سیٹ پر تمہیں اپائنٹ کرنا چاہتے ہیں وہ۔ اور اس سلسلے میں امریکن گورنمنٹ سے بھی بات ہوئی ہے ان کی۔ وہاں سے بھی ریسپانس بہت پوزیٹو ہے۔ تم یقیناً "ڈیزرو" کرتے ہو کہ تمہیں تمہاری صلاحیت اور قابلیت کے حساب سے عہدہ دیا جائے۔"

رائیل اس طرح بات کر رہا تھا جیسے بہت بڑا راز اس پر افشا کر رہا ہو۔ ایسا راز جس کو جاننے کے بعد سالار سکندر کی باچھیں کھل جاتیں۔ اس کی مایوسی کی انتہا نہیں رہی تھی جب اس نے میز کے دوسری طرف بیٹھے اپنے سے پندرہ سال چھوٹے اس سینتیس سالہ مرد کے چہرے کو اس خبر پر بھی بے تاثر پایا تھا۔

"اور وائس پریذیڈنٹ کے عہدے کے بدلے مجھے کیا کرنا ہے؟" رائیل کو اپنی اتنی لمبی تقریر کے جواب میں

اتنا ڈائریکٹ اور دو ٹوک سوال سننے کی توقع نہیں تھی۔
"پریذیڈنٹ کو اس پروجیکٹ پر تمہاری سپورٹ چاہیے۔ مطلق اور غیر مشروط سپورٹ۔"
رافیل نے اب لفاظی اور تمہیدوں میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ سالار سکندر کے لیے یہ دونوں چیزیں بے کار اور بے اثر تھیں۔
"میرا خیال ہے میں وہ نہیں دے سکوں گا۔ اس پروجیکٹ کے حوالے سے میری جو رائے اور اسٹینڈ ہے وہ میں بتا چکا ہوں۔ مراعات اور عہدے میرے اسٹینڈ کو بدل نہیں سکتے۔ میری خواہش ہے افریقہ کے لیے پریذیڈنٹ اگر اتنی ہمدردی اور اخلاص رکھتے ہیں تو وہ اس رپورٹ سے صرف متاثر نہ ہوں وہ فوری طور پر اس پر کوئی ایکشن لیں۔ کیا کچھ اور ہے جو آپ کو کہنا ہے؟"
سالار نے کافی کے اس مگ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا جو اس کے سامنے پڑا تھا۔ الیگزینڈر رافیل دنیا کی بہت بڑی بڑی آرگنائزیشنز میں بہت سے لوگوں کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ سالار سکندر کو وہ اس ملاقات سے پہلے کچھ بھی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اب اسے بے وقوف سمجھتا تھا۔ سینتیس سال کی عمر میں سے پلیٹ میں رکھ کر اسے اتنا بڑا عہدہ پیش کیا جا رہا تھا اور وہ اسے ٹھکرا رہا تھا۔ غرور تھا۔ تو بے جا تھا۔ بے وقوفی تھی تو انتہائی اور عشق تھی تو بے مقصد۔ صدارت پیش کی اس نے اپنی پوری زندگی میں کسی "ذہین" آدمی کو اتنا "بے وقوف" اور "بے غرض" نہیں پایا تھا۔ وہ یہ اعتراف نہیں کرنا چاہتا تھا پر کر رہا تھا۔ وہ پہلی بار ذہانت کو بے لوث اور بے غرض دیکھ رہا تھا اور وہ جانتا تھا وہ جس دنیا میں کام کر رہا تھا وہاں اس بے غرض اور بے لوث ذہانت کو عروج کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ وہاں بیٹھے اس نے سالار سکندر سے کہا تھا۔
"تمہیں سب کچھ آتا ہے۔ ٹیکٹ نہیں آتے اس لیے تم کامیابی کے سب سے اوپر والے زینے پر کبھی کھڑے نہیں ہو سکو گے۔" وہ اس سے ایسی بات نہیں کہنا چاہتا تھا پھر بھی کہہ بیٹھا تھا۔
"اگر ٹیکٹ فل ہونے کا مطلب بے ضمیر اور بددیانت ہونا ہے تو پھر یہ خصوصیت میں کبھی اپنے اندر پیدا نہیں کرنا چاہوں گا۔ میں اپنا استعفیٰ آج ہی میل کر دوں گا۔"
وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے آخری مصافحے کے لیے الیگزینڈر رافیل کی طرف ٹیبل پر کچھ جھک کر ہاتھ بڑھایا تھا۔ رافیل اٹھنا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے اٹھنا پڑا تھا۔ وہ مصافحہ کر کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے سالار سکندر کی پشت کو دیکھتا رہا اور یوں دیکھتا رہا تھا۔ وہ یہ نہیں جان پایا تھا۔

☆☆☆

سالار سکندر جب ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹرز سے نکلا اس وقت بوندا باندی ہو رہی تھی۔ وہ کیب پر وہاں آیا تھا اور واپسی پر بھی اس کو کیب میں ہی واپس جانا تھا مگر جو کچھ وہ پچھلے چند گھنٹوں میں اندر بھگت آیا تھا۔ اس کے بعد وہ بے مقصد ہیڈ کوارٹرز سے باہر آ کر پیدل فٹ پاتھ پر چلتا رہا۔ اس کا ہوٹل وہاں سے قریب تھا۔ وہ پیدل چلتا رہتا تو آدھ پون گھنٹے میں وہاں پہنچ جاتا۔ وہاں آتے ہوئے اسے جلدی تھی۔ واپس جاتے ہوئے نہیں۔ بوندا باندی کی وجہ سے سردی بڑھ گئی تھی مگر وہ اپنے سوٹ کے اوپر لانگ کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ گومیہ سے چلتے ہوئے واشنگٹن کی اگلے تین دن کی موسم کی پیش گوئی پڑھ کر چلا تھا۔ اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ امریکا میں گزارنے کی وجہ سے وہ جیسے عادی ہو گیا تھا۔ ایک بنی بندھی اور میکانکی انداز میں زندگی گزارنے کا جہاں ہر چیز پہلے سے دیکھ کر کی جاتی ہے۔ موسم کا حال دیکھ کر سفر پلان کیا جاتا ہے۔ بکنگ کروا کر کسی ہوٹل کے لیے روانہ ہوا جاتا ہے۔ ہر چیز کے بارے میں

پہلے سے طے کرلیا جاتا ہے۔ اس نے ورلڈ بینک میں اس جاب کا بھی اسی میکانکی اور پروفیشنل انداز میں ادراک کیا تھا لیکن جو کچھ وہ اب بھگت رہا تھا وہ کبھی اس کے فرشتوں نے بھی نہیں سوچا ہوگا۔

ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول کے بعد وہ اس کی پہلی جاب تھی اور وہ اس جاب سے بہت خوش تھا۔ وہ اب زندگی کو پانچ، دس، پندرہ، بیس سالوں کے تناظر میں دیکھتا تھا کیونکہ اب اسے اپنے ساتھ ساتھ کچھ اور زندگیوں کی ذمہ داریوں کو بھی اٹھانا تھا اور اب یک دم وہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے سب سے بڑے بحران میں پھنس گیا تھا۔ اس کے ساتھ بیوی اور بچوں کی ذمہ داریاں نہ ہوتیں تب وہ اس طرح پریشان نہ ہوتا کیونکہ جو بھی نتائج ہوتے اس کے کسی بھی فیصلے کے وہ صرف اسے بھگتنے پڑتے، کوئی اور اس کے کسی فیصلے سے پہنچنے والے کسی نقصان میں شریک نہ ہوتا... لیکن اب...

فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اس نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔ وہ چند دن پہلے تک اپنے آپ کو دنیا کا مصروف ترین انسان سمجھتا تھا اور اب ان چند گھنٹوں کے بعد دنیا کا بے کار ترین انسان...

کچھ عجیب سی ذہنی کیفیت تھی اس وقت اس کی... فی الحال اس کے پاس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی میٹنگ... کوئی وزٹ... کوئی ایجنڈا نہیں... کوئی فون کال، کوئی ای میل، کوئی پریزنٹیشن بھی نہیں... لیکن سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ ایک لمحے کے لیے چلتے چلتے اسے خیال آیا... کیا ہو اگر وہ سمجھوتا کر لے... وہیں سے واپس ہیڈ کوارٹرز چلا جائے... وہ پیش کش قبول کرلے جو ابھی اسے کی گئی تھی۔ کوئی مشکل اور ناممکن تو نہیں تھا یہ۔ ابھی سب کچھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا... زندگی پھر پہلے جیسی ہو جاتی۔ ورلڈ بینک میں پہلے سے بھی زیادہ بڑا عہدہ... ترقی... مراعات... اسٹیٹس... کیا برائی تھی اگر وہ ضمیر کو کچھ دیر کے لیے سلا دیتا... کانگو اس کا ملک نہیں تھا نہ پگمیز اس کے لوگ... پھر؟

پھر... واقعی ٹھیک کہا تھا رائیل نے "وہ کیوں ان کے لیے یہ سب کر رہا تھا اور یہ سب کرتے کرتے اپنے آپ کو وہاں لے آیا تھا، جہاں آگے کنواں تھا پیچھے کھائی... لیکن پھر اسے وہ ساری غربت اور بدحالی یاد آئی تھی جو اس نے ان لوگوں سے ملاقاتوں میں دیکھی تھی... وہ امید بھری نظریں یاد آئی تھیں... جن سے وہ اسے دیکھتے تھے... کاغذات کا وہ پلندہ یاد آیا تھا جس کا ایک ایک لفظ کہتا تھا کہ وہاں جو بھی ہو رہا تھا وہ انسانیت کی تذلیل تھی۔ وہ غلامی اور غلامانہ استحصال تھا جو اس کا مذہب چودہ سو سال پہلے ختم کر چکا تھا۔

اور یہ سب یاد کرتے ہوئے اسے امامہ بھی یاد آئی تھی۔

اس نے جیب سے سیل فون نکال کر فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اسے کال کی، رابطہ نہیں ہوا۔ اسے لگا شاید سگنلز کا کوئی مسئلہ ہوگا۔ فون اس نے دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ ایک عجیب سی اداسی اور تنہائی نے اسے گھیرا تھا حالانکہ وہاں فٹ پاتھ پر اس کے آس پاس سے درجنوں لوگ گزر رہے تھے اور برابر میں سڑک پر کئی گاڑیاں چل رہی تھیں... پھر بھی اس نے عجیب سی تنہائی محسوس کی تھی... یہ ویسی ہی تنہائی تھی جو وہ امامہ کی عدم موجودگی میں محسوس کرتا تھا۔

امامہ سے شادی ہونے تک وہ ڈپریشن کے کئی ادوار میں سے گزرا تھا... لیکن ہر بار وہ اس دور سے نکل آتا تھا... وسیم کی موت کے بعد امامہ کی ذہنی حالت نے اسے ایک بار پھر بری طرح انتشار کا شکار کیا تھا مگر یہ ڈپریشن پہلے جیسا نہیں تھا۔ اس نے کبھی بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اسے لگتا تھا "سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور سب کچھ واقعی ٹھیک ہو گیا تھا اور اب کئی سالوں سے سب کچھ ٹھیک تھا اب ایک بار پھر سے زندگی عجیب مدوجزر میں آ پھنسی تھی۔

"مجھے لگتا ہے' میری زندگی میں سکون نہیں ہے۔ کچھ دیر کے لیے سب کچھ ٹھیک رہتا ہے' پھر کچھ نہ کچھ غلط ہونے لگتا ہے۔"

اس نے کئی بار امامہ سے یہ سنا تھا اور وہ کبھی اس سے یہ اعتراض نہیں کرسکا تھا کہ یہ صرف اس کی نہیں' خود اس کی اپنی زندگی کا بھی یہی انداز تھا۔ کہیں نہ کہیں کچھ ٹھیک نہیں رہتا تھا اس کی زندگی میں بھی۔ پہلے کی بات اور تھی لیکن امامہ کے مل جانے کے بعد بھی... وہ ویسی زندگی نہیں جی رہا تھا جیسی زندگی وہ امامہ کے ساتھ گزارنے کا خواہش مند تھا یا تصور کرتا تھا۔ لیکن یہ صرف امامہ کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی ہی نہیں تھی جو نشیب و فراز سے گزرتی رہی تھی۔ اس کی پیشہ ورانہ زندگی میں بھی عجیب و غریب حالات پیدا ہوتے رہتے تھے۔

اس فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ایک لمبے عرصے کے بعد سالار سکندر نے اپنی سینتیس سالہ زندگی کے حاصل' محصول پر نظر دوڑائی تھی... نتیجہ یقیناً "بے ثمر" نہیں تھا... اتنی لمبی گنتی بیٹھتا تو گنتی بھول جاتا... لیکن بے سکونی تھی جو کسی بلا کی طرح ان کی زندگیوں کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھی۔ وہ بے سکونی کی جڑ تک پہنچنے میں ناکام رہتا تھا۔ وہ حافظ قرآن تھا۔ عملی مسلمان تھا۔ عبادات اور حقوق العباد دونوں میں مشغول... گناہوں سے تائب... نعمتوں سے سرفراز... لیکن سکون دل کو ترستا ہوا... خالی پن کا شکار...

سوچوں کی رفتار ایک دم ٹوٹی تھی... وہ حیران ہوا تھا... وہ کس بحران میں کیا سوچنے بیٹھ گیا تھا... وہ آزمائش میں پھنسا تھا لیکن وہ اتنی بڑی آزمائش نہیں تھی کہ وہ اپنی پوری زندگی کے حاصل و محصول کو اس ہونق پن میں ورلڈ بینک کی عمارت سے اپنے ہوٹل تک کے راستے میں چلتے ہوئے سوچتا۔ اس کی چھٹی حس اسے جیسے بڑے عجیب انداز میں بے چین کر رہی تھی۔

اس نے اپنی ہر منفی سوچ کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ شاید یہ ذہنی دباؤ کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ اس نے چند لمحوں کے لیے سوچا تھا اور پھر خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر اپنا لیپ ٹاپ والا بیگ رکھتے ہوئے اس نے معمول کے انداز میں ٹی وی آن کیا تھا۔ ایک مقامی چینل پر واشنگٹن میں صبح سویرے ہونے والے ایک ٹریفک حادثے کی خبر چل رہی تھی جس میں دو مسافر موقع پر مر گئے تھے' جبکہ تیسرا مسافر شدید زخمی حالت میں اسپتال میں تھا۔ لوکل چینل پر تباہ شدہ گاڑی کو جائے وقوع سے ہٹایا جا رہا تھا۔ اپنا لانگ کوٹ اتارتے ہوئے سالار نے ہاتھ میں پکڑے ریموٹ سے چینل بدلنا چاہا' لیکن پھر اسکرین پر چلنے والے ایک ٹکر کو دیکھتے ہوئے وہ جامد ہو گیا۔ اسکرین پر اسکرول میں اس حادثے کے متعلق مزید تفصیلات دی جارہی تھیں اور اس میں زخمی ہونے والے شخص کا نام پیٹرس ایباکا بتایا جا رہا تھا جو ایک activist (انقلابی) تھا اور سی این این کے کسی پروگرام میں شرکت کے لیے آرہا تھا۔ سالار کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا تھا۔

دنیا میں ہزاروں پیٹرس ایباکا ہوسکتے تھے... لیکن کانگو میں پگمیز کے لیے کام کرنے والا پیٹرس ایباکا ایک ہی تھا۔ اور سالار یہ بھی جانتا تھا کہ وہ پچھلے کئی دنوں سے امریکا میں تھا۔ وہ امریکا روانہ ہونے سے پہلے اس سے ملنے آیا تھا اور اس نے سالار کو بتایا تھا کہ اس کے کچھ دوستوں نے بالآخر بڑی کوششوں اور جدوجہد کے بعد کچھ بڑے نیوز چینلز کے نیوز پروگرامز میں اس کی شرکت کے انتظامات کیے تھے اور یہ گارڈین میں شائع ہونے والی رپورٹ کے بعد ممکن ہوسکا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ چھری میری گردن پر گرنے والی ہے۔" سالار نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔ "تم اگر اس پروجیکٹ کے حوالے سے ورلڈ بینک اور اس کے عہدے داران پر تنقید کرو گے تو سب سے پہلے میں ہی

نظروں میں آؤں گا اور یہ چینلز مجھ سے رسپانس لینے کے لیے رابطہ کریں گے۔"

سالار کو اس مشکل صورت حال کا اندازہ ہونے لگا تھا جس میں وہ پیٹرس ایباکا کے انٹرویوز کے بعد پھنستا۔ وہ آتش فشاں جو بہت عرصے سے پک رہا تھا' وہ اب پھٹنے والا تھا اور پھٹنے کے ساتھ ساتھ وہ بہت سوں کو بھی ڈبونے والا تھا۔

"میں تمہیں بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔" ایباکا نے اسے یقین دلایا تھا۔ "میں تم پر کوئی تنقید نہیں کروں گا بلکہ تمہاری سپورٹ کے لیے تمہاری تعریف کروں گا۔ تم تو اب آئے ہو یہ پروجیکٹ تو تمہارے آنے سے پہلے سے جاری ہے۔"

ایباکا بے حد سنجیدہ تھا لیکن سالار کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس کی یہ یقین دہانی ایک خوش فہمی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ سالار سکندر اس پروجیکٹ کی سربراہی کر رہا تھا اور نہ اسے جمعہ جمعہ چار دن ہوئے تھے وہاں آئے۔ نہ تو یہ وہ اتنا احمق ہو سکتا تھا کہ کسی پروجیکٹ کی تفصیلات جانے بغیر اسے جوائن کر لیتا۔ اگر وہ اس کا حصہ تھا تو کسی نہ کسی حد تک اسے بھی میڈیا کی شدید تنقید کا سامنا ہونے والا تھا۔ ایباکا کی تعریف ورلڈ بینک کی انتظامیہ کی نظروں میں اس کا امیج خراب کرتی اور اس کی خاموشی دنیا کی نظروں میں۔

"تم جلد سے جلد ورلڈ بینک چھوڑ دو۔ میں تمہاری رپورٹ کا حوالہ دوں گا کہ اس پروجیکٹ سے ناخوش تھے اور تمہارے اس پوزیشن کو چھوڑنے کی وجہ بھی یہ ہی ہے۔" ایباکا نے جیسے اسے ایک راہ دکھائی تھی۔

"میں اس سے پہلے ایک کوشش ضرور کروں گا کہ بینک کو مجبور کر سکوں کہ وہ اس پروجیکٹ پر نظر ثانی کرے۔"

جو راستہ وہ سالار کے لیے نکال رہا تھا وہ سالار کو بھی پتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک آخری کوشش کرنا چاہتا تھا۔ بینک کا رد عمل جاننے کے لیے۔ اسے جیسے یہ امید تھی کہ بینک اگر فوری طور پر اس پروجیکٹ کو نہیں روکتا تب بھی کوئی انکوائری تو آرڈر کر ہی سکتا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اتنے تفصیلی ثبوتوں کے باوجود بینک آنکھیں بند کر کے صم' بکم' کی طرح بیٹھا رہتا۔

ایباکا نے اس کے ساتھ کوئی بحث نہیں کی تھی۔ وہ ان دونوں کا آخری رابطہ تھا۔ وہ واشنگٹن آنے تک میڈیا پر ایباکا اور کانگو کے بارانی جنگلات کے حوالے سے کوئی نئی خبر تلاش کرتا رہا' لیکن وہ نئی خبر اسے آج ملی تھی۔ نیوز چینل بتا رہا تھا کہ بچنے والے مسافر کی حالت تشویش ناک تھی۔ سالار کچھ دیر شل ہوتے ہوئے اعصاب کے ساتھ کھڑا رہا پھر اس نے اپنا فون نکال کر یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ ایباکا کو کہاں لے جایا گیا تھا۔ عجیب اتفاق تھا' لیکن یک دم جیسے اس کا فون رابطوں کے مسائل کا شکار ہونے لگا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ کانگو میں امامہ سے رابطہ نہیں کر پایا تھا اور اب وہ کوئی لوکل کال نہیں کر پا رہا تھا' کچھ دیر اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف رہنے کے بعد ناکامی پر سالار نے جیسے جھنجلا کر کمرے میں موجود فون لائن اٹھا کر اسے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ فون لائن بھی کام نہیں کر رہی تھی۔ سالار حیران ہوا تھا۔ وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھا اور اس کی فون لائن کا ڈائریکٹ کام نہ کرنا حیران کن ہی تھا۔ اس نے انٹرکام پر آپریٹر کے ذریعے ایک کال بک کروائی تھی۔

اگلا آدھا گھنٹہ وہ آپریٹر کی کال کا انتظار کرتا رہا۔ وہ پہلا موقع تھا جب سالار کو ایک عجیب سی بے چینی محسوس ہوئی تھی' پہلی بار اسے لگا تھا جیسے اس کو کسی سے بھی رابطہ کرنے سے روکا جا رہا ہے۔ وہ اس شک کو اپنے ذہن سے جھٹک دینا چاہتا تھا۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر وہ اسی بے چینی اور بے قراری کے عالم میں اپنے کمرے سے نکل کر نیچے استقبالیہ پر آ گیا تھا۔ اس بار کہیں بھی خود کال کرنے کے بجائے اس نے ریسپشنسٹ سے کہا تھا کہ وہ اسے پولیس انکوائری سے پتا کرنے کے بجائے کہ آج صبح واشنگٹن میں ہونے والے اس ٹریفک حادثے کے زخمی کو کہاں لے

جایا گیا تھا۔ ریسپشنسٹ نے اسے لابی میں پڑے ایک صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا اور چند ہی منٹوں میں اس نے سالار کو اس اسپتال کا نام بتا دیا تھا جہاں پیٹرس ایباکا کو لے جایا گیا تھا۔ سالار نے اسی ریسپشنسٹ کو کانگو میں اپنے گھر کے اور امامہ کا سیل فون نمبر دیا تھا۔ وہ اگلی کال وہاں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جیسے اپنے خدشات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر تک کوشش کرتے رہنے کے بعد ریسپشنسٹ نے اسے کہا تھا کہ اس کے گھر کے نمبر یا امامہ کے سیل فون کسی پر کال نہیں ہو پا رہی تھی شاید کانگو اور امریکا کے درمیان اس وقت رابطوں میں گڑبڑ تھی۔ سالار کے خدشات کی لمحہ بھر میں ہوا نکل گئی تھی۔ وہ شاید ضرورت سے زیادہ وہم کرنے لگا تھا۔ اس نے اپنا سر جھٹکتے ہوئے سوچا اور ریسپشنسٹ سے اپنے کمرے کی ڈائریکٹ فون لائن کے فنکشنل نہ ہونے کی شکایت کرنے کے بعد وہ وہیں سے اسپتال کے لیے روانہ ہو گیا تھا جہاں پیٹرس داخل تھا۔

اسپتال پہنچ کر پیٹرس کو تلاش کرنا مشکل نہیں تھا، لیکن اسے ایباکا سے ملنے نہیں دیا گیا تھا۔ وہ مخدوش حالت میں تھا اور اس کی سرجری کے بعد اسے مصنوعی تنفس پر رکھا گیا تھا۔ اپنے آپ کو ایباکا کا رشتہ دار ظاہر کرنے پر اسے بہرحال ایباکا کو دور سے ایک نظر دیکھنے کی اجازت مل گئی تھی۔ مگر استقبالیہ پر موجود شخص نے اسے بے یقینی اور شبہ کی نظر سے دیکھا تھا۔ ایک ہگمین اور ایک جنوبی ایشیا میں رہنے والے کی رشتہ داری کیسے ممکن تھی...؟ لیکن اب اگر کوئی اس کا دعوے دار ہو گیا تھا تو وہ کیا کر سکتا تھا۔ ایباکا کی حالت ویسے بھی اتنی نازک تھی کہ وہ کسی بھی وقت مر سکتا تھا۔ اس کا دماغ آہستہ آہستہ کام کرنا چھوڑ رہا تھا اور ریسپشن پر موجود آدمی نے جیسے ایک مرتے ہوئے شخص کے لیے احساس ہمدردی دکھایا تھا۔

اسپتال کے آئی سی یو میں ٹیوبوں، تاروں اور پٹیوں میں جکڑے ایباکا کو سالار پہلی نظر میں پہچان نہیں سکا تھا۔ وہ سیاہ فام پست قامت آدمی موٹی چمک دار آنکھوں اور ایسی مسکراہٹ کے لیے پہچانا جاتا تھا جو کسی چھوٹی سی بات پر بھی اس کے چہرے پر آجاتی۔ وہ بات بے بات قہقہے لگانے کا بھی عادی تھا اس کے موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں سے نظر آنے والے دودھیا دانت اور مسوڑھے اس کے ہر قہقہے میں سب سے پہلے نمایاں ہوتے تھے۔

آئی سی یو کی کھڑکی سے اسے دیکھتے ہوئے سالار کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کرے۔ اس کا اور ایباکا کا انسانیت کے علاوہ کوئی رشتہ نہیں تھا پھر بھی وہ عجیب غم زدہ حالت میں وہاں کھڑا تھا۔ ایباکا کی مخدوش حالت اس کے علم میں آچکی تھی۔ ہگمیز اگر ایباکا کو کھو دیتے تو گونگے ہو جانے والے تھے کوئی چیز ان کے مقاصد کو اس سے زیادہ نقصان نہ پہنچاتی جتنا ایباکا کی موت پہنچانے والی تھی۔ سالار گم صم کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ صرف ہگمیز کا نہیں کانگو کا صدر بننا چاہتا تھا۔ ہارورڈ بزنس اسکول اور جان ایف کینیڈی اسکول آف گورنمنٹ سے فارغ التحصیل ہونے والے ممتاز ترین افراد میں سے ایک پیٹرس ایباکا بھی ہوتا اگر زندگی اسے ایک موقع دیتی۔ شاید وہ کبھی نہ کبھی کانگو کا صدر بن جاتا اور افریقہ کے نمایاں ترین لیڈرز میں اس کا شمار ہوتا... لیکن زندگی فی الحال اسے یہ موقع نہیں دے رہی تھی۔

وہاں کھڑے سالار کو ایک بار پھر جیسے خیال آیا تھا کہ وہ چاہتا تو اب بھی یہ سب ٹھیک کر سکتا تھا۔ ایباکا مر رہا تھا اور اس کے مرنے کے ساتھ ہی وہ سارے حقائق اور شواہد بھی غائب ہو جانے والے تھے۔ ہگمیز کو فوری طور پر ایباکا کا متبادل نہیں مل سکتا تھا جو امریکا میں کسی نہ کسی حد تک رسوخ رکھتا ہو۔ ایباکا کے ساتھ جو دوسرے لیڈرز تھے وہ سب مقامی تھے۔ زیادہ تر ان پڑھ... انہیں صرف جنگل میں لڑنا آتا تھا یا اپنی بقا کے لیے شکار کرنا۔ کانگو سے باہر کی دنیا میں اپنا کیس پیش کرنے کے لیے ان کے پاس ہائی چیرس اور زبان تو ایک طرف اعتماد تک نہیں

تھا جس کے ساتھ وہ سی پی آنکھ میں آنکھ ڈال کر اپنے حق کی بات اس دبنگ انداز میں کہہ سکیں، جس طرح ایبا کا کہتا تھا۔ شاید یہ ایک موقع اسے قدرت دے رہی تھی۔ وہ الجھا بھٹکا Temnpt ہوا۔ ضمیر کا چابک ایک بار پھر اس پر برسا تھا اور ضمیر کا چابک واحد چیز نہیں تھی جس نے سالار کو جھٹکا دیا تھا۔ اس کی اپنے ہوٹل واپسی پر ایک اور بڑا سانحہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے کمرے میں اس کا لاکر کھلا ہوا تھا اور اس لاکر میں موجود اس کا پاسپورٹ اور کچھ دوسرے اہم ڈاکومنٹس غائب تھے، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کا وہ بیگ بھی غائب تھا جس میں اس کا لیپ ٹاپ اور اس رپورٹ سے متعلقہ تمام ثبوتوں کی کاپیاں تھیں۔ سالار کو چند لمحوں کے لیے یقین نہیں آیا اسے لگا وہ اس کا کمرہ نہیں ہوگا۔ وہ شاید غلطی سے کسی اور کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ حماقت کی انتہا تھی۔ لیکن اس نے جیسے اپنے کمرے سے نکل کر دروازے پر نمبر پڑھا تھا۔ وہ اسی کا کمرہ تھا۔ جو اس بوکھلاہٹ کے عالم میں وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے پاگلوں کی طرح کمرے کے ایک ایک کونے کھدرے کو چھان مارا، صرف اس موہوم امید میں کہ شاید وہ جس ذہنی کیفیت سے گزر رہا تھا اس میں اس نے خود ہی ان سب چیزوں کو کہیں اور رکھ دیا تھا۔ کمرے میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھا اور اگرچہ ہوٹل کے کمرے میں رکھی جانے والی کسی بھی قیمتی اشیا کے لیے لاکر فراہم کرنے کے ساتھ ہی وہ ہر طرح کی ذمہ داری سے بری الذمہ ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود سالار کو یقین نہیں آیا کہ وہ سب ہو چکا تھا۔ کوئی اس کے کمرے سے اس کے ٹریول ڈاکومنٹس اور لیپ ٹاپ کیوں لے کر جاتا اور اس سے بھی بڑا سوال تھا کہ کون لے کر گیا تھا۔

بے حد تشویش کے عالم میں اس نے فون اٹھا کر فوری طور پر اپنے ساتھ ہونے والے واقعے کی اطلاع منیجر کو دیتے ہوئے اسے کمرے میں طلب کیا تھا۔ اسے اس وقت بھی یقین تھا کہ کوریڈور میں لگے سی سی ٹی وی فوٹیج کی مدد سے بڑے آرام سے اس کی عدم موجودگی میں اس کے کمرے میں داخل ہونے والے کسی بھی شخص کا پتا چل جائے گا، لیکن منیجر اور سیکورٹی گارڈز کے اس کے کمرے میں آتے ہی سالار کا دماغ یہ جان کر بھک سے اڑ گیا تھا کہ اس پورے فلور پر صفائی سے متعلقہ کام کرنے کے لیے پچھلے دو گھنٹے اس فلور کے سی سی ٹی وی کیمرے آف کیے گئے تھے۔ یہ ناقابل یقین بات تھی۔ اسے لگا تھا ایک دم جیسے اس کے ہاتھ پاؤں کٹ گئے تھے۔ اس کے پاس جو بھی تھا وہ اس لیپ ٹاپ اور اس کے بیگ میں تھا۔ ان کے غائب ہونے کا مطلب تھا کہ وہ بالکل بے دست و پا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی رپورٹ سے کسی الزام اور تحقیق کو ڈاکومنٹری ثبوت کے بغیر ثابت نہیں کر سکتا تھا اور ان دستاویزاتی ثبوتوں کی ایک کاپی اس کے پاس تھی اور ایک کاپی کو سیف میں اس کے گھر کے اس لاکر میں خود امامہ کی تحویل میں دے کر آیا تھا۔

وہ پہلا موقع تھا جب سالار نے ایک عجیب سا خوف محسوس کیا تھا۔ ہر چیز کو اتفاق سمجھتے ہوئے وہ پہلی بار ان سب واقعات کو ایک دوسرے سے جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ بڑے آرام سے جڑتے جا رہے تھے۔ وہ وہمی نہیں تھا نہ ہی سازشی نظریوں پر یقین رکھتا تھا، لیکن جو کچھ اس ایک دن میں ہوا تھا، وہ اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔

پیٹرس ایبا کا ایک حادثہ میں زخمی ہونا بھی اب اسے ایک اتفاق نہیں لگ رہا تھا۔ کوئی تھا جو پیٹرس ایبا کا کو نقصان پہنچانے کے بعد اب اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے بے بس کر رہا تھا۔ پہلا خیال جو اسے وہاں کھڑے کھڑے آیا تھا۔ وہ امامہ اور اپنے بچوں کے تحفظ کا تھا۔ ضروری تھا کہ وہ ان سے رابطہ کرتا اور ہر قیمت پر کرتا۔ اسے یقین تھا اس ہوٹل کے اندر وہ بھی بھی کانگو میں امامہ سے رابطہ نہیں کر سکتا تھا، لیکن اسے امامہ کو متنبہ کرنا تھا اس سے کہنا تھا کہ وہ ان ڈاکومنٹس کے ساتھ پاکستان ایمبیسی یا کسی پولیس اسٹیشن چلی جائے، کم از کم تب تک جب تک وہ خود وہاں نہیں پہنچ جاتا۔

اس نے مینجر سے کہا تھا کہ وہ پولیس میں رپورٹ کروانا چاہتا تھا۔ اس کی قیمتی چیزوں کی حفاظت یقیناً ہوٹل کی ذمہ داری نہیں تھی، لیکن ہوٹل کم از کم اتنی ذمہ داری ضرور رکھتا کہ اس کی عدم موجودگی میں اس فلور کے سی سی ٹی وی سسٹم کو صفائی کے لیے آف نہ کیا جاتا۔

مینجر نے معذرت کرتے ہوئے فوری طور پر اسے اس کے نقصان کی تلافی کی آفر کی تھی اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ پولیس کو اس معاملے میں انوالو نہ کرے، لیکن سالار اس وقت اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے سے ہی باہر نہیں نکلا تھا وہ اس ہوٹل سے بھی باہر نکل آیا تھا۔

ایک فون بوتھ سے اس نے ایک بار پھر کانگو میں اپنے گھر کے نمبرز اور امامہ کا نمبر ملانے کی کوشش کی تھی۔ نتیجہ وہی آیا تھا۔ اس کا فون ہاؤ آف ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے فون پر ای میلز، سوشل میسجنگ کے ذریعے بھی امامہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن کسی ای میل کسی میسج کا جواب نہیں آیا تھا۔ سالار نے باری باری پاگلوں کی طرح اپنے آفس کے ہر ممبر کو کال کرنی شروع کر دی تھی جو اس کے اسٹاف میں شامل تھا اور جن کے نمبرز اس وقت اس کے پاس تھے۔ کوئی ایک نمبر ایسا نہیں تھا جس پر رابطہ ہو پاتا۔

اس نے بالآخر پاکستان میں سکندر عثمان کو فون کیا تھا اور جب اسے فون پر ان کی آواز سنائی دی تو کچھ دیر کے لیے تو اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ وہ بالآخر کسی سے بات کرنے میں کامیاب ہو پا رہا تھا۔ سکندر عثمان کو بھی اس کی آواز سے پتا چل گیا تھا کہ وہ پریشان تھا۔

سالار نے کوئی تفصیلات بتائے بغیر مختصراً انہیں بتایا کہ وہ اپنی سفری دستاویزات گنوا بیٹھا ہے اور اس وجہ سے وہ فوری طور پر اگلی فلائٹ پکڑ کر واپس نہیں جا سکتا تھا اور وہ امامہ سے رابطہ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے سکندر سے کہا کہ وہ پاکستان سے امامہ کو کال کریں اور اگر اس سے رابطہ نہ ہو سکے تو پھر فارن آفس میں اپنے جاننے والوں کے ذریعے کنشاسا میں پاکستان ایمبیسی کے ذریعے اسے تلاش کریں اور فوری طور پر اس سے کہیں کہ وہ لاگر میں پڑے سارے ڈاکومنٹس سمیت ایمبیسی چلی جائے۔" سکندر عثمان بری طرح کھٹکے تھے۔

"ایسا کیا ہوا ہے کہ تمہیں یہ سب کچھ کرنا پڑ رہا ہے؟ سالار سب کچھ ٹھیک ہے نا؟"

"پاپا! اس وقت آپ صرف وہ کریں جو میں کہہ رہا ہوں۔ میں ڈیٹیلز آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔" وہ جھنجلا گیا تھا۔

"میں تھوڑی دیر تک آپ کو خود کال کر کے پوچھتا ہوں" آپ میرے فون پر کال مت کریں نہ ہی میرے نمبر پر میرے لیے کوئی میسج چھوڑیں۔" اس نے باپ کو مزید تاکید کی۔

"سالار! تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔" سکندر عثمان کا ان ہدایات کے بعد خوف زدہ ہونا لازمی تھا۔

سالار نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ باپ کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کے اپنے حواس ان سے زیادہ خراب ہو رہے تھے۔ فون بوتھ سے کچھ فاصلے پر پڑی ایک بینچ پر بیٹھتے ہوئے اس نے بے اختیار خود کو ملامت کی تھی۔ اسے اپنی فیملی کو کانگو میں چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا اور ان حالات میں۔ میٹنگ جاتی بھاڑ میں۔ وہ اسے آگے پیچھے کروا دیتا۔ کیا ضرورت تھی اتنی مستعدی دکھانے کی۔

اب رات ہو رہی تھی اور صبح سے لے کر اس وقت تک اس کے فون پر کوئی کال ہوئی تھی نہ کوئی ٹیکسٹ میسج نہیں آیا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا تب تک جب تک اس کے فون کو مانیٹر نہ کیا جا رہا ہوتا یا اس کے سگنلز کو کنٹرول نہ کیا جا رہا ہوتا۔ فون سگنلز کو بہترین حالت میں دکھا رہا تھا مگر سالار کو یقین تھا اس کا فون اور فون کے ذریعے ہوئے اس کے رابطوں کو کنٹرول کیا جا رہا تھا اور کس لیے...؟ یہ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

وہ اگر اسے نقصان پہنچانا چاہتے تھے تو ان سب ہتھکنڈوں کے بغیر نقصان پہنچاتے جیسے پیٹرس پر وار کیا گیا تھا اور انہیں اگر اسے بینک سے نکالنا تھا تو وہ یہ کام تو خود ہی کر رہا تھا' پھر یہ سب کیوں کیا جا رہا تھا۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی میں جیسے کوئی سنسناہٹ ہوئی تھی۔ اسے اچانک احساس ہوا وہ لوگ اسے یہ احساس ہی دلانا چاہتے تھے کہ اسے مانیٹر کیا جا رہا تھا۔ اسے نقصان پہنچایا جا سکتا تھا۔ اور کس کس قسم کا۔ اسے یہ بھی بتایا جا رہا تھا اور یہ سب ورلڈ بینک نہیں کر سکتا تھا صرف ورلڈ بینک نہیں۔ اسے سی آئی اے چیک کر رہی تھی۔ پتا نہیں جو پسینے چھوٹے تھے' وہ جسم کے ٹھنڈا ہونے پر چھوٹے تھے یا گرم ہونے پر۔ لیکن سالار کچھ دیر کے لیے پانی میں نہا گیا تھا۔ اس کا دماغ اس وقت بالکل خالی ہو گیا تھا۔ یہ بھی اس کے فرشتوں نے بھی نہیں سوچا ہو گا کہ وہ بھی کسی ایسے معاملے میں انوالو ہو سکتا تھا کہ سی آئی اے اس کے پیچھے پڑ جاتی اور اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پروجیکٹ ورلڈ بینک کی خواہش نہیں امریکا کی خواہش تھا اور وہ اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔

وہ ڈیڑھ گھنٹہ وہیں بت کی طرح بیٹھا رہا تھا۔ اسے تین دن کے لیے واشنگٹن میں رہنا تھا اور تیسرے دن واپس چلا جانا تھا' لیکن اب اپنی ٹریول ڈاکومنٹس گم ہو جانے کے بعد اسے یقین تھا وہ فوری طور پر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ کم از کم تب تک جب تک وہ ان مطالبات پر کچھ لچک نہ دکھاتا جو وہ لوگ اس سے کر رہے تھے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد سکندر عثمان کو اس نے دوبارہ فون کیا تھا اور انہوں نے اسے بتایا کہ امامہ اور اس کے بچے گھر نہیں ہیں۔ گھر لاکڈ ہے اور وہاں کوئی ملازم یا گارڈ نہیں ہے جو ان کے بارے میں کوئی اطلاع دیتا۔ ایمبیسی کے افسران نے کانگو کی وزارت داخلہ کے ساتھ اس سلسلے میں رابطہ کیا تھا' مگر اس کی فیملی کے بارے میں جو بھی پتا چلنا تھا وہ فوراً "پتا نہیں چل سکتا تھا۔ کچھ وقت تو لگتا ہے۔"

جو کچھ وہ فون پر سن رہا تھا' اس کے جسم میں کپکپاہٹ دوڑانے کے لیے کافی تھا۔ امامہ اور اس کے بچے کہیں نہ جا سکتے تھے۔ اس سے پوچھے اور اسے اطلاع دیے بغیر۔ گارڈز بینک کے فراہم کیے ہوئے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ گھر لاکڈ ہونے پر وہ بھی وہاں سے چلے گئے۔

"میں کوشش کر رہا ہوں فوری طور پر ایمبیسی میرے ویزے کا انتظام کرے اور میں وہاں جا کر خود اس سارے معاملے کو دیکھوں۔"

سکندر عثمان اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

"تم بھی کوشش کرو کہ فوری طور پر وہاں پہنچو۔ امریکن ایمبیسی کو ان کی گمشدگی کی اطلاع دو۔ تم تو امریکن نیشنل ہو۔ تمہارے بچے بھی۔ وہ ہماری ایمبیسی سے زیادہ مستعدی سے انہیں تلاش کریں گے۔"

سکندر عثمان نے اسے ایک راستہ دکھایا تھا اور بالکل ٹھیک دکھایا تھا' لیکن وہ باپ کو اس وقت یہ نہیں کہہ پایا تھا کہ وہ اس وقت امریکن گورنمنٹ کے ساتھ ہی الجھ پڑا تھا۔

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا سالار! تم پریشان مت ہو۔ کانگو میں ابھی اتنا بھی اندھیر نہیں مچا کہ تمہاری فیملی اس طرح غائب ہو جائے۔"

سکندر عثمان اگر کانگو میں رہ چکے ہوتے تو شاید کبھی یہ جملہ نہ کہتے۔ وہ شاید یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کا بیٹا جو امریکن نیشنل اور ورلڈ بینک سے منسلک تھا' اس کے یا اس کی فیملی کے ساتھ کچھ بھی غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ جواب میں کہنے کے لیے سالار کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ بھی۔

آج وہ محاورتاً "نہیں حقیقتاً" گونگا ہوا تھا اور جب کچھ بول نہیں پا رہا تھا تو اس کا دل چاہ رہا تھا' وہ گلا پھاڑ کر بے ہنگم انداز میں چلائے۔ سکندر عثمان سے مزید کچھ بھی کہے بغیر وہ فون رکھ کر فون بوتھ سے آ گیا تھا۔ اس فون

بوتھ سے واپس ہوٹل میں جانے میں اسے صرف پانچ منٹ لگے تھے، لیکن اس وقت وہ پانچ منٹ سالار کو پانچ ہزار سال لگ رہے تھے۔ وہ ملک اور وہ شہر اس کے دوستوں اور رشتہ داروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک فون کال کرتا اور وہاں مجمع لگا لیتا۔ لیکن کوئی مجمع کوئی اس کا مسئلہ، اس کی آزمائش ختم نہیں کر سکتا تھا اور آزمائش تھی کہ بلا کی طرح اس کے سر پر آئی تھی، اس سے بھی بڑھ کر اس کی فیملی کے سر پر۔

وہ ہوٹل کے کمرے میں آ کر دروازہ بند کر کے خود پر قابو نہیں رکھ پایا تھا۔ وہ بے اختیار چیخیں مارتا رہا تھا۔ اس ہوٹل کے ساتویں فلور کے ایک ڈبل گلیزڈ شیشوں والے ساؤنڈ پروف کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک کیے وہ اس کے ساتھ چپکا پاگلوں کی طرح چلاتا رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جب کئی سال پہلے مارگلہ کی پہاڑیوں پر ایک تاریک رات میں ایک درخت سے بندھا چلاتا رہا تھا۔ بے بسی کی وہی انتہا اس نے آج بھی محسوس کی تھی اور اس سے زیادہ شدت سے محسوس کی تھی۔ تب جو بھی گزر رہا تھا، اس کے اپنے اوپر گزر رہا تھا۔ جو بھی ہونا تھا صرف اسے ہونا تھا۔

آج جو بھی گزر رہا تھا، وہ اس کی بیوی اور کم سن بچوں پر گزر رہا تھا اور ان کو پہنچنے والی کسی تکلیف کا تصور بھی سالار سکندر کو جیسے صلیب پر لٹکا رہا تھا۔ اگر کوئی غلطی تھی تو اس کی تھی، اس کی فیملی کا کیا قصور تھا۔ وہ اسے مار دیتے پیٹرس ایباکا کی طرح۔ اسے یہ بھی قبول تھا کہ وہ ایباکا کی طرح اس بستر پر اسی حالت میں پڑا ہوتا لیکن امامہ، جبریل اور عنایہ اور وہ اس کا وہ بچہ جو ابھی دنیا میں آیا بھی نہیں تھا، ان کا کیا قصور تھا۔

وہ لوگ جو اس کے اعصاب کو شل کرنا چاہتے تھے، وہ اس میں کامیاب ہو رہے تھے۔ وہ اگر اسے گھٹنوں کے بل گرانا چاہتے تھے تو وہ گر گیا تھا۔ وہ اسے اوندھے منہ پھینکنا چاہتے تھے تو وہ اوندھے منہ پڑا تھا۔

وہ رات سالار پر بہت بھاری تھی۔ پتا نہیں وہ کتنی بار ہوٹل سے نکل کر فون بوتھ پر گیا تھا۔ سکندر عثمان کو فون کر کے وہ امامہ اور اپنے بچوں کے بارے میں کسی اطلاع کا پوچھتا اور پھر اسی طرح واپس آ جاتا۔ وہ ساری رات ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو پایا تھا۔ امامہ، جبریل اور عنایہ کے چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتے رہے تھے۔

اگلی صبح وہ آفس کے اوقات کے شروع ہونے سے بہت پہلے ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا تھا۔

الیگزینڈر رافیل نے اپنے کمرے میں آتے ہوئے سالار سکندر کو بڑے اطمینان سے دیکھا تھا۔ یہ وہ سالار نہیں تھا جو کل یہاں آیا تھا۔ ایک دن اور ایک رات نے اسے جیسے پہاڑ سے مٹی کر دیا تھا۔

"مجھے پریذیڈنٹ سے ملنا ہے۔"

اس نے آتے ہی یہ جملہ کہا تھا، رافیل اس سے اس جملے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا، وہ اس سے کہے گا کہ وہ ان کی تمام شرائط ماننے کے لیے تیار تھا، لیکن وہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔

"پریذیڈنٹ سے ملاقات۔ بہت مشکل ہے یہ تو۔ کم از کم اس مہینے میں تو یہ ممکن نہیں ہے۔ اور پھر اس ملاقات کی ضرورت کیوں پیش آئی تمہیں۔ اگر تمہیں وہ سب کچھ دہرانا ہے جو تم کل یہاں کہہ کر گئے تھے تو وہ میں پریذیڈنٹ تک پہنچا چکا ہوں۔"

رافیل آج اسی ٹون میں بات کر رہا تھا جس ٹون میں وہ کل بورڈ روم میں بیٹھا بات کرتا رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے لیے سالار کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ وہ ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر میں بیٹھ کر رونا نہیں چاہتا تھا، لیکن اس وقت اسے لگ رہا تھا، وہ کسی بھی لمحے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گا اور آخری چیز جو وہ کرنا چاہتا تھا، یہی ایک کام تھا۔

"کنشاسا میں کل سے میری فیملی غائب ہے۔ میری بیوی۔ میرا بیٹا۔ میری بیٹی۔" اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے اس نے رافیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"ہوں۔ بہت افسوس ہوا۔ تمہیں فوری طور پر واپس جانا چاہیے کانگو' تاکہ پولیس کی مدد سے اپنی فیملی کو بر آمد کرواسکو۔ جو حالات کانگو میں ہیں ان میں کوئی گمشدہ شخص بہت کم ہی صحیح سلامت ملتا ہے' لیکن پھر بھی۔"

رائیل یوں بات کر رہا تھا جیسے اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کے لہجے' چہرے' آنکھوں میں کہیں سالار کے انکشاف پر افسوس یا ہمدردی نہیں تھی۔ سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میرا پاسپورٹ اور سارے ڈاکومنٹس گم ہو چکے ہیں۔ ہوٹل کے کمرے سے سب کچھ غائب ہوا ہے کل۔ اور اب میں کل واپس کنشاسا نہیں جاسکتا۔ مجھے ہیڈ کوارٹر کی مدد چاہیے اپنے پاسپورٹ اور دوسری دستاویزات کے لیے۔ اور مجھے ورلڈ بینک سے فوری طور پر ڈاکومنٹس چاہئیں' تاکہ میں اپنا پاسپورٹ لے سکوں۔"

رائیل نے اس کی بات خاموشی سے سننے کے بعد اسے بڑے ہی ٹھنڈے انداز میں سرد مہری سے کہا۔

"ان حالات میں ورلڈ بینک تمہیں نئے پاسپورٹ کے لیے کوئی لیٹرز جاری نہیں کر سکے گا کیونکہ تم آج ریزائن کر رہے ہو۔ میرا خیال ہے تمہیں معمول کے طریقہ کار کے مطابق پاسپورٹ کے لیے اپلائی کرنا چاہیے اور پھر کانگو جانا چاہیے ایک عام شخص کے طور پر۔ اگر تم ورلڈ بینک کے ایمپلائی ہوتے تو ہم تمہاری فیملی کے لیے کسی بھی حد تک جاتے' لیکن اب وہ اور ان کا تحفظ ہماری آرگنائزیشن کی ذمہ داری نہیں۔ تمہارے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ تم کنشاسا میں امریکن ایمبیسی سے رابطہ کرو اور اپنی فیملی کے لیے مدد مانگو یا پھر پاکستانی ایمبیسی سے۔ تم اوریجنلی پاکستان سے ہی ہو نا؟"

رائیل نے اپنی گفتگو کے اختتام پر بڑے بھولپن سے اس سے یوں پوچھا جیسے اسے یہ اچانک یاد آیا ہو کہ وہ دہری شہریت رکھتا تھا۔

سالار اس کے اس تضحیک آمیز جملے کو شہد کے گھونٹ کی طرح پی گیا۔ ورلڈ بینک کے ایمپلائی کو بلیو پاسپورٹ ایشو ہوتا تھا اور اس پاسپورٹ کے حصول کے لیے اسے ایک بار پھر سے ہیڈ کوارٹر سے اس کے لیے لیٹر چاہیے تھا یا پھر ورلڈ بینک اس کی جگہ پر خود اس پاسپورٹ کے لیے اپلائی کر کے اسے پاسپورٹ لوا تا۔ لیکن اب رائیل کے دوٹوک انکار نے سالار کے ذہنی ہیجان میں اضافہ کر دیا تھا۔ زندگی میں کبھی کسی مغربی ادارے سے اسے اتنی شدید نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی اس دن ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹر میں بیٹھے ہوئے ہوئی تھی۔

وہ اپنی زندگی کے بہترین سال اور بہترین صلاحیتیں مغرب کو دیتا آیا تھا۔ اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے اور اب ورلڈ بینک۔ وہ اس ہیڈ کوارٹر میں کل تک ایک خاص اسٹیٹس کے ساتھ آتا رہا تھا اور آج وہ اس سے اس طرح کا برتاؤ کر رہے تھے جیسے وہ ایک بھکاری تھا۔ ایک ناکارہ' بے کار آدمی۔ جس کے پاس اب ورلڈ بینک کو دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ انہیں اس کی اتنی ہی دیانت داری' اخلاص اور ضمیر چاہیے تھا جو صرف ان کے ادارے اور تہذیب کی ترقی کے لیے ضروری تھا۔ انسانیت' مادہ پرستی کے اس جنگل کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی جسے مغرب ترقی کہتا تھا اور اسی ترقی کے حصول کی خواہش میں وہ بھی ساری عمر سرگرداں رہا تھا۔

بعض لمحے انسانوں کی زندگی میں تبدیلی کے لمحے ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی تبدیلیوں کے۔ صرف ایک لمحے کی ضرورت ہوتی ہے' جو انسان کو بہت ساری زنجیروں سے آزاد کر دیتا ہے۔ سینتیس سالہ زندگی میں آج دوسری بار سالار کی زندگی میں وہ لمحہ آیا تھا۔

پہلی بار مارگلہ کی پہاڑی پر موت کے خوف کی گرفت میں وہ اس طرز زندگی سے تائب ہو گیا تھا جو وہ گزارتا آیا تھا اور آج دوسری بار وہ امامہ اور اپنے بچوں کی موت کے خوف اور ورلڈ بینک میں اپنے سینئرز کے ہاتھوں ملنے والی ہتک اور تذلیل کے بعد وہ فیصلہ کر بیٹھا تھا جو وہ اب تک کرتے ہوئے جھجکتا اور کتراتا رہا تھا۔

بعض خوف سارے خوف کھا جاتے ہیں۔ سالار سکندر کے ساتھ بھی اس دن یہ ہی ہوا تھا۔ وہاں بیٹھے اس

نے اس دن یہ طے کیا تھا' وہ اگلے دس سال میں ورلڈ بینک سے بڑا ادارہ بنائے گا۔ وہ دنیا کے اس مالیاتی نظام کو الٹ کر رکھ دے گا جس پر مغرب قابض تھا۔ وہ ساری عمر مغربی اداروں میں مغربی تعلیم حاصل کرتا رہا تھا۔ وہ مغرب کا مداح تھا لیکن وہ مغرب کا مطیع نہیں بن سکتا تھا۔

ذلت بہت کم لوگوں کو مطیع بناتی ہے۔ تذلیل لوگوں کو منتقم المزاجی سکھاتی ہے۔ بدلہ لینے پر مجبور کرتی ہے۔ سالار سکندر نے اپنی پروفیشنل زندگی میں پہلی بار ایسی تذلیل چکھی تھی۔ ہتک۔ ذلت۔ تذلیل۔ جتنے بھی لفظ اس احساس کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں۔ اس کو محسوس ہوئے تھے۔ مغرب کی مشینری کا ایک بہترین اور کار آمد پرزہ بن کر بھی وہ صرف ایک پرزہ ہی بن سکا تھا جس کی مدت میعاد اور ضرورت ختم ہونے پر اسے ناکارہ سمجھ کر پھینک دیا جاتا۔ وہ ساری عمر یہ سمجھتا رہا تھا۔ وہ اپنی قابلیت' اپنی مہارت' اپنے کام سے جزولاینفک بن چکا تھا۔ وہ خود کو اہم نہیں "اہم ترین" سمجھتا رہا تھا۔ اس کا یہ یقین' خوش فہمی نکلی تھی۔

"تم مزید کسی ایشو کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو؟" الیگزنڈر رافیل نے بظاہر بے نیازی جتاتے ہوئے اس سے کہا۔

"نہیں۔" وہ مزید کچھ بھی کہے بغیر اٹھ گیا تھا۔ رافیل بھونچکا رہ گیا تھا۔ وہ اسے اپنے بیوی' بچوں کی زندگی کے لیے گڑگڑاتا دیکھنا چاہتا تھا۔ اپنے پاسپورٹ کو ایشو کرانے کے لیے ورلڈ بینک کی اپروول اور تعاون کی بھیک مانگتے ہوئے اور پھر آخر کار ان ٹرمز اور کنڈیشنز کو مانتے ہوئے استعفیٰ دیتے یا کانگو میں اس پروجیکٹ کو جاری رکھنے کی۔ جس کے لیے وہ کل یہاں بیٹھا تھا۔ لیکن سالار سکندر ان حالات میں بھی اٹھ کر چلا گیا تھا۔ رافیل کو لگا اس کا ذہنی توازن خراب ہو گیا تھا۔

ہیڈ کوارٹرز کی عمارت سے اس طرح نکلتے ہوئے سالار کو خود بھی یہ ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا ذہنی توازن خراب ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ اتنا بے رحم اور بے حس تو نہیں ہو سکتا تھا کہ امامہ اور بچوں کے لیے وہاں کچھ بھی کہے بغیر آجائے۔ وہ وہاں کمپرومائز کرنے گیا تھا۔ اپنی بیوی اور بچوں کی زندگی بچانے کے لیے ان کی شرائط ماننے کی نیت سے وہاں گیا تھا۔ لیکن رافیل کے الفاظ اور رویے نے جیسے سالار سکندر کا ذہن ہی الٹ کر رکھ دیا تھا۔

"میں ان میں سے کسی سے بھی اپنی فیملی کی زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ اگر گڑگڑاؤں گا تو بھی ان میں سے کسی کے سامنے نہیں گڑگڑاؤں گا۔ عزت اور ذلت دونوں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اللہ نے ہمیشہ مجھے عزت دی ہے۔ ذلت جب بھی میرا مقدر بنی ہے میرے فیصلوں' میرے انتخاب سے بنی ہے۔ میں آج بھی اللہ سے ہی عزت مانگوں گا۔ پھر اگر اللہ مجھے عزت نہیں دیتا ہے گا تو میں اللہ کی دی ہوئی ذلت بھی قبول کروں گا۔ لیکن میں دنیا میں کسی اور شخص سے ذلت نہیں لوں گا۔ نہ جھکوں گا۔ نہ کمپرومائز کروں گا۔ کم از کم اب اس سب کے بعد نہیں۔"

وہ ریت کا ٹیلا بن کر اندر گیا تھا اور آتش فشاں بن کر باہر آیا تھا۔ وہ وہی لمحہ تھا جب اس نے امامہ اور اپنے بچوں کی زندگیاں بھی داؤ پر لگا دی تھیں۔

"امامہ۔ جبریل۔ عنایہ۔ یہ نعمتیں مجھے اللہ نے دی ہیں۔ کسی انسان سے تو کبھی بھی نہیں ملیں۔ تو پھر میں انسانوں سے ان کے لیے بھیک کیوں مانگوں۔"

وہ ضدی تھا لیکن اس نے زندگی میں سوچا کبھی بھی نہیں تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب وہ امامہ اور اپنے بچوں کی زندگیوں کو اپنی ضد کے سامنے قربان کرنے پر تیار ہو جائے گا۔

سالار سکندر کو پھانسنے کے لیے جو پھندا تیار کیا گیا تھا' وہ اس سے بچ کر نکل گیا تھا اور جن لوگوں نے وہ پھندا تیار کیا تھا انہیں اندازہ نہیں تھا۔ بساط کس طرح پلٹنے والی تھی' وہ اس کو مات دینا چاہتے تھے۔ وہ انہیں شہ مات دینا

چاہتا تھا۔
"اور اللہ بے شک بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔"



وہ دن ورلڈ بینک کے لیے بہت بڑی خوش خبری لے کر آیا تھا۔ پیٹرس ایباکا کوما کی حالت میں مر گیا تھا۔ سالار سکندر نے وہ خبر بینک سے واپس ہوٹل آکر ٹی وی پر سنی تھی۔ یہ اس کے لیے ایک اور دھچکا تھا۔ مگر یہ وہ خبر تھی جو اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ پیٹرس ایباکا کی جو حالت دیکھ آیا تھا اس کے بعد اس کا دوبارہ نارمل ہونا ناممکن تھا۔ لیکن وہ رات ورلڈ بینک کے لیے سیاہ ترین رات تھی۔
پیٹرس ایباکا مرنے سے پہلے ورلڈ بینک کی موت کا سامان کر گیا تھا۔



"ایکسکیوزمی۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کر بار کی طرف چلی گئی تھی۔ اس کی نظروں نے جیکی کا تعاقب کیا۔ وہ بار کاؤنٹر پر بارٹینڈر سے بات کر رہی تھی۔ اس کے سیاہ بیک لیس لباس سے اس کی سفید خوب صورت پشت کمر کے خم تک نظر آ رہی تھی۔
اس نے نظر ہٹاتے ہوئے اپنے سامنے پڑے اورنج ڈرنک کا ایک گھونٹ لیا۔ بہت عرصے کے بعد اس نے کسی عورت کے جسم پر غور کیا تھا اور بہت عرصے کے بعد وہ کسی عورت کے ساتھ اکیلے کسی بار میں بیٹھا تھا۔ وہ ایک ہوٹل کا بار روم تھا لیکن وہ ایسی کسی جگہ پر بھی بہت عرصے کے بعد آیا تھا۔
وہ ہاتھ میں پکڑے گلاس سے دوسرا گھونٹ لے رہا تھا جب جیکی دو شیمپین گلاسز کے ساتھ واپس آگئی تھی۔
"میں نہیں پیتا۔" اس نے ایک گلاس اپنے سامنے رکھتے پر چونک کر اسے یاد دلایا تھا۔
"یہ شیمپین ہے۔" جیکی نے جواباً ایک کندھے کو ہلاتے ہوئے بے حد گہری مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا۔ اس کا اپنا گلاس کے ہاتھ میں تھا۔
"شیمپین شراب نہیں ہے کیا؟" اس نے جواباً جیسے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ وہ ٹیبل پر پڑی سگریٹ کی ڈبیا سے اب ایک سگریٹ نکال کر لائٹر کی مدد سے سلگا رہا تھا۔
جیکی نے آگے جھکتے ہوئے بڑی سہولت سے اس کے ہونٹوں میں دبا سگریٹ نکال لیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی یہ حرکت بے حد غیر متوقع تھی۔ وہ اب اسی سگریٹ کو اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبائے بائیں ہاتھ میں شیمپین گلاس پکڑے مسکراتے ہوئے سگریٹ کے کش لے رہی تھی۔
اس نے نظریں چراتے ہوئے سگریٹ کی ڈبیا سے ایک اور سگریٹ نکال لیا۔
"آؤ ڈانس کریں۔" وہ جیکی کی آفر ایک بار پھر چونکا۔ وہ ڈانس فلور پر رقص کرتے چند جوڑوں کو دیکھ رہی تھی۔
بار روم میں اس وقت زیادہ لوگ نہیں تھے اور ان میں سے بھی صرف چند ایک ہی اس ڈانس فلور پر موجود تھے۔ جنہیں واقعی ڈانس کرنا تھا وہ اسی ہوٹل کے نائٹ کلب میں موجود تھے۔
"میں ڈانس نہیں کرتا۔" اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے لائٹر رکھا۔
"آتا نہیں ہے؟" جیکی ہنسی تھی۔
"پسند نہیں ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔ وہ ڈرنک کا گھونٹ بھرتے ہوئے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ اس نے راکھ جھاڑنے کے بہانے نظریں چرائیں۔ جیکی کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی

تھی۔

"شراب کبھی نہیں پی تم نے؟"

اس نے ہاتھ میں پکڑا گلاس میز پر رکھتے ہوئے کچھ آگے جھکتے ہوئے پوچھا۔ اس شخص کی نظریں ایک لمحہ کے لیے گلاس سے الجھی تھیں پھر اس نے جیکی کو دیکھا۔

"بہت عرصہ پہلے۔" اس نے جیسے اعتراف کیا۔

"شیمپین؟" جیکی نے مصنوعی حیرت کے ساتھ کہا۔

"یہ بھی..." بے تاثر چہرے کے ساتھ اس نے ڈانس فلور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

گلاس دوبارہ اٹھاتے ہوئے سامنے بیٹھے ہوئے مرد کے چہرے پر نظریں جمائے جیکی نے اپنی زندگی میں آنے والے پُرکشش ترین مردوں کی فہرست میں اس کا شمار کیا تھا۔ وہ اس فہرست میں سب سے اوپر تھا۔ یہ اس کے جسمانی خدوخال نہیں تھے۔ جو اسے سب میں ممتاز کرتے تھے۔ اس کی زندگی میں شکل و صورت کے اعتبار سے اس سے زیادہ خوب صورت مرد آئے تھے۔ سامنے بیٹھے ہوئے شخص میں کچھ اور تھا جو اسے بے حد منفرد سب سے الگ بنا رہا تھا۔ اس کی بھاری مردانہ آواز، شائستہ رویہ، ذہین تیز اور گہری آنکھیں، اس کی مسکراہٹ یا پھر اس کی تمکنت اور رکھ رکھاؤ، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف ملتفت ہو رہی تھی اور بُری طرح ہو رہی تھی اور اس میں اس کا قصور نہیں تھا۔ وہ دعوے سے کہہ سکتی تھی کہ وہ مرد کسی بھی عورت کو متوجہ کر سکتا تھا۔ اس نے اس کے کریکٹر پروفائل میں پڑھا تھا کہ وہ عیاش نہیں تھا۔ اسے حیرت تھی کہ وہ کیوں نہیں تھا۔ اسے ہونا چاہیے تھا۔ اس پر نظریں جمائے اس نے سوچا اور بالکل اسی لمحے اس شخص نے ڈانس فلور سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔ جیکی کی مسکراہٹ بے اختیار گہری ہوئی تھی۔ وہ بھی بے مقصد مسکرا دیا تھا۔ وہ بہت عرصے کے بعد کسی عورت کی کمپنی کو انجوائے کر رہا تھا۔ وہ خوب صورت تھی، اسمارٹ تھی اور وہ الجھا ہوا تھا۔ نہ ہوتا تو یہاں اس وقت وہ ایک اجنبی عورت کے ساتھ کبھی نہ بیٹھا ہوتا۔

"تمہاری شیمپین!" جیکی نے اسے ایک بار پھر یاد دلایا۔

"تم لے سکتی ہو۔" اس نے جواباً گلاس کو اس کی طرف بڑھا دیا۔

"تم پہلے پیتے تھے، اب اس میں کیا برائی نظر آئی تمہیں؟" جیکی اس بار سنجیدہ ہوئی تھی۔

"لطف حاصل کرنے کے لیے پیتا تھا، جب لطف آنا ختم ہو گیا تو شراب چھوڑ دی۔"

وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنسی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ جیکی دونوں ہاتھ ٹیبل پر رکھے ہوئے آگے جھکی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

"کیا تم جانتے ہو، مجھے تم میں ایک ساحرانہ کشش محسوس ہوتی ہے۔"

وہ مسکرایا تھا یوں جیسے اس کے جملے سے محظوظ ہوا ہو۔

"ترے نصیب۔" اس نے جواباً کہا تھا۔

جیکی نے بڑے غیر محسوس انداز میں میز پر رکھے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ ہاتھ ہٹانا چاہتا تھا لیکن چاہتے ہوئے بھی نہیں ہٹا سکا۔ وہ اس کے ہاتھ کی پشت پر بظاہر غیر محسوس انداز میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑا سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دیا۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے پھر جیکی نے کہا۔

"کیا تم ایک رات کے تعلق پر یقین رکھتے ہو؟"

جواب فوری آیا تھا۔ "بالکل..."

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

کے لیے مشکل تھا کہ وہ اپنا لیپ ٹاپ تو ساتھ رکھتا تھا۔ لیکن ہاسپٹل جاتے ہوئے انہیں توقع تھی وہ سب کچھ وہیں چھوڑ کر جائے گا۔

سب کچھ ویسے ہی ہوا تھا جیسے ان کا پلان تھا لیکن نتیجہ وہ نہیں نکلا تھا جس کی انہیں توقع تھی۔

وہ ویڈیو انہیں لے ڈوبی تھی۔ کوئی بھی اس ویڈیو میں نظر آنے والے چہرے کے نقوش کو بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ اتنے واضح تھے اور اس ویڈیو میں دوسری سب سے نمایاں چیز وہ وقت اور تاریخ تھی جو اسکرین پر نیچے آ رہی تھی۔ وہ اس پیٹرس ایباکا کی شناخت نہیں بدل سکتے تھے اور وہ واشنگٹن کے ہاسپٹل میں بظاہر حادثے میں زخمی ہو کر آنے اور مرنے والے ایباکا کی شناخت بھی نہیں بدل سکتے تھے۔ وہ نیوز چینلز پر ایباکا کی تصویریں نہ چلوا چکے ہوتے اس حادثے کے فوراً بعد شدید زخمی فرد کے طور پر۔ تو شاید سی آئی اے یہ کر لیتی اور ایباکا کو واشنگٹن کے اس ہاسپٹل سے فوری طور پر واپس نیویارک منتقل کر دیا جاتا لیکن وہ ایک غلطی کے بعد صرف دوسری نہیں تیسری اور چوتھی غلطی بھی کر بیٹھے تھے۔

اس جلتی آگ کو بجھانے کی کوشش بہت جلد شروع کر دی گئی تھیں۔ انہوں نے یوٹیوب سے اس ویڈیو کو ہٹانے کی کوششیں شروع کر دیں وہ اسے بلاک نہیں کر سکتے تھے کیونکہ یہ شور شرابے کو بڑھا جاتا لیکن وہ بار بار اپ لوڈ ہونے والے لنکس کو مٹا رہے تھے اور اس میں کوشش کے باوجود ناکام ہو رہے تھے۔ سی آئی اے کی بلاگر ٹیم مختلف لنکس پر آنے والے تبصروں میں سیاہ فام بن کر ایسی پوسٹ کر رہے تھے جو یہ ظاہر کرتے کہ یہ کوئی نسلی تعصب ہو سکتا ہے۔ پیٹرس ایباکا کو مارنے میں کم از کم سی آئی اے یا ایف بی آئی جیسی کوئی ایجنسی ملوث نہیں ہو سکتی تھی وہ بڑے نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹا نقصان کرنے پر تیار تھے مگر یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ وہ معاملہ قومی سطح کا نہیں رہا تھا۔ وہ آگ امریکا سے کانگو تک پہنچ گئی تھی۔

اینڈرسن کوپر کی ٹیم نے پیٹرس ایباکا کی مشکوک حالت میں موت کے بعد ان پیغامات اور ای میلز کو اور اس ویڈیو میں نظر آنے والے وقت کو چیک کیا تھا۔ وہ سب پیغامات اور ای میلز جن میں ایباکا نے کوپر کے شو میں شرکت سے معذرت کرنے کے ساتھ ساتھ کسی قسم کی معاونت سے بھی انکار کیا تھا وہ اس ویڈیو سے دو گھنٹے بعد کے بھیجے گئے تھے اور اس وقت کے جب نیویارک کے ہاسپٹل میں ایباکا کی سرجری ہو رہی تھی اور ایسے پیغامات صرف کوپر ہی کو نہیں ان دوسرے پروگرامز کے میزبانوں کو بھی بھیجے گئے تھے یا صحافیوں کو جن سے ایباکا پچھلے کچھ دنوں سے مل رہا تھا اور ان کے مسئلے کو سامنے لانے کی درخواست کر رہا تھا۔

اینڈرسن کوپر نے ایک نیوز بریک میں پیٹرس کے ان پیغامات اور اس ویڈیو کی ٹائمنگ کو ہائی لائٹ کیا تھا اور پھر اس نے نیویارک اور واشنگٹن کے دو ہاسپٹلز کے مستند ذرائع کا حوالہ دیتے ہوئے یہ راز کھول دیا تھا کہ ان دونوں ہاسپٹلز میں اسے داخل کرنے والے سی آئی اے سے تعلق رکھتے تھے۔

پیٹرس ایباکا کی موت کی وجہ کیا ہو سکتی تھی۔ کون اسے مار سکتا تھا اور کیوں مار سکتا تھا۔ اس کو صرف وہ شخص بتا سکتا تھا جس کا نام ایباکا کوپر کے سامنے کئی بار لے چکا تھا۔ جو واشنگٹن میں اس سے ملنے کے لیے آنے والا واحد ملاقاتی تھا۔ اور جس نے اپنی شناخت ایباکا کے رشتہ دار کے طور پر ظاہر کی تھی۔ امریکہ کے ہر نیوز چینل پر اس رات سالار سکندر کا نام اس حوالے سے چل رہا تھا اور ہر کوئی سالار سے رابطہ کرنے میں ناکام تھا۔



اور اس رات اپنے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے ان تمام نیوز چینلز کی کوریج خوف و ہراس کے ساتھ سالار بھی دیکھ رہا تھا۔ سی آئی اے بھی دیکھ رہی تھی۔ اور ورلڈ بینک کے وہ سارے کرتا دھرتا بھی جو دو دن سے سالار

سکندر کو ہراساں کرنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگائے بیٹھے تھے۔

پیٹرس ایباکا کو اس ویڈیو میں نشانہ بنتے دیکھ کر سالار کو اس رات یہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کی فیملی زندہ نہیں تھی۔ وہ لوگ اگر ایباکا کو مار سکتے تھے اور اس طرح مار سکتے تھے تو وہ اور اس کی فیملی کیا شے تھی اور اگر اس رات اسے کسی چیز میں دلچسپی تھی تو وہ اپنی بیوی اور اپنے بچوں کی زندگی تھی۔ اور کچھ نہیں۔ اپنا آپ بھی نہیں۔

اور سی آئی اے میں اس آپریشن کو کرنے والے لوگ اس رات صرف ایک بات سوچ رہے تھے۔ انہیں سالار سکندر کا کیا کرنا تھا۔۔؟ زندہ رکھنا تھا۔ مارنا تھا۔ زندہ رکھنا تھا تو پھر اس کی کھلنے والی وہ زبان کیسے بند رکھتے جو ورلڈ بینک سمیت بہت سے دارالحکومتوں میں بھونچال برپا کر دیتی۔ مار دیتے تو کیسے مارتے۔ کہ اس کی موت پیٹرس ایباکا کی طرح سی آئی اے کے منہ پر ایک اور بدنامی کے دھبے کا اضافہ کرتی۔ یا پھر وہ کنشاسا میں موجود اس کی بیوی اور بچوں کی زندگی کے ذریعے اسے بلیک میل کرتے۔ قید میں وہ اسے رکھ نہیں سکتے تھے۔ ہمیشہ کے لیے وہ اس کے رابطوں کے ذرائع بھی بند نہیں رکھ سکتے تھے۔ زندگی یا موت؟۔۔۔ زندگی یا موت؟ ٹیبل ٹینس کی گیند کی طرح جال بنا انہیں کے کورٹس میں گھوم رہی تھی زندگی۔

پھر فیصلہ ہو گیا تھا لیکن وہ سی آئی اے نے نہیں کیا تھا۔ کانگو کے عوام نے کیا تھا۔



چار سالہ جبریل نے اپنے خاندان کو درپیش آنے والے اس بحران میں جو رول ادا کیا تھا وہ اس نے زندگی میں کئی بار ادا کرنا تھا۔ اسے اس وقت یہ تو علم نہیں تھا۔ اسے پتا تھا اس کی ماں تکلیف میں تھی اسے یہ بھی پتا تھا کہ اس کی ماں ایک بے بی لینے جا رہی تھی جو ایک لڑکا تھا اور اسے یہ بھی پتا تھا کہ اس کی ماں نے ہمیشہ کی طرح دو سالہ عنایہ کی ذمہ داری اس کو سونپی تھی۔

امامہ کے جانے کے بعد پیٹی کو اچانک خیال آیا تھا کہ امامہ اسے گھر سے کچھ چیزیں لانے کا کہہ کر گئی تھی جو نوزائیدہ بچے اور اس کے لیے ایک بیگ میں گھر پر پہلے ہی پیک کر کے رکھی ہوئی تھیں اور پیٹی سے ان دونوں بچوں کے لیے کھانا بنانے اور ان کے کپڑوں کے لیے بھی کہہ کر گئی تھی کیونکہ اسے بچوں کو گھر واپس نہیں بھیجنا تھا جب تک سالار نہ آ جاتا۔ اس نے پیٹی سے کہا تھا وہ ان بچوں کو ہاسپٹل میں ہی کسی نرس یا اسسٹنٹ کے پاس چھوڑ کر گھر سے یہ چیزیں لے آئے یا پھر گھر میں موجود کسی اور ملازم کی مدد لے لیکن وہ بچوں کو واپس نہیں لے جائے گی۔

پیٹی کو امامہ کی یہ ہدایات یاد نہیں رہی تھیں۔ ان کا گھر وہاں سے صرف دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا اور پیٹی نے سوچا تھا۔ وہ دو سال ان بچوں کو اکیلا چھوڑنے کے بجائے ان کو اپنے ساتھ ہی لے جائے گی اور واپس لے آئے گی۔

جبریل نے ساتھ لے جانے کی اس کوشش کے جواب میں صاف انکار کرتے ہوئے اسے یاد دلایا تھا کہ ممی نے اس سے کہا تھا وہ وہیں رہیں گے۔ وہ انہیں ساتھ نہیں لے جائے گی۔ پیٹی کو یاد آ گیا تھا اور اس نے دوبارہ اصرار نہیں کیا تھا۔ وہ جبریل کو بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ چار سال کی عمر میں بھی وہ بچہ کسی طوطے کی طرح ماں باپ کی باتیں رٹ کر پیروی کرتا تھا اور مجال تھی کہ وہ کسی دوسرے کی باتوں میں آ کر امامہ یا سالار کی طرف سے ملنے والی ہدایات فراموش کر دیتا۔ پیٹی انہیں امامہ کی ڈاکٹر کی ایک اسسٹنٹ کے پاس چھوڑ کر فوری طور پر گھر چلی گئی تھی۔

اس کی عدم موجودگی میں عنایہ کو نیند آنے لگی تھی۔ ڈاکٹر کی اسسٹنٹ نے نیند میں جھولتی ہوئی دو سال کی اس بچی کو اٹھا کر ایک بینچ پر لٹانے کی کوشش کی اور جبریل نے اسے روک دیا۔ وہ وہاں سے عنایہ سمیت ہٹنا نہیں چاہتا تھا جہاں پیٹی اسے بٹھا کر گئی تھی اور جہاں اسسٹنٹ عنایہ کو لے کر جا کر لٹانا چاہتی تھی۔ وہ ایک بغلی کمرہ تھا۔

چار سال کا وہ بچہ اپنی دو سالہ بہن کے ساتھ وہیں پبلک میں بیٹھے رہنا چاہتا تھا کیونکہ اسے پتا تھا کسی اجنبی کے

ساتھ کہیں نہیں جانا چاہیے۔ کسی ایسی جگہ، جو دور ہوتی۔ اسٹنٹ کچھ حیران ہو کر واپس اپنی ٹیبل پر گئی تھی۔ وہ ایک انٹرسٹنگ بچہ تھا۔ اس نے اپنی کرسی پر بیٹھے اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔ دو سالہ عنایہ اب جبریل کی گود میں سر رکھے سو رہی تھی اور وہ بے حد چوکنا بیٹھا، بہن کے سر کو اپنے ننھے ننھے بازوؤں کے حلقے میں لیے ملاقاتی کمرے میں آنے جانے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور تب وہ عورت ان دونوں کے برابر میں آ کر بیٹھی اور اس نے جبریل کو ایک مسکراہٹ دیتے ہوئے اس کا سر تھپتھپایا اور جواباً" اس بچے کے تاثرات نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اسے یہ بے تکلفی اچھی نہیں لگی ہے۔ اس عورت نے دوسری بار سوئی ہوئی عنایہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے کی کوشش کی تو اس بار جبریل نے اس کا ہاتھ بڑی نرمی سے پرے کرتے ہوئے سرگوشی میں اس سے کہا۔

" She is sleeping (یہ سو رہی ہے)"

"اوہ سوری!" امریکن عورت بظاہر شرمندگی ظاہر کرتے ہوئے اسے دیکھ کر مسکرائی، جبریل نے ایک بار پھر سپاٹ چہرے اور اس کی طرف دیکھے بغیر اس کی مسکراہٹ نظر انداز کی۔

اس عورت نے اپنا پرس کھول کر اس کے اندر سے چاکلیٹ کی ایک بار نکال کر جبریل کی طرف بڑھائی۔

"تھینکس" جواب چاکلیٹ آگے بڑھائے جانے سے بھی پہلے آیا تھا۔

"میرے پاس کچھ کھلونے ہیں۔" اس بار اس عورت نے زمین پر رکھے ایک بیگ سے ایک اسٹفڈ کھلونا نکال کر جبریل کی طرف بڑھایا، اس کی سرد مہری کی دیوار توڑنے کی یہ اگلی کوشش تھی۔ جبریل نے اس کھلونے پر ایک نظر ڈالے بغیر بہت شائستگی سے اس سے کہا۔

" Would you please stop bothering us"

(آپ ہمیں تنگ کرنا بند کریں گی پلیز)

ایک لمحے کے لیے وہ عورت چپ ہی رہ گئی تھی یہ جیسے شٹ اپ کال تھی اس کے لیے مگر وہ وہاں منہ بند کرنے کے لیے نہیں آئی تھی۔ انہیں ان دونوں بچوں کو وہاں سے لے جانا تھا اور ان کا خیال تھا۔ آتے جاتے ملاقاتیوں میں دو کم سن بچوں کو بہلا پھسلا کر وہاں سے لے جانا کیا مشکل تھا۔ زور زبردستی وہ اتنے لوگوں کے سامنے عنایہ کے ساتھ کر سکتے تھے جبریل کے ساتھ نہیں۔

وہ اب منتظر تھی کہ عنایہ کی طرح وہ چار سالہ بچہ بھی تھک کر سو جائے پھر شاید ان کو کسی طرح وہاں سے ہٹا دیا جاتا۔ لیکن اسے جبریل کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا سونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ دس پندرہ منٹ بیٹھے رہنے کے بعد وہاں سے اٹھ گئی تھی اسے ان بچوں کے حوالے سے نئی ہدایات لینی تھیں اور پانچ منٹ بعد جب وہ واپس آئی تو بیڈی وہاں ان دونوں کے پاس موجود تھی۔

وہ عورت ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی تھی۔ وہ ان دونوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے، صرف اپنی نگرانی میں رکھنا چاہتے تھے جب تک امریکہ میں سالار کے ساتھ معاملات طے نہ ہو جاتے۔

امریکہ میں سالار کو اس کی فیملی کے حوالے سے صاف جواب دینے کے باوجود سی آئی اے اس کی فیملی پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ وہ عورت ایک بار پھر اس ویٹنگ روم میں کہیں اور بیٹھ گئی تھی۔ عنایہ اب جاگ گئی تھی اور باتھ روم جانا چاہتی تھی۔ بیڈی اسے باتھ روم لے کر جانا چاہتی تھی۔ اس نے جبریل کو ایک بار پھر وہیں ٹھہرنے کا کہا تھا۔ وہ نہیں ٹھہرا تھا۔ وہ کسی طرح بھی عنایہ کو اپنی آنکھوں سے اوجھل کرنے پر تیار نہیں تھا۔ بیڈی کو اسے بھی باتھ روم لے جانا پڑا تھا۔ وہ عورت بھی اٹھ کر ان کے پیچھے باتھ روم آئی تھی اور جبریل نے اس عورت کو ایک بار پھر نوٹس کیا تھا۔

" Why are yor stalking us"

(تم ہمارے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہو۔)

واش بیسن میں ہاتھ دھونے میں مصروف وہ عورت قریبی بیسن میں ہاتھ دھوتی ہیڈی کے ساتھ کھڑے اس بچے کا جملہ سن کر جیسے ایڑیوں پر گھومی تھی۔ منہ بھی گھومتی تو بھی اسے اندازہ تھا وہ بچہ اسے ہی مخاطب کر رہا تھا۔ ہیڈی نے اس عورت کو دیکھا اور معذرت خواہانہ انداز سے مسکرائی یوں جیسے وہ جبریل کے اس تبصرے سے متفق نہیں تھی۔ لیکن جبریل اسی ناخوش گوار انداز میں اس عورت کو دیکھ رہا تھا۔ پینتالیس سال کی اس عورت نے مسکراتے ہوئے اس چار سال کے بچے کو سراہا تھا۔ وہ پہلی بار ایک چار سال کے بچے کے ہاتھوں پسپا ہوئی تھی اور وہ اسے سراہے بغیر نہیں رہ سکی تھی وہ۔ جن بھی ماں باپ کی اولاد تھا۔ کمال تربیت ہوئی تھی اس کی۔

ہیڈی ان دونوں کو لے کر وہاں سے چلی گئی تھی لیکن وہ عورت نہیں گئی تھی وہ ایک بار پھر اس بچے سے وہ جملہ نہیں سننا چاہتی تھی جو اس نے کچھ دیر پہلے سنا تھا۔ بہتر تھا اسے بھیجنے والے اس کی جگہ کسی اور کو بھیج دیتے۔

ہیڈی امامہ سے ڈیڑھ گھنٹے بعد بھی نہیں مل سکی تھی، ڈاکٹر نے بتایا تھا، وہ ہوش میں نہیں تھی۔ آپریشن ٹھیک ہوا تھا لیکن اسے ابھی خواب آور دوائیں دی جا رہی تھیں۔ ہیڈی نے امامہ کے فون سے بار بار سالار کو کال کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہونے کے بعد اس نے اپنے نمبر سے بھی کال کی۔ وہ اسے اس کے بیٹے کی خوش خبری دینا چاہتی تھی اور ساتھ یہ اطلاع بھی کہ اس کے دونوں بچے اس کے پاس تھے اور محفوظ تھے لیکن وہ رابطہ نہیں کر پائی تھی۔

ہیڈی نے بار بار امامہ سے بھی ملنے کی کوشش کی تھی اور اس کے بچوں کو بھی امامہ سے ملوانے کے لیے ڈاکٹر سے اصرار کیا تھا کیونکہ عنایہ اب بے قرار ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے ان کیوبیٹر میں پڑا ہوا حمین تو دکھا دیا تھا لیکن امامہ تک رسائی نہیں دی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اسے دونوں بچوں کو اس کی تحویل میں دینے کا کہا تھا اور ہمیشہ کی طرح جبریل اڑ گیا تھا۔ نیند سے بوجھل آنکھوں اور تھکاوٹ کے باوجود وہ عنایہ کا ہاتھ پکڑے بیٹھا ہوا تھا کیونکہ ممی نے اسے عنایہ کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ اس نے انکیوبیٹر میں وہ بے بی دیکھ لیا تھا جسے ممی لینے گئی تھیں لیکن ممی کہاں تھیں؟ یہ سوال اب صرف اسے ہی نہیں ہیڈی کو بھی پریشان کر رہا تھا۔ وہ اب کنشاسا میں سالار کے آفس کے ذریعے اس سے رابطہ کرنے میں مصروف تھی لیکن سالار غائب تھا اور ورلڈ بینک پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ صرف ورلڈ بینک پر نہیں ان مغربی اقوام کے نمائندوں پر بھی جو کانگو میں استعمار کے ستون بنے بیٹھے تھے۔



پیٹرس ایباکا اپنی موت کے چوبیس گھنٹوں کے اندر ہی صرف کانگو کے ہیروز کا نہیں پورے افریقہ کا ہیرو بن گیا تھا۔ اس خطے نے آج تک صرف بکنے والے حکمران دیکھے تھے جو اربوں ڈالرز کے کمیشن لے کر اپنے ملک کی ہر چیز بیچنے کے لیے ہر وقت تیار بیٹھے تھے اس خطے نے "ہیرو" پہلی بار دیکھا تھا۔ جان دینے والا ہیرو۔ پیٹرس ایباکا ساری زندگی پر امن طریقوں سے جدوجہد کرتا اور اس کا درس دیتا رہا تھا لیکن اپنی موت کے بعد اس کی جو وصیت منظر عام پر آئی تھی، اس میں اس نے پہلی بار اپنی غیر متوقع اور غیر فطری موت کی صورت میں اپنے لوگوں کو لڑنے کے لیے اکسایا تھا۔ اس جنگل کو بچانے کے لیے انہیں سفید فاموں کو مار بھگانا تھا، چاہے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔

اپنی اسی وصیت میں اس نے ورلڈ بینک، امریکہ اور ان دوسری عالمی طاقتوں کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے انہیں ان سب کے خلاف "جہاد" کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ مسلمان نہیں تھا لیکن مذاہب کا تقابلی جائزہ لیتا رہا تھا اور اسے اپنے لوگوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور ظلم کے خلاف بغاوت کے لیے "جہاد" سے زیادہ موزوں

لفظ نہیں ملا تھا۔ اس نے صرف ہجوم کو مخاطب کیا تھا صرف انہیں جنگلوں سے نکل کر شہروں میں آکر لوٹنے کے لیے کہا تھا۔ ورلڈ بینک اور ان آرگنائزیشنز کے ہیڈ کوارٹرز پر حملہ کر کے وہاں کام کرنے والوں کو مار بھگانے کا کہا تھا لیکن اس رات وہ صرف ہجوم نہیں تھے جو جو ایباکا کی کال پر ورلڈ بینک کے ساتھ ساتھ غیر ملکی آرگنائزیشنز پر چڑھ دوڑے تھے۔ وہ کانگو کے استعماریت کے ہاتھوں سالوں سے استحصال کا شکار ہوتے ہوئے عوام تھے جو باہر نکل آئے تھے۔

کنشاسا میں اس رات کنشاسا کی تاریخ کے سب سے بڑے فسادات ہوئے تھے جن میں کوئی سیاہ فام نہیں صرف سفید فام مارے گئے تھے۔ ورلڈ بینک کے آفسوں پر حملہ کر کے انہیں لوٹنے کے بعد آگ لگا دی گئی تھی۔ اور یہ سلسلہ صرف وہیں تک نہیں رکا تھا۔ ورلڈ بینک کے حکام کی رہائش گاہوں پر بھی حملے لوٹ مار اور قتل و غارت ہوئی تھی اور ان میں سالار سکندر کا گھر بھی تھا۔ وہ سالار سکندر کا گھر نہیں تھا جسے آگ لگائی گئی تھی' وہ ورلڈ بینک کے سربراہ کا گھر تھا جسے ہجوم نے اس رات تباہ کیا تھا۔ کانگو میں اس رات ڈیڑھ سو کے قریب امریکیوں اور یورپ کے لوگوں کو مار دیا گیا تھا اور ان میں اکثریت ورلڈ بینک اور دوسری عالمی تنظیموں میں کام کرنے والے افراد اور ان کے خاندان کے افراد کی تھی۔

ورلڈ بینک کے چالیس افراد ان فسادات میں مرے تھے اور یہ چالیس لوگ نچلے عہدوں پر کام کرنے والے لوگ نہیں تھے' وہ ورلڈ بینک کی سینئر اور جونیئر مینجمنٹ تھی جو اپنی اپنی فیلڈ کے ماہر ترین لوگ تھے جو کئی سالوں سے اس بینک اور اس کے مختلف آپریشنز اور پروجیکٹس سے منسلک تھے اور جو کانگو میں اس ادارے کے ستونوں کے طور پر کانگو کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔

ورلڈ بینک کی تاریخ میں پہلی بار ورلڈ بینک کے خلاف فسادات اور اس کے عملے کا قتل عام کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے دنیا میں ورلڈ بینک کے افسران کو صرف انڈے ٹماٹر مار کر یا ان کے چہروں اور کپڑوں پر سیاہ رنگ پھینک کر احتجاج کیا جاتا رہا تھا اور وہ احتجاج کسی اثر اور تبدیلی کے بغیر ختم ہو جاتا تھا۔ وہ مہذب دنیا میں رہنے والوں کا احتجاج تھا۔ یہ اس غیر مہذب دنیا میں رہنے والوں کا احتجاج تھا جنہیں مہذب دنیا انسانوں سے کمتر سمجھ کر رکھتی تھی۔

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ' ورلڈ بینک اور سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز میں آپریشن روم کی دیواروں پر لگی اسکرینوں پر تینوں اداروں کے سینئر حکام صرف دم سادھے بے بسی کے ساتھ کانگو کے مختلف علاقوں میں ہونے والے ان فسادات کے مناظر دیکھ رہے تھے۔ ان کو بچانے کی کوششیں ہو رہی تھیں لیکن فوری طور پر کوئی بھی کانگو کے ان فسادات میں عملی طور پر کچھ نہیں کر سکتا تھا' وہ زیادہ نقصان وہ ہو جو ورلڈ بینک اور دوسرے اداروں کا جو جانی اور مالی نقصان ہوا تھا' وہ پورا کر لیا جاتا لیکن جو ساکھ اور نام ڈوبا تھا' اسے دوبارہ بحال کرنے کے لیے کوئی معجزہ چاہیے تھا۔

ان فسادات کے آغاز سے بالکل پہلے اینڈرسن کوپر نے پیٹرس ایباکا کے ساتھ ہونے والے اس آف کیمرہ سیشن کو اپنے پروگرام میں چلا دیا تھا۔ تب تک اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس رات کانگو میں کیا ہونے والا تھا اگر اسے یا سی آئی اے کو اس کا رتی بھر بھی اندازہ ہوتا تو وہ ٹیپ شدہ چیزیں کبھی نہیں چلتیں۔ اس آف کیمرہ سیشن میں پیٹرس ایباکا نے امریکہ اور ورلڈ بینک پر شدید تنقید کرتے ہوئے انہیں گدھ اور وڈ کو قرار دیا تھا۔ جو کانگو کو نوچ نوچ کر کھا رہے تھے اور کوئی ان کا ہاتھ روک نہیں پا رہا تھا۔

پیٹرس ایباکا کا وہ آخری انٹرویو افریقہ میں لوگوں نے اسٹیڈیم اور چوکوں پر روتے ہوئے بڑی اسکرینوں پر سنا تھا اور اس کی گفتگو میں ورلڈ بینک کے صرف ایک عہدے دار کی تعریف تھی جو ورلڈ بینک کو اس پروجیکٹ کی انکوائری پر مجبور کر رہا تھا اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ اس پروجیکٹ اور ورلڈ بینک کو چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ پیٹرس ایباکا نے اس انٹرویو میں پہلی بار اپنی زندگی کو لاحق خطرات کی بھی بات کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ طاقتیں

جو اسے مار ڈالنا چاہتی ہیں وہ سالار سکندر کو بھی مار ڈالیں گی۔

سالار سکندر کا نام ہنٹرز ایباکا کے بعد ایک رات میں افریقہ میں زبان زد عام ہو گیا تھا۔ افریقہ میں ویسی شہرت اور ویسا تعارف پہلی بار کسی غیر ملکی کو نصیب ہوا تھا اور وہ "غیر ملکی" اس وقت واشنگٹن میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں ٹی وی پر یہ سب دیکھ رہا تھا پھر بار بار ہوٹل سے باہر جا کر پاکستان فون کر کے اپنی فیملی کے بارے میں پتا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کاش اسے وہ نام وری نہ ملتی اس نے سوچا تھا۔

اینڈرسن کوپر کا انٹرویو نشر ہونے کے دو گھنٹے کے اندر کانگو میں فسادات شروع ہو چکے تھے اور سالار سکندر نے ان فسادات کے مناظر بھی ٹی وی پر لائیو دیکھے تھے۔ ورلڈ بینک کے دفاتر میں لوٹ مار اور آگ لگانے کے منظر بھی اس فوٹیج کا حصہ تھے اور افسران کے رہائشی علاقوں میں گھروں پر حملے کے مناظر بھی۔ نیوز چینلز بتا رہے تھے کہ کنٹری ہیڈ سمیت سارے گھروں کو لوٹا گیا تھا اور ان میں سے گھروں میں اموات بھی ہوئی تھیں۔ کچھ میں افسران کی بیویوں پر حملے ہوئے تھے۔ کچھ میں ان کے بچے مارے گئے تھے۔

ٹی وی پر وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے وہ شدید پریشان تھا۔ وہ سب ہو جانے کے باوجود بھی جو ورلڈ بینک کے افسران نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ اسے اگر کچھ سے یہ پتا نہ چل چکا ہوتا کہ امامہ اور اس کے بچے گھر نہیں تھے تو وہ کبھی بھی اس بیڈ روم میں بیٹھا یہ مناظر نہیں دیکھ پاتا۔ لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ کبھی کبھی دشمن کا سب سے بڑا وار آپ کی بقا کا باعث بن جاتا ہے۔ امامہ اور اس کے بچوں کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ سی آئی اے نے انہیں صرف اس لیے اس گھر سے غائب رکھنے کی کوشش کی تھی تاکہ امامہ سے سالار کی فیملی یا اس کا بھی کوئی شخص رابطہ نہ کر سکے اور حمین کی — قبل از وقت پیدائش جیسے امامہ اور اس کے بچوں کی زندگی بچنے کا باعث بن گئی تھی پر اس وقت سالار کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔

بے شک اللہ سب سے بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔ اور بے شک ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔ ہر مشکل کے بعد آسانی تھی۔



"میرے بچے کہاں ہیں؟" اس نے اٹینڈنٹ کی شکل دیکھتے ہی ہوش و حواس سنبھالنے کے بعد سب سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

"وہ کچھ دیر میں آپ کے پاس آجائیں گے۔ آپ کو فوری طور پر اس ہاسپٹل سے کہیں منتقل کرنا ہے۔" اٹینڈنٹ نے بے حد مضطرب انداز میں کہا تھا۔ امامہ نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تھی اور بے اختیار کراہ کر رہ گئی تھی۔ زخم والی جگہ اب سن نہیں رہی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے کوئی خنجر کسی نے یکدم اس کے پیٹ کے نچلے حصے میں گھونپا تھا۔ اٹینڈنٹ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے واپس لٹانے میں مدد کی اور اسے لٹانے کے بعد سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی اس ٹرے میں سے ایک انجکشن اٹھا کر سرنج میں بھرنا شروع کیا جو وہ لائی تھی۔

"مجھے کوئی انجکشن نہیں لگوانا۔ مجھے اپنے بچوں کو دیکھنا ہے۔" امامہ نے بے حد ترشی سے اس سے کہا تھا۔

"یہ آپ کی تکلیف کم کر دے گا۔ آپ کی حالت ابھی ٹھیک نہیں ہے۔" اٹینڈنٹ نے کہتے ہوئے گلوکوز کی بوتل میں سرنج کی سوئی گھونپ دی۔

امامہ نے اپنے ہاتھ کی پشت پر ٹیپ کے ساتھ چپکائی ہوئی سرنج نکال دی۔

"مجھے فی الحال کسی میڈیسن کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اپنے بچوں سے ملنا ہے اور اپنے شوہر سے بات کرنی ہے۔"

وہ اس بار زخم کی تکلیف کو نظر انداز کرتے ہوئے اٹھ بیٹھی تھی اور اس نے اٹینڈنٹ کا ہاتھ بھی جھٹک دیا تھا۔ وہ اٹینڈنٹ کچھ دیر چپ کھڑی رہی تھی پھر وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔

اس کی واپسی آدھ گھنٹے کے بعد ہیڈی، جبریل اور عنایہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلتے ہی ماں پر پہلی نظر پڑتے ہی جبریل اور عنایہ شور مچاتے ہوئے اس کی طرف آئے تھے اور اس کے بستر پر چڑھ کر اس سے لپٹ گئے تھے۔ وہ ڈیڑھ دن کے بعد ماں کو دیکھ رہے تھے۔ ہیڈی بھی بے اختیار لپک کر اس کے پاس آئی تھی۔ ڈیڑھ دن سے امامہ کو نہ دیکھنے پر اور ڈاکٹرز کی بار بار کی لیت و لعل پر امامہ کے حوالے سے اس کے ذہن میں عجیب و غریب وہم آ رہے تھے اور اب امامہ کو خیریت دیکھ کر وہ بھی جذباتی ہوئے بنا نہیں رہ سکی تھی۔

”تم نے سالار کو اطلاع دی؟“ امامہ نے ہیڈی کو دیکھتے ہی اس سے پوچھا تھا۔

”میں کل سے ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن ان کا نمبر نہیں مل رہا۔ میں نے ان کے آفس اسٹاف سے بھی رابطہ کیا ہے لیکن وہ کہہ رہے ہیں کہ سالار صاحب کے ساتھ ان کا بھی رابطہ نہیں ہو رہا۔“

امامہ کے دماغ کو ایک جھٹکا لگا تھا۔ وہ ہیڈی کا پہلا جملہ تھا جس نے اسے چونکایا تھا۔

”کل؟“ وہ بڑبڑائی ”آج کیا تاریخ ہے؟“

اس نے ہیڈی سے پوچھا اور ہیڈی نے جو تاریخ بتائی وہ اس دن کی نہیں تھی جس دن وہ ہاسپٹل میں آئی تھی۔ وہ پچھلی دوپہر کو ہاسپٹل آئی تھی اور اس وقت اگلی رات ہو چکی تھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا وہ اتنے لمبے عرصے تک خواب آور ادویات کے زیر اثر رکھی گئی تھی۔ اور کل سے سالار نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ امریکہ تو کل ہی پہنچ چکا تھا پھر اس سے رابطہ کیوں نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ہیڈی سے اپنا بیگ لے کر اس میں سے فون نکال کر اس پر کال کی کوشش کی۔

اٹینڈنٹ نے اسے بتایا کہ ہاسپٹل میں اس حصے میں سگنلز نہیں آتے تھے وہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اپنے سیل فون پر اس نے سب chat apps اور ٹیکسٹ میسجز چیک کر لیے تھے کل سے آج تک اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس وقت سے لے کر جب وہ ہاسپٹل آئی تھی اب تک۔

بے حد تشویش لاحق ہونے کے باوجود امامہ نے یہی سمجھا تھا کہ ہاسپٹل میں سگنلز کے ایشوز کی وجہ سے وہ کوئی کال یا ٹیکسٹ میسج نہیں کر سکی۔ اس سے پہلے کہ وہ ہیڈی سے کچھ اور پوچھتی۔ ہیڈی نے اسے کانگو میں ہونے والے فسادات کے بارے میں بتایا تھا اور ساتھ یہ بھی کہ کوسمے میں ان کے گھر پر بھی حملہ کیا گیا تھا۔ امامہ سکتے میں رہ گئی تھی ہیڈی کے پاس تفصیلات نہیں تھیں کیونکہ وہ ایک بار ہاسپٹل سے نکلنے کے بعد دوبارہ بچوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں گئی تھی۔ اس کے پاس جو بھی خبریں تھیں وہ امامہ کے خاندان کے افراد کی طرف سے فون پر ملی تھیں یا پھر ہاسپٹل میں لگے ٹی وی سیٹ پر نشر ہونے والی خبروں سے۔

یہ وہ لمحہ تھا جب امامہ کو پہلی بار سالار کے حوالے سے بے قراری ہوئی تھی۔ پیٹرس ایباکا مارا گیا تھا تو سالار کہاں تھا۔۔۔؟ وہ بھی تو واشنگٹن میں تھا۔ ہیڈی نے اسے نیوز چینلز پر چلنے والی ساری خبریں بتائی تھیں۔ پیٹرس ایباکا کیسے مارا گیا اور کیسے اس کی موت سامنے آئی۔ اس سے آخری بار ملنے کے لیے جانے والا شخص سالار سکندر تھا اور سالار سکندر اس وقت سے غائب تھا۔

امامہ کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ اس کا خیال تھا اسے دنیا میں سب سے زیادہ محبت جبریل سے تھی پھر عنایہ سے پھر اپنی اس اولاد سے۔ جس کو ایک دن پہلے اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ لیکن اب جب سالار یکدم اس کی زندگی سے کچھ دیر کے لیے عجیب طرح سے غائب ہوا تھا تو اس کے اوسان خطا ہونے لگے تھے۔

وہ جبریل اور عنایہ کو اسی طرح بستر پر چھوڑ کر درد سے بے حال ہوتے ہوئے بھی لڑکھڑاتے قدموں سے فون لے

کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ اسے ہاسپٹل میں اس جگہ جانا تھا جہاں سے وہ کال کر سکتی اور اس سے بات کر سکتی۔ اسے اس گھر کے تباہ برباد ہونے کا بھی خیال نہیں آیا تھا جس میں ہونے والی لوٹ مار کے بارے میں پیڈی نے اسے کچھ دیر پہلے بتایا تھا۔ گھر' بچے سب کچھ یک دم اس ایک شخص کے سامنے بے معنی ہو گیا تھا جو اس کا سائبان تھا جو زندگی کی دھوپ میں اس کے لیے تب چھاؤں بنا تھا جب اس کا وجود حدت سے جھلس رہا تھا۔ پاؤں آبلہ پا ہو گئے تھے۔

اٹینڈنٹ اور پیڈی نے اسے روکنے اور پیچھے آنے کی کوشش کی وہ نہیں رکی۔ اس نے پیڈی کو اپنے پیچھے نہیں آنے دیا۔ اسے بچوں کے پاس رکنے کے لیے کہا۔ وہ ننگے پاؤں پھوڑے کی طرح دکھتے جسم کے ساتھ لڑکھڑاتے قدموں سے کوریڈور میں نکل آئی تھی۔

سالار وہاں ہوتا تو اس حالت میں اسے بستر سے ہلنے بھی نہ دیتا لیکن سارا مسئلہ یہی تو تھا کہ سالار وہاں نہیں تھا اور وہ اسے پانے کے لیے بے حال ہو رہی تھی۔ ہاسپٹل میں کوئی ایسی جگہ ڈھونڈتی جہاں سگنل آجاتے جہاں سے وہ سالار سے بات کر پاتی۔ اس کی آواز سن سکتی۔

اس کا جسم ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔ یہ موسم نہیں تھا جو اسے لرزا رہا تھا۔ خوف تھا جو رگوں میں خون جما رہا تھا۔ صرف ہاتھ نہیں تھے جو کپکپا رہے تھے۔ اس کا پورا جسم پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

"آپ کے شوہر بالکل ٹھیک ہیں۔ میں تھوڑی دیر میں ان سے آپ کی بات کرواتی ہوں۔"

امامہ لڑکھڑاتے قدموں سے چلتے چلتے ساکت ہوئی اور اٹینڈنٹ کی آواز پر پلٹی تھی۔ اور پھر وہاں کھڑے کھڑے جیسے موم کی طرح پگھلنے لگی تھی۔ زرد کانپتی' ٹھٹھرتی بے آواز روئی۔ وہاں بھی اپنے بچوں پر جان دے دینے والی۔ اور وہ رب تھا اپنے بندوں کو ایسے بے یارو مددگار چھوڑ دیتا جس نے اس کو پکارا تھا۔ مدد کے لیے وہی آیا تھا۔

رحم اٹینڈنٹ کو اس کی حالت پر نہیں آیا تھا۔ اس برتر ذات کو اپنے بندے پر آیا تھا۔ اور وہ اپنے بندوں پر بلاشبہ بے حد شفقت کرنے والا ہے۔



سی آئی اے اور ورلڈ بینک کے ساتھ ساتھ امریکن گورنمنٹ کو ایک ہی وقت میں سالار کی ضرورت پڑی تھی۔ کانگو میں اگر کوئی اس وقت ورلڈ بینک کی عزت کو بحال کرنے کی پوزیشن میں تھا تو وہ سالار سکندر ہی تھا۔ اور تیم ایک مہرہ بن گیا تھا۔ افریقہ میں جو آگ پیٹرس ایباکا کی موت سے لگی تھی وہ سالار سکندر کی زندگی ہی بجھا سکتی تھی۔ فیصلہ تاخیر سے ہوا تھا لیکن فیصلہ ہو گیا تھا۔

اس آپریشن کے تباہ کن نتائج نہ صرف سی آئی اے میں بہت سے لوگوں کی کرسی لے جانے والے تھے بلکہ ورلڈ بینک میں بھی بہت سے سر کٹنے والے تھے۔ تاریخ میں اور لکھا جانے والا تھا۔

سالار سکندر اس سب سے بے خبر ہوٹل کے اس کمرے میں اب بھی نیوز چینلز دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے اپنے باپ سے بات کر کے آیا تھا جنہوں نے اسے بتایا تھا کہ کانگو کے حالات کی وجہ سے فی الحال کانگو کی فلائٹس اور ویزا دونوں دستیاب نہیں تھے۔ سالار سکندر کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔ اس کا وہ غم گسار میگرین ایک بار پھر اس کا غم غلط کرنے آگیا تھا۔ وہ ہوٹل واپس آیا تھا۔ عجیب کیفیت میں ٹی وی کے سامنے کھڑا وہ سالار سکندر کے حوالے سے چلنے والی خبروں' کانگو کے دل دہلا دینے والے مناظر کے ساتھ یوں دیکھتا رہا تھا جیسے وہ کوئی اور تھا نہ اس سالار سکندر سے اس کا کوئی تعلق تھا نہ کانگو سے۔ وہاں امامہ اور اپنی اولاد چھوڑ آنے والا بھی کوئی اور تھا۔ انہیں بھول جانے والا بھی کوئی اور تھا۔

"What 'next to exstasy"

"تو کیا سوال تھا۔ کیا یاد دلایا تھا۔ کیا یاد آیا تھا۔"

" Pain " (درد کا احساس)

" And What is naxt to Pain "

(اور درد کے بعد)

اتنے سالوں بعد ایک بار پھر وہ سوال و جواب اس کے ذہن میں چلنے لگے تھے۔ آخر کتنے موقعے آئے تھے اس کی زندگی میں اسے سمجھانے کہ اس کے بعد کچھ نہیں ہے۔ عدم وجود۔ خالی پن۔

اور وہ اسی عدم وجود کی کیفیت میں آکھڑا ہوا تھا ایک بار پھر۔ زمین اور آسمان کے درمیان کسی ایسی جگہ معلق جہاں وہ نہ اوپر جا پا رہا تھا، نہ نیچے آپا رہا تھا۔

" And What is Naxt to NothingNess "

(اور اس عدم وجود، خالی پن کے بعد؟)

اس کا اپنا سوال ایک بار پھر اس کا منہ چڑانے آیا تھا۔

"Hell" (جہنم)

جہنم کوئی اور جگہ تھی کیا۔ اس نے جیسے بے اختیار کراہتے ہوئے سوچا۔

" And What is Next To Hell "

ہاں وہ اس کے بعد والی جگہ جانا چاہتا تھا۔ ان سب تکلیفوں، ان سب اذیتوں، ان سب آزمائشوں سے گزر کر۔ وہاں آگے اور آگے۔ جہاں جنت تھی۔ یا شاید اس کی حد لگی تھی۔

دو دن کے بعد اس کا سیل فون جیسے نیند سے نہیں موت سے جاگا تھا۔ وہ میوزک اور وہ روشنی۔ اسے لگا وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ میوزک اس نے امامہ کی کالر آئی ڈی کے ساتھ محفوظ کیا ہوا تھا۔

If Tomorrow Never Comes

رونان کیٹنگ کے مشہور گانے کی کال ٹیون۔

سیل فون پر اس کا مسکراتا چہرہ اور اس کا نام۔ سالار کو لگا تھا۔ وہ واقعی جنت میں کہیں تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کال ریسیو کی۔ لیکن ہیلو نہیں کہہ سکا۔ وہ امامہ نے کہا تھا۔ بے قرار آواز میں۔ وہ بول ہی نہیں سکا۔ سانس لے رہا تھا تو بڑی بات تھی۔ اپنے قدموں پر کھڑا تھا تو کمال تھا۔

وہ دوسری طرف بے قراری سے اس کا نام پکار رہی تھی۔ بار بار۔ سالار کا پورا وجود کانپنے لگا تھا۔ وہ آواز اسے ہرا کر رہی تھی۔ کسی بنجر سوکھے ٹنڈ منڈ پیڑ پر بارش کے بعد بہار میں پھوٹنے والی سبز کونپلوں کی طرح۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا لیکن اس کے سامنے رو نہیں سکتا تھا۔ وہ مرد تھا۔ بولنا مشکل تھا۔ پر بولنا ضروری تھا۔

"امامہ!" اس نے اپنے حلق میں پھنسے ہوئے نام کو آزاد کیا تھا۔

دوسری طرف وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ وہ عورت تھی۔ یہ کام بڑی آسانی سے کر سکتی تھی کیونکہ اسے بہادری اور مردانگی کے جھنڈے نہیں گاڑنے ہوتے۔ وہ بے آواز رو رہا تھا۔ وہ دوزخ سے گزر کر آئے تھے اور کسی نے دوسرے سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ دوسرا کہاں تھا۔ کیوں رو رہا تھا۔

بے آواز روتے ہوئے سالار نے اسی طرح کھڑے کھڑے اس کمرے کے درمیان میں امامہ کی ہچکیاں اور سسکیاں سنتے اپنے جوتے اتارے تھے پھر وہ گھٹنوں کے بل سجدے میں جا گرا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا اللہ کہاں

تھا۔ اور کیسے سنتا تھا۔ اس کی شہ رگ کے پاس۔ اس سے بھی قریب۔

کئی سال پہلے وہ ریڈ لائٹ ایریا میں امامہ کے نہ ہونے پر اسی طرح ایک طوائف کے کوٹھے پر سجدے میں جا گرا تھا۔ آج وہ امامہ کے ہونے پر سجدے میں گرا تھا۔

بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ مشرق۔ مغرب۔ ہر چیز اس کی متاع ہے۔

وہ کن کہتا ہے اور چیزیں ہو جاتی ہیں۔

گمان سے آگے۔ بیان سے باہر۔

بے شک اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔

بے شک اللہ ہی سب سے طاقت ور ہے۔

☆☆☆

"ممی از کوٹ۔"

جبریل نے حمین پر ایک نظر ڈالنے کے بعد تین لفظوں میں بڑے محتاط اور "مفصل" انداز میں اپنے خاندان میں اس نئے اضافے پر تبصرہ کیا تھا۔ جو فی الحال اسی قسم کے انکیوبیٹر میں تھا جس میں انہوں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ اس کے برعکس عنایہ بڑے اشتیاق سے والہانہ انداز میں اس "چھوٹے بھائی" کو دیکھ رہی تھی جس کی آمد کے بارے میں وہ مہینوں سے سن رہی تھی اور جسے ایک پری پرستان سے ایک رات ان کے گھر چھوڑ کر جانے والی تھی۔

امامہ کی باتیں سن سن کر اسے چھوٹے بھائی سے زیادہ اس پری کو دیکھنے میں دلچسپی ہو گئی تھی جو ان کے گھر روز دیکھنے آتی تھی کہ انہیں بھائی کی ضرورت تھی یا نہیں۔ وہ امامہ سے بھائی سے زیادہ پری کے بارے میں اشتیاق سے کرید کرید کر پوچھتی تھی۔ جبریل البتہ پاس بیٹھا اپنی اسٹوری بکس کے صفحے الٹتے پلٹتے ان دونوں کی گفتگو سنتا رہتا تھا۔ اس نے کبھی نہ بھائی کے بارے میں سوال کیا تھا نہ پری کے بارے میں۔ کیونکہ اسے پتا تھا "ممی" جھوٹ بول رہی تھیں۔ کیونکہ نہ پریاں ہوتی ہیں اور نہ بھائی کو پری نے لانا تھا۔ بھائی کو اسپتال سے آنا تھا۔ اور اسپتال خود جانا پڑے گا۔ اور وہ بھی کار سے سڑک کے ذریعہ اس اسپتال میں جہاں وہ ممی کے ساتھ جاتے تھے۔ لیکن اس نے اپنی یہ معلومات صرف عنایہ کے ساتھ تنہائی میں شیئر کی تھیں امامہ کے سامنے نہیں۔

"کیا ممی جھوٹ بولتی ہیں؟" عنایہ نے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ جھوٹ نہیں بولتیں لیکن وہ ہمیں بہلانے کے لیے کہتی ہیں۔"

اس نے بڑے مدبرانہ انداز میں بہن کو سمجھایا تھا جس نے بھائی کی فرفر زبان اور سوال سن سن کر بہت جلدی بولنا شروع کر دیا تھا۔

وہ سب اس وقت امریکن ایمبیسی کے اندر موجود ایک چھوٹے سے میڈیکل یونٹ میں تھے۔ وہ طوفان جو ان کی زندگی اڑانے آیا تھا۔ کچھ بھی تہس نہس کیے بغیر قریب سے گزر کر چلا گیا تھا۔

امامہ اپنے تینوں بچوں کے ساتھ سالار سے بات چیت کے بعد اب پرسکون تھی۔ اس نے وقفے وقفے سے پاکستان میں سب سے بات کی تھی۔ سب کو اپنی خیریت کی اطلاع دی تھی اور سب سے حمین کی پیدائش پر مبارک باد وصول کی تھی۔ بچے کی جنس کا پتا چلنے کے بعد وہ کوئی مہینے پہلے ہی اس کا نام طے کر چکے تھے۔ حمین کی حالت بہتر تھی۔ وہ کمزور تھا لیکن صحت مند اور ایکٹو تھا۔

اگر اس کی پیدائش قبل از وقت نہ ہوئی ہوتی اور امامہ کی سرجری نہ ہوئی ہوتی تو سالار فوری طور پر ان کو وہاں

آسان تھا۔ سی این این جیسے بڑے ادارے کو بھی امریکن مفادات کو ہر چیز پر بالاتر رکھنا کی سوچ کے تابع رکھنا مشکل نہیں تھا مگر مشکل تھا تو ان نیوز جرنلسٹس کی عالمی مقبولیت اور پہنچ پر کنٹرول رکھنا جو سی این این پر جب بھی کسی ایشو کو کتنا بھی امریکی مفادات کو بالاتر رکھنے کی پالیسی کے باوجود اٹھاتے وہ دنیا میں کسی نہ کسی نئے تنازعے کو جنم دے دیتے۔

اور یہاں بھی ایباکا کو مانیٹر کرنے والے لوگوں کو اچانک درپیش آنے والا چیلنج یہی تھا۔ اگر وہ پروگرام کوور ایباکا سے پہلے پیش کرنے کا ارادہ کر چکا ہوتا تو سی آئی اے کے لیے کوور کو اس آفیشنسی صحافت سے روکنے کا واحد حل یہ تھا کہ ایباکا کو اس تک کسی بھی قیمت پر نہ پہنچنے دیا جاتا لیکن یہاں کوور سے ایباکا اسے اس اسٹیج پر رابطہ کر رہا تھا جب وہ اور اس کی ٹیم پہلے ہی اس ایشو پر بہت زیادہ کام کرنے کے بعد کانگو روانگی کی تیاریوں میں تھی اور اب اس صورت حال میں کیا جاتا۔ ایک یہ تھا وہ چیلنج جس نے فوری طور پر ایباکا اور کوور کی ملاقات کے حوالے سے سی آئی اے کو پریشان کیا تھا اور اس پریشانی میں اضافہ تب ہوا تھا جب ایباکا اس کال کے ملنے کے فوراً بعد ہی واشنگٹن سے نیویارک کے لیے نکلا تھا اور جب تک ان کا اگلا لائحہ عمل فائنل ہو سکا ایباکا ٹائم وارنر سینٹر پہنچ چکا تھا۔

اینڈرسن کوور کے ساتھ دو گھنٹے کی ایک گرما گرم نشست کے بعد وہ جب سی این این اسٹوڈیوز سے باہر نکلا تھا تو ایباکا کا جوش پہلے سے بھی زیادہ بڑھ چکا تھا۔

اسے پہلی بار سالار سے رابطے کا خیال آیا تھا کیونکہ اینڈرسن کوور کے ساتھ سوال و جواب کے اس آف کیمرہ سیشن میں سالار سکندر کا ذکر کئی بار آیا تھا۔ اس نے کئی بار اس کے لیے تعریفی جملے ادا کیے تھے۔ جیسے سالار سکندر نے اس پروجیکٹ کے حوالے سے اس کے تحفظات کو سنجیدگی سے سنا۔ کیسے وہ خود اس کے ساتھ ان جنگلات میں جا جا کر مقامی لوگوں کے ساتھ حقائق اکٹھا کرتا رہا۔ اور کیسے اس نے ورلڈ بینک کو جمع کیے جانے والے حقائق اور تحفظات پر مشتمل رپورٹ بھیجی تھی جو اس پروجیکٹ کے اختیارات کو ہی نہیں اس کی بنیاد کو بھی قابل اعتراض گردانتی تھی سالار سکندر کے لیے اپنے ستائشی جذبات کوور تک پہنچاتے ہوئے ایباکا کو یہ اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ اس نے سالار سکندر کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

کوور اس پروجیکٹ کے حوالے سے جن مزید لوگوں سے بات چیت کرنے والا تھا ان میں سالار سکندر کا نام سرفہرست تھا۔ سی آئی اے کو اس کا اندازہ تھا۔ یہ وہ دن تھا جب سالار سکندر سفر کرتے ہوئے رات کو واشنگٹن پہنچ رہا تھا اور اسے اندازہ نہیں تھا کہ بدقسمتی اس سے پہلے اس کے انتظار میں وہاں پہنچی تھی۔

ایباکا نے اس عمارت سے نکلنے کے بعد سینٹرل پارک کی طرف جاتے ہوئے بے حد خوشی کے عالم میں سالار کو ٹیکسٹ کیا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اب سی این این تک رسائی حاصل کر چکا تھا اور کوور ہی کے حوالے سے اسے واشنگٹن کے سی این این اسٹوڈیوز میں اسی کی ٹیم کے چند اور لوگوں سے بھی ملنے کا موقع مل گیا تھا۔ اور ایباکا ساتویں آسمان پر تھا۔

اسے اب کوور کے ساتھ دو ہفتے کے بعد کانگو واپس جانا تھا جہاں وہ اینڈرسن کوور کو اس پروجیکٹ کے حوالے سے کی جانے والی تحقیقات میں مدد دیتا اور وہ خواب جو کئی سالوں سے صرف خواب تھا پیٹرس ایباکا اسے بالآخر حقیقت بنتا دیکھنے لگا تھا۔ اس ٹیکسٹ میں ایباکا نے اسے بتایا تھا کہ وہ بے حد خوش تھا۔ بے حد۔ پیٹرس ایباکا چھوٹے موٹے نیوز چینلز اور اخبارات میں اس مسئلے کو لے کر پھرتا اور روتا رہا تھا اور خوار ہوتا رہا تھا۔ اینڈرسن کوور سی این این پر پرائم ٹائم میں امریکہ کے مقبول ترین پروگرامز میں سے ایک 360 میں جب اسی مسئلے پر بات کرتا تو صرف عالمی افق پر ہی تہلکہ نہیں مچتا بلکہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور ورلڈ بینک کے اندر بھگدڑ

سے واشنگٹن بلوانے کی کوشش کرتا۔ لیکن فوری طور پر امامہ اور حمین ایرٹریول نہیں کر سکتے تھے اس لیے سالار کانگو آنے والا تھا اور وہ اب اس کے انتظار میں امریکن ایمبیسی میں تھے جہاں بہت سے اور بھی لوگ پناہ لیے ہوئے تھے جب تک انہیں کانگو سے نکالنے کے انتظامات نہ ہو جاتے یا حالات پر قابو نہ پا لیا جاتا۔ امامہ اور اس کے بچوں کو ہائی پروفائل گیسٹ کا اسٹیٹس ملا ہوا تھا۔ امامہ کو اگر یہ پتا ہوتا کہ اس ہائی پروفائل اسٹیٹس سے پہلے اس کے شوہر پر امریکہ میں کیا گزری تھی تو وہ مر کر بھی امریکن ایمبیسی کی شکل نہ دیکھتی۔

سالار نے اسے ہر بات سے بے خبر رکھا تھا۔ فون پر ان کی بہت لمبی بات نہیں ہو سکی تھی۔ سالار نے اسے آرام کرنے کے لیے کہا تھا۔ اسے خود فوری طور پر ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی تھی۔ اس نے امامہ سے کہا تھا۔ کوئی سگنلز اور سیٹلائٹ کا مسئلہ تھا جس کی وجہ سے اس کا رابطہ اس سے نہیں ہو پا رہا تھا اور اسی وجہ سے وہ اس قدر پریشان تھا۔

امامہ نے پیٹرس ایباکا کے حوالے سے بات کی تو اس نے اسے تسلی دی کہ سب کچھ ٹھیک ہے' وہ پریشان نہ ہو' عمر اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہے' وہ اسی سلسلے میں پولیس سے بھی رابطے میں ہے۔

امامہ مطمئن ہو گئی تھی۔ اگر سالار کی پریشانی کا باعث صرف اس سے رابطہ نہ ہو پانا تھا تو وہ مسئلہ تو وہ سمجھ سکتی تھی۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ سو نہیں سکی تھی۔ تکلیف میں سکون آور دوا لینے کے باوجود وہ سو نہیں سکتی تھی اور اب وہ دوا میں لے کر سونا نہیں چاہتی تھی۔ حمین اب بھی وہیں اس کے پاس تھی اور وہ کمرے میں چلتے ہوئے ٹی وی پر کانگو کے حالات کے حوالے سے چلنے والی خبریں دیکھ رہی تھی۔ مختلف ملکی اور غیر ملکی چینلز کو بدل بدل کر۔ جہاں پیٹرس ایباکا کے حوالے سے ذکر آ رہا تھا وہاں سالار سکندر کا ذکر بھی ہو رہا تھا اس انٹرویو کی جھلکیاں بھی بار بار چل رہی تھیں جن میں پیٹرس نے بار بار سالار کے بارے میں اچھے الفاظ میں بتایا اور اس کی اور اپنی زندگی کے حوالے سے لاحق خطرات کا ذکر بھی کیا تھا۔

سالار سے بات کرنے کے بعد امامہ کی جو پریشانی ختم ہوئی تھی' وہ پریشانی ایک بار پھر سر اٹھانے لگی تھی۔ سالار نے اسے ان سب معاملات سے بالکل بے خبر رکھا ہوا تھا۔ وہ پچھلے کئی مہینوں سے کانگو کے جنگلات میں پیٹرس ایباکا کے ساتھ بہت زیادہ سفر کر رہا تھا۔ وہ صرف یہ جانتی اور سمجھتی تھی کہ یہ آفیشل کام ہے لیکن ورلڈ بینک کے اس پروجیکٹ کے حوالے سے سالار سکندر کی اختلافی رپورٹ کے بارے میں اسے پہلی بار پتا چلا تھا۔ وہ بھی پیٹرس ایباکا کے اس انٹرویو کے ذریعے۔ معاملات اتنے صاف اور سیدھے نہیں تھے جتنے واشنگٹن میں بیٹھا سالار اسے بتا رہا تھا۔

وہ مصیبت میں تھا لیکن اسے کیوں بے خبر رکھ رہا تھا۔ امامہ کو اس کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ وہاں کنشاسا میں بیٹھ کر اس سے ان سب چیزوں کے بارے میں فون پر سوالات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھ کر اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔

"ممی!" جبریل نے اسے مخاطب کیا' وہ سوچوں سے چونکی۔

"Who wants to kill Papa "

"پاپا کو کون مارنا چاہتا ہے؟"

وہ اس کے سوال پر منجمد ہو گئی تھی۔

چار سالہ وہ بچہ بے حد تشویش سے اس سے پوچھ رہا تھا۔ امامہ کو ٹی وی دیکھتے ہوئے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ بیٹھا ٹی وی پر یہ سب کچھ سن اور دیکھ رہا تھا اور اپنے باپ کے حوالے سے ہونے والی ایسی کسی گفتگو کو وہ سمجھ سکتا تھا۔ وہ بلا کا ذہین تھا اپنے باپ کی طرح۔ امامہ اور سالار اس کے سامنے گفتگو میں بہت محتاط

رہتے تھے۔

امامہ نے ٹی وی آف کر دیا۔ وہ اب اسے ٹالنا چاہتی تھی۔

No one wants to kill papa

(کوئی آپ کے پاپا کو مارنا نہیں چاہتا؟)

اس نے جبریل کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ وہ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔

"اللہ آپ کے پاپا کی حفاظت کر رہا ہے اور ہم سب کی۔" وہ اسے تھپتھپاتے ہوئے بولی۔

"اللہ نے پھر میرے ابا کی حفاظت کیوں نہیں کی؟"

امامہ لاجواب ہو گئی۔ بڑوں کے سوالوں کے جواب آسان ہوتے ہیں بچوں کے نہیں۔

جبریل کے سوال اسے ہمیشہ ایسے ہی لاجواب کرتے تھے۔ وہ بحث نہیں کرتا تھا بات پوچھتا تھا۔ جواب سنتا تھا۔ سوچتا تھا۔ اور خاموش ہو جاتا تھا۔ مگر امامہ یہ نہیں سمجھ پاتی تھی' اس کے جواب نے اسے قائل کیا تھا یا نہیں۔ وہ بچہ گہرا تھا۔ اس کا احساس اسے تھا۔ وہ بہت حساس تھا۔ وہ اس سے بھی لاعلم نہیں تھی۔ لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے حوالے سے بہت ساری باتیں سوچتا تھا جو وہ ان سے پوچھتا بھی نہیں تھا۔

"دیکھو تمہارا چھوٹا بھائی۔ کیسا لگتا ہے تمہیں؟"

امامہ نے اب اس کی توجہ ایک دوسرے موضوع کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔

"ہی از کیوٹ"

اس نے جواب دیا تھا حمین کے بغور جائزے کے بعد لیکن اس جواب میں جذباتیت' خوشی اور حیرانی مفقود تھی۔

"تمہارے جیسا لگتا ہے نا؟" امامہ نے اسے خوش کرنے کی کوشش کی۔

"مجھے تو نہیں لگتا۔"

جبریل نے کچھ اور احتیاط سے بغور اس کا جائزہ لینے کے بعد ماں کو فوراً" جواب دیا تھا۔ اسے شاید ماں کا یہ تبصرہ اور مماثلت ابھی نہیں لگی تھی۔

"اچھا تم سے ڈفرنٹ ہے؟" امامہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اس کی مونچھیں ہیں۔ میری تو نہیں ہیں۔"

امامہ بے ساختہ ہنسی۔ وہ حمین کے چہرے اور بالائی لب پر آنے والے روئیں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

عنایہ اب بھی امامہ کے بیڈ کے بالکل قریب پڑے انکوبیٹر کی دیوار سے چپکی کھڑی تھی یوں جیسے حمین چڑیا گھر کا کوئی جانور تھا جسے وہ گلاس وال سے ناک اور ہاتھ ٹکائے حیرانی والے تاثرات کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

"یہ میری طرح لگتا ہے۔" اس نے بہت مدھم آواز میں اٹکتے ہوئے امامہ کو مطلع کیا تھا۔

وہ عنایہ کی مدھم آواز پر ہنس پڑی تھی۔ وہ احتیاط کر رہی تھی کہ سویا ہوا بھائی بیدار نہ ہو جائے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا۔ وہ سویا ہوا بھائی نہیں تھا سویا ہوا جن تھا جو بیدار ہونے کے لیے اپنے باپ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔

سالار سکندر اور امامہ ہمیشہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی اولاد دی تھی جو بالکل مشکل نہیں تھی۔ نہ ہی ان دونوں نے انہیں کسی بھی لحاظ سے تنگ کیا تھا۔ ان کے خاندان' دوستوں اور جبریل کے اسکول میں بھی ان دونوں کے بچوں کو مثالی بچے اور انہیں مثالی والدین مانا جاتا تھا۔

کانگو کے فسادات میں پیدا ہونے والا وہ تیسرا بچہ ان کا وہ سکون اور چین چھین کر انہیں واقعی مثالی بنانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ سی آئی اے نے جس بچے کو تین ہفتے پہلے دواؤں کے ذریعے قبل از وقت دنیا میں لانے کی کوشش کی

تھی۔ انہیں اگر محمد حمین سکندر کا تعارف ہو جاتا تو وہ اس پیدائش کو کم از کم تین سو سال تک روکتے
مستقبل سے بے خبر امامہ بڑی محبت سے اسے خود سے کچھ فاصلے پر سوئے دیکھ رہی تھی جو دو
دن بعد ہی خراٹے لے رہا تھا۔

”کیا یہ خراٹے لیتا ہے؟“ یہ جبریل تھا جس نے پہلی بار اس کے خراٹے نوٹس کرتے ہوئے بڑی بے یقینی سے
ماں کو دیکھا تھا۔

امامہ اس کے مشاہدے پر حیران ہوئی تھی۔ جبریل کے احساس دلانے پر اس نے پہلی بار غور کیا تھا۔ اگرغور
سے اس کے خراٹوں کی آواز نہیں آرہی تھی۔ لیکن اس کے سینے کا اتار چڑھاؤ بہت نمایاں تھا۔

”نہیں۔۔۔ وہ بس گہرے سانس لے رہا ہے۔“

امامہ نے جبریل کا چہرہ بھی حیرانی سے دیکھا تھا۔ اس نے کیسے اندازہ لگایا تھا اس کے سانس لینے کی رفتار سے کہ وہ
خراٹے لے رہا ہوگا۔

”ممی! کیا یہ آپ کا لاسٹ بے بی ہے؟“ سوال ڈائریکٹ کیا گیا تھا اور بے حد سنجیدگی سے کیا گیا تھا۔ امامہ کی سمجھ
میں نہیں آیا وہ خجل یا شرمندہ ہو۔ بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

”ہاں۔۔۔ شیور! یہ لاسٹ بے بی ہے۔“ اس نے جیسے جبریل کو تسلی دی تھی۔

”ہم دو بھائی اور ایک بہن ہے۔“ جبریل جیسے مطمئن ہوا اور اس نے انگلیوں کو چھو کر گنا۔

”ہاں ڈیئر!“ امامہ نے اس کا منہ چوم کر اسے یقین دلایا۔ اسے پتا نہیں تھا اس کے گھر ایک اور بچی نے پرورش
پانی تھی۔ کنیز غلام فرید عرف چنی۔



سکندر عثمان کے گھر آنے والا وہ مہمان غیر متوقع نہیں تھا' ناقابلِ یقین تھا۔ وہ ان کے گھر کئی بار گئے تھے۔ ہمسائے کے طور پر۔ مصالحت کے لیے۔ تعزیت کے لیے' لیکن ہاشم مبین زندگی میں کبھی ان کے گھر نہیں آئے تھے۔ آج وہ آگئے تھے تو انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ اب ان کے پڑوس میں نہیں رہتے تھے۔ وہ گھر چھوڑ کر جاچکے تھے۔ اس گھر میں اب کوئی اور رہتا تھا اور گھر بکنے کی خبر پر سالار نے بے حد کوشش کی تھی کہ سامنے آئے بغیر درپردہ کسی اور کو درمیان میں رکھ کر وہ گھر خرید پاتا۔ وہ ناکام رہا تھا۔ ہاشم مبین کے بیٹے اب بہت طاقت ور تھے اور ہاشم مبین بہت کمزور ہوچکے تھے۔ ان کے دل میں فیصلے کی خواہش تھی۔ ہاتھ میں طاقت نہیں تھی۔ جن پراپرٹی ڈیلرز کے ذریعے سالار سکندر ان سے رابطہ کررہا تھا' وہ بھی اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ گھر ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکا تھا کیونکہ وہ بہت بڑا تھا۔ آٹھ کنال کا وہ گھر تین حصوں میں بٹ کر بکا تھا اور اس کے باوجود اس پر کچھ اور کیسز تھے جو امامہ کی بہنوں نے اپنے حصے کے حوالے سے کیے تھے۔

سکندر عثمان نے سالار کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ اس حق میں نہیں تھے کہ وہ متنازعہ جائیداد خریدی جاتی' خاص طور پر اس لیے کیونکہ وہ امامہ کے والدین کی تھی اور دونوں فیملیز کے درمیان تنازعات تھے جو سالار کے خود پس پردہ رہ کر سامنے کسی اور کو رکھ کر اس کے ذریعے ایسی کسی خرید و فروخت کے شدید مخالف تھے' خاص طور پر اس لیے بھی کیونکہ سالار کے پاس اتنا بڑا گھر خریدنے کے وسائل نہیں تھے۔ وہ قرضہ اور ادھار لیے بغیر ایسی کوئی خرید و فروخت کر نہیں سکتا تھا اور سکندر عثمان زندگی میں کبھی قرض اور ادھار پر عیاشیاں اور اللے تللے کرنے کے حق میں نہیں رہے تھے۔

اور اب وہ ایک لمبے عرصے کے بعد جس ہاشم مبین کو اپنے سامنے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس رعونت' تمکنت کا سایہ تھے جو کبھی ان کے ہمسائے میں رہتے تھے اور جو ان سے بات تک کرنے کے روادار نہیں ہوتے تھے۔

چہرے پر جھریوں کا جال لیے زرد رنگت' کمر میں خم کے ساتھ جو ضعیف آدمی ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ پہلی نظر میں انہیں پہچان نہیں پائے تھے۔ ان کی سمجھ میں ابھی نہیں آرہا تھا کہ وہ ان کے ساتھ کیا رویہ رکھیں۔ آخر اب کیا شے تھی جو انہیں کھینچ کر یہاں لائی تھی۔

"مجھے امامہ سے بات کرنی اور ملنا ہے۔" چند ہی جملوں کے بعد ہاشم مبین نے ان سے کہا تھا۔

"وہ یہاں نہیں ہے۔" سکندر عثمان نے بڑے محتاط انداز میں انہیں بتایا۔

"میں جانتا ہوں۔ وہ کانگو میں ہے۔ میں وہاں کا نمبر لینا چاہتا ہوں۔ وہاں کے حالات خراب ہیں۔ وہ ٹھیک ہے؟"

انہوں نے رک رک کر۔ لیکن ایک ہی سانس میں ساری باتیں کی تھیں۔ سکندر کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ کیا کہیں۔

"ہاں۔ وہ' سالار اور بچے ٹھیک ہیں۔"

اگر وہ تشویش میں یہاں آئے تھے تو سکندر عثمان نے ان کی وہ تشویش دور کردی تھی۔ وہ فون نمبر کا مطالبہ گول کرگئے تھے۔

"میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں' ایک بار اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" ہاشم مبین اپنا مطالبہ نہیں بھولے تھے۔

"میں امامہ سے پوچھے بغیر اس کا نمبر یا ایڈریس آپ کو نہیں دے سکتا۔" سکندر عثمان نے کوئی تمہید نہیں باندھی تھی۔

"میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اب۔" انہوں نے بہت تھکے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"آپ اسے بہت زیادہ نقصان پہلے ہی پہنچا چکے ہیں۔" سکندر عثمان نے نرمی سے کہا۔ "وہ اب اپنی زندگی

میں سیٹ ہے۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ بہت خوش' بے حد مطمئن زندگی گزار رہی ہے۔ آپ کیوں ایک بار پھر اس کو ڈسٹرب کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی بیٹی نے پہلے ہی آپ کی وجہ سے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔ آپ اب اسے چھوڑ دیں۔ اسے بخش دیں۔"

ہاشم مبین کے چہرے کی جھریاں یک دم بڑھ گئی تھیں پھر انہوں نے مدھم آواز میں کہا۔

"میں جانتا ہوں مجھے احساس ہے۔"

سکندر عثمان بول نہیں سکے وہ ان کے منہ سے یہ جملے سننے کی توقع نہیں کر رہے تھے۔

"بس ایک آخری بار ملنا چاہتا ہوں اس سے۔ اس کی ایک امانت ہے' وہ دینی ہے مجھے۔ اور اس سے معافی مانگنی ہے۔"

"آپ مجھے اپنا فون نمبر اور ایڈریس دے دیں میں اس سے بات کروں گا' پھر آپ سے رابطہ کروں گا۔ آپ کہاں رہتے ہیں اب۔" سکندر نے اس سے پوچھا۔

"ایک اولڈ ہوم میں۔" سکندر چپ رہ گئے۔ ہاشم مبین اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"امامہ کو بتا دیں۔ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ پھر وہ مجھ سے ضرور بات کرے گی۔"

اپنی نشست سے کھڑے ہوتے ہوئے سکندر عثمان ان کے اگلے جملے پر دم بخود رہ گئے تھے۔



جیکی بے اختیار ہنسی۔ جواب غیر متوقع نہیں تھا۔ کوئی مرد اس کی کشش کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ کم از کم اس نے اپنی زندگی میں ایسا کوئی مرد نہیں دیکھا تھا جس نے اس کی اتنی کھلی دعوت کو رد کیا ہو۔

وہ نیویارک کی مہنگی ترین Escorts میں سے ایک تھی اور مہنگی ترین کا لفظ اس کے لیے بہت چھوٹا پڑ جاتا تھا۔ اس کی خدمات حاصل کرنے والے دنیا کی مشہور ترین کمپنیز کے سربراہان شامل تھے۔ کیونکہ جیکی کی خدمات ہر کوئی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے "کلائنٹس" محدود تھے اور Forbes کے 100 امیر ترین لوگوں کی فہرست میں شامل تھے۔ وہ ان کلائنٹس کے علاوہ صرف چند لوگوں کے لیے کام کرتی تھی اور آج اسے ایک لاکھ ڈالر سامنے بیٹھے ہوئے اس ایک شخص کے ساتھ رات گزارنے کے لیے دیے گئے تھے جو اس وقت مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اپنے گلاس میں موجود ورجن میری کا آخری گھونٹ لے رہا تھا۔

"اوہ۔ واٹ گریٹ۔" جیکی نے شیمپین کا ایک اور گھونٹ بھرتے ہوئے کافرانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا۔

"لیکن صرف حوروں کے ساتھ۔" اس شخص کا اگلا جملہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ اب اپنے ہاتھ کی پشت پر سرسراتا اس کا ہاتھ ہٹا رہا تھا۔

"حور۔ وہ کون ہے؟" جیکی سمجھ نہیں سکی لیکن اسے یک دم اس "حور" کو کھوجنے میں دلچسپی نہیں ہوئی جس کا ذکر وہ مرد کر رہا تھا جو 37 سال کی عمر میں ورلڈ بینک کی تاریخ کا اب سے کم عمر ترین وائس پریذیڈنٹ تھا اور جو وہاں ورلڈ بینک کے کچھ افراد کے ساتھ موجود تھا جو اس وقت بار کے قریب ڈانس فلور پر تھرک رہے تھے۔ یا بظاہر "تھرک رہے تھے"۔

سالار سکندر نے اپنے والٹ سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی پشت پر ایک پین سے کچھ لکھا اور میز پر انگلیوں کے نیچے دبائے اسے جیکی کی طرف کر دیا۔ جیکی نے وزیٹنگ کارڈ کی پشت پر عربی میں لکھا ایک جملہ

دیکھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے سالار سے کہا۔
"یہ کیا ہے۔؟ میں اسے پڑھ اور سمجھ نہیں سکتی۔" اس نے کندھے اچکا کر سالار کو دیکھا جو اب اپنے گلاس کے نیچے کچھ نوٹ دباتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔
"میں نے تمہارے ڈرنکس کی ادائی کر دی ہے۔"
جیکی نے انگلی اور انگوٹھے میں دبے اس کارڈ کو سالار کو دکھایا اور دوبارہ کہا۔ "میں یہ پڑھ اور سمجھ نہیں سکتی۔"
"جنہوں نے آپ کو بھیجا ہے وہ پڑھ بھی لیں گے، سمجھ بھی لیں گے، سمجھا بھی دیں گے۔"
جیکی کو اس کے جملے پر کرنٹ لگا۔ اس کی قاتلانہ مسکراہٹ سب سے پہلے غائب ہوئی تھی۔
"ایکسکیوزمی۔" (معاف کیجیے) اس نے ایک بار پھر اپنی لاعلمی اور بے خبری ظاہر کرنے کی کوشش کی۔
"Excused" (معاف کیا) وہ مسکراتے اور کہتے ہوئے اٹھ گیا۔
سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز میں بیٹھے اس ہوٹل کے ایک کمرے کو مانیٹر کرتے اور خفیہ کیمرے اور مائیکروفون کی مدد سے گفتگو سنتے ان پانچوں کو ایک لمحے کے لیے چپ لگ گئی تھی۔ ان پانچ نے ایک وقت میں ایک دوسرے کو بے اختیار دیکھا پھر ان سب نے بے اختیار اس شخص کو گالی دی تھی۔ وہ اس شخص کو پیش کیا جانے والا خراج تحسین تھا۔ وہ اس پھندے سے بچ کر نکلنے والے مردوں میں پہلا تھا۔
"اس کارڈ پر کیا لکھا ہے؟" سی آئی اے کی اسٹنگ ٹیم کے لیڈر نے آدھ گھنٹے بعد جیکی کے اس کمرے میں آنے سے پہلے وہاں بلوائے عربی مترجم سے پوچھا تھا۔
"اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔" اس مترجم نے وہ تحریر پڑھی۔
"مطلب؟"
"میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔" مترجم نے اس بار روانی سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔
ان سب لوگوں نے جیکی اور جیکی نے انہیں دیکھا پھر قاتلانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔
"
"I am sure he wasn't referring to me"
(مجھے یقین ہے کہ یہ میرے بارے میں نہیں ہے۔)



آپریشن کے دوران وہ نیورو سرجن چند لمحوں کے لیے رکا تھا۔ ایک نرس نے بڑھ کے اس کے ماتھے پر ابھرنے والے پسینے کے چند قطروں کو ایک کپڑے سے خشک کیا۔ وہ شخص ایک بار پھر اپنے سامنے آپریشن تھیٹر کی ٹیبل پر کھلے پڑے اس دماغ پر جھکا جو دنیا کے ذہین ترین دماغوں میں سے ایک تھا اور جو ایک گولی کا نشانہ بننے کے بعد اس کے سامنے اس میز پر آیا تھا۔ دنیا کی اہم ترین پوزیشن پر فائز رہنے والے اس شخص کے لیے اسے ایمرجنسی میں بلوایا گیا تھا۔ وہ سرجن اب تک 270 اہم اور نازک ترین کامیاب سرجریز کرنے کے بعد اس وقت امریکہ کی تاریخ کا کم عمر اور سب سے قابل سرجن تھا۔ لیکن آج پہلی بار اسے لگ رہا تھا کہ اس کا ہنڈرڈ پرسنٹ کامیابی کا ریکارڈ ختم ہونے والا تھا۔ وہ ایک بار پھر گہری سانس لے کر ٹیبل سے ہٹا۔ اسے کسی چیز کی ضرورت پڑی تھی اس آپریشن میں کامیابی کے لیے۔۔۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مجنے کے ساتھ ساتھ ان دوسری عالمی طاقتوں کے لیے بھی پریشانی کے آثار پیدا ہوتے جو اس پروجیکٹ میں حصہ دار تھے اور جن کے ہاتھ ان پگمیز کے خون سے رنگے جارہے تھے۔

وہ ٹیکسٹ بہت لمبا تھا۔ اس میں اور بھی بہت کچھ تھا۔ اور پیٹرس کا جوش و خروش وہیں ختم نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس بہت لمبے ٹیکسٹ کو کرتے کرتے ای میل کر دیا تھا۔ سالار سکندر اس وقت اپنی فلائٹ پر تھا اور کچھ گھنٹوں کے بعد وہ جب واشنگٹن اترا تھا تب تک اس کے رابطوں کے تمام ذرائع زیر نگرانی آچکے تھے۔ پیٹرس ایباکا کی وہ آخری ای میل سالار سکندر کو اس کی موت کے بعد ملی تھی۔ لیکن ان لوگوں کو سالار سکندر کے جہاز اترنے سے بھی کئی گھنٹے پہلے مل گئی تھی جو پیٹرس ایباکا کی زندگی اور موت کے حوالے سے فیصلہ کر رہے تھے۔

ایباکا کی فوری موت انہیں نہیں چاہیے تھی۔ انہیں فی الحال کچھ گھنٹوں کے لیے اس کی زندگی چاہیے تھی۔ اپنی تحویل میں ایباکا کو رکھتے ہوئے وہ اب ایباکا ہی کے ذریعے اس پورے کیس کو بند کرنا چاہتے تھے۔ وہ پنڈورا باکس جسے ایباکا نے کھولا تھا وہ ایباکا کے ہاتھوں ہی بند کروانا چاہتے تھے۔ اور اس کے بعد وہ ایباکا سے جان چھڑا لیتے۔ اس کی طبعی موت کے ذریعے۔

بعض اوقات کسی شخص کی زندگی کسی دوسرے کی موت بن جاتی ہے۔ اور کسی دوسرے کی موت کسی اور کی زندگی۔ ایباکا کی موت کے فیصلے نے سی آئی اے کی فوری طور پر سالار سکندر کو مارنے کی حکمت عملی بدل دی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے سالار سکندر کو ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں ہونے والے مذاکرات کے بعد اس کے انکار اور معاملہ حل نہ کرنے کی صورت میں ایک "حادثاتی موت" کا سامنا کرنا تھا۔ ایڈریس کو ورلڈ سے ایباکا کی ہونے والی اچانک ملاقات نے سی آئی اے کو یک دم بے بس کر دیا تھا۔ وہ ایباکا اور سالار دونوں کو اکٹھا نہیں مار سکتے تھے۔ شاید مارنے کا سوچ ہی لیتے اگر اتفاقی طور پر وہ دونوں ایک ہی وقت میں امریکہ میں موجود نہ ہوتے اور وہ بھی دو قریبی شہروں میں۔ وہ ایسا کوئی رسک نہیں لے سکتے تھے کہ کسی تفتیش شروع ہونے کی صورت میں ایباکا اور سالار کی طبعی اموات کے درمیان کوئی اور قدرتی تعلق نکال لیا جاتا۔

سالار کو فی الحال صرف خوف زدہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور سی آئی اے کو اندازہ نہیں تھا کہ انہوں نے غلط حکمت عملی بنا کر کوئی برا کو کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

پیٹرس ایباکا کو چند گھنٹوں کے بعد بروکلین کے ایک ایسے علاقے کی ایک تنگ و تاریک گلی میں روکا گیا تھا جہاں ایک قریبی عمارت میں ایباکا کو اپنے ایک دوست سے ملنا تھا۔ سی آئی اے کا خیال تھا ایباکا ان کے لیے حلوہ تھا جسے وہ بہت آرام سے اپنے پنجرے میں کرتے۔ ایسا نہیں ہوا تھا۔ ایباکا ان دو افراد سے بڑی بے جگری سے لڑا تھا جنہوں نے اچانک اس کے قریب اپنی گاڑی روک کر اسے ریوالور دکھاتے ہوئے اندر بٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ساری زندگی امریکہ کی مہذب دنیا میں مہذب طور طریقوں کے ساتھ گزاری تھی لیکن جنگل اور جنگلی زندگی اس کی سرشت اور جبلت میں تھی۔ اپنا دفاع کرنا اسے آتا تھا۔

وہ ان تربیت یافتہ گماشتوں کے قابو میں نہیں آیا تھا۔ پستہ قامت ہونے کے باوجود وہ سخت جان اور مضبوط تھا۔ وہ پٹتا اور پیٹتا رہا تھا۔ اس سڑک سے گزرتے ہوئے اکا دکا لوگوں میں سے کسی نے ایک سیاہ فام اور دو سفید فاموں کے درمیان ہونے والی اس دھینگا مشتی کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گزرنے والے سفید فام تھے اور پیٹرس ایباکا ان کی ملامتی نظروں کا معاملے کو نہ سمجھتے ہوئے بھی نشانہ تھا۔ جرم ہمیشہ کالا کرتا تھا۔ قصوروار ہمیشہ کالا ہوتا تھا۔ وہ فلاسفی یہاں سے گزر جانے والے لوگوں کے ذہنوں کے ساتھ ساتھ نظروں میں بھی تھی۔

وہ ایسا معاشرہ نہیں تھا جو کسی سیاہ فام کو پٹتے دیکھ کر انسانیت کے جذبے کے تحت تڑپ جاتا اور مدد کے لیے بن بلائے آجاتا۔ اور یہاں تو ایک ایسا سیاہ فام تھا جو پٹ رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ پیٹ بھی رہا تھا۔ خود لہولہان تھا تو ان

دو سفید فاموں کو بھی لہولہان کر چکا تھا۔ پتا نہیں یہ ایباکا کی بدقسمتی تھی۔ ان دونوں ایجنٹس کی یا پھر سی آئی اے کی
کہ لڑتے لڑتے ریوالور ایباکا کے ہاتھ میں آگیا تھا اور ایک بار ریوالور ہاتھ میں آنے پر اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ،
ان دونوں افراد پر گولیاں چلا دی تھیں۔ گولی ایک کو لگی تھی لیکن دوسرا خود پر ہونے والے فائر سے بہت پہلے اپنا
ریوالور نکال کر ایباکا پر دو فائر کر چکا تھا جو اس کے سینے میں لگے تھے۔

یکے بعد دیگرے ہونے والے ان تین فائرز نے اس سڑک پر چلتے راہ گیر کو وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا اور
ان ہی میں سے کسی نے پولیس کو بھی فون کیا تھا لیکن پولیس کے آنے سے پہلے ہی وہ دونوں ایجنٹ شدید زخمی
حالت میں تڑپتے ایباکا کو گاڑی میں ڈال کر فرار ہو گئے تھے۔ جس ایجنٹ کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ وہ ہوش و
حواس میں تھا اور اپنی گاڑی میں ایباکا کو لے کر فرار ہوتے ہوئے انہوں نے اپنے سرپرستوں کو سارے واقعے سے
انفارم کر دیا تھا۔

ایباکا کی وہ حالت اس دن سی آئی اے کے لیے دوسرا جھٹکا تھی۔ انہیں ایباکا صحیح سلامت کچھ گھنٹوں کے لیے
چاہیے تھا تاکہ اس کے ذریعے ان تمام چیزوں کو بھی نابود کر سکتے جو ایباکا کی موت کی صورت میں کسی اور کے ہاتھ
لگ جانے کی صورت میں ان کے لیے کوئی اور پیٹرس ایباکا کھڑا کر جاتی۔ سی آئی اے کو یہ پتا تھا کہ ایباکا کے پاس موجود
کاغذات کی ہزاروں نہیں تو کم از کم سینکڑوں کاپیاں تھیں جو ایباکا کا مختلف لوگوں کے پاس رکھوا رکھا تھا۔ پتا نہیں
یہ احتیاط تھی یا کوئی خوف یا کوئی حکمت عملی لیکن یہ وہ واحد حفاظتی تدبیر تھی جو ایباکا کے ذہن میں ابھرنے والے
خدشات کا ایک حل تھا اور یہ خدشات اس وقت ابھرنا شروع ہوئے تھے جب ایک سال پہلے پہلی بار چند لوگوں
نے اس سے رابطہ کر کے اس پورے معاملے سے پیچھے ہٹ جانے کے عوض رشوت دینے کی کوشش کی تھی۔
رشوت شاید ایک بہت چھوٹا اور گھٹیا لفظ تھا اس سب کے لیے جو اسے آفر کیا گیا تھا۔ اگر بلینک چیک کسی کو
صرف روپے کے لیے پیش کیا جاتا تھا تو ایباکا کو اس مقصد سے پیچھے ہٹنے اور دوسرے لفظوں میں اپنے لوگوں کی
زندگی بیچ دینے کے عوض ہر چیز کے حوالے سے ایک بلینک چیک پیش کیا گیا تھا۔ کوئی بھی ایسی چیز جو ایباکا کی
خواہش ہوتی۔ کوئی بھی چھوٹی سے چھوٹی' بڑی سے بڑی۔

ایباکا کا "انکار" اقرار میں نہیں بدلا تھا۔ قیمت ہمیشہ اقرار کی ہوتی ہے "انکار انمول" ہوتا ہے۔ بکنے والے
قوموں کے بیچ میں نہ بکنے والا کوئی کانٹے کی طرح چبھتے ہوئے بھی ہیرے کی طرح چمکتا ہے اور سی آئی اے
"ہیروں" کے کاروبار میں مہارت رکھنے کا دعوا رکھتی تھی۔

ان پیش کشوں اور اس انکار کے بعد ایباکا کو پہلی بار یہ خدشات لاحق ہونے لگے تھے کہ اگر اسے خریدا نہیں جا
سکا تو پھر اسے مارا جا سکتا ہے۔ اور یہ خدشہ ہی وہ چیز تھی جس نے ایباکا کو اپنے بہت سے دوستوں اور ساتھیوں کے
پاس ان دستاویزات کی کاپیاں رکھوانے پر مجبور کرنا شروع کر دیا تھا۔ سی آئی اے کو اس کی بھی خبر تھی۔ ایباکا نے
اگر سینکڑوں کاپیاں امریکہ اور کانگو اور انگلینڈ میں اپنے دوستوں کے پاس رکھوائی تھیں تو سی آئی اے کو ان
سینکڑوں لوگوں کی مکمل معلومات تھیں۔ وہ دستاویزات ہر اس جگہ سے چوری کر کے ان کی جگہ کچھ اور ڈاکومنٹس رکھ
دی جاتی تھیں اور ایباکا کو اس بات کا احساس تک نہیں ہوا تھا کہ اس کے پیچھے اس پروجیکٹ کے حوالے سے
سارے سراغ مٹائے جاتے رہے تھے۔

فی الحال دنیا میں اب صرف دو شخص تھے جن کے پاس وہ دستاویزات اصلی شکل میں تھیں کسی قسم کی تبدیلی کے
بغیر۔ پیٹرس ایباکا اور سالار سکندر۔ پیٹرس ایباکا اب موت اور زندگی کی کشمکش میں تھا اور سالار سکندر اگلے دن
فرار ہونے والا تھا مگر سی آئی اے کے لیے فی الحال سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ وہ ایباکا کے دستخط کیسے حاصل کرتے،
جن کی انہیں فوری ضرورت تھی تاکہ وہ اس کے وہ لاکرز کھلوا سکتے جہاں اس کی اصل دستاویزات تھیں۔ ان کی

حکمت عملی یہ تھی کہ وہ ان اصلی دستاویزات کو حاصل کرنے کے بعد ایباکا کو ختم کر دیتے مگر سب کچھ اس کے الٹ ہوا تھا۔

پلان اے اور پلان بی ناکام ہو چکا تھا۔ اب سی آئی اے کو پلان سی سے کام لینا تھا لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ایباکا کے پاس ایک پلان ڈی تھا جس کا انہیں کبھی پتا نہیں چل سکا تھا۔ وہ کانگو میں اپنی ایک گرل فرینڈ کے پاس ایک وصیت چھوڑ کر گیا تھا۔



امامہ کو اندازہ نہیں تھا۔ وہ کتنی دیر بے ہوشی کی حالت میں رہی تھی یا رکھی گئی تھی مگر بے ہوشی جب ختم ہونا شروع ہوئی تھی تو اس نے جیسے بے اختیاری کے عالم میں سب سے پہلے اس وجود کو ڈھونڈنا شروع کیا تھا جسے اس نے پہلی اور آخری بار آپریشن تھیٹر میں بے ہوش ہونے سے پہلے دیکھا تھا۔ تکلیف کی حالت میں بھی اسے یاد تھا کسی نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک لڑکا تھا۔

درد سے بے حال اس نے محسن سکندر کو اپنی آغوش میں لیتے ہوئے اسے چوما تھا اور پھر اسے چومتی چلی گئی تھی۔ وہ بے حد کمزور تھا اس کی بڑی دو اولادوں کے برعکس بے حد کمزور۔ اور وجہ اس کی قبل از وقت پیدائش تھی۔ وہ تین ہفتے قبل دنیا میں آیا تھا۔ نیم غنودگی میں وہ اپنا بستر ٹٹولتی رہی۔

اس بات کا احساس کیے بغیر کہ وہ نوزائیدہ بچہ اس کے بستر پر نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر اسے بے مقصد تلاش کرتے رہنے کے بعد اسے اچانک یاد آیا تھا کہ وہ وہاں نہیں ہو سکتا تھا۔ بے ہوشی کی دوا کا اثر آہستہ آہستہ زائل ہونا شروع ہو رہا تھا۔ اس کی یادداشت جیسے آہستہ آہستہ واپس آ رہی تھی۔ دماغ نے کام کرنا شروع کیا تھا تو آہستہ آہستہ اسے سب یاد آنے لگے تھے۔ جبریل۔ عنایہ۔ سالار۔ وہ کچھ بے چین ہوئی تھی۔ جبریل اور عنایہ کہاں تھے؟ پاپا کہاں تھے؟ اور سالار کیا اس کو پتا تھا اس کی اس حالت کے بارے میں۔

اس نے بھاری سر اور آنکھوں کے ساتھ اس کمرے کا جائزہ لیا تھا جس میں وہ تھی۔ وہ ایک ہسپتال کا وی آئی پی روم تھا اور ایک ساؤنڈ پروف کمرہ جس کی کھڑکیوں کے سامنے بلائنڈز تھے اور امامہ اس ذہنی حالت میں فوری طور پر یہ اندازہ نہیں کر پائی تھی کہ وہ دن تھا یا رات اور وقت کیا ہو رہا تھا۔ اس نے وقت کا خیال آنے پر کمرے کی کسی دیوار پر کلاک تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہاں کوئی وال کلاک نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا وہ آپریشن کے بعد اس کی تکلیف کو کم کرنے کے لیے سلائی گئی تھی اور اب وہ ہوش میں آئی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ دو دن کے بعد ہوش میں آ رہی تھی۔ امامہ نے یاد کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ وہاں کیسے آئی تھی۔ ذہن پر زور دے دے کر۔



سی آئی اے کے لیے سب سے بڑی پریشانی سالار کی فیملی تھی۔ انہیں غائب کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا مگر انہیں یہ احساس دلائے بغیر غائب کرنا کہ انہیں غائب کیا جا رہا تھا سب سے مشکل کام تھا۔ بینک کے کرتا دھرتا ابھی سالار سے مذاکرات کر رہے تھے اور ان مذاکرات کے نتیجے میں اگر وہ مان جاتا تو پھر اپنی فیملی کے ساتھ ہونے والے کسی برے سلوک پر وہ رد عمل کا اظہار کر سکتا تھا۔ وہ اسے یہ سراغ نہیں دینا چاہتے تھے کہ ورلڈ بینک کے علاوہ کوئی دوسری طاقت اس سب میں ملوث تھی۔

سالار جس رات واشنگٹن کے لیے روانہ ہوا تھا اس کے اگلے دن امامہ کی گائنا کولوجسٹ نے اسے فون کیا تھا۔

گیا کیونکہ اسے کسی میڈیکل کیمپ میں شرکت کے لیے اگلے ایک ہفتے کے لیے گھانا میں رہنا تھا۔ اس کی سیکریٹری نے امامہ سے کہا تھا کہ وہ اپنی تمام اپائنٹمنٹس ری شیڈول کر رہی ہے اور اس نے امامہ کو آج کے دن کا کہا تھا۔ امامہ نے کسی غور و خوض کے بغیر جانے کی ہامی بھر لی تھی۔ وہ اسے ایک معمول کی بات سمجھ رہی تھی اور اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا اگر سالار سکندر سی آئی اے کے ہاتھوں بے بس ہو رہا تھا تو امامہ تو کوئی شے ہی نہیں تھی۔

وہ ہمیشہ کی طرح جبریل اور عنایہ کے ساتھ ہیڈی کو بھی ہسپتال لے کر گئی تھی۔ وہ کنشاسا کے بہترین اسپتالوں میں سے ایک تھا کیونکہ وہاں پر زیادہ تر غیر ملکی ملٹی نیشنل کمپنیز اور سفارت کاروں کا علاج ہوتا تھا سالار اس وقت اپنی فلائٹ پر تھا اور امامہ کا خیال تھا وہ جب تک واشنگٹن پہنچتا وہ اس سے بہت پہلے واپس گھر آجاتی۔ لیکن وہ واپس گھر نہیں آسکی تھی۔

اس کی ڈاکٹر نے اس کا الٹرا ساؤنڈ کرنے کے بعد بے حد تشویش کے عالم میں اس سے کہا تھا کہ اسے بچے کی حرکت ابنارمل محسوس ہو رہی ہے۔ اس نے اسے بتایا تھا کہ اسے کچھ اور ٹیسٹ کروانے ہوں گے اور ساتھ اسے کچھ انجکشن بھی لینا ہوں گے۔ امامہ کو تشویش ہوئی تھی تو صرف یہ کہ سالار وہاں نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے ہمیشہ اس کے ساتھ ہی وہاں آتی تھی ایسے معائنوں کے لیے لیکن اسے اپنے بچے کے حوالے سے کوئی فکر نہیں تھی، کیونکہ وہ بچے کی حرکت کی ابنارملٹی کو بھی ایک اتفاقی چیز سمجھ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے فوری طور پر ہاسپٹل میں کچھ گھنٹوں کے لیے ایڈمٹ کیا تھا کہ انہیں اس کو زیر نگرانی رکھنا تھا۔

اسے ایک کمرے میں شفٹ کیا گیا تھا اور جو انجکشن امامہ کو دیے گئے تھے وہ درد بڑھانے والے انجکشن تھے۔ امامہ کو گھر سے غائب اور سالار اور اپنی کسی اور فیملی ممبر سے رابطہ منقطع رکھنے کے لیے سی آئی اے کے پاس اس سے بہترین حل نہیں تھا کہ اس کے بچے کی قبل از وقت پیدائش عمل میں لائی جائے۔

اس کے بچے کی حالت اتنی اچھی تھی کہ وہ تین ہفتے پہلے پیدا ہونے پر بھی زندہ بچ سکتا تھا۔ اور نہ بچتا تو بھی سالار یا امامہ میں سے کوئی ورلڈ بینک یا سی آئی اے کا ہاتھ اس ساری صورت حال میں سے برآمد نہیں کر سکتا تھا۔

امامہ انجکشن لگوانے سے پہلے ہاسپٹل کے کمرے میں ہی ہیڈی جبریل اور عنایہ کو لے آئی تھی۔ اس وقت بھی اس کا یہی خیال تھا کہ چند گھنٹوں میں وہ واپس گھر چلی جائے گی لیکن اسے پہلی بار تشویش تب ہوئی تھی جب اسے درد زہ ہونا شروع ہو گیا تھا اور ڈاکٹر نے اس کی تصدیق بھی کر دی تھی کہ انجکشن کے ری ایکشن میں شاید انہیں بچے کی زندگی بچانے کے لیے فوری طور پر دنیا میں لانا پڑے۔

وہ پہلا موقع تھا جب امامہ بری طرح پریشان ہوئی تھی وہاں کنشاسا میں گھر کے چند ملازموں کے علاوہ ان کا کوئی ایسا حلقہ احباب نہیں تھا جنہیں وہ ایسے کسی بحران میں مدد کے لیے پکارتے یا جن پر بھروسا کرتے۔ ان کا جتنا میل ملاپ تھا وہ سرکاری تھا اور غیر ملکی تھا۔

فوری طور پر امامہ کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا تھا کہ وہ بچوں کو کہاں بھیجے۔ اس کی ڈاکٹر نے اسے مدد کی پیش کش کی تھی کہ وہ بچوں کو اپنے گھر رکھ سکتی ہے لیکن امامہ کے لیے تو یہ ناممکن تھا۔ وہ اپنی اولاد کے بارے میں جنون کی حد تک محتاط تھی اور خاص طور پر جبریل کے حوالے سے۔ یہ غیر فطری نہیں تھا۔ اس نے ایک بھرے پرے خاندان سے نکل کر دس سال کی قید تنہائی کاٹی تھی اور پھر امید اور نا امیدی کے درمیان لٹکتے ہوئے اس نے ان خونی رشتوں کو پایا تھا۔ وہ اس کی کل کائنات تھے اور اسے اس وقت ملے تھے جب وہ سکندر کی موت کے بعد وہ مایوسی کے سب سے بدترین دور سے گزر رہی تھی۔ جبریل اس کی زندگی میں اس وقت بہار کی طرح آیا تھا۔ اس کے وجود کے اندر پلتے ہوئے بھی اس نے ماں کو کسی مسیحا کی طرح سنبھالا تھا۔

وہ پہلی بار جبریل کو دیکھنے اور گود میں لینے پر بلک بلک کر روئی تھی۔ لگتا تھا اولاد نہیں معجزہ تھا اس کے لیے۔ اور یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ معجزہ اس کے لیے کیسے ہو گیا تھا۔

وہ اس کی وہ اولاد تھی جس نے اس کی زندگی کے بدترین دنوں میں سے کچھ دن اس کے وجود کے اندر پلتے ہوئے اس کے کرب کو سہتے ہوئے گزارے تھے اور یہ وہ احساس تھا جو امامہ کو جبریل کے سامنے ہمیشہ شرمندہ بھی رکھتا تھا اور احسان مند بھی۔ سالار کہتا تھا وہ جبریل کی عاشق تھی اور وہ ٹھیک کہتا تھا۔ اسے جبریل کے سامنے واقعی کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ عنایہ۔۔۔ سالار دونوں کہیں پیچھے چلے جاتے تھے۔۔۔ وہ اس پر بھروسا کرتی تھی اور چار سال کے اپنے اس بیٹے کو ہر جگہ اپنے ساتھ یوں رکھتی تھی جیسے وہ بہت بڑا ہو۔ جبریل عام بچوں جیسی عادات نہیں رکھتا تھا۔ ذہانت اسے باپ سے ورثے میں ملی تھی لیکن برداشت اس نے کہاں سے لی تھی؟ یہ امامہ نہیں جان پائی تھی۔ اس کے دونوں بچے ہی ضدی اور شرارتی نہیں تھے لیکن جبریل میں ایک عجیب سی سنجیدگی اور سمجھ داری تھی جو اس کے معصوم چہرے پر بلا کی جچتی تھی۔

وہ ہر چیز کا بے حد خاموشی سے مشاہدہ کرنے کا عادی تھا بنا کوئی تبصرہ کیے۔ امامہ کون سی چیز کہاں رکھ کر بھولتی تھی یہ جبریل کو یاد رہتا تھا۔ وہ سالار سکندر کی عدم موجودگی میں اس گھر کا "بڑا" تھا۔ اور وہ جیسے اپنے اس کردار سے بخوبی واقف بھی تھا۔

ہسپتال میں امامہ اور ڈاکٹر کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو بھی اس کے سامنے ہی ہوتی رہی تھی اور وہ چپ چاپ بیٹھا سن اور دیکھ رہا تھا۔

امامہ کو اب بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی اس کی ڈلیوری کم از کم تب تک ٹل جائے جب تک سالار امریکہ پہنچ جائے اور وہ اس سے بات کرلے اور اسے صورت حال سے آگاہ کر دے۔ وہ اس کے اور بچوں کی فوری دیکھ بھال کے لیے کچھ کرتا ہی کرتا لیکن کم از کم وہ اس سے ڈلیوری سے پہلے ایک بار بات تو کر لیتی۔

وہ خوف جو ہمیشہ اسے اپنے حصار میں لیتا رہا تھا وہ اب بھی لے رہا تھا۔ اور کیا ہوا۔ اگر ڈلیوری کے دوران مر جائے تو۔۔۔ اور یہ وہ "تو" تھی جو اسے ہر بار آپریشن تھیٹر میں جاتے ہوئے سالار سے ایک بار معافی مانگنے پر مجبور کرتی تھی۔ اپنی احسان مندی جتانے پر بھی مجبور کرتی تھی لیکن بس زبان اگر ایک جملے پر آ کر اٹکتی تھی تو وہ اس سے محبت کا اظہار تھا۔ وہ آج بھی سالار سے محبت کے اظہار کے لیے بس جملے اور لفظ ہی ڈھونڈتی رہ جاتی تھی۔ وہ لفظ اور وہ جملے جو اسے اتنے خالص لگتے کہ وہ سالار تک وہ جذبات پہنچا پاتی جو اس کے دل میں اپنے محسن کے لیے تھے۔ اللہ کے بعد جو بھی تھا اس کے دم سے تھا۔ وہ محسن کی پہچان سے پہلے موت کے خوف میں مبتلا ہوئی تھی۔ اور اس بار پہلے سے کہیں زیادہ کیونکہ سالار دور تھا۔ وہ تنہا تھی۔ اور اس کے بچے کم سن تھے۔ اس کی خواہش پوری نہیں ہو سکی تھی۔ درد بڑھ رہا تھا اور ڈاکٹر اسے آپریشن تھیٹر میں لے جانا چاہتی تھی کیونکہ کیس نارمل نہیں تھا۔ اسے آپریشن کرنا تھا۔

امامہ نے پیڈی کو اپنے بچوں کی ذمہ داری سونپنے سے پہلے جبریل کو عنایہ کی ذمہ داری سونپی تھی۔ اسے بہن کا خیال رکھنے کا کہا تھا اور کبھی بھی اسے اکیلا نہ چھوڑنے کا کہا تھا۔ جبریل نے ہمیشہ کی طرح سر ہلایا تھا۔ فرماں برداری سے۔ یہ ذمہ داری اسے پہلی بار نہیں سونپی گئی تھی ہمیشہ سونپی جاتی تھی۔ لان میں اکیلے کھیلتے ہوئے۔ کسی شاپنگ مال میں شاپنگ کے دوران ٹرام میں بیٹھے۔ گاڑی میں اکیلے بیٹھے جب سالار کبھی کسی سروس اسٹیشن یا کسی اور جگہ اکیلا انہیں لے کر جاتا اور کچھ منٹوں کے لیے اتر کر کچھ لینے جاتا تو جبریل خود بخود کمانڈ سنبھالنے کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔ اور عنایہ بھائی کی فرماں برداری کرتی رہتی تھی۔ ایک بار پھر جبریل کو ایک ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ ایک بار پھر اس نے ہمیشہ کی طرح ماں کو تسلی دی تھی۔

بھی کرنا پڑ سکتا تھا۔ وہ پرانی سوچ اور اقدار رکھنے والا باپ نہیں تھا۔ جس کے پاس غلطی کی گنجائش ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ لبرل تھا۔ اس کے باوجود وہ ہل گیا تھا کیونکہ اس کا بیٹا ابھی صرف دس سال کا تھا اور حافظ قرآن بن رہا تھا۔

"پتا نہیں۔" جبریل نے اس کی بات کا مختصر جواب دیتے ہوئے کمر کے پیچھے ہاتھ باندھ لیے۔ اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو باپ کی نظروں سے چھپانے کے لیے اس سے زیادہ اچھا طریقہ کوئی اور نہیں تھا۔ باپ یہ ظاہر نہیں کر رہا تھا کہ وہ اس پر شک کر رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس ڈیسک ٹاپ کو آن کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا تھا۔

"تم روز دیر سے سوتے ہو؟" سالار نے اگلا سوال کیا۔

"جی۔" جبریل نے اب جھوٹ نہیں بولا تھا۔

"روز نیند نہیں آتی اور ڈیسک ٹاپ پر کارڈز کھیلتے ہو؟" سالار نے اگلا سوال اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کیا تھا۔

"جی۔" اس نے جیسے بالکل ہی ہتھیار ڈال دیے تھے۔

ڈیسک ٹاپ آن ہو چکا تھا۔ سالار ہوم پیج کھول چکا تھا۔ مزید کوئی سوال کیے بغیر اس نے وزٹ کیے جانے والے پیجز اور سائٹس کی ہسٹری کھول لی تھی۔ وہاں گیمز کا نام شامل نہیں تھا مگر ایک سرسری نظر نے بھی سالار کو منجمد کر دیا تھا۔ اس کا بیٹا جو کچھ وزٹ کر رہا تھا وہ اسے اس سے چھپانے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔

oligodendroglioma ۔ وہ ایک سرسری نظر میں بھی ان سارے پیجز میں چمکنے والا یہ لفظ پہچان سکتا تھا۔ وہ ان میں سے کسی پیج کو کلک کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ اس نے گردن موڑ کر جبریل کو دیکھا جس کا سانس رکا ہوا اور رنگ فق تھا۔ "تم میری بیماری کے بارے میں جانتے ہو؟"

سوال کیے بغیر بھی وہ اس سوال کا جواب جانتا تھا۔ جبریل کی آنکھیں سیکنڈز کے ہزارویں حصے میں پانی سے بھری تھیں اور اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایک عجیب خاموشی کا وقفہ آیا تھا جس میں باپ اور بیٹا ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے پھر سالار نے اپنے اس دس سالہ بیٹے کو ہاتھ بڑھا کر اپنے گلے سے لگاتے ہوئے گود میں بٹھا لیا۔

جبریل کے آنسو گالوں پر بہنے لگے تھے۔ سالار نے اسے بچپن میں تو کبھی روتے دیکھا تھا لیکن اب بہت عرصے سے نہیں۔ وہ اسے پچھلے کچھ عرصے سے "بڑا" سمجھنے لگا تھا اور وہ بڑا اب چھوٹے بچوں کی طرح اس کی گود میں منہ چھپا کر رو رہا تھا۔ اتنے مہینوں سے وہ راز اس کی معصومیت کو گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ آج وہ افشا ہو گیا تھا۔

"بابا۔ بابا" وہ اس کے سینے سے لگا ہوا سسک رہا تھا۔

"I don't want you to die" (میں آپ کو مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا) اور یہی وہ لمحہ تھا جب سالار سکندر کے دل سے ہر خوف ختم ہو گیا تھا۔ اسے آپریشن کروانا تھا۔ فوری طور پر۔ وہ اپنے خاندان کو اس طرح موت اور زندگی کی امید کے درمیان لٹکا نہیں سکتا تھا۔ جو بھی ہونا تھا، ہو جانا چاہیے تھا۔

"او کے۔ I won't ۔" اس نے اپنے بیٹے کا سر چومتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

پر سرجری کے فوراً بعد وہاں سے لے گئے تھے۔

NYPD نے سی آئی اے سے رابطہ کیا تھا اور انہیں یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ ایباکا کو فوری طور پر واشنگٹن منتقل کر دیا گیا تھا اور وہ وہاں مر چکا تھا۔ سی آئی اے اب سر پیٹ رہی تھی کہ وہ میڈیا پر پیٹرس ایباکا کے ایک حادثے میں زخمی ہو کر ہاسپٹل جانے والی خبر کو کیسے درست ثابت کرتی۔

پیٹرس ایباکا کے ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہونے کی خبر میڈیا پر چلانا ان کی ایسی حکمت عملی تھی جو اب ان کے گلے کی ہڈی بن گئی تھی۔ طوفان یوٹیوب پر کیا مچا تھا طوفان تو وہ تھا جو سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز میں آیا تھا۔ ایک آسان ترین سمجھا جانے والا آپریشن سی آئی اے کے منہ پر ذلت اور بدنامی تھوپنے والا تھا۔ ساتھ امریکن گورنمنٹ اور ورلڈ بینک بھی پھنسنے والے تھے اور فی الحال سی این این کو اس مصیبت سے نجات تو ایک طرف اس پر قابو پانے کا بھی کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

کبھی کبھی انسان کو اس کی بے وقوفی نہیں اس کی ضرورت سے زیادہ چالاکی لے ڈوبتی ہے۔ سی آئی اے کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ ایک بے وقوفی کا شکار اپنے کرتے وہ اپنی ساکھ داؤ پر لگا بیٹھے تھے۔ انہوں نے پیٹرس کو نیویارک کے اسی ہاسپٹل میں چھوڑ دیا ہوتا تو ان کی بچت ہو جاتی۔ وہ دو افراد جو ورلڈ بینک کے ثابت کر دیے جاتے یا کوئی مجرم جو ایباکا کو مارنے کے لیے اس سے الجھے تھے۔ کچھ دن شور مچتا پھر بات کالے اور گورے کی روایتی لڑائی تک ہی محدود رہ جاتی تعصب کے خلاف کچھ اپیلوں، قراردادوں اور شمعیں روشن کرنے کے ساتھ ختم ہو جاتی۔ پیٹرس ایباکا کی کہانی بھی ختم ہو جاتا اور اس کے ساتھ اس کا مشن بھی۔ عزت سی آئی اے کی بھی رہتی اور نائک ورلڈ بینک کی بھی۔ لیکن اس آپریشن کے ماسٹر مائنڈ کو ہر چیز کو الجھا کر انجام تک پہنچانے کی خواہش تھی کہ کل کوئی اس کو سلجھانے کے لیے دھاگے کا سرا ڈھونڈتا ہی رہ جاتا لیکن مسئلہ یہ ہوا تھا کہ تھی الجھانے والے اسے الجھاتے خود اندر پھنس گئے تھے اور اب انہیں باہر نکلنا نہیں آرہا تھا۔

وہ اسے کسی حادثے کا زخمی دکھا کر اس سے جان چھڑانا چاہتے تھے اور یہ کام وہ واشنگٹن میں کرنا چاہتے تھے، جہاں سالار سکندر تھا اور اس دن واشنگٹن میں صرف ایک حادثہ ہوا تھا۔ جس کا ایک زخمی پیٹرس ایباکا کو ظاہر کر کے دونوں کا جوڑ ملایا گیا تھا۔ ہاسپٹل کی انتظامیہ کو ایباکا کے حوالے سے معلومات تھیں، بالکل نیویارک کے اس ہاسپٹل کی طرح جہاں ایباکا کو پہلی بار لے جایا گیا تھا۔

اس کی حالت پہلے ہی بگڑی ہی تھی اور سی آئی اے سرجری کے بعد ہاسپٹل سے اسے ٹھکانے پر لے جا کر بھی اس سے کوئی کام کی بات نہیں پوچھ سکی تھی۔ تو اب انہیں اس سے وہ آخری کام لینا تھا جس کے لیے اسے واشنگٹن پہنچایا گیا تھا اور جس سے جڑے جھوٹ بار بار حادثے کے زخمیوں اور مرنے والے کے نہ صرف نام چلائے گئے تھے بلکہ ان کی ہر صورت ساری تفصیل بھی سی آئی اے کو یقین تھا نیوز چینلز پر چلنے والی یہ خبر سالار سکندر کے علم میں ضرور آئے گی اور انہیں یہ بھی یقین تھا کہ جس طرح کی قربت ان دونوں کی حالیہ کچھ عرصے میں رہی تھی وہ متقاضی تھی کہ سالار اس سے ملنے ضرور جائے گا۔

اندازے درست ثابت ہوئے تھے۔ وہ خبر سالار نے دیکھ بھی لی تھی اور وہ فوری طور پر اس سے ملنے بھی چلا گیا تھا۔ اگر کسی طرح وہ خبر اس کے علم میں نہ آتی یا وہ اس سے ملنے نہ جاتا تب سی آئی اے والے ہاسپٹل کے ذریعے اس سے رابطہ کرتے اور کہتے کہ پیٹرس ایباکا کی آخری خواہش ہے کہ وہ سالار سکندر سے ملنا چاہتا ہے۔ لیکن انہیں پلان B کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ سالار ایباکا کو دیکھنے چلا گیا تھا اور ہاسپٹل میں آنے جانے میں اسے تقریباً دو گھنٹے لگے تھے اور سی آئی اے کو اتنا ہی وقت چاہیے تھا۔ اس کے کمرے سے لیپ ٹاپ سمیت ہر اس چیز کا صفایا کرنے کے لیے جسے وہ کام کی سمجھتے تھے سالار کو کسی اور کام کے لیے کمرے سے اتنی دیر تک باہر رکھنا تھا۔

دیکھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے سالار سے کہا۔

"یہ کیا ہے۔ میں اسے پڑھ اور سمجھ نہیں سکتی۔" اس نے کندھے اچکا کر سالار کو دیکھا جو اب اپنے گلاس کے نیچے کچھ نوٹ دباتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔

"میں نے تمہارے ڈرنکس کی ادائی کر دی ہے۔"

جیکی نے انگلی اور انگوٹھے میں دبے اس کارڈ کو سالار کو دکھایا اور دوبارہ کہا۔ "میں یہ پڑھ اور سمجھ نہیں سکتی۔"

"جنہوں نے آپ کو بھیجا ہے وہ پڑھ بھی لیں گے، سمجھ بھی لیں گے، سمجھا بھی دیں گے۔"

جیکی کو اس کے جملے پر کرنٹ لگا۔ اس کی قاتلانہ مسکراہٹ سب سے پہلے غائب ہوئی تھی۔

"ایکسکیوزمی۔" (معاف کیجیے) اس نے ایک بار پھر اپنی لاعلمی اور بے خبری ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"Excused" (معاف کیا) وہ مسکراتے اور کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز میں بیٹھے اس ہوٹل کے ایک کمرے کو مانیٹر کرتے اور خفیہ کیمرے اور مائیکروفون کی مدد سے گفتگو سنتے ان پانچ لوگوں کو ایک لمحے کے لیے جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ ان پانچ نے ایک وقت میں ایک دوسرے کو بے اختیار دیکھا۔ پھر ان سب نے بے اختیار اس شخص کو گالی دی تھی۔ وہ اس شخص کو پیش کیا جانے والا خراج تحسین تھا۔ وہ اس پھندے سے بچ کر نکلنے والے مردوں میں پہلا تھا۔

"اس کارڈ پر کیا لکھا ہے؟" سی آئی اے کی اسٹنگ ٹیم کے لیڈر نے آدھ گھنٹے بعد جیکی کے اس کمرے میں آنے سے پہلے وہاں بلوائے عربی مترجم سے پوچھا تھا۔

"اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔" اس مترجم نے وہ تحریر پڑھی۔

"مطلب؟"

"میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔" مترجم نے اس بار روانی سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔

ان سب لوگوں نے جیکی اور جیکی نے انہیں دیکھا پھر قاتلانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

"I am sure he wasn't referring to me"

(مجھے یقین ہے کہ یہ میرے بارے میں نہیں ہے۔)



آپریشن کے دوران وہ نیورو سرجن چند لمحوں کے لیے رکا تھا۔ ایک نرس نے بڑھ کے اس کے ماتھے پر ابھرنے والے پسینے کے چند قطروں کو ایک کپڑے سے خشک کیا۔ وہ شخص ایک بار پھر اپنے سامنے آپریشن تھیٹر کی ٹیبل پر کھلے پڑے اس دماغ پر جھکا جو دنیا کے ذہین ترین دماغوں میں سے ایک تھا اور جو ایک گولی کا نشانہ بننے کے بعد اس کے سامنے اس میز پر آیا تھا۔ دنیا کی اہم ترین پوزیشن پر فائز رہنے والے اس شخص کے لیے اسے ایمرجنسی میں بلوایا گیا تھا۔ وہ سرجن اب تک 270 اہم اور نازک ترین کامیاب سرجریز کرنے کے بعد اس وقت امریکہ کی تاریخ کا کم عمر اور سب سے قابل سرجن تھا۔ لیکن آج پہلی بار اسے لگ رہا تھا کہ اس کا ہنڈرڈ پرسنٹ کامیابی کا ریکارڈ ختم ہونے والا تھا۔ وہ ایک بار پھر گہری سانس لے کر ٹیبل سے ہٹا۔ اسے کسی چیز کی ضرورت پڑی تھی اس آپریشن میں کامیابی کے لیے۔۔۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

حاصل و محصول

نیویارک میں واقع امریکہ کے سب سے بڑے میڈیا ڈسٹرکٹ مڈ ٹاؤن مین ہٹن کے کولمبس سرکل میں واقع ٹائم وارنر سینٹر کی عمارت کے سامنے کھڑے پیٹرس ایباکا کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے چمک رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر میں اس عمارت کے اندر واقع سی این این کے اسٹوڈیوز میں امریکہ کے ممتاز ترین اخباری صحافیوں میں سے ایک اینڈرسن کوپر سے اس کے پروگرام 360 کے سلسلے میں ملاقات کرنے والا تھا۔

اینڈرسن کوپر دو ہفتے بعد کانگو میں بارانی جنگلات کے حوالے سے ایک پروگرام کرنے جا رہا تھا۔ اس نے انگلینڈ اور یورپ کے اخبارات میں پیٹرس ایباکا کے انٹرویوز اور پگمیز کی بقا کے لیے چلائی جانے والی اس کی مہم کے بارے میں بنیادی معلومات لینے کے بعد اپنی ٹیم کے ایک فرد کے ذریعے اس سے رابطہ کیا تھا۔ اور آج اسے کوپر کے ساتھ ایک خفیہ ملاقات کرنی تھی اور پیٹرس ایباکا خوشی سے بے قابو تھا۔ کانگو کے تاریک جنگلات میں بسنے والے پگمیز کی جدوجہد کی بازگشت بالآخر روشنیوں کے شہر تہذیب یافتہ دنیا کے اس جنگل میں سنی جا سکتی تھی۔ ایباکا کو اس کی توقع تھی پر یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ کام اتنی جلدی بھی ہو سکتا تھا۔ وہ واشنگٹن میں کئی دنوں سے کئی نیوز چینلز کے لوگوں سے مل رہا تھا اور امید و ناامیدی کے درمیان لٹکا پھر رہا تھا اور ان ہی نیوز چینلز پر مختلف حوالہ جات کے ذریعے رابطے کرتے کرتے اسے بغیر کسی حوالے کے اور اچانک — اینڈرسن کوپر کی طرف سے ملنے والی وہ کال غیر یقینی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نعمت غیر مترقبہ بھی تھی۔

کئی سالوں سے کی جانے والی اس کی وہ بے نام جدوجہد اگر سی این این پر کوپر کے پروگرام میں ہائی لائٹ ہوتی اور دنیا کے سامنے آتی تو اس کے بعد ایباکا کے لیے بہت ساری چیزیں آسان ہو جاتیں۔ اور اس کے لیے سب کچھ جتنا آسان ہو جاتا۔ ورلڈ بینک اور اس سے منسلک عالمی قوتوں کے لیے اس پروجیکٹ کو دنیا کی نظروں سے چھپائے اسی طرح چلائے جاتے رہنا اتنا ہی مشکل ہو جاتا۔ بین الاقوامی میڈیا کی کوریج اور اس کوریج کے نتیجے میں ہونے والی تنقید کا سامنا کرنا مشکل ہوتا۔ پروجیکٹ ختم ہونے کے خدشات تو جو پیدا ہوتے سو ہوتے لیکن ورلڈ بینک کے لیے افریقہ کے دوسرے ممالک میں اسی طرح کے نئے پروجیکٹس کے لیے اور تعاون مشکل سے مشکل ہو جاتا۔ وہ یہ جانتے تھے۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ دبائے رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے اور اس میں کامیاب بھی تھے۔ ایک ایسا جن بن گیا تھا اور کسی جن کو بوتل میں واپس قید کرنے سے زیادہ آسان اس کی جان لے لینا تھا۔

ایباکا کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اینڈرسن کوپر کی طرف سے ملنے والی اس کال نے اس کی زندگی اور موت کے حوالے سے بھی فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر یہ خبر بس تھوڑی سی ہوئی تھی اس کی نگرانی کرنے والے لوگوں سے۔ ایک سراسیمگی اور بدحواسی پھیلی تھی ان لوگوں میں جنہوں نے یہ طے کرنا تھا کہ اب اچانک سی این این کے منظر میں آجانے کے بعد وہ فوری طور پر ایباکا کا کیا کریں۔ تشویش اس بات پر بھی ہوئی تھی کہ اگر ایباکا اور پگمیز کے حوالے سے کوپر نے پروگرام کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو چینل کے اور کتنے ایسے صحافی تھے جو اس پروجیکٹ کے حوالے سے پروگرام کرنے کی تیاریوں میں تھے۔

ایباکا جن چھوٹے موٹے نیوز چینلز اور جرنلسٹس کو "بڑا" اور "طاقتور" سمجھ کر واشنگٹن میں ان کے ساتھ گھنٹوں گزار کر آتا رہا تھا۔ وہ سب پہلے ہی ایباکا کی نگرانی کرنے والے لوگوں کی فہرست میں شامل تھے۔ ان سے ایباکا کے حوالے سے پہلے ہی بات کر لی گئی تھی اور انہیں اس پروجیکٹ اور اس ایشو کی کوریج کے حوالے سے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی ہدایات بھی پہنچائی گئی تھیں کہ امریکی مفادات کے لیے اس پروجیکٹ کے حوالے سے کوئی منفی کوریج اور رپورٹ کس قدر نقصان دہ ہو سکتی تھی۔ اور ان چھوٹے چینلز اور نیوز جرنلسٹس کو تابع کرتا



1۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی پہیلی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے ناک آؤٹ مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آ جاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ یہ دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی ساتھ سالہ حسن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی۔ اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

بارہویں قسط

حاصل و محصول

کھڑکی سے سالار نے واشنگٹن میں ڈوبتے ہوئے سورج پر ایک آخری نظر ڈالی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی نارنجی شعاعیں جہاز کے دودھیا پروں کو بھی ایک روپہلا رنگ دے رہی تھیں۔ جہاز اب ہزاروں فٹ کی بلندی پر تھا۔ ہوا میں معلق۔۔۔ نہ آسمان پر نہ زمین پر اور یہی کیفیت سالار سکندر کی بھی تھی۔

واشنگٹن ایئرپورٹ سے اس چارٹرڈ طیارے نے کچھ دیر پہلے کنشاسا کے لیے ٹیک آف کیا تھا جہاز میں عملے کے افراد کے علاوہ صرف دو اور افراد تھے جو اس کا اسٹاف تھا۔ 37 سال کی عمر میں وہ ورلڈ بینک کا کم عمر ترین وائس پریذیڈنٹ تھا اور اس کی تعیناتی چار دن پہلے ہوئی تھی۔

ورلڈ بینک کے بورڈ آف گورنرز کے ایک ہنگامی اجلاس نے متفقہ طور پر اسے افریقہ کے لیے ورلڈ بینک کا نیا نائب صدر۔۔۔ نیا چہرہ۔۔۔ چنا تھا۔۔۔ یہ عہدہ ورلڈ بینک کی تاریخ میں پہلی بار کسی غیر افریقی کو دیا گیا تھا اور دینے کی وجوہات ساری دنیا کے سامنے تھیں۔۔۔ سالار کی زندگی میں وہ "صدیوں جیسے چند دن" نہ آئے ہوتے تو وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا۔ اپنے اس "حاصل" پر فخر کرتا۔ اسے کامیابی کی انتہا محسوس کرتا۔ آگے کے مقاصد نئے سرے سے طے کرتا۔ اپنی امنگوں کا دائرہ بڑھا دیتا۔ نئے مقاصد۔۔۔ ترقی کی بھوک اور بڑھتی۔۔۔ ناموری کی خواہش سرکنڈوں کی رفتار سے بڑھتی۔۔۔ اس کا طرز زندگی پہلے دن سے یہی رہا تھا۔ دنیا کے بہترین تعلیمی اداروں نے اسے یہی پڑھایا تھا۔ دنیا کی بہترین کمپنیز اور آرگنائزیشنز میں کام کرنے کے تجربے نے اسے یہی سکھایا تھا۔ آگے بڑھتے جانا کامیابی کی شاہراہ پر آگے بڑھتے جانا۔ ایک کامیابی کی اینٹ پر دوسری کامیابی کی اینٹ رکھنا۔ اس سے بڑی کامیابی کی اور زینہ بناتے جانا۔۔۔ آگے۔۔۔ اور آگے۔۔۔ اوپر۔۔۔ اوپر۔۔۔ سب سے اوپر۔۔۔ ترقی اور ترقی۔۔۔ اتنی ترقی کہ انسان صرف سی وی میں درج فتوحات اور کامیابیوں سے پہچانا جائے۔ کسی معمولی انسان کی طرح شناختی کارڈ میں لکھے نام ولدیت اور ایڈریس سے نہیں۔۔۔

وہ بھی ایسا ہی تھا۔ دین کی طرف رغبت رکھنے کے باوجود دنیا کی ہوس سے پیچھا نہ چھڑانے کی اہلیت رکھنے والا۔۔۔ وہ بھی ناموری چاہتا تھا۔۔۔ نہ ماننے کے باوجود بے پناہ عروج اور کامیابی کا کیڑا اس کے وجود کو بھی گھن کی طرح لگا ہوا تھا مگر اس کو بھی دکھا نہیں تھا کیوں کہ کیڑے نے اس کے وجود کو کھوکھلا کر کے ابھی اسے منہ کے بل گرایا نہیں تھا۔

اور ان چند دنوں نے زندگی میں پہلی بار سالار سکندر کو بیٹھ کر سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ وہ زندگی میں چاہتا کیا تھا۔ پہلے امامہ کی جس کا نہ ملنا اس کے وجود کو دیمک زدہ کیے رکھتا تھا۔ اس کو لگتا تھا وہ بے کلی، بے قراری صرف محبت کے نہ ملنے کی وجہ سے ہے۔ وہ خالی ہاتھ اور خالی دل تھا اس لیے تکلیف میں تھا لیکن اب کیا تھا جو زندگی میں بے سکونی کے اس پودے کو بنجر نہیں ہونے دے رہا تھا جو جانے نہیں کس مقام پر اس کے وجود کے اندر اگ آیا تھا۔

سب کچھ جو پاس تھا۔۔۔ خاک تھا۔ جو مٹھی میں تھا۔۔۔ ریت تھا۔ جو نظر میں تھا، فریب تھا۔۔۔ اور ان سب کے بیچوں بیچ وہ شخص۔۔۔ دنیا کے ذہین ترین انسانوں میں سے ایک۔۔۔ بہترین مذہب کی پیروی کرنے والا۔۔۔ آخری آسمانی کتاب کا حافظ۔ ترقی اور کامیابی کے مینار پر کھڑا خود کو ویسے ہی معلق محسوس کر رہا تھا جیسے وہ جہاز جس میں وہ اس وقت بیٹھا، وہاں جا رہا تھا جہاں سے مغربی دنیا کے تمام ممالک اپنے اپنے شہریوں کو نکال چکے تھے۔

چار دن پہلے اس رات اس ہوٹل کے کمرے میں امامہ کی کال نہیں آئی تھی۔ پھر اس کے بعد میسجز، کالز کا سیلاب آ گیا تھا۔ چند گھنٹوں میں اسی ہوٹل میں ایک ڈیلکس کمرے سے اسے رائل سوئٹ میں منتقل کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بہترین سیکورٹی دی گئی تھی۔ کیوں کہ اس کی "زندگی" کو "خطرہ" تھا۔

امریکا کا ہر چھوٹا بڑا چینل اس وقت یہی ایک خبر بریکنگ نیوز کے طور پر چلا رہا تھا کہ سالار سکندر کی زندگی خطرے میں تھی اور وہ غائب کیوں تھا؟ وہ اس ساری صورت حال کے بارے میں کوئی بیان کیوں نہیں دے رہا تھا؟ پیٹرس ایباکا کے بارے میں کیوں خاموش تھا؟ ورلڈ بینک کی اس رپورٹ اور پروجیکٹ کے بارے میں کیوں کچھ نہیں کہہ رہا تھا جو متنازعہ تھا؟

اور سالار سکندر چینلز پر چلنے والی ان بریکنگ نیوز اور الرٹس کے درمیان ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر میں ورلڈ بینک کے صدر سے ملاقات کے لیے تیاری کر رہا تھا جو ورلڈ بینک کے صدر کی درخواست پر ہو رہی تھی۔ وہ ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز سے ورلڈ بینک کے صدر سے ملاقات کی بھیک مانگتے "گدا" بن کر وہاں سے نکلا تھا اور اب اسی صدر کی منت بھری درخواست پر وہاں صدر کے ذاتی استعمال میں آنے والی کاروں میں سے ایک شوفر سمیت لیموزین میں بادشاہوں کی طرح سکیورٹی اور پروٹوکول کے ساتھ وہاں بلایا جا رہا تھا۔

وہ زندگی میں پہلی بار کسی لیموزین میں بیٹھا تھا۔ زندگی میں پہلی بار سکیورٹی اور پروٹوکول کے "لوازمات" چکھ رہا تھا مگر زندگی میں میں پہلی بار اسے اس شخص کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جو اس کے بیٹے کو پنجرے میں قید پرندہ کر رہی تھی بے بس۔ پھڑپھڑاتا۔ قید میں آزادی کے لیے بے قرار۔ آسمان کی کھلی فضا کو حسرت سے دیکھتا۔ دل تھا کہ لگتا تھا بند ہو کر ہی دم لے گا۔ سانس تھا کہ بند ہونے کے لیے مچلتا پھر رہا تھا اور وہ اسی کیفیت اور حالت میں ورلڈ بینک کے صدر سے ملنے جا رہا تھا جب کہ وہ وہاں کبھی دوبارہ تھوکنے کے لیے بھی نہیں آنا چاہتا تھا۔

ہیڈ کوارٹر کے باہر پریس موجود تھا اپنے مشین گنوں جیسے کیمروں اور مائیکس کے ساتھ۔ بجلی کی طرح فلیش لائٹس کے جھماکوں کی تیاری اور انتظامات کے ساتھ۔۔۔ انہیں اطلاع کس نے دی تھی؟ اس کے اس دن وہاں آنے کی؟

یہ سالار سکندر کے لیے کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔۔۔ وہ سرکس کا وہ جانور تھا جسے بینک اور سی آئی اے اب نچا کر تماشا لوٹنا چاہتے تھے اور سرکس کا جانور اس لیموزین سے فلیش لائٹس اور سوالوں کے نعروں کے درمیان اترتے ہوئے اپنی اگلی حکمت عملی ترتیب دے رہا تھا۔ اسے اگر ناچنا ہی تھا تو اپنی شرطوں پر۔ نچانا تھا تو شرائط کسی کی انگلی کی نہیں۔

وہ لیموزین سے اتر کر اپنے کھلے کوٹ کے بٹن بند کرتا فلیش لائٹس کے جھماکوں سے بچھ فاصلے پر ڈرائیو وے کے دونوں اطراف میں لگی ہوئی وارننگ ٹیپ کے پار کیمرہ مینوں اور جرنلسٹس کی بھیڑ کی طرف ایک نظر بھی ڈالے بغیر عملے کے ان افراد کی رہنمائی میں لمبے لمبے قدموں کے ساتھ اندر چلا گیا تھا۔ جنہوں نے کار سے اترنے پر اس کا استقبال کیا تھا۔

کچھ نئے لوگوں کے علاوہ بورڈ روم میں وہ سب لوگ موجود تھے جن سے وہ کچھ دن پہلے بھی ملا تھا۔ لیکن اب سب کچھ بدل چکا تھا۔ جیسے اس کا باطن ویسے ہی ان لوگوں کا ظاہر۔

اس کا استقبال بورڈ روم میں ایک ہیرو کے طور پر تالیاں بجا کر خیر مقدمی نعروں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ یوں جیسے وہ کوئی ہیرو تھا جو جنگ جیت کر کسی بادشاہ کے دربار میں اپنی خدمات کے بدلے میں کوئی بڑا اعزاز لینے آیا تھا۔ ان سب کے چہروں پر مسکراہٹیں اور نرمی تھی۔ آنکھوں میں ستائش اور ہونٹوں پر داد و تحسین۔ گرم جوشی سے مصافحے اور معانقے کرتے ہوئے سالار سکندر صرف یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ "کر" کے "کیا" آیا تھا جس کے لیے ایسا استقبال کیا گیا تھا۔ وہ ان ہی لوگوں کے ساتھ اس بیضوی شکل کی میز پر پریذیڈنٹ کی سیٹ کے دائیں جانب پہلی نشست پر بٹھایا گیا تھا جن کی گردن کا سریا اور لہجوں کی رعونت نے اس کی عزت نفس کی دھجیاں اڑائی تھیں۔

انسان کی سب سے بڑی خاصیت یہی ہے کہ وہ بھولتا نہیں ہے نہ برائی نہ اچھائی۔ نہ کم ظرفی نہ ایثار۔ نہ بے

مری نہ احسان۔۔۔ نہ عزت نہ ذلت۔ سالار سکندر بھی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ایک "انسان" تھا جو کچھ ہو چکا تھا وہ پتھر پر لکیر تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ پانی کی پھوار تھا۔

اس کی آمد کے ٹھیک پانچ منٹ بعد ورلڈ بینک کا صدر بورڈ روم میں آ گیا تھا۔ سالار سکندر بھی باقی سب کی طرح اس کے احترام اور استقبال کے لیے کھڑا ہوا تھا۔

"ورلڈ بینک کو آپ پر فخر ہے۔" اس کے ساتھ ہی استقبالی کلمات کی ادائی کے بعد صدر کے منہ سے نکلنے والے پہلے جملے کو سن کر سالار سکندر کا دل قہقہے مار کر ہنسنے کو چاہا تھا۔ اسے سکندر عثمان یاد آئے تھے۔ اس کے بچپن میں اسکول میں اس کے ٹیچرز سے ملتے ہوئے وہ اپنی اس پانچویں "خبیث اولاد" کی عزت انہیں الفاظ میں کرتے تھے کیوں کہ سائیکاٹرسٹ نے انہیں سختی سے سمجھایا تھا کہ ان کے ملامتی جملے ان کے اس غیر معمولی ذہین بیٹے کے دماغ اور نفسیات پر برے اثرات چھوڑ سکتے ہیں اور اپنی اس پانچویں اولاد کے کارناموں پر جلنے کڑھنے کے باوجود سکندر عثمان اسے آئی لو یو بھی کہتے تھے اور آئی ایم سو پراؤڈ آف یو (مجھے تم پر فخر ہے) بھی۔

ورلڈ بینک کا صدر سالار سکندر کا باپ نہیں تھا۔ امریکن تھا اور اس وقت اگر بینک کے صدر کو اپنے عہدے کے لالے پڑے ہوئے تھے تو امریکا کو افریقہ میں اپنے مفادات اور اس ساکھ کے جس اچھی ساکھ کا اسے وہم تھا۔ سالار سکندر انہیں اس وقت وہ مسیحا لگ رہا تھا جو "سب کچھ" کر سکتا تھا۔ کم از کم افریقہ میں۔۔ قدرت نے بیٹھے بٹھائے اس کے ہاتھ میں Midas touch دے دیا تھا کہ وہ وہاں جس چیز کو چھوتا وہ سونا ہو جاتی اور انہیں اس وقت سالار سکندر کی زندگی چاہیے تھی۔ اس کی زندگی اس کی موت نہیں۔۔۔ اس کا ساتھ۔۔۔ اس کی مخالفت نہیں۔

پریذیڈنٹ کے جملے پر بورڈ روم کے لوگوں نے تالیاں بجائی تھیں یوں جیسے وہ پریذیڈنٹ کی طرف کی تائید کر رہے ہوں۔ سالار نے شکریہ ادا کیا تھا اور پریذیڈنٹ کے سیٹ سنبھالنے کے بعد سب لوگوں کی طرح اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

پریذیڈنٹ نے کانگو کی صورت حال سے گفتگو کا آغاز کیا تھا اور وہاں ورلڈ بینک کے ملازمین پر ہونے والے حملوں میں زخمی اور مارے جانے والے لوگوں کے لیے ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی تھی اور اس کے بعد پیٹرس ایباکا کو شان دار خراج عقیدت پیش کیا تھا چند جملوں میں اور پھر وہ سالار سکندر کی رپورٹ پر آ گیا تھا جو بینک کے بورڈ آف گورنرز نے "پڑھ" لی تھی۔ نہ صرف "پڑھ" لی تھی بلکہ اس رپورٹ کی تمام سفارشات کو مانتے ہوئے ایک انکوائری کمیشن تشکیل دے دیا گیا تھا جو اس پروجیکٹ کو وقتی طور پر معطل کرتے ہوئے نئے سرے سے اس کا جائزہ لے گا۔

سالار سکندر نہ حیران ہوا تھا نہ متاثر۔ اسے اندازہ تھا ورلڈ بینک اس سے کم میں کانگو میں دوبارہ داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ انہیں وہ پروجیکٹ اب ان حالات میں ختم کرنا ہی تھا اور اگر وہ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ بورڈ آف گورنرز نے وہ رپورٹ "اب" پڑھی تھی اور اس کو فوری طور پر متفقہ طور پر منظور کر لیا تھا تو ان کے پاس اس کے علاوہ اور چارہ ہی نہیں تھا۔ یہ نقصان کو کنٹرول کرنے کے لیے اختیار کی جانے والی سی آئی اے کی حکمت عملی کا پہلا حصہ تھا۔ یہ پنڈورا باکس ان کی وجہ سے کھلا تھا اب اس کو انہیں ہی بند کرنا تھا۔ وہ۔ جس جارحیت کو بہترین حکمت عملی مان کر چلے تھے ناکام ہو گئی تھی تو انہیں اب بیک فٹ پر جا کر دفاعی حکمت عملی اختیار کرنی پڑ رہی تھی۔

سالار سکندر خاموشی سے پریذیڈنٹ کی گفتگو سنتا رہا تھا۔ اس نے اپنی گفتگو کے اختتام پر سالار سکندر کو دی جانے والی نئی ذمہ داریوں کا اعلان کیا تھا۔ بورڈ روم میں بجتی ہوئی تالیوں میں وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ اپنی بے وقعت خدمات کے صلے میں ملنے والے اہم ترین عہدہ کی قدر و قیمت اندازہ لگا رہا تھا۔

اس کی پریزنٹیشن جو اس نے کچھ دن پہلے اسی بورڈ روم میں پیش کرنے سے بھی کئی ماہ پہلے ورلڈ بینک کو بھیجی

تھی اور جس پر اسے خاموشی سے رپورٹ واپس لینے یا عہدہ چھوڑ دینے کی دھمکی دی گئی تھی۔ اب بورڈ روم میں دوبارہ چلائی جا رہی تھی اور بورڈ روم میں بیٹھا ہوا ہر شخص اس رپورٹ میں پیش کیے جانے والے حقائق اور سلائیڈز کو دیکھ کر یوں حیران و مضطرب نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے وہ زندگی میں پہلی بار اس رپورٹ سے اور اس رپورٹ کے اندر پیش کیے جانے والے حقائق سے متعارف ہو رہا ہو۔ اگر وہ ایکٹرز تھے تو کسی تھرڈ کلاس تھیٹر کمپنی کے اور اگر منافق تھے تو اعلا معیار کے۔

سالار کو وہاں بیٹھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دنیا کے طاقت ور ترین مالیاتی ادارے کے ہیڈ کوارٹر میں نہیں کسی گھٹیا تھیٹر میں چلنے والے مزاحیہ ڈرامے کے سامنے بیٹھا ہے۔ جس میں ہر ایکٹر اوور ایکٹنگ کر رہا تھا اور مشین میں ریکارڈ قہقہے اور تالیاں ہر ہر جملے اور ایکسپریشن پر بج کر اسے ناظرین میں ثبت کرنے پر تلے تھے۔

"میں صدر اور بورڈ میں موجود تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے یہاں آنے کا موقع دیا۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ اس رپورٹ کو بنیاد بناتے ہوئے اس میں پیش کی جانے والی تمام سفارشات کو مان لیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے اس قدم کے اٹھانے سے ورلڈ بینک کو ایک بار پھر کانگو میں اپنی ساکھ بحال کرنے میں مدد ملے گی۔"

میٹنگ پر سالار سکندر کو بات کرنے کے لیے کہا گیا تھا اور اس نے بہت مختصر بات کی تھی۔ ٹو دا پوائنٹ' فارمل۔۔۔ پروفیشنل۔۔۔ جذباتیت کے بغیر۔ اور اسی دو ٹوک انداز میں۔ جس کے لیے وہ مشہور تھا۔

"میں شکر گزار ہوں کہ ورلڈ بینک اور بورڈ آف گورنرز نے مجھے نائب صدر کے لیے منتخب کیا لیکن میں اپنی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے یہ عہدہ نہیں سنبھال پاؤں گا۔ مجھے یقین ہے ورلڈ بینک کی ٹیم میں اس عہدے کے لیے مجھ سے زیادہ موزوں لوگ موجود ہیں۔"

صدر نے اس کے آخری جملوں پر بے چینی سے اپنی نشست پر پہلو بدلا۔ اسے توقع تھی اور صرف "ہاں" نہیں "نہیں" کی توقع تھی کہ سالار سکندر کا جواب اس آفر پر کیا آئے گا لیکن اس کے باوجود اسے بے چینی ہوئی تھی۔ اس وقت انہیں اپنی ساکھ بچانا تھی اور یہ کام اس وقت سالار ہی کر سکتا تھا۔

وہ میٹنگ اس کے بعد دو تین منٹ کے اندر ختم ہو گئی اور اس کے بعد سالار ورلڈ بینک کے صدر سے اکیلے میں ملا تھا۔ یہاں کا ماحول الگ تھا جو باتیں ہوئی تھیں وہ بھی کچھ اور تھیں۔

"مجھے اپنے گھر سے چوری ہونے والی تمام چیزیں چاہئیں۔ لیپ ٹاپ۔ اوریجنل ڈاکومنٹس۔۔۔ میرے باقی ڈاکومنٹس۔"

سالار سکندر نے اس کمرے میں میٹنگ کے شروع میں ہی ایجنڈا سیٹ کیا تھا اب اس کا کچھ بھی داؤ پر نہیں لگا تھا اور وہ باتیں منوانے ہی آیا تھا۔

"آپ کے گھر سے چوری ہو جانے والی چیزوں سے ورلڈ بینک کا کیا تعلق۔"

صدر نے انجان بننے کی پہلی اور آخری کوشش کی تھی۔ سالار نے بات کاٹ دی تھی۔

"اگر میری چیزیں نہیں مل سکتیں تو پھر مجھے کسی بھی ایشو پر بات کرنے کے لیے یہاں نہیں بیٹھنا۔"

صدر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا پھر اس نے لہجہ نرم رکھتے ہوئے اسے جیسے پچکارا۔

"میں ہدایات جاری کرتا ہوں کہ فوری طور پر آپ کے نقصان کی تلافی کی جائے اور آپ کے ڈاکومنٹس کا متبادل۔"

سالار نے اسی اکھڑپن سے اس کی بات کاٹی تھی۔ "مجھے اپنی چیزیں چاہئیں۔۔۔ نہ نقصان کی تلافی چاہیے نہ کوئی متبادل۔۔۔ مجھے اپنے اوریجنل ڈاکومنٹس چاہئیں۔"

خاموشی کے ایک لمبے وقفے کے بعد صدر نے ہتھیار ڈالے اور کہا۔

"ٹھیک ہے مل جائیں گے۔ لیکن ورلڈ بینک اور امریکا کو کانگو میں آپ کی ضرورت ہے۔" ایک شرط اس نے منوائی تھی ایک شرط انہوں نے رکھ دی تھی۔

"میں کسی کی کٹھ پتلی بن کر کانگو میں وہاں کے انسانوں کا استعمال نہیں کر سکتا نہ کروں گا۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"آپ کانگو میں جا کر وہ کریں جو آپ کرنا چاہتے ہیں۔" صدر نے کہا۔

"میں بندھے ہاتھوں کے ساتھ کہیں کچھ نہیں کر سکتا۔"

"نائب صدر کے طور پر آپ کو لامحدود پاور دیے جائیں گے اور فوری طور پر مطلع بھی کر دیا جائے گا آپ اس پروجیکٹ کو روکنا چاہتے ہیں یا وہاں چلنے والے کسی بھی پروجیکٹ کو۔ آپ کو ہیڈ کوارٹر کی منظوری کی ضرورت نہیں۔ آپ کو اختیار دیا جائے گا کہ آپ یہ فیصلہ خود کر سکیں گے۔"

چند لمحوں تک سالار بول نہیں سکا۔ یہ چال تھا تو کیا تھا سمجھا نہ تھا تو اچھا۔ وہ ماتھے پر بلوں کے ساتھ ہونٹ کاٹتا میز کے دوسری طرف بیٹھے اس شخص کو دیکھتا رہا جس کی کرسی کسی بھی وقت جانے والی تھی اور یہ اندازہ صرف صدر ہی کو نہیں سب کو تھا مگر وہ ایک باعزت راستہ چاہتا تھا۔ لاتیں کھا کر جانے کے بجائے باتوں کے ذریعے جانا چاہتا تھا۔

"جتنے اختیارات آپ مجھے دے کر کانگو میں بھیجنا چاہتے ہیں، اتنے اختیارات آپ کسی کو بھی دے کر کانگو بھیج دیں وہ صورت حال سنبھال لے گا۔" سالار نے کچھ لمحے خاموشی کے بعد کہا۔

"ایشو اختیارات کا نہیں ہے نیت کا ہے۔ جو تم افریقہ میں کرنا چاہتے ہو، کوئی دوسرا نہیں کرنا چاہے گا۔" سالار اس شخص کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"کچھ وقت لو۔ سوچو۔ پھر فیصلہ کرو۔" اسے قید کر کے آزاد کیا گیا تھا۔

اس نے واپسی پر بھی میڈیا سے بات نہیں کی۔ الجھن تھی کہ اور بڑھ رہی تھی۔ گھٹن تھی کہ سوا ہوئی تھی۔ واپسی کا راستہ بھی اس لیموزین کے کانٹوں پر طے ہوا تھا۔

ہوٹل میں واپس آتے ہی اس نے کمرے میں ٹی وی پر نہ صرف ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹر جاتے اپنی فوٹیج دیکھی تھی بلکہ نیوز چینلز پر اپنی تعیناتی کی بریکنگ نیوز بھی دیکھی تھی۔ "وہ" اس کے لیے "انکار" مشکل سے مشکل تر بنا رہے تھے۔ جال کی ڈوریاں کستے جا رہے تھے۔ اس کا سیل فون منٹوں میں مبارک باد کے پیغامات اور کالز سے بجنے لگا تھا۔

پہلے اس فون کا نہ بجنا قیامت تھا اور اب بجے چلے جانا عذاب اور اس سب کے بیچوں بیچ اس نے امامہ کو کال کی تھی یہ جاننے کے باوجود کہ یہ خبر اس تک بھی پہنچ گئی ہوگی۔ اس کا ردعمل کیا ہو سکتا تھا؟! اسے یاد تھا اس نے امامہ کے ساتھ پہلے عمرے کے بعد اس سے وعدہ کیا تھا وہ بینک کی ملازمت چھوڑ دے گا نوکری اس کے لیے مسئلہ نہیں تھی۔ وہ نوکری کبھی بھی کہیں بھی حاصل کر سکتا تھا مگر اس سے پہلے اس نے کبھی یہ غور نہیں کیا تھا کہ وہ جن جگہوں پر کام کرتا رہا تھا۔ وہ بلاواسطہ یا بالواسطہ "سود" سے منسلک رہے تھے۔ بڑے بڑے مالیاتی ادارے، آرگنائزیشن وہ سب جو دنیا کی اکنامک پلس چلاتے تھے۔ وہ سود کے خون سے ہی چلاتے تھے۔ فلاحی کام ہو یا سماجی ذمہ داری۔ پر خیرات کا رستہ بھی وہیں سے نکلتا تھا اور سالار سکندر اس سب کا حصہ تھا۔ اس بین الاقوامی مالیاتی نظام کا ایک پرزہ تھا جو سود کے پیسے سے چل رہا تھا۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا اسے "احکامات" کا علم نہیں تھا۔ وہ یہ اعتراف کرتا تھا اسے تمام "حدود" کا پتا تھا اور وہ "حدود" توڑنے کا گناہ گار چلا آ رہا تھا۔ زندگی میں بہت دفعہ رزق ہمیں مجبور کر دیتا ہے کہ ہم کھانے والے پیٹ کا سوچیں کمانے والے ہاتھ کا نہیں۔ سالار کو رزق کی مجبوری

نہیں تھی مگر کامیابی کی بھوک ضرور تھی۔۔ احساس کیے بغیر۔

امامہ نے پہلی دفعہ بڑی ڈھٹائی سے اس شیشے کے گھر کو توڑا تھا جو اس نے اپنے گرد بنایا تھا۔ اسے وہ عکس دیکھنے پر مجبور کیا تھا جسے وہ اپنا نہیں مانتا تھا۔ وہ اعتراف نہیں کرتا تھا لیکن شرمسار ہوا تھا۔ پریشان بھی۔ لیکن پھر اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ اس کا بینک کے ساتھ کانٹریکٹ ختم ہو رہا تھا اور وہ اسے دوبارہ رینیو نہیں کرے گا۔

امریکا جا کر اس نے پی ایچ ڈی کے ساتھ جس مالیاتی ادارے میں جز وقتی اکاؤنٹسٹ کی نوکری کی تھی۔ وہ کوئی انویسٹمنٹ بینک نہیں تھا لیکن کہیں نہ کہیں وہ بھی سود کے کاروبار سے مبرا نہیں تھا لیکن سالار اپنے آپ کو یہ تسلی دلاتا تھا کہ وہ وہاں ایک اکاؤنٹسٹ کے طور پر کام کر رہا ہے۔ وہ ادارہ اس سے سود سے منسلک کوئی کام نہیں لے رہا مگر ضمیر کہیں نہ کہیں ایک سوئی اسے چبھوتا رہتا تھا۔ اس کی تنخواہ وہیں سے آتی تھی جہاں سود کا منافع آتا تھا۔

ورلڈ بینک کو جوائن کرنے کے فیصلے سے امامہ خوش نہیں تھی اس کا اعتراض وہی تھا اور وہیں تھا۔

"تم بے شک ورلڈ بینک کے پروجیکٹس سے منسلک ہو رہے ہو لیکن ورلڈ بینک کرتا تو سود کا کاروبار ہی ہے نا۔ چھوٹے بینک افراد کا استحصال کرتے ہیں ورلڈ بینک قوموں کا۔ تم مجھے بتاؤ فرق کیا ہوا۔؟ آسان قرضہ۔ سستا قرضہ۔ لونگ ٹرم قرضہ۔ شارٹ ٹرم قرضہ۔ آسان شرائط کا قرضہ۔ کوئی ایسا قرضہ ہے ورلڈ بینک کے پاس جس پر وہ سود نہ لیتا ہو۔" اس نے سالار کے ساتھ بحث کی تھی۔

جبریل ابھی ایک سال کا تھا۔ سالار کو لگا تھا زندگی یک دم پرسکون ہونے لگی ہے۔ ایک خوش حال خاندان۔ زندگی کا وہ فیز جو وسیم اور سعد کی حادثاتی موت کے بعد امامہ کے ڈپریشن اور پاکستان چلے جانے کے ساتھ شروع ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ ہی سہی لیکن ختم ہوتا چلا گیا تھا اور تب جو موقع سالار کو ورلڈ بینک کی صورت میں ملا تھا وہ اس کے تجربے اور عمر کے حساب سے بہت شاندار تھا۔ وہ امامہ کے اعتراضات پر بے حد ناراض ہوا تھا۔

"اگر ہم اسی طرح ایک ایک چیز میں میخ نکالتے رہیں گے تو پھر اس معاشرے اور سسٹم میں تو کہیں بھی کام نہیں کر سکیں گے کیوں کہ یہ تو پورا معاشرہ سود پر کھڑا ہے اور وہ ہمارے لیے اپنے سسٹم کو نہیں بدلیں گے۔" اس نے امامہ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"پھر تو ہمیں حلال کھانے کی کوشش بھی ترک کر دینی چاہیے۔ پھر تم سپر اسٹور میں ڈبوں پر ان کے اجزا کیوں چیک کرتے رہتے ہو۔ ہمیں یہ سمجھ کر کھا لینا چاہیے یہ سب یہ سمجھ کہ یہ ہمارا نہیں ان کا معاشرہ ہے اور وہ اپنے سپر اسٹور میں وہ چیزیں رکھیں گے جو انہیں پسند ہیں۔"

امامہ نے چند لمحوں کے لیے اسے لاجواب کر دیا تھا۔ وہ بحث جاری رکھنے کے بجائے وہاں سے اٹھ گیا تھا لیکن امامہ کے ناخوش ہونے کے باوجود اس نے ورلڈ بینک جوائن کر لیا تھا اور ورلڈ بینک جوائن کرنے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ اس نے اپنا اگریمنٹ اور جاب پروفائل کے کاغذات امامہ کو زبردستی پڑھ پڑھ کر سنائے تھے۔ اس نے سب کچھ سننے کے بعد ان پیپرز کو واپس لفافے میں ڈال کر اسے دیتے ہوئے کہا تھا۔

"تم سود کے پیسے سے انسانیت کی خدمت اور بہتری کے خواب دیکھ رہے ہو اور تمہیں لگتا ہے کہ اس میں فلاح ہے۔ نہیں ہے۔ سود کا ثمر انسانوں کی زندگی بدل سکتا ہے مگر تباہی میں۔۔ بہتری میں نہیں۔"

اس کی سوئی جہاں اٹکی تھی وہیں اٹکی رہی تھی۔۔ امامہ ضدی تھی، سالار کو اس کا اندازہ تھا۔ وہ خود بھی ضدی تھا لیکن ان کی ضد کبھی ایک دوسرے کے مقابل نہیں آئی تھی۔ کہیں نہ کہیں ان میں سے کوئی نہ کوئی دوسرے کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا تھا۔ وہ پوائنٹ آف نو ریٹرن پر کبھی نہیں گئے تھے۔ اس ایک ایشو پر بھی اس سے شدید نظریاتی اختلاف رکھنے کے باوجود امامہ نے ہر بار روزگار کے سلسلے میں اس کے انتخاب کو بہ امر مجبوری قبول تو

کیا تھا لیکن اس نے کبھی اس روزگار کے بارے میں زبان بندی نہیں کی تھی اور اس کی یہ برملا تنقید سالار کو خفا بھی کرتی تھی اور کمزور بھی۔

اس دن بھی امامہ کو فون کرتے ہوئے اسے احساس تھا کہ وہ اس سے کیا سننے جا رہا ہے لیکن خلاف توقع امامہ نے اس کے نئے عہدے کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ اس سے جبریل اور عنایہ کی باتیں کرتی رہی۔ حمین کے بارے میں بتاتی رہی۔ یہاں تک کہ سالار کا احساس جرم حد سے گزر گیا۔ وہ جیسے چاہتا تھا کہ وہ اسے ملامت کرے۔ کوئی تو مبارک باد دینے کے بجائے اس کے ضمیر کو چوکے لگائے۔

"تمہیں پتا ہے ورلڈ بینک نے مجھے وائس پریذیڈنٹ۔۔۔"

امامہ نے اس کو بات مکمل نہیں کرنے دی۔ "ہاں۔" اس نے یک حرفی جواب دیا۔

"تو؟" سالار کو اس یک حرفی جواب سے تسلی نہیں ہوئی۔

"تو کیا؟" امامہ نے مدھم آواز میں پوچھا۔

"تو تم کچھ نہیں کہو گی؟" اس نے جان بوجھ کر یہ نہیں کہا تھا کہ تمہارا کیا خیال ہے۔

"نہیں۔" ایک اور یک حرفی جواب آیا۔

"کیوں؟" وہ بے قرار ہوا۔

"تم ہر فیصلہ اپنی مرضی سے کرتے ہو۔۔۔ پھر رائے دینے کا فائدہ۔"

سالار ایک لمحہ کے لیے خاموش ہوا پھر اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"میں نے ابھی آفر قبول نہیں کی۔"

"کر لو گے۔۔۔ میں جانتی ہوں۔" جواب نے اس کے چودہ طبق روشن کیے اور ساتھ اسے ہنسایا بھی۔

"اس میں ہنسنے والی تو کوئی بات نہیں تھی۔" امامہ کو اس کی یہ ہنسی اچھی لگی تھی پھر بھی اس نے کہا۔

"میں جب بھی تمہاری بات نہیں مانتا' نقصان اٹھاتا ہوں۔"

سالار نے اس لمحے عجیب اعتراف کیا۔ وہ جیسے اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس نے ورلڈ بینک جوائن کرنے کے حوالے سے اس کی بات نہ مان کر غلط فیصلہ کیا تھا لیکن وہ فی الحال اسے اتنے کھلے لفظوں میں یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس بار وہ ہنس پڑی تھی۔

"بڑی خوشی ہوئی یہ بات سن کر۔۔۔ لیکن میں یہ تو نہ سمجھوں ناکہ تم آئندہ ہمیشہ میری بات مانا کرو گے؟" اس نے سالار پر چوٹ کی۔

"بالکل" جواب ترانخ سے آیا۔

اس بار دونوں ہنس پڑے پھر سالار نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس سے کہا۔

"یہی وہ بات تھی جو کانگو سے آتے ہوئے میں تم سے کہنا چاہتا تھا۔"

امامہ کو یاد آیا اسے ایک اعتراف کرنا تھا' واپس آ کر۔

"اوہ۔۔۔ میں نے سوچا' پتا نہیں کیا کہنا چاہتے تھے تم۔" وہ دھیرے سے ہنسی' پھر اس نے کہا۔

"ایسا کیا ہوا ہے کہ تم یہ بات کہہ رہے ہو مجھ سے یا تب کہنا چاہ رہے تھے۔"

وہ یقیناً "بے وقوف" نہیں تھی۔ سالار کی سمجھ میں نہیں آیا اس بات کا کیا جواب دے۔ جواب دے بھی یا نہیں۔ جو پچھتاوا پیٹرس ایباکا سے ملاقات اور اس پروجیکٹ کے بارے میں ان حقائق کو جان کر شروع ہوا تھا وہ امریکہ میں پہنچ کر احساس جرم میں تبدیل ہو جائے گا اسے اندازہ نہیں تھا۔

"تم مجھ سے شیئر نہیں کرنا چاہتے؟" امامہ نے اس کی خاموشی کو پہلی کی طرح پوچھا۔

"ابھی نہیں..." اس نے جواب دیا۔
"یہاں کب آؤ گے؟" امامہ نے بات بدل دی تھی۔
"ابھی فلائٹس بند ہیں کنشاسا کے لیے۔ ایئرپورٹ عارضی طور پر بھی فنکشنل نہیں ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ جاؤں لیکن تم پریشان تو نہیں ہو نا؟" سالار نے اس سے پوچھا۔
"اب نہیں ہوں اور تم بھی پریشان مت ہونا۔ ہم سب محفوظ ہیں اور مجھے اور حمین کو علاج کی تمام سہولیات مل رہی ہیں۔"
امامہ نے اس کے لہجے میں نمودار ہوتی ہوئی تشویش کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ وہ خود سرجری اور حمین کے پری میچور ہونے کی وجہ سے سفر نہیں کر سکتی تھی کم از کم ایک ماہ تک۔ ورنہ سالار خود وہاں جانے کے بجائے اسے وہاں سے نکلوانے کی کوشش کرتا۔
سالار نے بہت مطمئن ہو کر کچھ دیر جبریل اور عنایہ سے بات چیت کی اور اس کے بعد کال ختم کر کے وہ اس لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوا اور ان ڈاکومنٹس کی طرف جو ابھی کچھ دیر پہلے ایک سربمہر لفافے میں ایک شخص اس کے کمرے میں اسے دے گیا تھا۔ سب کچھ بالکل محفوظ حالت میں تھا۔ کوئی چیز ڈیلیٹ یا غائب یا بدلی نہیں گئی تھی۔ اس کے باوجود سالار کو اپنے ان باکس میں جاتے ہی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی اس سے پہلے بھی وہاں تھا یا شاید اس وقت بھی وہ مانیٹر ہو رہا ہو گا کیونکہ اس کے ان باکس میں موجود سات گھنٹے پہلے تک آنے والی ہر ای میل کھولے اور پڑھے جانے کی نشاندہی کر رہی تھی۔
وہ اپنے فون سے اپنے ان باکس کو access نہیں کر پا رہا تھا ورنہ شاید یہ بات اسے پہلے ہی پتا چل جاتی۔ شاید ورلڈ بینک کے صدر کے ساتھ ملاقات میں اس نے ان چیزوں کی واپسی کا مطالبہ نہ کیا ہوتا تو اس کا ہیکڈ ای میل ایڈریس بھی دوبارہ اس کے لیے accesible نہ ہوتا۔
اسے اب غصہ نہیں آ رہا تھا نہ ہی بے بسی کی کسی کیفیت کو اس نے اس وقت محسوس کیا تھا۔ جو چالیں اسے چت چکی تھیں وہ اس کا اپنا انتخاب تھیں۔ ان باکس میں موجود ای میلز پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ایک ای میل پر ایک لمحہ کے لیے جیسے اس کا دل لمحہ بھر کے لیے رکا تھا۔ وہ پیٹرس ایباکا کی طرف سے میڈیا سینٹر کے باہر سے اسے بھیجا جانے والا آخری پیغام تھا جو بہت لمبا ہو جانے کی وجہ سے ایباکا نے ٹیکسٹ کرتے کرتے اسے ای میل کر دیا تھا۔ بوجھل دل کے ساتھ اس نے اس ای میل کو کھول لیا۔
"تمہیں پتا ہے میں اس وقت کہاں کھڑا ہوں؟ ٹائم وارنر سینٹر۔ اور کس لیے؟ میں ابھی کچھ دیر پہلے اینڈرسن کوپر کے ساتھ تھا سی این این اسٹوڈیو میں ہے۔ اس کے شو میں شرکت سے پہلے ابتدائی بات چیت کے ایک سیشن کے لیے۔ مجھے پتا ہے اس وقت تم کہو گے "او مائی گاڈ!
"Man You did it" (یہ تم نے کیا ہے!)
"Yes i did it"۔ (جی جناب)
سالار نے ایک لمحہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کئی راتوں سے سو نہیں پایا تھا۔ آنکھوں میں جلن تھی لیکن جس چیز نے اس وقت اس کی آنکھوں کو دھندلایا تھا وہ مسکراہٹیں تھیں۔ ایباکا کے جملے کے اختتام پر جس میں وہ فخریہ انداز میں مسکرایا اور بیٹ اچھال کر آنکھیں گھما رہا تھا۔
"اینڈرسن کوپر سے ملنے کے بعد میں نے سب سے پہلا مسیج تمہیں کیا ہے۔ کیونکہ میں یہاں تک کبھی نہ پہنچ پاتا اگر مجھے تمہاری صورت میں ورلڈ بینک کی بے ضمیر دنیا میں ضمیر کی جھلک نہ دکھائی دیتی۔ میں نے کبھی تمہیں یہ نہیں بتایا کہ جب میں پہلی بار تم سے ملا تھا تو میں اس جنگ میں ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔

ناامیدی اور مایوسی کے علاوہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہو رہا تھا اور میں بہت کمزور تھا۔

میں ان دیووں کے سامنے واقعی ایک پگمیز (بونا) تھا جو میرے ملک کو لوٹنے آئے تھے اور میں کچھ کر نہیں پا رہا تھا اپنے لوگوں کے لیے۔ اور پھر میں تم سے ملا اور مجھے لگا مجھے ابھی ہتھیار نہیں ڈالنے چاہئیں۔ ابھی امید تھی۔ تمہاری صورت میں۔ اور میں ٹھیک تھا۔ میں نے امید نہیں چھوڑی جنگ جاری رکھی اور میری امید مجھے یہاں تک لے آئی کہ اب چند دنوں میں پوری دنیا کانگو کے بارے میں بات کرے گی۔ ہم چھوٹے کالے بدصورت۔ معمولی انسانوں کے بارے میں۔ جو دنیا میں صرف مفتوح اور غلام بننے نہیں آئے۔ میں نے آج کوپر کو تمہارے بارے میں بھی بتایا۔ وہ تم سے بھی بات کریں گے۔ مجھے یقین ہے اب کانگو کی تاریخ بدلنے والی ہے۔ میرے لوگ اب ایک اچھی زندگی جئیں گے۔ "انسانوں" جیسی زندگی "جانوروں" جیسی نہیں۔ تم جب واشنگٹن پہنچ جاؤ تو مجھے انفارم کرنا۔ ہم دونوں کو ملنا ہے۔ کافی دن ہو گئے۔ اسٹاربکس کی کافی ہے۔ اس بار بل میں پے کروں گا۔" ای میل کا اختتام ایک اور مسکراہٹ سے ہوا تھا۔ ایک آنکھ مارتی شرارتی مسکراہٹ سے۔

سالار سکندر کسی بت کی طرح ان جملوں کو بار بار پڑھتا رہا۔ بار بار۔ ہر بار آخری جملے تک پہنچتے پہنچتے اسے لگتا تھا وہ گزشتہ سارے جملے بھول چکا ہے۔ اس نے درجنوں بار اس رات اس ای میل کو پڑھا تھا۔ پیٹرس ایباکا باتونی تھا۔ بلا کا باتونی۔ بات شروع کرتا تو بس شروع ہی ہو جاتا تھا۔ پتا نہیں کن کن کتابوں اور مصنفین اور فلاسفرز کے حوالے دیتا تھا۔ سالار سکندر اس کی گفتگو سے محظوظ ہوتا تھا اور کبھی کبھار تنگ بھی۔

آج اس ای میل میں ایباکا نے کسی کتاب، کسی مصنف، کسی فلاسفر کا قول نہیں دہرایا تھا۔ اس نے صرف وہ کہا تھا جو اس کی اپنی سوچ اپنے احساسات تھے۔ ہمیشہ کی طرح جذباتیت سے لتھڑے ہوئے۔ اس نے اس امید کی بات کی تھی جو وہ کھو رہا تھا اور جو ایباکا کو وہاں تک لے آئی تھی۔ کبھی کبھار زبان سے الفاظ نہیں الہامی باتیں نکلتی ہیں۔ اس ای میل میں ایباکا نے بھی ایسی ہی ایک بات کی تھی جو حرف بہ حرف ٹھیک تھی۔ کانگو کی تاریخ بدل رہی تھی اور اس تاریخ کو ایباکا نے اپنے خون سے بدلا تھا۔

سالار نے اس ای میل کو بند کر دیا تھا۔ اس میں ایباکا نے کوئی اہم بات شیئر کی ہوتی تو اس کے ان باکس سے وہ ای میل غائب ہو چکی ہوتی۔ لیکن اس ای میل نے اس کے دل کے بوجھ کو اور بڑھا دیا تھا۔ وہ جس ترازو کے دو پلڑوں میں جھول رہا تھا اس کا عدم توازن اور بڑھ گیا تھا۔

وہ اس ساری رات مصلے پر بیٹھا گڑگڑاتا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ سے آزمائش میں آسانی کی بھیک۔ سیدھے راستے کی بھیک۔ جس راستے سے وہ ایک بار پھر سے بھٹک گیا تھا اور ان لوگوں میں شامل نہ کرنے کی بھیک جن پر اللہ کا عذاب آتا تھا۔ کہیں نہ کہیں اسے خوف بھی تھا کہ وہ اللہ کے عذاب کو دعوت دے رہا تھا اور اگر اولاد اور بیوی اور مال کی آزمائش جان لیوا تھی تو جان لیوا یہ احساس بھی تھا۔

فجر کے وقت اسے ڈاکٹر سبط علی کا خیال آیا تھا۔ اور خیال نہیں آیا تھا۔ وہ جیسے دیوانہ وار ان کی طرف لپکا تھا۔ وہ ایمرجنسی میں ٹکٹ حاصل کر کے اگلی رات ہی پاکستان دوڑا چلا آیا تھا۔

ڈاکٹر سبط علی اسے ہمیشہ کی طرح ملے تھے گرم جوشی سے۔ لیکن حیرانی سے۔ وہ کئی سالوں کے بعد اس طرح اچانک ان کے پاس بھاگتا آیا تھا۔ انہوں نے اس سے باری باری سب کی خیریت دریافت کی۔

"امامہ ٹھیک ہے؟"

"جی۔" وہ ہمیشہ کی طرح اس دن بھی ان کی اسٹڈی میں اکیلا ان کے پاس بیٹھا تھا۔ سر جھکائے۔

"جبریل کیسا ہے؟" انہوں نے اگلا سوال کیا۔

"وہ بھی ٹھیک ہے۔"

"عنایہ؟" "وہ بھی۔"

"اور حمین؟"

"وہ بھی۔" وہ سر جھکائے ایک ایک کے بارے میں بتاتا گیا۔ ڈاکٹر سبط علی الحمدللہ کہتے رہے' پھر ایک لمبی خاموشی کے بعد انہوں نے اس سے مدھم آواز میں پوچھا۔

"اور تم؟"

"نہیں میں ٹھیک نہیں ہوں۔" اس بار سالار سکندر نے سر اٹھایا تھا اور پھر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ وہ دم بخود اسے دیکھتے رہے۔ وہ پہلی بار ایسے ٹوٹ کر رویا تھا۔

"مجھ سے ایک گناہ ہو گیا ہے ڈاکٹر صاحب!" اس نے روتے ہوئے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے رگڑتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر صاحب نے کچھ نہیں کہا وہ صرف اسے دیکھتے رہے تھے چند لمحوں بعد انہوں نے کہا۔

"مجھے مت بتانا۔" سالار نے حیران ہو کر ان کا چہرہ دیکھا۔

"آپ کو بتانے کے لیے ہی آیا ہوں یہاں۔"

"میں تمہارا گناہ جان کر کیا کروں گا؟ اب روک سکتا نہیں تمہیں۔ پچھتاوا دیکھ چکا ہوں۔ بہتر ہے اپنے اور اللہ کے درمیان ہی رکھو اسے۔ جو پردہ ہے' اسے پڑا رہنے دو۔ اللہ غفور الرحیم ہے۔ معاف کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور معاف کرتا ہے اپنے بندوں کو۔" انہوں نے ہمیشہ کی طرح تحمل سے اسے سمجھایا تھا۔

"میں بتاؤں گا نہیں تو میری گمراہی ختم نہیں ہو گی۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ میں کتنی تاریکی میں کھڑا ہوں۔ اندھیرا ہے کہ بڑھتا ہی جا رہا ہے اور مجھے اس تاریکی سے خوف آنے لگا ہے۔"

ڈاکٹر سبط علی نے اسے اس بے چارگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کے پاس وہ جب بھی آتا تھا کسی مشکل میں ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے اسے ایسی حالت میں اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"میں نے سود والا رزق چن کر اللہ کی حد توڑی ہے اور مجھ پر ایک کے بعد ایک پریشانی آ رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیا کروں۔"

وہ ایک بار پھر رونے لگا تھا۔ وہ اعتراف جو ضمیر کرتا رہتا تھا وہ آج پہلی بار کسی دوسرے انسان کے سامنے اپنی زبان سے کر رہا تھا۔

"توبہ کر لو اور وہ رزق چھوڑ دو۔" انہوں نے بلا توقف بڑی سہولت سے کہا۔

"توبہ آسان ہے مگر دلدل سے نکلنا آسان نہیں ہے میرے لیے۔" انہوں نے سالار کی بات کے جواب میں کہا۔

"آسان تو کچھ بھی نہیں ہوتا دنیا میں۔ لیکن ممکن بنا لیا جاتا ہے۔"

"میں 37 سال کا ہوں۔ اپنی عمر کے دس سال میں نے دنیا کے بہترین مالیاتی اداروں میں کام کیا ہے۔ سارا رزق سود سے کمایا ہے' وہ بھی جو میں نے اپنی ذات پر خرچ کیا وہ بھی' جو میں نے دوسروں پر خرچ کیا۔ جس رزق سے میں اپنی اولاد اور بیوی کی کفالت کر رہا ہوں۔ وہ بھی سود ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں اب کیا کروں؟"

ڈاکٹر سبط علی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اتنے سالوں بعد آپ کو اب یہ احساس کیوں ہوا کہ آپ کا رزق حلال

نہیں حرام ہے؟
ان کا لہجہ اسے پہلی بار عجیب محسوس ہوا تھا۔
"کیونکہ مجھے سکون نہیں ہے۔ زندگی میں کچھ نہ کچھ غلط ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے شاید میرا رزق میری آزمائشوں کی وجہ ہے۔"
وہ بے بس انداز میں کہہ رہا تھا۔
"آپ کو یاد ہے، جب آپ میرے پاس امامہ کی بیماری کے دنوں میں آئے تھے اور کہتے تھے کہ آپ کے گھر میں بے سکونی کیوں ہے۔ امامہ آپ سے محبت کیوں نہیں کرتی۔ آپ نے اس کے لیے دنیا کی ہر نعمت کا انبار لگا دیا ہے۔ اس پر احسانوں کی حد کر دی ہے۔ پھر بھی وہ آپ سے التفات کیوں نہیں رکھتی۔ بے رخی کیوں برتتی ہے؟ ناشکری کیوں ہے؟ احسان کو کیوں نہیں مانتی؟"
وہ ڈاکٹر سبط علی کا چہرہ دیکھنے لگا۔
"میں نے آپ سے کہا تھا، یہ سب اس کی وجہ سے نہیں ہو رہا، آپ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس بے سکونی کی جڑ آپ کے رزق میں ہے۔ وہ رزق وہاں سے آتا رہے گا۔ آپ کی زندگی ایسی ہی رہے گی۔ تب آپ یہ کہہ کر چلے گئے تھے کہ میں اب تو بینک میں کام نہیں کرتا۔ اب تو کسی اور ادارے میں بھی اور حیثیت میں کام کرتا ہوں اور آپ نے یہ بھی کہا کہ میں ہمیشہ کی طرح امامہ کی حمایت کر رہا ہوں اس کی کسی غلطی کو تسلیم نہیں کروں گا۔ ہر بات کا قصوروار آپ ہی کو قرار دوں گا۔"
وہ اسی طرح دھیمے انداز میں کہہ رہے تھے۔
"آپ نے تب بھی سوال کیا تھا اور جواب کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ میں نے آپ سے بحث نہیں کی تھی کیونکہ آپ بہت پریشانی میں تھے اس وقت۔۔۔ میں آپ کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن جو جواب میں نے تب آپ کو دیا تھا، آج بھی وہی دے رہا ہوں اور مجھے خوشی ہے آج آپ سوال کرنے میرے پاس نہیں آئے، حل ڈھونڈنے آئے ہیں۔"
وہ مسکرائے اور چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئے، پھر انہوں نے دوبارہ بات شروع کی۔
"آپ جس کاروبار سے منسلک رہے وہ کروڑوں لوگوں کے گھروں اور زندگیوں میں بے سکونی اور تباہی لاتا ہے، پھر یہ کیسے ہو سکتا کہ وہ بے سکونی اور بے برکتی آپ کے دروازے پر دستک دیئے نہ آتی۔ اللہ اپنی حدوں کو توڑنے والوں کو پسند نہیں کرتا، وہ مسلمان ہوں یا کافر۔"
سالار نے نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں ٹوک دیا۔
"ڈاکٹر صاحب! مجھے اب امامہ سے کوئی شکایت نہیں ہے، وہ میری زندگی میں پریشانی اور بے سکونی کا باعث نہیں رہی۔۔۔ مجھے گھر کی طرف سے سکون ہے۔"
اس بار ڈاکٹر صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔
"کیونکہ امامہ کے لیے آپ کے التفات کا وہ عالم نہیں رہا جو اس وقت تھا جب امامہ آپ کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ تب اللہ نے آپ کو اس کی بے التفاتی اور بے رخی کے ذریعے بے سکونی دی کیونکہ اس سے زیادہ تکلیف آپ کو کوئی اور چیز نہیں پہنچا سکتی تھی۔ آج اللہ آپ کو اس چیز سے سب سے زیادہ تکلیف پہنچا رہا ہے، جو آج آپ کے لیے سب سے اہم ہے۔"
وہ گنگ رہ گیا تھا۔ بات درست تھی۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ کی طرح اس کے عیبوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں اس کے دل میں چھپے چور کو عیاں کرتے جا رہے تھے۔

"آپ نے وقتی طور پر بینک کی نوکری چھوڑی' بلاواسطہ سود کے کاروبار سے منسلک ہونے کی بجائے کچھ عرصہ کے بعد بالواسطہ سود کے کاروبار سے منسلک ہو گئے۔ سالار سکندر مجھ سے زیادہ اچھی طرح آپ کو پتا ہے کہ حل کیا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اس حل کی طرف جانے پر آپ کا دل آمادہ نہیں ہے اور کبھی ہو گا بھی نہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ ٹھیک ہے لیکن میری سمجھ میں واقعی نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں۔"

اس نے ڈاکٹر صاحب کی ہر بات کو تسلیم کیا تھا۔ "میں نے پچھلے سال امریکہ میں ایک گھر mortgage کیا ہے۔ اس سال امامہ کی سالگرہ پر میں اس کو وہ گھر دینا چاہتا تھا۔ پانچ بیڈ روم کا گھر ہے۔ پرائیویٹ بیچ کے ساتھ۔ ساحل سمندر پہ۔ بہت مہنگا۔ مجھے اگلے کئی سال اس کا mortgage ادا کرتے رہنا ہے۔ اب میرے تین بچے ہیں۔ ایک اسکول جا رہا ہے' دو چند سالوں میں اسکول جانے لگیں گے۔ مجھے ان کو بہترین اسکولز میں پڑھانا ہے۔ بہترین تعلیم دلوانی ہے' بہترین یونیورسٹیز میں بھجوانا ہے بالکل اسی طرح جیسے میرے باپ نے کیا اور اس سب کے لیے مجھے پیسہ چاہیے۔ مجھے ایک پر آسائش زندگی کی عادت رہی ہے۔ میں ان آسائشات کے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ ساری آسائشات اور لائف اسٹائل پیسہ مانگتا ہے اور میں اگر حلال اور حرام کی سود کی بنیاد پر تفریق اور تمیز کرنے بیٹھوں گا تو پھر میں ان میں سے کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔ جہاں مجھے ترقی اور کامیابی نظر آتی ہے وہاں سود بھی ہے اور جہاں سود نہیں ہے وہاں ترقی کی وہ رفتار بھی نہیں ہے' جس پر میں سفر کرتا رہا ہوں۔ اب آپ مجھے بتائیں میں کیا کروں۔ میں کسی چھوٹی موٹی کمپنی میں کسی چھوٹے موٹے عہدے پر کام کر کے تھوڑا بہت پیسہ بنا کر جی سکتا ہوں لیکن اس سے میں خوش نہیں رہ سکتا۔ وہ آرگنائزیشنز جن میں مجھے اسپارک اور اسکوپ نظر آتا ہے' جو مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے' وہاں کسی نہ کسی شکل میں سود کی آمیزش ہے۔ حرام اور حلال کا فرق نہیں ہے۔ میں کیا کروں؟ یا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی یونیورسٹی میں فنانس اور اکنامکس پڑھا کر زندگی گزار لوں یا کسی کمپنی کا فنانشل آفیسر بن کر زندگی گزاروں۔"

وہ جیسے پھٹ پڑا تھا۔ وہ ساری کنفیوژن جو ذہن میں تھی اب زبان پر آ رہی تھی اور زبان پر آ کر جیسے اس کے اعصاب کو سکون دینے لگی تھی۔

"آپ میرے رزق کو میرے ہر مسئلے کی وجہ قرار دے رہے ہیں۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں بھی اس رزق سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بھی سود سے نفرت ہے لیکن کوئی متبادل راستہ بھی نہیں ہے میرے پاس۔" وہ اب پھر سے رنجیدہ ہو رہا تھا۔

"میں متبادل راستہ بھی بنانا چاہتا ہوں لیکن اس میں بھی وقت لگے گا۔ تب تک میں کیا کروں۔ میں آج ورلڈ بینک کو چھوڑتا ہوں تو چند مہینوں میں قصہ پارینہ ہو جاؤں گا۔ کانگو میں جو ہو رہا ہے۔ ہوتا رہے گا۔ یہ پروجیکٹ آج بند ہوا ہے۔ کل پھر چل پڑے گا۔"

ڈاکٹر صاحب نے بڑے تحمل سے اس کی بات کاٹتے ہوئے اس سے کہا۔

"سالار! آپ پہلے یہ فیصلہ کریں کہ وہ کیا چیز ہے جو آپ کے لیے زیادہ پریشان کن ہے۔ آپ کی اپنی زندگی۔ یا دوسروں کی زندگی۔

ہم دوسروں کی زندگی کو صرف اپنی زندگی پر ترجیح تو نہیں دے سکتے' دو ہی چوائسز ہوں تو ہم صرف اپنی ہی زندگی کو ترجیح دیں گے۔" ڈاکٹر سبط علی نے جیسے اسے آئینہ دکھایا تھا۔

"میرا ذہن اور زندگی اس وقت کسی دوراہے پر نہیں چوراہے پر آ کر کھڑی ہو گئی ہے۔ دو راستے ہوں تو انسان پھر بھی فیصلہ کر لیتا ہے۔ سو راستوں کا کیا کرے؟" وہ عجیب بے بسی سے ہنسا تھا۔

"آپ مسیحا نہیں ہیں۔ نہ ہی اللہ نے آپ کو مسیحا بننے کے لیے پیدا کیا ہے۔ آپ کو اللہ نے ایک اچھا انسان اور مسلمان بننے کے لیے پیدا کیا ہے۔ پہلے وہ فرائض پورے کریں جو اللہ کی طرف سے اور ان لوگوں کی طرف سے آپ پر عائد ہوتے ہیں جو آپ کی ذمہ داری ہیں' پھر ان لوگوں کی ذمہ داری کندھوں پر اٹھانے کی کوشش کریں جن کے بارے میں آپ سے کبھی ڈائریکٹ سوال نہیں کیا جائے گا۔"

وہ اس کے دماغ کی گرہوں کو کھولنے لگے تھے۔

"زندگی میں ہم اچھے اور برے فیصلے کرتے ہیں اور ہم ان کی قیمت چکاتے ہیں' آپ اپنے بچوں کے سنہری مستقبل' آسائشوں اور ایک mortgaged گھر کی ملکیت حاصل کرنے کے لیے سود کھاتے رہنا چاہتے ہیں تو قیمت بھی آپ ہی چکائیں گے۔ آپ کسی متبادل راستے کی تلاش میں مہلت چاہتے ہیں تو بھی اختیار اور انتخاب آپ ہی کے ہاتھ میں رہے گا لیکن کبھی کبھار ہم بہتر راستے اور مناسب وقت کی تلاش میں اپنی زندگی کی مہلت استعمال کر بیٹھتے ہیں۔" وہ ان کی باتیں ویسے ہی دم بخود سن رہا تھا جیسے ہمیشہ سنتا آیا تھا۔

"پہلے آپ اپنے گھر کے اندر نا اتفاقی اور بے سکونی سے آزمائے گئے۔ اب آپ اپنے کیریئر میں مشکلات سے آزمائے جا رہے ہیں۔ میری دعا صرف یہ ہے کہ اگلی آزمائش اس سے بڑی نہ ہو۔"

جو گرہیں کھل رہی تھیں ڈاکٹر سبط علی نے انہیں جیسے کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ سالار اندر سے ہل رہا تھا۔

"آپ نے مجھ سے یہ سب تب کیوں نہیں کہا جب میں آپ کے پاس آنا شروع ہوا تھا اور میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں بینک میں کام کرتا ہوں۔ آپ کو پتا تھا کہ سود کے کاروبار سے منسلک ہوں' پھر تب آپ نے مجھ سے کیوں یہ ساری باتیں نہیں کہیں۔ اس طرح خبردار نہیں کیا۔ کبھی بھی ٹوکا نہیں۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے شکایت کرنے لگا۔

"میں وہ مبلغ نہیں ہوں سالار! جو ہر شخص کو آتے ہی کٹہرے میں کھڑا کر دیتا ہے۔ یہ اللہ کی دنیا ہے اور اگر اللہ کی دنیا میں اللہ انسان کو اس کی بے عملی کے باوجود خود کھوجنے' خود سیکھنے کا موقع دیتا رہتا ہے تو میں کیسے آپ کو سرزنش کرنا شروع کر دیتا۔ آپ جس رب کے ماننے والے ہیں اس کی کتاب کو زبانی یاد کرنے اور دہراتے چلے آنے کے باوجود اس میں دیے گئے احکامات سے روگردانی کر رہے ہیں۔ آپ جس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار ہیں اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور احکامات پر عمل کرنے کو تیار نہیں۔ آپ جس عورت کے عشق میں گرفتار رہیں اس کے اصرار پر بھی اس رزق کو چھوڑ نہیں پا رہے۔ تو ڈاکٹر سبط علی آپ کو کیسے بدل دیتا' کیسے روک دیتا۔"

وہ پانی پانی ہوا تھا اور وہ ناہی گیا تھا۔

"میں آپ کو منع کرتا۔ ڈراتا۔ آپ میرے پاس آنا ہی چھوڑ دیتے۔ میں نے سوچا' آتے رہیں گے' بدل جائیں گے۔

مبارک باد

ملیحہ صدیقی کے آنگن میں پہلا پھول کھلا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے نوازا ہے۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے دلی مبارک باد اور دعائیں۔

اللہ تعالیٰ ملیحہ کے آنگن کی اس کلی کو لمبی عمر صحت اور خوشیاں عطا فرمائے۔ (آمین)

آپ کو یاد ہے جب میں نے ــــ آپ سے پہلی ملاقات میں اپنی کچھ کتابیں آپ کو دی تھیں کہ ان کا مطالعہ کیجیے گا وہ اپنے علم کی دھاک بٹھانے کے لیے نہیں کیا تھا۔ آپ کو یہی جتانا چاہ رہا تھا۔ کہ آپ جس اقتصادی اور مالیاتی سسٹم کے ساتھ منسلک تھے وہ غیر اسلامی تھا۔ جائز اور حلال نہیں تھا۔ سود پر کھڑا کیا گیا تھا۔ اور میں نہیں مانتا ان کتابوں کے مطالعے کے دوران یہ خیال آپ کے ذہن میں نہ آیا ہو کہ آپ کا رزق سود سے آلودہ ہو رہا ہے۔ میں نہیں مانتا میرے پاس اتنی باقاعدگی سے لیکچرز کے لیے آتے رہنے کے باوجود آپ نے کبھی ان لیکچرز میں سود یا ربا کے حوالے سے کوئی ممانعت کوئی درس نہ سنا ہو اور آپ کو یہ خیال نہ آیا ہو کہ جس کی ممانعت اور مذمت کی جا رہی ہے وہ وہی رزق ہے جو آپ بھی کما رہے تھے۔"

وہ ان کی باتوں کے جواب میں بولنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا وہ ٹھیک کہہ رہے تھے اس نے کئی بار ڈاکٹر سبط علی کو سود کے حوالے سے بات کرتے سنا تھا۔ وہ فوٹوگرافک میموری رکھتا تھا۔ آج بھی ہر وہ سوال دہرا سکتا تھا۔ ان کے جواب کے ساتھ جو کسی نے ڈاکٹر سبط علی سے اس حوالے سے پوچھا تھا۔ اسے یاد تھا جب اس نے پہلی بار ڈاکٹر سبط علی کو سود کے حوالے سے بات کرتے ہوئے سنا تھا تو وہ بہت خفیف ہوا تھا صرف وہی نہیں وہاں پر موجود وہ سارے افراد جو بنکس یا انویسٹمنٹ کمپنیز سے منسلک تھے۔

کسی نے ڈاکٹر صاحب سے یہ سوال کیا تھا کہ "آخر ربا یا سود میں ایسی خرابی کیا ہے کہ قرآن پاک اس کو حرام اور کاروبار کے منافع کو حلال کرتا ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے تب یہ جواب دیا تھا۔

"سود اسلام کی بنیاد کے خلاف ہے ہمارا دین جن کچھ بنیادوں پر کھڑا ہے اس میں سے ایک انسانی ہمدردی اور مدد کا اصول ہے۔ اگر مسلمان ایک دوسرے کے بھائی اور مددگار ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ضرورت کے لیے اپنے مسلمان بھائی کو دی جانے والی رقم کو منافع کے ساتھ مشروط کردے۔ ہمارا دین اللہ تعالیٰ کی برتری کے علاوہ دنیا میں کسی اور سے وابستگی عقیدت اور پرستش کے خلاف ہے۔ روپیہ صرف دنیاوی زندگی کو چلانے کا ذریعہ ہے اس روپے کو ہم اگر اپنا مقصد حیات بنا کر سرمایہ داری کے اصول اپنالیں گے تو ہم اس انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے سے ہٹا کر دولت کو اس مرتبے پر فائز کریں گے۔

اگر قرآن میں اللہ فرماتا ہے کہ سود کا کاروبار کرنے والا اللہ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کر رہا ہے۔ تو دولت کا بت بنا کر انسانوں کی ضرورتوں اور مجبوریوں کو استعمال کرتے ہوئے ان کا استحصال کرنا دنیا میں اللہ کے اس نظام کو چیلنج کرنے کے برابر ہی ہے۔ جس میں اللہ انسان کو ایک دوسرے کی فی سبیل اللہ مدد کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اگر اللہ کو ایک ماننے والا اور نبی کریم کو آخری پیغمبر ماننے والا بھی صرف خدا خوفی اور خدا ترسی کے لیے ایک دوسرے مسلمان کو منافع لیے بغیر کچھ دینے پر تیار نہیں تو مسلمان اور کافر میں فرق کیا ہے۔ کافر دولت کے حصول اور اس کی بڑھوتری کے لیے بہت سارے خدا پوجتا ہے۔ مسلمان تو اللہ کی عبادت صرف اللہ کی خوشنودی اور اخروی زندگی کے لیے کرتا ہے وہ تو رزق میں کشادگی اور نعمتوں کے عطا کیے جانے کو اللہ کی عبادت کے ساتھ مشروط نہیں کرتا۔"

اسے ڈاکٹر سبط علی کی ایک ایک بات یاد تھی کیونکہ ان کے الفاظ کئی راتوں تک اس کے لیے بازگشت بنے رہے تھے۔

"جب انسان کا ایمان اللہ کی ذات پر کمزور ہوتا ہے اور اس میں توکل نہیں ہوتا تو پھر اس کا اعتقاد دنیاوی چیزوں میں بڑھ جاتا ہے۔ روپے میں۔ مال و زر میں۔ بچتوں اور جمع پونجیوں میں۔ وہ اللہ کی ذات کو باہر رکھ کر بیٹھ جاتا ہے اپنا مستقبل پلان کرنے۔ اتنا پیسہ جوڑوں گا تو اس سال یہ لوں گا۔ کسی رشتہ دار یا ضرورت مند کی مدد کر دوں گا تو پھر قرض واپس نہ ملنے پر اتنا پیسہ ڈوب جائے گا۔ اتنے سال میں گھر بنا لینا چاہیے۔ کون سے سال کون

سی گاڑی ہونی چاہیے۔۔۔ بچوں کو پڑھانے کے لیے بھی پائی پائی جوڑنی ہو گی۔۔۔ بیٹیوں کی شادی کے لیے بھی پیسہ ہاتھ میں ہونا چاہیے۔۔۔ بیماری کا علاج بھی پیسے سے ہوتا ہے۔۔۔ ان ساری چیزوں کے بارے میں سوچتے سوچتے انسان کو پتا ہی نہیں چلتا وہ کب اللہ کی ذات کو پیچھے کرتے روپے کو آگے لے آتا ہے۔

روپے سے ایسا رشتہ جوڑ بیٹھتا ہے کہ اس سے علیحدگی کا تصور بھی نہیں کر پاتا۔۔۔ اس کی افزائش اور بڑھوتری پر خوشی سے پاگل ہوا جاتا ہے۔ اس سے اثاثے بنا لینے پر اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی اور مستقبل کو محفوظ سمجھتا ہے۔۔۔ یہ اس پیسے کی حرص کا شیطانی اثر ہے۔ جس سے انسان کو لگتا ہے دنیا کا سسٹم چلتا ہے۔۔۔ حالانکہ دنیا کا نظام تو اللہ چلاتا ہے۔۔۔ وہ لمحہ بھر میں سالوں کی جمع پونجیاں خاک کر دے۔۔۔ اللہ کو نظر انداز کر کے حرام کے ذریعے بنائے جانے والے اثاثوں کو انہیں کے ہاتھوں تباہ و برباد کر دے۔۔۔ پھر انسان کیا کرے گا۔۔۔؟"

وہ سارے جواب اسے آج بھی یاد تھے جنہوں نے اسے تب بے چین کیا تھا لیکن قائل نہیں۔ وہ مغربی تہذیب اور تعلیم جس میں اس نے ساری عمر پرورش پائی تھی وہ ترقی کو انسان کی منزل قرار دیتی ہے اور اس منزل کے حصول کے لیے قانونی اور غیر قانونی کی تفریق تو کرتی تھی۔۔۔ حرام اور حلال کی نہیں۔۔۔ وہ مغربی معاشرہ جو سود کے ستونوں پر کھڑا اسی کا بیج بو رہا تھا اسی کا پھل کھا رہا تھا وہ "منافع" کے اس طریقے کو جائز قرار دیتا تھا جو اخلاقیات اور انسانیت کے بنیادی اصولوں کی تذلیل اور تضحیک کر کے کھڑا کیا گیا تھا۔

"مغربی مالیاتی نظام یہود نے قائم کیا تھا اور دنیا کی معیشت کو اس مالیاتی نظام نے آکٹوپس کی طرح جکڑا ہوا ہے۔ دنیا میں مالیاتی نظام کے وہ بانی تھے اور اس کو مؤثر ترین بنانے میں قابل رشک حد تک کامیاب۔۔۔ وہ سود جو بنی اسرائیل کے زوال اور اس پر آنے والے بار بار کے عذاب کی وجہ بنتا رہا تھا وہ آج بھی نہ صرف اس سے چپکے ہوئے ہیں بلکہ اس کو مسلمان قوم کے اندر تک اس طرح پھیلا چکے ہیں کہ اب یہ سودی نظام دنیا میں کسی بھی خطے میں بسنے والے مسلمان کے خون اور خمیر میں رچنے بسنے لگا ہے۔۔۔ وہ اس کو صحیح اور جائز قرار دینے کے لیے توجیہات دینے لگے ہیں اور یہ وہ امت محمدی تھی جن کے لیے قبلہ بدلا گیا تھا اور جنہیں بنی اسرائیل سے امامت لے کر دی گئی تھی۔"

ڈاکٹر سبط علی کی وہ سب باتیں اس کے ذہن پر تب کنکریاں برساتی تھیں تو آج ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔

"تم کیا سوچ رہے ہو سالار؟" وہ اس کی اتنی لمبی خاموشی سے پریشان ہوئے تھے۔ انہیں لگا شاید انہوں نے کوئی زیادہ سخت بات کہہ دی تھی اسے۔

"میں کیا سوچوں گا اب۔۔۔ میرے ہاتھ اتنے لتھڑے ہوئے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آرہا اب اس سب سے نکلوں کیسے؟۔۔۔ کیا کروں؟" اس نے جیسے اپنی مشکل ڈاکٹر صاحب کے سامنے رکھ دی۔

"آپ اللہ سے دعا کریں وہ راستہ نکالے آپ کے لیے۔۔۔ اور وہ راستہ ہو جو دوسروں کی زندگی سنوار دے۔"

وہ ان کی بات نہیں سمجھ پایا لیکن اس نے آمین کہا تھا۔

"نہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرنے کی جسارت کرنے والوں میں سے ہونا چاہتا ہوں نہ میں اللہ کی حدود توڑنے والوں میں سے۔۔۔ اگر اس پورے سسٹم کا حصہ بنا رہا تھا تو صرف اس لیے کہ میری خواہش تھی کہ کبھی میں کوئی ایسا سسٹم بنا سکوں جو سود پر مبنی نہ ہو اور پھر بھی قابل عمل ہو اور منافع بخش بھی۔۔۔ غلطی صرف یہ کی کہ یہ خواہش رکھتے ہوئے بھی کوشش کبھی نہیں کی۔۔۔ ضروریات زندگی اور خواہشات کا ایک ڈھیر میرے راستے میں آ گیا جس نے میری ترجیحات کو بدل دیا۔۔۔ لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ دوبارہ آپ کے پاس سود کے حوالے سے کوئی سوال کبھی نہیں لے کر آؤں گا۔۔۔ حل لے کر آؤں گا۔" ڈاکٹر صاحب اس کی بات پر مسکرا دیے تھے۔

"میں تمہارے لیے دعا کروں گا۔ میں اپنی زندگی کے آخری حصے میں ہوں اور اپنی ساری زندگی بے حد خواہش رکھنے کے باوجود اس سسٹم کو تبدیل کرنے کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ بس کتابیں لکھ سکا۔ تجاویز دے سکا۔ لوگوں کو خبردار کرتا رہا۔ لیکن عملی طور پر کچھ نہیں کر سکا۔ میں نہ تمہارے جتنا ذہین تھا نہ تمہارے جتنا قابل۔ نہ تمہارے جتنا بارسوخ۔ تم شاید وہ کام کر جاؤ جس کے بارے میں ہم خواب دیکھتے 'سوچتے اور باتیں کرتے مرے جا رہے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب اب رنجیدہ ہو رہے تھے۔

"سود پر مبنی یہ مغربی مالیاتی نظام اس لیے طاقت ور ہے کیونکہ اس کو چلانے والے تمہارے جیسے ذہین لوگ ہیں جو اپنی ذہانت کو دنیاوی آسائشات کی خاطر انہیں ہی دیے جا رہے ہیں۔ جس دن تمہارے جیسی ذہانت اور قابلیت رکھنے والے لوگ ان کے ساتھ کھڑے ہونے کے بجائے ان کے خلاف کھڑے ہونا شروع ہو جائیں گے تو مغرب کا مالیاتی نظام گر جائے گا صرف اس لیے کہ وہ استحصال اور سامراجی ہے اور وہ انسان اشرف المخلوقات ہے کے نہیں طاقت ور کی بقا کے اصول پر قائم کیا گیا ہے۔ جو طاقت ور اور پیسے والا ہے وہ غریب اور خالی جیب والے کو جس طرح چاہے ایکسپلائٹ کرے۔ مجھے افسوس ہوتا ہے تو صرف اس لیے ہوتا ہے کہ حافظ قرآن اور صاحب حیثیت ہو کر وہ کام کر رہے ہو جو کوئی مجبور ضرور تا" کرتے ہوئے بھی شاید دوبار سوچتا ہے۔"

وہ سر جھکائے اپنی ہتھیلیاں دیکھتا گم صم بیٹھا رہا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

"آپ مجھے بتائیں میں کیا کروں؟ یہ عہدہ نہ لوں؟ جاب چھوڑ دوں؟" اس نے بہت دیر بعد ان سے بس ایک سوال کیا۔

"تم اس ذہانت کا استعمال کر کے فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں عطا فرمائی ہے۔ اللہ سے پوچھو وہ تمہارے لیے فیصلہ کرے۔"

انہوں نے فیصلہ ایک بار پھر اس پر چھوڑا تھا۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ ہنسا۔ کوئی بھی اس کے لیے اب فیصلہ نہیں کر رہا تھا۔ ہر ایک کو اس کی اس ذہانت پر مان تھا جو اس کے اپنے لیے ایک گمان ثابت ہوئی تھی۔

"اللہ انسان پر بہت مہربان ہے سالار۔ گناہ پر یہ نہیں کہتا کہ توبہ کا موقع نہیں دوں گا۔ بار بار توبہ کا موقع دیتا ہے۔ اپنی طرف پلٹ آنے کا موقع دیتا ہے۔"

وہ اب اس کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"زندگی میں جب انسان کو ہدایت مل جائے تو وہ یہ نہ دیکھے کہ کیا کر چکا ہے۔ بس وہاں سے راستہ بدل لے۔"

وہ چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہا تھا۔ وہ نرم گفتار جس کے لیے وہ مشہور تھے اور جو وہ سالوں سے سنتا چلا آ رہا تھا پر آج جانے کیوں دل یہ ماننے کو تیار نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی توبہ قبول ہو جائے گی اور اتنے آرام اور آسانی سے ہو جائے گی۔

اس بات پر ایمان رکھنے کے باوجود کہ اللہ انسانوں کو معاف کرتا ہے اور اپنے بندوں کے لیے بہت رحیم ہے۔ کہیں نہ کہیں اس کے اندر یہ احساس بہت شدید تھا کہ اس نے اللہ کو خفا کیا ہے۔ کس حد تک کیا ہے یہ نہیں پتا چل رہا تھا۔ وہ حافظ قرآن تھا۔ الہامی کتاب کو اپنے ذہن میں محفوظ کیے۔ اتنا الہام تو اسے بھی ہو سکتا تھا کہ اس کتاب کا خالق اس سے خوش تھا یا اس سے خفا۔ اتنا تعلق اور رابطہ تو تھا اس کا اللہ سے کہ یہ جان لے کہ "وہ" اس سے خوش نہیں۔ دیر سے ہی سہی مگر اس کی روح کے اندر موجود وہ خلا نہ اپنے خالی ہونے کا احساس دلانے لگا تھا جو اللہ کی محبت ہی سے بھرتا تھا۔ اس کی خوشنودی ہی سے چھلکتا تھا۔

وہ ڈاکٹر سبط علی کے گھر سے انہیں قدموں واپس واشنگٹن پلٹ آیا تھا۔ اسے اب اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا تھا جسے ایک لمبے عرصے سے گناہ نہیں ضرورت مانتا رہا تھا۔

ایک نیا اسلامی مالیاتی نظام بنانے کا وہ عزم جو ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹرز میں دی جانے والی ذلت کے احساس نے جنم دیا تھا' وہ اب پہلے سے زیادہ پختہ ہو گیا تھا۔ اس کا کفارہ اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی تھی۔

واشنگٹن میں ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹرز میں اس کے آفر قبول کرنے کے فیصلے پر خوشی کے شادیانے بجائے گئے تھے ۔۔۔ وہ "پرزہ" جو انہیں اس وقت اپنی بقا کے لیے چاہیے تھا' انہیں مل گیا تھا۔

سالار سکندر نے بڑے بھاری دل کے ساتھ اس کانٹریکٹ پر سائن کیے تھے۔۔۔ اب وہ ترقی ترقی نہیں لگ رہی تھی' دلدل کی ایک اور گہرائی لگ رہی تھی۔۔۔ جس میں سے نکلنے کے لیے اسے پہلے سے زیادہ ہاتھ پاؤں مارنے تھے۔



"حمین بہت خوش قسمت ثابت ہوا ہے تمہارے لیے۔"

سکندر عثمان نے اسے فون پر مبارک دیتے ہوئے کہا تھا' وہ صرف گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

"وہ ٹھیک ہے نا؟" سکندر عثمان نے حمین کے بارے میں اس سے پوچھا۔ وہ اس دن امامہ سے بات نہیں کر سکے تھے۔ قبل از وقت پیدائش کی وجہ سے وہ اور ان کی بیوی روز ہی اس کے بارے میں دریافت کرتے تھے۔

"ہاں وہ بالکل ٹھیک ہے۔۔۔ stable ہے۔" اس نے انہیں بتایا اور تب ہی سکندر عثمان کو اسکول کا کوئی چوکیدار یاد آیا تھا جو ان سے کچھ رقم ادھار لینے آیا تھا۔

"ہم رہا تھا سود پر کوئی رقم لی تھی اس کے ماں باپ نے اس کی بہنوں کی شادی کے لیے۔۔۔ اور وہ ابھی تک سود اتار رہا ہے۔ اب شاید کوئی اور مسئلہ آن پڑا ہے اسے۔"

سکندر عثمان اسے بتا رہے تھے اور سالار کو لگا کسی نے اس کے گلے کی رسی میں ایک گرہ اور ڈال دی تھی۔۔۔ بعض دفعہ جب اللہ کوئی چیز منہ پر مار کر تنبیہہ کرنا چاہتا ہے تو پھر ہر جگہ سے وہی بات بار بار بازگشت کی طرح واپس آتی رہتی ہے۔۔۔

اس کے پی ایچ ڈی کے لیے امریکہ چلے جانے کے بعد سکندر عثمان ہی گاؤں کے اس اسکول کو دیکھتے رہے تھے۔۔۔ وہی ہفتے میں ایک بار وہاں جاتے اور اسکول کی انتظامیہ اور ملازمین کے معاملات دیکھتے۔ سالار اب صرف نام کی حد تک اسکول کے معاملات میں انوالو تھا۔

"آپ اس کی مدد کریں۔۔۔ اس کا قرضہ اتار دیں۔" سالار نے ان سے کہا۔

"ہاں تاکہ وہاں لائن لگ جائے قرض مانگنے والوں کی۔" سکندر عثمان نے سنجیدگی سے کہا "ہمیں کیا پتا وہ سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔۔۔ ایک کا قرض اتار دیں گے۔۔۔ پورا گاؤں اپنا اپنا قرض لے کر آ کھڑا ہو گا اسکول میں۔۔۔ کسی نے بھینس کے لیے لیا ہو گا' کسی نے فصل کاشت کرنے کے لیے۔۔۔ کسی نے ٹیوب ویل لگوانے کے لیے اور کسی نے بیٹی کی شادی کے لیے۔۔۔ یہاں گاؤں دیہات میں 70 فی صد لوگ سود پر ایک دوسرے سے قرضے لیتے بھی ہیں اور دیتے بھی۔۔۔ یہ ان کی زندگی اور کاروبار کا سائیکل ہے۔ تم یا میں اسے روک سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں۔۔۔ ایک دفعہ تم غلام فرید کا قرض اتار دو گے۔ اگلی بار ضرورت پڑنے پر وہ پھر کسی نہ کسی سے قرض لے گا اور اسی طرح سود پر۔۔۔ وہاں کوئی کسی کو اس کے بغیر رقم ادھار نہیں دیتا۔۔۔ اور وہاں ادھار اور قرض کے بغیر لوگوں کا کام نہیں چلتا۔ اس لیے بہتر ہے' تم اور میں ان چیزوں میں نہ پڑیں۔"

سکندر عثمان نے جو توجیہہ دی تھی۔۔۔ وہ بھی غلط نہیں تھی مگر وہ یہ بات سن کر دنگ ضرور رہ گیا تھا کہ وہ وبا کہاں کہاں ناسور کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ سکندر عثمان کو اندازہ تھا؟ سے اندازہ نہیں ہوا تھا گاؤں میں آتے جاتے

رہنے کے باوجود۔۔۔

اسی رات اپنے ہوٹل میں ورلڈ بینک کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ اس کی ملاقات تھی۔ انہیں کانگو کے لیے اپنا لائحہ عمل ڈسکس کرنا تھا اور انفارمل ڈنر اور گپ شپ کے بعد وہ اس ہوٹل کے نائٹ کلب میں ان سب کے اصرار پر ایک اپینی گلوکارہ کو سننے کے لیے گیا تھا اور وہاں جیکی اس سے آٹکرائی تھی اس کے ساتھ پچھلے چند دنوں میں وہ سب پیش نہ ہو چکا ہوتا تو وہ کبھی اس پر شک نہیں کرتا۔ اسے ایسی کوئی عورت سمجھتا جو تنہائی کی ماری ہوئی ہوتی یا وقتی کمپنی چاہتی تھی۔۔۔ وہ بہر حال ایسا ہوٹل اور نائٹ کلب نہیں تھا جہاں دوسرے تیسرے درجے کی stripers یا کال گرلز با افراط گاہک کی تلاش میں منڈلاتی پھرتیں۔۔۔ وہاں ایسی کوئی خواتین نظر بھی آتیں تو پہلے سے کسی کے ساتھ ہوتیں یا کسی کی دعوت پر۔۔۔ اور ایسی کسی جگہ پر اس قدر ازیکٹو عورت کا اس پر یوں فدا اور فریفتہ ہونا اور اس کے ساتھیوں کا اس کے اطراف سے یک دم ایک ایک کر کے غائب ہونا۔۔۔ سالار نظر انداز نہیں کر سکا۔ اسے ہنسی آئی تھی۔

مغرب کو ہر فرسٹریشن کا علاج اور حل الکحل اور عورت کی شکل میں کیوں سوجھتا تھا۔ ان کی ہر ترغیب کی ابتدا اور انتہا عورت ہی کیوں ہوتی تھی۔۔۔ اور سی آئی اے کو جلدی آخر کس چیز کی تھی۔۔۔ اس کو ٹیپ کرنا تھا تو اتنا گھسا پٹا منصوبہ تو نہ بناتے۔۔۔ مستقبل میں اس کو استعمال کرنے کے لیے کوئی کمزوری چاہیے تھی تو کچھ تو انتظار کرتے۔۔۔

وہ وہاں سے اٹھ آیا تھا۔ ان ترغیبات اور حالات سے مزید خبردار ہو کر جو اس ترقی کا ثمر تھیں جن کی اس نے خواہش کی تھی۔۔۔

اور اب وہ اس جہاز پر تھا۔ اور اپنی پوری زندگی کو اپنی نظروں کے سامنے کسی فلم کی طرح چلتے دیکھتے ہوئے۔

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ بس اس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر حواس باختہ کیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ تجارت بھی تو سود ہی ہے حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔"

اس نے ایک بار قرآن پاک میں سورۃ بقرہ میں پڑھا تھا۔ دوسرا جملہ تو اس کی سمجھ میں آ گیا تھا لیکن پہلا جملہ وہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ آج اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

"وہ اس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر حواس باختہ کیا ہو۔"

اس کیفیت میں تو وہ تھا۔ حلق پر ہاتھ پڑا تھا سالار سکندر کے۔۔۔

جہاز پر کنشاسا کے اس سفر میں اس نے یہ طے کیا تھا کہ وہ اپنی نوکری سے کمائے جانے والے پیسے سے اپنے خاندان کی کفالت نہیں کرے گا۔ اس کے لیے کسی بھی اور ذریعے سے ان کی کفالت اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ بہت سی امریکن یونیورسٹیز میں لیکچرز کے لیے مدعو ہوتا رہا تھا اور ان لیکچرز کے لیے اسے معاوضہ بھی دیا جاتا رہا تھا۔۔۔ اس سے پہلے اس نے جاب کے علاوہ ان دوسرے ذرائع کے بارے میں غور نہیں کیا تھا جہاں کام کر کے وہ اتنا رزق بخوبی کما لیتا کہ کم از کم اس اسٹیج پر اسے اس ذمہ داری کو اٹھانے میں دقت محسوس نہیں ہوتی۔

اسے اب ورلڈ بینک کی نائب صدارت صرف دو چیزوں کے لیے چاہیے تھی۔۔۔ وہ قرض سر سے اتار دیتا جو امامہ نے اس کے لیے چھوڑا تھا اور وہ کچھ مہلت حاصل کر لیتا۔۔۔ سود سے پاک پہلے بین الاقوامی اسلامی مالیاتی ادارے کی تشکیل کے لیے۔

مقصد بہت بڑا تھا۔۔۔ وسائل بھی اتنے ہی درکار تھے۔۔۔ دماغ کہتا تھا اب کچھ ہو سکتا ہے نا ممکن کچھ نہیں۔۔۔ دل کہتا تھا بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں اور ضمیر کہتا تھا۔۔۔ راستہ ہے تو یہی ہے۔۔۔ اور اللہ۔۔۔ زندگی میں پہلی بار جیسے اللہ نے بھی اس آزمائش کے لیے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا تھا۔

اندر کی وہ آواز بالکل خاموش تھی جو ہمیشہ اس کی رہنمائی کرتی تھی۔ سالار سکندر کو اگر یہ وہم تھا کہ اللہ اس سے خفا تھا تو وہ صرف وہم نہیں تھا۔



اس کا ہاتھ پکڑے وہ اسے اب کسی راستے پر لے جانے لگا۔ ایک قدم' دوسرا قدم' تیسرا۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ ایک جھیل تھی۔ چھوٹی سی جھیل۔ جس کے کنارے پر وہ تھے۔ ہلکی نیلی رنگت کے شفاف پانی کی ایک جھیل۔ جس کے پانی میں وہ رنگ برنگی مچھلیاں تیرتے ہوئے دیکھ سکتی تھی۔

اور اس کی تہ میں بے شمار رنگوں کے موتی۔ پتھر۔ سیپیاں۔

جھیل کے پانی پر آبی پرندے تیر رہے تھے۔ خوب صورت راج ہنس جھیل کے چاروں اطراف پھول تھے۔ اور بہت سے پھول جھیل کے پانی تک جھکے ہوئے تھے۔ کچھ پانی کی سطح پر تیر رہے تھے۔

مگر اس کے قدموں کو ان میں سے کسی چیز نے نہیں روکا تھا۔ اس کے قدموں کو روکنے والی شے جھیل کے کنارے پر موجود لکڑی کی وہ خوب صورت چھوٹی سی کشتی تھی جو پانی میں ہلکورے لے رہی تھی۔ اس نے بے اختیار کھلکھلا کر اسے دیکھا۔

"یہ میری ہے؟" وہ مسکرا دیا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بچوں کی طرح بھاگتی کشتی کی طرف گئی۔ وہ اس کے پیچھے لپکا۔ اس کے قریب پہنچنے پر کشتی پانی سے کچھ باہر آگئی۔ وہ بڑی آسانی سے اس میں سوار ہو گئی۔ اسے لگا وہ کشتی صندل کی لکڑی سے بنی تھی۔ خوشبودار صندل سے۔

وہ اس کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا کشتی کو پانی میں لے گیا۔ وہ دونوں بے اختیار ہنسے۔

کشتی اب جھیل کے دوسرے کنارے کی طرف سفر کر رہی تھی۔ اس نے جھک کر پانی میں تیرتا کنول کا پھول پکڑ لیا۔ پھر اسی احتیاط کے ساتھ اسے چھوڑ دیا۔

اس نے دوسری طرف جھک کر اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں جھیل کا پانی ایک چھوٹی سی رنگین مچھلی سمیت لیا اور اس کے سامنے کر دیا اس کے ہاتھوں کے پیالے میں حرکت کرتی مچھلی کو دیکھ کر وہ ہنسی پھر اس نے اس مچھلی کو ہاتھ سے پکڑ اور پانی میں اچھال دیا۔ وہ دونوں جھک کر اسے دیکھتے رہے۔

پانی پر تیرتا ایک ہنس کشتی کے پاس آگیا۔ پھر دوسرا پھر تیسرا۔ وہ کشتی کے گرد اب جیسے ایک دائرہ سا بنا کر تیر رہے تھے۔ یوں جیسے ان کا استقبال کر رہے تھے۔ وہ پاس سے تیر کر گزرتے ہر ہنس کو وہ اپنے ہاتھوں سے چھوتی کھلکھلا رہی تھی۔ پھر ایک دم اس نے جھیل کے پانی پر کنول کے پھولوں کی قطاروں کو حرکت کرتے دیکھا۔ وہ جھیل کے پانی پر تیرتے اب رقص کر رہے تھے۔

ادھر سے ادھر جاتے۔ خوب صورت شکلیں بناتے۔ پاس آتے دور جاتے۔ پھر پاس آتے۔ یوں جیسے وہ یک دم جسموں کی طرح زندہ ہو گئے تھے۔ جھیل کے نیلے پانی پر وہ سفید کنول اپنے سبز خوب صورت پتوں کے ساتھ ہونے والی مسلسل حرکت سے پانی میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے وہ بے خود ہو رہی تھی یا بے اختیار۔ وہ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ سمجھنا اب ضروری تھا بھی نہیں۔

جھیل کے نیلے پانی پر رقص کرتے لاتعداد خوب صورت پھولوں کے بیچ اس نے ایک دم کسی عکس کو نمودار ہوتے دیکھا کشتی میں بیٹھے بیٹھے وہ چونک کر مڑی اور پھر وہ بے ساختہ کھڑی ہو گئی۔ کشتی دوسرے کنارے کے پاس آ گئی تھی اور وہاں۔ وہاں کچھ تھا۔

امامہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی گہری نیند سے۔ اس نے اپنی کلائی پر کسی کا لمس محسوس کیا تھا۔ خواب آور دوا کے زیر اثر

اسے ایک لمحہ کے لیے کمرے کی مدھم روشنی میں یوں لگا وہ ایک خواب سے کسی دوسرے خواب میں آئی تھی۔ سالار اس کے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھا تھا۔ بے حد قریب بستر پر دھرا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔ پتا نہیں نیند ٹوٹی تھی یا خواب۔ یا پھر وہ لمس تھا جو اسے خواب سے حقیقت میں لے آیا تھا لیکن وہ خواب تو رونے کے زیر اثر ہوتے ہوئے بھی یک دم اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے کھینچتے ہوئے کہنیوں کے بل اٹھ کر بیٹھنے لگی تھی سالار نے اسے روکا۔

"مت اٹھو مت۔۔۔"

"تم واقعی آگئے ہو؟" امامہ کو اب بھی جیسے یقین نہیں آیا تھا۔

وہ دھیرے سے ہنسا۔ "تمہیں بتایا تو تھا کہ آجاؤں گا۔"

"یہ تو نہیں بتایا تھا کہ کب آؤ گے؟ اور تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟"

"بس میں نے سوچا تمہاری نیند خراب ہوگی۔" وہ مدھم آواز میں بات کر رہا تھا۔ دوسرے بستر پر جبریل اور عنایہ تھے جو گہری نیند میں تھے اور صوفے پر ہیلن تھی جو کچھ دیر پہلے سالار کے آنے پر دروازہ کھلنے کی آواز سے جاگ گئی تھی اور سالار کے ساتھ کچھ خیر مقدمی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ کمرے سے چلی گئی تھی۔ وہ رات کے پچھلے پہر کنشاسا پہنچا تھا اور ایئرپورٹ پہ رکے بغیر وہاں آگیا تھا۔ شہر میں حالات اب نارمل ہو رہے تھے۔ فوج اور حکومت امن بحال کرنے میں کامیاب ہو رہے تھے۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" امامہ نے سالار کے چہرے کو پہلی بار غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے اور آنکھیں سرخ اور یوں سوجی ہوئی تھیں یوں جیسے وہ کئی راتوں سے سویا نہ ہو۔

"کچھ نہیں۔ بس اتنے دن گھر سے دور رہا تو شاید اس لیے پھر۔۔۔"

سالار نے اس سے آنکھیں ملائے بغیر کہا۔ امامہ نے اس کی بات کاٹ دی اسے یک دم اپنا خواب یاد آگیا تھا۔

"سالار! تمہیں پتا ہے ابھی میں خواب میں کیا دیکھ رہی تھی؟" سالار نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا؟"

"میں نے خواب میں ایک گھر دیکھا جھیل کنارے۔۔۔ جہاں تم مجھے لے کر جا رہے تھے۔ ایک کشتی میں بٹھا کر۔"

وہ دم بخود رہ گیا۔ جو گھر اس نے امریکہ میں اس کے لیے mortgage کیا تھا وہ سمندر کے ایک جھیل نما ٹکڑے کے کنارے تھا۔ اس نے ابھی تک امامہ کو اس گھر کے بارے نہیں بتایا تھا وہ اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا اس کی اگلی سالگرہ پر۔ لیکن اب وہ بیٹھے بٹھائے اسے جھیل کنارے ایک گھر کا قصہ سنا رہی تھی۔

"جس جھیل کے کنارے وہ گھر تھا وہ جھیل بے پناہ خوب صورت تھی۔۔۔ سفید کنول کے پھولوں سے بھری ہوئی نیلے پانی کی جھیل۔۔۔ جس میں ہر طرف راج ہنس تیر رہے تھے۔ اور پانی میں رنگ برنگی مچھلیاں۔۔۔ اور کشتی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے خود ہی چل رہی تھی۔۔۔ اور جھیل کے کنارے پھولوں بھری جھاڑیاں تھیں۔۔۔ رنگ رنگ کے پھول سبزے کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔۔۔ اور پھول ٹوٹ کر پانی پر بہتے چلے جا رہے تھے۔"

وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ جس جھیل کے کنارے اس نے گھر خریدا تھا۔ وہ بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس کے گرد بھی پھول تھے۔۔۔ آبی پرندے اور راج ہنس بھی۔۔۔ اور کنول کے پھول بھی۔۔۔ اور اس جھیل کے کنارے جتنے گھر تھے ان سب کی کشتیاں بھی اس پانی میں رہتی تھیں۔ بس فرق یہ تھا کہ ان میں سے کوئی لکڑی کی چپو والی کشتی نہیں تھی جیسا نقشہ وہ کھینچ رہی تھی۔

ایک لمحہ کے لیے اسے محسوس ہوا امامہ کو شاید اس گھر کا پتا چل گیا تھا۔ شاید اس نے اس کے لیپ ٹاپ میں

اس گھر کی تصویریں دیکھ لی تھیں۔۔۔ اور اب وہ جان بوجھ کر اسے چھیڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اگر ایسا بھی تھا تو اس نے کب لیپ ٹاپ دیکھا تھا۔ پچھلے کئی دنوں میں تو یہ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کا لیپ ٹاپ اس کے پاس تھا اور اگر یہ اس سے پہلے ہوا تھا تو پھر وہ اس وقت ان حالات میں وہ خواب کیوں سنا رہی تھی۔ وہ الجھا تھا اور بری طرح الجھا تھا۔

"اور گھر کیسا تھا؟" وہ کریدے بغیر نہیں رہ سکا۔

"شیشے کا۔" سالار کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ اس کا Mortgage کیا ہوا گھر بھی شیشے ہی کا تھا۔

"لیکن مجھے اس کے اندر کچھ نظر نہیں آیا۔۔۔ وہ شیشے کا تھا لیکن اندر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور میں کشتی سے اتر کر گھر کے اندر جانا چاہتی تھی تو تب ہی میری آنکھ کھل گئی۔"

وہ بہت مایوس نظر آ رہی تھی یوں جیسے اسے بہت افسوس ہو رہا تھا۔ سالار پلکیں جھپکے بغیر صرف اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"لیکن وہ گھر ویسا گھر تھا جیسا میں ہمیشہ بنانا چاہتی تھی جیسا میں اپنے اسکیچز میں اسکیچ کرتی رہتی تھی۔ وہی جھیل۔۔۔ وہی سبزہ۔۔۔ وہ شیشے کا گھر۔۔۔ اور ہر طرف پھول۔" وہ جیسے ابھی تک کسی خمار میں تھی۔ سالار بھی گنگ تھا۔ اس نے بھی اس گھر کو mortgage کرتے ہوئے وہی ساری چیزیں ڈھونڈی تھیں جو وہ اپنے اسکیچ میں ڈیزائن کرتی رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ امامہ سے کیا کہے۔۔۔ اگر وہ کھیل تھا تو وہ بہترین کھیل رہی تھی اور اگر وہ کھیل نہیں تھا تو اس کے دماغ کی چولیں ہل گئی تھیں۔

"تم نے کبھی زندگی میں کوئی جھیل دیکھی ہے ایسی جیسی میں تمہیں بتا رہی ہوں؟" سوال اچانک آیا تھا اور عجیب و غریب تھا۔

"میں نے؟" وہ چونکا۔۔۔ "میں نے؟" اس نے ذہن پر زور دیا اور پھر ایک جھماکے کے ساتھ اسے یاد آیا تھا کہ اس نے وہ جھیل خواب میں دیکھی تھی۔۔۔ اس رات جب وہ امامہ کو گھر لے کر آیا تھا تو اس نے خواب میں خود کو کسی حسین اور خوب صورت وادی میں امامہ کے انتظار میں پایا تھا اور پھر امامہ آگئی تھی اور پھر اس وادی کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ اسے اس وادی سے ایک جھیل اور کشتی تک لے گیا تھا۔ اس جھیل کا نقشہ ویسا ہی تھا جیسا وہ بتا رہی تھی۔۔۔ پھول، سبزہ، نیلا پانی۔۔۔ راج ہنس۔۔۔ کنول کے پھول۔۔۔ اور لکڑی کی چپو والی صندلین کشتی۔

سالار کے جسم میں کپکپاہٹ ہونے لگی تھی۔۔۔ وہ اگر پزل تھا تو اس کے دو ٹکڑے عجیب انداز میں جڑے تھے۔

"تم نے یہ کیوں پوچھا کہ میں نے خواب میں کبھی کوئی جھیل دیکھی ہے؟" اس نے سرسراتی آواز میں امامہ سے کہا۔

"تمہیں یاد ہے حرم پاک کے بارے میں دیکھا جانے والا وہ خواب۔۔۔ جس کا ایک حصہ میں نے دیکھا تھا تو ایک حصہ تم نے بھی دیکھا تھا۔۔۔ اور ایک ہی رات۔"

وہ اسے عجیب چیز میں یاد دلانے بیٹھ گئی تھی۔

"میں نے سوچا شاید یہ بھی ویسا ہی کوئی خواب ہو۔۔۔ شاید وہ گھر تم اندر سے دیکھ چکے ہو جو مجھے نظر نہیں آیا۔"

وہ بچوں جیسے اشتیاق کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔۔۔ یوں جیسے وہ کہے گا ہاں میں اس گھر کو اندر سے دیکھ چکا ہوں۔ سالار کسی بت کی طرح اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔۔۔ یقیناً "اس خواب کے دو ہی حصے تھے۔۔۔ لیکن وہ امامہ سے پچھلے حصے کا گواہ تھا۔۔۔ وہ اس وادی کو دیکھ چکا تھا جہاں وہ جھیل تھی پر اس جھیل کو اس نے دور سے دیکھا تھا کنارے

ہے۔ جسے امامہ نے پیار کیا تھا۔ اور جھیل کے پار جو گھر تھا۔ اس تک وہ دونوں ہی نہیں پہنچے تھے۔ اس نے گھر کی جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔۔۔ امامہ نے جھلک دیکھی تھی پر اندر نہیں جھانک پائی تھی۔۔۔

وہ خواب دونوں نے پہلے والے خواب کی طرح ایک رات میں نہیں دیکھا تھا۔ سالار نے وہ رخصتی کی پہلی رات امامہ کو گھر لانے پہ۔ اور امامہ نے تقریباً چھ سال بعد۔۔۔

"اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟" امامہ کو اس کی نظریں بے حد عجیب لگیں۔

اس نے امامہ سے نظریں ہٹالیں وہ اسے یہ نہیں بتا سکا کہ وہ کنشاسا آنے سے پہلے ڈاکٹر سبط علی سے مل کر واشنگٹن آنے کے بعد اس گھر کی mortgage کینسل کروا چکا تھا۔ امامہ کے خوابوں کا گھر اس کے ہاتھ سے جا چکا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے بس ایک لمحے کے لیے اسے عجیب پچھتاوا اور رنج ہوا اس mortgage کی کینسلیشن پر۔ ایک لمحہ کے لیے اسے یہ خیال بھی آیا تھا کہ وہ اس گھر کو واپس حاصل کرنے فوری طور پر امریکہ بات کر کے۔ وہ اس وقت جس پوزیشن میں تھا یہ کر سکتا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے ذہن کو جھٹکا تھا۔ یہ صرف سی آئی اے نہیں تھی جو اس کے لیے جال بچھا رہی تھی۔ شیطان بھی وہیں تھا۔ "اس کے بندوں" کو اپنے بندوں میں بدلنے کے راستے۔ جال سی آئی اے نے عورت کا پھینکا تھا تو شیطان نے گھر کا۔ زن۔ زر۔ زمین۔ انسان ان تین چیزوں سے سردار بنتا ہے اور انہیں چیزوں سے "سر" وار تک جاتے ہیں۔

سالار سکندر سی آئی اے کو اعوذباللہ من الشیطن الرجیم کہہ کر جو تا مار آیا تھا تو یہ کیسے ممکن تھا شیطان خود اٹھ کر سامنے نہ کھڑا ہوتا۔ اس سے بڑی ترغیب۔ بڑی گمراہی۔ بڑا لالچ۔ بڑا پھندا ایک بار قدم ڈگمگائے تو۔ ایک بار وہ ہاتھ آئے تو۔ اور شیطان کے منہ پر لعنت بھیج کر تھوک کر آنے والا جس کی پناہ اور حفاظت کا دعا کر کے آیا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا وہ رب اپنے بندے کی حفاظت کے لیے وہاں نہ ہوتا۔ وہ حافظ قرآن تھا۔ گناہ پر اس کے لیے سزا زیادہ تھی تو اچھائی پر اس کے لیے انعام بھی بے پناہ۔

"حمین کیسا ہے؟" وہ یک دم بات وہیں کی وہیں چھوڑ کر حمین کے انکوبیٹر کی طرف آیا تھا۔ شیطان نے افسوس سے ہاتھ ملے۔ وہ بات چھوڑ کر کیسے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ برق کی طرح آیا تھا اور پل بھر میں غائب ہوا۔ بس وسوسہ اور وہم ڈالتا تھا۔۔۔ وہ ڈال گیا تھا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔۔ دیکھو سو رہا ہے۔" امامہ نے وہیں تکیے سے ٹیک لگائے کہا۔

سالار نے انکوبیٹر کو کھول کر پہلی بار محمد حمین سالار کو گود میں لیا تھا۔ ساری میڈیکل احتیاطوں کی نفی کرتے ہوئے اس نے نم آنکھوں کے ساتھ اسے جھک کے سینے سے لگایا اور چوما۔ وہ ننھا بچہ باپ کے لمس پر کسمسایا پھر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔۔۔ سیاہ۔ موٹی۔ گول آنکھیں جو اس نحیف و نزار وجود پر عجیب و غریب لگ رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھولتے ہی باپ کو دیکھا تھا۔ پلکیں جھپکائے بغیر وہ اسے دیکھتا رہا۔ سالار بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ماتھے پر چند بل آئے تھے۔ ناک اوپر چڑھی۔ اور پھر حمین نے پوری قوت سے گلا پھاڑ کر رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کی آواز اتنی باریک اور اتنی تیز تھی کہ چند لمحوں کے لیے سالار ہکا بکا رہ گیا تھا کہ اس کے ننھے وجود کے اندر اس طرح گلا پھاڑ کر رونے کے لیے جان کہاں سے آئی تھی۔ جبریل اور عنایہ اس کی آواز پر بے اختیار ہڑبڑا کر اٹھے تھے۔ حمین جب بھی روتا تھا اسی طرح اچانک اور اسی والیم پر روتا تھا۔

پیڈی یک دم اندر آگئی تھی۔ سالار حمین کو واپس انکوبیٹر میں رکھنے کی جدوجہد میں مصروف تھا لیکن وہ ایک ہفتہ کا بچہ ایک بار انکوبیٹر سے نکلنے کے بعد دوبارہ اندر نہ جانے کے لیے جس حد تک جدوجہد کر سکتا تھا کر رہا تھا اس کا اگر بس چلتا تو وہ اپنے ہاتھوں کی پشت میں لگے ناک اور جسم کے ہر حصے پر لگی نالیوں اور تاروں کو کھینچ کر اتار دیتا

وہ ان میں سے کسی چیز کو تو نہیں اتار سکا مگر وہ ہلکا سا ڈائپر اس کے جسم کے مسلسل جھٹکوں سے یک دم کھل گیا تھا جو ۔۔۔ صرف رسماً ہی اسے باندھا گیا تھا۔

ڈائپر کے علاوہ حمین کے جسم پر جگہ جگہ لگائی تاروں اور نلکیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ وہ یکدم ہی ٹارزن کے بچے جیسے حلیے میں آ گیا تھا۔ بستر سے چھلانگ لگا کر باپ کی طرف بھاگتے جبریل نے اپنے چھوٹے بھائی کے اس "دلیرانہ" اقدام پر بے اختیار چیخ مار کر آنکھوں پر ہاتھ رکھا تھا۔

"baba baby is naked"

(بابا بےبی ننگا ہے۔) اس نے جیسے بے یقینی سے آنکھوں کی ہتھیلیوں سے ڈھانپے اعلان کیا۔

وہ آنکھیں بند نہ کر لیتا تو بے شرمی کے اگلے مظاہرے پر یقیناً "پتھر" کا ہو جاتا کیونکہ بےبی اسی طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر روتے ہوئے ڈائپر سے نجات حاصل کرنے کے بعد اب اس پانی سے بھی فراغت حاصل کر رہا تھا جو ٹیوبز کے ذریعے اس کے اندر منتقل کیا جا رہا تھا۔ ہیڈی کو تھماتے ہوئے سالار بے یقینی سے اپنی پیشاب سے بھیگی ہوئی شرٹ کو دیکھ رہا تھا۔ یہ کارنامہ اس کے پہلے بچے بھی نہیں کر سکے تھے۔

"تم نے غلط طریقے سے پکڑا ہے۔ کتنے سخت ہاتھ لگائے ہیں کہ وہ اس طرح رو رہا ہے۔ ہیڈی لیڈی ڈاکٹر کو بلاؤ ۔۔۔ بلکہ اسے مجھے دو ۔۔۔ نہیں میں آتی ہوں۔"

امامہ اس کی حالت کو مکمل طور پر نظرانداز کیے اپنے روتے ہوئے بیٹے کی طرف متوجہ اپنے بستر سے بے قراری کے عالم میں اتر رہی تھی۔

"Baba can I open my eyes"

(بابا میں اپنی آنکھیں کھول لوں)

جبریل اندھوں کی طرح ہاتھ پھیلائے باپ کو ڈھونڈتے لڑکھڑاتے قدموں سے آنکھیں بند کیے سالار کی طرف آ رہا تھا وہ اس چھوٹے بھائی کی بے پردگی دیکھنے پر تیار نہیں تھا جو اس وقت لٹل اسٹوارٹ کی طرح چلاتے ہوئے انکیوبیٹر سے باہر کودنے کو تیار تھا۔

عنایہ ایک بار ہڑبڑا کر جاگنے کے بعد سالار کی طرف متوجہ ہوئے بغیر دوبارہ سو چکی تھی۔ سالار نے جبریل کے پھیلے ہاتھوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ہمیشہ کی طرح زمین پر پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے۔ یہ وہ زندگی اور دنیا تھی جو اس کے ہاتھ سے پھسلتے پھسلتے رہ گئی تھی۔ اس کی انگلیوں کی پوروں تک جا کر واپس پلٹی تھی یہ زندگی ۔۔۔ یہ آوازیں ۔۔۔ اس کا خاندان ۔۔۔ وہ کمرہ اس میں موجود وہ ننھے وجود جو اس کے وجود کی تکمیل کرتے تھے۔

"Yes you can"۔

اس نے اسی طرح جبریل کو خود سے لپٹائے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ جبریل نے آنکھیں کھول کر سب سے پہلے چور نظروں سے حفظ ماتقدم کے طور پر انکیوبیٹر کو دیکھا تھا جہاں اب حمین ہیڈی اور امامہ کے وجود کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

"why are you crying papa"۔

(پاپا آپ کیوں رو رہے ہیں؟)

باپ کی طرف متوجہ ہوتے ہی اس نے پہلی نظر میں ہی اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے اور اس کے جملے نے امامہ کو بھی پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

سالار کی پشت اب اس کی طرف تھی اور وہ جبریل کو لپٹائے چومے جا رہا تھا۔



گھر مکمل طور پر جل گیا تھا۔ نقصان کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ مگر یہ ورلڈ بینک کی طرف سے فراہم کی جانے والی رہائش گاہ تھی۔ اس لیے اس کا نقصان پورا ہو جانے والا تھا۔ سالار کنشاسا پہنچنے کے اگلے ہی دن اس گھر کو دیکھنے آیا تھا جہاں وہ رہائش پذیر تھے۔ وہاں سب ہی گھروں کو ہی آگ لگائی گئی تھی لوٹ مار کے بعد۔ اب وہاں جو بچا تھا' وہ ملبہ اور راکھ تھی۔ وہ پھر بھی خوش نصیبوں میں تھا کیونکہ اس ملبے میں اس کے کسی پیارے کی ہڈیاں نہیں تھیں۔

یہ سالار سکندر کے ساتھ دوسری بار ہوا تھا۔ پہلی بار اس نے گاؤں میں اپنے اسکول کی عمارت کو یوں خاکستر ہوتے دیکھا تھا۔ اس گھر کے ملبے کو دیکھتے ہوئے اس نے جو سوچا تھا' وہ اسکول کی راکھ کو دیکھ کر نہیں سوچا تھا تب اس نے امامہ کی فیملی کو ہر نقصان کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا اور کہیں بھی اس نے یہ نہیں سمجھا یا سوچا تھا کہ یہ اس کے اپنے کسی عمل کی سزا تھی۔ کوئی تنبیہہ تھی جو اسے کی جا رہی تھی۔ وہ سود سے کمائے جانے والے پیسے سے فلاح عامہ کا کام کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ اللہ اسے قبول کرتا۔ آج ایک بار پھر وہ ایسے ہی ایک ملبے کے سامنے کھڑا ہوا یہ سمجھ پایا تھا کہ وہ اس کا رزق تھا جس سے صرف شر نکل رہا تھا، خیر نہیں۔

گھر کو لگنے والی آگ میں وہ چھوٹی موٹی ساری جیولری' سیونگ سرٹیفکیٹس اور اس کے بچوں کی انشورنس کے پیپرز راکھ ہو گئے تھے یا لوٹ لیے گئے تھے۔

امامہ کو شادی میں سالار کی فیملی کی طرف سے ملنے والا زیور پاکستان میں ہی ایک لاکر میں تھا۔ یہاں امامہ کے پاس صرف وہ چھوٹی موٹی ڈائمنڈز کی جیولری تھی جو وہ وقتاً ''فوقتاً'' افریقہ یا امریکہ میں خریدتی رہی تھی لیکن اس چھوٹی موٹی جیولری کی قیمت بھی چالیس لاکھ سے کم نہیں تھی۔ اس گھر میں اور بھی بہت کچھ چلا گیا تھا جس کا امامہ کو صدمہ تھا لیکن سالار کو نہیں تھا۔ اس کے لیے یہ کافی تھا کہ اس کا خاندان سلامت تھا۔

ورلڈ بینک نے اپنے تمام ملازمین کے نقصانات کو پورا کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور یہ کام ہنگامی بنیادوں پر

ہو رہا تھا۔ تمام ملازمین کو اپنے کلیمز داخل کرنے کے لیے کہا گیا تھا لیکن سالار سکندر نے کوئی کلیم داخل نہیں کیا تھا۔ اسے اب اس پیسے سے خوف آرہا تھا جو جب بھی اس کے پاس آتا۔ اس کی حلال کمائی کو بھی اپنے ساتھ خس و خاشاک کر دیتا۔

وہ ایمبیسی سے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں منتقل ہو گئے تھے۔ حمین امریکن ایمبیسی کے ہی اس اسپتال میں رہا تھا۔

"میں چاہتا ہوں جب ڈاکٹرز حمین کو سفر کے قابل قرار دیں تو تم بچوں کو لے کر پاکستان چلی جاؤ۔" سالار نے ایک رات امامہ سے کہا تھا۔ وہ اس دن کچھ بنیادی ضروریات کی چیزیں خرید کر لائی تھی ہوٹل کے اس سوئٹ کے لیے جو اب وقتی طور پر ورلڈ بینک کی طرف سے سالار سکندر کی رہائش گاہ بھی تھا اور آفس بھی۔۔۔ وہ ایک گھن چکر کی طرح پورے کانگو میں ایک بگولے کی طرح گھومتا پھر رہا تھا ورلڈ بینک اور یونائیٹڈ نیشنز کے امن پیغامبروں کے ساتھ۔۔۔ کام کے دوران دن اور رات کی تمیز اس نے پہلے بھی کبھی نہیں کی تھی لیکن اب تو یہ فرق بالکل ہی مٹ گیا تھا۔ اور اس ساری بھاگ دوڑ میں اسے امامہ سے بات کرنے کا خیال آیا بھی تھا تو صرف اسی ایک بات کے لیے۔

"کیوں؟" وہ ناخوش ہوئی تھی۔

"کیونکہ جو کچھ کانگو میں ہو چکا ہے میں اب تم لوگوں کے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتا۔"

امامہ کچھ دیر پہلے اس کے لیے کافی بنا کر لائی تھی۔۔۔ کئی دنوں بعد انہیں رات کے اس پہر آپس میں بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ حمین اسپتال سے ڈسچارج ہونے والا تھا اور سالار جیسے ان کو واپس بھیجنے کے لیے گھڑیاں گن رہا تھا۔

"کانگو اتنا غیر محفوظ ہے تو تم یہاں کیوں رہنا چاہتے ہو۔ تم بھی واپس چلو۔" امامہ نے۔۔۔ جواباً کہا۔

وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا "میں فی الحال نہیں جا سکتا۔" اس نے ایک گھونٹ لیا۔

"فی الحال؟" امامہ نے جواباً پوچھا۔

"اگلے پانچ سال۔"

"ہرگز نہیں۔"

امامہ نے کافی کا کپ اسی طرح رکھ دیا۔ مزید کسی سوال جواب کے بغیر اس نے جیسے فیصلہ سنا دیا تھا۔

"تمہاری ضد مجھے کمزور کرے گی امامہ۔۔۔ تم اور بچے یہاں رہیں گے تو میں بہت پریشان رہوں گا، اپنے کام پر دھیان نہیں دے پاؤں گا۔ تم لوگ محفوظ۔" امامہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تمہیں لگتا ہے ہم یہاں کانگو میں تمہیں چھوڑ کر رہنے کے لیے ہیں اور بچے پاکستان میں عیش کریں گے۔ تم اپنے سکون کے لیے مجھے بے سکون کرنا چاہتے ہو؟ میں نہیں جاؤں گی سالار۔۔۔ مجھے وہیں رہنا ہے جہاں تم رہو گے۔۔۔ میں کسی جگہ میں چھپوں گی نہ بچے چھپیں گے۔۔۔ اگر یہاں خطرہ آئے تو پھر سب کے لیے آئے اور اگر تحفظ ہو تو بھی سب کے لیے۔"

وہ اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا تھا وہ اس کے ہر لہجے سے واقف تھا اور جانتا تھا وہ اس ضد سے نہیں ہٹے گی۔

ڈاکٹر سبط علی نے کہا تھا امامہ سے جو تکلیف ملی تھی، وہ اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھا لیکن وہ ان سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اسے اس کے ساتھ میں جو سکون ملتا تھا وہ کس نیکی کا صلہ تھا۔

"تم کچھ کرنا چاہ رہے ہو جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔۔۔ لیکن تم چھپا نہیں سکو گے۔۔۔ میں جان جاؤں گی۔۔۔ تم بتاؤ

نہ بتاؤ۔"
وہ اب شکی بیویوں کی طرح اسے کرید رہی تھی اور ساتھ جیسے خبردار بھی کر رہی تھی۔ وہ اس سے کہہ نہیں سکا کہ اس میں ابھی اتنا حوصلہ پیدا نہیں ہو رہا کہ وہ اس کے سامنے وہ اعترافات کرے، جو وہ ڈاکٹر سبط علی کے سامنے کر کے آیا تھا اور پھر اسے بتائے کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ اسے ناکامی کا اندیشہ تھا اور ناکامی کا خوف بھی۔
"کچھ نہیں۔ مجھے کیا کرنا ہے۔ جنگلوں میں مارا مارا پھر رہا ہوں پیٹرس ایباکا کے ساتھیوں سے ملنے اور مذاکرات کرنے۔" سالار نے بات ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔
"ایک مہینے تک پھر بھی پاکستان چلیں گے۔"
"تم چلو گے؟" امامہ نے بیچ میں ہی بات کاٹ کر پوچھا تھا یوں جیسے اسے اندیشہ ہوا تھا کہ وہ اب بہانے سے اسے پاکستان واپس بھیجنا چاہتا تھا۔
"ہاں۔ چلوں گا یار۔ اتنی بے اعتباری بھی ٹھیک نہیں ہوتی۔"
اس نے جیسے برا مانتے ہوئے کافی کا آخری گھونٹ لے کر کپ رکھ دیا تھا۔



ورلڈ بینک اور امریکی حکومت نے اگر واشنگٹن میں سالار سکندر کے ساتھ مذاکرات میں اسے فری ہینڈ کی ضمانت دی تھی تو انہوں نے یہ وعدہ پورا کیا تھا۔ انہوں نے سالار سکندر کو افریقہ کے سیاہ و سفید کا مالک بنا کر وہاں بھیجا تھا۔ وہ ورلڈ بینک کے مختلف خطوں کے لیے مخصوص وائس پریذیڈنٹس میں سے پہلا اور واحد وائس پریذیڈنٹ تھا جس کے پاس کام کرنے کی اتنی آزادی اور اختیارات تھے اور جس سے ورلڈ بینک کا بورڈ آف گورنرز ہی نہیں امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ بھی وقتی طور پر دب رہا تھا۔ سالار سکندر ان کا وہ پیادہ تھا جو بیٹھے بٹھائے پیادے سے بادشاہ بن گیا تھا اور اس چیس بورڈ پر موجود تمام اہم مہروں کو یک دم اس کو بادشاہ کی حیثیت دینی پڑ رہی تھی۔
واشنگٹن میں ورلڈ بینک کی نائب صدارت قبول کرنے کے اگلے دن اس نے کنشاسا جانے سے پہلے پہلی بار واشنگٹن میں اہم ترین نیوز چینلز کے نمائندوں کے ساتھ پریس کانفرنس کی۔ وہ پیٹرس ایباکا کی موت کے بعد اس کی پہلی رسمی بات چیت تھی جس میں اس نے کانگو میں ورلڈ بینک کے اس پروجیکٹ کے حوالے سے ماضی میں ہونے والی زیادتیوں کا ازالہ کرنے کی یقین دہانی کراتے ہوئے ورلڈ بینک پر کی جانے والی تنقید کو کھلے دل سے تسلیم کیا تھا۔ اس نے بینک کا دفاع نہیں کیا تھا۔
اس کے ساتھ ایک دن پہلے ہونے والے مذاکرات میں ورلڈ بینک اور امریکی انتظامیہ نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ نائب صدر کے طور پر ورلڈ بینک کی پالیسیوں کا دفاع کرتے ہوئے ورلڈ بینک کی صفائی پیش کرے اور وہاں یہ نہ بتائے کہ ورلڈ بینک نے اس کی رپورٹ ابتدائی اسٹیج پر رد کر دی تھی اور اسے استعفیٰ دینے کا کہہ دیا تھا مگر سالار سکندر نے ورلڈ بینک کی افریقہ میں ماضی کی کسی بھی پالیسی کے دفاع سے انکار کر دیا تھا ہاں وہ اس بات پر رضامند ضرور ہو گیا تھا کہ وہ اپنی رپورٹ کو رد کرنے کے حوالے سے ورلڈ بینک کی انتظامیہ کو موردِ الزام نہیں ٹھہرائے گا اور صرف یہی کہے گا کہ ورلڈ بینک کی انتظامیہ نے اس کی رپورٹ کے مندرجات کو دیر سے پڑھا اور پھر اس پر ایکشن لیا۔
ورلڈ بینک کی انتظامیہ اس پر نیم دلی سے رضامند ہو گئی لیکن ان کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ کچھ نیوز چینلز نے ورلڈ بینک کے کانگو آفس کے کسی ملازم کے ذریعے ان ای میلز کا ریکارڈ اپنے پروگرام میں پیش کر دیا جن میں کئی مہینے پہلے ورلڈ بینک نے سالار سکندر کی اس رپورٹ کے حوالے سے اس کے خلاف سخت ایکشن لینے اور نادہی

کارروائی کی دھمکی دیتے ہوئے اسے استعفیٰ دینے کے لیے کہا تھا۔ یہ ورلڈ بینک کے لیے ایک اور جھٹکا تھا اور سالار سکندر کی ساکھ کو بڑھانے میں معاون ایک اور اہم پیش رفت۔

سالار سکندر کی پریس کانفرنس ورلڈ بینک کی انتظامیہ کے لیے کھسیاہٹ کا باعث ہونے کے باوجود صرف اس لیے حوصلہ افزا تھی کیونکہ اس میں سالار سکندر نے افریقہ کے بدترین معاشی اور معاشرتی حالات میں ورلڈ بینک سے ہونے والی غلطیوں کے باوجود اس کی وہاں ضرورت اور کردار کی اہمیت پر زور دیا تھا' خاص طور پر دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں۔

اس کی اس پہلی پریس کانفرنس کی اہم باتیں افریقہ کے بڑے بڑے اخبارات نے اگلے دن ہیڈ لائنز کے طور پر لگائی تھیں۔ کانگو کے عوام کے لیے سالار سکندر کا چہرہ استحصالی سامراج کا چہرہ نہیں تھا ان کے لیے وہ پیٹرس ایباکا کے ایک قریبی اور قابل اعتماد ساتھی کا چہرہ تھا' جو ان میں سے نہ ہونے کے باوجود ان کے لیے درد رکھتا تھا۔ اور کیوں رکھتا تھا؟ اس کا جواب اس نے پیٹرس ایباکا کی آخری رسومات میں شریک افریقہ کے لاکھوں عوام کے مجمع کے سامنے پیٹرس ایباکا کی زندگی اور اس کی خدمات کے لیے پیش کیے جانے والے خراج تحسین میں دیا تھا۔

وہ کانگو میں آنے کے بعد پیٹرس ایباکا کی میت واپس آنے سے پہلے کانگو کے طول و عرض میں ہر اس قبائلی لیڈر سے ملا تھا جو پیٹرس ایباکا کا ساتھی تھا اور جو قبائلیوں میں تھوڑا بہت اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ پیٹرس ایباکا کے خاندان نے اس کی موت کے بعد کسی بھی غیر ملکی ادارے یا حکومت کے نمائندوں سے ملنے سے انکار کر دیا تھا لیکن سالار سکندر کی ملاقات کی درخواست کو انہوں نے رد نہیں کیا تھا۔ وہ اس سے بے حد خوش دلی اور احسان مندی سے ملے تھے۔ سالار سکندر نے پیٹرس ایباکا کی آخری ای میل انہیں دی تھی جو اس نے سالار کو کی تھی۔ اس ای میل کا پرنٹ آؤٹ اگلے دن بڑے بڑے مقامی اخبارات میں شائع ہوا تھا۔

افریقہ اب پیٹرس ایباکا کے جسد خاکی کے استقبال اور اس کی تدفین کی تیاریاں کر رہا تھا اور سالار سکندر صرف ایک کوشش کہ وہاں متوقع لاکھوں کا مجمع ایک بار پھر سے اس طرح مشتعل ہو کر غیر ملکی سفارت خانوں اور اداروں اور غیر ملکیوں پر حملہ نہ کرے۔

امریکی حکومت ابتدائی طور پر اس کی میت کو واپس بھیجنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ امریکی شہریت بھی رکھتا تھا اور وہ اس کی میت کی "قانوناً" مقامی طور پر تدفین کر سکتے تھے کیونکہ انہیں یہی خدشہ تھا کہ پیٹرس کی تدفین کے لیے اکٹھا ہونے والا مجمع ایک بار پھر سے کانگو میں قتل و غارت کا بازار گرم کر سکتا تھا۔ کانگو کی حکومت بھی مقامی دباؤ کے باوجود ایباکا کی میت واپس لینے سے انکاری تھی مگر یہ سالار سکندر کے ساتھ ملاقات میں ایباکا کی فیملی کا دباؤ اور اصرار تھا کہ وہ ایباکا کی میت کی واپسی ممکن بنائے اور وہ اس بات کی گارنٹی دینے پر تیار تھے کہ ایباکا کی تدفین پرامن ہوگی۔

سالار سکندر نے ورلڈ بینک کی انتظامیہ کے ذریعے امریکی حکومت کو یہ بات باور کرائی تھی کہ ایباکا کی لاش کی باعزت واپسی کانگو اور افریقی عوام کے دلوں میں اس غصے کو ختم کرنے میں معاون ثابت ہوگی جو اس کے مردہ جسم کو امریکہ زبردستی وہیں رکھ کر بڑھا رہا تھا۔ امریکی حکومت' اس کے کانگو واپسی کے دو ہفتے بعد ایباکا کی میت واپس بھیجنے پر تیار ہوئی تھی۔

کانگو کی حکومت نے غیر ملکی حکومتوں کے ان نمائندوں سے جو تدفین میں شریک ہونا چاہتے تھے معذرت کر لی تھی کہ وہ ایباکا کی تدفین میں شریک ہونے والے لاکھوں افراد کے متوقع ہجوم میں نہ تو انہیں تحفظ فراہم کر سکتے ہیں نہ ان کی حفاظت کی ضمانت۔ ورلڈ بینک کی انتظامیہ اور اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ نے سالار سکندر کو بھی ایباکا کی آخری رسومات میں شریک ہونے سے روکا تھا جس کے لیے اسے ایباکا کی فیملی نے مدعو کیا تھا اور سالار نے اس دعوت

نے کو قبول کر لیا تھا۔
امامہ بھی اس کے اس فیصلے سے ناخوش اور خوف زدہ تھی اور اس نے اسے سمجھانے اور روکنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ وہ اس وقت تک یہ کوشش کرتی رہی تھی جب تک ایبا کا کی لاش کنشاسا پہنچ گئی اور اسی شام اس کی تدفین کے انتظامات ہو رہے تھے۔
سالار سکندر اس کی اس منت سماجت کے دوران ایئرپورٹ جانے سے پہلے دو نفل پڑھنے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا اور وہ بے بسی سے بچوں کو لیے بیٹھ گئی تھی۔
"اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم بچوں کو لے کر فوری طور پر پاکستان چلی جانا۔ اس انتظار میں مت بیٹھی رہنا کہ میری ڈیڈ باڈی مل جائے۔"
اس نے نفل پڑھنے کے بعد یہ جملہ اس سے یہی کہا تھا۔ وہ اس وقت اپنے بیڈ روم میں تھا۔ بچے سوٹ کے دوسرے کمرے میں تھے اور امامہ ان کے پاس سے اٹھ کر اسے سمجھانے آئی تھی اور اس کی نماز ختم ہونے کے انتظار میں بیٹھی تھی اور اس نے جاء نماز تہہ کرتے ہوئے ۔۔۔ بڑے اطمینان کے ساتھ یہ کہا تھا۔
امامہ کے دل پر چوٹ پڑی۔ "تم بہت بے رحم ہو" اس نے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے سالار سے کہا۔
"تم سے کم۔" سالار نے ہنستے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔
پھر وہ دوسرے کمرے میں اپنے بچوں سے ملنے آیا تھا۔ جبریل باپ کے ساتھ ہی دروازے تک چلا آیا۔
دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے امامہ کو خدا حافظ کہا تو اس نے اس کا بازو پکڑ لیا۔
"تم واپس آجاؤ گے نا؟" وہ برستی آنکھوں سے منت بھرے انداز میں اس سے کہہ رہی تھی۔ یوں جیسے وہ اس کی بات نہیں ٹالے گا یا شاید رک ہی جائے۔
اس نے امامہ سے نظریں ملائے بغیر اپنے بازو سے اس کا ہاتھ اٹھا کر اسے نرمی سے چوما اور کہا "ان شاء اللہ" پھر جھک کر اپنی ٹانگ سے چپکے جبریل کو اٹھاتے ہوئے اس کا منہ چوما اور کہا "اپنی ممی اور بہن بھائی کا خیال رکھنا۔"
"I Always do baba" جبریل نے اسے یقین دلایا۔
(بابا! میں ہمیشہ رکھتا ہی ہوں۔)
سالار نے ایک بار پھر اس کا منہ چوما اور اسے کہا۔ "آئی ایم پراؤڈ آف یو!"
سالار نے اسے گود سے اتار دیا اور سب کو خدا حافظ کہا۔ دروازے میں برستی آنکھوں کے ساتھ کھڑی امامہ کو دیکھے بغیر۔

☆☆☆

لاکھوں لوگوں کے ہجوم کے ساتھ سالار سکندر نے ایئرپورٹ پر ایبا کا کی میت کو وصول کیا تھا۔ ان لاکھوں لوگوں کے ہجوم میں سالار سکندر کے علاوہ ایک بھی سفید فام نہیں تھا یہاں تک کہ اس دن کانگو میں اس ایونٹ کو کور کرنے والے نیوز چینلز کا سارا عملہ بھی مقامی تھا۔ کوئی ہتھیاروں سے مسلح اس قبائلی ہجوم میں جانے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا جن کو جان لینے اور جان دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا تھا۔ جو وحشی اور اجڈ تھے اور اپنی بقا کے لیے ہر اس چیز کو خس و خاشاک بنا دینے پر تیار بجوان کے راستے میں دیوار بنتی۔
اور لاکھوں سیاہ فام لوگوں کے ہجوم میں ایک صاف رنگت والا سفید فام تھا جو نسلی طور پر سفید فام نہ ہونے کے

باوجود اپنی صاف رنگت اور ان لوگوں کی سیاہ ترین رنگت کے مقابلے میں سفید فام لگ رہا تھا۔ وہ وہاں نہتا تھا۔ کانگو کی حکومت نے اسے کچھ سیکیورٹی دی تھی مگر اس سیکیورٹی کو ان قبائلیوں نے رد کر دیا تھا جو اس سارے ایونٹ کے انتظامات سنبھالے ہوئے تھے۔ اور سالار سکندر رش تھا اسی دلیری سے اپنے ساتھ ایک بھی گارڈ لیے بغیر اندر چلا گیا تھا۔

دنیا میں کروڑوں TV اسکرینز پر لائیو نشر ہونے والا وہ ایونٹ لاکھوں کے اس ہجوم میں صرف ایک شخص کو فوکس کیے ہوئے تھا اور بار بار۔ تیکھے نقوش والا وہ دراز قامت شخص ایباکا کی آخری رسومات کے موقع پر اسٹیج پر اس کے خاندان کے ساتھ اس مجمع کے سامنے بیٹھا تھا جس میں سے کوئی بھی اس پر گولی چلا تا تو یہ بھی پہچانا نہیں جاسکتا تھا کہ وہ کہاں تھا اور کون تھا؟

اور اگر وہ مجمع اس پر چڑھ دوڑتا تو اللہ کے سوا کوئی نہیں تھا جو اس مجمع کے ہاتھوں اس کی بوٹیوں کے بھی ٹکڑے ہونے سے روک سکتا۔ اور یہ احساس سالار سکندر کو اس اسٹیج پر ان لاکھوں لوگوں کے سامنے بیٹھے پر ہو رہا تھا۔ جو ایباکا کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے کی جانے والی قبائلی سرداروں کی جوشیلی تقریروں میں اس سامراج کی تباہی کے لیے نعرے بلند کر رہے تھے جن کا ساتھی بن کر وہ وہاں بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل پر لاکھوں لوگوں کی ہیبت طاری ہو رہی تھی اور اس کی زبان پر قرآنی آیات کا ورد تھا۔

یہ احساس ہونے کے باوجود کہ اللہ اس سے خفا تھا وہ اللہ ہی کو پکار رہا تھا۔

امریکہ میں سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز اور ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں اسکرین پر نظر آنے والا وہ شخص ان سب کو اپنی ہیبت میں لے رہا تھا جن کا ڈنکا پوری دنیا میں بجتا تھا۔ دلیری ہو تو ایسی ہو۔ جرأت ہو تو یہ۔

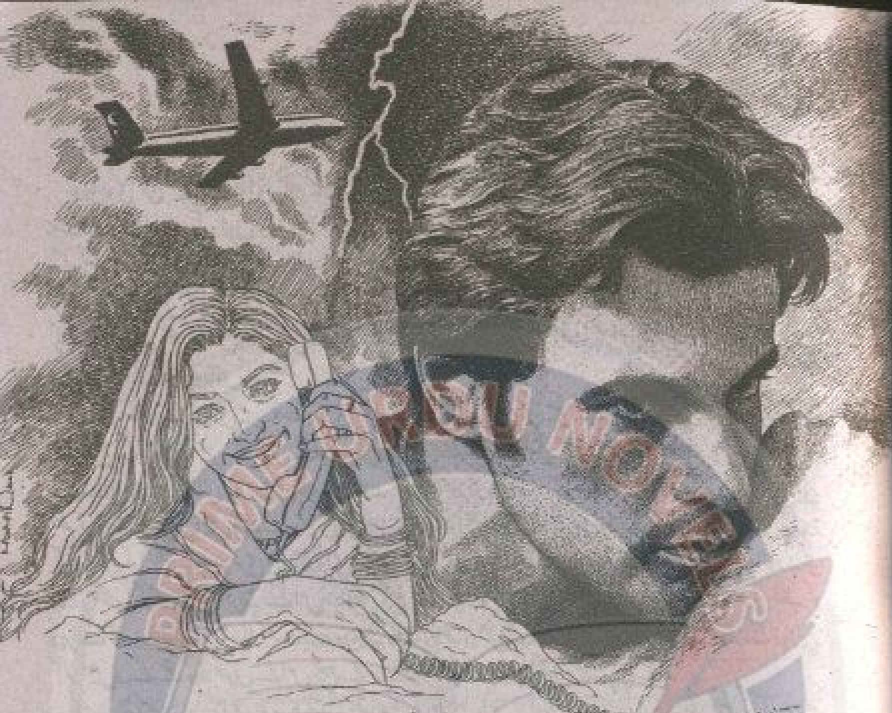
وہ گنگ تھے، دم بخود تھے۔ اور مرعوب۔

وہ شخص اب پیٹرس ایباکا کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اپنی نشست سے اپنا نام پکارے جانے پر اٹھ رہا تھا۔ لاکھوں کا مجمع اس کے لیے جواباً "تالیاں بجا کر داد و تحسین دے رہا تھا۔

چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد۔ تیکھے نقوش اور سنجیدہ چہرہ۔ سیاہ تھری پیس سوٹ میں وہ وجاہت اور وقار کی ایک خوب صورت مثال تھا۔ جو اس وقت پوری دنیا کے کیمروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس اسٹیج کے بالکل اوپر کافی بلندی پر ایک بلیک ہاک ہیلی کاپٹر میں سی آئی اے کے کچھ کمانڈوز۔ اس مجمع کو ٹیلی اسکوپس سے مانیٹر کر رہے تھے۔ چند اور بلیک ہاکس آس پاس کی عمارتوں کو۔ وہ سالار سکندر کی حفاظت اور زندگی کے لیے اس وقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

سالار سکندر روسٹرم کے پیچھے پہنچ گیا تھا۔ مجمع کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ اب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے کے بعد قرآنی آیات کی تلاوت کر رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)



1۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ جیسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ ہجے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی، اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

تیرہویں قسط

یا مجیب السائلین

وہ ٹی وی آن نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن بے چینی کے باعث ٹی وی بند کر کے بھی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں کروڑوں لوگوں کی طرح امامہ نے بھی ہوٹل کے کمرے میں سالار سکندر کو اس اسٹیج پر لاکھوں کے مجمع کے سامنے تقریر کا آغاز کرتے سنا اور دیکھا تھا۔ وہ سرد اور تقریباً "بے حس و حرکت وجود کے ساتھ کسی بت کی طرح اس شخص کو ٹی وی پر دیکھ رہی تھی۔ گو اس کے وجود میں کہیں حرکت تھی تو اس کے دل کے دھڑکنے کی۔ جو اتنی بلند تھی کہ اس وقت اس کے پاس بیٹھا کوئی شخص بھی سن سکتا تھا یا پھر اس زبان پر اس شخص کی زندگی کے لیے کی جانے والی دعاؤں کی بھنبھناہٹ جنہیں اللہ سن رہا تھا۔

سالار سکندر نے زندگی میں بہت ساری تقریریں کی تھیں لیکن ان میں سے کوئی تقریر بھی لاکھوں کے ایک ایسے مجمع کے سامنے نہیں کی تھی جس سے وہ انسانی ہمدردی کے علاوہ اور کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔

وہ Lingala (مقامی زبان) میں ان سے بات کر رہا تھا اور جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ ترجمہ ہو کر ٹی وی کی اسکرین پر نظر آ رہا تھا۔ پوری دنیا میں کی جانے والی ٹی وی کوریج میں سواحلی اور لنگالا میں کی جانے والی وہاں کے مقامی لیڈرز کی ہر تقریر کو انگلش اور دوسری بین الاقوامی زبانوں میں ترجمہ کر کے پیش کیا جا رہا تھا۔ نہ امامہ کو اندازہ تھا اور نہ ہی سالار سکندر کو کہ وہ آج افریقہ کے اس سیاہ فام مجمع کے سامنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبہ کو دہرائے گا۔ وہ الفاظ جن کی بازگشت سے وہ ہمیشہ بچتا رہا تھا وہ اس کے لاشعور سے تصور کا سفر طے کر کے زبان پر آ کر نہیں رکے تھے، وہ لاکھوں کے اس مجمع کے سامنے ادا ہو کر کروڑوں لوگوں تک پہنچے تھے۔

اس نے بسم اللہ سے اپنی تقریر کا آغاز کیا تھا ہمیشہ کی طرح۔ اس نے مجمع کو قرآنی آیات سنائی تھیں۔ کہ عزت اور ذلت صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کے بعد اس نے سر اٹھا کر مجمع کو دیکھا تھا اور پھر جیسے اس کا ذہن خالی ہو گیا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ بھول گیا تھا کہ اسے وہاں کیا کہنا تھا۔ اس نے سر جھکا کر دوبارہ روسٹرم پر رکھے اس کاغذ پر نظر دوڑائی تھی جس پر اس نے اس تقریر کے نکات لکھے تھے۔ وہ ساری عمر صرف نکات نوٹ کر کے ہی تقریریں کرتا رہا تھا۔ اپنی یادداشت اور اپنے علم پر ایسا ہی اندھا یقین رکھتا تھا۔ اور اب وہ بالکل خالی ذہن کے ساتھ ہونقوں کی طرح اس مجمع کو دیکھ رہا تھا جو اس کے اگلے الفاظ کے منتظر تھے۔ اس کے پچھلے الفاظ ان کے سر سے گزرے تھے۔ افریقہ کے وہ قبائل جو اس وقت وہاں اکٹھے تھے وہ آج بھی اللہ کی عبادت نہیں کرتے تھے، نہ ہی اللہ کے وجود کو پہچانتے اور مانتے تھے۔ وہ بہت سی دوسری چیزوں کو اعلیٰ تر مانتے تھے۔ ان کے لیے وہ رب (جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے) بھی اتنا ہی ناآشنا تھا جتنا وہ "رب جو عزت اور ذلت عطا کرنے پر قادر تھا"۔ سالار سکندر کو اب ایسا اور کیا کہنا تھا جو سمجھ میں آتا اور بہت آسانی سے آتا اور یہی وہ لمحہ تھا جب اسے آخری خطبہ یاد آیا تھا۔

"میں ایک ایسی آرگنائزیشن کا حصہ ہوں جس نے ماضی میں اس خطے اور آپ لوگوں کے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں۔ آپ لوگوں کو کمتر سمجھا گیا۔ آپ لوگوں کے حقوق چھینے گئے، آپ لوگوں کے وسائل اور اثاثوں پر ناجائز قبضہ کیا گیا۔ میں اس سب کے لیے آپ سے معذرت خواہ ہوں کیوں کہ میں ایک ایسے مذہب کو ماننے والا ہوں جو یہ سب "گناہ" قرار دیتا ہے۔ میں ایک ایسے مذہب کا ماننے والا ہوں جس کے پیغمبر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) امانتوں میں خیانت سے منع کرتے تھے۔ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرنے کی تلقین کرتے تھے جو اپنے لیے۔ جنہوں نے بتایا "کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر برتری حاصل نہیں ہے۔" وہ انسانی مساوات کی بات کرتے تھے۔ ذات پات، رنگ و نسل، چھوت چھات کو نہیں مانتے تھے۔

سالار سکندر حافظ تھا، مبلغ نہیں تھا۔ مقرر تھا، مفسر نہیں تھا۔ زندگی میں اس نے کبھی اپنے پروفیشن میں مذہب کو لانے کی کوشش نہیں کی تھی وہ آج بھی اس نیت سے وہاں نہیں آیا تھا پر اس وقت جو بھی اس کی زبان سے نکل رہا تھا وہ دل کی آواز تھی اور دلوں تک جا رہی تھی۔

افریقہ میں غیر انسانی حالات میں رہنے والا وہ سیاہ فام مجمع اس کی باتیں سن رہا تھا اور اب پہلی بار ساکت وصامت خاموشی کے ساتھ سن رہا تھا۔ اور اس خاموشی کو ایک بے اختیار داد و تحسین نے توڑا تھا۔ یہ داد سالار سکندر کے جملے پر نہیں ملی تھی۔ یہ داد نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخر الزماں کے آخری خطبے کے ایک بنیادی فلسفے کو ملی تھی۔ وہ اللہ کا پیغام تھا جو آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے چودہ سو سال پہلے آیا تھا اور آج چودہ سو سال بعد بھی وہ پیغام دلوں کو تسخیر بھی کر رہا تھا، ان پر مرہم بھی رکھ رہا تھا۔ اس لیے کہ وہ پیغام انسانیت کے لیے تھا۔ قیامت تک کے لیے تھا۔ ہیڈ کوارٹرز میں بیٹھے لوگ اب بھی دنگ تھے۔ لاکھوں کا وہ مجمع اس آدمی کو اپنے رعب میں نہیں لے پایا تھا لیکن اس آدمی کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ اس لاکھوں کے مجمع کو جیسے اس کی مٹھی میں لے آئے تھے۔ سالار سکندر نے وہ اسم اعظم پڑھتے ہوئے افریقہ کی نبض پر ہاتھ رکھا تھا جو چودہ سو سال پہلے بھیج دیا گیا تھا۔

امامہ بھی دم بخود تھی۔ وہ شخص کس جگہ کھڑا کیا دہرا رہا تھا اور اگر اسے اس آخری خطبہ کا یہ حصہ یاد تھا تو یہ کیسے ممکن تھا باقی حصہ یاد نہ ہوتا۔ اور یاد تھا تو اس لیے کہ وہ کہیں گزر گیا تھا۔

"یہ لوگ بابا کے لیے تالیاں کیوں بجا رہے ہیں؟"

وہ جبریل کے سوال پر جیسے چونک پڑی تھی وہ اس کے پاس بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ امامہ صرف اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔

تالیوں کی گونج اب تھم رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک بجتی رہی تھیں۔ اتنی دیر تک کہ سالار سکندر کو یاد آ گیا تھا کہ اسے آج وہاں کیا کہنا تھا لیکن اب اپنے بھولے ہوئے الفاظ یاد آنے پر اسے خوشی نہیں ہوئی تھی۔ تاثیر اس میں تھی جو بھول کر یاد آیا تھا۔

"میں افریقہ میں اپنے مذہب کے ان ہی اصولوں اور اسی سوچ کے ساتھ کام کرنے آیا ہوں اور کام کروں گا اور میں آپ لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مجھے یہ احساس ہوا کہ میں ان اصولوں پر آپ لوگوں کی فلاح کے لیے کام نہیں کر سکتا تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ لیکن میں ان طاقتوں کے ہاتھ مضبوط نہیں کروں گا۔ جن کے خلاف پیٹرس ایباکا نے جنگ کی اور جن سے لڑتے ہوئے اس نے جان دی۔"

سالار سکندر کہہ رہا تھا۔

"لیکن ایباکا نے اپنی جان اس لیے قربان نہیں کی کہ وہ اپنے لوگوں کو بدترین حالات میں جیتا دیکھے۔ وہ اپنے لوگوں کے لیے خواب دیکھتا تھا ایک اچھی زندگی کے خواب۔"

سالار سکندر اب انہیں ایباکا کی آخری ای میل سنا رہا تھا۔

"میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں جب تم سے پہلی بار ملا تھا تو میں اس جنگ میں ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ ناامیدی اور مایوسی کے علاوہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہو رہا تھا اور میں بہت کمزور تھا۔

میں ان دیووں کے سامنے واقعی ایک ہیچ تھا جو میرے ملک کو لوٹنے آئے تھے اور میں کچھ کر نہیں پا رہا تھا اپنے لوگوں کے لیے اور پھر میں تم سے ملا اور مجھے لگا مجھے ابھی ہتھیار نہیں ڈالنے چاہئیں۔ ابھی امید زندہ ہے تمہاری صورت میں [illegible]

لے آئی کہ اب چند دنوں میں پوری دنیا کانگو کے بارے میں بات کرے گی۔ ہم چھوٹے کالے بدصورت معمولی انسانوں کے بارے میں۔ جو دنیا میں مفتوح اور غلام بننے نہیں آئے۔ مجھے یقین ہے اب کانگو کی تاریخ بدلنے والی ہے۔ میرے لوگ اب ایک اچھی زندگی جئیں گے۔ انسانوں جیسی زندگی جانوروں جیسی نہیں۔"

مجمع سالار سکندر کے ہر جملے پر دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ وہ ایباکا کی آخری ای میل نہیں پڑھ رہا تھا، وہ ایباکا کی آخری وصیت تھی جو صرف سالار سکندر کے پاس تھی۔

"اور ایباکا جو خواب کانگو کے لیے دیکھتا تھا وہ بھوک، جنگ اور بیماری کا خواب نہیں تھا وہ امن اور انسانیت پر یقین رکھتا تھا اور زندگی کے آخری لمحے تک وہ امن ہی کی بات کرتا رہا اور یہ امن وہ اپنے لیے نہیں آپ لوگوں کے لیے چاہتا تھا۔ اپنے لوگوں کے لیے ایباکا کو اس سے بڑا خراج تحسین آپ تب تک پیش نہیں کر سکیں گے جب تک اس کانگو کو ایک جدید، ترقی یافتہ قوم اور ملک نہ بنا دیں اور کانگو یہ کر سکتا ہے۔ ہم سب مل کر یہ کر سکتے ہیں اور میں اور میرا ادارہ 'پیٹرس ایباکا' کا یہ خواب پورا کرنے میں آپ لوگوں کے ساتھ کھڑا ہے۔ ہم جانے والے کل کو نہیں بدل سکتے۔ آنے والا کل ہمارے ہاتھ میں ہے۔ میری خواہش ہے کہ اکیسویں صدی کا کانگو ایباکا جیسے اور بہت سے لیڈرز پیدا کرے۔ جو ترقی، امن اور کانگو کے بہتر مستقبل کا تصور لے کر آگے چلیں اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل ہو جائیں۔ یہ میرا پیغام نہیں ہے یہ ایباکا کا پیغام ہے۔ جو کسی مذہب پر کاربند نہیں تھا لیکن اللہ کے وجود کو مانتا تھا اور یہ زمین اللہ کی ہے اللہ کے بندوں کے لیے ہے۔ کسی غاصب کے لیے نہیں ہے۔ سامراج کے لیے نہیں ہے۔ آپ کے لیے ہے۔ کانگو کے لوگوں کے لیے ہے۔"

لاکھوں کا وہ مجمع جو چند لمحے پہلے تک ایک ناقابل تسخیر پہاڑ لگ رہا تھا اب تسخیر ہو چکا تھا۔ وہ سالار سکندر کے الفاظ پر رو رہا تھا۔ اس کے الفاظ پر تالیاں بجا رہا تھا۔ اس کے الفاظ پر نعرے لگا رہا تھا۔

سالار سکندر اپنی تقریر ختم کر کے روسٹرم سے ہٹ چکا تھا۔ اس کے روسٹرم سے واپس اپنی نشست کی طرف جاتے ہوئے لاکھوں کا وہ مجمع سالار سکندر کا نام پکار رہا تھا۔ افریقہ، سالار سکندر کا نام پکار رہا تھا۔ وہ روسٹرم پر آیا بھی آوازوں کی گونج میں تھا، وہ وہاں سے واپس بھی آوازوں کی گونج میں ہی ہوا تھا لیکن اب ماحول تبدیل ہو چکا تھا۔

وہ دس منٹ کی تقریر کے لیے گیا تھا اور آدھے گھنٹے کے بعد وہاں سے ہٹ سکا تھا۔ اور وہ اس کی زندگی کا طویل ترین آدھا گھنٹہ تھا صرف اس ہی کی نہیں، امامہ کی زندگی کا بھی۔ آنسو صرف اس مجمع کی آنکھوں سے ہی رواں نہیں ہوئے تھے۔ امامہ کی آنکھوں سے بھی برسنے لگے تھے۔ وہ مجمع سالار سکندر کو اپنا نجات دہندہ کے طور پر دیکھتے ہوئے رو رہا تھا اور امامہ اس "نجات دہندہ" کی جان ایک بار بچ جانے پر۔

"آپ کیوں رو رہی ہیں ممی؟" جبریل نے کچھ پریشان ہو کر ماں کو دیکھا تھا جو پچھلے کئی گھنٹوں سے کچھ بھی بولے بغیر گم صم ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی اس کے کسی سوال کا جواب دیے بغیر اور اب ایک دم رونے لگی تھی۔ امامہ نے کچھ بھی کہے بغیر اسے لپٹا لیا۔ انسان روتا کیوں ہے؟ یہ آسان سوال بھی کبھی کبھار الجبرا کا سوال بن جاتا ہے۔

وہ دس منٹ سالار کو جیسے شرم ساری کے سمندر میں ایک بار پھر غرق کر گئے تھے۔ وہ آج جس آخری خطبے کے الفاظ یاد آ جانے اور دہرا دینے پر اپنی عزت بچانے میں کامیاب ہوا تھا۔ وہ آخری خطبہ اس کے اپنے ضابطہ حیات کی عکاسی کیوں نہیں کر پایا تھا۔ اس پر عمل اس کی زندگی کی ترجیحات میں کیوں شامل نہیں تھا۔ یاد دہانی تھی جو اسے بار بار کرائی جا رہی تھی۔ تنبیہہ تھی جو اسے دی جا رہی تھی جو "ارادہ، نیت" تھا اسے "مشن" بنا دینے کے لیے یہ ضروری تھا۔ سالار سکندر ان دس منٹوں کے بعد اسٹیج پر گم صم بیٹھا رہا تھا۔ اس کی زبان پر اب بھی آیات تھیں، شکر کے الفاظ تھے۔ اس رب نے آج بھی ہمیشہ کی طرح اس کی عزت رکھی تھی۔ اس ذات نے اس حافظ قرآن کو دنیا کے سامنے رسوا نہیں کیا تھا اور اس احساس نے صرف تشکر ہی نہیں شرم ساری بھی بڑھائی تھی۔

☆ ☆ ☆

"وہ تمہیں پتا ہے تمہارے اندر خودکشی کرنے کی خواہش آج بھی اسی طرح موجود ہے۔ جس طرح سترہ سال پہلے تھی۔"

سالار سکندر نے لیپ ٹاپ پر آخری ای میل کا جواب دیتے ہوئے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے امامہ کی آخری پھنکار سنی۔ بچے سو چکے تھے اور وہ ہوٹل کی وارڈ روب کھولے پتا نہیں کتنی بار اپنے اور اس کے کپڑوں کو تہہ کر کرکے رکھ رہی تھی۔ کبھی وارڈ روب کے ایک خانے میں۔ پھر دوسرے خانے میں۔ پھر سے پہلے خانے میں۔ اور سالار یہ سب نوٹس کرنے کے باوجود لیپ ٹاپ پر ای میلز چیک کرنے اور اپنے اگلے دن کے شیڈول کو حتمی شکل دینے میں مصروف رہا تھا اور اب جب وہ اپنا کام نمٹا چکا تھا تو وہ امامہ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ وہ پریشان تھی اسے اندازہ تھا۔ جو کچھ آج ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ اس کے ذہنی تناؤ کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" سالار نے لیپ ٹاپ بند کر کے اپنے بیڈ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ وہ دو گھنٹے پہلے ہوٹل واپس آیا تھا اور دو گھنٹے سے اپنا کام لیے بیٹھا تھا اور اب جب کام ختم ہو گیا تھا تو وہ امامہ کی طرف متوجہ ہوا تھا جو اس کی خاموشی اور بے اعتنائی کے مظاہرے پر اب تقریباً "روہانسی" ہو چکی تھی۔

"تمہیں پتا ہے مجھے تمہاری کیوں ضرورت ہے اور میں کیوں فکرمند رہتی ہوں تمہارے بارے میں؟"

وہ اس کے اعتراف پر برہم ہوئی تھی اور بے حد خفگی سے ہاتھ میں پکڑی اس کی شرٹ تیسری بار تہہ کر کے رکھنے کے بجائے اسی طرح وارڈ روب کے خانے میں ٹھونس کر اسے بند کرتے ہوئے سالار کے بیڈ سائیڈ کی طرف آئی تھی۔ "کیوں کہ بچے پریشان ہو جاتے ہیں۔ تم کوئی سپر مین نہیں ہو کہ وہ تمہارے کمالات دیکھ کر تالیاں بجائیں گے۔ لطف اندوز ہوں گے۔ تمہیں کچھ ہو گا تو۔"

وہ بات کرتے کرتے پھر روہانسی ہو گئی۔ بات مکمل نہیں کر سکی۔ وہ گہری خاموشی کے ساتھ اس کی بات سنتا رہا سر جھکا کر۔ پھر اس کے خاموش ہو جانے پر اس نے سر اٹھا کر امامہ کو دیکھا۔ وہ اس کے بالمقابل کھڑی تھی اور وہ بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں لگی ہوئی لائٹس کی زرد روشنی میں اس کی سرخ آنکھیں اور سرخ ناک اس کے روتے رہنے کو چھپنے اور نمایاں کر رہی تھی۔ وہ ان ہی آنکھوں سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ وہ چہرہ اور آنکھیں تھیں جو اسے کھوجنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ بے بس کرنے کی اضافی خصوصیت کے ساتھ۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" جواب پہلے سے مدھم آواز میں آیا تھا اور وہی آیا تھا۔ وہ اور برہم ہوئی۔

"میں مذاق نہیں کر رہی۔" اسے لگا تھا جیسے وہ اسے ہمیشہ کی طرح زچ کر رہا تھا۔

"اب اگر تم نے ایک بار پھر یہ جملہ دہرایا تو میں اس کمرے سے چلی جاؤں گی۔ تمہیں میری ہر بات احمقانہ لگ رہی ہے۔"

"یو آر رائٹ۔" وہ اس بار زچ ہو کر جھلاتے ہوئے ہنس پڑی تھی۔ پھر اس کے پاس بستر پر بیٹھ گئی۔

"آخری خطبہ سنا رہے تھے آج تو سارا سناتے۔ ادھوری بات کیوں کی۔" وہ اب اس پر طنز کر رہی تھی۔

"ہمت نہیں پڑی۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، تم جو بھی کہتی رہی ہو۔ ٹھیک کہتی رہی ہو، پہلے بھی۔ آج بھی۔"

وہ زندگی میں پہلی بار اس کے سامنے ایسا اعتراف کر رہا تھا امامہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ غصہ پہلے بھی نہیں تھا پر جو گلہ تھا وہ بھی یک دم غائب ہوا تھا۔

"پیٹرس ایباکا اپنی زندگی کے آخری لمحے تک امن کے لیے لڑا۔ وہ نیویارک کی ایک سڑک پر اپنی جان بچانے کے لیے لڑ نہیں رہا تھا ان ہی طاقتوں کے آلہ کاروں کے ساتھ جن کے ساتھ تم کھڑے ہو اور جن کے ساتھ تم مل کر افریقہ

کی تقدیر بدلنا چاہتے ہو۔"

اس نے سالار سکندر کو وہ آئینہ دکھایا تھا جو اسے صرف امامہ ہاشم ہی دکھا سکتی تھی۔ "تم سمجھتے ہو وہ تمہیں یہ سب کرنے دیں گے؟"

"تم سمجھتی ہو میں یہ سب کرنا چاہتا ہوں؟" اس نے جواباً اس سے پوچھا تھا اسی انداز میں۔ وہ بول نہیں سکی۔ سوال عجیب تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے پھر امامہ نے پوچھا۔

"پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"میں اپنے لیے ایک باعزت راستہ چاہتا ہوں۔ اپنے لیے، تمہارے لیے، اپنے بچوں کے لیے۔ جس جنجال میں میں اپنے آپ کو اور تم لوگوں کو پھنسا چکا ہوں اس سے نکلنا چاہتا ہوں لیکن میں ایک کنویں سے نکلنے کی کوشش میں کسی دوسرے کنویں میں کودنا نہیں چاہتا۔ جو اس سے زیادہ گہرا اور تاریک ہو۔"

وہ اس کا چہرہ حیرانی سے دیکھتی رہی۔ جس ایشو پر وہ بحث کرنا چاہتی تھی وہ اس پر پہلے ہی گھٹنے ٹیک چکا تھا۔ لیکن جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اور وہ سمجھنا چاہتی تھی۔

"تم کیا کرنا چاہتے ہو سالار؟" وہ ایک بار پھر پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

"میں ایک اسلامی مالیاتی نظام بنانا چاہتا ہوں۔ جو سود سے پاک ہو لیکن جو پوری دنیا کے لیے ہو، باضابطہ، قابل عمل اور جو اس کی جگہ لینے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔" جواب اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ حیرانی سے سالار سکندر کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔ بول ہی نہیں سکی۔ وہ ہمیشہ عجیب باتیں کرتا تھا۔ وہ اب اس کی عادی ہو چکی تھی لیکن جو وہ اب کہہ رہا تھا وہ عجیب ترین تھا۔ وہ اس کی بہت ساری باتوں پر دم بخود ہوتی تھی۔ ہکا بکا بھی۔ لیکن آج اپنی خاموشی کو وہ کس کیفیت کا نام دیتی امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"تمہیں لگتا ہے میں نہیں کر پاؤں گا؟"

بہت دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہنے کے بعد اس خاموشی کو سالار نے توڑا تھا۔ اس نے جیسے امامہ کی کیفیت کو ہی الفاظ میں نہیں ڈھالا تھا بلکہ اس نے اپنے ہر خدشے کو بھی جیسے سوال میں بدل کر امامہ کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہ سوال لاشعور سے آیا تھا۔ یقین سے نہیں اندیشے سے ابھرا تھا۔ جواب نہیں تسلی مانگ رہا تھا۔

"یہ کام دنیا میں اگر کوئی کر سکتا ہے تو وہ صرف تم کر سکتے ہو سالار سکندر۔"

اس بار گنگ ہونے کی باری سالار کی تھی۔ یہ جواب نہیں تھا، وہ اعتماد تھا جس کی اسے ضرورت تھی۔ اس کا خون بڑھا تھا اور سیروں کے حساب سے بڑھا تھا۔ اس نے امامہ کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ اس کے جواب نے اسے تسلی اور دلاسے کی وہ تھپکی دی تھی جو اس کا بوجھ ہٹا گیا تھا۔

"تھینک یو۔" امامہ کی طرف دیکھے بغیر سر جھکائے سالار نے اپنا تشکر اس تک پہنچایا تھا۔ وہ غیر متوقع جواب تھا۔ شکریہ کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی تھی امامہ کو۔ لیکن وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی یوں جیسے منتظر تھی کہ وہ کچھ اور کہے گا۔

"تمہیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔" بالآخر سالار نے کہا تھا، وہ ہنس پڑی یوں جیسے اس نے کوئی عجیب بات کہی تھی۔

"تم مشکلات کی بات مجھ سے کر رہے ہو سالار؟" سالار نے اسے دیکھا۔ انداز استہزائیہ تھا پر سوال نہیں تھا وہ۔

"زندگی میں بڑے برے دن گزارے ہیں میں نے۔" اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

"لیکن وہ برے دن میری وجہ سے نہیں آئے تھے اب شاید میری وجہ سے بھی آئیں۔ سب سے مشکل چیز

یہی ہے میرے لیے کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں۔ اس کے اثرات تم تک اور بچوں تک آئیں گے۔ واحد کمزور کرنے والی شے یہی ہے مجھے۔ اپنے آپ پر آنے والی مصیبتیں تو برداشت کر لیتا ہے انسان لیکن بیوی بچوں کو پہنچنے والی تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔"

سالار کو یہ بات کرتے ہوئے وہ لمحات یاد آئے تھے جو اس نے واشنگٹن میں امامہ اور بچوں کی زندگی اور سلامتی کے لیے امید اور ناامیدی کے عالم میں گزارے تھے۔

"تم یہ مت سوچو۔ جو کرنا چاہتے ہو وہ کرو۔ باقی دیکھا جائے گا۔ زندگی اس سے بدتر تو بہرحال نہیں ہوگی جیسی میں گزار آئی ہوں۔ باقی سب کچھ تو سہا جا سکتا ہے۔"

امامہ کو اس وقت یہ بات کرتے ہوئے اندازہ نہیں تھا کہ جن مشکلات سے سالار خوف زدہ تھا یہ وہ مشکلات نہیں تھیں جن کا وہ سوچ رہی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی وہ صرف مالی مسائل کے حوالے سے اسے متنبہ کر رہا تھا۔

"میں سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی۔ بچپن سے دنیا کی ہر نعمت ملی۔ روپے پیسے کے بارے میں کبھی سوچنا نہیں پڑا۔ وہ وقت گزر گیا پھر ایک وقت آیا جب اپنی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتی تھی۔ دوسروں کے سر پر محتاجی کی زندگی گزارنی پڑی۔ نوکری کرنا پڑی۔ ضروریات پوری ہوتی تھیں لیکن اپنی خواہشات اور آسائشات والی زندگی نہیں رہی تھی۔ وہ وقت بھی گزر گیا۔ پھر تمہارے ساتھ گزرے پچھلے سات سال میں دنیا کی ہر نعمت ہر آسائش ملی۔ پہلے سے بڑھ کر پہلے سے بہتر۔ میری توقعات اور سوچ سے بھی زیادہ۔ لیکن میں یہ بھی نہیں بھولی کہ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ چیزوں کی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ کبھی نہ کبھی مل جاتی ہیں۔ صرف انسان ہیں جن کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ وہ نہیں ملتے۔" وہ بات کرتے ہوئے رنجیدہ ہوئی تھی۔ "تو جب تک بچے اور تم میرے پاس ہو باقی کسی چیز کی پرواہ نہیں ہے مجھے۔ کم زیادہ۔ میں سب میں گزارہ کر سکتی ہوں۔"

اس نے سالار کو دیکھا۔ وہ خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ وہ اسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اور بچے بھی اس سے چھن سکتے تھے جیسے اس سے چھین لیے گئے تھے اور ہر آزمائش مال سے شروع ہو کر مال پر ختم نہیں ہو جاتی۔ لیکن وہ امامہ سے ابھی کچھ اور کہنا نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم آج کا تناؤ بھرا دن اسے دینے کے بعد وہ اسے مزید کسی خدشے اور اندیشے میں مبتلا کر کے اس کو رات بھی سولی پر لٹکا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

"تم یہ سب کیسے کرو گے؟ کسی کے ساتھ مل کر؟" امامہ نے بالآخر ذہن میں ابھرنے والا وہ سوال اس سے پوچھا جو اس کے دماغ میں کلبلا رہا تھا۔

"پتا نہیں۔" جواب عجیب مسکراہٹ کے ساتھ آیا تھا اور بے چارگی والی ایک کیفیت کے ساتھ بھی۔ اور وہ ایک بار پھر اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی تھی لیکن اسے یقین تھا۔ سالار سکندر اپنے لائحہ عمل کے بارے میں اتنا لاعلم نہیں تھا جتنا اس نے اپنے آپ کو ظاہر کیا تھا۔

"یہ کہو نا کہ تم مجھے بتانا نہیں چاہتے۔"

"بتانے کا فائدہ نہیں۔ کم از کم اس اسٹیج پر جب ہر نکتہ صرف ایک خیال اور سوچ ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔"

سالار نے کہا اور بات کرتے ہوئے پہلی بار اس کی نظر امامہ کے ہاتھ میں پہنی اس انگوٹھی پر پڑی تھی جو اس نے اسے شادی کے تحفے کے طور پر دی تھی۔ وہ بے حد حیرانی کے عالم میں اس انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے کچھ بولنا بھی بھول گیا تھا۔ امریکہ سے واپس آنے کے بعد اور ان تمام حالات سے گزرنے کے بعد آج اتنے ہفتوں بعد وہ پہلی بار اس کے ہاتھ میں وہ انگوٹھی دیکھ رہا تھا بلکہ اس کے جسم پر کوئی زیور دیکھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ انگوٹھی بھی اس گھر میں موجود لاکر میں پڑے دوسرے زیورات کے ساتھ جل گئی تھی اس آتشزدگی میں اور اب اس جگمگاتی بیش قیمت

انگوٹھی کو اس کی تیسری انگلی میں سجا دیکھ کر سالار سکندر کو ایک عجیب خوشی ہوئی تھی۔ ناقابل بیان خوشی۔ اس نے امامہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ کہاں سے آئی؟" گفتگو کا موضوع عجیب انداز میں بدلا تھا۔

امامہ ہنسی اور اس نے اس کی ہتھیلی پر ہی اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ بڑے جتانے والے انداز میں۔ اسے سالار کی خوشی اور کیفیت کا اندازہ تو نہیں ہوا تھا لیکن خود وہ اس انگوٹھی کو دیکھ کر کھل سی گئی تھی۔ اس گھر میں ضائع ہو جانے والے تمام زیورات میں اگر اسے کسی زیور کا غم تھا تو وہ یہ انگوٹھی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی جذباتی وابستگی تھی۔ وہ دیر سے ملا تھا لیکن منہ دکھائی کا تحفہ تھا اور اس کے ہاتھ میں جب جب وہ پہنی ہوئی ہوتی تھی۔ وہ دیکھنے والے کو اپنی خوب صورتی سے مبہوت کرتی تھی۔ امامہ اس کی قدر تو جانتی تھی لیکن اس کی قیمت کا اندازہ آج بھی نہیں تھا۔ اسے یہ تو پتا تھا کہ وہ بیش قیمت تھی کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی فنکشن میں اسے پہن کر گئی ہو اور کسی نہ کسی نے اسے سراہا نہ ہو۔ اسے داد نہ دی ہو اور اس انگوٹھی کی قیمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہو۔ اس کا کھو جانا امامہ کے لیے عجیب کسک کا باعث بنا تھا۔ وہ اسے ہر وقت ہاتھ میں نہیں پہنے رکھتی تھی۔ کبھی پہنے رکھتی تھی۔ کبھی اتار دیتی تھی لیکن وہ جب بھی گھر میں زیور اتارتی تھی تو اسے لاکر میں ہی رکھتی تھی۔ یہ سالار کی ہدایت تھی۔ یہ کانگو تھا۔ ان کے ملازمین قابل اعتماد اور ایمان دار تھے اور چھان پھٹک کر رکھے گئے تھے لیکن وہ بے حد غریب تھے اور وہ زیورات کی شکل میں ان کے سامنے ترغیبات چھوڑ کر ان کو آزما کر نقصان اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔

حمین کی پیدائش کے بعد سالار کے واپس کانگو آنے پر امامہ کو پہلی بار اس انگوٹھی کا خیال آیا تھا جب اسے بالآخر یہ پتا چل گیا تھا کہ گھر میں کچھ بھی نہیں بچا۔ سب کچھ جل گیا ہے یا لوٹ لیا گیا ہے۔ امریکن ایمبیسی کے اسپتال میں قیام کے دوران امامہ کو یہ یاد نہیں آیا تھا۔ اس نے آخری بار وہ انگوٹھی کب اتاری تھی۔ اس نے آخری بار اپنے گلے میں پہنی ہوئی چین کب اتاری تھی۔ اپنے بندے کب اتارے تھے اس کا خیال تھا یہ کام اس نے اسپتال چیک اپ کے لیے جانے سے پہلے کیا تھا۔ لیکن صرف خیال تھا اسے ٹھیک سے یاد نہیں تھا اور وہ اس کی وجہ اینستھیزیا کو سمجھتی تھی جو اسے سرجری کے لیے دیا گیا تھا لیکن جو اس کی یادداشت کو گڑبڑانے کا باعث بن رہا تھا۔

لیکن آج سالار سکندر کے آنے سے دو گھنٹے پہلے پاکستان کے لیے پیکنگ کرتے ہوئے اس نے اپنا ہینڈ بیگ تبدیل کرنے کے لیے اس میں سے چیزیں نکال کر ایک نئے ہینڈ بیگ میں منتقل کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ وہ ہینڈ بیگ تھا جو اسپتال جانے سے لے کر اب تک اس کے زیر استعمال تھا اور اب کچھ دن پہلے بازار سے ایک ہینڈ بیگ خرید کر وہ پرانے ہینڈ بیگ کے اندر موجود چھوٹی بڑی بہت ساری جیبوں کو کھنگال رہی تھی اور ان ہی چھوٹی بڑی جیبوں میں سے ایک جیب کے اندر وہ چھوٹا سا پاؤچ نکلا تھا اور اسے ہاتھ میں لیتے ہی چند لمحوں کے لیے امامہ کی سانس ہی رک گئی تھی۔ ایک جھماکے کے ساتھ اسے یاد آیا تھا کہ اس نے اپنے جسم پر موجود زیور سرجری کے لیے تیار ہوتے ہوئے اتار کر اس بیگ میں رکھا تھا اور پھر یہ بیگ بیڈی کو دے دیا تھا اور ان تمام ہفتوں میں اس بیگ کو اس نے کئی بار ضرورتاً کھولا تھا لیکن کبھی بھی اس نے اسے کھنگالا نہیں تھا۔ شاید کھنگال لیتی اگر اس کی زندگی نارمل حالات سے گزر رہی ہوتی۔

ہاتھ سے پاؤچ کو ٹٹولتے ہوئے اس کے دل کی ــــ دھڑکن خوشی سے بڑھی تھی اس کے اندر زیور تھا اور انگوٹھی بھی۔ وہ اس پورے دن کی ذہنی اذیت کو منٹوں میں غائب کر دینے والی خوشی تھی جو اس لمحے اس پاؤچ کو کھول کر اپنے ہاتھ میں اس انگوٹھی کو لے کر اس نے جو چیز محسوس کی تھی۔ اور وہ بیڈی کی ایمان داری بھی تھی

جس نے کئی دن اس بیگ کو اپنے پاس رکھنے کے باوجود اسے ایک امانت کی طرح کسی خیانت کے بغیر امامہ کو لوٹایا تھا۔

وہ شکر کا ایک اور لمحہ تھا امامہ کے لیے جس نے بھیگتی آنکھوں کے ساتھ اس انگوٹھی کو اپنے ہاتھ میں دوبارہ پہنا تھا پھر سونے کی چین کو اور پھر ان کانوں کے بندوں کو اور وہ یہ سرپرائز سالار کو دینے سے پہلے ہی بھول گئی تھی اور اب سالار نے اس کے ایئر رنگز اس کی چین کو نوٹس نہیں کیا تھا اور وہ اس انگوٹھی پر اٹک گیا تھا۔

"تم نے میرے ایئر رنگز اور چین نہیں دیکھی۔" وہ اب اسے وہ دونوں چیزیں بھی ہاتھ سے چھوتے ہوئے دکھا رہی تھی۔ کسی بچے کی طرح خوشی اور جوش سے اپنا کھویا ہوا کھلونا واپس اور غیر متوقع طور پر مل جانے پر۔

سالار نے مسکراتے ہوئے ان چیزوں کو دیکھا اور پھر امامہ کے یک دم سب کچھ بھول بھال کر جگمگا اٹھنے والے چہرے پر نظر ڈالی تینوں چیزوں کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں آیا تھا۔ وہ چین ڈاکٹر سبط علی کی دی ہوئی تھی وہ ایئر رنگز امامہ کو شادی کے تحائف میں اس کے ساس سسر نے دیے تھے اور وہ انگوٹھی جو اس نے اسے دی تھی وہ؟ سکندر عثمان کی طرف سے جائیداد میں ملنے والے ایک پلاٹ کو بیچ کر خریدی گئی تھی۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی چیز سود اور حرام کے پیسے سے نہیں خریدی گئی تھی اور وہ سالار کی طرف سے ملنے والا واحد زیور تھا جو اس کی اپنی آمدنی سے نہیں خریدا گیا تھا۔ اور وہ زیور واپس آ گیا تھا۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟" امامہ نے اسے مخاطب کیا' وہ اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے اس انگوٹھی کو اسی ہاتھ کے انگوٹھے سے چھوتے ہوئے جیسے چونکا تھا اپنی گہری سوچ سے۔ کچھ حقائق اور ان کا ادراک ایسا شرمسار اور نادم کرنے والا ہوتا ہے کہ انسان چاہتے ہوئے بھی انہیں کسی کے سامنے دہرا نہیں سکتا' وہ بھی اس وقت ایک بار پھر اسی لمحے سے گزرا تھا۔

"کچھ نہیں۔ ایسے ہی کچھ خیال آیا تھا۔" سالار گہرا سانس لے کر بات ٹال گیا تھا۔

"اس انگوٹھی کی قیمت کیا ہے؟" پتا نہیں امامہ کو یک دم اس کی قیمت پوچھنے کا خیال کیوں آیا تھا۔

"یہ انمول ہے کیونکہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔" سالار نے اس کا ہاتھ چوما تھا اور وہی جواب دیا تھا جو پہلی بار اس انگوٹھی کو پہناتے ہوئے دیا تھا' وہ ہمیشہ کی طرح سرشار ہوئی تھی۔ یہ بہت دفعہ پیش کیا جانے والا "خراج تحسین" تھا لیکن ہمیشہ نیا لگتا تھا کیونکہ ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ یہ وہ سالار سکندر نہیں رہا تھا جو امامہ ہاشم کو کچھ نہیں پاتا تھا اور اسے امامہ کی دل جوئی کرنے نہیں آتی تھی۔ زندگی کے اتنے سال ساتھ گزارنے کے بعد وہ ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہو چکے تھے۔

"پیکنگ مکمل ہو گئی۔" سالار نے داد دینے کے ساتھ ہی اگلے کسی جملے سے بچنے کے لیے بات کا موضوع ہی بدل دیا تھا۔

"ہاں مکمل ہو گئی۔" امامہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ تین دن کے بعد وہ پاکستان جا رہے تھے۔

"پیکنگ تھی ہی کیا اس بار۔ سب کچھ تو گھر میں ہی جل گیا۔ بس بچوں کی ضروری چیزیں ہیں جو خرید کر لائی ہوں یا اپنے کچھ کپڑے۔"

"تم کتنے دنوں کے لیے ٹھہرو گے وہاں؟" امامہ نے بات کرتے کرتے اس سے پوچھا۔

"ایک ہفتہ۔" سالار نے بستر پر لیٹتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"کیوں؟ تم ہمارے ساتھ وہاں زیادہ دن کیوں نہیں ٹھہرو گے؟" امامہ کو اعتراض ہوا۔

"ایک ہفتہ بھی بہت زیادہ ہے میرے لیے۔ کام کا ڈھیر ہے یہاں اور مجھے تمہارے واپس آنے سے پہلے گھر کا بھی بندوبست کرنا ہے۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ ایک ہفتے کے بعد ہی واپس آجاؤں گی۔" امامہ نے کہا۔

"نہیں تم اب ایک ماہ کے بعد ہی واپس آؤ۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ وہاں گھر کا ماحول تبدیل ہوگا تو تم بہتر محسوس کرو گی۔ یہاں بچوں کے ساتھ بہت پریشانی ہوتی ہے تمہیں۔" سالار نے اسے کہا تھا۔

"مجھے بچوں سے زیادہ تمہاری پریشانی ہوتی ہے۔" وہ ایک بار پھر وارڈ روب کے سامنے کھڑی تھی۔ سالار نے بستر پر لیٹے لیٹے اسے دیکھا۔ وہ وارڈ روب سے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہی تھی اور اس کے انداز میں کچھ تھا جس نے سالار کو چونکایا تھا۔

"میری کیا پریشانی؟" اس نے پوچھا تھا۔

"پتا نہیں۔ تمہی مجھے ڈر لگتا ہے۔" اس نے آدھی بات کر کے وارڈ روب دوبارہ کھول لی اور ایک بار پھر الجھے انداز میں کپڑے ٹھیک کرنے لگی۔

"کس چیز سے ڈر لگتا ہے؟" سالار نے اسی انداز میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ امامہ نے ویسے ہی کھڑے کھڑے گردن موڑ کر اسے دیکھا "کس چیز سے ڈر لگتا ہوگا مجھے؟" وہ جیسے کسی سائیکاٹرسٹ سے اپنے مسئلے کا حل پوچھ رہی تھی۔

"میری موت سے۔" اور وہ سائیکاٹرسٹ بے حد بے رحم تھا۔

امامہ بل نہیں سکی اس نے جیسے نشتر اس کے جسم میں موجود ناسور کے اوپر سیدھا ہی مار دیا تھا۔ اس نے کتنے آرام سے جیسے پہیلی بوجھ لی تھی۔ وہ وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی یوں جیسے اب اس کے پاس کہنے کے لیے پوچھنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

"ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟" سالار اس کی نظروں سے جیسے الجھا تھا۔

"تم بہت بے رحم ہو اور ہمیشہ سے ہو۔"

"تم نے سوال کیا تھا مجھ سے۔ میں نے تو صرف اندازہ لگایا۔ صحیح اندازہ لگایا ہے کیا؟" وہ جیسے داد چاہتا تھا۔

"اب تمہیں پتا چلا میں تم سے کیوں کہتی ہوں کہ تمہارے اندر آج بھی موت کشش رکھتی ہے۔" وہ جو کہنا چاہ رہی تھی وہ نہیں کہہ سکی اور جو کہہ رہی تھی اس کے غلط ہونے کا اسے اندازہ ہو گیا تھا۔

"موت سے کون فینٹسی ہوتا ہے امامہ؟ کوئی پاگل ہی ہوگا جو ایسا سوچے گا اور ایک وقت میں میں پاگل تھا..... اب نہیں ہوں۔" وہ عجیب انداز میں مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

"اب بھی ہو۔" امامہ کہے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہ ہنسا تھا یوں جیسے اس کے جملے سے محظوظ ہوا ہو.....

"You are always right"۔ (تم ہمیشہ ٹھیک کہتی ہو)

اس کی ہنسی نے امامہ کو کم تپایا تھا اس کے جملے نے زیادہ..... وہ وارڈ روب کو پوری قوت سے بند کرتے ہوئے باتھ روم میں گھس گئی تھی۔ اسے پتا تھا وہ اب اسے زچ کرے گا اور کرتا ہی جائے گا' یہ اس کا ذہنی تھکن اتارنے کا ایک طریقہ تھا..... اسے زچ کرنا..... اور وہ اس وقت اپنا دماغ خراب کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔



کانگو کا بحران اور اس سے پہلے ہونے والے واقعات سی آئی اے کے لیے سالار سکندر کو اس لسٹ میں ڈالنے کا باعث بنا تھا جن پر باقاعدہ نظر رکھی جاتی تھی' وہ افریقہ میں اب ان کا (Key figure) سب سے اہم کارندہ تھا ان کے لیے کام کر رہا تھا لیکن ان کا ساتھی نہیں تھا۔ ان کے پے رول پر بھی نہیں تھا۔ وہ پہلی بار ایک عجیب و غریب کام میں حصہ دار بنے تھے shadow work partner دونوں ایک دوسرے سے بھی واقف تھے'

ایک دوسرے کے نام سے بھی اور ایک دوسرے کے کام سے بھی۔۔۔ اس بات سے بھی کہ دوسرا اس بات سے واقف تھا کہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے' مانیٹر کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ورلڈ بینک کی طرف سے دی جانے والی ٹاپ پروفیشنلز کی ٹیم بھی سی آئی اے کے انڈر کور ایجنٹس کی ہی اور ——— دونوں پارٹنرز اپنے سائے کی موجودگی سے باخبر ہونے کے باوجود اپنا کام کر رہے تھے۔ اور کوئی کسی کو دھوکا دیے بغیر ایک دوسرے کا ساتھی بنا ہوا تھا۔ سی آئی اے سالار سکندر کی سیکیورٹی اور افریقہ میں ورلڈ بینک کے پروجیکٹس کو کامیاب بنانے کی ذمہ دار ۔ تھی اور وہ اس رول کو بخوبی انجام دے رہے تھے۔ سالار سکندر' ورلڈ بینک امریکی حکومت اور سی آئی اے کے لیے نعمت مترقبہ ثابت ہوا تھا۔ اس نے کانگو اور افریقہ میں ایک بہت نازک صورت حال میں ان سب کو ایک بے حد شرم ناک اور خطرناک صورت حال سے نکالا تھا اور بے حد خوبی اور مہارت سے۔ اس کی تقریر میں اپنے ہی ادارے کی اور سامراجی قوتوں پر کی جانے والی تنقید کسی کو بری نہیں لگی تھی۔ اگر صورت حال کنٹرول میں آجاتی تو وہ اس سے زیادہ گالیاں کھانے پر تیار رہتے۔ لیکن اگر کوئی چیز سالار سکندر کی تقریر میں انہیں قابل اعتراض لگی تھی تو وہ اپنے مذہب اور پیغمبر کا حوالہ تھا۔ اس نے دین کو آدمیت اور انسانیت کے سیکولر لبادے میں ملفوف کر کے پیش نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے دین اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کا ذکر کیا تھا اور سالار سکندر ہمیشہ ایک لبرل سوچ رکھنے والا مسلمان سمجھا جاتا تھا۔ بیٹھے بٹھائے اس کی ایک پبلک اسپیچ میں جھلکنے والی مذہبی "انتہا پرستی" ورلڈ بینک کے ساتھ ساتھ امریکی حکومت اور سی آئی اے کو بھی قابل اعتراض لگی تھی۔

وہ افریقہ میں بے شک ان کے لیے سب سے اہم تھا لیکن کوئی اہم ترین شخص بھی "اسلامی سوچ" کے پرچار کے لیے ورلڈ بینک کا عہدہ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ نارمل حالات ہوتے تو وہ تقریر سالار سکندر سے استعفے کے لیے بے حد مضبوط وجہ تھی لیکن یہ نارمل حالات نہیں تھے۔ ورلڈ بینک کے ساتھ ساتھ امریکی حکومت اور سی آئی اے نے بھی سالار سکندر کی اس تقریر سے نظریں چرا کر بظاہر اس کی پردہ پوشی کی تھی لیکن درپردہ میڈیا میں اپنے صحافیوں کے ذریعے سالار سکندر کو اس تقریر میں مذہبی حوالہ دینے کے لیے شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا اور یہ سلسلہ براہ راست کوریج کے فوراً بعد ہی شروع کر دیا گیا تھا۔ امریکہ اور سی آئی اے کو کانگو اور افریقہ میں ہر کارہ چاہیے تھا۔ سچا اور لیڈر نہیں۔۔۔ وہ ہر شخص کو اس کی اوقات میں رکھنا جانتے تھے اور اب اس پالیسی پر عمل کر رہے تھے۔ چینلز پر سالار سکندر کی اس تقریر کو موضوع بحث لانے والوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کے بہت سے دوسرے ریفرنسز کو بھی زیر بحث لانا شروع کر دیا تھا۔ ایک چیخ و پکار سالار سکندر کی مذہبی شناخت' مذہبی اعتقادات اور اعمال کے حوالے سے شروع کر دی گئی تھی۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کا ایک بنیادی حصہ سود کے خلاف ان کے احکامات بھی تھے جنہیں مغربی میڈیا نے بہت نمایاں انداز میں پیش کیا تھا کیونکہ وہ انہیں مغربی نظام معیشت کی بنیادوں کو چیلنج کرنے والی سوچ اور فلاسفی لگی تھی وہ یہ بات علی الاعلان نہیں کہہ پا رہے تھے کہ وہ مغربی نہیں' سودی نظام معیشت کو چیلنج کرنے والی فلاسفی تھی۔۔۔

سالار سکندر کے خلاف مغربی میڈیا میں اٹھنے والا یہ طوفان اسے افریقہ میں اور مشہور کر رہا تھا۔۔۔ اور سالار سکندر نے مغربی میڈیا پر اپنی اس تقریر کے حوالے سے کوئی وضاحتیں۔ صفائیاں اور معذرتیں پیش نہیں کی تھیں۔ اس کے آفس کا خیال تھا کہ اس تقریر کے اقتباسات کو کچھ ہلکا کر کے نئے سیاق و سباق کے ساتھ پیش کیا جائے۔

سالار نے کسی بہانے' معذرت' وضاحت اور سیاق و سباق کو اپنی اس تقریر کے لیے پیش کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے آفس نے دو دن بعد ایک سطری بیان جاری کیا تھا کہ سالار سکندر اپنی اس تقریر کے ہر جملے اور لفظ پر یقین رکھتے ہوئے اس کی ذمہ داری لیتے ہیں اور اسے مکمل طور پر قبول کرتے ہیں۔

یہ جیسے اس میڈیا کے منہ پر مارا جانے والا طمانچہ تھا جو اس کی طرف سے اس تنقید کے بعد کسی وضاحتی بیان اور معذرت کا منتظر تھا۔

وہ ورلڈ بینک کا پہلا بنیاد پرست نائب صدر قرار دیا گیا تھا۔ سی آئی اے کو سالار سکندر کو مانیٹر کرتے ہوئے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی اسلامی مالیاتی نظام کو قائم کرنے کی بات کر رہا تھا جو سود سے پاک ہوتا۔ ان کے لیے یہ پریشان کن بات نہیں تھی۔ سالار سکندر ورلڈ بینک کے ساتھ منسلک رہتے ہوئے عملی طور پر ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ اور جو خواب وہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اس کو وہ ایک خیالی پلاؤ سے زیادہ اہمیت دینے پر تیار نہیں تھے۔ ان کے لیے اگر کوئی بات پریشان کن تھی تو وہ سالار سکندر کا یک دم سامنے آنے والا مذہبی شخص تھا جو ان کے نزدیک افریقہ جیسی حساس جگہ پر ان کے لیے پریشانیاں کھڑی کرنے کا باعث ہو سکتا تھا۔ ضروری ہو گیا تھا کہ سالار سکندر کو صرف افریقہ ہی میں نہیں ہر جگہ ہی مانیٹر کیا جائے اور سی آئی اے نے یہی کیا تھا۔ اس کی سرگرمیاں سی آئی اے کے ریکارڈ کا حصہ بن رہی تھیں۔ اور پہلی غیر معمولی سرگرمی جو سی آئی اے نے ریکارڈ کی تھی وہ ایباکا کی تدفین کے تین ہفتے بعد مسقط میں سالار سکندر کی سمندر میں ایک لانچ پر پانچ لوگوں سے ایک ملاقات تھی جس میں سے ایک مسقط کی رائل فیملی سے تھا۔ بظاہر اس ملاقات کو ایک گیٹ ٹو گیدر سمجھا جا سکتا تھا۔ سالار سمیت وہ پانچوں پرانے شناسا اور دوست تھے۔ ایک ہی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھے۔ مختلف قومیتوں اور پروفیشنز سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اپنی اپنی فیلڈ کے نامور لوگ تھے اور ان میں سے کسی کا بھی کانگو اور افریقہ سے کوئی تعلق نہیں تھا سوائے سالار سکندر کے۔ نہ کانگو اور افریقہ سے تعلق تھا نہ ہی ورلڈ بینک سے لیکن اس کے باوجود ان سب میں کچھ باتیں مشترک تھیں۔ وہ سب سالار سکندر کے ہم عمر تھے۔ صرف ایک شخص مسقط کی رائل فیملی سے تعلق رکھتا تھا اس کے علاوہ باقی سب مختلف قومیت رکھنے کے باوجود امریکن شہریت رکھتے تھے اور مسقط کی رائل فیملی سے تعلق رکھنے والا شخص بھی اس وقت امریکہ ہی میں مقیم تھا۔ وہ سب دنیا کے 100 انڈر 40 گلوبل لیڈرز کی فہرست میں شامل تھے جن کے بارے میں یہ پیش گوئی تھی کہ وہ دس سال بعد دنیا کے ممتاز ترین لیڈرز میں سے ہوں گے۔ ان میں سے کوئی بھی بات سی آئی اے کے لیے پریشان یا تشویش کن نہیں تھی سوائے ایک آخری مماثلت کے۔ سالار سمیت وہ پانچ کے پانچ افراد مسلمان تھے۔ اور باعمل مسلمان تھے اور قرآن پاک کے حافظ تھے۔



وہ پاکستان میں امامہ کے قیام کا تیسرا ہفتہ تھا۔ وہ شروع کے دو ہفتے لاہور میں ڈاکٹر سبط علی اور سعیدہ اماں کے پاس گزار کر اب باقی دو ہفتے اسلام آباد رہنے آئی تھی۔ زندگی اب یوں بھاگم دوڑ میں گزر رہی تھی کہ اسے اس "برابر والے گھر" کو دیکھ کر بار بار اداس ہونا بھی یاد نہیں رہا تھا۔ وہ گھر بک چکا تھا۔ امامہ جانتی تھی اور اس کے کھلے کشادہ لان پر اب مزید تعمیرات ہو چکی تھیں۔ گھر کا نقشہ بھی کچھ کا کچھ کر دیا تھا اس کے نئے مکینوں نے۔ اور اب سکندر عثمان کے گھر سے شاپنگ کے لیے بار بار باہر آتے جاتے اس گھر کو دیکھ کر وہ نظریں چرا لیتی تھی۔ وہ اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ نہ ماضی کے اس حصے میں دوبارہ جانا چاہتی تھی جو کسی دلدل کی طرح اسے اندر ہی اندر کھینچنے لگتا تھا۔ اور نظریں چرانا آسان ان تین نعمتوں کی وجہ سے تھا جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی تھیں۔ جبریل، عنایہ اور حمین نے جیسے اس کی زندگی کو ماضی سے نکال کر مستقبل میں بھیج دیا تھا۔ ان کے وجود سے وابستہ مصروفیات نے اس کی زندگی کی رفتار کو بے حد تیز کر دیا تھا۔ سوچنے اور یادوں میں بھٹکنے کا وقت نہیں رہا تھا اس کے پاس۔ اور یہ بھی جیسے ایک نعمت تھی اس کے لیے۔

سکندر عثمان اور طیبہ اب وہاں اکیلے رہتے تھے... طیبہ وقتاً "فوقتاً" اپنے سب بیٹوں کے پاس دوسرے ملکوں میں آتی جاتی رہتی تھیں لیکن ان کا زیادہ تر وقت اسلام آباد میں ہی گزرتا تھا۔ امامہ اور اس کے بچوں نے سکندر عثمان اور ان کی روٹین کی زندگی کو اسی طرح توڑا تھا جیسے ان کے باقی بچوں کا اپنی فیملیز کے ساتھ آنا توڑتا تھا۔

سالار پاکستان امامہ کے ساتھ آیا تھا۔ ان کی فلائٹ اسلام آباد ہی کی تھی۔ دو تین دن امامہ اس کے ساتھ وہاں رہتی پھر اس کے ساتھ لاہور چلی جاتی اور پھر وہاں سعیدہ اماں اور ڈاکٹر سبط علی کے پاس کچھ دن گزار کر واپس اسلام آباد آجاتی اور پھر وہیں سے واپس کانگو چلا جانا تھا اسے...

وہ وہاں ان کی آمد کا دوسرا دن تھا جب سالار نے اسے امریکہ میں اپنے کسی پرانے دوست کے بارے میں بتایا تھا جو اب اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان میں مقیم تھا اور سالار سکندر سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے مبارک باد دینے کے لیے...

سالار اپنے پرسنل وزٹ پر تھا لیکن اس ایک ہفتے میں بھی اسے مسلسل بہت سے سرکاری عہدے داران اور احباب سے ملنا تھا جو اس کو ورلڈ بینک کی نائب صدارت سنبھالنے پر ابھی تک ذاتی طور پر مل کر مبارکباد نہیں دے سکے تھے۔

کئی سالوں بعد سعد اپنی فیملی کے ساتھ سالار سے ملنے اس کے گھر آیا تھا اور سالار فوری طور پر اسے پہچان ہی نہیں سکا تھا۔ وہ مکمل طور پر باریش تھا۔ اور اس کی داڑھی اسی فی صد سفید ہو چکی تھی جسے رنگنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ وہ بے حد مہنگے برانڈڈ شلوار قمیض میں ملبوس تھا لیکن شلوار اس کے ٹخنوں سے اوپر تھی... وہ فربہی مائل تھا اور اسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کھانے پینے کا شوقین تھا اور ایکسرسائز سے اسے دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ نقاب لیے ہوئے اس کی بیوی ایک آٹھ سالہ بچہ اور دو چھوٹی بچیاں تھیں۔

وہ اور اس کی بیوی سالار اور امامہ سے بڑی گرم جوشی سے ملے تھے۔ امامہ جانتی تھی سعد سالار کے شناساؤں میں سے تھا قریبی دوستوں میں سے نہیں لیکن اس کے باوجود سعد اپنی گپ شپ اور بلند و بانگ قہقہوں کے دوران سالار کے اس کے ساتھ امریکہ میں گزرے ہوئے وقت کے بارے میں ایسے ایسے قصے نکال کرسنا تا رہا جیسے وہ اور سالار بہترین اور بے حد گہرے دوست رہے تھے... یار غار قسم کے دوست۔

"مجھے تو ہمیشہ سے ہی اندازہ تھا کہ سالار بڑی ترقی کرنے والا تھا بس ذرا قبلہ خراب تھا اس کا۔ وہ میں کھینچ کھینچ کر ٹھیک کرتا رہتا تھا۔"

چائے پینے کے دوران اس نے امامہ پر جیسے ایک انکشاف کیا۔ سالار اور امامہ نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا کر رہ گئے۔

"اور اب دیکھیں بھابھی! کیسا بدلا ہے؟ میری کوششیں کیسا رنگ لائی ہیں۔" سعد کہہ رہا تھا سالار نے اپنا کپ رکھتے ہوئے اسی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"لیکن تم بالکل نہیں بدلے۔ میری کوششیں کوئی رنگ نہیں لا سکیں اس کا مجھے بڑا افسوس ہے۔" سالار نے جتانے والے انداز میں کہا۔ سعد نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

"ارے ہم پر کہاں کسی کا رنگ چڑھنا تھا۔ ہم پر تو اپنا ہی رنگ بڑا پکا تھا۔ بھابھی یہ آپ کا شوہر نائٹ کلبز اور ڈسکوز کا بڑا شوقین تھا۔ مجھے بھی کھینچ کھینچ کر لے جانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ نت نئی لڑکیوں سے دوستی تھی اس کی... بڑی رنگین زندگی گزاری ہے اس نے۔"

سالار نے سعد کے بارے میں ٹھیک کہا تھا وہ نہیں بدلا تھا۔ بیشتر لوگ خود کو بہترین مسلمان ثابت کرنے کے لیے دوسروں کے ہر عیب اور خامی کو دکھانے اور جتانے کی وبا میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان کا اسلام انہیں صرف مقابلہ اور موازنہ سکھاتا ہے... پردہ پوشی نہیں... وہ کسی انسان کے حال اور کامیابیوں پر اسے مبارک باد تو دے

سکتے ہیں اس پر رشک بھی کر سکتے ہیں۔ اسے اپنا دوست کہنے پر فخر بھی کر سکتے ہیں لیکن اس کے ماضی کے سابقوں اور لاحقوں کو بھلائے بغیر۔ دل آزاری اور دل شکنی ان کے اسلامی گناہوں کی فہرست میں شامل نہیں ہوتے۔۔۔ سعد بھی یہی کر رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے سامنے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کتنے "نیک" شخص کی بیوی تھی جو دنیاوی کامیابیوں میں سالار سکندر سے پیچھے ہو سکتا تھا لیکن مومن تھا اور روحانی، دینی اور اخلاقی اعتبار سے اس سے بے حد بہتر تھا۔

احساس کمتری کی یہ ایک بے حد بھیانک شکل ہوتی ہے، جس میں کوئی شخص یہ بھی طے نہیں کر پاتا کہ اسے دوست کے ساتھ دوستی کرنی ہے یا دشمنی۔

سعد اب اپنے انکشاف سے جیسے خود ہی محظوظ ہوتے ہوئے اپنی پلیٹ میں ایک نیا کباب لیتے ہوئے ہنس رہا تھا امامہ کا چہرہ پھیکا پڑا تھا۔۔۔ بہت سے انکشافات کسی کے لیے بھی بے تاثر اور بے اثر نہیں ہو سکتے۔ وہ بھی جب کوئی انکشاف اس طرح طشت ازبام اتنے توہین آمیز انداز میں کیا گیا ہو۔

"بھابھی! بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے سعد۔ میری کافی رنگ برنگی لڑکیوں سے دوستی تھی لیکن سعد کو صرف ایک ہی رنگ کی لڑکی پسند تھی اور میں ذرا شوقین مزاج تھا۔ ڈسکوز اور نائٹ کلبز آتا جاتا رہتا تھا ان لڑکیوں کے ساتھ۔ لیکن سعد ظاہر ہے میرے جیسا شوقین مزاج نہیں تھا' اس لیے وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ گھر ہی رہنا پسند کرتا تھا۔"

کباب تو سعد نے پلیٹ میں رکھ لیا تھا لیکن پلیٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے ہی بچی تھی۔ سالار سکندر نے کئی سالوں کے بعد ایسی کم ظرفی اور بے لحاظی کا مظاہرہ کیا تھا جو اس کا ایک زمانے میں شناختی نشان تھا اور اسے سعد کے تین کم سن بچوں اور بیوی کے سامنے اس گھٹیا پن کا مظاہرہ کرنے پر خوشی نہیں ہوئی تھی لیکن سعد کے کسی اور ممکنہ تمغہ امتیاز کو اپنے سینے پر سجانے سے روکنے کے لیے اس کے علاوہ کوئی حفاظتی اقدام کارگر نہیں ہو سکتا تھا۔

"کیا نام تھا اس کا۔۔۔ ہاں استیفنی۔۔۔ اب تو علیک سلیک ہی رہ گئی ہو گی یا وہ بھی نہیں ہے؟" اس کی یادداشت سفاکانہ حد تک تیز تھی اور اس وقت اس نے سعد کا قتل ہی کر دیا تھا۔ سعد کا اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رہ گیا تھا۔ سالار یک دم اس طرح گفتگو کرنے لگا تھا جیسے وہ کسی بار یا پارک میں اکیلے بیٹھے تھے اور ان کے آس پاس کسی دوسرے شخص کا کوئی وجود نہیں تھا۔۔۔ اس سب کی ابتدا سعد نے کی تھی لیکن اختتام اب سالار کر رہا تھا۔ سعد جواب کیا دیتا اس کا تو سانس لینا بھی محال ہو گیا تھا۔

امامہ اس کی بیوی کے تاثرات دیکھ نہیں پائی تھی۔ اس کے چہرے پر نقاب تھا لیکن اس کی آنکھیں یہ بتانے کے لیے کافی تھیں کہ وہ سالار کے انکشافات سے خوش نہیں ہوئی تھی۔ خود امامہ کو بھی سالار کا یہ جوابی وار کچھ زیادہ نہیں بھایا تھا۔

"بھابھی! آپ کچھ لیں۔" اس نے صورت حال کو سنبھالنے کی بروقت کوشش کرتے ہوئے سعد کی بیوی عالیہ کی توجہ اس گفتگو سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں' بچے اور یہ لے رہے ہیں بس کافی ہے۔ ہم کچھ دیر پہلے ہی کسی لنچ سے آئے ہیں تو مجھے بالکل طلب نہیں ہے۔"

امامہ کو عالیہ کا لہجہ بے حد کھردرا لگا تھا۔ وہ سعد کی طرح باتونی نہیں تھی یا پھر شاید سالار کے وہاں بیٹھے ہونے کی وجہ سے اور سعد کے اس سے مسلسل باتیں کرتے رہنے کی وجہ سے اسے زیادہ بولنے کا موقع نہیں مل پا رہا تھا۔

"آپ تو ختم نبوت پر یقین نہیں رکھتیں نا؟" کیا سوال تھا جو سعد کی بیوی کی زبان سے امامہ کے لیے نکلا تھا۔

کمرے میں یک دم خاموشی نہیں سکتہ چھایا تھا۔ وہ تجسس نہیں تھا جوابی وار تھا۔ سعد سے نہیں آیا تھا اس بار اس کی بیوی سے آیا تھا۔

"نہیں الحمدللہ میں مسلمان ہوں۔" چائے کا کپ ہونٹوں سے ہٹا کر امامہ نے بے حد مشکل سے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ بعض لاحقے کبھی سابقے نہیں بنتے۔۔۔ وہ بھی ایک ایسا ہی حصہ تھا اس کی زندگی کا۔ جس کا تعارف اس کا رنگ پھیکا کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔

"اوہ اچھا۔۔۔ مجھے انہوں نے یہ نہیں بتایا تھا۔" وہ اسی بے نیازی سے سعد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی تھی۔ "تو بھابی! آپ پھر کوئی ادارہ جوائن کریں نا۔۔۔ آپ کو تو بہت زیادہ اصلاح اور علم کی ضرورت ہوگی۔ جب تک آپ پاکستان میں ہیں' آپ میرے ساتھ ایک مدرسے میں چلیں۔ وہاں درس قرآن بھی ہوتا ہے اور آپ کی روحانی اور اخلاقی تربیت۔۔۔"

"آپ کا بہت شکریہ لیکن مجھے اسلام قبول کیے اور قادیانیت چھوڑے سولہ' سترہ سال ہو چکے ہیں اور میں ایک حافظ قرآن کی بیوی ہوں۔" امامہ نے اس کی بات بڑی نرمی سے کاٹی تھی۔

"وہ تو میں بھی ہوں۔" عالیہ نے اسی انداز میں کہا۔ "لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"آپ کو نہیں پڑا ہوگا مجھے پڑا ہے۔"

"بھابھی! آپ کو اس حوالے سے جب بھی ہماری مدد کی ضرورت پڑے ہم حاضر ہیں۔ اب میل جول تو ہوتا ہی رہے گا۔۔۔ میں ان شاء اللہ اس سال وقت نکال کر تبلیغ کے لیے کچھ دنوں کے لیے کانگو بھی آؤں گا تو آپ لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ ویسے بھی اچھا رہے گا اگر ہمارے بچے آپس میں ملتے جلتے رہیں۔" سعد نے اپنی طرف سے بروقت موقع پر مداخلت کرتے ہوئے گفتگو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

"جی بھابھی! ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ۔ ہمارے بچوں کو آپس میں ملتے رہنا چاہیے اور ہمیں بھی۔۔۔ بہت سی چیزوں میں آپ کو اپنے بچوں کی تربیت کرتے ہوئے ہماری رہنمائی کی ضرورت ہوگی۔" عالیہ نے اپنے شوہر کی گفتگو کو مکمل کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اگر کبھی ایسی ضرورت پیش آئی تو میں اور امامہ ضرور آپ سے رہنمائی لینے کی کوشش کریں گے لیکن فی الحال مجھے لگتا ہے ہمیں اس کی ضرورت نہیں پڑ رہی۔"

اس بار سالار نے اس گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے جیسے ایک فل اسٹاپ لگانے کی کوشش کی تھی۔

"یار! بچے کہاں ہیں تمہارے؟ تم ان سے تو ملواتے میں چاہ رہا تھا احسن اور جبریل بھی آپس میں متعارف ہو جاتے۔"

سعد' سالار کو کم از کم اس حد تک ضرور جانتا تھا کہ وہ اس کے لہجے کی بے رخی اور بے اعتنائی کو پہچان لیتا اور وہ اس نے پہچان لی تھی اور ایک بار پھر اس نے بات بدل کر ماحول کو خوشگوار کرنے کی کوشش کی تھی۔

"جی جی ضرور' بچے ابھی لا ہی رہا ہوگا ملازم۔ باہر لان میں کھیل رہے تھے۔" امامہ نے سعد کی اس کوشش کو کامیاب کرنے میں ساتھ دیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہاں کوئی اور بات ہوتی۔ ملازم کے ساتھ عنایہ اور جبریل کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ سعد نے بڑی گرم جوشی سے ان دونوں کو پیار کیا تھا پھر جبریل اور احسن کا ایک دوسرے سے تعارف کروایا۔ چار ساڑھے چار کا جبریل اور سات آٹھ سال کے احسن سعد کی وہ پہلی ملاقات تھی لیکن وہ آخری ملاقات نہیں تھی۔۔۔

وہ دونوں ایک جیسے تھے۔ مزاجاً' کم گو' ریزرو' بہت تمیزدار۔ جبریل احسن سے عمر میں بہت چھوٹا ہونے کے باوجود اچھا قد کاٹھ رکھتا تھا اور دیکھنے میں ان کے درمیان عمر کا فرق اتنا نمایاں نہیں تھا۔ چھ سالہ آیہ اور چار سالہ

مروہ ؟ حسن کی نسبت اتنی ریزرو ڈ نہیں تھیں۔
وہ لوگ آدھ گھنٹہ اور بیٹھے تھے اور پھر انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر چلے گئے تھے۔ وہ ایک یادگار اور خوشگوار ملاقات نہیں تھی لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کی ہر ملاقات ایسا ہی تاثر لیے ہوئے رہنے والی تھی۔

سعد اور عالیہ کے جانے کے بعد سالار اور امامہ نے اس ملاقات کے دوران ہونے والے انکشافات کو دہرایا تھا نہ ان لوگوں کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ ان کا خیال تھا وہ ان کی زندگی میں صرف شناساؤں کی کیٹگری میں رہنے والے لوگ تھے ان کا حلقہ احباب بننے والے نہیں تھے۔۔۔ انہیں اس وقت یہ اندازہ بالکل نہیں ہوا تھا کہ وہ دونوں خاندان ایک عجیب و غریب رشتے میں جڑنے والے تھے۔

☼ ☼ ☼

سالار ایک ہفتے کے بعد واپس کانگو چلا گیا تھا اور امامہ اسلام آباد سے لاہور سالار کے ساتھ آئی تھی پھر وہیں اگلے دو ہفتے رہی تھی۔ کچھ دن ڈاکٹر سبط علی کے پاس اور کچھ دن سعیدہ اماں کے پاس۔ جو ان ہی دنوں پاکستان آئی ہوئی تھیں۔
وہاں سے واپس اسلام آباد آنے پر امامہ اور بچوں کو سکندر عثمان اور طیبہ کے ساتھ بہت سا وقت گزارنے کو ملا تھا اور اس کے واپس جانے میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا' جب سکندر عثمان نے بڑے غور و خوض کے بعد اس کو ہاشم مبین کے بارے میں بتایا تھا۔
"وہ کئی دفعہ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ تمہارا نمبر لینے کے لیے۔۔۔ یا تمہارا ایڈریس لینے کے لیے لیکن میں اتنی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تھا کہ تمہارا اور ان کا رابطہ کرواتا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا تم پھر پریشان ہو۔۔۔"
سکندر عثمان اس سے کہہ رہے تھے۔
"لیکن مجھے لگا میں بہت زیادتی کروں گا تمہارے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی۔۔۔ اگر میں ان کی یہ خواہش پوری نہ کروں۔"
وہ بے یقینی سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی "وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟"
"یہ سوال انسان ماں باپ سے نہیں پوچھتا۔" سکندر عثمان نے دھیمے لہجے میں اس سے کہا تھا۔ اس کے حلق میں جیسے پھندا لگا تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے یہ سوال انسان ماں باپ سے نہیں پوچھتا لیکن اسے تو یہ بھول ہی گیا تھا کہ اس کے ماں باپ بھی ہیں۔۔۔ زندگی کے سولہ سترہ سال اس نے ان کے بغیر گزارے تھے۔۔۔ ان کے ہوتے ہوئے بھی۔۔۔ وہ آج بھی ان سے محبت کرتی تھی۔ آج بھی ان کے بارے میں جذباتی تھی۔ لیکن پچھلے کچھ سالوں نے سب بدل دیا تھا۔ وسیم کی موت نے۔۔۔ جبریل اور عنایہ اور حمین نے۔۔۔ اور سالار نے۔
"اب ملنے کا فائدہ نہیں ہے۔"
اس نے سر جھکا کر سکندر عثمان سے کہا اور اسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ ان سے ملنے سے انکار کر رہی تھی۔ وہ تو صرف اپنے خاندان سے ملنے کے لیے منتیں ہی کرتی رہی تھی۔ انکار تو ہمیشہ دوسری طرف سے ہوتا تھا۔ آج پہلی دفعہ وہ انکار کر رہی تھی۔ کچھ نہ کچھ بدلا تھا امامہ میں۔۔۔ یا پھر سب کچھ ہی بدل گیا تھا۔
"ماں باپ کے بارے میں ہم فائدے اور نقصان بھی نہیں سوچتے۔۔۔ صرف حق اور فرض سوچتے ہیں۔"
سکندر عثمان نے ایک بار پھر بڑی رسانیت سے اس سے کہا تھا۔ انہوں نے اس بار بھی ٹھیک کہا تھا۔ سر جھکائے وہ اپنی گود میں رکھے ہاتھوں پر جیسے ماضی کو ایک فلم کے فلیش بیک کی طرح گزرتے دیکھ رہی تھی۔۔۔ اور وہ

یہ فلم اتنی بار دیکھ چکی تھی کہ اب وہ اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی' وہ اپنی یادداشت کے اس حصے کو ہی جیسے کاٹ کر خود سے الگ کر دینا چاہتی تھی۔

"پاپا میں اب اس معلق پل پر نہیں جھول سکتی۔ میرے بچے ہیں اب میں اپنی ذہنی الجھنیں ان تک منتقل نہیں کرنا چاہتی۔ میں بہت خوش اور پر سکون ہوں اپنی زندگی میں۔۔۔ بس ایسے ہی رہنا چاہتی ہوں۔۔۔ کسی لعنت ملامت کا بوجھ میں نہیں اٹھا سکتی اب۔۔۔ کسی معافی تلافی کی بھی ضرورت نہیں رہی ہے اب۔۔۔ جو گزر گیا۔ بس گزر گیا۔ میں واپس پلٹ کر نہیں دیکھنا چاہتی۔"

وہ سکندر عثمان سے کہہ رہی تھی اور اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں کب برسنا شروع ہوئی تھیں۔

"امامہ! وہ مسلمان ہو چکے ہیں۔" وہ جامد ہو گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا رد عمل دے' خوش ہو؟ وہ خوش تھی۔۔۔ رو پڑے؟ وہ پہلے ہی رو رہی تھی۔ اللہ کا شکر ادا کرے؟ وہ ہمیشہ کرتی رہتی تھی۔

"وہ مسلمان نہ بھی ہوتے تب بھی میں تمہیں کہتا تم ان سے مل لو۔ ہم سب بہت خامیوں والے انسان ہیں۔ غلطیاں گناہ سب کرتے رہتے ہیں۔ سب ایک جیسے ہی ہیں۔۔۔ کچھ خوبیوں میں اچھے۔۔۔ کچھ خامیوں میں برے لیکن سب سے بہتر شاید وہ ہوتا ہے جو در گزر کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔۔۔ اور بعض گناہوں کی سزا جب اللہ دے دیتا ہے تو پھر ہمیں نہیں دینی چاہیے۔"

سکندر عثمان نے اسے سمجھایا تھا۔ وہ اس کے اندر کی کیفیت سے بے خبر تھے۔۔۔ ہوتے تو یہ سب نہ کہتے۔۔۔ سوال معافی کا تو تھا ہی نہیں۔۔۔ اولاد اور ماں باپ کا تعلق معافی پر تو کبھی کھڑا کیا ہی نہیں جا سکتا۔۔۔ گلے شکوے کا وقت بھی اب گزر چکا تھا۔۔۔ وہ ان کا سامنا اس لیے نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ اپنے وجود کو بکھرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی اس نے بے حد مشکل سے اپنے آپ کو سمیٹا تھا۔ سالار کے لیے' اپنے بچوں کے لیے' اپنے گھر کے لیے۔

اس نے سکندر عثمان سے بحث نہیں کی تھی۔ وہ اگلے دن ہاشم مبین سے ملنے پر بھی تیار ہو گئی تھی لیکن وہ اس رات سو نہیں سکی تھی۔ کچھ لوگوں کے روبرو ہونے کے لیے آپ ساری عمر ترستے رہتے ہیں اور پھر جب ان کا ہونا طے پا جاتا ہے تو سمجھ نہیں آتا انسان ان کا سامنا کرے گا کیسے۔

آج سے کچھ سال پہلے ہاشم مبین نے یہ کام کیا ہوتا تو اس وقت وہ ساتویں آسمان پر ہوتی۔ اپنے خاندان کو اپنے دین پر لے آنے کے لیے' گمراہی کے راستے سے پلٹ آنے کے لیے اس نے بڑے سال دعائیں مانگی تھیں۔۔۔ اور اس خاندان کا معزول سربراہ اب جب تائب ہو گیا تھا تو امامہ اپنے دل کی کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

وہ اگلی سہ پہر آئے تھے۔۔۔ وہ کمرے میں آئی تو باپ پر پہلی نظر ڈالتے ہی رو پڑی تھی نہ رونے کا تہیہ کیے ہوئے بھی۔۔۔ وہ بے حد ضعیف لگ رہے تھے۔ یہ تننے والا وہ وجود نہیں تھا جس سے وہ ساری عمر ڈرتی رہی تھی۔

ہاشم مبین نے اسے گلے لگایا تھا۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ بھی بڑے حوصلے سے ان سے مل کر الگ ہوئی تھی' پہلے کی طرح۔ عادتاً' ان سے لپٹی نہیں رہی تھی اور پھر وہ آمنے سامنے دو صوفوں پر بیٹھ گئے تھے۔۔۔ اس کمرے میں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں تھے اور طویل گہری خاموشی تھی۔۔۔ پھر اس خاموشی کو ہاشم مبین کی ہچکیوں اور سسکیوں نے توڑا تھا۔ وہ بوڑھا آدمی اب بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا تھا۔

امامہ انہیں چپ چاپ بیٹھی دیکھتی رہی تھی' وہ بھی بے آواز رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے برسنے والے آنسو اس کی ٹھوڑی سے ٹپکتے ہوئے اس کی گود میں رکھے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔

"وقت واقعی بڑا ظالم ہوتا ہے۔ مجھ سے بہت بڑا گناہ ہو گیا۔ میں نے بہت ظلم کیا اپنے آپ پر۔ اپنے

خاندان پر پتا نہیں کیسے ہو گیا یہ سب کچھ؟"
ہاشم مبین روتے ہوئے اعتراف کر رہے تھے اور امامہ کو یاد آیا تھا انہوں نے ایک بار اس سے کہا تھا کہ جو کچھ وہ کرنے جا رہی تھی وہ اس پر بہت پچھتائے گی۔ ایک وقت آئے گا کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گا اور وہ واپس پلٹ کر ان سے معافی مانگنے آئے گی۔ اور تب وہ اسے معاف نہیں کریں گے۔ وقت واقعی بڑا بے رحم اور ظالم ہوتا ہے۔ اس کے سامنے بیٹھ کر بچوں کی طرح روتا ہوا یہ بوڑھا شخص اس کا اپنا باپ نہ ہوتا تو وہ آج بہت فخر محسوس کرتی کہ اس کا سر نیچا نہیں ہوا تھا۔ کسی اور کا ہوا تھا پر سارا دکھ ہی تھا کہ اس کا باپ اگر اپنے کیے کی سزا پا رہا تھا تو بھی تکلیف اسی کو ہو رہی تھی۔
"مجھے لگتا ہے امامہ! مجھے تمہاری بددعا لگ گئی۔" ہاشم مبین نے روتے ہوئے کہا۔
"مجھے کبھی بددعا کرنے کا خیال ہی نہیں آیا ابو۔ آپ کے لیے کیا کسی کے لیے بھی۔"
اس نے بالآخر ہاشم مبین سے کہا تھا۔ وہ آج اس تفنتنے کے ساتھ اس کے سامنے ہوتے تو وہ انہیں کہتی کہ انہیں اس کی بددعا نہیں لگی۔ انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے کی سزا ملی ہے۔ وہ رتبہ جو اللہ تعالیٰ نے صرف انہیں عطا کیا تھا اس رتبے کو کسی اور کو دینے کا خمیازہ بھگت رہا تھا ان کا خاندان وہ صرف قادیانی نہیں ہوئے تھے بلکہ انہوں نے اس مذہب کی تبلیغ بھی پوری جانفشانی سے کی تھی۔ پتا نہیں کتنوں کو گمراہ کیا تھا اور اس گمراہی کے بدلے میں کتنوں کی عاقبت خراب کی تھی ورنہ ان کے خاندان میں بھی یہ تو نہیں ہوا تھا جو ان کے ساتھ ہو رہا تھا۔ وہ کروڑ پتی تھے اور ساری عمر آسائشوں میں گزارنے کے بعد وہ اپنا بڑھاپا اولڈ ہوم میں گزارنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان کے خاندان میں پہلی بار کوئی ایسے بے گھر بے در ہوا تھا۔ لیکن ان کے خاندان میں گمراہی کی روایت بھی ہاشم مبین ہی کی قائم کردہ تھی۔
"آپ نے دیر سے کیا لیکن صحیح اور اچھا فیصلہ کیا۔" یہ ایک جملہ کہتے ہوئے امامہ کو بے حد تکلیف ہوئی تھی اسے وسیم یاد آیا تھا۔ سعد یاد آیا تھا۔ اسے اپنا وہ خاندان یاد آیا تھا جو سارے کا سارا غیر مسلم تھا اور غیر مسلم ہی رہنے والا تھا۔ واپس تو یا وہ پلٹی تھی یا ہاشم مبین۔
"تمہارا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں۔ بہت وقت لگا دیا میں نے تمہارے سامنے آنے میں۔ لیکن بس معافی مانگنا چاہتا تھا تم سے اور تمہاری ایک امانت تھی میرے پاس۔ وہ مرنے سے پہلے تمہیں دے دینا چاہتا تھا۔"
ہاشم مبین نے بالآخر اپنی ہچکیوں اور سسکیوں پر قابو پا لیا تھا۔ وہ اب اپنے ساتھ لائے ہوئے بیگ سے ایک لفافہ نکال کر اسے دے رہے تھے۔
"یہ کیا ہے؟" اس نے لفافہ تھامے بغیر ان سے پوچھا تھا۔ "جائیداد میں تمہارا حصہ۔ اسی حصے کے لیے تمہارے بھائیوں کو خفا کر دیا ہے میں نے۔ وہ یہ بھی آپ لینا چاہتے تھے مجھ سے۔ لیکن میں تمہاری چیز انہیں نہیں دے سکتا تھا۔ ساری عمر تمہیں کچھ نہیں دے سکا۔ کچھ تو دینا چاہتا تھا تمہیں مرنے سے پہلے۔"
وہ ان کی بات پر رو پڑی تھی۔ ابو اس کی ضرورت نہیں تھی مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے مجھے میں اسے لے کر کیا کروں گی۔ اگر میرے بھائیوں کو میرا حصہ دے دینے سے ان کی زندگی میں آپ کے لیے کوئی گنجائش نکلتی ہے تو آپ یہ انہیں دے دیں۔"
ہاشم مبین نے بے حد مایوسی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔ "میں ان کے لیے اب "غیر مسلم" ہوں امامہ۔ وہ مجھے اپنی زندگی سے نکال کر پھینک چکے ہیں جیسے کبھی میں نے تمہیں اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا۔" وہ شکست خوردہ انداز میں کہہ رہے تھے۔

"پھر آپ میرے حصے کو بیچ کر اپنے لیے کوئی گھر لے لیں... کوئی جگہ... میرے پاس اب سب کچھ ہے۔ آپ کا کوئی روپیہ پیسہ اب میری ضرورت نہیں رہا۔" امامہ نے وہ لفافہ پکڑ کر ان کے بیگ میں واپس رکھ دیا تھا۔

"تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟" انہوں نے رنجیدگی سے کہا۔

میں آپ کو معاف کرنے نہ کرنے والی کون ہوتی ہوں ابو... یہ فیصلہ تو آپ کے لیے اللہ کو کرنا ہے... میں تو صرف یہ دعا کر سکتی ہوں کہ اللہ آپ کو معاف کر دے... بڑی معافی تو وہاں سے آنی چاہیے۔"

وہ سر جھکائے بیٹھے رہے پھر انہوں نے کہا۔

"تم ہم سے ملتی رہو گی نا؟" عجیب آس اور حسرت تھی۔ امامہ نے سر ہلا دیا تھا۔ ماں باپ کا یہ حال اسے دل گرفتہ کیے ہوئے تھا۔ ہاشم مبین کے چہرے پر اس ملاقات کے دوران پہلی بار مسکراہٹ آئی تھی۔

"میں جائیداد کا یہ حصہ تمہارے بچوں کے نام کر دیتا ہوں امامہ۔"

"ابو میں آپ کی جائیداد اور روپے پیسے میں سے کچھ بھی نہیں لوں گی۔ میں لوں گی بھی تو سالار واپس کر دے گا۔" اس نے ہاشم مبین سے دو ٹوک انداز میں کہا تھا۔

ہاشم مبین کچھ دیر بیٹھ کر پھر اسے ساتھ لے کر اس کی ماں سے ملوانے گئے تھے۔ سکندر عثمان اور ان کی بیوی بھی ساتھ گئے تھے۔ وہ ایک اور جذباتی ملاقات تھی۔

"تم اب بہت بہادر ہو گئی ہو۔" اس رات سالار نے اس سے کہا تھا۔ اس نے اپنے دن کی روداد سنائی تھی فون پر۔

"کیسے؟" وہ اس کے تبصرے پر حیران ہوئی تھی۔ "تم آج ایک بار بھی روئی نہیں مجھے اپنے پیرنٹس سے ملاقات کے بارے میں بتاتے ہوئے۔" وہ چپ رہی پھر اس نے سالار سے کہا۔

"آج ایک اور بوجھ میرے کندھوں اور دل سے ہٹ گیا ہے۔ بہت دیر سے ہی سہی لیکن اللہ تعالیٰ نے گمراہی سے نکال ہی لیا ہے میرے ماں باپ کو۔ دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ سالار دیر سے ہی سہی پر قبول ہو جاتی ہیں۔"

امامہ کے لہجے میں ایک عجیب طمانیت تھی جسے سالار نے ہزاروں میل دور بیٹھے بھی محسوس کیا تھا۔

"تمہاری ہو جاتی ہیں۔" اس نے مدھم آواز میں امامہ سے کہا۔

"کیا تمہاری نہیں ہوتیں؟" اس نے جواباً پوچھا۔

"میری بھی ہوتی ہیں لیکن تمہاری زیادہ ہوتی ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"الحمدللہ۔" امامہ نے جواباً کہا۔ وہ ہنس پڑا۔ "تم میرے پیرنٹس کو اولڈ ہوم سے نکال کر ایک گھر لے دو سالار، ان کے پاس میرے لیے جائیداد کا جو حصہ ہے اسے بیچ کر۔ بے شک کوئی چھوٹا گھر ہو لیکن انہیں وہاں اولڈ ہوم میں نہیں دیکھ سکتی۔"

"میں پاپا سے کہہ دوں گا وہ کر دیں گے یہ کام... ان کا خیال بھی رکھیں گے۔ تم اگر اسلام آباد میں مستقل رہنا چاہتی ہو تو رہ سکتی ہو امامہ... تم اور بچے وہاں..."

امامہ نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ "میں یہاں مستقل نہیں رہنا چاہتی... میں تمہارے پاس رہنا چاہتی ہوں اور واپس آ رہی ہوں اسی تاریخ کو۔"



سی آئی اے نے سالار سکندر کی اس سرگرمی کو صرف مانیٹر اور ریکارڈ نہیں کیا تھا انہوں نے اس ملاقات میں شامل پانچوں افراد کو بھی اپنی واچ لسٹ میں ڈال لیا تھا۔ اگلے آنے والے مہینوں میں سالار سکندر اور ان پانچ افراد

کے بہت سارے تفریحی دورے ہوتے رہے تھے۔۔۔ لیکن اب سی آئی اے صرف سالار سکندر کی نہیں ان پانچ افراد کی نقل و حرکت کو بھی مانیٹر کر رہی تھی۔۔۔ ایک عجیب پر اسرار نیٹ ورک کام کر رہا تھا۔۔۔ وہ پانچ افراد سالار سکندر سے صرف چند ماہ اچانک ملتے رہے تھے لیکن اس کے بعد سالار سکندر کے ساتھ ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ وہ پانچ افراد اب آپس میں بھی نہیں مل رہے تھے لیکن وہ پانچ افراد انفرادی طور پر ایسی ہی ملاقاتیں کر رہے تھے۔۔۔ پیٹرن وہی تھا چار پانچ اپنی اپنی فیلڈ کے ممتاز ترین لوگ۔۔۔ لیکن دنیا کے مختلف ممالک میں۔۔۔ سب ہی ایک ہی عمر کے دائرے میں اور سب ہی امریکن نیشنل۔۔۔ اور پھر۔۔۔ مماثلتیں ایک جگہ جا کر مرکوز ہو جاتی تھیں، وہ سب بھی مسلمان تھے۔ ان میں کچھ حفاظ تھے۔۔۔ کچھ نہیں تھے لیکن وہ سب با عمل مسلمان تھے۔

وہ ایک اسلامی مالیاتی سسٹم پر کام کر رہے تھے اور یہ سی آئی اے جانتی تھی لیکن اس نظام کی شکل کیا تھی۔ خدوخال کیا تھے۔ وہ اسے بوجھنے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے اور اس کی وجہ صرف ایک تھی۔۔۔ ایک جگسا پزل کی طرح اس نظام سے منسلک ہونے والے سب افراد کے پاس اس کا ایک ایک ٹکڑا تھا۔۔۔ اور وہ اس ٹکڑے کو اچھی طرح سمجھتا اور جانتا تھا لیکن وہ ٹکڑا اس تصویر میں کہاں لگنا تھا، یہ صرف ایک شخص جانتا تھا۔۔۔ سالار سکندر۔



"ممی! حمین کب بڑا ہو گا؟" اس دن جبریل نے اپنی آرٹ بک میں کچھ بناتے ہوئے امامہ سے پوچھا جو روتے بلکتے حمین کو ہمیشہ کی طرح تھپک تھپک کر خاموش کرنے اور کچھ کھلانے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش میں بے حال ہو رہی تھی اور اس کی یہ حالت جبریل اور عنایہ بغور دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ مہینے پہلے کانگو میں اپنے نئے گھر میں منتقل ہوئے تھے۔ اس ہوٹل میں دو تین مہینے رہنے کے بعد۔

"بڑا تو ہو گیا ہے۔" امامہ نے اس کے سوال اور انداز پر غور کیے بغیر کہا۔

"تو پھر روتا کیوں رہتا ہے؟" امامہ بے چارگی سے اپنے بڑے بیٹے کو دیکھ کر رہ گئی۔
"آپ اس سے پوچھ لیں کہ اس کو کیا چاہیے۔" وہ امامہ کو جیسے مسئلے کا حل بتا رہا تھا۔
"میں پوچھ نہیں سکتی اور وہ بتا نہیں سکتا۔" امامہ اب بھی اسے اٹھائے لاؤنج میں ٹہلتے ہوئی اسے تھپک رہی تھی اور وہ اسی طرح روتے ہوئے اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے مچل رہا تھا۔ وہ اسے نیچے بٹھا دیتی تو وہ گود میں اٹھائے جانے کے لیے ہاتھ بلند کر کر کے دھاڑیں مارتا۔ اور یہ ڈرل دن میں دو تین بار کا معمول تھا۔ رونا حمین سکندر کا من پسند۔ مشغلہ تھا۔ وہ بغیر آنسوؤں کے گلا پھاڑ پھاڑ کر روتا تھا اور پھر رونے کے بیچوں بیچ کوئی بھی دلچسپ چیز نظر آنے پر یک دم رونا بند کر کے اس کا جائزہ لینے میں مصروف ہو جاتا اور جب اس کام سے فارغ ہو جاتا تو ایک بار پھر اپنے رونے کے سلسلے کو وہیں سے جاری کرتا جہاں اس نے چھوڑا تھا۔
سات آٹھ ماہ کی عمر میں ہی اس نے بیک وقت چار دانت نکالنے شروع کر لیے تھے جو خرگوش کے دانتوں کی طرح اس کے منہ کے درمیان میں تھے اور اس کے رونے اور ہنسنے پر نظر آتے تھے۔
"اس کو جلدی کس بات کی ہے؟" بیک وقت چار دانتوں کو نکلتے دیکھ کر سالار نے کہا تھا۔ جبریل اور وہ حمین سکندر کے بارے میں ایک جیسے تاثرات اور خیالات رکھتے تھے۔
"یہ تم خود اس سے پوچھ لو۔" امامہ نے جواب دیا تھا۔
حمین و بالا اس کے پہلے دو بچوں کی نسبت زیادہ تھکانے اور آزمانے والا کام ثابت ہو رہا تھا۔ حمین سکندر ان چار دانتوں کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے بھی صرف بڑوں کے کھانے والی ہر اس چیز میں دلچسپی محسوس کرتا تھا جو چٹخارے والی ہوتیں۔ اپنے پوپلے منہ کے ساتھ بھی چپس اس کی پسندیدہ خوراک تھی جسے وہ صرف چبا نہیں نگل بھی سکتا تھا۔ وہ چپس کا پیکٹ تک پہچانتا تھا اور ایسا ممکن نہیں تھا کہ جبریل اور عنایہ اس کے قریب بیٹھ کر کوئی چیز اطمینان سے اسے کھلائے بغیر خود کھا لیتے۔
وہ ایک عجیب و غریب بچہ تھا۔ اور یہ بیان اس کے بارے میں سالار سکندر نے دیا تھا جس کا خیال تھا اس نے ایسی مخلوق کبھی نہیں دیکھی۔
سکندر عثمان نے اس سے کہا تھا "میں نے دیکھی ہے۔ وہ تمہاری کاپی ہے۔"
"یہ زیادتی ہے۔" سالار نے ان کی بات پر احتجاج کیا تھا۔ وہ اور طیبہ ان لوگوں کے پاس کانگو آئے ہوئے تھے جب وہ دونوں حمین سکندر کے ہاتھوں بننے والی ان کی درگت دیکھ رہے تھے۔ وہ تب دس ماہ کا تھا اور سب سے پہلے جو لفظ اس نے بولنا شروع کیا تھا وہ "سالا" تھا اور ہر بار سالار کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ بے حد خوشی سے ہاتھ پاؤں مارتا سالا سالا چلاتے ہوئے اس کی طرف جانے کی کوشش کرتا تھا۔
یہ پہلا لفظ تھا جو اس نے بولنا شروع کر دیا تھا۔ جبریل اور عنایہ کی طرح وہ بھی جلدی بولنا سیکھ رہا تھا۔ اس میں چیزوں کی شناخت اور پہچان کی صلاحیت بھی ان ہی دونوں کی طرح منفرد تھی لیکن اس کی بولنے کی صلاحیت ان دونوں سے بھی اچھی تھی
"بیٹا بابا!" پہلی بار سالار کے لیے وہ لفظ سن کر ہنسی سے بے حال ہونے کے باوجود امامہ نے اس لفظ کو بدلنے کی کوشش کی تھی۔ وہ سالار پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے توڑ توڑ کر سکھا رہی تھی۔ با... با
"سالا۔" حمین نے ماں کی محنت پر پانی پھیرتے ہوئے سالار کے لیے وہی لفظ استعمال کیا جو وہ سالار کے لیے ماں کو پکارتے سنتا تھا۔

"تم اسے بابا مت سکھاؤ' صرف رٹ لگوا دو میرے نام کے ساتھ' یہ بھی غنیمت ہو گا میرے لیے۔"
سالار نے اسے مشورہ دیا تھا۔ وہ بہرحال کچھ زیادہ محظوظ نہیں ہوا تھا اس طرز تخاطب سے جو سکندر عثمان اور طیبہ کے لیے ایک تفریح بن گئی تھی۔
اور پانچ سالہ جبریل بڑھاپے کے سے تحمل اور دانائی کے ساتھ اپنے اس اکلوتے چھوٹے بھائی کو دیکھتا رہتا تھا جس نے ان کے گھر کے امن اور سکون کو پچھلے تقریباً" ایک سال سے تہ وبالا کر کے رکھا ہوا تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا حمین بڑا ہو جائے اور چلنا شروع ہو جائے تو ٹھیک ہو جائے گا لیکن جب بالآخر اس نے چلنا شروع کیا تو دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ اس "مسئلے" کا غلط "حل" تھا۔
حمین سکندر کو پیر کیا پر مل گئے تھے۔۔۔ اور وہ اب کہیں بھی جا سکتا تھا اور کہیں سے مراد "کہیں" بھی تھا۔
اور اس کی فیورٹ جگہ باتھ روم تھی۔ وہ بھی وہاں اس وقت جانا پسند کرتا تھا جب جبریل اسے باتھ روم میں جاتا دکھائی دیتا۔۔۔ اور جبریل نے اس کے ہاتھوں کئی بار خاصی شرمناک صورت حال کا سامنا کیا۔۔۔ جس باتھ روم کو بچے استعمال کرتے تھے اس باتھ روم میں لاک نہیں تھا اور دروازے کا ہینڈل گھما کر اسے کھولنا حمین کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جبریل کے لیے حمین کی موجودگی میں باتھ روم جانا جان جوکھوں کا کام بن جاتا تھا۔ وہ امامہ یا پیڈی کے آس پاس نہ ہونے پر باتھ روم کے دروازے کے اندرونی طرف باتھ روم میں پڑی ان سب چیزوں کو رکاوٹوں کے طور پر دروازے کے ساتھ ڈھیر کر کے پھر باتھ روم کا استعمال کرتا تھا۔
سالار سکندر اگر اسے "عجیب و غریب" کہتا تھا تو حمین سکندر باپ کے دیے گئے اس ٹائٹل پر پورا اترنے کی کوشش کر رہا تھا اور پوری دل جمعی کے ساتھ۔۔۔ بھی بھی ان سب کو لگتا تھا' حمین سکندر کو کوئی بھی کنٹرول نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ مگر دنیا میں ہر فرعون را موسیٰ ہوتا ہے اور حمین کی ان کی زندگی میں آمد ایک ایسی ہی نعمت کے طور پر ہوئی تھی۔



نائب صدر کے طور پر سالار سکندر نے افریقہ کے لیے کسی انسان کی طرح نہیں مشین کی طرح کام کیا تھا۔ اس کی ملازمت کا دورانیہ افریقہ کی تاریخ کے سنہری ترین سالوں میں گردانا جاتا تھا۔ وہ افریقہ میں تقرر ہونے سے پہلے افریقہ کی معیشت کا ماہر سمجھا جاتا تھا لیکن وہاں اپنے قیام کے دوران سالار سکندر افریقہ کے انسائیکلوپیڈیا میں تبدیل ہو گیا تھا۔ افریقہ کا کوئی ملک یا علاقہ ایسا نہیں تھا جس کے بارے میں معلومات اس کی انگلیوں پر نہیں تھیں اور جہاں اس نے کانٹیکٹس نہیں بنائے تھے۔
وہ ورلڈ بینک کی نمائندگی کرتے ہوئے افریقہ کی فلاح اور ترقی کے لیے کام کی خواہش رکھتے ہوئے جیسے وہاں ایک دو دھاری تلوار پر چل رہا تھا۔۔۔ اسے ورلڈ بینک یعنی عالمی طاقتوں کے اہداف بھی حاصل کرنے تھے انہیں ناراض بھی نہیں کرنا تھا اور اسے افریقہ میں افریقی عوام کی فلاح و بہبود کو بھی مد نظر رکھنا تھا۔۔۔ وہ مشکل ترین اہداف کے حصول کے لیے نامساعد ترین حالات میں کام کر رہا تھا۔۔۔ اور کامیابی سے کر رہا تھا۔۔۔ پیٹرس ایباکا کی موت اور اس سے پیدا ہونے والے حالات ورلڈ بینک کے لیے ایک وقتی جھٹکا تھے۔ وہ مصلحتاً" پسپا ہونے پر مجبور ہوئے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ افریقہ کے لیے عالمی طاقتوں کی پالیسیاں بدل گئی تھیں۔۔۔ اور سالار یہ بات بخوبی جانتا تھا۔۔۔ تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ سب کچھ نظروں سے اوجھل اور یادداشت سے محو ہونا شروع ہو گیا تھا۔ غریب قوموں کی یادداشت ان کے پیٹ کے ساتھ بندھی ہوتی ہے۔ پیٹ خالی ہوتا ہے تو ان کی

یادداشت بھی خالی ہو جاتی ہے۔

پیٹرس ایباکا بھی بہت جلد اپنی قوم کی یادداشت سے غائب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اور سالار کو اس بات کا اندازہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ وقتی ابال ہے۔ جو کچھ عرصہ اس قوم کو مشتعل رکھے گا اس کے بعد زمینی حقائق انہیں یہ سب بھولنے پر مجبور کر دیں گے۔ اور زمینی حقائق یہ تھے کہ افریقہ کے عوام اپنی ہر ضرورت کے لیے ترقی یافتہ قوموں پر انحصار کرتے تھے۔ ان کی روزی روٹی ان کے پروجیکٹس میں کام کرکے ہی چلتی تھی۔ ان کے اپنے لیڈرز اور حکومتیں کرپٹ تھیں، چور تھیں جو ملکی وسائل کو صرف اپنے فارن بینک اکاؤنٹس کو بھرنے کے لیے استعمال کرتی تھیں اپنے ملک اور عوام کی زندگی اور حالات بدلنے کے لیے نہیں۔

افریقہ میں سب کچھ تھا۔ اپنے حالات بدلنے کی نیت نہیں تھی۔۔۔ اور یہ نیت کوئی دوسرا انسان ان کے اندر پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ سالار سکندر بھی نہیں اور یہ وہ حقائق تھے۔ جن سے مغربی دنیا واقف تھی تو افریقہ بھی انجان نہیں تھا۔

سالار سکندر کی وجہ سے اگر کوئی فرق پڑا تھا تو صرف یہ کہ اگر پہلے ان پروجیکٹس کا دس فی صد وہاں کے عوام کی بہتری پر خرچ ہو رہا تھا تو اب اس کا تناسب اب بیس سے تیس فیصد کے درمیان ہو گیا تھا۔ وہ اس سے بڑی تبدیلی نہیں لا سکتا تھا۔ وہ بیس سے تیس فیصد وسائل بھی اگر ٹھیک استعمال ہوتے تو وہاں بہتری کی رفتار چار گنا کی جا سکتی تھی اور یہ کام سالار نے کیا تھا۔ وہ ان وسائل کے استعمال کو سو فیصد شفاف نہیں بنا سکتا تھا لیکن اس کے استعمال کا فوکس ٹھیک کر سکتا تھا۔ ترجیحات درست کر سکتا تھا اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب رہا تھا۔

ایک نائب صدر کے طور پر افریقہ میں اس کی اور اس کے آفس کی کارکردگی اور استعداد دنیا کے دوسرے خطوں میں کام کرنے والے نائب صدور کے مقابلے میں بہترین تھی۔ وہاں شروع ہونے والے پروجیکٹس کیس اسٹڈیز کے طور پر دوسرے خطوں میں ورلڈ بینک کے دوسرے نائب صدور اٹھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔۔۔ وہ ورلڈ بینک کا سربراہ نہیں تھا لیکن سالار سکندر نے اپنے آپ کو بہت نمایاں نہ رکھتے ہوئے بھی ورلڈ بینک کے باقی تمام نائب صدور کو نہ صرف کنارے لگا کر غیر فعال کر دیا تھا۔ بلکہ ورلڈ بینک کے اس اگلے صدر کو بھی پس منظر میں دھکیل دیا تھا جسے پیٹرس ایباکا کی موت کے دوران پیدا ہونے والے کرائسس پر قابو نہ پا سکنے کی پاداش میں پرانے صدر کو ہٹا کر تعینات کیا گیا تھا۔

وہ تین سال مسلسل "ٹائم" کے مین آف دا ایئر کے طور پر اس کے سرورق کا حصہ بنا تھا اور ورلڈ بینک کے ساتھ ہونے والے اس پروجیکٹ کے بارے میں اختلافات سے پہلے وہ ورلڈ بینک کے حلقوں میں ایک بہت زیادہ پروفیشنل ورکر کی شہرت رکھتا تھا جو ہر لحاظ سے غیر متنازعہ اور بے حد اچھی شہرت کا مالک تھا۔۔۔ اور اب اس شہرت کو "خراب" کرنے والی صرف ایک ہی شے تھی۔ اس کا "بنیاد پرست" مسلمان ہونا جو اس ایک تقریر کے علاوہ اور اس کے لائف اسٹائل کے علاوہ اس کے کام اور پالیسیوں میں کہیں نہیں جھلکا تھا۔

سالار سکندر کی ملازمت کا دورانیہ ختم ہونے کے قریب آ رہا تھا۔ بینک نے یہ دورانیہ ختم ہونے سے دو سال پیشتر ہی سالار سکندر کو ملازمت میں توسیع کی آفر کی تھی اور اس نے یہ آفر قبول نہیں کی تھی۔ پھر اس آفر کو وقفے وقفے سے بار بار بہتر پیکجز کے ساتھ اسے اصرار کے ساتھ پیش کیا جاتا رہا۔ لیکن سالار کا انکار قائم رہا تھا۔ وہ افریقہ میں اپنے قیام کو اب ختم کرنا چاہتا تھا۔ اور ورلڈ بینک کے ساتھ ساتھ امریکن حکومت کے لیے بھی یہ تشویش کی بات تھی۔ افریقہ کو سالار سکندر سے زیادہ بہتر کوئی نہیں چلا سکتا تھا۔ اس بات پر بورڈ آف ڈائریکٹرز میں کوئی دو رائے نہیں تھیں اور نہ ہی امریکن حکومت کو کوئی شبہ تھا۔ اس نے پچھلے چند سالوں میں نہ صرف ورلڈ

بینک کی ساکھ اور امیج ہی افریقہ میں بدل کر رکھ دیا تھا بلکہ اس نے امریکن حکومت کے لیے بھی وہاں خیر سگالی کے جذبات دوبارہ پیدا کرنے میں بہت کامیابی حاصل کی تھی۔۔۔ اس کا ورلڈ بینک کو اس وقت چھوڑ کر جانا ان کے لیے بہت بڑا دھچکا ہوتا۔۔۔ لیکن وہ رکنے پر تیار نہیں تھا اور امریکن حکومت کو سوچنا پڑ رہا تھا کہ وہ اسے ایسی کیا چیز پیش کرے، جو اسے روک سکے۔

ورلڈ بینک کی صدارت ہی یقیناً" ایسا ایک تاج تھا جو اس کو پہنا کر اسے روکا جا سکتا تھا۔ سالار سکندر اس عہدے کے لیے موزوں ترین اور کم عمر ترین امیدوار تھا مگر اس عہدے پر سالار سکندر کی تعیناتی امریکی حکومت کے لیے خود ایک مسئلہ بن گئی تھی۔۔۔ وہ ایک "بنیاد پرست" مسلمان کو ورلڈ بینک کا صدر نہیں بنا سکتے تھے اور وہ اس "بنیاد پرست" مسلمان کو کسی اور چیز کی آفر کر کے روک بھی نہیں پا رہے تھے۔۔۔ یہ فیصلہ انہیں کرنا تھا کہ کیا اس کی مسلم بنیاد پرستی کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔۔۔ لیکن ابھی امریکی حکومت اور ورلڈ بینک کے پاس اس بارے میں سوچنے کے لیے وقت تھا کیونکہ سالار کی ملازمت کا دورانیہ ختم ہونے میں ایک سال باقی تھا۔

اس ایک سال میں سالار سکندر کی زندگی میں تین بڑے واقعات ہوئے تھے اور تینوں نے اس کی زندگی پر بہت گہرے نقوش چھوڑے تھے، گہرے اور ہمیشہ رہ جانے والے۔۔۔ اور یہ کہنا غلط نہیں تھا کہ ان واقعات نے ایک بار پھر اس کی زندگی بدل دی تھی۔

چنی غلام فرید بھی اس کی زندگی میں اس کی آخری اور چوتھی اولاد کے طور پر اسی سال آئی تھی۔ اس کی زندگی کا پہلا بڑا واقعہ۔



چنی سے سالار سکندر کا غائبانہ تعارف ہمیشہ بے نام رہا تھا۔ غلام فرید کے حوالے سے سکندر عثمان سے اسے کئی بار خبریں ملتی رہی تھیں بالکل اسی طرح جس طرح گاؤں میں قائم اس اسکول کے بہت سے دوسرے ملازمین کے بارے میں پتا چلتا رہتا تھا۔ سکندر عثمان نے غلام فرید کے ذریعے گاؤں کی مسجد کے امام کو پہنچائی جانے والی امداد کے بارے میں بھی سالار کو مطلع کر دیا تھا کیونکہ یہ امداد سالار کے کہنے پر ہی سکندر عثمان نے شروع کی تھی۔ غلام فرید کو اس امداد میں ہیر پھیر کے نتیجے میں ملازمت سے فارغ کرنے کا حکم بھی سالار ہی کا تھا۔ بددیانتی اور بے ایمانی اس کے لیے قطعاً" ناقابل برداشت تھی اور یہ معاملہ اسے اس لیے زیادہ سنگین اور زیادہ ناقابل برداشت لگا تھا کہ جس رقم میں ہیر پھیر کیا گیا تھا وہ مسجد کے لیے دی گئی تھی اور مسجد کی رقم میں بددیانتی کرنے والے شخص کو وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں سمجھتا تھا۔ سکندر عثمان بھی غلام فرید کو دی جانے والی اس سزا کے حق میں تھے۔ اس لیے انہوں نے سالار سکندر کی ہدایات پر پوری طرح عمل درآمد کیا تھا۔

غلام فرید کے ہاتھوں ایک بچی کے سوا اپنے پورے خاندان کا قتل سکندر عثمان کو بری طرح ہلا گیا تھا۔ اس دل خراش واقعہ کو میڈیا نے بہت دن اچھالا تھا۔۔۔ غلام فرید سے پوچھے جانے والے سوالوں کے جوابات وہ ہیڈ لائنز کی شکل میں دکھاتے اور چھاپتے رہے تھے، جو صرف سکندر عثمان ہی نہیں سالار کی نظروں سے بھی گزرتے رہے تھے، اپنی فیملی کو اس طرح بے رحمی سے مار دینے والا شخص میڈیا کو ذہنی عدم توازن کا شکار لگ رہا تھا کیونکہ وہ اس حادثے کی توجیہات ہر روز بدل دیتا تھا۔

"اسے اپنی بیوی کے کردار پر شک تھا۔ اس لیے اس نے اپنے خاندان کو مارا۔"

یہ حادثے کے فوراً" بعد میڈیا کی طرف سے بریکنگ نیوز حاصل کرنے کے چکروں میں نشر اور شائع ہونے والی

پہلی خبر تھی۔

یہ ایک غیر ذمہ دار صحافی نے "اندازا" بنا کر اپنے ٹی وی پر نشر کی تھی اور باقیوں نے آنکھیں بند کر کے اس کی تقلید کی تھی۔ ڈیسک جرنلزم کی یہ چھوٹی سی بددیانتی کئی سالوں بعد کسی شخص کے گلے کا پھندا بن جانے والی بھی ہے اس صحافی کو اندازہ بھی نہیں تھا۔

جوں جوں غلام فرید سے مختلف صحافیوں کو ملنے اور بات کرنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ مختلف انکشافات سامنے آتے رہے۔ وہ پہلی خبر چھپ گئی تھی۔ اب اس قتل کی وجہ غربت سامنے آئی تھی۔ بیوی سے لڑائی جھگڑے تھے گھر میں بھوک اور بیماری تھی۔ رشتہ داروں اور قرض خواہوں کے اپنی رقم کے تقاضے تھے۔ اور ان سب کے آخر میں اسکول کی ایک نوکری سے ایک مالی بددیانتی پر نکالا جانا اور بے گھر کیا جانا تھا جو سکندر عثمان اور سالار کو احساس جرم میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔

وہ اب غلام فرید کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے سوائے اس کے کہ اس کی بچ جانے والی واحد اولاد کی دیکھ بھال اور کفالت کی ذمہ داری اٹھا لیتے اور سالار کے کہنے پر وہ سکندر عثمان نے اٹھا لی تھی۔ وہ اس کے لیے ماہانہ رقم بھیجتے تھے جو اس کے رشتہ دار آ کر لے جاتے تھے اور کبھی کبھار سکندر عثمان کے کہنے پر وہ چنی کو لا کر انہیں دکھا بھی جاتے تھے تاکہ انہیں یہ تسلی رہے کہ وہ رقم واقعی اس پر خرچ ہو رہی تھی۔ اس کی مناسب دیکھ بھال ہو رہی تھی اور وہ محفوظ ہاتھوں میں تھی۔ یہ شاید اسی طرح چلتا رہتا اگر اس سال سالار اپنی فیملی کے ساتھ دو ہفتوں کے لیے پاکستان نہ آتا۔ اور ایک لمبے عرصے کے بعد سکندر عثمان کے بجائے خود گاؤں اسکول دیکھنے نہ جاتا یا وہاں جا کر غلام فرید کی بچی کا خیال آنے پر اس کے دل میں اسے دیکھنے کی خواہش پیدا نہ ہوتی اور ہمیشہ کی طرح چنی کے رشتہ دار کو چنی کو لے کر آنے کے بجائے اسکول ہی کی انتظامیہ کے چند لوگوں کے ساتھ سالار خود اچانک اس کے گھر نہ چلا جاتا۔

جس ڈیڑھ سال کی چنی کو سالار سکندر نے پہلی بار دیکھا تھا وہ اسے سات آٹھ ماہ کی ایک بچی لگی تھی۔ بے حد کمزور۔ دبلی پتلی۔ اس کی سانولی رنگت یرقان جیسی پیلاہٹ لیے ہوئے تھی۔ اس کا جسم اور چہرہ کسی جلدی انفیکشن کے نتیجے میں چھوٹے بڑے رسنے والے پیپ زدہ دانوں سے بھرا ہوا تھا اور اس کے سیاہ بال دھوپ گندگی میں رہ رہ کر بھوری لٹوں میں تبدیل ہو چکے تھے جو دھلنے اور کنگھی نہ ہونے کی وجہ سے آپس میں جڑی ہوئی تھیں۔ اس کے اوپری دھڑ پر جو فراک تھا۔ وہ بوسیدگی اور خستہ حالی کو تو ظاہر کر ہی رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کے سائز سے بہت بڑا ہونے پر یہ بھی ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی کوئی اور استعمال کرتا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں جیسے وہ جسم میں پانی کی کمی کا شکار ہو۔ ہاتھ پیروں کے بڑھے ہوئے اور میل سے بھرے ٹیڑھے میڑھے ٹوٹے ہوئے ناخن یہ ظاہر کر رہے تھے کہ اس کی دیکھ بھال کتنے اچھے طریقے سے ہو رہی تھی۔

جس وقت سالار اس گھر کے صحن میں داخل ہوا وہ گھر کے کچے صحن میں دانہ چگتی ہوئی مرغیوں کے پاس بیٹھی تھی اور اسی دانے اور گندگی کو بلا تکلف اپنے منہ میں ڈال رہی تھی۔ سالار نے اس بڑے صحن کے ایک کونے میں مرغیوں کے پاس بیٹھی اس بچی کو غور سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی کفالت کے لیے معقول رقم بھیجنے کے باوجود وہ اس حال میں ہو سکتی تھی۔

چنی کے رشتہ دار بے حد نروس اور گھبرائے ہوئے تھے۔ وہ سالار کو اندر لائے تھے اور مہمان خانے میں اسے بٹھانے کی کوشش کی تھی۔ سالار کو جلدی تھی۔ اسے صرف ایک نظر اس بچی کو دیکھنا تھا اور واپس جانا تھا۔ گھر کے

اندرونی حصے میں جانے کے بجائے یہ کام وہ وہیں صحن میں کھڑے کھڑے نمٹانا چاہتا تھا اور چنی کے رشتہ داروں کی بدقسمتی اور چنی کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس وقت وہیں صحن میں تھی وہ لوگ presentation اور display کے لیے ہنگامی بنیادوں پر اسے اب سجا سنوار نہیں سکتے تھے۔

"یہ بس ایسے ہی رہتی ہے۔ جتنی بار بھی کپڑے بدلو' یہ جا کر مرغیوں میں گھس جاتی ہے۔ حمیدہ! ارے او حمیدہ! ذرا دیکھو چنی کو۔ کپڑے بدلوا صاحب نے ملنا ہے۔"

گھر کے مالک نے بے حد گھبرائے اور شرمندہ سے انداز میں چنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیوی کو آواز لگائی تھی اور وہ پہلا موقع تھا جب سالار نے چنی کو بغور دیکھا تھا اور وہ بھی اپنا نام پکارے جانے پر کچھ خوف زدہ انداز میں اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

حمیدہ نے ہنگامی بنیادوں پر لپک کر چنی کو اندر لے جانے کی کوشش کی تھی لیکن سالار نے روک دیا' وہ جو چھپانا چاہتے تھے اسے چھپا نہیں پائے تھے اس لیے وہ اسے سالار کے پاس لے آئے تھے۔

حمیدہ کی گود میں اٹھائی ہوئی بہتی ہوئی نزلہ زدہ ناک والی اس بچی کو دیکھتے ہوئے سالار سکندر کو عجیب رحم آیا تھا اس پر۔۔۔ وہ افریقہ میں بچوں کو اس سے بھی برے حالات میں دیکھ چکا تھا لیکن ان بچوں کے ساتھ سالار سکندر کا کوئی احساس جرم نہیں تھا۔۔۔ جو چنی کو دیکھتے ہوئے اسے محسوس ہوا تھا۔

"نہیں نہیں۔ اس کو نہ اٹھائیں' یہ بڑی گندی ہے جی۔۔۔ آپ کے کپڑے نہ خراب کر دے۔ اس کو ابھی لیٹرین میں جانا نہیں آیا۔"

حمیدہ سے پہلے اس کے میاں نے سالار کو اس بچی کو اٹھانے سے روکا تھا۔ سالار نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس بچی کو اٹھا لیا تھا اور چنی بڑے آرام سے کسی جھجک کے بغیر اس کے پاس آگئی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار سالار سکندر جیسے حلیے والا کوئی شخص دیکھا تھا۔ سالار نے اسے تھپکتے ہوئے پچکارا تھا۔ وہ پلکیں جھپکائے جواب دیے بغیر لیکن اس سے چپکے ہوئے اسے دیکھتی رہی۔

"ہاں جی بس تھوڑی بیمار ہی رہتی ہے۔ شروع سے ہی ایسی ہے۔ ڈاکٹر کی دوائی سے فرق نہیں پڑا۔ اب پیر صاحب سے دم کرا کے لائے ہیں۔ انہوں نے تعویذ بھی دیا ہے گلے میں ڈالنے کے لیے۔ حمیدہ وہ تو نے ڈالا نہیں ابھی تک۔"

سالار میاں بیوی سے اب اس بچی کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور وہ گڑبڑائے ہوئے اس کے چہرے اور جسم پر رستے ہوئے دانوں کی وجوہات اور علاج بیان کر رہے تھے۔

سالار سکندر کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ غلط جگہ پر تھی۔ اس کا خیال نہیں رکھا جا رہا تھا اور اس کی کفالت کے لیے دی جانے والی امداد اس پر استعمال نہیں ہو رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کون سی ذہنی رو تھی جس میں اس نے چنی کو فوری طور پر وہاں سے لے جانے اور کسی دارالامان میں داخل کروانے کا فیصلہ کیا تھا یا کسی ایسی جگہ جہاں پر وہ بچی اچھی طرح پرورش پاتی اور اس ذہنی رو میں یہ فیصلہ اس نے چنی کے رشتہ داروں کو سنا بھی دیا تھا۔ ان کے احتجاج کے باوجود وہ چنی کو وہاں سے لے آیا تھا اور وہ اسے روک نہیں پائے تھے بدحواسی اور پریشانی کے باوجود۔ وہ چنی کو نہیں لے جا رہا تھا۔ ان کا ماہانہ وظیفہ لے جا رہا تھا اور وہ پیسے بند ہو جاتے تو۔ اس تو کے آگے ان سب کو بہت ساری فکریں لاحق ہو گئی تھیں لیکن سالار کے ساتھ اسکول کی انتظامیہ بھی تھی اور کچھ سیکیورٹی اہلکار بھی' وہ زبانی احتجاج کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکے تھے۔

حیران کن بات یہ تھی کہ اس سارے شور شرابے اور احتجاج میں چنی بے حد اطمینان اور پرسکون انداز میں سالار کی گود میں چڑھی اس کا کالر پکڑے رہی تھی۔۔۔ اس کے ساتھ گھر سے نکلتے ہوئے بھی وہ بے قرار اور پریشان

نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس کی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بٹھائے جاتے ہوئے۔

اس گاؤں سے اسلام آباد واپسی پر سالار اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتا رہا تھا اور چنی برابر والی سیٹ پر بیٹھی دروازے کی کھڑکی سے چپکی بے حد خاموشی اور اطمینان سے پورا راستہ باہر دیکھتی رہی تھی۔ وہ اگر بے چین ہوئی تھی تو صرف تب جب سالار نے اسے گاڑی میں بٹھاتے ہوئے اسے سیفٹی بیلٹ باندھنے کی کوشش کی تھی۔ جو اس کے ہاتھ پاؤں مارنے پر سالار نے کھول دی تھی۔ اسے اس وقت حمین یاد آگیا تھا۔ وہ بھی اس عمر میں اسی طرح سیفٹی بیلٹ سے جان چھڑاتا تھا۔

سیفٹی بیلٹ کھول دینے پر وہ ایک بار پھر سے پرسکون ہو گئی تھی۔ پورا راستہ سالار اسے وقتاً "فوقتاً" دیکھتا رہا لیکن وہ اس قدر اطمینان کے ساتھ شیشے سے باہر نظر آنے والی سڑک اور اس پر گزرنے والی ٹریفک کو دیکھنے میں مگن تھی کہ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر گاڑی کے اندر موجود سالار کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سالار اس کا یہ انہماک دیکھ کر مسکراتا رہا تھا۔ اس نے رستے میں ایک جگہ رک کر اسے ایک جوس کا ڈبہ اور بسکٹ کا ایک پیکٹ لے کر دیا تھا۔ وہ منٹوں میں وہ دونوں چیزیں کھا گئی تھی یوں جیسے وہ کئی دنوں کی بھوکی تھی۔

اسلام آباد آتے ہوئے گاڑی کے سفر کے دوران سالار اس بچی کی رہائش کے لیے مناسب ترین جگہ کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس وقت اس نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اسے خود پالے گا۔ وہ اتنی بڑی ذمہ داری لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور اگر سوچ بھی لیتا تو بھی یہ کام امامہ سے پوچھے بغیر نہیں کر سکتا تھا۔

جو بھی ممکنہ باتیں چنی کے لیے اس کے ذہن میں آرہی تھیں۔ وہ خود ہی انہیں مسترد کر رہا تھا۔ اسلام آباد پہنچنے پر گھر کے گیراج میں اس کے بچوں نے بھاگتے ہوئے اس کا استقبال کیا تھا اور گاڑی کے اندر چنی کو سب سے پہلے ساڑھے تین سالہ حمین نے دیکھا تھا اور اس کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح گول ہو گئی تھیں یوں جیسے اس نے جنگل کا کوئی جانور دیکھ لیا ہو۔ اس نے کھڑکی کے شیشے سے ناک اور منہ چپکائے ہیلو کہہ کر چنی کو مخاطب کیا تھا جو کھڑکی کے اندر والی سائیڈ سے شیشے سے چہرہ چپکائے ہوئے تھی اور حمین دوسری طرف سے۔ وہ کچھ خائف ہو کر تھوڑا سا پیچھے ہٹی تھی۔ اس سے پہلے کہ حمین کوئی اور حرکت کرتا۔ سالار گاڑی سے نکل کر دوسری طرف چکا تھا۔ اس نے حمین کو ہٹا کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور چنی کو باہر نکال لیا۔ چنی سے آنے والے بدبو کے بھبکے سب سے پہلے حمین نے ہی محسوس کیے تھے۔ اس نے بے اختیار اپنے ناک پر ہاتھ رکھتے ہوئے باپ سے کہا۔

"Oh my God she is so smelly and dirty and ugly"

(او مائی گاڈ یہ کتنی بودار گندی اور بد صورت ہے) وہ بے اختیار ناک پر ہاتھ رکھے کہتا گیا تھا جبکہ جبریل اور عنایہ کچھ فاصلے پر کھڑے کسی تبصرے اور سوال کے بغیر گھر میں باپ کے ساتھ آنے والے اس مہمان کو دیکھ رہے تھے۔

"حمین۔" سالار نے اسے ڈانٹنے والے انداز میں پکارا اور گھورا۔

Oh but then that's ok ...
May be she likes to live like this
I mean some people like to be different
I like her hairstyle... She is cool...

(و لیکن ٹھیک ہے۔ شاید اسے اسی طرح رہنا پسند ہو میرا مطلب ہے کہ کچھ لوگ مختلف ... ہوتے ہیں مجھے اس کا ہیئر اسٹائل اچھا لگا ہے۔ یہ کول ہے۔")

حمین نے ہمیشہ کی طرح باپ کی پھنکار کے بعد سیکنڈز میں اپنا بیان تبدیل کیا اور اپنی بات کے آخر میں چنی کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے باپ سے کہا۔

"Baba I also want to have her hair style"

(بابا میں بھی اس کی طرح ہیئر اسٹائل بنانا چاہتا ہوں)

سالار نے اس کی زبان کی قینچی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سائز کا خاموش نہ ہونے والا "جن" تھا جو اس گھر کے افراد کے ارد گرد ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا اور اس کے سوالات۔ ختم نہ ہونے والے سوالات نے امامہ اور سالار کی آئیڈیل والدین بننے کی ہر خواہش، خوبی اور معلومات کو ختم کر دیا تھا۔

"I think she is goldi lock"

حمین کی تعریفوں کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ اب باپ کو یہ جتا کر خوش کرنا چاہتا تھا کہ اسے وہ بچی اچھی لگی تھی۔

"یہ گولڈی لاک نہیں ہے۔ گندی ہے اس نے کئی ہفتوں سے اپنے بال نہیں دھوئے بلکہ شاید کئی مہینوں سے۔"

جبریل نے اسے ٹوک کر بتایا تھا۔ وہ تینوں اب سالار کے پیچھے پیچھے اندر جا رہے تھے۔

"آل رائٹ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کول نہیں ہے۔"

جواب پھر سے برزخ سے ہی آیا تھا جبریل بے اختیار پچھتایا۔ اس نے اس کے تبصرے کا جواب دے کر سالار کے پیچھے لگنے والی بلا اپنے پیچھے لگا لی تھی۔

"اگر میں کئی مہینوں تک اپنے بال نہ دھوؤں تو میرے بال بھی ایسے ہی ہوں گے میرا مطلب ہے گولڈن براؤن یا لائٹ گرے یا مسٹرڈ یلو۔" اس کا ذہن اب کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔

"نہیں۔" جبریل نے بے حد سخت لہجے میں فل اسٹاپ لگایا۔

"او کے۔" حمین نے بے حد اطمینان سے کہا "لیکن میں اپنے بال ڈائی تو کر سکتا ہوں۔"

جبریل نے اس بار اسے مکمل طور پر نظر انداز کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا وہ بالوں کے بعد چنی جیسے۔ ناخنوں کو بھی اپنانے کے بارے میں سوچنا شروع کر دے۔

امامہ نے سالار کو اس بچی کو اٹھائے دیکھا تھا۔ وہ طیبہ کے ساتھ بیٹھی اس وقت چائے پی رہی تھی اور وہ چائے پینا ہی بھول گئی تھی۔

"یہ کون ہے؟"

"بعد میں بتاؤں گا۔ تم اسے نہلا کر کپڑے بدل دو اس کے پھر میں اسے ڈاکٹر کو دکھانا چاہتا ہوں۔" اس نے چنی کو گود سے اتارتے ہوئے کہا تھا۔

امامہ کچھ الجھی تھی لیکن وہ اسے لے کر چلی گئی تھی اور اس کو نہلانے کی کوشش کے آغاز میں ہی اسے پتا چل گیا تھا کہ اس بچی کے بالوں کو کاٹے بغیر اس کو نہلایا نہیں جا سکتا۔ اس کے سر میں بڑے بڑے پھوڑے تھے اور ان پھوڑوں سے رسنے والی پیپ نے اس کے بالوں کی لٹوں کو آپس میں اس طرح جوڑ دیا تھا کہ اب ان کا کھلنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس نے شیونگ کٹ میں پڑی قینچی سے چنی کے سارے بال جڑوں تک کاٹ دیے تھے۔۔۔ وہ اس کا سر گنجا نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ پھوڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ امامہ کو اس بچی کو نہلاتے ہوئے بہت رحم اور ترس آیا تھا اور بے حد حیرانی بھی ہوئی تھی اسے۔۔۔ چنی بالکل چپ چاپ بیٹھی نہاتی رہی تھی۔ اس نے عام بچوں کی طرح رونا دھونا نہیں مچایا تھا۔۔۔ نہ ہی اپنے بال کٹنے یا ان گھنسوں اور پھوڑوں پر ہاتھ لگنے پر کسی تکلیف کا اظہار کیا تھا۔

باتھ روم میں جبریل اور عنایہ باتھ روم میں جا کر اس بچی کی صفائی ستھرائی کو بذات خود جا کر دیکھنے سے حمین کو روکنے کی کوششوں میں مصروف تھے جنہیں اس کام پر امامہ تعینات کر کے گئی تھی۔

وہ بالآخر جب چنی کو بالکل کریو کٹ میں نہلا دھلا کر حمین ہی کا ایک جوڑا پہنا کے باہر لائی تھی تو اسے دیکھ کر سب سے پہلی چیخ مارنے والا حمین ہی تھا۔

"Oh my God! Momy you have made her uglier horrible and you have destroyed my most favourite shirt

"او مائی گاڈ ممی! آپ نے اسے مزید بدصورت۔۔۔ خوفناک بنا دیا ہے اور آپ نے میری سب سے فیورٹ شرٹ بھی خراب کر دی ہے۔"

اس کو صدمہ تھا چنی کے بالوں کے ساتھ ساتھ اپنی شرٹ کو اس کے جسم پر دیکھ کر بھی دکھ ہوا تھا۔

"Momy she was a girl. You have made her a boy. God will never forgive you for that.

"ممی یہ لڑکی تھی۔ آپ نے اسے لڑکا بنا دیا۔ اللہ اس کے لیے آپ کو معاف نہیں کرے گا۔"

امامہ کو اس کی بات پر ہنسی آئی، سالار ٹھیک کہتا تھا۔ وہ "عجیب و غریب" ہی تھا اور چنی اس ساری گفتگو کے دوران خاموشی سے۔۔۔ اپنے اس نئے خاندان کو دیکھ رہی تھی۔

وہ اس گھر میں ہمیشہ کے لیے رہنے آئی تھی لیکن اس وقت کسی کو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ مہمان نہیں تھی۔



اس سال صرف چنی سالار سکندر کے خاندان میں نہیں آئی تھی۔ اس سال کا دوسرا بڑا واقعہ سالار سکندر کے برین ٹیومر کی تشخیص تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)



5۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ جینسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

8۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

چودھویں قسط

"اور اب اس کا کرو گے کیا؟" امامہ نے اپنے بیڈ پر سالار اور اپنے درمیان پر سکون گہری نیند میں خراٹے لیتی چنی کو دیکھتے ہوئے سالار سے پوچھا جو بیڈ کے دوسری جانب نیم دراز تھا اور وہ بھی اس وقت چنی ہی کو دیکھ رہا تھا جو اس بات سے مکمل طور پر بے خبر اور بے نیاز تھی کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔

زندگی میں پہلی بار کسی نے محبت اور شفقت کے ساتھ اس کا پیٹ بھر جانے تک اسے کھانا کھلایا تھا اور وہ بے حد رغبت سے امامہ اور حمین کے ہاتھوں سے لقمے لے لے کر کھاتی رہی تھی۔ خاص طور پر حمین کے ہاتھوں سے جو بہت ضد کر کے اس کار خیر میں شامل ہوا تھا۔

"اوہ! مائی گاڈ!" حمین نے اپنے ہاتھ میں پکڑا پہلا ہی لقمہ کھانے پر جیسے خوشی اور جوش کے عالم میں اپنے مخصوص انداز میں چیخ مارتے ہوئے نعرہ لگایا تھا۔

"Mummy She Likes Me" (ممی یہ مجھے پسند کرتی ہے) اس نے ٹماٹر کی طرح سرخ ہوتے ہوئے امامہ کے کانوں میں وہ "سرگوشی" کی تھی جو لاؤنج میں بیٹھے ہر شخص نے سنی تھی۔ چھ فٹ دور بیٹھے جبریل نے ایک کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر بے حد تحمل سے اگلا صفحہ پلٹتے ہوئے ایک جوابی "سرگوشی" کی۔

"She is the only one who Likes You"

"صرف یہی تمہیں پسند کرتی ہے۔"

امامہ نے حمین کے انکشاف کو اسی طرح نظر انداز کیا تھا جس طرح حمین نے جبریل کے تبصرے کو۔ وہ اس وقت چنی کو کھانا کھلانے میں مصروف تھا اور یہ ایک "اہم" ترین کام تھا جو اسے سونپا گیا تھا۔

چنی پلکیں جھپکائے بغیر حمین اور امامہ کو باری باری دیکھتے ہوئے ان کے ہاتھ سے کھانا کھاتی رہی تھی۔ بے حد سکون اور اطمینان سے۔ جو حیران کن تھا۔ اور وہ سکون اور اطمینان اس وقت بھی اس کے وجود سے جھلک رہا تھا جو نیند میں تھا اور جسے دیکھتے ہوئے سالار بے حد گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس نے کچھ دیر پہلے ہی امامہ کو اس کے اور اس کے باپ اور خاندان کے حوالے سے پیش آنے والے تمام حالات و واقعات کو اپنے احساس جرم کے ساتھ آگاہ کیا تھا اور چنی کے لیے امامہ کی ہمدردی اور ترس میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اہم ترین سوال وہی تھا جو امامہ نے پوچھا تھا۔

"میں اسے کسی (یتیم خانہ) Orphanage یا ویلفیئر ہوم میں داخل کروانے کے لیے کر آیا ہوں۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا ہے۔ مجھ پر اتنی ذمہ داری تو ہے کہ میں اس کی زندگی خراب ہونے نہ دوں۔ جو وہاں رہ کر ہو جائے گی جہاں یہ تھی۔" سالار نے بے حد سنجیدگی سے امامہ سے کہا۔

"تم احساس جرم کا شکار ہو رہے ہو؟" وہ اس کے اعتراف کے باوجود امامہ کے بغیر نہ رہ سکی۔

"ہاں۔ جو کچھ اس کے باپ نے اپنے خاندان کے ساتھ کیا اس میں میں بھی قصوروار ہوں۔ تھوڑی سی زیادہ کنسرن دکھا دیتا میں تو یہ سب نہ ہوتا جو ہو گیا۔" سالار اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ امامہ نے اس کا ہاتھ تھپکا۔

"تم اسے اپنے پاس رکھ کر کسی (یتیم خانہ) میں داخل نہیں کروا سکتے۔ خاص طور پر اس صورت حال میں جب اس کے رشتہ دار موجود ہیں اور کورٹ نے انہیں اس کی گارڈین شپ بھی دے رکھی ہے۔ وہ تمہارے خلاف قانونی کارروائی کر سکتے ہیں۔"

امامہ نے جیسے اسے خبردار کیا تھا۔
"مجھے پروا نہیں ہے اس کا بھی کچھ نہ کچھ انتظام کرلوں گا میں... فی الحال تو میں نے اپنی لیگل ٹیم سے کہا ہے کہ وہ اس کے بارے میں مجھے ایڈوائس کریں... کورٹ کو اپروچ کیا جاسکتا ہے اس بچی کے لیے۔ گارڈین شپ بدلی جاسکتی ہے۔ کوئی بہتر رشتہ دار ڈھونڈا جاسکتا ہے یا پھر کسی ویلفیئر ہوم کو اس کی ذمہ داری سونپی جاسکتی ہے۔"
وہ امامہ سے کہہ رہا تھا اور اس ساری گفتگو کے دوران سالار سکندر نے ایک لمحہ کے لیے بھی اس بچی کو گود لینے کے آپشن پر سوچا ہی نہیں تھا' وہ صرف اس بچی کی بہتر نگہداشت چاہتا تھا اور اس کے لیے روپیہ خرچ کرنے پر تیار تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ پاکستان میں قیام کے دوران ہی چنی کے لیے کوئی بہتر جگہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔
یہ خیال پہلی بار اس گھر میں حمین کو آیا تھا جو دوسرے دن امامہ سے چنی کا نام پوچھنے کی جدوجہد کررہا تھا۔
"مجھے یاد ہی نہیں رہا تمہارے بابا سے اس کا نام پوچھنا۔"
امامہ کو اس کے استفسار پر یاد آیا۔ سالار اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ چنی' امامہ اور تینوں بچوں کے ساتھ لاؤنج میں تھی جہاں وہ عنایہ کے تھمائے ہوئے کچھ کھلونوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھی۔ اس کے سر اور جسم پر موجود الرجی پر اب وہ کریم لگی ہوئی تھی جو امامہ تھوڑی دیر پہلے اسے ڈاکٹر کو دکھا کر تشخیص کرانے کے بعد لے کر آئی تھی۔
"Can I name her (میں اس کا نام رکھ دوں؟)"
حمین نے ماں کی بات کے جواب میں اسے تجویز پیش کی۔
"نہیں تم یہ نہیں کرسکتے۔" اس سے کچھ فاصلے پر ایک کتاب پڑھتے ہوئے جبریل نے جیسے اسے لگام ڈالنے کی کوشش کی۔
"کیوں؟" حمین نے اپنا پورا منہ اور آنکھیں بیک وقت پوری طرح کھول کر انہیں گول کرتے ہوئے تعجب کی انتہا پر پہنچتے ہوئے کہا۔
"کیونکہ اس کا پہلے ہی ایک نام ہے۔" جبریل نے اسی ٹھنڈے انداز میں اس کے سوال کا جواب ایسے دیا جیسے اسے حمین کی کم عقلی پر افسوس ہورہا ہو۔
"تمہیں اس کا نام پتا ہے؟" تڑاق سے اگلا سوال جبریل کی طرف اچھالا گیا۔
"نہیں۔" جبریل گڑبڑایا۔ "مجھے اس کا نام نہیں پتا۔"
حمین نے اسی انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسی ڈرامائی انداز میں کہا۔ "ممی اس کا نام نہیں جانتیں۔" وہ اب امامہ کی طرف متوجہ تھا۔ جو عنایہ کے لیے کچھ ڈرائنگ کررہی تھی۔ "عنایہ کو اس کا نام نہیں پتا۔" اس نے اب اپنے دونوں ننھے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو پھیلایا۔ "وہ! پوری دنیا میں کسی کو بھی اس کا نام نہیں معلوم!"
وہ جیسے عدالت میں اس کا کیس لڑنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا رہا تھا۔
"اور تم... کیا تم نہیں چاہتے کہ اس کا کوئی نام ہو؟"
اس کے انداز میں اس قدر ملامت تھی کہ ایک لمحہ کو جبریل کو بھی مدافعانہ انداز اختیار کرنا پڑا۔ وہ بری طرح گڑبڑایا۔
"میں نے یہ تو نہیں کہا۔"
"میں نے خود سنا ہے۔" حمین نے اپنے سینے پر اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں پھیلا

طور پر گول کرتے ہوئے اہم گواہ کا رول ادا کیا۔
جبریل نے فوری طور پر اپنا چہرہ کتاب کے پیچھے چھپانے میں عافیت سمجھی تھی۔ وہ اس چھوٹے بھائی کو تو تب بھی چپ نہیں کروا سکا تھا جب اسے بولنا نہیں آتا تھا اور اب چپ کرواتا؟
"حمین! اس کے پیرنٹس نے اس کا کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھا ہوگا۔ وہ اتنی بڑی ہے۔"
امامہ نے اس بار مداخلت کرنی ضروری سمجھی۔ حمین کو اس کی بات پر جیسے کرنٹ سا لگ گیا۔
"پیرنٹس!" اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی تھی۔ جبریل کو کتاب ہٹا کر اسے دیکھنا پڑ گیا۔ "اوہ! مائی گاڈ۔" حمین کی آواز صدمہ زدہ تھی۔ "پھر یہ ان کے پاس کیوں نہیں ہے؟"
اس نے اسی صدمے میں امامہ سے جیسے احتجاجاً کہا تھا اور یہ وہ سوال تھا جس کا جواب امامہ نہیں دے سکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سوال کے جواب میں چنی کے خاندان کے بارے میں اسے کیا بتائے۔
اس کی خاموشی نے حمین کو جیسے اور بے تاب کیا۔
"کیا اس کا کوئی بھائی یا سسٹر بھی نہیں ہے؟"
"نہیں! اس کا کوئی نہیں ہے۔" امامہ نے جواب دیا۔ حمین کا چہرہ کھل اٹھا۔
"تب تو میں اس کا نام رکھ سکتا ہوں۔" گفتگو جہاں سے شروع ہوئی تھی گھوم پھر کر وہیں آ گئی تھی۔ حمین اپنی کوئی بات نہیں بھولتا تھا۔ یہ اس کے ماں باپ کی بدقسمتی تھی۔
"او کے... تم اس کا نام رکھ لو۔" امامہ نے جیسے ہاتھ جوڑنے والے انداز میں اس کے سامنے ہتھیار ڈالے اور دوبارہ عنایہ کی ڈرائنگ کی طرف متوجہ ہو گئی۔
"ممی! کیا یہ ہمارے ساتھ رہے گی؟" حمین نے ایک اور سوال سے اسے مشکل میں ڈالنا ضروری سمجھا۔
"نہیں..." امامہ نے اسی طرح کام میں مصروف اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر کہا۔
"کیوں؟" حمین نے جیسے چیخ نما انداز میں سوال کیا۔ امامہ صرف گہری سانس لے کر رہ گئی تھی۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ حمین کے پاس سوال ختم ہو جائیں یا وقتی طور پر کسی وقت رک جایا کریں۔
"جب تمہارے بابا آئیں گے تو ان ہی سے پوچھنا۔" اس نے بلا کو اپنے سر سے ٹالنے کی کوشش کی۔
"ممی! کیا ہم اسے اڈاپٹ کر سکتے ہیں۔" امامہ کا دماغ گھوم گیا تھا اس سوال پر۔
"نہیں... یہ نہیں ہو سکتا۔" کوئی دوسری صورت حال ہوتی تو وہ اس سوال پر ہنس پڑتی لیکن محمد حمین سکندر نے اپنے ماں باپ کی حس مزاح کو ختم کر دیا تھا۔ ان کی برداشت کے پیمانے کے ساتھ ساتھ...
"تم اسے اڈاپٹ کیوں کرنا چاہتے ہو؟" جبریل نے جیسے ہول کر کہا تھا۔
"کیونکہ مجھے ایک بے بی چاہیے۔"
اس نے بے حد روکھے انداز میں کسی سے نظریں ملائے بغیر اعلان کیا۔ جبریل جیسے غش کھا گیا تھا۔ امامہ دم بخود اپنے ساڑھے تین سالہ بیٹے کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھی جبکہ لاؤنج میں آتے ہوئے سکندر عثمان اپنی ہنسی پر قابو نہیں رکھ سکے تھے۔ حمین نے سکندر عثمان کو اندر آتے اور ہنستے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جا کر ان کی ٹانگوں سے لپٹا اور اس نے وہ مطالبہ ایک بار پھر پیش کیا۔
"ایک دن آئے گا جب بے بی آپ کے پاس ہوگا۔" انہوں نے اسے تھپکتے ہوئے تسلی دی۔
"ایک دن؟" حمین کی آنکھیں عادتاً گول ہوئیں۔ "آج کیوں نہیں؟"
اس نے ضد کی۔ سکندر عثمان نے زمین پر بیٹھی کھلونوں سے کھیلتی ہوئی چنی کو دیکھا جتنا ترحم اور احساس جرم سالار سکندر کے دل میں چنی کے لیے تھا اتنا ہی ترحم سکندر عثمان کے دل میں اس بچی کے لیے تھا۔ وہ جیسے ان

دونوں کا مشترکہ احساس جرم تھی۔

"بیٹا! اسے واپس جانا ہے۔ وہ آپ کی بے بی نہیں ہو سکتی۔" سکندر عثمان نے اب حمین کو سمجھانے کی کوشش کا آغاز کیا۔

"اسے کہاں جانا ہے؟" حمین کو سکندر عثمان کی بات پر ایک نیا جھٹکا لگا۔ وہ جیسے ہکا بکا انداز میں چنی کو دیکھنے لگا۔ "اپنی فیملی کے پاس۔" سکندر عثمان نے مختصراً کہا۔ وہ اسے یتیم خانہ کے بارے میں بتانا نہیں چاہتے تھے نہ چنی کے حوالے سے مزید سوالوں کا پنڈورا باکس کھولنا چاہتے تھے لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کا سوال اس صورت حال میں غلط ہو گیا تھا۔

"لیکن ممی نے تو کہا تھا اس کی کوئی فیملی نہیں ہے۔"

سکندر عثمان نے امامہ کو دیکھا۔ امامہ نے انہیں۔ "آپ کے بابا اس کو کسی نرسری میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔" امامہ نے اس کے لیے ایک جواب ڈھونڈا۔

"یہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہ سکتی۔ ہمارا گھر اتنا بڑا ہے۔" اس نے ہاتھ پھیلا کر "بڑا" پر زور دیا۔

سوال بے ساختہ تھا اور جواب بھی اسی میں تھا۔ بچے بعض دفعہ وہ حل چٹکی بجاتے پیش کر دیتے ہیں جن سے بڑے آنکھیں چرائے پھر رہے ہوتے ہیں۔ حمین کا یہ "حل" سالار سکندر نے بھی سنا جو اس وقت چند یتیم خانوں کا معلوماتی میٹریل اٹھائے لاؤنج میں داخل ہو رہا تھا لیکن اس وقت حمین کا یہ حل ان سب کو حمین کی بچکانہ ضد اور فینٹسی سے زیادہ کچھ نہیں لگا تھا۔ وہ ابھی دو ہفتے اور پاکستان میں تھا اور وہ ان دو ہفتوں میں چنی کے حوالے سے کوئی فیصلہ کر لینا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے وہ اس کے رشتہ داروں سے کورٹ کے ذریعے چنی کی گارڈین شپ لینے کے لیے مالی معاملات طے کرنے میں مصروف تھا۔

"یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔ یہ آپ کے دادا ابو کا گھر ہے۔" اندر آتے ہوئے سالار نے اس کے سوال کا جواب پیش کیا۔

حمین سوچ میں پڑا۔

"آپ کے بابا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" امامہ نے جیسے اس کی خاموشی پر سکون کا سانس لیا۔ "ہمارے پاس گھر نہیں ہے۔" حمین الجھا۔ "یہ ہمارے ساتھ کنشاسا میں رہ سکتی ہے۔" حمین کو کنشاسا والے گھر کا خیال آیا۔

"لیکن وہ بھی ہمارا گھر نہیں ہے۔ ہم اسے جلد چھوڑ دیں گے۔ زیادہ سے زیادہ ایک سال میں۔"

سالار نے بے حد سنجیدگی سے اس کے ساتھ یوں بات کرنا شروع کر دی جیسے وہ کسی بڑے آدمی سے بات کر رہا ہو۔ اس کے تینوں بچے غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے اور یہ ان کے جینز میں ودیعت ہوئی تھی مگر یہ غیر معمولی ذہانت جو جبریل اور عنایہ کی شکل میں انہیں نعمت لگی تھی، حمین کی شکل میں مصیبت بن گئی تھی۔

حمین ابھی بھی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ جیسے چنی کے لیے ایک گھر کی تلاش میں تھا جہاں اسے رکھا جا سکتا اور امامہ کو گھر کے ذکر پر جیسے اپنا گھر یاد آگیا تھا۔ "ہمارے پاس ہمارا اپنا گھر کیوں نہیں ہے؟"

"ہمارا اپنا گھر ہو گا۔" امامہ نے حمین کو جیسے بہلایا۔

"کب؟"

"بہت جلد۔"

امامہ چائے بنا کر سالار اور سکندر عثمان کو پیش کر رہی تھی جو ملازم چند لمحے پہلے رکھ کر گیا تھا۔

"اسی لیے منع کرتا تھا میں کہ فضول خرچیاں مت کرو۔ وقت پر ایک گھر بنا لو۔ جیسے تمہارے سارے بھائیوں نے بنا لیے۔" سکندر عثمان کو اس موضوع گفتگو سے وہ پلاٹ اور وہ انگوٹھی یاد آگئی۔

"وہ پلاٹ اس وقت ہوتا تو چار پانچ کروڑ کا ہو چکا ہوتا۔ اس رنگ کی اس وقت کی مارکیٹ پرائس سے ڈبل۔" سکندر عثمان نے روانی سے کہا۔ اپنے لیے چائے ڈالتی امامہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی۔ الجھی۔

"کس رنگ کی؟" اس نے جیسے حیران ہو کر سکندر عثمان سے پوچھا۔

"جو رنگ تم نے پہنی ہوئی ہے۔" سکندر عثمان نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ سالار کو غلطی کا احساس ہوا۔ اسے سکندر کو اس موضوع پر آنے سے پہلے موضوع بدل دینا چاہیے تھی لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ امامہ نے بے یقینی سے ہاتھ میں پہنی انگوٹھی کو دیکھا۔ پھر سالار کو پھر سکندر عثمان کو۔

"یہ پلاٹ بیچ کر آئی ہے؟"

"ہاں۔ ایک کروڑ 37 لاکھ کی۔ ذرا سوچو دس گیارہ سال پہلے وہ پلاٹ نہ بکتا تو آج وہ اسلام آباد میں جس جگہ پر ہے اس سے چار پانچ گنا قیمت ہو چکی ہوتی۔ رنگ تو اتنی قیمتی نہیں ہو سکتی وقت کے ساتھ..."

سکندر عثمان نے نہ امامہ کے تاثرات پر غور کیا تھا نہ سالار کے۔ وہ روانی میں چائے پیتے ہوئے بات کہتے چلے گئے تھے۔ امامہ ساکت اور دم بخود سالار کو دیکھ رہی تھی جو اس سے نظریں چرائے چائے پینے میں مصروف تھا۔ وہ اس وقت یہی کر سکتا تھا۔ کمرے میں یک دم اپنی بات کے اختتام پر چھانے والی خاموشی سے سکندر عثمان کو لگا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔

چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے وہ رکے۔ انہوں نے ساکت بیٹھی امامہ کو دیکھا، جو سالار کو گھور رہی تھی اور پھر سکینڈ کے ہزارویں حصے میں انہیں اس خاموشی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

"اسے اب بھی نہیں پتا؟" انہوں نے بے یقینی سے اپنے بیٹے سے پوچھا جس نے مگ سامنے پڑی ٹیبل پر رکھتے ہوئے بڑے تحمل سے کہا۔

"اب پتا چل گیا ہے۔" سکندر عثمان کی سمجھ میں نہیں آیا وہ فوری طور پر اس انکشاف کے بعد کس رد عمل کا اظہار کرتے جو ایک راز کو غیر ارادی طور پر افشا کرنے پر ان کی شرمندگی کو چھپا لیتا۔

امامہ نے اپنے ہاتھ کی پشت کو پھیلا کر اس انگوٹھی کو دیکھا۔ پھر سکندر عثمان کو۔ پھر سالار کو... وہ اگر کہتا تھا کہ وہ انمول تھی تو غلط نہیں کہتا تھا۔ اس کی زندگی میں بہت سارے لمحے آئے تھے۔ جب اس کا دل بس سالار کے گلے لگ جانے کو چاہا تھا۔ کسی لفظ، کسی اور اظہار کے بغیر۔ احسان مندی اور تشکر کے لیے دنیا میں موجود سارے لفظ بھی کبھی اس جذبے اور احساس کو کسی دوسرے تک پہنچانے کے لیے چھوٹے پڑ جاتے ہیں جو انسان کے اندر سے کسی دوسرے کے لیے کسی چشمے کی طرح ابلتا ہے۔ اس کا دل بھی اس وقت سالار سے صرف لپٹ جانے کو چاہا تھا۔ بچوں کی طرح... وہ زندگی میں کتنی بار اسے اس طرح لاجواب کرتا رہے گا۔

اس نے سامنے بیٹھے اس شخص کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا جو اس کی زندگی کی کتاب کا سب سے خوب صورت ترین باب تھا۔ یہ اس انگوٹھی کی قیمت نہیں تھی۔ جس نے امامہ ہاشم کی زبان سے لفظ چھین لیے تھے۔ یہ دینے والے شخص کی بے لوث محبت تھی۔ جس کے سامنے امامہ کھڑی نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ کیا کہتی... وہ سالار سکندر سے کیا کہہ سکتی تھی۔



"تم نے رنگ اتار دی؟" اس رات سالار امامہ کے ہاتھ میں اس رنگ کو نہ پا کر پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"میں بے وقوف نہیں ہوں کہ اتنی قیمتی رنگ ہر وقت پہنے پھروں۔" امامہ نے اسے جواباً کہا۔ وہ اپنے فون پر کچھ ٹیکسٹ میسجز چیک کرنے میں مصروف تھی۔ سالار ٹی وی پر کوئی نیوز چینل لگائے بیٹھا تھا جب چند

سرفنگ کرتے ہوئے اس کی نظر امامہ کے ہاتھ پر پڑی تھی جو اس کے قریب صوفے پر بیٹھی اپنے فون میں گم تھی۔

"تمہیں مجھے بتانا چاہیے تھی اس کی قیمت۔" اس نے سالار سے کہا۔

"صرف اسی خدشے کے تحت نہیں بتایا تھا تمہیں۔۔۔ اور دیکھو میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ تم اسے بھی اب لاکر میں رکھ دو گی۔"

سالار کچھ ناخوش سا دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہوا۔ ایک لمحہ کے لیے امامہ خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

"تو اور سنبھال رکھوں۔۔۔ ساتھ لیے پھرنا بے وقوفی ہے، گم ہو جائے تو؟ مجھے پہلے بھی اس کے گم ہونے کا اتنا صدمہ ہوا تھا اور اب تو۔۔۔ ہارٹ اٹیک ہی ہو جائے گا مجھے جو ایک کروڑ سے بھی مہنگی انگوٹھی میں گم کر دوں۔"

"تقریباً سوا دو کروڑ۔" سالار ٹی وی پر نظریں جمائے بڑبڑایا۔ امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"کیا۔۔۔؟"

"اس کی موجودہ قیمت۔۔۔" وہ اسی انداز میں اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر بولا۔

"اسی لیے تو نہیں پہن رہی۔۔۔ بے وقوفی تھی ویسے یہ۔۔۔" اس نے ایک ہی سانس میں کچھ توقف کے بعد کہا۔

"کیا؟" سالار اس بار اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"ایک پلاٹ بیچ کر انگوٹھی خریدنا۔۔۔ اور وہ بھی اتنی مہنگی۔۔۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو کبھی نہ خریدتی۔"

"اسی لیے تم میری جگہ نہیں ہو امامہ۔۔۔" سالار نے جتانے والے انداز میں اسے کہا۔ وہ نادم ہوئی تھی لیکن اس نے ظاہر نہیں کیا۔

"وہ پلاٹ ہوتا تو آج اسے بیچ کر گھر بنا چکے ہوتے ہم۔۔۔" اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سالار سے کہا۔

"تمہارے خوابوں کا ایکڑوں پر پھیلا ہوا گھر چند کروڑ میں بن جاتا؟؟"

وہ اب اسے چڑانے والے انداز میں کچھ یاد دلا رہا تھا اور امامہ کو ایک جھماکے کے ساتھ وہ اسکریپ بک یاد آئی جس میں اس نے اپنے ممکنہ گھر کی ڈھیروں ڈرائنگز بنا رکھی تھیں۔۔۔ گھر کے نقشے ہی نہیں کمروں کی کلر اسکیم تک۔۔۔ گھر کے اندر کی سجاوٹ کی تفصیلات تک۔۔۔ اور وہ اسکریپ بک گھر کے بہت سے دوسرے سامان کے ساتھ سکندر عثمان کے گھر کی اوپری منزل کے دو کمروں میں اسٹور کیے ہوئے سامان کے ساتھ کہیں رکھی ہوئی تھی۔ دس سال پہلے امریکہ شفٹ ہونے کے بعد وہ اسکریپ بک اس کے پاس تھی لیکن وہاں سے کانگو جانے سے پہلے وہ اپنا کچھ سامان پاکستان چھوڑ گئی تھی اور اس میں وہ اسکریپ بک بھی تھی اور شاید اس کی قسمت میں بچنا تھا۔ اس لیے وہ بچ گئی تھی ورنہ کانگو میں پڑے اس کے باقی سامان کے ساتھ جل کر خاک ہو چکی ہوتی۔

"اچھا کیا مجھے یاد دلا دیا۔ میں تو کل ہی وہ اسکریپ بک نکالتی ہوں۔ مدت ہو گئی اسے دیکھے اور اس میں کچھ add کیے۔"

امامہ کا ذہن برق رفتاری سے انگوٹھی سے ہٹ کر گھر پر چلا گیا تھا اور یہ نہیں کیا ہوا تھا کہ ٹی وی دیکھتے دیکھتے سالار کو امریکہ میں خریدے اور پھر بیچ دیے جانے والے اس گھر کا خیال آیا تھا۔ جس کے بارے میں اس نے امامہ کو بتایا تک نہیں تھا۔

"تمہیں ایک چیز دکھاؤں؟" سالار نے ریموٹ کا میوٹ کا بٹن دباتے ہوئے ٹی وی کی آواز بند کی اور سامنے ٹیبل پر پڑے اپنے لیپ ٹاپ کو اٹھایا۔

"کیا؟" وہ دوبارہ اپنے سیل فون کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے چونکی۔

سالار اب لیپ ٹاپ کھول کر اس میں سے تصویروں والے حصے میں جا کر اس گھر کی تصویریں ڈھونڈ رہا تھا اور وہ چند منٹوں کی جدوجہد کے بعد اسکرین پر نمودار ہو گئی تھیں۔

"یہ کیا ہے؟" امامہ نے ایک کے بعد ایک اسکرین پر نمودار ہونے والی ان تصویروں کو دیکھتے ہوئے سالار کو دیکھا۔

"ایک گھر۔ ایک جھیل۔۔۔ اس کے گرد پھیلا لان۔۔۔"

وہ اس کی بات پر ہنسی۔

وہ تو مجھے نظر آ رہا ہے۔۔۔ لیکن کس کا گھر ہے؟

اس نے سالار سے پوچھا "اور مجھے کیوں دکھا رہے ہو؟"

"تم نے کبھی پہلے یہ تصویریں دیکھی ہیں؟" سالار نے ایک لمحہ کے لیے ٹھٹک کر اس سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ کیوں؟" امامہ نے اس کے سوال پر کچھ حیران ہو کر پوچھا۔

"جب حمین پیدا ہوا تھا اور میں تمہارے پاس امریکہ سے گیا تھا تو تم نے مجھے بتایا تھا کہ اس رات تم نے خواب میں ایک گھر دیکھا تھا۔ یاد وہ گھر ایسا تھا؟ تمہیں وہ خواب یاد ہے نا؟" سالار نے اس سے پوچھا۔

"ہاں یاد ہے۔" وہ ایک لمحہ کے لیے ٹھٹکی "لیکن وہ گھر ایسا نہیں تھا۔۔۔ وہ جھیل بھی ایسی نہیں تھی۔"

امامہ نے جیسے اپنی یادداشت پر زور دیا۔ خواب بے شک پرانا تھا لیکن تخیل کبھی پرانا نہیں ہوتا۔ اور یہ کہہ کر اس نے جیسے سالار کے احساس جرم کے غبارے کی ہوا نکال دی تھی وہ بے اختیار ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

"لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو یہ سب؟ اور یہ کس کا گھر ہے؟" امامہ کو اب الجھن ہوئی۔

"تمہارے لیے خریدا تھا۔" سالار نے ایک بار پھر ان تصویروں کو سکرول کرنا شروع کر دیا۔

امامہ کو اس کی بات پر جیسے جھٹکا لگا تھا۔ "کیا مطلب؟ میرے لیے؟"

"ہاں تمہارے لیے mortgage کیا تھا امریکہ میں۔۔۔ تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا تمہاری برتھ ڈے پر گفٹ کر کے لیکن۔"

وہ اب ان تصویروں کو باری باری دیکھتے ہوئے بات کرتے کرتے آخری تصویر پر جا کر رکا۔

"لیکن۔۔۔؟" امامہ نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"لیکن پھر میں نے اسے بیچ دیا کانگو دوبارہ آنے سے پہلے۔" سالار نے تصویروں کے فولڈر کو بند کر کے اسے ڈیلیٹ کرتے ہوئے کہا۔ "سود سے میں دنیا میں تو گھر لے سکتا تھا، جنت میں گھر نہیں لے سکتا تھا۔"

اس نے لیپ ٹاپ اسکرین سے نظریں ہٹا کر امامہ کو دیکھا اور عجیب انداز میں مسکرایا۔ شرمندگی، ندامت، بے چارگی۔۔۔ سب کچھ تھا اس مسکراہٹ میں۔۔۔ یوں جیسے کسی نے ہتھیار ڈالے ہوں۔

"تم لے بھی لیتے تو بھی میں اس گھر میں کبھی نہ جاتی۔ صرف ایک گھر ہی کی تو فرمائش کی ہے تم سے پوری زندگی میں۔۔۔ وہ بھی حرام کے پیسے سے بنا کر دیتے مجھے۔" امامہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں تمہارے خوابوں کا گھر بنا کر دینا چاہتا تھا۔ ایکڑوں پر پھیلا۔ جھیل کے کنارے۔۔۔ سمر ہاؤس اور گزیبو والا۔" سالار نے ٹھنڈی سانس لی "اور جلد بنانا چاہتا تھا بڑھاپے تک پہنچنے سے پہلے۔" اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

امامہ نے سر جھٹکا "تم واقعی بے وقوف ہو۔ میرے خوابوں کے گھر کی اینٹیں حرام کے پیسے سے رکھی جائیں۔ خواہش نہیں کی تھی میں نے۔۔۔ اور ایکڑوں کا گھر تم سے کہا تھا لیکن دعا تو اللہ تعالیٰ سے کرتی ہوں کہ وہ اس کو متحمل کرے اور راستے اور وسائل دے۔۔۔ تم سے ایک بار بھی میں نے نہیں کہا کہ اتنا کماؤ یا اسی سال گھر کھڑا کر کے دو۔ اتنے سالوں میں ایک بار بھی تم سے ضد کی کہ اس سال ضرور لے کر ہی دو گھر۔۔۔ کبھی یاد دہانی نہیں کرائی میں نے۔۔۔ پھر کیوں جلدی تھی تمہیں اس گھر کے لیے کہ تمہیں mortgage کرنا پڑا۔"

اسے افسوس ہو رہا تھا۔ "تم نے کبھی مجھ سے نہیں کہا، مجھے ریمائنڈر نہیں دیے لیکن مجھے پتا تو تھا نا کہ تمہاری

خواہش ہے یہ۔۔۔ میں چاہتا تھا میں تمہاری یہ خواہش پوری کروں۔۔۔ تم نے صرف ایک چیز مانگی تھی مجھ سے۔۔۔ اس لیے۔"

وہ اس سے کہتا جا رہا تھا۔ امامہ ہنس پڑی۔

"تم خواب دیکھ رہے ہو سود سے پاک ایک اسلامی مالیاتی نظام کا جسے دنیا میں رائج کر سکو۔۔۔ اور میں خواب دیکھتی ہوں ایک ایکڑوں پر پھیلے گھر کا۔۔۔ حلال کے پیسے سے بنے ہوئے گھر کا۔۔۔ خواب تمہارا بھی اللہ ہی پورا کر سکتا ہے اور میرا بھی۔۔۔ اس لیے اسے اللہ پر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ویسے بھی میں نے سوچا ہے وہ انگوٹھی بیچ کر اس سے کوئی پلاٹ تو لے کر رکھ ہی سکتی ہوں میں۔"

سالار نے بے حد خفگی سے اس کی بات کاٹی۔ "تم اسے بیچ دو گی؟"

وہ ہنس پڑی۔ "نہیں۔۔۔ تم سمجھتے ہو میں اسے بیچ سکتی ہوں؟"

"ہاں!" سالار نے اسی روٹھے انداز میں کہا۔ وہ ایک بار پھر ہنس پڑی۔ "تمہیں پتا ہے دنیا میں صرف ایک ہی مرد ہے جو میرے لیے ایسی انگوٹھی خرید سکتا ہے۔"

"اب تم رو کر مجھے جذباتی کرو گی۔" سالار نے اس کی آنکھوں میں ابھرتی نمی کو دیکھ کر حفاظتی بند باندھنے کی کوشش کی پہلے اسے ٹوکا۔

"یہ انگوٹھی invaluable (انمول) ہے۔۔۔ تم invaluable (انمول) ہو۔" اس نے ٹھیک بھانپا تھا۔ امامہ کی آنکھیں برسنے لگی تھیں۔

"پھر ایک بات مانو۔" سالار نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"کیا؟"

"اسے ہاتھ میں پہن لو۔"

"گم ہو جائے گی۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"میں اور لے دوں گا۔" اس نے امامہ کے آنسو پونچھے۔

"تمہارے پاس اب بیچنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں۔" امامہ نے آنسوؤں کی بارش میں بھی ہوش مندی دکھائی تو وہ ہنسا۔

"تم مجھے اپ سیٹ کر رہی ہو۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا باہر پڑے میٹرس پر سویا ہوا حمین جاگ گیا تھا۔ وہ دونوں بیک وقت اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ نیند میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

"اب یہ کیا کہہ رہا ہے؟" سالار حیران ہوا۔ اس نے پہلی بار اسے نیند میں باتیں کرتے دیکھا تھا۔

"شاید تسلی نہیں ہوئی اس کی۔۔۔ کوئی بات ہو گی کرنے والی جو اس وقت یاد آئی ہو گی۔ کرتا۔" امامہ نے گہرا سانس لے کر اٹھ کر حمین کی طرف جاتے کہا جو میٹرس پر بیٹھے آنکھیں بند کیے کچھ اس طرح بول رہا تھا جیسے کوئی ضروری بات کسی سے کر رہا ہو۔

امامہ نے اسے دوبارہ لٹا کر تھپکنا شروع کیا اور اس کے برابر میں انگوٹھا منہ میں ڈالے لیٹی ہوئی جبریل کو دیکھا جو گہری نیند میں تھی۔۔۔ اس کا میٹرس حمین کے میٹرس کے برابر میں تھا۔ اگر اسے ہونے والی الرجی کی وجہ سے امامہ احتیاط نہ کر رہی ہوتی تو وہ جنی کو اپنے میٹرس پر ہی سلا چکا ہوتا کیونکہ وہ جنی کو ان لوگوں کی تمام کوششوں کے باوجود اپنی "لے پالک اولاد" مان چکا تھا۔

"سالار! اس کے بارے میں جو بھی طے کرنا ہے جلد کرو۔۔۔ حمین جس طرح اس سے اٹیچ ہو رہا ہے۔ میں

نہیں چاہتی کچھ اور وقت یہاں رہنے کے بعد یہ یہاں سے جائے تو وہ اپ سیٹ ہو۔"

امامہ نے حمین کو تھپکتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر جنی پر پڑی چادر ٹھیک کرتے ہوئے سالار سے کہا۔

"صبح طے کر لو کہ اسے کہاں چھوڑ کر آنا ہے تو اسے چھوڑ آتے ہیں۔ جو دو چار ادارے مجھے مناسب لگ رہے ہیں ان کے بارے میں انفارمیشن تو لے آیا ہوں۔"

سالار نے بیڈ کی طرف جاتے ہوئے جس کام کو بہت آسان سمجھتے ہوئے امامہ کو ہدایات دی تھیں۔ وہ کام اتنا آسان ثابت نہیں ہوا تھا۔

اگلے دن وہ اس بچی کو لے کر ان چاروں اداروں میں گئے تھے جہاں وہ اسے رکھنا چاہتے تھے۔ دو اداروں نے مناسب قانونی کارروائی کے بغیر اس بچی کو فوری طور پر اپنی تحویل میں لینے سے انکار کر دیا۔ جن دو اداروں نے اس بچی کو وقتی طور پر لینے پر آمادگی ظاہر کی تھی، وہاں بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کے انتظامات دیکھ کر وہ دونوں خوش نہیں ہوئے۔

شام کو وہ پھر جنی کے ساتھ واپس گھر پہنچ چکے تھے اور حمین کی باچھیں جنی کو ایک بار پھر دیکھ کر کھل گئی تھیں۔ وہ صبح بھی بڑی مشکل سے ہی جنی کو رخصت کرنے پر تیار ہوا تھا اور اب جنی کی واپسی تو اس کے لیے ایک بگ نیوز تھی اور جنی بھی اسے دیکھ کر کچھ اسی طرح نہال ہوئی تھی۔ وہ دن ختم ہونے سے پہلے بھی نہ بولنے کے باوجود اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی مسکراہٹ اور کھلکھلاہٹ یہ عیاں کرنے کے لیے کافی تھی کہ اس پر بھی حمین کا سامنا کرنے پر اثر وہی ہو رہا تھا جو حمین پر ہوا تھا۔

اگلے چند دن سالار نے جنی کی گارڈین شپ کے حوالے سے قانونی کارروائی کرنے اور جنی کی پیدائش اور پیدائش سے متعلقہ باقی کاغذات پورے کرنے کی کوشش کی اور جب دو تین دنوں میں وہ ان کاموں میں پھنسا رہا تو حمین نے جنی کے بارے میں یہ بھی دریافت کر لیا تھا کہ وہ "گونگی" تھی کیونکہ وہ ان تین چار دنوں میں بالکل خاموش رہی تھی۔ صرف ضرورتاً زبان سے آوازیں نکالتی رہی تھی جو بہت محدود اور اوں آں تک محدود تھیں اور یہ جنی کے بارے میں ایک بے حد خوفناک انکشاف تھا جس نے امامہ اور سالار دونوں کو ہلا دیا تھا۔

"Mummy ! she is dumb" (ممی! یہ گونگی ہے) "dumb" (گونگی)۔" امامہ کو یقین نہیں آیا۔

حمین نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے پورا یقین ہے۔"

اس نے امامہ کو اس دن کی سب سے "اہم" اطلاع دی جو اس نے پچھلے چند دنوں میں جنی کی مسلسل خاموشی سے اخذ کی تھی۔

"نہیں سن تو رہی ہے۔" امامہ نے جنی سے بات کرنے کی کوشش کے بعد نتیجہ نکالتے ہوئے کہا۔ وہ ہر آواز پر متوجہ ہوتی تھی۔

"ممی! یہ امپورٹنٹ نہیں ہے۔" حمین ماں کے اطمینان پر خوش نہیں ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا اس کی اپنی تشخیص ٹھیک تھی اور اسے ہی درست سمجھا جانا چاہیے۔ "The most important thing is to talk and she can't talk"

(اہم بات بولنا ہے اور یہ بول نہیں سکتی) حمین نے اس کی معذوری پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اپنی آنکھوں میں حتی المقدور سنجیدگی اور افسوس شامل کیا۔

"The most important thing is to listen"

(سب سے اہم بات سننا ہے) امامہ نے بڑے غلط موقع پر اپنے بیٹے کو نصیحت کی کوشش کی۔ وہ چند لمحے خاموش رہ کر جیسے ماں کی بات پر سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

"I dont think so_ There are so many things which can listen but only few can talk_

(میں ایسا نہیں سمجھتا۔ یہاں بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو سن سکتی ہیں لیکن چند ہی ایسی ہیں جو بول سکتی ہیں۔)

محمد حمین سکندر کی دانائی نے امامہ کو ہمیشہ کی طرح چاروں شانے چت گرایا تھا۔ وہ اب لان میں موجود وہ ساری چیزیں ماں کو گنوا رہا تھا جو "وہ سن سکتی" تھیں لیکن بول نہیں سکتی تھیں۔ اور ان چیزوں میں اس نے چنی اور اس کے ہاتھ میں پکڑی گڑیا کو بھی گنا تھا۔ امامہ نے ہاتھ جوڑ کر اس کمنٹری کو روکا تھا۔ وہ ایک چلتی پھرتی ٹاکنگ ڈکشنری تھا جو لفظ سنتا جیسے ریکارڈ کر لیتا تھا اور پھر ہر اس چیز کا نام دوبارہ دہرا سکتا تھا جو وہ ایک بار سن چکا ہوتا تھا۔

چنی کے بارے میں حمین کا یہ مشاہدہ اس وقت امامہ کو احمقانہ لگا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ بچی نئے ماحول میں آنے کی وجہ سے ابھی ایڈجسٹ نہیں ہوئی اس لیے بول نہیں پا رہی۔ بظاہر وہ وہاں بے حد پر سکون اور مطمئن نظر آئی۔ اس کی تاریخ پیدائش جان لینے کے بعد یہ ماننا مشکل تھا کہ ڈیڑھ سال کی چنی نے کوئی لفظ ہی نہ بولا ہو۔ امامہ بچوں کا سات آٹھ ماہ کی عمر میں ٹوٹے پھوٹے لفظوں کو ادا کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ دیکھ چکی تھی۔ لیکن اسے واقعی یہ اندازہ نہیں تھا جب آپ کسی کی توپیں اور ان چاہی اولاد ہوں اور آپ کے گھر بھوک اور بیماری سے کر ہر وہ مسئلہ موجود ہو جو دشمن پر کسی انسان کی زندگی جہنم بنا سکتا ہو۔ اور پھر آپ رشتہ داروں پر انحصار کرتے ہوں جہاں آپ کی زندگی کا واحد معروف ماہانہ آنے والی رقم ہو اور اس کے علاوہ کسی کو آپ سے کوئی توقع ہو نہ آپ کی ضرورت تو دیکھنا اور بول پانا بہت بڑی "جدوجہد" بن جاتا ہے اور یہ جدوجہد انسان بچپن سے خود نہیں کر سکتا۔ چنی کی سب سے بڑی (کامیابی) یہ تھی کہ اس نے کسی کی طرف سے انگلی پکڑ کر چلانے کی کوشش نہ کرنے کے باوجود اپنے نحیف و نزار وجود کو اپنے قدموں پر کھڑا کرنا سیکھ لیا تھا۔ بول پانا ایک دوسری جدوجہد تھی جو اسے اس گھر میں کرنی تھی۔ وہ گونگی نہیں تھی لیکن اس گھر میں آنے سے پہلے اس نے کوئی لفظ بول اور ادا نہیں کیا تھا۔ ساڑھے تین سال کا بچہ اپنے ایک ساتھی بچے کو کسی بڑے کی نسبت زیادہ آسانی سے بوجھ رہا تھا۔



چنی کے نصیب میں کسی ادارے میں پرورش پانا نہیں لکھا تھا اس کے نصیب میں سالار سکندر کے گھر میں ہی پلنا بڑھنا لکھا تھا۔ جب تک سالار قانونی معاملات کو نپٹا کر چنی کے لیے ایک ادارے کا انتخاب کرتا چنی کو شدید نمونیہ ہو گیا تھا۔ دو دن کے بعد ان لوگوں کو واپس امریکہ جانا تھا۔ ان کی تین ہفتے کی چھٹی ختم ہو رہی تھی۔ فوری طور پر چاہنے کے باوجود وہ چنی کو کسی ہاسپٹل یا فوسٹر ہوم میں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکے۔ ایک عجیب خدشہ ان دونوں کو لاحق ہوا تھا۔ اگر اس بچی کی اچھی نگہداشت نہ ہوتی اور وہ ان کے اس طرح چھوڑ جانے پر خدانخواستہ مر جاتی تو وہ خود کو کبھی معاف نہ کر پاتے۔ سالار اور امامہ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ امامہ بچوں کے ساتھ تب تک وہیں رہے گی جب تک چنی کی حالت سنبھل نہیں جاتی، سالار واپس چلا گیا تھا۔

امامہ دو ہفتے اور پاکستان رکی رہی۔ چنی کی حالت سنبھل گئی تھی مگر اب وہ بچوں کے ساتھ اور خاص طور پر حمین کے ساتھ اس طرح الجھ ہو گئی تھی کہ وہ ان سے الگ ہونے پر تیار ہی نہیں تھی۔ سالار ان لوگوں کو پاکستان سے واپس لے جانے کے لیے آیا اور حمین کو بتائے بغیر وہ دوبارہ چنی کو ایک ادارے میں چھوڑنے گیا۔ وہ دونوں بار اس سے لپٹ کر چیخیں مار کر رونے لگی۔ وہ اس کے علاوہ کسی اور کی گود میں بھی جانے کو تیار نہیں تھی۔ وہ زبردستی

اسے تھما کر باہر نکلتا اور اس کی چیخوں کی آواز سن کر کسی عجیب کیفیت میں واپس چلا آتا۔ وہ اس کی گود میں آتے ہی یوں چپ ہو جاتی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے وہ واقعی اپنے باپ کی گود میں ہو۔

وہ جبریل کو قرآن پاک خود حفظ کروا رہا تھا اور پاکستان سے چلے جانے کے بعد دو ہفتوں تک وہ روز اسکائپ پر جبریل کو پڑھاتا۔ پھر بچوں اور امامہ سے بات کرتا تو چنی بھی اسی ماحول کا حصہ ہوتی۔ وہ سالار کو اسکرین پر نمودار ہوتے دیکھ کر اسی طرح خوشی سے چیخیں مارتی۔ اوں آں کرتی۔ اور اس نے اپنی زندگی کا پہلا لفظ بھی سالار کے پاکستان آنے پر اسے دیکھ کر باقی بچوں کے ساتھ اس کی طرف بھاگتے ہوئے ادا کیا تھا۔ "با۔ با" وہ سالار کی طرف بھاگتے ہوئے بولتی جا رہی تھی اور اس بات کو سب سے پہلے حمین نے نوٹس کیا تھا۔

"Oh my God! she can talk"

(او خدا! یہ بول سکتی ہے)

سالار کی طرف بھاگتے ہوئے اس کے پیروں کو جیسے بریک لگ گئے۔ وہ اپنی سیاہ آنکھیں گول کیے چنی کو دیکھ رہا تھا جو اب سالار کی ٹانگوں سے لپٹی ہوئی تھی۔ سالار عنایہ کو اٹھائے ہوئے تھا اور وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹی۔ با۔ با۔ با۔ بولتی جا رہی تھی۔ منہ اوپر کیے ہوئے۔ چمکتی آنکھوں کے ساتھ۔ ان بچے کے مندمل ہوتے ہوئے نشانات والا چہرہ اور سر پر نکلتے ہوئے سیاہ بالوں کی ہلکی سی تہہ۔ اور صحت مند چہرہ۔ یہ وہ بچی نہیں تھی جسے ایک مہینے پہلے وہ مرغیوں کی گندگی کھاتے اٹھا کر لایا تھا۔

اس کے ٹراوزر کے کپڑے کو اپنی مٹھیوں میں بھینچے وہ اب مٹھیاں کھول کر بازو ہوا میں لہرا رہی تھی۔ سالار سکندر کی طرف۔ اس طرح کہ وہ اب اسے بھی اٹھائے گا جیسے اس نے عنایہ کو اٹھایا تھا۔ پدرانہ شفقت اگر کوئی چیز تھی تو اس وقت سالار نے چنی کے لیے وہی محسوس کی اور کس رشتے سے۔ یہ اس کی بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات کبھی بھی نہیں آسکتی تھی کہ۔ کچھ رشتے خون کے نہیں ہوتے نصیب کے ہوتے ہیں۔ سالار سکندر اور اس کا خاندان نصیب سے چنی کو ملا تھا۔

سالار نے عنایہ کو نیچے اتارا اور اپنے پیروں سے لپٹی چنی کو اٹھا لیا۔ وہ کھلکھلائی۔ اس نے عنایہ کی طرح باری باری سالار کے گال چومے پھر وہ سالار کی گردن کے گرد ہاتھ لپیٹ کر اس کے ساتھ یوں چپک گئی کہ اب نیچے نہیں اترے گی۔ وہ پہلا لمحہ تھا جب سالار کو اندازہ ہوا چنی سے الگ ہونا وقت طلب کام ہے۔ وہ کیسے ان کے گھر اور زندگیوں کا حصہ بن گئی تھی ان میں سے کسی کو احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ سوائے حمین کے۔ جو دن میں تقریباً "تین سو بار" یہ اعلان کرتا تھا۔

" That she finally has a sister "

(وہ اب اس کی بہن ہے)

چنی کے اسٹیٹس میں یہ تبدیلی جبریل کی کوششوں سے ممکن ہوئی تھی۔ جس نے کئی دن حمین کے ساتھ سر کھپانے پر اسے اس بات پر تیار کر لیا تھا کہ وہ چنی کو ایڈاپٹ کر کے اپنی اولاد بنانے کی بجائے اسے اپنی بہن بنا سکتا تھا۔ "بے بی سسٹر"۔

اور اب حمین کی اس بے بی سسٹر کو کسی دارالامان چھوڑنا سالار کے لیے عجیب جان جوکھوں کا کھیل بن گیا تھا۔ سالار سکندر کوئی بہت زیادہ جذباتی انسان نہیں تھا مگر اس ڈیڑھ سال کی بچی نے اسے عجیب دوراہے پر لا کھڑا کر دیا تھا۔

وہ واپس جانے سے پہلے امامہ کے ساتھ بیٹھ کر چنی کے لیے ہر امکان کو زیر غور لاتا رہا تھا اور ہر امکان کو رد کرتا رہا یہاں تک کہ امامہ نے کہہ ہی دیا۔

"تم اسے ایڈاپٹ کرنا چاہتے ہو؟" ان سارے امکانات میں بس یہ ایک امکان تھا جس پر سالار بات نہیں کر سکا تھا اور اب اس امکان کے امامہ کی زبان پر آنے پر وہ خاموش نہیں رہ سکا۔

"ہاں... لیکن یہ کام تمہاری مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ایڈاپٹ جو بھی کرے... پالنا تو تمہیں ہے۔ تم پال سکتی ہو؟" سالار نے اس سے پوچھا۔

"پہلے کون پال رہا ہے؟" امامہ نے عجیب جواب دے کر جیسے سالار کو اس مشکل سے نکال لیا۔

"اگر اس کے نصیب میں زندگی تھی تو اس کی زندگی رہی۔ اس کے نصیب میں ہمارے گھر میں ہی پرورش پانا لکھا ہے تو ہم کیسے روک سکتے ہیں۔ شاید اس میں اس کی اور ہماری کوئی بہتری لکھی ہوگی۔"

امامہ نے سالار سے کہا تھا لیکن جو اس نے سالار سے نہیں کہا تھا' وہ یہ تھا کہ وہ سالار کے لاشعور میں موجود اس احساس جرم کو ختم کرنا چاہتی تھی جو چنی کی فیملی کے ساتھ ہونے والے حادثے سے پیدا ہوا تھا۔ اگر اس بچی کی اچھی تعلیم و تربیت کوئی کفارہ ہو سکتا تھا تو امامہ ہاشم اپنے شوہر کے لیے یہ کفارہ ادا کرنے کو تیار تھی۔

چنی کو ایڈاپٹ کرتے ہوئے سالار سکندر نے اس کو اپنی ولدیت بھی دی تھی۔ اس بچی کو ایڈاپٹ کرتے ہوئے سالار سکندر کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ بچی کفارہ نہیں تھی۔

رئیسہ سالار اپنے نصیب میں اور اپنے سے منسلک ہر شخص کے نصیب میں خوش نصیبی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی... وہ ہما تھی۔ خوش نصیبی کا وہ پرندہ جو جس کے بھی سر پر بیٹھتا اسے بادشاہ بنا دیتا اور اسے ایک بادشاہ ہی کی ملکہ بننا تھا۔



کانگو کا آخری سال سالار سکندر کے لیے کئی حوالوں سے بے حد ہنگامہ خیز رہا تھا۔ وہ ورلڈ بینک کے ساتھ اپنے آخری سال میں اپنے سارے معاملات کو وائنڈ اپ کر رہا تھا اور اس کی زندگی کے آدھے دن' رات جہاز پر سفر کے دوران گزر رہے تھے اور ان ہی روز و شب میں اس کی ملازمت کا دورانیہ ختم ہونے سے چند ہفتے پہلے اسے واشنگٹن بلایا گیا تھا۔ اور امریکی حکومت نے اسے ورلڈ بینک کے صدر کے عہدے کی پیشکش کی تھی... وہ آفر جو پچھلے ایک ڈیڑھ سال سے اسے بالواسطہ کی جاتی رہی تھی اور وہ اسے ایک سبز باغ سمجھ کر نظر انداز کر رہا تھا' وہ ایک ٹھوس حقیقت بن کر اس کے سامنے آگئی تھی... انکار اتنا آسان نہیں تھا جتنا سالار سمجھتا تھا۔ یہ بہت بڑی ترغیب تھی کہ اس آفر پر غور کرتا... وہ جس پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا اسے مکمل کرنے میں کچھ وقت باقی تھا۔

ورلڈ بینک کا پہلا کم عمر ترین مسلمان صدر... 42 سال کی عمر میں اس عہدے پر کام کرنے کے لیے کوئی بھی کچھ بھی کرنے کو تیار ہو سکتا تھا... وہ تاریخ کا حصہ بن سکتا تھا۔ بے حد آسانی سے صرف ایک عہدے کو قبول کر لینے سے... سالار سکندر نے زندگی کے اس مرحلے پر ایک بار پھر یہ اعتراف کیا تھا کہ ترغیبات سے بچنا اتنا آسان کام نہیں تھا جتنا وہ اسے سمجھنے لگ گیا تھا۔

اس نے امریکہ میں ہونے والی میٹنگ اور اس آفر کے بارے میں سب سے پہلے کانگو واپس آنے پر امامہ کو بتایا تھا۔ اس کے لہجے میں ضرور کچھ ایسا تھا جس سے امامہ کھٹکی تھی۔

"تو؟" اس نے سالار سے پوچھا۔

"تو کیا؟" سالار نے اسی انداز میں کہا۔ ان دونوں نے ابھی کچھ دیر پہلے کھانا کھایا تھا اور وہ ڈنر ٹیبل پر ہی تھے۔ سالار رات گئے واپس پہنچا تھا اور ہمیشہ کی طرح نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

"تم نے کیا کہا؟" امامہ نے اس سے پوچھا۔

میں نے سوچنے کے لیے ٹائم لیا ہے۔" اس نے ڈیزرٹ کے پیالے سے ایک چمچ لیا۔ امامہ اس کے جواب سے جیسے بے حد ناخوش ہوئی۔

"سوچنے کے لیے ٹائم؟ تم انکار کر کے نہیں آئے؟" اس نے جیسے سالار کو یاد دلایا تھا۔

"انکار کیا تھا۔ قبول نہیں ہوا۔ مجھے سوچنے کے لیے کہا گیا ہے۔"

سالار نے سوئٹ ڈش کا ایک اور چمچ لیا پھر پیالہ دور کھسکا دیا۔

"تم کیا سوچ رہے ہو سالار؟" امامہ نے میٹھا نہیں کھایا تھا اس کا پیالہ ویسے ہی پڑا رہا تھا۔ سالار اسے دیکھنے لگا۔ دونوں بے حد خاموشی سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے۔ پھر امامہ کی ناخوشی اور خفگی جیسے کچھ اور بڑھی تھی۔ اس نے سالار کے چہرے پر جیسے کچھ پڑھا تھا جو اسے پسند نہیں آیا تھا۔

"تم یہ آفر قبول کرنا چاہتے ہو؟" اس نے سالار سے ڈائریکٹ سوال کیا۔

"تم کیا چاہتی ہو؟" سالار نے جواباً پوچھا۔

"نہیں۔" اتنا حتمی اور دو ٹوک جواب آیا تھا کہ سالار بول ہی نہیں سکا۔ اسے شاید پھر ویسے ہی جواب اور رد عمل کی توقع تھی جو اس نے نائب صدارت آفر ہونے پر اس کے سوال پر دیا تھا۔

"تمہیں یاد نہیں تم کس مقصد کے لیے کام کر رہے ہو اور کیا کرنا چاہتے ہو؟" امامہ نے جیسے اسے یاد دلایا۔

"بالکل یاد ہے۔"

"پھر الجھن کس بات کی ہے؟" امامہ نے پوچھا۔

الجھن نہیں ہے۔ صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ ابھی تھوڑا وقت چاہیے مجھے اپنے پروجیکٹ کو عملی شکل میں دنیا کے سامنے لانے کے لیے۔ ورلڈ بینک کے صدر کے طور پر کام کر لوں گا تو اس پروجیکٹ میں مجھے بہت مدد ملے گی۔ میری اور اس پروجیکٹ کی repute بہت بڑھ جائے گی۔ ڈھیروں کمپنیز اور انویسٹرز ہماری طرف آئیں گے۔ بہت سی جگہوں پر مجھے تعارف کروانا ہی نہیں پڑے گا۔"

امامہ نے اسے ٹوکا "بس صرف یہ وجہ ہے؟" وہ اسے دیکھنے لگا وہ پھر حتمی انداز میں اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ دنیا میں ان چند انسانوں میں سے تھی جن کے سامنے وہ جھوٹ بول نہیں پاتا۔ کوشش کرنے کے باوجود۔ کیونکہ وہ اس کا جھوٹ پکڑ لیتی تھی۔ پتا نہیں یہ بیویوں کی خصوصیت تھی یا صرف امامہ ہاشم کی۔

"ورلڈ بینک کے صدر کے طور پر ایک مسلمان کی تعیناتی ایک اعزاز بھی تو ہے۔" سالار نے اس بار بے حد مدھم آواز میں وہ ترغیب بھی سامنے رکھی۔

"ورلڈ بینک کیا ہے سالار۔ جن ہے۔ ہوا ہے۔ کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ سود کا کام کرنے والی قوموں کا ایک اجتماع اور کیا ہے۔ کیا اعزاز والی بات ہے اس میں کہ سود کا کام کرنے والی ان قوموں کی سربراہی ایک مسلمان کے پاس ہے۔ یہ اعزاز نہیں شرم سے ڈوب مرنے والی بات ہے کسی مسلمان کے لیے۔"

امامہ نے جیسے اسے آئینہ نہیں جوتا دکھا دیا تھا۔ وہ خفا تھی ناخوش تھی اور بڑے آرام سے یہ دیکھ رہی تھی کہ یہ "ترغیب" تھی جو اس کے شوہر کے قدموں کی زنجیر بن رہی تھی۔

"جس پروجیکٹ پر تم کام کر رہے ہو اس میں کامیابی تمہیں اللہ تعالیٰ نے دینی ہے۔ تمہارے علم، تمہارے تجربے، تمہاری قابلیت اور ورلڈ بینک کے ساتھ منسلک رہنے والی شناخت نے نہیں۔ تم اب 40's میں آچکے ہو۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ پانچ سال ورلڈ بینک کا صدر رہنے کے بعد تم 47 سال کے ہو چکے ہو گے۔ پھر اس کے بعد تم ایک اسلامی مالیاتی نظام پر کام کرنا شروع کرو گے؟ جب تم اپنی ساری جوانی ورلڈ بینک کو دے چکے ہو گے۔ تم یقیناً "مذاق" کر رہے ہو پھر۔ اپنے ساتھ۔ اور ان لوگوں کے ساتھ جنہیں تم ایک

ممکنہ انقلاب کا حصہ بنائے بیٹھے ہو۔"
وہ کہتے ہوئے ٹیبل سے اٹھ گئی اور برتن سمیٹنے لگی۔
"تمہیں پتا ہے امامہ! میری زندگی کا سب سے بہترین asset (اثاثہ) کیا ہے؟" سالار سکندر نے یک دم اس سے کہا۔ امامہ اسی طرح اپنے کام میں مصروف رہی۔ اس نے سالار سکندر کے کسی ممکنہ انکشاف میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ وہ اس وقت اتنی ہی بددل تھی۔
"تمہاری یہ ظالمانہ صاف گوئی۔ جو مجھے میری اوقات میں لے آتی ہے۔ تم مجھ سے امپریس کیوں نہیں ہو جاتیں۔"
سالار کے انداز میں اعتراف بے بسی۔ خراج تحسین، شرمندگی اور معصومیت بیک وقت تھا۔ امامہ اس بار رک کر اسے دیکھنے لگی۔
"میں الجھا تھا۔ tempt ہوا تھا۔ لیکن گمراہ نہیں۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو، وقت گزرتا جا رہا ہے۔ چیزیں سوچ سمجھ کر صبر سے کرنی چاہئیں لیکن تاخیر سے نہیں۔"
وہ اب اپنا اعتراف بیان ہوئے رہا تھا۔ امامہ کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔
"مجھے تم سے متاثر ہونے، تمہارے گن گانے کے لیے بنایا ہی نہیں گیا سالار۔ اس کے لیے دنیا ہے۔ مجھے تمہیں چیلنج کرکے تمہیں آگے بڑھانے کے لیے تمہارا ساتھی بنایا گیا ہے۔ یہ کام کوئی اور نہیں کر سکتا۔" وہ اب مسکراتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی۔
"مجھے پتا ہے اور میں اس کی قدر بھی کرتا ہوں۔" وہ پھر اعتراف کر رہا تھا۔ وہ فیصلہ جو اس کے لیے مشکل بن رہا تھا وہ اس کی بیوی نے بے حد آسان کر دیا تھا۔ وہ آسانی چاہتا تھا۔ وہ مشکل کی طلب گار تھی۔ کیونکہ ہر مشکل میں آسانی تھی۔



وہ آفر میڈیا کے ذریعے سے منظر عام پر آگئی تھی اور ورلڈ بینک کے اگلے ممکنہ صدر کے طور پر سالار سکندر کا نام بہت سی جگہوں پر اچھالا جانے لگا تھا۔ اس کے خاندان اور حلقہ احباب کے لیے یہ بے حد فخر کا باعث بننے والی خبر تھی اور سالار سکندر کے انکار کرنے کے باوجود کہ اس نے یہ عہدہ فی الحال قبول نہیں کیا، کوئی بھی یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ وہ اس آفر کو قبول کرنے سے انکار کر سکتا تھا یا اسے انکار کرنا چاہیے۔
سکندر عثمان خاص طور پر اس کے اس فیصلے سے بالکل بھی خوش نہیں ہوئے تھے کہ وہ اس آفر کو قبول کرنے کے بجائے کہ اپنے کیریئر کی اس اسٹیج پر ورلڈ بینک سے علیحدگی اختیار کر کے کچھ اور کرے گا۔ انہوں نے سالار سکندر سے اور کی تفصیلات جاننے میں بھی ذرہ برابر دلچسپی نہیں لی تھی۔ ان کا فوکس صرف اس بات پر تھا کہ وہ ورلڈ بینک کا صدر کیوں نہیں بننا چاہتا تھا۔ ایک عام باپ کی طرح وہ بھی اپنی اولاد کے لیے دنیاوی کامیابی چاہتے تھے۔ اور وہ دنیاوی کامیابی سامنے موجود تھی۔ بس ہاتھ بڑھا کر تھام لینے تک دور۔
"تم عقل سے پیدل ہو اور ہمیشہ پیدل ہی رہو گے۔"
انہوں نے سالار کے ساتھ اپنی شدید خفگی کا اظہار میڈیا میں اس کے آفس کی طرف سے آنے والی اس خبر کے بعد کرتے ہوئے کہا تھا۔ جس میں اس کے آفس نے یہ بیان ریلیز کر دیا تھا کہ وہ ورلڈ بینک کی صدارت کا عہدہ سنبھالنے میں اپنی ذاتی وجوہات کی بنا پر انٹرسٹڈ نہیں اور صرف نائب صدر کے طور پر افریقہ میں اپنی ٹرم کو مکمل کرنا چاہتا ہے۔

سالار چند دن کے لیے پاکستان آیا ہوا تھا اور سکندر عثمان نے ضروری سمجھا تھا کہ وہ ایک بار اسے سمجھانے کی کوشش ضرور کرتے اور اس کوشش کے دوران سالار کی بتائی ہوئی وجہ پر وہ تیخ پا ہو گئے تھے۔ ان کی وہ اولاد ساری عمر عجیب و غریب باتیں اور کارنامے کرنے کے لیے ہی پیدا ہوئی تھی۔

"تم ورلڈ بینک کا صدر نہیں بننا چاہتے... وہ عہدہ جو پلیٹ میں رکھ کر تمہیں پیش کیا جا رہا ہے۔" وہ استہزائیہ انداز میں اس سے کہہ رہے تھے جو ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا بے حد خاموشی سے باپ کی لعنت ملامت سن رہا تھا۔

"تم سود سے پاک ایک اسلامی مالیاتی نظام بنانے کا خیالی پلاؤ پکاتے اور کھاتے رہنا چاہتے ہو۔" وہ اتنا تلخ ہونا نہیں چاہ رہے تھے جتنا تلخ ہو گئے تھے۔ "تمہاری طرح ڈھیروں لوگ یہ خیالی پلاؤ بنا رہے ہیں ساری دنیا میں اور بناتے ہی چلے جا رہے ہیں... نہ پہلے کوئی کچھ کر سکا تھا... نہ ہی آئندہ کچھ ہونے والا ہے۔" وہ سالار سکندر کو جیسے آئینے میں وہ عکس دکھانے کی کوشش کر رہے تھے جو ان کے خیال میں اسے کوئی دکھا نہیں پا رہا تھا۔

"اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے اس ذہنی فتور کے پیچھے امامہ کا ہاتھ ہو گا... اس سے مشورہ تو کیا ہو گا نا تم نے۔"

وہ بیٹے کی رگ رگ کو جانتے تھے اور اس وقت انہیں سالار کے ساتھ ساتھ امامہ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔

"ہر نسل اسے خیالی پلاؤ سمجھے گی تو پھر یہ صدیوں تک خیالی پلاؤ ہی رہے گا... کسی ایک نسل سے کسی ایک فرد کو اٹھ کر اس کے لیے کچھ کرنا ہو گا... صرف حرام حرام کہہ کر تو ہم اس سودی نظام کے اندر نہیں رہ سکتے۔" سالار سکندر کو اپنے باپ کی باتیں کڑوا ہٹ لگی تھیں لیکن وہ انہیں نگلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"تم جانتے ہو سالار! یہ جو موجودہ نظام ہے۔ اسے ہٹانا کیوں مشکل ہے؟" سکندر عثمان نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "کیونکہ یہ افراد کا بنایا ہوا نظام نہیں ہے... ریاستوں کا بنایا ہوا نظام ہے... فلاحی ریاستوں کا۔ وہ بے شک اسلامی نہ ہوں لیکن وہ اپنے اندر اس نظام کو چلا کر کم از کم اپنے معاشرے میں لوگوں کو ایک فلاحی سسٹم دیے ہوئے ہیں... تم افراد کو چیلنج کر سکتے ہو ہم ریاستوں کو چیلنج نہیں کر سکتے۔ جب تک مسلم ممالک خود ایک مضبوط اقتصادی نظام بنانے کی کوشش نہیں کرتے، جب تک اسلامی فلاحی ریاستوں کی شکل میں سامنے نہیں آتے کچھ نہیں بدلے گا... کبھی بھی... دنیا ایسی ہی رہے گی جیسی ہے۔

اقتصادی نظام کیا، ہر نظام صرف طاقت ور کا چلے گا... کمزور کی "عقل" میں کسی کو دلچسپی نہیں ہوتی... سکہ طاقتور کا چلتا ہے... یہ سود کی جنگ نہیں ہے، یہ قوموں کی جنگ ہے... ہم مسلمان ہیں... نکمے اور نااہل ہیں۔ قوم کے لیے نہیں اپنے لیے جیتے ہیں۔

اس وقت اس لیے مار کھا رہے ہیں اور کھاتے رہیں گے جب تک ایسے ہی رہیں گے... وہ یہود و نصاریٰ ہیں۔ یہ ان کے عروج کی صدی ہے، وہ باعلم اور باعمل ہیں۔ اپنی زندگیاں اپنی قوموں کے لیے قربان کرنے کا عزم اور حوصلہ رکھتے ہیں، اس لیے وہ راج کر رہے ہیں اور راج کرتے رہیں گے جب تک ان کے اندر یہ جذبہ موجود ہے... ہم بددعائیں دے دے کر کسی قوم کو زوال نہیں دلا سکتے... ہم دہشت گرد بن کر بھی کسی قوم کے کچھ لوگ مار سکتے ہیں، کچھ عمارتیں تباہ کر سکتے ہیں... خوف پھیلا سکتے ہیں... لیکن دنیا پر اپنی حاکمیت قائم کرنے کے لیے ہمیں مغربی اقوام سے بڑھ کر باعمل ہونا پڑے گا... اور یہ مقابلہ بہت مشکل ہے اور یہ مقابلہ افراد نہیں کرتے اقوام کرتی ہیں متحد ہو کر۔"

سکندر عثمان نے جو بھی کہا تھا ٹھیک کہا تھا۔ سالار سکندر بھی کچھ سال پہلے تک ایسے ہی سوچتا تھا اور اس کی سوچ آج بھی وہی ہوتی تو وہ باپ کی ہاں میں ہاں ملاتا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔ جب تک کسی قوم کے افراد صرف اپنے لیے جئیں اور مریں گے تب تک کچھ نہیں بدلے گا۔ جب لوگ قوم کے لیے سوچنا شروع کردیں گے سب کچھ بدل جائے گا۔"

اس نے سکندر عثمان سے کہا۔

"جن معاشروں اور اقوام کی مثالیں آپ دے رہے ہیں ان کے ڈھیروں افراد نے اپنی زندگیاں لیبارٹریز' لائبریریز اور اپنے اسٹڈی ٹیبلز پر صرف اس خواب اور عزم کے ساتھ گزاری تھیں کہ جو کام وہ فرد کے طور پر کر رہے ہیں' وہ ان کی قوم کے لیے بہتر ثابت ہو۔ ان میں سے کوئی بھی پرسنل گلوری کے لیے زندگی قربان نہیں کر رہا تھا' نہ وہ بانی اور موجد کے طور پر کوئی پہچان بنا کر تاریخ کا حصہ بننا چاہتے تھے۔ وہ بس اسٹیٹس کو توڑنا چاہتے تھے۔ اپنی قوم کے "کل" کو اپنے آج سے بہتر چاہتے تھے۔ اور یہی خواہش میری بھی ہے۔ ایک کوشش اپنی قوم کے لیے مجھے بھی کر لینے دیں۔۔۔ مقالے اور کتابیں لکھ لکھ کر اپنا بڑھاپا میں نہیں گزارنا چاہتا پاپا۔"

سکندر عثمان بہت دیر تک بول ہی نہیں سکے تھے۔ اس نے ان ہی کی باتوں کا حوالہ دے کر ان سے بحث کی تھی اور ہمیشہ کی طرح وہ بحث جیت لیا تھا۔

"ورلڈ بینک کے کتنے صدر گزرے ہیں مجھ سے پہلے۔۔۔ کسی کو نام بھی یاد نہیں ہو گا۔ انہوں نے ورلڈ بینک کے طور پر کیا کارنامے کیے ہوں گے' یہ بھی کسی کو یاد نہیں۔ یاد اگر کسی کو ہے تو ورلڈ بینک کا نام یاد ہے۔۔۔ کسی ہرکارے اور پرزے کا نام کسی کو یاد نہیں رہے گا۔ میں ایسے کسی ہرکارے اور پرزے کے طور پر تاریخ کا حصہ بننا نہیں چاہتا۔ ایک کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ شاید اس میں کامیاب ہو جاؤں اور ناکام بھی رہا تو بھی کوئی احساس جرم تو نہیں ہو گا۔۔۔ یہ احساس تو نہیں رہے گا کہ میں سود کھانے اور کھلانے والوں کے ساتھ زندگی گزار کر مرا۔"

سکندر عثمان سالار سکندر کی دلیلوں کا جواب کبھی بھی نہیں دے سکے تھے۔ تب بھی نہیں جب وہ ایک ٹین ایجر تھا۔ اور اب بھی نہیں۔ اب اس کے پاس جو دلیل تھی' وہ بے حد وزنی ہو گئی تھی۔

"ٹھیک ہے تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کرو۔"

انہوں نے بے حد مایوسی سے کہا۔ "تم نے پہلے بھی میری بات نہیں مانی تو اب کیسے مانو گے۔۔۔ مجھے بس افسوس یہ رہے گا کہ تم بہت زیادہ کامیاب ہو سکتے تھے' اس سے کئی گنا زیادہ ترقی حاصل کر سکتے تھے لیکن تمہارے ذہنی فتور نے ہمیشہ تمہاری ٹانگ کھینچی اور یہ صرف تمہارا مسئلہ نہیں' ضرورت سے زیادہ ذہین ہر مسلمان کا مسئلہ ہے۔۔۔ تم لوگ ہمیشہ دو انتہاؤں کے درمیان جھولتے رہتے ہو۔ نہ خود چین سے رہتے ہو نہ اپنے سے وابستہ لوگوں کو رہنے دیتے ہو۔"

وہ طنز کرنے کے بعد اب ایک روایتی باپ کی طرح اسے مطعون کر رہے تھے۔ سالار مسکرا دیا۔ وہ باپ کی مایوسی کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ ان کا خواب توڑ رہا تھا۔

"مجھے یقین ہے پاپا! میں جو بھی کرنے جا رہا ہوں وہ صحیح ہو گا۔ اس لیے آپ پریشان نہ ہوں۔" اس نے سکندر کو تسلی دی۔

"اور یہ یقین تمہیں کیوں ہے؟" سکندر اس کی تسلی کے باوجود طنز کیے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

"کیوں کہ آپ نے زندگی میں جب جب مجھے' جس بھی فیصلے سے روکا ہے' وہ میرے لیے بہت اچھا ثابت ہوا ہے۔۔۔ آپ کی ممانعت گڈ لک چارم ہے میرے لیے۔"

سکندر عثمان ٹھیک کہتے تھے' وہ واقعی ڈھیٹ تھا مگر اس نے سینس آف ہیومر اپنے باپ سے ہی لیا تھا۔ جن کا پارہ لمحہ میں چڑھا اور اترا اور وہ ہنس پڑے۔

"کمینے!"

"شکریہ۔" سالار نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔



"اور یہ فلو کب سے چل رہا ہے تمہارا؟" فرقان نے سالار سے پوچھا تھا۔ وہ تقریباً آٹھ مہینے کے بعد مل رہے تھے اور سالار ڈاکٹر سبط علی سے ملاقات کے بعد فرقان کی طرف آیا تھا۔ دو دن بعد اس کی واپسی کی فلائٹ تھی اور فرقان نے بالکل ڈاکٹروں والے انداز میں اس کے فلو کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا تھا۔

"یہ تو اب ایک ڈیڑھ ماہ سے کچھ مستقل ہی ہو گیا ہے' آتا جاتا رہتا ہے۔ سر درد کے ساتھ شاید کسی چیز سے الرجی ہے۔" سالار نے لاپروائی سے کہا۔

"تم کوئی میڈیسن لے رہے ہو؟" فرقان نے پوچھا۔

"ہاں وہی اینٹی بایوٹک لیکن کبھی اثر ہو جاتا ہے' کبھی نہیں۔" سالار نے جتایا۔

"تم بلڈ ٹیسٹ وغیرہ کرواؤ کہیں کوئی اور مسئلہ نہ ہو۔" فرقان اس وقت مر کے بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ مسئلہ اتنا بڑا ہو سکتا تھا۔ وہ کسی معمولی بیماری کو دریافت کرنا چاہتا تھا اور یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اگلے دو دن لاہور میں اس کے کہنے پر سالار کے کروائے جانے والے ٹیسٹس نے فرقان کے پیروں کے نیچے سے زمین نکال دی تھی اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ یہ رپورٹس سالار کی ہو سکتی ہیں۔

"کیوں مزید ٹیسٹس کیوں؟ کوئی ایسا سیریس مسئلہ تو نہیں ہے مجھے۔ فلو ہے' پہلے بھی ہوتا رہا ہے ٹھیک ہو جائے گا۔" دوسرے دن مزید ٹیسٹ کا کہنے پر سالار نے ایک بار پھر لاپروائی سے اس کی بات ہوا میں اڑانے کی کوشش کی تھی۔ اسے لاہور میں اس دن کاموں کا ایک ڈھیر نپٹانا تھا اور اس ڈھیر میں کسی ہاسپٹل میں جا کر کچھ مزید ٹیسٹ کروانا اس کے لیے بے حد مشکل کام تھا۔ فرقان خود میں اتنی ہمت پیدا نہیں کر سکا کہ وہ اسے بتا پاتا کہ اس کے ابتدائی ٹیسٹ کس چیز کی جانب اشارہ کر رہے تھے۔

"یہ ضروری ہے سالار! کام ہوتے رہیں گے' کام ہو جاتے ہیں لیکن صحت پر کمپرومائز نہیں کیا جا سکتا۔" فرقان نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

"صحت بالکل ٹھیک ہے یار! صحت کو کیا ہوا ہے۔ ایک معمولی فلو ہونے پر تم نے ڈاکٹروں کی طرح مجھے بھی ہاسپٹلوں کے چکروں پر لگا دیا۔" سالار نے اسی انداز میں کہا تھا۔

"اور ویسے بھی اگلے مہینے مجھے امریکہ جانا ہے' وہاں میڈیکل چیک اپ کرواتا ہے مجھے۔ اپنا۔ تم فکر نہ کرو سب ٹھیک ہے۔"

وہ اب اسے ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا اور فون پر اسے کہہ رہا تھا کہ اسے کسی سے ملنا تھا اگلے پندرہ منٹ تک۔

"سب ٹھیک نہیں ہے سالار!" فرقان کو بالآخر اسے تو بتانا پڑا۔

"کیا مطلب؟" سالار اس کی بات پر ٹھٹکا۔

"میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں آدھے گھنٹے میں۔" فرقان نے فون پر مزید کچھ کہے بغیر فون رکھ دیا تھا۔

سالار اس کے انداز پر الجھا تھا لیکن اس نے اسے صرف ایک ڈاکٹر کا پروفیشنلزم سمجھا تھا جو اسے اپنی صحت کے حوالے سے فکرمند دیکھ کر اپنی ذمہ داری کا ثبوت دے رہا تھا۔

"تم فوری طور پر کہیں نہیں جا رہے۔ مجھے اس ہفتے میں تمہارے تمام ٹیسٹس کروانے ہیں اور اس کے بعد ہی تم کہیں جا سکتے ہو۔"

فرقان واقعی نہ صرف آدھے گھنٹے میں اس کے پاس پہنچ گیا تھا بلکہ اس نے سالار کو اپنی سیٹ کینسل کروا

کے لیے بھی کہہ دیا تھا۔

"کیا مسئلہ ہے فرقان! تم مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتے..... ؟ کیا چھپا رہے ہو تم؟ کیوں ضرورت ہے مجھے اتنے لمبے چوڑے ٹیسٹس کی؟"

سالار اب پہلی بار واقعی کھٹکا تھا فرقان کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ اسے کچھ بتائے بغیر ٹیسٹ پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا۔

"میں صرف یہ کنفرم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کوئی ٹیومر نہیں ہے۔"

وہ دنیا کا مشکل ترین جملہ تھا جسے ادا کرنے کے لیے فرقان نے وہ سارے لفظ اکٹھے کیے تھے یوں جیسے سالار سے زیادہ وہ اپنے آپ کو یہ تسلی دینا چاہتا تھا کہ جو وہ رپورٹس اور اس کا طبی علم اسے بتا رہا تھا وہ غلط ثابت ہو جائے۔ وہ ہر قیمت پر غلط ثابت ہو جائے۔

"ٹیومر؟" سالار نے بے یقینی سے کہا۔

"برین ٹیومر۔" فرقان نے اگلے دو لفظ جس وقت سے کہے۔ سالار اس وقت سے بھی انہیں بول نہیں سکا اس کے کان جیسے سائیں سائیں کرنے لگے تھے حواس اور دماغ ایک ساتھ ماؤف ہوئے تھے کئی لمحے وہ بے یقینی سے فرقان کو دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

"یہ ٹیسٹس جو تم نے کروائے ہیں یہ انڈیکیٹ کر رہے ہیں کہ....."

وہ خود بھی وہ جملہ پورا نہیں کر پایا۔ زندگی کا خوفناک ترین لمحہ تھا وہ۔ اور خوفناک ہی لگ رہا تھا سالار کو۔ وہ پاکستان کے بہترین اونکالوجسٹ میں سے ایک کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور فرقان کو اگر ایسی کچھ علامات نظر آئی تھیں تو وہ اندازے کی غلطی نہیں ہو سکتی تھی۔



"او مائی گاڈ....." حمین نے امامہ کے ساتھ اسکول کوریڈور میں چلتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں قلقاری مارتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کیا "Mummy! I have made you soo famous"
(ممی میری وجہ سے آپ بہت مشہور ہو گئی ہیں۔)

امامہ پیرنٹ ٹیچر میٹنگ اٹینڈ کرنے اسکول آئی تھی اور حمین کو پڑھانے والا ہر ٹیچر حمین کی ممی سے ملنے کا خواہش مند تھا۔ اور وہاں اسکول میں جس سے بھی امامہ کی ملاقات ہوئی تھی اس نے امامہ کو حمین کی ممی کے طور پر ہی شناخت کیا تھا' حالانکہ اسی اسکول میں جبریل بھی قرآن پاک حفظ کرنا شروع کرنے تک پڑھتا رہا تھا..... عنایہ بھی پڑھ رہی تھی اور رئیسہ نے بھی اسکول کی نرسری میں کچھ عرصہ پہلے جانا شروع کیا تھا لیکن ایسی شہرت امامہ اور سالار کو ان کے بڑے دونوں بچوں نے نہیں دلائی تھی جیسی حمین نے دنوں اور ہفتوں میں دلوا دی تھی۔

وہ ڈھائی سال کی عمر سے اس امریکن اسکول میں جانا شروع ہوا تھا اور اسکول میں اس نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی تھی کیونکہ اس اسکول میں ہر نیشنلٹی کا بچہ آ رہا تھا اور ان میں سے اسی فی صد فارن ڈپلومیٹس اور ملٹی نیشنل کمپنیز میں کام کرنے والے لوگوں کے بچے تھے اور دو سالوں میں اس اسکول میں محمد حمین سکندر کو ہر ایک جانتا اور پہچانتا تھا' جو اس شرف سے محروم تھا اس نے کم از کم حمین کے بارے میں سن ضرور رکھا تھا۔

اور اسکول میں ہونے والی وہ پیرنٹ ٹیچرز میٹنگز جو بھی سالار اور امامہ کے لیے جبریل اور عنایہ کی وجہ سے فخر کا باعث ہوتی تھیں اب ایک کڑوی گولی تھی یا پھر تلوار کی دھار' جس پر چلنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا اور آج بھی ایسا ہی ہوا تھا' ہر ٹیچر کے پاس حمین کا ایک اعمال نامہ تھا جو وہ امامہ کو دکھانا چاہتا تھا۔

"I am so disappointed" (میں بہت مایوس ہوئی ہوں)

امامہ نے اپنے ساتھ چلتی ہوئی رئیسہ کو اپنے دائیں طرف سے بائیں طرف کرتے ہوئے حمین کو سرزنش کی، جو اس بات پر بے حد فخر محسوس کر رہا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کی ممی ہر جگہ جائی جا رہی تھی۔

"I am also disappointed. It's time you change my school"

"That's so right Mummy!

"بالکل ٹھیک ممی! میں بھی بہت مایوس ہوا ہوں اور یہی وقت ہے میرا اسکول تبدیل کر دیا جائے۔" اس نے بڑے اطمینان سے قلابازی کھائی تھی اور پھر سنجیدگی کا چولا اوڑھتے ہوئے ماں کے سامنے ایک ممکنہ حل پیش کیا وہ اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔

"دیکھو رئیسہ کی کسی نے شکایت نہیں کی۔ I am so proud of her (مجھے اس پر فخر ہے)" امامہ نے اسے رئیسہ کی مثال دینی شروع کی۔

"I don't think so."

حمین نے ماں کی بات سے متاثر ہوئے بغیر کہنا شروع کیا۔ "that she can't speak well"

"Every teacher said

(ہر ٹیچر کا کہنا ہے کہ وہ صحیح سے بول نہیں سکتی) اس سے پہلے کہ وہ پھر شروع ہو جاتا۔ امامہ نے اسے روکنا ضروری سمجھا۔

"وہ سیکھ رہی ہے، ابھی بہت چھوٹی ہے۔"

امامہ نے رئیسہ کا دفاع کرنا ضروری سمجھا لیکن جو حمین کہہ رہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ رئیسہ کو بولنے میں پرابلم تھی۔ وہ امامہ کے بچوں کی طرح جلد سیکھنے والی نہیں تھی۔ اسے کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا اور بہت سارے چھوٹی چھوٹی کمیاں تھیں اور اسے ایڈاپٹ کرنے کے کچھ عرصے کے بعد ہی وہ ساری چیزیں پتا چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ رئیسہ کو ایڈاپٹ کرتے ہوئے امامہ نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس بچی کی پرورش سے بڑا چیلنج اسے لکھنا پڑھنا سکھانا تھا۔ اسے یہ مسئلہ اپنے بچوں کے ساتھ نہیں ہوا تھا، وہ پیدائشی ذہین تھے۔ ماں باپ دونوں طرف سے اور ان کے لیے کوئی بھی چیز سیکھنا کیک واک تھی۔ رئیسہ کے ساتھ معاملہ مختلف تھا۔ وہ چیزوں کو مشکل سے پہچان پاتی اور انہیں یاد رکھنے کی دقت کا شکار رہتی۔ یہ اللہ کا شکر تھا کہ وہ autistir نہیں تھی نہ ہی اسے کوئی اور mental disability (ذہنی پسماندگی) تھی۔ مگر وہ امامہ کے لیے ایک صبر آزما کام ضرور تھی اور رئیسہ کا کم ذہین ہونا اس کے بچوں سے بھی چھپا ہوا نہیں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ رئیسہ سے بے حد مانوس ہونے کے باوجود یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ ان تینوں سے different (مختلف) تھی۔ وہ ان کی رفتار اور accuracy (درستی) کے ساتھ انگلش تو کیا اردو پنجابی کوئی بھی زبان نہیں بول پاتی تھی۔ اسے سوچنا پڑتا تھا۔ ہر اگلا لفظ زبان سے ادا کرنے کے لیے۔ وہ ان کے ساتھ ایک سال گزار لینے کے باوجود کچھ بھی سیکھنے کے لیے بہت وقت لیتی تھی۔ اس کو سب کچھ بار بار لکھوانا پڑتا تھا۔ بار بار سنوانا پڑتا تھا۔ بار بار بولنا پڑتا تھا اور یہ بے حد صبر آزما کام تھا۔ بار ہا اسے پڑھانے یا کچھ یاد کروانے کی کوشش کرتے ہوئے امامہ کو خیال آتا کہ اس کی ایڈاپشن کا فیصلہ ایک غلط اور جذباتی فیصلہ تھا۔ لیکن وہ چاہتے تو اب بھی اس فیصلے سے ہٹ سکتے تھے اور پھر اسے اپنی سوچ پر شرمندگی ہوتی کہ وہ بے حد خود غرض بن کر سوچنے لگی تھی اگر وہ بچی واقعی اس کی اپنی اولاد ہوتی تو کیا وہ اس کے بارے میں اس طرح سوچتی۔ وہ احساس ندامت رئیسہ کی طرف اس کی توجہ میں کچھ اور اضافہ کر دیتی اور رئیسہ کا Slow learner (کند ذہن) ہونا سالار سے بھی چھپا ہوا نہیں تھا اسے اس مشقت کا بھی اندازہ تھا جو امامہ کو رئیسہ کو پڑھانے میں پیش

آنے والی تھیں۔ مگر وہ عملی طور پر کچھ کر نہیں سکتا تھا چاہتے ہوئے بھی۔

اس کی اپنی پروفیشنل مصروفیات میں سے اگر وہ کسی ایک چیز کے لیے ہر صورت وقت نکالتا تھا تو وہ جبریل کو قرآن پاک حفظ کروانا تھا جو وہ خود کروا رہا تھا، یہ جیسے قرآن کے ساتھ جڑے رہنے کی اس کی لاشعوری کوشش بھی تھی۔ رئیسہ کے لیے الگ سے وقت نکال کر کچھ کر پانا سالار کے لیے ممکن نہیں تھا اور نہ ہی امامہ نے اسے کبھی یہ جتایا تھا وہ ذمہ داری جو اس کے شوہر نے لی تھی، وہ نبھا رہی تھی اور بڑی تن دہی سے نبھا رہی تھی اور اگر کوئی اس کے اس کام میں اس کے ساتھ بھرپور مدد کر رہے تھے تو وہ اس کے بچے تھے خاص طور پر حمین۔

وہ رئیسہ کو کچھ سکھانے کے لیے ماں جیسی ہی برداشت اور تحمل کا مظاہرہ کرتے تھے، صرف حمین تھا جو جبریل اور عنایہ کے برعکس رئیسہ کو کچھ سکھاتے ہوئے اس کی کند ذہنی کو محسوس کرتا تھا اور جھنجھلا کر یہ بات جتانے سے بھی نہیں چوکتا تھا اور جواباً جبریل یا امامہ ہمیشہ اسے ایک نصیحت آموز لیکچر دیتے تھے جس کا لب لباب یہ ہوتا تھا کہ رئیسہ کی جگہ وہ بھی ہو سکتا تھا تو پھر اسے کیسا لگتا۔

حمین کا ضمیر جیسے ایک بار پھر جاگ جاتا۔

"Ok ! one more try

(ٹھیک ہے ایک اور کوشش)

وہ دوبارہ رئیسہ کو سکھانے بیٹھتا۔ اور رئیسہ کے ساتھ سب سے زیادہ وقت گزارنے کی یہ ایک وجہ بھی بن گیا تھا اور اب ماں کے اس روٹین کے موازنے کو وہ کسی خاطر میں ہی نہیں لا رہا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا وہ موازنہ سرے سے غلط تھا۔

"اس بار تمہارے بابا آئیں گے تو میں انہیں وہ ساری باتیں بتا دوں گی جو تمہاری ٹیچرز نے تمہارے بارے میں کی ہیں۔" امامہ نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے اسے دھمکایا تھا۔

My teachers back bite why do you want to pick a bad habit

(میری ٹیچرز نے چغل خوری کی ہے "آپ ان سے یہ گندی عادت کیوں لینا چاہتی ہیں۔)

اس نے جیسے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"رکو کے دیکھو پھر۔" امامہ نے اسے دھمکایا اور فون پر سالار کو کال ملائی۔ چند مرتبہ بیل جانے کے بعد فون اٹھالیا گیا، لیکن اٹھانے والا فرقان تھا، امامہ حیران ہو گئی۔ سالار لاہور میں تھا اور اس نے کچھ مصروفیات کی وجہ سے اپنی سیٹ آگے کروائی تھی۔ فرقان سے وہ جس دن پہلی بار لاہور آکر ملا تھا۔ اس نے امامہ کو بتایا تھا۔ اس نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ فرقان اس کے بار بار ہونے والے فلو کی وجہ سے اسے بلڈ ٹیسٹ کروانے کا کہہ رہا تھا اور امامہ نے اس سے کہا تھا کہ اسے فرقان کی بات مان لینی چاہیے۔

"پتا نہیں مجھے کہہ رہا تھا میرے چہرے کے ایک حصے پر سوجن نظر آرہی ہے۔ میں نے کہا فلو ہمیشہ ناک کے اسی حصے سے ہوتا رہتا ہے اب بھی ہے شاید اس وجہ سے لیکن ساتھ سی ٹی اسکین کا بھی کہہ رہا ہے۔ کروالوں گا تاکہ اسے تسلی ہو جائے۔ ڈاکٹرز تو ویسے پاگل ہوتے ہیں۔"

اس نے تب امامہ سے کہا تھا، لیکن سالار نے اسے اگلے دن یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ ٹیسٹ کروا آیا تھا، لیکن اس کے بعد امامہ اور سالار کی ان ٹیسٹ کی رپورٹس کے حوالے سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس نے خود ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ چونکہ سالار نے ٹیسٹ کے حوالے سے اسے کچھ بتایا نہیں تو اس کا مطلب یہی تھا کہ ٹیسٹ ٹھیک ہی رہے ہوں گے۔

اور اب فرقان ایک بار پھر سالار کے فون پر تھا تو یہ لاہور میں اس کی سالار سے تیسری ملاقات تھی ان چند دنوں میں۔ وہ سوچے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہ اب اس سے اس کا اور بچوں کا حال پوچھ رہا تھا، لیکن اس کا انداز بے حد عجیب تھا۔ وہ خوش مزاجی جو اس کے طرز تخاطب کا حصہ ہوتی تھی وہ آج امامہ کو مکمل طور پر غائب محسوس ہوئی۔

"سالار ابھی تھوڑی دیر میں فون کرتا ہے تمہیں۔" اس نے ابتدائی علیک سلیک کے بعد اس سے کہا۔

"فون آپ کو کیسے دے دیا اس نے؟" یہ بات امامہ کو بے حد حیران کن لگی تھی۔

"ہاں وہ اسپتال میں آئے ہوئے تھے اور سالار کو مجھ سے کچھ کام تھا اسی لیے وہ یہاں ملنے آیا مجھے۔ ذرا واش روم تک گیا ہے تو فون یہیں چھوڑ گیا۔"

فرقان نے روانی میں وہ جگہ بتائی جہاں وہ تھے پھر اسی روانی میں امامہ سے اس جگہ ہونے کا جواز دیا پھر فون اپنے پاس ہونے کی توجیہہ دی اور امامہ کے لیے اپنے بیان کو ناقابل یقین کر دیا۔ وہ واش روم جاتے ہوئے اپنا فون کہیں چھوڑ کر جانے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ بھی ایک ہاسپٹل میں۔ بے شک وہ فرقان کا اسپتال ہی کیوں نہ ہوتا۔ وہ کھٹک گئی تھی، لیکن اس نے مزید سوال جواب کے بجائے فون بند کر کے سالار کی کال کا انتظار کرنا بہتر سمجھا۔

سالار ایم آر آئی کروا رہا تھا۔ اور پچھلے چند دنوں میں اوپر تلے ہونے والے ٹیسٹ ان سارے خدشات کی تصدیق کر رہے تھے جو فرقان کو ہوئے تھے۔ اسے برین ٹیومر تھا، لیکن اس کی نوعیت کیا تھی یہ کس اسٹیج پر تھا۔ اس کی ہولناکی کیا تھی، یہ جاننے کے لیے ابھی مزید بہت سے ٹیسٹ اور ڈاکٹرز کی رائے ضروری تھی۔ سالار ابتدائی شاک کی کیفیت سے نکل چکا تھا، مگر اس کی زندگی یک دم جمود کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ بھاگ دوڑ جو وہ پچھلے کئی سالوں سے کرتا آرہا تھا اور جس میں اس کی زندگی کے روز و شب گزر رہے تھے وہ عجیب انداز میں رکی تھی۔

برین ٹیومر مہلک تھا اس کی تصدیق ہو چکی تھی، لیکن وہ کتنا جان لیوا تھا اور صحت یابی کے چانسز کیا تھے۔ علاج کیا تھا۔ کہاں سے ہو سکتا تھا۔ کتنی مدت اس کے لیے درکار تھی۔ اس کی صحت پر اس کے کیا اثرات

ہونے والے تھے۔ اور ان سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ اس کی فیملی پر اس کی اس بیماری کے انکشاف کا کیا اثر ہونے والا تھا۔ وہ بتائے گیا نہ بتائے۔ وہ چھپائے تو کس طرح۔؟

اور وہ پہلا موقع تھا جب سالار سکندر نے پہلی بار بیٹھ کر اپنی زندگی کے بیالیس سالوں کے بارے میں سوچا تھا۔ گزر جانے والے بیالیس سالوں کے بارے میں اور باقی کی رہ جانے والی مدت کے بارے میں جو یکدم ہی دہائیوں سے سمٹ کر سالوں مہینوں ہفتوں یا دنوں میں سے کسی کا روپ دھارنے والی تھی۔

مہلت کا وہ اصول جو قرآن پاک کی بنیاد تھا۔ وہ سالار سکندر کی سمجھ میں آیا تھا لیکن یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ قانون اب اس کی اپنی زندگی پر لاگو ہونے جا رہا تھا۔ اپنی زندگی کے خاتمے کا سوچنا' روز قیامت پر یقین رکھنے کے باوجود اس کے رونگٹے کھڑے کر رہا تھا۔

"میڈیکل سائنس بہت ترقی کر گئی ہے۔ ہر چیز کا علاج ممکن ہو چکا ہے۔ نیسٹ میڈیسنز آ رہی ہیں۔ کوئی بھی بیماری اب ناقابل علاج تو رہی ہی نہیں۔"

اس کے ٹیومر کے molignant (مہلک) ہونے کی تصدیق اسی دن ہوئی تھی اور اس کی تصدیق ہو جانے پر فرقان اس سے کم اپ سیٹ نہیں ہوا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے گم صم بیٹھے سالار کو تسلی دینا شروع کی تھی۔ اپنے جملوں کی بے ربطی کے باوجود۔

"تم ابھی صرف یہ سوچو کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" سالار نے سر اٹھا کر پہلی بار اسے دیکھا اور پھر کہا۔

"تم ڈاکٹر ہو کر مجھ سے یہ بات کہہ رہے ہو۔" فرقان بول نہیں پایا۔ وہ دونوں بہت دیر تک وہاں چپ بیٹھے رہے تھے۔

"تم فوری طور پر امریکا چلے جاؤ بلکہ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ وہاں بہترین ڈاکٹرز اور اسپتال ہیں۔ ہو سکتا ہے وہاں اس کا علاج ہو جائے یا ہو سکتا ہے کوئی اور حل ہو۔" وہ اب ڈاکٹر بن کر نہیں اس کا ایک عزیز دوست بن کر بات کر رہا تھا۔

"امامہ سے کیا کہوں؟" اس نے فرقان سے عجیب سوال کیا۔

"ابھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک بار امریکا سے ٹیسٹ ہونے دو۔ دیکھو وہاں کے ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟" فرقان نے اس سے کہا تھا۔

"یہاں کے ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟" فرقان اس کے اس سوال کو نظر انداز کر گیا تھا۔ وہ اسے وہ سب بتانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا جو وہ اپنے چند ساتھی ڈاکٹرز سے سالار کی رپورٹ پر مشاورت کے بعد سن چکا تھا۔

"پاکستان میں برین ٹیومرز کا علاج اور نیورو سرجری اتنی ایڈوانسڈ نہیں ہے جتنا امریکا میں۔ اس لیے یہاں کے ڈاکٹرز کی رائے میرے نزدیک زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔"

وہ نظریں چرائے کہتا گیا تھا' سالار صرف اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ اسے فرقان کی بے بسی پر اپنے سے زیادہ ترس آیا' وہ اس سے کچھ چھپانا بھی نہیں چاہتا تھا اور کچھ بتانا بھی نہیں۔



"وہ نہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ فلو کی وجہ سے ہی گیا تھا دوبارہ۔ بس گپ شپ کرتے ہوئے فون ٹیبل پر رکھا اور پھر اٹھانا یاد ہی نہیں رہا۔"

سالار نے اس رات فون پر امامہ سے بات کرتے ہوئے کہا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

"اور فلو...؟ اس کا کیا ہوا؟"

"بس چل رہا ہے۔"

"ٹیسٹوں کی رپورٹس آ گئیں؟"

"ہاں سب ٹھیک ہے۔ بس وائرل انفیکشن ہے اس نے کچھ میڈیسنز دی ہیں' ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میں تو پریشان ہی ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا پتا نہیں کیا مسئلہ ہے۔ کیوں دوبارہ اسپتال میں فرقان کے ساتھ بیٹھے ہو۔"

وہ خاموشی سے اس کی گفتگو سنتا رہا۔ فرقان نے ٹھیک مشورہ دیا تھا۔ اسے ابھی امامہ کو کچھ بھی نہیں بتانا چاہیے تھا' لیکن اس کے لہجے میں جھلکنے والے اطمینان نے اسے عجیب طریقے سے گھائل کیا تھا۔ وہ اسے دھوکا دے رہا تھا۔

وہ اب اسے بچوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ بچوں سے باری باری بات کروا رہی تھی۔ وہ پچھلے تین دن سے جبریل کو قرآن پاک نہیں پڑھا پایا تھا۔ امامہ نے اسے یاد دلایا۔

"تم پڑھا دو۔" سالار نے جواباً کہا۔

"میں تو پچھلے تین دن سے پڑھا ہی رہی ہوں۔ revision (دہرائی) کروا رہی ہوں۔ نیا سبق تو تم ہی دو گے۔" وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

"کتنے پارے رہ گئے؟" سالار نے اس کی بات پر عجیب جائے واپسی سے پوچھا۔

امامہ نے نوٹس کیا۔ "آخری دس۔"

"جلدی ہو جائیں گے۔" وہ بڑبڑایا۔

"ہاں ان شاء اللہ۔ وہ ماشاء اللہ ذہین بھی تو بہت ہے۔ دس سال کا ہونے سے پہلے ہی قرآن پاک مکمل ہو جائے گا اس کا۔"

وہ اس بار سالار کے لہجے پر غور کیے بغیر کہتی گئی۔ وہ چاہتے تھے جبریل اس سے بھی کم عمری میں قرآن پاک حفظ کر لیتا کیونکہ وہ بلا کا ذہین تھا اور اس کی زبان بے حد صاف تھی' لیکن سالار نے اسے اس عمر میں قرآن پاک حفظ کرنے پر لگایا تھا جب وہ کچھ باشعور ہو کر اس کے معنی و مفہوم کے ساتھ ساتھ اس فریضے کی اہمیت سے بھی واقف ہو گیا تھا۔

اسکائپ کی اسکرین پر اب باری باری اس کے بچے دکھنے لگے تھے۔ وہ اب لیپ ٹاپ آن کیے ہوئے بیٹھا ان کی شرارتوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک بھیانک حقیقت کے اندر بیٹھا ایک خوب صورت خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ باری باری اپنی طرف سے کمپیوٹر کے کیمرے کے سامنے منہ کر کے باپ کو چوما کر رہے تھے۔

"بابا! آج میں نے لکھی بنائی ہے۔" عنایہ اسکرین پر ایک بڑے سائز کا اسکٹ دکھا رہی تھی۔

"واہ یہ تو بہت ہی اچھی دکھتی ہیں۔" سالار نے اپنے اندر کے فشار کو چھپاتے ہوئے بیٹی کو داد دی۔ وہ سب کچھ وہ اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ وہ سب کچھ ختم ہو جانے والا تھا۔

امامہ ان سب کو وہاں سے ہٹا کر لے گئی تھی کیونکہ اب جبریل کو نیا سبق پڑھنا تھا۔ وہ اور اس کا نو سالہ بیٹا آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سالار سے اگلا سبق پوچھ رہا تھا۔ سالار نے اسے پچھلا سبق سنانے کے لیے کہا تھا۔

جبریل نے پڑھنا شروع کیا تھا۔ سینے پر ہاتھ باندھے آنکھیں بند کیے خوش الحان آواز میں۔ اس نے باپ سے صرف ذہانت ورثے میں نہیں پائی تھی۔ خوش الحانی بھی پائی تھی۔

نو سال کی عمر میں بھی اس کی قرأت دلوں کو چھو لینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ کسی بھی سننے والے کی آنکھوں کو نم کر سکتی تھی۔ جبریل نے کب اپنا پہلا سبق ختم کیا تھا' سالار کو اندازہ ہی نہیں ہوا وہ کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ جبریل

آنکھیں کھول کر اپنے ہاتھ سینے سے ہٹا کر سامنے رکھے قرآن پاک کو دیکھا پھر اسکرین پر باپ کے نظر آنے والے چہرے کو جو کسی بت کی طرح بے حس حرکت تھا۔
"بابا!" جبریل کو ایک لمحہ کے لیے لگا شاید نیٹ کا کنکشن ختم ہو گیا تھا یا سگنلز کی وجہ سے streaming نہیں ہو پائی تھی۔
سالار چونکا اور اپنا گلا صاف کرتے ہوئے اس نے جبریل کو ایک بار پھر پچھلا سبق سنانے کو کہا۔ وہ حیران ہوا تھا۔
"وہ تو میں نے سنا دیا۔"
"میں نہیں سن سکا ایک بار پھر سناؤ۔"
وہ پہلا موقع تھا جب جبریل نے باپ کے چہرے کو بے حد غور سے دیکھا تھا کچھ مسئلہ تھا اس دن باپ کو۔ اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا' لیکن کوئی سوال کیے بغیر اس نے ایک بار پھر پچھلا سبق سنانا شروع کر دیا۔ اس بار سالار پہلے کی طرح کہیں اور محو نہیں ہوا تھا۔ اس نے بیٹے کو نیا سبق پڑھا کر اور چند بار دہرانے کے بعد اسکائپ بند کر دیا تھا۔
"Is baba ok" (کیا بابا ٹھیک ہیں؟) جبریل نے اسکائپ پر سالار سے بات کرنے کے بعد ماں سے پوچھا۔
"ہاں وہ ٹھیک ہیں بس فلو ہے اس لیے کچھ طبیعت خراب ہے ان کی۔" امامہ نے اس کے سوال پر زیادہ غور کیے بغیر کہا۔
"When is he returning" (وہ واپس کب لوٹ رہے ہیں؟)
جبریل نے اگلا سوال کیا۔
"ابھی تو امریکا جا رہے ہیں دو ہفتے کے لیے پاکستان سے۔ کہہ رہے تھے کچھ میٹنگز ہیں پھر امریکا سے آئیں گے۔"
امامہ نے سالار سے فون پر ہونے والی گفتگو اسے بتائی۔



وہ دو ہفتے بعد امریکا سے کنشاسا آگیا تھا۔ اور وہ کچھ بدلا ہوا تھا' یہ صرف امامہ نے ہی نہیں بچوں نے بھی محسوس کیا تھا' لیکن ان میں سے کسی کے استفسار پر بھی سالار نے ایسا کوئی جواب نہیں دیا تھا جس پر ان کو تشویش ہوتی۔ امامہ کا خیال تھا اس کا ورلڈ بینک کے ساتھ کام کا دورانیہ پورا ہو رہا تھا۔ یہ اداسی اس کا باعث تھی' لیکن وہ اور بچے خود بے حد خوش تھے کیونکہ ان کی پاکستان واپسی میں چند ہفتے رہ گئے تھے اور جب تک ان کی اگلی منزل متعین نہ ہو جاتی انہیں پاکستان ہی میں رہنا تھا' لیکن اس سے پہلے ہی ان کی زندگی میں وہ طوفان آگیا تھا جس نے امامہ سمیت ان سب کی زندگیوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔



ورلڈ بینک کی نائب صدارت چھوڑنے سے صرف دو ہفتے پہلے جب سالار کانگو میں الوداعی ملاقاتیں اور فیئرویل ڈنرز لینے میں مصروف تھا۔ وال اسٹریٹ جرنل نے ورلڈ بینک کی صدارت سے انکار کی وجہ ڈھونڈ نکالتے ہوئے سالار سکندر کو ہونے والے برین ٹیومر کی نیوز بریک کی تھی اور پھر یہ خبر صرف اس اخبار ہی نے نہیں ڈھیروں دوسرے اخبارات نے بھی لگائی تھی۔ سالار سکندر کے برین ٹیومر کی بریکنگ نیوز میں مغرب کو دلچسپی نہیں تھی نہ ہی میڈیا کو۔ دلچسپی اگر تھی تو سی آئی اے کو۔ اس اسٹیج پر سالار کی مہلک بیماری کی خبر بریک کرنے کا مطلب اس پروجیکٹ کے شروع ہونے سے پہلے ہی اس کی کمر توڑنے کے مترادف تھا جس پر سالار کام کر رہا تھا۔ "وہ

جانتے تھے سالار ورلڈ بینک سے الگ ہونے کے بعد کیا کرنے جا رہا تھا اور انہیں یقین تھا جو وہ کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا وہ ناممکنات میں سے تھا۔ اس کے باوجود حفاظتی اقدامات ضروری تھے اور سب سے بہترین دفاعی حکمت عملی وہی تھی جو انہوں نے اختیار کی تھی۔ وہ سالار سکندر کی بیماری کو تشہیر کرنے کے بعد اب اس پروجیکٹ کے ممکنہ سرمایہ کاروں کے پیچھے ہٹ جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ شطرنج تھی۔ سالار اپنے مہرے کی پہلی چال چلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ "وہ" پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ "انہوں" نے پہلی چال چل دی تھی اور پہلی چال میں ہی بادشاہ کو شہ مات ہونے والی تھی۔ یہ کم از کم "ان" کو یقین تھا۔



اس نے انٹرنیٹ پر glioma کا لفظ گوگل پر سرچ کیا۔ پھر oligodendroglial کو۔ ساڑھے نو سال کی عمر میں محمد جبریل سکندر نے ان دو لفظوں کو Spelling Bee کے مقابلے میں حصہ لینے کے لیے ان الفاظ کی فہرست میں شامل کیا تھا جن کی اسپیلنگ اسے یاد کرنا تھی۔ اسے ان دو الفاظ کی اسپیلنگ یاد کرتے ہوئے یہ اندازہ نہیں تھا وہ اپنے باپ کو لاحق دنیا کے مہلک ترین برین ٹیومر سے واقفیت حاصل کر رہا تھا۔

Spelling Bee کے مقابلے کے لیے جبریل نے صرف ان الفاظ کی اسپیلنگ یاد کی تھی۔ وہ دو الفاظ کیا تھے، وہ کھوجنے کی کوشش اس نے تب کی تھی جب اس نے انٹرنیٹ پر اپنے باپ کے نام کے ساتھ اس کی بیماری کے حوالے سے ایک خبر دیکھی تھی۔ وہ ورلڈ بینک کی ویب سائٹ تھی جو ان کے ڈیسک ٹاپ کا ہوم پیج تھا اور کئی بار سالار کے زیر استعمال آتا تھا اور اس ہوم پیج پر تازہ ترین اسکرول ہونے والی خبروں میں سے ایک سالار سکندر کی بیماری کے حوالے سے وال اسٹریٹ جرنل کی نیوز تھی جو صرف آدھ گھنٹہ پہلے بریک ہوئی تھی۔

ساڑھے نو سال کے اس بچے نے اس بیماری کو کھوجنا شروع کیا تھا۔ سالار ابھی گھر نہیں لوٹا تھا۔ امامہ دوسرے کمرے میں بچوں کو پڑھا رہی تھی اور جبریل انٹرنیٹ پر ساکت بیٹھا یہ پڑھ رہا تھا کہ اس کا باپ گریڈ ٹو کے oligodendroglial کا شکار تھا۔ اس ٹیومر کا علاج نہیں ہو سکتا تھا۔ مکمل طور پر کامیاب علاج۔ اور اگر علاج ہو بھی جاتا تو مریض سات سے دس سال تک زندہ رہ سکتا تھا۔ اس برین ٹیومر کے مریض صحت مند رہ کر بھی اس سے زیادہ نہیں جی سکتے تھے۔

ساڑھے نو سال کا وہ بچہ اس دن چند لمحوں میں بڑا ہو گیا تھا۔ اس گھر میں سالار کے بعد وہ پہلا شخص تھا جسے سالار کی بیماری اور اس کی نوعیت اور اثرات کا علم ہوا تھا۔ جبریل کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ اس ہولناک انکشاف کا کیا کرے۔ ماں کو بتائے یا نہ بتائے۔ یہ اس کا Dilemma (مخمصہ) نہیں تھا۔ اس کا مخمصہ اور تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



عمیرہ احمد

آبِ حیات

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کر دیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایئر رِنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص ــــ سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ ملا ہے۔



۱۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی پہیلی کو کیوں مار ڈالا۔

۲۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادی۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

۳۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

۴۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

۵۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

پندرھویں قسط

یا مجیب السائلین

"حمین! جاؤ بھائی کو بلا کے لاؤ، وہ سونے سے پہلے تم لوگوں کو دعا پڑھا دے۔ پتا نہیں اتنی دیر کیوں لگا دی اس نے۔"

بچوں کو پڑھانے سے فارغ ہونے کے بعد انہیں سونے کے لیے لیٹنے کا کہتے ہوئے امامہ کو جبریل یاد آیا۔ اسے کمرے سے گئے کافی دیر ہو گئی تھی۔

"آج میں پڑھاتا ہوں۔"

حمین نے اعلان کرتے ہی اپنے دونوں ہاتھ کسی نمازی کی طرح سینے پہ باندھتے ہوئے بڑے جذب کے عالم میں دعا پڑھنے کے لیے اپنا منہ کھولا اور امامہ نے تحکمانہ انداز میں فوری طور پر اسے ٹوکا۔

"حمین! بھائی پڑھائے گا۔"

حمین نے بند آنکھیں کھول لیں اور سینے پر بندھے ہاتھ بھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے نکل جاتا، امامہ نے نائٹ سوٹ کے اس پاجامے پر لگی گرہ کو دیکھا جو وہ ابھی ابھی باتھ روم سے پہن کر باہر نکلا تھا۔ پاجامے کے اوپری حصے کو ازار بند کے بجائے ایک بڑی سی گرہ لگا کر کسا گیا تھا اور اس گرہ کے دونوں سرے کسی خرگوش کے کانوں کی طرح اس کے پیٹ کے اوپر کھڑے تھے۔

"ادھر آؤ۔" امامہ نے اسے بلایا۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے جھک کر نیچے بیٹھتے ہوئے اس گرہ کو کھولنے کی کوشش کی تاکہ پاجامے کو ٹھیک کر سکے۔

حمین نے ایک چیخ ماری اور جھٹکا کھا کر اس گرہ پر دونوں ہاتھ رکھے پیچھے ہٹا۔ "ممی! نہیں۔"

"اس کی string کہاں ہے؟" امامہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس گرہ کو باندھنے کی وجہ کیا تھی۔

"میں نے اسکول میں کسی کو دے دی ہے؟"

امامہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیوں.....؟"

"چیریٹی میں....." حمین نے جملہ مکمل کیا۔

امامہ نے ہکا بکا ہو کر اپنے اس بیٹے کا اعتماد اور اطمینان دیکھا۔ "چیریٹی میں؟" وہ واقعی حیران تھی۔ "صرف ایک ڈوری کو؟"

"نہیں....." مختصر جواب آیا۔

"پھر.....؟"

"ڈوری سے بیگ کو باندھا تھا۔"

"کس بیگ کو؟" امامہ کا ماتھا ٹھنکا۔

"اس بیگ کو جس میں TOYS (کھلونے) تھے۔" جواب اب بھی پورا آیا تھا۔

"کس کے TOYS (کھلونے)؟" امامہ کے ماتھے پر بل پڑے۔

"Well" حمین نے اب ماں، رئیسہ اور عنایہ کو باری باری..... محتاط انداز میں دیکھا اور اپنے جواب کو گول مول کرنے کی بہترین کوشش کی۔

"There were many owners." (وہ کئی لوگوں کے تھے۔)

امامہ کو ایک لمحے میں سمجھ میں آیا تھا۔

"many owners کون تھے۔ کس کو دیے؟ کیوں دیے؟ کس سے اجازت لی؟"

اس نے یکے بعد دیگرے تابڑ توڑ سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔
یہ پہلا موقع نہیں تھا جب حمین سکندر نے مہاتما بدھ بننے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے بہن بھائیوں کے کھلونے دان کیے تھے اور اس کے بہن بھائیوں میں اگر بلا کا تحمل نہ ہوتا تو اس کے اس کارنامے پر ہر بار بلا کارن پڑتا۔
عنایہ کی آنکھیں اب آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں۔ اس "چھوٹے بھائی" نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ وہ ان کی ہر چیز کو کسی بھی وقت مشنری جذبے کے تحت کسی کو بھی دے سکتا تھا۔
"ممی!" عنایہ بری طرح بلبلائی تھی۔
"charity is not a sin" (چیرٹی گناہ نہیں ہے۔)
حمین نے اپنی آنکھیں علامتاً گول کرتے ہوئے ان دو الفاظ کا ایک بار پھر استعمال کیا جو پچھلے کچھ دنوں سے بار بار اس کی گفتگو میں آ رہے تھے۔ رئیسہ اس ساری گفتگو کے دوران اپنے بیڈ پر لیٹی ان دونوں کو خاموشی سے سن رہی تھی۔
"تم نے میرے کھلونے چرائے؟"
عنایہ کا بس چلتا تو وہ اس کو پیٹ ڈالتی۔ کم از کم رات کے اس پہر جب اسے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس کا کون کون سا کھلونا چیرٹی میں دے آیا تھا۔
"صبح بات کریں گے اس بارے میں۔ ابھی نہیں۔"
امامہ نے مداخلت کی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی صوفہ پر پڑا اس کا سیل فون بجنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ سالار کی کال تھی۔
"حمین جا کر اپنے بیڈ پہ لیٹو۔ میں خود بلا لاتی ہوں جبریل کو۔"
امامہ نے صوفہ کی طرف جاتے ہوئے کمرے کے دروازے کی طرف جاتے حمین کو ٹوکا۔ وہ بے حد فرماں برداری سے واپس اپنے بیڈ کی طرف آ گیا تھا۔
امامہ نے سیل فون پر سکندر عثمان کا نام چمکتے دیکھا اور کال ریسیو کرتے ہوئے اس نے تینوں بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔
"سالار کہاں ہے؟" سکندر عثمان نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہی عجیب اضطراب میں اس سے پوچھا تھا۔
"ایک ڈنر میں گئے ہیں۔ بس ابھی آنے ہی والے ہیں۔"
"میں اسے کال کر رہا تھا، وہ میری کال ریسیو نہیں کر رہا۔" امامہ کو ان کے لہجے میں عجیب سی پریشانی اور گھبراہٹ محسوس ہوئی تھی۔
"ہو سکتا ہے ڈنر میں آپ کی کال نہ لے پا رہے ہوں۔ وہ اکثر اپنا فون فنکشنز میں سائلنٹ کر دیتے ہیں۔ خیریت ہے نا پاپا؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔
"تم لوگوں نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ اتنی بڑی بات مجھ سے کیوں چھپائی ہے؟"
سکندر عثمان حواس باختگی میں انہیں کہتے چلے گئے۔ انہیں کچھ دیر پہلے ان کے ایک قریبی عزیز نے اس حوالے سے فون کیا تھا۔
اس عزیز نے سالار کی بیماری کے حوالے سے یہ خبر کسی چینل پر دیکھی تھی اور پھر فوری طور پر افسوس کا اظہار کرنے کے لیے سکندر کو فون کیا تھا اور سکندر عثمان ان کے اظہار افسوس پر شاکڈ رہ گئے تھے۔ انہیں یقین نہیں آیا کہ سالار کے بارے میں، جو وہ کہہ رہے تھے، وہ ٹھیک تھا لیکن اس کے بعد اگلے دس، پندرہ منٹوں میں انہیں اوپر

تلے کئی کالز آئی تھیں اور انہوں نے حواس باختگی کے عالم میں سالار کو کالز کرنا شروع کر دی تھیں۔ جو اس نے ریسیو نہیں کیں۔

اس ڈنر میں بیٹھے سکندر عثمان کی کال آنے سے بہت پہلے سالار کو یہ پتا چل گیا تھا کہ میڈیا میں اس کی بیماری کی خبر بریک ہو چکی تھی۔ اس کے اسٹاف نے اسے اطلاع دی تھی اور ڈنر ٹیبل پر بیٹھا ہوا سالار سکتے میں آ گیا تھا۔ اسے اس اسٹیج پر اس خبر کے آؤٹ ہونے کے مضمرات کا اندازہ چند ثانیوں میں ہو گیا تھا۔ وہ خبر صرف اس کے اسٹاف نے اس تک نہیں پہنچائی تھی۔ وہ جنگل کی آگ کی طرح اس ڈنر میں بیٹھے بہت سے اہم لوگوں کے علم میں آ چکی تھی اور ان میں سے چند نے سالار سے اس سلسلے میں بات بھی کی لیکن سکندر عثمان کا نام اپنے فون پر چمکتا دیکھ کر سالار کی بھوک ختم ہو گئی تھی۔

اسے یقین تھا وہ کال کس مقصد کے لیے کی جا رہی تھی لیکن وہ وہاں بیٹھ کر سکندر عثمان سے بات کرنے کی ہمت ہی نہیں کر سکا۔ وہ بوجھ جس نے کئی مہینوں سے اسے دہرا کر رکھا تھا ایک دم ہی جیسے اور بہت سے لوگوں کی کمریں جھکا دینے والا تھا اور اگر سکندر عثمان کو یہ خبر مل چکی تھی تو امامہ۔۔۔؟

وہ آگے نہیں سوچ سکا تھا۔ وہ چند گھنٹے پہلے گھر سے نکلتے ہوئے گھر پر ایک بہت خوش و خرم خاندان چھوڑ کر آیا تھا۔ جو بھی لاوا تھا اس کے اندر تھا۔ کوئی دوسرا اس کی لپیٹ میں آ کر خاکستر نہیں ہوا تھا اور اب۔ سالار سکندر کا فون ٹیکسٹ میسجز اور مسڈ کالز سے اٹ گیا تھا اور وہ اس ڈنر ٹیبل پر بیٹھے صرف اس نقصان کو کنٹرول کرنے کے طریقے سوچ رہا تھا جو اس خبر سے پہنچ سکتا تھا۔ اسے اگر یہ پتا ہوتا کہ امامہ اب تک بے خبر تھی اور سکندر عثمان کا فون اٹھا لینے کی صورت میں وہ اب بھی بے خبر ہی رہتی اور وہ واپسی پر اس خوش و خرم خاندان کو ایک بار پھر پہلے ہی کی طرح دیکھ سکتا تو سالار سکندر اپنے باپ سے بات کر لیتا لیکن وہ اس وقت اس کبوتر کی طرح تھا جو بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرنا چاہتا تھا لیکن کون سی بلی کو دیکھ کر۔۔۔؟ یہ اس کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ جو سامنے نظر آ رہی تھی یا جو آنکھیں بند کرنے پر نظر آنے لگتی تھی۔

"کیا نہیں بتایا پاپا؟ کیا چھپایا ہے آپ سے؟" امامہ کی سمجھ میں سکندر عثمان کی بات نہیں آئی تھی۔ اسے لگا اس نے شاید ان کی بات سننے اور سمجھنے میں کوئی غلطی کی تھی۔

"برین ٹیومر کے بارے میں۔" سکندر عثمان نے جیسے کراہتے ہوئے کہا تھا مگر اس کے باوجود وہ سالار کا نام نہیں لے سکے تھے۔ امامہ اب بھی کچھ نہیں سمجھی۔

"برین ٹیومر؟ کس کے برین ٹیومر کے بارے میں؟" وہ الجھی اور وہ پہلا موقع تھا جب سکندر عثمان کو احساس ہوا کہ وہ بھی ان کی طرح بے خبر تھی۔

"پاپا! آپ کس کے برین ٹیومر کی بات کر رہے ہیں؟" امامہ نے ان کو خاموش پا کر ایک بار پھر پوچھا۔ جواب سکندر عثمان کے حلق میں اٹک گیا تھا۔

"پاپا۔۔۔!" امامہ ان کے مسلسل خاموش رہنے پر ایک بار پھر اپنا سوال دہرانا چاہتی تھی مگر دہرا نہیں سکی۔ بجلی کے کوندے کی طرح اس کے دماغ میں اپنے ہی سوال کا جواب آیا تھا۔ سکندر عثمان کس کی بیماری پر یوں بے چین ہو سکتے تھے۔ سالار۔۔۔ کیا وہ سالار کی بات کر رہے تھے؟ سالار کے برین ٹیومر کی؟ ایک جھماکے کے ساتھ اسے کئی ہفتے پہلے کی فرقان اور اپنی بات چیت یاد آئی۔ ہاسپٹل کا وزٹ۔۔۔ کچھ ہفتوں سے سالار کا بدلا ہوا رویہ۔۔۔

وہ بے یقینی کے عالم میں فون ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔ یہ اس کا وہم تھا۔ اسے وہم ہی ہونا چاہیے۔ اس نے جیسے گڑگڑا کر دعا کی تھی۔ اب کچھ اور نہیں۔۔۔ کوئی آزمائش نہیں۔ اس نے اپنے مفلوج ہوتے ہوئے اعصاب کے ساتھ عنایہ، حمین، رئیسہ کو دیکھا جو خوش گپیاں کرتے ہوئے سونے کی تیاری میں مصروف تھے۔

فون پر اب دونوں طرف خاموشی تھی۔ نہ سکندر عثمان بول پا رہے تھے' نہ وہ۔ وہاں پچھتاوا تھا' یہاں بے یقینی۔ سالار کا نام لینے کی نہ ان میں ہمت تھی' نہ اس میں حوصلہ۔

"آپ سے کس نے کہا؟" امامہ نے بالآخر جیسے اپنے اوسان پر قابو پاتے ہوئے کانپتی ہوئی آواز میں ان سے پوچھا۔ اس نے اپنے پچھلے سوال کے جواب پر اصرار نہیں کیا تھا۔

"اس نے تمہیں نہیں بتایا؟" سکندر عثمان نے عجیب بے بسی کے ساتھ اس سے پوچھا' جیسے یہ نہیں کہنا چاہتے تھے۔ یہ کہنا چاہتے تھے کہ وہ خبر غلط تھی۔ کاش کہہ سکتے۔

امامہ کو اس سوال کا جواب دینے یا سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ اس نے باہر ہارن کی آواز سنی تھی۔

"میں کچھ دیر میں آپ سے بات کرتی ہوں پاپا۔" اس نے اپنے سرد پڑتے ہاتھ میں تھامے فون کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے سکندر عثمان سے کہا۔

"مجھے تمہیں نہیں بتانا چاہیے تھا۔" وہ اپنے پچھتاوے کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ پائے۔ اس حالت میں بھی انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کے اس انکشاف پر امامہ پر کیا گزری ہوگی۔

امامہ نے جواب نہیں دیا' فون بند کر دیا۔ سب کچھ یک دم ہی مہمل' بے معنی ہو گیا تھا۔ کسی بت کی طرح فون کو گود میں رکھے وہ ساکت بیٹھی رہی۔

وہ ساری زندگی "برے وقت" سے ڈرتی رہی تھی اور برے وقت کی آہٹ پر کان لگائے رکھتی تھی اور اب بس کچھ ہی سال تو ایسے گزرے تھے کہ اس نے آہٹوں پر کان لگانے بند کیے اور برا وقت۔ وہ جیسے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اتنا دبے پاؤں۔ اتنا اچانک کہ وہ ہل بھی نہیں پا رہی تھی۔

اس سے کچھ فاصلے پر عنایہ اور رئیسہ کے ساتھ وقتاً "فوقتاً" گفتگو کرتا ہوا حمین سونے کی کوشش میں بھی صوفے پر بت کی طرح بیٹھی ماں پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ممی نے دادا سے فون پر بات کی تھی اور پھر ممی خاموش بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ہارن بجنے پر بھی پاپا کو ریسیو کرنے نہیں گئی تھیں۔ حمین نے جمائی لیتے ہوئے صورت حال کا تجزیہ کیا۔ امامہ کو ایک بار پھر دیکھا' پھر عنایہ اور رئیسہ کو جو تقریباً "نیند کی وادی میں چلنے والی تھیں۔ ایک اور جمائی لے کر اس نے امامہ کو مخاطب کیا۔

"ممی آپ ٹھیک ہیں؟"

امامہ نے چونک کر خالی نظروں سے حمین کو دیکھا وہ حمین کا سوال کچھ نہیں سکی تھی۔ بس یہ پتا چلا تھا کہ اس نے کچھ کہا تھا۔ جواب دینے یا کوئی اور سوال کرنے کے بجائے وہ اٹھ کر باہر نکل گئی تھی۔ حمین کچھ اور الجھا تھا۔ اس کی ماں انہیں خدا حافظ کے بغیر اور ان کے ماتھے پر بوسہ دیے بغیر ایسے نہیں جاتی تھی جیسے وہ اس وقت گئی یہ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ حمین کی زندگی میں۔ اس کا دماغ الجھا تھا۔ اس گھر کے افراد باری باری اس طوفان کے ہچکولوں کو محسوس کرنا شروع ہو گئے تھے۔

"تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟" سالار نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہی وہاں پڑے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے جبریل کو دیکھ لیا تھا۔ باپ کی آواز جبریل کو کسی کرنٹ کی طرح لگی تھی۔ برق رفتاری سے اس نے کمپیوٹر کی اسکرین پر وہ سائٹ بند کی جو وہ کھولے بیٹھا تھا اور پھر مزید کچھ بھی بند کیے بغیر وہ ریوالونگ چیئر پر بیٹھے بیٹھے گھوما۔

وہ اب باپ کا استقبال کرنے کے لیے تیار تھا جو لاؤنج کے بیرونی دروازے سے سیدھا اندر آیا تھا لیکن ابھی تک اس کے قریب نہیں پہنچا تھا۔ امامہ ہارن کی آواز سن کر بھی نہیں آئی تھی۔ جبریل ہارن کی آواز سن ہی نہیں سکا تھا۔ اس کا ذہن جس گرداب میں پھنسا ہوا تھا وہاں وہ سن بھی نہیں سکتا تھا۔

"میں ایک اسائنمنٹ کی تیاری کر رہا تھا۔" جبریل نے اپنے سامنے کھڑے سالار کو دیکھے بغیر' نظریں ملائے بغیر

کہا۔ وہ باپ کا چہرہ کیوں نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ وہ ساڑھے نو سال کا بچہ اس وقت نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ اس نے جیسے بے خبری میں ایک ایسا راز پا لیا تھا جسے اب وہ کسی کے سامنے عیاں ہو جانے سے ڈر رہا تھا۔

سالار نے جبریل کا چہرہ دیکھا۔ اس کے عقب میں ڈیسک ٹاپ پر ورلڈ بینک کا ہوم پیج دیکھا پھر اس نے اپنی ڈنر جیکٹ اتارتے ہوئے اس سے کہا۔

"بہت دیر ہو گئی ہے۔ ساڑھے دس ہو رہے ہیں اور تمہیں دس بجے سے پہلے پہلے سب کام مکمل کر لینا چاہیے، یاد ہے؟"

سالار نے جیسے اسے یاددہانی کرائی تھی۔ وہ اس گھر کے بچوں کے لیے ایک طے شدہ معمول تھا' دس بجے سے پہلے پہلے۔ اپنا کام مکمل کر کے سو جانا۔

جبریل نے اس بار بھی باپ کو دیکھے بغیر سر ہلایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تمہاری ممی کہاں ہیں؟" سالار نے اس سے پوچھا۔ ہارن کی آواز کے باوجود بھی اس کا استقبال کرنے نہیں آئی تھی۔ اور جبریل رات کے اس پہر لاؤنج پر ڈیسک ٹاپ پر اکیلا موجود تھا۔ اس کے گھر میں یہ خلاف معمول تھا..... وہ خدشہ جو اسے ڈنر میں لاحق ہوا تھا وہ جیسے یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔

جبریل کو جواب دینا نہیں پڑا۔ بچوں کے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ آ گئی تھی۔ سالار نے اسے دیکھا اور اس کے چہرے پر پڑنے والی ایک نظر ہی اسے یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ اس کے بدترین خدشات ٹھیک ثابت ہوئے تھے۔

اس لاؤنج میں موجود تینوں افراد عجیب ڈرامائی انداز میں وہاں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ کسی اسٹیج پر کے ایکٹرز کی طرح جو ڈرامے کے درمیان اپنی لائنز بھولنے کے ساتھ ساتھ اسٹیج پر آمد اور جانے کا راستہ بھی بھول چکے تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ پہلے دوسرا جائے۔

وہ خاموشی اس ساڑھے نو سال کے بچے نے پہلی بار اپنے گھر میں اپنے ماں باپ کے درمیان ایک دیوار کی طرح حائل ہوتی دیکھی تھی۔ اور اس خاموشی نے اس کے خوف کو بڑھایا تھا۔ وہ بلا کا ذہین تھا لیکن دنیا کی کوئی ذہانت انسانی رشتوں کے الجھے دھاگوں کو سلجھا نہیں سکتی۔ نہ جذباتیت کو مات دے سکتی ہے نہ بے حسی کو توڑ سکتی ہے۔ نہ خاموشی کی دیواریں چھید سکتی ہے۔

سالار کی طرح جبریل نے بھی یہ تو جان لیا تھا کہ امامہ بھی سالار کی بیماری کے بارے میں جان گئی تھی لیکن یہ انکشاف اسے کس حد تک اذیت دے رہا تھا۔ جبریل اس کا اندازہ نہیں کر پا رہا تھا نہ اس کے ردعمل کا۔

"گڈ نائٹ۔" اسے جیسے راہ فرار سوجھ گئی۔ وہ وہ لفظ بول کر ماں کی طرف دیکھے بغیر وہاں سے غیر متوازن چال کے ساتھ گیا تھا۔ لاؤنج میں کھڑے رہ جانے والے ان دونوں افراد نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ایک نظر پھر دوسری پھر تیسری۔ پھر سالار پلٹ کر اپنے بیڈ روم کی طرف گیا تھا۔ وہ اس سے زیادہ ان نظروں کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔

اپنے بیڈ روم میں داخل ہو کر پیچھے دیکھے بغیر بھی وہ جانتا تھا وہ اس کے پیچھے تھی اور میکانکی انداز میں اندر آئی تھی یوں جیسے کسی ٹرانس میں تھی۔ متحیر زدہ نہیں تھی۔ وحشت زدہ تھی۔ یوں جیسے بہت کچھ پوچھنے کے باوجود کچھ پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔ جیسے اسے یقین تھا۔ اب جو بھی خبر ملنی تھی۔ بدی سے بدتر ملنی تھی۔

سالار اب بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ڈنر جیکٹ کو صوفے پر پھینکتے ہوئے اس نے وہ فون ٹراؤزر کی جیب سے نکال لیا تھا جو بج رہا تھا۔ وہ سکندر عثمان تھے۔ اس نے اس بار باپ سے صرف نظر نہیں کیا تھا۔ جب امامہ کو سب کچھ پتا چل چکا تھا تو پھر باقی کسی سے کیا چھپانا تھا اسے؟

اس کی آواز سنتے ہی سکندر عثمان اپنا حوصلہ کھو بیٹھے تھے۔ سالار نے باپ کو زندگی میں پہلی بار روتے دیکھا تھا اور اس لمحے اسے پہلی بار احساس ہوا کہ صرف اولاد کے آنسو ہی تکلیف دہ نہیں ہوتے۔ ماں باپ کو اپنی نظروں کے سامنے اپنی وجہ سے روتے دیکھنا بھی بے حد مشکل ہوتا ہے۔

"تم نے طے کر رکھا ہے کہ تم ساری عمر مجھے چین نہیں لینے دو گے۔"

سکندر عثمان نے آنسوؤں کے درمیان اس سے کہا۔ وہ اولاد کی تکلیف پر پریشان ہونے والے باپ تھے، رو پڑنے والے باپ نہیں تھے۔ آج ان کا یہ زعم بھی اسی اولاد نے ختم کیا تھا جو اتنے سالوں سے ان کے لیے فخر کا باعث رہی تھی۔

"اس بار تو میں نے کچھ بھی نہیں کیا پاپا!" اس جملے نے سکندر عثمان کو مزید زخمی کیا تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ واقعی اس بار تو اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

"میں اور تمہاری ممی کنشاسا آ رہے ہیں اسی ہفتے۔" انہوں نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔

"پاپا! کیا فائدہ ہے؟ میں وقت نہیں دے پاؤں گا۔ سب کچھ وائنڈ اپ کر رہا ہوں میں یہاں، کچھ دنوں کی بات ہے پھر میں آ جاؤں گا آپ کے پاس، پاکستان۔"

اس نے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ ان دونوں کو ان حالات میں اپنے سامنے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں فی الحال بالکل ٹھیک ہوں۔ ٹریٹمنٹ ہو رہا ہے۔ آپ صرف دعا کریں۔ ممی سے میری بات کروا دیں۔" اس نے سکندر عثمان کو دلاسا دیتے ہوئے انہیں ماں سے بات کروانے کو کہا۔ طیبہ بھی اسی کیفیت میں تھیں جس میں سکندر عثمان تھے۔ اس کی بیماری کا انکشاف جیسے ایک آتش فشاں کے پھٹنے کی طرح تھا جس نے منٹوں میں اس سے جڑے ہر شخص کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا تھا۔

کمرے میں ٹہلتے ہوئے فون کان سے لگائے وہ اپنے ماں باپ کو تسلیاں دیتے ہوئے اس وجود سے بے خبر نہیں تھا جو کمرے کے درمیان اس ساری گفتگو کے دوران کسی بت کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ ایک ایک لفظ کو سنتے ہوئے اور ایک بھی لفظ کو سمجھے بغیر۔

سالار نے بالآخر فون بند کیا اور اسے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔ ایک عجیب سا احساس جرم تھا جس کا شکار وہ اس وقت ہو رہا تھا۔ پتا نہیں احساس جرم تھا یا خود ترسی۔ اس کی بیماری نے اسے بڑے غلط انداز میں سب کی توجہ کا مرکز بنا دیا تھا۔ سب کی توجہ کا مرکز اور ہر ایک کی تکلیف کا باعث۔

اس نے فون رکھ کر امامہ کو دیکھا۔ اس کا چہرہ سفید تھا۔ بالکل بے رنگ، یوں جیسے اس نے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔ اس پر نظریں جمائے پلکیں جھپکائے بغیر۔ شاکی نظریں، بے یقینی سے بھری ہوئی۔

"بیٹھ کے بات کرتے ہیں!" خاموشی کو سالار نے توڑا تھا۔ وہ اس کی نظروں کا سامنا نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر امامہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے صوفے کی طرف لے آیا۔ وہ کھنچی چلی آئی تھی۔ یوں جیسے ایک روبوٹ ہو۔

"تمہیں کس نے بتایا؟"

بہت دیر صوفے پر برابر ایک دوسرے کو دیکھے بغیر گم صم بیٹھے سالار نے بالآخر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ گفتگو کا آغاز اب بھی اسے ہی کرنا تھا۔ سوال کا جواب جاننے کے باوجود اس نے پوچھا تھا۔

اس سوال کے علاوہ سارے سوال مہلک تھے۔ سارے سوالوں سے وہ بچنا چاہتا تھا۔ کسی دوسرے کے بارے میں پوچھنا اور بات کرنا اور بات تھی۔ اپنے بارے میں بات کرنا۔ اپنی بیماری۔ اپنی زندگی، اپنی موت۔۔۔ یہ انسان نہیں کر سکتا، وہ بھی انسان تھا۔

"تم نے کیوں نہیں بتایا؟" سوال کا جواب وہ نہیں آیا تھا جس کی اسے توقع تھی۔ سوال کا جواب سوال سے ہی آیا تھا۔ گلے میں پھنسی ہوئی رندھی ہوئی زخمی سی آواز میں۔ وہ امامہ کی آواز نہیں تھی۔ بے بسی اور بے یقینی کی آواز تھی۔ کیا ہوا۔۔۔؟ کب ہوا۔۔۔ سے بھی زیادہ چبھنے والا سوال۔ اس نے اسے اس قابل کیوں نہیں سمجھا تھا کہ اپنی زندگی کی اتنی بڑی تکلیف وہ خبر کو اس کے ساتھ بانٹتا۔ چھپانا کیوں ضروری سمجھا تھا۔ زندگی کے اتنے سال ساتھ گزارنے کے باوجود بھی۔

"ہمت نہیں پڑی۔" جواب نے امامہ کی ہمت بھی توڑی تھی۔ وہ کم حوصلہ تو کبھی نہیں تھا تو کیا وہ خبر اس بیماری کی نوعیت اس حد تک خراب تھی کہ وہ کم ہمت ہو رہا تھا۔

وہ اسے دیکھے بغیر اب جوتوں کے تسمے کھولتے ہوئے اسے اپنی بیماری کے بارے میں بتا رہا تھا۔

ٹیومر کی تشخیص۔۔۔ نوعیت ممکنہ علاج متوقع مضمرات۔۔۔ مدھم آواز میں اسے دیکھے اس سے نظریں ملائے بغیر وہ اسے سب کچھ بتاتا چلا گیا۔ وہ دم سادھے سب کچھ سنتی گئی۔ یوں جیسے وہ اپنے کسی بھیانک خواب کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گے نا؟"

اس نے ساری گفتگو سننے کے بعد اس کا کندھا دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر منت والے انداز میں پوچھا تھا۔ یوں جیسے وہ مریض نہیں ڈاکٹر تھا اور اس کی زندگی اور بیماری خود اس کے ہاتھ میں تھی۔۔۔ وہ جواب ہی نہیں دے سکا۔ بول ہی نہیں سکا۔ وہ سوال تھوڑی تھا وہ تو آس اور امید تھی جو وہ اسے کم از کم اپنے لفظوں سے دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنی بیماری کے بارے میں پاکستان اور امریکہ کے ڈاکٹرز کی آرا بتادی تھیں اور اس کے باوجود وہ اس سے ایک احمقانہ سوال پوچھ رہی تھی۔ سالار نے خفگی محسوس کی غصہ نہیں آنا چاہیے تھا لیکن غصہ آیا تھا۔

"امامہ! تم جا کر سو جاؤ۔" اس نے اپنے کندھے سے اس کے دونوں ہاتھ ہٹاتے ہوئے اسے کچھ کھردرے لہجے میں ایک ویسا ہی احمقانہ مشورہ دیا۔ وہ اپنے جوتے اتار کر صوفے سے اٹھ جانا چاہتا تھا۔ وہ اٹھ نہیں سکا۔ وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ بچوں کی طرح اس کے کندھے سے لگی۔۔۔ وہ اسے سونے کا کہہ رہا تھا۔ نیند تو ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی اب اس کی زندگی سے۔۔۔ وہ جو ایک گھر اتنی مشکل سے بنایا تھا وہ ٹوٹنے جا رہا تھا۔ سائبان اٹھنے والا تھا اور وہ اسے کہہ رہا تھا وہ سو جائے۔

وہ اس سے لپٹی ہچکیوں کے ساتھ روتی رہی' وہ مجرموں کی طرح چپ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ تسلی دلاسا دے سکتا تھا' پر کیا دیتا۔۔۔ ابھی اسے وہ سارے لفظ ڈھونڈنے اور سوچنے تھے' جن میں وہ اپنی بیوی کو یہ کہتا کہ وہ اب اپنے مستقبل کو اس کے بغیر سوچے' اپنے حال میں سے اسے نکالنا سیکھے۔ یہ ناامیدی اور مایوسی نہیں تھی۔ حقیقت پسندی تھی۔۔۔ وہ حقیقت پسندی جس سے امامہ نفرت کرتی تھی۔

"میں رپورٹس دیکھنا چاہتی ہوں۔" وہ روتے روتے یک دم بولی تھی۔ پتا نہیں اب کیا گمان تھا جسے وہ وہم بنانا چاہتی تھی۔ سالار نے ایک لفظ کہے بغیر اٹھ کر کمرے میں پڑی ایک کیبنٹ سے فائلز کا ایک پلندہ لا کر اس کے سامنے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ وہ کپکپاتے ہاتھوں سے ان رپورٹس کو دیکھنے لگی' دھندلائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہ ان کاغذات کو دیکھتے ہوئے جیسے یہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ کچھ اور تو نہیں تھا جو وہ چھپا رہا تھا۔ کوئی اور بری خبر پیروں کے نیچے سے باقی ماندہ زمین بھی نکال دینے والا انکشاف۔۔۔ ہر کاغذ اس کی آنکھوں کی دھند کو گہرا کر رہا تھا' وہ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ رہ چکی تھی رپورٹس میں استعمال شدہ ٹرمز کو پڑھ بھی سکتی تھی' سمجھ بھی سکتی تھی۔ آخری فائل کو بند کر کے واپس رکھتے ہوئے اس نے سالار کو دیکھا۔

"میڈیکل سائنس غلط بھی تو کہہ سکتی ہے۔"

سالار رندھی ہوئی آواز میں کہے گئے اس جملے پر ہنس پڑا۔ وہ غلط آدمی کو غلط جملے سے امید دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بلکہ شاید یہ جملہ اس سے نہیں اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔ اپنے دماغ میں چلنے والے جھگڑ روکنے کے لیے۔

"ہاں سائنس غلط بھی کہہ سکتی ہے۔ ڈاکٹرز کی تشخیص بھی غلط ہو سکتی ہے علاج بھی۔" اس نے امامہ ہاشم کی بات کو رد نہیں کیا تھا۔ اس کی اذیت کو وہ اور نہیں بڑھانا چاہتا تھا۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گے نا؟" اس کا بازو ایک بار پھر تھاما گیا تھا۔ سوال پھر دہرایا گیا تھا۔ وہ خاموش نہیں رہ سکا غصہ بھی نہیں دکھا سکا۔

"اگر میرے ہاتھ میں ہوتا تو ضرور۔۔۔ لیکن یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس لیے ان شاء اللہ۔"

وہ پھر ہچکیوں سے رو پڑی تھی۔ اس بار سالار نے اسے لپٹا لیا۔ وہ مرد تھا رونا نہیں چاہتا تھا مگر جذباتی ہو رہا تھا۔۔۔ وہ آنسو نہیں تھے۔ وہ سارے خوف اور خدشات تھے جو اس کی بیماری ان کی زندگی میں لے آئی تھی۔ چار کم سن بچوں کے ساتھ وہ ایک عورت اپنی زندگی کو کیسے اکیلے بسر کرنے کا تصور کرتی۔ جب وہ پچھلے گیارہ سالوں سے اس پر ہر لحاظ سے انحصار کرتی رہی تھی۔ خوف بے شمار تھے اور وہ اس کے اظہار کے بغیر بھی جیسے اس کا ذہن پڑھ رہا تھا۔

"امامہ! تمہیں بہادر بن کر اس سب کا مقابلہ کرنا ہے۔"

اس نے بالآخر اس کے لیے ایک جملہ ڈھونڈا تھا کہنے کے لیے۔۔۔ صدیوں پرانا روایتی جملہ۔ تکلیف میں انسان بے حس تو ہو سکتا ہے بہادر کیسے ہوتا ہے؟۔۔۔ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہیں سکی۔

زندگی میں پہلی بار اس نے سالار کی کسی بات پر اعتراض کے باوجود وہ اعتراض اس تک نہیں پہنچایا۔۔۔ لڑنا جھگڑنا بحث مباحثہ یہ تو تب ہوتا ہے جب سالوں کا ساتھ ہو۔۔۔ سالوں کا ساتھ گزر گیا تھا۔ اب جو رہ گیا تھا۔ وہ مہلت تھی اور اس مہلت نے اسے کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ شکوہ۔۔۔ شکایت۔۔۔ گلہ۔۔۔ اعتراض۔۔۔ کچھ بھی۔۔۔ وہ روتی رہی وہ اسے ساتھ لگائے تھپکتا رہا۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔" بہت دیر تک اس سے لپٹ کر روتے رہنے کے بعد وہ اس سے الگ ہوئی اور اس نے جیسے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"تم پھر سوال کر رہی ہو؟" سالار کو لگا اس کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں تھی۔

"نہیں سوال نہیں کر رہی۔۔۔ بتا رہی ہوں۔۔۔ تمہیں بہادر بن کر اس سب کا مقابلہ کرنا ہے۔"

وہ اس کا جملہ اسی سے دہرا رہی تھی وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"بیماری ہے۔ موت تو نہیں ہے۔" کیسی تسلی تھی جو اس نے دی تھی۔ اسے شاید خیال آیا تھا کہ اسے سالار کو تسلی دینا چاہیے تھی اس کے آنسو اسے پریشان کر رہے ہوں گے۔۔۔ مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کے الفاظ اس کے چہرے کا ساتھ نہیں دے رہے ہوں گے۔

امامہ سرخ سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ لڑکھڑاتی زبان میں اسے جو امید دلا رہی تھی اس کی حقیقت اسے بھی پتا تھی اور اس کو بھی جیسے وہ امید دلا رہی تھی۔

"تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔ امامہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک اور سیلاب آیا۔

"میں نے زندگی میں تمہیں بہت سارے آنسو دیے ہیں' تمہارے رونے کی بہت ساری وجوہات کا باعث بنا ہوں میں۔" اس کے آنسوؤں نے عجیب کانٹا چبھویا تھا سالار کو۔

بہتے آنسوؤں کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے وہ ہنسی۔

"ہاں پر میری زندگی میں خوشی اور ہنسی کے سارے لمحات کی وجہ بھی تم ہو۔"
وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ پھر یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔
"سو جاؤ۔ بہت رات ہو گئی ہے۔" وہ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے واش روم میں چلا گیا تھا جب واپس آیا۔ وہ اسی طرح وہاں بیٹھی تھی۔ ان ہی فائلوں کے پلندے کو ایک بار پھر گود میں لیے۔ یوں جیسے اس میں جھوٹ ڈھونڈ رہی ہو۔ کوئی غلطی کوئی غلط فہمی۔ امید تو وہاں نہیں تھی۔
سالار نے کچھ کہے بغیر خاموشی سے اس کی گود سے وہ ساری فائلیں اٹھالیں' اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔
"امامہ ایک وعدہ کرو۔" فائلوں کو اس کیبنٹ میں لاک کرتے ہوئے سالار نے اس سے کہا۔
"کیا؟" اس نے دوپٹے سے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے اس سے کہا۔
"بچوں کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔ وہ بہت چھوٹے ہیں۔"
امامہ نے سر ہلا دیا۔



"برین ٹیومر کیا ہوتا ہے؟" حمین نے دعا کا آخری لفظ پڑھتے ہی جبریل سے پوچھا جبریل کا رنگ اڑ گیا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی کمرے میں آیا تھا۔
"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" جبریل کو لگا جیسے حمین نے وہ سوال اس سے جان بوجھ کر کیا تھا۔ یوں جیسے اس کی چوری پکڑلی تھی۔ "کوئی disease (بیماری) ہوتی ہے؟" وہ جبریل سے پوچھنے کے باوجود اندازہ لگا چکا تھا۔
"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" جبریل نے ایک بار پھر اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنا سوال دہرایا' لیکن اس نے دل میں جیسے دعا کی تھی کہ اسے کچھ پتا نہ ہو۔
"ہماری فیملی میں کسی کو برین ٹیومر ہے۔" حمین نے بالآخر اعلان کیا جبریل نے عنایہ اور رئیسہ کو دیکھا وہ دونوں سو چکی تھیں۔
"I think dada has got brain tumar" (میرا خیال ہے دادا کو ہے)۔" اس نے جبریل کے تبصرے سے پہلے اپنا اگلا نتیجہ اس کے ساتھ بانٹا۔
"He told Mummy and Mummy got upset۔" انہوں نے ممی کو بتایا ہے اور ممی اپ سیٹ ہو گئی ہیں)
جبریل اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ تو اس کی ماں تک بھی یہ خبر پہنچ چکی تھی۔ اور اس کے دادا تک بھی۔۔۔ اور پوری فیملی تک۔۔۔ وہ بچہ سوچ رہا تھا۔
"Is dada going to die (کیا دادا مرنے والے ہیں؟)
حمین نے اس بار لیٹے لیٹے بے حد رازدارانہ انداز میں جبریل سے پوچھا۔
"نہیں۔" اس نے بے اختیار کہا۔
"Thank God... I love him so much"
"تھینک گاڈ! مجھے ان سے بہت پیار ہے۔"
حمین نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ سینے پر رکھ کر جیسے سکون کا سانس لیا۔
"تب ٹھیک ہے۔"

"حمین! تم یہ بات کسی کو مت بتانا۔" جبریل نے یک دم اسے ٹوکا۔
"دادا کے برین ٹیومر والی؟" وہ متجسس ہوا۔
"ہاں۔"
"کیوں؟"
اس کیوں کا کوئی معقول جواب نہیں تھا اس کے پاس' لیکن جواب کے بغیر حمین کو وہ قائل نہیں کر سکتا تھا۔
"یہ ممی کا سیکرٹ ہے' وہ اسے ڈس کلوز (ظاہر) نہیں کرنا چاہتیں۔"
"اوہ اچھا۔" حمین کو فوری طور پر بات سمجھ میں آ گئی۔
"دادا نے ممی کو یہ بات بتائی تو وہ اپ سیٹ ہو گئیں' اب تم کسی اور کو بتاؤ گے تو وہ بھی اپ سیٹ ہو جائے گا۔"
جبریل جتنے حفاظتی بند باندھ سکتا تھا' اس وقت باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ننھا بچہ ماں باپ کے اس راز کو راز رکھنے کے لیے ہلکان ہوتا جا رہا تھا۔
"او مائی گاڈ! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"
حمین کو یک دم خیال آیا۔ وہ جبریل کی بات نہ مان کر کتنا برا کام کرنے والا تھا۔
جبریل اب سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔
"لوگوں کو اپ سیٹ کرنا گناہ ہے نا؟" ایک پراسرار سرگوشی اس کے بائیں کان میں ایک بار پھر گونجی۔
"ہاں' یہ بہت بڑا گناہ ہے۔" جبریل نے سرگوشی میں ہی اندھیرے میں چمکنے والی ان آنکھوں کو ڈرایا۔
"اچھا۔۔۔ او کے۔"
حمین کی آواز میں اس بار خوف تھا اور وہ سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ وہ آج کل ہر کام اور بات کو ایک ہی پیمانے پر جج کرتا تھا۔ کیا وہ sin (گناہ) ہے؟
جبریل کچھ دیر اسی طرح لیٹا رہا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ حمین کے خراٹے تھوڑی ہی دیر میں اس کے کانوں میں گونجنے لگے وہ اس کے خراٹوں سے بے حد چڑتا تھا اور ہمیشہ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ حمین سے پہلے سوئے کیونکہ اگر وہ پہلے سو جاتا تو اس کے خراٹوں کی آواز سے وہ سو نہیں پاتا تھا۔ اور آج وہ جان بوجھ کر اس کے نیند میں جانے کا انتظار کرتا رہا' جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ سو چکا ہے تو وہ بڑی احتیاط سے بستر سے اٹھا اور بے آواز قدموں چلتا ہوا دروازہ کھول کر دوبارہ لاؤنج میں آ گیا جس کی لائٹ اب آف تھی۔ جبریل نے لاؤنج کی لائٹ جلائے بغیر کمپیوٹر آن کیا اور دوبارہ ان ہی میڈیکل ویب سائٹس کو دیکھنے لگا جنہیں وہ سالار کے آنے سے پہلے دیکھ رہا تھا۔
ساڑھے نو سال کی عمر میں محمد جبریل سکندر نے پہلی بار برین ٹیومر کے بارے میں پڑھا تھا۔ نیورو سرجری کے بارے میں۔۔۔ neurooncology کے بارے میں oligodendrogliomas کے بارے میں۔۔۔ اس کی ہر ٹائپ کے بارے میں۔۔۔ اور دماغ کے بارے میں۔۔۔ وہ پہلے بھی اپنی سائنس کی کلاسز میں دماغ کے بارے میں متجسس رہتا تھا لیکن اب وہ دماغ اور اس کو لاحق ایک بیماری اس شخص کی زندگی کو چیلنج کر رہی تھی جس سے اسے بے حد پیار تھا۔۔۔ وہ اس بیماری کا علاج ڈھونڈنا چاہتا تھا جس سے وہ اپنے باپ کی زندگی بچا سکے۔۔۔ ساڑھے نو سال کی عمر میں دماغ اور دماغ کی بیماریوں سے یہ دنیا کے کم عمر ترین اور قابل ترین سرجن کا پہلا تعارف تھا۔
سالار سکندر اپنی بیماری کے بارے میں جتنا کچھ جانتا تھا جبریل سکندر اس ایک رات میں اس سے دس گنا زیادہ جان چکا تھا۔۔۔ وہ پہلی رات نہیں تھی جب جبریل جاگ کر اس بیماری کی کھوج میں لگا تھا' وہ اس کی زندگی کی ان راتوں کا آغاز تھا جو اسے دماغ کی گتھیوں کو سلجھانے میں گزارنی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اس رات امامہ کو نیند نہیں آئی۔ سالار کے سو جانے کے بعد بھی وہ اس طرح جاگتی رہی تھی جیسے نیند نامی کسی شے سے واقف ہی نہ ہو۔

اسے خوف رہتا تھا وہ جس سے پیار کرتی تھی وہ اس سے چھن جاتا تھا۔ وہ سالار سے پیار نہیں کرتی تھی۔ کرنے لگی تو اس کا اعتراف نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ضروری ہو گیا تو وہ اس کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ وہ اس کو کھو دینے سے ڈرتی تھی۔ پیار کیسی قاتل شے ہے۔ کسی تیر تلوار سے نہیں مارتا۔ "ہو" جانے سے مار دیتا ہے۔

اس نے لاہور میں نہر کنارے ملنے والی اس بوڑھی خانہ بدوش عورت کے بارے میں سالار کو بھی بتایا تھا۔۔۔ جب وہ اس کے پاس امریکہ واپس گئی تھی اور وہ حیران رہ گیا تھا کہ وہ موم کیسے ہوئی۔ اس کا دل کیسے بدل گیا۔

سالار نے اس بوڑھی عورت کے قصے کو دلچسپی سے سنا تھا۔ یقین نہیں کیا تھا۔ اس کا خیال تھا امامہ اس وقت جس ذہنی حالت میں تھی وہ چیزوں کے بارے میں ضرورت سے زیادہ حساسیت دکھا رہی تھی۔ اس نے امامہ کی اس بات کو بھی زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا تھا کہ وہ اس عورت کو کوشش کے باوجود ڈھونڈ نہ سکی۔

اور آج اتنے سالوں کے بعد امامہ کو ایک بار پھر وہی عورت یاد آئی تھی۔ وہ کہیں اسے ملتی تو وہ اسے بتاتی کہ اسے وہم نہیں تھا۔ وہ جس سے پیار کرتی تھی۔ وہ اس سے چھن جاتا تھا۔

سالار کی آنکھ رات کے کسی پل کھلی تھی۔ امامہ برابر کے بستر میں نہیں تھی۔ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بستر کی طرف پڑے ہوئے صوفے پر۔ اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کر دیا۔ وہ اٹھی نہیں تھی۔ صوفے پر سر جھکائے۔ وہ کمرے میں روشنی ہونے پر بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ ایک گہرا سانس لے کر سالار نے اپنی آنکھوں کو رگڑا تھا پھر وہ اٹھ کر اس کے برابر صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔

"تمہیں پتا ہے میں کیوں تمہیں یہ سب نہیں بتانا چاہتا تھا۔ صرف اسی وجہ سے؟ تم مجھے بہت پریشان کر رہی ہو۔" وہ دھیمی آواز میں اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ اسے ڈانٹنا چاہتا تھا۔ ڈانٹ نہیں سکا۔۔۔

اس نے سر اٹھا کر سالار کا چہرہ دیکھا۔ "مجھے نیند نہیں آرہی۔"

"تم سونے کے لیے لیٹو گی تو نیند آجائے گی۔" اس نے جواباً کہا۔

وہ چپ چاپ اس کے پاس سے اٹھ کر بیڈ پر جا کر لیٹ گئی۔ اس کی اس اطاعت نے سالار کو بری طرح کاٹا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ بجھا کر وہ بھی سونے کے لیے بستر پر لیٹ گیا تھا لیکن نیند اب اس کی آنکھوں سے بھی غائب ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

بیماری کے انکشاف کے اثرات اسے اگلے دن ہی پتا چلنے شروع ہو گئے تھے۔۔۔ بورڈ آف گورنرز کے پانچوں ارکان کے بعد باری باری بہت سے ایسے لوگوں نے اسے میسجز اور کالز کرنی شروع کر دی تھیں جو ان کے اس مالیاتی نظام سے وابستہ ہونے کے لیے فنانشل امداد دے رہے تھے۔ وہ سالار سکندر کی زندگی کے حوالے سے تشویش کا شکار نہیں تھے' وہ اس ادارے میں اپنی انویسٹمنٹ کے حوالے سے عدم تحفظ کا شکار ہو گئے تھے' جس سے وہ سالار سکندر کے نام کی وجہ سے جڑنا چاہتے تھے۔

یہ سالار سکندر اور اس کے ساتھیوں کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ اس اسٹیج پر اس طرح کی عدم اعتمادی ان کے ادارے کی ساکھ کے لیے بے حد نقصان دہ تھی۔

اگلے چند دن سالار سکندر نے دنیا جہان سے مافیہا صرف کالز' ای میلز' میسجز کے ساتھ گزارے تھے۔۔۔

کچھ بڑے سرمایہ کار پیچھے ہٹ گئے تھے اور وہ واپس تب آنے پر تیار تھے جب انہیں ان کا ادارہ کام کرتا اور کامیاب ہوتا نظر آتا۔ باقی کے سرمایہ کاروں کو روکنے کے لیے جان توڑ کوششوں کی ضرورت تھی۔ جو وہ سب کر رہے تھے۔

ایک capitalistic (سرمایہ دارانہ) دنیا کے اندر روپیہ صرف روپے کے پیچھے بھاگتا ہے۔ اور روپیہ سانپ کی طرح ڈرپوک ہوتا ہے۔ ایک ہلکے سے خطرے کی آہٹ پر بھی بھاگ جاتا ہے۔ دوستیاں، تعلقات، اعتماد، کوئی چیز اس کے پاؤں کی زنجیر نہیں بنتی سوائے ایک چیز کے۔ تحفظ اور ترقی۔ وہ صرف وہاں ٹکتا ہے جہاں پھل پھول سکتا ہے۔ دن دگنی رات چوگنی ترقی کر سکتا ہے۔ وہاں نہیں جہاں اس کی ترقی کو خدشات لاحق ہو جائیں۔

سالار سکندر نے زندگی کا ایک بڑا حصہ مالیاتی اداروں اور انویسٹمنٹ بینکنگ میں گزارا تھا۔ وہ سرمایہ کاروں کی نفسیات اور ذہنیت کو اپنے بائیں ہاتھ کی طرح جانتا تھا۔ وہ کب درخت پر بیٹھے پرندوں کی طرح اڑتے ہیں اور کب دانے کے پیچھے آتے ہیں یہ کوئی اس سے بہتر نہیں جان سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنے موجودہ آقاؤں کی کرم نوازی کی وجہ سے ایک بے حد مشکل صورت حال میں پھنس چکا تھا۔

اگلے چند ہفتے ان ابتدائی چند دنوں سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہوئے تھے۔ ان کے سارے بڑے سرمایہ کار انہیں چھوڑ چکے تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ان کا ستر فیصد فنانس ان کے پاس آنے سے بھی پہلے ختم ہو گیا تھا تیس فیصد فنانس وہ تھا جو بورڈ آف ڈائریکٹرز کی اپنی کنٹری بیوشن تھی اور وہ سارا ان انویسٹرز کی شکل میں موجود تھا جو وہ ان پانچ سالوں میں اپنے ادارے کے لیے دنیا کے مختلف حصوں میں کرتے آئے تھے۔ ان کے پاس رننگ کیپٹل بہت کم تھا۔ وہ کیپٹل جس کی بنیاد پر انہوں نے بین الاقوامی طور پر اس ادارے کا آغاز کرنا تھا۔ ایک بڑے سرمایہ کار کے معاہدہ کر کے بھاگ جانے کا مطلب تھا کہ ہزاروں دوسرے پوٹینشل انویسٹر آپ کو اپنے ریڈ زون میں رکھ دیں۔ جانے والا بڑا انویسٹرز کئی ممکنہ آنے والے انویسٹرز کو بھی پہلے ہی غائب کر دیتا ہے۔ پانچ سال میں دن رات کی جانے والی محنت چند ہفتوں میں دھوئیں کی طرح اڑ گئی تھی۔ وہ اگر پھر سے زیرو پر نہیں بھی آئے تھے تب بھی ان کی ساکھ کی کرتوٹی تھی۔

اور اس سارے کرائسس نے سالار کو ایک اور چیز سکھائی تھی۔ کوئی بھی ادارہ فرد واحد پر کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔ ون مین شو اس ون مین کے ختم ہونے کے بعد آدھی سیٹوں کے تماشائی بھی کھینچ کر نہیں لا سکتا۔ یہ بہت بڑا سبق تھا جو سالار سکندر نے بہت بڑی قیمت ادا کر کے حاصل کیا تھا۔

وہ زندگی میں بہت کم مایوس ہوا تھا بہت کم اسے یہ لگا تھا کہ وہ کچھ نہیں کر سکے گا اور یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اسے بیٹھ کر یہ سوچنا پڑ گیا تھا کہ کیا یہ سب کچھ ایسا تو نہیں ہے جو وہ نہیں کر سکتا۔ کیا وہ اپنی صلاحیتوں اور استطاعت سے بڑا خواب دیکھ رہا تھا؟ کیا اس کی فیملی کے لوگ اور احباب ٹھیک تھے جب وہ اسے اس راستے پر چلنے سے روک رہے تھے۔ وہ نہیں سمجھ پایا کہ وہ اتنا منفی ہو کر کیوں سوچ رہا تھا۔ شاید اس کی ایک بنیادی وجہ وہ بیماری تھی جس کا وہ شکار تھا جو اسے زندگی میں پہلی بار زندگی کے آخری لمحے کے بارے میں ٹک ٹک کرتے ہوئے بتا رہی تھی۔ سات سے دس سال۔ اسے جو بھی کرنا تھا۔ اس سے بھی کم مدت میں کرنا تھا۔ لیکن دھاگے کا سرا کہاں تھا؟ اور سرا پکڑا کیسے جائے فوری طور پر یہ سمجھ سے باہر تھا۔



"اگر میں تمہیں ایک بیڈ نیوز بتاؤں تو کیا تم اپ سیٹ ہو جاؤ گی؟" اگلے دن اسکول ختم ہونے کے بعد گاڑی کے انتظار میں کھڑے حمین سکندر نے رئیسہ سے کہا۔ عنایہ اور جبریل کو پک کرنے سے پہلے ڈرائیور ان دونوں کو

پک کرتا تھا پھر اسی سکول کے ایک دوسرے کیمپس سے جبریل اور عنایہ کو۔
ایک لمحے کے لیے رئیسہ کی سمجھ میں نہیں آیا وہ حمین کے اس سوال کا کیا جواب دے۔ جبریل کے خوب سمجھانے بجھانے اور دھمکیوں کے باوجود وہ کوئی خبر اتنی ہی دیر ہضم کر سکتا تھا جتنی دیر اس نے ہضم کر لی تھی۔ اور گھر میں رئیسہ وہ سب سے پہلا فرد ہوتی تھی جسے وہ ہر بریکنگ نیوز دیتا تھا کیونکہ گھر میں رئیسہ کے علاوہ اسے کوئی اس جیسا سامع نہیں ملتا تھا جو اس کی ہر بات کو نہ صرف دلچسپی سے سنتا رہتا بلکہ آمنّا و صدقنا کہہ کر اس پر یقین بھی کر لیتا۔
گھر میں اب بچوں کے دو گروپ تھے۔ جبریل اور عنایہ۔ سوبر اور سمجھ دار۔ اور حمین اور رئیسہ ان دونوں کو کس کیٹگری میں ڈالا جاتا یہ مشکل تھا کیونکہ وہ دونوں ایک کیٹگری میں نہیں آتے تھے حمین بے حد شرارتی اور باتونی تھا۔ سوالات کی بھرمار کے ساتھ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بے انتہا ذہین۔ پڑھائی اس کا مسئلہ نہیں تھا اس کے ماں باپ کا مسئلہ تھا۔ رئیسہ اس کا الٹ تھی۔ خاموش۔ سوبر۔ سوچ سمجھ کر بولنے والی۔ لیکن اوسط ذہانت کے ساتھ۔ وہ فطرت اور عادات کے حساب سے جبریل اور عنایہ کے گروپ میں زیادہ بہتر طور پر ایڈجسٹ ہوتی لیکن ذہانت کے حساب سے اسے کہیں رکھنا ہوتا تو وہ دونوں ہی گروپس میں نہیں رکھی جا سکتی تھی۔
سالار اور امامہ کے تینوں بچوں کے آئی کیو میں انیس بیس کا فرق ہو سکتا تھا مگر ایک اور بیس کا نہیں لیکن ذہانت اور عادات کا فرق ہونے کے باوجود حمین سکندر کے ساتھ اس کا بلا کا اتفاق تھا۔ وہ دونوں گھر کے چھوٹے تھے اور دونوں اکٹھے رہنا پسند کرتے تھے۔ جبریل اور عنایہ کی طرح۔
رئیسہ اس کی بات آدھی سمجھی تھی آدھی نہیں سمجھی تھی لیکن اسے تجسس ہوا تھا۔
"نہیں میں اپ سیٹ نہیں ہوں گی۔" اس نے چند لمحے سوچ کر کہا۔
"گریٹ۔" حمین کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ ایک گناہ سے بھی بچنے والا تھا اور وہ اپنے دل و دماغ کا بوجھ بھی ہٹا سکتا تھا۔
"تمہیں پتا ہے ممی اور بابا آج کل اپ سیٹ کیوں ہیں؟"
وہ اب بڑے ڈرامائی انداز میں سالار اور امامہ کی ناشتے کی میز پر "پراسرار" خاموشی کا راز فاش کرنے والا تھا۔
"کیوں۔۔۔" رئیسہ کا تجسس بڑھا۔
"دادا کو برین ٹیومر ہو گیا ہے۔"
رئیسہ نے بغیر تاثر کے اس کا چہرہ دیکھا۔ "یہ ایک بیماری ہے، لیکن وہ اس سے مریں گے نہیں۔" اس نے رئیسہ کو سمجھایا۔ رئیسہ کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آئی تھی۔
"اوکے۔" اس نے حسب عادت حمین کی بات کے جواب میں کہا اور فراک کی جیب میں پڑی ہوئی وہ چاکلیٹ نکال کر کھانے لگی جو کچھ دیر پہلے حمین نے اسے تھمائی تھی۔
"یہ بہت بڑا سیکرٹ ہے، بلکہ ٹاپ سیکرٹ۔" حمین اسے زیادہ متاثر نہ دیکھ کر اسے متاثر کرنے کی کوشش کی۔
رئیسہ نے چاکلیٹ چباتے چباتے رک کر اسے دیکھا۔ "واؤ۔" اس نے متاثر ہونے کی کوشش کی اور حمین بری طرح تپا۔
"میں نے تمہیں ایک بری خبر سنائی ہے اور تم کہہ رہی ہو واؤ۔"
رئیسہ چاکلیٹ کھانا بھول گئی۔
"مجھے کیا کہنا تھا؟" وہ خائف ہو گئی تھی۔

حمین دونوں ہاتھ کمر پر رکھے بے حد خفا انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
"تمہیں کہنا چاہیے تھا۔ اوہ! مائی گاڈ!" حمین نے اپنا معمول کا جملہ پورے تاثرات کے ساتھ اسے رٹانے کی کوشش کی۔
"اوہ! مائی گاڈ۔" رئیسہ نے اس جملے اور اس کے تاثرات کی نقل اتارنے کی بھرپور کوشش کی۔
"ہاں بالکل اسی طرح۔" حمین نے اس کی پرفارمنس سے مطمئن ہوتے ہوئے جیسے اسے سراہا "تم اب کسی سے بھی یہ سیکرٹ شیئر نہیں کرو گی۔ اوکے؟" اس نے رئیسہ کو تاکید کی "یاد رکھو لوگوں کو اپ سیٹ کرنا گناہ ہے۔" وہ اسے ہمیشہ کی طرح سبق دے رہا تھا۔
رئیسہ نے ہمیشہ کی طرح سر ہلا دیا۔ حمین کی بات آدھی اس کی سمجھ میں آئی تھی آدھی نہیں۔۔ لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ حمین اسے اتنی لمبی چوڑی نصیحت نہ بھی کرتا تو بھی رئیسہ اس گھر میں ان چاروں میں سب سے کم بولنے والی تھی۔۔ وہ حمین سے بے حد قریب ہونے کے باوجود اس سے بھی گفتگو کا آغاز خود نہیں کر پاتی تھی۔ وہ شرماتی تھی جھجکتی تھی یا عدم اعتماد کا شکار تھی لیکن رئیسہ سالار کے لیے گفتگو کا آغاز کرنا ایک مشکل کام تھا۔ وہ صرف بات کا جواب دیتی تھی۔ اکسانے پر سوال کرتی تھی لیکن اگر کوئی اسے مخاطب نہ کرتا تو وہ گھنٹوں خاموش بیٹھی رہ سکتی تھی۔ اپنے کام یا کسی بھی اس کھلونے میں مگن جس کے ساتھ وہ کھیل رہی ہوتی۔
"کار آ گئی۔۔" حمین نے اسے تاکید کرنے کے بعد گیٹ سے نمودار ہونے والے ڈرائیور کو دیکھتے ہوئے پرجوش انداز میں اعلان کیا اور ساتھ اسے متنبہ کیا۔
"یاد رکھو یہ ایک سیکرٹ ہے۔" حمین نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر ایک انگلی رکھی۔۔ پھر اسی ہتھیلی کو مٹھی کی شکل میں بند کیا۔ رئیسہ نے بیگ اٹھانے سے پہلے اس کے ایکشن کی نقل کی پھر حمین نے high five کے لیے ہوا میں ہاتھ بلند کیا۔ رئیسہ نے بھی بے حد ایکسائیٹڈ انداز میں اپنے ہاتھ کا پنجہ اس کے ہاتھ سے ٹکراتے ہوئے high Five کیا۔



"سالار، کچھ دیر کے لیے یہ سب چھوڑ دو۔" امامہ نے اس رات بالآخر اس سے کہا تھا۔
وہ بہت دیر تک فون پر کسی سے بات کرتا رہا تھا اور ڈنر کے دوران آنے والی اس کال کو لینے کے بعد ڈنر بھول گیا تھا۔ امامہ بہت دیر تک ٹیبل پر اس کا انتظار کرنے کے بعد وقفے وقفے سے اسے دیکھنے بیڈ روم میں آتی رہی لیکن اسے مسلسل فون کال میں مصروف دیکھ کر اس نے بالآخر بچوں کو کھانا کھلا دیا اور اب جب وہ بالآخر بیڈ روم میں آئی تو سالار فون کال ختم کر رہا تھا۔
کھانے کا پوچھنے پر اس نے انکار کر دیا تھا۔ وہ صوفہ پر بیٹھا اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنی آنکھیں مسل رہا تھا۔ اور بے حد تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہ جس کرائسس میں تھا وہ اس سے بے خبر نہیں تھی لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ تسلی ہی دے سکتی تھی لیکن اسے اندازہ تھا کہ اس کی تسلیاں طفل تسلیوں سے زیادہ کچھ نہیں۔۔ سالار سکندر کی راتوں کی نیند اگر حرام ہوئی تھی تو اس کی وجوہات یقیناً سنگین ہی تھیں۔
وہ اور سالار کئی دنوں سے آپس میں بہت کم بات چیت کر پا رہے تھے۔ جو بات چیت ہوتی بھی تو وہ بھی صرف اس کے علاج کے حوالے سے اور امامہ کی زندگی کا مرکز صرف اس کی زندگی ہی رہ گیا تھا۔ وہ کوشش اور جدوجہد کے باوجود اپنے ذہن کو کسی اور چیز میں الجھا نہیں پاتی تھی اور سالار کے پاس کتنا سا میں اپنے ان آخری مہینوں میں

اپنی بیماری کے بارے میں روز بیٹھ کر بات کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔
"کیا چھوڑ دوں؟" وہ آنکھیں مسلتے ہوئے چونکا اور اس کے طرف متوجہ ہوا۔
"کام۔"
"اچھا!" وہ ہنس پڑا۔
"سب کچھ چھوڑ کر صرف اپنے علاج پر توجہ دو۔ اپنی صحت 'اپنی زندگی پر۔ ہمارے لیے صرف وہ اہم ہے۔" وہ اب جیسے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔
"امامہ! میرے پاس چوائس نہیں ہے اور میرے پاس وقت بھی نہیں ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک کام کروں۔" وہ اس کی بات سن کر کچھ لمحوں کے لیے جیسے کچھ بول ہی نہیں پائی۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا تھا۔
"میں ہر طرح سے مشکل میں ہوں۔ آج کل برے وقت میں نے پہلے بھی دیکھے ہیں لیکن ایسا برا وقت نہیں کہ جس چیز کو بھی ہاتھ لگاؤں ریت ہو جائے۔"
وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔ امامہ کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ وہ کئی ہفتوں سے لگاتار رو رہی تھی۔ اس کے باوجود آنکھوں کا پانی ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کنواں ہی بن گئی تھیں۔
"گناہ گار تو ہوں میں۔ ہمیشہ سے ہوں۔ گمان اور غرور تو کبھی نہیں کیا میں نے۔ کیا بھی تو توبہ کر لی۔ لیکن پتا نہیں کیا گناہ کر بیٹھا ہوں کہ یوں پکڑ میں آیا ہوں۔"
"آزمائش ہے سالار۔ گناہ کی سزا کیوں سمجھ رہے ہو؟" امامہ نے اس کی کلائی پر ہاتھ رکھا۔
"کاش آزمائش ہی ہو اور ختم ہو جائے نہ ختم ہونے والی سزا نہ ہو۔" وہ بڑبڑایا تھا۔
"تمہارے پاس کتنی سیونگز ہیں؟" اس نے بات کرتے کرتے موضوع بدل دیا۔
"میرے پاس؟" وہ ابھی۔ "یہاں نہیں۔ پاکستان میں بینک میں کافی رقم ہوگی۔ شادی سے پہلے کی بھی تھی' بعد میں بھی جمع کرواتی رہی لیکن مجھے اماؤنٹ نہیں پتا۔ تمہیں ضرورت ہے کیا؟" اس نے یک دم سالار سے پوچھا۔
"نہیں۔ مجھے ضرورت نہیں ہے لیکن تمہیں شاید اب اسے استعمال کرنا پڑے بچوں کے لیے۔ یہاں سے پاکستان جاؤ گے تو وہاں کتنا عرصہ پاپا کے پاس تمہیں بچوں کے ساتھ ٹھہرنا پڑے' مجھے ابھی اندازہ نہیں۔ چند مہینے ٹھہرنا پڑتا ہے یا چند سال' مجھے نہیں پتا۔" وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔
"وہاں پاپا کے پاس بچوں کی تعلیم کم از کم متاثر نہیں ہوگی۔ امریکہ میں فی الحال تم سب کو رکھنا افورڈ نہیں کر سکتا' خاص طور پر اب جب میری جاب ختم ہو رہی ہے اور میں اپنے ادارے کو لانچ کرنے کے پروسس میں بھی بے حد مسائل کا شکار ہوں اور اس پر یہ ورلڈ بینک کی جاب کے ساتھ میڈیکل انشورنس بھی ختم ہو جائے گی جو امریکہ میں میری ہیلتھ انشورنس ہے وہ کینسر ٹریٹمنٹ کور نہیں کرتی۔"
سالار نے ایک گہرا سانس لیا۔
"اس لیے میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا کہ میں کیا چیز کروں اور کیا نہیں۔"
"سالار! تم اس وقت صرف ایک چیز پر دھیان دو۔ اپنے آپریشن اور علاج پر۔ باقی ساری چیزیں ہو جائیں گی' بچوں کی تعلیم۔ تمہارا ادارہ۔ سب کچھ۔ اور پیسوں کے بارے میں پریشان مت ہو۔ بہت کچھ ہے میرے پاس جو بیچا جا سکتا ہے۔"
سالار نے اسے ٹوک دیا۔ "نہیں کوئی بھی چیز میں اب نہیں بیچوں گا۔ تمہارے پاس یہ سب کچھ ہونا چاہیے۔ میں گھر نہیں دے سکا تمہیں۔ تو کچھ تو ہونا چاہیے تمہارے پاس کہ۔"
امامہ نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اب اس سے آگے کچھ مت کہنا۔ مجھ سے یہ مت کہنا کہ میں

مستقبل کا سوچوں۔۔۔ یہ سب کچھ میرے پاس ہو اور تم میرے پاس نہ ہو تو میں مستقبل کا کیا کروں گی۔"
پانی اس کے گالوں پر کسی آبشار کی طرح گر رہا تھا۔
"مستقبل کچھ بھی نہیں ہے سالار۔۔۔! جو ہے بس حال ہے۔ آج ہے آنے والا کل نہیں۔۔۔ پڑھ لکھ جائیں گے بچے۔۔۔ بہت اعلیٰ اسکولز میں نہیں بھی تو بھی۔۔۔ میں نے سوچنا چھوڑ دیا ہے کل کے بارے میں۔" وہ رو رہی تھی۔
"تمہیں پتا ہے امامہ! مجھے کس چیز کا رنج سب سے زیادہ ہے؟"
"سالار نے بات بدلنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے آنسوؤں کو روکنے کے لیے وہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ "تم ٹھیک کہتی تھیں کہ میں نے اپنی زندگی کا بہترین وقت سود پر کھڑے اداروں کے لیے کام کرتے کرتے گزار دیا۔ صرف کچھ سال پہلے میں نے کام کرنا شروع کیا ہوتا اپنے ادارے کے لیے تو آج یہ ادارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا ہوتا۔۔۔ مجھے یہ بیماری تب ہوئی ہوتی تو مجھے یہ رنج نہ ہوتا کہ میں اپنے کیے کا ازالہ نہیں کر سکا۔ یہ بہت بڑا پچھتاوا ہے میرا۔ جو کسی طوق کی طرح میری گردن میں لٹکا ہوا ہے۔" وہ بے حد رنجیدہ تھا۔
"تم کیوں سوچ رہے ہو ایسے۔ تم کوشش تو کر رہے ہو۔۔۔ محنت تو کر رہے ہو۔ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش تو کر رہے ہو۔۔۔" وہ اس کی باتوں پر جیسے تڑپ اٹھی تھی۔
"ہاں لیکن اب بہت دیر ہو گئی ہے۔"
"تم امید چھوڑ بیٹھے ہو؟"
"نہیں۔ امید تو نہیں۔ چھوڑی لیکن۔۔۔" وہ بات کرتے کرتے ہونٹ کاٹنے لگا "مجھے کبھی یہ لگا ہی نہیں تھا کہ وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ جب تک سب کچھ ٹھیک رہتا ہے۔ ہمیں لگتا ہے ہمارے پاس بہت وقت ہے۔ ہر کام کر لیں گے۔۔۔ ہر کام ہو جائے گا۔۔۔ ہم وہ سارے کام پہلے کر لینا چاہتے ہیں جو ہمارے نفس کو پسند ہیں وہ سارے کام زندگی کے آخری حصے کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔ میں بھی مختلف نہیں تھا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔"
سالار اپنے ہاتھ مسل رہا تھا بے حد رنج کے عالم میں۔
"قرآن کہتا ہے کہ جب انسان جزا سزا کے لیے روز قیامت اللہ کے سامنے پیش ہو گا تو وہ پکار کر کہے گا کہ اے میرے رب مجھے ایک بار دوبارہ دنیا میں لوٹا دے۔ ایک موقع اور دے اور اس بار میں تیری اطاعت کروں گا گناہ سے دور رہوں گا۔۔۔ مجھ سے بہتر کوئی یہ سمجھ نہیں سکتا کہ وہ روز قیامت کیسی ہو گی وہ ایک بار پھر دنیا میں لوٹا دینے کی پکار کیسی ہو گی۔ وہ ایک موقع اور مانگنے کی التجا کیا ہو گی۔"
اس کی آواز بھرائی تھی۔
"ایک بار میں نے مارگلہ کی پہاڑی پر ایک درخت سے بندھے آدھی رات میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ وہ مجھے ایک موقع دے کہ میں گناہوں سے تائب ہو جاؤں۔ میں وہ نہ کروں جو کچھ میں کرتا رہا ہوں۔ اللہ نے مجھے موقع دیا اور میرا خیال تھا کہ میں سب گناہوں سے تائب ہو گیا۔ ایسا نہیں تھا۔ میں چھوٹے گناہوں سے تائب ہو کر بڑے گناہوں میں پھنس گیا تھا۔ اب ایک موقع میں اللہ تعالیٰ سے اور مانگنا چاہتا ہوں لیکن مجھ میں ہمت ہی نہیں۔ مجھے اللہ سے بہت شرم آنے لگی ہے۔"
سالار اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے ہنس پڑا تھا۔
"اب میں صرف اللہ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ وہ میری زندگی نہیں صرف مجھے اس کام کی تکمیل کر لینے دے جو میں کرنا چاہتا ہوں اور اگر یہ کام میں نہ کر سکا تو پھر میری دعا ہے کہ یہ کام میری اولاد پایہ تکمیل تک پہنچائے اگر میں

نہ رہا تو پھر تم جبریل کو ایک اکاؤنٹ..."
امامہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کیوں سوچتے ہو تم ایسے۔"
"سوچنا چاہیے امامہ۔"
"تم ہی کرو گے یہ کام سالار... کوئی اور نہیں کر سکے گا... تمہاری اولاد میں سے بھی کوئی نہیں... ہر کوئی سالار سکندر نہیں ہوتا۔"
وہ شاید زندگی میں پہلی بار اعتراف کر رہی تھی۔ اس کے غیر معمولی ہونے کا۔ اس کے خاص ہونے کا۔ اس کے تمام اعترافات اور اظہار ندامت کے باوجود۔ اس کی زندگی کے ہر نشیب و فراز سے واقف ہونے کے باوجود اسے یہ ماننے میں معمولی سا بھی شائبہ نہیں تھا کہ اس کا شوہر عام انسان نہیں تھا۔
سالار نے اس رات اس سے بحث نہیں کی تھی۔ اس کی اپنی ہمت جتنی ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ امامہ کی ہمت اس طرح توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک ہفتے بعد اسے ایک اور چیک اپ اور ٹیسٹ کے لیے امریکہ جانا تھا اور وہ مزید کسی بری خبر کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار بھی کر رہا تھا۔



"ممی! میں آپ کو سیب کاٹ کر لا کر دوں؟"
امامہ جبریل کی بات پر حیران ہوئی تھی گھر کے سامان کی پیکنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور وہ ہر روز تھوڑا تھوڑا سامان پیک کر کے اسٹور کرتی جا رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ گھر کے ایک کمرے میں اسی کام میں مصروف تھی جب جبریل نے اس کا ہاتھ بٹاتے بٹاتے یک دم اس سے کہا تھا۔ امامہ کی حیرانی بجا تھی... پھل کاٹ کر کھلانے کی آفر حمین کی طرف سے "تو نارمل" بات تھی لیکن جبریل اس طرح کے کام نہیں کرتا تھا نہ ہی وہ خود پھل کھانے کا شوقین تھا۔
"نہیں... تم کھانا چاہ رہے ہو تو میں تمہیں کاٹ دوں؟" امامہ نے جواباً اسے آفر کی۔
"نہیں۔" جبریل نے جواب دیا۔ وہ اس کمرے کی کھلی ہوئی وارڈ روب سے کپڑے نکال نکال کر امامہ کے قریب بیڈ پر رکھ رہا تھا جنہیں امامہ ایک بیگ میں رکھ رہی تھی۔ وہ شاید اتنے مہینوں میں پہلا موقع تھا جب امامہ کو تشویش ہوئی تھی۔ اس کے بچے اس کی پریشانی اور تکلیف کو محسوس کرنا شروع ہو گئے تھے اور یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی کئی مہینوں کے بعد اس نے جبریل کو غور سے دیکھا تھا... وہ ایک دو مہینے میں دس سال کا ہونے والا تھا اور وہ دس سال کا ہونے کے باوجود اپنے قد کاٹھ سے دس سال سے بڑا لگتا تھا۔ وہ شکل و صورت میں سالار کی نسبت اس سے زیادہ مشابہت رکھتا تھا اور حمین سالار سے... لیکن اس کے دونوں بیٹوں کی آنکھیں سالار کی طرح تھیں... بڑی چمکتی ہوئی ذہانت سے چمکتی ہوئی... کوئی اگر کسی اور چیز سے نہیں تو آنکھوں سے یہ ضرور پہچان لیتا کہ وہ سالار سکندر کی اولاد تھے۔
"آپ ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟" جبریل نے ماں کی نظریں خود پر مبذول پا کر پوچھا تھا۔ وہ مسکرا دی۔
"تم بڑے ہو گئے ہو۔" جبریل نے کچھ جھینپ کر ماں کو دیکھا پھر ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ ماں سے کہا۔
"تھوڑا سا۔"
"ہاں۔ تھوڑے سے... جلد ہی پورے بڑے بھی ہو جاؤ گے۔" وہ بیڈ پر پڑے کپڑے اٹھاتے ہوئے اس سے بولی۔
"لیکن میں بڑا ہونا نہیں چاہتا۔" بیگ میں کپڑے رکھتے ہوئے امامہ نے اسے کہتے سنا وہ وارڈ روب کی ایک اور

شیلف خالی کر رہا تھا۔

"کیوں؟" اسے اچنبھا ہوا۔

"ایسے ہی۔" اس نے بڑے عام سے انداز میں ماں سے کہا۔

وہ پہلا موقع تھا جب امامہ کو اس کا انداز عجیب الجھا ہوا محسوس ہوا۔ اس گھر میں صرف وہ نہیں تھے جو پریشان تھے۔ ان کی سب سے بڑی اولاد بھی ایسی ہی پریشانی سے گزر رہی تھی لیکن اس پریشانی کی نوعیت کو امامہ تب بوجھ نہیں سکی تھی۔ وہ اسے صرف ایک رد عمل سمجھی تھی۔ جبریل پہلے بھی ماں کے حوالے سے بے حد حساس تھا۔ اسے کوئی بھی پریشانی ہوتی تو وہ سب سے پہلے محسوس کر لیتا تھا۔ پھر وہ ماں سے کریدے بغیر نہیں رہتا تھا۔ یہ اس کی فطرت کا حصہ تھا۔

امامہ نے اس پھل کاٹنے کی آفر کو بھی اسی تشویش کا حصہ سمجھا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ کوئی بھی اسے ان دنوں دیکھ کر یہ اندازہ لگائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ وہ پریشان تھی۔ دنوں میں اس کی گرتی ہوئی صحت، اس کے آنکھوں کے سیاہ حلقے اور اس کی اکثر رونے کی وجہ سے سرخ اور سوجی رہنے والی آنکھیں کسی کو بھی اس کی ذہنی اور جذباتی حالت کا پتا دے سکتی تھیں۔ اس لیے جبریل اگر کوئی اندازہ لگا رہا تھا تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

وہ کچھ الجھتی سوچتی ہوئی اسی طرح سامان پیک کرتی رہی اور وقفے وقفے سے سامان لاکر رکھتے ہوئے جبریل کو دیکھتی رہی پھر جیسے اسے خیال آیا تھا کہ اسے جبریل کو اپنے حوالے سے کوئی تسلی اور دلاسا دینا چاہیے تھا اس کی تشویش کو کم کرنے کے لیے۔

"جبریل! میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اسے یہ جملہ بولتے ہی اس جملے کے بلکے پن کا احساس ہو گیا تھا۔ جبریل نے وارڈ روب کے پاس کھڑے کھڑے یک دم جیسے پلٹ کر ماں کو دیکھا اور پھر بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے پتا ہے۔"

امامہ اس سے نظریں چرا گئی تھی۔ جبریل نے جیسے ماں کا پردہ رکھا تھا۔ وہ ماں کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا نہ ہی اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ کئی دنوں کے بعد ان دونوں کو ایک دوسرے سے بات چیت کا موقع مل رہا تھا۔

ایک بار پھر سے وہ دونوں کام میں مصروف ہو گئے تھے اور تب ہی کام کرتے کرتے امامہ نے پہلی بار کمرے کی خاموشی کو محسوس کیا۔ وہ دونوں اتنی دیر سے کام کر رہے تھے لیکن ان کے درمیان بہت کم جملوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ معمول میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اسے اور جبریل کو جب بھی اکیلے کچھ وقت گزارنے کا موقع ملتا تھا۔ وہ دونوں بہت اچھی گپ شپ کرتے تھے۔ جبریل اسے اسکول کی بہت سی باتیں سناتا۔ اپنے دوستوں کے بارے میں۔ ٹیچرز کے بارے میں۔ وہ باتونی نہ ہونے کے باوجود ایسے مواقع پر ماں سے بہت کچھ شیئر کرتا تھا۔ آج پہلا موقع تھا کہ چھوٹے بہن بھائیوں کی عدم موجودگی میں بھی وہ اتنا خاموش تھا۔

امامہ کی چھٹی حس نے ایک عجیب سا سگنل دیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سب کچھ جانتا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا لیکن ناممکن بھی نہیں تھا۔

"جبریل!"

"جی ممی۔" وہ اس کے مخاطب کرنے پر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ سوال کرتے کرتے رہ گئی۔ کیا پتا یہ اس کا واہمہ ہی ہو وہ واقعی بے خبر ہو اور اگر وہ بے خبر تھا تو اس سے یہ سوال کرنا۔ وہ بات بدل گئی۔

"تمہارا قرآن پاک ختم ہونے والا ہے۔ بس تھوڑے ہی دن میں۔ پھر ماشاء اللہ تم حافظ قرآن ہو جاؤ گے۔ تم نے قرآن پاک سے ابھی تک کیا سیکھا؟" وہ گفتگو کو اس موضوع پر لے آئی جس پر وہ اکثر اس سے بات کرتی تھی۔

وہ اب وارڈ روب کی ایک دراز خالی کرنے والا تھا۔ ماں کے سوال پر کام کرتے کرتے ٹھٹک گیا۔

"بہت ساری چیزیں ہیں۔" اس نے ذرا سا سوچ کر ماں سے کہا۔

"لیکن اگر کوئی ایک چیز ہو جو تمہیں سب سے امپورٹنٹ بھی لگتی ہو اور سب سے اچھی بھی۔۔۔" وہ مطمئن تھی، ان دونوں کے درمیان بات چیت شروع ہو گئی تھی۔

"آپ کو پتا ہے، مجھے کیا چیز سب سے امپورٹنٹ لگتی ہے قرآن پاک میں؟" وہ بھی اب بے حد دلچسپی سے بات کرنے لگا تھا۔

"کیا؟" "Hope۔ (امید)"

امامہ اس کا منہ دیکھنے لگی "کیسے؟" پتا نہیں اس نے کیوں پوچھا تھا لیکن جواب وہ ملا تھا جس نے کسی مرہم کی طرح اس کے زخموں کو ڈھانپا تھا۔

"دیکھیں، سارا قرآن ایک دعا ہے تو دعا hope (امید) ہوتی ہے نا۔۔۔ ہر چیز کے لیے دعا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے نا کہ اللہ ہر مشکل میں ہمیں امید بھی دے رہا ہے۔۔۔ یہ مجھے سب سے اچھی چیز لگتی ہے قرآن پاک کی۔۔۔ کہ ہم کبھی hopeless (نا امید) نہ ہوں۔۔۔ کوئی گناہ ہو جائے تب بھی اور کوئی مشکل پڑے تب بھی۔۔۔ کیونکہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔" اس کا دس سالہ بیٹا بے حد آسان الفاظ میں اسے وہ چیز سمجھا رہا تھا جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی۔۔۔ جو باتیں دانائی نہیں سمجھا پاتی، وہ معصومیت سمجھا دیتی ہے۔

جبریل بات کرتے کرتے رک گیا اس نے امامہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک دیکھی۔

"کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟" اس نے یک دم بے حد محتاط ہوتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

امامہ نے نم آنکھوں اور مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں تم نے بالکل ٹھیک کہا اور تم نے بالکل ٹھیک پڑھی۔"

وہ اب دوبارہ پیکنگ کرنے لگی تھی اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے اور اس سے پوچھتے ہوئے کہ اس نے اور کیا چیز سیکھی قرآن پاک سے۔



"آپ بے حد خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اپنے ٹیومر کے بارے میں اتفاقی طور پر پتا چلا۔ ان اثرات سے پتا نہیں چلا جو ٹیومر کی وجہ سے جسم پر ہونا شروع ہو چکے ہوتے ہیں۔" امریکہ میں ایک اور ٹیسٹ کے بعد وہاں کے ایک بہترین نیورو سرجن نے سالار سکندر کو "خوش خبری" دی تھی جو صرف اسی کے نزدیک خوش خبری تھی۔

"دو ٹیومرز ہیں۔۔۔ ایک بے حد چھوٹے سائز کا اور کچھ بڑا۔۔۔ لیکن دونوں فی الحال اس اسٹیج پر ہیں کہ انہیں سرجری کے ذریعے ختم کیا جا سکتا ہے بغیر کوئی زیادہ نقصان ہوئے۔" وہ اب رپورٹس اور ٹیسٹوں کے بعد اس کے آپریشن کے حوالے سے صورت حال کو ڈسکس کر رہا تھا۔

"اور کم سے کم نقصان کیا ہے، جو ہو سکتا ہے۔" سالار نے اسے ٹوکا۔

"نیورو سرجری ایک خطرناک سرجری ہے۔ جس جگہ یہ دونوں ٹیومرز ہیں وہ جگہ بھی بہت نازک ہے۔۔۔ آپ کا دماغ متاثر ہو سکتا ہے۔۔۔ آپ کی یادداشت متاثر ہو سکتی ہے۔۔۔ اعصاب پر اثر پڑ سکتا ہے۔۔۔ جس کے نتیجے میں آپ کو رعشہ کا مرض لاحق ہو سکتا ہے۔۔۔ کبھی کبھار مرگی کا حملہ ہو سکتا ہے۔۔۔ آپ کی نظر متاثر ہو سکتی ہے۔" وہ ڈاکٹر یوں متعدد اثرات کو دہرا رہا تھا جیسے کسی ہوٹل کا ویٹر مینو کارڈ دیکھے بغیر بھی وہاں ملنے والے کھانوں کی فہرست پڑھ رہا ہو۔

"اور میں سرجری نہ کرواؤں تو؟" سالار نے اس سے پوچھا۔

"کچھ عرصہ آپ سرجری کے بغیر گزار سکتے ہیں کیونکہ میں نے آپ کو بتایا ہے، ابھی ان ٹیومرز نے آپ کے دماغ اور جسم کو متاثر کرنا شروع نہیں کیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد ایسا ہونا شروع ہو جائے گا اس وقت سرجری بے حد خطرناک ہو جائے گی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ یہ چھوٹا ٹیومر فوری طور پر remove کروالیں کیونکہ یہ ذرا بھی بڑا ہوا تو آپ کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو جائے گا... دوسرے ٹیومر کو دواؤں اور دوسرے طریقوں سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بڑھنے کو مکمل طور پر روک دیا جائے۔" ڈاکٹر غیر جذباتی انداز میں اسے بتا رہا تھا۔

وہ بھی غیر جذباتی انداز میں یہ اندازے لگانے میں مصروف تھا کہ وہ سرجری کے بغیر کتنا عرصہ نکال سکتا تھا۔

"چھ سات ماہ... لیکن میں یہ advise نہیں کروں گا کہ آپ اسے زیادہ delay (دیر) کریں... جو میڈیسنز آپ استعمال کر رہے ہیں وہ اس سے زیادہ مدد نہیں کر سکیں گی آپ کی۔" سالار سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

ایک مہینے کے بعد اسے کنشاسا چھوڑ کر پاکستان چلے جانا تھا۔ اس کے تین مہینے کے بعد اسے اپنا ادارہ لانچ کرنا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ اہم اس کے لیے یہ تھا کہ وہ ورلڈ بینک کی جاب چھوڑنے کے فوری بعد ایک بار پھر سے اپنے ادارے کے لیے فنڈز وصول کرنے کی کوشش کرتا اور ایک بار ادارہ لانچ ہو جاتا تو اس کے فوراً بعد وہ سرجری کے لیے کبھی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اسے اس وقت بہت زیادہ کام کرنے کی ضرورت تھی اور وہ بھی سامنے آ کر... وہ غائب نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا دھچکا ہوتا اس کے ادارے کے لیے خاص طور پر تب اگر خدانخواستہ اس کی سرجری ٹھیک نہ رہتی... وہ چھ سات ماہ کے بعد سرجری نہیں کروا سکتا تھا اور وہ فوری طور پر سرجری کروانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

تین دن کے بعد کنشاسا واپس آنے پر اس نے امامہ کو یہ ساری صورت حال بتا دی تھی۔ وہ اس کے مخمصے اور الجھن کو سمجھ پا رہی تھی مگر کوئی حل وہ بھی اسے نہیں دے پا رہی تھی۔

اور حل ایک بار پھر جبریل نے ہی دیا تھا۔ سالار اس رات اتفاقی طور پر کسی کام سے لاؤنج میں نکلا تھا جب اس نے دروازہ کھولتے ہی جبریل کو ڈیسک ٹاپ کے سامنے بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ سالار کے یک دم رات گئے وہاں آنے پر اس نے برق رفتاری سے وہ سب کچھ بند کرنا شروع کیا تھا جو سائٹس وہ کھولے بیٹھا تھا۔ مگر وہ کمپیوٹر بند نہیں کر سکا تھا۔

"تم کیا کر رہے ہو جبریل؟" سالار نے لاؤنج کے وال کلاک پر دو بجے کا وقت دیکھا تھا۔

"کچھ نہیں بابا مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں کارڈز کھیل رہا تھا۔" جبریل نے ڈیسک ٹاپ پر شٹ ڈاؤن کو کلک کرتے ہوئے باپ سے کہا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے جیسے کھڑے ہوتے ہوئے ڈیسک ٹاپ کو اپنے عقب میں چھپا لیا تھا یوں جیسے اسے خدشہ تھا کہ باپ تاریک سکرین میں سے بھی یہ بوجھ لے گا کہ وہ کیا کر رہا تھا۔

وہ جواب اگر حمین دیتا تو سالار کی سمجھ میں آ سکتا تھا لیکن جبریل کی زبان سے وہ جواب بے حد غیر معمولی تھا۔ وہ اس کے بچوں میں سب سے زیادہ نظم و ضبط کا پابند تھا۔ آدھی رات کو ڈیسک ٹاپ پر بیٹھ کر کارڈز کھیلنے والا بچہ نہیں تھا۔

سالار نے بے حد نارمل گفتگو کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ کر ڈیسک ٹاپ آن کر لیا تھا۔ جبریل کا رنگ فق ہو گیا۔

"نیند کیوں نہیں آ رہی تمہیں؟" سالار نے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے اپنے بیٹے کو دیکھا جو اس کے اتنا قریب کھڑا تھا کہ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک سکتا تھا اور وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کا بیٹا گھبرایا ہوا تھا۔ تو انٹرنیٹ پر وہ کون سی ایسی چیزیں دیکھ رہا تھا کہ اس کے چہرے کا رنگ یوں فق ہو گیا تھا۔

سالار کے اپنے پیروں کے نیچے سے بھی اس وقت زمین نکل گئی تھی۔ یہ تو پتا تھا اسے کہ وہ بیٹوں کا باپ تھا اور اس کے بیٹے بڑے ہو رہے تھے اور کبھی نہ کبھی ان کی بلوغت کے دوران اسے ایسی ناخوشگوار صورت حال کا سامنا

بھی کرنا پڑ سکتا تھا۔ وہ پرانی سوچ اور اقدار رکھنے والا باپ نہیں تھا۔ جس کے پاس غلطی کی گنجائش ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ لبرل تھا۔ اس کے باوجود وہ عمل گیا تھا کیونکہ اس کا بیٹا ابھی صرف دس سال کا تھا اور حافظ قرآن بن رہا تھا۔

"پتا نہیں۔" جبریل نے اس کی بات کا مختصر جواب دیتے ہوئے کمر کے پیچھے ہاتھ باندھ لیے۔ اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو باپ کی نظروں سے چھپانے کے لیے اس سے زیادہ اچھا طریقہ کوئی اور نہیں تھا۔ باپ یہ ظاہر نہیں کر رہا تھا کہ وہ اس پر شک کر رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس ڈیسک ٹاپ کو آن کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا تھا۔

"تم روز دیر سے سوتے ہو؟" سالار نے اگلا سوال کیا۔

"جی۔" جبریل نے اب جھوٹ نہیں بولا تھا۔

"روز نیند نہیں آتی اور ڈیسک ٹاپ پر کارز کھیلتے ہو؟" سالار نے اگلا سوال اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کیا تھا۔

"جی۔" اس نے جیسے بالکل ہی ہتھیار ڈال دیے تھے۔

ڈیسک ٹاپ آن ہو چکا تھا۔ سالار ہوم پیج کھول چکا تھا۔ مزید کوئی سوال کیے بغیر اس نے وزٹ کیے جانے والے پیجز اور سائٹس کی ہسٹری کھول لی تھی، وہاں گیمز کا نام شامل نہیں تھا مگر ایک سرسری نظر نے بھی سالار کو منجمد کر دیا تھا۔ اس کا بیٹا جو وزٹ کر رہا تھا وہ اسے اس سے چھپانے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔

oligodendroglioma — وہ ایک سرسری نظر میں بھی ان سارے پیجز میں چمکنے والا یہ لفظ پہچان سکتا تھا۔ وہ ان میں سے کسی پیج کو کلک کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ اس نے گردن موڑ کر جبریل کو دیکھا جس کا سانس رکا ہوا اور رنگ فق تھا۔ "تم میری بیماری کے بارے میں جانتے ہو؟"

سوال کیے بغیر بھی وہ اس سوال کا جواب جانتا تھا۔ جبریل کی آنکھیں سیکنڈز کے ہزارویں حصے میں پانی سے بھری تھیں اور اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایک عجیب خاموشی کا وقفہ آیا تھا جس میں باپ اور بیٹا ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے پھر سالار نے اپنے اس دس سالہ بیٹے کو ہاتھ بڑھا کر اپنے گلے سے لگاتے ہوئے گود میں بٹھا لیا۔

جبریل کے آنسو گالوں پر بہنے لگے تھے۔ سالار نے اسے بچپن میں تو کبھی روتے دیکھا تھا لیکن اب بہت عرصے سے نہیں۔ وہ اسے پچھلے کچھ عرصے سے "بڑا" سمجھنے لگا تھا اور وہ بڑا اب چھوٹے بچوں کی طرح اس کی گود میں منہ چھپا کر رو رہا تھا۔ اتنے مہینوں سے وہ راز وہ اس کی معصومیت کو گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ آج وہ افشا ہو گیا تھا۔

"بابا... بابا" وہ اس کے سینے سے لگا ہوا سسک رہا تھا۔

"I don't want you to die." (میں آپ کو مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا) اور یہی وہ لمحہ تھا جب سالار سکندر کے دل سے ہر خوف ختم ہو گیا تھا۔ اسے آپریشن کروانا تھا۔ فوری طور پر۔ وہ اپنے خاندان کو اس طرح موت اور زندگی کی امید کے درمیان لٹکا نہیں سکتا تھا۔ جو بھی ہونا تھا ہو جانا چاہیے تھا۔

"او کے۔ I won't۔" اس نے اپنے بیٹے کا سر چومتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ناشتے کی میز پر امامہ نے جبریل کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھی تھیں جو سلام کر کے سالار یا امامہ سے نظریں ملائے بغیر آ کر کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟"

امامہ نے اس کا ماتھا چھو کر جیسے ٹمپریچر معلوم کرنے کی کوشش کی۔

"جی ممی ٹھیک ہوں۔" جبریل کچھ گھبرایا۔ نظریں اٹھائے بغیر اس نے پلیٹ میں پڑا آملیٹ چھری اور کانٹے سے کاٹنے کی کوشش کرتے ہوئے جیسے امامہ کی توجہ اپنے چہرے سے ہٹانے کی کوشش کی۔

چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے سالار نے بھی اسی لمحے جبریل کو دیکھا تھا لیکن کچھ کہا نہیں۔

"تم جاگتے رہے ہو کیا ساری رات؟" امامہ کو اس کی آنکھیں ابھی بھی تشویش میں مبتلا کر رہی تھیں۔

"نہیں ممی! یہ بہت رویا ہے۔"

اس سے پہلے کہ جبریل کوئی اور بہانہ بنانے کی کوشش کرتا' حمین نے سلائس کا کونا دانتوں سے کاٹتے ہوئے بے حد اطمینان سے جبریل کو جیسے بھرے بازار میں ننگا کر دیا۔ کم از کم جبریل کو ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ ٹیبل پر موجود سب لوگوں کی نظریں بیک وقت جبریل کے چہرے پر گئیں' وہ جیسے پانی پانی ہوا۔

ایک بھی لفظ کہے بغیر امامہ نے سالار کو دیکھا' سالار نے نظریں چرائیں۔

سلائس کے کونے کترتا ہوا حمین' بے حد اطمینان سے' رات کے اندھیرے میں بستر میں چھپ کر بہائے گئے ان آنسوؤں کی تفصیلات کسی کمنٹری کرنے والے کے انداز میں بغیر رکے بتاتا چلا جا رہا تھا۔

"جبریل روز روتا ہے۔ اور اس کی آوازوں کی وجہ سے میں سو نہیں پاتا۔ اور جب میں اس سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ جاگ رہا ہے تو وہ جواب نہیں دیتا۔ ایسے ظاہر کرتا ہے جیسے وہ سو رہا ہے۔ مگر مجھے......"

ناشتے کی میز پر حمین کے انکشافات نے ایک عجیب سی خاموشی پیدا کر دی تھی۔

"اور ممی مجھے پتا ہے کہ یہ کیوں روتا ہے۔"

حمین کے آخری جملے نے امامہ اور سالار کے پیروں کے نیچے سے نئے سرے سے زمین کھینچی تھی۔

"لیکن میں یہ بتاؤں گا نہیں کیونکہ میں نے جبریل سے پرامس کیا ہے کہ میں کسی سے اس کو شیئر نہیں کروں گا۔ میں کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔"

حمین نے اعلان کرنے والے انداز میں ایک ہی سانس میں انہیں چونکایا اور دہلایا۔ سالار اور امامہ دونوں کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا رد عمل ظاہر کریں۔ خاموش رہیں۔ حمین کو کریدیں۔ جبریل سے پوچھیں۔ کریں کیا؟ اور جانیں کیا۔

"میں تو نہیں روتا۔"

حمین کے خاموش ہونے کے بعد ماں باپ کو دیکھتے ہوئے جبریل نے حلق میں پھنسی ہوئی آواز کے ساتھ جیسے اپنا پہلا دفاع کرنے کی کوشش کی اور حمین نے اس پہلی کوشش کو پہلے ہی وار میں زمین بوس کر دیا۔

"اوہ مائی گاڈ! اب تم جھوٹ بھی بول رہے ہو۔"

"تم حافظ قرآن ہو کر جھوٹ بولتے ہو۔"

سلائس کا آخری بچا ہوا ٹکڑا ہاتھ میں پکڑے حمین سکندر نے اپنی آنکھوں کو حتی المقدور پھیلایا۔ جبریل پر کچھ اور پانی پڑا۔ اس کا چہرہ کچھ اور سرخ ہوا۔

"ممی! جھوٹ بولنا گناہ ہے نا؟"
حمین نے جیسے ماں سے تصدیق کرنے کی کوشش کی۔
"حمین! خاموش ہو جاؤ اور ناشتا کرو۔" اس بار سالار نے مداخلت کی اور اسے کچھ سخت لہجے میں گھرکا۔ اپنے حواس بحال کرنے کے بعد صورت حال کو سنبھالنے اور جبریل کو اس سے نکالنے کی یہ اس کی پہلی کوشش تھی۔
امامہ اب بھی سرد ہاتھوں کے ساتھ وہاں بیٹھی جبریل کو دیکھ رہی تھی۔ اس لمحے اس نے دعا کی تھی کہ جبریل کچھ نہ جانتا ہو۔ اس کے آنسوؤں کی وجہ وہ نہ ہو جو وہ سمجھ رہی ہے۔ اور حمین۔ اس نے حمین کو کیا بتایا تھا؟
ناشتا ختم کرنے تک سالار نے حمین کو دوبارہ اس کے احتجاج کے باوجود منہ کھولنے نہیں دیا تھا۔
ان چاروں کو پورچ میں کھڑی گاڑی میں بٹھانے اور ڈرائیور کے ساتھ اسکول بھیجنے کے بعد امامہ، سالار کے پیچھے اندر آگئی تھی۔
"جبریل کو میری بیماری کے بارے میں پتا ہے۔"
سالار نے اندر آتے ہوئے مدھم آواز میں اسے بتایا۔ وہ اس کے پیچھے آتے آتے رک گئی۔ پاؤں اٹھانا بھی کبھی دنیا کا مشکل ترین کام بن جاتا ہے، یہ اس لمحے اسے معلوم ہوا تھا۔ کچھ حلق میں بھی اٹکا تھا۔ پتا نہیں وہ سانس تھا یا پھندا۔ تو اس دن وہ اسے ہی تسلیاں دے رہا تھا اور اسے جو لگ رہا تھا کہ شاید جبریل کو کچھ پتا لگ گیا ہے۔ شاید جبریل کچھ پریشان لگ رہا ہے۔ وہ وہم نہیں تھا۔
"رات کو بات ہوئی تھی میری اس سے۔" سالار اسے بتا رہا تھا۔
"کب؟" اس نے بمشکل آواز نکالی۔
"رات گئے۔ تم سو رہی تھیں۔ میں لاؤنج میں کسی کام سے گیا تھا، وہ کمپیوٹر پر برین ٹیومر کے علاج کے بارے میں جاننے کے لیے میڈیکل ویب سائٹ کھولے بیٹھا تھا۔ وہ کئی ہفتوں سے ساری ساری رات یہی کرتا رہا ہے۔ میں نے پوچھا نہیں۔ اسے کس نے بتایا؟ کب پتا چلا؟ لیکن مجھے لگتا ہے اسے شروع سے ہی پتا ہے۔"
وہ اب دوبارہ اسی ڈیسک ٹاپ کو کھولے کرسی پر بیٹھا تھا جو وہ پچھلی رات بھی کھولے بیٹھا رہا تھا۔
"مجھے شک ہے۔ شاید اس نے حمین اور عنایہ کو بھی بتایا ہو۔"
وہ سالار کے عقب میں کھڑی تھی۔ سالار کمپیوٹر کی اسکرین پر ان ویب سائٹ کو بند کر رہا تھا اور ڈیلیٹ کر رہا تھا، جو وہ رات کو نہیں کر سکا تھا۔ امامہ کے حلق میں اٹکی چیز آنسوؤں کے گولے میں بدلی۔
محمد جبریل سکندر کنویں سے زیادہ گہرا تھا۔ وہاں باپ کے ساتھ ایک بار پھر ایک بے آواز تماشائی کی طرح ان کی زندگی کی تکلیف اور اذیت کو جھیل رہا تھا۔ جیسے اس نے کئی سال پہلے اپنی پیدائش سے بھی پہلے امامہ کے وجود کے اندر جھیلی تھی۔ جب وہ وسیم کی موت کے بعد اپنی زندگی کے اس وقت کے سب سے بدترین مرحلے سے گزری تھی۔ وہ بڑوں کا بوجھ تھا، بڑوں کو ہی ڈھونا چاہیے تھا۔ اس کے کندھے اس سے نہیں جھکنے چاہیے تھے۔ وہ دو بڑے اس وقت شرمسار تھے۔
"اس نے تم سے کیا کہا؟" اس نے بالآخر ہمت کر کے سالار کے عقب میں کھڑے ہو کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔
"بابا! میں آپ کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔" مدھم آواز میں سالار کے جواب نے ایک نشتر کی طرح اسے کاٹا تھا۔
بچپن کمال کی چیز ہے، ساری لفاظی، تکلف، لحاظ کا پردہ پھاڑ کر دل کی بات کو یوں کہتا ہے کہ دل نکال کر رکھ دیتا ہے۔

"اس نے تم سے وہ کہا جو میں نہیں کہہ سکی۔" سالار نے اپنے کندھوں پر اس کے ہاتھوں کی نرمی اور اس کے لفظوں کی گرمی کو جیسے ایک ہی وقت میں محسوس کیا تھا۔

"میں کچھ ہفتوں تک آپریشن کروا رہا ہوں۔ دو ہفتوں میں یہاں سے واپس پاکستان جائیں گے۔ تم لوگوں کو پاکستان چھوڑ کر پھر میں امریکہ جاؤں گا سرجری کے لیے۔"

اس نے امامہ کو مڑ کر نہیں دیکھا تھا نہ اس کے ہاتھ کندھوں سے ہٹائے تھے نہ اسے تسلی دی تھی۔ وہ اسے جبریل کی طرح سینے سے لپٹا کر وہ وعدہ نہیں کر سکتا تھا جو اس نے جبریل سے کیا تھا۔ وہ بچہ تھا۔ وہ بچہ نہیں تھی۔ وہ بہل گیا تھا۔ وہ بہل نہیں سکتی تھی۔

"مجھے تمہیں ایک کام سونپنا ہے امامہ۔" سالار نے بالآخر کمپیوٹر آف کرتے ہوئے امامہ سے کہا۔

"کیا؟" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"ابھی نہیں بتاؤں گا۔ آپریشن کے لیے جانے سے پہلے بتاؤں گا۔"

"سالار! مجھے کوئی کام مت دینا۔۔۔ کچھ بھی۔۔۔" وہ رو پڑی۔

"کوئی بڑا کام نہیں ہے۔۔۔ تمہارے لیے کوئی مشکل کام بھی نہیں ہے۔"

وہ اب کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اب ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔

"میں کوئی آسان کام بھی نہیں کرنا چاہتی۔" اس نے سر جھٹکتے ہوئے بے حد بے بسی سے کہا۔ وہ ہنس پڑا۔

عجیب تسلی دینے والے انداز میں اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

"اپنی آٹو بائیو گرافی (خود نوشت) لکھ رہا ہوں پچھلے کچھ سالوں سے۔۔۔ سوچتا تھا بڑھاپے میں پبلش کرواؤں گا۔" وہ خاموش ہوا۔ پھر بولنے لگا۔ "وہ نامکمل ہے ابھی۔۔۔ میں بہت کوشش بھی کروں تب بھی اسے مکمل نہیں کر سکتا۔ لیکن تمہارے پاس رکھوانا چاہتا ہوں۔۔۔ یہ چاروں ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ مجھے نہیں پتا آپریشن کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ مجھے یہ بھی نہیں پتا۔ آگے کیا ہونے والا ہے۔ لیکن پیچھے جو کچھ ہو چکا ہے وہ لکھ چکا ہوں میں اور میں چاہتا ہوں تم اسے ان چاروں کے لیے اپنے پاس محفوظ رکھو۔"

ان جملوں میں عجیب بے ربطی تھی وہ اس سے کھل کر یہ نہیں کہہ پایا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد وہ اس کے بچوں کے ہوش سنبھالنے پر ان سے ان کے باپ کا تعارف ان کے باپ کے لفظوں میں ہی کروائے وہ اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکا تھا کہ اسے آپریشن میں ہونے والی کسی پیچیدگی کے نتیجے میں ہونے والی دماغی بیماری کا بھی اندیشہ تھا۔ اس نے جو نہیں کہا تھا۔ امامہ نے وہ بھی سن لیا تھا۔ بس صرف سنا تھا وہ آنے والے وقت کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ وہ برا وقت تھا اور وہ ہر برے وقت سے آنکھیں بند کر کے گزرنا چاہتی تھی۔

"کتنے چیپٹر ہیں اس کتاب کے؟" اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھا۔

"سینتیس سال کی عمر میں پہلا چیپٹر لکھا تھا پھر ہر سال ایک چیپٹر لکھتا رہا ہوں۔ ہر سال ایک لکھنا چاہتا تھا۔ زندگی کے پہلے پانچ سال۔۔۔ پھر اگلے پانچ۔ پھر اس سے اگلے۔ ابھی زندگی کے صرف چالیس سال ریکارڈ کر پایا ہوں۔" وہ بات کرتے کرتے رکا۔ چیپٹر گنوائے بغیر وہ عمر گنوانے بیٹھ گیا تھا۔

"چالیس کے بعد بھی تو زندگی ہے۔ 41-42-43" وہ بات کرتے کرتے اٹکی۔ رکی۔۔۔ ہکلائی۔

"وہ جو ہے اسے میں document نہیں کرنا چاہتا۔ تم کرنا چاہتی ہو تو کر لینا۔" کیا وہ اجازت دے رہا تھا۔ اسے جیسے کہہ رہا ہو تم یاد رکھنا چاہتی ہو یہ عرصہ تو یاد رکھ لینا۔

"کہاں ہے کتاب؟" وہ یہ سب نہیں پوچھنا چاہتی تھی پھر بھی پوچھتی جا رہی تھی۔

"اسی کمپیوٹر میں ہے۔" وہ دوبارہ کمپیوٹر آن کرنے لگا اور ڈیسک ٹاپ پر پڑے ایک فولڈر کو کھول کر اس نے

امامہ کو دکھایا۔ فولڈر کے اوپر ایک نام چمک رہا تھا۔ تاش۔۔۔

"تاش؟" امامہ نے رندھی آواز میں پوچھا۔

"نام ہے میری آٹوبائیوگرافی کا۔" وہ اب اسے دیکھے بغیر فولڈر کھولے اسے فائلز دکھا رہا تھا۔

"انگلش میں لکھی جانے والی آٹوبائیوگرافی کا نام اردو میں رکھو گے؟" اسٹڈی ٹیبل کے کونے سے ٹکی وہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"میری زندگی کو اس لفظ سے زیادہ بہتر کوئی (بیان) نہیں کرسکتا۔ کیا فرق پڑتا ہے، تم لوگوں کے لیے لکھی ہے' تم لوگ تو سمجھ سکتے ہو تاش کیا ہے۔"

وہ اس کی طرف دیکھے بغیر مدھم آواز میں بولتا ہوا صفحات کو اسکرول ڈاؤن کر رہا تھا۔ لفظ بھاگتے جا رہے تھے' پھر غائب ہو رہے تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس کی زندگی کے سال غائب ہوئے تھے۔ پھر وہ آخری چیپٹر آخری صفحے پر جا رکا تھا۔ آدھا صفحہ لکھا ہوا تھا' آدھا صفحہ خالی تھا۔ سالار نے اس فولڈر کو کھولنے کے بعد پہلی بار سر اٹھا کر امامہ کو دیکھا۔ نم آنکھوں کے ساتھ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"تم پڑھنا چاہو گی؟" اس نے مدھم آواز میں امامہ سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔



وہ کتاب امامہ نے اس دن اس کے آفس جانے اور اپنے بچوں کے اسکول واپس آنے سے پہلے ختم کر لی تھی۔ اس نے آٹھ چیپٹرز میں اپنی زندگی کے چالیس سال محفوظ کیے تھے اور بڑی بے رحمی کے ساتھ اپنی زندگی کو رقم کیا تھا۔ امامہ ہاشم کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا لیکن صرف رومانس۔۔۔ صرف تصوراتی۔۔۔ سچ اور تلخ حقائق پر مشتمل خودنوشت سوانح نہیں اور وہ بھی ایسی کتاب جس کا مرکزی کردار اس کی اپنی زندگی کا ہیرو تھا۔ جو کچھ اس نے اس کتاب میں اپنے حوالے سے لکھا تھا۔ وہ کبھی اس کے منہ سے سننے کی ہمت نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ اس سے خفا ہو جاتی۔ بددل بھی۔۔۔ بدگمان بھی۔۔۔ لیکن وہ اس کے بارے میں سب کچھ پڑھ رہی تھی۔ سن نہیں رہی تھی۔ تنہا تھی۔ اس کے سامنے نہیں تھی اور وہ صفائی اور بے رحمی کی حد تک اپنے بارے میں صاف گوئی دکھا رہا تھا۔ اپنے سارے عیب۔۔۔ ساری غلطیاں۔۔۔ ساری گمراہیاں۔۔۔ خامیاں۔۔۔ سب۔

اور پھر اس کی زندگی میں امامہ ہاشم نے کیا رول ادا کیا تھا۔۔۔ وہ بھی۔۔۔ اس کی اولاد نے کیا تبدیلی کی تھی' وہ بھی۔۔۔ اس کے باپ نے اس کے لیے کیا۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا تھا وہ بھی۔۔۔ اور اس رزق نے کیا تباہی کی تھی۔ وہ بھی' جو سود سے کمایا اور گنوایا گیا تھا۔

امامہ ہاشم نے اس کتاب کے آٹھ چیپٹرز ایک نشست میں پڑھے تھے اور پھر اس کتاب کے آٹھویں چیپٹر کے آخر میں ایک لائن لگا کر اسے ختم کرتے ہوئے اگلا صفحہ کھولا تھا۔

سالار سکندر کی زندگی کے نویں چیپٹر کا آغاز۔۔۔



"تم مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہے؟" اس دن اسکول سے واپسی پر گاڑی میں بیٹھے حمین کو جبریل کی خاموشی نے پریشان سے زیادہ بے زار کیا تھا۔ وہ اس کی کسی بات کا جواب نہیں دے رہا تھا اور اسے مکمل طور پر نظرانداز کر رہا تھا۔

"میں تم سے کبھی کوئی بات نہیں کروں گا' تم بہت مین ہو۔"

جبریل نے بالآخر اپنی خاموشی توڑتے ہوئے اپنی خفگی کا اظہار کیا۔ حمین اس کی بات پر بے قرار ہوا۔

"لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے، میں نے کیا کیا ہے؟"
"تم نے سب کو بتا دیا کہ میں روتا ہوں۔"
"اس لیے کہ میں تمہارے رونے کی وجہ سے اپ سیٹ تھا، تم اتنا کیوں روتے ہو؟" جبریل نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اس سے نظر چرائی اور حمین کی بے قراری میں اضافہ کیا۔
"کیا میں تمہیں گلے لگا سکتا ہوں؟" اس نے جبریل کے بازو سے چمٹتے ہوئے اس کے کان میں ایک بلند و بالا سرگوشی کی۔ جبریل بے اختیار اپنے کان میں گونجنے والی اس کی آواز پر مڑا اور اسے گھور کر دیکھا۔
"میں نہیں چاہتا تھا کہ گرلز یہ بات سن لیں۔"
حمین نے بے حد معصومیت سے برابر میں بیٹھی دونوں لڑکیوں کے بارے میں اسے مطلع کیا اور پھر جبریل کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خود ہی جبریل کے گلے لگ گیا۔ جبریل ایک لمحہ ساکت رہا، پھر موم کی طرح پگھلا۔ یہ اس کی فطرت تھی۔
"فرینڈز!" حمین نے سیکنڈز میں اس سے الگ ہوتے ہوئے بے حد اطمینان سے اس سے استفسار کیا۔
"صرف اس صورت میں اگر تم میرے بارے میں بات کرنا بند کر دو۔"
جبریل نے ایموشنل بلیک میلنگ کی ایک تازہ کوشش کی۔
"پرامس!" حمین نے پلک جھپکتے میں وعدہ کیا۔ جبریل نے کچھ مطمئن انداز میں سر ہلایا اور دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔
"لیکن اگر میں اپنا وعدہ بھول جاؤں تو تم مجھے معاف کر دو گے نا!"
اگلے لمحے ابھرنے والی آواز نے جبریل کو دوبارہ پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔
"میرا مطلب ہے، کبھی میں بھول بھی جاتا ہوں۔ تمہیں پتا ہے نا میں بچہ ہوں۔" وہ جبریل کی گھورتی ہوئی نظروں کے جواب میں بے حد اطمینان سے توجیہہ پیش کر رہا تھا۔ وہ ایک جملے میں تین قلابازیاں کھا رہا تھا اور اپنے بڑے بھائی کو جتا رہا تھا کہ وہ صرف "عمر" میں بڑا تھا۔
جبریل نے اسے مزید کچھ نہیں کہا، اسے کچھ کہنا وقت اور دماغ ضائع کرنے کے برابر تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے کتاب پڑھی؟" اس رات سالار نے واپس آ کر سونے سے پہلے اس سے پوچھا۔
"نہیں۔" وہ چونکی اور اس سے نظریں ملائے بغیر اس نے بستر کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے "فوراً" کہا۔
"میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے نہیں پڑھنی، تو پھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟" اس نے اسی انداز میں اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر کہا۔
"مجھے اس کتاب کو اس کمپیوٹر سے ہٹا دینا چاہیے۔" سالار کو اس کی بات سنتے ہوئے اچانک خیال آیا۔
"کیوں...؟" وہ حیران ہوئی۔
"میں نہیں چاہتا جبریل اسے پڑھے، وہ اس کمپیوٹر کو بہت استعمال کرتا ہے... تمہارے لیپ ٹاپ میں محفوظ کر دیتا ہوں۔"
"جب بچوں کے لیے لکھ رہے ہو تو بچوں سے کیوں چھپانا چاہتے ہو؟"
"میں اس عمر میں انہیں اپنے بارے میں یہ سب نہیں پڑھانا چاہتا۔"
"تو پھر مجھے بھی مت پڑھاؤ۔" اس نے بستر کی چادر ٹھیک کرنے کے بعد سالار سے اپنا چہرہ چھپانے کے لیے

وارڈروب کھول لی تھی۔ سالار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ یو ایس بی میں اس کمپیوٹر سے فائلز محفوظ کرنے کے بعد اب انہیں اس کے لیپ ٹاپ میں محفوظ کر رہا تھا۔
"میں یہ کتاب کبھی نہیں پڑھوں گی اور میں کبھی اپنے بچوں کو بھی یہ کتاب نہیں پڑھاؤں گی۔" وارڈروب میں سے کچھ ڈھونڈتے ہوئے امامہ نے جیسے اعلان کیا۔
"ٹھیک ہے، مت پڑھنا اور بچوں کو بھی مت پڑھانا۔ پبلش کروا دینا۔" وہ اسی سنجیدگی سے اپنے کام میں مصروف رہا۔
"تم کیا سمجھتے ہو؟ دنیا کیا کرے گی تمہاری آٹو بائیو گرافی پڑھ کر۔" امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے اس کی بات پر کیوں غصہ آیا۔ شاید بے بسی کا شدید احساس تھا جو غصے میں بدلا تھا۔ وہ اس کے اس انداز پر چونکا اور پھر مسکرا دیا۔
"آج کئی مہینوں کے بعد تمہیں مجھ پر غصہ آیا ہے۔"
اس نے امامہ کا لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے امامہ کو چھیڑا جیسے وہ ہمیشہ کی طرح اسے غصہ دلانے کے لیے کرتا تھا۔ یوں جیسے وہ پچھلے سارے مہینے کہیں غائب ہو گئے تھے۔ زندگی وہیں کھڑی تھی جہاں اس انکشاف سے پہلے کھڑی تھی۔۔۔ وہیں سے جڑی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے اس سے کہہ نہیں سکی کہ اس نے بھی کئی مہینوں کے بعد اسے چڑایا تھا۔ اسی انداز میں، جس سے وہ چڑتی تھی۔ ساری عمر چڑتی رہی تھی۔ پر آج دلبری کے اس انداز پر اس کا دل بھر آیا تھا۔
ایک بھی لفظ کہے بغیر وہ پلٹی اور واش روم کا دروازہ کھول کر اندر گھس گئی۔ وہ روز صبح طے کرتی تھی کہ اسے آج نہیں رونا۔۔۔ ہمت کرنی تھی۔ حوصلہ کرنا تھا اور ہر روز شام تک آنسو سب کچھ تہس نہس کر چکے ہوتے تھے۔ وہ اب بھی وہاں اندر باتھ ٹب کے کونے پر بیٹھی بے آواز رو رہی تھی۔



کنشاسا سے واپسی ان کی زندگی کا بے حد خوشگوار ترین سفر ہوتا اگر اس سفر کے پیچھے سالار سکندر کی بیماری نہ کھڑی ہوتی۔ وہ پانچ سال کے بعد اپنے ملک واپس آئے تھے۔۔۔ لیکن اب آگے اندیشوں کے سوا فی الحال کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کئی سالوں کے بعد امامہ پھر گھر سے بے گھر ہوئی تھی۔۔۔ اپنی چھت اسے یک دم وہ سالار کے والدین کے گھر آ بیٹھی تھی۔ وہ بے حد اچھے لوگ تھے۔۔۔ پیار کرنے والے۔ احسان نہ جتانے والے۔ پر احسان تو تھا ان کا۔

کنشاسا سے پاکستان آنے سے پہلے اس نے ایک دن چاروں بچوں کو بٹھا کر سمجھایا تھا۔
"ہم اب جہاں جا رہے ہیں وہ ہمارا گھر نہیں ہے۔۔۔ وہاں ہم گیسٹ ہیں اور جتنی دیر بھی ہمیں وہاں رہنا ہے، اچھے مہمانوں کی طرح رہنا ہے۔ اور اچھے مہمان کیا کرتے ہیں؟"
اس نے اپنے بچوں کے سامنے بے گھری کو نیا ملبوس دے کر پیش کرتے ہوئے کہا۔
"اچھے گیسٹ ڈھیر ساری چیزیں لاتے ہیں۔۔۔ مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں اور جلدی چلے جاتے ہیں۔۔۔ اور کوئی بھی کام نہیں کرتے، ریسٹ کرتے ہیں۔"
حمین نے حسب عادت اور حسب توقع سب پر سبقت لے جانے کی کوشش میں اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر اپنا جواب پیش کرتے ہوئے امامہ کو ایک ہی وار میں لاجواب کر دیا۔
اسے ہنسی آ گئی۔ ماں کو ہنستے دیکھ کر حمین بے حد جذباتی ہو گیا۔

"ہرا۔ میں جیت گیا!" اس نے ہوا میں مکے لہراتے ہوئے جیسے صحیح جواب بوجھ لینے کا اعلان کیا۔
"کیا اس نے ٹھیک کہا ہے؟" عنایہ کو جیسے یقین نہیں آیا تھا۔
"نو۔" امامہ نے کہا۔ حمین کے چہرے پر بے یقینی جھلکی۔
"اچھے مہمان کسی کو تنگ نہیں کرتے۔ کسی سے فرمائش نہیں کرتے۔ کسی چیز میں نقص نہیں نکالتے۔ اور ہر کام میزبان سے اجازت لے کر کرتے ہیں۔ وہ اپنے کاموں کا بوجھ میزبان پر نہیں ڈالتے۔"
امامہ نے انہیں سمجھانے والے انداز میں کہا۔
"او، مائی گاڈ! ممی! میں اچھا گیسٹ نہیں ہونا چاہتا میں بس گیسٹ بننا چاہتا ہوں۔"
حمین نے ماں کی بات کاٹتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔
"ہم دادا' دادی کے گھر جا رہے ہیں اور ہمیں وہاں ویسے رہنا ہے جس سے وہ کمفرٹیبل ہوں۔ انہیں شکایت یا تکلیف نہ ہو۔" امامہ نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
"اوکے!" عنایہ' رئیسہ اور جبریل نے بیک وقت ماں کو اطمینان دلایا۔
"اور ہم اپنے گھر میں کب جائیں گے؟" حمین نے ماں کو اپنے آپ کو نظر انداز کرنے پر بالآخر پوچھا۔
"جلدی جائیں گے۔" اس نے نظر ملائے بغیر حمین کو جواب دیا۔ وہ مطمئن نہیں ہوا۔
"جلدی کب؟" وہ بے صبرا تھا۔
"بہت جلدی۔"
"اور ہمارا گھر ہے کہاں؟" حمین نے پچھلے جواب سے مطمئن نہ ہوتے ہوئے سوال بدلا اور امامہ کو جیسے چپ لگ گئی۔ سوال ٹھیک تھا۔ جواب نہیں تھا۔
"ہم نیا گھر خریدیں گے۔" عنایہ نے جیسے اس کی چپ کا دفاع کیا۔
"کہاں۔؟" حمین کو مکمل جواب چاہیے تھا۔
"جہاں بابا ہوں گے۔" جبریل نے اس بار اسے مکمل جواب دینے کی کوشش کی۔
"اور بابا کہاں ہوں گے؟" حمین نے ایک اور منطقی سوال کیا جو امامہ کو چبھا تھا۔
"ابھی ہم پاکستان جا رہے ہیں پھر بابا جہاں جائیں گے' وہاں ہم لوگ بھی چلے جائیں گے۔" جبریل نے ماں کی آنکھوں میں امڈنے والی نمی کو بھانپا اور جیسے دیوار بننے کی کوشش کی۔
"واؤ۔ یہ تو بہت اچھا ہے۔" حمین بالآخر مطمئن ہوا۔
"میں بابا کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔" اس نے جیسے اعلان کر کے ماں کو اپنی ترجیح بتائی۔ امامہ ان چاروں سے مزید کچھ نہیں کہہ سکی۔ یہ سمجھانا بھی بڑا مشکل کام ہوتا ہے اور خاص طور سے اس چیز کو سمجھانا جو خود سمجھ میں نہ آرہی ہو۔ اس نے ان چاروں کو سونے کے لیے جانے کا کہہ دیا اور خود ان کے کمرے سے نکل آئی۔
"ممی!" حمین اس کے پیچھے لاؤنج میں نکل آیا تھا۔ امامہ نے اسے پلٹ کر دیکھا۔ وہ جیسے کسی سوچ میں تھا۔
"یس۔" اس نے جواب دیا۔
"میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں لیکن میں کنفیوز ہوں۔" اس نے ماں سے کہا۔
"کیوں؟" وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔
"کیونکہ میں اپنا وعدہ نہیں توڑنا چاہتا۔" اس نے اپنی الجھن کی وجہ بتائی۔
"لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں آپ کا سیکرٹ جانتا ہوں۔"
امامہ کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آیا۔

"میں جانتا ہوں۔ آپ اپ سیٹ ہو۔" وہ کہہ رہا تھا وہ جیسے کچھ اور زمین میں گڑی۔ وہ اب اس کے اور قریب آگیا تھا۔ چھ سال کی عمر میں بھی اس کی کمر سے اوپر قد کے ساتھ۔ "پلیز آپ اپ سیٹ نہ ہوں۔" اس نے اب ماں کی کمر کے گرد اپنے بازو لپیٹتے ہوئے کہا۔

(I don't like it when you cry)

"جب آپ روتی ہیں تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔" اس سے چپٹا وہ اب اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ بت کی طرح کھڑی تھی۔ پہلے جبریل اور اب حمین۔ اس کی ہر اولاد کو اس کے ساتھ اس تکلیف سے گزرنا تھا کیا۔؟

"تم کیا جانتے ہو؟" وہ اتنا چھوٹا سا جملہ بھی ادا نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ صرف اسے تھپکنے لگی۔

"دادا ٹھیک ہو جائیں گے۔" وہ اب اسے تسلی دینے لگا۔ امامہ کو لگا جیسے اس کو سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ وہ شاید بابا کہہ رہا تھا۔

"میں نے دادا سے پوچھا۔" اس نے ایک بار پھر امامہ سے کہا اس بار وہ مزید الجھی۔

"کس سے کیا پوچھا؟"

"دادا سے پوچھا تھا انہوں نے کہا وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔" امامہ مزید الجھی۔

"دادا کو کیا ہوا؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

"دادا کو برین ٹیومر نہیں ہوا... دادا کو الزائمر ہے... لیکن وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

امامہ کا دماغ بھک سے اڑا تھا۔



"سالار کو کچھ مت بتانا۔"

پاکستان پہنچنے کے بعد جو پہلا کام تھا۔ وہ امامہ نے یہی کیا تھا۔ اس نے سکندر عثمان سے اس انکشاف کے بارے میں پوچھا تھا جو سکندر عثمان نے حمین کے برین ٹیومر کے حوالے سے سوالوں کے جواب میں کیا تھا اور انہوں نے جواباً اسے بتایا تھا کہ ایک مہینہ پہلے روٹین کے ایک میڈیکل چیک اپ میں ان کی اس بیماری کی تشخیص کی گئی تھی جو ابھی ابتدائی اسٹیج پر تھی۔ لیکن انہیں سب سے پہلی پریشانی یہی تھی کہ کہیں امامہ نے سالار سے اس بات کا ذکر نہ کر دیا ہو اور جب اس نے یہ بتایا کہ اس نے سالار سے ابھی ذکر نہیں کیا تو انہوں نے پہلی بات اس سے یہی کہی تھی۔

"میں اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا... اس کا آپریشن ہونے والا ہے اور میں اپنی بیماری کے حوالے سے اسے اور ٹینس کروں۔"

وہ اب بھی اپنے سے زیادہ سالار کے بارے میں فکر مند تھے۔

"پاپا! میں نہیں بتاؤں گی اسے... میں بھی یہ نہیں چاہتی کہ وہ پریشان ہو۔" امامہ نے انہیں تسلی دی۔ "آپ جانتے ہیں۔ آپ سے بہت اٹیچڈ ہے وہ... اپنی بیماری بھول جائے گا وہ۔"

"جانتا ہوں۔" انہوں نے ایک رنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔ "اس عمر میں اپنی بیماری کی فکر نہیں ہے مجھے... میں نے زندگی گزار لی ہے اپنی... اور اللہ کا شکر ہے... بہت اچھی گزاری ہے۔ اس کو صحت مند رہنا چاہیے۔" انہوں نے آخری جملہ عجیب حسرت سے کہا۔

"اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اس کی بیماری بھی خود لے لیتا۔ اپنی زندگی کے جتنے بھی سال باقی ہیں وہ اسے دے دیتا۔"

امامہ نے ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"آپ بس اس کے لیے دعا کریں پاپا۔ ماں باپ کی دعا میں بہت اثر ہوتا ہے۔"

"دعا کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے مجھے۔ میں سوچتا تھا اس نے مجھے نوعمری اور جوانی میں بہت ستایا تھا۔ لیکن جو میرے بڑھاپے میں ستا رہا ہے یہ۔" وہ بات مکمل نہیں کرسکے۔ رو دیے۔

"ایک کام کریں گے پاپا؟" امامہ نے ان کا ہاتھ تھپکتے ہوئے کہا۔

"کیا؟"

اپنی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی اتارتے ہوئے امامہ نے ان کے ہاتھ کو کھولتے ہوئے ان کی ہتھیلی پر وہ انگوٹھی رکھ دی۔

"اسے بیچ دیں۔" وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"کیوں؟" انہوں نے بمشکل کہا۔

"مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔"

"کتنے؟"

"جتنے مل سکیں۔"

"امامہ..." انہوں نے کچھ کہنا چاہا، امامہ نے روک دیا۔

"انکار مت کریں۔ یہ کام میں آپ کے علاوہ کسی سے نہیں کروا سکتی۔" وہ نم آنکھوں کے ساتھ چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔



اپنے آپریشن سے دو ہفتے پہلے نیویارک میں سالار سکندر اور SIF کے بورڈ آف گورنرز نے پہلے گلوبل اسلامک انویسٹمنٹ فنڈ کے قیام کا اعلان کر دیا تھا۔

پانچ ارب روپے کے سرمائے سے قائم کیا گیا۔

Samar Invesment Fund-

ثمر انویسٹمنٹ فنڈ وہ پہلی اینٹ تھی اس مالیاتی نظام کی جو سالار سکندر اور اس کے پانچ ساتھی اگلے بیس سالوں میں دنیا کی بڑی فنانشل مارکیٹوں میں سود پر مبنی نظام کے سامنے لے کر آنا چاہتے تھے۔ پانچ ارب روپیہ اس ابتدائی ٹارگٹ سے بہت کم رقم تھی جس کے ساتھ وہ اس فنڈ کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ اگر سالار سکندر کی بیماری کا انکشاف میڈیا کے ذریعے اتنے زور و شور سے نہ کیا جاتا تو SIF کے بورڈ آف گورنرز کے چھ ممبرز اس فنڈ کا آغاز ایک ارب ڈالر کے سرمائے سے دنیا کے پچاس ممالک میں بیک وقت کرتے اور وہ ٹارگٹ مشکل ضرور تھا ناممکن نہیں تھا اور ان کے پاس پانچ سال تھے اسے حاصل کرنے اور بنیادی انفراسٹرکچر کھڑا کرنے کے لیے۔

لیکن سالار سکندر کی بیماری نے جیسے پہلے قدم پر ہی ان کی کمر توڑ دی تھی۔ اس کے باوجود بورڈ آف گورنرز نہیں ٹوٹا تھا، وہ اکٹھے رہے تھے۔ جڑے رہے تھے۔ کیونکہ ان چھ میں سے کوئی شخص بھی یہ کام "کاروبار" کے طور پر نہیں کر رہا تھا۔ وہ ایک اندھی کھائی میں کودنے کے مجاہدانہ جذبے سے کر رہے تھے۔

Late 30's میں اس پروجیکٹ سے منسلک چھ کے چھ افراد ایک دوسرے کو ذاتی طور پر اچھی طرح جانتے تھے۔ ایک دوسرے کی نیت بھی۔ ایک دوسرے کی حیثیت بھی۔ اور ایک دوسرے کی شہرت بھی۔

سالار سکندر، عالم کلیم، موسیٰ بن رافع، ابوذر سلیم، علی اکمل اور راکن مسعود پر مشتمل SIF کا بورڈ آف

گورنرز دنیا کے بہترین بورڈ آف گورنرز میں گردانا جا سکتا تھا۔ وہ چھ کے چھ افراد اپنی اپنی فیلڈ کا پاور ہاؤس تھے۔ وہ چھ مختلف شعبوں کی مہارت، صلاحیت، اور تجربے کو SIF کے پلیٹ فارم پر لے آئے تھے۔ اور 40's early میں ہونے کے باوجود 15 سے 20 سال کے تجربے ساکھ اور (اپنی کامیابیوں) کے ساتھ وہ دنیا کے کم عمر ترین اور قابل ترین بورڈ آف گورنرز میں سے ایک تھا۔

عامل کلیم ایک امریکن مسلم تھا جس کی ماں ملائشین اور باپ ایک عرب تھا لیکن وہ دونوں امریکہ میں ہی پیدا اور پلے بڑھے تھے۔ عامل کلیم ایک فائنشل کنسلٹنسی فرم کا مالک تھا اور امریکہ کے ڈیڑھ سو سے زیادہ فائنشل اداروں کے لیے کنسلٹنسی کر رہا تھا۔ وہ دنیا کے دس بہترین Investment Gurus میں تیسرے نمبر پر براجمان تھا اور فوربس کی اس لسٹ میں شامل تھا جس میں اس نے اگلے دس سالوں کے ممکنہ ارب پتی پروفیشنلز کے نام دیے تھے۔ عامل کلیم بورڈ آف گورنرز کا سب سے زیادہ مذہبی اور باعمل مسلمان تھا۔ یہ اعزاز اسے بورڈ کے بقیہ پانچ ممبرز نے اجتماعی طور پر اس کی دینی معلومات اور عملی کردار کو دیکھتے ہوئے بخشا تھا جس پر عامل کلیم مطمئن تھا لیکن خوش نہیں تھا۔ سالار اسے yale کے دنوں سے جانتا تھا وہ اور عامل ان پانچ افراد کے گروپ میں تھے جن کا ہر چیز میں مقابلہ رہتا تھا سالار سب سے بہترین GP کے ساتھ ٹاپ کرنے کے باوجود جن چند سبجیکٹس میں کسی سے پیچھے رہا تھا وہ عامل کلیم ہی تھا۔

موسیٰ بن رافع مسقط اور عمان کے دو شاہی خاندانوں سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنے ملک میں اقتدار پر براجمان خاندان سے اختلافات کی بنیاد پر اپنے والدین کے زمانے سے امریکہ میں ہی تھا۔ اس کی پیدائش امریکہ میں ہوئی تھی اور اس کی پیدائش کے کچھ عرصہ کے بعد اس کے والدین مستقل طور پر امریکہ منتقل ہو گئے تھے۔

26 سال کی عمر میں اپنے باپ کی حادثاتی موت کے بعد موسیٰ وہ شپنگ کمپنی ورثے میں ملی جو اس کے باپ کی ملکیت تھی اور ایک اوسط درجے کی شپنگ کمپنی کو موسیٰ اگلے پندرہ سالوں میں ایک چوٹی کی شپنگ لائن بنا چکا تھا۔ اس کی کمپنی اب کینیٹنرز عالمی شپنگ میں سب سے تیز رفتار اور بہترین کمپنی مانی جاتی تھی۔ سالار اور وہ کولمبیا میں آپس میں ملے تھے اور پھر ان کا رابطہ ہمیشہ رہا۔ سالار سکندر سٹی بینک میں کام کرنے کے دوران اس کی فیملی کے بہت سے اثاثوں کو ایک انویسٹمنٹ بینکر کے طور پر دیکھتا رہا تھا۔

ابوذر سلیم ایک امریکن افریقی تھا اور ایک بہت بڑی فارماسیوٹیکل کمپنی کا مالک تھا۔ وہ افریقہ میں فارماسیوٹیکل کنگ مانا جاتا تھا۔ کیونکہ امریکہ based اس کی کمپنی افریقہ کے مختلف ممالک میں فارماسیوٹیکل سپلائیز میں پہلے نمبر پر تھی۔ سالار کے بعد وہ بورڈ آف گورنرز کا دوسرا ممبر تھا جو افریقہ سے اتنا گہرا تعلق اور مسلسل آنے جانے کی وجہ سے بہت ساری افریقی زبانوں میں گفتگو کر سکتا تھا۔ بورڈ کے گورنرز اسے ابوذر سلیم نہیں کہتے تھے۔ حاتم طائی کہتے تھے۔ وہ بلاشبہ اس بورڈ کا سب سے فراخ دل ممبر تھا۔ اس کی کمپنی اپنے سالانہ خالص منافع کا چوتھا حصہ افریقہ کے مختلف ممالک کے خیراتی اداروں میں صرف کر رہی تھی۔ سالار اور ابوذر نہ صرف یونیورسٹی میں ساتھ پڑھتے رہے تھے بلکہ انہوں نے یونائیٹڈ نیشنز کی ایک انٹرن شپ بھی اکٹھے کی تھی۔

علی اکمل ایک ہندوستانی نژاد امریکن تھا جو ٹیلی کمیونیکیشنز کی ایک کمپنی چلا رہا تھا۔ ٹیلی کام سیکٹر میں اس کی کمپنی امریکہ میں پچھلے دس سالوں میں سب سے زیادہ منافع کمانے والی کمپنیز میں شمار ہوتی تھی۔ سب سے تیز رفتار ترقی کا تاج بھی اسی کمپنی کے سر پر تھا علی اکمل خود ایک ٹیلی کام انجینئر تھا وہ اور سالار ایک دوسرے سے Yale کے دنوں میں وہاں ہونے والے کچھ مباحثوں کے ذریعے متعارف ہوئے تھے اور پھر یہ تعارف دوستی میں تبدیل ہو گیا تھا۔

راکن مسعود ایک پاکستانی امریکن تھا اور ایک مینجمنٹ کمپنی چلا رہا تھا۔ گلف کے شاہی خاندانوں کا ایک بڑا

حصہ راکن کے clientel میں شامل تھا اور اب اس clientel میں یورپ کے بہت سے نامی گرامی خاندان اور ہالی ووڈ کی بہت سی امیر شخصیات بھی شامل تھیں۔ راکن کو سالار پاکستان سے ہی جانتا تھا اگرچہ وہ شروع سے دوست نہیں تھے لیکن ان کے خاندانوں کے آپس میں قریبی تعلقات تھے۔ اس کی طرح راکن بھی فنانس میں ڈاکٹریٹ تھا اور سود سے پاک نظام کا سب سے زیادہ پرعزم اور قولی و عملی سپورٹر بھی۔

چھ افراد پر مشتمل وہ گروپ پانچ ارب روپے کا وہ سرمایہ صرف اپنی ساکھ کی بنیاد پر اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اور انہیں یقین تھا وہ اگر سترہ ملکوں میں پانچ ارب روپے کے اس سرمائے کو سرمایہ کاری کرنے والوں کے لیے منافع بخش بنا سکے تو اگلے تین سالوں میں 50 ملک اور ایک ارب ڈالر کا ٹارگٹ نا ممکنات میں سے نہیں تھا۔

SIF کے پہلے فیز میں ان پروجیکٹ کی تعداد محدود تھی جن پر انہیں کام کرنا تھا مگر دوسرے اور تیسرے فیز میں وہ اپنے مالیاتی منصوبوں کو نہ صرف ان 17 ممالک میں بلکہ اگلے دس سال میں ستر ممالک میں لے جانا چاہتے تھے جہاں وہ ایک کم آمدنی والے شخص کو بھی مالیاتی سروسز فراہم کر سکیں۔

SIF چند بے حد بنیادی اور آسان اصولوں پر قائم کیا گیا تھا۔ وہ اپنے فنڈ کا بڑا حصہ ان نئے انوسٹمنٹ نظریات پر لگانا چاہتے تھے جو افراد اور چھوٹے اداروں کی طرف سے پیش کیے جاتے اور جن میں SIF کو اگلے کسی بڑے منصوبے کے بہتر امکانات نظر آتے ہیں۔ لیکن SIF ایک Lender کے طور پر آنے کے بجائے ایک پارٹنر کے طور پر ایسے ہر منصوبے پر کام کرتا۔ ایک خاص مدت تک۔ نفع اور نقصان میں برابری کی شراکت میں۔ اور اس مدت کا تعین اس آئیڈیا پر لگنے والے سرمائے کی مالیت پر منحصر تھا۔

خود پرکھو، سیکھاؤ، استعمال کرو، منافع کماؤ۔ نقصان کے لیے تیار رہو۔

ہیومن ریسورس پر انوسٹمنٹ کے لیے یہ SIF کی فلاسفی تھی۔

SIF پچھلے پانچ سالوں میں پہلے ہی اپنے لیے بنیادی انفراسٹرکچر کی فراہمی کے لیے بنیادی ہوم ورک کر چکا تھا۔ بیک اپ سپورٹ کے لیے کچھ ایسی انوسٹمنٹ بھی کر چکا تھا جو سود سے منسلک نہیں تھی۔ چھ افراد کا وہ گروپ اپنی اپنی فیلڈ کی مہارت اس کمپنی میں لا کر بیٹھے تھے اور وہ اس مہارت کو سرمایہ کاروں کو ترغیب دینے کے لیے استعمال بھی کر رہے تھے لیکن نفع اور نقصان کی شراکت کے اصول پر کھڑے اس نظام پر کون صرف ان کی مہارت پر اعتماد کرتے ہوئے آتا یہ بڑا چیلنج تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑا چیلنج تھا کہ وہ اپنے پاس آنے والے پچھلے پانچ ارب کے سرمائے کو ان اسٹیک ہولڈر کے لیے منافع بخش بنا سکتے جنہوں نے ان کی ساکھ اور مہارت پر اعتبار کیا تھا۔

وہ ایک بڑے کام کی طرف ایک بے حد چھوٹا قدم تھا۔ اتنا چھوٹا قدم کہ بڑے مالیاتی اداروں نے اس کو سنجیدگی سے لیا بھی نہیں تھا۔ فنانشل میڈیا نے اس پر پروگرامز کیے تھے، خبریں لگائی تھیں۔ دلچسپی دکھائی تھی لیکن کسی نے بھی اسے آئندہ آنے والے سالوں کے لیے اپنے لیے کوئی خطرہ نہیں سمجھا تھا۔

دنیا میں کوئی۔ بینک، ادارہ، فنڈ ایسا نہیں تھا جو مکمل طور پر سود سے پاک سسٹم پر کھڑا ہو پاتا اور کھڑا تھا بھی تو وہ مالیاتی نظام کے ہاتھیوں کے سامنے چیونٹیوں کی حیثیت میں کھڑا تھا۔ SIF کیا کر سکتا تھا۔ ؟ اور کیا بدل سکتا تھا۔ ؟ ایک کامیاب مالیاتی ادارہ ہو سکتا تھا۔ ایک قابل عمل مالیاتی نظام کے طور پر دنیا میں موجود نظام کو ٹکر دینے کے لیے اس کو فنانشل viability دکھائی تھی جو ابھی کسی کو نظر نہیں آئی تھی۔ صرف ان چھ دماغوں کے علاوہ جو اس کے پیچھے تھے۔

✡ ✡ ✡



SIF کے قیام کا اعلان اپنے کندھوں پر لدے ایک بہت بھاری بوجھ کو ہٹا دینے جیسا تھا۔ کم از کم سالار کو ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ اسے اتنی پذیرائی نہیں ملی تھی جتنی اس صورت میں ملتی جو وہ اسے اس سے زیادہ بڑے لیول پر لانچ کرتے لیکن ایسا بھی نہیں تھا جو انہیں مایوس کر دیتا۔ وہ دنیا کی بڑی بڑی فنانشل مارکیٹوں میں جہاں بہترین مالیاتی ادارے پہلے ہی موجود تھے۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے داخل ہوئے تھے اور انہیں پتا تھا۔ مقابلہ آسان نہیں تھا۔

امریکہ میں ایک ہفتے کے دوران اس نے SIF کے درجنوں سیمینارز اور میٹنگز اٹینڈ کی تھیں اور کچھ یہی حال بورڈ آف گورنرز کے دوسرے ممبرز کا تھا۔ ایک ہفتے کے بعد اسے پاکستان جا کر اپنے بچوں سے ملنا تھا اور پھر واپس آکر دوبارہ امریکہ میں سرجری کروانی تھی۔ اس کا شیڈول اپوائنٹمنٹس سے بھرا ہوا تھا۔

ایک ہفتہ کے اختتام تک وہ SIF کے ان سرمایہ کاروں میں سے کچھ کو واپس لانے میں کامیاب ہو گئے تھے جو سالار کی بیماری کی خبر کے بعد پیچھے ہٹ گئے تھے۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔

بارش کا وہ پہلا قطرہ جس کا انہیں انتظار تھا۔

سالار SIF کے قیام کے لیے سرمایہ کار اور سرمایہ تو لانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن وہ ذاتی طور پر خود اس میں بورڈ آف گورنرز کے دوسرے ممبرز کی طرح کوئی بڑی انویسٹمنٹ نہیں کر سکا تھا۔ کچھ اثاثے جو اس کے پاس تھے انہیں بیچ کر بھی اس کا حصہ کروڑ سے بڑھ نہیں سکا تھا۔ وہ اس اسٹیج پر اپنی فیملی کے کسی فرد سے قرض لینا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ کسی ناگہانی صورت حال میں امامہ اور اپنے بچوں کے لیے اگر لمبے چوڑے اثاثے نہیں چھوڑ سکتا تھا تو کوئی واجبات بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

مگر اس فنڈ کی انویسٹمنٹ کے ایک دن بعد سکندر عثمان نے اسے امریکہ فون کیا تھا۔

"میں پانچ کروڑ کی انویسٹمنٹ کرنا چاہتا ہوں SIF میں۔" انہوں نے ابتدائی گپ شپ کے بعد اس سے کہا۔

"آپ اتنی بڑی رقم کہاں سے لائیں گے؟" وہ چونکا۔

"باپ کو غریب سمجھتے ہو تم؟" وہ خفا ہوئے۔ سالار ہنس پڑا۔

"اپنے سے زیادہ نہیں۔"

"تم سے مقابلہ نہیں ہے میرا۔" سکندر عثمان نے بے نیازی سے کہا۔ "تمہیں میرے برابر آنے کے لیے دس بیس سال لگیں گے۔"

"شاید نہ لگیں۔"

"چلو! دیکھیں گے۔ ابھی تو مجھے بتاؤ۔ یہاں پاکستان میں لوکل آفس اور کیا طریقہ کار ہے۔" انہوں نے بات بدلی تھی۔

"آپ نے اب کیا بیچا ہے؟" سالار نے انہیں بات بدلنے نہیں دی براہ راست سوال کیا۔

"فیکٹری۔" وہ سکتے میں رہ گیا۔

"اس عمر میں میں نہیں سنبھال سکتا تھا اب۔ کامران سے بات کی۔ وہ اور اس کا ایک دوست لینے پر تیار ہو گئے۔ مجھے ویسے بھی فیکٹری میں سے سب کا حصہ دینا تھا۔" وہ اس طرح اطمینان سے بات کر رہے تھے جیسے یہ ایک معمولی بات تھی۔

"آپ کام کرتے تھے پاپا! آپ نے چلتا ہوا بزنس کیوں ختم کر دیا۔ کیا کریں گے اب آپ؟" وہ بے حد ناخوش

ہوا تھا۔

"کر لوں گا کچھ نہ کچھ۔ یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے اور نہیں بھی کروں گا تو بھی کیا ہے۔ تم باپ کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتے کیا۔ باپ ساری عمر اٹھا تا رہا ہے۔" وہ اسے ڈانٹ رہے تھے۔

"آپ نے میرے لیے کیا ہے یہ سب؟" سالار رنجیدہ تھا۔

"ہاں!" اس بار سکندر عثمان نے بات کو گھمائے پھرائے بغیر کہا۔

"پاپا! مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا آپ کو۔ مشورہ کرنا چاہیے تھا۔"

"تم زندگی میں کون سا کام میرے مشورے سے کرتے رہے ہو۔ ہمیشہ صرف اطلاع دیتے ہو۔" وہ بات کو ہنسی میں اڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہ محظوظ نہیں ہوا۔ اس کا دل عجیب طرح سے بوجھل ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟" سکندر عثمان نے جیسے اس کی خاموشی کو کریدا۔

"آپ مجھ پر اتنے احسان کیوں کرتے ہیں؟ کب تک کرتے رہیں گے؟" وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"جب تک میں زندہ ہوں۔" سکندر عثمان اس کی زندگی کی بات نہیں کر سکے تھے۔

"آپ مجھ سے زیادہ جئیں گے۔"

"وقت کا کس کو پتا ہوتا ہے؟" سکندر عثمان کا لہجہ پہلی بار سالار کو عجیب لگا تھا۔ وہ زیادہ غور نہیں کر سکا۔ سکندر عثمان نے بات بدل دی تھی۔



"جبریل! تم ان سب کا خیال رکھ لو گے؟" امامہ نے شاید کوئی دسویں بار اس سے پوچھا تھا۔

"جی ممی! میں رکھ لوں گا۔ یو ڈونٹ وری (آپ پریشان نہ ہوں۔)" اور اس نے ماں کے ساتھ پیکنگ میں مدد کرواتے ہوئے دسویں بار ماں کو ایک ہی جواب دیا۔

وہ سالار کی سرجری کے وقت اس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ اور سالار کے بے حد منع کرنے کے باوجود وہ پاکستان میں بچوں کے پاس رہنے پر تیار نہیں ہوئی تھی۔

"اس وقت تمہیں میری زیادہ ضرورت ہے۔ بچے اتنے چھوٹے نہیں ہیں کہ وہ میرے بغیر ہفتہ نہ گزار سکیں۔" اس نے سالار سے کہا تھا۔

اور اب جب اس کی سیٹ کنفرم ہو گئی تھی تو اسے بچوں کی بھی فکر ہو رہی تھی۔ وہ پہلی بار ان کو اکیلا چھوڑ کر جا رہی تھی۔ اتنی لمبی مدت کے لیے۔

"دادی بھی پاس ہوں گی تمہارے۔ ان کا بھی خیال رکھنا ہے تم نے۔"

"جی رکھوں گا۔"

"اور ہوم ورک کا بھی۔ ابھی تم سب لوگوں کے اسکول نئے ہیں۔ تھوڑا ٹائم لگے گا ایڈجسٹ ہونے میں۔ چھوٹے بہن بھائی گھبرائیں تو تم سمجھانا۔"

"جی!"

"میں اور تمہارے بابا روز بات کریں گے تم لوگوں سے۔"

"آپ واپس کب آئیں گے؟" جبریل نے اتنی دیر میں پہلی بار ماں سے پوچھا۔

"ایک مہینے تک۔ شاید تھوڑا زیادہ وقت لگے گا۔ سرجری ہو جائے تب پتا چل سکے گا۔" اس نے متفکرانہ انداز

میں سوچتے ہوئے کہا۔
"زیادہ سے زیادہ بھی رکھیں گے تو دوسرے دن تک رکھیں گے اگر کوئی کمپلیکیشن نہ ہوئی ورنہ دوسرے دن بابا گھر آجائیں گے۔"
امامہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ "تمہیں کیسے پتا؟"
"آئی ریڈ اباؤٹ اٹ (میں نے اس کے متعلق پڑھا ہے)" اس نے ماں سے نظریں ملائے بغیر کہا۔
"کیوں؟"
"انفارمیشن کے لیے۔" جبریل نے سادگی سے کہا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے نظریں ہٹالیں اور اپنے ہینڈ بیگ میں سے کچھ تلاش کرنے لگی۔ ایک دم اسے محسوس ہوا جیسے جبریل اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا' اس کی نظریں مسلسل اس پر ٹکی ہوئی تھیں۔
امامہ نے ایک لحظہ سر اٹھا کر اسے دیکھا' وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
"کیا ہوا؟" اس نے جبریل سے پوچھا۔ اس نے جواباً امامہ کی کنپٹی کے قریب نظر آنے والے ایک سفید بال کو اپنی انگلیوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔
"آپ کے کافی بال سفید ہوگئے ہیں۔" وہ ساکت اسے دیکھتی رہی۔ وہ اس کا سفید بال چھوتے ہوئے جیسے بے حد متفکر تھا۔
امامہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی' پلکیں جھپکائے بغیر۔ اس کی پیدائش سے پہلے کا سارا وقت امامہ کی زندگی کا بدترین وقت تھا یا کم از کم اس کی اس وقت تک کی زندگی کا بدترین وقت تھا۔
امریکہ واپس جانے کے بعد اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش میں وہ قرآن پاک بہت پڑھتی تھی۔
سالار جب بھی تلاوت کر رہا ہوتا' وہ اس کے پاس آکر بیٹھ جاتی۔ وہ کتاب جیسے کسی اسفنج کی طرح اس کا درد جذب کرلیتی تھی اور اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اکیلی نہیں تھی جو سالار کی تلاوت سن رہی ہوتی تھی اس کے اندر متحرک وہ وجود بھی اس پورے عرصہ میں ساکت رہتا تھا' یوں جیسے وہ بھی اپنے باپ کی آواز پر کان لگائے بیٹھا ہو' جیسے وہ بھی تلاوت کو پہچاننے لگا ہو۔ جو آواز اس کی ماں کے لیے راحت کا باعث بنتی تھی' وہ اس کے لیے بھی سکون کا منبع تھی اور جب وہ رو رہی ہوتی تو اس کے اندر پرورش پاتا وہ وجود بھی بے حد بے چینی سے گردش میں رہتا۔ یوں جیسے وہ ماں کے آنسوؤں سے بے چین ہوتا ہو' اس کی تکلیف اور غم کو سمجھ پا رہا ہو۔
وہ دس سال بعد بھی ویسا ہی تھا۔ وہ اپنی ماں کے سیاہ بالوں میں سفید بال دیکھ کر فکرمند تھا۔
امامہ نے اس کے ہاتھ سے اپنا بال چھڑا کر اس کا ہاتھ چوما۔
"اب گرے ہیئر کے بارے میں پڑھنا مت شروع کر دینا۔" امامہ نے نم آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا۔ وہ جھینپا پھر مدھم آواز میں بولا۔
"میں پہلے ہی پڑھ چکا ہوں اسٹریس اینڈ ہیلدی ڈائٹ مین ریزنز ہیں۔"
وہ حمین نہیں' جبریل تھا۔ سوال سے پہلے جواب ڈھونڈنے والا۔
وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ ایک وقت وہ تھا جب اس کا کوئی نہیں رہا تھا۔ ایک وقت یہ تھا جب اس کی اولاد اس کے سفید بالوں سے بھی پریشان ہو رہی تھی۔ وہ اس کی زندگی کے حاصل و محصول کا سب سے بہترین' سب سے منافع بخش حصہ تھا۔



ساڑھے تین کروڑ کا وہ چیک دیکھ کر وہ کچھ دیر کے لیے ہل نہیں سکا تھا۔ وہ لفافہ امامہ نے کچھ دیر پہلے اسے دیا تھا

اور وہ اس وقت فون پر کسی سے بات کر رہا تھا اور لفافہ کھولتے ہوئے اس نے امامہ سے پوچھا تھا۔
"اس میں کیا ہے؟" سوال کا جواب ملنے سے پہلے اس کے نام کا ٹا گیا وہ چیک اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔
سالار نے سر اٹھا کر امامہ کو دیکھا وہ چائے کے دو کپ سینٹر ٹیبل پر رکھتے صوفے پر بیٹھی ان سے اٹھتی بھاپ کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ کہے بغیر وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔
"میں چاہتی ہوں تم یہ رقم لے لو۔ اپنے پاس رکھو یا SIF میں انویسٹ کرو۔" سالار کے پاس بیٹھنے پر اس نے چائے کا مگ اٹھاتے ہوئے کہا۔
"تم نے وہ انگوٹھی بیچ دی؟" سالار نے بے ساختہ پوچھا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بول نہیں سکی پھر مدھم آواز میں سر جھکا کر بولی۔
"میری تھی بیچ سکتی تھی۔"
"بیچنے کے لیے تمہیں نہیں دی تھی۔" وہ خفا تھا یا شاید رنجیدہ۔ "تم چیزوں کی قدر نہیں کرتیں۔" وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔
چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے امامہ نے سر ہلایا۔
"ٹھیک کہتے ہو۔ میں چیزوں کی قدر نہیں کرتی۔ انسانوں کی کرتی ہوں۔"
"انسانوں کی بھی نہیں کرتیں۔" سالار خفا تھا۔
"صرف تمہاری نہیں کی شاید اسی لیے سزا ملی۔" نمی آنکھوں میں آئی تھی۔ آواز کے ساتھ ہاتھ بھی کپکپایا۔ خاموشی آ کر رکی ٹوٹی۔
"تم بے وقوف ہو۔" وہ اب خفا نہیں تھا۔ اس نے وہ چیک لفافے میں ڈال کر اسی طرح میز پر رکھ دیا تھا۔
"تھی۔" امامہ نے کہا۔
"اب بھی ہو۔" سالار نے اصرار کیا۔
"وہ عقل مندی کا کرنا کیا ہے میں نے اب؟" اس نے جواباً پوچھا۔
"یہ رقم اب اپنے پاس رکھو۔ بہت سی چیزوں کے لیے ضرورت پڑے گی تمہیں۔" اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے کہا تھا۔
"میرے پاس ہے کافی رقم۔ اکاؤنٹ خالی تو نہیں ہے۔ بس میں چاہتی تھی۔ میں SIF میں کنٹری بیوٹ کروں۔" وہ کہہ رہی تھی۔
"زیور بیچ کر کنٹری بیوٹ نہیں کروانا چاہتا میں تم سے۔ تم صرف دعا کرو اس کے لیے۔"
"زیور سے صرف پیسہ مل سکتا ہے۔" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ بات پوری پہنچائی تھی۔ سالار نے چائے کا مگ اٹھا لیا۔ "میں ویسے بھی زیور نہیں پہنتی۔ سالوں سے لاکر میں پڑا ہے۔ سوچ رہی تھی وہ بھی۔"
سالار نے اس کی بات مکمل ہونے نہیں دی' بے حد سختی سے اس سے کہا "تم اس زیور کو کچھ نہیں کرو گی۔ وہ بچوں کے لیے رکھا رہنے دو۔ میں کچھ نہیں لوں گا اب تم سے۔" وہ خاموش ہو گئی۔ چائے کے دو گھونٹ لینے کے بعد سالار نے مگ رکھ دیا اور اس کی طرف مڑ کر جیسے کچھ بے بسی سے کہا۔
"کیوں کر رہی ہو یہ سب کچھ؟"
کچھ کہے بغیر اس کے بازو پر ماتھا ٹکاتے ہوئے اس نے ہاتھ اس کے گرد لپیٹ لیے۔ وہ پہلا موقع تھا جب سالار کو احساس ہوا کہ اس کے آپریشن کی تاریخ جوں جوں قریب آ رہی تھی وہ اس سے زیادہ حواس باختہ ہو رہی تھی۔ حواس باختہ شاید ایک بہت چھوٹا لفظ تھا امامہ کی پریشانی' اضطراب' اندیشوں اور واہموں کو بیان کرنے کے لیے وہ

بھی پریشان تھا لیکن امامہ کی حواس باختگی نے جیسے اسے اپنی پریشانی بھلا دی تھی۔

"تم میرے ساتھ مت جاؤ امامہ! یہیں رہو بچوں کے پاس۔" سالار نے ایک بار پھر اس سے کہا۔ وہ اس کے ساتھ سرجری کے لیے امریکہ جانا چاہتی تھی اور سالار کی خواہش تھی' وہ نہ جائے۔ اس کی ضد کے آگے اس نے ہتھیار تو ڈال دیے تھے لیکن اب اسے اس طرح پریشان دیکھ کر اسے خیال آرہا تھا کہ اسے وہاں اس کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے وہ وہاں کسی بری اور غیر متوقع صورت حال کا سامنا کیسے کرے گی۔

"بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ ان کو اکیلا چھوڑ کر تم میرے ساتھ کیسے رہو گی۔ وہ پریشان ہو جائیں گے۔" وہ اسے اب ایک نیا عذر دے رہا تھا۔

"نہیں ہوں گے... میں نے انہیں سمجھا دیا ہے۔" وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔

"وہاں فرقان ہو گا میرے ساتھ... پاپا ہوں گے' تمہیں یہاں رہنا چاہیے بچوں کے پاس۔" سالار نے دوبارہ اصرار کیا۔

"تمہیں میری ضرورت نہیں ہے؟" وہ خفا ہوئی۔

"ہمیشہ۔" سالار نے اس کا سر ہونٹوں سے چھوا۔

"ہمیشہ؟" اس کے کندھے سے لگے زندگی میں پہلی بار امامہ نے اس لفظ کے بارے میں سوچا تھا۔ جو جھوٹا تھا۔

"اس بیگ میں میں نے سب چیزیں رکھ دی ہیں۔"

سالار نے یک دم بات بدلی یوں جیسے وہ اسے اور اپنے آپ کو ایک اور خندق سے بچانا چاہتا ہو۔ وہ اب کمرے میں کچھ فاصلے پر پڑے ایک بریف کیس کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

"ساتھ لے جانے کے لیے؟" امامہ نے سمجھے بغیر اسی طرح اس کے ساتھ لگے لگے کہا۔

"نہیں اپنی ساری چیزیں... چابیاں' پیپرز' بینک کے پیپرز' ہر ایسی ڈاکومنٹ جو بچوں سے متعلقہ ہے۔ اکاؤنٹ میں جو پیسے ہیں' چیک بک کو سائن کر کے رکھ دیا ہے۔ اور اپنی ایک will (وصیت) بھی..."

وہ بڑے تحمل سے اسے بتا رہا تھا۔ وہ گم صم سنتی رہی۔

"سرجری میں خدانخواستہ کوئی کمپلیکیشن ہو جائے تو... حفاظتی تدبیر ہے۔"

"سالار!" اس نے جیسے اسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔

"تمہارے نام ایک خط بھی ہے اس میں۔"

"میں نہیں پڑھوں گی۔" اس کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا لگا۔

"چلو پھر تمہیں ویسے ہی سنا دوں جو لکھا ہے؟" وہ اب اس سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔" اس نے پھر اسے ٹوک دیا۔

"تم کتاب پڑھنا نہیں چاہتیں... خط پڑھنا نہیں چاہتیں... مجھے سننا نہیں چاہتیں پھر تم کیا چاہتی ہو۔" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"میں نے کتاب پڑھ لی ہے۔" اس نے بالآخر اعتراف کیا۔

وہ چونکا نہیں تھا۔ "میں جانتا ہوں۔"

وہ بھی نہیں چونکی تھی۔

"کوئی اپنی اولاد کے لیے ایسا تعارف چھوڑ کے جاتا ہے۔" اس نے جیسے شکایت کی تھی۔

"سچ نہ لکھتا؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"جس بات کو اللہ نے معاف کر دیا اسے بھول جانا چاہیے۔"
"پتا نہیں معاف کیا بھی ہے یا نہیں۔ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔"
"اللہ نے پردہ تو ڈال دیا ہے نا" اس نے اپنی بات پر اصرار کیا تھا۔ "میں نہیں چاہتی میری اولاد یہ پڑھے کہ ان کے باپ نے زندگی میں غلطیاں کی ہیں۔ ایسی غلطیاں جو ان کی نظروں میں تمہاری عزت اور احترام ختم کر دے۔"
وہ اس سے کہہ رہی تھی۔
"جھوٹ بولتا اور لکھتا کہ میں پارسا پیدا ہوا تھا اور فرشتوں جیسی زندگی گزارتا رہا۔"
"نہیں بس انسانوں جیسی گزاری۔"
وہ بے اختیار ہنسا "شیطان لگ رہا ہوں کیا اس کتاب میں؟"
"میں اس کتاب کو ایڈٹ کروں گی۔" اس نے جواب دینے کے بجائے دوسری ہی بات کی۔ وہ جیسے کچھ اور محظوظ ہوا۔
"یعنی مجھے مومن بنا دو گی؟"
"وہ زندگی میں نہیں بنا سکی تو کتاب میں کیا بناؤں گی؟" وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔
وہ پھر ہنسا "یہ بات بھی ٹھیک ہے۔"
اس نے سر جھکایا۔ بہت عرصے بعد وہ اس طرح بات کر رہے تھے۔ ایسے جیسے زندگی میں آگے کوئی بھی مسئلہ نہیں تھا۔ سب ٹھیک تھا۔ کہیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔
"کیا نام رکھو گی پھر میری آٹو بائیو گرافی کا؟"
"آب حیات۔" اس نے بے اختیار کہا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ رنگ اڑا پھر وہ مسکرایا۔
"وہ تو کوئی بھی پی کر نہیں آتا۔" امامہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔
"تلاش تو کر سکتا ہے۔" اس نے بھی اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
"لاحاصل ہے۔"
"وہ تو پھر زندگی بھی ہے۔" وہ لاجواب ہو کر چپ ہو گیا۔
"تم نے زندگی تاش کا کھیل سمجھ کر جی ہے اور اس کتاب کو بھی ایسے ہی لکھا ہے۔" وہ کہہ رہی تھی وہ سن رہا تھا۔ "زندگی 52 پتوں کا کھیل تو نہیں ہے۔ ان 250 صفحوں میں اعترافات ہیں لیکن کوئی ایسی بات نہیں جسے پڑھ کر تمہاری اولاد تمہارے جیسا بننا چاہے۔ میں چاہتی ہوں تم زندگی کو آب حیات سمجھ کر لکھو جسے پڑھ کر تمہاری اولاد تمہارے جیسا بننا چاہے۔ صرف تمہاری اولاد نہیں۔ کوئی بھی اسے پڑھ کر تمہارے جیسا بننا چاہے۔"
وہ اس سے کہتی رہی۔
"میرے پاس اب شاید مہلت نہیں اتنی۔" سالار نے مدھم آواز میں کہا۔
"تو مہلت مانگو اللہ سے۔ تمہاری تو وہ ساری دعائیں پوری کر دیتا ہے۔" وہ رنجیدہ ہوئی تھی۔
"تم مانگو۔ جو چیز اللہ میرے مانگنے پر نہیں دیتا۔ تمہارے مانگنے پر دے دیتا ہے۔" سالار نے اس سے عجیب سے لہجے میں کہا۔
"مجھے یقین ہے تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ بے حد مایوسی پریشانی اور تمہاری میڈیکل رپورٹس دیکھنے کے باوجود پتا نہیں سالار! مجھے یہ کیوں نہیں لگتا کہ تمہارا اور میرا ساتھ بس زندگی کے اتنے سالوں تک ہے۔ اس طرح ختم ہو سکتا ہے۔" اس نے سالار کا ہاتھ تھاما تھا۔

"مجھے بھی نہیں لگتا۔" وہ بھی عجیب رنجیدگی سے مسکرایا تھا۔ "ابھی تو بہت کچھ ہے جو ہمیں ساتھ کرنا ہے۔ ساتھ حج کرنا ہے۔ تمہارے لیے ایک گھر بنانا ہے۔"

وہ اب وہ ساری چیزیں گنوا رہا تھا جو اسے کرنی تھیں۔ یوں جیسے اندھیرے میں جگنو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہو۔

امامہ نے سر جھکا لیا۔ وہ بھی اندھیرے میں صرف جگنو دیکھنا چاہتی تھی اندھیرا نہیں۔



آپریشن ٹیبل پر لیٹے انستھیزیا لینے کے بعد، بے ہوشی میں جانے سے پہلے، سالار ان سب کے بارے میں سوچتا رہا تھا جن سے وہ پیار کرتا تھا۔ امامہ جو آپریشن تھیٹر سے باہر بیٹھی تھی۔ سکندر عثمان جو اس عمر میں بھی اس کے منع کرنے کے باوجود اس کو اپنی نظروں کے سامنے سرجری کے لیے بھیجنا چاہتے تھے۔ اس کی ماں جو اس کے بچوں کو پاکستان میں سنبھالے بیٹھی تھی۔ اور اس کی اولاد۔ جبرل۔ حمین۔ عنایہ۔ رئیسہ۔ اس کی نظروں کے سامنے باری باری ایک ایک چہرہ آ رہا تھا۔ جبرل کے علاوہ اس کے سب بچوں کو صرف یہ پتا تھا کہ ان کے بابا کا ایک چھوٹا سا آپریشن تھا اور بس آپریشن کروا کر وہ ٹھیک ہو جائیں گے لیکن امریکہ آنے سے پہلے اس انکشاف پر عنایہ پہلی دفعہ پریشان ہونا شروع ہوئی تھی۔ سالار کی تسلیوں کے باوجود آپریشن کا لفظ اسے سمجھ میں آ رہا تھا۔

"Baba is a boy and boys are brave."

حمین نے اسے تسلی دی تھی۔

اور رئیسہ۔ جو اس کے لیے ہمیشہ گھر آنے پر لان کا کوئی پھول یا پتا جو اسے اچھا لگتا تھا وہ توڑ کر رکھتی تھی۔ یہ اس کی عادت تھی۔ اس نے امامہ کو۔ اس نے سالار کو امریکہ سرجری کے لیے جانے سے پہلے ایک زرد رنگ کا بھنڈی دیا تھا۔ وہ اس موسم بہار کا پہلا بھنڈی تھا جو سکندر عثمان کے لان میں کھلا تھا۔ وہ پھول اس کے بیگ میں تھا۔ مرجھایا ہوا۔ اس نے پچھلی رات بیگ کھولنے پر اسے دیکھا تھا۔

غنودگی کی حالت میں جاتے ہوئے وہ عجیب چیزیں سوچنے اور دیکھنے لگا تھا یوں جیسے اپنے ذہن پر اپنا کنٹرول کھو بیٹھا ہو۔ آیتیں جو وہ پڑھ رہا تھا وہ پڑھتے ہوئے اب اس کی زبان آہستہ آہستہ سوئی ہونا شروع ہو گئی تھی۔ وہ اٹکنے لگا تھا پھر ذہن وہ لفظ کھوجنے میں ناکام ہونے لگا جو وہ پڑھ رہا تھا۔ چہرے، آوازیں، سوچیں، سب کچھ آہستہ آہستہ گم ہونا شروع ہوئیں پھر غائب ہوتی چلی گئیں۔



چار گھنٹے کا وہ آپریشن چار سے پانچ، چھ، سات اور پھر آٹھ گھنٹے تک چلا گیا تھا۔ وہ آٹھ گھنٹے امامہ کی زندگی کے سب سے مشکل ترین گھنٹے تھے۔ سکندر عثمان، فرقان اور سالار کے دونوں بڑے بھائی وہاں موجود تھے۔ اسے حوصلہ اور تسلی دے رہے تھے مگر وہ گم صم ان آٹھ گھنٹوں میں صرف دعائیں کرتی رہی تھی۔ وہ ذہن اور صلاحیتیں جو اللہ کی نعمت کے طور پر سالار سکندر کو عطا کی گئی تھیں۔ اس کی دعا تھی اللہ ان نعمتوں کو سالار کو عطا کیے رکھے۔ صحت، زندگی جیسی نعمتوں کا زوال نہ ہو اس پر۔ آٹھ گھنٹے میں وہ اپنی فیملی کے اصرار اور خود باوجود کوشش کے کچھ کھا پی نہیں سکی تھی۔ وہ پچھلی ساری رات بھی جاگتی رہی تھی۔ وہ بھی سالار بھی۔ وہ باتیں بھی نہیں کرتے رہے تھے۔ بس خاموش بیٹھے رہے پھر کافی پینے چلے گئے۔ وہاں سے واپسی کے راستے میں بھی کافی کے کپ ہاتھ میں لیے چلتے ہوئے وہ دونوں کچھ بھی نہیں بولے تھے۔ اگر بات کی بھی تھی تو موسم کی۔ کافی کی۔

بچوں کی۔۔۔ اور کچھ بھی نہیں۔
آپریشن تھیٹر جانے سے پہلے وہ اس سے گلے ملا تھا۔ اسی انداز میں جس میں وہ ہمیشہ اس سے ملتا تھا۔ جب بھی اس سے رخصت ہوتا تھا اور اس نے ہمیشہ کی طرح سالار سے وہی کہا تھا جو وہ اس سے کہتی تھی۔ "waiting will be" وہ سر ہلا کر مسکرا دیا تھا۔ اس سے نظریں چرائے شاید وہ جذباتی نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ بھی رونا نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم اس وقت۔۔۔ اور وہ نہیں روئی تھی کم از کم اس کے سامنے آپریشن تھیٹر کا دروازہ بند ہونے تک۔۔۔

اس کے بعد وہ خود پر قابو نہیں رکھ پائی تھی۔ اسے امید بھی تھی اور اللہ کی ذات پر یقین بھی۔۔۔ اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو واہموں، اندیشوں، وسوسوں سے بے نیاز نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ اب اس کی زندگی کا حصہ بن گئے تھے۔
ان آٹھ گھنٹوں میں پتا نہیں اس نے کتنی دعائیں، کتنے وظیفے کیے تھے۔۔۔ اللہ کے رحم کو کتنی بار پکارا تھا۔۔۔ امامہ نے گنتی نہیں کی تھی۔
آپریشن کا بڑھتا ہی جانے والا وقت جیسے اس کی تکلیف، اذیت اور اس کے خوف کو بھی بڑھاتا جا رہا تھا۔
آٹھ گھنٹے کے بعد بالآخر اسے آپریشن کے کامیاب ہونے کی اطلاع تو مل گئی تھی۔ ڈاکٹرز نے اس کا ایک ٹیومر ختم کر دیا تھا۔۔۔ دوسرا نہیں کر سکے تھے۔۔۔ اسے سرجری کے ذریعے ریموو کرنا بے حد خطرناک تھا۔۔۔ وہ بے حد نازک جگہ پر تھا۔۔۔ بے حد کامیابی سے اسے ہٹانے کی صورت میں بھی ڈاکٹرز کو خدشہ تھا کہ سالار کے دماغ کو کوئی نقصان پہنچے بغیر یہ نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔ سرجری کے بغیر اسے ادویات اور دوسرے طریقوں سے کنٹرول کرنا زیادہ بہتر تھا کیونکہ اس میں فوری طور پر سالار کی زندگی اور دماغ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں تھا۔
ساڑھے آٹھ گھنٹے کے بعد امامہ اور سکندر عثمان نے بالآخر اسے دیکھا تھا۔۔۔ وہ ابھی ہوش میں نہیں تھا اور اسے کچھ گھنٹوں کے بعد ہوش آنا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد ڈاکٹرز آپریشن کی صحیح طرح کامیابی منا سکتے تھے، جب وہ ہوش میں آنے کے بعد بات چیت کرنا شروع کرتا، اپنی فیملی کو پہچانتا۔ اپنے ذہن کے متاثر نہ ہونے کا ثبوت دیتا۔
امامہ ایک دریا پار کر آئی تھی۔ اب آگے ایک اور دریا کا سامنا تھا۔ امامہ سالار کو بہت دیر تک نہیں دیکھ سکی۔
وہ زندگی میں دوسری بار اسے اس طرح دیکھ رہی تھی۔۔۔ بے بسی کی حالت میں زندگی اور موت سے لڑتے ہوئے۔
پہلی بار اس نے اپنی شادی سے پہلے اسے تب دیکھا تھا جب اس نے کلائی کاٹ کر خودکشی کی کوشش کی تھی۔۔۔ اور اب اتنے سالوں بعد وہ اسے ایک بار پھر اس حالت میں دیکھ رہی تھی۔ تاروں اور ٹیوبز میں جکڑا ہوا۔۔۔ وہ اسے دیکھنے کی کوشش کرنے کے باوجود اس پر نظر نہیں جما سکی، وہ وہاں سے باہر آ گئی۔
وہ لوگ اب اسپتال میں نہیں ٹھہر سکتے تھے۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اسپتال سے واپس اس کرائے کے اپارٹمنٹ میں آنا پڑا تھا جہاں وہ لوگ رہ رہے تھے۔
سکندر عثمان اس کے ساتھ تھے۔۔۔ سالار کے دونوں بھائی اور فرقان اسپتال کے قریب اپنے کچھ دوستوں کے ہاں رہ رہے تھے۔ سکندر عثمان کو ان کے کمرے میں چھوڑ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔۔۔ وہاں عجیب سناٹا تھا۔۔۔ یا شاید وحشت تھی۔۔۔ وہ بے حد تھکی ہوئی تھی، سونا چاہتی تھی اس کے باوجود سو نہیں پا رہی تھی۔ یوں جیسے وہ بے خوابی کا شکار ہو گئی تھی۔
اس کے اسمارٹ فون پر جبریل اسکائپ پر آن لائن نظر آ رہا تھا۔ وہ بے اختیار اسے کال کرنے لگی۔
"بابا کیسے ہیں؟" اس نے سلام دعا کے بعد پہلا سوال کیا۔
"وہ ٹھیک ہیں، آپریشن ٹھیک ہو گیا ہے۔ ڈاکٹرز اب ان کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔" وہ اس کو بتانے لگی۔

"آپ پریشان نہ ہوں' وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔" وہ ہمیشہ کی طرح ماں کو تسلی دے رہا تھا۔
"جبریل! تم تلاوت کرو کسی ایسی سورۃ کی۔۔۔ کہ مجھے نیند آجائے۔"
وہ اولاد کے سامنے اتنی بے بس اور کمزور ہو کر آنا نہیں چاہتی تھی لیکن ہو گئی تھی۔
جبریل نے لیپ ٹاپ کی اسکرین اور اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھا پھر جیسے اس نے ماں کی تکلیف کم کرنے کی کوشش کی۔
"آپ کو سورۃ رحمان سناؤں؟"
"ہاں۔"
"او کے میں وضو کر کے آتا ہوں۔۔۔ آپ بستر پر لیٹ جائیں۔" وہ پچھلے دو دن میں پہلی بار مسکرائی تھی۔
وہ وضو کے بغیر زبانی کوئی چھوٹی بڑی آیت بھی نہیں پڑھتا تھا۔۔۔ یہ احترام انہوں نے اسے نہیں سکھایا تھا۔۔۔ یہ اس کے اندر تھا۔ قرآن پاک کو حفظ کرنے کی خواہش کا اظہار بھی ان کی طرف سے ہونے سے بہت پہلے اس کی طرف سے ہوا تھا۔ وہ تب صرف تین سال کا تھا اور سالار کو روزانہ بلاناغہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے دیکھتا تھا پھر ایک دن اس نے امامہ سے پوچھا تھا۔
"بابا کیا پڑھتے ہیں؟"
"وہ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں جیسے تم قاعدہ پڑھتے ہو۔" امامہ نے اسے بتایا۔
"لیکن قاعدہ تو بہت چھوٹا ہے۔" جبریل نے جیسے اپنی مایوسی ظاہر کی۔
"جب تم قاعدہ پڑھ لو گے پھر قرآن پاک پڑھنا۔"
"لیکن وہ تو میں بہت دفعہ پڑھ چکا ہوں۔" وہ اپنا قرآنی قاعدہ واقعی کئی دفعہ پڑھ چکا تھا۔ اسے سبق دینے' دہرائی کروانے اور اگلے دن سننے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ وہ قرآنی قاعدے کا کوئی حرف' کوئی آواز نہیں بھولتا تھا اور یہ اس پہلے دن سے تھا جب اس نے قرآنی قاعدہ پڑھنا شروع کیا تھا۔ اس کے باوجود امامہ اور سالار اسے فوری طور پر پہلے سپارے پر نہیں لائے تھے' وہ اسے چھوٹی چھوٹی سورتیں اور قرآنی دعائیں یاد کرواتے تھے۔ اور جبریل وہ بھی برق رفتاری سے کر رہا تھا۔ سالار اسے قرآن پاک اس عمر میں پڑھانا چاہتا تھا جب وہ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے سمجھ بھی پائے۔
"بابا کو یہ ساری کتاب یاد ہے؟" جبریل نے اس قرآن پاک کی ضخامت کو اپنے ننھے سے ہاتھ کی انگلیوں میں لے کر ناپنے کی کوشش کی جو سالار کچھ دیر پہلے پڑھ رہا تھا اور پڑھتے ہوئے ٹیبل پر چھوڑ کر گیا تھا۔
"ہاں!" امامہ اس کے تجسس سے محظوظ ہوئی تھی۔
"ساری؟" جبریل نے جیسے کچھ بے یقینی سے ماں سے پوچھا۔
"ساری۔" امامہ نے اس کے تجسس کو جیسے اور بڑھایا۔
جبریل میز کے قریب کھڑا سوچ میں گم قرآن پاک کی چوڑائی اور موٹائی کو ایک بار پھر اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے ناپتا رہا پھر اس نے اپنا کام ختم کرتے ہوئے امامہ سے کہا۔
"واؤ!!"
امامہ بے اختیار ہنسی۔ اس نے باپ کو پورے حساب کتاب کے بعد داد دی تھی۔
"مجھے بھی قرآن پاک زبانی یاد کرنا ہے۔۔۔ میں کر سکتا ہوں کیا؟" اس نے امامہ کی ہنسی سے کچھ نادم ہونے کے باوجود ماں سے پوچھا۔
"ہاں بالکل کر سکتے ہو۔۔۔ اور ان شاء اللہ کرو گے۔"

"کب؟"
"جب تم بڑے ہو جاؤ گے۔"
"بابا جتنا؟" جبریل کچھ خوش نہیں ہوا تھا۔
"نہیں بس تھوڑا سا بڑا۔" امامہ نے اسے تسلی دی۔
"او کے اور جب میں قرآن پاک حفظ کرلوں گا تو میں بھی بابا کی طرح قرآن پاک کھولے بغیر پڑھا کروں گا۔"
"بالکل پڑھنا۔" امامہ نے جیسے اس کی حوصلہ افزائی کی۔
"اور آپ کو بھی سناؤں گا۔ پھر آپ بھی آنکھیں بند کر کے سننا جیسے آپ بابا کو سنتی ہیں۔" اس نے ماں سے کہا تھا۔
اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ وقت اتنا جلدی آئے گا کہ وہ خود اس سے قرآن پاک کی تلاوت کرنے کی فرمائش کرے گی۔
"ممی۔ آپ سو گئیں؟" اس نے جبریل کی آواز پر ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں اور سائیڈ ٹیبل پر پڑا فون اٹھالیا۔ وہ اسکائپ کی ونڈو میں نظر آرہا تھا۔
"نہیں۔" امامہ نے کہا۔
"میں شروع کروں؟" جبریل نے کہا۔
"ہاں۔" سر پر ٹوپی رکھے ہاتھ سینے پر باندھے وہ اپنی خوب صورت آواز میں سورہ رحمان کی تلاوت کر رہا تھا۔ اسے سالار سکندر یاد آنا شروع ہو گیا۔ وہ اس سے یہی سورۃ سنتی تھی اور جبریل کو جیسے یہ بات بھی یاد تھی۔
یہ پہلا موقع تھا جب اسے اندازہ ہوا کہ صرف سالار سکندر کی تلاوت اس پر اثر نہیں کرتی تھی۔ دس سال کی عمر میں اس کا بیٹا اس سورۃ کی تلاوت کرتے ہوئے اپنی ماں کو اسی طرح مسحور اور دم بخود کر رہا تھا۔ اس کی آواز میں سوز تھا۔ اس کا دل جیسے پگھل رہا تھا۔ ایسے جیسے کوئی ٹھنڈے پھاہوں کے ساتھ اس کے جسم کے رستے زخموں کو صاف کر رہا ہو۔
"فبای الاء ربکما تکذبٰن۔" (اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)
وہ ہر بار پڑھتا ہر بار اس کا دل بھر آتا۔ بے شک اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار تھیں۔ وہ شکر ادا نہیں کر سکتی تھی... اور سب سے بڑی نعمت وہ اولاد تھی جس کی آواز میں اللہ تعالیٰ کا وہ اعلان اس کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ بار بار پہنچ رہا تھا۔
"ممی!" جبریل نے تلاوت ختم کرنے کے بعد بے حد مدھم آواز میں اسے پکارا۔ یوں جیسے اسے آنکھیں بند کیے دیکھ کر اسے خیال آیا ہو کہ شاید وہ تلاوت سنتے ہوئے سو گئی ہے اور وہ اسے جگانا نہ چاہتا ہو۔ وہ سوئی نہیں تھی لیکن سکون میں تھی جیسے کسی نے اس کے سر اور کندھوں کا بوجھ اتار کر اسے ہلکا کر دیا ہو۔
"جبریل! تم عالم بننا۔" آنکھیں بند کیے اس نے جبریل سے کہا۔ "تمہاری آواز میں بہت تاثیر ہے۔"
"ممی! مجھے نیورو سرجن بننا ہے۔" وہ ایک لمحہ خاموش رہا تھا اور پھر اسی مدھم آواز میں اس نے ماں کو اپنی زندگی کی اگلی منزل بتا دی تھی۔
امامہ نے آنکھیں کھول لیں۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔
"میری خواہش ہے کہ تم عالم بنو۔" امامہ نے اس بار زور دے کر کہا وہ جانتی تھی۔ وہ نیورو سرجن کیوں بننا چاہتا تھا۔
"حمین زیادہ اچھا عالم بن سکتا ہے۔ میں نہیں۔" وہ الجھا جھجکا۔

"تم زیادہ لائق اور قابل ہو بیٹا۔"

"سوچوں گا۔۔۔ آپ سو جائیں۔" اس نے ماں سے بحث نہیں کی بات بدل دی۔



وہ دس سال کا تھا جب اس کے باپ کی موت ہوئی تھی اور اس موت نے اسے اس کی ماں اور اس کے بہن بھائیوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

وہ سب سے بڑا تھا۔ ماں باپ کا لاڈلا تھا۔ ایسی اولاد جس پر ماں باپ کو فخر تھا۔ اس کی ذہانت' قابلیت' سمجھداری' فرماں برداری سب پر۔۔۔ اور یہ اس کا کمال نہیں تھا یہ اس کی تربیت کا کمال تھا جو اس کے ماں باپ نے کی تھی۔ وہ سب بہن بھائی ایسے ہی تھے۔ وہ ایک آئیڈیل خوش و خرم خاندان تھا۔ بے حد مذہبی نہیں تھا لیکن بڑی حد تک عملی طور پر مذہبی تھا۔

باپ کی موت اچانک ہوئی تھی اور وہ اس سے سنبھل نہیں سکا۔ اگلے کئی سال۔۔۔ وہ تعلیم میں دلچسپی لینے۔۔۔ زندگی میں کچھ کرنے۔۔۔ اور بڑا نام بنانے کے اس کے سارے خوابوں کے ہے۔

خاتمے کا سال تھا اور یہی وہ سال تھا جب اس نے اپنے باپ کے ایک اچھے جاننے والے اور ان کے ہمسائے میں رہنے والے ایک خاندان میں بہت زیادہ آنا جانا شروع کر دیا۔۔۔ یہی وہ وقت تھا جب اس نے دنیا کے ہر مذہب میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔۔۔ اپنے مذہب کے علاوہ۔۔۔ ہر مذہب میں۔۔۔ اس خاندان نے اس کی زندگی کے ایک بہت مشکل مرحلے پر اس کی زندگی میں جیسے ایک اینکر ایک سپورٹ کا کام کیا تھا۔

وہ اگر گیارھویں سال میں محبت کا شکار ہوا تھا تو امریکہ جیسے معاشرے میں کوئی اہم بات نہیں تھی۔ اسے محبت نہیں کرش سمجھا جا سکتا تھا لیکن اسے یہ یقین تھا کہ اسے اس لڑکی سے محبت تھی اور وہ ہمیشہ اس لڑکی کے ساتھ رہنا چاہتا تھا' ان کے گھر کا حصہ بن کر' ان کے خاندان کا حصہ بن کر۔۔۔ اور ان کا مذہب اختیار کر کے۔۔۔ ان جیسا نام رکھ کر۔



گرینڈ حیات ہوٹل کا بال روم اس وقت Scripps National spelling Bee کے 92 ویں مقابلے کے دو فائنلسٹس سمیت دیگر شرکا ان کے والدین' بہن بھائیوں اور اس مقابلے کو دیکھنے کے لیے موجود لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہونے کے باوجود اس وقت پن ڈراپ سائلنس کا منظر پیش کر رہا تھا۔

دونوں فائنلسٹ کے درمیان راؤنڈ 14 کھیلا جا رہا تھا۔ 13 سالہ ٹیسی اپنا لفظ اسپیل کرنے کے لیے اس وقت اپنی جگہ پر آ چکی تھی۔ پچھلے 92 سالوں سے اس بال روم میں دنیا کے بیسٹ اسپیلر کی تاجپوشی ہو رہی تھی۔ امریکہ کی مختلف ریاستوں کے علاوہ دنیا کے بہت سارے ممالک میں اسپیلنگ بی کے مقامی مقابلے جیت کر آنے والے پندرہ سال سے کم عمر کے بچے اس آخری راؤنڈ کو جیتنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے ایسی ہی ایک بازی کے شرکا آج بھی اسٹیج پر تھے۔

"Sassafras" ٹیسی نے رکی ہوئی سانس کے ساتھ پروناؤنسر کا لفظ سنا۔ اس نے پروناؤنسر کو لفظ دہرانے کے لیے کہا پھر اس نے خود اس لفظ کو دہرایا۔ وہ چیمپئن شپ ورڈز میں سے ایک تھا لیکن فوری طور پر اسے وہ یاد

نہیں آسکا بہر حال اس کی ساؤنڈ سے وہ اسے بہت مشکل نہیں لگا تھا اور اگر سننے میں اتنا مشکل نہیں تھا تو اس کا مطلب تھا وہ ٹرکی لفظ ہو سکتا تھا۔

نو سالہ دوسرا فائنلسٹ اپنی کرسی پر بیٹھا' گلے میں لٹکے اپنے نمبر کارڈ کے پیچھے انگلی سے اس لفظ کو اسپیل کرنے میں لگا ہوا تھا۔ وہ اس کا لفظ نہیں تھا لیکن وہاں بیٹھا ہر وہ بچہ بھی غیر ارادی طور پر اس وقت یہی کرنے میں مصروف تھا جو مقابلے سے آؤٹ ہو چکا تھا۔

فینسی کا ریگولر ٹائم ختم ہو چکا تھا۔ اس نے لفظ کو اسپیل کرنا شروع کیا۔ S-S-A-S وہ پہلے چار لیٹرز بتانے کے بعد ایک لمحے کے لیے رکی۔ زیر لب اس نے باقی کے پانچ لیٹرز دہرائے پھر دوبارہ بولنا شروع کیا۔

"A-F-R" وہ ایک بار پھر رکی دوسرے فائنلسٹ نے بیٹھے بیٹھے زیر لب آخری دو لیٹرز کو دہرایا "S-U" مائیک کے سامنے کھڑی فینسی نے بھی بالکل اسی وقت یہی دو لیٹرز بولے اور پھر بے یقینی سے اس گھنٹی کو بجتے سنا جو اسپیلنگ کے غلط ہونے پر بجتی تھی۔ حیرت صرف اس کے چہرے پر نہیں تھی اس دوسرے فائنلسٹ کے چہرے پر بھی تھی۔ پرونا ونسر اب Sassafras کی درست اسپیلنگ دہرا رہا تھا۔ فینسی نے بے اختیار اپنی آنکھیں بند کیں۔

"آخری لیٹر سے پہلے A ہی ہونا چاہیے تھا۔ میں نے U کیا سوچ کر لگا دیا۔" اس نے خود کو کوسا۔

تقریباً "ق رگنت" کے ساتھ فینسی کراہتم نے مقابلے کے شرکا کے لیے رکھی ہوئی کرسیوں کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ یہ رنر اپ کو کھڑے ہو کے داد دی جا رہی تھی نو سالہ دوسرا فائنلسٹ بھی اس کے لیے کھڑا تالیاں بجا رہا تھا۔ اس کے قریب پہنچنے پر اس نے فینسی سے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ فینسی نے ایک مدھم مسکراہٹ کے ساتھ اسے جواباً "وش کیا اور اپنی سیٹ سنبھال لی۔ ہال میں موجود لوگ دوبارہ اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے اور وہ دوسرا فائنلسٹ مائیک کے سامنے اپنی جگہ پر آچکا تھا۔ فینسی نے کسی موہوم سی امید کے ساتھ اسے دیکھنا شروع کیا۔ اگر وہ بھی اپنے لفظ کو مس اسپیل کرتا تو وہ ایک بار پھر فائنل راؤنڈ میں واپس آجاتی۔

"That was a catch 22۔" اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ وہ اندازہ نہیں لگا کی وہ اس کے لیے کہہ رہا تھا یا وہ اس لفظ کو واقعی اپنے لیے بھی catch 22 سمجھ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی ایسا ہو تا۔ کوئی بھی ہو تا۔ یہی چاہتا۔

سینٹر اسٹیج پر اب وہ نو سالہ فائنلسٹ تھا۔ اپنی شرارتی مسکراہٹ اور گہری سیاہ چمکتی آنکھوں کے ساتھ۔ اس نے اسٹیج پر کھڑے چیف پروناؤنسر کو دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ جوناتھن جواباً" مسکرایا تھا اور ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ رکھنے والا وہ وہاں واحد نہیں تھا۔ وہ نو سالہ فائنلسٹ اس چیمپئن شپ کو دیکھنے والے کراؤڈ کا سویٹ ہارٹ تھا۔

اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ چمکتی ہوئی تقریباً" گول آنکھیں جو کسی کارٹون کریکٹر کی طرح بے حد animated تھیں اور اس کے تقریباً" گلابی ہونٹ۔ جن پر وہ وقتاً" فوقتاً" زبان پھیر رہا تھا اور جن پر آنے والا ذرا سا خم بہت سے لوگوں کو بلاوجہ مسکرانے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ معصوم فتنہ تھا' یہ صرف اس کے والدین جانتے تھے جو دوسرے بچوں کے والدین کے ساتھ اسٹیج کی بائیں طرف پہلی صف میں اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

وہاں بیٹھے دوسرے فائنلسٹ کے والدین کے برعکس وہ بے حد پرسکون تھے ان کے چہرے پر ایسی کوئی ٹینشن نہیں تھی جب ان کا بیٹا چیمپئن شپ ورڈ کے لیے آکر کھڑا ہوا تھا۔ ٹینشن اگر کسی کے چہرے پر تھی تو وہ ان کی سات سالہ بیٹی کے چہرے پر تھی جو دو دن پر مشتمل اس پورے مقابلے کے دوران دباؤ میں رہی تھی اور وہ اب بھی آنکھوں پر گلاسز لگائے پورے انہماک کے ساتھ اپنے نو سالہ بھائی کو دیکھ رہی تھی جو پروناؤنسر کے لفظ کے لیے تیار تھا۔

"Cappelletti" جوناتھن نے لفظ ادا کیا۔ اس فائنلسٹ کے چہرے پر بے اختیار ایسی مسکراہٹ آئی جیسے وہ بمشکل اپنی ہنسی کو کنٹرول کر رہا ہو۔ اس کی آنکھیں پہلے کلاک وائز پھر اینٹی کلاک وائز گھومنا شروع ہو گئی تھیں۔ ہال میں کچھ کھلکھلاہٹیں ابھری تھیں۔

اس نے اس چیمپئن شپ میں اپنا ہر لفظ سننے کے بعد اسی طرح ری ایکٹ کیا تھا۔ بھینچی ہوئی مسکراہٹ اور گھومتی ہوئی آنکھیں۔۔۔ کمال کی خود اعتمادی تھی۔ کئی دیکھنے والوں نے اسے داد دی۔ اس کے حصے میں آنے والے الفاظ دوسروں کی نسبت زیادہ مشکل تھے۔ یہ اس کی بیڈ لک تھی لیکن بے حد روانی سے بغیر اٹکے بغیر گھبرائے اسی پراعتماد مسکراہٹ کے ساتھ وہ ہر پہاڑ سر کرتا رہا تھا اور اب وہ آخری چوٹی کے سامنے کھڑا تھا۔

Definition Please (تعریف؟) اس نے اپنا ریگولر ٹائم استعمال کرنا شروع کیا۔

"Language of origin۔" (زبان کا ماخذ؟)

اس نے پروناؤنسر کے جواب کے بعد اگلا سوال کیا۔ "اٹالین" اس نے پروناؤنسر کے جواب کو دہراتے ہوئے کچھ سوچنے والے انداز میں ہونٹوں کو دائیں بائیں حرکت دی۔ اس کی بہن بے حد پریشانی اور دباؤ میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے والدین اب بھی پرسکون تھے اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ لفظ اس کے لیے آسان تھا۔ وہ ایسے ہی تاثرات کے ساتھ پچھلے تمام الفاظ کو اسپیل کرتا رہا تھا۔

"Use in a sentence please۔" (اسے جملے میں استعمال کریں)

وہ اب پروناؤنسر سے کہہ رہا تھا۔ پروناؤنسر کا بتایا ہوا جملہ سننے کے بعد اس نے گلے میں لٹکے ہوئے نمبر کارڈ کی پشت پر انگلی سے اس لفظ کو اسپیل کیا۔

"Your Finish Time starts۔"

اسے ان آخری 30 سیکنڈز کے شروع ہونے پر اطلاع دی گئی جس میں اس نے اپنے لفظ کو اسپیل کرنا تھا۔ اس کی آنکھیں بالآخر گھومنا بند ہو گئیں۔

"Cappelleti" اس نے ایک بار پھر اپنے لفظ کو دہرایا اور پھر اسے اسپیل کرنا شروع ہو گیا۔

"C-a-p-p-e-l-l-" وہ اسپیلنگ کرتے ہوئے ایک لمحہ رکا پھر ایک سانس لیتے ہوئے اس نے دوبارہ اسپیل کرنا شروع کیا۔

"e-t-t-i-" ہال تالیوں سے گونج اٹھا اور بہت دیر تک گونجتا رہا۔

اسپیلنگ بی کا نیا چیمپئن صرف ایک لفظ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔

تالیوں کی گونج تھمنے کے بعد جوناتھن نے اسے آگاہ کیا تھا کہ اسے اب ایک اضافی لفظ کو اسپیل کرنا تھا اس نے سرہلایا۔ اس لفظ کو اسپیل نہ کر سکنے کی صورت میں نینسی ایک بار پھر مقابلے میں واپس آجاتی۔

"weissnichtwo" اس کے لیے لفظ پروناؤنس کیا گیا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوئی تھی پھر اس کا منہ کھلا اور اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"او! مائی گاڈ؟" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ شاکڈ تھا اور پوری چیمپئن شپ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی آنکھیں اور وہ خود اس طرح جامد ہوا تھا۔

نینسی بے اختیار اپنی کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ تو بالآخر کوئی ایسا لفظ آگیا تھا جو اسے دوبارہ چیمپئن شپ میں واپس لا سکتا تھا۔

اس کے والدین کو پہلی بار اس کے تاثرات نے کچھ پریشان کیا تھا۔ کیا crunch تھا ان کا بیٹا اب اپنے نمبر کارڈ سے اپنا چہرہ حاضرین سے چھپا رہا تھا۔ حاضرین اس کی انگلیوں اور ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑی آسانی سے اسکرین پر دیکھ سکتے تھے اور ان میں سے بہت سوں نے اس بچے کے لیے واقعی بہت ہمدردی محسوس کی تھی۔ وہاں بہت کم ایسے تھے جو اسے جیتتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

ہال میں بیٹھا ہوا صرف ایک فرد ریلیکسڈ تھا۔ ریلیکسڈ؟ یا ایکسائیٹڈ؟ کہنا مشکل تھا اور وہ اس بچے کی سات سالہ بہن تھی جو اب اپنے ماں باپ کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی اور جس نے بھائی کے تاثرات پر پہلی بار بڑے اطمینان کے ساتھ کرسی کی پشت کے ساتھ مسکراتے ہوئے ٹیک لگائی تھی۔ گود میں رکھے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو بہت آہستہ آہستہ اس نے بے تابی کے انداز میں بجانا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ماں باپ نے بیک وقت اس کے تالی بجاتے ہاتھوں اور اس کے مسکراتے چہرے کو الجھے ہوئے انداز میں دیکھا پھر اسٹیج پر اپنے لرزتے کانپتے کنفیوزڈ بیٹے کو جو نمبر کارڈ کے پیچھے اپنا چہرہ چھپائے انگلی سے نمبر کارڈ کے پیچھے کچھ لکھنے اور بڑبڑانے میں مصروف تھا۔

ہال اب آہستہ آہستہ تالیاں بجا رہا تھا۔ وہ اب اپنا کارڈ نیچے کر چکا تھا یوں جیسے ذہنی تیاری کر چکا ہو۔

92 ویں اسپیلنگ بی کے فائنل مقابلے میں پہلی بار پہنچنے والا وہ فائنلسٹ اپنی قسمت آزمانے کے لیے تیار تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادی ہے۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی' جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی ہم عمر سات سالہ بہن مسکرادی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کررہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کردیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس سے بھی انکار کردیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہورہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہوکر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

سترہویں قسط

ابدا "لبدا"

" w-e-i-s-s-n-i-c-h-t-w-o " حمین سکندر نے ایک ہی سانس میں رکے بغیر Championship word کے ہجے کیے ___ کسی روبوٹ کی طرح ہنار کے۔ خلا میں دیکھتے ہوئے۔ یوں جیسے وہ ان حروف کو خلا میں کہیں لکھا دیکھتے ہوئے پڑھ رہا تھا۔ وہ اس مقابلے کا پہلا لفظ تھا جسے اس نے ہنار کے اس طرح ادا کیا تھا ورنہ وہ ہر لفظ کو سوچ سوچ کر ہجے کرتا تھا یوں جیسے ناپ تول رہا ہو۔

" An unknown place " (ایک نامعلوم مقام) اس نے لفظ کے ہجے کرتے ہی اسی رفتار سے اس کا مطلب بتایا۔ پھر اس کی نظر pronouncer پر گئی۔ pronouncer کے منہ سے نکلی "درست" کی آواز ہال میں گونج اٹھنے والی تالیوں کی آواز میں گم ہو گئی تھی۔ ہال میں اب حاضرین، والدین اور بچے اپنی اپنی سیٹوں سے تالیاں بجاتے ہوئے کھڑے ہو رہے تھے۔ وہ 92nd اسپیلنگ بی کے نئے فاتح کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے جو اسٹیج پر فلیش لائٹس اور ٹی وی کیمروں کی چکاچوند کر دینے والی روشنیوں میں ساکت کھڑا تھا۔ دم سادھے۔ گنگ۔ اس کی گول آنکھیں گھومنا تک بھول گئی تھیں۔ یوں جیسے وہ ابھی تک اس شاک سے نکل نہ پایا ہو کہ وہ جیت چکا ہے۔ یہ حمین سکندر تھا اور یہ حمین سکندر ہی ہو سکتا تھا۔

تالیوں کی بہرا کر دینے والی گونج اور کیمروں کی خیرہ کر دینے والی روشنیوں میں اس نو سالہ بچے نے خود کو سنبھالا۔ اپنے اعصاب اور حواس پر ایک ہی وقت میں قابو پانے کی کوشش کی اور پھر جو پہلا جملہ اس کے سامنے لگے مائیک نے حاضرین تک پہنچایا تھا اس نے ان تالیوں کی گونج میں ایک بلند شگاف قہقہے کی آواز کو بھی شامل کیا تھا۔

"وہ۔ او مائی گاڈ۔" وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں بول سکا۔ حاضرین کی ہنسی نے جیسے اسے کچھ اور نروس کیا۔ پھر نادم۔ پھر پرجوش اور پھر اس نے سر جھکا کر حاضرین کی تالیوں کا جواب دیا۔ پھر ایک قدم آگے بڑھا کر ججز کی اس قطار کا جو حاضرین سے کچھ آگے بیٹھے ہوئے تھے لیکن اب کھڑے تالیاں بجا رہے تھے۔ پھر اس نے پلٹ کر اس طرف دیکھا تھا جہاں اس کے ماں باپ اور رئیسہ بیٹھے تھے۔ وہ بھی اب سب کے ساتھ کھڑے اس کے لیے تالیاں بجا رہے تھے۔

حمین سکندر تقریباً بھاگتا ہوا ان کی طرف گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ سپاٹ لائٹ بھی گئی جو اس سے پہلے اسٹیج پر اس کو فوکس کیے ہوئے تھی۔ وہ ___ تالیاں بجاتی اور آنسو بہاتی امامہ سے آکر لپٹا تھا۔ پھر اس سے الگ ہوتے ہوئے اس نے اسی تیزی سے امامہ کے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو دونوں ہاتھوں سے رگڑے پھر ان ہاتھوں کو اپنی شرٹ پر رگڑتے ہوئے وہ سالار سے لپٹ گیا۔ I make you proud Did "(کیا آپ کو مجھ پر فخر ہوا)" اس نے ہمیشہ کی طرح باپ سے پوچھا۔

" Very proud " (بہت فخر) اس نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھیں چمکیں۔ مسکراہٹ گہری ہوئی۔ پھر وہ رئیسہ کی طرف گیا۔ دونوں ہتھیلیاں پھیلاتے ہوئے اس نے بازو ہوا میں بلند کرتے ہوئے رئیسہ کے پھیلائے ہوئے ہاتھوں پر ہائی فائی کیا۔ اپنے گلے میں لٹکا نمبر کارڈ اتار کر اس نے رئیسہ کے گلے میں ڈالا۔ پھر جھک کر اسے تھوڑا سا اٹھایا۔ وہ کھکھلائی۔ حمین نے اسے نیچے اتارا اور اسی طرح بھاگتا ہوا واپس اسٹیج کے درمیان چلا گیا جہاں میزبان اب اس سے بات چیت کرنے کے لیے منتظر کھڑا تھا۔

"آخری لفظ کتنا مشکل تھا؟" ابتدائی کلمات کے بعد میزبان نے چھوٹتے ہی اس سے پوچھا۔ وہ چند سیکنڈ پہلے سب فائنلسٹ سے ہاتھ ملاتے "ان کی مبارک باد" وصول کرتے ہوئے اس کے پاس پہنچا تھا۔ ہال میں موجود

سب لوگ اب دوبارہ نشستیں سنبھال چکے تھے اور تقسیم انعامات کی تقریب دیکھنے کے منتظر تھے۔
"آخری لفظ تو بے حد آسان تھا۔" حمین نے بڑے اطمینان سے کندھے اچکا کر کہا۔ ہال میں قہقہہ گونجا۔
"تو پھر مشکل کیا تھا؟" میزبان نے چھیڑ چھاڑ والے انداز میں کہا۔
"اس سے پہلے پوچھے جانے والے سارے الفاظ۔" حمین نے بے حد سنجیدگی سے ترکی بہ ترکی کہا۔ ہال میں پہلے سے زیادہ اونچا قہقہہ بلند ہوا۔
"کیوں؟"
"کیوں کہ میں ہر لفظ بھول گیا تھا۔ بس تکے لگاتا رہا، ہر لفظ کے ہجے کرنے کے لیے۔ بس آخری لفظ تھا جو میں آنکھیں، کان، ناک سب بند کرکے بھی ہجے کر سکتا تھا۔"
وہ روانی سے کہتا گیا ہال میں تالیاں اور قہقہے لگتے رہے۔ وہ اس بچے کی حاضر جوابی، خوش مزاجی اور بذلہ سنجی کی داد دیتے ہوئے محظوظ ہو رہے تھے، لیکن اس کی بات پر یقین نہیں کر رہے تھے۔ ہال میں بیٹھی ہوئی صرف رئیسہ تھی جو یہ جانتی تھی کہ وہ حرف بہ حرف ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آخری لفظ کے علاوہ واقعی سارے لفظ بھولے تھے اور وہ اس کے تاثرات دیکھ کر ہی یہ جان جاتی تھی کہ وہ ایک بار پھر اپنا لفظ ہجے کرنا بھول گیا تھا اور پھر اپنی کرسی پر بیٹھی وہ اپنی انگلیوں کی پوروں پر اس کے لیے دل ہی دل میں دعا کرنا شروع کر دیتی۔
"اور آخری لفظ اتنا آسان کیوں لگا تھا آپ کو۔" میزبان نے پھر پوچھا۔
ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھے دوسرے ہاتھ سے رئیسہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حمین نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔ "کیونکہ میں اور میری بہن weissnichtwo (نامعلوم مقام) سے آئے ہیں۔" ہال ایک بار پھر تالیوں اور قہقہوں سے گونج اٹھا تھا۔ ہال میں لگی اسکرین پر گلاسز لگائے شرماتی ہوئی رئیسہ ابھری تھی جس کے اطراف میں بیٹھے امامہ اور سالار بھی اس کی بات پر ہنس پڑے تھے۔
حمین نے جو کہا تھا، وہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ دونوں پچھلے کئی ہفتوں سے اس ایک لفظ کا استعمال اپنے لیے اتنا باقاعدگی سے کر رہے تھے کہ یہ ان کی روزمرہ کی گفتگو کا حصہ بن گیا تھا۔
رئیسہ اور حمین سمجھتے تھے کہ وہ دونوں کسی نامعلوم تصوراتی دنیا سے آئے تھے۔ جو صرف ان دونوں کو پتا تھی، ان دونوں کو نظر آتی تھی، کسی دوسرے کو نہیں۔ وہ دونوں (انوکھے) تھے اور یہ ان دونوں کا ذاتی خیال تھا۔ یہ پچھلے کچھ ہفتوں میں پائی جانے والی ان دونوں کی نئی فینٹسی کا نام تھا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ حمین سکندر اپنی اس فینٹسی کا نام بھول جاتا جو یک دم اس کے سامنے حقیقت بن کر آگئی تھی۔
رئیسہ فخریہ انداز میں اپنے اس بار شرکو دیکھ رہی تھی جو اس کی طرح weissnichtwo سے آیا تھا اور اس لفظ کو واقعی آنکھیں، کان، ناک بند کیے بھی دہرا سکتا تھا۔ pronouncer کے منہ سے اس ایک لفظ کو سنتے ہی وہ جان گئی تھی کہ وہ چیمپئن شپ اس سال حمین سکندر کے نام ہونے والی ہے بالکل اس طرح جس طرح وہ پچھلے دو سال عنایہ اور جبریل کے نام رہی تھی۔ ان دونوں نے بھی حمین کی طرح پہلی بار شریک ہو کر اس چیمپئن شپ کو اپنے نام کر لیا تھا۔
spelling Bee کی وہ ایکٹوٹی امامہ نے اپنے گھر میں رئیسہ کے لیے اسٹارٹ کی تھی۔ اس کی زبان سیکھنے کی صلاحیت (linguistic skcills) کو بہتر کرنے کے لیے۔ نئے لفظ سیکھنا۔ ان کے ہجے کرنا، انہیں درست تلفظ کے ساتھ بولنا سیکھنا۔ ان کا مفہوم اور پھر روزمرہ کی گفتگو میں ان کا استعمال۔ وہ ایکٹوٹی بڑھتے بڑھتے ان کے لیے ایکٹوٹی نہیں، روٹین کا ایک حصہ بن گئی تھی اور اس روٹین کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ان چاروں بچوں کا (ذخیرہ الفاظ) vocabulary اپنی عمر کے بچوں سے بہت زیادہ اور بہت اچھا تھا۔ مقابلوں میں حصہ لینے کا

خیال بھی انہیں بھی نہ آتا اگر وہ اپنی vocabulary کی وجہ سے پہلے ہی اپنے اسکول میں نمایاں نہ ہوتے۔

حمین کی گفتگو کے دوران جو وہ اپنی تیاری، پریکٹس کی روٹین کے حوالے سے کر رہا تھا، کیمرہ بار بار امامہ اور سالار کو ہال میں لگی بڑی اسکرین پر دکھا رہا تھا۔ کیونکہ وہ اس چیمپئن کے والدین تھے جو اس وقت سینٹر اسٹیج پر تھا۔ ان کے آس پاس بیٹھے دوسرے مقابلے میں حصہ لینے والے بچوں کے والدین وقتاً فوقتاً ان سے آ کر مل رہے تھے۔ وہ مبارک بادیں وصول کر رہے تھے۔ بے حد پرسکون انداز میں دھیمی مسکراہٹوں کے ساتھ۔ یوں جیسے یہ سب کچھ معمول کی بات ہو، عام بات ہو۔ اور واقعی یہ سب ان کے لیے عام سی بات تھی۔ ان کی لائق اولاد نے ان کے لیے یہ سب "عام سی بات" ہی کر دیا تھا۔

زندگی میں اب تک ان سب کی وجہ سے ان دونوں کی زندگی میں ایسے بہت سے فخر کے لمحات آئے تھے۔ ایسے لمحات جن کی یادوں کو وہ ساری عمر عزیز رکھ سکتے تھے۔

"ممی اگلے سال میں حصہ لوں گی۔" ان کے درمیان بیٹھی ہوئی رئیسہ نے اپنے گلے میں لٹکے، حمین کے کارڈ کو ہلاتے ہوئے سرگوشیوں میں امامہ کو اطلاع دی۔ امامہ نے اسے تھپکا جیسے تسلی دے کر ہامی بھر رہی ہو۔

اسٹیج پر اب حمین کو ٹرافی دی جا رہی تھی۔ تالیوں، سیٹیوں، فلیش لائٹس کی چکا چوند اور میوزک کی گونج میں۔ حاضرین ایک بار پھر کھڑے ہو کر تالیاں بجاتے ہوئے داد دے رہے تھے اور وہاں سے کئی کلو میٹر دور واشنگٹن کے ایک قدرے نواحی علاقے کے ایک گھر میں بیٹھے جبریل اور عنایہ ٹی وی پر اس پروگرام کی لائیو کوریج دیکھتے ہوئے اسی خوشی اور جوش کا حصہ بنے ہوئے تھے جو اسکرین پر انہیں اس ہال میں نظر آ رہا تھا۔ عنایہ تھوڑی دیر پہلے اپنے ٹیسٹ کی تیاری ختم کر کے بیٹھی تھی، جس کی وجہ سے وہ امامہ اور سالار کے ساتھ نہیں جا سکی تھی اور جبریل اس کے لیے پیچھے رک گیا تھا۔ وہ ٹیسٹ کی تیاری کرتے ہوئے بھی بار بار اپنے کمرے سے نکل کر ٹی وی لاؤنج میں آ کر ٹی وی پر صرف حمین سے پوچھا جانے والا لفظ سنتی۔ وہ اور جبریل میکانیکی انداز میں بیک وقت اس لفظ کے ہجے کرتے اس سے پہلے کہ حمین اس کے ہجے کرتا پھر وہ بے یقینی سے اپنے چھوٹے بھائی کی وہ ہنسی دیکھتے جو اس لفظ کے ردعمل میں آتی اور پھر وہ اسے کوشش کرتے ہوئے دیکھتے، اس لفظ کو spell کرنے کے لیے۔ اور ہر صحیح آخری حرف پر ان دونوں کے سینوں سے بیک وقت سانس خارج ہوتا یوں جیسے جان میں جان آ گئی ہو اور اس کے بعد عنایہ ایک بار پھر ٹی وی لاؤنج سے غائب ہو جاتی۔

اور اب جبکہ اس تیسری ٹرافی کا ان کے گھر ہی آنے کا فیصلہ ہو گیا تھا تو وہ دونوں بے حد خوش تھے۔ ان سب کے درمیان مقابلہ ہوتا تھا۔ حسد اور رقابت نہیں، یہ خاصیت ان چاروں میں ہی نہیں تھی۔

ٹی وی دیکھتے ہوئے گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ جبریل اس وقت اپنے لیے ملک شیک بنانے میں مصروف تھا۔ عنایہ اس کے دروازے کی طرف جانے کے بجائے خود دروازے پر چلی گئی۔ کی ہول سے اس نے باہر جھانکا۔ وہاں گیارہ سالہ ایرک کھڑا تھا۔ عنایہ چند لمحوں کے لیے وہیں کھڑی رہی۔ الجھن کا شکار۔ وہ اس کا کلاس فیلو تھا۔ ان کا ہمسایہ تھا۔ اس کے والدین ان کے فیملی فرینڈز تھے۔ جبریل گھر پر نہ ہوتا تو وہ دروازہ کبھی نہ کھولتی۔ یہ اس کے ماں باپ کی ان سب کے لیے اکیلے گھر پر ہونے کی صورت میں ہدایات تھیں مگر اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ دروازہ کھولے یا نہ کھولے۔ وہ باہر کی ہول پر نظریں جمائے یوں کھڑا تھا جیسے اس سوراخ میں سے یہ دیکھ پا رہا ہو کہ اسے اندر سے دیکھا جا رہا تھا اور دیکھنے والا کون تھا، یہ بھی۔

"باہر کون ہے؟" وہ جبریل تھا جو اچانک ہی وہاں آ گیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر پلٹی پھر اس نے کہا۔

"ایرک۔" دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ بے مقصد اور کسی بھی وقت دوستوں یا جاننے والوں کو گھر نہیں بلا سکتے تھے لیکن ایرک کے لیے ان سب کے دل میں ہمدردی تھی۔

"اچھا آنے دو' شاید اسے بھی ٹیسٹ کا کچھ پوچھنا ہو۔" جبریل نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ دونوں ہاتھ اپنی جینز کی جیبوں میں ڈالے ارک نے دروازہ کھلنے پر اپنے امریکن لب و لہجے میں ہمیشہ کی طرح بمشکل انہیں السلام علیکم کہا جسے وہ ہمیشہ ہی کی طرح بمشکل سمجھے۔

"مبارک ہو۔" ارک نے وہیں کھڑے جبریل کے پیچھے جھانکتی عنایہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو۔" جبریل نے بھی اتنا ہی مختصر جواب دیا۔ وہ بات کرتے ہوئے دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے۔ ارک اسی طرح جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اندر آ گیا۔

"تم نے ٹیسٹ کی تیاری کرلی؟" عنایہ اس سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

"نہیں۔" وہ چلتے ہوئے لاؤنج میں آ گیا۔ ٹی وی پر وہ اب ایک بار پھر اسی پروگرام کی لائیو کوریج دیکھ رہا تھا۔ "کیوں؟"

"بس ایسے ہی۔" اس نے عنایہ کی طرف دیکھے بغیر ٹی وی اسکرین کو دیکھتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" عنایہ نے اسے اسی طرح کھڑے دیکھ کر کہا۔ جبریل تب تک لاؤنج کے ایک طرف موجود کچن ایریا میں دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔

"ارک! تمہاری ممی کو پتا ہے کہ تم یہاں ہو؟" جبریل کو فریج میں سے دودھ نکالتے ہوئے اچانک خیال آیا۔

"میرا خیال ہے۔" ارک نے جواباً "کان سے مکھی اڑانے والے انداز میں کہا۔ "نہیں پتا؟"

جبریل دودھ کی بوتل کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے ٹھٹکا۔ اسے پچھلے ہفتے کا خیال آیا تھا جب ارک کی ممی اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آئی تھیں اور انہوں نے شکایت کی تھی کہ وہ بتائے بغیر گھر سے نکلا تھا اور وہ اتفاقاً "اسے ڈھونڈنے لگیں تو انہیں پتا چلا وہ گھر پر تھا ہی نہیں۔ تب ہی وہ ان لوگوں کے گھر آ گئی تھیں کیونکہ انہیں پتا تھا وہ انہیں کہیں اور نہیں تو یہاں مل جائے گا۔

"ممی گھر پر نہیں ہیں۔" ارک نے جبریل کے تنبیہی انداز کو بھانپ لیا تھا۔

"کہاں گئی ہیں؟" جبریل کبھی اتنی پوچھ گچھ نہ کرتا اگر یہ ارک نہ ہوتا تو۔ کہیں نہ کہیں ان سب کو پتا تھا کہ وہ بعض دفعہ ان سے جھوٹ بولتا تھا اور بڑے اطمینان سے بولتا تھا اور یہ عادت اسے پہلے نہیں تھی۔۔۔ ایک سال پہلے جب اس کا باپ زندہ تھا۔

"کسی دوست کے پاس گئی ہیں۔۔۔ سیل اور مارک بھی ان کے ساتھ ہیں۔" اس نے جبریل کو بتایا۔ ٹی وی پر اب کوریج ختم ہو کر کمرشلز چل رہے تھے۔

"تم ساتھ نہیں گئے؟" عنایہ نے اس سے پوچھا۔

"مجھے ٹیسٹ کی تیاری کرنی تھی۔" اس نے ترکی بہ ترکی کہا۔ عنایہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اب ریموٹ ہاتھ میں لیے اس کا معائنہ اس طرح کرنے اور اس کے بٹنوں کو چھونے میں مصروف تھا جیسے زندگی میں پہلی بار ریموٹ دیکھا ہو۔ عنایہ کی طرف متوجہ نہ ہوتے ہوئے بھی اسے اندازہ تھا وہ اس کی بات پر اسے دیکھ رہی ہوگی۔

"چلو پھر ٹیسٹ کی تیاری کرتے ہیں۔" عنایہ نے جواباً "اسے کہا۔ اسے واقعی تشویش ہوئی تھی کہ ارک نے ٹیسٹ کی تیاری نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ ایک بار پھر ٹیسٹ میں برا اسکور لینے والا تھا۔

"یہ سب واپس کب آئیں گے؟" ارک نے اس کی آفر کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے بات بدلنے کی کوشش کی۔ ٹیسٹ کی تیاری اس کی زندگی کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس کی زندگی کے مسائل کچھ اور تھے۔

"واپس آ رہے ہوں گے۔" عنایہ نے اسے بتایا اور اسے دیکھنے لگی۔ اسے پتا تھا اب وہ بے مقصد' بے معنی سوال کرتا رہے گا تاکہ وہاں بیٹھا رہے تب تک' جب تک وہ وہاں سے بھی بے زار نہیں ہو جاتا۔ اسے ارک پر ترس آیا تھا۔ پچھلے ایک سال سے ہمیشہ ہی آتا تھا۔ وہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ وہ اس کی کلاس کے سب سے بہترین

اسٹوڈنٹس میں سے ایک تھا۔ ایک سال میں وہ اوسط سے بھی کم ہو گیا تھا۔

"تم اپنی ممی کے ساتھ نہیں گئے؟" عنایہ نے اس سے کہا۔ اس نے ایک لمحہ قبل جبریل کی ملک شیک کی آفر رد کی تھی۔

"ہاں میں جا سکتا تھا لیکن میں نہیں گیا... میں کوئی گیم کھیل سکتا ہوں...؟" اس نے ایک ہی جملے میں جواب اور سوال کیا۔ عنایہ ہچکچائی۔

"نہیں۔" عنایہ کے بجائے جبریل نے جواب دیتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ریموٹ لے لیا تھا۔

"اس وقت ہمارے گھر میں کوئی گیمز نہیں کھیلتا۔ کافی دیر ہو چکی ہے۔"

جبریل نے اس کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے اسے اپنے گھر کے قوانین نرمی سے بتائے۔ وہ روز گیمز نہیں کھیل سکتے تھے... وہ رات کو بھی گیمز نہیں کھیل سکتے تھے۔ عام طور پر وہ اس وقت تک ڈنر کر چکے ہوتے لیکن آج حمین کے اس مقابلے میں شرکت کی وجہ سے ڈنر لیٹ ہو گیا تھا۔

"لیکن میں تو ایک آؤٹ سائڈر ہوں... اور مہمان بھی۔" ایرک نے چند لمحے سوچنے کے بعد جبریل سے کہا جو اب ٹی وی پر سی این این لگا کر بیٹھا تھا۔

"نہیں تم ہمارے ہی ہو۔" جبریل نے جواباً اسے کہا۔ ایرک بول نہیں سکا۔ وہ جیسے ان سے یہی سننا چاہتا تھا۔

"میں ڈنر ٹیبل سیٹ کر دوں... سب آنے والے ہوں گے۔" عنایہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اب لاؤنج میں ہی ایک حصے میں لگی ہوئی ڈائننگ ٹیبل پر میٹس اور پلیٹیں رکھنے لگی... ایرک کچھ دیر وقفے وقفے سے اسے اور جبریل کو دیکھتا رہا پھر جیسے اسے وہاں اپنی موجودگی بے مقصد نظر آئی تھی۔ جبریل نیوز بلیٹن میں محو تھا۔ عنایہ ٹیبل سیٹ کرنے میں... ایرک پھر بھی وہاں سے جانے پر تیار نہیں تھا۔ اس گھر میں زندگی تھی... سکون... جو اب اس کے گھر میں نہیں تھا۔

کچھ دیر بے مقصد سی این این دیکھتے ہوئے وہ اٹھ کر عنایہ کے پاس آگیا اور کچھ کہے بغیر خود ہی ٹیبل سیٹ کرنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔ آٹھ کرسیوں والی ٹیبل پر عنایہ نے سات میٹس لگائے تھے اور ایرک نے یہ نوٹس کیا تھا۔ اس نے جیسے کچھ کہے بغیر یہ جان لیا تھا کہ وہ وہاں سے کھانا کھا کر جائے گا۔ وہ اکثر ان کے گھر کھانا کھا لیتا تھا۔ پاکستانی کھانا بھی... صرف تازہ کھانے کی خواہش میں... کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کی ضرورت کے تحت۔ اس کے اپنے گھر میں کیرولین کھانا ویک اینڈ پر بنا کر فریز کیا کرتی تھی۔ پھر وہ پورا ویک وہی کھانا بار بار گرم ہو کر کھایا جاتا۔ ایسا ہمیشہ سے نہیں تھا۔ ایک سال سے ہو گیا تھا جب سے اس کا باپ ایک حادثے میں ہلاک ہوا تھا۔

کیرولین وکیل تھی ایک نامور اور بے حد مصروف وکیل۔ تین بچوں کی باپ کے بغیر اکیلے دیکھ بھال کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ کیرئیر کو بھی سنبھالنا اسے بہت مشکل لگنے لگا تھا۔ وہ نہ جاب بدل سکتی تھی نہ ہی اپنے کیرئیر کے اس اسٹیج پر اپنا پروفیشن۔ گھر میں رہنے والی ماں بننا اس کی خواہشات میں سے تھا ہی نہیں۔ شوہر کی حادثاتی موت ایک صدمہ تھی۔ وہ اور جیمز پندرہ سال سے اکٹھے تھے اور ایک مثالی جوڑا تھے... پندرہ سال کی رفاقت کے بعد اچانک ایک دن پھر اکیلے ہو جانا تکلیف دہ تھا لیکن مستقبل کا عدم تحفظ ایک اور مسئلہ تھا۔ وہ مشرقی عورت نہیں تھی کہ صرف بچوں کو اپنا ساتھی اور زندگی کا مقصد سمجھتے ہوئے صرف انہیں کافی سمجھتی اور ان ہی کے سہارے اپنی زندگی گزار دیتی۔ اسے اپنی زندگی میں کسی ساتھی کی تلاش اور ضرورت بھی تھی جو جیمز کے کار کریش کے چھ ماہ بعد ایک کولیگ کی شکل میں مل گیا تھا۔

چینلز اس وقت اس انٹرویو کو بریکنگ نیوز کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ صرف دس منٹوں میں دنیا بھر میں سالار سکندر اور SIF ایک بار پھر زبان زدعام ہونے والی تھی اور اس بار یہ "شہرت" نہیں رسوائی تھی جو اس خاندان کے حصے میں آنے والی تھی۔

"وہ بڑا آدمی کون تھا؟" انٹرویو نے غلام فرید سے اگلا سوال کیا۔

"میں اس کا چوکیدار تھا" اس کے اسکول کا۔ اس نے مجھے اس لیے وہاں سے نکال دیا کہ اس کے میری بیوی سے تعلقات تھے۔"

انٹرویو کرنے والے نے غلام فرید کو ٹوکا۔ "اس بڑے آدمی کا نام کیا تھا؟"

"سالار سکندر" غلام فرید نے بے حد روانی سے کہا۔

دنیا بھر کی ٹی وی اسکرینز پر عین اسی لمحے سالار سکندر کی تصویر نمودار ہوئی تھی اور پھر اس کے چند لمحے بعد رئیسہ سالار کی۔ بیک وقت۔ ایک ہی جیسی تصویریں۔

وہ CIA کا اسٹنگ آپریشن نہیں تھا، وہ انہوں نے پوری قوت اور طاقت سے مغربی انٹیلی جنس ایجنسیز کے اشتراک سے دنیا کے کامیاب ترین اسلامی مالیاتی نظام کے بانی اور SIF کی بنیادوں پر دن دہاڑے حملہ کیا تھا۔

"غلام فرید تم کیا چاہتے ہو؟" انٹرویو لینے والا اب اس سے پوچھ رہا تھا۔

غلام فرید ایک لمحے کے لیے رکا پھر اس نے کہا۔ "سالار سکندر کے لیے پھانسی کی سزا۔"



نیروبی کے اس فائیو اسٹار ہوٹل میں ہونے والی تقریب افریقہ کی تاریخ کے یادگار ترین لمحوں میں سے ایک تھی۔ کچھ گھنٹوں کے لیے دنیا کی تمام اسٹاک مارکیٹس جیسے اس ایک تقریب پر فوکس کرکے بیٹھ گئی تھیں جہاں SIF حمین سکندر کی کمپنی TAI کے ساتھ مل کر افریقہ میں دنیا کے سب سے بڑے مالیاتی فنڈز کے قیام کا اعلان کرنے والی تھی۔ وہ انضمام نہیں تھا "اشتراک تھا اور دنیا کا کوئی بڑا مالیاتی ادارہ نہیں تھا جس کا سربراہ وہاں اس فائیو اسٹار ہوٹل کے بینکوئیٹ ہال میں موجود نہ ہو۔ وہاں دنیا کے بہترین دماغ تھے "اپنی اپنی فیلڈز کے نامور لوگ اور ان لوگوں کے جمگھٹے میں وہاں سالار سکندر اور حمین سکندر اس گلوبل فنڈ کا اعلان کرنے والے تھے۔ جس کی مالیت دنیا کے تمام بڑے مالیاتی اداروں کو پچھاڑنے والی تھی۔

9:14 پر بھی ٹیلی اسکوپ کی آنکھ سے اس ٹارگٹ کلر کو وہ "مہمان" لفٹ کے دروازے سے نمودار ہوتا نظر نہیں آیا۔ لیکن وہ دم سادھے "آنکھ ٹیلی اسکوپ پر لگائے" ایک انگلی ٹریگر پر رکھے لفٹ کا دروازہ کھلنے کا منتظر تھا۔

دس۔ نو۔ آٹھ۔ سات۔ چھ۔ پانچ۔ چار۔ تین۔ دو۔ ایک۔

(آخری قسط ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

"جبریل کی موت نے ایسا کر دیا ہے اسے۔" سالار نے میز سے اٹھتے ہوئے اس کے تبصرے کے جواب میں کہا۔

برتن سنک میں رکھتے ہوئے امامہ عجیب انداز میں ٹھنڈی پڑی تھی۔ دو دن بعد سالار کا طبی معائنہ ہونا تھا۔ پہلے ہر تین ماہ کے بعد اس کا طبی معائنہ ہوتا تھا اب اس بار چھ ماہ کے بعد۔ یہ دیکھا جاتا تھا کہ اس کے دماغ میں موجود ٹیومر کس حالت میں تھا۔ بڑھنے لگا تھا؟ گھٹنے لگا تھا؟ اس کے دماغ میں کوئی اور ٹیومر تو نہیں بن گیا تھا۔ ٹیومر نے کچھ اور سیلز کو تو متاثر کرنا نہیں شروع کر دیا تھا۔ CTS' TMT' BPT' LP CBC, MRI پتا نہیں کتنے ٹیسٹس تھے جن کی رپورٹس وہ دم سادھے دیکھتی رہتی تھی۔ ہر کلیئر رپورٹ اس کا سانس بحال کرتی۔ کوئی معمولی سی بھی خراب رپورٹ اسے بے حال کرتی۔ زندگی جیسے پھر تین ماہ کے دائرے میں سمٹ کر آگئی تھی۔ تین ماہ کے بعد وہ میڈیکل چیک اپ ہوتا۔ اور پھر وہ تین ماہ کے لیے جینے لگی اور جب جب میڈیکل چیک اپ کی تاریخیں قریب آنے لگتیں امامہ کی بدحواسی میں بھی اضافہ ہونے لگتا۔

اور یہ سب پچھلے تین سال سے ہو رہا تھا اور تین سال سے وہ ٹھیک تھا۔ اس کا آپریشن کامیاب رہا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس کی ذہنی صلاحیتوں پر بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ چھوٹے موٹے اثرات آئے تھے لیکن وہ ایسے نہیں تھے کہ انہیں تشویش لاحق ہوتی لیکن اس کے باوجود امامہ ہاشم کو لگتا تھا زندگی بدل گئی ہے۔

اور اب سالار کی زبان سے جبریل کی موت کا ذکر سن کر اور اس موت نے اس کے بیٹے کو کیسے متاثر کیا تھا۔ وہ ایک بار پھر اسی طرح منجمد ہو گئی تھی۔ چند گھنٹے پہلے ہونے والی تقریب یک دم جیسے اس کے دماغ سے محو ہو گئی تھی۔ وہ چیک اپ جو دو دن بعد ہونے والا تھا اگر وہ ٹھیک رہتا تو پھر اس کا چیک اپ تین کے بجائے چھ ماہ کے بعد ہوتا۔ سالار کی نہیں جیسے اس کی اپنی زندگی کی میعاد تین سے چھ ماہ بڑھنے والی تھی۔

کچن میں سنک کے سامنے کھڑے اس نے لاؤنج میں بیٹھے سالار کو دیکھا۔ اس کے گرد بیٹھے اس سے خوش گپیوں میں مصروف اپنے بچوں کو دیکھا۔

وہ خوش قسمت تھی کہ وہ اب بھی ان کی زندگیوں میں تھا۔ جیتا جاگتا۔ ہنستا مسکراتا۔ خوش باش صحت مند۔ کم از کم کوئی اب اسے دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اسے کوئی بیماری تھی اور ایسی بیماری تھی۔ وہ صرف اپنی سرجری کے بعد صحت یابی اور علاج کے دورانیے میں بیمار لگتا تھا۔ سرجری کے لیے سر کے بال صاف کروانے کی وجہ سے بھی اور اس کے بعد ہونے والے علاج کی وجہ سے بھی۔۔۔

تب اس کے چہرے پر یک دم جھریاں سی آگئی تھیں۔ بہت کم وقت میں اس کا وزن بہت زیادہ کم ہوا تھا۔ وہ شاید اس کا نتیجہ تھیں۔ چھ سات ماہ وہ ایک کے بعد ایک چھوٹے بڑے انفیکشنز کا شکار ہوتا رہا تھا۔

وہ سرجری کے بعد واپس پاکستان آنا چاہتی تھی لیکن آنہیں سکی۔ وہ اسے وہاں اس طرح اکیلے یہ جنگ لڑنے کے لیے چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ وہ کام چھوڑ کر گھر بیٹھ کر آرام کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اور یہ آپشن اس کے پاس تھا بھی نہیں۔ سرجری کے ایک ہفتے بعد وہ دوبارہ STI کے پروجیکٹس لیے بیٹھا تھا۔ اور وہ صرف بیٹھ کر اسے دیکھتی رہی تھی۔

تیمارداری۔ عیادت۔ دیکھ بھال۔ ان لفظوں کو سالار سکندر نے بے معنی کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ حتی المقدور اپنی ذمہ داری خود اٹھا رہا تھا۔ جیسے ساری عمر اٹھانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ وہ پھر بھی اسے تنہا چھوڑ دینے پر تیار نہیں تھی۔ چھ سات ماہ کے بعد وہ بالآخر صحت مند ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے نئے بال اگ آئے تھے اس کا وزن بڑھ گیا تھا۔ اس کے چہرے سے وہ جھریاں غائب ہو گئی تھیں جو راتوں رات آگئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور چہرے کی پیلاہٹ بھی چلی گئی تھی۔ وہ اب ویسا ہی سالار نظر آتا تھا جیسا اس بیماری کی تشخیص سے پہلے تھا۔ وہ

گھنٹے ٹریڈمل پر جاگنگ کرنے والا۔ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے لگاتار کام کرنے کی صلاحیت رکھنے والا۔ ہار نہ ماننے والا۔ چھوٹی موٹی تکلیف کو بتائے بغیر سہہ جانے والا۔ لیکن وہ ٹیومر اس کے اندر موجود تھا۔ ایک خاموش آتش فشاں کی طرح۔ اثرات کے بغیر۔ حرکت کے بغیر۔ لیکن اپنا بھیانک وجود برقرار رکھتے ہوئے۔ جیسے موت جو نظر نہ آتے ہوئے بھی ہوتی ہے۔ کبھی بھی آسکتی ہے اور کہیں بھی آجاتی ہے۔

ڈاکٹرز کہتے تھے اس کی صحت کی بحالی ناقابل یقین اور قابل رشک ہے امامہ ہاشم پھر بھی مطمئن ہونے سے قاصر تھی۔ وہ اپنے کسی خدشے کو ختم نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے کسی خوف کا گلا نہیں گھونٹ سکتی تھی۔ تین سال خیر خیریت سے گزر جانے کے باوجود وہ آج بھی اسی ذہنی کیفیت میں تھی۔ سالار نہیں تھا۔ اس نے اپنی زندگی اور بیماری دونوں کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے پاس سوچنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ وہ اس زندگی سے خوش اور مطمئن تھا جو وہ گزار رہا تھا۔ وہ خوش اور مطمئن نہیں تھی۔ اس کے پاس سوچنے کے لیے بہت وقت تھا۔ اس کا دن مصروفیات میں گزر جاتا تھا۔ مگر اس کی راتیں اب بھی سوچوں میں گزرتی تھیں۔ اور وہ بے خواب راتیں تب بڑھنے لگتی تھیں جب اس کے میڈیکل چیک اپ کی تاریخیں قریب آنے لگتی تھیں۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود اپنے دماغ سے وہ تاریخیں جھٹک نہیں پاتی تھی۔ جیسے وقت یک دم الٹی گنتی بن کر چلنے لگتا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ زندگی کے یہ تین سال اس نے سالار کی زندگی اور صحت کے علاوہ کسی اور چیز کے بارے میں اس قدر سوچتے ہوئے گزارے تھے۔ ساری ضروریات' خواہشات یک دم کہیں غائب ہوگئی تھیں۔ وہ جیسے یہ بھول ہی گئی تھی کہ اسے کیا پسند تھا کیا نہیں۔ سالار کے ساتھ گزارے ہوئے شادی کے شروع کے دس سالوں میں اس نے دنیا کی ہر نعمت چکھ لی تھی۔ ہر آسائش دیکھ لی تھی۔ لگژری کارز سے پرائیویٹ جیٹس کے سفر تک۔ سونے کے زیورات سے لے کر ہیروں تک۔ سب۔ وہ آدھی دنیا اس کے ساتھ گھومی تھی۔ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کی تمنا اس نے کی ہو اور سالار نے اسے تحفتاً نہ دیا ہو۔ وہ اپنی زندگی کے ان دس سالوں پر پریوں کی کہانی لکھ سکتی تھی۔ لیکن ایسی زندگی گزارنے کے بعد بھی امامہ ہاشم کو زندگی کی سب سے بڑی نعمت زندگی ہی لگی تھی۔

"اس شخص" کی زندگی۔ وہ اس کے پاس تھا تو دنیا کی کوئی اور چیز نہ ہونے کے باوجود بھی وہ خوش رہ سکتی تھی۔ ہنس سکتی تھی۔ جی سکتی تھی۔ باقی اور کچھ بھی نہ ہوتا۔ مہنگے کپڑے' زیورات' آسائشات' گھر کچھ بھی نہ ہوتا صرف اس کا ساتھ اس کے ساتھ رہتا تو وہ خوش رہ سکتی تھی۔ جینے کے لیے بس اتنا کافی تھا اور اب ایک بار پھر اس کے میڈیکل چیک اپ کی تاریخ قریب تھی۔ ایک بار پھر اس کی نیندیں غائب ہونا شروع ہوگئی تھیں۔

لاؤنج میں حمین کی کسی بات پر ہنستے ہوئے سالار کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے اس کی سرجری کے بعد پہلی بار اسے دیکھنا یاد آیا تھا۔ آٹھ گھنٹے کی سرجری کے بعد پہلی بار اسے دیکھنا۔ پھر اگلی صبح اسپتال جاکر اسے دوبارہ دیکھنا۔ وہ یاد نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ بھول نہیں پاتی تھی۔ وہ تب بھی اس کے چہرے پر نظریں جمائے اسے دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھے بیٹھی تھی جب وہ ہوش میں آیا تھا۔ اس کے متورم پپوٹے ہلنے لگے تھے۔ وہ آنکھیں کھولنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

"سالار... سالار!" وہ بے اختیار اسے پکارنے لگی تھی۔ ایک بار' دو بار... کئی بار۔ اس نے بالآخر آنکھیں کھول دی تھیں۔ سوجی ہوئی سرخ آنکھیں۔ وہ غنودگی میں تھا اور اس کیفیت سے لڑ رہا تھا۔ اس نے سالار کا چہرہ چھوا' ایک بار پھر اس کا نام پکارتے ہوئے۔

اس بار سالار نے اسے دیکھا تھا۔ گردن ذرا سی موڑتے ہوئے لیکن ان آنکھوں میں اس کے لیے کوئی پہچان' کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ صرف اسے دیکھ رہا تھا۔ پہچاننے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

امامہ کو جیسے دھچکا لگا تھا۔ کیا وہ واقعی اسے پہچان نہیں پا رہا تھا۔ ڈاکٹرز نے اس خدشے کا اظہار آپریشن سے پہلے کیا تھا کہ اس کی یادداشت جاسکتی ہے۔ آپریشن کے مضمرات میں سے یہ ایک تھا۔ اس کے باوجود وہ شدید صدمے کا شکار ہوئی تھی۔ گنگ۔۔۔ دم بخود۔۔۔ وہ سرد ہاتھ پیروں کے ساتھ ان آنکھوں کو دیکھتی رہی تھی جو اسے ایک اجنبی کی طرح دیکھ رہی تھیں۔۔۔ پھر جیسے ان آنکھوں میں چمک آنی شروع ہوئی۔ جیسے اس کا عکس ابھرنا شروع ہوا۔ اس کی پلکیں اب ساکت نہیں تھیں۔۔۔ وہ جھپکنے لگی تھیں۔ شناسائیت کا احساس دیتے ہوئے۔ بیڈ پر اس کے ہاتھ کے نیچے موجود سالار کے ہاتھ میں حرکت ہوئی تھی۔ وہ اس کا نام اب بھی نہیں لے پا رہا تھا لیکن اس کے ہاتھ کا لمس شناخت کر رہا تھا۔ ردعمل ظاہر کر رہا تھا۔ تین سال گزرنے کے بعد بھی امامہ اس سرجری سے پہلے اور اس سرجری کے بعد کا ایک ایک لمحہ گنوا سکتی تھی۔ وہ سب کچھ جیسے اس کے ذہن پر انمٹ نقوش کی طرح نقش تھا۔

سالار کی زبان سے جو پہلا لفظ نکلا تھا وہ اس کا نام نہیں تھا۔ وہ ”الحمدللہ“ تھا۔ اور امامہ کو پہلی بار الحمدللہ کا مطلب سمجھ میں آیا تھا۔ اس نے امامہ کا نام اگلے جملے میں لیا تھا اور امامہ کو لگا اس نے زندگی میں پہلی بار اپنا نام سنا ہو۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنا نام خوب صورت لگا تھا۔ اس نے پہلی چیز پانی مانگی تھی اور امامہ کو لگا دنیا میں سب سے قیمتی چیز پانی ہی تو ہے اور اس نے کلمہ پڑھا تھا۔ کوئی مرتے ہوئے کلمہ پڑھتا ہے۔ پھر زندہ ہو جانے پر اس نے کلمہ پڑھتے ہوئے کسی کو پہلی بار دیکھا تھا اور اس سب کے دوران سالار نے امامہ کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ لمس نہیں تھا۔ جنت تھی جو ہاتھ میں تھی۔

”تمہیں نیند نہیں آ رہی یہاں؟“ سالار نے یک دم اسے مخاطب کیا۔ وہ ابھی بھی کچن کے سنک سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ دور تھی اس لیے خود پر قابو بھی پا گئی تھی۔ آنسو بھی چھپا گئی تھی۔

”ہاں۔۔۔ میں آ گئی ہوں۔“ اس نے پلٹ کر سنک میں باقی برتن بھی رکھے۔ ”میں سب باتیں تو ”یہاں“ سے بھی سن رہی ہوں۔“ اس نے کہا تھا۔

”ممی اگلے سال رئیسہ جائے گی ”اسپیلنگ بی“ میں۔“ حمین نے وہاں بیٹھے۔۔۔ وہ اعلان کیا تھا جو رئیسہ اس سے پہلے ہی اس تک پہنچا چکی تھی۔ امامہ نے ٹونٹی بند کرتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ وہ خود کو سنبھال چکی تھی لیکن حمین کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

”رئیسہ کیا کرے گی؟“ اس نے صرف رئیسہ کا نام سنا تھا۔

”ممی! میں بھی یہ ٹرافی جیت کر لاؤں گی۔“ رئیسہ نے اس بار خود امامہ کو منصوبے کے بجائے مقصد بتایا۔



عائشہ عابدین اپنے باپ کے انتقال کے سات ماہ بعد پیدا ہوئی تھی۔ تین بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی اور تینوں بہنوں کی عمر میں زیادہ وقفہ نہیں تھا۔ اس کے والدین نہ صرف خود ڈاکٹرز تھے، بلکہ ڈاکٹرز کے ایک نامور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ عائشہ کی ماں نورین الٰہی نے اپنی بیٹی کو تھوڑے عرصے کے لیے پاکستان میں اپنی ماں کے پاس بھیج دیا تھا۔ وہ امریکہ میں میڈیسن جیسے پروفیشن سے منسلک ہوئے تھے۔ دو بیٹیوں کے ساتھ اس نوزائیدہ بچی کو شوہر کی اچانک موت کے بعد پیدا ہونے والے حالات میں سنبھال نہیں سکتی تھیں۔ عائشہ اگلے پانچ سال پاکستان ہی میں رہی۔ حالانکہ نورین الٰہی۔۔۔ اس کو سال چھ مہینے وہاں رکھنا چاہتی تھیں لیکن عائشہ کی نانی اور نانا کو اس سے اتنی انسیت ہو گئی تھی۔ اور وہ بھی ان کے ساتھ اتنی خوش اور مطمئن تھی کہ نورین خیال آنے پر بھی اسے واپس نہیں لے جا سکیں۔ وہ چھوٹی بچیوں کے ساتھ امریکہ میں زندگی ایک آرتھوپیڈک سرجن کے طور پر ویسے ہی اتنی مشینی تھی۔ شوہر کی موت کے بعد۔ کہ وہ چاہتیں بھی تو عائشہ کو اپنے ساتھ لے جانے پر

بھی وہ اس کی پرورش کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتی تھیں۔
پانچ سال کے بعد بالآخر وہ عائشہ کو امریکہ اپنے پاس لے آئیں لیکن عائشہ کا وہاں دل نہ لگا۔ وہ اپنی دونوں بڑی بہنوں سے مانوس نہیں تھی۔ نورین اتنی بہت مصروف تھیں اور عائشہ کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ دو سال کسی نہ کسی طرح وہاں گزارتی رہی لیکن سات سال کی عمر میں نورین کو ایک بار پھر۔ اس کی ضد پر اسے واپس پاکستان بھیجنا پڑا لیکن اس بار نورین کو اس کے رہن سہن کے حوالے سے فکر ہونے لگی تھی۔ وہ اور ان کی دونوں بیٹیاں اور آدھے سے زیادہ سسرال اور میکہ امریکہ میں مقیم تھے اور وہ عائشہ کو بھی مستقل طور پر امریکہ میں ہی رکھنا چاہتی تھیں کیونکہ پاکستان میں اب ان کے صرف والدین رہ گئے تھے جو پاکستان چھوڑ کر اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کے پاس امریکہ آنے پر تیار نہیں تھے۔
سات سال کی عمر میں اسے واپس پاکستان بھیجنے کے باوجود اس بار نورین اسے سال میں دو بار امریکہ بلاتی رہیں۔ ان کی کوشش تھی عائشہ اور اس کی بہنوں میں میل جول اور روابط میں لگاؤ پیدا ہو جائے۔ ان کی کوشش کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ عائشہ اور اس کی دونوں بہنیں اب ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہونے لگی تھیں اور عائشہ کو اب امریکہ اتنا اجنبی نہیں لگتا تھا جتنا اسے شروع میں لگتا تھا۔
دس سال کی عمر میں عائشہ ایک بار پھر امریکہ آئی تھی اور اس بار اسے وہاں رہنے میں پہلے جیسے مسئلے پیش نہیں آئے تھے لیکن اب ایک نیا مسئلہ پیش تھا۔ وہ اسکول میں جا کر پریشان ہونے لگی تھی۔ وہ پاکستان میں بھی کو ایجوکیشن میں پڑھتی رہی تھی مگر وہاں اور یہاں کے ماحول میں فرق تھا۔ نورین اسکول کے حوالے سے کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ مسئلہ ان کی بڑی دونوں بیٹیوں کو پیش نہیں آیا تھا۔ وہ عائشہ کی طرح کلاس میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان نہیں ہوتی تھیں۔ نہ ہی برہم ہوتی تھیں۔ عائشہ کو اسکول اچھا نہیں لگتا تھا۔ نورین کے پاس ایک راستہ یہ تھا کہ وہ اسے وہاں کسی اسلامک اسکول بھیجیں وہ اس راستے کو استعمال نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ اس عمر میں اسے اتنی بامقصد زندگی دینا نہیں چاہتی تھیں۔ ان کا خیال تھا وہ کچھ عرصہ یہاں رہنے کے بعد خود ہی ٹھیک ہونا شروع ہو جائے گی۔ ایک سال بعد بھی جب عائشہ بہتر ہونے کے بجائے زیادہ پریشان ہونا شروع ہوئی اور اس کے گریڈز اور خراب ہونے لگے تو نورین کو اسے ایک بار پھر پاکستان بھیجنا پڑا تھا۔ وہ اب اسے اولیولز کے بعد وہاں بلوانا چاہتی تھیں کیونکہ ان کا خیال تھا وہ اس وقت تک کچھ سمجھ دار ہو جائے گی اور وہاں چیزوں کو آسانی سے سمجھ سکے گی۔
تیرہ سال کی عمر میں عائشہ عابدین ایک بار پھر امریکہ رہنے ہونے کے لیے آئی تھی لیکن اس بار وہ وہاں اپنے لیے ایک نیا مسئلہ دیکھ رہی تھی امریکہ اسے اسلامی ملک نہیں لگ رہا تھا۔ وہاں کی شخصی آزادی اس کے لیے پریشان کن تھی۔ وہاں لباس اور زبان کے معاملے میں روا رکھے جانے والی آزادی اسے ہولانے لگی تھی لیکن ان میں سب سے بڑا چیلنج اس کے لیے یہ تھا کہ وہ وہاں حجاب میں بھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتی تھی جو اس نے پاکستان میں لینا شروع کیا تھا اور جس سے نورین خوش نہیں تھیں۔
اس بار نورین نے بالآخر گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ یہ مان لیا تھا کہ عائشہ کا امریکہ میں اب کوئی مستقبل نہیں تھا۔ وہ پاکستان میں ہی رہنا چاہتی تھی اور وہاں پیش آنے والے تمام چھوٹے بڑے مسائل کے ساتھ خوش تھی۔ انہوں نے عائشہ کو ایک بار پھر امریکہ سے واپس پاکستان بھیج دیا تھا۔ یہ عائشہ عابدین کا انتخاب تھا کہ اسے اپنی زندگی نانا، نانی کے طریقے سے ایک اسلامی ملک میں گزارنی ہے۔ ایک تو عمر کے طور پر امریکہ کی ترقی سے متاثر ہونے اور وہاں رہائش کا اختیار رکھنے کے باوجود عائشہ عابدین ایک پرسکون اچھی زندگی کا خواب لے کر ایک بار پھر پاکستان لوٹی تھی جہاں وہ اپنے جیسے لوگوں کے درمیان زندگی گزارتی۔

عائشہ کے نانا نانی نے اسے کانونٹ میں پڑھانے کے باوجود زیادہ بے باک انداز میں اس کی پرورش نہیں کی تھی۔ عائشہ کو انہوں نے گھر میں ایک ایسے مولوی سے قرآن پاک پڑھایا تھا جو کسی کم فہم رکھنے والا کوئی روایتی مولوی نہیں تھا۔ وہ ایک اچھے ادارے کے طلبا کو قرآن اور حدیث کی تربیت دیتا تھا۔ خود عائشہ کے نانا نانی بھی دین اور دنیا کی بہت سمجھ رکھتے تھے۔ وہ اعلا تعلیم یافتہ تھے۔ ملنے جلنے کے شوقین اعلا طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ دینی اور اخلاقی قدروں کے حساب سے قدامت پسند تھے لیکن یہ قدامت پرستی دین کے ان معنوں میں نہیں تھی جو انہوں نے عائشہ کو دیا تھا۔

عائشہ عابدین ایک ایسے ماحول میں جہاں دین کی سمجھ بوجھ اور اس میں گہری دلچسپی کے ساتھ پیدا ہوئی تھی جہاں پر حرام اور حلال کی تلواروں سے ڈرانے کے بجائے دلیل اور منطق سے اچھائی اور برائی سمجھائی جاتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ عائشہ اپنے مذہب سے بے حد جذباتی لگاؤ رکھتی تھی۔

وہ پانچ وقت نماز باقاعدگی سے پڑھتی تھی۔ حجاب بھی اوڑھتی تھی۔ روزے بھی رکھتی تھی۔ اپنے نانا نانی کے ساتھ حج بھی کرچکی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ فنون لطیفہ کی ہر صنف میں بھی دلچسپی رکھتی تھی۔ پینٹنگز بناتی تھی۔ اسکول میں پورے لباس کے ساتھ پیراکی کے مقابلوں میں بھی حصہ لیتی تھی۔ ہر وہ کام کرتی تھی جس میں اسے دلچسپی ہوتی اور جس کی اسے اپنے نانا نانی سے اجازت ملتی تھی۔

امریکی معاشرے کا حصہ بننے کے باوجود نورین کو یہ تسلیم کرنے میں عار نہیں تھا کہ ان کی بیٹی کی تربیت بہت اچھی ہوئی تھی اور اس کا سہرا اپنے والدین کو صرف وہی نہیں دیتی تھیں۔ ان کے خاندان اور سسرال کے وہ سب لوگ دیتے تھے جو عائشہ سے کبھی مل چکے تھے۔

نورین نے اپنی بڑی دونوں بیٹیوں کو بھی بڑی توجہ اور محنت سے پالا تھا۔ انہوں نے انہیں امریکہ میں رہتے ہوئے اپنے کلچر اور مذہب سے جتنا قریب رکھنے کی کوشش کرسکتی تھیں اتنا رکھا تھا۔ مگر ان کا زندگی گزارنے کا انداز بہت آزاد تھا۔ اور نورین کو یہ اس لیے کبھی قابل اعتراض نہیں لگا تھا کیونکہ ان کی بیٹیاں حدود و قیود سے کبھی آگے نہیں بڑھیں جو ان کے لیے کبھی پریشانی کا باعث بنتی۔ سو ان کے اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ نہ صرف تعلیمی لحاظ سے بہت اچھی تھیں بلکہ امریکہ میں پلنے بڑھنے والی دوسری پاکستانی لڑکیوں کی نسبت ان کی زیادہ فرماں بردار اور پروا کرنے والی تھیں۔

لیکن انہیں ان دونوں میں اور عائشہ کی تربیت میں تب فرق سمجھ میں آتا جب عائشہ امریکہ ان کے پاس رہنے کے لیے آتی یا وہ پاکستان رہنے آتیں۔

انہیں یہ احساس ہوتا کہ وہ "بیٹی" کی ماں ہیں۔ عائشہ ان کے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ ان کے پاس بیٹھی رہتی۔ ان کی باتیں توجہ سے سنتی۔ ان کے لیے کھانے بناتی اور اس سب کے بدلے میں اسے نورین سے کچھ بھی نہیں چاہیے ہوتا تھا۔ وہ یہ سب عادتاً کرتی تھی اور یہ سب اس نے ان ہی والدین سے سیکھا تھا جو نورین کے ماں باپ تھے۔

نورین اپنے ماں باپ کی اس حوالے سے بے حد احسان مند اور ممنون تھیں کہ انہوں نے اس کی بیٹی کی صرف تربیت ہی اچھی نہیں کی تھی بلکہ اسے بہت اچھے اداروں سے تعلیم دلوا رہے تھے کہ نورین کی خواہش تھی کہ عائشہ ڈاکٹر بنتی کیونکہ ان کی بڑی دونوں بیٹیوں میں سے کسی کو میڈیسن میں دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھیں۔ عائشہ کو بھی میڈیسن میں بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی اور شاید ماں کی خواہش نہ ہوتی تو وہ میڈیسن کے بجائے آرکیٹکٹ بننا چاہتی لیکن نورین کی خواہش کو مقدم سمجھتے ہوئے اس نے زندگی کے بہت سارے مقاصد بدل دیے تھے۔ شاید کہیں وہ اپنی ماں کی وہ خفگی بھی دور کرنا چاہتی تھی جو بار بار امریکہ جاکر بھی وہاں ایڈجسٹ نہ

ہونے اور پھر واپس آنے پر وہ اپنی ماں کے دل میں پیدا کرتی رہی تھی۔
نورین اس لیے بھی اسے میڈیسن پڑھانا چاہتی تھیں کیونکہ ان کا خیال تھا اگر عائشہ کو دوبارہ کبھی امریکہ آنا پڑتا تو اس کے پاس ایک اچھی پروفیشنل ڈگری ہوگی تو اسے نوکری کے مسئلے نہیں ہوں گے۔ میڈیکل پڑھانے کا وہ خواب، جو نورین نے اس کے لیے دیکھا تھا وہ عائشہ عابدین کی زندگی کا سب سے بھیانک خواب ثابت ہوا تھا۔



وہ اگلی صبح پھر ان کے دروازے پر کھڑا تھا۔ بچوں کو اسکول گئے ابھی صرف گھنٹہ ہی ہوا تھا اور امامہ نے لانڈری سے کپڑے نکال کر چند منٹ پہلے ڈرائیو میں ڈالے تھے۔ اسے آج گیراج صاف کرنا تھا اور بیل بجنے پر اس کے بارے میں سوچتے ہوئے نکلی تھی تو اس نے ایرک کو سامنے کھڑا پایا تھا۔
امامہ نے دروازہ کھول دیا تھا لیکن وہ دروازے سے ہٹی نہیں تھی۔ ایرک نے ہمیشہ کی طرح اپنے مخصوص انداز میں سلام کیا تھا جو اس نے ان ہی سے سیکھا تھا۔ امامہ نے سلام کا جواب دیا لیکن وہ پھر بھی وہیں کھڑی رہی تھی۔ راستہ روکے اور اس پر نظریں جمائے۔
"آپ اندر آنے کو نہیں کہیں گی؟" ایرک نے بالآخر کہا۔
"تم اسکول نہیں گئے؟" امامہ نے اس کا سوال گول کرتے ہوئے جواباً اس سے پوچھا۔
"میں... دراصل" ایرک نے چند لمحے کوئی جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی پھر وہی جواب دیا جو وہ سمجھ رہی تھی۔
"کیوں؟"
"میری طبیعت خراب ہے۔" ایرک نے نظریں ملائے بغیر کہا۔
"طبیعت کو کیا ہوا؟" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی یک دم نرم پڑی۔
"مجھے لگتا ہے مجھے کینسر ہے۔" ایرک نے بے حد اطمینان کے ساتھ کہا۔
وہ کچھ لمحوں کے لیے ہکا بکا رہ گئی تھی۔
"فار گاڈ سیک" اس نے بالآخر اپنے حواس پر قابو پایا۔ "جو بھی منہ میں آئے بول دیتے ہو۔ سوچتے نہیں کیا کہتا ہے اور کیا نہیں۔ ایسے ہوتا ہے کینسر؟"
وہ اسے ڈانٹتی ہی چلی گئی۔ ایرک کو مایوسی ہوئی۔ اسے امامہ سے ہمدردی کی توقع تھی جو پہلے ملتی رہی تھی۔
"آپ کو کیسے پتا مجھے کینسر نہیں ہے؟" اس نے بالآخر امامہ سے کہا۔
وہ اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔ اس کی شکل بے حد معصوم تھی۔ چاکلیٹ براؤن چمکدار ریشمی بال جو کنگھی کے بغیر بکھرے ہوئے تھے اور اسی رنگ کی آنکھیں جو پہلے شرارت سے چمکتی رہتی تھیں۔ اب ان میں ایک الجھن بھری اداسی تھی۔
امامہ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا۔ جواب دے سکتی تھی لیکن گیارہ سال کے اس بچے کو کیا جواب دیتی جو پہلے ہی زندگی کے سبق سیکھ نہیں پا رہا تھا۔
خاموشی سے اس نے راستہ چھوڑا اور ایپرن کی ڈوریاں کمر کے گرد کستے ہوئے دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر چلی گئی۔ ایرک نے اندر آتے ہوئے دروازہ بند کیا۔ کنڈی لگائی۔ یوں جیسے وہ اس کا اپنا گھر تھا پھر وہ بھی لاؤنج میں آگیا تھا۔
امامہ کچن کاؤنٹر پر بیکنگ کا بہت سا سامان پھیلائے کھڑی تھی وہ اپنے کام میں مصروف رہی کاؤنٹر پر پڑے سیل فون سے کسی سورت کی تلاوت ہو رہی تھی جو وہ کام کرتے ہوئے سن رہی تھی۔ ایرک نے بھی لاؤنج میں آکر کمرے میں بلند ہونے والی آیات کی آواز سنی۔ چند لمحوں کے لیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ کھڑا رہے۔ بیٹھ

جائے بات کرے۔ نہ کرے۔
اس نے جبریل کو کئی بار تلاوت کرتے سنا تھا اور وہ جب بھی تلاوت کر رہا ہوتا کوئی اور بات نہیں کرتا تھا' اس کے آس پاس کوئی اور اونچی آواز میں بات بھی نہیں کرتا تھا' اریک فیصلہ نہیں کر پایا کہ سیل فون پر چلنے والی تلاوت کے دوران اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس کی یہ مشکل امامہ نے آسان کی۔ اس نے سیل فون پر وہ تلاوت بند کر دی۔
"جبریل کی آواز ہے؟" اریک نے جیسے تصدیق والے انداز میں پوچھا۔
"ہاں۔"
"بہت پیاری ہے۔"
امامہ اس بار مسکرائی۔
"میں بھی سیکھنا چاہتا ہوں یہ۔ قرآن۔" اریک نے جیسے اس سنائی دینے والی چیز کے لیے بالآخر موزوں لفظ تلاش کیا۔ امامہ خاموش رہی۔
"میں سیکھ سکتا ہوں کیا؟"
اس نے امامہ کو خاموش پا کر سوال کیا۔ ایک اور عجیب سوال۔ امامہ نے سوچا کبھی کبھی اس کے سوال بھی مشکل میں ڈال دیتے ہیں۔ اسے غلط فہمی تھی کہ اسے مشکل میں ڈالنے والے سارے سوال صرف حمین کے پاس ہی تھے۔
"دلچسپی ہو تو سب کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔" اس نے اپنے جواب کو حتی المقدور مناسب کر کے پیش کیا۔
"آپ سکھا سکتی ہیں؟" اس کا اگلا سوال اس سے بھی زیادہ گھما دینے والا تھا۔
"نہیں۔ میں نہیں سکھا سکتی۔" امامہ نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ وہ مطلب سمجھ تھا نیت نہیں۔
"جبریل سکھا سکتا ہے؟" اس نے متبادل حل پیش کیا۔
"وہ بہت مصروف ہے' اسے ہائی اسکول ختم کرنا ہے اس سال۔" امامہ نے جیسے بہانا پیش کیا۔
"میں انتظار کر سکتا ہوں۔" اریک کے پاس بھی متبادل حل تھا۔
امامہ نے اس بار اس گفتگو ______ سے بچنے کے لیے ایک کیبنٹ کھول کر کچھ ڈھونڈنا شروع کیا' اریک نے اس موضوع گفتگو میں اس کی عدم دلچسپی محسوس کرتے ہوئے موضوع بدلنے کی کوشش کا آغاز کیا۔
"حمین اپنے بیڈ روم میں کیوں نہیں لے گیا اسے؟" وہ اب لاؤنج کے درمیان رکھی میز پر پڑی' حمین کی اسپلنگ ٹرالی کی طرف متوجہ تھا۔ امامہ نے پلٹ کر اسے دیکھا۔
"آج اس کے کچھ دوست مدعو ہیں یہاں گھر پر۔ ان ہی کو دکھانے کے لیے رکھی ہے۔" اس نے انڈوں کی ٹوکری سے ایک انڈا نکالتے ہوئے جواب دیا۔
"وہ پارٹی ہے۔" اریک نے خوشی کا اظہار کیا۔ یا کم از کم خوش دکھائی دینے کی کوشش کی۔ "میں انوائیٹڈ ہوں کیا؟" اس نے اگلے جملے کو پھر سوال میں بدلا۔
وہ ایک پیالے میں انڈے توڑ توڑ کر ڈالتے رہی۔ "تم پہلے ہی یہاں ہو۔" خوش مزاجی سے کہے گئے اس جملے میں ایسا کچھ نہیں تھا جو اریک کو برا لگتا لیکن اسے برا لگا تھا۔
"آپ کو میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگتا؟" لاؤنج کے درمیان میں کھڑے اس نے امامہ سے پوچھا۔
"جھوٹ بول کر آنا اچھا نہیں لگتا۔" اس بار اس کے جواب نے چند لمحوں کے لیے اریک کو لاجواب کیا۔ اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے امامہ کو دیکھا پھر اس ٹرالی کو جو درمیانی سینٹر پر پڑی تھی۔
اسے اندازہ تھا کہ وہ کس جھوٹ کا ذکر کر رہی تھی اور اسے یہ بھی پتا تھا کل رات ہونے والے واقعہ کے بعد

امامہ اس سے یہ ضرور کہتی۔ وہ اسے اچھی طرح جانتا تھا کم از کم اتنا تو۔ انڈے پھینٹتے ہوئے امامہ نے ایک اچٹتی نظر اس پر ڈالی ٹیڈی شرٹ اور نیلی جینز کے ساتھ جوگرز پہنے بکھرے بالوں کے ساتھ سر جھکائے دونوں ہاتھ جینز کی جیبوں میں ڈالے ایک جوگر کی نوک سے فرش کو رگڑتے ہوئے وہ پتا نہیں گہری سوچ میں تھا یا شرمندگی میں۔ امامہ کو بے اختیار اس پر ترس آیا۔

"ناشتا کیا ہے؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ ارک نے نفی میں سرہلایا۔ امامہ نے اس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ ناشتا کرے گا یا نہیں۔ وہ اس کے لیے ناشتا بنانے لگی تھی۔ ارک کو بھی پتا تھا وہ کیا کر رہی ہے۔

"آپ مجھے چپّی بنا دیں۔" وہ جانتی تھی وہ پراٹھا کھانا چاہتا تھا وہ ان کے گھر کئی بار پراٹھا کھا چکا تھا۔

"میں اسے وہاں لگا دیتا ہوں۔" ارک نے درمیانی سینٹر ٹرالی کے برابر میں پڑے سرٹیفکیٹ کو اٹھاتے ہوئے اسے دیوار پر لگانے کی پیش کش کی' وہ جیسے اپنے اور امامہ کے درمیان ملاقات کے شروع میں ہی آنے والی تلخی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"نہیں مت لگاؤ۔" امامہ نے اسے روکا۔

"کیوں؟" اس نے الجھ کر پوچھا۔ "آپ کو فخر نہیں ہے حمین پر؟"

وہ اس کی بات پر کچن میں کام کرتے کرتے ہنسی۔ وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکی کہ اگر وہ اپنے بچوں کے سرٹیفکیٹس' ٹرافیاں اور اعزازات کو اپنے گھر کی دیواروں پر لگاتی تو اس کے گھر میں کوئی جگہ خالی نہ بچتی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایسی ہی قابل اولاد دی تھی۔

"حمین کے بابا کو پسند نہیں ہے یہ۔" اس نے پراٹھے کے لیے پیڑا بناتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" وہ متجسس ہوا۔

"یہ اپنے کارناموں کی نشانیوں کو ہر وقت دیواروں پر لٹکا دیکھیں گے آتے جاتے ہوئے تو ان کے دماغوں کو ساتویں آسمان سے کیسے نیچے اتاریں گے ہم۔" اسے سالار کی بات یاد آئی تھی۔ جو اس نے پہلی بار جبریل کے کسی سرٹیفکیٹ کو دیوار پر لگانے کی اس کی کوشش کے جواب میں کہی تھی۔

"کوئی بھی بڑی اچیومنٹ والا دن ہو۔ چوبیس گھنٹے کے بعد ماضی بن جاتا ہے اور ماضی کے ڈھنڈورے پیٹنے والے لوگ کبھی مستقبل کے بارے میں نہیں سوچتے۔" اس نے سالار کی بات من و عن دہرائی تھی پتا نہیں ارک کی سمجھ میں آئی یا نہیں۔ لیکن اس نے مزید کسی سوال کے بغیر وہ سرٹیفکیٹ اسی میز پر رکھ دیا تھا۔

"مسز سالار آپ مجھے پسند نہیں کرتیں؟" وہ اس کے اگلے سوال پر بری طرح چونکی۔

"سب تمہیں بہت پسند کرتے ہیں پھر میں تمہیں پسند کیوں نہیں کروں گی۔" اس نے بڑے تحمل سے جیسے اسے سمجھایا۔

"آپ مجھے ایڈاپٹ کر سکتی ہیں؟" اگلا سوال اتنا اچانک تھا کہ وہ پراٹھا بھول کر اس کی شکل دیکھنے لگی۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ وہ کیا کہے پھر وہ ہنس پڑی تھی۔ ارک کو اس کی ہنسی اچھی نہیں لگی۔

"ارک تمہاری ممی ہیں۔ وہ۔ بہن بھائی ہیں۔ ایک فیملی ہے۔"

"پلیز۔" ارک نے کچھ بے تابی سے اس کی بات کاٹ کر جیسے پلیز کہہ کر اس کی منت کی تھی۔

"تمہاری ممی تم سے بہت پیار کرتی ہیں ارک! وہ کبھی بھی تمہیں کسی دوسرے کو نہیں دیں گی اور تمہیں ان کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کے پاس جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" امامہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"ممی کے پاس ایک بوائے فرینڈ ہے۔ وہ جلد ہی ان سے شادی بھی کرلیں گی۔ کیا آپ تب مجھے ایڈاپٹ کر سکتی ہیں؟" اس نے جیسے اس مسئلے کا بھی حل نکالا تھا۔

"تم کیوں چاہتے ہو ہمارے پاس آنا؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

"کیونکہ یہ مجھے گھر لگتا ہے۔"

بہت مختصر جملے میں اس بچے کا ہر نفسیاتی مسئلہ چھپا تھا۔۔۔ وہ کس تلاش میں کہاں کہاں پھر رہا تھا۔ امامہ کا دل اور بچھلا مگر کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی حل نہیں ہوتا۔ چاہے عقل کی ہر کنجی لگالیں کچھ تالے نہیں کھلتے۔

"تم اپنی ممی کو چھوڑ کر ہمارے پاس آنا چاہتے ہو۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔" امامہ نے جیسے جذباتی بلیک میلنگ کی کوشش کی تھی۔

"ممی مجھے چھوڑ دیں گی۔۔۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا۔ ان کا بوائے فرینڈ ہے۔۔۔" اریک کے پاس اس جذباتی حربہ کا جواب تھا۔

"وہ شادی کرلیں۔۔۔ بوائے فرینڈ کے ساتھ رہنے لگیں۔ کچھ بھی ہو۔ تم ان کے بیٹے ہی رہو گے۔۔۔ تم سے ان کی محبت کم نہیں ہوگی۔۔۔ وہ تمہیں اور تمہارے دونوں بہن بھائیوں کو اپنی زندگی سے نکال نہیں سکتیں۔" اس نے کیرولین کی وکالت کرکے اریک کی مایوسی کو جیسے اور بڑھایا۔

"میں عنایہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس کے اگلے جملے نے امامہ کا دماغ جیسے گھما دیا تھا۔۔۔ وہ اگلے کئی لمحے بول ہی نہیں سکی تھی۔ وہ ان لوگوں سے اٹیچڈ تھا' ان لوگوں کو پسند کرتا تھا لیکن وہ اس طرح اس انداز میں ان کے خاندان کا حصہ بننے کا سوچ سکتا تھا۔ اس کا اندازہ اسے نہیں تھا۔

"یہ بھی نہیں ہو سکتا۔" اس نے بالآخر اس سے کہا۔

"کیوں؟" وہ بے تاب ہوا۔

"تم ابھی اس طرح کی باتیں کرنے کے لیے بہت چھوٹے ہو۔" اسے اس سے زیادہ مناسب جواب نہیں سوجھا تھا۔ "جب میں بڑا ہو جاؤں گا' تب شادی کر سکتا ہوں اس سے؟"

"نہیں۔" اس بار اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"کیوں؟" وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔

"اس سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہو تم؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

"کیونکہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔"

"لیکن ہو سکتا ہے' وہ تمہیں اتنا پسند نہ کرتی ہو کہ تم سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے۔" اریک کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔

"کیا اس نے آپ سے ایسا کہا؟" اس نے ایک بچکانہ سوال کیا تھا۔

"نہیں' اس نے مجھ سے نہیں کہا۔ وہ بہت چھوٹی ہے۔ تمہیں پسند یا ناپسند کرنے کے بارے میں وہ ابھی سوچ بھی نہیں سکتی۔۔۔ لیکن یہ میں تم سے کہہ رہی ہوں اریک! کہ اس طرح کی باتیں کرنا اور سوچنا چھوڑ دو۔۔۔ ورنہ شاید ہمارے لیے تم سے ملنا جلنا ممکن نہیں رہے گا۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ ترش ہوئی تھی اور یہ ضروری تھا' وہ نہیں چاہتی تھی' وہ ایسی کوئی بات عنایہ سے بھی کرے۔

"آپ مجھ سے خفا نہ ہوں۔۔۔ اگر آپ ایسا نہیں چاہتیں تو میں عنایہ سے شادی نہیں کروں گا لیکن میں اس سے پیار کرتا ہوں۔" اریک اس کی خفگی سے کچھ پریشان ہوا لیکن پھر بھی اسے اپنے دل کی کیفیت بتائے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ بے اختیار لمبی سانس لے کر رہ گئی۔۔۔ وہ اس معاشرے کے وہ چیلنجز تھے جو اس سمیت ہر مسلمان ماں

کو ڈراتے تھے۔

"تم کیا کر سکتے ہو عنایہ کے لیے؟" اس نے بے حد سنجیدگی سے ارک سے پوچھا۔

"سب کچھ۔" اسے وہی جواب ملا جس کی اسے توقع تھی۔

"او کے پھر اسکول جاؤ باقاعدگی سے... دل لگا کر پڑھو۔ اپنا کوئی کیریئر بناؤ۔ عنایہ کسی ایسے لڑکے کو تو کبھی پسند کر سکتی جو باقاعدگی سے اسکول نہ جاتا ہو۔ اپنی ماں کی بات نہ مانتا ہو۔ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی پرواہ نہ کرتا ہو۔ جو اسٹڈیز کو سنجیدگی سے لیتا ہی نہ ہو۔ اور پھر جھوٹ بولتا ہو۔"

ارک کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ امامہ نے جیسے دو سیکنڈز میں اس کی زندگی کی پہلی محبت کا تیا پانچہ کر دیا تھا۔

وہاں یک دم خاموشی چھائی تھی۔ امامہ اب بھی کچن میں کام میں مصروف تھی۔ ارک کا ناشتہ تیار کر کے اس نے ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ وہ بہت دیر خاموش رہا پھر اس نے امامہ سے کہا۔

"میں اپنے آپ کو ٹھیک کر لوں گا۔"

"یہ بہت اچھا ہو گا ارک... لیکن اس کے ساتھ تمہیں ایک اور وعدہ بھی کرنا ہے مجھ سے۔"

"کیا؟" وہ الجھا۔

"جب تک تم ہائی اسکول پاس کر کے یونیورسٹی میں نہیں چلے جاتے تم عنایہ سے اس طرح کی کوئی بات نہیں کرو گے... میں نہیں چاہتی وہ تم سے مکمل طور پر خفا ہو جائے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ میں ایسا ہی کروں گا۔"

ارک نے بھی اسی سنجیدگی سے امامہ سے کہا تھا جس سنجیدگی سے وہ اس سے بات کر رہی تھی۔ وہ اپنا چھری اور کانٹا پکڑے کرسی پر بیٹھا اب کھانے کی تیاری میں تھا۔

"اور جب تک تم یونیورسٹی نہیں پہنچ جاتے ہم دوبارہ اس ایشو پر بات نہیں کریں گے... محبت... شادی... عنایہ۔" امامہ نے جیسے ان تین چیزوں کے گرد ریڈ زون لگاتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ وہ معمول کی طرح یہ بات بھی مان گیا تھا۔

امامہ کا خیال تھا اس نے حفاظتی بند باندھ دیا تھا۔ تھوڑا عرصہ مزید گزر جانے پر وہ اپنے باپ کی موت کو بھول جانے کے بعد ٹھیک ہو جاتا۔ اس سے عنایہ اور اس سے متعلقہ ہونے والی ساری گفتگو بھول جاتا... اس نے ارک کی اس بات چیت کو ایک امریکن بچے کی بچکانہ گفتگو سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی... اسے اندازہ نہیں تھا ارک ایک عام امریکن بچہ نہیں تھا۔



احسن سعد کا باپ اس بات پر ہمیشہ فخر کرتا تھا کہ اس کا بیٹا آج کے زمانے میں پاکستان کے بہترین انگلش میڈیم اور کو ایجوکیشن اداروں میں پڑھنے کے باوجود ایک سچا اور پکا مسلمان تھا۔ داڑھی رکھتا تھا۔ پانچ وقت کی نماز مسجد میں پڑھتا تھا۔ حج اور عمرے کی سعادت اپنے شوق سے حاصل کر چکا تھا۔ لڑکیوں سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ کسی ایسی سرگرمی میں ملوث نہیں تھا جو "حرام" تھی اور ماں باپ کا فرماں بردار تھا۔ دن کو دن اور رات کو رات کہنے والی سعادت مندی اور اس کے ساتھ ساتھ پڑھائی میں شروع سے اب تک اس نے اسکالرشپ حاصل کی تھی... صرف وہی نہیں ان کی دونوں چھوٹی بیٹیاں بھی جو بڑے بھائی ہی کی طرح دینی طور پر باعمل ہونے کے ساتھ ساتھ پوزیشن ہولڈرز تھیں۔

سعد اور اس کی بیوی اس بات پر جتنا فخر کرتے وہ کم تھا اور یہ فخر وہ برملا لوگوں تک پہنچاتے بھی تھے۔ ان کے حلقہ احباب میں زیادہ تر لوگ ان ہی کی طرح کنزرویٹو اور مذہبی تھے لیکن کم لوگ ایسے تھے جن کے بچے ان کے بچوں کی طرح لائق فائق ہوتے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ والدین کے اتنے فرماں بردار ہوتے۔

باندھنا تھا۔ ان کا گھران کے سوشل سرکل میں ایک آئیڈیل گھر سمجھا جاتا تھا ایسا آئیڈیل گھر جیسا گھر اور فیملی سب بنانا چاہتے۔ لیکن یہ صرف اس کی ماں کا خاندان تھا جو اس آئیڈیل گھر کی کھوکھلی بنیادوں سے واقف تھا اور احسن سعد کے باپ کو پسند نہیں کرتا تھا۔

سعد نے ایک بہت امیر اور اچھے خاندان میں شادی کی تھی لیکن اس کے بعد اس نے اپنی بیوی کو ایک اچھی اور نیک مسلمان عورت بنانے کے لیے جو کچھ کیا تھا۔ وہ اس کے خاندان سے پوشیدہ نہیں تھا۔ اگر شادی کے پہلے ہی سال احسن پیدا نہ ہو گیا ہوتا تو اس کی بیوی کے ماں باپ اپنی بیٹی کی علیحدگی کروا چکے ہوتے۔۔۔ کئی بار احسن کی پیدائش کے بعد بھی معاملات اس حد تک جاتے رہے کہ طلاق ہو جاتی لیکن سعد اور اس کے گھر والوں کا شور شرابا ہمیشہ انہیں کمزور کر دیتا۔ سعد اپنی بیوی کو ایک باحجاب 'فرماں بردار' دین سے قریب اور دنیا سے دور رہنے والی بیوی بنانا چاہتا تھا اور یہ وہ مطالبہ تھا جو وہ مذہب کا نام استعمال کرتے ہوئے کرتا تھا۔

سعد میں اس کے علاوہ کوئی خرابی نہیں تھی کہ وہ اپنی بیوی کو اس سانچے میں ڈھالنے کے لیے ہر حربہ استعمال کر سکتا تھا۔ گالم گلوچ سے لے کر مار کٹائی تک اور ماں باپ کے گھر جانے پر پابندی لگانے سے گھر میں قید کر دینے تک۔۔۔ اور خاندانوں کے بڑے جب بھی ان مسائل پر اکٹھے ہوتے سعد اپنے ہر رویے کا جواز اسلام سے لے کر آتا۔ وہ شوہر تھا۔ بیوی کو اپنے طریقے اختیار کروانا نہیں چاہتا تھا۔ اسلامی طریقے پر رکھنا چاہتا تھا۔ کیا بیوی کا خاندان اپنی بیٹی کو بے راہ رو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی بیوی کے میکے والوں کے پاس ہزار دلیلوں کے باوجود سعد کے قرآن و حدیث اور مذہبی حوالوں کا جواب نہیں تھا۔ وہ روشن خیال پڑھے لکھے تھے مگر ان کے پاس صرف دنیاوی تعلیم تھی۔ ان کے پاس دین کا علم ہوتا تو وہ سعد کے قرآن و حدیث کے حوالوں کا سیاق و سباق بھی اسے بتا دیتے۔

سعد کی بیوی اس سے عمر میں چھوٹی تھی اور ہر بار اس کے گھر والے اسے کچھ اور وقت صبر اور برداشت کے ساتھ گزارنے کا کہتے اور سعد کی کچھ اور فرماں برداری اختیار کرنے کی نصیحت کرتے۔۔۔ ان سب کا خیال تھا' وقت گزرنے اور بچے ہونے کے ساتھ ساتھ سعد بدلتا جائے گا۔

وقت بدلنے کے ساتھ سعد نہیں بدلا تھا۔ اس کی بیوی بدلتی چلی گئی تھی۔ اس نے ذہنی طور پر یہ مان لیا تھا کہ وہ شادی سے پہلے واقعی اسلام سے دور تھی اور دین کی تعلیمات وہی تھیں جو سعد اس کے کانوں میں ڈالتا تھا اور اسے واقعی وہی کرنا چاہیے جو اس کا شوہر کہتا تھا۔ ویسا پردہ۔۔۔ ویسی خدمت۔۔۔ ویسی فرماں برداری۔ ایک اسٹیج وہ آ گیا تھا جب دونوں میاں بیوی سوچ کے حساب سے ایک جیسے ہو گئے تھے۔ اس کی بیوی بھی سعد کی طرح لوگوں پر اپنے فتوے نافذ کرنے لگی تھی۔ دوسروں کے بارے میں اپنے فتووں کا کھلا اظہار کرتی تھی۔ وہ کسی کی ذرا بھی ایسی چیز کو برداشت نہیں کر پاتی تھی جو اسے غیر اسلامی لگتی۔ ان کا خیال تھا' اسلام انہیں اس کا حکم دیتا تھا کہ جو علم ان کے پاس ہے وہ دوسروں تک پہنچائیں۔ جو خلاف اسلام کام ہو' روک سکتے ہیں۔ اسے روک دیں جسے برا کہہ سکتے ہیں۔ اسے برا نہ کہیں بلکہ سب کے سامنے اس طرح مطعون کریں کہ اگلا شرم سے پانی پانی ہو جائے۔

اسلام میں "حکم" کے علاوہ "حکمت" نام کی بھی ایک چیز۔۔۔ ہے' وہ اس سے ناواقف تھے۔۔۔ وہ میاں بیوی اس بات پر شکر ادا کرتے تھے کہ اللہ نے انہیں یہ توفیق عطا کی کہ وہ لوگوں کو کھینچ کھینچ کر مذہب کی طرف لا رہے تھے' راہ ہدایت کی طرف راغب کر رہے تھے۔

ان دونوں کی ازدواجی زندگی میں اگر کسی بات پر ان کا کبھی اتفاق ہوا تھا تو وہ صرف یہی ایک بات تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کے درمیان کسی اور چیز پر زندگی میں بھی اتفاق نہیں ہوا تھا مگر سعد کی بیوی ہر اس چیز پر جو اس کے شوہر کو ناگوار گزرتی تھی' صرف خاموش رہنا سیکھ گئی تھی۔۔۔ خاموشی اختیار نہ کرنے اور اختلاف رائے کرنے کا نتیجہ وہ شادی کے ابتدائی سالوں میں بہت بری طرح بھگت چکی تھی۔ اس نے اور سعد کے درمیان اتنے سال گزر جانے

کے باوجود اس قدر ذہنی ہم آہنگی کے باوجود محبت نہیں تھی لیکن اسی فیصد پاکستانی جوڑوں کی طرح وہ اس کے بغیر بھی رشتہ تو چلاتے ہی آرہے تھے۔ اگر ایک دوسرے سے محبت نہ ہونے نے ان کے لیے ساتھ رہنا مشکل بنایا تھا تو اس مشکل کو آسان اس مشترکہ نفرت نے کر دیا تھا جو وہ میاں بیوی ہر اس شخص سے کرتے تھے جو ان کی زندگیوں اور ذہنوں میں موجود اسلام کے تصور پر پورا نہیں اترتا تھا۔

وہ دونوں میاں بیوی اپنے خاندان اور حلقہ احباب میں پسند نہیں کیے جاتے تھے حالانکہ ان دونوں کا خیال تھا کہ وہ دونوں بے حد خوش اخلاق اور سب کی ضرورت میں ان کی کام آنے والے تھے لیکن کہیں نہ کہیں اسلام کے اس کٹر تصور نے جو وہ دوسروں پر ٹھونسنا چاہتے تھے لوگوں کے لیے ان کو کسی نہ کسی حد تک ناقابل برداشت بنا دیا تھا اور وہ اس ناپسندیدگی سے ناواقف نہیں تھے۔ لیکن ان کا خیال تھا بلکہ انہیں یقین تھا وہ نیکی کی بات پھیلانے والے ہیں اور اگر اس کی وجہ سے لوگ ان سے کٹتے ہیں تو اللہ انہیں اس کا اجر دے گا۔

احسن سعد نے ایک ایسے گھر میں پرورش پائی تھی جہاں پر اس کے ماں باپ نے اسے لوگوں کو اسی کسوٹی پر رکھنا سکھایا تھا جس پر وہ خود دوسروں کو پرکھتے تھے۔ اس نے ماں باپ کے درمیان ہر طرح کا جھگڑا بچپن میں ہی دیکھ لیا تھا اور اس نے سیکھا تھا کہ شوہر اور بیوی کا تعلق ایسا ہی ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ حاکم اور محکوم کا۔ برتر اور کمتر کا۔ کفیل اور مکفول کا۔ عزت اور احترام کا نہیں۔ پیار اور محبت کا بھی نہیں۔

مرد کی ساری عزت اور غیرت اس کے گھر کی عورت کے کردار اور عمل سے وابستہ ہے اس کے اپنے عمل اور کردار سے نہیں۔ ایک امریکن نیشنل اور وہاں سے اعلا تعلیم یافتہ باپ نے احسن سعد کو جو پہلا سبق پڑھایا تھا" وہ یہی تھا۔

احسن سعد کو کچھ چیزیں شدید ناپسند تھیں۔ ناپسندیدگی ایک چھوٹا لفظ تھا یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ اسے کچھ چیزوں سے نفرت تھی اور ان چیزوں کی فہرست میں ماڈرن عورت اور امریکہ سرفہرست تھے۔ باپ کی طرح وہ دنیا میں تمام انتشار اور گناہ کی وجہ ان ہی دو کو قرار دیتا تھا۔

وہ ایک بے حد لبرل اسکول میں کو ایجوکیشن میں اے لیولز کر رہا تھا لیکن وہ وہاں اپنے ساتھ پڑھنے والی ہر اس لڑکی کو "آوارہ" سمجھتا تھا جو حجاب میں نہیں تھی۔ ماں باپ کی طرح وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ وہ سب لڑکیاں لڑکوں کو دعوت گناہ دیتی ہیں۔ جان بوجھ کر اپنی طرف راغب کرتی ہیں۔

اس کی اپنی دونوں بہنیں اس کے برعکس ——— کو ایجوکیشن سے نہیں پڑھ رہی تھیں مگر احسن سعد کو شروع سے ہی ایسے اسکولز میں پڑھایا جاتا رہا جہاں کو ایجوکیشن تھی جہاں اس کا واسطہ ہر قسم کی لڑکیوں سے پڑتا تھا اور باپ کو اسے مثالی بنا کر پیش کرنے کے لیے یہ ایک اور مثال مل گئی تھی۔ اس کا بیٹا کو ایجوکیشن میں پڑھنے کے باوجود گرل فرینڈ کے مفہوم سے بھی واقف نہیں تھا۔ یہ اس منافقت کی ایک اور جھلک تھی جو سعد کے اپنے اندر مذہب اور مذہب کی حدود کو نافذ کرنے کے حوالے سے تھی۔

احسن سعد اور اس کی دونوں بہنوں کی زندگی سماجی طور پر جتنی محدود کی جا سکتی تھی سعد اور اس کی بیوی نے کر رکھی تھی۔ ان کی زندگی کی واحد "تفریح" پڑھنا تھا۔ واحد "خوشی" اچھے گریڈز لینا تھا۔ واحد "دلچسپی" مذہبی کتابیں پڑھنا تھا۔ واحد مقصد "آخرت میں سرخروئی" تھی۔ واحد "ہابی" "والدین کی خدمت تھا"۔ اور اس سب میں وہ "دنیا" کو ایک لعنت کے طور پر سمجھتی تھیں اور ہر وہ چیز جو دنیا کی طرف کھینچتی تھی وہ شیطانی تھی۔

وہ ایک پرفیکٹ dysfunational فیملی تھی جس میں ماں باپ نے اپنے خراب ازدواجی تعلق سے پیدا ہونے والے نقائص اور خامیوں کو مذہب کے کمبل سے اسے ڈھک کر اپنے آپ کو پاک کر لیا تھا۔ تاکہ کوئی ان کی عبادتوں علم سے آگے بڑھ کر ان سے بات نہ کر سکے۔ ان کی ساری بشری کمزوریاں اور خامیاں نماز' روزوں اور

دوسری عبادتوں میں چھپ جائیں۔۔۔ سب سے خوف ناک بات یہ تھی کہ اس گھر میں رہنے والے کسی فرد کو یہ احساس ہی نہیں تھا کہ ان میں بہت سے نقائص تھے ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو پرفیکٹ سمجھ رہا تھا۔۔۔ دوسروں کے لیے ایک رول ماڈل۔۔۔ اللہ سے قریب۔۔۔

احسن سعد بھی اپنے آپ کو کامل سمجھتا تھا۔ سب برائیوں سے مبرّا۔ سب اچھائیوں کا منبع۔۔۔ اس پر اپنے باپ کی سوچ اور کردار کی گہری چھاپ تھی جو اس سے عشق کرتا تھا کیونکہ وہ اس کی واحد نرینہ اولاد تھی۔۔۔ احسن سعد نے باپ سے بہت کچھ وراثت میں لیا تھا۔ شکل و صورت' ذہانت' مزاج' عادات۔۔۔ لیکن جو سب سے بڑی چیز احسن سعد نے باپ سے لی تھی وہ منافقت تھی۔۔۔ اس کی پہچان نہ رکھتے ہوئے بھی۔۔۔ اسے ماڈرن عورت اور امریکہ سے نفرت تھی۔۔۔ وہ انہیں گناہ اور برائی کی جڑ سمجھتا تھا۔۔۔ اور وہ ایک ماڈرن عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا جس کے پاس امریکن شہریت بھی ہو۔۔۔ اور وہ امریکہ میں اعلا تعلیم بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔۔۔ اس کا باپ ٹھیک کہتا تھا احسن جس چیز کی بھی تمنا کرتا تھا۔ وہ اسے مل جاتی تھی۔۔۔ یہ دونوں چیزیں بھی اسے ملنے والی تھیں۔۔۔ اس کی خوش قسمتی ایک اور خاندان کی بدقسمتی میں بدلنے والی تھی۔

"تمہیں پتا ہے JB لڑکیاں تمہیں ہاٹ سمجھتی ہیں۔"

ایک لمحے کے لیے ڈنر ٹیبل پر خاموشی چھا گئی تھی' وہ ایسا ہی غیر متوقع جملہ تھا جو حمین نے پاستا کھاتے ہوئے اپنے تیرہ سالہ بڑے بھائی کے گوش گزار کیا تھا۔ امامہ' سالار' عنایہ' رئیسہ نے بیک وقت حمین کو دیکھا پھر جبرئیل کو جو سرخ ہوا تھا۔۔۔ وہ شرمندگی نہیں غصہ تھا جو حمین کے ان بے لاگ تبصروں پر اکثر آجاتا تھا۔

"وہ مجھے بھی کول کہتی ہیں لیکن تمہیں تو ہاٹ سمجھتی ہیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے نا۔"

اس نے ماں باپ کی نظروں کی پروا کی تھی نہ ہی جبریل کے سرخ ہوتے چہرے کی۔ اس نے اپنے تبصرے کے بعد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے لڑکیوں کی نظر میں اپنے اسٹیٹس پر افسوس کا اظہار بھی اسی سانس میں کیا تھا۔

"Will you please shut up"

"(تم خاموش نہیں رہ سکتے؟)" جبریل نے اس دفعہ کچھ سخت لہجے میں اسے روکنے کی کوشش کی۔ ماں باپ کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے اس نے اسے شٹ اپ کہنے کے بجائے ان دو لفظوں کو توڑ کر کے بالواسطہ اسے ٹوکا۔

"Oh one more twister."

حمین نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے اسے کوئی بڑا ہی مشکل لفظ کہہ دیا تھا جس سے وہ واقف ہی نہیں تھا۔

"حمین۔" اس بار امامہ نے اسے تنبیہہ کی۔ وہ سپر مل ہونے والی اس پارٹی کو بھگتا کے بیٹھی تھی۔ جو حمین نے اپنے کلاس فیلوز ۔۔۔ کو دی تھی۔

"میں غلط نہیں کہہ رہا ممی۔۔۔" حمین نے اس کی تنبیہہ کو جیسے ہوا میں اڑایا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میری جاننے والی ہر لڑکی کا جبریل پر کرش ہے۔"

جبریل نے اس بار ہاتھ میں پکڑا ہوا کانٹا پلیٹ میں رکھ دیا۔ یہ جیسے اس کے صبر کے پیمانے کے لبریز ہو جانے کی نشانی تھی۔

"یہاں تک کہ میری گرل فرینڈز بھی۔"

"فرینڈز!" سالار نے ٹوکا۔

"جو بھی ہو۔" اس نے اسی انداز میں بات جاری رکھی۔ "میں ایلو آر سو کی۔"

حمین نے اس بار جبریل کو رشک بھری نظروں سے دیکھا۔ امامہ اپنی بے انتہا کوشش کے باوجود اپنی ہنسی پر قابو نہیں پا سکی۔ اسے حمین کی گفتگو سے زیادہ جبریل کے رد عمل پر ہنسی آرہی تھی جس کی اب کان کی لوئیں تک سرخ ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ ماں کے ہنسنے پر کچھ اور جز بز ہوا تھا۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے کون سی چیز ہے جو اسے لڑکیوں میں پاپولر کرتی ہے؟" سالار نے صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے حمین سے یوں سوال کیا جیسے یہ کوئی بڑا فلسفیانہ سوال تھا۔

"میں اس بارے میں پہلے ہی سوچ چکا ہوں۔" حمین نے اپنے کانٹے کی نوک پاستے کے درمیان پھیرتے ہوئے سالار کے فلسفیانہ سوال کا اسی فلسفیانہ انداز میں جواب دینے کی کوشش کی۔

"اس کی بہت سی ریزن ہیں۔ لڑکیاں ان لڑکوں کو پسند نہیں کرتیں جو بہت بولتے ہیں اور JB بالکل بات نہیں کرتا۔"

"اور۔" سالار نے سلاد کا ایک ٹکڑا کھاتے ہوئے آگے بولنے کی ترغیب دی۔

"اور لڑکیاں ان لڑکوں کو پسند کرتی ہیں جو لیے دیے رہتے ہیں اور JB میں یہ بات بھی ہے۔"

اس نے اپنے بھائی کا تجزیہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

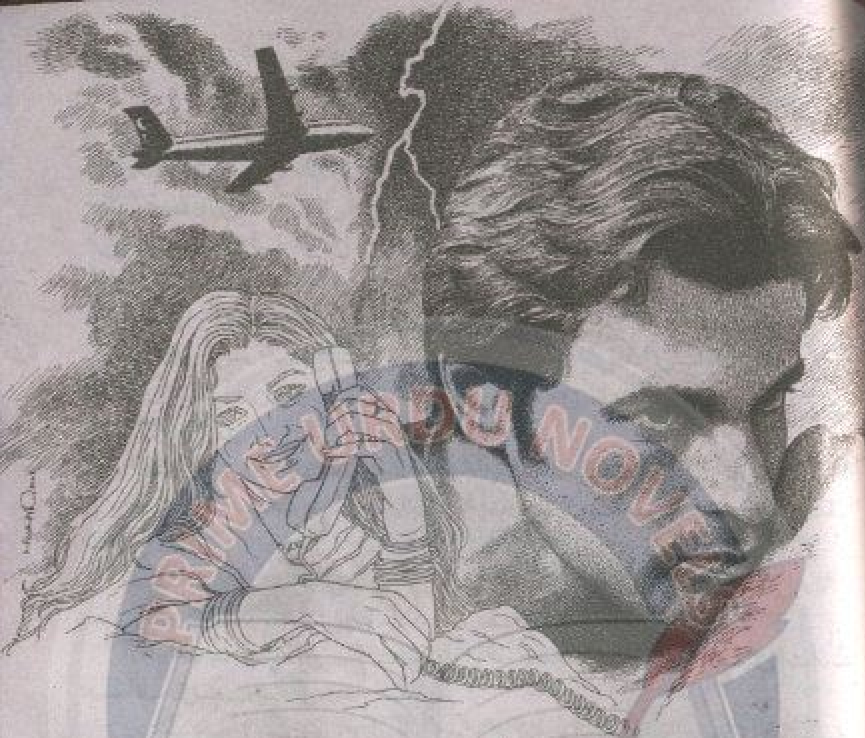
"اور لڑکیوں کو وہ لڑکے اچھے لگتے ہیں جو ان کی کبھی نہ ختم ہونے والی باتیں سن سکتے ہوں اور JB سب کی باتیں سنتا ہے خواہ وہ کتنی ہی احمق ہوں۔"

اس بار سالار کو بھی ہنسی آئی جو اس نے گلا صاف کر کے چھپائی۔ عنایہ اور رئیسہ چپ چاپ کھانا کھاتے ہوئے حمین کے جملے سنتیں پھر جبریل کے تاثرات دیکھتیں۔ وہ بڑا بھائی تھا۔ یہ چھوٹا بھائی تھا اور وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ وہ اس قابل اعتراض گفتگو میں حصہ کیسے لیں۔

"اور لڑکیاں ان لڑکوں کو پسند کرتی ہیں جو گڈ لکنگ ہوں۔" حمین اسی طرح روانی سے کہتے ہوئے اس بار اٹکا۔ "اور یہاں میرے اور JB کے درمیان موازنہ کیا جائے تو ہم دونوں ہر لحاظ سے یکساں گڈ لکنگ ہیں۔"

اس نے بات پھر گھمائی اس بار بالآخر جبریل نے اسے ٹوکا۔
"تمہیں پتا ہے حمین لڑکیاں ان لڑکوں کو پسند کرتی ہیں جو ایڈیٹ نہیں ہوتے۔" اس کا اشارہ حمین کی سمجھ گیا تھا۔
"ہاں یہ اسی صورت ممکن ہے اگر لڑکیاں خود احمق نہ ہوں۔"
"بابا!" اس بار عنایہ نے سالار کو پکارا تھا۔ اور اس نے حمین کے تبصرے پر احتجاج کیا تھا۔
"تم ان دونوں لڑکوں کے بارے میں کیا کہو گے؟" سالار نے بے حد سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔
"تین کہیں بابا! آپ ممی کو لڑکیوں کی صف سے کیوں نکال رہے ہیں۔" حمین نے سوال کا جواب گول کیا اور بے حد معصومیت سے سالار سے پوچھا وہ اسمارٹ نہیں تھا پر اسمارٹ تھا۔ ہوشیار اور موقع شناس تھا۔ بات کہنا، بدلنا، سنبھالنا اس عمر میں بھی جانتا تھا۔
"حمین! بس کرو۔" امامہ نے اس بار اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔ اس کی واقعی سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ اسے ڈانٹے یا اس کی باتوں پر ہنسے۔
وہ جو بھی کہہ رہا تھا۔ غلط نہیں تھا۔ جبریل تیرہ سال کی عمر میں بھی اپنے قد کاٹھ کی وجہ سے بڑا لگتا تھا۔ وہ حمین کی طرح زیادہ دبلا پتلا نہیں تھا۔ حمین ٹھیک کہہ رہا تھا کہ لڑکیاں اسے ہاٹ سمجھتی ہیں۔ جو ایک بات حمین نے لڑکیوں کے لیے پسند کرنے کی وجوہات میں نہیں گنوائی تھی۔ وہ اس کی خوب صورت آواز تھی۔ جو اب آہستہ آہستہ بھاری "مردانہ" ہونے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں سالار کی آنکھیں تھیں۔ بڑی سیاہ اور بے حد گہری۔ وہ اسی کی طرح بے حد متحمل مزاج تھا۔ حمین کی طرح بے مقصد بولنے کی عادت نہیں تھی اسے۔ اور وہ اگر لڑکیوں میں مقبول تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سب کے لیے ایک "پہیلی" تھا۔ حمین کی شخصیت "مقناطیسی" تھی۔ حمین کو اپنے چارم کا پتا تھا اور وہ اس کا صحیح وقت پر استعمال کرنا جانتا تھا۔ جبریل اپنی کشش سے بے خبر تھا اور اسے اس کشش کو استعمال کرنے میں دلچسپی بھی نہیں۔ لیکن دنیا میں اگر کوئی خاموشی اور متحمل مزاجی کے اس پہاڑ میں شگاف ڈال کر اسے برہم کر سکتا تھا تو وہ حمین تھا۔ JB کو تنگ کرنا اس کی زندگی کا دلچسپ اور پسندیدہ ترین کام تھا۔ وہ اسے بھائی کہنا ایک سال پہلے چھوڑ چکا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا۔ JB کہنا کول تھا بھائی کہنا کول نہیں تھا اور حمین کی زندگی کی ترجیحات میں سے ایک یہ تھی کہ وہ ہر چیز میں سے کول نیس نکالتا تھا۔
"بابا! جب میں اسپیلنگ بی جیت کر آؤں گی تو میں بھی اپنے سارے کلاس فیلوز کو بلاؤں گی۔"
رئیسہ نے اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے سالار کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کا ذہن پچھلی شام سے اس ایک ٹرافی کے حصول میں اٹکا ہوا تھا جو اس گھر میں تین بار آچکی تھی اور اب اصولی طور پر اسے چوتھی بار لانے کی ذمہ داری اس کے کندھے پر خود بخود آگئی تھی۔ وہ جبریل کے بعد اس گھر کی سب سے ذمہ دار اور بلکہ ضرورت سے زیادہ ذمہ دار بچی تھی۔ وہ جبریل کی طرح خود ہر کام کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لینے کی کوشش کرتی تھی۔ اور پھر پوری لگن اور تن دہی سے اس کام کو کرنے میں مصروف ہو جاتی تھی۔ وہ ان تینوں کی طرح غیر معمولی ذہین نہیں تھی لیکن اب وہ ڈیڑھ سال چنی بھی نہیں رہی تھی جو کوئی نہ ہوتے ہوئے بھی بول ہی نہ پاتی۔
امامہ کے ساتھ ساتھ ان تینوں نے بھی کم ذہانت رکھنے والی رئیسہ کو ذہین بنانے کے لیے بہت محنت کی تھی۔ اور اب وہ وہ کارنامہ انجام دینے کے لیے بے تاب تھی جو ان تینوں نے کیا تھا۔ نیشنل لیول کے اس مقابلے کو جیت کر چوتھی بار ٹرافی اس گھر میں لانے کا۔ اس ساری لائم لائٹ کا فوکس بننے کا جو اس نے اپنے بہن بھائیوں کو ان فتوحات کے بعد ملتے دیکھی تھی۔
رئیسہ سالار زندگی میں کوئی بڑا کام کرنا چاہتی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کی قسمت میں "صرف" بڑے کام لکھے ہیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بڑے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

اٹھارھویں قسط

"بابا! مجھے آپ کو حمین کے بارے میں کچھ بتانا ہے۔"
رئیسہ کی منمناتی آواز پر سالار بیرونی دروازے سے نکلتے نکلتے ٹھٹک گیا۔ اپنی فراک پر لگی ایک تتلی کا پر مروڑتے ہوئے وہ اس کے عقب میں کھڑی تھی۔ وہ اس وقت واک کے لیے نکل رہا تھا اور رئیسہ اس کو ہمیشہ کی طرح دروازے تک چھوڑنے آئی تھی لیکن اس کو خدا حافظ کہہ کر دروازہ بند نہیں کیا تھا اس نے کچھ سرگوشی نما منمناتی آواز میں سالار سے جو کہا تھا اس پر سالار کو اچنبھا ہوا تھا۔
وہ کبھی کسی کی شکایت نہیں کرتی تھی اور حمین کی شکایت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ حمین کی سب سے بڑی رازداں تھی۔ رئیسہ کے بارے میں یہ خیال صرف سالار کا ہی نہیں بلکہ اس کے خاندان کے ہر شخص کا تھا۔ کیوں کہ اسے حمین کے بارے میں بہت سی وہ باتیں بھی پتا ہوتی تھیں جو گھر میں کسی دوسرے شخص کے علم میں نہیں ہوتی تھیں۔
دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھے سالار نے کچھ غور اور حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا بتانا ہے؟"
رئیسہ نے جواب دینے کے بجائے پلٹ کر لاؤنج کی طرف دیکھا جہاں سے حمین کی آواز آرہی تھی۔ وہ امامہ سے باتیں کر رہا تھا۔
"کچھ ہے، جو میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں۔" رئیسہ نے اسی سرگوشی نما آواز میں سالار سے کہا۔ اس بار سالار نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دروازہ کھول کر باہر جاتے ہوئے اس سے کہا۔
"آؤ ہم واک کے لیے چلتے ہیں۔" اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ گھر کے اندر حمین کے بارے میں بات کرتے ہوئے جھجک رہی ہے۔ وجہ جو بھی ہو۔
رئیسہ چپ چاپ اس کے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔ موسم انتہائی خوش گوار تھا اور ان کی رہائشی کالونی کے کچھ اور افراد بھی اس وقت سڑک پر واک کرنے میں مصروف تھے۔ وہ دونوں بھی سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگے۔
"تو حمین کے بارے میں تم کیا بتانا چاہتی ہو؟" پانچ دس منٹ کی واک اور اس کے ساتھ ہلکی پھلکی گپ شپ کے بعد سالار نے اس سے کہا۔ رئیسہ نے فوری طور پر کچھ جواب نہیں دیا جیسے وہ کسی سوچ میں پڑ گئی ہو۔
"آئی ایم ناٹ شیور۔" اس نے کہا۔ "کچھ ہے جو میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں لیکن مجھے یہ نہیں پتا کہ مجھے بتانا چاہیے یا نہیں۔" وہ ہمیشہ اسی طرح بات کرتی تھی۔ ہر لفظ بولنے سے پہلے دس دفعہ تول کر۔
"تم مجھ پر ٹرسٹ کر سکتی ہو۔" سالار نے جیسے اسے تسلی دی۔
"مجھے آپ پر ٹرسٹ ہے۔ لیکن میں حمین کو ہرٹ بھی نہیں کرنا چاہتی۔" اس نے سالار کی بات کے جواب میں کہا۔ "یہ اس کا سیکرٹ ہے اور یہ اچھی بات نہیں ہے کہ میں اس کا سیکرٹ کسی کو بتاؤں۔ شاید مجھے نہیں بتانا چاہیے۔"
"میں پوری طرح شیور نہیں ہوں۔ میں ابھی سوچ رہی ہوں۔" وہ اب سالار کے ساتھ چلتے ہوئے اس طرح بڑبڑا رہی تھی جیسے خود کلامی کر رہی ہو۔ متذبذب ہو یا خود سے الجھ رہی ہو۔
سالار نے ساتھ چلتے ہوئے اسے بہ غور دیکھا۔ وہ کچھ بتانا چاہ رہی تھی لیکن وہ متذبذب بھی تھی۔ رئیسہ کا یہ مسئلہ تھا۔ فیصلہ نہ کر پانا۔ مگر اس وقت سالار اس کے اس مسئلے پر سوچ بچار کرنے کے بجائے صرف اس لیے حیران اور کسی حد تک فکر مند تھا کہ رئیسہ نے حمین کے بارے میں وہ جو بھی راز تھا اسے اس میں شریک کرنے

کا سوچا کیوں؟ کیا اسے یہ اندیشہ تھا کہ حمین کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے یا پھر یہ پریشانی تھی کہ بعد میں پتا چلنے پر حمین سے وہ اور امامہ بہت ناراض ہو سکتے تھے۔

"ایسی کیا بات ہے رئیسہ؟" سالار نے اسے نرم آواز میں بہلانے والے انداز میں کریدا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ حمین کے بارے میں جو بھی بات ہے وہ ایک سیکرٹ ہی رہے گی۔۔۔ میں کسی کو اس کے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔"

اس نے رئیسہ سے کہا۔ مگر وہ متاثر نہیں ہوئی۔

"بابا! آپ حمین سے بہت خفا ہو جائیں گے اور میں یہ نہیں چاہتی۔" اس بار رئیسہ نے اپنے خدشات کا اظہار کھل کر اس سے کیا۔ سالار کی چھٹی حس نے اسے سگنل دینا شروع کیے تھے۔

"میں آپ کو ایک دو دن بعد بتاؤں گی۔ میں ابھی اس پر سوچنا چاہتی ہوں۔" رئیسہ نے بالآخر اس سے کہا۔

"رئیسہ! یہ اچھی بات نہیں ہے۔" سالار نے اس بار سنجیدگی سے اسے ٹوکا۔ "اگر حمین نے کچھ ایسا کیا ہے جو تمہیں لگتا ہے ہمیں پتا ہونا چاہیے تو تمہیں ہمیں بتانا چاہیے۔ اس طرح کوئی بھی چیز چھپانا ٹھیک بات نہیں ہے۔"

وہ اب واقعی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ اسے یہ اندازہ تھا کہ حمین کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتا جس سے ان کو کوئی بڑی پریشانی لاحق ہوتی مگر رئیسہ کی یہ پردہ پوشی اس وقت سالار کو بے حد بری لگی تھی۔

"مجھے ایک دن دیں۔" رئیسہ نے اس کے لہجے میں جھلکتی خفگی کو محسوس کیا اور اسے منانے کی کوشش کی۔

میں آپ کو کل بتا دوں گی۔ میں بس کچھ اور سوچنا چاہتی ہوں اس پر۔"

وہ بے اختیار گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ انہوں نے اپنے بچوں کی پرورش زور زبردستی سے نہیں کی تھی۔ نہ ہی ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے انہیں کنٹرول کیا تھا۔ وہ اس وقت بھی زبردستی اس سے وہ بات اگلوانا نہیں چاہتا تھا۔ رئیسہ کو اگر یہ چیز الجھا رہی تھی کہ آیا جو وہ کرنے جا رہی تھی وہ صحیح ہے یا غلط۔۔۔ تو سالار چاہتا تھا وہ یہ فیصلہ خود ہی کرے۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ ایک دن اور سوچ لو اور پھر مجھے بتاؤ۔" اس نے بات ختم کر دی لیکن رئیسہ کے انکشاف سے پہلے ہی اسکول سے امامہ کو کال آ گئی تھی۔ حمین کی ٹیچر اس کے کسی "اہم اور فوری" مسئلے پر ان سے ملاقات کرنا چاہتی تھی۔ ان دونوں نے اس کال کو زیادہ اہمیت نہ دی تھی۔ ان کا خیال تھا وہ پڑھائی سے متعلق کوئی مسئلہ ہو گا یا پھر کوئی چھوٹی موٹی بدتمیزی۔ حمین کے حوالے سے ایسی شکایات انہیں ہمیشہ ہی ملتی رہتی تھیں۔ وہ جبریل کی طرح نہیں تھا۔

لیکن اگلے دن اسکول میں انہیں حمین کے حوالے سے جو بتایا گیا تھا۔ اس نے کچھ دیر کے لیے ان کے ہوش و حواس ہی اڑا دیے تھے۔ وہ جونیئر ونگ میں "بزنس" کر رہا تھا اور ایسی ہی ایک بزنس ڈیل کے نتیجے میں ایک بچہ اپنا ایک بے حد مہنگا گیم گنوانے کے بعد اپنے ماں باپ وہ اس لین دین کی تفصیلات سے آگاہ کر بیٹھا تھا اور اس کا پتا ان والدین کی شکایت سے چلا تھا جس کے نتیجے میں اسکول نے تحقیقات کی تھیں اور حمین سکندر کو پہلا وارننگ لیٹر ایشو ہوا تھا۔ وہ اگر حمین سکندر جیسا اسٹار اسٹوڈنٹ نہ ہوتا تو اسکول کی انضباطی کارروائی کچھ اور زیادہ سخت ہوتی لیکن سالار اور امامہ کے لیے وہ وارننگ لیٹر بھی کافی تھا۔ ان کے چاروں بچوں میں سے کسی کو پہلی بار کوئی وارننگ لیٹر ملا تھا اور وہ بھی تب جب چند دن پہلے وہ اس اسکول میں ایک ہیرو کے درجے پر فائز تھا اور وہ "ہیرو" اس وقت ان کے پاس سر جھکائے بیٹھا تھا۔ سالار کا دماغ کچھ دیر کے لیے واقعی گھوم کر رہ گیا تھا۔ اس کے حوالے سے متوقع خدشات میں یقیناً" وہ صورت حال نہیں تھی جو انہیں اس وقت درپیش تھی۔

اس "بزنس" کے آغاز کو بہت زیادہ وقت نہیں گزرا تھا اور حمین سکندر نے رئیسہ کو پہلے دن سے اس بزنس کے حوالے سے بتا رکھا تھا۔ بزنس کا آغاز اتفاقی تھا۔ اس کی کلاس میں اس کا ایک کلاس فیلو ایسے جوگرز لے کر آیا تھا جنہیں دیکھ کر حمین سکندر مچل گیا تھا۔

امامہ نے ان برانڈڈ سنیکرز کی خواہش کو رد کر دیا تھا کیوں کہ چند ہفتے پہلے حمین نے نئے اسنیکرز لیے تھے اور جب تک وہ پرانے نہ ہو جاتے ایک اور جوڑے کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حمین سکندر ہر روز اسپورٹس آورز میں اپنے اس کلاس فیلو کے سنیکرز دیکھتا اور انہیں حاصل کرنے کے طریقے سوچتا رہتا۔ اس نے ان سنیکرز کو "بارٹر ٹریڈ" کے ذریعے حاصل کرنے کی کوششوں کا آغاز کیا تھا۔

"کوئی ایسی چیز جس کے بدلے میں وہ کلاس فیلو ان اسنیکرز کو حمین کو دے دیتا۔" اس کا وہ کلاس فیلو حمین سکندر کے اتنے ڈائریکٹ سوال پر کچھ گڑبڑا ہی گیا تھا۔ ایسی پیش کش اور اس کے سنیکرز کو ایسا خراج تحسین کسی نے پہلے کبھی پیش نہیں کیا تھا۔

اس نے کچھ تامل کے بعد حمین کو یہ بتایا تھا کہ وہ ایک اور کلاس فیلو کی گھڑی کو بہت پسند کرتا تھا اور اگر اسے وہ مل جاتی تو وہ اس کے بدلے وہ اسنیکرز دے سکتا تھا۔ جس کلاس فیلو کی گھڑی اس نے مانگی تھی اسے اپنی کلاس کے ایک دوسرے کلاس فیلو کی سائیکل میں بے حد دلچسپی تھی اور اس سائیکل والے کو ایک اور کلاس فیلو کے بیگ میں... یہ سلسلہ چلتے چلتے حمین سکندر کے پاس موجود ایک ای بورڈ تک آیا تھا جو وہ کبھی کبھار اسکول لے جا کر بجاتا تھا اور حمین سکندر نے فوری طور پر اس ای بورڈ کے بدلے وہ اسنیکرز حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور پھر نہ صرف یہ فیصلہ کیا تھا بلکہ دوسرے دن اس کو عملی جامہ بھی پہنا دیا تھا۔ بزنس کا پہلا اصول موثر اسٹریٹیجی اور دوسرا وقت پر صحیح استعمال۔

سالار سکندر کے منہ سے دن رات سننے والے الفاظ کو اس کے نو سالہ بیٹے نے کس قدر مہارت سے استعمال کیا تھا۔ یہ اگر سالار سکندر دیکھ لیتا تو وہ اش اش کر اٹھتا۔

حمین سکندر کی کلاس کے بارہ افراد نے اگلے دن اسکول گراؤنڈ میں اپنی پسندیدہ ترین چیز کے حصول کے لیے اپنی کم فیورٹ چیز کا تبادلہ کیا تھا اور تبادلے کی اس چین کے ذریعے حمین سکندر وہ اسنیکرز حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا اور یہی حال ان دوسرے گیارہ بچوں کا بھی تھا جو خوشی اور بے یقینی کے عالم میں اپنی اپنی پسندیدہ ترین چیز کو دیکھ رہے تھے جو بے حد آسانی سے دوسروں سے ان کے پاس آ گئی تھی۔

کلائنٹس کا اطمینان کاروبار کا تیسرا اصول تھا اور نو سال کی عمر میں سالار سکندر کے اس بیٹے نے یہ تینوں چیزیں مدنظر رکھی تھیں۔ وہ اس وقت گیارہ مسرور کسٹمرز کے درمیان راجہ اندر بنا کھڑا تھا جو اب اس کا شکریہ ادا کرتے نہیں تھک رہے تھے۔

اس دن حمین سکندر نے اسپورٹس آور میں ان نئے اسنیکرز کے ساتھ پریکٹس کی تھی اور سب سے پہلے جس نے اس کے وہ اسنیکرز دیکھے تھے وہ رئیسہ تھی' جسے اس نے پیٹرٹاؤن سیڈ کے وہ اسنیکرز اس وقت بھی دکھائے تھے جب اس کا ان پر دل آ گیا تھا اور جب اس نے گھر میں امامہ سے ان کی فرمائش کی تھی اور اس نے تب بھی ان اسنیکرز کے بارے میں بتایا تھا اسے۔ جن کے حصول کے لیے وہ ایک "بزنس پلان" بنا رہا تھا۔ اس کا وہ بزنس پلان سات سالہ رئیسہ کے سر کے اوپر سے گزرا تھا لیکن اسے اگر ایک واحد احساس ہوا تھا تو وہ یہ کہ کسی بھی دوسرے کی چیز کسی بھی طرح لینا شاید مناسب نہیں تھا لیکن حمین سکندر کے پاس اس کا جواب تھا اور صرف جواب نہیں' بے حد مطمئن کر دینے والا جواب۔

اب چار دن کے بعد رئیسہ وہ اسنیکرز حمین کے پیروں میں دیکھ رہی تھی اور وہ اسے بے حد فاتحانہ انداز میں بتا رہا تھا کہ اس نے یہ بارٹر ڈیل کن گیارہ کلاس فیلوز کے تعاون سے سر انجام دی۔

"اور اگر ان میں سے کسی نے اپنی کوئی چیز واپس مانگ لی تو؟"
رئیسہ نے اس کی ساری گفتگو سننے کے بعد اپنے ذہن میں ابھرنے والے پہلے خدشے کا اظہار اس سے کیا۔
"ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔" حمین نے بے حد پر اعتماد انداز میں کہا۔
"کیوں؟" حمین نے اس کی "کیوں" کے جواب میں اپنی جیب سے ایک کانٹریکٹ نکال کر اسے دکھایا جس پر حمین سمیت بارہ لوگوں کے دستخط تھے اور اس کانٹریکٹ پر اس لین دین کے حوالے سے شرائط و ضوابط درج تھے جس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ ایک دفعہ چیزوں کا تبادلہ ہونے کے بعد وہ واپس نہیں ہو سکتی تھیں۔
وہ رئیسہ کو ساری شرائط پڑھ کر سنا رہا تھا جس کی بنیاد پر وہ بزنس ڈیل ہوئی تھی۔ رئیسہ خاموشی سے سنتی رہی پھر اس نے کہا۔
"اگر بابا ممی نے تمہارے اسنیکرز دیکھ لیے تو؟"
حمین نے اس کے سوال پر اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔
"Now that's a tricky part" (اب یہی ایک الجھن ہے۔)
وہ اپنا کانٹریکٹ تہہ کرتے ہوئے اپنا سر مسلسل کھجا رہا تھا۔ "میں ان کو یہ اسنیکرز نہیں دکھاؤں گا نہ ان کے سامنے پہنوں گا اور نہ ہی تم انہیں بتاؤ گی۔"
حمین نے سر کھجانا بند کرتے ہوئے اس سے کہا تھا۔
"ہم ان سے جھوٹ بولیں گے؟" رئیسہ کو یہ صورت حال کوئی اتنی مناسب نہیں لگی تھی۔
"بالکل نہیں" حمین نے بے ساختہ کہا۔ "بھلا جھوٹ کیوں بولیں گے ہم... ہم بس انہیں بتائیں گے ہی نہیں۔" اس نے بات کو لپیٹا۔
"کیوں؟" رئیسہ اب بھی مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ "پیرنٹس بہت سی باتوں کو نہیں سمجھتے۔" حمین نے جیسے کسی بزرگ کی طرح فلاسفی جھاڑی۔ "اس لیے انہیں سب کچھ بتانا ضروری نہیں ہوتا۔ پھر میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ میں نے بزنس کیا ہے۔ ہم سب نے اپنی مرضی سے ساری چیزوں کا ایکسچینج کیا ہے تو اگر ممی بابا کو پتا نہ بھی چلے تو بھی کوئی بات نہیں۔"
حمین نے اس سے کہا تھا۔ رئیسہ مطمئن ہوئی یا نہیں۔ وہ خاموش ہو گئی تھی۔ وہ حمین کا "راز" تھا اور وہ اسے کسی سے شیئر نہیں کر سکتی تھی۔
وہ بس پہلا اور آخری موقع تھا جب ان دونوں کے درمیان اس حوالے سے لمبی چوڑی بات چیت ہوئی تھی۔ رئیسہ کا خیال تھا، وہ بس پہلی اور آخری بزنس ڈیل تھی، جو حمین نے کی تھی اور وہ اس کے بعد ایسا کچھ کرنے والا نہیں تھا۔ حمین کا اپنا خیال بھی یہی تھا لیکن اس بزنس ڈیل کے صرف ایک ہفتے کے بعد ان گیارہ لوگوں میں سے ایک اور لڑکا اس کے پاس آن موجود ہوا تھا۔ اس بار اسے کلاس کے ہی ایک لڑکے کے گلاسز چاہیے تھے اور وہ حمین کے ذریعے یہ ڈیل کروانا چاہتا تھا اور اس ڈیل کے بدلے وہ حمین کو پانچ ڈالرز دینے پر تیار تھا۔ وہ رقم بڑی نہیں تھی لیکن حمین اس ترغیب کے سامنے ٹھہر نہیں سکا۔ ایک بار پھر اس نے ایک پوری بارٹر چین کے ذریعے وہ برانڈ ڈیزائن گلاسز اپنے کلائنٹ کو ڈیلیور کر دیے تھے اور پانچ ڈالرز کما لیے تھے۔ یہ اس کی زندگی کی پہلی کمائی تھی اور رئیسہ کو اس بارے میں بھی پتا تھا۔

وہ اس بار بھی خوش نہ تھی لیکن حمین کو اس بار بھی اس بزنس ڈیل کے نتیجے میں ہونے والی آمدنی کے حوالے سے کوئی شرمندگی نہیں تھی اور پھر یہ بزنس اس کی اپنی کلاس سے نکل کر اسکول میں پھیل گیا تھا۔ اسکول میں سب کو یہ پسند تھا۔ اسکول میں چند مہینوں میں سب کو یہ پتا تھا کہ اگر کسی کو اسکول میں کسی دوسرے بچے کی کوئی چیز پسند آجائے تو اس کے حصول کے لیے حمین سکندر واحد نام تھا جس کی خدمات وہ حاصل کر سکتے تھے۔ حمین سکندر کو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہا تھا۔ جب سنیکرز کے ایک جوڑے کے لیے اس نے اس بزنس کا آغاز کیا تھا۔ تین ماہ کے عرصہ میں حمین نے اس بزنس سے تقریباً "175" ڈالرز کمائے تھے اور یہ 175 ڈالرز ان چند اشیاء کے علاوہ تھے جو اس نے بارٹر چین کے دوران اپنے لیے حاصل کی تھیں اور رئیسہ اس کے ہر لین دین سے واقف بھی تھی اور ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ زیادہ پریشان بھی ہو رہی تھی۔

حمین سکندر کے پاس اب پیسے تھے جو اس نے ممی بابا سے نہیں لیے تھے اور حمین کے پاس اب کچھ ایسی چیزیں تھیں جو اس کی ملکیت بن گئی تھیں اور یہ رئیسہ کے لیے بہت پریشان کن بات تھی۔ حمین سکندر کی ساری توجیہات سننے کے باوجود رئیسہ مطمئن نہیں ہوئی تھی نہ وہ اس "بزنس" کو ہضم کر پا رہی تھی جس کا پتا اس کے والدین کو نہیں تھا اور نہ ہی وہ حمین کے پاس آنے والی دوسری چیزوں کو۔ اور ایک ہفتے کے تبادلے کے بعد پہلی بار رئیسہ نے فیصلہ کیا تھا کہ اسے اب اس بزنس کے بارے میں اپنے والدین کو بتا دینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ حمین کسی مشکل کا شکار ہو جائے۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

سالار اور امامہ نے اسکول میں حمین سے زیادہ بات چیت نہیں کی تھی۔ سالار نے اس سے کہا تھا وہ اس مسئلے پر گھر میں بات کریں گے اور پھر وہ چلے گئے تھے لیکن حمین پریشان ہو گیا تھا۔ وہ اور رئیسہ ایک اسکول میں تھے۔ جبریل اور عنایہ دوسرے میں۔ اس لیے یہ راز صرف رئیسہ تک ہی رہا تھا ورنہ اسکول کے کسی اور بچے کے ذریعے یہ بات جبریل یا عنایہ تک بھی پہنچ جاتی۔

چھٹی کے وقت حمین نے رئیسہ کو اس صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا جو اسے پیش آئی تھی۔ وہ بے حد پریشان ہو گئی تھی۔

"وارننگ لیٹر؟" اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا کہ حمین کے ساتھ یہ ہو سکتا تھا۔ "میں نے تمہیں کتنی بار منع کیا تھا۔ لیکن تم نے بات نہ مانی۔"

"مجھے توقع نہیں تھی کہ ایسا ہو جائے گا۔" وہ دونوں اسکول بس میں سوار ہونے کے بجائے اب اس مسئلے کو ڈسکس کرنے میں مصروف تھے۔

"بابا اور ممی بہت خفا ہوئے ہوں گے؟" رئیسہ نے اس سے پوچھا۔ "وہ تمہیں بہت ڈانٹا کیا؟"

"نہیں یہاں تو نہیں ڈانٹا لیکن گھر جا کر ڈانٹیں گے۔ بابا نے کہا تھا۔ انہیں مجھ سے ضروری باتیں کرنی ہیں گھر جا کر۔" حمین کچھ فکر مند انداز میں کہہ رہا تھا۔

"وہ تمہیں اسکول سے نکال دیں گے کیا؟" رئیسہ کو تشویش ہوئی۔

"نہیں ایسا تو نہیں ہوگا بابا نے معذرت کی ان سے۔ اور وہ مان بھی گئے۔" حمین نے اسے بتایا۔

"کتنی بری بات ہے۔" رئیسہ کو اور افسوس ہوا۔ "بابا کو کتنا برا لگا ہوگا۔ وہ بہت شرمندہ ہو گئے ہوں گے اور ممی بھی ہو رہی ہوں گی۔"

"مجھے پتا ہے۔" حمین کچھ خجل تھا۔ اپنے ماں باپ کو اس طرح پریشان اس نے بھی پہلی بار ہی دیکھا تھا اور وہ بھی اسکول کی ایڈمنسٹریشن کے سامنے۔ وہ اس کے لیے بھی کچھ اچھا منظر نہیں تھا۔

"تمہیں یہ نہیں کرنا چاہیے تھا حمین۔"

"جانتا ہوں لیکن اب کیا ہوگا؟" اس نے رئیسہ سے جیسے مشورہ لیا۔
اس کے پاس جب اپنے آپشنز ختم ہو جاتے تھے تو وہ رئیسہ کی رائے لیتا تھا۔ وہ رائے اس کی سمجھ میں آ جاتی تو وہ اس پر عمل کرتا نہ کرتا لیکن وہ بہت چھوٹی عمر سے ہر چیز کے بارے میں رئیسہ کی رائے پوچھنے کا عادی تھا۔

رئیسہ کو بات کرنے پر اکسانے کے لیے ان سب بہن بھائیوں کی عادت تھی۔
"تمہیں بابا اور ممی سے سوری کر لینا چاہیے۔" رئیسہ نے اسے رائے دی۔ "جب کوئی غلط کام ہو جائے تو سب سے پہلے یہی کرنا چاہیے۔" رئیسہ نے پہلے مشورہ دیا پھر اپنے ماں باپ کی نصیحت دہرائی۔
"ایکسپوز تو میں پہلے ہی ہو چکا ہوں لیکن کیا ان کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا ہوگا گھر پہنچنے تک؟" وہ کچھ محتاط انداز میں پوچھ رہا تھا۔
"میرا نہیں خیال کہ ایسا ہے۔" رئیسہ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا۔
"اچھا۔" حمین کو اس کے اندازے کے درست ہونے پر پورا یقین تھا کیونکہ اس کی اپنی چھٹی حس بھی یہی کہہ رہی تھی لیکن اگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا تو وہ مسئلے کا حل تھا۔
امامہ اور سالار اس دن وہ وارننگ لیٹر لے کر گھر آ گئے تھے اب انہیں اس وارننگ لیٹر کا جواب دینا تھا۔
اسکول کی انتظامیہ حمین کی سابقہ اور موجودہ کارکردگی کی وجہ سے اسے اس پہلے بڑے "جرم" کے لیے درگزر کرنے پر تیار تھی لیکن وہ دونوں بے حد پریشان تھے۔ ان کی اولاد میں سے اگر کبھی کسی کی طرف سے انہیں چھوٹی موٹی شکایات آتی رہی تھیں تو وہ حمین ہی تھا۔ اس کے باوجود حمین نے کبھی کوئی ایسی شرارت نہیں کی تھی نہ ایسا کوئی کام کیا جس پر انہیں اس طرح اسکول بلا کر وارننگ لیٹر تھمایا جاتا اور پھر جو کام اس نے کیا تھا اس نے ان کا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا۔ وہ اگر ان کے سامنے وہاں خود اعتراف نہ کر چکا ہوتا تو وہ کبھی یقین نہ کرتے کہ حمین "بزنس" ٹائپ کی کوئی چیز اسکول میں کر سکتا تھا اور پھر اس طرح کا بزنس۔ اس کو کیا ضرورت پیش آئی تھی اور اس کرنے کی تک کیا تھی۔ وہ واقعی سمجھ نہیں پا رہے تھے۔
"جبریل اور عنایہ کو اس حوالے سے کچھ نہیں بتانا۔" سالار نے امامہ کو گھر ڈراپ کرتے ہوئے اس سے کہا تھا۔
"اور رئیسہ کو؟ اس سے بھی بات کرنی ہوگی۔" وہ بڑبڑایا تھا۔
اس دن اسکول سے واپسی پر حمین جتنا سنجیدہ تھا اس سے زیادہ سنجیدہ امامہ تھی۔ ہر روز کی طرح پرجوش سلام کا جواب سلام سے ملا تھا نہ ہی ہمیشہ کی طرح وہ اس سے جا کر لپٹا تھا اور نہ ہی امامہ نے ایسی کوئی کوشش کی تھی اور یہ سرد مہری کا مظاہرہ صرف حمین کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ رئیسہ کے ساتھ بھی ہوا تھا مگر امامہ نے انہیں کھانا کھلاتے ہوئے بھی کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں اب متفکر تھے۔ سالار گھر پر نہیں تھا اور حمین کو اندازہ تھا کہ اس کے گھر واپسی کے بعد وہ خاموشی جو گھر میں تھی قائم نہیں رہے گی۔



رات کے کھانے سے فارغ ہو کر سالار نے باقی بچوں کے اپنے کمرے میں جانے کے بعد حمین اور رئیسہ کو وہاں روک لیا تھا۔ وہ دونوں سالار کے سامنے صوفے پر بیٹھے نظریں جھکائے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو حمین سے ایسی خاموشی اور سنجیدگی کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی جس کا مظاہرہ وہ اب کر رہا تھا۔
"تمہیں یہ سب پتا تھا رئیسہ؟" سالار نے رئیسہ کو مخاطب کیا۔
اس نے سر اٹھایا۔ حمین کو دیکھا اور پھر کچھ شرمندہ انداز میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "یس بابا!"

"اور تم حمین کے بارے میں مجھے یہی بتانا چاہتی تھیں؟" اس سوال پر اس بار حمین نے چونک کر رئیسہ کو دیکھا جس نے اس کی نظروں کو نظرانداز کرتے ہوئے ایک بار پھر سرہلایا تھا۔
"تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔" سالار نے جواباً" رئیسہ سے کہا۔

"بابا آئی ایم سوری۔" رئیسہ نے کچھ روہانسی ہو کر کہا۔
"یہ قابل معافی نہیں۔" انہوں نے جواباً" کہا۔
"بابا! اس میں رئیسہ کا کوئی قصور نہیں۔" حمین نے اس کی حمایت کرنے کی کوشش کی۔ سالار نے اسے ترشی سے جھڑک دیا۔
"شٹ اپ!" حمین اور رئیسہ دونوں گم صم ہو گئے تھے۔ انہوں نے سالار کے منہ سے اس طرح کے لفظ اور اس انداز میں ان کا اظہار پہلی بار دیکھا تھا۔
"تم اب یہاں سے جاؤ۔" سالار نے تحکمانہ انداز میں رئیسہ سے کہا جس کی آنکھیں اب آنسوؤں سے بھر رہی تھیں اور سالار کو اندازہ تھا وہ چند لمحوں میں رونا شروع کر دے گی اور وہ فی الحال وہاں بیٹھ کر اسے بہلانا نہیں چاہتا تھا۔ رئیسہ چپ چاپ وہاں سے چلی گئی تھی۔ سٹنگ ایریا میں اب صرف وہی دونوں باپ بیٹا رہ گئے تھے۔
"تمہیں اسکول میں بزنس کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا؟" سالار نے اس سے بات چیت شروع کی۔
"نہیں۔" حمین نے بڑے محتاط انداز میں اس سے نظریں ملائے بغیر جواب دیا تھا۔
"پھر کس کام کے لیے بھیجا گیا تھا؟" سالار نے اس سے اگلا سوال کیا۔
"پڑھنے کے لیے۔" حمین کا سر اب بھی جھکا ہوا تھا۔
"اور تم یہ پڑھ رہے تھے؟" سالار نے بے حد خفگی سے اس سے کہا۔
"بابا! میں نے جو بھی کیا ہے، آپ کو بتا کر کیا ہے۔" حمین نے یک دم کہا۔
"کیا بتایا ہے تم نے بزنس کے بارے میں؟" اس نے مختصراً" کہا۔
اور اس وقت سالار کو کئی مہینے پہلے اپنی اور حمین سکندر کی وہ گفتگو یاد آئی تھی جب اس نے ایک رات بڑی سنجیدگی سے اس کے پاس آ کر اس سے "بزنس" کے حوالے سے بات چیت کی تھی۔ وہ اس وقت اپنے کام میں مصروف تھا اور اس نے حمین کے ان سوالوں کو صرف اس تجسس کا حصہ سمجھا تھا جو اسے ہر چیز کے بارے میں ہوتا تھا۔
"بابا! اگر ہمیں کوئی چیز حاصل کرنی ہو تو کیسے کریں؟"
وہ سوال اتنا سادہ تھا کہ سالار حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ اتنے سیدھے سوال نہیں کرتا تھا۔
"مثلاً" کیا حاصل کرنا ہو؟" اس نے جواباً" پوچھا تھا۔
"کچھ بھی۔۔۔ کوئی بھی ایسی چیز جو کسی دوسرے کے پاس ہو اور ہمیں اچھی لگے تو کیسے لیں؟"
"لینا ضروری ہے کیا؟" سالار نے اپنے لیپ ٹاپ پر کام کرتے ہوئے پوچھا۔
"بہت ضروری۔" اس نے بے حد مختصر جواب دیا۔
"محنت کرو اور وہ چیز خرید لو۔" یہ جواب دیتے ہوئے سالار کو اندازہ نہیں تھا وہ اسے راستہ دکھا رہا تھا۔
"ہم" وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ "یعنی بزنس کرنا پڑے گا؟" اس نے سالار سے پوچھا تھا۔
"ظاہر ہے۔" سالار نے جواب دیا۔
"اور بزنس کیسے کرتے ہیں؟" حمین نے جواباً" پوچھا۔
"بزنس پلان بنا کر۔" وہ اپنے کام میں مصروف اس کے سوالوں کا جواب دیتا گیا، ان کی نوعیت یا مقصد کے

بارے میں غور کیے بغیر۔
"وہ کیسے بناتے ہیں؟"
"سب سے پہلے یہ طے کرتے ہیں کہ کیا بزنس کرنا ہے؟"
"اس کے بعد؟"
"اس کے بعد اس کے لیے انوسٹمنٹ (سرمایہ) چاہیے۔"
"اگر وہ نہ ہو تو۔" حمین نے پوچھا۔
"تو پھر کوئی ایسی اسٹریٹجی ہونی چاہیے جس سے کسی پارٹنر کو آن بورڈ لا کر انوسٹمنٹ کی کمی پوری کی جا سکے۔"
"اوکے۔ تو بزنس اسٹریٹجی ہونی چاہیے اور اس کے بعد پارٹنرز۔ پھر؟" وہ بے حد متجسس ہو رہا تھا۔
"پھر effective implementation۔ جو پلان کیا ہو اس پر اچھی طرح سے عمل درآمد کیا جائے۔ اور وقت پر۔" وہ ایک بزنس پلان کو جتنی سادگی سے اسے سمجھا سکتا تھا اسے سمجھا رہا تھا۔
"اور سب سے آخر میں کلائنٹ کو مطمئن کرنا۔ تاکہ آپ کو اور کلائنٹس ملتے رہیں۔"
"اوکے۔" حمین نے یہ اصول بھی سمجھ لیا تھا۔ اس کے باپ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے جو کچھ پوچھ رہا ہے اس کا استعمال وہ کس طرح اور کہاں کرے گا۔
سالار بہت دیر تک اپنے اس نو سالہ ہم شکل کو دیکھتا رہا جس کے چہرے کی معصومیت سے اب بھی یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ بھی کوئی غلط کام کر سکتا تھا۔
"میں ناخوش ہوں۔" سالار نے اس سے کہا۔
"آئی ایم سوری۔" جواب تڑ سے آیا تھا لیکن سالار کو احساس تھا اس معذرت میں شرمندگی نہیں تھی۔ اعتماد اور قابلیت ہر وقت پسند نہیں آتی۔ سالار کے ساتھ بھی اس وقت وہاں بیٹھے یہی ہو رہا تھا۔
"تمہیں یہ سب کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"
حمین نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔ پھر اس نے باپ کو اسنیکرز کے جوڑے کی وجہ سے اسٹارٹ کیے جانے والے اس بزنس وینچر کی تفصیلات بتانا شروع کر دیں۔
سالار ٹوکے بغیر اس کی گفتگو سنتا رہا۔ حمین نے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ اسکول میں ماں باپ کی اپنی وجہ سے ہونے والی شرمندگی دیکھنے کے بعد اس نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ انہیں سب کچھ بتا دے گا۔ اب کوئی جھوٹ نہیں بولے گا۔
جب وہ خاموش ہوا تو سالار نے اس سے پوچھا وہ کانٹریکٹس کہاں ہیں جو تم نے ان سب سے سائن کروائے ہیں؟
حمین وہاں سے اٹھ کر کمرے میں گیا اور کچھ دیر بعد ایک فائل لے کر واپس آیا۔ اس نے وہ فائل سالار کی طرف بڑھا دی تھی۔ سالار نے فائل کھول کر اس کے اندر موجود معاہدے کی شقوں پر نظر ڈالی' پھر حمین سے پوچھا۔
"یہ کس نے لکھی ہیں؟"
"میں نے خود۔" اس نے جواب دیا۔ سالار اس معاہدے کو پڑھنے لگا۔ ایک نو سالہ بچے نے اس معاہدے میں اپنے ذہن میں آنے والی ہر اس شق کو شامل کیا تھا جو اسے ضروری لگی تھی یا جو اس نے کہیں دیکھی ہو گی۔
سالار متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ معاہدے کی صرف زبان بچکانہ تھی لیکن شقیں نہیں۔ حمین نے اس

معاہدے کے ذریعے اپنے آپ کو مکمل طور پر محفوظ کرلیا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ بچوں کے ساتھ ڈیلنگ کر رہا تھا اور اسے بچوں کی نفسیات کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ بدلتے موڈ کے تابع ہوتے ہیں' معاہدوں کے نہیں۔
سالار نے فائل بند کی پھر اس سے پوچھا "اور جو رقم تم نے ان سب لوگوں سے لی ہے' وہ کہاں ہے؟"

"میرے پاس۔" حمین نے جواب دیا
"کچھ خرچ کی؟" سالار نے پوچھا
"نہیں" اس نے کہا۔
پھر سالار نے سرہلایا' پھر فائل اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اس سے کہا۔ "اب تم ایک اور لیٹر لکھو گے جس میں تم اپنے ان سب کلائنٹس سے معذرت کرو گے اور انہیں ان کی رقم اور وہ چیزیں لوٹاؤ گے جو تمہارے پاس ہیں... اس کے بعد تم وہ ساری چیزیں ان سب لوگوں تک واپس پہنچاؤ گے جو تم نے ایکسچینج کی ہیں۔" حمین چند لمحوں تک ساکت رہا پھر اس نے سرہلایا۔
"او کے... اور میں یہ کیسے کروں؟" اس نے سالار سے کہا۔
"تم ایک بزنس مین ہو... تمہیں اگر وہ بزنس کرنا آتا تھا تو یہ بھی آنا چاہیے۔" سالار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اور پھر جب تم یہ کام ختم کرلو گے تو ہم دوبارہ بات کریں گے... تمہارے پاس ایک ہفتہ ہے۔"
حمین نے جاتے ہوئے باپ کی پشت دیکھی' جو وہ اسے کرنے کا کہہ کر گیا تھا' وہ اس کے لیے بے حد شرمندہ کرنے والا کام تھا۔ ہر بچے کے پاس جاکر معذرت کرکے اس کے پیسے واپس کرنا مشکل نہیں تھا۔ اسے پتا تھا ہر بچہ بے حد خوشی خوشی اپنے پیسے واپس لے لے گا... لیکن مسئلہ اصل چیز اصل مالک کو پہنچانا تھا۔ اسے گھر بیٹھے ہی یہ اندازہ تھا کہ کوئی بچہ بھی خوشی خوشی اسے وہ چیز واپس نہیں کرے گا جو وہ اس بارٹر ڈیل کے ذریعے حاصل کرچکا تھا اور پھر ضروری نہیں کہ ہر بچے نے وہ چیز صحیح حالت میں رکھی ہو... خود اس کے پاس موجود دوسرے بچے کے اسٹیکرز بھی اب کھیل کھیل کر پرانے ہو گئے تھے' اسے وہاں بیٹھے بیٹھے اندازہ ہو رہا تھا باپ اسے کس پریشانی میں ڈال گیا تھا۔
"تم نے بابا سے میرے بارے میں کیوں بات کی تھی؟" حمین نے اگلی صبح اسکول بس میں رئیسہ سے پوچھا۔
"میں نے کچھ بتایا تو نہیں' لیکن میں تمہارے لیے پریشان تھی" رئیسہ نے جواباً اس سے کہا۔
"اگر تم بتا دیتیں تو میں تم سے کبھی بات نہیں کرتا۔" حمین نے اس سے کہا۔
"بابا نے تمہیں معاف کردیا؟" رئیسہ کو جس بات کی پریشانی تھی اس نے اس سے وہ سوال کیا۔
"بابا نے مجھ سے کہا ہے' میں سب کی چیزیں اور پیسے واپس کروں پھر وہ مجھ سے دوبارہ بات کریں گے۔"
حمین سنجیدہ اور کچھ پریشان لگا رئیسہ کو۔
"کیا میں تمہاری ہیلپ کرسکتی ہوں؟" اس نے حمین کو آفر کی۔
"نہیں میں مینیج کرلوں گا۔" اس نے جواباً کہا۔



اس "بزنس" کا وہ اگلا تجربہ حمین سکندر کی زندگی کا سب سے سبق آموز تجربہ تھا' ایک اسٹار اسٹوڈنٹ کے طور پر اسکول کے بچوں کو اپنی پسندیدہ چیز لینے کی ترغیب دینا اور پھر اس حد تک انہیں للچانا کہ وہ آنکھیں بند کرکے اپنی پسندیدہ چیز کے پیچھے چل پڑیں... الگ بات تھی لیکن اپنی پسندیدہ چیز کو واپس دے دینا خوشی خوشی... علیحدہ معاملہ تھا۔ چیز واپس دینے کا کہنے والا حمین سکندر ہو تا یا کوئی اور' ان کو فرق نہیں پڑتا تھا۔

وہ مطمئن اور خوش کلائنٹس جنہوں نے حمین سکندر کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچایا تھا وہ اسی طرح اسے کھینچ کر واپس بھی لے آئے۔۔۔ وہ ایک ہفتے کے بجائے ایک دن میں وہ کام سرانجام دے دینا چاہتا تھا لیکن اگلے ہی دن اسے پتا چل گیا تھا کہ سالار سکندر نے اس کام کے لیے اسے ایک ہفتہ کیوں دیا تھا ایک دن کیوں نہیں۔

حمین سکندر اگلے دن اسکول میں اس بزنس کے ذریعے ہونے والے بزنس معاہدوں کو ختم کرنے میں پہلی بار اسکول کے سب سے ناپسندیدہ اسٹوڈنٹ کے درجہ پر فائز ہو رہا تھا۔ کامیابی انسان کو ایک سبق سکھاتی ہے۔ ناکامی دس۔۔۔ لیکن حمین سکندر نے پندرہ سیکھے تھے۔



"بابا! آئی ایم سوری!" گاڑی سے اترتے ہوئے سالار کو دیکھ کر لپکتی ہوئی اس کے پاس آئی تھی رئیسہ سائیکل چلا رہی تھی۔۔۔ وہ رئیسہ کی پہلی غلطی تھی جس پر سالار کو اسے ڈانٹنا پڑا تھا اور رئیسہ پچھلی رات سے یہ بات ہضم نہیں کر پا رہی تھی۔

گاڑی کا دروازہ کھولے سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سالار نے اپنی اس منہ بولی بیٹی کو دیکھا جو پروانوں کی طرح اپنے ماں باپ کے گرد منڈلاتی پھرتی تھی۔

"تمہیں پتا ہے تم نے کیا غلطی کی؟" سالار نے ایک دن کی خاموشی کے بعد اسے معاف کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"یس۔۔۔ مجھے آپ کو اور ممی کو سب کچھ بتانا چاہیے تھا۔" رئیسہ نے اپنے گلاسز ٹھیک کرتے ہوئے سر جھکا کر کہا

"اور؟" سالار نے مزید کریدا۔

"اور مجھے حمین کو سپورٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔۔۔ لیکن بابا میں نے اس کو سپورٹ بھی نہیں کیا۔" رئیسہ نے پہلا جملہ کہتے ہی اس کی تصحیح کی۔

"تم نے خاموش رہ کر اسے سپورٹ کیا۔" سالار نے کہا۔

"بابا! میں نے اسے منع کیا تھا لیکن اس نے مجھے کنوینس کر لیا۔" رئیسہ نے اپنا مسئلہ اور وضاحت پیش کی۔۔۔

"اگر اس نے تمہیں کنوینس کر لیا تھا تو پھر تم مجھے کیوں بتانا چاہتی تھیں حمین کے بارے میں کچھ؟" اس بار رئیسہ نے جواب نہیں دیا' وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ سالار نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور کہا۔

"تم کنوینس نہیں ہوئی تھیں۔۔۔ تمہارے دل میں تھا کہ حمین ٹھیک کام نہیں کر رہا۔"

رئیسہ نے سالار کی بات پر اسی طرح سر جھکائے جھکائے سر ہلایا۔

"یہ زیادہ بری بات تھی۔۔۔ تمہیں پتا تھا' وہ ایک غلط کام کر رہا ہے لیکن تم نے اسے کرنے دیا۔ چھپایا۔"

"وہ مجھ سے ناراض ہو جاتا بابا!" رئیسہ نے کہا۔

"تو کیا ہوتا؟" سالار نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

"میں اسے ناراض نہیں کر سکتی۔" اس نے اس بار کچھ اور بے بسی سے کہا۔

"اس کی ناراضی اس سے بہتر تھی جتنی پریشانی وہ اب اٹھائے گا۔ تمہیں اندازہ ہے اسکول میں کتنی شرمندگی اٹھانی پڑے گی اب اسے۔"

رئیسہ نے ایک بار پھر سر ہلا دیا۔

"وہ تمہارا بھائی ہے۔ دوست ہے۔ تم اس سے بہت پیار کرتی ہو۔ میں جانتا ہوں لیکن اگر کوئی ہمیں عزیز ہو تو اس کی غلطی ہمیں عزیز نہیں ہونی چاہیے۔" وہ اب اسے جتنے آسان اور سادہ لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کر سکتا تھا' کر رہا تھا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے سن رہی تھی اور ذہن نشین کر رہی تھی۔

سالار خاموش ہوا تو رئیسہ نے سر اٹھا کر اس سے پوچھا۔

"کیا میں اب بھی آپ کو اچھی لگتی ہوں بابا؟" سالار نے اس کے گرد بازو پھیلا کر اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے اس کا سر چوما۔

"یس۔"

رئیسہ کھل اٹھی۔ وہ ایسی ہی تھی چھوٹی سی بات پر پریشان ہونے والی۔ چھوٹی سی بات پر خوش ہو جانے والی۔ رئیسہ اب گاڑی کی پچھلی سیٹ سے اس کا بریف کیس نکالنے لگی تھی۔



عنایہ نے اریک کو کھڑکی سے دیکھا تھا اور وہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ وہ ایک چھٹی کا دن تھا اور وہ سٹنگ ایریا کی کھڑکی میں پڑے کچھ چھوٹے ان ڈور پلانٹس کو تھوڑی دیر پہلے کچن سنک سے پانی دے کر لائی تھی اور اب انہیں کھڑکی میں رکھ رہی تھی جب اس نے اریک کو گھر سے نکلتے دیکھا تھا اور وہ ہل نہیں سکی تھی اور اریک کو اس طرح دیکھنے والی وہ اکیلی نہیں تھی۔ وہ اب کالونی کے اس روڈ کے فٹ پاتھ پر آچکا تھا جو ان گھروں کے بیچ گھومتی انہیں ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے تھی۔ اور اس سڑک سے اکا دکا گزرنے والی گاڑیاں اور فٹ پاتھ پر اپنے کتوں اور بلیوں کو ٹہلانے والے افراد میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جو اریک کو نہ دیکھ رہا ہو۔

"عنایہ!" کچن میں کام کرتی امامہ نے اسے اتنی دیر کھڑکی سے باہر جھانکتے دیکھ کر پکارا تھا۔ عنایہ اس قدر مگن تھی کہ اسے ماں کی آواز سنائی نہیں دی تھی' امامہ کچن ایریا سے خود بھی سٹنگ ایریا کی اس کھڑکی کے سامنے آگئی جس سے عنایہ باہر دیکھ رہی تھی اور کھڑکی سے باہر نظر آنے والے منظر نے اسے بھی عنایہ ہی کی طرح منجمد کیا تھا۔

اریک ایک کیکڑے کی طرح اپنے چاروں ہاتھوں اور پیروں پر چل رہا تھا۔ وہ چوپائے کی طرح نہیں چل رہا تھا' وہ اپنی پشت کے بل چل رہا تھا۔ اپنا پیٹ اونچا کیے۔ اپنے دونوں ہاتھوں کے بل اپنے اوپری دھڑ کو اٹھائے۔ اپنی ٹانگیں گھٹنوں کے بل اٹھائے۔ وہ بڑی دقت سے چل بلکہ رینگ رہا تھا لیکن رکے بغیر بے حد اطمینان سے وہ اس طرح ادھر سے ادھر جاتے ہوئے چہل قدمی میں مصروف تھا جیسے یہ اس کے چلنے کا نارمل طریقہ تھا۔ وہ جب تھک جاتا' بیٹھ کر تھوڑی دیر سانس لیتا پھر اسی طرح چلنا شروع کر دیتا۔

"یہ کیا کر رہا ہے؟" عنایہ نے اب کچھ پریشان ہو کر امامہ سے پوچھا تھا جو خود بھی اسی کی طرح ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھی۔

"پتا نہیں۔"

"کیا یہ چل نہیں سکتا؟" عنایہ کو تشویش ہوئی تھی۔

"پتا نہیں۔" امامہ اور کیا جواب دیتی۔

"جبریل! تم ذرا جا کر اسے اندر لے کر آؤ۔"

جبریل اوپر والی منزل سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ جب امامہ نے اس کے قدموں کی آواز پر پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کسے؟" جبریل نے جواباً کھڑکی کے پاس آتے ہوئے کہا اور امامہ کو اس کے سوال کا جواب دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس نے ایرک کو دیکھ لیا تھا، پھر وہ رکے بغیر باہر نکل آیا۔ ایرک اسی طرح ان کے گھر کے سامنے کیڑا بنا ادھر سے ادھر جا رہا تھا لیکن وہ رکا نہیں تھا۔ اسی طرح اسے نظر انداز کرتے ہوئے چلتا رہا۔

"ہیلو۔" جبریل نے ایرک کے ساتھ ٹہلتے ہوئے اس سے کہا۔ اس کی سرخ ہوتی رنگت، پھولا ہوا سانس اور ماتھے پر چمکتے پسینے کے قطروں سے اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ تھک چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود صرف لوگوں کی توجہ حاصل کیے رکھنے کے لیے خود پر ظلم کر رہا تھا۔

"ہیلو!" اس نے بھی جبریل کی ہیلو کا جواب اتنے ہی پرجوش، لیکن تھکے ہوئے انداز میں دیا تھا۔

"یہ کوئی نئی ایکسرسائز ہے؟" جبریل نے اس کے ساتھ ہلکے قدموں سے چلتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" ایرک کا جواب آیا۔

"پھر؟"

"میں کیڑا ہوں... اور کیڑے ایسے ہی چلتے ہیں۔" ایرک نے اس بار اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"اوہ آئی سی۔" جبریل نے بے اختیار کہا۔ "اور یہ تبدیلی کب آئی؟ آخری بار جب میں نے تمہیں دیکھا تھا تو تم انسان تھے۔" جبریل اس سے یوں بات کر رہا تھا جیسے اسے اس کی بات پر یقین آ گیا۔

"آج رات۔" ایرک نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

"اوہ! کیڑے اکثر رک کر آرام بھی کرتے ہیں، تم نہیں کرو گے۔" جبریل نے بالآخر اسے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔

ایرک کے لیے جیسے تنکے کو سہارا والی بات ہوئی تھی۔ وہ ڈھے جانے والے انداز میں فٹ پاتھ پر چت لیٹتے ہوئے بولا۔

"او یس۔ میں بھول گیا تھا، اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا۔" اس نے جبریل کے قدموں میں لیٹے لیٹے کہا۔

"ڈونٹ مائنڈ، کیڑے اتنی ایفرٹ کرنے کے بعد کھاتے پیتے بھی ہیں۔" جبریل نے جیسے اسے اگلی بات یاد دلائی۔

"آہاں۔ مجھے بھی کھانے کو کچھ چاہیے۔" ایرک کی بھوک واقعی اس کی بات سے جاگی۔ اس کے بازو اور کمر اس وقت تقریباً شل ہو رہی تھی۔

"ہمارے گھر میں کیڑوں کی کچھ خوراک ہے، اگر تمہیں انٹرسٹ ہو تو تم جا کے کھا سکتے ہو۔" جبریل نے بالآخر اس سے کہا۔

وہ سیدھا سیدھا اسے آ کر امامہ کا پیغام بھی دے سکتا تھا، لیکن انہیں ایرک کا پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کس موڈ میں ہوتا اور کیا جواب دیتا۔

"مجھے سوچنے دو۔" ایرک سوچ میں پڑا۔ جبریل نے سر اٹھا کر اس کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں سے اسے امامہ اور عنایہ نظر آ رہی تھیں۔

"لیکن مجبوری والی کوئی بات نہیں۔ اگر تم نہیں آنا چاہتے تو بھی ٹھیک ہے۔" جبریل نے کہتے ہوئے قدم آگے بڑھائے۔

ایرک ایک دم اسی طرح کیڑا بنے اس کے ساتھ چلنے لگا۔ جبریل رکا اور اس نے بڑی شائستگی سے اس سے کہا۔

"مجھے اچھا لگے گا اگر تم کچھ دیر کے لیے دوبارہ انسان بن جاؤ۔ میری بہن اور ممی کیکڑوں سے بہت ڈرتی ہیں۔۔۔ اور ان کے ڈر کو ختم کرنے کے لیے ہمیں ہر وہ کیکڑا مارنا پڑتا ہے جو ہمیں نظر آجائے۔"

اس نے مذاق کی بات سنجیدگی سے کی تھی اور ایرک نے بخوبی سمجھ لیا تھا کہ وہ اس سے کیا چاہتا ہے۔ وہ رکا' بیٹھا' پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جبریل کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس نے امامہ اور عنایہ کی حیران نظریں محسوس کرلی تھیں مگر پھر بھی وہ مطمئن تھا۔

"ایرک! تم کیا کر رہے تھے باہر؟" اس کے اندر آتے ہی عنایہ نے اس سے سب سے پہلے پوچھا تھا۔۔۔ وہ جواباً صرف مسکرایا تھا۔ فاتحانہ انداز میں۔۔۔ یوں جیسے جو وہ چاہتا تھا حاصل کر لیا ہو۔

"یہ ایرک نہیں ہے' ایک کیکڑا ہے۔" جبریل نے اس کا تعارف کروایا "اور اسے اچھا لگے گا اگر اس کو اس نام سے ہی پکارا جائے۔"

اس نے جبریل کے تعارف کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ سیدھا کچن کاؤنٹر کے قریب پڑے ایک اسٹول پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔

"تم اتنے دن سے آئے کیوں نہیں؟" امامہ نے بات کا موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ اسے اندازہ تھا۔۔۔ صرف اسے نہیں ان تینوں کو۔ کہ وہ ان کے گھر کے باہر کیکڑا بن کر چہل قدمی کیوں کر رہا تھا۔

"میں مصروف تھا۔" ایرک نے مختصر جواب دیا۔ وہ اب اپنے بازو اور کلائیاں دبا رہا تھا۔

جبریل اور عنایہ نے نظروں کا تبادلہ کیا اور اپنی ہنسی کو روکا۔ انہیں اندازہ تھا ایک کیکڑا بن کر چند دس منٹ چہل قدمی کا نتیجہ اب کیا نکلنے والا ہے۔

"تم بعض دفعہ بے حد احمقانہ حرکتیں کرتے ہو۔" عنایہ نے اس سے کہا۔

"تم واقعی ایسا سمجھتی ہو؟" ایرک اس کے تبصرے پر جیسے کچھ مضطرب ہوا۔

"ہاں بالکل۔"

ایرک کے چہرے پر اب کچھ مایوسی آئی۔

"اگر تم ہمارے گھر کے اندر آنا چاہتے تھے تو اس کا سیدھا راستہ دروازے پر دستک دے کر اجازت مانگنا ہے۔ کیکڑا بن کر ہمارے گھر کے سامنے پھرنا نہیں۔۔۔ یا تم یہ چاہتے تھے ہم خود تمہیں کھینچ کر اندر بلائیں۔" عنایہ نے کچھ خفگی سے کہا۔

ایرک کا چہرہ سرخ ہوا۔۔۔ یہ شرمندگی تھی اس بات کی کہ وہ اس کی اس حرکت کی وجہ سمجھ گئے تھے۔

"مسز سالار مجھے پسند نہیں کرتیں۔" ایرک نے اس کی بات کے جواب میں امامہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ امامہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا پہلی بار اس کے سمجھانے کا اثر ایرک پر یہ ہو گا۔

"خیر وہ تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں کرتا۔ خاص طور پر میں But you are still welcome"

یہ جبریل تھا جس نے ماں کے جواب دینے سے پہلے جواب دیا تھا۔ وہ فریج سے ایک سوفٹ ڈرنک نکال رہا تھا۔

"میرے بھی تمہارے بارے میں ایسے ہی خیالات ہیں۔" ایرک نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

"او ڈرنگی۔" جبریل اب اسے زچ کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا ایرک کو اس کی بات بری لگی تھی کہ۔

ایرک نے اسی طرح روٹھے انداز میں بیٹھا رہا تھا لیکن وہ یہاں ان لوگوں کے پاس آ کر ایک بار پھر ویسے ہی

خوش اور پرسکون تھا جیسے ہمیشہ ہوجاتا تھا۔ ان کے گھر میں گرم جوشی تھی جو سب کے لیے تھی۔ ایرک بھی اس نرم سی گرماہٹ کو محسوس کرسکتا تھا۔ وہ اپنے اسٹول سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے امامہ سے کہا۔

"مسز سالار! میں فریج سے کوئی ڈرنک لے سکتا ہوں؟"

"نہیں، جو آخری تھا، وہ میں نے لے لیا لیکن تم یہ پی سکتے ہو۔" امامہ سے پہلے جبریل نے اس سے کہا اور اپنے ہاتھ میں پکڑا وہ کین، جس سے اس نے ابھی ایک دو گھونٹ لیے تھے، اس کے سامنے کچن کاؤنٹر پر رکھ دیا اور خود اندرونی کمرے کی طرف چلا گیا۔ عنایہ لاؤنج کی صفائی میں امامہ کی مدد کر رہی تھی۔ ایرک کچھ دیر دیکھتا رہا پھر اس نے کین اٹھا کر ایک ہی سانس میں اسے ختم کیا۔

"اگر مدد کی ضرورت ہو تو میں مدد کرسکتا ہوں۔" ایرک نے ان دونوں کو مختلف چیزیں ادھر سے ادھر اٹھا کر رکھتے دیکھ کر آفر کی۔

"تمہارے بازو اب دو دن تک کچھ بھی اٹھانے کے قابل نہیں ہوں گے۔ اس لیے آرام کرو ہم خود ہی کرلیں گے ایرک۔" امامہ نے جواباً اس سے کہا۔

"میرا نام ایرک نہیں ہے۔" ایرک نے بے حد سنجیدگی سے امامہ کو جواب دیا۔

"ہاں ہاں پتا ہے تمہارا نام اب crab (کیکڑا) ہے۔" عنایہ نے ہونٹ چباتے ہوئے مذاق اڑانے والے انداز میں اس سے کہا۔

"میرا نام عبداللہ ہے۔" امامہ اور عنایہ نے بیک وقت پہلے اسے دیکھا پھر ایک دوسرے کو۔

"کیا مطلب؟" امامہ بھی ہکا بکا سی رہ گئی تھی۔

"اب میرا نام ایرک نہیں عبداللہ ہے۔" ایرک نے اپنا جملہ اسی سنجیدگی سے دہرایا تھا۔

"کس نے بدلا ہے تمہارا نام؟" عنایہ بھی ماں کی طرح دنگ تھی۔

"میں نے خود۔" ایرک نے فخریہ انداز میں خالی کین ڈسٹ بن میں پھینکتے ہوئے کہا۔

"ایرک ایک بہت خوب صورت نام تھا۔" امامہ نے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔ "کیوں عنایہ؟" اس نے روانی میں عنایہ سے پوچھا۔

"عبداللہ زیادہ خوب صورت نام ہے ممی۔" عنایہ نے ماں کی تائید نہیں کی لیکن بڑے جتانے والے انداز میں بتایا کہ وہ "عبداللہ" سے کیا مفہوم لے رہی تھی۔ وہ اللہ کا نام تھا اور وہ امامہ سے ایرک کے سامنے یہ نہیں کہنا چاہتی تھی کہ اللہ کا نام سب سے خوب صورت ہوتا ہے۔

سالار اور امامہ نے امریکہ میں اپنے بچوں کو مذہب سے ناآشنا نہیں رکھا تھا اور ماں باپ سے بڑھ کر یہ کام جبریل کرتا تھا جو ان تینوں کو قرآن کی بہت ساری باتیں بتاتا تھا لیکن اپنے مذہب سے مکمل طور پر واقف ہونے اور باعمل ہونے کے باوجود ان دونوں نے اپنے بچوں کو اس معاشرے میں رہتے ہوئے مذہبی مباحث میں حصہ لینے سے ہمیشہ باز رکھا تھا۔ وہ مسلمان کے طور پر واضح شناخت رکھنے کے باوجود کسی بھی طرح کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے والے شخص کی دل آزاری کا باعث نہیں بنتے تھے۔ اپنے مذہب کو دوسروں کے لیے تکلیف پہنچانے کا ذریعہ بنا کر۔

"لیکن ایرک کو عبداللہ کی ضرورت کس لیے؟" امامہ کو اس کی بات سمجھ میں آگئی تھی۔ اس کے باوجود وہ ایرک سے کہے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہ جس موضوع سے بچنا چاہتی تھی، بات آج پھر وہیں آگئی تھی۔

"کیوں ضرورت نہیں ہے؟" ایرک نے اسی انداز میں امامہ سے پوچھا۔ اس سوال کا جواب امامہ کے پاس

نہیں تھا۔

"تمہاری ممی کو پتا ہے کہ تم نے نام بدل لیا؟" عنایہ نے ماں کی مشکل سوال بدل کر آسان کی تھی۔

"ابھی نہیں پتا، لیکن میں بتا دوں گا۔" ایرک نے اسی سہولت سے کہا۔

"اور یہ نام تم نے رکھا کیسے ہے؟" امامہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"انٹرنیٹ سے ڈھونڈا ہے۔" ایرک نے اطمینان سے کہا۔

"اس کا مطلب جانتے ہو؟" امامہ نے اگلا سوال کیا۔

"ہاں۔ اللہ کا بندہ۔" اس نے امامہ کو ایک بار پھر لاجواب کیا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ سب اب مجھے عبداللہ کہا کریں۔" ایرک نے اگلا مطالبہ کیا۔

"اس سے کیا ہوگا؟" اس بار وہ امامہ کے سوال پر خاموش رہ گیا تھا۔ واقعی اس سے کیا ہو سکتا تھا۔

وہ کچھ دیر ایسے ہی کھڑا رہا، پھر کچھ کہے بغیر خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ امامہ کو عجیب سا قلق ہوا۔ وہ کھڑکی کی طرف گئی اور باہر جھانکا۔ اس کا خیال تھا وہ ایک بار پھر کیلوڈ آن کرفٹ پاتھ پر پھر رہا ہوگا لیکن وہ باہر نہیں تھا۔

"عبداللہ برا نہیں ہے۔" وہ عنایہ کی آواز پر کرنٹ کھا کر پلٹی تھی۔ وہ ایک بار پھر رو رہا چلانے کے لیے تیار تھی لیکن وہ اب اداس تھی۔

"عنایہ! وہ ایرک ہے۔ صرف نام بدل لینے سے وہ عبداللہ نہیں ہو سکتا بیٹا۔" امامہ نے کتنا ضروری سمجھا تھا لیکن یہ جملہ کہتے ہوئے اسے اپنی آواز کی بازگشت نے عجیب انداز میں ہولایا تھا۔ عنایہ خاموش رہی تھی۔



سالار نے اس فائل میں لگے کاغذات کو باری باری دیکھا۔ آخری کاغذ فائل میں رکھنے کے بعد اس نے سامنے بیٹھے حمین کو دیکھا۔ فائل بند کی اور اسے واپس تھما دی۔

"تو اس سارے تجربے سے تم نے کیا سیکھا؟"

"بہت ساری باتیں۔" حمین نے گہرا سانس لے کر کہا۔ سالار نے اپنی ہنسی بے اختیار چھپائی۔

"صرف دو باتیں بتاؤ۔"

"بچے اچھے کلائنٹس نہیں ہوتے۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

"اور؟" سالار نے پوچھا۔

"بزنس آسان نہیں ہے۔" اس نے چند لمحے خاموش رہ کر سالار سے کہا۔

"درست۔" سالار نے تائید کی پھر اس سے کہا۔ "ہر وہ چیز جو اچھی لگے اور دوسرے کی ملکیت ہو، ہماری زندگی کا مقصد نہیں ہو سکتی نہ ہی ہماری موسٹ فیورٹ چیز ہو سکتی ہے۔"

سالار نے اس کے بزنس سلوگن کو جان بوجھ کر دہرایا جو اس نے اس کے کانٹریکٹ میں پڑھا تھا۔ "اپنی پسندیدہ چیز حاصل کریں!" ایک لمحے کے لیے اس سلوگن نے اسے چکرا کر ہی رکھ دیا تھا۔ وہ اس کی اولاد کا بزنس سلوگن کیسے ہو سکتا تھا اور وہ بھی نو سال کی عمر میں۔

"ہماری موسٹ فیورٹ چیز وہی ہوتی ہے اور ہونی چاہیے جو ہمارے پاس ہے۔ کسی دوسرے کی موسٹ فیورٹ چیز چھیننے کا ہمیں حق نہیں ہے۔" وہ اپنے نو سالہ بیٹے کو بزنس کے گر بتانے میں اخلاقیات کا درس دینے کی کوشش کر

رہا تھا۔ پتا نہیں صحیح کر رہا تھا یا غلط۔ مگر سالار سکندر باپ تھا وہ اپنے نو سالہ بیٹے کو یہ نہیں سکھا سکتا تھا کہ بزنس میں کوئی اخلاقیات نہیں ہوتیں۔ صرف پیسہ ہوتا ہے۔ یا نہیں ہوتا۔ باقی ہر چیز سیکنڈری تھی۔

"تمہیں پتا ہے انسان کے پاس سب سے طاقت ور چیز کیا ہے؟" اس نے حمین سے پوچھا۔

"کیا؟" حمین نے کہا۔

"عقل... اگر اس کا صحیح استعمال کرنا آتا ہو تو۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اور تمہیں پتا ہے انسان کے پاس سب سے خطرناک چیز کیا ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"کیا؟" حمین نے پھر اسی انداز میں کہا۔

"عقل! اگر... اس کا صحیح استعمال نہ آتا ہو تو یہ صرف دوسروں کو نہیں خود آپ کو بھی تباہ کر سکتی ہے۔"

حمین جانتا تھا سالار کس کی عقل کی بات کر رہا تھا۔ وہ اس کی ہی بات کر رہا تھا۔

وہ دنیا کے دو ذہین ترین دماغ تھے، صرف باپ بیٹا نہیں تھے۔ پینتالیس سال کی عمر میں وہ ایک سود سے پاک اسلامی مالیاتی نظام کا ڈھانچہ کھڑا کر چکا تھا۔ اب اس ڈھانچے کی بنیادیں مضبوط کرنے کے بعد اس کی عمارت کھڑی کر رہا تھا۔ وہ رسک لیتا تھا چیلنج قبول کرتا تھا۔ نئے راستے ڈھونڈتا اور بنانا جانتا تھا۔

برین ٹیومر سے لڑتے ہوئے بھی وہ اپنی زندگی کے ایک ایک دن کو با مقصد گزار رہا تھا۔ ایک دنیا اس کے نام سے واقف تھی۔ ایک دنیا اسے مانتی تھی۔ وہ جس فورم پر بات کرنے کھڑا ہوتا۔ فنانس کی دنیا کے گرو اس کو خاموشی اور توجہ سے سنتے تھے۔ وہ زندگی میں کوئی اور بڑے معرکے نہ بھی مارتا تو بھی سالار سکندر فنانس کی دنیا میں لیجنڈری حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

حمین سکندر ایک نو سال کا بچہ تھا جس کا پہلا بزنس کسی انویسٹمنٹ کے بغیر صرف انٹرپرینیورشپ اسکلز سے شروع ہوا تھا اور کامیابی سے فراڈ بھرنے کے بعد تین مہینے کے اندر بری طرح نہ صرف ڈوبا تھا بلکہ ساتھ ہی اسکول میں اس کی ساکھ کو بھی لے ڈوبا تھا۔ اس نے اپنے پاس بقیہ رہ جانے والے 175 ڈالرز کی ایک ایک پائی واپس کر دی تھی۔ ہر ایک سے نہ صرف زبانی طور پر معذرت کی تھی بلکہ ہر ایک کو ایک معذرت کا خط بھی لکھا تھا جو اس نے خود ڈرافٹ کیا تھا۔ یہ حمین سکندر کی زندگی کے سب سے شرمندہ کرنے والے لمحات تھے۔ وہ کچھ دنوں پہلے کے قومی سطح پر ملنے والے اسٹارڈم کو گھنٹوں میں کھو چکا تھا۔ لیکن اس سارے تجربے نے حمین سکندر کو پہلی بار کچھ سنجیدہ کیا تھا۔ کچھ سوچنے پر مجبور کیا تھا۔

اس نے اس رات ایک بات اپنے باپ کو نہیں بتائی تھی اور وہ یہ تھی کہ اسے زندگی میں بزنس ہی کرنا تھا۔ اپنے باپ سے زیادہ بڑا اور کامیاب نام بننا تھا۔ اسے دنیا کا امیر ترین آدمی بننا تھا۔ حمین سکندر نے یہ خواب جاگتی آنکھوں سے اپنے کلاس فیلوز کو ان کی رقم واپس کرتے ہوئے دیکھا تھا جس کی تعبیر اسے کیسے حاصل کرنی تھی یہ اسے ابھی سوچنا تھا۔



"ممی! میں قرآن پاک پڑھنا چاہتا ہوں۔" ڈنر ٹیبل پر اس رات ایرک اپنی فیملی کے ساتھ کئی دنوں بعد ساتھ بیٹھا تھا۔ کیرولین کا بوائے فرینڈ بھی وہیں تھا جب کھانے کے درمیان ایرک نے کیرولین سے یہ بات کہی تھی۔

"وہ کیا ہے؟" ایک لمحہ کے لیے کیرولین کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کس چیز کو پڑھنے کی خواہش کا اظہار کر رہا

"مسلمز" کی "ہولی" بک۔ (مقدس کتاب) جو عنایہ کی فیملی پڑھتی ہے۔" اس نے ماں کو وضاحت دی۔

کیرولین کے پارٹنر رالف نے کھانا کھاتے ہوئے رک کر ان دونوں کو دیکھا تھا۔ وہ تقریباً" پچھلے تین مہینے سے اسی گھر میں کیرولین کے ساتھ ایک Live in ریلیشن شپ میں تھا۔ ایرک اسے پسند نہیں کرتا تھا، وہ اچھی طرح جانتا تھا لیکن ایرک نے کبھی اس سے بدتمیزی بھی نہیں کی تھی۔ ان دونوں کا تعلق بے حد رسمی سا تھا مگر اتنے عرصے میں یہ پہلی بار تھا کہ وہ ایرک کی کسی بات پر تبصرہ کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ جھجک رہا تھا۔ وہ ایرک کے دل میں اپنے لیے ناپسندیدگی میں اور اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"تم ٹرانسلیشن پڑھنا چاہتے ہو؟" کیرولین نے کہا۔

"نہیں، میں عربی پڑھنا چاہتا ہوں جیسے وہ پڑھتے ہیں۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"لیکن تمہیں عربی نہیں آتی۔" کیرولین بھی اب بے حد سنجیدہ تھی۔ یہ ایک عجیب فرمائش تھی۔

"ہاں لیکن جبریل مجھے سکھا دے گا۔ [illegible]" اس نے کہا۔

فوری طور پر کیرولین کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا جواب دے۔ وہ ایک نئی زبان کا ذکر اس طرح کر رہا تھا جیسے وہ دو دن میں اسے سیکھ لینے والا تھا۔

"اس کی ضرورت کیا ہے؟" کیرولین کو خاموش دیکھ کر رالف بولے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ "مسلمانوں کی ہولی بک ہے، تمہیں اس کو پڑھنے کے لیے ایک نئی زبان سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اس کی ٹرانسلیشن پڑھ سکتے ہو۔ اگر تمہیں ایک کتاب کے طور پر اسے پڑھنے میں دلچسپی ہے تو۔" رالف نے اپنی طرف سے بے حد مناسب مشورہ دیا تھا۔ جو ایرک نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا تھا۔ اس نے رالف کی بات کا جواب دینے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔

"ممی۔" رالف کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اس نے سوالیہ انداز میں کیرولین کی طرف دیکھا۔

وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ اس کے اور ایرک کے تعلقات آج کل جس نوعیت کے رہ گئے تھے اس میں یہ بڑی بات تھی کہ وہ کسی کام کے لیے اس سے اجازت مانگ رہا تھا ورنہ وہ کوئی کام کر کے بھی اسے بتانے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔

"تمہاری اسٹڈیز ڈسٹرب ہوں گی ایرک۔" کیرولین کو جو واحد مسئلہ نظر آیا تھا اس نے اس کا ذکر کیا۔

"وہ متاثر نہیں ہوں گی۔ آئی پرامس۔" اس نے فوراً" سے پیشتر ماں کو یقین دہانی کروائی۔ رالف کو عجیب سی ہتک کا احساس ہوا تھا۔ خود کو یوں نظر انداز کیے جانے پر۔ لیکن دوبارہ مداخلت کرنے کے بجائے کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔

"اوکے۔ ٹھیک ہے لیکن اگر تمہاری اسٹڈیز پر کوئی اثر پڑا تو میں تمہیں روک دوں گی۔"

ایرک کا چہرہ کھل اٹھا۔ "اوکے!" اس نے جیسے ماں کو تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

"تم کب جایا کرو گے جبریل کے پاس قرآن پاک پڑھنے؟" کیرولین نے پوچھا۔

"ہفتے میں دو بار۔" ایرک نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ جیسے مطمئن ہو گئی۔

"آپ جبریل کی ممی کو فون کر کے بتا دیں کہ آپ نے مجھے اجازت دے دی ہے اور آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔" ایرک نے کہا۔

کیرولین کو پلک جھپکتے میں سمجھ میں آگیا تھا کہ اس ساری اجازت کا اصل مقصد کیا تھا... رالف کے سامنے وہ

ایرک سے یہ نہیں کہنا چاہتی تھی کہ وہ یقیناً "جبریل کے خاندان کی شرط کی وجہ سے اس سے اجازت لینا چاہ رہا تھا۔"
"ٹھیک ہے میں فون کروں گی۔" کیرولین نے کہا۔ ایرک شکریہ ادا کرتے ہوئے کھانا ختم کرکے چلا گیا۔
"تم بے وقوفی کر رہی ہو۔" اس کے وہاں سے جاتے ہی رالف نے بے حد ناخوش انداز میں کیرولین سے کہا تھا۔
"کیسی بے وقوفی؟" وہ سمجھتے ہوئے بھی نہ سمجھی تھی۔
"تمہارا بیٹا پہلے ہی تمہارے لیے سر درد بنا ہوا ہے۔ وہ tempramental (متلون مزاج) ہے اور تم اسے قرآن پاک اور عربی سیکھنے کے لیے بھیج رہی ہو تاکہ وہ انتہا پسند ہو جائے۔ وہ بھی ایک مسلمان خاندان کے پاس۔"
کیرولین ہنس پڑی تھی۔
"تم اس خاندان کو جانتے نہیں ہو رالف! میں ساڑھے تین سال سے جانتی ہوں۔ نیبرز ہیں ہمارے۔ جیمز کی موت کے بعد انہوں نے ہمارا بہت خیال رکھا تھا۔" کیرولین کہہ رہی تھی۔ "میں مارک اور سیل کو اکثر ان لوگوں کے پاس چھوڑ کر جاتی تھی۔ وہ ایرک کو کچھ برا نہیں سکھائیں گے۔ سکھانا ہوتا تو وہ اسے میری اجازت کے بغیر بھی۔ سکھانا شروع کر چکے ہوتے مجھے کیسے پتا چلتا۔ کم از کم ایرک ایسا نہیں ہے کہ وہ کوئی بھی کام مجھ سے پوچھے بغیر کرنے کا تصور بھی نہ کرسکے۔"
"تم پھر بھی سوچ لو۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ ایک اچھا فیصلہ ہے۔ ایک ڈسٹربڈ بچے کو قرآن پاک پڑھانا۔ وہ اگر مسلمانوں ہی کی طرح وائلنٹ (تشدد پسند) ہو گیا تو...؟" رالف کے اپنے ہی خدشات تھے جنہیں کیرولین نے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔
"مجھے پتا ہے ایرک کے مزاج کا۔ اسے کسی چیز کا شوق پیدا ہو تو بس شوق نہیں جنون سوار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ سب زیادہ دن نہیں چلتا۔ وہ بڑی جلدی بور ہونا شروع ہو جاتا ہے اور یہ تو ایک دوسری زبان سیکھنا ہے۔ تم دیکھنا ایک دو ہفتوں کے بعد خود ہی چھوڑ دے گا وہ۔"
کیرولین نے بے حد مطمئن انداز میں رالف کے خدشات ختم کرنے کی کوشش کی اور جو اس نے کہا تھا اسے اس پر یقین تھا مگر وہ پھر بھی خوش اس لیے تھی کہ کئی ہفتوں کے بعد اس کے اور ایرک کے درمیان باہمی رضامندی سے ایک بات ہوئی تھی۔
ایرک اس اجازت کے اگلے ہی دن دوبارہ امامہ اور سالار کے گھر پہنچ گیا تھا۔ جبریل کے پاس قرآن پاک کا آغاز کرنے۔
وہ ایک دن پہلے بھی اسی طرح جبریل کے پاس گیا تھا۔ وہ اس وقت قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ ایرک اس کے پاس جاکر بیٹھ گیا تھا اور پھر اتنی دیر اس کے پاس بیٹھا رہا کہ جبریل کو بالآخر تلاوت ختم کرکے اس سے پوچھنا پڑا تھا کہ وہ وہاں کسی کام سے تو نہیں آیا؟
"میں بھی ایسے قرآن پاک پڑھنا سیکھنا چاہتا ہوں جیسے تم پڑھ رہے ہو۔" اس نے جبریل کو جواب دیا تھا۔
وہ اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔ اسے اس کا مطالبہ عجیب لگا تھا۔
"میری تو یہ مذہبی کتاب ہے، اس لیے پڑھ رہا ہوں میں۔" اس نے ایرک کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ "تم پڑھ کر کیا کرو گے؟"
"مجھے دلچسپی ہے جاننے میں اور مجھے اچھا لگتا ہے جب تم تلاوت کرتے ہو تو۔" ایرک نے جواباً کہا۔
"تم انٹرنیٹ پر ٹرانسلیشن پڑھ سکتے ہو یا میں تمہیں دے دوں گا ایک انگلش ٹرانسلیشن۔ اور تمہیں تلاوت اچھی لگتی ہے تو تم وہ بھی وہاں سے ڈاؤن لوڈ کرکے سن سکتے ہو۔ تمہیں اس کے لیے قرآن پاک کی

تلاوت سیکھنے کی ضرورت نہیں۔" جبرئیل نے نرمی سے جیسے اسے راستہ سمجھایا تھا۔

"لیکن میں ٹرانسلیشن نہیں پڑھنا چاہتا اور میں تلاوت سننا نہیں خود کرنا چاہتا ہوں جیسے تم کرتے ہو۔" ارک اب بھی مصر تھا۔

"یہ بہت لمبا کام ہے ارک! ایک دن میں نہیں ہو سکتا۔" جبرئیل نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ وہ نہ ٹلا۔

"کتنا لمبا کام ہے؟" ارک نے پوچھا۔

"تمہیں تو کئی سال لگ جائیں گے۔"

"وہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میرے پاس بہت وقت ہے۔" ارک نے بہت مطمئن ہو کر اس سے کہا تھا۔

جبرئیل عجیب مشکل میں پڑ گیا تھا۔ ارک کئی بار پڑھائی کے حوالے سے کوئی بات اس سے پوچھنے آجاتا تھا اور جبرئیل اسے سمجھا دیا کرتا تھا لیکن یہ ان کی مقدس کتاب کی بات تھی۔ ایک گیارہ سالہ عیسائی بچے کی فرمائش پر وہ ابھی امریکہ میں بیٹھ کر بھی وہ سوچے سمجھے بغیر [illegible] جوش و جذبات میں اسے قرآن پاک سکھانا شروع نہیں کر سکتے تھے۔

"تم سب سے پہلے اپنی ممی سے پوچھو۔" جبرئیل نے بالآخر اس سے کہا۔

"ممی کو کوئی ایشو نہیں ہو گا مجھے پتا ہے۔" اس نے جبرئیل کو یقین دلانے کی کوشش کی۔

"اگر ان کو ایشو نہیں ہو گا تو انہیں یہ بات مجھ سے یا ممی سے کہنی ہو گی۔" جبرئیل اس کی یقین دہانی سے متاثر ہوئے بغیر بولا تھا۔

"میں اپنے لیے کچھ بھی فیصلہ کر سکتا ہوں۔ مجھے ہر کام ممی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ارک نے اس سے کہا۔

"تم ابھی چھوٹے ہو ارک۔ اور زیادہ سمجھ دار بھی نہیں ہو۔ جب تک تم اٹھارہ سال کے نہیں ہو جاتے تمہیں ہر کام اپنی ممی سے پوچھ کر ہی کرنا چاہیے۔ جیسے ہم لوگ اپنے پیرنٹس سے پوچھ کر کرتے ہیں اور یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔" جبرئیل نے اسے سمجھایا تھا۔

وہ آدھا گھنٹہ اس سے بحث کر کے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ اجازت لیے بغیر بھی کوئی کام کر لینا غلط نہیں ہے لیکن جبرئیل قائل نہیں ہوا۔ بالآخر ارک نے ہار مان لی تھی اور اگلے دن ممی کی اجازت کے ساتھ آنے کا کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

امامہ کے لیے کیرولین کی فون کال ایک سرپرائز تھی۔ اس نے بڑے خوش گوار انداز میں اس سے بات چیت کرتے ہوئے امامہ کو اس اجازت کے بارے میں بتایا تھا جو اس نے ارک کو دی تھی اور امامہ حیران رہ گئی تھی۔ اسے ارک اور جبرئیل کے درمیان اس حوالے سے ہونے والی گفتگو کا علم نہ تھا۔

"ممی! مجھے یقین تھا وہ نہ اپنی ممی سے بات کرے گا نہ ہی وہ اسے اجازت دیں گی۔" جبرئیل نے ماں کے استفسار پر اسے بتایا تھا۔

امامہ نے اسے کیرولین کی کال کے بارے میں مطلع کرتے ہوئے بتایا تھا۔

"لیکن اب اس کی ممی نے مجھے کال کر کے کہا ہے کہ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے تو اب کیا کریں؟" امامہ نے کہا۔

"کیا کرنا ہے۔" وہ ہنس پڑا تھا۔ "قرآن پاک سکھاؤں گا اسے اب۔" جبرئیل نے ماں سے کہا تھا۔

اسے اپنے جواب پر امامہ کے چہرے پر خوشی نظر نہیں آئی۔
"آپ کو پریشانی کس بات کی ہے۔ پہلے یہ تھی کہ اس کی فیملی کو اعتراض نہ ہو لیکن اب تو اس کی فیملی نے اجازت دے دی ہے پھر اب تو کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔"
جبریل نے جیسے ماں کو کریدنے کی کوشش کی تھی۔ امامہ اس سے کہہ نہیں سکی کہ اسے سارا مسئلہ عنایہ کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ قرآن پاک سیکھنے کی یہ خواہش اگر ایرک کی اس خواہش کے بغیر سامنے آتی تب وہ کچھ اور طرح کے تامل اور جھجک کا شکار ہوتی لیکن خوشی خوشی ایرک کو اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر قرآن پاک سیکھنے دیتی۔
"مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جو بھی ہوتا ہے اللہ کی مرضی سے ہی ہوتا ہے اور ہم کچھ بھی بدلنے پر قادر نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے ایرک تم سے قرآن پاک سیکھنا چاہتا ہے تو تم سکھاؤ اسے۔" امامہ نے بالآخر جیسے ہتھیار ڈال دیے تھے۔



گیارہ سال کی عمر میں قرآن پاک سے ایرک کا وہ پہلا باقاعدہ تعارف تھا۔ اس سے پہلے وہ صرف اس کتاب کا نام جانتا تھا۔ جبریل تاریخ کے حصے کے طور پر.....
وہ سالار اور امامہ کے گھر جا کر مسلمانوں کے قریب ہوا تھا اور جبریل کی تلاوت سن سن کر وہ قرآن پاک سے متاثر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ زبان اور وہ تلاوت اسے جیسے کسی فینٹسی میں لے جاتی تھی۔ وہ لفظ "ہیبت" سے آشنا نہیں تھا۔ ہوتا تو شاید یہی استعمال کرتا اس کے لیے۔ جبریل کی آواز دلوں کو پگھلا دینے والی ہوتی تھی وہ خوش الحان نہیں تھا۔ وہ بلا کا خوش الحان تھا اور گیارہ سال کا وہ بچہ اس زبان اور اس کے مفہوم سے واقف ہوئے بغیر بھی صرف اس کی آواز کے سحر میں گرفتار تھا۔
جس دن اس نے جبریل سے قرآنی قاعدہ کا پہلا سبق لیا تھا اس رات اس نے آن لائن قرآن پاک کا پورا انگلش ترجمہ پڑھ لیا تھا۔ وہ کتابیں پڑھنے کا شوقین اور عادی تھا اور قرآن پاک کو اس نے ایک کتاب ہی کی طرح پڑھا تھا۔ بہت ساری چیزوں کو سمجھتے ہوئے۔ بہت ساری چیزوں کو نہ سمجھتے ہوئے۔ بہت ساری باتوں سے متاثر ہوتے ہوئے۔ بہت سارے احکامات سے الجھتے ہوئے۔ بہت سارے جملوں کو ذہن نشین کرتے ہوئے۔ بہت سارے واقعات کو اپنی کتاب بائبل سے منسلک کرتے ہوئے۔
اس نے بائبل بہت اچھی طرح پڑھی تھی اور اس نے قرآن پاک کو بھی اسی لگن سے پڑھا تھا۔ اس کی ماں کی یہ رائے ٹھیک تھی کہ ایرک کو جب ایک چیز کا شوق ہو جاتا تھا تو پھر وہ شوق نہیں، جنون بن جاتا تھا لیکن اس کی ماں کا یہ خیال بالکل غلط تھا کہ وہ ایک دو ہفتوں کے بعد خود ہی اپنے اس شوق سے بے زار ہو جانے والا تھا کیونکہ وہ مستقل مزاج تھا۔
جبریل کو حیرت نہیں ہوئی تھی جب اگلے دن ایرک نے اسے قرآنی قاعدہ کا سبق بالکل ٹھیک ٹھیک سنایا تھا۔ وہ بے حد ذہین تھا اور وہ اتنے سالوں سے اس سے واقف ہونے کے بعد — یہ تو جانتا تھا کہ ایرک کوئی بھی چیز آسانی سے بھلاتا نہیں تھا، لیکن وہ یہ جان کر کچھ دیر خاموش ضرور ہو گیا تھا کہ ایرک نے ایک رات میں بیٹھ کر قرآن پاک کا پورا ترجمہ پڑھ لیا تھا۔
"اس کا فائدہ کیا ہوا؟" جبریل نے اس سے پوچھا تھا۔
"کس چیز کا... قرآن پاک پڑھنے کا؟" ایرک نے اس کے سوال کی وضاحت چاہی۔
"ہاں!" جبریل نے جواب دیا۔

ارک کو کوئی جواب نہیں سوجھا۔ اس کا خیال تھا۔ جبریل اس سے متاثر ہوگا۔ وہ متاثر نہیں ہوا تھا اُلٹا اس سے سوال کر رہا تھا۔

"فائدہ تو نہیں سوچا میں نے' میں نے تو بس تجسس میں پڑھا ہے قرآن پاک۔" ارک نے کندھے اچکا کر پوچھا۔

"تو اب تمہاری کیا رائے ہے قرآن پاک کے بارے میں۔۔۔؟ اب بھی سیکھنا چاہتے ہو؟" جبریل نے اس سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ اب اور بھی زیادہ۔" ارک نے کہا۔ "مجھے یہ بے حد انٹرسٹنگ لگی ہے۔"

جبریل اس کی بات پر مسکرایا تھا۔ وہ ایسے بات کر رہا تھا جیسے انسائیکلوپیڈیا کے بارے میں بات کر رہا ہو یا کسی دلچسپ کتاب کے بارے میں جو وہ مکمل پڑھے بغیر نہیں رہ سکا ہو۔

"مقدس کتابوں کو صرف پڑھ لینا کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔" جبریل نے اس سے کہا تھا۔ "اسے پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔"

ارک اس کو بغور دیکھتے ہوئے اس کی بات سن رہا تھا۔

"یہ میں جانتا ہوں۔" اس نے کہا' یہ وہی بات تھی جو وہ اپنے ماں باپ سے بھی بہت بار سن چکا تھا۔

اس دن جبریل نے اسے دوسرا سبق قرآنی قاعدہ کا نہیں دیا تھا۔ اس نے اسے دوسرا سبق "ایک اچھا انسان" بننے کے حوالے سے دیا تھا۔

"کوئی بھی ایسی چیز جس کا تعلق اللہ سے ہے اور جو ہم سیکھتے ہیں تو پھر اس دن ہمارے اندر دوسروں کے لیے کچھ زیادہ بہتری آنی چاہیے تاکہ یہ نظر آئے کہ ہم کوئی "خاص چیز" سیکھ رہے ہیں۔"

جبریل نے اسے سمجھایا تھا۔ وہ تبلیغ کرنا نہیں چاہتا تھا اور یہ مشکل کام بھی تھا کہ اپنے مذہب کا ڈنکا بجائے بغیر کسی کو یہ سمجھا سکے کہ اسلام آخری مذہب کیوں تھا۔۔۔ کامل ترین کیوں تھا۔

"وہ سارے سبجیکٹ جو ہم اسکول میں پڑھتے ہیں اور جو ہم وہاں سیکھتے ہیں' وہ ہماری پرسنالٹی پر اثر انداز نہیں ہوتے وہ صرف تب ہمارے کام آتے ہیں' جب ہمیں ایگزام دینا ہو۔۔۔ جاب کرنی ہو۔۔۔ یا بزنس کرنا ہو۔۔۔ کتابیں ہمیں باعلم بناتی ہیں۔۔۔ باعمل نہیں۔۔۔ باعمل ہمیں صرف وہ کتاب بنا سکتی ہے' جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو صرف باعمل کرنے کے لیے اتاری ہے۔"

ارک اس کی بات بڑی توجہ سے سن رہا تھا' بالکل ویسے ہی جیسے اس سے پہلے کوئی چیز سمجھا کرتا تھا۔

"بابا نے مجھ سے کہا تھا اگر ہم اچھے انسان نہ بن سکیں اور اپنے خاندان اور معاشرے کے لیے تکلیف کا باعث ہوں تو عبادت کرنے اور مذہب کے بارے میں پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ مذہب اور مذہبی کتابیں اللہ تعالیٰ نے صرف ایک مقصد کے لیے اتاری ہیں کہ ہم اچھے انسان بن کر رہیں۔۔۔ ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کا خیال رکھیں۔ خاص طور پر ان کا جو ہماری ذمہ داری ہیں۔۔۔ جیسے تمہارے چھوٹے بہن بھائی اور تمہاری ممی تمہاری ذمہ داری ہیں۔۔۔ تمہارا اپنا جسم اور ذہن تمہاری اپنی ذمہ داری ہے۔"

جبریل بڑی ذہانت سے گفتگو کو اس موضوع کی طرف موڑ رہا تھا جس پر وہ ارک سے بات کرنا چاہتا تھا اور ارک یہ بات سمجھ رہا تھا۔ وہ چھوٹا تھا' بے وقوف نہیں تھا۔ وہ کہیں اور بیٹھا ہوتا تو بھی اس موضوع پر کسی کو بات کرنے کی اجازت نہ دیتا وہ ان ایشوز کے حوالے سے اتنا ہی حساس تھا' لیکن وہ اس گھر میں آکر کسی سے بھی کچھ بھی سن لیتا تھا۔

"تو اب تم نے دیکھنا ہے کہ جس دن تم قرآن پاک پڑھ کر جاتے ہو۔ اس دن تمہارے اندر کیا تبدیلی آتی ہے۔ اس دن تم اپنی فیملی کے لیے اور دوسروں کے لیے کیا اچھا کام کرتے ہو۔" جبریل نے جیسے اسے چیلنج دیا تھا۔

"میں کوشش کروں گا۔" ایرک نے وہ چیلنج قبول کرلیا تھا۔ پھر اس نے جیسے اس کی مدد مانگی "تو آج میں گھر میں جا کر کیا کروں؟"

"تم آج ایک ایسا کام مت کرنا جس سے تمہیں پتا ہو کہ تمہاری ممی اپ سیٹ ہوتی ہیں۔"

جبریل نے اس سے کہا تھا۔ ایرک کچھ خجل سا ہو گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا جبریل اتنے بے دھڑک انداز میں اس کے بارے میں ایسی بات کہے گا۔

"تم مجھے عبداللہ کہا کرو۔" ایرک نے جان بوجھ کر بات کا موضوع بدلنے کے لیے اسے ٹوکا۔

"عبداللہ تو اللہ کا بندہ ہوتا ہے۔ سب سے kind (مہربان) سب سے زیادہ خیال رکھنے والا اور احساس کرنے والا۔ کسی کو تکلیف نہ دینے والا۔ میں تمہیں عبداللہ تب کہنا شروع کروں گا جب تم سب سے پہلے اپنی ممی کو تکلیف دینا بند کرو گے۔"

جبریل نے اس کی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔ ایرک جیسے کچھ اور خجل ہوا۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا جیسے جبریل اس سے جو کچھ کہہ رہا تھا' وہ اس کی ممی کے کہنے پر کہہ رہا تھا' لیکن وہ اس سے بحث میں نہیں الجھا تھا اس نے خاموشی سے اس کی بات مان لی تھی۔

اس دن ایرک گھر جا کر پہلی بار رالف سے خوش دلی سے ملا تھا۔ کیرولین اور وہ دونوں سٹنگ ایریا میں بیٹھے فٹ بال میچ دیکھ رہے تھے۔ رالف اور کیرولین کو ایک لمحے کے لیے لگا شاید ایرک سے غلطی ہوئی تھی یا پھر انہیں وہم ہو رہا تھا۔ اس نے پہلی بار رالف سے خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا تھا اور کیرولین اس بات پر شروع شروع میں اسے ڈھیروں بار ڈانٹ اور سمجھا چکی تھی۔ زچ ہو چکی تھی اور پھر اس نے ایرک کو کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ایرک اور رالف کے درمیان کبھی کوئی تکرار نہیں ہوئی تھی' لیکن رالف یہ جانتا تھا کہ وہ اسے پسند نہیں کرتا اور اس نے بھی ایرک کے ساتھ فاصلے کم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اس کا خیال تھا ان دونوں کے درمیان فاصلہ رہنا ہی بہتر تھا تاکہ لحاظ ختم نہ ہو' لیکن وہ ذاتی حیثیت میں ایک اچھا سمجھا ہوا آدمی تھا اور وہ ایرک کے حوالے سے کیرولین کی پریشانی کو بھی سمجھتا تھا۔

ایرک رکے بغیر وہاں سے چلا گیا تھا۔ رالف اور کیرولین نے ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھا۔

"اس کو کیا ہوا؟" رالف نے کچھ خوشگوار حیرت کے ساتھ کہا تھا۔

"پتا نہیں۔" کیرولین نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

وہ پہلی تبدیلی نہیں تھی جو ایرک میں آئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ مزید تبدیل ہوتا گیا تھا۔ ویسا ہی جیسا وہ پہلے ہوا کرتا تھا۔ قرآن پاک کا سبق ہفتے میں دو دن کے بجائے وہ اب ہر روز لینے جایا کرتا تھا۔ اگر کبھی جبریل یہ کام نہ کر سکتا تو حمین یا امامہ اسے سبق پڑھا دیتے' لیکن ایرک کو یہ اعتراف کرنے میں عار نہیں تھا کہ جیسے جبریل اسے پڑھاتا تھا' ویسے اور کوئی نہیں پڑھا سکتا تھا۔ اس کی آواز میں تاثیر تھی ایرک اس سے پہلے بھی متاثر تھا' لیکن اس سے قرآن پاک پڑھنے کے دوران وہ اس سے مزید قریب ہو گیا تھا۔

اس گھر میں ایرک کی جڑیں اب زیادہ گہری اور مضبوط ہو گئی تھیں۔ امامہ کی تمام تر احتیاط کے باوجود۔

☼ ☼ ☼

جبریل لوگوں کو نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں متاثر کرتا تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں اس کا ٹھہراؤ اس کی عمر کے عام بچوں کے برعکس تھا۔ سالار کی بیماری نے امامہ کے ساتھ ساتھ دس سال کی عمر میں اسے بھی بدل دیا تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ حساس اور اپنی فیملی کے بارے میں زیادہ ذمہ دار ہو گیا تھا یوں جیسے وہ اسی کی ذمہ داری تھی اور سالار اور امامہ یقیناً "خوش قسمت" تھے کہ ان کی سب سے بڑی اولاد میں ایسا احساس ذمہ داری تھا۔

اس نے امریکا میں سالار کی سرجری اور اس کے بعد وہاں امامہ کے بھی وہیں قیام کے دوران اپنے تینوں چھوٹے بہن بھائیوں کی پروا کسی باپ ہی کی طرح کی تھی۔

سکندر عثمان اور طیبہ سالار کے بچوں کی تربیت سے پہلے بھی متاثر تھے، لیکن ان کی غیر موجودگی میں جبریل نے جس طرح ان کے گھر پر اپنے بہن بھائیوں کا خیال رکھا تھا۔ وہ ان کو مزید متاثر کر گیا تھا۔ امامہ نے اپنے بچوں سے کہا تھا کہ یہ ہمارا گھر نہیں ہے ہم یہاں مہمان ہیں اور مہمان بھی میزبان کو شکایت کا موقع نہیں دیتے اور ان چاروں نے ایسا ہی کیا تھا۔ طیبہ اور سکندر کو بھی ان چاروں بچوں کے حوالے سے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا نہ ہی انہیں ان کے حوالے سے کسی اضافی ذمہ داری کا احساس ہوا تھا۔

وہ تینوں اپنا ہر کام خود ہی کر لینے کی کوشش کرتے تھے اور رئیسہ کی ذمہ داری ان تینوں نے آپس میں بانٹی ہوئی تھی کیونکہ ان چاروں میں سب سے چھوٹی اور کسی حد تک اپنے کاموں کے لیے وہی دوسروں پر انحصار کرتی تھی۔

اپنے بہن بھائیوں کی ذمہ داریاں اس طرح اپنے سر پر لینے نے جبریل کو بہت بدلا تھا۔ ایک دس سالہ بچہ تھی مینے اپنا کھیل کود اور نئی سرگرمیاں بھلا بیٹھا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب جبریل ذہنی طور پر بھی بدلتا چلا گیا تھا۔

تیرہ سال کی عمر میں ہائی اسکول سے ڈسٹنکشن کے ساتھ پاس کر کے یونیورسٹی جانے والا وہ اپنے اسکول کا پہلا اسٹوڈنٹ تھا اور وہ یونیورسٹی صرف ڈسٹنکشن کے ساتھ نہیں پہنچا تھا وہ بل گیٹس فاؤنڈیشن کی ایک اسکالر شپ پر پہنچا تھا۔ وہ وہ پہلی سیڑھی تھی جو میڈیسن کی طرف جاتے ہوئے اس نے چڑھی تھی۔ سالار سکندر کے خاندان کا پہلا پروفیشنل ڈاکٹر یونیورسٹی پہنچ چکا تھا۔

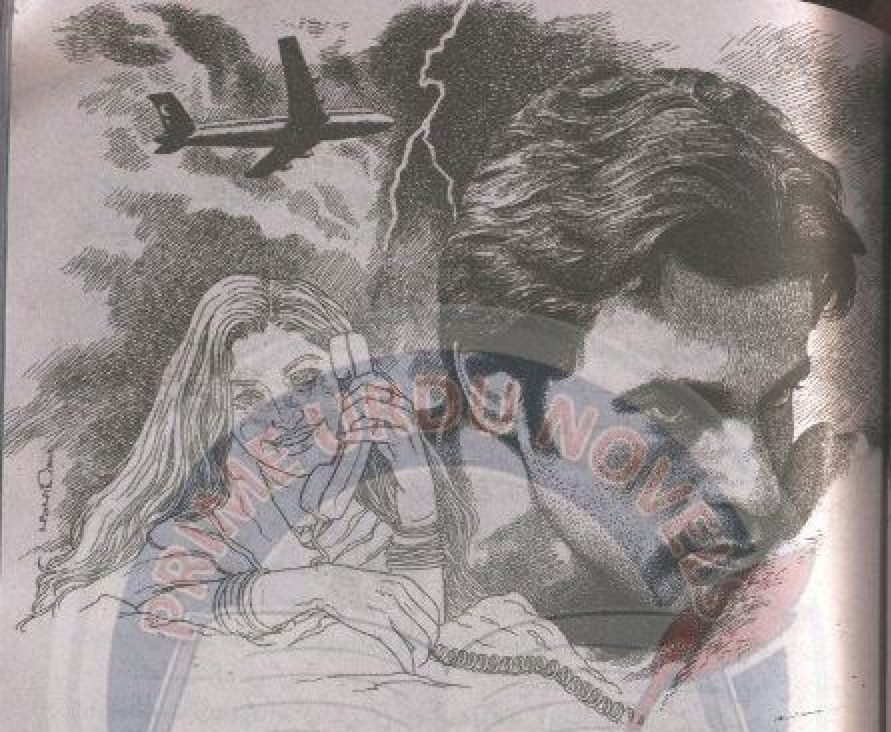
☼ ☼ ☼

گرینڈ حیات ہوٹل کا ہال روم اس وقت نیشنل اسپیلنگ بی کے 93 ویں مقابلے کے فائنلسٹ کا پہلا راؤنڈ منعقد کروانے کے لیے تیار تھا۔ حمین سکندر اپنے ٹائٹل کا دفاع کر رہا تھا اور رئیسہ سالار اس مقابلے میں پہلی بار حصہ لے رہی تھی۔ وہ سالار سکندر کے گھر میں چیمپئن شپ لانے کے لیے پرجوش تھی اور صرف وہی تھی جو پرجوش تھی۔ گھر کے باقی افراد فکر مند تھے اور اس پریشانی کی وجوہات دو تھیں۔ اگر وہ نہ جیت سکی تو؟ اور اگر حمین سکندر جیت گیا تو؟

رئیسہ اس وقت اسٹیج پر اپنے پہلے لفظ کے بولے جانے کے انتظار میں تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)





کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6- اسپیلنگ بی کے بارے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دی۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آ جاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی بہن سات سالہ بس مسکرا دی۔

A- وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7- وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

A- وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

انیسویں قسط

”ابدا“ ابدا

رئیسہ نے پوچھا جانے والا لفظ بے حد غور سے سنا تھا۔ وہ لفظ غیر مانوس نہیں تھا۔ وہ ان ہی الفاظ میں شامل تھا جس کی اس نے تیاری کی تھی۔ ”Crustacoology“ اس نے زیرِ لب اس لفظ کو دہرایا‘ پھر بنا آواز اس کے ہجے کیے اور پھر بالآخر اس نے اس لفظ کو ہجے کرنا شروع کیا تھا۔

”C-r-u-s-t-a-c-o-l-o-g-y“ رئیسہ نے بے یقینی کے عالم میں اس گھنٹی کو سنا تھا جو لفظ غلط ہونے پر بجی تھی۔ اس کا رنگ فق ہوا‘ لیکن اس سے زیادہ وہ فائنلسٹ میں شامل حمین سکندر کا‘ جسے اس کے بولنے کے دوران ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے کیا غلطی کی تھی۔ ہال میں امامہ اور سالار جبریل اور عنایہ کے ساتھ عجیب سی کیفیت میں بیٹھے تھے۔ یہ غیر متوقع نہیں تھا وہ اس کی توقع بہت پہلے سے کر رہے تھے۔

رئیسہ کا فائنل راؤنڈ تک پہنچنا بھی ان کے لیے ناقابلِ یقین ہی تھا۔ اس نے اپنی صلاحیتوں سے بڑھ کر پرفارمنس دکھائی تھی۔ لیکن کسی بھی مرحلے پر اس کے باہر ہونے کا خدشہ دل میں لے کر بیٹھے رہنے کے باوجود اب جب ان کے خدشات حقیقت کا روپ دھار رہے تھے تو انہیں تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ ابھی مقابلے سے باہر نہیں ہوئی تھی۔ واپس آسکتی تھی مگر وہ پہلا موقع تھا جو رئیسہ نے سید ھا منہ پر کھایا تھا اور اب اس کے اثرات سے باہر نکلنے کے لیے اسے کچھ وقت چاہیے تھا۔

حمین اس سے کچھ کرسیوں کے فاصلے پر تھا۔ ان دونوں کے درمیان کچھ اور فائنلسٹس تھے‘ لیکن اس کے باوجود اس نے اٹھ کر رئیسہ کی کرسی پر آکر اس کا کندھا تھپکا تھا۔ اسے چیئر اپ کرنے کی کوشش کی تھی۔

”مجھے اسپیلنگ آتی تھی۔“ رئیسہ نے بے حد مدھم اور بے حد کمزور آواز میں جیسے حمین پر واضح کیا تھا اور ایک جملے سے زیادہ وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ اسے پتا تھا۔ کسی وضاحت کا فائدہ نہیں تھا۔ وہ جب واپس آکر بیٹھی تو اس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ دوسرے فائنلسٹس کے ساتھ بیٹھے اپنے ماں باپ اور بہن بھائی کو نظر اٹھا کر دیکھ سکتی۔ یہ احساس رکھنے کے باوجود کہ وہ بیک وقت اسے ہی دیکھ رہے ہوں گے۔

”یہ ایک کھیل ہے رئیسہ اور اسے کھیل کی اسپرٹ کی طرح لینا ہے۔“ مقابلے سے ایک دن پہلے سالار نے اسے سمجھایا تھا۔

وہ جیسے ذہنی طور پر اسے ”ڈرنے“ کے لیے نہیں ”ڈٹ کر اٹھنے“ کے لیے تیار کر رہا تھا۔ رئیسہ نے ہمیشہ کی طرح بے حد توجہ سے باپ کی بات سنی تھی۔ لیکن جو بھی تھا وہ ”آٹھ سال کی بچی“ تھی‘ جس کے تین بہن بھائی وہ ٹرافی جیت چکے تھے جیسے جیتنے کے لیے وہ اب کوشش کر رہی تھی۔ اسے توقع تھی کہ وہ بھی ”جیت“ جائے گی۔

آٹھ سال کی عمر میں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہار اور جیت ہوتی کیوں ہے۔ وہ جبریل‘ عنایہ اور حمین نہیں تھی کہ غیر معمولی ذہانت رکھتی اور غیر معمولی انداز میں صورتِ حال کا تجزیہ کر لیتی‘ وہ عام بچوں کی طرح تھی اور اسے لگتا تھا اگر دوسرے آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتے ہیں تو وہ بھی لا سکتی ہے۔ اسے ”اپنا“ اور ”دوسروں“ کا فرق سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

حمین سکندر اب اسٹیج پر اپنے پہلے لفظ کے لیے کھڑا تھا اور اس کا استقبال تالیوں کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ اگر پچھلے سال کا ڈارلنگ آف دا کراوڈ تھا تو اس سال بھی وہ ہاٹ فیورٹ کے طور پر مقابلے میں کھڑا تھا۔ پچھلے سارے راؤنڈز میں اس نے مشکل ترین الفاظ کو حلوے کی طرح بوجھا تھا اور اس سے ایسی ہی توقع اس راؤنڈ میں بھی کی جا رہی تھی۔ وہ پچھلے سال کا چیمپئن تھا۔ اپنے ٹائٹل کا دفاع کر رہا تھا اور فائنلسٹس کی نظروں میں اس کے لیے احترام نہیں مرعوبیت تھی۔

"vignette" اس کا لفظ بولا جا رہا تھا۔ وہ حمین سکندر کے لیے ایک اور "حلوہ" تھا۔ وہ اس سے زیادہ مشکل اور لمبے الفاظ کے ہجے کر چکا تھا۔ رئیسہ نے بھی زیر لب کئی دوسرے فائنلسٹس کی طرح وہ لفظ ہجوں کی طرح درست طور پر ادا کیا۔

"v-i-g-n-e-t-t-e" رئیسہ نے اسٹیج پر کھڑے حمین کو رکتے دیکھا۔ اس کا خیال تھا وہ آخری حرف سے پہلے سوچنے کے لیے رکا تھا اور یہ صرف اسی کا نہیں پینل کا بھی خیال تھا جو فائنلسٹس کے لیے الفاظ بول رہے تھے۔ سب جیسے اسے سوچنے کے لیے ٹائم دے رہے تھے۔ حمین نے ایک لمحہ رکنے کے بعد اس لفظ کو ان اسپیلنگ کے ساتھ اسی طرح ادا کیا۔ بیل بجی۔ ہال میں پہلے سکتہ ہوا پھر سرگوشیاں ابھریں۔ پھر پروناؤنسر نے صحیح اسپیلنگ ادا کیے۔ حمین نے سر جھکا کر جیسے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اپنی کرسی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

وہ اس مقابلے کا پہلا اپ سیٹ تھا۔ پچھلے سال کا چیمپئن اپنے پہلے ہی لفظ کے ہجے کرنے میں ناکام رہا تھا۔

ہال میں بیٹھے سالار، امامہ، جبریل اور عنایہ بیک وقت اطمینان اور پریشانی کی ایک عجیب کیفیت سے گزرے تھے۔ وہ ایک ہی راؤنڈ میں رئیسہ کی ناکامی دیکھ کر حمین کی کامیابی پر تالیاں نہیں بجانا چاہتے تھے اور انہیں یہ بجانی بھی نہیں پڑی تھیں۔ لیکن حمین سے لفظ نہ بوجھا غیر متوقع تھا۔ غیر متوقع سے زیادہ یہ صورت حال ان کے لیے غیر یقینی تھی لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا۔ اس دن انہیں وہاں بیٹھے مقابلے کے آخر تک اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

رئیسہ اگلے دو لفظ بھی نہیں بوجھ سکی تھی اور حمین سکندر بھی... وہ دونوں فائنل مقابلے کے ابتدائی مرحلے میں ہی مقابلے سے آؤٹ ہو گئے تھے۔

رئیسہ کی یہ پرفارمنس غیر متوقع نہیں تھی، لیکن حمین سکندر کی ایسی پرفارمنس اس رات ایک بریکنگ نیوز تھی۔ پچھلے سال کا چیمپئن مقابلے سے آؤٹ ہو گیا تھا اور حمین سکندر کے چہرے کا اطمینان ویسے کا ویسا تھا۔ یوں جیسے اسے فرق ہی نہیں پڑا ہو۔ رئیسہ کے پیچھے پیچھے وہ بھی مقابلے سے باہر ہونے کے بعد اپنے ماں باپ کے پاس آکر بیٹھ گئے تھے۔

دونوں نے ان دونوں کو تھپکا تھا۔ تسلی دی تھی۔ یہی کام جبریل اور عنایہ نے بھی کیا تھا۔

"بہت اچھے۔" انہوں نے اپنے چھوٹے بہن بھائی کا حوصلہ بڑھایا تھا۔

ان دونوں نے خود پچھلے سال کے بعد دوبارہ "اسپیلنگ بی" کے مقابلے میں حصہ لے کر اپنا ٹائٹل ڈیفنڈ نہیں کیا تھا۔ اس لیے آج ٹائٹل کھونے کی کیفیت سے نہ گزرنے کے باوجود وہ اسے تسلی دے رہے تھے۔

رئیسہ یک دم ہی جیسے بیک گراؤنڈ میں چلی گئی تھی۔ وہ خاموشی سے یہ سب کچھ بیٹھی دیکھتی رہی تھی۔

ان لوگوں نے اس سال کے نئے چیمپئن کو بھی دیکھا تھا اور ان انعامات کے ڈھیر کو بھی جو اس سال اس پر نچھاور کیے جا رہے تھے اور پچھلے سال وہ حمین سکندر گھر لایا تھا۔ رئیسہ کا غم جیسے کچھ اور بڑھا تھا۔ وہ سالار سکندر کے خاندان کا نام روشن نہیں کر سکی تھی۔ جیسے اس کے بڑے بہن بھائی کرتے تھے... وہ ان جیسی نہیں تھی... وہ پہلا موقع تھا جب رئیسہ کو احساس کمتری ہوا تھا اور شدید قسم کا... آٹھ سال کی عمر میں بھی وہ یہ جانتی تھی کہ وہ لے پالک تھی۔ سالار سکندر کے ایک دوست اور اس کی بیوی کے ایک حادثے میں مارے جانے کے بعد سالار اور امامہ نے اسے گود لیا تھا۔ یہ وہ بیک گراؤنڈ تھا جو رئیسہ سالار کو دیا گیا تھا اور اس چیز نے اسے کبھی پریشان نہیں کیا تھا نہ ان سوالوں پر اس نے غور کیا تھا۔ وہ ایک ایسے ملک اور معاشرے میں پرورش پا رہی تھی جہاں اس کے اسکول میں ہر تیسرا چوتھا بچہ اڈاپٹڈ ہوتا تھا یا سنگل پیرنٹ کی اولاد ہوتا تھا۔ معاشرہ اسے کمپلیکس میں مبتلا نہیں

کر سکتا تھا اور گھر میں غیریت کا احساس اسے کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔

مگر وہ پہلا موقع تھا جب رئیسہ نے اپنے آپ کو ان سب سے کمتر سمجھا تھا۔ وہ سب اس سے بہتر شکل و صورت کے تھے، اس سے بہترین ذہنی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ کسی بھی طرح ان کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتی تھی لیکن وہ ان کی طرح دنیا کے ساتھ بھی مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

ان کے گھر میں لانے والی ٹرافیز، میڈلز، سرٹیفکیٹ اور نیک نامی میں اس کا بہت تھوڑا حصہ تھا۔ یہ اسے پہلے بھی محسوس ہوتا تھا، لیکن آج وہ پہلی بار اس پر رنجیدہ ہوئی تھی اور اس رنجیدگی میں اس نے حمین سکندر کی ناکامی کے بارے میں غور نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اس نے گاڑی میں ہونے والی گفتگو پر غور کیا تھا۔ جو واپس گھر جاتے ہوئے ہو رہی تھی۔

"تم اداس ہو؟" یہ حمین کی سرگوشی تھی جو اس نے گاڑی میں سب کی ہونے والی گفتگو کے درمیان رئیسہ کے کان میں کی تھی۔

"نہیں۔" رئیسہ نے اسی انداز میں جواب دیا۔

"مجھے پتا ہے تم اداس ہو۔" حمین نے ایک اور سرگوشی کی۔ رئیسہ کو پتا تھا وہ اس کے جھوٹ کو سچ نہیں مانے گا۔

"تم نیکسٹ ایئر جیت سکتی ہو۔" اس نے جیسے رئیسہ کو ایک آس دلائی۔

"مجھے پتا ہے، لیکن اگلا سال بہت دور ہے۔" اس نے مدھم آواز میں کہا۔

حمین نے اس کی کمر میں گدگدی کرنے کی کوشش کی۔ وہ سکڑ کر پیچھے ہٹی۔ اسے ہنسی نہیں آئی تھی اور وہ ہنسنا چاہتی بھی نہیں تھی۔

"میں بھی تو ہارا ہوں۔" حمین کو اس کے موڈ کا اندازہ ہو گیا تھا۔

"تم جیتے بھی تو تھے نا۔" اس نے جواباً کہا۔ چند لمحوں کے لیے حمین سے جیسے کوئی جواب نہیں بن پڑا، پھر اس نے کہا۔

"وہ تو یونہی تکا لگ گیا تھا۔" اس نے جیسے اپنا ہی مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

رئیسہ جواب دینے کے بجائے گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ یہ جیسے اعلان تھا کہ وہ اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتی۔

☼ ☼ ☼

ایرک ان کے گھر کے باہر ٹہل رہا تھا۔ جب وہ لوگ واپس گھر پہنچے تھے۔ گاڑی سے باہر نکلتے ہی جبریل نے اس سے کہا تھا۔

"ایرک! تمہیں اس وقت یہاں نہیں ہونا چاہیے۔" رات واقعی خاصی ڈھل چکی تھی۔

"مجھے نیند نہیں آرہی تھی اور پھر میں حمین سے افسوس بھی کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ تسلی دلوانے کے لیے۔" ایرک نے جبریل کی بات کے جواب میں کہا۔

"آپ نے ہی تو کہا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا چاہیے اور ہمدردی کرنی چاہیے۔" اس نے جیسے جبریل کو وضاحت دی۔ حمین جیسے اپنی آنکھیں گھما کر رہ گیا تھا۔

"اب اس میں ہمدردی والی کیا بات ہے۔ اٹس اوکے۔" اس نے ایرک سے کہا جو اس سے ہاتھ ملا کر اسے تھپک رہا تھا۔

"تم نے بہت اچھا کھیلا رئیسہ!" اریک نے رئیسہ سے کہا۔ اس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ رئیسہ کے چہرے پر جیسے ایک اور رنگ آکر گزرا تھا۔
"ویسے وہ لفظ بہت آسان تھے جو تمہیں اسپیل کرنے تھے۔ میں حیران ہوں تمہیں کیسے وہ لفظ نہیں آئے۔"
رئیسہ سے رسمی سے جملوں کے تبادلے کے بعد اریک ایک بار پھر حمین سے مخاطب ہوا تھا۔
باقی سب لوگ گھر کے اندر جاچکے تھے۔ صرف وہ' حمین اور رئیسہ ہی باہر تھے۔
"اگلی بار تم اسپیلنگ بی میں حصہ لے لینا۔ اگر تمہیں وہ لفظ اتنے ہی آسان لگے ہیں تو۔" حمین نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔
اریک نے یقیناً" ٹی وی پر لائیو کوریج دیکھی تھی۔
"یہ برا آئیڈیا نہیں ہے۔" اریک نے اندر جاتے ہوئے حمین اور رئیسہ کے عقب میں چڑانے والے انداز میں کہا۔ حمین اور اس کے درمیان اکثر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔
"بیسٹ آف لک" حمین نے بھی دروازہ کھول کر اندر جانے سے پہلے لحظہ بھر کے لیے پلٹ کر کہا۔
یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اریک کو جواب دیے بغیر چلا جاتا۔



"رئیسہ بہت اپ سیٹ ہے۔" اس رات سالار نے امامہ سے سونے سے پہلے کہا تھا۔
"میں جانتی ہوں اور میں اسی لیے نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس مقابلے میں حصہ لیتی جن میں وہ تینوں ٹرافیز جیت چکے تھے۔ لیکن تم نے منع نہیں کیا اسے۔" امامہ نے جواباً" اس سے کہا۔
"میں کیسے اسے منع کرتا؟ یہ کہتا کہ تم نہیں جیت سکتیں' اس لیے مت حصہ لو اور پھر وہ فائنل راؤنڈ تک پہنچی۔ بہت اچھا کھیلی ہے۔ یہ زیادہ اہم چیز ہے۔" سالار نے اپنے ہاتھ سے گھڑی اتارتے ہوئے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ دی۔
"وہ بہت سمجھدار ہے' ایک دو دن تک ٹھیک ہو جائے گی جب میں اسے سمجھاؤں گی کہ حمین بھی تو ہارا ہے' لیکن اسے پروا تک نہیں۔ اسے اپنے سے زیادہ فکر رئیسہ ہی کی تھی۔" امامہ نے کہا' وہ ایک کتاب کے چند آخری رہ جانے والے صفحے پلٹ رہی تھی۔
"اسے فکر کیوں ہو گی؟ وہ تو اپنی مرضی سے ہارا ہے۔" سالار نے بے حد اطمینان سے کہا۔
صفحے پلٹتی امامہ ٹھٹک گئی۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"
سالار نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔ "تمہیں اندازہ نہیں ہوا؟"
"کس بات کا؟ کہ وہ جان بوجھ کر ہارا ہے؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔" امامہ نے خود سوال پوچھا خود جواب دیا' پھر خود جواب کی تردید کی۔
"تم پوچھ لینا اس سے کہ ایسا ہو سکتا ہے یا نہیں۔" سالار نے بحث کیے بغیر اس سے کہا' وہ اب سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ امامہ ہکا بکا اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر جیسے اس نے جھلا کر کہا۔
"تم باپ بیٹا عجیب ہو۔ بلکہ عجیب ایک مہذب لفظ ہے۔"
"تم جبریل کو مائنس کیوں کر جاتی ہو ہر بار؟" سالار نے اسے چھیڑا۔
"شکر ہے وہ حمین اور تمہاری طرح نہیں ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا' حمین۔ وہ کیوں اس طرح کرے گا۔" وہ اب بھی الجھی ہوئی تھی۔

"پوچھ لینا اس سے کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے' یہ کوئی فلاسفی کا سوال تو نہیں ہے کہ جواب نہیں مل سکتا۔" سالار نے اب بھی اطمینان سے ہی کہا تھا۔
"جب تم نے یہ راز کھول دیا ہے تو یہ بھی بتا دو کہ کیوں کیا ہے اس نے یہ سب۔؟" امامہ کریدے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔
"رئیسہ کے لیے۔" سالار نے جواباً اس سے کہا تھا۔
"اور مجھے اس پر فخر ہے" اس نے آنکھیں بند کر کے کروٹ لی اور سائیڈ ٹیبل لیمپ آف کر دیا۔
وہ اندھیرے میں اس کی پشت کو گھور کر رہ گئی تھی۔
وہ غلط نہیں کہتی تھی' وہ دونوں باپ بیٹا ہی عجیب تھے' بلکہ عجیب ایک مہذب لفظ تھا ان کے لیے۔

☆☆☆

"رئیسہ تم سو کیوں نہیں رہی؟" عنایہ نے اسے ایک کتاب کھولے اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھے دیکھ کر پوچھا تھا۔
"میں وہ الفاظ دیکھنا چاہتی ہوں اور یاد کرنا چاہتی ہوں جو مجھے نہیں آتے" اس نے مڑے بغیر عنایہ کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ عنایہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔
انہیں ابھی گھر واپس آئے ایک گھنٹہ ہی ہوا ہوگا اور وہ ایک بار پھر سے کتاب لے کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ عنایہ کے کمرے میں ہی سوتی تھی اور جبریل کے گھر سے جانے کے بعد اسٹڈیز میں ہیلپ کی بنیادی ذمہ داری اب عنایہ پر ہی آگئی تھی۔
"تم نے پہلے ہی بہت محنت کی ہے رئیسہ! یہ صرف تمہاری بدقسمتی تھی۔" عنایہ کو اندازہ نہیں ہوا وہ اسے تسلی دینے کے لیے جن الفاظ کا انتخاب کر رہی تھی وہ بڑے غلط تھے۔ وہ الفاظ رئیسہ کے دماغ میں جیسے کھب گئے تھے۔
"اب سو جاؤ۔ There's always a next time" عنایہ نے کسی بڑے کی طرح اس کی پشت کو تھپکا تھا۔
"میں نہیں سو سکتی" مدھم آواز میں رئیسہ نے جیسے عنایہ سے کہا۔ وہ ابھی تک ویسے ہی بیٹھی تھی عنایہ کی طرف پشت کیے۔ کتاب اسٹڈی ٹیبل پر کھول کر نکائے' جہاں ایک صفحے پر وہ لفظ چمک رہا تھا جس کے ہجے نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ مقابلے سے آؤٹ ہوئی تھی۔
عنایہ کو یوں لگا جیسے رئیسہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اسے لگا اسے غلط فہمی ہوئی ہے' لیکن وہ غلط فہمی نہیں تھی۔ رئیسہ نے کتاب بند کر کے ٹیبل پر رکھی اور پھر وہاں سے اٹھ کر وہ بستر پر آئی اور اوندھے منہ لیٹ کر اس نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔
"رئیسہ! رئیسہ پلیز۔" عنایہ خود بھی روہانسی ہو گئی تھی۔ رئیسہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونے والی بچی نہیں تھی اور وہ مقابلے میں ہارنے کے بعد اسٹیج سے ہٹنے پر بھی دوسروں کی طرح نہیں روئی تھی۔ پھر اب اس وقت۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ رئیسہ اپنے بدقسمت ہونے پر رو رہی تھی۔

"تم کیا کر رہے ہو اس وقت؟" امامہ لاؤنج میں ہونے والی کھڑکھڑاہٹوں کو سن کر رات کے اس وقت باہر نکل آئی تھی۔ وہ اس وقت تہجد کے لیے اٹھی تھی۔
جبریل اس ویک اینڈ پر گھر آیا ہوا تھا اور کئی بار وہ بھی رات کے اس پہر پڑھنے کے لیے جاگتا اور پھر کچھ نہ کچھ

کھانے کے لیے کچن جاتا۔ مگر اس بار اس کا سامنا حمین سے ہوا تھا۔ وہ کچن کاؤنٹر کے سامنے پڑے ایک اسٹول پر بیٹھا سلیپنگ سوٹ میں ملبوس آئس کریم کا ایک لیٹر والا کین کھولے اسی میں سے آئس کریم کھا رہا تھا۔

امامہ کو سوال کرنے کے ساتھ ہی جواب مل گیا تھا اور اس نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بے حد خفگی کے عالم میں کاؤنٹر کے سامنے آتے ہوئے اس سے کہا۔

"حمین! یہ وقت ہے آئس کریم کھانے کا اور وہ بھی اس طرح۔" اس کا اشارہ اس کے کین کے اندر ہی آئس کریم کھانے کی طرف تھا۔

"میں نے صرف ایک سکوپ کھائی تھی۔" وہ ماں کے یک دم نمودار ہونے اور اپنے اس طرح پکڑے جانے پر گڑبڑایا تھا۔

"لیکن یہ کھانے کا کوئی وقت نہیں ہے۔" امامہ نے اس کے ہاتھ سے چمچہ لیا اور ڈھکن سے کین بند کرنے لگی۔

"ممی تو واقعی ایک چمچہ ہی کھائی ہے میں نے۔" وہ بے اختیار کراہا۔

"دانت صاف کرکے سوؤ۔" امامہ نے اس کے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے کین کو واپس فریزر میں رکھ دیا۔

حمین جیسے احتجاجاً اسی انداز میں اسٹول پر بیٹھا رہا۔

"ایک تو میں آج ہارا اور میں نے اپنا ٹائٹل کھو دیا۔ دوسرا آپ مجھے آئس کریم کے دو اسکوپس تک نہیں لینے دے رہیں۔" اس نے جیسے ماں سے احتجاجاً کہا۔

وہ چند لمحوں کے لیے کاؤنٹر کے دوسری طرف کھڑی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"ٹائٹل تم نے اپنی مرضی سے کھویا ہے، تمہاری اپنی چوائس تھی یہ۔" حمین کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ ماں کو دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

"آپ کو کس نے بتایا یہ؟"

"تمہارے لیے یہ جاننا ضروری نہیں۔" امامہ نے کہا۔

"آل رائٹ مجھے پتا ہے۔" اس نے ماں سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"کس نے؟" امامہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

"بابا نے۔" اس کا جواب کھٹاک سے آیا تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کو ہاتھ کی پشت کی طرح جانتے تھے۔

"بہت غلط کام تھا۔ تمہیں یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔" امامہ نے جیسے اسے ملامت کرنے کی کوشش کی۔ "تم نے یہ کیوں کیا؟"

"آپ جانتی ہیں ممی۔" وہ اسٹول سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"رئیسہ کے لیے؟" امامہ نے وہ جواب دیا جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔

"فیملی کے لیے۔" جواب کھٹاک سے آیا تھا۔ "آپ نے سکھایا تھا اپنے بہن بھائیوں سے مقابلہ نہیں ہوتا۔ میں جیت جاتا تو اسے برا کر ہی جیتتا نا۔ اسے بہت دکھ ہوتا۔" امامہ بول نہیں سکی۔

وہ دس سال کا تھا، لیکن بعض دفعہ وہ سو سال کی عمر والوں جیسی باتیں کرتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس سے کیا کہتی۔ ڈانٹتی؟ داد دیتی؟ نصیحت کرتی؟ حمین سکندر لاجواب نہیں کرتا تھا، بے بس کر دیتا تھا۔

"گڈ نائٹ۔" وہ اب وہاں سے چلا گیا تھا۔ امامہ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

اس کے گھنے سیاہ بالوں میں بندھا ہوا ربن تھوڑا ڈھیلا تھا' جو اس کے کندھوں سے کچھ نیچے جانے والے بالوں کو گدی سے لے کر سر کے بالکل درمیان تک باندھے ہوئے تھا' لیکن ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ ماتھے پر آنے والے بالوں کو روکنے کے لیے رنگ برنگی ننھی پنز سے اس کا سر بھرا ہوا تھا' یہ عنایہ کا کارنامہ تھا۔

رئیسہ کو پنز پسند تھے۔ سالار کو یاد بھی نہیں تھا وہ اس کے لیے کتنے پنز خرید چکا تھا' لیکن ہر روز نہ بدلے جانے والے کپڑوں کے ساتھ میچنگ پنز دیکھ کر اسے اندازہ ہوتا تھا کہ رئیسہ اس معاملے میں خود کفیل تھی۔

سالار نے اس کے بالوں کے ربن کی گرہ ٹھیک کی اور ہاتھ سے اس کے بالوں کو سنوارا۔

"عنایہ نے مجھے بتایا تم اپ سیٹ ہو۔" سالار نے بلا تمہید بات کا آغاز کیا۔

وہ یک دم نادم ہوئی۔ "نہیں۔۔۔ نہیں تو۔" اس نے گڑبڑا کر سالار سے کہا۔

سالار اسے دیکھتا رہا' رئیسہ نے کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کی' پھر نظریں چرالیں' پھر جیسے کچھ مدافعانہ انداز میں ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں اپ سیٹ نہیں' یہ تو چھوٹی سی بات ہے۔" اس نے اب سر جھکا لیا تھا۔

"پھر اپ سیٹ کیوں ہو؟" سالار نے جواباً پوچھا۔

"کیونکہ میں بد قسمت ہوں۔" اس نے بے حد ہلکی آواز میں کہا۔

سالار بول ہی نہ سکا' اسے اس سے اس جملے کی توقع نہیں تھی۔

"کیا تمہیں لگتے ہو رئیسہ!"

سالار سیدھا بیٹھے بیٹھے آگے کو جھک آیا۔ وہ اب کہنیاں اپنے گھٹنوں پر ٹکائے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔

اس کے ہاتھوں پر آنسوؤں کے قطرے گرے تھے۔ وہ سر جھکائے باپ کے سامنے بیٹھی اب رو رہی تھی۔ اس کے گلاسز دھندلا گئے تھے۔ سالار کو تکلیف ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا۔ اس نے رئیسہ کو اس طرح روتے دیکھا تھا۔ عنایہ بات بات پر رو پڑنے والی تھی' رئیسہ نہیں۔

"میں ہوں۔" وہ ہچکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔

"نہیں' تم بد قسمت نہیں ہو۔" سالار نے اس کے گلاسز اتارتے ہوئے انہیں میز پر رکھا اور رئیسہ کو اٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔

وہ باپ کی گردن میں بازو ڈالے اس کے ساتھ لپٹی ہوئی رو رہی تھی' جیسے وہ اسپیلنگ بی آج ہی ہاری تھی۔ سالار کچھ کہے بغیر تسلی کرنے والے انداز میں اسے تھپکتا رہا۔

"میں نے آپ کو شرمندہ کیا بابا!" ہچکیوں کے درمیان اس نے رئیسہ کو کہتے سنا۔

"بالکل بھی نہیں رئیسہ۔۔۔ مجھے تم پر فخر ہے۔" سالار نے کہا۔

امامہ بالکل اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آئی تھی اور وہیں ٹھٹک گئی تھی۔ سالار نے ہونٹوں پر انگلی کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کا کہا تھا۔

"میں نے اتنی محنت کی تھی' لیکن میں کبھی حمین' جبریل بھائی اور عنایہ آپی کی طرح کچھ بھی جیت نہیں سکتی' کیونکہ میں لکی نہیں ہوں۔" وہ اس کے سینے میں منہ چھپائے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔

سالار کی طرح امامہ کو بھی عجیب تکلیف ہوئی تھی اس کی اس بات سے۔ وہ صوفے پر آکر سالار کے برابر بیٹھ گئی تھی۔ کافی کا وہ مگ اس نے ٹیبل پر رکھ دیا جو وہ سالار کو دینے آئی تھی۔

یہ سالار نہیں تھا' امامہ تھی۔ جس نے رئیسہ پر جان ماری تھی۔۔۔ اسے بولنا اور درست بولنا سکھانے

کے لیے۔ اسے پڑھنا لکھنا سکھانے کے لیے۔

سالار نے اسے صرف۔ گود لیا تھا۔ امامہ نے اس کی زندگی بدل دی تھی اور اس کا خیال تھا اب سب کچھ ٹھیک تھا۔ لیکن وہ فرق جو وہ اپنے آپ میں اور ان تینوں میں دیکھ رہی تھی اس نے ان دونوں کو ہی پریشان کیا تھا۔

وہ رونے دھونے کے بعد اب خاموش ہو گئی تھی۔ سالار نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"اب بس۔" رئیسہ نے گیلے چہرے کے ساتھ سر ہلایا۔

اس کے بال ایک بار پھر بے ترتیب تھے۔ ربن ایک بار پھر ڈھیلا ہو چکا تھا۔ سالار سے الگ ہوتے ہوئے اس نے امامہ کو دیکھا تھا اور جیسے کچھ اور نادم ہوئی۔ سالار نے اسے ایک بار پھر ٹیبل پر بٹھا دیا۔

"تمہیں کیوں لگتا ہے وہ تینوں لکی ہیں اور تم نہیں؟" سالار نے اسے بٹھانے کے بعد اس کے گلاسز اٹھا کر ٹشو سے ان کے گیلے شیشے رگڑتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کیونکہ وہ جس چیز میں حصہ لیتے ہیں جیت جاتے ہیں، میں نہیں جیتتی۔" وہ ایک بار پھر رنجیدہ ہوئی۔ "ایگزامز میں مجھ سے زیادہ اچھے گریڈز لیتے ہیں۔ میں کبھی اے پلس نہیں لے سکتی۔ میں کوئی بھی ایسا کام نہیں کر سکتی جو وہ نہیں کر سکتے لیکن وہ بہت سے ایسے کام کر سکتے ہیں جو میں نہیں کر سکتی۔" آٹھ سال کی وہ بچی اوسط درجے کی ذہانت رکھتی تھی لیکن اس کا تجزیہ بہت عمدہ تھا۔

"دنیا میں صرف ہر مقابلہ جیتنے والے لکی نہیں ہوتے۔ سب کچھ کر پانے والے لکی نہیں ہوتے۔ لکی وہ ہوتے ہیں جنہیں یہ پتا چل جائے کہ وہ کس کام میں اچھے ہو سکتے ہیں اور پھر وہ اس کام میں کوشش کریں اور فالتو کاموں میں اپنی انرجی ضائع نہ کریں۔" وہ اب اسے سمجھا رہا تھا۔ رئیسہ کے آنسو تھم چکے تھے۔ وہ اب باپ کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"تم نے بہت اچھی کوشش کی لیکن بس تم اسپیلنگ بی میں اتنا ہی اچھا پرفارم کر سکتی تھیں۔ وہاں کچھ بچے ایسے ہوں گے جو تم سے زیادہ اچھے تھے اور انہوں نے تمہیں ہرا دیا۔ لیکن ان درجنوں بچوں کا سوچو جنہیں تم ہرا کر فائنل راؤنڈ میں پہنچی تھیں۔ کیا وہ بھی بدقسمت ہیں۔ وہ کیا یہ سوچ لیں کہ وہ ہمیشہ ہاریں گے؟" سالار اس سے پوچھ رہا تھا۔ رئیسہ نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔

"حمین، جبریل اور عنایہ کبھی اسپورٹس میں اتنے نمایاں نہیں رہے جتنے بہت سے دوسرے بچے ہیں۔ اس لیے مت سوچو وہ سب کر سکتے ہیں۔" اس بار امامہ نے اسے سمجھایا۔ رئیسہ نے سر ہلایا۔ بات ٹھیک تھی۔ وہ اسپورٹس میں اچھے تھے لیکن وہ اسپورٹس میں اپنے اسکول کے سب سے نمایاں اسٹوڈنٹس نہیں تھے۔

"تمہیں اب یہ دیکھنا ہے کہ تم کس چیز میں بہت اچھا کر سکتی ہو اور پھر تمہیں اسی چیز میں دل لگا کر کام کرنا ہے۔ کوئی بھی کام اس لیے نہیں کرنا کہ وہ جبریل، حمین اور عنایہ کر رہے ہیں۔" سالار نے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔

"یہ ضروری نہیں ہوتا کہ صرف اے پلس والا ہی زندگی میں بڑے کام کرے گا۔ بڑا کام اور کامیابی تو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ تم دعا کیا کرو کہ اللہ تم سے بہت بڑے کام کروائے اور تمہیں بہت کامیابی دے۔" رئیسہ نے ان گلاسز کو ٹھیک کیا جو سالار نے اسے لگائے تھے۔

"تم رئیسہ ہو، تم حمین، جبریل اور عنایہ نہیں ہو اور ہاں تم ان سے الگ ہو اور یہی سب سے اچھی چیز ہے۔ الگ ہونا بہت اچھی چیز ہوتا ہے رئیسہ اور زندگی اسپیلنگ بی کا ایک مقابلہ نہیں ہوتا جس میں کچھ الفاظ ہجے کر کے ٹائٹل جیتنے کے بعد ہم خود کو لکی اور نہ جیتنے پر بدقسمت سمجھیں۔" وہ اب اس کے بال ٹھیک کرتے ہوئے اس کا ربن دوبارہ باندھ رہا تھا۔

"زندگی میں الفاظ کے ہجے کرنے کے علاوہ بھی بہت ساری صلاحیتیں چاہئیں۔ ایک دو نہیں۔ اور تمہارے

بہت ساری صلاحیتیں ہیں اور بھی آئیں گی۔ تم ایک اسٹار کی طرح روشن ہو گی جس بھی جگہ جاؤ گی جو بھی روکی۔" رئیسہ کی آنکھیں، چہرہ اور ہونٹ بیک وقت چمکے تھے۔

"اور پتا ہے صحیح معنوں میں لکی کون ہوتا ہے؟ وہ جس کی اچھائی اور اخلاق لوگوں کو اسے یاد رکھنے پر مجبور کر دے اور تم میری بہت اچھی اور بہت اخلاق والی لکی بیٹی ہو۔" وہ اب ٹیبل سے اتر کر باپ کے گلے لگی تھی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ اسے کیا سمجھانا چاہ رہا تھا۔

"ہاں میں ہوں نا۔" اس نے بڑی گرم جوشی سے سالار سے کہا۔ اس سے الگ ہو کر وہ امامہ کے گلے لگی۔ امامہ نے اس کی ہیئر بینڈ نکال کر ایک بار پھر ٹھیک کیں۔

سالار نے کافی کے دو گھونٹ بھرے پھر اسے ادھورا چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ اسے تاخیر ہو رہی تھی۔

"بابا مجھ سے خفا تو نہیں ہوئے نا؟" سالار کے جانے کے بعد رئیسہ نے امامہ سے پوچھا۔

"نہیں خفا نہیں ہوئے، لیکن تمہارے رونے سے ہمارا دل دکھا۔" امامہ نے جواباً کہا۔

"آئی ایم سوری ممی! میں دوبارہ کبھی نہیں روؤں گی۔" اس نے امامہ سے وعدہ کیا۔ امامہ نے اسے تھپکا۔

"تم میری بہادر بیٹی ہو۔ عنایہ آپی کی طرح بات بات پر رونے والی تو نہیں۔" رئیسہ نے پرجوش انداز میں سر ہلا دیا۔

اس کے ماں باپ اسے سب سے زیادہ بہادر اور اخلاق والا سمجھتے تھے اور یہ اسے پتا ہی نہیں تھا۔ یہ بات چیت آٹھ سالہ رئیسہ کے ذہن پر نقش ہو گئی تھی۔

امامہ اور سالار کو دوبارہ کبھی اس کو ایسی کسی بات پر سمجھانا نہیں پڑا تھا۔ اسے اب یہ طے کرنا تھا کہ وہ کس کام میں اچھی تھی۔ کس کام میں آگے بڑھ سکتی تھی۔ اس کے باپ نے اسے کہا تھا۔ خوش قسمت وہ تھا جو یہ بوجھ لیتا اور پھر اپنی انرجی کسی اور چیز میں ضائع کرنے کے بجائے اسی ایک کام میں لگاتا۔ رئیسہ بھی لکی کی اس ہی تعریف پر پورا اترنے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔



حمین سکندر کا انتخاب MIT کے SPLASH پروگرام میں ہو گیا تھا۔ وہ اپنے اسکول سے اس پروگرام کے لیے منتخب ہونے والا پہلا اور واحد بچہ تھا۔ اس پروگرام کے تحت MIT ہر سال غیر معمولی ذہانت کے حامل کچھ بچوں کو دنیا کی اس ممتاز ترین یونیورسٹی میں چند ہفتے گزارنے اور وہاں پڑھانے والے دنیا کے قابل ترین اساتذہ سے سیکھنے کا موقع دیتی۔ یہ بہترین دماغوں کو بے حد کم عمری میں ہی کھوجنے، پرکھنے اور چننے کا MIT کا اپنا ایک عمل تھا۔

امامہ اور سالار کے لیے، حمین سکندر کے اسکول کی طرح یہ بے حد اعزاز کی بات تھی، لیکن اس کے باوجود وہ یہ جاننے پر کہ حمین سکندر کا انتخاب ہو گیا تھا، فکر مند ہوئے تھے۔ وہ جبریل سکندر کو تن تنہا کہیں بھی بھیج سکتے تھے، لیکن حمین کو اکیلے اس عمر میں اتنے ہفتوں کے لیے کہیں بھیجنا ان کے لیے بے حد مشکل فیصلہ تھا۔ خاص طور پر امامہ کے لیے جو اس دس سال کے بچے کو خود سے الگ کر کے اس طرح اکیلے بھیجنے پر بالکل تیار نہیں تھی، لیکن یہ اسکول کا اصرار اور حمین کی ضد تھی جس نے اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ہم ان کی قسمت کو کنٹرول نہیں کر سکتے۔ کل کیا ہونا ہے۔ کس طرح ہونا ہے۔ کوئی چیز ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے تو میں مستقبل کے خوف کی وجہ سے انہیں گھر میں قید نہیں کروں گا کہ دنیا انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔" سالار نے واضح طور پر اس سے کہا تھا۔

"جانے دو... دیکھنے اور کھوجنے دو دنیا کو۔ ہماری تربیت اچھی ہوگی تو کچھ نہیں ہوگا اسے..." اس نے امامہ کو تسلی دی تھی اور وہ بھاری دل سے مان گئی تھی۔

حمین سکندر ساڑھے دس سال کی عمر میں پہلی بار MIT کی دنیا کھوجنے گیا تھا۔ ایک عجیب تجسس اور جوش و خروش کے ساتھ... MIT سے زیادہ اسے اس بات پر ایکسائٹمنٹ ہو رہی تھی کہ وہ کہیں اکیلا جا رہا تھا۔ کسی بڑے کی طرح۔

اسے گھر سے بھیجتے ہوئے ان سب کا خیال تھا۔ وہ وہاں چند دن سے زیادہ نہیں رہ پائے گا۔ ایڈجسٹ نہیں ہوگا۔ ہوم سک ہو جائے گا۔ اور واپس آنے کی ضد کرے گا۔ ان کی توقعات بالکل غلط ثابت ہوئی تھیں۔ ایسا بالکل نہیں ہوا تھا۔ حمین سکندر وقتی طور پر ہی سہی لیکن وہاں جا کر وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ وہ "دنیا" تھی اور "دنیا" نے اس ساڑھے دس سال کے بچے کو پوری طرح فینٹیسی نیٹ (مسائش) کیا تھا۔

اس دنیا میں ذہانت واحد شناختی علامت تھی اور وہ بے حد ذہین تھا۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے وہ اپنے ماں باپ کے لیے یہ خوش خبری بھی لایا تھا کہ وہ SPLASH میں آنے والا دنیا کا ذہین ترین دماغ قرار دیا گیا تھا۔ 150 کی ذہانت رکھنے والے صرف چند بچوں میں سے ایک... جنہوں نے اس پروگرام کو اس شناخت کے ساتھ اٹینڈ کیا تھا اور اپنی صلاحیتوں کے حساب سے ان بچوں میں سرفہرست۔ حمین سکندر کو نہ صرف اس کی ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے سنگل آؤٹ کیا گیا تھا' بلکہ MIT نے اسے ان بچوں میں بھی سرفہرست رکھا تھا جن کی پرورش MIT مستقبل کے ذہین ترین دماغوں کی کھوج کے پروگرام کے تحت کرنا چاہتی تھی۔

اور حمین بے حد خوش تھا۔ اس سب کے اغراض و مقاصد سے پوری طرح باخبر نہ ہونے کے باوجود وہ صرف اس بات پر خوش تھا کہ اسے اب بار بار MIT میں جانے کے مواقع ملنے والے تھے۔ کیوں اس ادارے نے کچھ منتخب بچوں کے لیے ہر سال MIT کے کچھ پروگرامز میں شرکت اوپن کر دی تھی' یہ ان بچوں کی ذہانت کو ایک خراج تحسین اور مراعات تھی۔

"مجھے ہر سال وہاں جانا ہے۔" اس نے گھر آتے ہی کھانے پر ماں باپ کو اطلاع دی تھی' جنہوں نے اس کی بات کو زیادہ توجہ سے نہیں سنا تھا۔ اگر کسی چیز پر سالار سکندر نے غور کیا تھا تو وہ یہ تھی کہ وہ اتنے دن ان سے الگ رہنے کے باوجود بے حد خوش اور مطمئن تھا۔

"نہیں میں نے کسی کو مس نہیں کیا۔ میں نے وہاں بہت انجوائے کیا۔" اس نے اپنی ازلی صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے امامہ کی ایک بات کے جواب میں اعلان کیا تھا اور وہ دونوں اسے دیکھ کر رہ گئے تھے۔

وہ بڑا ہوتا اور ایسی بات کرتا تو وہ زیادہ غور نہ کرتے' لیکن وہ ایک بچہ تھا اور اگر کسی جگہ کے ماحول میں اس قدر مگن ہو گیا تھا کہ اسے اپنی فیملی بھی بھول گئی تھی اور وہ اپنے گھر اور گھر والوں سے مضبوط روابط ہونے کے باوجود انہیں بھول گیا تھا تو یہ کوئی بڑی حوصلہ افزا بات نہیں تھی ان دونوں کے لیے۔

"آپ کو پتا ہے بابا مجھے اگلے سال ڈھیر ساری مراعات ملیں گی' جب میں وہاں جاؤں گا پھر اس سے اگلے سال اس سے بھی زیادہ۔ پھر اس سے اگلے سال اس سے بھی زیادہ۔ پھر اس سے اگلے سال اس سے بھی زیادہ۔" وہ بے حد ایکسائٹمنٹ سے ان دونوں کو بتا رہا تھا۔ یوں جیسے وہ یہ پلان خود ہی کر کے آیا تھا کہ اسے اب وہاں ہر سال جانا تھا۔

"آپ کو پتا ہے میں MIT کے کسی بھی سمر پروگرام کے لیے اپلائی کروں تو مجھے داخل کر لیں گے وہ اور مجھ سے کوئی فیس نہیں لیں گے۔ بلکہ مجھے وہاں سب کچھ فری ملے گا۔" اس کا خیال تھا اس کے ماں باپ اس خبر پر اسی کی طرح ایکسائٹڈ ہو جائیں گے۔ وہ ایکسائٹڈ نہیں ہوئے تھے' وہ سوچ میں پڑ گئے تھے۔

"تو پاپا آپ مجھے ہر سال وہاں بھیجا کریں گے نا؟" اس نے بالآخر سالار سے کہا۔ وہ جیسے آتے ہی جانے کی یقین دہانی چاہتا تھا۔

"اگلا سال بہت دور ہے جبریل۔۔۔ جب اگلا سال آئے گا تو دیکھا جائے گا۔" سالار نے گول مول انداز میں اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن ہمیں پلاننگ تو ابھی سے کرنی چاہیے نا۔" وہ جبریل کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔ وہ پہلی بار کسی کام کو پلان کرنے بات کر رہا تھا۔ یہ اس ننھے ذہن پر MIT کا پہلا اثر تھا۔

"میں نے سوچا ہے میں MIT سے ہی پڑھوں گا۔" اس نے جیسے باپ کو بتایا تھا۔

وہ دونوں اس کی بات سے محظوظ ہوئے۔ وہاں جانے سے پہلے تک وہ تعلیم میں دلچسپی نہ رکھنے کا اعلان کرتا رہتا تھا اور اس کو یقین تھا' دنیا کا بڑا انسان وہ ہوتا ہے۔ جو صرف ہائی اسکول تک پڑھے اور بس۔۔۔ اور وہ چونکہ خود بھی ایک بڑا انسان بننا چاہتا تھا تو وہ بھی صرف ہائی اسکول تک ہی پڑھنا چاہتا تھا۔

"اور اس کے بعد؟" سالار نے اس سے پوچھا۔

"اس کے بعد میں نوبل پرائز جیتوں گا۔" اس نے بے حد اطمینان سے کہا تھا۔ یوں جیسے وہ اسپیلنگ بی کی بات کر رہا ہو۔ وہ دونوں اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئے۔



"آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں پاپا؟" سالار نے بے حد نرمی سے سکندر عثمان سے پوچھا تھا۔

وہ دو گھنٹے سے ان کے پاس بیٹھا باتیں کرنے سے زیادہ ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان کی گفتگو میں اب الزائمر جھلکنے لگا تھا۔ وہ جملوں کے درمیان رک کر کسی لفظ کو یاد نہ آنے پر گڑبڑاتے الجھتے جھنجلاتے۔۔۔ اور بھول جاتے۔۔۔ اور پھر وہ بات کرتے کرتے اٹھ کر کمرے میں ادھر ادھر جاتے ہوئے چیزیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگتے تھے۔ یوں جیسے انہیں کسی چیز کی تلاش تھی۔ سالار نے انہیں بالآخر ٹوک کر پوچھ ہی لیا تھا۔

"یہیں رکھا تھا۔" انہوں نے سالار کی بات کے جواب میں کہا۔ وہ اپنے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل کے پاس کھڑے تھے۔ سالار بہت دور صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا؟" سالار نے کریدا۔

"ایک سگار باکس کامران نے بھیجا تھا' وہی دکھانا چاہتا تھا تمہیں۔" انہوں نے بے حد جوش سے کہا اور ایک بار پھر تلاش شروع کر دی۔

سگار باکس چھوٹی چیز نہیں تھا۔ وہ اس کے باوجود تکیے اٹھا اٹھا کر ڈھونڈ رہے تھے۔ پتا نہیں اس وقت ان کے ذہن میں ڈھونڈنے والی چیز کی کوئی شکل بھی تھی یا نہیں۔ وہ الزائمر کے اس مریض کو پہلی بار اس حالت میں مرض کے اثرات کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ جو اس کا باپ تھا۔

"شاید ملازم نے کہیں رکھا ہے۔ میں اسے بلاتا ہوں۔" انہوں نے بالآخر تھک کے کہا تھا۔ وہ اب واپس سالار کے پاس آکر بیٹھ گئے تھے اور انہوں نے اسے آوازیں دینی شروع کر دیں۔ سالار نے انہیں ٹوکا۔

"پاپا انٹرکام ہے۔ اس کے ذریعے بلائیں۔" سالار نے سائیڈ ٹیبل پر پڑے انٹرکام کا ریسیور اٹھاتے ہوئے باپ سے کہا۔

"اس سے وہ نہیں آتا۔" انہوں نے جواباً کہا اور دوبارہ اسے آوازیں لگانے لگے۔

وہ ایک ہی سانس میں جسے آوازیں دے رہے تھے' ان کے گھر اس وقت وہ ملازم موجود نہیں تھا' وہ چھٹی پر تھا

اور سالار یہ جانتا تھا۔ وہ ان کا پرانا ملازم تھا۔ اسے لگا اسے باپ کی مدد کرنی چاہیے۔ ملازم کو خود بلانا چاہیے۔
"نمبر بتا دیں، میں بلاتا ہوں اسے۔" سالار نے سکندر عثمان کو ایک بار پھر ٹوکا تھا۔
"نمبر نہیں پتا، تمہیں میں فون سے دیتا ہوں تمہیں۔" انہوں نے اس کی بات کے جواب میں کہا تھا اور پھر سے بغیر اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے۔
سالار عجیب کیفیت میں انٹرکام کا ریسیور ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ وہ سیل فون جسے اس کا باپ تلاش کر رہا تھا۔ وہ سامنے میز پر پڑا تھا۔ وہ اس انٹرکام کے نمبر کو اپنے سیل فون کی یادداشت میں ڈھونڈنا چاہتے تھے اور وہ انٹرکام پر اس ملازم کا ایک حرفی نمبر یاد نہیں رکھ پاتے تھے۔ وہ الزائمر کے جن کے ہاتھوں اپنے باپ کو زیر ہوتے دیکھ رہا تھا۔ تکلیف بڑا چھوٹا لفظ تھا اس کیفیت کے لیے۔ جو اس نے محسوس کی تھی۔
وہ بہت عرصے کے بعد امامہ اور بچوں کے ساتھ دو ہفتے کے لیے پاکستان آیا تھا۔ طیبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور سالار اور ان کی ملاقات کئی مہینوں سے نہیں ہوئی تھی اور اب وہ طیبہ کے ہی بے حد اصرار پر بالآخر پاکستان آیا تھا اپنی فیملی کے ساتھ "تو اپنے والدین کی حالت کو دیکھ کر بہت اپ سیٹ ہوا تھا۔ خاص طور پر سکندر عثمان کو دیکھ کر۔
اس نے انہیں ہمیشہ بے حد صحت مند اور چاق و چوبند دیکھا تھا۔ وہ ایک مشین کی طرح کام کرتے رہے تھے ساری زندگی۔ اور کام ان کی زندگی کی سب سے پسندیدہ تفریح تھی اور اب وہ بڑی حد تک گھر تک محدود ہو گئے تھے۔ گھر میں سکندر عثمان اور نوکروں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔
اسلام آباد میں ہی مقیم سالار کا بڑا بھائی اپنی فیملی کے ساتھ اپنے گھر میں رہتا تھا۔ وہ سکندر عثمان اور طیبہ کو اپنے ساتھ رکھنے پر تیار تھا لیکن وہ اس کے بیوی بچے سکندر عثمان کے اس پرانے گھر میں شفٹ ہونے پر تیار نہیں تھے اور طیبہ اور سکندر عثمان اپنا گھر چھوڑ کر بیٹے کے گھر نہیں جانا چاہتے تھے۔ سالار سمیت سکندر کے تینوں بیٹے بیرون ملک تھے۔ بیٹی کراچی۔ وہ گھر جو کسی زمانے میں افراد خانہ کی چہل پہل سے گونجتا تھا اب خالی ہو چکا تھا۔
سالار پہلی بار سکندر عثمان کی بیماری کے انکشاف پر بھی بے حد اپ سیٹ ہوا تھا۔ وہ انکشاف اس پر اس کی سرجری کے کئی مہینوں بعد ہوا تھا اور وہ بھی بے حد اتفاقی انداز میں جب سکندر عثمان اپنے ایک طبی معائنے کے لیے امریکہ گئے تھے اور سالار کو ان کی بیماری کی تفصیلات کا پتہ چلا تھا۔
"آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟" اس نے سکندر عثمان سے شکایت کی تھی۔ انہوں نے جواباً" بے حد لاپروا انداز میں ہنستے ہوئے کہا تھا۔
"کیا بتاتا یار۔ مجھے اپنی بیماری سے زیادہ تمہاری بیماری کا دکھ ہے۔ میں ستر کا ہو چکا ہوں۔ کوئی بیماری ہونی ہو کتنا جیوں گا میں؟ اور اس عمر میں الزائمر کے بغیر بھی یاد نہیں رہتا انسان کو۔" وہ اپنی بیماری کو معمولی بنا کر پیش کرنے کی کوشش کر رہے تھے ایسے جیسے یہ کوئی بات ہی نہیں۔
اور اب وہی بیماری اس کے سامنے اس کے باپ کی یادداشت کو گھن کی طرح کھانے لگی تھی۔ زندگی عجیب شے ہے انسان اس کے طویل ہونے کی دعا بھی کرتا ہے اور اس کی طوالت کے اثرات سے ڈرتا بھی ہے۔ سکندر عثمان ابھی تک سیل فون ڈھونڈ رہے تھے۔ سالار نے فون اٹھا کر باپ کے ہاتھ میں دے دیا۔
"اوہ اچھا۔ ہاں یہ رہا۔" انہوں نے فون ہاتھ میں لیا پھر سوچنے لگے تھے کس لیے لیا تھا۔
"یہ فون کس لیے دیا ہے تم نے؟ میں نے مانگا تھا کیا؟" وہ اب اس سے پوچھ رہے تھے۔ کوئی چیز سالار کے حلق میں گولہ بن کر پھنسی۔

"نہیں... بس میں ویسے ہی آ گیا تھا آپ کو۔" وہ کہتے ہوئے یک دم اٹھ گیا۔ وہ باپ کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا۔

"تم اتنی جلدی جا رہے ہو... کیا اور نہیں بیٹھو گے؟" وہ جیسے مایوس ہوئے تھے۔

"بیٹھوں گا... تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔" وہ ان سے نظریں چراتا بھرائی آواز میں کہتا ہوا وہاں سے نکل گیا تھا۔

اپنے بیڈ روم سے متصل باتھ روم میں باتھ ٹب کے کنارے بیٹھا وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ وہ سکندر عثمان سے بے حد قریب تھا اور یہ قربت آج عجیب طرح سے اذیت دے رہی تھی اسے۔ وہ اپنی زندگی کے ہنگاموں میں اتنا مصروف رہا تھا کہ اس نے سکندر عثمان کی بگڑتی ہوئی ذہنی حالت کو نوٹس ہی نہیں کیا تھا۔ نوٹس تو تب کرتا جب وہ ان سے باقاعدگی سے مل پاتا۔

SIF اسے گرداب کی طرح الجھائے ہوئے تھا۔ اس کے بوجھ کس نے اب اس کے پیروں کو پروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ سفر میں رہتا تھا۔ چار پانچ سال میں SIF دنیا کی بڑی فنانشل مارکیٹس میں ایک شناخت بنا رہا تھا... بے حد سفر، تیز رفتار ترقی کے ساتھ... اور کام کی اس رفتار نے اسے بہت سی چیزوں سے بے خبر بھی کیا تھا۔ وہاں بیٹھے ہوئے اس نے اعتراف کیا تھا اور اب وہ حل ڈھونڈ رہا تھا اور حل ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہا تھا۔

وہ دونوں ان کے ساتھ مستقل امریکہ شفٹ ہونے پر کبھی تیار نہیں ہوتے۔ سالار کو اس کا اندازہ تھا اور امریکہ چھوڑ کر ان کے پاس مستقل آ جانا سالار کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کے باوجود حل سامنے تھا۔ بے حد مشکل تھا، لیکن موجود تھا۔



"امامہ! تم بچوں کے ساتھ پاکستان شفٹ ہو جاؤ۔" اس رات اس نے بالآخر انتظار کے بغیر وہ حل امامہ کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ امامہ کو اس کی بات سمجھ میں ہی نہیں آئی تھی۔

"کیا مطلب؟"

"میں چاہتا ہوں تم جبریل، عنایہ اور رئیسہ کے ساتھ پاکستان آ جاؤ۔ میرے پیرنٹس کو میری ضرورت ہے میں ان کے پاس نہیں ٹھہر سکتا لیکن میں انہیں اس حالت میں اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ تم نے دیکھا ہے پاپا کو۔" وہ بے حد رنجیدہ تھا۔

"ہم انہیں اپنے پاس رکھ سکتے ہیں، وہاں امریکہ میں۔" امامہ نے جیسے ایک تجویز پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

"وہ یہ گھر نہیں چھوڑیں گے اور میں اس عمر میں انہیں اور اپ سیٹ کرنا نہیں چاہتا۔ تم لوگ یہاں شفٹ ہو جاؤ... میں آتا جاتا رہوں گا۔ جبریل ویسے بھی یونیورسٹی میں ہے، اسے گھر کی ضرورت نہیں ہے اور میں تو امریکہ میں بھی سفر ہی کرتا رہتا ہوں زیادہ۔ مجھے وہاں فیملی ہونے نہ ہونے سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔" وہ اس سے نظریں ملائے بغیر کہہ رہا تھا۔

امامہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی، وہ سب کچھ اس طرح آسان بنا کر پیش کر رہا تھا جیسے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ وہ منٹوں کا کام تھا جو کیا جا سکتا تھا۔

"تمہارے اپنے پیرنٹس بھی ہیں یہاں... وہ بھی بہت بوڑھے ہیں... تم یہاں رہو گی تو ان سب کی دیکھ بھال

کر سکو گی۔" وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ امامہ نے کچھ خفگی سے اس سے کہا۔
"تم یہ سب میرے پیرنٹس کے لیے نہیں کر رہے سالار۔ اس لیے ان کا حوالہ نہ دو۔"
"تم ان کے پاس رہنا نہیں چاہتیں کیا؟" سالار نے جیسے ایموشنلی بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ "تم ان کے بارے میں فکر مند نہیں ہو تم کیا؟ انہیں اس عمر میں دیکھ بھال کی ضرورت ہو گی۔ کوئی چوبیس گھنٹے ساتھ نہ رہے، چند گھنٹے ہی رہے، لیکن حال چال پوچھنے والا ہو۔" وہ کہہ رہا تھا۔ اپنے والدین کی بات کرنے سے زیادہ اس کے والدین کی بات کر رہا تھا۔
امامہ کو بُرا لگا اسے اس جذباتی بلیک میلنگ کی ضرورت نہیں تھی۔
"سالار! اتنے سالوں میں کبھی پہلے تم نے میرے پیرنٹس کی دیکھ بھال کو ایشو بنا کر مجھے پاکستان میں رکھنے کی بات نہیں کی۔ آج بھی ان کو ایشو نہ بناؤ۔" وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔
"ہاں نہیں کی تھی کیونکہ آج سے پہلے میں نے بھی اپنے پیرنٹس کا یہ حال بھی نہیں دیکھا تھا۔" اس نے جواباً کہا۔ وہ قائل نہیں ہوئی۔
"مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے اسی انداز میں کہا تھا۔
"تم ان کے پاس رہنا نہیں چاہتیں؟ یہاں گھر پر۔" سالار نے دوٹوک انداز میں اس سے پوچھا۔
"میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔" اس نے جواباً کہا۔ سالار نے اس سے نظریں چرائیں۔
"ان سب کو تمہاری ضرورت ہے امامہ۔"
"اور تم؟ تمہیں میری ضرورت نہیں ہے؟" امامہ نے گلہ کیا تھا۔
"ان سب کے پاس زندگی کے زیادہ سال نہیں ہیں۔ میں یہ بوجھ اپنے ضمیر پر نہیں لینا چاہتا کہ میں نے زندگی کے آخری سالوں میں اپنے ماں باپ کی پروا نہیں کی۔" وہ اس سے کہہ نہیں سکی وہ اس کے ساتھ بھی تو اسی لیے چپکی رہنا چاہتی تھی اسے بھی تو اس کی زندگی کا پتا نہیں تھا۔
ڈاکٹرز نے کہا تھا پانچ سات سال۔ زیادہ سے زیادہ دس سال۔ اور وہ اسے اس سے بھی پہلے اپنے سے الگ کر رہا تھا۔ وہ یہ ساری باتیں زبان پر نہیں لاسکتی تھی کیونکہ وہ یہ ساری باتیں سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ زندگی کے کسی بھیانک خواب کے بارے میں۔ مستقبل کے بُرے دنوں کے بارے میں۔ وہ فی الحال صرف حال کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی۔ جو سامنے تھا۔ جو آج تھا وہ اسی میں جینا چاہتی تھی۔
"تمہیں میری ضرورت ہے سالار۔ اکیلے تم کیسے رہو گے؟" وہ اس سے کہہ رہی تھی۔
"میں رہ لوں گا امامہ۔ تم جانتی ہو میں کام میں مصروف ہوں تو مجھے سب کچھ بھول جاتا ہے۔" یہ سچ تھا لیکن اس کو نہیں کہنا چاہیے تھا۔ امامہ چپ ہو گئی تھی۔
وہ کچھ بول نہیں سکی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے پل میں بھر گئی تھیں۔ سالار اس کے برابر صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس نے امامہ سے نظریں چرانے کی کوشش کی تھی، نہیں چرا سکا۔
"زندگی میں انسان صرف اپنی ضرورتوں کے بارے میں سوچتا ہے تو خود غرض ہو جاتا ہے۔" اس نے امامہ کو وضاحت ایک فلاسفی میں لپیٹ کر پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ امامہ قائل نہیں ہوئی۔
"مجھے پتا ہے تمہیں ضرورت نہیں ہے۔ نہ میری، نہ بچوں کی۔ تمہارے لیے کام کافی ہے۔ کام تمہاری فیملی ہے، تمہاری تفریح بھی۔ لیکن میری زندگی میں تمہارے اور بچوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ میرا کام اور تفریح صرف تم لوگ ہو۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں گلہ بھی کیا۔ اس کی بے حسی بھی جتائی، اپنی مجبوری بھی سنائی۔

"تم یہ نہیں سوچتے کہ تم بھی انڈر ٹریٹمنٹ ہو' تمہیں بھی کسی خیال رکھنے والے کی ضرورت ہے۔" وہ جیسے اسے یاد دلا رہی تھی' بیماری کا نام لیے بغیر کہ اسے بھی کسی تیمار دار کی ضرورت تھی۔

"پرانی بات ہو گئی امامہ... میں ٹھیک ہوں' پانچ سال سے اس بیماری کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوں۔ کچھ نہیں ہوتا مجھے۔" اس نے جیسے امامہ کے خدشات دیوار پر پڑھ کر بھی پھونک سے انہیں اڑایا تھا۔

"میں پاپا کو اس حال میں یہاں اس طرح نہیں چھوڑ سکتا نوکروں کے آسرے... میں حمین کو ان کے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں حمین کو اکیلا یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ اس لیے تمہاری ضرورت ہے اس گھر کو۔ تم اسے ریکویسٹ سمجھو۔ خود غرضی یا پھر اصرار... لیکن میں چاہتا ہوں تم پاکستان آجاؤ۔ یہاں اس گھر میں۔" اس نے سالار کی آواز اور آنکھوں میں رنجیدگی دیکھی تھی۔

"میرے لیے تمہارے بغیر رہنا بے حد مشکل ہے... میں عادی ہو گیا ہوں تمہارا' بچوں کا... گھر کے آرام کا... لیکن میرے باپ کے بے حد احسانات ہیں ہم پر... صرف مجھ پر ہی نہیں' ہم دونوں پر... میں اپنے آرام کے لیے' آرام کو ان کے لیے چھوڑنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ یہ فرض ہے مجھ پر..." وہ جو کچھ اس سے کہہ رہا تھا وہ مشورہ اور رائے نہیں تھی' نہ ہی درخواست... وہ فیصلہ تھا' جو وہ کر چکا تھا اور اب صرف اسے سنا رہا تھا۔

وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا' لیکن غلط وقت پر کہہ رہا تھا۔ وہ اس سے قربانی مانگ رہا تھا' لیکن بہت بڑی مانگ رہا تھا۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر اس کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔ وہ فرشتہ نہیں تھی' لیکن یہ بات سالار کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔



دو ہفتوں کے بعد امریکہ واپس جاتے ہوئے سالار نے سکندر عثمان کو اپنے فیصلے کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ خوش نہیں ہوئے تھے۔

"نہیں' بے وقوفی کی بات ہے یہ... امامہ اور بچوں کو یہاں شفٹ کرنا۔" انہوں نے فوری طور پر کہا تھا۔ "ان کی اسٹڈیز کا حرج ہوگا اور یہاں لا کیوں رہے ہو انہیں' تنگ کیا بنتی ہے؟" سالار نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ ان کے لیے کر رہا تھا یہ سب۔

"بس پاپا... وہاں مشکل ہو رہا ہے سب کچھ مینیج کرنا... مالی طور پر۔" اس نے باپ سے جھوٹ بولا' وہ انہیں زیر احسان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"بہت زیادہ ہوتے جا رہے ہیں وہاں اخراجات... سیونگ بالکل نہیں ہو رہی... یہاں کچھ عرصہ رہیں گے تو تھوڑی بہت بچت کر لیں گے ہم۔" اس نے بے حد روانی سے سکندر عثمان سے کہا۔

"لیکن تم تو کہہ رہے تھے SIF بہت کامیاب ہے۔ تمہارا پیکیج بہت اچھا ہے۔" وہ کچھ متوحش ہوئے۔

"ہاں... وہ تو بہت اچھا جا رہا ہے۔ اس کے حوالے سے مسائل نہیں ہیں مجھے... لیکن بس... سیونگ نہیں ہو پا رہی' پھر بچیاں بڑی ہو رہی ہیں' میں چاہ رہا ہوں کچھ سال پاکستان میں رہیں' اپنی ویلیوز کا پتا ہو' پھر لے جاؤں گا انہیں۔" اس نے اپنے بہانے کو کچھ اضافی سہارے دیے۔

سکندر عثمان ابھی بھی پوری طرح قائل نہیں ہوئے تھے۔

"تم اکیلے کیسے رہو گے سالار... تمہارا ابھی علاج ہو رہا ہے۔ بیوی بچوں کے بغیر وہاں کون خیال رکھے گا تمہارا۔" وہ اپنی تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔ "میں سوچ رہا ہوں میرے پاس جو اکاؤنٹ میں کچھ رقم ہے وہ تمہیں دے دوں تاکہ تمہیں اگر کوئی فنانشل مسئلہ ہے تو..." سالار نے ان کی بات کاٹ دی۔

"بس پاپا اب نہیں۔" اس نے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ "اب اور کچھ نہیں۔ کتنا کریں گے آپ میرے لیے۔ مجھے بھی کچھ کرنے دیں۔ احسان نہیں کر سکتا تو حق ہی ادا کرنے دیں مجھے۔" اس نے عجیب بے بسی سے کہا۔

"مجھے تمہاری فکر رہے گی۔"

سالار نے ایک بار پھر ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی آپ کی فکر رہتی ہے پاپا۔"

"اس لیے رکھنا چاہتے ہو ان سب کو یہاں؟" سکندر عثمان جیسے بوجھ گئے تھے۔

"آپ جو چاہے سمجھ لیں۔"

"میں اور طیبہ بالکل ٹھیک ہیں۔ پرانے ملازم ہیں ہمارے پاس وفادار۔ سب ٹھیک ہے تم میری وجہ سے فکر مت کرو۔" وہ اب بھی تیار نہیں تھے۔

اولاد پر انہوں نے ہمیشہ احسان کیا تھا۔ احسان لینے کی عادت ہی نہیں تھی انہیں اور وہ بھی عمر کے اس حصے میں۔ بے حد خواہش ہونے کے باوجود۔ مجبور ہو جانے کے باوجود۔ سکندر عثمان اولاد کو اپنی وجہ سے تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔

"میں ویسے بھی سوچتا ہوں، فیکٹری جایا کروں کبھی کبھار۔ کام مکمل طور پر چھوڑ دیا ہے اس لیے بیمار ہونے لگا ہوں میں۔" وہ اپنے الزام کی شکل بدل رہے تھے۔

"تمہارے بچوں اور بیوی کو تمہارے پاس رہنا چاہیے سالار۔ تم زبردستی انہیں یہاں مت رکھو۔ میرے اور طیبہ کے لیے بس۔" انہوں نے جیسے سالار کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"زبردستی نہیں رکھ رہا پاپا ان کی مرضی سے ہی رکھ رہا ہوں۔ وہ یہاں آ کر ہمیشہ خوش ہوتے رہے ہیں اب بھی خوش ہوں گے۔" اس نے باپ کو تسلی دی تھی اسے اندازہ نہیں تھا باپ کا تجربہ کتنا درست ہونے والا تھا۔



"میں پاکستان نہیں جاؤں گا۔" پاکستان شفٹ ہونے کی سب سے زیادہ مخالفت حمین سکندر کی طرف سے آئی تھی اور یہ مخالفت صرف سالار کے لیے ہی نہیں امامہ کے لیے بھی خلاف توقع تھی۔ وہ پاکستان جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ دادا کے ساتھ اس کی بنتی بھی بہت تھی اور وہ دادی کا لاڈلا بھی تھا۔ پاکستان میں اسے بڑی اٹریکشنز دکھتی تھیں اور اب یک بیک مستقل طور پر پاکستان جا کر رہنے پر سب سے زیادہ اعتراضات اسی کے تھے۔

"بیٹا! دادا اور دادی بوڑھے ہو گئے ہیں۔ تم نے دیکھا وہ بیمار بھی تھے۔ انہیں کیئر کی ضرورت ہے۔" امامہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"ان کے پاس سرونٹ ہیں وہ ان کا اچھی طرح خیال رکھ سکتے ہیں۔" بالکل قائل ہوئے بغیر بولا۔

"سرونٹ ان کی اچھی کیئر نہیں کر سکتے۔" امامہ نے جواباً کہا۔

"آپ انہیں اولڈ ہوم بھیج دیں۔" وہ اس معاشرے کا بچہ تھا اس معاشرے کا بے رحم لیکن عملی حل تھا۔

"کل کو ہم بھی بوڑھے ہو جائیں گے تو تم ہمیں بھی اولڈ ہوم میں بھیج دو گے۔" امامہ نے کچھ ناخوش ہوئے اس سے کہا۔

"آپ انہیں یہاں لے آئیں۔" حمین نے ماں کی خفگی کو محسوس کیا۔

"وہ یہاں نہیں آنا چاہتے' وہ اپنا گھر نہیں چھوڑنا چاہتے۔" امامہ نے اس سے کہا۔

"پھر ہم بھی اپنا گھر کیوں چھوڑیں؟ میں اپنا اسکول کیوں چھوڑوں؟" وہ دنیا کے ذہین ترین دماغوں میں سے ایک تھا' غلط بات نہیں کہہ رہا تھا۔ منطقی بات کر رہا تھا۔ دماغ کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہوتا ہے' وہ عقل سے سوچتا ہے دل سے نہیں۔

"یہ ہمارا گھر نہیں ہے حمین۔ کرائے کا ہے' ہم صرف یہاں رہ رہے ہیں اور جب ہم سب پاکستان چلے جائیں گے تو بابا اور جبریل اس گھر کو چھوڑ دیں گے کیونکہ انہیں اتنے بڑے گھر کی ضرورت نہیں ہوگی۔ جبریل ابھی یونیورسٹی میں ہے۔ تمہارے بابا نیویارک شفٹ ہونا چاہتے ہیں۔" امامہ اسے کہتی چلی گئی تھی۔

"جبریل پاکستان نہیں جائے گا؟" حمین نے پوچھا۔

"نہیں تمہارے بابا اسے اس لیے پاکستان بھیجنا نہیں چاہتے کیونکہ وہ یونیورسٹی میں ہے' اس کی اسٹڈیز متاثر ہوں گی۔" امامہ نے اسے سمجھایا۔

"میری بھی تو ہوں گی' مجھے بھی ہر سال MIT جانا ہے۔ میں کیسے جاؤں گا۔" وہ خفا ہوا تھا اور بے چین بھی۔ اسے اپنا ہر پروگرام خطرے میں پڑتا دکھتا تھا۔

"تم ابھی اسکول میں ہو' جبریل یونیورسٹی میں ہے۔ اور پاکستان میں بہت اچھے اسکولز ہیں۔ تم کور کر لو گے سب کچھ۔ جبریل نہیں کر سکے گا' اسے آگے میڈیسن پڑھنی ہے۔" امامہ اسے وضاحت دینے کی کوشش کر رہی تھی جو حمین کے دماغ میں نہیں بیٹھ رہی تھی۔

"یہ فیئر نہیں ہے ممی!" حمین نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ "اگر جبریل پاکستان نہیں جائے گا تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔ مجھے MIT جانا ہے۔" وہ واضح طور پر بغاوت کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے' تم مت جاؤ۔ میں عنایہ اور رئیسہ چلے جاتے ہیں' تم یہاں رہنا اپنے بابا کے پاس۔" امامہ نے یکدم اس سے بحث کرنا بند کر دی تھی۔ وہ کچھ مزید بے چین ہوا۔

"یہ تمہارے بابا کا حکم ہے اور ہم سب اس کو مانیں گے۔ تم نافرمانی کرنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی' میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔" امامہ کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ دنیا کے وہ دو بہترین دماغ ایک دوسرے کے مقابل آ گئے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)



کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بالو سے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کررہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کردیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بھی انکار کردیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہورہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

۲۰
بیسویں قسط

"تم پاکستان نہیں جانا چاہتے حمین؟" اس رات سالار نے حمین کو بٹھا کر پوچھا تھا۔ امامہ نے اسے رات کے کھانے سے کچھ دیر پہلے اس کے انکار کے بارے میں بتایا تھا۔

"نہیں۔" حمین نے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور کوئی بھی نہیں جانا چاہتا۔" اس نے مزید بتایا۔

"میں کسی اور کی نہیں صرف تمہاری بات کر رہا ہوں۔" سالار نے اسے ٹوک دیا۔

حمین سر جھکائے چند لمحے خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے سر اٹھا کر باپ کو دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

"وجہ؟" سالار نے اسی انداز میں کہا۔

"بہت ساری ہیں۔" اس نے بے حد مستحکم انداز میں باپ کو جواب دیا۔

"کسی بھی کام کو کرنے یا نہ کرنے کی صرف ایک وجہ ہوتی ہے باقی سب بہانے ہوتے ہیں۔ اس لیے تم صرف وجہ بتاؤ بہانے نہیں۔" سالار نے اپنے گیارہ سالہ بیٹے کے ذخیرۂ الفاظ کی ہوا نکالتے ہوئے کہا۔

حمین اس ملاقات کے لیے پہلے سے تیار تھا اور وجوہات کو جمع کرنے پر بھی اچھا خاصا وقت صرف کر چکا تھا۔ باپ نے جیسے انگلی سے پکڑ کر دوبارہ زیرو پر کھڑا کر دیا تھا۔

"میں پاکستان میں ایڈجسٹ نہیں ہو سکتا۔" حمین نے بالآخر ایک وجہ تلاش کر کے پیش کی۔

"اگر تم کانگو میں ایڈجسٹ ہو سکتے ہو تو پاکستان میں بھی ہو جاؤ گے۔ افریقہ سے زیادہ برا نہیں۔" سالار نے اسی انداز میں کہا۔

"تب میں چھوٹا تھا۔" حمین نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

"تم اب بھی چھوٹے ہی ہو۔" سالار نے بات کاٹی۔

"لیکن میں بڑا ہو رہا ہوں۔" حمین نے جیسے اعتراض کیا۔

"اس میں کافی ٹائم لگے گا۔ تمہارے لیے کم از کم پچیس سال۔" سالار نے بے حد سنجیدگی سے اسے چھیڑا۔ وہ باپ کو دیکھ کر رہ گیا۔

"آئی ایم سیریس بابا!" اس نے سالار کی بات سے محظوظ ہوئے بغیر کہا۔ "میں پاکستان نہیں جانا چاہتا۔ اور یہ ممی کے لیے بھی اچھی بات نہیں ہے۔" وہ کسی بڑے کی طرح باپ کے فیصلے پر تبصرہ کر رہا تھا۔

سالار خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔

"مجھے یہاں تعلیم حاصل کرنی ہے۔ میں وہاں چھٹیوں پر جا سکتا ہوں ہمیشہ کے لیے نہیں۔" وہ بالکل امریکی انداز میں بے حد صاف گوئی سے باپ کو بتا رہا تھا کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں۔

"چند سالوں کی بات ہے حمین! اس کے بعد تم بھی اس قابل ہو جاؤ گے کہ امریکا واپس آ کر کہیں بھی پڑھ سکو۔" سالار نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ وہ گیارہ سال کا بچہ باپ کو بے حد مدلل انداز میں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"چند سال سے بہت فرق پڑتا ہے۔ ایک سال سے بھی بہت فرق پڑتا ہے۔" اس نے سالار کی بات کے جواب میں کہا۔

"تو تم یہ قربانی نہیں دو گے؟" سالار نے اس بار بات بدلی۔

"جبریل بھی تو دے سکتا ہے قربانی۔ آپ بھی تو دے سکتے ہیں۔ میں ہی کیوں؟" اس نے جواباً اسی انداز

میں کہا۔
دنیا کے بڑے بڑے اداروں کے برابر آ کے ان کے سامنے بیٹھ کر ان سے کاروباری امور طے کرنا اور بات تھی۔ ان کے سوالات اور اعتراضات کے انبار کو سمیٹنا آسان کام تھا۔ اپنے گیارہ سال کے بیٹے کو اس بات پر قائل کرنا زیادہ مشکل تھا کہ وہ وہ قربانی کیوں دے جو اس کا بھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کا باپ بھی نہیں دے رہا تھا۔ پھر وہ کیوں؟ اور اس کیوں کا جواب فارمولوں اور کلیوں میں نہیں ملتا تھا' صرف ان اخلاقی اقدار میں ملتا تھا جن پر اس نے اپنی اولاد کی تربیت کی تھی' لیکن اس کے باوجود اس کی اولاد اس سے یہ سوال کر رہی تھی۔
"تم جانتے ہو تمہارے دادا کو الزائمر ہے۔ وہ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور انہیں ضرورت ہے کہ کوئی ان کے پاس ہو۔ تم سے انہیں زیادہ محبت ہے۔ اس لیے میں چاہتا تھا تم ان کے پاس رہو۔" سالار نے جیسے وہ جواب ڈھونڈنا شروع کیے جن سے وہ اسے سمجھا سکتا۔
"ویسے بھی جب تمہاری ممی' عنایہ اور رئیسہ کے ساتھ یہاں سے چلی جائیں گی تو تم یہاں کس کے پاس رہو گے؟ گھر میں تمہاری دیکھ بھال کے لیے کوئی نہیں ہو گا۔" سالار نے کہنا شروع کیا۔
"میں اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں۔" حمین نے باپ کی بات ختم ہوتے ہی کہا۔ "میں اتنا چھوٹا نہیں ہوں بابا۔ میں اکیلا رہ سکتا ہوں۔ آپ مجھے بورڈنگ میں بھی رکھ سکتے ہیں یا پھر میں کسی رشتہ دار کے پاس بھی رہ سکتا ہوں۔" اس نے سالار کے سامنے ایک کے بعد ایک حل رکھنا شروع کیا۔
"ان میں سے ایک بھی آپشن میرے لیے قابل قبول نہیں ہے' تمہیں سب کے ساتھ پاکستان جانا ہے۔" سالار نے دو ٹوک انداز میں اس سے کہا۔
"آپ مجھ میں اور جبریل میں فرق کیوں کرتے ہیں بابا؟" اس کے اگلے جملے نے سالار کا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنے گیارہ سالہ بیٹے کا چہرہ دیکھا جس نے زندگی میں پہلی بار اس سے ایسا سوال یا ایسی شکایت کی تھی۔
"فرق۔۔۔؟ تم اس فرق کی وضاحت کر سکتے ہو؟" سالار پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ چار منٹ لگیں گے اسے سمجھانے میں اور اب جیسے ایک پینڈورا باکس ہی کھلنے لگا تھا۔
"آپ جبریل کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔" اگلا تبصرہ پہلے سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ دیکھتے رہے' پھر کچھ دیر بعد سالار نے اس سے کہا۔
"اور میں اسے کیوں بہتر سمجھتا ہوں؟" وہ جیسے اس کے اس الزام کی بھی وضاحت چاہتا تھا۔
"کیوں کہ وہ حافظ قرآن ہے۔۔۔ میں نہیں ہوں۔" بے حد روانی سے کہے گئے اس جملے نے سالار کو سن کر دیا تھا۔ وہ واقعی پینڈورا باکس ہی کھول بیٹھا تھا' لیکن بہت غلط حوالے سے۔
وہ باغی نہیں تھا۔ نہ ہی بدتمیز' نہ ہی بدلحاظ' لیکن وہ جو سوچتا اور محسوس کرتا تھا' وہ کہہ دیتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار سالار کو لگا' وہ سکندر عثمان تھا اور اپنے سامنے آن بیٹھا تھا۔ لاجواب۔۔۔ بے بس۔۔۔ تاریخ یقیناً" اپنے آپ کو دہراتی ہے' لیکن اپنی مرضی کے وقت پر۔
"تمہیں جبریل برا لگتا ہے؟" سالار نے بے حد مدھم آواز میں اس سے پوچھا۔
"وہ میرا ایک ہی بھائی ہے۔ مجھے وہ کیسے برا لگ سکتا ہے' لیکن مجھے آپ لوگوں کا یہ رویہ اچھا نہیں لگتا۔" حمین کو یہ شکایت کب سے ہونی شروع ہوئی تھی اس کا اندازہ سالار کو نہیں ہوا' لیکن وہ اس وقت وہاں عجیب سی کیفیت میں بیٹھا ہوا تھا۔
"ایسا نہیں ہے حمین۔" اس نے حمین سے کہا' وہ اپنے شب خوابی کے پاجامے کو گھٹنے سے رگڑ رہا تھا جیسے اس میں سوراخ ہی کر دینا چاہتا ہو۔

"بابا۔۔۔ میں آجاؤں؟" وہ جبریل تھا جو دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوا تھا۔
گفتگو کے عجیب مرحلے پر وہ اندر آیا تھا۔ سالار اور حمین دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر کچھ جزبز ہوئے تھے۔
"ہاں آجاؤ۔" سالار نے اس سے کہا۔
وہ اندر آکر حمین کے برابر میں صوفے پر بیٹھ گیا پھر اس نے ایک نظر حمین کو دیکھا جو اس سے نظریں نہیں ملا رہا تھا پھر اس نے باپ سے کہا۔
"دادا کے پاس میں پاکستان چلا جاتا ہوں۔۔۔ میں زیادہ اچھے طریقے سے ان کی دیکھ بھال کرسکوں گا۔" کمرے میں عجیب خاموشی چھائی تھی نہ سالار کچھ کہہ سکا نہ حمین کچھ بول سکا تھا۔ ان دونوں کی آواز زیادہ اونچی نہیں تھی لیکن جبریل پھر بھی یقیناً یہ گفتگو سن کر ہی آیا تھا۔
"ممی اور حمین یہیں رہیں آپ کے پاس۔۔۔ میں اکیلا بھی ان کو سنبھال سکتا ہوں۔" وہ ہمیشہ کی طرح مدھم اور مستحکم آواز میں کہہ رہا تھا۔
"پاکستان میں ویسے بھی میڈیسن کی تعلیم کے لیے کم وقت لگتا ہے۔ یونیورسٹی کا سال ضائع ہونے سے بھی فرق نہیں پڑے گا۔" وہ اتنے آرام سے کہہ رہا تھا جیسے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔۔۔ جبریل ایسا ہی تھا' کسی تردد کے بغیر مسئلے کا حل نکالنے والا۔
"میں تم سے بعد میں بات کروں گا جبریل۔" سالار نے اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔
"میں گھر میں سب سے بڑا ہوں بابا۔۔۔ میری ذمہ داری سب سے زیادہ ہے۔ حمین کو آپ یہیں رہنے دیں اور مجھے جانے دیں۔۔۔ اور میں یہ سب بہت خوشی سے کہہ رہا ہوں' مجھے کوئی خفگی نہیں ہے۔" جبریل نے سالار کے ٹوکنے کے باوجود اس سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
اس کے کمرے سے جانے کے بعد بھی سالار اور حمین خاموش ہی بیٹھے رہے۔ وہ بے حد ہتک آمیز صورت حال تھی جس کا سامنا ان دونوں نے چند لمحے پہلے کیا تھا۔
"میرے اور امامہ کے لیے تم میں اور جبریل میں کوئی فرق نہیں۔۔۔ اسے قرآن پاک حفظ کرنے کی وجہ سے عزت دیتے ہیں لیکن تم تینوں پر اسے فوقیت نہیں دیتے' اس لیے یہ کبھی مت سمجھنا کہ ہم دونوں تم چاروں میں کوئی تفریق کریں گے۔" سالار نے بہت لمبی خاموشی کے بعد اس سے کہنا شروع کیا تھا۔
"تمہارے دادا میری ذمہ داری ہیں اور میرا خیال تھا میں اپنی ذمہ داری جبریل اور تمہارے ساتھ بانٹ سکتا ہوں۔ اس لیے یہ کوشش کی ہے۔ لیکن تم پر زبردستی نہیں کروں گا میں۔۔۔ تم نہیں جانا چاہتے' مت جاؤ۔"
سالار اس سے کہتا ہوا اٹھ کر چلا گیا' حمین وہیں بیٹھا رہا۔۔۔ سر جھکائے۔۔۔ خاموش۔۔۔ سوچتے ہوئے۔



"مجھے امید ہے کہ تم مجھ سے خفا نہیں ہوگے؟"
جبریل اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھا پڑھ رہا تھا جب اس نے کمرے کا دروازہ کھلتے اور حمین کو اندر آتے دیکھا۔ دونوں کے درمیان خاموش نظروں کا تبادلہ ہوا پھر جبریل دوبارہ اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہوگیا۔ حمین بستر پر جاکر لیٹ گیا اور اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بالآخر اسے مخاطب کیا تھا۔
"خفا؟" جبریل نے پلٹ کر اسے کچھ حیرانی سے دیکھا تھا۔ "کیوں؟"
حمین اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بڑے محتاط انداز میں اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔
"تم نے ہماری باتیں سنی تھیں؟" وہ کچھ بھی کہنے سے پہلے جیسے تصدیق چاہتا تھا۔

ایک لمحہ کے لیے جبریل اسے دیکھتا رہا پھر اس نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں!"

حمین کے تاثرات بدلے۔ تھوڑی شرمندگی نے اسے جیسے کچھ اور دفاعی پوزیشن پر کھڑا کیا تھا۔

"اسی لیے پوچھ رہا تھا تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو نا؟" حمین نے اب اپنے جملے کو ذرا سا بدلا۔

"نہیں۔" جبریل نے اسی انداز میں کہا۔ حمین اپنے بستر سے اٹھ کر اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

"لیکن مجھے مایوسی ضرور ہوئی۔" جبریل نے اس کے قریب آنے پر جیسے اپنے جملے کو مکمل کیا۔ حمین اب اسٹڈی ٹیبل سے پشت ٹکائے کھڑا تھا۔

"میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ تم میرے بھائی ہو اور میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ یقین کرو میں تمہارے خلاف نہیں ہوں۔" حمین نے جیسے اسے صفائی دینے کی کوشش کی۔

"مجھے پتا ہے۔" جبریل نے نرمی سے اسے ٹوکا اور اس کا بازو ہلکے سے تھپتھپایا۔ "لیکن تمہیں بابا سے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ انہیں بہت دھچکا لگا ہے۔" جبریل اب اسے سمجھا رہا تھا۔ "تم واقعی سمجھتے ہو کہ وہ مجھے تم سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں... فرق کرتے ہیں؟" ______ "جبکہ مجھے لگتا تھا وہ تمہیں زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔" جبریل نے جواباً اس سے کہا تھا۔ "کافی سال ایسے ہی لگتا رہا۔" جبریل نے جیسے بات ادھوری چھوڑ دی۔

حمین نے کچھ تجسس سے کریدا۔ "پھر؟"

"پھر میں بڑا ہو گیا۔" وہ مسکرایا تھا۔ "اور میں نے سمجھا کہ ایسا نہیں ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "کچھ کوالٹیز کو وہ مجھ میں زیادہ پسند کرتے ہیں کچھ تم میں لیکن انہوں نے ہم دونوں میں کبھی فرق نہیں کیا اگر کیا بھی ہو گا تو اس کی کوئی وجہ ہوگی۔" وہ اس کا بڑا بھائی تھا اور بڑے بھائی کی طرح ہی اسے سمجھا رہا تھا۔ حمین خاموشی سے بات سن رہا تھا۔ جب اس نے بات ختم کی تو حمین نے اس سے کہا۔

"میں یہ نہیں چاہتا کہ تم اپنی یونیورسٹی چھوڑ کر پاکستان جاؤ۔ میں اتنا خود غرض نہیں ہوں۔" وہ جیسے اسے صفائی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بس میں یہاں رہنا چاہتا ہوں۔" اس نے جبریل سے کہا تھا۔

"تمہیں کوئی خود غرض کچھ بھی نہیں رہا حمین۔ تمہاری چوائس کی بات ہے اور بابا اس لیے تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کیوں کہ تم چھوٹے ہو اور یہاں تم اکیلے نہیں رہ سکتے۔ بابا بہت بزی ہیں۔ کئی بار کئی کئی دن گھر نہیں آتے۔ تم اکیلے کیسے رہو گے ان کے ساتھ۔ صرف اس لیے تمہیں پاکستان بھیجنا چاہتے تھے وہ۔"

اس نے جبریل کی بات کاٹ دی اور بے حد ہلکی لیکن مستحکم آواز میں اس سے کہا۔

"میں نہیں چاہتا کہ تم پاکستان جاؤ۔ تمہاری اسٹڈیز متاثر ہوں۔ میں چلا جاؤں گا۔ حالانکہ میں خوش نہیں ہوں، لیکن مجھے لگتا ہے میں سب کو ناراض کر کے یہاں رہ نہیں سکتا۔" وہ کہتے ہوئے اپنے بستر کی طرف چلا گیا۔

جبریل کو لگا وہ کچھ الجھا ہوا ہے۔ جبریل اسے لیٹتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس نے حمین سے کہا۔

"چند سالوں کی بات ہے حمین۔ پھر بابا تمہیں بھی واپس امریکا بلا لیں گے۔ پھر تم اپنے خوابوں کی تکمیل کر سکتے ہو۔" جبریل نے جیسے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"میں خواب نہیں دیکھتا۔" اس نے جواباً چادر اپنے اوپر کھینچتے ہوئے کہا تھا۔ جبریل اسے دیکھ کر رہ گیا۔ حمین کے دماغ میں کیا تھا اسے بوجھنا بڑا مشکل تھا صرف دوسروں کے لیے ہی نہیں شاید اس کے اپنے لیے بھی۔

جبریل ایک بار پھر اپنی اسٹڈی ٹیبل پر پڑھنے بیٹھ گیا تھا۔ وہ اس ویک اینڈ پر گھر آیا ہوا تھا۔ اب اسے کل پھر واپس جانا تھا' اس کا اگلا سمسٹر شروع ہونے والا تھا۔
"بابا کے ساتھ کون رہے گا؟" کاغذ پر کچھ لکھتے ہوئے اس کا ہاتھ رک گیا۔ جبریل نے پلٹ کر ایک بار پھر بستر پر لیٹے ہوئے حمین کو دیکھا' اس نے تقریباً "دس منٹ بعد اسے مخاطب کیا تھا' جب وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ سو چکا ہے۔ اور اس کے سوال نے کسی کرنٹ کی طرح اسے جیسے حمین کی سوچ تک رسائی دی تھی۔
وہ واقعی بے حد گہرا تھا۔ یہ MIT نہیں تھی۔ امریکا نہیں تھا۔ جو حمین کو واپس جانے سے روک رہا تھا۔ یہ سالار سکندر کی بیماری تھی جس نے حمین کو اسے اکیلا چھوڑ دینے پر متوحش کیا تھا۔
وہ ساں باپ کے پاس رکنا چاہتا تھا۔ بغیر اسے یہ جتائے کہ وہ اس کی وجہ سے وہاں رہنا چاہتا تھا۔ یوں ہے کہ وہ اس کے بارے میں فکر مند ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سالار سکندر اپنے باپ کے بارے میں فکر مند تھا' لیکن اسے یہ جتانا نہیں چاہتا تھا۔
"تم بابا کی وجہ سے رکنا چاہتے ہو؟" جبریل نے جیسے اس کا راز افشا کر دیا تھا۔ حمین کے چادر سے ڈھکے وجود میں حرکت ہوئی۔ شاید اپنے دل کا بھید یوں فاش ہو جانے کی توقع نہیں تھی اسے۔ لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ اس نے چادر بھی اپنے چہرے سے نہیں ہٹائی۔ جبریل پھر بھی اسے دیکھتا رہا۔
حمین سکندر ایک خرگوش کی طرح سرنگیں بنانے میں ماہر تھا۔ پلک جھپکنے میں کیا کیا کھود کر کہاں سے کہاں نکلنے کا شوقین۔ وہ پلک جھپکنے میں دل سے نکلتا تھا اور وہ لمحہ بھر میں دل میں واپس اٹکتا تھا۔ جبریل سکندر اپنے اس چھوٹے بھائی کو دیکھا رہا جسے وہ کبھی سمجھ نہیں پاتا تھا اور جب سمجھتا تھا تو اسے اپنی سمجھ بوجھ پر شک ہونے لگتا تھا۔



"تم سب لوگ جا رہے ہو؟" بار بار پوچھنے اور اس کا جواب عنایہ سے ہاں میں ملنے کے باوجود ایرک کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ ممکن تھا اور کبھی ہو بھی سکتا تھا۔
"لیکن کیوں؟" اگلا سوال کرنے کا خیال اسے بڑی دیر بعد آیا تھا حالانکہ عنایہ اس سوال سے پہلے اس کا بھی جواب دے چکی تھی۔
"بابا چاہتے ہیں ہم کچھ سال دادا دادی کے پاس رہیں۔ وہ اکیلے ہیں پاکستان میں۔" عنایہ نے ہمیشہ کی طرح بڑے تحمل سے اس کے اس سوال کا جواب ایک بار پھر دہرایا۔
"چند سال؟ کتنے سال؟" ایرک بے حد پریشان تھا۔
"پتا نہیں۔" عنایہ نے جواب دیا اور اسے واقعی اس سوال کا جواب نہیں پتا تھا۔
"لیکن یہ گھر کیوں چھوڑ رہے ہو تم لوگ؟ تمہارے فادر اور جبریل تو نہیں جا رہے؟" ایرک نے اسی انداز میں کہا تھا۔
"بابا نیویارک شفٹ ہو رہے ہیں' جبریل ویسے ہی یونیورسٹی میں ہے۔ اتنا بڑا گھر ہماری ضرورت نہیں رہا اب۔" عنایہ نے دہرایا۔
"لیکن تم پریشان مت ہو۔ ہم لوگ امریکا تو آتے جاتے رہیں گے۔ اور تم پاکستان آ سکتے ہو۔ جب بھی تمہارا دل چاہے۔" عنایہ کو اندازہ تھا اس کی اپنی فیملی کے ساتھ جذباتی وابستگی کا۔ وہ ان کے بغیر اکیلا رہ جانے والا تھا۔

وہ دونوں اس وقت اسکول کے گراؤنڈ کے ایک بینچ پر بریک کے دوران بیٹھے ہوئے تھے۔ ارک نے اس کی باتوں کے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ بس خاموش بیٹھا رہا تھا یوں جیسے اس صدمے کو سہنے کی کوشش کر رہا ہو جو عنایہ کے انکشاف نے اسے دیا تھا۔

"کیا میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جا سکتا؟" ایک لمبی خاموشی کے بعد ارک نے بالآخر اس سے پوچھا۔ اس سوال نے عنایہ کو مشکل میں ڈال دیا۔ جواب وہ جانتی تھی لیکن دے نہیں سکتی تھی۔

"تمہاری ممی اور فیملی کو تمہاری ضرورت ہے۔ تم انہیں چھوڑ کر ہمارے ساتھ کیسے جا سکتے ہو؟" عنایہ نے اپنے انکار کو بے حد مناسب الفاظ میں اس تک پہنچایا تھا۔

"ممی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں ان سے اجازت لے سکتا ہوں۔ کیا آپ لوگ مجھے اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں؟" ایک اور سوال کیا۔ عنایہ ایک بار پھر وہیں کھڑی ہو گئی۔

"ارک! میں نہیں جانتی۔ میں ممی اور بابا سے پوچھ سکتی ہوں۔ لیکن اپنی فیملی کو اس طرح چھوڑ کر ایک دوسری فیملی کے ساتھ جانا ٹھیک نہیں ہے۔" عنایہ نے کہا تھا۔ وہ تیرہ سال کی تھی اسے بڑوں کی طرح نہیں سمجھا سکتی تھی پھر بھی اس نے کوشش کی تھی۔

ارک اس کی بات پر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

"چند سالوں تک میں ویسے ہی یونیورسٹی چلا جاؤں گا۔ گھر سے تو ویسے بھی جانا ہی ہوگا مجھے۔" اس نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

"پھر تو اور بھی ضروری ہے کہ یہ وقت تم اپنی فیملی کے ساتھ گزارو۔" عنایہ نے اسی نرم لہجے میں کہا۔

"میں اپنے آپ کو تمہاری فیملی کا حصہ سمجھتا ہوں۔ کیا تم لوگ ایسا نہیں سمجھتے؟" ارک نے جواباً اس سے کہا اور جیسے پھر سے اسے مشکل میں ڈالا۔

"میں ممی سے بات کروں گی ارک۔" عنایہ نے اس سوال سے نکلنے کے لیے جیسے ایک حل تلاش کیا۔

"اگر آپ لوگ چلے گئے تو میرا گھر ایک بار پھر سے ٹوٹ جائے گا۔" ارک نے اس سے کہا۔ "میرے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں رہے گی جہاں میں جا سکوں۔" اس نے جیسے منت والے انداز میں کہا تھا۔ یوں جیسے یہ سب عنایہ کے ہاتھ میں تھا وہ چاہتی تو سب رک جاتے۔

عنایہ کا دل بری طرح پسیجا تھا۔

"ایسے مت کہو ارک۔ دور جانے سے یہ تھوڑی ہوتا ہے کہ تمہارے ساتھ ہمارا تعلق بھی ختم ہو جائے گا۔ ہم لوگ ملتے رہیں گے۔ بات بھی کریں گے۔ ای میلز بھی۔ چھٹیوں میں تم ہمارے پاس پاکستان آ سکتے ہو۔ اور ہم یہاں امریکا۔ کچھ بھی ختم ہونے نہیں جا رہا۔" عنایہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی یہ جانتے ہوئے بھی کہ ارک ٹھیک کہہ رہا تھا۔ فاصلہ دیو ہوتا ہے 'سارے' تعلق کھا جاتا ہے۔ پیار کا 'دل کا' دوستی کا 'رشتوں کا۔

"اگر وہ سب نہیں رک سکتے تو تم رک جاؤ۔" ارک نے یک دم اس سے کہا' وہ بری طرح گڑبڑائی۔

"میں کیسے رک سکتی ہوں۔ پہلے ہی حمین ضد کر رہا ہے۔ اور اس کی بات کوئی نہیں مان رہا اور مجھے تو کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔ میں ممی کی ہیلپ کرنا چاہتی ہوں' دادا دادی کا خیال رکھنے میں۔" اس نے ارک سے کہا تھا' وہ بے اختیار اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن رک گیا۔ اتنے سال عنایہ کے ساتھ رہنے' اس کے ساتھ دوستی اور تقریباً' ہر روز اس کے گھر جانے کے باوجود ان کے درمیان ایسی بے تکلفی نہیں تھی کہ وہ اسے کچھ بھی کہہ دیتا یا کہہ سکتا۔ عنایہ سکندر کا یہ رکھ رکھاؤ ماں باپ کی طرف سے جینز میں آیا تھا یا خاندانی تربیت تھی' لیکن یہ جس

وجہ سے بھی تھا اس نے عنایہ سکندر کو ہمیشہ اپنی کلاس کے لڑکوں کے لیے معیار بنا رکھا تھا اور ارک کے لیے تخیل ۔۔۔ وہ جس معاشرے میں پل بڑھ رہے تھے وہاں آئی لو یو۔ ہیلو ہائے جیسی چیز بن کر رہ گئی تھی۔ کوئی بھی کسی سے بھی کبھی بھی کہہ سکتا تھا اور سننے کے لیے تیار رہتا تھا۔ نہ یہ بری چیز سمجھی جاتی تھی نہ براہ بنانے والی چیز۔ اس کے باوجود ارک کو جھجک محسوس ہو رہی تھی اسے لگتا تھا وہ اگر کبھی عنایہ سے اپنی محبت کا اظہار اس طرح کرے گا تو وہ ناراض ہو جائے گی اور پھر شاید اس گھر میں اس کا داخلہ ہی بند ہو جائے گا۔ اور پھر اس نے امامہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایسی کوئی بات عنایہ سے نہیں کرے گا جب تک وہ بڑا نہیں ہو جاتا' زندگی میں کچھ بن نہیں جاتا۔ اور ارک اب اچانک اپنے آپ کو ایک مخمصے میں پا رہا تھا۔ وہ اب جا رہی تھی۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔ اور پتا نہیں وہ لوگ دوبارہ کبھی مل بھی پاتے یا نہیں تو کیا اسے اس سے کہنا چاہیے تھا وہ سب جو وہ عنایہ کے لیے دل میں محسوس کرتا تھا۔ یا ایسے ہی خاموش رہنا چاہیے تھا۔

اس دن پہلی بار عنایہ کے حوالے سے ارک بری طرح پریشان ہوا۔ اسے یہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ جا رہی ہے' اسے لگ رہا تھا وہ اسے کھونے والا ہے۔ اور اس مسئلے کا کوئی حل فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور جو حل وہاں بیٹھے بیٹھے ارک کی بالآخر سمجھ میں آیا تھا۔ وہ کس قدر بے وقوفانہ تھا اس کا اسے اندازہ بھی نہیں تھا۔



"میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اس دو سطروں پر مشتمل خط کی ہیڈ لائن تھی جو سالار کو ارک کی طرف سے ملا تھا اور سالار نے بے حد سنجیدگی سے اس خط کو پڑھا تھا۔ وہ متحیر تھا اس لیے نہیں کہ وہ ارک کی طرف سے ایسے کسی خط کی توقع نہیں کر رہا تھا بلکہ اس لیے کیونکہ اس نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ عنایہ اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ کوئی اس کے حوالے سے اس سے ایسی بات بھی کر سکتا۔ وہ اس معاملے میں روایتی باپ ہی تھا جسے ابھی بھی اپنی بیٹی بہت چھوٹی لگ رہی تھی۔

امامہ اسے چائے دینے بیڈ روم میں آئی تھی جب اس نے ڈاک چیک کرتے سالار کو ایک کاغذ ہاتھ میں لیے سوچوں میں گم دیکھا۔ وہ چائے کا کپ رکھ کر جانے لگی تھی جب سالار نے اسے روک لیا اور وہ خط اسے تھما دیا۔ امامہ نے کچھ الجھے انداز میں اس خط کو پکڑا تھا لیکن پہلی سطر پر نظر ڈالتے ہی اس کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا تھا۔ دوسری سطر پر نظر ڈالے بغیر بھی وہ جانتی تھی وہ کون ہو سکتا ہے غصے کی ایک لہر اس کے اندر اتر آئی تھی اور سرخ چہرے کے ساتھ اس نے سالار سے کہا "ارک؟"

سالار نے سر ہلاتے ہوئے چائے کا گھونٹ لیا اور اس سے کہا۔ "سارا لیٹر پڑھو۔"

امامہ نے خط پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا "اسے پڑھے بغیر بھی میں جانتی ہوں اس نے کیا لکھا ہو گا۔" وہ پھر بھی خط پڑھ رہی تھی۔

سالار چونکا تھا۔ "تم سے بات کی ہے اس نے پہلے؟"

"نہیں میں پھر بھی جانتی ہوں۔" امامہ نے خط ختم کرتے ہوئے اسے تہ کر کے سالار کی طرف بڑھایا۔ وہ بہت خفا لگ رہی تھی۔

خط میں ارک نے حتی المقدور بے حد مناسب انداز میں سالار سکندر سے عنایہ کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ وہ اس سے کس قدر محبت کرتا تھا اور کیوں اس کے لیے عنایہ کا ساتھ ضروری تھا۔ پھر اس نے سالار کو جتایا تھا کہ وہ اس کے لیے کیا کیا کر سکتا تھا اور عنایہ کو وہ کتنا خوش رکھے گا۔

وہ خط اس کی اپنی بیٹی کے حوالے سے نہ لکھا گیا ہوتا تو سالار اس خط کو پڑھ کر محظوظ ہوتا ہنستا اور شاید ارک

سے چھیڑ چھاڑ بھی کرتا' لیکن وہ اس کی اپنی بیٹی کے حوالے سے تھا۔ بچگانہ ہوتے ہوئے بھی یہ مسئلہ بچگانہ نہیں رہا تھا۔

"عنایہ پسند کرتی ہے ایرک کو؟" جو پہلا خیال سالار کے ذہن میں آیا تھا وہ اب یہ آیا تھا۔

"تم کیسی باتیں کرتے ہو سالار۔ عنایہ بے چاری کو پتا تک نہیں ہے کہ یہ کیا خیالی پلاؤ پکا رہا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ مجھ سے کہتی۔ ایرک ایک فیملی فرینڈ ہے' بوائے فرینڈ نہیں ہے۔" امامہ نے بے حد ناگواری سے اس کے سوال کو بالکل رد کرتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ ضروری نہیں ہے امامہ' کہ ہمیں اپنی اولاد کے دل کی ہر بات پتا ہو۔"

امامہ نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا "مجھے ہے۔" وہ ہنس پڑا۔

"میں دن رات ان کے ساتھ رہتی ہوں سالار۔ تم نہیں رہتے۔ تم باپ ہو اولاد کو اور طرح جانتے ہو میں ماں ہوں ان کو اور طرح دیکھتی ہوں۔" اس نے سالار کے ہنسنے پر جیسے وضاحت کی تھی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو اس کے باوجود یہ ضروری نہیں ہے کہ چوبیس گھنٹے بھی اگر اولاد کو نظروں کے سامنے رکھا جائے تو ان کے دلوں کو بھی جانا جاسکے۔ میں خوش فہمیاں اور غلط فہمیاں دونوں ہی نہیں پالتا امامہ۔ باپ ہوں اس لیے حقیقت پسند ہو کر سوچ رہا ہوں۔ ماں کی طرح جذباتی ہو کر نہیں۔"

امامہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ دونوں کئی سالوں سے اکٹھے تھے اسے یہ خوش گمانی نہیں ہونی چاہیے تھی کہ عنایہ کو ایرک کی پسندیدگی کے بارے میں بالکل ہی اندازہ نہیں ہوگا۔ اس کا دل چاہا وہ کہہ دے تھا نہ ہو۔ لیکن سالار صحیح بات کہہ رہا تھا۔

"میں عنایہ سے پوچھ لوں گی۔" اس نے یک دم کہا۔

"کیا؟" سالار چائے پیتے پیتے رکا۔

"ایرک کے حوالے سے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیسے اس سے۔" وہ عجیب طرح سے الجھ کر رکی "وہ ابھی بچی ہے۔"

سالار اس کی بات پر ہنسا۔ "ہاں' یہ خط پڑھتے ہوئے میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ کوئی میری بیٹی کے بارے میں اس طرح سوچ بھی کیسے سکتا ہے۔ وہ ابھی بچی ہے۔ لیکن یہ زندگی ہے اور ہم امریکا میں رہ رہے ہیں جہاں آٹھ نو سال کے بچے بچیاں بھی بوائے فرینڈز اور گرل فرینڈز کے کانسیپٹ سے واقف ہیں۔ اس لیے ہمیں بھی کچھ زیادہ حقیقت پسندی سے اس صورت حال کو دیکھنا پڑے گا۔ تم ابھی عنایہ سے بات مت کرو۔ مجھے ایرک سے بات کرنے دو۔" سالار نے جیسے اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک حل نکالا۔

"اور اس سے مل کر تم کیا کرو گے؟" امامہ کو جیسے یہ حل پسند نہیں آیا تھا۔

"اسی حوالے سے گفتگو کروں گا۔ اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ یہ سب بچگانہ ہے اور کیوں ممکن نہیں ہے۔" سالار نے جواباً کہا۔

"دو تین سال پہلے بھی ایرک نے ایسی ہی بات کی تھی عنایہ کے بارے میں۔ تب بھی میں نے اسے سمجھایا تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا' وہ مسلمان نہیں ہے اور بے حد چھوٹا ہے لیکن میں زیادہ سختی سے منع اس لیے نہیں کر سکتی تھی اسے کیوں کہ اس وقت وہ اپنے باپ کی موت کی وجہ سے بہت اپ سیٹ تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی وہ اور اپ سیٹ ہو۔" امامہ نے سالار کو پہلی بار ایرک کے ساتھ ہونے والی وہ گفتگو بتائی تھی۔

سالار اس کی بات پر حیران ہوا "تم نے کیا کہا تھا تب اس سے؟"

"میں نے اس سے کہا کہ وہ ابھی صرف اپنی تعلیم پر توجہ دے اور مجھ سے وعدہ کرے کہ وہ عنایہ سے اس بارے

میں بات نہیں کرے گا' جب تک وہ اپنی تعلیم مکمل نہیں کر لیتا۔" امامہ نے اسے بتایا۔

"اور وہ مان گیا؟" سالار نے جواباً اس سے پوچھا۔ امامہ نے سر ہلا دیا۔

"اس نے عنایہ سے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی ورنہ وہ مجھے ضرور بتاتی۔" امامہ نے کہا۔

"اسی لیے اس نے خط میں ریفرنس دیا ہوا ہے کہ وعدے کے مطابق میں عنایہ کے بجائے آپ سے اپنی خواہش کا اظہار کر رہا ہوں۔۔۔ اور میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کس وعدے کا ریفرنس دے رہا ہے۔" سالار پہلی بار متاثر نظر آیا تھا۔ امامہ کے چہرے پر اب بھی سنجیدگی تھی۔

"میرا خیال ہے اب مجھے اس سے ضرور ملنا چاہیے' یہ ساری صورت حال بے حد دلچسپ ہے۔" سالار نے کہا اور امامہ نے برا منایا۔

"کیا دلچسپی ہے اس صورت حال میں؟ تمہیں زندگی میں ہمیشہ عجیب و غریب لوگ اور انوکھے حالات ہی اچھے لگتے ہیں۔" وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔۔۔ تم سے میری شادی اس کا ثبوت ہے۔۔۔ اور دیکھو پھر کتنی اچھی رہی ہے ہم دونوں کے لیے۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔۔۔ وہ حس مزاح جو اس کی شخصیت کا حصہ تھی' زندگی کے اتنے سال ساتھ گزارنے کے باوجود آج بھی اسے لاجواب کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا اور وقتاً فوقتاً اس کا مظاہرہ کرتا رہتا تھا۔

"تم اریک سے مل کر کیا کرنا چاہتے ہو؟" امامہ نے اس کے تبصرے کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"بات چیت کرنا چاہتا ہوں اس کی سچائی دیکھنا چاہتا ہوں اس پروپوزل کے حوالے سے۔"

وہ ہول کر رہ گئی تھی۔ "کیا مطلب ہے تمہارا سالار؟ تم ایک تیرہ سال کے بچے کے پروپوزل کی بات کر رہے ہو۔۔۔ ایک غیر مسلم کی۔۔۔ اور تم اپنی بیٹی کے لیے اسے کنسیڈر کرنے کی بات کر رہے ہو؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا؟ یہ مذاق نہیں ہے۔" امامہ نے بے حد خفا ہو کر اس سے کہا تھا۔

"ہاں میں جانتا ہوں' یہ مذاق نہیں ہے۔۔۔ وہ تیرہ سال کا بچہ ہے' یہ میں بھی جانتا ہوں۔۔۔ غیر مسلم ہے' یہ بھی میں جانتا ہوں۔۔۔ لیکن وہ تیرہ سال کا بچہ اگر دس گیارہ سال کی عمر میں بھی یہی پروپوزل دیتا ہے اور اپنے وعدے کی پاسداری کر رہا ہے تو پھر اسے غیر سنجیدگی سے نہیں لے سکتے۔" سالار اب سنجیدہ ہو گیا تھا۔ امامہ بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"تم عنایہ کے لیے اسے کنسیڈر نہیں کر سکتے۔۔۔ ڈونٹ ٹیل می کہ تم ایسا کر رہے ہو؟"

"میں صرف اس ایک آپشن کو دیکھ رہا ہوں جو زندگی میں پہلی بار میری بیٹی کے حوالے سے آیا ہے۔" سالار نے جواباً کہا تھا۔

"سالار میں کسی غیر مسلم کا آپشن اپنی بیٹی کے لیے کنسیڈر نہیں کروں گی۔" امامہ نے دو ٹوک انداز میں اس سے کہا۔ "مذاق میں بھی نہیں۔" سالار نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"کسی غیر مسلم کا آپشن میں بھی کنسیڈر نہیں کروں گا لیکن کسی ایسے غیر مسلم کا ضرور کروں گا جو مسلمان ہونے کی خواہش اور ارادہ رکھتا ہو۔" اس نے بھی اسی انداز میں کہا۔

"میں اس آپشن کو بھی کنسیڈر نہیں کروں گی۔۔۔ میں نہ آئیڈیلسٹ ہوں نہ ہی فینٹسی پر یقین رکھتی ہوں۔ میں اپنی بیٹی کو کسی مشکل صورت حال میں نہیں ڈالوں گی ایسے کسی ممکنہ رشتے کے ذریعہ۔" امامہ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

"ہم رسک دوسروں کے لیے لے سکتے ہیں' دوسروں کو نصیحتیں بھی کر سکتے ہیں اور دوسروں کو ایسے بڑے

کاموں پر اکسا بھی سکتے ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کر سکتے ہیں لیکن یہ سب چیزیں اپنے بچوں کے لیے ہم نہیں چاہ سکتے۔" وہ کہتی گئی۔

"میں نے تم سے شادی کر کے ایک رسک لیا تھا امامہ۔ مجھے بھی بہت روکا گیا تھا۔ بہت سارے وہم میرے دل میں بھی ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ دنیا میں لوگ ایسے رسک لیتے ہیں، لینے پڑتے ہیں۔" سالار نے جواباً اس سے جو کہا اس نے امامہ کی زبان سے سارے لفظ چھین کر اسے جیسے گونگا کر دیا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن اسے ارک کے ساتھ اپنا موازنہ اور اس انداز میں "اچھا نہیں لگا تھا۔

"ارک اور مجھ میں بہت فرق ہے۔ مذہب میں فرق ہو گا لیکن کلچر میں نہیں۔ ہم ہمسائے تھے "ایک جیسے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔"

وہ اپنے دفاع میں پرجوش دلائل دیتے دیتے ایک دم اپنا جوش کھوتی چلی گئی۔ اسے یک دم احساس ہوا تھا کہ اپنی دفاع میں دیا جانے والا اس کا ہر جواز اس کے اور ارک کے درمیان موجود مماثلت کو مزید ثابت کر رہا تھا۔

"میں ارک کے آپشن پر غور نہیں کر رہا۔ عبداللہ کے آپشن پر کر رہا ہوں۔ تیرہ سال کی عمر میں اپنی بیٹی کی کسی سے شادی نہیں کروں گا لیکن اگر تیرہ سال کی عمر میں بھی میری بیٹی کی وجہ سے کوئی میرے دین کی طرف راغب ہو رہا ہے تو میں صرف اس لیے اسے رد نہیں کروں گا کہ یہ میری غیرت اور معاشرتی روایات پر ضرب کے برابر ہے۔ مجھے معاشرے کو نہیں "اللہ کو منہ دکھانا ہے۔"

سالار نے جیسے ختم کرنے والے انداز میں بات کی تھی۔ امامہ قائل ہوئی یا نہیں، لیکن خاموش ہو گئی تھی۔ اس کی بات غلط نہیں تھی لیکن سالار کی بھی درست تھی۔ وہ دونوں اپنے تناظر میں سوچ رہے تھے اور دوسرے کے نظریے کو بھی سمجھ رہے تھے۔

وہ پہلا موقع تھا جب امامہ نے شکر ادا کیا تھا کہ وہ پاکستان جا رہے ہیں۔ عنایہ اور ارک ایک دوسرے سے دور ہو جاتے تو اس کے خیال میں ارک کے سر سے عنایہ کا بھوت بھی اتر جاتا۔ سالار کے برعکس وہ اب بھی یہ ماننے پر تیار نہیں تھی کہ ارک کی اسلام اور عنایہ میں دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اسے یقین تھا تیرہ سال کا وہ بچہ جو بیس پچیس سال کا ہوتے ہوتے زندگی کے بہت سارے نشیب و فراز سے گزرتا اور زندگی کی رنگینیوں سے بھی متعارف ہوتا پھر سالار سکندر کا خاندان اور اس خاندان کی ایک لڑکی عنایہ سکندر "ارک عبداللہ کو کہاں یاد رہتی اور اتنی یاد کہ وہ اس کے لیے اپنا مذہب چھوڑ کر اس کے پیچھے آتا؟" امامہ اس بات پر بھی اللہ تعالیٰ کی شکرگزار تھی کہ وہ سب کچھ یک طرفہ تھا اگر عنایہ اس کا حصہ ہوتی تو اس کی پریشانی اس سے سوا ہوتی۔



"ممی! ارک ہمارے ساتھ پاکستان جانا چاہتا ہے۔"

کچن میں کام کرتی امامہ ٹھٹک گئی۔ عنایہ اس کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹا رہی تھی' جب اس کے ساتھ کام کرتے کرتے اس نے اچانک امامہ سے کہا۔ امامہ نے گردن موڑ کر اس کا چہرہ بغور دیکھا تھا۔ عنایہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی' وہ ڈش واشر میں برتن رکھ رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے ارک نے تمہارے پاپا کو خط لکھا ہے۔" امامہ نے کریدنے والے انداز میں یک دم عنایہ سے کہا۔ وہ کچھ گلاس رکھتے ہوئے چونکی اور ماں کو دیکھنے لگی پھر اس نے کہا۔

"اس نے پاپا سے بھی یہی بات کی ہوگی۔ وہ بہت اپ سیٹ ہے۔ چند دنوں سے۔ ہر روز مجھ سے ریکویسٹ کر رہا ہے کہ یا تو اس کو بھی ساتھ لے جاؤں یا پھر خود بھی نہیں رہ جاؤں۔" اس کی بیٹی نے بے حد سادگی سے اس

سے کہا تھا۔ وہ اب دوبارہ برتن رکھنے میں مصروف ہو گئی تھی۔
امامہ اپنے جس خدشے کی تصدیق کرنا چاہ رہی تھی اس کی تصدیق نہ ہونے پر اس نے جیسے شکر کیا تھا۔ وہ خط کے مندرجات سے واقف نہیں تھی۔
"مجھے ارک پر ترس آتا ہے۔" عنایہ نے ڈش واشر بند کرتے ہوئے اس سے کہا۔ امامہ نے کچن کیبنٹ بند کرتے ہوئے ایک بار پھر اسے دیکھا عنایہ کے چہرے پر ہمدردی تھی اور ہمدردی کے علاوہ اور کوئی تاثر نہیں تھا اور اس وقت امامہ کو اس ہمدردی سے بھی ڈر لگا تھا۔
"کیوں ترس آتا ہے؟" امامہ نے کہا۔
"کیوں کہ وہ بہت اکیلا ہے۔" عنایہ نے جواباً کہا۔
"خیر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کی فیملی ہے۔ ممی بہن بھائی دوست۔ پھر اکیلا کہاں ہے۔"
"لیکن ممی وہ ان سب سے اس طرح کلوز تو نہیں ہے جس طرح ہم ہیں۔" عنایہ نے اس کا دفاع کیا۔
"تو یہ اس کا قصور ہے۔ وہ گھر میں سب سے بڑا ہے۔ اسے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کا خود خیال رکھنا چاہیے۔" امامہ نے جیسے ارک کو قصوروار ٹھہرانے کی کوشش کی۔
"اگر جبریل اپنی فیملی کے بجائے کسی دوسرے کی فیملی کے ساتھ اس طرح الیچ ہو کر یہ محسوس کرنے لگے کہ وہ اکیلا ہے تو تمہیں کیسا لگے گا؟" امامہ نے جیسے اسے ایک بے حد مشکل سوال حل کرنے کے لیے دے دیا تھا۔
عنایہ کچھ دیر کے لیے واقعی ہی بول نہیں پائی پھر اس نے بے حد مدھم آواز میں کہا۔
"ممی ارک، جبریل کی طرح خوش قسمت نہیں ہوتا۔" امامہ کو اس کا جملہ عجیب طرح سے چبھا۔ اس کی بیٹی نے شاید زندگی میں پہلی بار کسی دوسرے شخص کے بارے میں اپنی ماں کی رائے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے جیسے اس کا دفاع کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش نے امامہ کو پریشان کیا تھا۔
"ارک چھوٹا بچہ نہیں ہے عنایہ!" امامہ نے کچھ تیز آواز میں اس سے کہا۔ "وہ تیرہ سال کا ہے۔" اس نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔
عنایہ نے حیران ہو کر ماں کا چہرہ دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس جملے کا مطلب کیا ہے۔ واحد چیز جو عنایہ اخذ کر پائی تھی وہ یہ تھی کہ اس کی ماں کو اس وقت ارک کا تذکرہ اور اس کی زبان سے۔ اچھا نہیں لگا تھا لیکن یہ بھی حیران کن بات تھی کیوں کہ ارک کا ذکر ان کے گھر میں اکثر ہوتا تھا۔
"ممی کیا میں ارک کا خط پڑھ سکتی ہوں؟" غیر متوقع طور پر عنایہ نے فرمائش کی تھی جبکہ امامہ سمجھ رہی تھی وہ اب گفتگو کا موضوع بدل دے گی۔
"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔" امامہ نے حتمی انداز میں کہا، وہ اب اس موضوع کو شروع کرنے پر پچھتا رہی تھی۔
"حمین نے پڑھا ہو گا وہ خط۔ ارک اسے ایک خط دکھا رہا تھا۔ میرا خیال ہے یہ وہی خط ہو گا۔"
عنایہ نے کچن سے نکلتے ہوئے اس کے اوپر جیسے بجلی گرائی تھی۔
"حمین نے؟" امامہ کو یقین نہیں آیا۔
"ہاں۔ میں نے ارک اور اسے ساتھ بیٹھے کوئی کاغذ پڑھتے دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے یہ خط ہی ہو گا کیوں کہ ارک ہر کام اس سے پوچھ کر کر رہا ہے آج کل۔ بٹ آئی ایم ناٹ شیور۔" عنایہ نے اپنے ہی اندازے کے بارے میں خود ہی بے یقینی کا اظہار کیا۔
"ہر شیطانی کام کے پیچھے حمین ہی کیوں نکلتا ہے آخر؟" امامہ نے دانت پیستے ہوئے سوچا تھا، وہ اس وقت یہ

بھی بھول گئی تھی کہ اسے کچن میں کیا کام کرنا تھا۔ اسے اب یقین تھا کہ ارک کو اس خط کا مشورہ دینے والا حمین ہی ہو سکتا تھا۔



اور امامہ کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ خط ارک نے لکھا تھا اور حمین نے اسے ایڈٹ کیا تھا۔ اس نے اس خط کے ڈرافٹ میں کچھ جذباتی جملوں کا اضافہ کیا تھا اور کچھ حد سے زیادہ جذباتی جملوں کو حذف کیا تھا۔

ارک اس کے پاس ایک خط کا ڈرافٹ لایا تھا۔ یہ بتائے بغیر کہ وہ خط وہ سالار سکندر کے نام لکھنا چاہتا تھا' اس نے حمین سے مدد کی درخواست کی تھی کہ وہ ایک مسلم گرل فرینڈ کو پروپوز کرنا چاہتا تھا اور اس کے باپ کو خط لکھنا چاہتا تھا۔ حمین نے جواباً "اسے مبارک باد دی تھی۔ ارک نے اس سے کہا تھا کہ کیوں کہ وہ مسلم کلچر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا اس لیے اسے اس کی مدد درکار تھی اور حمین نے وہ مدد فراہم کی تھی۔

محمد حمین سکندر نے مسلمانوں کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے خط کو دوبارہ لکھا تھا اور ارک نے نہ صرف اس کا شکریہ ادا کیا تھا بلکہ جب سالار سکندر نے اسے ملاقات کی دعوت دی تو اس نے حمین کو اس بارے میں بھی مطلع کیا تھا۔ حمین کی ایکسائٹمنٹ کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس کا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ ارک کا یہ راز سب سے کہہ دے لیکن اس نے ارک سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس راز کو کسی سے نہیں کہے گا۔ عنایہ نے ایک آدھ دن اس گٹھ جوڑ کے بارے میں اسے کریدنے کی کوشش کی تو بھی اس نے صرف یہ کہا تھا کہ وہ ایک ضروری خط لکھنے میں ارک کی مدد کر رہا تھا' لیکن خط کس کے نام تھا اور اس میں کیا لکھا جا رہا تھا عنایہ کے کریدنے پر بھی حمین نے یہ راز نہیں اگلا تھا۔

"مجھے پتا ہے ارک نے وہ خط کس کے لیے لکھوایا تھا۔" عنایہ امامہ کے پاس سے ہو کر سیدھا حمین کے پاس پہنچی تھی۔

وہ اس وقت اپنے کمرے میں کمپیوٹر پر کوئی گیم کھیلنے میں مصروف تھا اور عنایہ کے اس تبصرے پر اس نے بے اختیار دانت پیستے ہوئے کہا۔

"مجھے پہلے ہی پتا تھا وہ کوئی راز نہیں رکھ سکتا۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ کسی کو نہ بتاؤں خاص طور پر تمہیں۔۔۔ اور اب تمہیں بتا دیا اس نے۔" حمین خفا تھا اس کا اندازہ یہی تھا کہ یہ راز ارک نے خود ہی فاش کیا ہوگا۔

"ارک نے مجھے نہیں بتایا۔۔۔ مجھے تو ممی نے بتایا ہے۔" اس بار حمین گیم کھیلنا بھول گیا تھا۔ اس کے ہیرو نے اس کے سامنے اونچی چٹان سے چھلانگ لگائی اور وہ اسے سمندر میں گرنے سے نہیں بچا پایا۔۔۔ کچھ ویسا ہی حال اس نے اپنا بھی اس وقت محسوس کیا تھا۔ ایک دن پہلے ہی اس کے اور ممی کے تعلقات میں پاکستان جانے کے فیصلے نے پھر سے گرم جوشی پیدا کی تھی اور اب یہ انکشاف۔

"ممی نے کیا بتایا ہے؟" حمین کے منہ سے ایسے آواز نکلی جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھا ہو۔

"ممی نے بتایا کہ ارک نے پاپا کو کوئی خط لکھا ہے اور مجھے فوراً" خیال آیا کہ جو خط تم پڑھ رہے تھے' وہ وہی ہو سکتا ہے۔"

عنایہ روانی میں بتا رہی تھی اور حمین کے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہونا کی مثال اس وقت اس پر صادق آ رہی تھی۔ ایسی کون سی مسلم گرل فرینڈ بن گئی یک دم ارک کی جس کے باپ کو خط لکھوانے کے لیے اس کی ضرورت پڑی جبکہ چوبیس گھنٹے وہ اگر کسی کے گھر بھی آتا تھا تو وہ خود ان ہی کا گھر تھا پھر اس کی عقل میں یہ بات کیوں نہیں آئی یا جوش میں اتنا ہی اندھا ہو گیا تھا کہ اس نے یہ سوچ لیا کہ ارک کبھی عنایہ کے حوالے

سے ایسا کچھ نہیں سوچ سکتا۔ حمین اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا۔ اور ملامت بڑا چھوٹا لفظ تھا ان الفاظ کے لیے جو وہ اس وقت اپنے اور ارک کے لیے استعمال کر رہا تھا۔

"تم بول کیوں نہیں رہے؟" عنایہ کو اس کی خاموشی کھٹکی تھی۔

"میں نے سوچا ہے میں اب کم بولوں اور زیادہ سوچوں۔ حمین نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے اس وقت وہ خبر پہنچائی جس پر اسے یقین نہیں آیا۔

"خواب دیکھتے رہو۔" اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو چڑانے والے انداز میں کہا۔

"ممی نے تمہیں بتایا اس خط میں کیا ہے؟" حمین اس وقت گلے گلے تک اس دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔

"نہیں، لیکن میں نے انہیں بتایا کہ یہ خط حمین کی مدد سے لکھا گیا ہوگا میں اس سے پوچھ لوں گی۔ اس خط میں کیا لکھا تھا ارک نے پاپا کو؟"

عنایہ اب اس سے پوچھ رہی تھی۔ حمین بے اختیار کراہا تھا۔ وہ مصیبت کو دعوت نہیں دیتا تھا۔ مصیبت خود آکر اس کے گلے کا ہار بن جاتی تھی۔



ارک کو سالار نے خود دروازے پر ریسیو کیا تھا وہ ویک اینڈ تھا اور اس وقت ان کے بچے سائیکلنگ کے لیے نکلے ہوئے تھے گھر پر صرف امامہ اور سالار تھے۔

"یہ آپ کے لیے۔" ارک نے اپنے ایک ہاتھ میں پکڑے چند پھول جو گلدستے کی شکل میں بندھے ہوئے تھے اس کی طرف بڑھائے۔

سالار نے ایک نظر ان پھولوں پر ڈالی اسے یقین تھا اس میں سے کچھ پھول۔ اسی کے لان سے لیے گئے تھے لیکن اس نے اسے نظرانداز کیا تھا۔

"اس کی ضرورت نہیں تھی۔" اس نے اسے اندر لاتے ہوئے شکریہ کے بعد کہا۔ ارک فارمل میٹنگ کے لیے آیا تھا اور آج پہلی بار سالار نے اسے فارمل انداز میں دیکھا تھا۔

"بیٹھو!" سالار نے اسے وہیں لاؤنج میں ہی بیٹھنے کے لیے کہا۔ ارک بیٹھ گیا۔ سالار اس کے بالمقابل بیٹھا اور اس کے بعد اس نے ٹیبل پر پڑا ایک لفافہ کھولا۔ ارک نے پہلی بار غور کیا وہ اسی کا خط تھا اور سالار اب اس خط کو دوبارہ کھول کے دیکھ رہا تھا۔ ارک بے اختیار نروس ہوا تھا۔ خط لکھ کر بھیجنا اور بات تھی اور اسی خط کو اس بندے کے ہاتھ میں دیکھنا جس کے نام وہ لکھا گیا تھا دوسری۔

سالار نے ایک ڈیڑھ منٹ لیا پھر اس خط کو ختم کرتے ہوئے ارک کو دیکھا۔ ارک نے نظریں ہٹالیں۔

"کیا عنایہ کو پتا ہے تمہاری اس خواہش کے بارے میں؟" سالار نے بے حد براہ راست سوال کیا تھا۔

"میں نے مسز سالار سے وعدہ کیا تھا کہ میں عنایہ سے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کروں گا اس لیے میں نے آپ کو خط لکھا۔" ارک نے جواباً کہا۔ سالار نے سر ہلایا اور پھر کہا۔

"اور یہ واحد وجہ ہے جس کی وجہ سے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔ تمہارا خط پھاڑ کر نہیں پھینکا۔ تم وعدہ کر کے نبھا سکتے ہو، یہ بہت اچھی کوالٹی ہے۔"

سالار سنجیدہ تھا اور اس نے بے دھڑک انداز میں ارک کی تعریف کی تھی، لیکن اس کے لہجے اور چہرے کی سنجیدگی نے ارک کو خائف کیا تھا۔

"تو تم عنایہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" سالار نے اس خط کو اب واپس میز پر رکھ دیا تھا اور اس کی نظریں ارک پر

چینلز اس وقت اس انٹرویو کو بریکنگ نیوز کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ صرف دس منٹوں میں دنیا بھر میں سالار سکندر اور SIF ایک بار پھر زبان زد عام ہونے والی تھی اور اس بار یہ "شہرت" نہیں رسوائی تھی جو اس خاندان کے حصے میں آنے والی تھی۔

"وہ بڑا آدمی کون تھا؟" انٹرویو نے غلام فرید سے اگلا سوال کیا۔

"میں اس کا چوکیدار تھا" اس کے اسکول کا۔ اس نے مجھے اس لیے وہاں سے نکال دیا کہ اس کے میری بیوی سے تعلقات تھے۔"

انٹرویو کرنے والے نے غلام فرید کو ٹوکا۔ "اس بڑے آدمی کا نام کیا تھا؟"

"سالار سکندر" غلام فرید نے بے حد روانی سے کہا۔

دنیا بھر کی ٹی وی اسکرینز پر عین اسی لمحے سالار سکندر کی تصویر نمودار ہوئی تھی اور پھر اس کے چند لمحے بعد رئیسہ سالار کی۔ بیک وقت۔ ایک ہی جیسی تصویریں۔

وہ CIA کا اسٹنگ آپریشن نہیں تھا۔ وہ انھوں نے پوری قوت اور طاقت سے مغربی انٹیلی جنس ایجنسیز کے اشتراک سے دنیا کے کامیاب ترین اسلامی مالیاتی نظام کے بانی اور SIF کی بنیادوں پر دن دہاڑے حملہ کیا تھا۔

"غلام فرید تم کیا چاہتے ہو؟" انٹرویو لینے والا اب اس سے پوچھ رہا تھا۔

غلام فرید ایک لحظہ کے لیے رکا پھر اس نے کہا۔ "سالار سکندر کے لیے پھانسی کی سزا۔"



نیروبی کے اس فائیو اسٹار ہوٹل میں ہونے والی تقریب افریقہ کی تاریخ کے یادگار ترین لمحوں میں سے ایک تھی۔ کچھ گھنٹوں کے لیے دنیا کی تمام اسٹاک مارکیٹس جیسے اس ایک تقریب پر فوکس کرکے بیٹھ گئی تھیں جہاں SIF حمین سکندر کی کمپنی TAI کے ساتھ مل کر افریقہ میں دنیا کے سب سے بڑے مالیاتی فنڈز کے قیام کا اعلان کرنے والی تھی۔ وہ انضمام نہیں تھا اشتراک تھا اور دنیا کا کوئی بڑا مالیاتی ادارہ نہیں تھا جس کا سربراہ وہاں اس فائیو اسٹار ہوٹل کے بینکوئٹ ہال میں موجود نہ ہو۔ وہاں دنیا کے بہترین دماغ تھے' اپنی اپنی فیلڈز کے نامور لوگ اور ان لوگوں کے جمگھٹے میں وہاں سالار سکندر اور حمین سکندر اس گلوبل فنڈ کا اعلان کرنے والے تھے۔ جس کی مالیت دنیا کے تمام بڑے مالیاتی اداروں کو پچھاڑنے والی تھی۔

9:14 پر بھی ٹیلی اسکوپ کی آنکھ سے اس ٹارگٹ کو وہ "مہمان" لفٹ کے دروازے سے نمودار ہوتا نظر نہیں آیا۔ لیکن وہ دم سادھے "آنکھ" ٹیلی اسکوپ پر لگائے ایک انگلی ٹریگر پر رکھے لفٹ کا دروازہ کھلنے کا منتظر تھا۔

دس۔ نو۔ آٹھ۔ سات۔ چھ۔ پانچ۔ چار۔ تین۔ دو۔ ایک۔

(آخری قسط ان شاءاللہ آئندہ ماہ)

فرسٹ رہا کرتی تھی۔ نساء جبریل کی کلاس فیلو تھی اور اس سے "شدید" متاثر اور مرعوب۔ اس کے باوجود کہ وہ خود ایک شان دار تعلیمی کیریر رکھنے والی طالبہ تھی۔

عائشہ فیس بک پر اپنی بہن کی وال پر اکثر جبریل کے کمنٹس پڑھتی تھی جو وہ اس کی بہن کے اسٹیٹس اپ ڈیٹس پر دیتا رہتا تھا۔ عائشہ بھی کئی بار ان اپ ڈیٹس پر تبصرہ کرنے والوں میں سے ہوتی تھی، لیکن جبریل سکندر کی حس مزاح کا مقابلہ وہاں کوئی بھی نہیں کر پاتا تھا۔ اس کے کمنٹس نساء عابدین کی وال پر بالکل الگ چمکتے نظر آتے تھے اور جب وہ کسی وجہ سے وہاں تبصرہ نہیں کر پاتا تو کئی بار اس کے کلاس فیلوز کے تبصروں کی لمبی قطار کے بیچ میں جبریل کی خاموشی اور غیر حاضری کو بری طرح محسوس کیا جاتا اور ان محسوس کرنے والوں میں سرفہرست عائشہ عابدین تھی جسے خود بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ جبریل کے کمنٹس پڑھتے پڑھتے اس کی عادی ہو گئی تھی۔

نساء کے ساتھ جبریل کی مختلف فنکشنز اور سرگرمیوں میں اکثر بہت ساری گروپ فوٹوز نظر آتی تھیں، لیکن عائشہ کو ہمیشہ جبریل کی فیملی کے بارے میں تجسس رہا تھا۔ وہ سالار سکندر سے واقف تھی۔ کیونکہ اس کا تعارف نساء نے ہی کروایا تھا، لیکن اس کی فیملی کے باقی افراد کو دیکھنے کا اسے بے حد اشتیاق تھا اور یہی اشتیاق اسے بار بار جبریل کی فرینڈز لسٹ میں نہ ہونے کے باوجود اس کی تصویروں کو کھوجنے کے لیے مجبور کرتا تھا، جہاں اسے رسائی حاصل تھی۔ کچھ تصویریں وہ دیکھ سکتی تھی۔ کچھ وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لیکن ان تصویروں میں جن تک اسے رسائی حاصل تھی ان میں جبریل کی فیملی کی تصاویر نہیں تھیں۔

جبریل بھی غائبانہ طور پر عائشہ سے واقف تھا اور اس تعارف کی وجہ فیس بک پر نساء کے اسٹیٹس پر ہونے والے تبصروں میں ان کا حصہ لینا تھا اور نساء نے اپنی وال پر جبریل کو اپنی بہن سے متعارف کروایا تھا۔ وہ غائبانہ تعارف بس اتنا ہی رہا تھا، کیونکہ جبریل نے بھی اس کی آئی ڈی کھوجنے کی کوشش نہیں کی اور عائشہ کی اپنی وال پر تصویریں بہت کم تھیں اس سے بھی زیادہ کم وہ لوگ تھے جنہیں اس نے اپنی کانٹیکٹ لسٹ میں ایڈ کیا ہوا تھا۔ نساء کے برعکس اس کا حلقہ احباب بے حد محدود تھا اور اس کی کوشش بھی یہ ہی رہتی تھی کہ وہ اسے اتنا ہی محدود رکھے۔

عائشہ کو جبریل کے بارے میں ہمیشہ یہ غلط فہمی رہی کہ وہ نساء میں انٹرسٹڈ ہے اور اس تاثر کی بنیادی وجہ خود نساء تھی جو اس بات کو تسلیم کرنے میں بھی تامل نہیں کرتی تھی کہ عمر میں اس سے چھوٹا ہونے کے باوجود وہ جبریل کو پسند کرتی تھی۔ ایک دوست کے طور پر جبریل کی اس سے بے تکلفی اور دوستی تھی۔ ایسی ہی بے تکلفی جیسی اس کی اپنے دوسرے ہم جماعتوں سے بھی تھی، اور نساء نے کبھی اس بے تکلفی کو غلط معنوں میں نہیں لیا تھا۔ کیونکہ جبریل لڑکیوں کے ساتھ بے تکلفی اور دوستی میں بھی بہت ساری حدود و قیود رکھتا تھا اور بے حد محتاط تھا۔

نساء عمر میں اس سے چار سال بڑی تھی۔ وہ اپنے قد کاٹھ اور پختگی دونوں سے چندرہ سولہ سال کا نہیں لگتا تھا اور نساء یہ بھی جانتی تھی۔ یونی ورسٹی میں اتنا وقت گزار لینے کے باوجود جبریل ابھی تک گرل فرینڈ نامی کسی بھی چیز کے بغیر تھا تو ایسے حالات میں سالار سکندر کی اس لائق اولاد پر قسمت آزمائی کرنے کے لیے کوئی بھی تیار ہو سکتا تھا۔ صرف نساء ہی نہیں۔

عائشہ عابدین ان سب چیزوں سے واقف تھی۔ نساء کی جبریل میں دلچسپی ان کے گھر میں ایک کھلا راز تھا، لیکن ان دونوں کے مستقبل کے حوالے سے نہ تو ان کو کوئی مغالطہ تھا نہ ہی کسی اور کو۔ نساء ذہانت اور قابلیت سے متاثر ہونے والوں میں سے تھی اور جبریل سکندر وہ پہلا شخص نہیں تھا جس نے اسے متاثر کیا تھا، مگر فی الحال یہ جبریل ہی تھا جس کا ذکر وہ کرتی رہتی تھی۔

عائشہ عابدین ایک غیر جانب دار مبصر کی طرح یہ سب کچھ دیکھتی آرہی تھی اور جب وہ جبریل سے ملی تو وہ اس سے

پہلے ہی بہت متاثر تھی۔
یونی ورسٹی کے ایک فنکشن میں وہ پہلی بار جبریل سے بالآخر ملنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ نساء کو اندازہ نہیں تھا کہ عائشہ صرف جبریل سے ملنے کے لیے اس کے ساتھ یونی ورسٹی آنے پر تیار ہوئی ہے ورنہ وہ جب بھی امریکہ آتی ان سب کی کوششوں کے باوجود اپنی مرضی کی جگہوں کے علاوہ کہیں نہیں جاتی تھی۔ یونی ورسٹی میں ہونے والی کوئی تقریب تو وہ شاید وہ آخری چیز تھی جس کے لیے عائشہ یونی ورسٹی آتی اور نساء نے یہ بات جبریل سے اسے متعارف کراتے ہوئے کہہ بھی دی تھی۔
جبریل سکندر وہ پہلا لڑکا تھا جسے دیکھنے کا عائشہ عابدین کو اشتیاق ہوا تھا اور جبریل سکندر ہی وہ پہلا لڑکا تھا جسے عائشہ عابدین اپنے ذہن سے نکالنے میں اگلے کئی سال تک کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ تصویریں بھی کبھار کسی شخص کی شخصیت اور وجاہت کو کیموفلاج کر دیتی ہیں۔ اور بہت اچھا کرتی ہیں۔ محمد جبریل سکندر سحرانگیز کرشماتی شخصیت کا مالک تھا۔ خطرناک حد تک متاثر اور مرعوب کرنے والی شخصیت، سولہ سال کی عمر میں بھی وہ تقریباً چھ فٹ قد کے ساتھ سالار سکندر کی گہری سیاہ آنکھیں اور اپنی ماں کے تیکھے نین نقوش اور بے حد بھاری آواز کے ساتھ ایک عجیب ٹھہراؤ کا منبع دکھتا تھا۔ ایک بے حد معمولی ڈارک بلو جینز اور دھاری دار بلیک اینڈ وائٹ ٹی شرٹ میں ملبوس جبریل سکندر مسکراتا ہوا پہلی بار عائشہ عابدین سے مخاطب ہوا تھا اور وہ بری طرح نروس ہوئی تھی۔ وہ نروس ہونا نہیں چاہتی تھی، لیکن جبریل سے وہاں کھڑے صرف مخاطب ہونا بھی اسے اس کے قدموں پر کھڑے رہنا دشوار کر رہا تھا۔ وہ صرف نساء ہی نہیں کسی بھی عمر کی کسی بھی لڑکی کو پاگل کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ عائشہ عابدین نے دل ہی دل میں اعتراف کیا تھا۔
”کیوں؟ آپ کو اچھا نہیں لگتا امریکہ آ کر گھومنا پھرنا؟“ اس نے نساء کے کسی تبصرے پر عائشہ سے پوچھا تھا۔
”نہیں، مجھے اچھا لگتا ہے، لیکن بہت زیادہ نہیں۔“ وہ گڑبڑائی۔ اس نے خود کو سنبھالا پھر جبریل کے سوال کا جواب دیا جس کی آنکھیں اسی پر ٹکی ہوئی تھیں۔
وہ اب سینے پر بازو لپیٹے ہوئے تھا۔ وہ اس کے جواب پر مسکرایا تھا پھر اس نے نساء کو فنکشن کے بعد عائشہ کے ساتھ کسی ریسٹورنٹ میں کافی کی دعوت دی تھی جو نساء نے قبول کر لی تھی، وہ دونوں اپنے کچھ دوستوں کا انتظار کرتے ہوئے گپ شپ میں مصروف ہو گئے تھے۔
عائشہ ایک بار پھر غیر جانب دار مبصر بن گئی تھی۔ نساء حاکم مزاج لڑکی تھی اور گھر میں وہ ہر کام اپنی مرضی اور اپنے طریقے سے کرنے کی عادی تھی، لیکن عائشہ نے محسوس کیا تھا، نساء جبریل کے ساتھ اس طرح نہیں کر رہی تھی۔ وہ اس کی پوری بات سن کر کچھ کہتی اور اس کی بہت سی باتوں سے اتفاق کر رہی تھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے، عائشہ عابدین کو وہ بے حد اچھے لگ رہے تھے۔ ایک پرفیکٹ کپل۔ جس پر اسے رشک آ رہا تھا اور جبریل سے اس طرح متاثر ہونے کے باوجود وہ اسے نساء کی زندگی کے ساتھی کے طور پر ہی دیکھ رہی تھی۔ نساء کا ذوق اور انتخاب ہر چیز میں اچھا اور منفرد تھا اور جبریل اس کا ایک اور ثبوت تھا۔
فنکشن کے بعد وہ نساء اور جبریل کے کچھ دوستوں کے ساتھ ایک کیفے میں کافی پینے گئی تھی۔ یہ ایک اتفاق تھا یا خوش قسمتی کہ چھ افراد کے اس گروپ میں جبریل اور عائشہ کی نشستیں ایک دوسرے کے ساتھ تھیں۔ نساء جبریل کے بالمقابل میز کے دوسری جانب تھی اور عائشہ کے دوسری طرف نساء کی ایک اور دوست سوزین۔
عائشہ عابدین کی گھبراہٹ اب اپنی انتہا پر تھی۔ وہ اس کے اتنے قریب تھی کہ اس کے پرفیوم کی خوشبو محسوس کر رہی تھی۔ ٹیبل پر دھرے اس کے ہاتھ کی کلائی میں بندھی گھڑی کے ڈائل پر ٹک ٹک کرتی سوئی دیکھ سکتی تھی، لیکن اگر وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی تو وہ گردن موڑ کر اسے اتنے قریب سے دیکھنا تھا۔ وہ غلط جگہ بیٹھ گئی تھی۔

عائشہ عابدین کو مینیو دیکھتے ہوئے احساس ہوا تھا۔
جبریل میزبان تھا اور وہ سب ہی سے پوچھ رہا تھا اس نے عائشہ سے بھی پوچھا تھا۔ عائشہ کو مینیو کارڈ پر اس وقت کچھ بھی لکھا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ جو دکھ رہا تھا وہ اس احساس سے غائب ہو گیا تھا کہ وہ گردن موڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔
"جو سب لیں گے میں بھی لے لوں گی۔" عائشہ نے جیسے سب سے محفوظ حل تلاش کیا تھا جبریل مسکرایا اور اس نے اپنا اور اس کا آرڈر ایک ہی جیسا نوٹ کروایا۔ وہ ایک وہی مچھلی تھا جسے اس نے ڈرنکس کے ساتھ آرڈر کیا تھا اور بعد میں کافی کے ساتھ چاکلیٹ موز۔ نساء اپنا آرڈر پہلے دے چکی تھی اور باقی سب لوگ بھی اپنے آرڈر نوٹ کروا رہے تھے۔ بیف برگر۔ شریمپس۔ اسٹفڈ ٹرکی۔ یہ امریکن دوستوں کے آرڈر تھے۔ نساء نے ایک سالمن سینڈوچ منگوایا تھا۔
"میں اس سال میڈیکل میں چلی جاؤں گی۔ میرا ایڈمیشن ہو گیا ہے۔" دوران گفتگو جبریل کے سوال پر یک دم اس نے بتایا۔
"فنٹاسٹک۔" اس نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ خود بھی میڈیسن میں ہی جا رہا تھا۔
وہ سب لوگ گفتگو میں مصروف تھے اور اس گفتگو میں اس کی خاموشی کو جبریل ہی وقتاً فوقتاً "ایک سوال سے توڑتا۔ وہ جیسے اسے بوریت سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر شامل کرنے کی۔ اور عائشہ نے یہ چیز محسوس کی تھی۔ وہ جن ٹین ایجرز کو جانتی تھی وہ اور طرح کے تھے۔ یہ اور طرح کا تھا۔
کھانا آنے پر وہ اسی طرح گفتگو میں مصروف خود کھانے کے ساتھ ساتھ عائشہ کو بھی سرو کرتا رہا۔ یوں جیسے وہ روٹین میں یہ سب کرنے کا عادی رہا ہو۔
محمد جبریل سکندر سے ہونے والی وہ پہلی ملاقات اور اس میں ہونے والی ایک ایک چیز عائشہ عابدین کے ذہن اور دل دونوں پر نقش ہو گئی تھی۔
"جس بھی لڑکی کا یہ نصیب ہو گا' وہ بے حد خوش قسمت ہو گی۔" اس نے بے حد دل سے خواہش اور دعا کی تھی۔
اس عمر میں بھی اس نے اپنی زندگی کے حوالے سے کچھ بھی سوچنا شروع نہیں کیا تھا۔ اگر کرتی تو جبریل وہ پہلا لڑکا ہوتا کہ اس جیسے شخص کی خواہش وہ اپنے لیے کرتی۔ جبریل نے اس کے لاشعور کو اس پہلی ملاقات میں اس طرح متاثر کیا تھا۔
"میں تمہارے لیے بہت دعا کر رہی ہوں نساء۔ کہ تمہاری شادی جبریل سے ہو جائے۔ جب بھی ہو۔ وہ بہت اچھا ہے۔" اس کینے سے اس شام گھر واپس آنے کے بعد عائشہ نے نساء سے کہا تھا۔ وہ جواباً ہنسی۔
"خیر ابھی شادی وغیرہ کا تو کوئی سین نہیں ہو سکتا ہم دونوں کے لیے۔ وہ بہت ینگ ہے اور مجھے اپنا کیریئر بنانا ہے۔ لیکن مجھے وہ بہت پسند ہے۔ اور اگر کبھی بھی اس نے مجھ سے کچھ کہا تو میں انکار نہیں کروں گی۔ کون انکار کر سکتا ہے جبریل کو۔" اپنے بیڈ روم میں کپڑے تبدیل کرنے کے لیے نکالتے ہوئے نساء نے اس سے کہا۔
"اس کے ماں' باپ نے بہت اچھی تربیت کی ہے اس کی۔ تم نے دیکھا' وہ کس طرح تمہیں توجہ دے رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں میں بھی اپنے ساتھ کوئی گیسٹ لے کر گئی ہوں اور جبریل نے اسے اس طرح توجہ نہ دی ہو۔" عائشہ کا دل عجیب انداز میں بجھا۔ تو وہ توجہ سب ہی کے لیے ہوتی تھی اور عادت تھی مہمانی میں۔ اس نے کچھ مایوسی سے سوچا۔
"تمہیں پتا ہے مجھے کیوں اچھا لگتا ہے وہ؟" نساء اس سے کہہ رہی تھی۔ "وہ حافظ قرآن ہے۔ بہت باعمل

ہے۔ کبھی تم اس کی تلاوت سنو۔ لیکن الٹرا مذہبی ہونے کے باوجود وہ بہت لبرل ہے۔ تنگ نظر نہیں ہے جیسے بہت سارے مسلم ہو جاتے ہیں۔ نہ ہی اس کو میں نے کبھی دوسروں کے حوالے سے شدت پسند پایا ہے۔ مجھے نہیں یاد کبھی اس نے میرے یا کسی اور فی میل کلاس فیلو کے لباس کے حوالے سے کچھ کہا ہو۔ یا ویسے کسی کے بارے میں کمنٹ کیا ہو۔ کبھی نہیں۔"

نساء کہتی جا رہی تھی۔ وہ لباس کے معاملے میں خاصی ماڈرن تھی اور اسے یہ قابل قبول نہیں تھا کہ کوئی اس پر اس حوالے سے کوئی قدغن لگائے اور جبریل میں اسے یہ خوبی بھی نظر آگئی تھی۔ عائشہ بالکل کسی سحرزدہ معمول کی طرح یہ سب سن رہی تھی۔ نساء کے انکشافات نے جیسے عائشہ کے لیے اس کی زندگی کے آئیڈیل لائف پارٹنر کی چیک لسٹ میں موجود خوبیوں کی تعداد بڑھا دی تھی۔

وہ فجر کے وقت نماز کے لیے اٹھی تھی اور اس وقت نماز پڑھنے کے بعد اس نے ایک بار پھر فیس بک چیک کیا تھا اور خوشی کی ایک عجیب لہر اس کے اندر سے گزری تھی وہ ایڈ ہو چکی تھی اور جو پہلا کام عائشہ نے کیا تھا' وہ اس کی تصویروں میں اس کی فیملی کی تصویروں کی تلاش تھی اور اسے ناکامی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے اکاؤنٹ میں اس کی فیملی کی بہت ساری تصاویر تھیں۔ سالار سکندر کی۔ حجاب میں ملبوس امامہ کی۔ اس کی خوبصورت بہن حنایہ کی۔ حمین کی۔ اور رئیسہ کی۔ جبریل کے انکلز اور کزنز کی جو ان کی فیملی کے برعکس بے حد ماڈرن نظر آرہے تھے' لیکن ان سب میں عجیب ہم آہنگی نظر آرہی تھی۔

وہ جبریل سکندر سے دوستی کرنا چاہتی تھی' لیکن وہ ہمت نہیں کرپائی تھی۔ لیکن وہ اور اس کی فیملی یکدم جیسے اس کے لیے ایک آئیڈیل فیملی کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ ایسی فیملی جس کا وہ حصہ بننا چاہتی تھی۔ وہ اس فیملی کا حصہ نہیں بن سکی تھی' لیکن عائشہ عابدین کو احسن سعد اور اس کی فیملی سے پہلی بار متعارف ہو کر بھی ایسا ہی لگا تھا کہ وہ جبریل سکندر جیسا خاندان تھا۔ اور احسن سعد' جبریل سکندر جیسا مرد۔ قابل' باعمل مسلمان' حافظ

قرآن۔

عائشہ عابدین نے جبریل سکندر کے دھوکے میں احسن سعد کو اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔



اس کتاب کا پہلا باب اگلے نو ابواب سے مختلف تھا۔ اسے پڑھنے والا کوئی بھی شخص یہ فرق محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ پہلا باب بدل دیا تھا۔ نم آنکھوں کے ساتھ اس نے پرنٹ کی دہائی۔ پرنٹر برق رفتاری سے وہ پچاس صفحے نکالنے لگا جو اس کتاب کا ترمیم شدہ پہلا باب تھے۔

اس نے ٹیبل پر پڑی ڈسک اٹھائی اور بے حد تھکے ہوئے انداز میں اس پر ایک نظر ڈالی۔ پھر اس نے اسے دو ٹکڑوں میں توڑ ڈالا۔ پھر چند اور ٹکڑے۔ اپنی ہتھیلی پر پڑے ان ٹکڑوں کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اس نے انہیں ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

ڈسک کا کور اٹھا کر اس نے زیر لب اس پر لکھے چند لفظوں کو پڑھا۔ پھر چند لمحے پہلے لیپ ٹاپ سے نکالی ہوئی ڈسک اس نے اس کور میں ڈال دی۔

پرنٹر تب تک اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ اس نے ٹرے میں سے ان صفحات کو نکال دیا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ اس نے انہیں ایک فائل کور میں رکھ کر انہیں دوسری فائل کورز کے ساتھ رکھ دیا جن میں اس کتاب کے باقی نو ابواب تھے۔

ایک گہرا سانس لیتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کھڑے ہو کر اس نے ایک آخری نظر اس لیپ ٹاپ کی مدھم پڑتی اسکرین پر ڈالی۔

اسکرین تاریک ہونے سے پہلے اس پر ایک تحریر ابھری تھی۔ "ول بی ویٹنگ"

اس کی آنکھوں میں ٹھہری نمی یک دم چھلک پڑی تھی۔ وہ مسکرا دی۔ اسکرین اب تاریک ہونے لگی۔ اس نے پلٹ کر ایک نظر کمرے کو دیکھا، پھر بیڈ کی طرف چلی آئی۔ ایک عجیب سی تھکن اس کے وجود پر چھانے لگی تھی۔ اس کے وجود یا ہر چیز پر۔ بیڈ پر بیٹھ کر چند لمحے اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی چیزوں پر نظر دوڑائی۔

وہ جانے کب وہاں اپنی رسٹ واچ چھوڑ گیا تھا۔ شاید رات کو جب وہ وہاں تھا وہ وضو کرنے گیا تھا۔ پھر شاید اسے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ وہ رسٹ واچ اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ سیکنڈز کی سوئی کبھی نہیں رکتی، صرف منٹ اور گھنٹے ہیں جو رکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سفر ختم ہوتا ہے۔ سفر شروع ہو جاتا ہے۔

بہت دیر تک اس گھڑی پر انگلیاں پھیرتی وہ جیسے اس کے لمس کو کھوجتی رہی۔ وہ لمس وہاں نہیں تھا۔ وہ اس کے گھر کی واحد گھڑی تھی جس کا ٹائم بالکل ٹھیک ہوتا تھا۔ صرف منٹ نہیں۔ سیکنڈز تک۔ کاملیت اس گھڑی میں نہیں تھی اس شخص کے وجود میں تھی جس کے ہاتھ پر وہ ہوتی تھی۔

اس نے آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے اس گھڑی کو دوبارہ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ کمبل اپنے اوپر کھینچتے ہوئے وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے لائٹ بند نہیں کی تھی۔ اس نے دروازہ بھی مقفل نہیں کیا تھا۔ وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بعض دفعہ انتظار بہت "لمبا" ہوتا ہے۔ بعض دفعہ انتظار بہت مختصر ہوتا ہے۔

اس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔ وہ اسے نیند سمجھ رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے وہ اسے چاروں طرف پھونک رہی تھی۔ جب اسے وہ یاد آیا۔ وہ اس وقت وہاں ہوتا تو اس سے آیت الکرسی اپنے اوپر پھونکنے کی فرمائش کرتا۔

بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑے ایک فوٹو فریم کو اٹھا کر اس نے بڑی نرمی کے ساتھ اس پر پھونک ماری۔ پھر فریم کے شیشے

پر نظر نہ آنے والی گرد کو اپنی انگلیوں سے صاف کیا' چند لمحے تک وہ فریم میں اس ایک چہرے کو دیکھتی رہی' پھر اس نے اس کو دوبارہ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ سب کچھ جیسے ایک بار پھر سے یاد آنے لگا تھا۔ اس کا وجود ایک بار پھر سے ریت بننے لگا تھا۔ آنکھوں میں ایک بار پھر سے نمی آنے لگی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ "اسے" بہت دیر ہو گئی تھی۔

امامہ نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولی تھیں۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ سالار اس کے برابر میں سو رہا تھا۔ اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی' رات کا آخری پہر تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ عجیب خواب تھا۔۔۔ وہ کس کا انتظار کر رہی تھی' اسے خواب میں بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ کتاب کے وہ دس ابواب سالار کے تھے۔۔۔ وہ کتاب سالار ہی لکھ رہا تھا اور ابھی تک اس کے نو ابواب لکھے جا چکے تھے۔۔۔ دسواں نہیں۔۔۔ وہ گھڑی بھی سالار کی تھی اور سالار نے حمین کی پچھلی برتھ ڈے پر اس کی ضد اور اصرار پر اسے دی تھی اور اب وہ گھڑی حمین باندھتا تھا۔۔۔ اور اس نے خواب میں اپنے آپ کو بوڑھا دیکھا تھا' وہ اس کا مستقبل تھا۔ وہ کسی کو یاد کر رہی تھی' کسی کے لیے اداس تھی۔ مگر کس کے لیے۔۔۔ اور وہ کس کا انتظار کر رہی تھی اور کوئی نہیں آ رہا تھا۔۔۔ مگر کون۔۔۔ اور پھر وہ ٹیرس والی ویٹنگ خواب کی ایک ایک تفصیل کو دہرا رہی تھی۔ ایک ایک جزئیات کو دہرا سکتی تھی۔

وہ بستر سے اٹھ گئی بے حد بے چینی کے عالم میں۔۔۔ ان کی پیکنگ مکمل ہو چکی تھی۔ وہ اس گھر میں ان کی آخری رات تھی۔ اس کے بعد وہ ان سب کے ساتھ پاکستان جانے والی تھی اور سالار اور جبریل کو وہیں رہ جانا تھا۔

ایک بار پھر سے اس کا گھر ختم ہو جاتا تھا۔ یہ جیسے اس کی زندگی کا ایک ابدی اذیت بن گیا تھا۔۔۔ گھر بننا۔۔۔ گھر ختم ہونا۔۔۔ پھر بننا۔۔۔ پھر ختم ہونا۔ ایک عجیب ہجرت تھی جو ختم ہی نہیں ہوتی تھی اور اس ہجرت میں اپنے گھر کی وہ خواہش اور خواب پتا نہیں کیا چلا گیا تھا۔ وہ اس رات اس طرح خواب سے جاگنے کے بعد بھی بہت اداس تھی۔

پہلے وہ سالار کی بے انتہا مصروفیت کی وجہ سے اس کے بغیر اپنے آپ کو رہنے کی عادی کر پائی تھی اور اب پاکستان چلے جانے کے بعد اسے جبریل کے بغیر بھی رہنا تھا۔ وہ چلتی ہوئی کمرے میں موجود صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے اسے ایک بار پھر اس خواب کا خیال آنے لگا تھا۔ اس خواب کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ بری طرح ٹھٹکی۔۔۔ کتاب کے دس ابواب۔۔۔ اس کی اداسی۔۔۔ اس کا بڑھاپا۔۔۔ کسی کو یاد کرنا۔

اسے یاد آیا تھا اس کتاب کا ہر باب سالار کی زندگی کے پانچ سالوں پر مشتمل تھا۔ ڈاکٹرز نے سالار کو سات سے دس سال کی زندگی کی مہلت دی تھی اور کتاب کا دسواں باب پچاس سال کے بعد ختم ہو رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی تیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک صرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

اکیسویں قسط

تبارک الذی

پریذیڈنٹ نے کافی کا خالی کپ واپس میز پر رکھ دیا۔ پچھلے پانچ گھنٹوں میں یہ کافی کا آٹھواں کپ تھا جو اس نے پیا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی اتنی کافی نہیں پی تھی مگر زندگی میں کبھی اسے اس طرح کا فیصلہ بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ آگے کنواں اور پیچھے کھائی والی صورت حال سے دوچار تھا اور اپنے عہد صدارت میں بہت غلط وقت پر ایسی صورت حال سے دوچار ہوا تھا۔

کانگریس کے انتخابات سر پر تھے اور یہ فیصلہ ان انتخابات کے نتائج پر بری طرح اثر انداز ہوتا۔ "بری طرح" کا لفظ شاید ناکافی تھا۔ اس کی پارٹی دراصل الیکشن ہار جاتی' لیکن اس فیصلہ کو نہ کرنے کے اثرات زیادہ مضر تھے۔ وہ اسے جتنا ٹال سکتا تھا' ٹال چکا تھا' جتنا کھینچ سکتا تھا' کھینچ چکا تھا۔ اب اس کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ کچھ حلقوں کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ کچھ طاقت ور لوگ دبے لفظوں میں اپنی ناراضی اور شدید رد عمل سے اسے خبردار کر رہے تھے۔ فارن آفس اسے مسلسل مختلف ممالک سے امریکی سفارت خانوں کی تقریباً" روزانہ کی بنیاد پر آنے والے خدشات اور استفسارات کے بارے میں آگاہ کر رہا تھا اور خود وہ دو ہفتے کے دوران مستقل ہاٹ لائن پر رہا تھا۔ امریکہ کی بین الاقوامی پسپائی ایک الیکشن ہارنے سے زیادہ سنگین تھی مگر اس کے پاس آپشنز نہ ہونے کے برابر تھے' اپنی کابینہ کے چھ اہم ترین ممبرز کے ساتھ پانچ گھنٹے کی طویل گفت و شنید کے بعد وہ جیسے تھک کر پندرہ منٹ کا وقفہ لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اور اس وقت اس بریک کے آخری چند منٹ گزار رہا تھا۔ میز سے کچھ کاغذات اٹھا کر وہ دوبارہ دیکھنے لگا تھا' وہ کیبنٹ آفس میں ہونے والی پانچ گھنٹے کی طویل میٹنگ کے اہم نکات تھے۔ اس کی کیبنٹ کے وہ چھ ممبر دو برابر گروپس میں بٹے ہوئے دو مختلف حلقوں کے ساتھ تھے۔ اس کا ووٹ فیصلہ کن قرار پاتا اور یہی چیز اسے اتنا بے بس کر رہی تھی۔ اس فیصلے کی ذمہ داری ہر حال میں اسی کے سر پر آ رہی تھی۔ یہ اس کے عہد صدارت میں ہوتا اور اس کے فیصلہ کن ووٹ سے ہوتا۔ اگر ہوتا تو۔۔۔ اور اس ذمہ داری کو وہ لاکھ کوشش کے باوجود کسی اور کے سر نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو ایک نظر پھر دیکھنا شروع کیا۔ وہ وائٹ ہاؤس اس وقت حقیقتاً" اسے ہاؤس کی طرح لگ رہا تھا۔ بریک کے آخری دو منٹ باقی تھے جب وہ ایک فیصلہ پر پہنچ گیا تھا۔ بعض دفعہ تاریخ بنانے والے ہاتھوں کو خود جکڑ کر خود کو بنواتی ہے۔

اور تاریخ 17 جنوری 2030 کو بھی یہی کر رہی تھی۔



ہشام نے پہلی بار اس لڑکی کو سوڈان میں دیکھا تھا۔ UNHCR (اقوام متحدہ کا ہائی کمیشن برائے پناہ گزین) کے ایک کیمپ میں کسی پناہ گزین کو کسی عورت کے ساتھ اشاروں میں بات کرتے اور اسے کچھ سمجھاتے ہوئے وہ پاکستانی یا انڈین تھی۔ ہشام نے اس کے نقوش اور رنگت سے اندازہ لگایا تھا اور پھر اس کے گلے میں لٹکے کارڈ پر اس کا نام پڑھ کر اسے اس کا نام پتا چل گیا تھا۔

بے حد معمولی شکل و صورت کی ایک بے حد پتلی چھوٹے بالوں والی' سانولی رنگت کی ایک دراز قامت لڑکی۔ اس کا پانچ فٹ سات انچ قد اس کی واحد خصوصیت لگی تھی اس پہلی ملاقات میں ہشام کو۔

وہ ایک عورت سے بات کرتے کرتے ہشام کی طرف متوجہ ہوئی' ایک ساتھی کارکن کے طور پر اسے مسکراہٹ دی اور ہاتھوں کے اشارے سے ہیلو اور حال چال پوچھا' اس لڑکی نے بھی ہاتھوں کے اشارے سے اس کو جواب دیا۔ دونوں نے بیک وقت اپنے گلے میں لٹکے کارڈز پکڑ کر اوپر کرتے ہوئے اور اس پر انگلی پھیرتے

ہوئے جیسے خود کو متعارف کرایا۔ وہ CARE کی ورکر تھی' وہ ریڈ کراس کا اور وہ دونوں یو ایس اے سے آئے تھے۔ رسمی تعارف اور وہاں کے حالات کے بارے میں اشاروں میں ہی بات کرنے کے بعد وہ دونوں آگے بڑھ گئے تھے۔

ان کی دوسری ملاقات دوسرے دن ہوئی تھی۔ لکڑی کے عارضی باتھ رومز کی تنصیب و تعمیر والی جگہ پر وہ آج بھی اس سے پہلے وہاں موجود تھی اور کچھ تصویریں لے رہی تھی۔ وہ کچھ سامان لے کر وہاں آیا تھا۔ ایک لوڈر گاڑی میں۔ دونوں نے ایک بار پھر اشاروں کی زبان میں رسمی علیک سلیک کی۔

تیسری ملاقات لمبی تھی' وہ ایڈ ورکرز کے ایک ڈنر میں ملے تھے۔ ڈنر ہال کے باہر کوریڈور میں۔ دونوں دس منٹ تک اشاروں کی زبان میں بات کرتے رہے۔ وہ پاکستان سے تھی' وہ بحرین سے۔ وہ نیویارک یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا' وہ سٹی یونیورسٹی نیویارک میں۔ وہ فنانس کا اسٹوڈنٹ تھا' وہ سوشل سائنسز کی۔ اور ان دونوں کے درمیان صرف ایک چیز مشترک تھی۔ رفاہی کام' جس سے وہ دونوں اپنی نوعمری سے وابستہ تھے۔ ان دونوں کا نصابی سی وی اتنا لمبا نہیں تھا جتنا ان کی غیر نصابی سرگرمیاں۔

کوریڈور میں گزارے ان دس منٹوں میں ان دونوں نے ایک دوسرے کے بارے میں ہی پوچھا اور جانا تھا۔ اشاروں کی زبان میں سوالات بہت تفصیلی نہیں تھے لیکن ہشام کا دل چاہا تھا کہ وہ اس سے اور بھی سوال کرتا۔ وہ قوت گویائی رکھتی تو وہ کر ہی لیتا۔ اس کے ساتھ کھڑے اس نے سوچا تھا۔ وہ اسے اس شام اتنی ہی دلچسپ لگی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں ہمیشہ کی طرح مل کر آگے بڑھ جاتے۔ اس کوریڈور سے بہت سارے گزرنے والے ایڈ ورکرز میں سے ایک جوان دونوں کو جانتا تھا اس نے انہیں بلند آواز میں دور سے مخاطب کرتے ہوئے ہیلو کہا اور ساتھ حال احوال دریافت کیا۔ وہ دونوں بیک وقت اس کی طرف متوجہ ہوئے' انہوں نے بیک وقت اس کی ہیلو کا جواب دیتے ہوئے جوابا" اس کی خیریت دریافت کی اور پھر دونوں نے بیک وقت کرنٹ کھا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ گنگ ہو کر..... اور پھر دونوں قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔ اور ہنستے ہی گئے تھے۔ سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ۔ اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے ان کے پاس اس سے اچھا طریقہ کوئی اور نہیں تھا اس وقت۔ ان دونوں کا پہلا تعارف "خاموشی" نے کرایا تھا اور وہ خاموشی ہمیشہ ان کے ہر جذبے کی آواز بنی رہی۔ وہ جیسے ان کا سب سے دلچسپ کھیل تھا۔ جب ایک دوسرے سے کچھ بھی خاص کہنا ہوتا تو اشاروں کی زبان میں بات کرنے لگتے۔ ہنستے کھلکھلاتے بوجھتے' بھٹکتے' سمجھتے۔ کیا کھیل تھا!!

وہ اس وقت یونیورسٹی میں نو وارد تھے۔ ہشام کو حیرت تھی ان کی ملاقات اس سے پہلے کیوں نہیں ہوئی۔ وہ دونوں ایک جیسی رفاہی ایجنسیوں کے ساتھ کام کر رہے تھے' لیکن اس سے پہلے وہ صرف امریکہ کے اندر ہی طوفانوں اور سیلابوں کے دوران ہونے والے ریلیف ورک سے منسلک رہے تھے' یہ پہلا موقع تھا کہ وہ دونوں امریکہ سے باہر ہونے والے کسی ریلیف کیمپ میں حصہ لینے کے لیے گئے تھے۔

نیویارک واپسی کے بعد بھی ان دونوں کا رابطہ آپس میں ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ مختلف یونیورسٹیز میں ہونے کے وہ ایک دوسرے سے وقتا" فوقتا" مختلف سوشل ایونٹس میں ملتے رہتے تھے کیونکہ دونوں مسلمان طلبہ کی یم سے بھی وابستہ تھے۔ اور پھر یہ رابطہ وقتا" فوقتا" ان سوشل ایونٹ سے ہٹ کر بھی ہونے لگا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی فیملی سے بھی مل چکے تھے اور اب بہت باقاعدگی سے ملنے لگے تھے۔ دونوں کے والد ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

ہشام امریکا میں بحرین کے سفیر کا بیٹا تھا' اور بحرین کے سفارت خانے میں ہونے والی اکثر محفلوں میں اسے بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ اس کی ماں ایک فلسطینی نژاد ڈاکٹر تھی اور اس کا باپ امریکہ کے علاوہ بہت سے یورپین ممالک میں

بحرین کی نمائندگی کر چکا تھا۔ وہ بہن بھائیوں میں وہ بڑا تھا اور اس کی بہن ابھی ہائی اسکول میں تھی۔

رفاہی کاموں میں دلچسپی ہشام کو اپنی ماں سے وراثت میں ملی تھی جو ہشام کے باپ سے شادی سے پہلے ریڈ کراس کے ساتھ منسلک تھی اور فلسطین میں ہونے والے ریلیف کیمپس میں اکثر ان امدادی ٹیموں کے ساتھ جاتی تھی جو امریکہ سے جاتی تھیں شادی کے بعد اس کا وہ کام صرف فنڈز اکٹھے کرنے اور عطیات تک محدود رہ گیا تھا مگر ہشام نے اپنی ماں فاطمہ سے یہ شوق وراثت میں لیا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ شوق بڑھتا ہی گیا تھا۔

اس لڑکی سے ملنے کے بعد اسے اپنا شوق اور جنون بہت کم اور کمتر لگا تھا۔ وہ اپنی کم عمری میں جن رفاہی پروگراموں کے ساتھ منسلک رہی تھی بہت کم ایسا ہوا تھا کہ ریلیف آپریشن کے بعد بہترین خدمات کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے والوں میں اس کا نام نہ ہوتا۔

اس سے میل جول کے آغاز ہونے کے بعد ہشام کو احساس ہوا کہ ان کے درمیان انسانیت کی خدمت کا جذبہ ایک واحد مشترک چیز نہیں تھی اور بھی بہت سی دلچسپیاں مشترکہ تھیں اور صرف دلچسپیاں اور مشاغل ہی نہیں۔ خصوصیات بھی۔ دونوں کتابیں پڑھنے کے شوقین تھے اور بہت زیادہ۔ دونوں کو تاریخ میں دلچسپی تھی۔ دونوں گھومنے پھرنے کے شوقین تھے اور دونوں بہت زیادہ باتونی نہیں تھے۔ سوچ سمجھ کر بات کرنے کے عادی تھے۔

ہشام کی پوری زندگی مخلوط تعلیمی ماحول اور معاشرے میں گزری تھی۔ نہ اس کے لیے لڑکیاں نئی چیز تھیں نہ ان سے دوستی۔ لیکن زندگی میں پہلی بار وہ کسی لڑکی سے متاثر ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ اس کا بھی کوئی آئیڈیل نہیں رہا تھا لیکن اسے لڑکیوں کی جو خوبیاں متاثر کرتی تھیں ان میں سے کوئی بھی چیز اس لڑکی میں نہیں تھی۔ نہ وہ حسین تھی، نہ اسٹائلش، نہ ایسی ذہین کہ اگلے کو چاروں شانے چت کر دے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اسے کسی مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی تھی۔ نظر کا ایک جدید انداز کا چشمہ لگائے وہ سادہ سی جینز اور کرتیوں میں اکثر دیگر جدید تراش خراش کے لباس اور اسٹائلش جوتوں والی لڑکیوں کے سامنے ہشام کو زیادہ پرکشش محسوس ہوتی تھی۔ خود میں مگن، دوسروں سے بے نیاز۔ کارڈ کرتیوں اور ٹراؤزر میں سر کے بال جوڑے کی شکل میں باندھے اپنی لمبی گردن کو کسی راج ہنس کی طرح اٹھائے وہ ہمیشہ اپنے فون یا ٹیبلٹ ہاتھ میں پکڑے اپنے حال میں مگن ملتی تھی ان بہت سی دوسری لڑکیوں کے برعکس جو اسے دیکھتے ہی اس کی طرف متوجہ ہو جاتی تھیں۔ ہشام عرب تھا، عورت کی اداؤں سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود اداؤں ہی سے گھائل ہونے والا لیکن اس لڑکی کے پاس کوئی ادا برے سے تھی ہی نہیں اس کے باوجود وہ گھائل ہو رہا تھا۔

"میرے معاشرے میں اگر مرد کسی عورت کے ساتھ کہیں جائے تو کھانے کا بل وہ دیتا ہے عورت نہیں۔"

ہشام نے پہلی بار اسے باہر کھانے کی دعوت دی تھی اور بل کی ادائیگی کے وقت اسے پرس نکالتے دیکھ کر اس نے بڑی سنجیدگی سے روکتے ہوئے کہا تھا۔ وہ جواباً مسکراتے ہوئے پرس سے کچھ نوٹ نکالتے ہوئے اس سے بولی۔

"اور میرے باپ نے مجھ سے کہا تھا کہ اپنے باپ اور بھائی کے علاوہ کسی بھی مرد کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے اپنا بل خود دینا، یہ تمہیں ہر خوش فہمی اور اسے ہر غلط فہمی سے دور رکھے گا۔ اس لیے یہ میرے حصہ کا بل۔"

اس نے نوٹ میز پر رکھتے ہوئے ہشام سے کہا تھا۔ مسکرائی وہ اب بھی تھی۔ ہشام چند لمحوں کے لیے لاجواب ہوا تھا۔ وہ بڑا مہنگا ریسٹورنٹ تھا جہاں وہ اسے لے کر آیا تھا اور وہ جب بھی کسی لڑکی کو وہاں لا کر بل خود ادا کرتا تھا تو اسے اس لڑکی کی طرف سے بے حد ناز بھرا اور مصنوعی حیرت اور گرم جوشی سے بھرپور شکریہ وصول ہوتا تھا مگر

آج کچھ خلاف توقع چیز ہو گئی تھی۔

"ریسٹورنٹ مہنگا تھا، میں اس لیے کہہ رہا تھا۔" وہ جما ـــــ ہشام کو اکیلے میں بھی دانت پیسنے پر مجبور کرتا رہا تھا ـــــ اس نے زندگی بھر بھی کسی عورت کو ایسی توجہ نہیں دی تھی۔

"شکریہ، لیکن میں بہت امیر ہوں۔" اس لڑکی نے جواباً مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے تم میرا بل بھی دے سکتی ہو۔" پتا نہیں اس نے یہ کیوں کہا۔

"بل نہیں دے سکتی، لیکن بل دینے کے لیے ادھار دے سکتی ہوں۔" وہ جواباً اس سے بولی۔

"تو مہربانی کرو اور دے دو۔" ہشام نے اسی روانی سے کہا۔

وہ پہلی بار الجھی' اسے دیکھا پھر اس نے اپنے پرس سے بل کی بقایا رقم نکال کر اس کی طرف بڑھائی' ہشام نے وہ رقم پکڑ کر بل پر رکھ کر اسے تبسم کرتے ہوئے ویٹر کی طرف بڑھا دیا۔

اس لڑکی نے اتنی دیر میں اپنا بیگ کھول لیا۔ وہ اس میں سے کچھ تلاش کر رہی تھی' چند لمحے گود میں رکھے بیگ میں ہاتھ مارتے رہنے کے بعد اس نے ایک چھوٹی ڈائری نکالی اور پھر اس کے بعد قلم۔ میز پر ڈائری رکھ کر اس نے اس ڈائری میں اس رقم کا اندراج کیا جو اس نے کچھ دیر پہلے ہشام کو ادھار دی تھی۔ پھر اس نے قلم اور ڈائری دونوں ہشام کی طرف بڑھائے۔ اس نے کچھ حیران ہو کر دونوں چیزیں پکڑیں اور پھر اس سے کہا۔

"یہ کیا ہے؟" لیکن سوال کے ساتھ ہی اسے پہلی نظر ڈائری پر ڈالتے ہی جواب مل گیا تھا۔ وہ اس کے دستخط اس رقم کے سامنے چاہتی تھی جہاں اس نے ادھار دی جانے والی رقم لکھی تھی۔ وہ چند لمحوں کے لیے اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا' وہ اب اپنے گلاسز اتار کر انہیں صاف کرتے ہوئے دوبارہ لگا رہی تھی۔ معمول کی طرح خود میں محو اور اسے نظر انداز کیے یوں جیسے یہ سب روز مرہ کی بات تھی۔

ہشام نے قلم سنبھال کر دستخط کرنے سے پہلے ڈائری کے صفحے پلٹ کر ہوئے تجسس سے' لیکن محظوظ ہونے والے انداز میں دیکھا۔ وہاں چھوٹی بڑی رقموں کی ایک قطار تھی اور لینے والا صرف ایک ہی شخص تھا جس کا نام نہیں تھا صرف دستخط تھے' مختلف تاریخوں کے ساتھ' لیکن کہیں بھی ادائی والے حصے میں کسی ایک رقم کی بھی ادائی نہیں کی گئی تھی۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا تم اتنی حساب کتاب رکھنے والی ہو۔ ہر چیز کا حساب رکھتی ہو؟" ڈائری پر دستخط کرتے ہوئے ہشام کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

"اگر میں لکھوں گی نہیں تو بھول جاؤں گی اور معاملات میں تو شفافیت ضروری ہوتی ہے۔" اس لڑکی نے جواباً اطمینان کے ساتھ کہا' وہ اب اس سے ڈائری اور قلم لے کر واپس اپنے بیگ میں رکھ چکی تھی۔

"ڈائری سے تو لگتا ہے تم واقعی بہت امیر ہو۔ اتنی دریا دلی سے کس کو قرض دے رہی ہو؟" ٹیبل سے اٹھتے ہوئے ہشام نے اس کو کریدا' وہ بات گول کر گئی۔ ان کے درمیان اتنی بے تکلفی نہیں تھی کہ وہ اسے زیادہ کریدتا' مگر اس ڈائری میں کیے ہوئے اس آدمی کے دستخط اسے یاد رہ گئے تھے۔ وہ اس دستخط کے انداز سے اتنا تو اندازہ لگا ہی چکا تھا کہ وہ کسی مرد کے دستخط تھے۔

ایک ہفتے بعد اس نے اس لڑکی کو وہ قرض واپس کرتے ہوئے اس کی ڈائری میں ادائی کے حصے میں اپنا دستخط "اداشدہ" کی تحریر کے ساتھ کرتے ہوئے ایک بار پھر سے ڈائری الٹ پلٹ کر دیکھی۔ وہ ڈائری اس سال کی تھی اور سال کے شروع سے اس مہینے تک کسی صفحے پر کوئی ادائی نہیں تھی' لیکن ادھار لینے کی رفتار میں تسلسل تھا۔ چھوٹی بڑی رقمیں' لیکن لاتعداد بار۔

"اس سال تمہیں کوئی ادھار واپس کرنے والا میں پہلا شخص ہوں۔" ہشام نے جیسے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔

اس نے مسکرا کر اس سے ڈائری اور نوٹ دوبارہ واپس لیے نوٹوں کو ہشام کے سامنے گنا' اپنے پرس سے چند چھوٹے نوٹ نکال کر ہشام کو واپس کیے کیونکہ اس نے بڑے نوٹوں میں رقم واپس کی تھی۔ اور اس کے کچھ پیسے بچ رہے تھے۔

"چھوڑو' اسے رہنے دو۔" ہشام نے نوٹ واپس دینے کی کوشش کی۔ "اتنی بڑی رقم نہیں ہے یہ۔" اس نے جیسے لاپروائی سے کہا۔

"کافی کا ایک کپ اور ایک ڈونٹ آسکتا ہے' ایک وفل آئس کریم آسکتی ہے یا ایک برگر۔" اس نے بڑے اطمینان سے جواباً کہا' وہ ہنسا۔

"تم واقعی ضرورت سے زیادہ حساب کتاب کرتی ہو۔"

"میری ماں کہتی ہے پیسہ مشکل سے کمایا جاتا ہے اور اس کی قدر کرتے ہوئے اسے خرچ کرنا چاہیے۔" اس نے جیسے ایک بار پھر ہشام کو لاجواب کیا تھا اور اسی شرمندگی دکھائے بغیر۔

"اس طرح تو تم واقعی بہت امیر ہو جاؤ گی۔" ہشام نے اسے چھیڑا۔

"ان شاء اللہ" اس نے جواباً اتنے اطمینان سے کہا کہ ہشام کو ہنسی آگئی تھی۔ ہنسنے کے بعد ہشام کو احساس ہوا کہ یہ مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ اسی طرح سنجیدہ تھی۔

"تمہیں برا تو نہیں لگا؟" اس نے کچھ سنبھلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کیا؟"

"میرا ہنسنا۔"

"نہیں۔ مجھے کیوں برا لگے گا۔ تم کیا مجھ پر ہنسے تھے؟" ہشام نے سر کھجایا' لڑکی سیدھی تھی' سوال ٹیڑھا تھا۔

"یہ جس کو اتنے ادھار دیتی رہی ہو' یہ کون ہے؟" اس نے بھی اس سے ایک ٹیڑھا سوال کیا تھا۔

"ہے کوئی۔" وہ ایک بار پھر نام گول کر گئی۔

"تم نام بتانا نہیں چاہتیں۔" وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

"ہاں۔"

وہ چند لمحوں کے لیے چپ رہا پھر اس نے کہا۔ "بہت زیادہ قرضہ نہیں ہو گیا اس کے سر؟" اس کی سوئی اب بھی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"میں اسے انکار نہیں کر سکتی۔"

ہشام عجیب طرح سے بے چین ہوا۔ "پیسے کے معاملے میں کسی پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔" شاید زندگی میں پہلی بار اس نے کسی کو ایسا مشورہ دیا تھا۔

"پیسے ہی نہیں میں ہر معاملے میں اعتماد کرتی ہوں اس پر۔" اس نے بڑے آرام سے کہا تھا۔

ہشام کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سے کیا کہے؟ وہ ان کی دوستی کا آغاز تھا اور وہ ایک دوسرے کی ذاتیات میں دخل اندازی نہیں کر سکتے تھے ان کے درمیان ایسی بے تکلفی نہیں تھی۔ اس شخص کا تعارف بھی ہشام سے بہت جلد ہو گیا تھا۔



تالیوں کی گونج نے حمین سکندر کی تقریر کے تسلسل کو ایک بار پھر توڑا تھا' روسٹرم کے پیچھے کھڑے چند لمحوں

کے لیے رک کر اس نے تالیوں کے اس شور کے تھمنے کا انتظار کیا۔ وہ ایم آئی ٹی کے گریجویٹنگ اسٹوڈنٹ کا اجتماع تھا اور وہ وہاں آغاز کرنے والے مقرر کے طور پر بلایا گیا تھا۔ پچھلے سال وہ ایم آئی ٹی کے گریجویٹنگ اسٹوڈنٹس میں شامل تھا۔ سلون اسکول آف مینجمنٹ سے امتیازی کامیابی کے ساتھ نکلنے والوں میں سے ایک اور اس سال وہ یہاں گریجویٹنگ اسٹوڈنٹس سے خطاب کر رہا تھا۔ ایم آئی ٹی وہ واحد یونیورسٹی نہیں تھی جس نے اسے اس سال اس اعزاز کے قابل سمجھا تھا۔ لیگ آئی وی والی کی چند اور نامور یونیورسٹیز نے بھی اسے مدعو کیا تھا۔

چوبیس سال کی عمر میں حمین سکندر پچھلے تین سالوں کے دوران دنیا کے بہترین منتظموں میں سے ایک مانا جا رہا تھا اس ایک آئیڈیا کی وجہ سے جو پچھلے چھ سالوں میں ایک بیج سے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

ٹریڈ این آئیڈیا کے نام سے اس کی ڈیجیٹل فنانس کمپنی نے پچھلے تین سالوں میں گلوبل مارکیٹس میں دھوم مچا رکھی تھی۔ دنیا کے 125 بہترین مالیاتی اور کاروباری ادارے اس کمپنی کے باقاعدہ کلائنٹس تھے اور ڈیڑھ ہزار چھوٹے ادارے بالواسطہ اس کی خدمات سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اور یہ سب تین سال کی مختصر مدت میں ہوا تھا جب وہ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کمپنی کی بنیاد رکھنے میں بھی مصروف تھا۔

ٹریڈ این آئیڈیا کا تصور بے حد دلچسپ اور منفرد تھا اور ایک عام صارف کو وہ ابتدائی طور پر کسی چند سوں کا کھیل جیسا لگتا۔ اس کی ابتدا بھی حمین سکندر نے بے حد چھوٹے پیمانے پر کی تھی۔ ایک ویب سائٹ پر اس نے دنیا کی بہترین یونیورسٹیز کے اسٹوڈنٹس کو ایک آن لائن چیلنج دیا تھا۔ ایسا کوئی آئیڈیا فروخت کرنے کے لیے جس کے لیے انہیں یا تو سرمایہ چاہیے تھا یا کسی کمپنی کی سپورٹ اور یا پھر وہ اپنا آئیڈیا کسی خاص قیمت پر فروخت کرنے کے لیے تیار تھے لیکن کاروبار اور کاروباری دونوں بے حد مختلف تھے۔

اس ویب سائٹ پر تین کورز تھے۔ اے کیٹگری بی اور سی کیٹگری۔ ہر کورز میں بیس سوالات تھے اور ویب سائٹ پر رجسٹریشن کے لیے ایک پاس ورڈ ضروری تھا جو اس کورز میں کامیاب ہونے کے بعد بھیجا جاتا اور وہی نمبر اس کاروبار کرنے والے کی ID تھی۔ کیٹگری اے کا کورز مشکل ترین تھا اور ناک آؤٹ کے انداز میں معین مدت کے لیے تھا۔ کیٹگری B اور C اس سے آسان تھے اور نہ کسی خاص مدت تک محدود تھے اور نہ ہی ان میں ناک آؤٹ ہوتا تھا۔ یہ ان تین کیٹگریز کی درجہ بندی تھی جو وہاں آنے والے ٹریڈرز کی پرفارمنس پر خود کار انداز میں انہیں مختلف کیٹگریز میں رکھتی تھی۔ جو A کیٹگری میں آگے نہ جا پاتا وہ B کے کورز میں حصہ لیتا اور جو B میں بھی آگے نہ جا پاتا تو وہ C میں اور جو C میں بھی آگے نہ جا پاتا تو اسے ٹریڈ این آئیڈیا کی طرف سے آؤٹ کر دیا جاتا تھا اس پیغام کے ساتھ کہ ابھی اسے اور سیکھنے کی ضرورت ہے۔ ٹریڈنگ اس کا کام نہیں۔

اے کیٹگری کے کورز میں کامیاب ہو جانے والے غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کے حامل افراد ایک پاس ورڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے اور پھر اگلے مرحلے تک رسائی کرتے۔ ایک ایسے ٹریڈ سینٹر میں جہاں بہترین یونیورسٹیز کے بہترین دماغ اپنے اپنے آئیڈیاز کو رجسٹر کروانے کے بعد آن لائن موجود ٹریڈرز کے ساتھ اپنے آئیڈیاز کے حوالے سے بات چیت کرتے۔ وہ گروپ ڈسکشن بھی ہو سکتی تھی اور وہ ٹریڈرز کی آپس میں گفت و شنید بھی۔

پہلے مرحلے میں حمین پانچ بڑی کمپنیز کو اس بات پر آمادہ کر پایا تھا کہ وہ اس ٹریڈ روم میں آئیڈیا لے کر آنے والوں کے آئیڈیاز سنیں اور اس پر ان سے بات چیت کریں۔ اگر انہیں کسی کا آئیڈیا پسند آ جائے تو اس کے عوض انہیں TAI کو ایک مخصوص فیس ادا کرنی تھی اگر وہاں کوئی آئیڈیا انہیں پسند آ جاتا اور وہ اسے خریدنے اس

میں سرمایہ کاری کرنے یا اس میں پارٹنر شپ کرنے پر تیار ہوتے تو کیٹیگری بی میں پیش ہونے والے آئیڈیاز کی خرید و فروخت بھی اسی فارمولا کے تحت ہوتی تھی۔ لیکن وہاں ایک اضافی چیز یہ تھی کہ وہاں اپنے آئیڈیاز کے ساتھ آنے والے مختلف نوجوان افراد ایک دوسرے کے ساتھ رابطے کے ذریعہ اپنی پسند کے کسی ایک جیسے آئیڈیا پر شراکت داری کر سکتے تھے اور اگر ایسا کوئی اشتراک کسی آئیڈیے کو عملی شکل میں ڈھال دیتا تو ٹیڈ این آئیڈیا اس اشتراک کے لیے بھی انہیں ایک فیس چارج کرتا۔

کیٹیگری C اس سے بھی آسان تھی۔ وہاں کاروبار کے لیے آنے والے ٹریڈرز اپنے آئیڈیاز کو بارٹر بھی کر سکتے تھے یعنی کسی بھی ٹریڈر کو اگر دوسرے کا آئیڈیا پسند آتا اور وہ اسے نقد سے خریدنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو پھر وہ اس آئیڈیے کے بدلے کچھ اور خدمات، مہارت یا پروجیکٹ اسے پیش کر سکتا تھا۔ وہ ایک بنیادی سا فارمولا تھا جو حمین نے صرف ذہانت کو کیش کرنے کی بنیاد پر نکالا تھا اور اپلائی کیا تھا۔

پہلی بار اس کی کلائنٹ بننے والی پانچ میں سے تین کمپنیز کو وہاں پہلے مہینے میں تین ایسے آئیڈیاز پسند آ گئے تھے جن کے فروخت کنندگان کو انہوں نے hire کر لیا تھا۔

تین سال پہلے کلائنٹس اور ٹریڈرز کی ایک محدود تعداد سے شروع ہونے والی کمپنی اب ان ابتدائی کاروبار سے بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ وہ اب خود ٹیڈ این آئیڈیا پر آنے والے ٹریڈرز سے ایسے آئیڈیاز اور بزنس پروپوزلز لے لیتی جس میں انہیں دم خم نظر آتا اور وہ اپنے بڑے کلائنٹس کی ضروریات اور دلچسپی کے مطابق مختلف آئیڈیاز اور پروجیکٹس انہیں شیئر کر دیتی۔

ٹیڈ این آئیڈیا نے پچھلے تین سال میں تین سو نئی کمپنیز کی بنیاد رکھی تھی جن کے آئیڈیاز ان کے پلیٹ فارم پر آنے کے بعد مختلف بین الاقوامی کمپنیز نے ان آئیڈیاز میں سرمایہ کاری کی تھی۔ ٹیڈ این آئیڈیا سے ملنے والے آئیڈیاز پر تکمیل پانے والے پروجیکٹس کی کامیابی کا تناسب نوے فی صد تھا۔

دنیا کے سو بہترین اداروں کے بہترین اسٹوڈنٹس کو ایک پلیٹ فارم پر لانے والا یہ ادارہ اب دنیا کی ہزاروں یونیورسٹیز کے لاکھوں اسٹوڈنٹس کو اپنے اپنے آئیڈیاز گھر بیٹھے آن لائن نامور اور کامیاب ترین کمپنیز کے نمائندوں کے سامنے پیش کرنے کا موقع دے رہا تھا۔ وہ پلیٹ فارم نیا کاروبار شروع کرنے والوں کے لیے ایک ڈریم پلیٹ فارم تھا۔ ٹیڈ این آئیڈیا اب ان ہی کیٹیگریز کے ساتھ ایک اور ایسی کیٹیگری کا اضافہ کر چکا تھا جہاں کوئی بھی شخص اپنی خسارے میں جانے والی کمپنی، بزنس سیٹ اپ، پروجیکٹ بیچ سکتا تھا اور آن لائن ہی اس کا تخمینہ بھی کروا سکتا تھا۔

حمین سکندر کا نام دنیا کی کسی بھی بڑی مالیاتی کمپنی کے لیے اب نیا نہیں تھا۔ اس کی کمپنی کاروبار کے نئے اصول لے کر آئی تھی اور ان نئے اصولوں پر کام کر رہی تھی۔

"اکثر لوگوں کا خیال ہے میں رول ماڈل ہوں۔ ہو سکتا ہے میں بہت ساروں کے لیے ہوں۔ لیکن خود مجھے رول ماڈل کی تلاش کبھی نہیں رہی۔" تالیوں کا شور ختم جانے کے بعد اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا تھا۔ "رول ماڈلز اور آئیڈیلز کتابوں میں زیادہ ملتے ہیں اور میرے ماں باپ کو ہمیشہ مجھ سے یہ شکایت رہی کہ میں کتابیں نہیں پڑھتا۔"

وہاں بیٹھے ہوئے اسٹوڈنٹس میں کھلکھلاہٹیں ابھری تھیں اور اگلی ایک نشست پر بیٹھی امامہ بھی ہنس پڑی تھی۔

"میں نے اپنی زندگی میں دلچسپی سے صرف ایک کتاب پڑھی ہے اور وہ میرے باپ کی آٹوبائیوگرافی (سوانح عمری) تھی۔۔۔ وہ بھی بارہ سال کی عمر میں اپنی ماں کے لیپ ٹاپ میں سے۔" سامنے والی نشستوں پر بیٹھی امامہ کا

رنگ فق ہو گیا' وہ غصہ ایک دم بھول گئی تھی۔

"اور وہ واحد کتاب ہے' جس کو میں نے بار بار پڑھا۔ وہ واحد کتاب ہے' جو میرے لیپ ٹاپ میں بھی ہے۔ میرے باپ کی آٹوبائیوگرافی کی بہترین بات یہ ہے کہ اس میں کوئی ہیرو' کوئی آئیڈیل' کوئی رول ماڈل نہیں ہے اور اسے پڑھتے ہوئے مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوا کہ میرا باپ کتنا لکی ہے کہ اسے کسی سے متاثر ہو کر اس جیسا نہیں بننا پڑا' زندگی گزارنے کے ان کے اپنے اصول اور فارمولاز ان کے بچپن اور جوانی گزارنے کے لیے رہنما رہے۔"

وہ کہتا جا رہا تھا اور وہاں بیٹھی امامہ' عجیب سے شاک اور شرمندگی میں بیٹھی تھی' وہ کتاب جسے وہ آج بھی شائع کرانا نہیں چاہتی تھی' صرف اس لیے کیونکہ وہ اپنی اولاد کو ان کے باپ کے حوالے سے کسی شرمندگی میں مبتلا نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ کتاب اس کی تیسری اولاد بارہ سال کی عمر میں صرف ایک بار نہیں' بار بار پڑھتا رہا تھا۔ اس کی ایک کاپی اس کے لیپ ٹاپ تک بھی چلی گئی تھی اور وہ بے خبر تھی۔

"میں نے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ طے کیا تھا کہ مجھے متاثر ہونے جیسا آسان کام نہیں کرنا۔ متاثر کرنے جیسا مشکل کام کر کے دکھانا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "میرا تعارف کراتے وقت وہ ساری چیزیں گنوائی گئیں جن سے آپ سب کے سانس رک جائیں' آنکھیں جھپکنا بند ہو جائیں' منہ کھلے رہ جائیں۔ میں نے کس عمر میں کیا کر دیا اور کس عمر میں کیا۔ اس سال میری کمپنی کا ٹرن اوور کیا تھا۔ دنیا کے دس بہترین منتظم میں' میں کس نمبر پر ہوں۔ دنیا کی کون کون سی کمپنیاں میری کلائنٹ ہیں۔ آپ میں سے اگر کوئی مجھ سے اور میری کامیابی سے متاثر نہیں ہوا یہ سب سن کر بھی تو مجھے حیرت ہو گی۔" وہ رکا جیسے مجمع کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔ "لیکن اس تعارف میں بہت سے ایسے حقائق شامل نہیں' جن کو سن کر آپ کو مجھ میں اپنا آپ یا اپنے آپ میں' میں نظر آنے لگوں گا۔ جیسے اس تعارف میں یہ حقیقت شامل نہیں ہے کہ میں آج تک کوشش کے باوجود بھی اپنی بہن سے لیا گیا قرض واپس نہیں کر سکا۔"

مجمع میں ہلکی تالیوں کے ساتھ قہقہے گونجے۔

حمین بے حد سنجیدہ تھا۔

"لیکن میں ایک دن وہ ساری رقم واپس کروں گا۔ یہ وہ وعدہ ہے جو میں اس سے آٹھ سال کی عمر سے کر رہا ہوں جب میں نے اس سے پہلی بار قرض لیا تھا اور میں ابھی وعدہ پورا نہیں کر سکا۔" وہ ہنستے ہوئے مجمع کے سامنے بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ "میری بہن کے پاس ڈائریز کا ایک ڈھیر ہے' جس میں اس نے ادھار دیے جانے والے ایک ایک پینٹ کا بھی حساب رکھا ہوا ہے۔" تالیوں کے شور میں وہ رکا۔ "اور ہر اچھے بزنس مین کی طرح میں بھی اتنی بڑی رقم فوری طور پر کسی کو نہیں دے سکتا' چاہے وہ قرضے کی واپسی ہی کیوں نہ ہو۔" وہ بول رہا تھا۔

"اور میں سست ہوں' ضرور تاً" جھوٹ بولتا ہوں' چیزیں اکثر بھول جاتا ہوں' دوستوں کو مایوس کرتا ہوں۔" اس کے ہر جملے پر وہ اسٹوڈنٹس پرجوش انداز میں تالیاں بجا رہے تھے جیسے کسی راک اسٹار کو داد دے رہے ہوں۔

"اور ان تمام خامیوں کے ساتھ بھی مجھے اگر بااثر ترین افراد کی فہرست میں رکھا جاتا ہے تو یہ خوف ناک بات ہے۔ خوف ناک اس لیے کیونکہ ہم ایک ایسے زمانے میں داخل ہو چکے ہیں جہاں صرف کامیابی ہمیں قابل عزت اور قابل رشک بنا رہی ہے۔ ہماری انسانی خصوصیات اور خوبیاں نہیں۔"

تالیوں کے شور نے ایک بار پھر اسے رکنے پر مجبور کیا تھا۔ مجمع اب اس کی حس مزاح کو نہیں اس کے ان الفاظ کو سراہ رہا تھا۔

"ایم آئی ٹی کے گریجویٹنگ اسٹوڈنٹس سے یہ بات کہتے ہوئے میں احمق لگوں گا کہ ان چیزوں کا دوبارہ تعین

کریں جو ہمارے لیے متاثر کن ہونا چاہئیں۔ میں دس سال کا تھا جب میرے باپ نے مجھے زبردستی پاکستان بھیج
دیا۔ مجھے اور میری فیملی کو۔ کیونکہ میرے دادا کو الزائمر تھا اور میرے باپ کا خیال تھا انہیں ہماری ضرورت
ہے۔ میں نے اگلے چھ سال اپنے دادا کے ساتھ گزارے۔ دنیا کی کوئی یونیورسٹی مجھے وہ تربیت اور علم نہیں دے
سکتی جو الزائمر کے ہاتھوں اپنی یادداشت کھوتے ہوئے اس پچھتر سال کے بوڑھے نے اپنے دس سال کے پوتے کو
دی۔ ایم آئی ٹی بھی نہیں۔"

سناٹے کو تالیوں نے توڑا تھا پھر اس کے لیے کھڑے ہو جانے والے ہجوم نے اگلے کئی منٹ اپنے ہاتھ نہیں
روکے۔

"میں ہمیشہ سوچتا تھا اس سب کا فائدہ کیا تھا۔ مجھے امریکہ میں ہونا چاہیے تھا دادا کے پاس نہیں۔ لیکن پھر
آہستہ آہستہ سب کچھ بدلنا شروع ہو گیا۔ مجھے ان کے ساتھ بیٹھنا بات کرنا سننا اور ان کی مدد کرنا اچھا لگنے لگا۔
دس سال کا بچہ کبھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی انسان سامنے پڑی ہوئی چیز کا نام کیسے بھول سکتا ہے۔ لیکن میں یہ
سب دیکھ رہا تھا اور اس سب نے مجھے ایک چیز سکھائی۔ کل بھی نہیں آتا۔ جو بھی ہے "آج" ہے۔ اور آج کا
بہترین مصرف ہونا چاہیے "کل" چانس ہے ہو سکتا ہے آپ کو نہ ملے۔"

اس نے تقریر ختم کر دی تھی وہ پورا مجمع ایک بار پھر اس کے لیے کھڑا ہو چکا تھا۔ تالیاں بجاتے ہوئے
امامہ بھی تالیاں بجا رہی تھی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے اسے داد دیتے ہوئے۔ اس کی
اولاد نے اسے ایسے بہت سے فخریہ لمحے دیے تھے۔ بہت سارے۔ آہستہ آہستہ اس گھر کے سارے پرندے
اڑ گئے تھے۔ جبریل، عنایہ، حمین، رئیسہ۔ مگر ہر ایک کی پرواز شاندار تھی وہ جس آسمان پر بھی اڑ رہے تھے
فاتحانہ انداز میں اڑ رہے تھے۔

"تم سمجھدار ہو گئے ہو یا ایکٹنگ کر رہے تھے؟" وہاں سے واپسی پر امامہ نے اس سے گاڑی میں پوچھا تھا۔
وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے ہنس پڑا۔ "ایکٹنگ کر رہا تھا یہ تو ظاہر ہے۔ غلط سوال کر لیا آپ نے مجھ سے۔"
اس نے ماں کی بات کے جواب میں کہا۔

"تم بہت خراب ہو حمین!" امامہ کو یک دم جیسے پیار آیا۔

"میں بھی سوچ رہا تھا آپ بابا کی آٹو بائیو گرافی بھول کیسے سکتی ہیں؟" حمین نے ماں کے اس جملے پر فوراً کہا۔

"تمہیں اسے نہیں پڑھنا چاہیے تھا۔" امامہ اب بھی سنجیدہ تھی۔

"آپ ہی کہتی ہیں کتابیں پڑھنا اچھی عادت ہے۔" اس نے ماں سے کہا۔

"میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ کتابیں چوری کر کے اور بغیر اجازت پڑھو۔" امامہ نے اسی سنجیدگی سے اسے ڈانٹا۔

"زندگی میں پہلی اور آخری بار کوئی کتاب چوری کر کے پڑھی ہے۔ آپ تسلی رکھیں میں اتنا جنونی نہیں ہوں
ریڈنگ کے بارے میں۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

امامہ اگر اسے شرمندہ دیکھنا چاہتی تھی تو یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ اس کے پاس ہر منطق اور ہر بہانہ تھا۔ سالار کا
بیٹا تھا تو ان چیزوں کی بہتات تھی اس کے پاس۔

"ممی آپ خواہ مخواہ ہی پریشان ہوتی رہتی ہیں، ہم بڑے ہو چکے ہیں، آپ ہر بات ہم سے راز میں نہیں رکھ
سکتیں۔" اس نے ماں کا کندھا تھپکتے ہوئے جیسے اسے یاد دلایا۔

"باقی تینوں ہو چکے ہیں۔ تم نہیں ہوئے۔" امامہ نے اس کی بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے
اڑاتے ہوئے کہا۔

"ڈیٹس ناٹ فیئر، آپ نے میری تقریر نہیں سنی کیا؟" اس نے بے ساختہ اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ اسپیچ عنایہ نے لکھی ہوگی۔" امامہ نے کہا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ لاجواب ہوا اور وہ ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے بھی اسے امامہ کی چبھتی نظروں کا احساس ہو رہا تھا۔

"She just edited it" (اس نے صرف تصحیح کی تھی) اس نے بالآخر اعتراف کیا۔

"ایز آلویز" (ہمیشہ کی طرح) امامہ نے جتانے والے انداز میں کہتے ہوئے گہرا سانس لیا۔

"آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ میں ساری عمر اسپیچز لکھتا رہا ہوں، کرتا رہا ہوں، یہ مشکل نہیں ہے میرے لیے میں خود بھی کر سکتا ہوں۔"

"کر سکتے ہو بالکل کر سکتے ہو لیکن بس یہ نہ کہو کہ تمہاری تقریر سن کر تمہارے سمجھ دار ہونے کا یقین کر لوں۔" امامہ مزید کچھ کہنے کے بجائے خفگی کے عالم میں خاموش ہوگئی اور ونڈ سکرین سے باہر دیکھنے لگی۔

"غصے میں آپ بہت حسین لگتی ہیں۔" اس نے یکدم بڑی سنجیدگی سے کہا۔ امامہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"یہ بھی میں نے بابا کی کتاب میں کہیں پڑھا تھا۔ چیپٹر نمبر فائیو میں۔۔۔؟ نہیں شاید فور میں۔" وہ اب اپنا بازو ماں کے کندھے کے گرد پھیلائے اسے منانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"واقعی لکھا ہے تمہارے بابا نے؟" امامہ نے جیسے بے یقینی سے اس سے پوچھا اس کے باوجود کہ وہ یہ کتاب درجنوں بار پڑھ چکی تھی۔ ایڈٹ ری ایڈٹ کر چکی تھی۔ اس کے باوجود ایک لمحہ کے لیے اسے واقعی شبہ ہوا۔

"لکھا تو نہیں لیکن اگر آپ کہیں تو میں ایڈٹ کر کے شامل کروا دیتا ہوں۔۔۔ آپ کو ویسے بھی پتا ہے میں غلط باتوں کا چیمپئن ہوں۔" اس نے بے حد اطمینان سے ماں سے کہا۔

وہ ہنس پڑی، وہ واقعی یہ بھی کر سکتا تھا۔ اس میں اسے شبہ نہیں تھا۔



"ہم کہیں مل سکتے ہیں؟" سکرین چمکی۔

"کہاں؟" تحریر ابھری۔

"جہاں بھی تمہیں آسانی ہو میں آجاؤں گا۔" جواب آیا۔

"اچھا سوچتی ہوں۔" لفظوں نے کہا۔

"کب تک بتاؤ گی؟" اشتیاق سے پوچھا گیا۔

"کچھ دنوں تک۔" تامل سے کہا گیا۔

"میں انتظار کروں گا۔" وعدے کی طرح دہرایا گیا۔

"جانتی ہوں۔" یقین دلایا گیا۔

اور پھر آگے کچھ بھی نہیں تھا۔ یوں جیسے کوئی پہاڑ آگیا ہو یا پھر کھائی کہ نہ لفظ رہے ہوں، نہ وقت۔

عنایہ نے اپنے فون پر انگلیوں سے سکرول کرتے ہوئے ان میسجز کے تھریڈ کو دیکھا، پڑھا، یوں جیسے پہلی بار اس گفتگو کو پڑھ رہی ہو۔ یوں جیسے وہ گفتگو پہلی بار ہوئی ہو۔ اس کی مخروطی خوب صورت دودھیا انگلیاں فون کی سکرین پر نہیں جیسے ان لفظوں پر پھسل رہی تھیں۔

سوال جواب اتنے سالوں سے کرتے آرہے تھے وہ۔ اسی ترتیب میں۔۔۔ اور ہر بار گفتگو وہیں جا کر رکتی تھی جہاں اس بار ختم ہوئی تھی۔ اس سے آگے کے سوال و جواب دونوں کے پاس نہیں تھے یا شاید ہمت نہیں تھی کہ اس سے آگے وہ کچھ پوچھتے۔ لیکن مہینے میں کم از کم ایک بار کسی بھی دوسرے موضوع پر بات کرتے کرتے ان

کے درمیان اس گفتگو کا تبادلہ ضرور ہوتا۔ وہ سوال جواب کسی پرانی یادیا میوزک کی طرح بیک گراؤنڈ میں چلتے جیسے ابھی ہوا تھا۔ وہ کسی اور موضوع پر بات کر رہے تھے اور بات وہاں تک آگئی تھی۔ اور جہاں آگئی تھی وہاں رک گئی تھی۔ اب وہاں سے موضوع بدلنے کے لیے انہیں پھر کچھ وقت چاہیے تھا۔

وہ ارک سے محبت نہیں کرتی تھی اور اسے شبہ تھا کہ شاید وہ بھی نہیں کرتا ہو۔ بہت سارے احساس وہم اور خوش فہمی بھی تو ہو سکتے تھے، مگر یہ بھی درست تھا کہ اتنے سالوں میں ارک کے علاوہ اس کے سرکل میں کوئی مرد دوست نہیں تھا۔ امریکہ، پاکستان دونوں جگہ۔ اسکول، کالج۔ کسی بھی جگہ عنایہ کسی لڑکے کو اپنا دوست نہیں بنا سکی تھی، نہ وہ اتنی بے تکلفی کا مظاہرہ کر سکتی تھی اور نہ اسے ایسی کسی دوستی کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

ارک بھی ایسا ہی تھا اور یہ زیادہ حیرانی کی بات تھی۔ کیوں کہ وہ امریکہ میں رہتا تھا جہاں طرز زندگی بہت مختلف تھا۔ اس کے باوجود عنایہ کی طرح وہ بھی ریزروڈ تھا۔ اور جب وہ عنایہ سے کہتا تھا کہ اس کی کوئی گرل فرینڈ نہیں تو عنایہ کو یقین ہوتا تھا کہ ایسا ہی ہے۔ اور اگر وہ یہ کہتا تھا کہ اس کی پچھلے کئی سالوں سے کسی لڑکی کے ساتھ دوستی ہے بھی تو وہ عنایہ ہے تو اسے اس پر بھی یقین تھا۔

اور اس دوستی کے باوجود دونوں کے درمیان بے تکلفی نہیں تھی۔ شاید اس کی وجہ فاصلہ تھا یا کلچر یا عنایہ کا وہ مزاج جس سے ارک بخوبی واقف تھا۔ اتنے سالوں کے بعد بھی تقریباً" ہر روز ای میل، میسجز یا فون کے ذریعے ایک دوسرے سے ہر وقت رابطے میں رہنے کے باوجود ان کے درمیان ہونے والی گفتگو مخصوص موضوعات کے گرد گھومتی تھی۔ کبھی بھی وہ صرف "میں اور تم" پر نہیں گئے تھے اور یہ دونوں کی طرف سے کی جانے والی شعوری کوششوں کا نتیجہ تھا۔

عنایہ ایک مہینہ پہلے رہائش کے لیے امریکہ آئی تھی اور چاہنے کے باوجود اس نے ارک کو یہ نہیں بتایا تھا' بتانے کا فائدہ نہیں نقصان تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے یہ خدشہ تھا کہ اس کے امریکہ آجانے پر وہ اس سے ملنے کی پوری کوشش کرے گا اور یہ اس کے لیے اس لیے بہت آسان ہوتا کیوں کہ وہ حمین اور جبریل کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھا۔ عنایہ ان دونوں سے یہ کہہ چکی تھی کہ وہ اس کے امریکہ آنے کے بارے میں ارک سے کچھ نہیں کہیں' ان دونوں نے اس سے کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔ ارک جیسے ان کی فیملی کے لیے ایک ایسی کھلی حقیقت تھا جس سے سب آنکھیں چرانا چاہتے تھے لیکن چرا نہیں پاتے۔ ارک بہت عرصہ پہلے اس کے اور امامہ کے درمیان زیر بحث آچکا تھا۔ عنایہ جان چکی تھی وہاں اس کے لیے کوئی مستقل نہیں تھا۔ اس شادی میں کیا ایشوز تھے اور کیا خدشات' کیا اندیشے تھے اور کیا مسائل۔ عنایہ آنکھیں بند کرکے رٹے رٹائے انداز میں گنوا سکتی تھی کیوں کہ اس نے یہ سب کچھ امامہ سے لاتعداد بار سنا تھا اور اس نے امامہ کی خواہش کا احترام کیا تھا۔

اس نے آہستہ آہستہ ارک سے دور جانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے باوجود کہ امامہ نے اسے کبھی ارک سے قطع تعلق کرنے کے لیے نہیں کہا تھا لیکن عنایہ کا خیال تھا اسے یہ "عادت" بدل دینی چاہیے' جو دونوں کے لیے ایک اسٹیج پر آکر آزار بن سکتی تھی۔

وہ دونوں زیادہ تر ای میلز اور ٹیکسٹ میسجز کے ذریعہ رابطے میں رہے تھے۔ عنایہ نے کوشش کی تھی یہ رابطہ کم ہونا چاہیے' تعلیمی مصروفیات' پروفیشنل ذمہ داریاں' اس کے پاس بہترین بہانوں کے طور پر موجود تھے۔ لیکن اس کے باوجود ارک سے اس کا رابطہ ٹوٹ نہیں سکا اور یہ کمال ارک کا تھا' وہ جڑا رہا تھا' اس کی بے اعتنائی' بے رخی' سرد مہری کے باوجود۔ یہاں تک کہ عنایہ کو شدید قسم کی ندامت ہونے لگی تھی۔ پتا نہیں اس شخص میں اتنی برداشت اور تحمل کیسے تھا کہ وہ اپنے آپ کو نظرانداز کیے جانے اور کم اہمیت پانے پر بھی کوئی اعتراض کوئی احتجاج نہیں کرتا تھا۔ اس سے یہ نہیں پوچھتا تھا کہ اسے بیٹھے بٹھائے کاموں کا ڈھیر اب ہی کیوں یاد آنے لگا تھا اور

نہ ہی یہ کہ وہ خود بھی ڈاکٹر تھا اس سے زیادہ مصروف تھا تو کم از کم وہ پروفیشنل مصروفیات کا بہانہ اس کے سامنے پیش نہ کرے۔

وہ ہفتوں اس کی کسی ای میل کسی میسج کا جواب دیے بغیر غائب رہتی اور وہ پھر بھی اس کو ٹیکسٹ میسجز کے ذریعہ اپنا حال احوال اپنی مصروفیات کے بارے میں بتاتا رہتا اور پھر وہ کئی دنوں بعد اس کے بھیجے ہوئے کسی نہ کسی ٹیکسٹ کسی نہ کسی ای میل کا جواب دینے پر مجبور ہو جاتی اور وہ اپنی غیر حاضری کا جو بھی بہانا بناتی وہ بغیر بحث کے قبول کر لیتا' چاہے وہ کتنا ہی ناقابل یقین کیوں نہ ہوتا اور اس کی یہ قبولیت جیسے اس کے احساس جرم کو اور بڑھا رہی تھی۔ وہ بچپن میں ایسا نہیں تھا جیسا بڑا ہو کر ہو گیا تھا۔ اتنے سالوں میں عنایہ میں اتنی تبدیلیاں نہیں آئی تھیں جتنی ایرک میں آئی تھیں اور اس کی بہت سی دوسری وجوہات کے علاوہ ایک بنیادی وجہ اس کا قبول اسلام بھی تھا۔

وہ اٹھارہ سال کی عمر میں ایرک سے عبداللہ ہو گیا تھا لیکن وہ آج بھی اپنے سوشل سرکل میں ایرک کہلاتا تھا یا پھر ایرک عبداللہ۔ ان لوگوں کے امریکہ سے آجانے کے بعد بھی ایرک ان سے رابطے میں رہا تھا' وہ اسے بھی ای میل کرتا تھا اور امامہ کو بھی اور اس کی ہر ای میل امامہ کو جیسے ایک یاددہانی کی طرح لگتی تھی' حالانکہ اس کی ای میلز میں رسمی گفتگو کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔

وہ بھی میڈیسن میں ہی ریزیڈنسی کر رہا تھا۔ عنایہ کی طرح۔ ان کے پروفیشن نے دو مختلف ملکوں میں رہتے ہوئے بھی ان دونوں کو بڑے عجیب انداز میں ایک دوسرے سے باندھے رکھا تھا۔ اس نے کنگ ایڈورڈ سے پڑھا تھا اس نے ایریزونا سے۔ اسے آئی سرجن بننا تھا ایرک کو ہارٹ۔ مگر ان کے مشترکہ پروفیشن نے جیسے ان کو گفتگو کے بہت سارے موضوعات دے دیے تھے۔

قبول اسلام کے بعد یونیورسٹی میں گریجویشن کے دوران وہ چند سال تک گرمیوں میں پاکستان آتا رہا تھا لیکن ایک بار میڈیکل میں جانے کے بعد وہ آنا جانا ختم ہو گیا تھا۔ امامہ اس بات پر خوش ہوئی تھی' وہ کبھی بھی اسے پاکستان آنے سے منع نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ سالار سمیت فیملی کے کسی بھی شخص کو ایرک کے پاکستان آنے پر اعتراض نہیں تھا اور وہ اسے منع کر کے اس کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی لیکن اس طرح اس کا ہر سال ان کے پاس آنا امامہ کے خدشات بڑھاتا رہا تھا اور جس سال پہلی بار اس نے پاکستان نہ آنے کے بارے میں انہیں اطلاع دی تھی' امامہ نے جیسے سکون کا سانس لیا تھا اسے یقین تھا وہ اب اپنی زندگی کی نئی مصروفیات میں سب کچھ بھول جانے والا تھا۔

کچھ ایسا ہی عنایہ نے بھی سوچا تھا اسے بھی لگا تھا ایرک بدل جائے گا' اور وہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھی۔ میڈیکل کی تعلیم مشکل تھی پھر اب اس کی زندگی میں اور لوگ آرہے تھے۔ وہ ان کے خاندان کو اور اسے اگر بھول بھی جاتا تو اس کے لیے نارمل ہوتا۔۔۔ بلکہ رنگ اور گلے کے باوجود۔۔۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس نے پاکستان آنا جانا چھوڑا تھا' ان سے رابطہ ختم نہیں کیا تھا۔ اور اس تعلق اور رابطے کے باوجود ان دونوں کے درمیان اعتراف یا اظہار کا کوئی کمزور لمحہ نہیں آیا تھا۔ اسے بار بار یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ اس کے لیے اسپیشل تھی لیکن یہ جملہ اس نے کبھی اس کی زبان سے نہیں سنا تھا اور یہ شاید بہت اچھا ہی تھا۔ تعلق ختم کرتے ہوئے گلے اور شکایتیں کچھ کم رہتیں۔۔۔ تکلیف بھی۔۔۔ یہ عنایہ سکندر کا خیال تھا۔

اس کے لیے اب رشتے دیکھے جا رہے تھے۔ بہتر لوگوں کو منتخب کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ اسے اندازہ تھا اس کی ریزیڈنسی کے دوران ہی اس کی منگنی یا شاید شادی ہو جائے گی اور وہ اس کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرتے ہوئے ان فیملیز اور لڑکوں سے بھی مل رہی تھی جن سے اس کا رشتہ طے پانے کا امکان تھا اور اس

سب کچھ کے درمیان اریک عبداللہ وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ نہ وہ زندگی سے جاتا تھا نہ دل سے نہ دماغ سے۔

اس دن بھی ان دونوں کے درمیان ایک چیٹنگ ایپ پر معمول کے میسجز کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ وہ اسے اپنے ہاسپٹل کا کوئی مسئلہ بتا رہا تھا اور اس نے جواباً" بڑی روانی سے اسے اپنے ہاسپٹل کا نام بتاتے ہوئے وہاں کسی مسئلے کا ذکر کیا اور سینڈ کا بٹن دباتے ہوئے بے اختیار اپنی غلطی پر پچھتائی۔ اس کا ٹیکسٹ اب فون کی سکرین پر نمودار ہو چکا تھا اور اسے یقین تھا اریک عبداللہ اتنا کند ذہن نہیں تھا کہ وہ اس جملے کو نظر انداز کر کے گزر جاتا۔ اس کے جملے کے بعد بہت دیر تک دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ یوں جیسے وہاں سب کچھ ساکت ہو گیا تھا۔ پھر بالآخر وہ ٹیکسٹ آیا جس کی اسے توقع تھی۔

"تم امریکہ میں ہو؟"

اس کا دل چاہا وہ لکھ دے اسمارٹ فون نے اسپتال کا نام غلطی سے لکھ دیا تھا۔ یا کوئی اور جھوٹ یا بہانہ۔ وہ تو مان لیتا تھا۔ سوال جواب اور بحث کب کرتا تھا لیکن وہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔ بس دل چاہا تھا "اسے "ہاں" کہہ دے اور اس نے یہی کیا تھا۔

اس کے بس نے اریک عبداللہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ عنایہ کا خیال تھا۔ فون ہاتھ میں پکڑے اس کی اسکرین پر نظریں جمائے وہ اس "ہاں" کے بعد کسی ردعمل کا انتظار کرتی رہی۔۔۔ خوشی، حیرت، بے یقینی، غصہ۔۔۔ کسی بھی ردعمل کا۔۔۔ وہ آن لائن تھا اور وہاں سکوت تھا۔ ایسا سکتہ اور سکوت کہ ایک لمحہ کے لیے عنایہ کو ڈر لگا۔ اس نے ہیلو لکھ کر اسے جیسے اس سکتے سے جھنجوڑنے کی کوشش کی تھی۔

"تم نے مجھے بتایا نہیں؟" دوسری طرف سے اس کی تحریر ابھری تھی۔ اس بار خاموشی عنایہ کی طرف چھائی تھی۔ وہ ایک سو ایک بہانے بنا سکتی تھی لیکن ایک بھی بہانا بنانا نہیں چاہتی تھی۔ ان دونوں کے درمیان شاید اب وہ لمحہ آگیا تھا جب اسے صاف گوئی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔

"تم مجھ سے ملنے کے لیے کہتے اور میں ملنا نہیں چاہتی تھی اس لیے۔" دوسری طرف بہت لمبی خاموشی چھائی تھی اس بار اتنی ہی لمبی جتنا عنایہ توقع کر رہی تھی۔

"آل رائٹ" پھر اسکرین چمکی اور بجھ گئی۔

وہ ایسے ہی کرتا تھا۔ بحث کرتا ہی نہیں تھا غصہ دکھاتا ہی نہیں تھا۔ مگر وہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ اسی طرح ہتھیار ڈالنے والے انداز میں بات کیا کرتا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے عنایہ کو غصہ آیا کہ وہ خواہ مخواہ احساس ندامت لیے بیٹھی تھی۔ اچھا ہے صاف صاف کہہ دیا اور نہ ملنے سے اسے فرق کیا پڑنا تھا' وہ ویسے بھی دو مختلف ریاستوں میں تھے۔۔۔ ملنے کے لیے بھی انہیں چھٹیوں کا انتظار کرنا پڑتا۔ وہ سوچ رہی تھی ساتھ ہی اپنے آپ کو توجیہات بھی دے رہی تھی۔

"میں پاکستان جا رہا ہوں۔" کچھ دیر بعد ابھرنے والے اگلے ٹیکسٹ نے اسے چونکایا۔

"کب؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"17 کو" جواب آیا۔

"کیوں؟" اس نے اب وہ پوچھا جو وہ پوچھنا چاہتی تھی۔

جواب نہیں آیا اور کئی دنوں تک نہیں آیا۔



ہشام نے اسے دیکھتے ہوئے چائے کا مگ خالی کیا۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر اشاروں کی زبان میں اپنے سامنے

بیٹھی عورتوں اور بچوں سے مخاطب ہو کر انہیں صحت و صفائی کے حوالے سے سمجھاتے ہوئے اپنے بیگ سے اس سے متعلقہ چیزیں نکال نکال کر دے رہی تھی۔ صابن... ٹوتھ پیسٹ... ٹوتھ برش ٹوتھ پک ٹیشو کاٹن رُوئی کے بنڈل' شیمپو' فرسٹ ایڈ کٹ اور اس میں موجود سامان... وہ سب عام استعمال کی چیزیں تھیں جنہیں کسی ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ملک میں بھی بیٹھ کر کسی کو ان کا استعمال سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی... لیکن وہ داداب تھا کینیا کے بارڈر کے قریب UNHCR کے افریقہ میں بڑے ترین کیمپوں میں سے ایک... جہاں افریقہ میں قحط اور خانہ جنگی سے متاثرہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی۔

اور ان دونوں کو وہاں آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ داداب میں یہ ان کا پہلا وزٹ تھا لیکن وہ پچھلے چار سالوں میں UNHCR کے بہت سارے کیمپس میں جا چکے تھے۔ افریقہ' ایشیا' لاطینی امریکہ... یہ ان کی تفریح بھی تھی جنون بھی اور کام بھی۔

لکڑی کی ایک خالی پیٹی کو الٹا کر بیٹھے ویسی ہی ایک دوسری پیٹی کو میز بنائے اور اس پر چائے کے مگ رکھے' اپنی چائے میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھاتے ہوئے وہ شدید تھکن کے عالم میں بھی اسے دیکھتا رہا... وہ مختلف جگہوں پر نئے آنے والے پناہ گزینوں کے ساتھ اس دن صبح سے ہونے والا ان کا اٹھائیسواں کیمپ تھا۔ وہ گروپ کی شکل میں نکلے تھے اور اب وہ دو کی ٹولیوں میں بٹ گئے نئے خیموں میں جا جا کر اندراج کرتے ہوئے صحت و صفائی کے حوالے سے سامان تقسیم کرتے پھر رہے تھے اور اب شام ہونے والی تھی۔ ہشام نے اپنا کام ختم کر لیا تھا۔ گرم پانی کے فلاسک اور پشت پر لدے بیگ سے مگ اور چائے کا سامان نکال کر وہ اپنی ساتھی کے واپس آنے سے پہلے ہی چائے بنا کر اس کا انتظار کر رہا تھا اور وہ ابھی بھی وہیں تھی۔ اسی طرح اپنے کام میں محو... اس نے اپنا مگ دوبارہ چائے سے بھرا۔

وہ اس کے ساتھ دنیا کے بہت سارے ملکوں میں جا چکا تھا اور لوگ کوئی بھی ہوں' زبان کوئی بھی ہو اس نے اپنی ساتھی کو کبھی کسی دقت کا شکار نہیں دیکھا تھا۔ وہ اشاروں کی زبان کی ماہر تھی لیکن ہشام جانتا تھا وہ اشاروں کے بغیر بھی کسی گونگے سے اس کے دل کا حال اگلوا لیتی... ایک عجیب گرم جوشی تھی اس میں جو کسی کا بھی دل موم کر کے رکھ دیتی اور وہ اب بھی کر رہی تھی۔

ان گندے' کمزور' بیمار' قحط زدہ تباہ حال لوگوں کے بیچ بیٹھی وہ پروفیشنل مہارت سے اپنا کام کرتے ہوئے اشاروں کی زبان اور ٹوٹی ہوئی مقامی زبان میں ان سے گپ شپ کرنے کی کوشش کر رہی تھی... بچوں کے ساتھ ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ' عورتوں کے ساتھ مسکراہٹوں اور معانقوں کا تبادلہ... وہ اپنا کام ختم کرنے کے قریب تھی...

اس کے پاس موجود سامان ختم ہو چکا تھا اور اس سامان سے خالی ہونے والا بیگ اس نے ایک پانچ سالہ بچے کو اوڑھانے والے انداز میں دیا تھا جو بار بار اس بیگ کو لینے کے لیے ہاتھ پھیلا رہا تھا اور پھر ہشام نے ایک چھوٹی بچی کو اس کے بالوں میں لگی ہوئی ایک خوب صورت ہیئر پن کو چھوتے دیکھا۔ وہ زمین پر پڑے ایک لکڑی کے کریٹ پر بیٹھی تھی اور وہ بچی اس کے عقب میں جا کر اس کے تقریباً جوڑے والے انداز میں لپیٹے ہوئے بالوں کو چھیڑ رہی تھی اور پھر اس نے اس ہیئر پن کو اتارنے کی کوشش کی' ہشام نے اسے پلٹ کر اس بچی کو اٹھا کر اپنی گود میں لیتے دیکھا اور پھر اپنے بالوں میں لگی ہوئی ہیئر پن اتار کر اس نے اس بچی کے گھونگھریالے بالوں میں لگا دی اور اسے گود سے اتارتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بالآخر ہشام کی طرف متوجہ ہوئی جو تب تک چائے کا دوسرا مگ بھی ختم کرنے کے قریب تھا۔ انہیں وہاں سے ابھی کافی دور چل کر جانا تھا' جہاں سے انہیں UNHCR کی گاڑی مل جاتی جو انہیں اس جگہ لے جاتی جہاں پر ان تمام ورکرز کی رہائش تھی۔

ہشام نے اسے بالآخر اپنی طرف آتے دیکھا' وہ دور سے مسکرائی۔ ہشام نے بھی اس کی مسکراہٹ کا جواب

مسکراہٹ سے دیا۔
"تم ہر کام بہت جلدی کر لیتے ہو۔" اس کے قریب آکر لکڑی کے ایک اوندھے ہوئے کریٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے جیسے ہشام کو سراہا۔ وہ واقعی اپنے ذمہ لگائے ہوئے تمام کام بہت تیزی سے کرنے کا عادی تھا۔

"عقل مند ہوں اس لیے۔" اس نے جواباً" مسکراتے ہوئے چائے کا وہ مگ اس کی طرف بڑھایا جس میں پڑی چائے کے ٹھنڈا ہونے پر اس نے اسے پھینک کر اس کے لیے ابھی دوبارہ چائے بنائی تھی۔

"مجھ سے بھی زیادہ۔" اس کی ساتھی نے چائے کا مگ ہشام سے لیتے ہوئے بے حد جتانے والے انداز میں کہا۔

"تم سے تو واقعی زیادہ۔" اس نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

شام اب آہستہ آہستہ گہری ہو رہی تھی۔ پناہ گزینوں کا وہ ہجوم اب آہستہ آہستہ وہاں سے دور اپنے خیموں کی طرف جا رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ آج انہیں جو کچھ ملنا تھا مل چکا تھا۔

ایک کچی پگڈنڈی نما سڑک کے کنارے سبزے میں لکڑی کے کریٹ الٹائے چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ دونوں اپنی ٹانگیں سیدھی کیے جیسے اپنی تھکن اتار رہے تھے۔

"تمہارے لیے کچھ ہے۔" ہشام نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر مگ رکھتے ہوئے جیب سے کچھ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ رئیسہ نے اس انگوٹھی کو بے حد تعجب کے عالم میں دیکھا تھا جو ہشام نے اس کے سامنے بڑھائی تھی۔ ایک بے حد خوب صورت سبز مخملی ڈبیہ میں دھری آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ایک ہیرے کی انگوٹھی۔

اس نے سر اٹھا کر ہشام کو دیکھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے جیسے چائے پینا بھول گئی جو وہ مگ میں ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی۔

"یہ کہاں سے ملی؟" دادا ب کے اس ویرانے میں اس انگوٹھی کو دیکھ کر جو خیال کسی کو آنا چاہیے تھا وہی رئیسہ کو بھی آیا تھا۔

"کیا مطلب کہاں سے ملی؟" ہشام بری طرح بدکا۔ "میں نے خریدی ہے۔" اس نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"کہاں سے؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

"نیروبی سے" ہشام نے جواباً" کہا۔

"پھر مجھے کیوں دے رہے ہو؟" اس نے چائے پینا دوبارہ شروع کرتے ہوئے کہا۔ سوال کرنے کے بعد جو وہ نروس ہوئی تھی اسے یک دم احساس ہوا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

"تمہیں پرپوز کر رہا ہوں۔" ہشام نے ایک بار پھر اس انگوٹھی کو اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

رئیسہ نے ایک نظر اسے دیکھا ایک نظر اس انگوٹھی کو اور پھر گردن گھما کر اس پورے علاقے کو۔ وہ خاردار جھاڑیوں اور پناہ گزینوں کے بیچوں بیچ اسے ایک ڈائمنڈ رنگ پیش کرتے ہوئے پرپوز کر رہا تھا۔ وہ کسی بھی لڑکی کے لیے ایک رومانٹک لمحہ تھا اور اس کے لیے بھی ہوتا اگر اسے یک دم ہنسی آنا شروع نہ ہو گئی ہوتی۔ چائے کا مگ لکڑی کے ایک کریٹ پر رکھتے ہوئے وہ بے اختیار قہقہہ لگاتے ہوئے بے حال ہونے لگی تھی۔

ہشام بری طرح نادم ہوا اور اس نے ڈبیہ بند کر دی۔

"یہ اس طرح ہنسنے کا کیا مطلب ہوا؟" اس نے رئیسہ سے پوچھا۔ وہ اب اپنی ہنسی پر قابو پا چکی تھی۔

"ہم یہاں ریلیف کے کام کے لیے آئے ہیں۔" اس نے ہشام کو یاد دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ "تم کچھ اور کیسے سوچ سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں سوچ سکتا؟" ہشام نے بحث کرنے والے انداز میں کہا۔ "ہمیشہ سوچتا رہا ہوں اور بس میرا دل چاہا میں تمہیں پرپوز کروں تو کر دیا۔"

رئیسہ نے چائے کا مگ دوبارہ منہ سے لگا لیا' وہ اب سنجیدہ تھی۔ ہشام ڈبیہ ہاتھ میں پکڑے چپ چاپ اسے چائے پیتے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

"تم کچھ نہیں کہو گی؟"

"میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی (ٹو بی وری آنسٹ)" اس نے بالآخر چائے کا مگ رکھ دیا۔ وہ اب اپنے بیک پیک کو کھول کر ایک ریڈیو نکال رہی تھی' یہ جیسے گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش تھی۔

"کیوں...؟ تم پسند نہیں کرتیں مجھے؟" ہشام بھی یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"کرتی ہوں... تمہیں کوئی بھی ناپسند نہیں کر سکتا' لیکن شادی کا فیصلہ بہت بڑا فیصلہ ہوتا ہے۔ میں خود نہیں کر سکتی... تمہیں میری فیملی کی رضامندی مجھے پرپوز کرنے سے پہلے لینی ہو گی۔" ریڈیو فریکوئنسی سیٹ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے ہشام کی طرف دیکھے بغیر اس سے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" ہشام نے بے اختیار اطمینان کا سانس لیا۔ "میں ان سے بات کروں گا' یہ کوئی بڑی بات نہیں۔" رئیسہ اس سے کہہ نہیں سکی کہ اس کی قومیت اس کی فیملی کے لیے قابل اعتراض ہو سکتی تھی' وہ ایرک اور عنایہ کے معاملے میں امامہ کی رائے سے بہت اچھی طرح واقف تھی۔ وہ اپنے تمام بچوں کی شادیاں پاکستانیوں سے کرنا چاہتی تھی۔

"تم یہ رنگ اپنے پاس رکھ لو میں تمہاری فیملی سے بات کروں۔ تب تم اسے پہن سکتی ہو۔" ہشام نے وہ ڈبیہ ایک بار پھر اس کی طرف بڑھائی۔ رئیسہ نے اپنا ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھایا' وہ اپنے گھٹنے پر رکھے ریڈیو کے ساتھ مصروف تھی یا کم از کم یہی ظاہر کر رہی تھی۔

"اس کا فائدہ نہیں... اگر میں نے رنگ لے لی اور میری فیملی نے انکار کر دیا تو؟" اس نے ہلکی آواز میں خبریں سنتے ہوئے کہا۔ ہشام نے بے چینی سے اسے دیکھا۔

"تمہاری فیملی انکار کیسے کر سکتی ہے؟" وہ پہلی بار کچھ بے چین ہوا تھا۔

"ہمیں ہر پوسیبلٹی سامنے رکھنی چاہیے۔" رئیسہ نے مدھم آواز میں جیسے اسے سمجھایا۔

"وہ انکار کریں گے تو؟" ہشام نے پوچھا۔

"تو بس۔" رئیسہ نے کہا۔

"یعنی بس ختم؟" ہشام کو جیسے یقین نہیں آیا۔

"تم یہ کیسے ہونے دو گی... میرے لیے تمہاری کوئی فیلنگز نہیں ہیں؟" ہشام کو جیسے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

"فیلنگز ہیں تمہارے لیے لیکن وہ میری اپنی فیملی کے لیے فیلنگز سے بہت کم ہیں... کم از کم ابھی کیا تم اپنی فیملی کی مرضی کے خلاف کچھ کر سکتے ہو؟" رئیسہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں میں کر سکتا ہوں... کم از کم تم سے شادی تو۔" اس نے جواباً کہا تھا۔ رئیسہ کو جیسے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ ریڈیو کو چھیڑتے ہوئے اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"ویسے یہ جو رنگ میں ڈائمنڈ ہے' یہ نقلی ہے۔" ہشام بری طرح چونکا۔ وہ بات کو کہاں سے کہاں لے گئی تھی۔

اس نے بے اختیار ہاتھ میں پکڑی ڈبیہ کھولی اور اس میں سے انگوٹھی نکال کر اسے آنکھوں کے پاس لے

جاتے ہوئے بولا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"کیونکہ میں نے اسے اچھی طرح دیکھا ہے۔ میری ممی کے پاس بہت سارے ڈائمنڈز ہیں۔ میں ڈائمنڈ پہچان سکتی ہوں۔" ریشہ نے اسی انداز میں کہا۔

وہ ویک اینڈ پر نیپال گئے تھے اور جیولری کی مارکیٹ میں پھرتے ہوئے ایک دکان پر ریشہ کو یہ انگوٹھی اچھی لگی تھی۔ جو ہشام نے اسے بتائے بغیر خرید لی تھی۔ وہ اسے اسی انگوٹھی کے ساتھ پروپوز کرنا چاہتا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا۔ تم نے مجھے تب کیوں نہیں بتایا؟ میں نے تو ڈائمنڈ رنگ کے طور پر بہت مہنگا خریدا ہے اسے۔" ہشام حیران سے زیادہ شرمندہ ہوا۔

"مجھے یہ تھوڑی پتا تھا کہ تم اسے خریدنا چاہتے ہو۔ مجھے تو بس اچھی لگی تھی اور جیولر کہہ رہا تھا ڈائمنڈ ہے تو میں اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی یہ بتا کر کہ یہ ڈائمنڈ نہیں ہے۔" ریشہ نے اس سے کہا۔

ہشام نے کچھ مایوسی کے عالم میں اس رنگ کو ڈبیہ میں رکھ کر ڈبیہ بند کر دی۔ ریشہ نے اس کے تاثرات دیکھے اور ہاتھ بڑھا کر تسلی دینے والے انداز میں اس سے وہ ڈبیہ لی۔

"تمہارا بڑا نقصان ہو گیا۔" اس نے جیسے ہشام کو تسلی دی۔

"نہیں اتنا نقصان نہیں ہوا جتنی شرمندگی ہوئی ہے کہ میں ایک نقلی ڈائمنڈ کے ساتھ تمہیں پروپوز کر رہا تھا۔"

ریشہ نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ "پریشان مت ہو میں اسے رکھ لیتی ہوں۔ اگر میری فیملی مان گئی تو میں یہی رنگ پہن لوں گی۔" وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

وہ انگوٹھی جو وہ محبت میں لینے پر تیار نہیں تھی ہمدردی میں لے رہی تھی۔ وہ واقعی فلاحی کارکن تھی۔

"ہنس کیوں رہے ہو؟" وہ حیران ہوئی۔

"خوش ہوں اس لیے۔" ہشام نے جواباً کہا۔

"مجھے پتھروں میں ڈائمنڈ کی پہچان ہو نہ ہو انسانوں میں ہے۔ اور میں نے ایک نقلی ڈائمنڈ ایک اصلی ڈائمنڈ کو دیا تھا کم از کم مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں۔" ہشام نے اتنے سال کے ساتھ میں اسے پہلی بار شرم سے سرخ ہوتے دیکھا۔

وہاں اب خاموشی تھی۔ ہوا کی سرسراہٹ۔ اسٹریٹ شام اور اس میں ریڈیو پر چلنے والا نیوز بلیٹن۔ جس میں بحرین میں ایک طیارے کے کریش ہونے کی خبر دی جا رہی تھی۔ جس پر وہ دونوں اکٹھے متوجہ ہوئے تھے۔



☼ ☼ ☼

آج بہت لمبے عرصے کے بعد امامہ اس کمرے میں اس باکس کو کھولے بیٹھی تھی۔ ایک ایک کر کے وہ سارے اسکیچ بکس اور اسکریپ بکس نکالے جس پر کئی دہائیوں پہلے اس نے اپنے گھر کی بنیادیں پنسل اور رنگوں سے رکھنی شروع کی تھیں۔

وہ اس کمرے کی صفائی کروانے کے لیے ملازم کے ساتھ وہاں آئی تھی اور صفائی کراتے ہوئے اس باکس کو دیکھتے ہی اسے بہت کچھ یاد آگیا تھا اور اب صفائی مکمل کرانے کے بعد وہ اس باکس کو اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ بڑی فرصت سے پرانی یادوں کو گنگنانے اور جینے کے لیے۔

وہ ایلس ان ونڈر لینڈ کی طرح انہیں کھولے کہیں سے کہیں پہنچ گئی تھی۔ اتنی دہائیاں گزرنے کے بعد وہ اسکریپ بکس خستہ حال ہو رہی تھیں۔ ایک جگہ میں بھرے ہوئے رنگ اڑنے لگے تھے' لکھے ہوئے لفظ مٹنے لگے تھے' کھینچی ہوئی لکیریں دھندلانے لگی تھیں۔ لیکن ان دھندلی لکیروں' مٹتے لفظوں' پھیکے پڑتے رنگوں اور بھربھراتے کاغذوں میں بھی اسے ہر یاد ویسی ہی رنگین' تازہ' خوش گوار' زندہ محسوس ہو رہی تھی جیسے وہ آج ہی کا قصہ تھا۔ کل ہی کی بات تھی' برسوں ہونے والا واقعہ تھا۔

وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ ہر صفحہ بڑی احتیاط سے پلٹ رہی تھی یوں جیسے ذرا بے احتیاطی ہوئی تو رنگ جھڑ جائیں گے' لکیریں رگڑ کھا کر چھو منتر کی طرح غائب ہو جائیں گی' سب کچھ غائب ہو جائے گا اپنے ساتھ اس کی زندگی کے بہترین دنوں کو لے کر۔

ہر صفحے پر اس کے ہاتھ کے بنے اسکیچز تھے۔ کون سا کمرہ کیسے بنتا تھا۔ کس دیوار پر کیا لگتا تھا۔ کہاں کیسا رنگ ہونا تھا۔ اس کے ہاتھ کی تحریر میں وہ چیزیں لکھی ہوئی تھیں۔ ہر صفحہ' ہر لکیر' ہر تصویر یکدم جیسے بولنے لگی تھی۔ اس کے اور سالار کے درمیان ہونے والی باتیں۔ وہ ہر چیز بنا کر سالار کو دکھاتی تھی اس سے رائے لیتی تھی' جب بھی جہاں بھی کسی کے گھر اسے کوئی چیز پسند آجاتی' وہ چیز اس کی اسکریپ بک میں موجود اس کے گھر کے کسی کمرے کا حصہ بن جاتی تھی۔ ان صفحات پر بنی تصویروں کو دیکھتے ہوئے اس کے کانوں میں اپنی اور سالار کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔

پتا نہیں زندگی اتنی تیزی سے کیوں گزرتی ہے یا پھر بالکل رک کیوں جاتی ہے۔ جب وہ سالار کے ساتھ تھی تو سب کچھ ہوا کی رفتار سے گزر جاتا تھا۔ اب وہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔ تو سب کچھ ایسے رک گیا تھا جیسے زندگی کو زنگ ہی لگ گیا ہو۔

اس نے ایک صفحہ اور پلٹا' پھر ایک اور۔ اس اسکیچ بک میں موجود گھر بناتے ہوئے اسے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ زندگی میں صرف یہ ہی ایک گھر بناسکتی تھی وہ بھی کاغذوں پر۔ حقیقت میں نہیں' وہ محنت اور وقت جو اس نے اس گھر پر لگایا تھا' شاید اتنی ہی مدت بھی جتنی کوئی اپنے گھر پر لگاتا تھا لیکن اس کا گھر اس مدت کے بعد بھی کاغذوں پر ہی رہا تھا' کبھی زمین پر حقیقت بن کر کھڑا نہیں ہو سکا تھا۔

اس کی زندگی کی بہت ساری خواہشات میں صرف ایک وہ ایسی خواہش تھی جو حسرت بنی تھی اور اب تو ایک مدت ہوگئی تھی اس نے "گھر" کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ آج بس اس باکس کو دیکھنے پر اسے یاد آیا تھا کہ اس نے بھی ایک گھر بنانے کی کتنی خواہش کی تھی۔ بچت بھی کی تھی۔ کوشش بھی۔ لیکن بعض چیزیں مقدر میں نہیں ہوتیں۔ ان صفحوں پر پھیلی خوابوں کے گھر کی وہ تصویریں اس کی زندگی کے سب سے اچھے دنوں کی تصویریں تھیں۔ ان کے در و دیوار سے اس کی خوشیاں اب بھی چھلکتی تھیں۔ اتنے سالوں کے بعد بھی۔۔۔

وہ گھر حقیقت میں نہ ڈھلنے کے باوجود اسے عجیب خوشی دے رہا تھا۔ عجیب طرح سے گدگدا رہا تھا۔ جیسے کوئی ننھا بچہ اپنا دل پسند کھلونا پالینے پر کھلکھلاتا ہے۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے ان اسکیچ بکس کو بند کیا لیکن پھر باکس میں رکھنے کے بجائے وہیں سامنے پڑی میز پر رکھ دیا۔

اسے امریکہ سے آنے والے اس مہمان کے استقبال کی تیاری کرنی تھی جو تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ رہا تھا۔



وہ جبریل سکندر کی ڈاکٹر ویربل برنارڈ کے ساتھ آخری سرجری تھی۔ وہ اس کے بعد ریٹائر ہو رہے تھے اور ان کے اسسٹنٹ کے طور پر وہ آخری سرجری اس کی زندگی کی سب سے اہم سرجری تھی۔

وہ پانچ سالہ ایک بچہ تھا جو سیڑھیوں سے گر کر سر پر لگنے والی ایک چوٹ کے بعد کوما میں گیا تھا۔ اور اب اسے سرجری کی ایمرجنسی میں ضرورت پڑی تھی۔ اس کے دماغ میں انٹرنل بلیڈنگ ہو رہی تھی۔

جبریل ڈاکٹر ویربل کے ساتھ پچھلے دو سالوں سے کام کر رہا تھا۔ وہ امریکہ کی تاریخ کے کامیاب ترین سرجنز میں سے ایک تھے اور جبریل ان کا پسندیدہ ترین اسسٹنٹ تھا۔ ڈاکٹرز کے سرکل میں ڈاکٹر ویربل برنارڈ کو دیوتا کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ یہودی النسل تھے اور ان کے ساتھ کام کرنا ہی خود ایک اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ وہ مزاجاً بے حد اکھڑ اور تیکھے مزاج کے تھے اور بے حد کم کسی کے کام سے خوش ہونے والوں میں سے تھے۔ خاص طور پر کسی مسلمان کے اور وہ بھی ایشیائی نسل کے۔

اس کے باوجود جبریل سکندر ان کا چہیتا تھا۔ کہیں نہ کہیں وہ اس میں اپنا آپ دیکھتے تھے، اس کی یکسوئی، اس کی مہارت کو۔ اور یہ بات اس ہاسپٹل میں سب کو پتا تھی کہ ڈاکٹر ویربل کو ٹھنڈا رکھنے کا کام جبریل سکندر سے بہتر کوئی نہیں کرسکتا۔

اور جتنے مہربان وہ جبریل کے ساتھ تھے، اتنا ہی متاثر وہ ڈاکٹر ویربل سے تھا۔ نیورو سرجن کے طور پر ان کا ڈنکا اگر

دنیا میں بچتا تھا تو وہ اس قابل تھے۔ اپنی بدمزاجی کے باوجود۔ انہوں نے ساری عمر شادی نہیں کی تھی۔ دو کتے اور دو بلیاں پالی تھیں اور ساری زندگی ان ہی کے ساتھ گزاری تھی اور انہوں نے جبریل کو بھی اپنی پہلی ملاقات میں پہلا مشورہ یہی دیا تھا۔

"تم اس فیلڈ میں بہت آگے جاسکتے ہو' اس لیے شادی مت کرنا۔ اپنے پروفیشن اور کیریر کو فوکس کرنا۔ دنیا کا ہر شخص اپنی زندگی اچھی کرنے کے لیے شادی کرسکتا ہے' لیکن دنیا کا ہر شخص دوسروں کی زندگی بچانے کے لیے اپنی زندگی قربان نہیں کرسکتا۔"

انہوں نے جبریل کو نصیحت کی تھی جو اس نے مسکرا کر سنی تھی اور اب اتنا عرصہ ان کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ ڈاکٹر ویزل کے مزاج کو بخوبی سمجھ اور پڑھ سکتا تھا۔

"تمہارا ہاتھ مسیحا کا ہاتھ ہے' کیونکہ تم اچھے ماں' باپ کا خون رگوں میں لیے ہوئے ہو اور قرآن کے حافظ ہو۔ اپنی اس مسیحائی کی حفاظت کرنا۔"

انہوں نے چند دن پہلے اس کے اپارٹمنٹ پر اس کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے کہا تھا جو اس کی طرف سے ان کے لیے ایک الوداعی ڈنر تھا۔ وہ ان کی بات پر حیران رہ گیا تھا۔ وہ ایک بے حد متعصب اور کٹر قسم کے یہودی تھے' ان کی زبان سے قرآن حفظ کرنے کو مسیحائی سے جوڑنا جبریل کے لیے ناقابل یقین تھا اور اس کے چہرے اور آنکھوں کی حیرانی نے جیسے اس کے تعجب کو ان تک بھی پہنچایا تھا۔

"برے مسلمان برے لگتے ہیں' اچھے نہیں۔" وہ کہہ کر اپنی ہی بات پر خود ہنسے تھے۔

"آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے میں نے۔" جبریل نے بھی انہیں خراج تحسین پیش کرنا چاہا تھا۔ انہوں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"میں نہ بھی ہوتا تو بھی تم سیکھتے۔ مجھے خوشی ہے کہ مجھے بھی اپنی زندگی کے آخری سالوں میں تمہارے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔" انہوں نے جواباً" اس سے کہا۔

ڈاکٹر ویزل کی شخصیت کے اس پہلو کی جھلک صرف جبریل نے دیکھی تھی اور کوئی کبھی مر کر بھی یقین نہیں کرسکتا تھا کہ وہ کسی کے لیے اتنے مہربان ہوسکتے تھے۔ جبریل کو ان کے ساتھ کام کرنا کبھی مشکل نہیں لگا تھا' لیکن اب ان کے جانے کے بعد وہ خود ایک سرجن کے طور پر اپنے کیریر کا آغاز کرنے جارہا تھا۔

آپریشن ٹیبل پر لیٹے ہوئے اس بچے کے دماغ کا آپریشن کرتے ہوئے وہ ڈاکٹر ویزل کے بالکل برابر میں کھڑا تھا' وہ ہمیشہ کی طرح گپ شپ کررہے تھے' اپنے طویل میڈیکل کیریر کے حوالے سے۔ جب ان کی گفتگو میں پہلی بار جبریل نے کچھ اداسی محسوس کی تھی۔

پھر اس نے ڈاکٹر ویزل کو اوزار سے اس بچے کے دماغ میں بلیڈنگ روکنے کے لیے ایک اور جگہ پر کٹ لگاتے دیکھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں جبریل کو کچھ کھٹکا تھا' وہ ان کا ہاتھ چلتے دیکھ رہا تھا لیکن اسے لگا تھا' کچھ غلطی ہوئی تھی۔ اس کا احساس ٹھیک تھا' وہ بچہ ہوش میں نہیں آسکا تھا۔ ڈاکٹر ویزل کے پروفیشنل کیریر کی آخری سرجری ناکام رہی تھی۔ عائشہ عابدین نے اپنی اکلوتی اولاد کھو دی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)



کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دی۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آ جاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بد دیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

بائیسویں قسط واپ

وہ خانہ کعبہ کے سامنے کھڑا تھا۔ اور وہ وہاں مقام ملتزم کے سامنے کھڑا تھا۔ کتنی بار وہ یہاں آیا تھا اور کتنی بار یہاں آکر کھڑا ہوا تھا۔ اسے اب گنتی بھی بھول چکی تھی، لیکن ہر بار کی طرح اس بار بھی وہ وہاں اسی حالت میں کھڑا تھا۔ ہیبت کے عالم میں۔ عجز کی کیفیت میں۔ دنیا کی کوئی جگہ سالار سکندر کو مٹی نہیں کرتی تھی، صرف وہ جگہ تھی جو اسے خاک بنا دیتی تھی اور وہ "خاک" بننے ہی وہاں آتا تھا۔ ہر بار اپنی اوقات جاننے اور اس کی یاد دہانی کے لیے۔ ہر بار جب دنیا اسے کسی چوٹی پر بٹھاتی تھی تو وہ اپنے فخر اور تکبر کو دفنانے یہاں آتا تھا۔ آج بھی آیا تھا۔ بلکہ بلایا گیا تھا۔

خانہ کعبہ کا دروازہ کھولا جا رہا تھا۔ سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ اور وہ دنیا کے مختلف خطوں سے آئے ان دس مسلمانوں میں شامل تھا، جنہیں خانہ کعبہ کے اندر ہونے والی صفائی کی سعادت کے لیے چنا گیا تھا۔ اور یہ اعزاز اس کے حصے کس نیکی کے عوض آیا تھا، یہ ابھی تک سمجھ میں اس کی نہیں آ رہا تھا۔ کرم اور کرم تو اس پر اللہ کا ہمیشہ رہا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے نامہ اعمال میں ایسی کوئی نیکی کھوج رہا تھا جو اسے کرم کا باعث بنتی۔

وہ شاہی خاندان کا مہمان بن کر پچھلے سالوں میں کئی بار عمرے کی سعادت حاصل کر چکا تھا۔ امامہ کے ساتھ بھی اس کے بغیر بھی۔ مگر یہ دعوت نامہ جو وہاں سے اس بار آیا تھا۔ وہ سالار سکندر کو کسی اور ہی کیفیت میں لے گیا تھا۔ ایسا انعام اور اتنا انعام۔ ایسا کرم اور اتنا کرم۔ وہ خطا کار اور گناہ گار تھا۔ ایسا کیا کر بیٹھا تھا کہ وہ اسے در گزر کر رہا تھا یوں عطا کر رہا تھا، وہ بھی جو وہم و گمان میں بھی نہ آنے والی باتیں ہوں۔

وہ اس دعوت نامے کو آنکھوں سے لگا کر روتا رہا تھا۔ کیا صاف کرنا تھا اس نے وہاں جا کر۔ سب صفائی تو اس کے اپنے اندر ہونے والی تھی اور ہوتی آ رہی تھی۔

امامہ بھی وہاں تھی، ایک دوسری قطار میں ان ہی افراد کی فیملیز کے ساتھ۔ وہ اسے بھی ساتھ لایا تھا اور وہ اسے رشک سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اور کیا کر سکتی تھی۔ اس کے گھر امریکہ سے آنے والا وہ "مہمان" اس بار اس کے لیے ایسی سعادت لانے والا تھا۔ اس کا اندازہ تو اسے تھا ہی نہیں۔ وہ اسے ہمیشہ سرپرائز کرتا تھا، بغیر جتائے آ جاتا تھا جب بھی اسے وقت ملتا تھا۔ دو دن کے لیے، تین دن کے لیے۔ اس بار بڑے عرصے کے بعد اس نے امامہ کو اپنی آمد کے بارے میں پہلے سے بتایا تھا۔

"تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔" اس نے امامہ سے کہا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح سرپرائز بوجھ گئی تھی، ایسا کبھی نہیں ہوا تھا اس نے وہ پہیلیاں نہ بوجھی ہوں جو سالار اس کے سامنے رکھتا تھا۔

"تم مجھے عمرے پر لے کر جاؤ گے۔" اس نے کئی اندازے لگانے کے بعد اس سے فون پر کہا اور اس کے ہنسنے پر امامہ نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"مجھے پتا تھا۔"

لیکن جس سعادت کے لیے اللہ نے اسے اس بار بلایا تھا، اسے اس کا اندازہ نہیں تھا، وہ اسے نہیں بوجھ سکی تھی اور جب اس صبح اس نے بالآخر امامہ کو وہ دعوت نامہ دکھایا تھا تو وہ گنگ ہو کر رہ گئی تھی اور پھر وہی ہوا تھا جو ہوتا آیا تھا، جو ہونا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔

"تم اس لیے رو رہی ہو کہ یہ دعوت نامہ تمہارے لیے نہیں ہے؟" سالار نے اس کے بہتے آنسو روکنے کے لیے جیسے اسے چھیڑا۔

"نہیں میں صرف اس لیے رو رہی ہوں کہ۔۔۔" وہ آنسوؤں کے درمیان رکی۔ "اللہ تم سے اتنا پیار کیوں کرتا ہے۔" وہ پھر رونے لگی تھی۔ "حسد نہیں ہے، رشک ہے۔ تمہارا اعزاز ہے، لیکن مجھے لگ رہا ہے میرے سر پر تاج بن کر سجا ہے۔" وہ آنسوؤں کے بیچ کہتی جا رہی تھی۔

"جو بھی اعزاز ہیں، تمہاری وجہ سے ہی آئے ہیں امامہ۔۔۔ پہلے بھی۔۔۔ اب بھی۔۔۔ کوئی اور زندگی کا ساتھی ہوتا تو یہ سب نہ ہوتا۔" اس نے جواباً اس سے کہا تھا۔

اور اب خانہ کعبہ کے کھلتے ہوئے دروازے سے وہ سالار سکندر کو سیڑھیاں چڑھ کر اندر جاتا دیکھ رہی تھی۔ وہ اندر جانے والا آخری شخص تھا۔

معجزہ ہی تھا وہ زندہ تھا۔ صحت مند تندرست' چاق وچوبند... اس عمر میں بھی بیس بائیس گھنٹے کام کرتے رہنے کی سکت کے ساتھ۔

ڈاکٹرز کہتے تھے اس کی زندگی معجزہ تھی اور اس کی ایسی صحت مند زندگی معجزے سے آگے کی کوئی شے... بیالیس سال کی عمر میں اسے ٹیومر ہوا تھا اور وہ اب چھپن سال کا تھا۔ جو ٹیومر اسے ہوا تھا۔ وہ سات سے دس سال کے اندر انسان کو ختم کر دیتا تھا اور وہ چودہ سال سے زندہ تھا۔ ہر چھ مہینے کے بعد اپنی رپورٹس کو دیکھتا تھا۔ اس کے دماغ میں موجود ٹیومر آج بھی تھا۔ اسی جگہ پر۔ اسی سائز میں... اور بس...

وہ رب جو سمندروں کو باندھ دیتا تھا اور انہیں ان کی حدوں سے باہر نکلنے نہیں دیتا تھا۔ اس کے سامنے وہ چند ملی میٹر کا ایک ناسور کیا شے تھا؟

موت اور اس کے بیچ زندگی نہیں دعائیں آکر کھڑی ہوئی تھیں اور سالار سکندر کو خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوتے ہوئے بھی یہ یاد تھا کہ وہ کس کی دعاؤں کی وجہ سے وہاں آج بھی اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ وہ امامہ ہاشم کے علاوہ کسی اور کی دعائیں ہو ہی نہیں سکتی تھیں جو اسے زندگی بن کر لگی تھیں۔

"کتنے سال سے میں نے اپنے لیے کوئی دعا ہی نہیں کی۔ جو بھی دعا ہے تمہارے اور بچوں سے شروع ہو کر تم اور بچوں پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ جب تک مجھے اپنا آپ یاد آتا ہے... مجھے دعا ہی بھول جاتی ہے۔" وہ اکثر اس سے ہنستے ہوئے کہا کرتی تھی۔ یوں جیسے ایک ماں اور بیوی کی پوری کہانی لکھ دیتی تھی۔

"دیکھو اللہ تمہیں کہاں کہاں بلاتے ہیں' کہاں کہاں دعا کرنے کا موقع دے رہے ہیں۔"

یہاں آتے ہوئے امامہ نے بڑی حسرت سے اس سے کہا تھا اور اب خانہ کعبہ کے اندر کھڑے وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اسے جہاں بھی بلاتا تھا' وہ اسے ہر اس جگہ پر امامہ کو بھی یاد رکھواتا تھا۔ جیسے اسے جتاتا اور بتاتا ہو کہ اسے کیسی درجے والی عورت کا ساتھ عطا کیا گیا تھا۔

اس گھر کے اندر کی دنیا اور دنیا تھی۔ اس کائنات کا حصہ ہوتے ہوئے بھی وہاں کروڑوں نہیں آئے تھے' لاکھوں نہیں' ہزاروں نہیں... بس ہر صدی میں چند سو... اور ایک وہ صدی تھی جب وہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آئے تھے۔ اپنے وجود کے علاوہ اسے وہاں صاف کرنے والی کوئی شے نظر ہی نہیں آرہی تھی۔

"تم اندر جا کے کیا مانگو گے سالار؟" اس نے خانہ کعبہ آتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

"تم بتاؤ کیا مانگوں؟" سالار نے جواباً اس سے پوچھا۔

"پتا نہیں' مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا۔" وہ رونے لگی۔ اور اس دعوت نامہ کو دیکھنے کے بعد بار بار یہی ہو رہا تھا' وہ بار بار بات کرتے ہوئے رونے لگتی تھی۔ جیسے دل بھر آتا ہو... جیسے خوشی کی حد ختم ہو جاتی ہو۔

"تم سارے ستونوں کو ہاتھ لگا کر آنا... ساری دیواروں کو... ان کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی چھوا ہو گا' کسی نہ کسی کو... پھر تم باہر آؤ گے تو سب سے پہلے میں تمہارا ہاتھ چھوؤں گی۔" وہ بچوں جیسے انداز میں کہہ رہی تھی۔

اور خانہ کعبہ کے اندر اس کی دیواروں' ستونوں کو آب زم زم سے دھوتے ہوئے سالار سکندر کی سمجھ میں آگیا تھا امامہ ہاشم کیوں یاد آتی ہے ایسی ہر جگہ پر... کیوں دعا والی ہر جگہ پر سب سے پہلے اس کے لیے دعا کرنا یاد آتا تھا۔ کیوں کہ وہ عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔ خالص... غرض کے بغیر تھا... قربانیوں سے گندھا تھا' یہ کیسے ممکن تھا' وہاں سے جواب نہ ملتا... بھلا دیا جاتا۔

"تم نے اندر جا کر میرے لیے کیا مانگا؟" اس کے باہر آنے پر امامہ نے عجیب بے تابی سے اس سے پوچھا تھا۔ وہ ابھی اس کے پاس آیا ہی تھا' اس کے دونوں ہاتھ پکڑے وہ اب اس سے پوچھ رہی تھی۔

"مانگا ہے کچھ... بتا نہیں سکتا۔" سالار نے جواباً عجیب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "جب پوری ہو جائے گی دعا پھر بتاؤں گا۔" اس نے اسے جیسے اگلا سوال کرنے سے روک دیا تھا۔ "میں جانتی ہوں کیا مانگا ہے... لیکن میں بھی نہیں' دیکھتی ہوں قبول ہوتی ہے تمہاری دعا یا نہیں۔" امامہ نے جواباً عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا تھا۔

✿ ✿ ✿



اسفند کی موت کی اطلاع عائشہ عابدین کو دینا جبریل سکندر کی ذمہ داری نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ اس بچے کی ماں سے ملنے آیا تھا اور عائشہ عابدین کو دیکھتے ہی کچھ دیر کے لیے وہ گنگ ہو گیا تھا۔ کچھ ایسا ہی حال عائشہ عابدین کا تھا' وہ دونوں کئی سالوں بعد ایک دوسرے سے ملے تھے اور ملتے ہی ایک دوسرے کو پہچان گئے تھے' اور اب یہ شناخت جیسے ان کے حلق کا کانٹا بن گئی تھی۔

عائشہ کو یقین نہیں آیا تھا کہ امریکہ کے بہترین اسپتال میں بہترین ڈاکٹر کے ہاتھوں بھی اس کے بچے کی جان جا سکتی تھی۔ وہ خود ڈاکٹر تھی' اسفند کی چوٹ کی نوعیت اور سنگینی کو جانتی تھی' لیکن وہ خود جس اسپتال میں کام کر رہی تھی' وہاں اس نے اس سے بھی زیادہ سنگین اور پیچیدہ نوعیت کے آپریشنز کے بعد بھی مریضوں کو صحت یاب ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن اس کا اپنا بیٹا ان خوش قسمت لوگوں میں شامل کیوں نہیں ہو سکا تھا۔ اس سوال کا جواب عائشہ عابدین نے ڈھونڈا تھا' وہ ایک لمبے عرصے تک اسے بھوت بن کر چمٹا رہا تھا۔

اس نے غم کو پہلی بار مجسم حالت میں دیکھا تھا' اس شخص کی شکل میں جو اسے اس کی متاع حیات چھن جانے کی خبر سنانے آیا تھا۔ اور یہ وہ شخص تھا جس کے سراب نے عائشہ عابدین کو اس عذاب میں ڈالا تھا جس میں وہ تھی۔

ایک ڈاکٹر کی طرح جبریل اسے بتا آیا تھا کہ آپریشن کیوں ناکام ہوا' اسفند کی حالت کیوں بگڑی... کیوں نہیں سنبھل سکی... اور ان تمام تفصیلات کو دہراتے ہوئے جبریل سکندر کے لاشعور میں ڈاکٹر ویزل کے ہاتھ کی وہ حرکت بار بار آتی رہی' بار بار سر جھٹکنے کے باوجود۔ وہ ایک بت کی طرح گم صم اس کی بات سنتی رہی جیسے وہ اس کے بیٹے کے بارے میں نہیں کسی اور کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

"آپ کے ساتھ کوئی اور ہے؟" اپنی بات کے جواب میں ایک مکمل خاموشی رکھنے کے باوجود جبریل اس سے ایک بار پھر پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اسے وہ اس وقت نارمل نہیں لگ رہی تھی اور اسے احساس ہوا تھا کہ اسے اس کی فیملی میں کسی اور سے بات کرنی چاہیے تھی۔ یا اگر اب کر سکتا تھا تو اب کر لے۔

عائشہ عابدین نے اس کی بات کے جواب میں نفی میں سر ہلا دیا۔ جبریل اس کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا' وہ اس سے اگلا سوال کیسے کرے... سوال ہونے کے باوجود... خاندان نہیں تھا تو کہاں تھا... وہ کیا سنگل پیرنٹ کے طور پر اسفند کی پرورش کر رہی تھی؟ شوہر اگر نہیں بھی تھا تو کوئی خاندان کا اور فرد تو ہوتا... اس کی ماں اور بہنیں... وہ مزید کچھ نہیں سوچ سکا۔ عائشہ نے یک دم اس سے کہا تھا۔

"آپ جائیں... میں مینیج کر لوں گی سب کچھ۔" اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آئی تھی۔ اسے پتا تھا وہ "سب کچھ" کیا تھا اور جبریل کو بھی اندازہ تھا وہ کس طرف اشارہ کر رہی تھی۔

ایک روتی بلکتی ہوئی ماں کو تسلی دینا آسان کام تھا' لیکن بظاہر ہوش و حواس میں نظر آتی ایک خاموش گم صم ماں کو تسلی دینا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ صرف چند منٹوں کے لیے اس بچے کی فیملی سے ملنے آیا تھا اور اب یہ ملاقات ختم کرنا اس کے لیے پہاڑ بن گیا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی مریض کو مرتے نہیں دیکھا تھا' لیکن کسی بچے کو پہلی بار مرتے دیکھا تھا۔ عائشہ عابدین سے مل کر اس کا رنج کچھ اور بڑھا تھا۔ وہ اس آپریشن کو لیڈ نہیں کر رہا تھا' نہ ہی وہ اسفند کی موت کا ذمہ دار تھا' اس کے باوجود یہ احساس اس کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں تھا کہ اس آپریشن میں ڈاکٹر ویزل سے کچھ غلطی ہوئی تھی۔ "آپریشن کے فوراً" بعد ڈاکٹر ویزل اور اس کی بات چیت نہیں ہو سکی تھی۔ وہ عجیب اضطراب اور پریشانی کے عالم میں وہاں سے گئے تھے۔ سب کا اندازہ تھا وہ اس آخری آپریشن کی ناکامی سے اپ سیٹ ہوئے تھے' صرف جبریل تھا جس کا خیال تھا وہ خود بھی اپنی غلطی کا اندازہ لگا چکے تھے لیکن اب اس صورت حال کے درمیان وہ پھنسا کھڑا تھا۔ ضمیر کی چبھن اور انسانی ہمدردی... لیکن اس سے بھی بڑھ کر شناسائی کا وہ پرانا تعلق جو اس کے اور عائشہ عابدین کے درمیان نکل آیا تھا۔

"کوئی دوست ہے یہاں آپ کا؟" جبریل اب اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ اسے ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اسے پہچانی ہے یا نہیں اور اسے اس صورت حال میں اپنا تعارف کروانا چاہیے یا نہیں۔

"نہیں۔" عائشہ نے سر جھکائے اسے دیکھے بغیر کہا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے ان پر نظریں جمائے' سر جھکائے بیٹھی تھی۔ جبریل اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ "میرا خیال ہے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔" اپنا

ہاتھ اس کی کرسی کے ہتھے پر رکھتے ہوئے جبریل نے اس سے کہا تھا۔ وہ اسے رلانا نہیں چاہتا تھا، لیکن اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے اندازہ ہوا تھا کہ اسے اس وقت پھوٹ پھوٹ کر رونے کی ضرورت تھی۔ سکتے کی وہ کیفیت غیر فطری تھی۔

"میں جبریل سکندر ہوں... نساء کا کلاس فیلو اور دوست... اور مجھے بہت افسوس ہے کہ ہم اسفند کو نہیں بچا سکے۔" وہ مدھم آواز میں اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ عائشہ نے گردن موڑ کر بھی اس کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس وقت کسی کو پہچاننا نہیں چاہتی تھی، خاص طور پر ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو۔

"مجھے بتائیں میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" جبریل نے اس کے ہاتھوں کی ٹھنڈک محسوس کی تھی یوں جیسے اس نے برف کو ہاتھ میں لیا تھا، وہاں کا ٹمپریچر بھی عائشہ عابدین کے وجود کی ٹھنڈک کو غائب کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔

"پلیز مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ میری وجہ سے اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ آپ ڈاکٹر ہیں، کسی کو آپ کی ضرورت ہوگی۔" اس نے رک رک کر اس سے کہا تھا۔ وہ اب اپنے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں کے بیچ دبا کر بیٹھ گئی تھی۔ یوں جیسے یہ چاہتی نہ ہو کہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑے، اسے تسلی دے... کرسی کے کونے پر بیٹھی اپنے وجود کو جوتوں کے پنجوں پر ٹکائے وہ آگے پیچھے جھول رہی تھی یوں جیسے کسی گہری سوچ میں یا کسی ذہنی انتشار میں ہچکولے کھا رہی ہو۔

وہ پہلی بار تھا کہ جبریل نے عائشہ عابدین کو غور سے دیکھا تھا۔ بے حد حیرانی کے عالم میں... سیاہ جینز اور سیاہ ہی جیکٹ میں ملبوس گردن کے گرد ایک گرے رنگ کا مفلر لپیٹے اس کی ہم عمر وہ لڑکی اب اس کی ہم عمر نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے کندھوں سے نیچے تک لہراتے سیاہ چمک دار بالوں میں جگہ جگہ سفید بال تھے۔ اس کی رنگت زرد تھی اور آنکھیں سرخ... یوں جیسے وہ عادی رونے والوں میں سے تھی یا پھر ساری ساری رات جاگنے والوں میں سے۔ اس کے سر پر وہ حجاب بھی نہیں تھا جو سالوں پہلے اس کی پہچان تھا۔

ڈاکٹر نورالہدیٰ کے خاندان میں وہ حجاب لینے والی پہلی اور واحد لڑکی تھی اور بے حد اچھی خاندانی اقدار رکھنے کے باوجود جبریل جانتا تھا کہ نساء اور اس کے خاندان کا رجحان مذہب کی طرف نہیں تھا۔ صرف عائشہ عابدین تھی جو مذہبی رجحان اور بے حد واضح طور پر ایسی ہی پہچان بھی رکھتی تھی اور اس کی وجہ شاید اس کا پاکستان میں قیام پذیر ہونا تھا، یہ جبریل کا اندازہ تھا۔ عائشہ سے اس کی کبھی اتنی تفصیلی ملاقاتیں نہیں ہوئیں کہ اسے اس کی شخصیت کا صحیح اندازہ ہو پاتا۔

وہ جس عمر میں اس سے ملا تھا۔ وہ ٹین ایج تھی اور اس عمر میں اسے بات بات پر مسکرانے اور بلش کرنے والی وہ لڑکی عنایہ اور رئیسہ جیسی ہی لگی تھی۔ اس نے اس سے زیادہ غور اس پر نہیں کیا تھا اس کے باوجود کہ وہ اس کے فیس بک پر موجود تھی اور کبھی کبھار اس کی تصویروں کو لائیک کرتی نظر آتی تھی، پھر وہ غائب ہو گئی تھی۔ اسے نساء سے پتا چلا تھا کہ میڈیسن کی تعلیم کے دوران ہی اس کی شادی ہو گئی تھی اور اس وقت جبریل نے مبارک باد کا میسج اس کی وال پر لگانا چاہا تو اسے پتا چلا کہ وہ اب اس کے کانٹیکٹس میں نہیں تھی۔ عائشہ عابدین سے اس کا وہ پہلا تعارف بس یہیں تک ہی رہا تھا۔ نساء اور وہ بہت جلد مختلف اسٹیٹس کے ہاسپٹلز میں چلے گئے تھے۔ ان کے درمیان ایک دوست اور کلاس فیلو کے طور پر موجود رشتہ بھی کچھ کمزور پڑنے لگا تھا۔ نساء اب انگیجڈ تھی اور جبریل اپنے پروفیشن میں بے حد مصروف... اور اس بے حد تیز رفتار سے گزرنے والی زندگی میں عائشہ عابدین کسی اسپیڈ بریکر کی طرح آئی تھی۔ جبریل نے اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اپنا سیل فون نکال کر اس میں سے نساء کا نمبر ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ چند لمحوں میں اسے نمبر مل گیا تھا۔

"کیا میں نساء کو فون کر کے بلاؤں؟" اس نے عائشہ سے کہا۔

"نہیں..." جبریل اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ وہ عجیب تھی یا ہو گئی تھی جبریل کی سمجھ میں نہیں آیا یا پھر یہ صدمہ تھا جس نے اسے یوں بے حال کر دیا تھا۔

جبریل کو لوگوں پر ترس آتا تھا ہمیشہ ہی... ہمدردی اس کی گھٹی میں تھی، لیکن اس کے باوجود وہ ایک مصروف ڈاکٹر تھا۔ ایک ایک منٹ دیکھ کر چلنے والا... اس نے وہاں بیٹھے بیٹھے سوچا تھا... وہ اسپتال کے متعلقہ شعبے سے کسی کو یہاں بھیجتا ہے تاکہ وہ عائشہ عابدین کی مدد کرے اور اس کے خاندان کے دوسرے افراد سے رابطہ کر سکے۔ وہ اٹھنے لگا تھا جب اس نے عائشہ عابدین کی آواز سنی تھی۔

"آپ کو پتا ہے' میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا ہے؟" وہ رک کر اسے دیکھنے لگا' وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی' لیکن خودکلامی کے انداز میں بول رہی تھی۔
"کیونکہ میں اللہ کی نافرمان عورت ہوں' اللہ نے مجھے سزا دی ہے۔ احسن سعد ٹھیک کہتا ہے۔"
جبریل اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ عائشہ عابدین نے جیسے وہ بوجھ اتار کر اس کے سامنے پھینکنے کی کوشش کی تھی جو اس کے لیے آزار بن گیا تھا۔ احسن سعد کون تھا' جبریل نہیں جانتا تھا اور وہ اس کے بارے میں جو کہتا تھا' جبریل اس کی وجہ سے بھی ناواقف تھا۔ مگر اس کے وہ دو جملے اس دن اس کے پیروں کی زنجیر بن گئے تھے۔



گاڑی پورچ میں آکر رکی اور اندر سے امامہ بڑی تیز رفتاری سے باہر نکلی تھی۔ گاڑی تب تک رک چکی تھی اور اس کی اگلی سیٹ سے اریک اتر رہا تھا۔ پہلی نظر میں امامہ اسے پہچان نہیں سکی۔ وہ واقعی بدل گیا تھا۔ لمبا تو وہ پہلے بھی تھا' لیکن اب وہ پہلے کی طرح بہت دبلا پتلا نہیں رہا تھا۔
اس کے ہاتھوں میں دو گلاب کی کلیوں اور چند سبز شاخوں کا ایک چھوٹا سا بکے تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔ امامہ کو یاد تھا وہ بچپن میں بھی اسے اسی طرح ایک پھول اور دو پتوں والی شاخیں اکثر دیتا تھا۔ جب بھی اسے کسی خاص موقع پر ملنے آتا تھا۔ اور بعض دفعہ وہ پورا "گلدستہ" اس کے گھر کے لان سے ہی بنایا گیا ہوتا تھا۔
اریک اسے سلام کے بعد گلے ملنے کے لیے بے اختیار آگے بڑھا' پھر جھینپ کر خود ہی ٹھٹکا' شاید اسے کوئی خیال آیا تھا۔ امامہ نے آگے بڑھ کر جھکنے والے انداز میں اس کے گرد بازو پھیلایا تھا۔
"میں تمہیں پہچان ہی نہیں سکی تم بڑے ہو گئے ہو۔ بہت بدل بھی گئے ہو۔" اس نے اریک سے کہا' وہ مسکرایا۔
"لیکن آپ نہیں بدلیں۔ آپ ویسی ہی ہیں۔"
وہ ہنس پڑی تھی۔ "سننے میں کتنا اچھا لگتا ہے کہ کچھ نہیں بدلا۔ حالانکہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ میں بھی بوڑھی ہو گئی ہوں۔" وہ ہنس رہی تھی۔
"بڑھاپے کی Defination (تعریف) اب شاید بدل گئی ہوگی۔" اریک نے برجستگی سے کہا' وہ پھر ہنس پڑی۔
"یہ آپ کے لیے۔" اریک نے اسے وہ چھوٹا سا گلدستہ تھمایا تھا۔
"تمہاری عادتیں نہیں بدلیں۔ لیکن پھول بدل گیا ہے۔" امامہ نے گلدستہ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔
"کیونکہ ملک بدل گیا ہے۔" اس نے برجستہ کہا۔
"ہاں یہ بھی ٹھیک کہا تم نے۔ سامان کہاں ہے تمہارا؟" امامہ کو ایک دم خیال آیا وہ گاڑی سے اس گلدستے اور ایک چھوٹے بیگ کے علاوہ خالی ہاتھ اترا تھا۔
"ہوٹل میں۔ میں وہیں رہوں گا۔ بس آپ سے ضروری ملاقات کرنی تھی' اس لیے آیا ہوں۔" اریک نے اس کے ساتھ اندر جاتے ہوئے کہا۔
"پہلے تم ہمیشہ ہمارے پاس آیا کرتے تھے اور یہیں رہتے تھے' اب کسی اور کے پاس آئے ہو کیا؟" امامہ کو لگا تھا وہ شاید پاکستان اپنے کسی پیشہ ورانہ کام سے آیا تھا۔
"نہیں۔ کسی اور کے پاس تو نہیں آیا' لیکن بس مجھے لگا اس بار کسی ہوٹل میں رک کر بھی دیکھنا چاہیے۔" وہ بات گول کر گیا تھا۔ وہ لنچ کا وقت تھا اور اس نے صبح جب فون پر اس سے ملاقات کے لیے بات کی تھی تو امامہ نے دوپہر کے کھانے پر خاص اہتمام کیا تھا۔ اریک کو جو چیزیں پسند تھیں' اس نے بنوائی تھیں اور اریک نے اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے بڑے شوق سے کھانا کھایا تھا۔
کھانے کے دوران گپ شپ میں اریک اور اس کے درمیان ہر ایک کے بارے میں بات ہوئی تھی سوائے عنایہ کے۔ اریک نے اس کا ذکر تک نہیں کیا تھا اور امامہ نے یہ بات نوٹس کی تھی۔ حوصلہ افزا تھی یہ بات' لیکن پتا نہیں کیوں اسے غیر معمولی لگی تھی۔ اور اس کی چھٹی حس نے اسے جو سگنل دیا تھا وہ ٹھیک تھا۔

کھانے کے بعد چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ رکھتے ہوئے اریک نے اپنے بیگ سے ایک لفافہ نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا تھا۔ امامہ ابھی چائے پی رہی تھی۔ وہ بری طرح تھکی تھی۔

"یہ کیا ہے؟"

"آپ دیکھ لیں۔"

اس نے امامہ سے کہا۔ پلک جھپکتے اس خوب صورت لفافے کو کھولنے سے بھی پہلے۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ یک دم غائب ہوئی تھی۔ وہ اس ایک لمحے سے بچنا چاہ رہی تھی اور وہ پھر بھی سامنے آ کھڑا ہو گیا تھا۔ لفافے کے اندر ایک خوب صورت کاغذ پر بے حد خوب صورت طرز تحریر میں اریک نے وہی لکھا ہوا تھا جس کا اسے خدشہ تھا۔ وہ عنایہ کے لیے اس کی طرف سے ایک رسمی پرپوزل تھا۔ اس وعدے کے ساتھ کہ وہ اسے بہت خوش رکھے گا اور کمال آفر کے ساتھ کہ وہ اس پرپوزل کے لیے ان کی تمام شرائط قبول کرنے پر تیار ہے۔"

امامہ کی نظریں کچھ دیر اس کاغذ پر جمی رہیں اور اریک کی بھی۔ پھر امامہ نے کاغذ کو اس لفافے میں واپس ڈال کر اسے میز پر رکھ دیا تھا۔ اریک سے اب نظر ملانا اور سامنا کرنا یک دم مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا وہ سنجیدہ تھا اور گفتگو کا آغاز اسی نے کر دیا تھا۔

"آپ نے کئی سال پہلے مجھ سے کہا تھا۔ میں پڑھ لکھ کر کچھ بن جاؤں پھر آپ سے اس بارے میں بات کروں اور تب تک میں عنایہ سے بھی اس موضوع پر بات نہ کروں دیکھیں۔ میں نے آپ کی دونوں شرائط پوری کی ہیں۔" اس نے کہا اور اس کے دونوں جملوں نے امامہ کے لیے جواب کو اور بھی مشکل کر دیا تھا۔

"میں جانتا ہوں مسز سالار آپ کے لیے میں ایک بہت مشکل انتخاب ہوں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ایک برا انتخاب ثابت نہیں ہوں گا۔" اریک نے جیسے اس کی مشکل بھانپتے ہوئے خود ہی اسے یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔

وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی' وہ اچھا لڑکا تھا۔ برا ہوتا تو اسے برا بھلا کہنا کتنا آسان ہوتا۔ امامہ نے دل میں سوچا۔
وہ اپنی طرف سے انکار کی ہر وجہ ختم کر آیا تھا۔ مسلمان بھی ہو گیا تھا' ایک اچھے پروفیشن میں بھی تھا۔ خاندانی اعتبار سے بھی اچھا تھا۔ امامہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ پھر بھی اسے انکار کیا کہہ کے کرے۔ یہ کہہ کے کہ اسے خوف اور خدشات تھے اس کے نو مسلم ہونے کے حوالے سے۔ یا یہ کہے کہ وہ صرف ایک پاکستانی سے عنایہ کی شادی کرنا چاہتی تھی جو اس کے اپنے کلچر سے واقف ہو۔ اس کے ذہن میں اس وقت جوابات جیسے بھاگ رہے تھے اور کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو تسلی بخش ہوتا لیکن اس کے پاس ہو واحد ایک جواب تو اریک کو دینا ہی تھا۔

"تم بہت اچھے ہو اریک۔" امامہ نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"عبداللہ!" اس نے امامہ کو بیچ میں ٹوک کر جیسے اس کی تصحیح کی۔

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی پھر اس نے جیسے بڑی مشکل سے اس سے کہا۔ "عبداللہ۔ تم بڑے اچھے لڑکے ہو اور میں تمہیں پسند کرتی ہوں لیکن عنایہ کے حوالے سے ابھی کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہے میں نہیں جانتی۔ عنایہ تمہارے پرپوزل کے حوالے سے کیا سوچتی ہے۔ اس کی پسند ناپسند بے حد اہم ہے۔"

وہ جملہ ادا کرتے ہوئے بھی امامہ کو احساس ہو رہا تھا وہ ایک بے تکی بات کر رہی تھی۔ اگر بات عنایہ کی پسند ناپسند کی تھی تو پھر رشتہ پکا تھا۔ اریک کے لیے اس کی پسندیدگی بہت واضح تھی۔

"میں نے عنایہ سے پہلے اس لیے بات نہیں کی کیوں کہ آپ نے مجھ سے وعدہ لیا تھا میں یہ بات جب بھی کروں گا' آپ سے ہی کروں گا۔" اس نے امامہ کی بات کاٹ کر جیسے اسے یاد دہانی کرائی تھی۔

"میں سالار سے بات کروں گی۔ تم دو ہفتے پہلے آ جاتے تو ان سے تمہاری ملاقات ہو جاتی۔ وہ یہیں تھے کچھ دن۔" امامہ نے جواباً کہا تھا۔ فوراً "ہاں" کہہ دینے سے یہ بہتر تھا۔

"وہ جہاں بھی ہوں گے میں ان سے ملنے جا سکتا ہوں میں جانتا ہوں وہ بڑے مصروف ہیں لیکن پھر بھی۔" اریک نے اس سے کہا۔ "آپ کو تو میرے پرپوزل پر کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟" وہ یک دم خوش ہوا تھا اور اس کے چہرے سے چھلکنے

والی خوشی اور اطمینان نے جیسے امامہ کو احساس جرم میں مبتلا کر دیا تھا۔

"میں نے تمہیں بتایا ہے عبداللہ تم بہت اچھے ہو، لیکن میری خواہش ہے کہ عنایہ کی شادی جس سے بھی ہو وہ صرف نام کا مسلمان نہ ہو، نیک ہو، دین دار ہو، سمجھ بوجھ رکھنے کے ساتھ ساتھ دین کی تعلیمات پر عمل بھی کرتا ہو۔" امامہ نے اس سے کہنا شروع کیا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ وہ اس کی بات بے حد غور سے سن رہا تھا۔

"مرد کو دین کا پتا نہ ہو تو عورت کے لیے بہت مسئلہ ہو جاتا ہے۔ یہ ایک پوری نسل کی تربیت کی بات ہوتی ہے۔ ہم لوگ لبرل مسلمان ہیں لیکن بے دین اور بے عمل نہیں ہیں اور نہ ہی ایسے ہونا چاہتے ہیں، نہ اپنی اگلی نسلوں کے لیے یہ چاہتے ہیں۔ مجھے نہیں پتا تم کتنے باعمل ہو اور اسلام کے بارے میں تمہارے نظریات کتنے واضح ہیں لیکن عنایہ بہت مذہبی ہے۔ میں نہیں چاہتی اس کی شادی ایسی جگہ ہو جہاں میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کی وجہ مذہبی اعتقادات اور ان پر عمل کا ہونا یا نہ ہونا ہو۔" وہ کہتی جا رہی تھی۔

"تمہیں شاید پتا نہ ہو لیکن میں بھی نومسلم تھی۔ اپنے مذہب کو ترک کر کے اسلام کی صحیح تعلیمات اختیار کی تھیں میں نے۔۔۔ فیملی گھر سب چھوڑا تھا۔۔۔ بڑے مسائل کا سامنا کیا تھا۔۔۔ یہ آسان نہیں تھا۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ رکی۔ اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ ہنسی یوں جیسے اپنے آنسوؤں کو چھپانا چاہتی ہو۔

"یہ آسان کام نہیں تھا۔" اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "لیکن سالار نے بہت آسان کر دیا میرے لیے۔۔۔ وہ باعمل مسلمان ہے اور میں اپنی بیٹی کے لیے اس کے باپ جیسا مسلمان ہی چاہتی ہوں۔ زندگی میں اتنی تکلیفیں برداشت کر کے اتنی لمبی جدوجہد کے بعد میں اپنی اگلی نسل کو پھر سے بے دین اور بے عمل دیکھنا نہیں چاہتی۔ تم مسلمان تو ہو لیکن شاید اسلام کی تعلیمات میں اتنی دلچسپی نہ ہو کیوں کہ تمہارے مسلمان ہونے کی وجہ ایک لڑکی سے شادی ہے۔ شادی ہو جائے گی تمہاری دلچسپی دین میں ختم ہو جائے گی۔ کچھ عرصہ بعد شاید تمہیں یہ بھی یاد نہ رہے کہ تم مسلمان ہو۔ حرام اور حلال کے درمیان جو دیوار ہم اٹھا کر رکھتے ہیں۔ تمہارے لیے وہ اٹھانا ضروری نہ ہو۔ محبت بہت دیر پا چلنے والی شے نہیں ہے۔ اگر دو انسانوں کے بیچ عادات، اعتقادات اور خیالات کی خلیج ہو تو۔"

ابریک نے اس کی گفتگو کے درمیان اسے ایک بار بھی نہیں ٹوکا تھا۔ وہ صرف خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

"تم کسی ویسٹرن لڑکی سے شادی کر لو تو تمہاری بہت اچھی نبھے گی۔" وہ اب اسے جیسے مشورہ دیتے ہوئے راستہ دکھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

"کوئی اچھی مسلمان لڑکی ہو دین سے ہو۔"

"وہ جو بھی ہو گی، آپ کی بیٹی تو نہیں ہو گی مسز سالار۔" اس بار اس نے اس لمبی گفتگو کے دوران پہلی بار امامہ کو ٹوکا۔ امامہ خاموش ہو گئی۔

"آپ نے اچھا کیا یہ سب کچھ کہا مجھے۔۔۔ جو بھی آپ کے خدشات ہیں میں اب انہیں دیکھ سکتا ہوں اور آپ کو وضاحت بھی دے سکتا ہوں۔ نو سال ہو گئے ہیں مجھے عبداللہ بنے۔ لیکن مجھے لگتا ہے مسلمان میں بہت پہلے سے تھا تب سے جب آپ لوگوں کے خاندان سے ملنا شروع ہوا تھا۔۔۔" وہ بہت سوچ سوچ کر ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہا تھا۔

"میں بہت زیادہ باعمل اور باکردار مسلمان نہیں ہوں۔ آپ کے بیٹوں جیسا تو بالکل بھی نہیں ہوں لیکن اپنے آس پاس نظر آنے والے بہت سے مسلمانوں سے بہتر ہوں۔ نو سال میں میں نے اپنے دین کے حوالے سے صرف حرام اور حلال ہی کو نہیں سمجھا اور بھی بہت کچھ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے پتا ہے آپ ختم نبوت پر یقین نہیں رکھتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی تسلیم نہیں کرتی تھیں۔

پھر آپ تائب ہو کر مسلمان ہوئیں۔۔۔ مجھ سے یہ مت پوچھیے گا کہ یہ مجھے کس نے بتایا لیکن میں یہ جانتا ہوں اور اس لیے آپ سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ آپ مجھ سے زیادہ ہمدردی رکھیں گی۔ آپ کی طرح میں بھی اپنی اگلی نسل کو اچھا انسان اور مسلمان دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔ صرف مسلمان نہیں اس لیے آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ ایک اچھی دین دار عورت ہی ایک اچھے گھرانے کی بنیاد رکھتی ہے۔۔۔ یہ بھی دین نے ہی بتایا ہے مجھے۔"

امامہ اس کی باتیں سن رہی تھی عبداللہ اس کے انکار کو بہت مشکل کرتا جا رہا تھا۔ وہ جو بھی اس سے کہہ رہا تھا، وہ بھی

لیٹی کے بغیر کہہ رہا تھا۔
"مجھے عنایہ بہت اچھی لگتی ہے' محبت کرتا ہوں اس سے لیکن شادی کا فیصلہ صرف محبت کی وجہ سے نہیں کیا نہ ہی مذہب کی تبدیلی محبت کا نتیجہ ہے۔۔۔ میری زندگی میں آپ اور آپ کی فیملی کا ایک بہت پاورفل رول رہا ہے۔۔۔ میں آپ لوگوں کے مذہب سے بعد میں متاثر ہوا تھا' آپ لوگوں کی انسانیت اور مہربانی سے پہلے متاثر ہوا تھا۔۔۔ اور میری زندگی کے ایک بہت مشکل فیز میں مجھے آپ لوگوں کا حسن سلوک یاد ہے' ایک ایک چیز۔ آپ کہیں تو میں دہرا سکتا ہوں میں اس مذہب کے حصار میں آ گیا تھا جو ایسے خوب صورت انسان بنانے کی صلاحیت اور قدرت رکھتا تھا میں اس وقت بہت چھوٹا تھا' آپ لوگوں کے لیے جو محسوس کرتا تھا' اسے آپ لوگوں کو بتا نہیں سکتا تھا۔ اب اتنے سالوں بعد مجھے موقع ملا ہے تو میں بتا رہا ہوں۔"
وہ رکا۔۔۔ سر جھکائے بہت دیر خاموش رہا۔
"آپ لوگ میری زندگی میں نہ آتے تو میں ایک بہت برا انسان بنتا۔۔۔ پاپا کی موت کے بعد میں ویسے ہی تھا جیسے سمندر میں ایک چھوٹی سی کشتی جس کی کوئی سمت نہیں ہوتی۔۔۔ ڈوب جاتی تو ڈوب جاتی۔۔۔ میں اس وقت بہت دعا کیا کرتا تھا کہ مسٹر سکندر کو کچھ نہ ہو' ان کا ٹریٹمنٹ ٹھیک ہو جائے کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا آپ کے گھر میں وہ تکلیف آئے جس سے میں اور میری فیملی گزر رہی تھی۔" وہ چپ ہو گیا۔ امامہ بھی بول نہیں سکی۔۔۔ پانی دونوں کی آنکھوں میں تھا اور درد بھی۔۔۔ اور دونوں یہ دونوں چیزیں چھپانے کی کوشش میں تھے۔
"میں پاکستان صرف آپ سے بات کرنے اور یہ سب بتانے کے لیے آیا ہوں۔ کہ آپ نے اپنی بیٹی کی تربیت بہت اچھی کی ہے۔ وہ بہت عزت اور حیا والی ہے اور میں نے اتنے سالوں میں اس کے لیے محبت کا جذبہ رکھنے کے باوجود ان حدود کا احترام کیا ہے جو آپ نے اس کے لیے طے کی ہیں اور جسے اس نے بھی نہیں توڑا۔ میں آپ کی بیٹی کو اتنی ہی عزت اور احترام کے ساتھ اپنی زندگی اور گھر کا حصہ بنانا چاہتا ہوں۔"
عبداللہ نے اپنے بیگ سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکال کر اس لفافے کے اوپر رکھ دی جو اس نے میز پر رکھا تھا۔ اس خوب صورت لفافے کے اوپر ایک خوب صورت سرخ ڈبیا میں عنایہ سکندر کا نصیب تھا جو اتنا ہی خوب صورت تھا۔ نم آنکھوں کے ساتھ امامہ اس ڈبیا پر سے نظریں نہیں ہٹا سکی۔ اس کی مرضی سے کبھی کچھ نہیں ہوتا تھا لیکن جو بھی ہوتا تھا وہ بہترین ہوتا تھا۔



"رنگ خوب صورت ہے پر نقلی ہے۔" حمین نے ڈنر ٹیبل پر بیٹھے فش اور چپس کھاتے ہوئے ڈبیا کو رئیسہ کی طرف سرکایا جو سلاد کا ایک پیالہ کھاتے ہوئے اس کی بات سن رہی تھی۔ کھلی ہوئی ڈبیا کو بند کرتے ہوئے اس نے اسی ہاتھ سے اپنے گلاسز ٹھیک کیے اور بڑے تحمل سے کہا۔
"میں جانتی ہوں۔" وہ فش اور چپس تقریباً نگل رہا تھا اور ساتھ ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی پر رگبی کا ایک میچ دیکھ رہا تھا۔
رئیسہ ویک اینڈ گزارنے وہاں آئی تھی' امریکہ واپس آنے کے بعد اور اگلے دن عنایہ بھی وہاں پہنچ رہی تھی اور اس وقت ایک فاسٹ فوڈ سے ہوم ڈیلیوری سروس کے ذریعے منگایا گیا۔۔۔۔ کھانا کھانے میں مصروف تھے جب رئیسہ نے وہ انگوٹھی اسے دکھائی تھی۔
"تم نے کسی کو دی ہے یا تمہیں کسی نے دی ہے؟" حمین نے میچ دیکھتے دیکھتے چلی ساس کی بوتل تقریباً اپنی پلیٹ میں خالی کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔
"ہشام نے دی ہے۔" رئیسہ نے کسی تمہید کے بغیر مدھم آواز میں بے حد سنجیدگی سے کہا۔ اس بار حمین نے اسکرین سے نظریں ہٹائی تھیں۔
"جب وہ واپس آئے گا تو میں اسے واپس کر دوں گی۔" اس نے ایک لمحہ کے توقف کے بعد اسی سانس میں کہا۔
"مطلب؟" حمین اب سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"اس نے مجھے پروپوز کیا ہے لیکن میں نے اس کا پروپوزل قبول نہیں کیا۔ میں چاہتی ہوں پہلے دونوں فیملیز آپس میں بات کرلیں۔" رئیسہ نے اسے مختصراً بتایا۔
"لیکن ہشام تو ابھی اپنی فیملی کے ساتھ بحرین میں ہوگا۔ اس کی فیملی کیا وہاں سے آکر بات کرے گی؟" حمین نے جواباً اس سے پوچھا۔ وہ دونوں ہشام اور اس کی فیملی کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔
تین دن پہلے بحرین میں ہونے والے رائل فیملی کے اس فضائی حادثے میں وہاں کے حکمران اور اس کی فیملی کے چھ افراد کی ہلاکت ہوئی تھی۔ بحرین کا حکمران ہشام کا تایا تھا اور اس حادثے کی اطلاع ملنے کے فوری بعد ہشام اپنی فیملی کے ساتھ بحرین چلا گیا تھا۔ رئیسہ بھی اس کے ساتھ ہی امریکہ واپس آئی تھی۔
"ہشام تو آجائے گا اگلے ہفتے لیکن اس کی فیملی ابھی رہے گی وہاں۔" رئیسہ نے اس سے کہا۔
"تو پھر کیا ہوگا؟" حمین نے دوبارہ چپس کھانا شروع کرتے ہوئے کہا۔
"اسی لیے تو تم سے بات کر رہی ہوں، تم بتاؤ۔" رئیسہ نے اسے جواباً کہا۔
"ممی کریں گی صاف صاف دوٹوک انکار۔" چلی ساس میں مچھلی کا ٹکڑا ڈبوتے ہوئے حمین نے جیسے مستقبل کا نقشہ دو جملوں میں اس کے سامنے کھینچا۔
"ہاں مجھے پتا ہے۔" رئیسہ نے گہرا سانس لیا۔
"تمہیں پسند تو نہیں ہے نا؟" حمین نے اس سے اس طرح سرسری سے انداز میں پوچھا جیسے یہ کوئی عام سی بات تھی۔
"ہے۔" اس نے یک لفظی جواب دیا اور ایک پورا زیتون اٹھا کر نگلا۔
"ٹوبیڈ" (بہت برا) حمین نے جیسے افسوس کرنے والے انداز میں کہا۔
"عنایہ اور عبداللہ کا پتا ہے، تمہیں اس کے باوجود تم نے......"
رئیسہ نے اس کی بات کاٹی۔ "ہشام پیدائشی مسلمان ہے۔"
"لیکن بحرینی ہے بلکہ عرب ہے۔" حمین نے اسے بات مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔
"ویسے تو وہ امریکی ہے۔" رئیسہ نے جیسے مدافعانہ انداز میں کہا۔
"امریکی تو ممی کو ویسے ہی زہر لگتے ہیں۔" حمین نے بے حد اطمینان سے تصویر کا ایک اور تاریک پہلو اسے دکھایا۔
"اسی لیے تو تم سے بات کر رہی ہوں۔" رئیسہ نے سلاد کھانا بند کر دیا۔
"تم ایک بات بتاؤ تمہیں وہ صرف پسند ہے یا محبت وغیرہ ہے؟" رئیسہ نے اسے جواباً گھورا۔
"صرف جنرل نالج کے لیے پوچھ رہا ہوں۔" حمین نے مدافعانہ انداز میں بے اختیار کہا۔
"یہ جنرل نالج کا سوال نہیں ہے۔" رئیسہ نے جتانے والے انداز میں کہا۔
"کامن سینس کا ہوگا پھر۔ وہ تو میری ویسے ہی خراب ہے۔" پلیٹ صاف کرتے ہوئے حمین نے بے حد اطمینان سے کہا۔
"تم کچھ کرسکتے ہو یا نہیں؟" رئیسہ نے اس کو اگلا جملہ بولنے سے پہلے کہا۔
"میں صرف کوشش کرسکتا ہوں لیکن اس کا فائدہ نہیں...... لیکن سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ تم میری ملاقات ہشام سے کراؤ...... میں دیکھنا چاہتا ہوں تمہارے حوالے سے وہ دراصل کتنا سیریس ہے۔"
"وہ میں کروادوں گی وہ مسئلہ نہیں ہے۔" رئیسہ نے کچھ مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔
"اور اگر ممی بابا نہیں مانتے پھر؟" حمین نے یک دم اس سے کہا۔ وہ خاموش بیٹھی رہی، پھر اس نے کہا۔
"مجھے وہ اچھا لگتا ہے لیکن ایسی جذباتی وابستگی نہیں ہے کہ میں اسے چھوڑ نہ سکوں۔"
"اچھے کی امید رکھنی چاہیے لیکن بدترین کے لیے تیار رہنا چاہیے...... بابا کو اعتراض نہیں ہوگا، لیکن ممی کا میں کہہ نہیں سکتا، کوشش کروں گا...... لیکن ہشام نے اپنی فیملی سے بات کی ہے تمہیں پروپوز کرنے سے پہلے؟ کیوں کہ اگر اس کی فیملی کو کوئی اعتراض ہوا تو ممی بابا میں سے کوئی بھی اس پروپوزل پر غور نہیں کرے گا۔" حمین کو بات کرتے کرتے خیال

آیا تھا۔
"اپنی فیملی سے بات کر کے ہی اس نے مجھ سے بات کی ہے' اس کی فیملی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔" رئیسہ نے اسے جیسے یقین دہانی کرائی۔
حمین اس کی بات سنتے ہوئے اپنے میز پر دھرے فون کی اسکرین پر کچھ دیکھ رہا تھا اور اپنی انگلی سے اسکرین کو اسکرول کر رہا تھا' رئیسہ کو لگا اس نے اس کی بات غور سے نہیں سنی۔
"تم میری بات سن رہے ہو؟" رئیسہ نے جیسے اسے متوجہ کیا۔
"ہاں... میں ہشام کو سرچ کر رہا ہوں۔" اس نے جواباً کہا۔
"کیا؟" رئیسہ چونکی۔
"ہشام کو اور اس کی فیملی کو پتا ہے کہ تم اڈاپٹڈ ہو؟" حمین اسی طرح سکرین اسکرول کر رہا تھا...
"ہشام کو پتا ہے تو ظاہر ہے اس کی فیملی کو بھی پتا ہو گا۔" وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی اور پھر بولی۔
"اوہ..." حمین اپنے فون کی اسکرین پر کچھ پڑھتے پڑھتے بے اختیار چونکا تھا۔
"کیا ہوا؟" رئیسہ چونکی۔
"تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے اور شاید بری بھی۔" حمین نے ایک گہرا سانس لے کر سر اٹھایا اور اسے دیکھا اور پھر اپنا فون اس کے سامنے رکھ دیا۔



وہ شخص دیوار پر لگی رئیسہ کی تصویر کے سامنے پچھلے پندرہ منٹ سے کھڑا تھا۔ پلکیں جھپکائے بغیر' ٹکٹکی باندھے اس لڑکی کا چہرہ دیکھتے ہوئے... چہرے میں کوئی شباہت تلاش کرتے ہوئے... سالار سکندر کے شجرہ میں دبے آتش فشاں کی شروعات ڈھونڈتے ہوئے... اگر وہ اس شخص کو نشانہ بنا سکتا تھا تو اسی ایک جگہ سے بنا سکتا تھا۔ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا... خود کلامی... ایک اسکینڈل کا تانا بانا تیار کرنے کے لیے ایک کے بعد ایک مکر و فریب کا جال... وجوہات... حقائق کو چھپاتے... وہ ایک گہرا سانس لے کر اپنے عقب میں بیٹھے لوگوں کو کچھ ہدایات دینے کے لیے مڑا تھا۔
سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز کے اس کمرے کی دیواروں پر لگے بورڈز' چھوٹے بڑے نوٹس' چارٹس' فوٹو گرافس اور لیڈ ریسز کی چٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔
کمرے میں موجود چند آدمیوں میں سے تین اس وقت بھی کمپیوٹرز پر مختلف ڈیٹا کھنگالنے میں مصروف تھے' یہ کام وہ پچھلے ڈیڑھ ماہ سے کر رہے تھے۔ اس کمرے میں جگہ جگہ بڑے بڑے ڈبے کھلے پڑے تھے جو مختلف فائلز' ٹیپس' میگزینز اور نیوز پیپرز کے تراشوں اور دوسرے ریکارڈز سے بھرے ہوئے تھے۔ کمرے میں موجود ریکارڈ کیبنٹس پہلے ہی بھری ہوئی تھیں۔ کمرے میں موجود تمام ڈیٹا ان کمپیوٹرز کی ہارڈ ڈسکس میں بھی محفوظ تھا۔
کمرے میں موجود دو آدمی پچھلے ڈیڑھ ماہ سالار سکندر کے بارے میں آن لائن آنے والا تمام ریکارڈ اور معلومات اکٹھی کرتے رہے تھے۔ کمرے میں موجود تیسرا شخص سالار اور اس کی فیملی کے ہر فرد کے ای میلز کا ریکارڈ کھنگالتا رہا تھا۔ چوتھا شخص اس کی فیملی اور مالی معلومات کو چیک کرتا رہا تھا۔ اس ساری جدوجہد کا نتیجہ ان تصویروں اور شجرہ نسب کی صورت میں ان بورڈز پر موجود تھا۔
وہ چار افراد دعویٰ کر سکتے تھے کہ سالار اور اس کی فیملی کی پوری زندگی کا ریکارڈ اگر خدا کے پاس موجود تھا تو اس کی ایک کاپی اس کمرے میں بھی تھی۔ سالار کی زندگی کے بارے میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ان کے علم میں نہیں تھی یا جس کے بارے میں وہ ثبوت نہیں دے سکتے تھے۔
سی آئی اے کے اسٹنگ آپریشنز سے لے کر اس کی مین ایج کی گرل فرینڈز تک اور اس کے مالی معاملات سے لے کر اس کی اولاد کی پرسنل اور پرائیویٹ لائف تک ان کے پاس ہر چیز کی تفصیلات تھیں۔
لیکن سارا مسئلہ یہ تھا کہ ڈیڑھ دو ماہ کی اس محنت اور پوری دنیا سے اکٹھے کیے ہوئے اس ڈیٹا میں سے وہ ایسی کوئی چیز

نہیں نکال سکے تھے جس سے وہ اس کی کردار کشی کر سکتے۔ وہ ٹیم جو پندرہ سال سے اس طرح کے مقاصد پر کام کرتی رہی تھی۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ اتنی سر توڑ محنت کے باوجود اس شخص اور اس کے گھرانے کے کسی شخص کے حوالے سے کسی قسم کا اسکینڈل ڈھونڈ نہیں پائی تھی۔ وہ سو پوائنٹس کی جو چیک لسٹ انہیں دی گئی تھی' وہ دو سو کراسز سے بھری ہوئی تھی اور یہ ان کی زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا۔ انہوں نے ایسا صاف ریکارڈ کسی کا نہیں دیکھا تھا۔

کسی حد تک ستائش کے جذبات رکھنے کے باوجود وہ ایک آخری کوشش کر رہے تھے۔۔۔ ایک آخری کوشش۔۔۔ کمرے کے ایک بورڈ سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے بورڈ تک جاتے جاتے وہ آدمی سالار کے فیملی ٹری کی اس تصویر پر رکا تھا۔ اس تصویر کے آگے کچھ اور تصویریں تھیں اور ان کے ساتھ کچھ بلٹ پوائنٹس۔۔۔ ایک دم جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا تھا۔ اس نے اس لڑکی کی تصویر کے نیچے اس کی تاریخ پیدائش دیکھی پھر مڑ کر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کو وہ سال بتاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو اس سال ان ڈیٹس پر یہ کہاں تھا؟"

کمپیوٹر پر بیٹھے ہوئے آدمی نے چند منٹوں کے بعد سکرین پر نمودار ہونے والی تحریر پڑھتے ہوئے کہا۔

"پاکستان!"

سوال کرنے والے آدمی کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آئی تھی۔

"کب سے کب تک؟"

اس آدمی نے اگلا سوال کیا' کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے کی بورڈ پر انگلیوں کو حرکت دیتے ہوئے سکرین پر دیکھتے ہوئے اسے تاریخیں بتائیں۔

"آخر کار ہمیں کچھ مل ہی گیا۔" اس آدمی نے بے اختیار ایک سیٹی بجاتے ہوئے کہا تھا۔ انہیں جہاز ڈبونے کے لیے تارپیڈو مل گیا تھا۔

یہ پندرہ منٹ پہلے کی روداد تھی۔ پندرہ منٹ بعد وہ اب جانتا تھا کہ اسے اس آتش فشاں کا منہ کھولنے کے لیے کیا کرنا تھا۔



اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو مٹھیوں کی طرح بھینچ کر کھولا' ایک بار۔۔۔ دو بار۔۔۔ تین بار۔۔۔ پھر اپنی آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے مسلا۔۔۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے' اپنی لمبی ٹانگوں کو اسٹڈی ٹیبل کے نیچے رکھے فٹ ہولڈر پر سیدھا کرتے ہوئے وہ جیسے کام کرنے کے لیے ایک بار پھر تازہ دم ہو گیا تھا۔۔۔ پچھلے چار گھنٹے سے مسلسل اس لیپ ٹاپ پر کام کرتے رہنے کے باوجود جو اس وقت بھی اس کے سامنے کھلا ہوا تھا اور جس پر چمکتی گھڑی اس وقت سوئٹزر لینڈ میں رات کے ڈھائی بج جانے کا اعلان کر رہی تھی۔ وہ ڈیووس میں ورلڈ اکنامک فورم کا کی نوٹ سپیکر تھا جس کی تقریر کل دنیا کے ہر بڑے چینل اور اخبار کی شہ سرخی بننے والی تھی تین بج کر چالیس منٹ پر اس نے بالآخر اپنا کام ختم کیا۔ لیپ ٹاپ کو بند کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا' وہ موسم سرما تھا اور ڈیووس میں سورج طلوع ہونے میں ابھی وقت تھا۔۔۔ اتنا وقت کہ وہ چند گھنٹے کے لیے سو جاتا۔۔۔ اور چند گھنٹوں کی نیند اس کے لیے کافی تھی نماز کے لیے دوبارہ جاگنے سے پہلے۔۔۔

وہ اس کی زندگی کا معمول تھا اور اتنے سالوں سے تھا کہ اسے معمول سے زیادہ عادت لگنے لگا تھا۔ صوفے کے سامنے موجود سینٹر ٹیبل پر سوئٹزر لینڈ اور امریکہ کے کچھ بین الاقوامی جریدوں کی کاپیز پڑی تھیں اور ان میں سے ایک کے سرورق پر حمین سکندر کی تصویر تھی۔

"ینگ گلوبل لیڈرز 500 کی فہرست میں پہلے نمبر پر براجمان' اپنی مخصوص شرارتی مسکراہٹ اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کیمرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے۔

ایک لمحے کے لیے سالار کو ایسا لگا تھا جیسے وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا۔۔۔ اسی اعتماد' دلیری اور وقار کے ساتھ جو اس کا خاصہ تھا۔

سالار سکندر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لہرائی' اس نے جھک کر وہ میگزین اٹھایا تھا... وہ ورلڈ اکنامک فورم میں پہلی بار آ رہا تھا... اور دنیا کے اس موقر فورم کا جیسے نیا پوسٹر بوائے تھا۔ وہاں پڑا کوئی میگزین ایسا نہیں تھا جس میں اس نے حمین سکندر یا اس کی کمپنی کے حوالے سے کچھ نہ پڑھا ہو۔

"Devilishly' Handsome' Dangerously' Meticulous"

سالار سکندر کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی... وہ ہیڈ لائن حمین سکندر کے بارے میں تھی جس سے اس کی ملاقات کل اسی فورم میں ہونے والی تھی' جہاں اس کا بیٹا بھی خطاب کرنے والا تھا۔ اس نے اس میگزین کو دوبارہ سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔

اس کے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑا سیل فون کھنکا' بستر پر بیٹھتے ہوئے سالار نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ وہ واقعی شیطان تھا' خیال آنے پر بھی سامنے آجاتا تھا...

"جاگ رہے ہیں"۔ وہ حمین سکندر کا ٹیکسٹ تھا' اسے باپ کی روٹین کا پتا تھا۔ وہ خود بھی بے خوابی کا شکار تھا۔

"یس!" سالار نے جواباً ٹیکسٹ کیا۔

"بڑی اچھی فلم آرہی تھی' سوچا آپ کو بتا دوں۔" جواب آیا۔

سالار کو اس سے ایسے ہی کسی جواب کی توقع تھی۔

دوسرا ٹیکسٹ آیا جس میں اس چینل کا نمبر بھی تھا جس پر وہ مووی آرہی تھی' اس کی کاسٹ کے ناموں کے ساتھ جس میں چارلیز تھیرن کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ وہ باپ کو تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔ سالار کو اندازہ ہو گیا تھا۔

"مطلع کرنے کا شکریہ۔"

سالار نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ٹیکسٹ کا جواب دیا۔ اس کی بات کا جواب نہ دینا اس سے زیادہ بہتر تھا۔

"میں سنجیدگی سے شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

اگلا جملہ بے سروپا تھا۔ سالار سکندر گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ورلڈ اکنامک فورم کا ینگ سٹار سپیکر تھا جو اپنی تقریر سے ایک رات پہلے باپ سے رات کے اس وقت اس طرح کی بے تکی باتیں کر رہا تھا۔

"واہ کیا بات ہے اسے بھی TAI میں چلا دو۔" اس نے اسے جوابی ٹیکسٹ کیا اور پھر گڈ نائٹ کا میسج... کھٹاک سے ایک مسکراہٹ اس کی اسکرین پر ابھری تھی... دانت نکالتے ہوئے۔

"آئی ایم سیریس..." سالار فون رکھ دینا چاہتا تھا' لیکن پھر رک گیا۔

"آپشن چاہیے یا پروف؟" اس نے اس بار بے حد سنجیدگی سے اسے ٹیکسٹ کیا۔

"مشورہ۔" جواب اسی تیز رفتاری سے آیا۔

"ٹی وی بند کر کے سو جاؤ۔" اس نے جواباً اسے ٹیکسٹ کیا۔

"بابا! میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ رئیسہ اور عنایہ کی شادی سے پہلے میرا شادی کرنا مناسب نہیں' خاص طور پر جب جبریل کی شادی کا فی الحال کوئی امکان نہیں۔"

وہ اس کے اس جملے پر اب کھٹکا تھا... اس کی باتیں اتنی بے سروپا نہیں تھیں جتنا وہ انہیں سمجھ رہا تھا۔ رات کے اس پہر وہ فلم سے اپنی شادی اور اپنی شادی سے عنایہ اور رئیسہ کی شادی کا ذکر کرنے بیٹھا تھا تو کوئی مسئلہ تھا... اور مسئلہ کیا تھا' یہ سالار کو ڈھونڈنا تھا۔

"تو؟" اس نے اگلے ٹیکسٹ میں جیسے کچھ اور اگلوانے کے لیے دانہ ڈالا' جواب خاصی دیر بعد آیا... یعنی وہ اب سوچ سوچ کر ٹیکسٹ کر رہا تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹا جیسے شطرنج کی ایک بساط بچھا کر بیٹھ گئے تھے۔

"تو بس پھر ہمیں عنایہ اور رئیسہ کے حوالے سے کچھ سوچنا چاہیے۔" جواب سوچ سمجھ کر آیا تھا' لیکن مبہم تھا۔

"رئیسہ کے بارے میں یا عنایہ کے بارے میں؟" سالار نے بڑے کھلے الفاظ میں اس سے پوچھا۔ حمین کو شاید باپ سے اس بے دھڑک سوال کی توقع نہیں تھی' وہ امامہ نہیں تھا جس کو وہ گھما پھرا لیتا تھا' وہ سالار سکندر تھا جو اسی کی طرح

لمحوں میں بات کی تہ تک پہنچ جاتا تھا۔

"رئیسہ کے بارے میں۔" بالآخر اسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہنا پڑا' سالار کے لیے جواب غیر متوقع نہیں تھا۔ لیکن حیران وہ اس کی ٹائمنگ پر ہوا تھا۔

"تم خود رئیسہ کے لیے بات کر رہے ہو یا رئیسہ نے تمہیں بات کرنے کے لیے کہا ہے؟" سالار کا اگلا ٹیکسٹ پہلے سے بھی ڈائریکٹ تھا۔ حمین کا جواب اور بھی دیر سے آیا۔

"میں خود کر رہا ہوں۔" سالار کو اس کے جواب پر یقین نہیں آیا۔

"رئیسہ کہیں انوالوڈ ہے؟" اس نے اگلا ٹیکسٹ کیا۔ جواب ایک بار پھر دیر سے آیا اور یک دم سالار کو احساس ہوا کہ یہ بات چیت دو افراد کے درمیان نہیں ہو رہی تھی۔ تین لوگوں کے درمیان ہو رہی تھی۔ وہ حمین اور رئیسہ۔

وہ تاخیر جو حمین کی طرف سے جواب آنے پر ہو رہی تھی' وہ اس لیے ہو رہی تھی۔ کیوں کہ وہ سالار کے ساتھ ہونے والے سوال جواب رئیسہ کو بھی بھیج رہا تھا اور پھر اس کی طرف سے آنے والے جوابات اسے فارورڈ کر رہا تھا۔ وہ ان دونوں کی بچپن کی عادت تھی' ایک دوسرے کے لیے ترجمان کا رول ادا کرنا۔ اور زیادہ تر یہ رول رئیسہ ہی اس کے لیے کیا کرتی تھی۔

"کوئی اسے پسند کرتا ہے۔" جواب دیر سے آیا تھا لیکن اس کے ڈائریکٹ سوال کے جواب میں بے حد ڈپلومیٹک انداز میں دیا گیا تھا اور یہ حمین کا انداز نہیں تھا۔ یہ رئیسہ کا انداز تھا۔

"کون پسند کرتا ہے؟ ہشام؟" سالار نے جوابا" بے حد اطمینان سے ٹیکسٹ کیا۔ اسے یقین تھا اس کے اس جوابی سوال نے دونوں بہن بھائی کے پیروں تلے سے کچھ لمحوں کے لیے زمین نکالی ہوگی۔ ان کو یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ سالار اتنا "باخبر" ہو سکتا ہے۔

حسب توقع ایک لمبے وقفے کے بعد ایک پورا منہ کھولے ہنستی ہوئی اسمائلی آئی تھی۔

"گڈ شاٹ۔" یہ حمین کا جواب تھا۔

"رئیسہ سے کہو آرام سے سو جائے۔ ہشام کے بارے میں آمنے سامنے بیٹھ کر بات ہوگی۔ میں اس وقت آرام کرنا چاہتا ہوں اور تم دونوں اب مجھے مزید کوئی ٹیکسٹ نہیں کرو گے۔" سالار نے ایک وائس میسج حمین کو بھیجتے ہوئے فون رکھ دیا۔ وہ جانتا تھا اس کے بعد وہ واقعی بھوتوں کی طرح غائب ہو جائیں گے۔ خاص طور پر رئیسہ۔



جبریل نیند سے فون کی آواز پر ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ اسے پہلا خیال ہاسپٹل کا آیا تھا لیکن اس کے پاس آنے والی وہ کال ہاسپٹل سے نہیں آئی تھی۔ اس پر نسا کا نام چمک رہا تھا۔ وہ غیر متوقع تھی۔ ایک ہفتے پہلے اسفند کی تدفین کے دوران اس کی ملاقات نسا سے ایک لمبے عرصے کے بعد ہوئی تھی اور اس کے بعد اس طرح رات کے اس وقت آنے والی کال۔

کال ریسیو کرتے ہوئے دوسری طرف سے اس نے جبریل سے معذرت کی تھی کہ وہ رات کے اس وقت اسے ڈسٹرب کر رہی تھی اور پھر بے حد اضطراب کے عالم میں اس نے جبریل سے کہا تھا۔

"تم عائشہ کے لیے کچھ کر سکتے ہو؟"

جبریل کچھ حیران ہوا۔ "عائشہ کے لیے کیا؟"

"وہ پولیس کسٹڈی میں ہے۔"

"واٹ؟" وہ ہکا بکا رہ گیا۔ "کیوں؟"

"قتل کے کیس میں۔" وہ دوسری طرف سے کہہ رہی تھی۔

جبریل سکتہ میں رہ گیا۔ "کس کا قتل؟" وہ اب رونے لگی تھی۔

"اسفند کا۔" جبریل کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔

وہ یخنی میں ڈوبے ہوئے روٹی کے ٹکڑے' چمچے سے اپنے باپ کو کھلا رہا تھا' اس کا باپ لقمے کو چبانے اور نگلنے میں تقریبا" دو منٹ لے رہا تھا۔ وہ ہر بار صرف اتنی ہی یخنی پیالے میں ڈالتا جس میں ایک ٹکڑا ڈوب جاتا پھر چمچے سے اس

ٹکڑے کو باپ کے منہ میں ڈالنے کے بعد وہ بے حد تحمل سے پیالے میں نیا ٹکڑا ڈالتا جو گرم یخنی میں پھولنے لگتا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں یخنی اس پیالے میں ڈالتا تو یخنی اب تک ٹھنڈی ہو چکی ہوتی۔ یخنی کا ایک پیالہ پینے میں اس کا باپ تقریباً "ایک گھنٹہ" لگاتا تھا۔ ٹھنڈی یخنی میں ڈوبے ہوئے روٹی کے ٹکڑے بھی وہ اسی رغبت سے کھاتا جیسے وہ ان گرم لقموں کو کھا رہا تھا۔

سکندر عثمان کے ذائقے کی حس آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ گرم اور ٹھنڈی خوراک میں تمیز کرنا وہ کب کا بھول چکے تھے۔ صرف ان کی دیکھ بھال کرنے والے فیملی کے افراد تھے جو اس فرق کو ان کے لیے اب بھی برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اب بھی خوراک کو ان کے لیے ممکنہ حد تک ذائقہ دار بنا کر دے رہے تھے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس ذائقے سے لطف اندوز ہو سکتے تھے نہ اس ذائقے کو یاد رکھ سکتے تھے۔

باپ کو کھانا کھلانے کے ساتھ ساتھ سالار اور امامہ نے بھی وہیں بیٹھے کھانا کھایا تھا۔ وہ جب بھی یہاں آتا تھا، تینوں وقت کا کھانا باپ کے کمرے میں اسے کھلاتے ہوئے ہی کھاتا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں یہی کام امامہ اور بچے کرتے تھے۔ ان کے گھر کا ڈرائنگ روم ایک عرصے سے نہ ہونے کے برابر استعمال ہو رہا تھا۔ اس کے ماں باپ کا بیڈ روم اس کی فیملی کے افراد کی بہت ساری سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہ اس شخص کو تنہائی سے بچانے کی ایک کوشش تھی جو کئی سالوں سے اس کمرے میں بستر تک محدود تھا اور الزائمر کی آخری سٹیج میں داخل ہو چکا تھا۔

ٹرالی میں پڑا نیپکن اٹھا کر اس نے سکندر عثمان کے ہونٹوں کے کونے سے نکلنے والی یخنی کے وہ قطرے صاف کیے جو چند لمحے پہلے نمودار ہوئے تھے۔ انہوں نے خالی آنکھوں سے اسے دیکھا جن سے وہ اسے ہمیشہ دیکھتے تھے۔ وہ انہیں کھانا کھلاتے ہوئے جواب کی توقع کے بغیر ان سے بات کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس کے باپ کی خاموشی کے وقفے اب گھنٹوں پر محیط ہونے لگے تھے۔ گھنٹوں کے بعد کوئی لفظ یا جملہ ان کے منہ سے نکلتا تھا جس کا تعلق ان کی زندگی کے کسی سال کی کسی یاد سے ہوتا تھا اور وہ سب اس جملے کو سال کے ساتھ جوڑنے کی کوشش میں لگ جاتے تھے۔

سکندر عثمان کھانا کھاتے ہوئے ہمیشہ یک ٹک اسے دیکھتے تھے۔ اب بھی دیکھ رہے تھے۔ سالار جانتا تھا اس کا باپ جیسے ایک اجنبی کا چہرہ پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کو کھانا کھلانے کی کوئی احتیاط، کوئی محبت، کوئی لگن ان کی یادداشت میں کہیں محفوظ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ایک اجنبی کے ہاتھ سے کھانا کھا رہے تھے اور ان کے ختم ہوتے ہوئے ذہنی خلیے اس اجنبی کے چہرے کو کوئی نام دینے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

سالار جانتا تھا اس کے باپ کو اس کے ہاتھ سے کھایا ہوا دوپہر کا کھانا بھی یاد نہیں ہوگا۔ وہ جتنی بار اس کمرے میں آتا ہوگا، وہ اپنے باپ کے لیے ایک نیا شخص، ایک نیا چہرہ ہوگا اور صرف وہی نہیں، اس کی فیملی کے باقی سب افراد بھی۔ سکندر عثمان شاید حیران ہوتے ہوں گے کہ ان کے کمرے میں بار بار نئے لوگ کیوں آتے تھے۔ وہ اپنے گھر میں "اجنبیوں" کے ساتھ رہ رہے تھے۔

اس نے یخنی کا آخری چمچ اپنے باپ کے منہ میں ڈالا۔ پھر پیالہ ٹرالی میں رکھ دیا۔ اب وہ اپنے باپ کو چمچ سے پانی پلا رہا تھا۔ اس کا باپ لمبا گھونٹ نہیں لے سکتا تھا۔ امامہ کچھ دیر پہلے کمرے سے اٹھ گئی تھی۔ اس کا سامان پہلے ہی ایئرپورٹ جا چکا تھا۔ اب باہر ایک گاڑی اس کے انتظار میں کھڑی تھی جو اسے تھوڑی دیر میں ایئرپورٹ لے جاتی۔ اس کا اسٹاف بے صبری سے اس کمرے سے اس کے برآمد ہونے کا منتظر تھا۔

سالار نے گلاس واپس رکھتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ کر اپنے باپ کی گردن کے گرد پھیلا ہوا نیپکن ہٹایا۔ پھر کچھ دیر تک سکندر عثمان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے وہ بیٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ اس نے انہیں اپنی روانگی کا بتایا تھا اور اس تشکر و احسان مندی کا بھی جو وہ اپنے باپ کے لیے ہمیشہ محسوس کرتا تھا، خاص طور پر آج۔ سکندر عثمان خالی نظروں سے اسے دیکھ اور سن رہے تھے۔ وہ جانتا تھا وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ لیکن یہ ایک رسم تھی جو وہ ہمیشہ ادا کرتا تھا۔ اس نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد باپ کے ہاتھ چومے پھر انہیں لٹا کر کمبل اوڑھا دیا، اور کچھ دیر بے مقصد بیڈ کے پاس کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ اس کے بعد پتا نہیں کب وہ اپنے باپ کے پاس آنے کے قابل ہوتا۔ سالار یہ نہیں جانتا تھا وہ آخری کھانا تھا جو اس نے اپنے باپ کے ساتھ کھایا تھا۔

تاش کا ترپ کا پتا پھینکا جانے والا تھا اور "مہلت" ختم ہونے والی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ۔ ان شاء اللہ)

تبارک الذی

لاک اپ میں بیٹھ کر اس رات عائشہ عابدین نے اپنی گزری زندگی کو یاد کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کی زندگی میں اتنا بہت کچھ ہو چکا تھا کہ وہ اس کوشش میں بھی ناکام ہو رہی تھی یوں جیسے وہ انتیس سال کی زندگی نہیں تھی آٹھ سو سال کی زندگی تھی۔ کوئی بھی واقعہ اس ترتیب سے یاد نہیں آرہا تھا جس ترتیب سے وہ اس کی زندگی میں ہوا تھا اور وہ یاد کرنا چاہتی تھی۔

لاک اپ کے بستر پر چت لیٹے چھت کو گھورتے اس نے یہ سوچنے کی کوشش کی تھی کہ اس کی زندگی کا سب سے بدترین واقعہ کون سا تھا۔ سب سے تکلیف دہ تجربہ اور دور...

باپ کے بغیر زندگی گزارنا؟

احسن سعد سے شادی؟

اس کے ساتھ اس کے گھر میں گزارا ہوا وقت؟

ایک معذور بیٹے کی پیدائش؟

احسن سعد سے طلاق؟

اسفند کی موت؟ یا پھر اپنے ہی بیٹے کے قتل کے الزام میں دن دیہاڑے اسپتال سے پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونا؟ اور ان سب واقعات کے بیچوں بیچ کئی اور ایسے تکلیف دہ واقعات جو اس کے ذہن کی دیوار پر اپنی جھلک دکھاتے ہوئے جیسے اس فہرست میں شامل ہونے کے لیے بے قرار تھے۔

وہ طے نہیں کر سکی۔ ہر تجربہ، ہر حادثہ اپنی جگہ تکلیف دہ تھا۔ اپنی طرز کا ہولناک... وہ ان کے بارے میں سوچتے ہوئے جیسے زندگی کے وہ دن جیتے گئی تھی اور اگلے واقعہ کے بارے میں سوچنا شروع کرتے ہوئے اسے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا تھا کہ پچھلا واقعہ زیادہ تکلیف دہ تھا یا پھر وہ جو اسے اب یاد آیا تھا۔

کبھی کبھی عائشہ عابدین کو لگتا تھا وہ ڈھیٹ ہے۔ تکلیف اور ذلت سہہ سہہ کر وہ اب شرمندہ ہونا اور درد سے متاثر ہونا چھوڑ چکی تھی۔ زندگی میں وہ اتنی ذلت اور تکلیف سہہ چکی تھی کہ شرم اور شرمندگی کے لفظ جیسے اس کی زندگی سے خارج ہو گئے تھے... وہ اتنی ڈھیٹ ہو چکی تھی کہ مرنا بھی بھول گئی تھی۔ اسے کسی تکلیف سے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ دل تھا تو وہ اتنے ٹکڑے ہو چکا تھا کہ اب اور ٹوٹنا اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ ذہن تھا تو اس پر جالے ہی جالے تھے... عزت نفس، ذلت، عزت جیسے لفظوں کو چھپا دینے والے جالے... یہ سوچنا اس نے کب کا چھوڑ دیا تھا کہ یہ سب اس کے ساتھ ہی کیوں ہوا تھا اس نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا... اس سوال کا جواب ویسے بھی اسے احسن سعد نے رٹوا دیا تھا۔

"لکھو اس کاغذ پر کہ تم گناہ گار ہو... اللہ سے معافی مانگو... پھر مجھ سے معافی مانگو... پھر میرے گھر والوں سے معافی مانگو... بے حیا عورت!"

پتا نہیں یہ آواز اس کے کانوں میں گونجنا بند کیوں نہیں ہوتی تھی... دن میں... رات میں... سیکڑوں بار ان جملوں کی بازگشت اسے اس کے اس سوال کا جواب دیتی رہتی تھی کہ یہ سب اس کے ساتھ ہی کیوں ہوا تھا۔

وہ ایک گناہ گار عورت تھی... یہ جملہ اس نے اتنی بار اپنے ہاتھ سے کاغذ پر لکھ کر احسن سعد کو دیا تھا کہ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ جملہ حقیقت تھا۔ اس کا گناہ کیا تھا؟ یہ اسے یاد نہیں آتا تھا مگر اسے پھر بھی یقین تھا کہ جو بھی گناہ اس نے کبھی زندگی میں کیا ہو گا بہت بڑا ہی کیا ہو گا۔ اتنا بڑا کہ اللہ تعالیٰ اسے یوں بار بار "سزا" دے رہا تھا۔ سزا کا لفظ بھی اس نے احسن سعد اور اس کے گھر میں ہی سنا اور سیکھا تھا... جہاں گناہ اور سزا کے لفظ کسی ورد کی طرح دہرائے جاتے تھے۔ ورنہ عائشہ عابدین نے تو احسن سعد کی زندگی میں شامل ہونے سے پہلے اللہ کو خود پر صرف "مہربان" دیکھا تھا۔

"بے حیا عورت..." وہ گالی اس کے لیے تھی۔ عائشہ عابدین کو گالی سن کر بھی یقین نہیں آیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایک گالی اپنے لیے سن کر وہ گنگ رہ گئی تھی۔ کسی مجسمے کی طرح کھڑی یوں جیسے اس نے کوئی سانپ یا اژدھا دیکھ لیا ہو... وہ نازو نعم میں پلی تھی۔ گالی تو ایک طرف اس نے کبھی اپنے نانا نانی یا ماں سے اپنے لیے کوئی سخت لفظ بھی نہیں سنا

تھا۔ ایسا لفظ جس میں عائشہ کے لیے توہین یا تضحیک ہوتی اور اب اس نے اپنے شوہر سے اپنے لیے جو لفظ سنا تھا اس میں الزام اور تہمت تھی۔

وہ "بے حیا" تھی۔ عائشہ عابدین نے اپنے آپ کو بہلایا تھا' سو تاویلیں دے دے کر کہ یہ گالی اس کے لیے کیسے ہو سکتی ہے۔ یا شاید اس نے غلط سنا تھا یا پھر ان الفاظ کا مطلب وہ نہیں تھا جو وہ سمجھ رہی تھی۔ وہ اس کیفیت پر ایک کتاب لکھ سکتی تھی ان توجیہات' ان وضاحتوں پر جو پہلی گالی سننے کے بعد اگلے کئی دن عائشہ عابدین نے اپنے آپ کو دی تھیں۔ اپنی عزت نفس کو دوبارہ بحال کرنے کے لیے اینٹی بائیوٹکس کے ایک کورس کی طرح۔ لیکن یہ سب صرف پہلی گالی کی دفعہ ہوا تھا پھر آہستہ آہستہ عائشہ عابدین نے ساری توجیہات اور وضاحتوں کو دفن کر دیا تھا۔ وہ اب گالیاں کھاتی تھی اور بے حد خاموشی سے کھاتی تھی اور بہت بری بری۔ اور اسے یقین تھا وہ ان گالیوں کی مستحق تھی کیونکہ احسن سعد اس سے یہ کہتا تھا۔ پھر وہ مار کھانا بھی اسی سہولت سے سیکھ گئی تھی۔ اپنی عزت نفس کو ایک اور دلاسا دیتے ہوئے۔

پانچ افراد کا وہ گھرانہ اسے یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ اسی قابل تھی۔ وہ مومنین کے ایک ایسے گروہ میں پھنس گئی تھی جو زبان کے پتھروں سے اسے بھی مومن بنانا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ "گناہ گار" تھی۔

احسن سعد اس کی زندگی میں کیسے آیا تھا اور کیوں آگیا تھا...

ایک وقت تھا جب اسے لگتا تھا کہ وہ اس کی خوش قسمتی بن کر اس کی زندگی میں آیا ہے اور پھر ایک وہ وقت آیا جب اسے وہ ایک ڈراؤنا خواب لگنے لگا تھا جس کے ختم ہونے کا انتظار وہ شدومد سے کرتی تھی اور اب اسے لگتا تھا کہ وہ وہ عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے کردہ ناکردہ گناہوں پر اس دنیا میں ہی دے دیا ہے۔

وہ ہاؤس جاب کر رہی تھی جب احسن سعد کا پرپوزل اس کے لیے آیا تھا۔ عائشہ کے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس کے لیے درجنوں پرپوزلز پہلے بھی آ چکے تھے اور اس کے نانا نانی کے ہاتھوں رد بھی ہو چکے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ پرپوزل بھی کسی غور کے بغیر رد کر دیا جائے گا کیونکہ اس کے نانا نانی اس کی تعلیم مکمل ہوئے بغیر اسے کسی قسم کے رشتے میں باندھنے پر تیار نہیں تھے مگر اس بار ایسا نہیں ہوا تھا۔ احسن سعد کے والدین کی میٹھی زبان عائشہ عابدین کی فیملی پر اثر کر گئی تھی اور اس پر بھی۔

"ہمیں صرف ایک نیک اور اچھی بچی چاہیے اپنے بیٹے کے لیے۔ باقی سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہے اور آپ کی بیٹی کی اتنی تعریفیں سنی ہیں ہم لوگوں نے کہ بس ہم آپ کے ہاں جھولی پھیلا کر آئے بغیر رہ نہ سکے۔"

احسن کے باپ نے اس کے نانا سے کہا تھا اور عائشہ عابدین کو تب پتا چلا تھا کہ اس کی ایک نند اس کے ساتھ میڈیکل کالج میں پڑھتی تھی۔ ان دونوں کا آپس میں بہت رسمی سا تعارف تھا مگر اسے حیرت ہوئی تھی کہ اس رسمی تعارف پر بھی اس کی اتنی تعریفیں وہ لڑکی اپنی فیملی میں کر سکتی تھی جو کالج میں بالکل خاموش اور لیے دیے رہتی تھی۔

عائشہ عابدین کے لیے کسی کی زبان سے اپنی تعریفیں سننا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ وہ کالج کی سب سے نمایاں اسٹوڈنٹس میں سے ایک تھی اور وہ ہر شعبے میں نمایاں تھی اکیڈمک قابلیت میں نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں اور پھر اپنی پرسنالٹی کی وجہ سے بھی۔ وہ اپنے بیچ کی نہ صرف حسین بلکہ بے حد اسٹائلش لڑکیوں میں گنی جاتی تھی۔ بے حد باعمل مسلمان ہوتے ہوئے بھی اور مکمل طور پر حجاب لیے ہوئے بھی۔ حجاب عائشہ عابدین پر جچتا بھی تھا۔ یہ اس کی کشش کو بڑھانے والی چیز تھی اور اس کے بارے میں لڑکے اور لڑکیوں کی یہ متفقہ رائے تھی اور اب اس لڑکی کے لیے احسن سعد کا پرپوزل آیا تھا جس کی فیملی کو اس کے نانا نانی نے پہلی ملاقات میں ہی اوکے کر دیا تھا۔

پتا نہیں کون "سادہ" تھا۔ اس کے نانا' نانی جنہیں احسن کے ماں باپ بہت شریف اور سادہ لگے تھے یا پھر وہ خود کہ انہوں نے اس خاندان کے بارے میں لمبی چوڑی تحقیق صرف اس لیے نہیں کروائی کیونکہ انہوں نے احسن سعد کے ماں باپ کی دین داری کا پاس کیا تھا' لیکن اس کے باوجود انہوں نے شادی سے پہلے احسن سعد اور عائشہ کی ایک ملاقات کروانا ضروری سمجھا تھا۔ احسن سعد اس وقت امریکا میں ریزیڈنسی کر رہا تھا اور چھٹیوں میں پاکستان آیا ہوا تھا۔

احسن سعد سے پہلی ملاقات میں عائشہ کو ایک لمبے عرصے کے بعد جبریل یاد آیا تھا اور اسے وہ جبریل کی طرح کیوں لگا تھا؟

عائشہ کو اس سوال کا جواب کبھی نہیں ملا۔

وہ مناسب شکل و صورت کا تھا، تعلیمی قابلیت میں بے حد اچھا اور بات چیت میں بے حد محتاط۔ اس کا پسندیدہ موضوع صرف ایک تھا۔ مذہب جس پر وہ گھنٹوں بات کر سکتا تھا اور اس کے اور عائشہ عابدین کے درمیان رابطے کی کڑی یہی تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ دونوں مذہب پر بات کرنے لگے تھے اور عائشہ عابدین اس سے مرعوب ہوئی تھی۔ وہ حافظ قرآن تھا اور وہ اسے بتا رہا تھا کہ زندگی میں کبھی کسی لڑکی کے ساتھ اس کی دوستی نہیں رہی وہ عام لڑکوں کی طرح کسی الٹی سیدھی حرکتوں میں نہیں پڑا۔ وہ مذہب کے بارے میں جامع معلومات رکھتا تھا اور وہ معلومات عائشہ کی معلومات سے بہت زیادہ تھیں، لیکن وہ ایک سادہ زندگی گزارنا چاہتا تھا اور عائشہ بھی یہی چاہتی تھی۔

ایک عملی مسلمان گھرانے کے خواب دیکھتے ہوئے وہ احسن سعد سے متاثر ہوئی تھی اور اس کا خیال تھا وہ اپنی عمر کے دوسرے لڑکوں سے بے حد میچور اور مختلف ہے۔ وہ اگر کبھی شادی کرنے کا سوچتی تھی تو ایسے ہی آدمی سے شادی کرنے کا سوچتی تھی۔ احسن سعد پہلی ملاقات میں اسے متاثر کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس کی فیملی اس کے گھر والوں سے پہلے متاثر تھی۔

یہ صرف نورین الہی تھی جس نے احسن کی فیملی پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ اسے وہ بے حد "دکر" لگے تھے اور اس کی اس رائے کو اس کے اپنے ماں باپ نے یہ کہتے ہوئے رد کر دیا تھا کہ وہ خود ضرورت سے زیادہ لبرل ہے اس لیے وہ انہیں اس نظر سے دیکھ رہی ہے۔ نورین شاید کچھ اور بحث و مباحثہ کرتی اگر اسے یہ محسوس نہ ہوتا کہ عائشہ عابدین بھی وہی چاہتی تھی جو اس کے ماں باپ چاہتے تھے۔ نورین الہی نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے تمام خدشات کو یہ کہہ کر سلا دیا تھا کہ عائشہ احسن کے والدین کے پاس نہیں امریکا میں احسن کے ساتھ رہے گی اور امریکا کا ماحول بڑے بڑوں کو ماڈرن بنا دیتا ہے۔

شادی بہت جلدی ہوئی تھی اور بے حد سادگی سے۔ یہ احسن سعد کے والدین کا مطالبہ تھا اور عائشہ اور اس کے نانا نانی اس پر بے حد خوش تھے۔ عائشہ ایسی ہی شادی چاہتی تھی اور یہ اسے اپنی خوش قسمتی لگی تھی کہ اسے ایسی سوچ رکھنے والا سسرال مل گیا تھا۔ احسن سعد کی فیملی کی طرف سے جہیز کے حوالے سے کوئی مطالبہ نہیں آیا تھا بلکہ انہوں نے سختی سے عائشہ کے نانا نانی کو ان روایتی تکلفات سے منع کیا تھا مگر یہ عائشہ کی فیملی کے لیے اس لیے ممکن نہیں تھا کیونکہ عائشہ کے لیے اس کے نانا نانی بہت کچھ خریدتے رہتے تھے اور جس کلاس سے وہ تعلق رکھتی تھی وہاں جہیز سے زیادہ مالیت کے تحائف دلہن کے خاندان کی طرف سے موصول ہو جاتے تھے اور عائشہ کی شادی کی تقریب میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ بہت سادگی سے کی جانے والی تقریب بھی شہر کے ایک بہترین ہوٹل میں منعقد کی گئی تھی۔ احسن سعد اور اس کے خاندان کو عائشہ اور اس کی فیملی کی طرف سے دیے جانے والے تحائف کی مالیت بے شک لاکھوں میں تھی، مگر اس کے برعکس احسن سعد کی فیملی کی جانب سے شادی پر دیے جانے والے عائشہ کے ملبوسات اور زیورات احسن سعد کے خاندانی رکھ رکھاؤ اور مالی حیثیت سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ وہ بس مناسب تھے۔

عائشہ کی فیملی کا دل برا ہوا تھا، لیکن عائشہ نے انہیں سمجھایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ "سادگی" سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ اگر انہوں نے زیورات اور شادی کے ملبوسات پر بھی بہت زیادہ پیسہ خرچ نہیں کیا تو بھی یہ ناخوش ہونے والی بات نہیں تھی۔ کم از کم اس کا دل ان چھوٹی موٹی باتوں کی وجہ سے کھٹا نہیں ہوا تھا۔

اس کا دل شادی کی رات اس وقت بھی کھٹا نہیں ہوا تھا جب کمرے میں آنے کے بعد اس کے قریب بیٹھ کر پہلا جملہ احسن سعد نے اپنی نئی نویلی دلہن اور اس کے حسن کے بارے میں نہیں کہا تھا بلکہ اس کی ماں کے حوالے سے کہا تھا۔

"تمہاری ماں کو شرم نہیں آئی۔ اس عمر میں فاحشاؤں کی طرح سلیولیس لباس پہن کر مردوں کے ساتھ ٹھٹھے لگاتی پھر رہی تھیں اور اسی طرح تمہاری بہنیں اور تمہارے خاندان کی ساری عورتیں پتا نہیں آج کیا کیا پہن کر شادی میں شرکت کرنے پہنچی ہوئی تھیں۔" عائشہ کا اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رہ گیا تھا۔ جو اس نے اپنے کانوں سے سنا تھا اسے یقین نہیں آیا تھا۔

احسن کا یہ لب و لہجہ اتنا نیا اور اجنبی تھا کہ اسے یقین آ ہی نہیں سکتا تھا۔ ان کے درمیان نسبت طے ہونے کے بعد

"موقع" بات چیت ہوتی رہی تھی اور وہ ہمیشہ بڑے خوش گوار انداز اور دھیمے لب و لہجے میں بڑی شائستگی اور تمیز کے ساتھ بات کرتا تھا۔ اتنا اکھڑ لہجہ اس نے پہلی بار سنا تھا اور جو لفظ وہ اس کی ماں اور خاندان کی عورتوں کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ عائشہ عابدین کے لیے ناقابل یقین تھے۔

"تمہاری ماں کو کیا آخرت کا خوف نہیں ہے؟ مسلمان گھرانے کی عورت ایسی ہوتی ہے۔ اور پھر بیوہ ہے وہ۔" عائشہ آنکھیں پھاڑے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے یہ سب کیوں سنا رہا تھا؟ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک دن کی دلہن تھی اور یہ وہ الفاظ نہیں تھے جو وہ سننے کے لیے اپنی زندگی کے ایک اہم دن کے انتظار میں تھی۔

وہ آدھے گھنٹے تک ایسی عورتوں کو لعنت و ملامت کرتا رہا تھا اور اسے یہ بھی بتاتا رہا تھا کہ اس کی فیملی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کی ماں اور بہنیں اتنی آزاد خیال ہوں گی اور امریکہ میں ان کا یہ لائف اسٹائل ہوگا۔ انہوں نے تو اس کے نانا نانی اور خود اسے دیکھ کر یہ رشتہ طے کیا تھا۔ وہ احسن سعد سے یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکی کہ وہ اس رشتے کے طے ہونے سے پہلے امریکہ میں دو تین بار اس کی ماں اور بہنوں سے مل چکا تھا۔ اور نسبت طے ہوتے ہوئے بھی اس کی فیملی اس کی ماں اور بہنوں سے مل چکی تھی۔ وہ آزاد خیال تھیں۔ تو یہ ان سے چھپا ہوا نہیں تھا جس کا انکشاف اس رات ہونے پر وہ یوں صدمہ زدہ ہو گئے تھے۔

احسن سعد کے پاس مذہب ایسی تلوار تھی جس کے سامنے عائشہ عابدین بولنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں یہ مان لیا تھا کہ غلطی اس کی ماں اور بہنوں ہی کی تھی۔ وہ اسلامی لحاظ سے مناسب لباس میں نہیں تھیں اور احسن اور اس کی فیملی اگر خفا تھی تو شاید یہ جائز ہی تھا۔

اس رات احسن سعد نے اس ابتدائیے کے بعد ایک لمبی تقریر میں اسے بیوی اور ایک عورت کی حیثیت سے اس کا درجہ اور مقام بتا اور سمجھا دیا تھا جو ثانوی تھا۔ وہ سر ہلاتی رہی تھی۔ وہ ساری آیات اور احادیث کے حوالے آج کی رات کے لیے ہی جیسے اکٹھا کرتا رہا تھا۔ وہ بے حد خاموشی سے سب کچھ سنتی گئی.... وہ وقتی غصہ نہیں تھا "وہ ارادتاً" تھا۔ وہ اسے نفسیاتی طور پر ہلا دینا چاہتا تھا اور وہ اس میں کامیاب رہا تھا۔

اس پُراعتماد لڑکی کی شخصیت پر یہ پہلی ضرب تھی جو اس نے لگائی تھی۔ اس نے اسے بتایا تھا کہ اس گھر اور اس کی زندگی میں وہ اس کے ماں باپ اور بہنوں کے بعد آئی ہے اور ہاں اس فہرست میں اس نے اللہ کو بھی پہلے نمبر پر رکھا تھا۔ عائشہ عابدین کو اس نے جیسے اس دائرے سے باہر کھڑا کر دیا تھا جس کے اندر اس کی اپنی زندگی گھومتی تھی۔ اکیس سال کی ایک نوعمر لڑکی جس طرح ہراساں ہو سکتی تھی وہ ویسے ہی ہراساں اور حواس باختہ تھی۔

احسن سعد نے اس سے کہا تھا اس کے اور عائشہ کے درمیان جو بات چیت ہوگی عائشہ اسے کسی سے شیئر نہیں کرے گی۔ عائشہ نے اس کی بھی ہامی بھر لی تھی۔ اس کا خیال تھا یہ ایک عام وعدہ ہے جو ہر شوہر بیوی سے لیتا ہے۔ مگر وہ ایک عام وعدہ نہیں تھا۔ احسن سعد نے اس کے بعد اس سے قرآن پاک پر رازداری کا حلف لیا تھا یہ کہتے ہوئے کہ وہ اس کی بیوی تھی اور شوہر کے طور پر وہ یہ استحقاق رکھتا تھا کہ وہ اس سے جو کہے وہ اس کی اطاعت کرے۔ اکیس سال کی عمر میں وہ عائشہ عابدین کی زندگی کی سب سے بری رات تھی، لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس کے بعد بری راتوں کی گنتی بھی بھولنے والی تھی۔

اس رات احسن سعد کا غصہ اور رویہ صرف اس کا غصہ اور رویہ نہیں تھا۔ اگلی صبح عائشہ عابدین سے اس کی فیملی بھی اسی انداز میں ملی تھی۔ بے حد سرد مہری بے حد اکھڑا ہوا لہجہ۔ اس کا احساس جرم اور بڑھا تھا اور اس نے دعا کی تھی کہ اس رات ولیمہ کی تقریب میں اس کی ماں اور بہنیں ایسا کوئی لباس نہ پہنیں جس پر اسے ایک اور طوفان کا سامنا کرنا پڑے۔

لیکن شادی کے چند دنوں کے اندر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی فیملی کی خفگی کی وجہ اس کی اپنی فیملی کا آزاد خیال ہونا نہیں تھا۔ ان کی خفگی کی وجہ ان توقعات کا پورا نہ ہونا تھا جو وہ عائشہ کی فیملی سے لگائے بیٹھے تھے۔ شادی سادگی سے کرنے اور جہیز کچھ بھی نہ لانے کا مطلب "کچھ بھی" نہ لانا نہیں تھا۔ ان کو توقع تھی کہ ان کے اکلوتے اور اتنے قابل بیٹے کو عائشہ کی فیملی کوئی بڑی گاڑی ضرور دے گی۔ عائشہ کے نام کوئی گھر کوئی پلاٹ کوئی بینک بیلنس ضرور کیا جائے گا۔ جیسے ان کے خاندان کی دوسری بہوؤں کے نام تھا۔ شادی سادگی سے ہونے کا مطلب ان کے نزدیک صرف شادی کی تقریبات

کا سادہ ہونا تھا۔ شادی کے تیسرے دن یہ گلے شکوے عائشہ سے کر لیے گئے تھے اور اس کوشش کے ساتھ کہ وہ انہیں اپنی فیملی تک پہنچا دے جو عائشہ نے پہنچا دیے تھے۔ اب شاکڈ ہونے کی باری اس کی فیملی کی تھی۔

شادی کے تین دن بعد پہلی بار نورین نے اپنی بیٹی کو یہ آپشن دیا تھا کہ وہ ابھی اس رشتے کے بارے میں اچھی طرح سوچ لے۔ جو لوگ تیسرے ہی دن ایسے مطالبے کر سکتے ہیں وہ آگے چل کر اسے اور بھی پریشان کر سکتے تھے۔ عائشہ ہمت نہیں کر سکی تھی۔ اپنی دوستوں اور کزنز کے ٹیکسٹ میسجز اور کالز اور چھیڑ چھاڑ کے دوران وہ یہ ہمت نہیں کر سکی تھی کہ ماں سے کہہ دیتی کہ اسے طلاق چاہیے۔ اس نے وہی راستہ چنا تھا جو اس معاشرے میں سب چنتے تھے۔ سمجھوتے کا اور اچھے وقت کے انتظار کا۔ اس کا خیال تھا یہ سب کچھ وقتی تھا یہ چند مطالبے پورے ہونے کے بعد سب کچھ بدل جانے والا تھا اور پھر ایک بار وہ احسن کے ساتھ امریکا چلی جاتی تو پھر وہ اور احسن اپنے طریقے سے زندگی گزارتے۔

احسن کی فیملی کی ساری شکایات دور کر دی گئی تھیں۔ اسے شادی کے ایک ہفتے کے بعد ایک بڑی گاڑی دی گئی تھی۔ عائشہ کے نام نورین نے اپنا ایک پلاٹ ٹرانسفر کر دیا تھا اور عائشہ کے نانا نے اس کو کچھ رقم تحفے میں دی تھی جو اس نے احسن کے مطالبے پر اس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دی تھی۔ وہ اس کے بعد دو ہفتوں کے لیے ہنی مون منانے بیرون ملک چلے گئے تھے۔

احسن سعد نے پہلی بار ہنی مون کے دوران کسی بات پر برہم ہو کر اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اس سے پہلے اس نے اسے گالیاں دی تھیں۔ عائشہ عابدین سے بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی اپنی زندگی کے بارے میں۔ عائشہ نے جان لیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس کا شوہر بہت اچھا مسلمان ہو' لیکن اچھا انسان نہیں تھا اور عائشہ نے اس کا انتخاب اس کے اچھے مسلمان ہونے کی وجہ سے کیا تھا۔ اس دھوکے میں جس میں وہ ان بہت سارے اچھے مسلمانوں اور انسانوں کی وجہ سے آئی تھی جو منافق اور دوغلے نہیں تھے۔

وہ ایک مہینے کے بعد واپس امریکا چلا گیا تھا' لیکن اس ایک مہینے میں عائشہ بدل گئی تھی۔ وہ ایک عجیب و غریب خاندان میں آ گئی تھی جو بظاہر تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھا' لیکن اندر سے بے حد گھٹن زدہ تھا اور اس گھٹن اور منافقت کا منبع احسن سعد کا باپ تھا۔ اس کا اندازہ اسے بہت جلد ہو گیا تھا۔

احسن خود اپنے باپ کی کاپی بن گیا تھا اور اسے اپنی ماں کی کاپی بنانا چاہتا تھا جسے وہ ایک آئیڈیل مسلمان عورت سمجھتا تھا۔ وہ اور اس کی بہنیں' وہ عائشہ عابدین کو ان کے جیسا بنانا چاہتے تھے اور عائشہ عابدین کو بہت جلد اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ آئیڈیل مسلم عورتیں نفسیاتی مسائل کا شکار تھیں۔ اس گھر کے ماحول اور سعد کے رویے اور مزاج کی وجہ سے۔ اس کی نندوں کے لیے رشتوں کی تلاش جاری تھی' لیکن عائشہ کو یقین تھا جو معیار احسن اور سعد ان دونوں کے لیے رکھ بیٹھے تھے اس کو سامنے رکھ کے رشتوں کی تلاش اور بھی مشکل تھی۔

عائشہ شادی کے دو ہفتوں کے اندر اندر اس ماحول سے وحشت زدہ ہو گئی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ احسن سعد کا لیا ہوا حلف توڑ کر اپنے نانا نانی سے سب کچھ شیئر کرتی اور ان سے کہتی کہ وہ اسے اس جہنم سے نکال لیں۔ اسے پتا چلا کہ وہ پریگننٹ ہے۔ وہ خبر جو اس وقت اسے خوش قسمتی لگتی اسے اپنی بدقسمتی لگی تھی۔ عائشہ عابدین ایک بار پھر سمجھوتا کرنے پر تیار ہو گئی۔ ایک بار پھر اس امید کے ساتھ کہ بچہ اس گھر میں اس کی حیثیت کو بدل دینے والا تھا اور کچھ نہیں تو کم از کم اس کے اور احسن سعد کے تعلق کو۔ تو یہ بھی اس کی خوش فہمی تھی۔ وہ پریگننسی اس کے لیے ایک اور پھندا ثابت ہوئی۔ احسن سعد اور اس کی فیملی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ بچے کی پیدائش تک پاکستان میں ہی رہے گی۔

عائشہ نے نو مہینے جتنے صبر اور تحمل کے ساتھ گزارے تھے' صرف وہی جانتی تھی۔ وہ ہاؤس جاب کے بعد جاب کرنا چاہتی تھی' لیکن اس کے سسرال والوں اور احسن کو یہ پسند نہیں تھا اس لیے عائشہ نے اس پر اصرار نہیں کیا۔ اس کے سسرال والوں کو عائشہ کا بار بار اپنی نانی نانا کے گھر جانا اور ان کا اپنے گھر آنا بھی پسند نہیں تھا تو عائشہ نے یہ بات بھی بنا چوں چرا کے مان لی تھی۔ وہ اب کسی سوشل میڈیا پر نہیں تھی کیونکہ احسن کو خود ہر فورم پر موجود ہونے کے باوجود یہ پسند نہیں تھا کہ وہ وہاں ہو اور اس کے کانٹیکٹس میں کوئی مرد ہو' چاہے وہ اس کا کوئی رشتہ دار یا کلاس فیلو ہی کیوں نہ ہو اور عائشہ نے اپنی بہنوں کے اعتراضات کے باوجود اپنی ID ختم کر دی تھی۔ اس کے پاس ویسے بھی کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے

اظہار کے لیے اسے فیس بک سے کسی اکاؤنٹ کی ضرورت پڑتی۔
احسن سعد کی ماں کو یہ پسند نہیں تھا کہ وہ اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھے۔ صبح دیر تک سوتی رہے عائشہ صبح سویرے فجر کی نماز پڑھنے کے بعد ہر حالت میں لاؤنج میں آجاتی تھی۔ گھر میں ملازم تھے لیکن ساس سسر کی خدمت اس کی ذمہ داری تھی اور اس پر اسے اعتراض بھی نہیں تھا۔ کھانا بنانے کی ذمہ داری جو اس سے پہلے خواتین میں تقسیم تھی'اب عائشہ کی ذمہ داری تھی اور یہ بھی ایسی بات نہیں تھی جس سے اسے تکلیف پہنچتی۔ وہ بہت تیز کام کرنے کی عادی تھی اور نانا نانی کے گھر میں بھی وہ بڑے شوق سے ان کے لیے بھی کبھار کھانا بنایا کرتی تھی۔ وہ ذمہ داریوں سے نہیں گھبراتی تھی تذلیل سے گھبراتی تھی۔ اس گھر کے افراد ستائش اور حوصلہ افزائی جیسے لفظوں سے ناآشنا تھے۔ وہ تنقید کرسکتے تھے تعریف نہیں۔ یہ صرف عائشہ نہیں تھی جس کی خدمت گزاری کو وہ سراہنے سے قاصر تھے وہاں کوئی بھی کسی کو سراہتا نہیں تھا۔
وہ اس گھر میں یہ سوال کرتی تو اپنے آپ کو ہی وہ احمق لگتی کہ اس نے کھانا کیسا بنایا تھا۔ شروع شروع میں بڑے شوق سے کیے جانے والے ان سوالات کا جواب اسے بے حد تضحیک آمیز جملوں اور تمسخر سے ملا تھا۔ بھی بھی اسے لگتا تھا کہ وہ بھی نفسیاتی ہونا شروع ہو گئی ہے۔
احسن سعد اس کے لیے ایک ضابطہ طے کر گیا تھا۔ وہ غلطی کرے گی تو کاغذ پر لکھ کر اپنی غلطی کا اعتراف کرے گی۔ اللہ سے حکم عدولی کی معافی مانگے گی پھر اس شخص سے۔ جس کی اس نے نافرمانی کی ہوگی۔
ہفتے میں ایک بار عائشہ ایسا ایک معافی نامہ گھر کے کسی نہ کسی فرد کے نام لکھ رہی ہوتی تھی اور پھر آہستہ آہستہ اسے اندازہ ہوا وہ معافی نامہ بھی سعد کی ایجاد تھی۔ احسن سعد اپنا سارا بچپن اپنی غلطیوں کے لیے اپنے باپ کو ایسے ہی معافی نامے لکھ کے دیتا رہا تھا اور اب اپنی بیوی کے گلے میں اس نے وہی رسی ڈال دی تھی۔
عائشہ پہلے حجاب کرتی تھی اب وہ نقاب اور دستانے بھی پہننا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے بال کٹوانا چھوڑ دیا تھا۔ میک اپ' فیشل' چہرے کے بالوں کی صفائی' سب کچھ چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس گھر کی عورتیں ان میں سے کوئی کام نہیں کرتی تھیں۔ وہ آئیڈیل عورتیں تھیں اور عائشہ عابدین کو اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھالنا تھا۔ اپنے باہر کو دوسروں کے بنائے ہوئے سانچوں میں ڈھالتے ڈھالتے عائشہ عابدین کے اندر کے سارے سانچے ٹوٹنا شروع ہو گئے تھے۔
اس کے نانا نانی اور فیملی کو یہ پتا تھا کہ اس کے سسرال والے اچھے لوگ نہیں تھے' لیکن عائشہ اس گھر میں کیا برداشت کررہی تھی' انہیں اس کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ اس حلف کو نبھا رہی تھی جو وہ شادی کی پہلی رات لے بیٹھی تھی۔ کوئی بھی اس سے ملنے' اس سے فون پر بات کرتے پر اسے کریدتا رہتا مگر عائشہ کے پاس بتانے کو کچھ بھی نہیں ہوتا تھا سوائے اس کے کہ وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی اور اس کی ناخوشی دوسرے کی غلط فہمی تھی اور ان مہینوں کے دوران اس کا اور احسن سعد کا تعلق نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ واپس جانے کے بعد بچے کی پیدائش تک دوبارہ واپس نہیں آیا تھا۔ ان کے درمیان فون پر اور اسکائپ پر بات بھی بہت مختصر ہوتی اور اس میں بھی تب وقفہ رہتا جب احسن کے گھر میں کوئی اس سے خفا ہوتا' امریکا میں ہونے کے باوجود گھر میں ہونے والے ہر معاملے سے اسے آگاہ رکھا جاتا تھا' خاص طور پر عائشہ کے حوالے سے۔
عائشہ کو کبھی کبھی لگتا تھا وہ شوہر اور بیوی کا رشتہ نہیں تھا' ایک بادشاہ اور کنیز کا رشتہ تھا۔ احسن سعد کو اس سے ویسی ہی اطاعت چاہیے تھی اور وہ اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے ایسی بیوی بننے کی کوشش کررہی تھی جیسی احسن سعد کو چاہیے تھی۔
اسفند کی پیدائش تک کے عرصے میں عائشہ عابدین کچھ کی کچھ ہو چکی تھی۔ جس گھٹن میں وہ جی رہی تھی اس گھٹن نے اس کے بچے کو بھی متاثر کیا تھا۔ اس کا بیٹا اسفند نارمل نہیں تھا' یہ عائشہ عابدین کا ایک اور بڑا گناہ تھا۔



اوول آفس سے ملحقہ ایک چھوٹے سے کمرے میں پروٹوکول آفیسر کی رہنمائی میں داخل ہوتے ہوئے سالار سکندر کے انداز میں اس جگہ سے واقفیت کا عنصر بے حد نمایاں تھا۔ وہ بڑے مانوس انداز میں چلتے ہوئے وہاں آیا تھا اور اس کے بعد

ہونے والے تمام Rituals (آداب) سے بھی واقف تھا۔ وہ یہاں کئی بار آ چکا تھا۔ کئی وفود کا حصہ بن کر۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا جب وہ وہاں تنہا بلایا گیا تھا۔

اسے بٹھانے کے بعد وہ آفیسر اندرونی دروازے سے غائب ہو گیا تھا۔ وہ پندرہ منٹ کی ایک ملاقات تھی جس کے اہم نکات وہ اس وقت ذہن میں دہرا رہا تھا۔ وہ امریکہ کے کئی صدور سے مل چکا تھا، لیکن وہ صدر جس سے وہ اس وقت ملنے آیا تھا خاص تھا۔ کئی حوالوں سے۔

وال کلاک پر ابھی 9:55 ہوئے تھے۔

صدر کے اندر آنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ اس سے پہلے 9:56 پہ ایک ویٹر اس کو پانی پیش کر کے گیا تھا۔ اس نے گلاس اٹھا کر رکھ دیا تھا۔ 9:57 پہ ایک اور اٹینڈنٹ اسے کافی سرو کرنے آیا تھا۔ اس نے منع کر دیا۔ 9:59 پہ اوول آفس کا دروازہ کھلا اور صدر کی آمد کا اعلان ہوا۔ سالار اٹھ کھڑا ہوا۔

اوول آفس کے دروازے سے اس کمرے میں آنے والا صدر امریکہ کی تاریخ کا کمزور ترین صدر تھا۔ وہ 2030ء کا امریکہ تھا۔ بے شمار اندرونی اور بیرونی مسائل سے دوچار ایک کمزور ملک۔ جس کی کچھ ریاستوں میں اس وقت خانہ جنگی جاری تھی۔ کچھ میں نسلی فسادات۔ اور ان سب میں امریکہ کا وہ پہلا صدر تھا جس کی کابینہ اور تھنک ٹینکس میں مسلمانوں اور یہودیوں کی تعداد اب برابر ہو چکی تھی۔ اس کی پالیسیز کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ بھی اندرونی خلفشار کا شکار تھی۔ لیکن یہ وہ مسائل نہیں تھے جن کی وجہ سے امریکہ کا صدر اس سے ملاقات کر رہا تھا۔

امریکہ اپنی تاریخ کے سب سے بڑے مالیاتی اور بینکنگ بحران کے دوران اپنی بین الاقوامی پوزیشن اور ساکھ کو بچانے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہا تھا اور SIF (ایس آئی ایف) کے سربراہ سے وہ ملاقات ان ہی کوششوں کا ایک حصہ تھی۔ ان آئینی ترامیم کے بعد جو امریکہ کو اپنے ملک کی حیثیت کو مکمل طور پر ڈوبنے سے بچانے کے لیے کرنی پڑی تھیں۔

اپنی تاریخ کے اس سب سے بڑے مالیاتی بحران میں جب امریکہ کی اسٹاک ایکسچینج کریش کر گئی تھی۔ اس کے بڑے مالیاتی ادارے دیوالیہ ہو رہے تھے۔ ڈالر کی ویلیو کو کسی ایک جگہ روکنا مشکل ہو گیا تھا اور مسلسل گرتی ہوئی اپنی کرنسی کو استحکام دینے کے لیے امریکہ کو تین مہینے کے دوران تین بار اس کی ویلیو خود کم کرنی پڑی تھی۔ صرف ایک ادارہ تھا جو اس مالیاتی بحران کو جھیل گیا تھا۔ لڑکھڑانے کے باوجود وہ امریکہ کے بڑے مالیاتی اداروں کی طرح زمین بوس نہیں ہوا تھا نہ ہی اس نے ڈاؤن سائزنگ کی تھی نہ بیل آؤٹ پیکجز مانگے تھے اور وہ SIF تھا۔ پندرہ سال میں وہ ایک بین الاقوامی مالیاتی ادارے کے طور پر اپنی شان دار ساکھ اور نام بنا چکا تھا اور امریکہ اور بہت سے دوسرے چھوٹے ملکوں میں بہت سے چھوٹے بڑے اداروں کو ضم کر کے اپنی چھتری تلے لا چکا تھا اور وہ چھتری مغربی مالیاتی اداروں کی شدید مخاصمت اور مغربی حکومتوں کے سخت ترین امتیازی قوانین کے باوجود پھیلتی چلی گئی تھی۔

پندرہ سالوں میں SIF نے اپنی بقا اور ترقی کے لیے بہت ساری جنگیں لڑی تھیں اور ان میں سے ہر جنگ جو کبھی تھی۔ لیکن SIF اور اس سے منسلک افراد لڑتے رہے تھے اور پندرہ سال کی اس مختصر مدت میں مالیاتی دنیا کا ایک بڑا نام بن چکا اب SIF بھی تھا جو اپنی بقا کے لیے لڑی جانے والی ان تمام جنگوں کے بعد اب بے حد مضبوط ہو چکا تھا۔

یورپ اور ایشیا اس کی بڑی مارکیٹیں تھیں۔ لیکن یہ افریقہ تھا جس پر SIF مکمل طور پر قابض تھا۔ وہ افریقہ جس میں کوئی گورا 2030ء میں SIF کے بغیر کوئی مالیاتی ٹرانزیکشن کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ افریقہ SIF کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ سالار سکندر کے ہاتھ میں تھا، جسے افریقہ اور اس کے لیڈرز نام اور چہرے سے پہچانتے تھے۔ پچھلے پندرہ سالوں میں صرف سالار کا ادارہ وہ واحد ادارہ تھا جو افریقہ کے کئی ممالک میں بدترین خانہ جنگی کے دوران بھی کام کرتا رہا تھا اور اس سے منسلک وہاں کام کرنے والے سب افریقی تھے اور SIF کے مشن اسٹیٹمنٹ پر یقین رکھنے والے۔ جو یہ جانتے تھے جو کچھ SIF ان کے لیے کر رہا تھا اور کر سکتا تھا۔ وہ دنیا کا کوئی اور مالیاتی ادارہ نہیں کر سکتا تھا۔

SIF افریقہ میں ابتدائی دور میں کئی بار نقصان اٹھانے کے باوجود وہاں سے نکلا نہیں تھا، وہ وہیں جما اور ڈٹا رہا تھا اور اس کی وہاں بقا کی بنیادی وجہ سود سے پاک وہ مالیاتی نظام تھا جو وہاں کی مقامی صنعتوں اور صنعت کاروں کو نہ صرف سود سے پاک قرضے دے رہا تھا بلکہ انہیں اپنے وسائل سے اس انڈسٹری کو کھڑا کرنے میں انسانی وسائل بھی فراہم کر رہا تھا۔

پچھلے پندرہ سالوں میں SIF کی افریقہ میں ترقی کی شرح ایک اسٹیج پر اتنی بڑھ گئی تھی کہ بہت سے دوسرے مالیاتی اداروں کو افریقہ میں اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے SIF کا سہارا لینا پڑا تھا۔

سالار سکندر سیاہ فاموں کی دنیا کا بے تاج بادشاہ تھا اور اس کی یہ پہچان بین الاقوامی تھی۔ افریقہ کے مالیاتی نظام کی کنجی SIF کے پاس تھی۔ اور سالار سکندر کے اس دن وائٹ ہاؤس میں بیٹھے ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ امریکہ ورلڈ بینک کو دیے جانے والے فنڈز میں اپنا حصہ ادا کرنے کے قابل نہیں رہا تھا اور ورلڈ بینک کو فنڈز کی فراہمی میں ناکام رہنے کے بعد اس سے سرکاری طور پر علیحدگی اختیار کر رہا تھا۔ ورلڈ بینک اس سے پہلے ہی ایک مالیاتی ادارے کے طور پر بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ یہ صرف امریکہ نہیں تھا جو مالیاتی بحران کا شکار تھا۔ دنیا کے بہت سے دوسرے ممالک بھی اسی کساد بازاری کا شکار تھے اور اس افراتفری میں ہر ایک کو صرف اپنے ملک کی معیشت کی پروا تھی۔ اقوام متحدہ سے منسلک ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جیسے اداروں کے ذریعے ترقی پذیر ممالک کی اقتصادیات پر قابض رہنا اب نہ صرف ناممکن ہو گیا تھا' بلکہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں آئے ہوئے مالیاتی بحران کے بعد اب یہ بے کار بھی ہو گیا تھا۔

ورلڈ بینک اب وہ سفید ہاتھی تھا جس سے وہ ساری استعماری قوتیں جان چھڑانا چاہتی تھیں اور کئی جان چھڑا چکی تھیں۔ اقوام متحدہ کا وہ چارٹر جو اپنے ممبران کو ورلڈ بینک کے ادارے کو فنڈز فراہم کرنے کا پابند کرتا تھا۔ اب ممبران کے عدم تعاون اور عدم دلچسپی کے باعث کاغذ کے ایک پرزے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اقوام متحدہ اب وہ ادارہ نہیں رہا تھا جو بین الاقوامی برادری کو سیکڑوں سالوں سے چلے آنے والے ایک ہی مالیاتی نظام میں پروئے رہنے پر مجبور کر سکتا۔

دنیا بدل چکی تھی اور گھڑی کی سوئیوں کی رفتار کے ساتھ مزید بدلتی جا رہی تھی اور اس رفتار کو روکنے کی ایک آخری کوشش کے لیے امریکہ کے صدر نے SIF کے سربراہ کو وہاں بلایا تھا۔

ایوان ہاکنز نے اندر داخل ہوتے ہوئے اپنے اس پرانے حریف کو ایک خیر مقدمی مسکراہٹ دینے کی کوشش کی جو اس کے استقبال کے لیے مؤدبانہ اور بے حد باوقار انداز میں کھڑا تھا۔ سیاست میں آنے سے پہلے ایوان ایک بڑے مالیاتی ادارے کا سربراہ رہ چکا تھا۔ سالار سکندر کے ساتھ اس کی سالوں پرانی واقفیت بھی تھی اور رقابت بھی۔ SIF نے امریکہ میں اپنی تاریخ کا پہلا بڑا انضمام اس کے ادارے کو کھا کر کیا تھا اور اس انضمام کے بعد ایوان کو اس کے عہدے سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ وہ آج امریکہ کا صدر تھا' لیکن وہ ناکامی اور بدنامی آج بھی اس کے ریکارڈ میں ایک داغ کے طور پر موجود تھی۔ یہ ایوان کی بدقسمتی تھی کہ اتنے سالوں کے بعد وہ اسی پرانے حریف کی مدد لینے پر ایک بار پھر مجبور ہوا تھا۔ وہ اس کے دورِ صدارت میں اسے دھول چٹانے آن پہنچا تھا۔ یہ اس کے احساسات تھے۔ سالار کے نہیں۔ وہ وہاں کسی اور ایجنڈے کے ساتھ آیا تھا' اس کا ذہن کہیں اور پھنسا ہوا تھا۔

"سالار سکندر۔" چہرے پر ایک گرم جوش مسکراہٹ کا نقاب چڑھائے' ایوان نے سالار کا استقبال تیز رفتاری سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے یوں کیا تھا' جیسے وہ حریف نہیں رہے تھے بہترین دوست تھے جو وائٹ ہاؤس میں نہیں کسی گالف کورس پر مل رہے تھے۔ سالار نے اس کی خیر مقدمی مسکراہٹ کا جواب اتنی ہی خوش دلی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے دیا تھا۔ دونوں کے درمیان رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا' موسم کے بارے میں ایک آدھ بات ہوئی' جو اچھا تھا اور اس کے بعد دونوں اپنی اپنی نشست سنبھال کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ ون آن ون ملاقات تھی۔ کمرے کے دروازے اب بند ہو چکے تھے اور وہاں ان دونوں کا اسٹاف نہیں تھا اور اس ون آن ون ملاقات کے بعد ان دونوں کی ایک مشترکہ پریس کانفرنس تھی جس کے لیے اس کمرے سے کچھ فاصلے پر ایک اور کمرے میں بیٹھے دنیا بھر کے صحافی بے تابی سے منتظر تھے۔

اس ملاقات سے پہلے ان دونوں کی ٹیم کے افراد کئی بار آپس میں مل چکے تھے۔ ایک فریم ورک وہ ڈسکس بھی کر چکے تھے اور تیار بھی۔ اب اس ملاقات کے بعد باضابطہ طور پر وہ دونوں وہ اعلان کرتے جس کی بھنک میڈیا کو پہلے ہی مل چکی تھی۔

امریکہ اب ورلڈ بینک کے ذریعے نہیں SIF کے ذریعے دنیا کے ترقی پذیر ممالک میں گھسنا چاہتا تھا۔ خاص طور پر افریقہ میں اور اس کے لیے وہ ورلڈ بینک سے باضابطہ علیحدگی اختیار کر رہا تھا۔ مگر اس کے سامنے مسئلہ صرف ایک تھا۔ امریکہ کا ایجنڈہ SIF کے ایجنڈے سے مختلف تھا اور اس ملاقات میں سالار سکندر کو غیر رسمی انداز میں ۔۔۔ آخری بار

ان امریکی مفادات کے تحفظ کی یاددہانی کروائی تھی۔ امریکہ SIF کی ٹیم کے بہت سارے مطالبات مان کر اس فریم ورک پر تیار ہوا تھا۔ یہ وہ امریکہ نہیں رہا تھا جو بندوق کی نوک پر کسی سے کچھ بھی کروا سکتا تھا۔ یہ انتشار کا شکار ایک کھوکھلا ہوتا ہوا ملک تھا جو بات سنتا تھا۔ مطالبات سنتا تھا اور اپنی پوزیشن سے پیچھے ہٹ جاتا تھا یا پھر آخری حربے کے طور پر اپنے مفادات کی خاطر وہ کرتا تھا جو اس بار بھی اس میٹنگ کے اچھے یا برے نتیجے کے ساتھ پہلے سے مشروط تھا۔

میٹنگ کا نتیجہ ویسا ہی نکلا تھا۔ جیسی ایوان کو توقع تھی۔ سالار سکندر کو SIF کے ایجنڈے کے حوالے سے کوئی ابہام نہیں تھا۔ نہ ہی امریکی حکومت کے ایجنڈے کے حوالے سے۔ وہ امریکی حکومت کی مدد کرنے پر تیار تھا۔ اس فریم ورک کے تحت جو اس کی ٹیم نے تیار کیا تھا۔ لیکن SIF کو امریکہ کا ترجمان بنانے پر تیار نہیں تھا۔ اس نے ایوان کی تجویز کو شکریہ کے ساتھ رد کر دیا تھا۔ وہ مگرمچھوں کے درمیان دشمنی ہو سکتی تھی 'دوستی نہیں'۔ مگر دشمنی کے ساتھ بھی وہ ایک ہی پانی میں رہ سکتے تھے۔ بڑے محتاط اور پرامن طریقے سے 'اپنی اپنی حدود میں' اور اس نے ایوان کو بھی یہی مشورہ دیا تھا جس سے ایوان نے اتفاق کیا تھا۔ سالار سکندر سے انہیں جیسے جواب کی توقع تھی انہیں ویسا ہی جواب ملا تھا۔

SIF کو اب ایک نئے سربراہ کی ضرورت تھی جو زیادہ لچک دار رویے کا حامل ہو اور زیادہ سمجھ دار بھی۔ سالار سکندر میں ان دونوں چیزوں کی اب کمی ہو گئی تھی۔ یہ ایوان کا اندازہ تھا۔

سی آئی اے کو SIF کے نئے سربراہ کے بارے میں تجاویز دینے سے پہلے SIF کے پرانے سربراہ کو ہٹانے کے لیے احکامات دیے گئے تھے اور یہ اس میٹنگ کے بعد ہوا تھا۔

اس سے پہلے ایوان نے سالار سکندر کے ساتھ اس پریس کانفرنس میں شرکت کی تھی جس میں امریکہ نے باقاعدہ طور پر ملک میں ہونے والے مالیاتی بحران سے نمٹنے کے لیے نہ صرف SIF کی مدد لینے کا فیصلہ کیا تھا بلکہ SIF کے ساتھ طے پانے والے اس فریم ورک کا بھی اعلان کیا تھا جس کی منظوری صدر نے بے حد دباؤ کے باوجود دے دی تھی۔

ایوان ہالکنز کو اس اعلان کے وقت ویسی ہی تضحیک محسوس ہو رہی تھی جتنی اس نے اس وقت محسوس کی تھی۔ جب اس کے مالیاتی ادارے کا انضمام SIF کے ساتھ ہوا تھا اور جس کے بعد وہ اپنے عہدے سے فارغ ہو گیا تھا۔ اسے یقین تھا تاریخ اس بار اپنے آپ کو کچھ مختلف طریقے سے دہرانے والی تھی۔ اس دفعہ اسکرین سے غائب ہونے والا اس کا پرانا حریف تھا' وہ نہیں۔



رئیسہ سالار کی زندگی پر اگر کوئی کتاب لکھنے بیٹھتا تو یہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ وہ خوش قسمت تھی۔ جس کی زندگی میں آتی تھی اس کی زندگی بدلنا شروع کر دیتی تھی۔ وہ جیسے پارس پتھر تھی جو اس سے چھو جاتا' سونا بننے لگتا تھا۔

سالار سکندر کے خاندان کا حصہ بننے کے بعد وہ ان کی زندگی میں بھی بہت ساری تبدیلیاں لے آئی تھی اور اب ہشام سے منسلک ہونے کے بعد اس کی زندگی کے اس خوش قسمتی کے دائرے نے ہشام کو بھی اپنے گھیرے میں لینا شروع کر دیا تھا۔

بحرین میں ہونے والے اس طیارے کے حادثے میں امیر سمیت شاہی خاندان کے جو افراد ہلاک ہوئے تھے وہ دراصل بحرین کی بادشاہت کے حق داروں کی ہلاکت تھی۔ پیچھے رہ جانے والا ولی عہد نوجوان 'ناتجربہ کار اور عوام سے بہت دور تھا اور اس حلقے میں بے حد ناپسندیدہ تھا جو امیر کا حلقہ تھا۔

ہشام کے باپ صباح بن جراح کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ وہ امیر اور شاہی خاندان کے افراد کی تدفین کی تقریبات میں شرکت کے لیے جب بحرین پہنچے گا تو بادشاہت کا ہما اس کے سر پر آن بیٹھے گا۔ بحرین کی کونسل کے ایک ہنگامی اجلاس میں ولی عہد کو برطرف کرتے ہوئے بادشاہت کے حق داروں کی فہرست میں بہت نیچے کے نمبر پر براجمان صباح کو اکثریتی تائید سے۔ بحرین کا نیا امیر نامزد کر دیا گیا تھا۔ اس عہدے پر اسے وقتی طور پر فائز کیا گیا تھا۔ مگر اگلے چند ہفتوں میں کونسل نے اس حوالے سے حتمی فیصلہ بھی کر دیا تھا۔ ولی عہد کی نامزدگی کونسل کے اگلے اجلاس تک کے لیے ملتوی کر دی گئی تھی۔

یہی وہ خبر تھی جو رئیسہ کو حمین نے سنائی تھی۔ خبر اتنی غیر متوقع اور ناقابل یقین تھی کہ رئیسہ کو بھی یقین نہیں آیا تھا۔

لیکن جب اسے یقین آیا تو وہ پر جوش ہو گئی۔
"اور اب بری خبر کیا ہے؟ وہ بھی سنا دو۔" اس نے حمین سے پوچھا تھا۔
"ہشام اور تمہاری شادی میں اب بہت ساری رکاوٹیں آئیں گی۔ صرف اس کے خاندان کی طرف سے نہیں پورے شاہی خاندان کی طرف سے۔" حمین نے بنا کسی تمہید کے کہا۔ وہ فکر مند ہونے کے باوجود خاموش ہو گئی تھی۔
ہشام سے اس کی ملاقات امریکہ واپسی کے دوسرے دن ہی ہو گئی تھی۔ وہ ویسا ہی تھا۔ بے فکر۔ لاپروا۔ اپنے باپ کے بدلے جانے والے اسٹیٹس کے بارے میں زیادہ دلچسپی نہ دکھاتا ہوا۔ اس کا خیال تھا اس کے باپ کو ملنے والا وہ عہدہ وقتی تھا۔ چند ہفتوں کے بعد کونسل اس کے باپ کی جگہ شاہی خاندان کے ان افراد میں سے کسی کو اس عہدے پر فائز کرے گی جو جانشینی کی دوڑ میں اس کے باپ سے اوپر کے نمبر پر تھے۔
"تم نے اپنی فیملی سے بات کی؟" اس نے چھوٹتے ہی رئیسہ سے وہی سوال کیا تھا جس کے حوالے سے وہ فکر مند تھی۔
"حمین سے بات ہوئی میری اور حمین نے پاپا سے بھی بات کی ہے لیکن پاپا کو ہمارے حوالے سے پہلے ہی کچھ اندازہ تھا۔ انہوں نے کہا ہے وہ مجھ سے اس ایشو پر آمنے سامنے بات کریں گے لیکن حمین تم سے ملنا چاہتا ہے۔"
رئیسہ نے اسے بتایا۔ حمین ہشام سے چند بار سرسری انداز میں پہلے بھی مل چکا تھا۔ لیکن یہ پہلی بار تھا کہ حمین نے خاص طور پر اس سے ملنے کی فرمائش کی تھی۔
"مل لیتا ہوں۔ میں تو اتنا مصروف نہیں رہتا' وہ رہتا ہے' تم اس سے پوچھ لو کہ کب ملنا چاہے گا۔" ہشام نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا تھا۔
"تمہاری فیملی کو میری ایڈاپشن کا پتا ہے؟" اس بار رئیسہ نے بالآخر اس سے وہ سوال کیا تھا جو بار بار اس کے ذہن میں آ رہا تھا۔
"نہیں۔ میری کبھی ان سے اس حوالے سے بات نہیں ہوئی۔ لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟" ہشام اس کی بات پر چونکا تھا۔
"انہیں اعتراض تو نہیں ہو گا کہ میں ایڈاپٹڈ ہوں۔"
"کیوں اعتراض ہو گا؟ میرا نہیں خیال کہ میرے پیرنٹس اتنے تنگ نظر ہیں کہ اس طرح کی باتوں پر اعتراض کریں گے۔" ہشام نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ "میں اپنے والدین کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"
حمین سے اس کی ملاقات دو ہفتے بعد طے ہوئی تھی مگر اس سے پہلے ہی ہشام کو ایک بار پھر ایمرجنسی میں بحرین بلا لیا گیا تھا۔ اس کے باپ کی کونسل نے متفقہ فیصلے سے امیر کے طور پر توثیق کر دی تھی اور ہشام بن صباح کو بحرین کا نیا ولی عہد نامزد کر دیا گیا تھا۔ ایک خصوصی طیارے کے ذریعے ہشام کو بحرین بلایا گیا تھا اور وہاں پہنچنے پر یہ خبر ملنے پر اس نے سب سے پہلے فون پر رئیسہ کو یہ اطلاع دی تھی۔ وہ بے حد خوش تھا۔ رئیسہ چاہتے ہوئے بھی خوش نہ ہو سکی۔ وہ ایک عام آدمی سے یک دم ایک "خاص آدمی" ہو گیا تھا۔ حمین کی باتیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔
ہشام بہت جلدی میں تھا۔ ان دونوں کے درمیان صرف ایک آدھ منٹ کی گفتگو ہو سکی تھی۔ فون بند ہونے کے بعد رئیسہ کے لیے سوچ کے بہت سارے در کھل گئے تھے۔ وہ پریوں کی کہانیوں پر یقین نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ اس نے جس فیملی میں پرورش پائی تھی وہاں کوئی پریوں کی کہانی نہیں تھی۔ وہاں اتفاقات اور انقلابات نہیں تھے۔ کیریئر' زندگیاں' نام' سب محنت سے بنائی جا رہی تھیں اور رئیسہ سالار کو اپنے سامنے نظر آنے والی وہ پریوں کی کہانی بھی ایک سراب لگ رہی تھی۔
وہ ایک عرب امریکن سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ ایک عرب بادشاہ سے نہیں۔ اسے آسائشات کی ہوس نہیں تھی اور اس کی زندگی کے مقاصد اور تھے۔ اور چند دن پہلے تک اس کے اور ہشام کی زندگی کے مقاصد ایک جیسے تھے۔ اب وہ لمحہ بھر میں ریل کی پٹڑی کے دو ٹریک نہیں رہے تھے۔ مخالف سمت میں جانے والا ایک دوسرا ٹریک ہو گئے تھے۔
وہ بہت غیر جذباتی ہو کر اب حمین کی اس گفتگو کو یاد کر رہی تھی جو اس نے ہشام کے حوالے سے کی تھی اور وہ تب کی تھی جب وہ ولی عہد نہیں بنا تھا۔ اسے اب جاننا تھا کہ حمین' ہشام کے بارے میں اب کیا سوچتا ہے۔

ہشام کے حوالے سے یہ خبر بھی حمین نے ہی اسے اسی رات دی تھی جب وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ ایک کانفرنس اٹینڈ کرنے کے لیے مانٹریال میں تھا۔

"میں جانتی ہوں۔" اس نے جواباً حمین کو ٹیکسٹ کیا۔

"مجھے تمہیں مبارک باد دینی چاہیے یا افسوس کرنا چاہیے؟" جواباً ٹیکسٹ آیا تھا۔ وہ اس کے مزاج سے واقف تھا۔ وہ مسکرا دی۔

"تمہاری رائے کیا ہے؟" اس نے جواباً پوچھا۔

"افسوس ناک خبر ہے۔"

"جانتی ہوں۔" اس نے حمین کے ٹیکسٹ پر اتفاق کیا۔

جواباً اس کی کال آنے لگی تھی۔

"اتنا بھی اپ سیٹ ہونے والی بات نہیں ہے۔" حمین نے ہیلو سنتے ہی بڑے خوش گوار لہجے میں اس سے کہا تھا۔ وہ اس کی آواز کا ہر انداز پہچانتا تھا۔

"میں اپ سیٹ تو نہیں ہوں... بس یہ سب غیر متوقع ہے اس لیے..." رئیسہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"میرے لیے غیر متوقع نہیں ہے یہ... مجھے اندازہ تھا اس کا۔" اس نے جواباً کہا تھا۔

"تو پھر اب...؟" رئیسہ نے ایک بار پھر ادھورے جملے میں اس سے مسئلے کا حل پوچھا۔

"ہم نے کہا تھا، تم اس پروپوزل کے حوالے سے بہت زیادہ جذباتی نہیں ہو۔" حمین نے اطمینان سے لمحے بھر میں تصویر کا سیاہ ترین پہلو اسے دکھایا۔ یعنی ہشام کو بھول جانے کا مشورہ دیا۔

"تم واقعی ایسا سوچ رہے ہو؟" رئیسہ کو جیسے یقین نہیں آیا۔ "تمہیں لگتا ہے میری اور اس کی شادی نہیں ہو سکتی؟"

"ہو سکتی ہے، لیکن اس کی شادی صرف تمہارے ساتھ ہو اور تمہارے ساتھ ہی رہے، یہ میرے لیے زیادہ بڑا مسئلہ ہے۔" "عرب بادشاہ "حرم" رکھتے ہیں۔" حمین نے اسے جتایا تھا۔ تصویر کا ایک اور رُخ اسے دکھایا جو اس نے ابھی دیکھنا شروع بھی نہیں کیا تھا۔

"میں جانتی ہوں۔" اس نے مدھم آواز میں کہا پھر اگلے ہی جملے میں جیسے اس کا دفاع کرنے کی کوشش کی "لیکن ہشام کے باپ نے شاہی خاندان کا حصہ ہوتے ہوئے بھی دوسری شادی کبھی نہیں کی۔"

"وہ امریکہ میں سفیر رہے ہیں... بادشاہ کبھی نہیں رہے۔" حمین نے ترکی بہ ترکی کہا۔ دونوں کے درمیان خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آیا۔

"So it's all over."

(تو پھر سب ختم)

اس نے بالآخر حمین سے پوچھا۔ حمین کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ پہلی محبت تھی جو اس نے کبھی نہیں کی تھی مگر اس نے پہلی محبت کا انجام بہت بار دیکھا تھا اور اب رئیسہ کو اس انجام سے دوچار ہوتے دیکھ کر اسے دلی تکلیف ہو رہی تھی۔

"تمہارا دل تو نہیں ٹوٹے گا؟" وہ بے حد فکر مند انداز میں اس سے پوچھ رہا تھا۔ رئیسہ کا دل بھر آیا۔

"ٹوٹے گا... لیکن میں برداشت کر لوں گی۔" رئیسہ نے بھرائی آواز میں اپنی آنکھوں میں آئی نمی پونچھتے ہوئے کہا۔

حمین کا دل اور پگھلا۔ "ساری دنیا میں تمہیں یہی ملا تھا۔" اس نے دانت پیستے ہوئے رئیسہ سے کہا تھا۔

"مسئلہ شادی نہیں ہے رئیسہ! مسئلہ آئندہ کی زندگی ہے۔ کوئی گارنٹی نہیں ہے اس رشتے میں۔" حمین نے ایک بار پھر اس کے ہتھیار ڈالنے کے باوجود جیسے اس کا دکھ کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ خاموش ہو گئی۔ کال ختم ہو گئی تھی۔ مگر ہشام نہ رئیسہ کے ذہن سے نکلا تھا نہ ہی حمین کے۔

اگلے دن کے اخبارات نہ صرف بحرین کے نئے امیر اور ولی عہد کی تصویروں اور خبروں سے بھرے ہوئے تھے بلکہ ان خبروں میں ایک خبر نئے ولی عہد ہشام بن صباح کی منگنی کی بھی تھی جو بحرین کے ہلاک ہونے والے امیر کی نواسی سے طے پا رہی تھی۔ وہ خبر حمین اور رئیسہ دونوں نے پڑھی تھی اور دونوں نے ایک دوسرے سے شیئر نہیں کی تھی۔

کوٹ اتارتے اور دروازے کے پیچھے لٹکاتے ہوئے۔ وہ لاؤنج میں سیدھا کچن ایریا کی طرف گئی کچھ بھی کہے بغیر اس نے ایک کیبنٹ کھول کر کافی کا جار نکال لیا تھا اور پھر پانی گرم کرنے لگی۔

جبریل لاؤنج میں کھڑا اس جگہ کا جائزہ لے رہا تھا جہاں آنے والا کوئی شخص بھی یہ جان جاتا کہ اس گھر میں ایک بچہ تھا جو اس گھر میں رہنے والوں کی زندگی کا محور تھا۔

لاؤنج میں بنے پلے ایریا میں اسفند کے کھلونے پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پر جگہ جگہ عائشہ اور اس کی تصویریں۔

جبریل نے نظر چرائی تھی۔ پتا نہیں اس guilt (احساسِ جرم) کو وہ کیا کہتا اور اس کا کیا کرتا جو بار بار عائشہ عابدین کے بچے کے حوالے سے اسے ہوتا تھا۔ اس نے مڑ کر عائشہ کو دیکھا تھا۔ وہ بے حد میکانیکی انداز میں اس کے لیے کافی کا ایک کپ تیار کر رہی تھی۔ یوں جیسے وہ کوئی ویٹرس تھی۔ پورے انہماک سے ایک ایک چیز کو ٹرے میں سجاتے اور رکھتے ہوئے باقی ہر چیز سے بے خبر۔ اس بات سے بھی کہ وہاں جبریل بھی تھا۔

وہ اب کافی کی ٹرے لے کر لاؤنج میں آ گئی تھی۔ سینٹر ٹیبل پر کافی کے ایک کپ کی ٹرے رکھتے ہوئے وہ کچھ کہے بغیر صوفہ پر بیٹھ کر اس سے پوچھنے لگی۔

"شوگر...؟"

"مجھے کافی کڑوی نہیں لگتی۔" جبریل اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا تھا۔

"کریم ملک۔" عائشہ نے شوگر پاٹ چھوڑ کر باقی دو چیزوں کے بارے میں پوچھا جو ٹرے میں رکھی ہوئی تھیں۔

"یہ بھی نہیں... مجھے کچھ دیر میں ہسپتال کے لیے نکلنا ہے۔" جبریل نے اب مزید کچھ کہے بغیر وہ کپ اٹھا لیا تھا جو عائشہ نے اس کی طرف بڑھایا تھا۔ اس نے بڑی خاموشی سے کافی پی۔ کپ دوبارہ میز پر رکھا اور پھر اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

"اسے آپ میرے جانے کے بعد کھولیں... پھر اگر کوئی سوال ہو تو میرا نمبر یہ ہے۔"

اس نے کھڑے ہوتے ہوئے جیب سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میز پر اسی لفافے کے پاس رکھ دیا۔

"حالانکہ میں جانتا ہوں آپ سوال نہیں کرتیں... مجھے فون بھی نہیں کریں گی۔ اس کے باوجود مجھے اسے پڑھنے کے بعد آپ کے کسی سوال کا انتظار رہے گا۔"

عائشہ نے خاموشی سے میز پر پڑے اس لفافے اور کارڈ کو دیکھا پھر سر اٹھا کر کھڑے جبریل کو۔ دنیا میں ایسی تمیز اور تہذیب والے مرد کہاں پائے جاتے ہیں۔ اس نے سامنے کھڑے مرد کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا اور اگر پائے جاتے تھے تو ان میں سے کوئی اس کا نصیب کیوں نہیں بنا تھا... وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

جبریل کو اپارٹمنٹ کے دروازے پر چھوڑ کر آنے کے بعد اس نے اپنے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے جھانک کر پارکنگ کو دیکھا جہاں وہ ابھی کچھ دیر میں نمودار ہوتا اور پھر وہ نمودار ہوا تھا اور وہ تب تک اسے دیکھتی رہی جب تک وہ گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چلا نہیں گیا۔

پھر وہ میز پر پڑے اس لفافے کی طرف آئی تھی۔ اس سفید لفافے کو اس نے اٹھا کر دیکھا جس پر اس کا نام جبریل کی خوب صورت طرزِ تحریر میں لکھا ہوا تھا۔

"مس عائشہ عابدین۔"

پھر اس نے لفافے کو کھول لیا۔



کاغذ کی اس چٹ پر احسن سعد کا نام اور فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ ریسپشن سے جبریل کو بتایا گیا تھا کہ وہ شخص کئی بار اسے کال کر چکا تھا اور ایمرجنسی میں اس سے بات کرنا یا ملنا چاہتا تھا۔ جبریل اس وقت چھ گھنٹے آپریشن تھیٹر میں گزارنے کے بعد بے حد تھکا ہوا گھر جانے کے لیے نکل رہا تھا جب یہ چٹ اس کے حوالے کی گئی تھی۔ اس چٹ پر اس کے لیے ایک میسج بھی تھا۔

ٹیلی اسکوپ سے اس نے ایک بار پھر اس بینکوئٹ ہال کی کھڑکی سے اندر نظر ڈالی۔ ہال میں سیکیورٹی کے لوگ اپنی اپنی

جگہوں پر مستعد تھے۔ کیٹرنگ اسٹاف بھی اپنی اپنی جگہ پر تھا۔ اس بینکوئٹ ہال کا داخلی دروازہ اس قد آدم کھڑکی کے بالکل سامنے تھا جس کھڑکی کے بالمقابل ساٹھ فٹ چوڑی 'دو رویہ' مرکزی سڑک کے پار ایک عمارت کی تیسری منزل کے ایک اپارٹمنٹ میں وہ موجود تھا۔ اس اپارٹمنٹ کے بیڈ روم کی کھڑکی کے سامنے ایک کرسی رکھے وہ ایک جدید اسنائپر رائفل کی ٹیلی اسکوپک سائٹ سے کھڑکی کے پردے میں موجود ایک چھوٹے سے سوراخ سے اس بینکوئٹ ہال میں جھانک رہا تھا۔ بینکوئٹ ہال کا داخلی دروازہ کھلا ہوا تھا اور کوریڈور میں استقبالی قطار اپنی پوزیشن لے چکی تھی۔ اس کی گھڑی میں نو بجے تھے۔ مہمان نو بج کر پندرہ منٹ پر اس کوریڈور میں داخل ہونے والا تھا اور تقریباً" ایک گھنٹہ اور پندرہ منٹ وہاں گزارنے کے بعد وہ وہاں سے جانے والا تھا۔ مہمان کے اس ہوٹل میں پہنچنے سے لے کر اس کی روانگی کے بعد تک تقریباً" ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے ہر طرح کا مواصلاتی رابطہ جام ہونے والا تھا۔

سیکیورٹی کے ہائی الرٹ کی وجہ سے تھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے وہاں سیل فون اور متعلقہ کوئی ڈیوائسز کام نہیں کر سکتی تھیں لیکن وہ ایک پروفیشنل ٹارگٹ کلر تھا۔ اس سے پہلے بھی اسی طرح کے ہائی الرٹس میں کامیابی سے کام کرتا رہا تھا۔ اس کو ہائر کرنے کی وجہ بھی اس کی کامیابی کا تناسب تھا جو تقریباً" سو فیصد تھا وہ صرف دو افراد کو مارنے میں ناکام رہا تھا اور اس کی وجہ اس کے نزدیک اس کی بری قسمت تھی۔ پہلی بار اس کی رائفل لاسٹ سیکنڈز میں اس اسٹینڈ سے مل گئی تھی جس پر وہ رکھی تھی اور دوسری بار۔۔۔ خیر دوسری بار کا قصہ طویل تھا۔

وہ پچھلے دو مہینے سے اس اپارٹمنٹ میں رہ رہا تھا۔ اس دن سے تقریباً" ایک مہینہ پہلے سے جب یہ ہوٹل اس بینکوئٹ کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ جنہوں نے اسے اس اہم کام کیلئے ہائر کیا تھا اس تقریب کے لیے اس ہوٹل اور اس کے اس بینکوئٹ ہال کا انتخاب کرنے والے بھی وہی تھے۔

اس "مہمان" کو ختم کرنے کا فیصلہ چار ماہ پہلے ہوا تھا۔ وقت، جگہ اور قاتل کا انتخاب بے حد ماہرانہ طریقے سے بڑے غور و خوض کے بعد کیا گیا تھا۔ اس مہمان کی سال بھر کی مکمل مصروفیات کے شیڈول میں سے مقام 'ملک' اور ممکنہ قاتلوں کے نام شارٹ لسٹ کیے گئے تھے پھر ہر جگہ اور تاریخ پر ہونے والے اس حادثے کے اثرات پر سیر حاصل بحث کی گئی تھی۔ فوری اثرات اور اس سے نمٹنے کی حکمت عملی پر بات کی گئی تھی۔ ممکنہ رد عمل کے نقصانات سے بچنے کے لیے منصوبے تیار کیے گئے تھے۔ قاتلانہ حملے کے ناکام ہونے کی صورت میں ہونے والے ممکنہ رد عمل اور نقصانات پر غور کیا گیا تھا اور ہر میٹنگ کے بعد کام کی جگہیں اور تاریخیں بدلتی رہتی تھیں لیکن قاتل ایک ہی رہا تھا کیونکہ وہ موزوں ترین تھا۔

اس شہر میں اس تاریخ پر اس تقریب کے لیے سیکیورٹی کی وجوہات کے باعث تین مختلف ہوٹلز کا نام لسٹ میں رکھا گیا تھا لیکن اسے ہائر کرنے والے جانتے تھے کہ تقریب کہاں ہوگی۔

اس کو دو ماہ پہلے ہی اس اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر ستائیس سالہ لڑکی سے دوستی کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس لڑکی کے چار سالہ پرانے بوائے فرینڈ سے بریک اپ (تعلقات ختم کرنے) کے لیے ایک پروفیشنل کال گرل کا استعمال کیا گیا تھا جو اس کے کار ڈیلر بوائے فرینڈ سے ایک کار خریدنے کے بہانے ملی تھی اور اسے ایک ڈرنک کی آفر کر کے ایک موٹیل لے گئی تھی۔

اس کال گرل کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کی ریکارڈنگ دوسرے دن اس لڑکی کو میل میں موصول ہوئی تھی۔ اس کا بوائے فرینڈ نشے میں تھا۔ اسے پھنسایا گیا تھا اور یہ سب ایک غلطی تھی۔ اس کے بوائے فرینڈ کی کوئی تاویل اس کے غصے اور رنج کو کم نہیں کر سکی تھی۔ اس کی گرل فرینڈ کے لیے یہ بات اس لیے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ زیادہ ناقابل برداشت تھی کیونکہ وہ تین ہفتے میں شادی کرنے والے تھے۔ اس نے اپنے بوائے فرینڈ کا سامان گھر کے دروازے سے باہر نہیں پھینکا تھا اپنے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے باہر پھینکا تھا۔

سڑک پر بکھرے سامان کو اکٹھا کرتے ہوئے خود کو اور اس کال گرل کو کوستے ہوئے بھی اس کا بوائے فرینڈ یہ سوچ رہا تھا کہ چند ہفتوں میں اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور وہ دونوں دوبارہ اکٹھے ہو جائیں گے۔ جنہوں نے ان کا تعلق ختم کروایا تھا انہیں اس بات کا اندیشہ بھی تھا۔ چنانچہ معاملات کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے اس لڑکے کے کمپیوٹر کو ہیک کیا گیا تھا۔ اس کی اور اس کی گرل فرینڈ کی بے حد قابل اعتراض تصویروں کو اس کی ای میل آئی ڈی کے ساتھ بہت ساری ویب سائٹس پر اپ لوڈ کر دیا گیا تھا۔

یہ جیسے تابوت میں آخری کیل تھی۔ اس لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ کی ای میل آئی ڈی سے بھیجا ہوا پیغام پڑھا تھا جس میں لکھا تھا کہ اس نے اپنے بریک اپ کے بعد اس کی ساری پکچرز کو قابل اعتراض ویب سائٹس پر اپ لوڈ کر دیا تھا۔ اس کی گرل فرینڈ نے پہلے وہ لنکس کھول کر دیکھے تھے پھر اپنے بوائے فرینڈ کی اس کال گرل کے ساتھ ویڈیو کو اپ لوڈ کیا تھا اور اس کے بعد اپنے سابقہ بوائے فرینڈ کو اس کے شوروم میں جا کر اس کے کسٹمرز کے سامنے اس وقت پیٹا تھا جب وہ انہیں ایک جدید ماڈل کی گاڑی بیچنے میں تقریباً "کامیاب" ہو چکا تھا۔

"Happy Families Drive this car"

(یہ گاڑی خوش باش لوگ چلاتے ہیں) اس نے تقریباً "ایک کم چھپن بار" یہ جملہ اس جوڑے کے سامنے دہرایا تھا جو ٹیسٹ ڈرائیو کے لیے وہاں موجود تھے اور اس کے ساتھ اس نے ایک سو چھپن بار یہ جھوٹ بھی بولا تھا کہ کس طرح خود بھی اس کار کو ذاتی استعمال میں رکھنے کی وجہ سے اس کا اور اس کی گرل فرینڈ کا تعلق مضبوط ہوا تھا۔ اس کے بوائے فرینڈ کو مار کھانے پر اتنا شاک نہیں لگا تھا۔ چار سالہ کورٹ شپ کے دوران وہ اپنی گرل فرینڈ کے ہاتھوں اس شہر کی تقریباً "ہر مشہور" پبلک پلیس پر پٹ چکا تھا اور یہ تو بہر حال اس کا اپنا شوروم تھا۔ جتنا اسے اپنی گرل فرینڈ کا الزام سن کر شاک لگا تھا۔

اس کے چیخنے چلانے اور صفائیاں دینے کے باوجود اس کی گرل فرینڈ کو یقین تھا کہ اس نے شراب کے نشے میں یہ حرکت کی ہوگی ورنہ اس کے ذاتی لیپ ٹاپ میں موجود تصویریں اس کے ای میل ایڈریس کے ساتھ کون اپ لوڈ کر سکتا تھا۔

اس بریک اپ کے ایک ہفتے کے بعد وہ نائٹ کلب میں اس سے ملا تھا۔ چند دن ان کی ملاقاتیں یوں ہی بے مقصد انداز میں ہوتی رہی تھیں۔

وہ میڈیکل ٹیکنیشن تھی اور اس نے اپنا تعارف پینٹر کے طور پر کرایا تھا۔ وہ ہر بار اس لڑکی کے ڈرنکس کی قیمت خود ادا کرتا رہا تھا۔ چند دن کی ملاقاتوں کے بعد اس نے اسے گھر مدعو کیا تھا اور اس کے بعد وہاں اس کا آنا جانا زیادہ ہونے لگا تھا۔ وہ اس بلڈنگ کے افراد کو — روزانہ کا ملاقاتی ہونے کا تاثر دینا چاہتا تھا اور دو ماہ کے اس عرصہ کے دوران وہ اس اپارٹمنٹ کی دوسری چابی بنوا چکا تھا اور ایک ہفتہ پہلے وہ اس لڑکی کی عدم موجودگی میں اس کے اپارٹمنٹ پر وہ اسنائپر رائفل اور کچھ دوسری چیزیں بھی منتقل کر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا اس تقریب سے ایک ہفتہ پہلے اس علاقے کی تمام عمارتوں پر سیکیورٹی چیک ہوگا۔ وہ تب ایسا کوئی بیگ سکریننگ کے بغیر عمارت میں منتقل نہیں کر سکے گا اور اس وقت بھی اس علاقے کی تمام عمارات بے حد سخت سیکیورٹی میں تھیں۔ وہ ایک ریگولر وزیٹر نہ ہوتا تو اس وقت اس بلڈنگ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

اس بلڈنگ سے پچاس میل دور اس کی گرل فرینڈ کو ہسپتال میں کسی ایمرجنسی کی وجہ سے روک لیا گیا تھا ورنہ وہ اس وقت اپنے اپارٹمنٹ میں ہوتی۔ پارکنگ میں کھڑی اس کی کار کے چاروں ٹائرز پنکچرڈ تھے اور اگر وہ ان دونوں رکاوٹوں سے کسی نہ کسی طرح بچ کر پھر بھی گھر روانہ ہو جاتی تو راستے میں اس کو روکنے کے لیے کچھ اور بھی انتظامات کیے گئے تھے۔

نو بج کر تیرہ منٹ ہو رہے تھے۔ وہ اپنی رائفل کے ساتھ مہمان کے استقبال کے لیے بالکل تیار تھا۔ جس کھڑکی کے سامنے وہ تھا وہ کھڑکی بلٹ پروف شیشے سے بنی ہوئی تھی۔ ڈبل لیئرڈ بلٹ پروف شیشہ......

یہی وجہ تھی کہ ان کھڑکیوں کے آگے سیکیورٹی اہلکار تعینات نہیں تھے۔ تعینات ہوتے تو اسے یقیناً "نشانہ باندھنے" میں دقت ہوتی لیکن اس وقت اسے پہلی بار یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اس سے پہلے کسی کو مارنے کے لیے اتنی شاندار سہولیات نہیں ملی تھیں۔ مہمان کو کوریڈور میں چلتے ہوئے آنا تھا۔ ایلیویٹر سے نکل کر کوریڈور میں چلتے ہوئے بینکوئٹ ہال کے داخلی دروازے تک اس مہمان کو شوٹ کرنے کے لیے اس کے پاس پورے دو منٹ کا وقت تھا۔ ایک بار وہ اپنی بینکوئٹ ہال کی ٹیبل کی طرف چلا جاتا تو اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا لیکن دو منٹ کا وقت اس جیسے پروفیشنل کے لیے دو گھنٹے کے برابر تھا۔

اس بینکوئٹ ہال کی کھڑکیاں بلٹ پروف تھیں صرف اس کھڑکی کے سوا جس کے سامنے وہ تھا۔ تین ہفتے پہلے بظاہر ایک اتفاقی حادثے میں اس کھڑکی کا شیشہ توڑا گیا تھا۔ اسے تبدیل کروانے میں ایک ہفتہ لگا تھا۔ اور تبدیل کیا جانے والا شیشہ ناقص تھا۔ یہ صرف وہی لوگ جانتے تھے جنہوں نے یہ منصوبہ بندی کی تھی۔

اسٹیج تیار تھا اور اس پر وہ فنکار آنے والا تھا جس کے لیے یہ ڈراما تیار کیا جا رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

جبریل نے ٹیبل کے دوسری طرف بیٹھے ہوئے شخص کو بغور دیکھا۔ وہ اس سے چند سال بڑا لگتا تھا۔ ایک بے حد مناسب شکل و صورت کا بے حد سنجیدہ نظر آنے والا مرد جو کلین شیوڈ تھا۔ حالانکہ جبریل کے ذہن میں اس کا جو خاکہ تھا' وہ ایک داڑھی والے مرد کا تھا۔

ویٹران کے سامنے کافی رکھ کر چلا گیا تو احسن سعد نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"میرے بارے میں آپ یقیناً" بہت کچھ سن چکے ہوں گے میری سابقہ بیوی سے۔" اس کے لہجے میں ایک عجیب سی تحقیر اور یقین تھا' اور ساتھ ہونٹوں پر ابھر آنے والی ایک طنزیہ مسکراہٹ بھی۔ جبریل نے کچھ ایسا ہی جملہ اس میسج میں پڑھا تھا جو احسن سعد نے فون کالز پر اس سے رابطہ کرنے پر ناکامی پر اس کے لیے چھوڑا تھا۔

"مجھے اپنی سابقہ بیوی کے بارے میں تمہیں کچھ بتانا ہے۔"

چھ گھنٹے آپریشن تھیٹر میں کھڑے رہنے کے بعد اس کاغذ پر لکھی وہ تحریر پڑھتے ہی جبریل کا دماغ پل بھر کے لیے گھوم کر رہ گیا تھا۔ جس ریسپشنسٹ نے ڈاکٹر احسن سعد کا وہ پیغام جبریل سکندر کے لیے نوٹ کیا تھا اس نے وہ چٹ جبریل کو دیتے ہوئے بے حد عجیب نظروں سے اسے دیکھا تھا' وہ ایک بے حد اہانت آمیز فقرہ تھا اور اسے پڑھتے اور سنتے دیکھ کر کوئی بھی جبریل سکندر کے حوالے سے عجیب سے احساسات کا شکار ہوتا اس کے باوجود کہ اس اسپتال میں جبریل بے حد "صاف ستھرا ریکارڈ" رکھنے والے چند نوجوان ڈاکٹرز میں سے ایک تھا۔

"آر یو شیور دس از فار می (آپ کو یقین ہے کہ یہ میرے لیے ہے)" جبریل ایک پاکستانی نام دیکھنے کے باوجود اس پیغام کو پڑھ کر اس ریسپشنسٹ سے پوچھے بغیر رہ نہیں سکا' نہ وہ احسن سعد کو جانتا تھا نہ کسی سابقہ بیوی کو۔ اور یہ شخص اس سے ایمرجنسی میں ملنا چاہتا تھا۔ اسے لگا کوئی غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔

"اوہ آیا آئی ایم پریٹی شیور!" اس ریسپشنسٹ نے جواباً" کہا۔

جبریل الجھے ذہن کے ساتھ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے گیا تھا اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اس نے وہیں کھڑے کھڑے احسن سعد کے اس نمبر پر کال کی جو اس چٹ پر لکھا ہوا تھا پہلی ہی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ یوں جیسے وہ اسی کے انتظار میں تھا اور جبریل کے کچھ کہنے سے پہلے اس نے جبریل کا نام لیا۔ ایک لمحہ کے توقف کے بعد جبریل نے یس کہا۔

"مجھے آپ سے فوری طور پر ملنا ہے' میں کچھ دن کے لیے یہاں ہوں اور پھر چلا جاؤں گا۔" احسن سعد نے جلدی سے کہا۔

"مگر آپ مجھ سے کس سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں؟ میں آپ کو نہیں جانتا۔"

چٹ کے اس پیغام کے باوجود جبریل پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

"میں عائشہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" احسن سعد کے جملے پر جبریل کا ذہن بھک سے اڑ گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عائشہ کا شوہر اس سے رابطہ کرے گا۔ اس نے احسن سعد کا نام نہ نساء سے سنا تھا نہ ہی عائشہ سے اور نہ ہی اسفند کی تدفین کے موقع پر کسی سے' جہاں وہ دس پندرہ منٹ رک کر نساء اور ڈاکٹر نورین سے ہی تعزیت کر کے آیا تھا۔ اگر احسن سعد وہاں تھا بھی تو ان دونوں کی ملاقات نہیں ہوئی تھی' اور اب یک دم بیٹھے بٹھائے وہ نہ صرف اس کو کال ۔۔۔ کر رہا تھا' بلکہ کال کر کے وہ بات بھی عائشہ ہی کے بارے میں کرنا چاہتا تھا لیکن کیا بات ۔۔۔؟

"عائشہ عابدین؟" جبریل نے بڑے محتاط لہجہ میں اس سے پوچھا' اس بار یہ یقین ہونے کے باوجود کہ وہ عائشہ عابدین ہی کا شوہر ہو سکتا تھا' اس کو فوری طور پر کوئی اور "عائشہ" یاد نہیں آئی تھی جس کا شوہر اس سے رابطہ کرنے کی ضرورت محسوس کرتا اور رابطہ کرنے کی ضرورت تو یقیناً" اسے عائشہ کے شوہر سے بھی متوقع نہیں تھی۔

"ہاں۔۔۔ ڈاکٹر عائشہ عابدین۔" دوسری طرف سے احسن سعد نے بڑے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔
"میں یہ سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ مجھ سے ملنا کیوں چاہ رہے ہیں؟" جبریل کہے بغیر نہیں رہ سکا۔ "میں آپ کو ٹھیک سے جانتا بھی نہیں۔"
"آپ مجھے ٹھیک سے نہیں جانتے لیکن میری سابقہ بیوی کو ضرورت سے زیادہ جانتے ہیں' اسی لیے اسے وکیل فراہم کر رہے ہیں۔۔۔ اس کی ضمانت کروا رہے ہیں۔"
جبریل خاموش رہا۔ احسن سعد کے طنز میں صرف تحقیر نہیں تھی۔ "باخبری" بھی تھی۔ وہ مکمل معلومات رکھنے کے بعد ہی اس سے رابطہ کر رہا تھا۔
"میں آپ کے اسپتال سے زیادہ دور نہیں ہوں۔۔۔ اور میں زیادہ وقت بھی نہیں لوں گا آپ کا کیونکہ آپ بھی مصروف ہیں اور فالتو وقت میرے پاس بھی نہیں ہے۔۔۔ لیکن آپ سے ملنا اس لیے ضروری ہے کیونکہ ایک مسلمان کے طور پر میں آپ کو اس خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں جس کا اندازہ آپ کو نہیں ہے اور چاہتا ہوں آپ وہ غلطی نہ کریں' جو میں نے کی ہے۔"
احسن سعد بہت لمبی بات کر رہا تھا اس کی بات سنتے ہوئے جبریل نے سوچا مگر وہ اس کی بات سننے سے بھی پہلے اس سے ملنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ احسن سعد سے مل کر اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ عائشہ کے خلاف وہ کیس واپس لے لے جو اس نے فائل کیا تھا۔ اس وقت احسن سعد کے ساتھ ملنے کی جگہ طے کرتے ہوئے اسے یقین تھا کہ وہ اس شخص کو سمجھا لے گا' اس کے باوجود کہ اس نے نساء سے اس کے بارے میں بے حد خوف ناک باتیں سنی تھیں۔ اس کے باوجود کہ اس نے عائشہ عابدین کی وہ حالت دیکھی تھی مگر کہیں نہ کہیں جبریل سکندر اسے ایک خراب شادی اور خراب سے زیادہ بے جوڑ شادی ہی سمجھتا رہا تھا جس میں ہونے والی غلطیاں ایک طرفہ نہیں ہو سکتی تھیں۔ کہیں نہ کہیں ایک مرد کے طور پر اس کا یہ خیال تھا کہ ساری غلطیاں احسن سعد کی نہیں ہو سکتیں' کچھ خامیاں عائشہ عابدین میں بھی ہوں گی۔۔۔ کہیں نہ کہیں جبریل سکندر یہ جاننے کے بعد کہ احسن سعد کی فیملی بے حد مذہبی تھی' ان کا طرف دار تھا۔ اس کا خیال نہیں اسے یقین تھا کہ وہ اتنے سخت نہیں ہو سکتے جتنا اس نے ان کے بارے میں سنا تھا۔ کہیں نہ کہیں وہ طرف داری اس حافظ قرآن کے لیے بھی رکھتا تھا جو اس کی طرح قرآن جیسی متبرک شے کو اپنے سینے اور ذہن میں رکھتا تھا۔ وہ یہ ماننے پر تیار نہیں تھا کہ جس دل میں قرآن محفوظ کیا گیا ہے' وہ اتنا سخت اور بے رحم ہو سکتا ہے۔ اسے یقین تھا جو بھی کچھ تھا اس میں غلط فہمیوں کا زیادہ قصور ہو گا' بری نیت اور اعمال کی نسبت اور وہ اسی خیال کے ساتھ احسن سعد سے ملنے آیا تھا' اس یقین کے ساتھ کہ وہ اسے سمجھا لے گا اور اس جھگڑے کو ختم کروا دے گا اور احسن سعد سے مصافحہ کرنے' کافی پینے کے لیے اس میز پر بیٹھنے تک اس کا یہ یقین قائم رہا تھا' جو احسن سعد کی گفتگو کے آغاز کے ساتھ ہی ہوا ہونا شروع ہو گیا تھا۔
"عائشہ نے کبھی مجھ سے آپ کے حوالے سے بات نہیں کی۔"
جبریل نے اس پر نظریں جمائے نرم لہجے میں کہا۔ احسن سعد قہقہہ مار کر ہنسا۔ جبریل اپنی بات مکمل نہیں کر سکا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی گفتگو میں ہنسنے والی کیا بات تھی۔
"میں نہ تو بے وقوف ہوں' نہ ہی بچہ۔" اس نے اپنے قہقہے کے اختتام پر جبریل سے کہا۔
"مجھے یقین ہے کہ تم بے وقوف ہو اور نہ ہی بچے اور نہ میں ایسا سمجھتا ہوں۔" جبریل نے جواباً بڑے محتاط انداز میں کہا۔
"تو پھر مجھ سے بچوں جیسا برتاؤ نہ کرو۔" احسن سعد نے ایک بار پھر اس کی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ اس کی آواز اب بلند تھی' ماتھے پر بل اور ہونٹ بھینچے ہوئے۔۔۔ اس نے کافی کے اس کپ کو ہاتھ سے دور دھکیل دیا

تھا جس سے کچھ دیر پہلے اس نے ایک گھونٹ لیا تھا۔ کافی چھلک کر میز پر گری تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ اب مٹھیوں کی شکل میں بھنچے ہوئے میز پر تھے، لمحوں میں احسن سعد نے کسی گرگٹ کی طرح رنگ بدلا تھا۔ وہ اب شدید غصے میں نظر آرہا تھا اور جبریل کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان چند جملوں میں جن کا تبادلہ ان کے درمیان ہوا تھا، ایسا کیا تھا جس نے اسے ایسا غضب ناک کر دیا۔

"تم اس عورت کے Guaranter (ضامن) بنے ہوئے ہو اور تم مجھ سے یہ کہہ رہے ہو کہ اس نے تم سے میرے بارے میں کبھی کچھ نہیں کہا۔" اس کی آواز اب پہلے سے بھی زیادہ بلند ہو گئی تھی۔ آس پاس کی میزوں پر بیٹھے لوگوں نے گردنیں موڑ کر ان کو دیکھا۔ جبریل نے ایک نظر اطراف میں مڑتی گردنوں کو دیکھا پھر بے حد سرد مہری سے اس سے کہا۔

"اگر تم اس آواز اور انداز میں مجھ سے بات کرنا چاہتے ہو تو میں یہاں ایک منٹ بھی مزید ضائع نہیں کرنا چاہوں گا۔" جبریل نے کہتے ہوئے ایک ہاتھ سے اپنا والٹ جیب سے نکالا اور دوسرے ہاتھ کو فضا میں ذرا سا بلند کر کے ویٹر کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اسے بل لانے کا اشارہ کیا۔ احسن سعد کو یک دم ہی احساس ہوا، وہ سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو غلط طریقے سے ہینڈل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں اپنے بیٹے کے قتل کی وجہ سے اس قدر فرسٹریٹڈ ہوں کہ... آئی ایم سوری۔" وہ اگلے ہی لمحے گرگٹ کی طرح ایک بار پھر رنگ بدل گیا تھا۔ اب اس کی آواز ہلکی تھی۔ بھنچی ہوئی مٹھیاں ڈھیلی پڑ چکی تھیں اور وہ ایک ہاتھ سے اپنا ماتھا اور کنپٹیاں رگڑ رہا تھا۔ جبریل نے اس تبدیلی کو بھی اتنی ہی باریکی سے دیکھا تھا جتنی باریکی سے اس نے پہلی تبدیلی دیکھی تھی اور اس نے احسن سعد کی معذرت کو قبول کیا تھا۔

"تم میرے مسلمان بھائی ہو اور میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس دھوکے سے بچاؤں جو میں نے کھایا۔" اس کا اگلا جملہ جبریل کے سر کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ احسن سعد اب بے حد نرم اور دھیمے انداز میں بات کر رہا تھا، بے حد شائستگی کے ساتھ... جبریل نے ٹوکے بغیر اسے بات کرنے دی۔

"میری بیوی ایک بدکردار عورت ہے... جس طرح اس نے تمہیں الو بنایا ہے اپنی مظلومیت استعمال کر کے، اسی طرح تم سے پہلے درجنوں کو بنا چکی ہے۔ وہ کسی بھی مرد کو منٹوں میں اپنی مٹھی میں کر کے انگلیوں پر نچا سکتی ہے۔" اس کے لہجے میں عائشہ کے لیے اتنا زہر موجود تھا کہ جبریل دم بخود رہ گیا تھا۔ وہ جن لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا وہاں طلاق بھی ہوتی تھی، بریک اپ بھی مگر کوئی اپنی بیوی کے بارے میں اس طرح کی گفتگو نہیں کرتا تھا جس طرح کی گفتگو احسن کر رہا تھا۔

"میرا عائشہ کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا اور میں سمجھ نہیں پا رہا کہ تمہاری باتوں کو الزامات سمجھوں یا غلط فہمی؟" جبریل مداخلت کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"یہ حقائق ہیں۔" احسن نے جواباً کہا۔

"جو بھی ہے مجھے ان میں دلچسپی نہیں۔ عائشہ ایک بہت اچھی لڑکی ہے اور میں نے صرف اس لیے اس کی مدد کی کیونکہ اس کی بہن میری کلاس فیلو تھی۔" احسن نے اس کی بات کاٹی "تم اس کی بہن کو جانتے ہو گے اس عورت کو نہیں... اس فاحشہ اور حرافہ کو نہیں..."

"زبان کو لگام دو..." جبریل کا چہرہ اور کانوں کی لویں بیک وقت سرخ ہوئی تھیں، وہ احسن سے اس طرح کے الفاظ کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"تم اگر اس عورت کو جانتے ہوتے تو تمہیں ان الفاظ پر کبھی اعتراض نہ ہوتا۔ وہ اس سے زیادہ گندے الفاظ کی مستحق ہے۔" احسن کی زبان ویسے ہی چلتی رہی تھی۔

"وہ تمہاری بیوی رہ چکی ہے' تمہارے ایک بچے کی ماں ہے' وہ کم از کم تم سے یہ الفاظ ڈیزرو نہیں کرتی.... بیوی بری ہو سکتی ہے' ماں بھی.... مگر عورت کی عزت ہوتی ہے نا.... اتنی عزت تو دکھاؤ اس کے لیے۔" جبریل بے حد ٹھنڈے مزاج کا تھا' لیکن جو "گفتگو" وہ سن رہا تھا وہ اس جیسے ٹھنڈے مزاج کے شخص کو کھولانے کے لیے بھی کافی تھی۔

"جو عورت بیوی رہ چکی ہو' اس کی کیا عزت؟" احسن سعد نے جواب نہیں دیا تھا' اپنی ذہنیت کو اس کے سامنے ننگا کر کے رکھ دیا تھا۔

"Then I Pity on You" مجھے تم پر ترس آرہا ہے۔

اور اس عورت پر بھی جو تمہاری بیوی رہی۔" جبریل نے بے حد سرد لہجے میں اس سے کہا تھا' اسے اندازہ ہو گیا تھا وہ غلط شخص کو سمجھانے بیٹھا تھا۔

"اس سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں پھر تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے؟" احسن سعد نے جواباً اسے ایک جھلسانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔ "تم اسے جانتے ہی کتنا ہو کر ایک شوہر کی رائے کو رد کر رہے ہو؟"

"میں اسے سولہ سال کی عمر سے جانتا ہوں' اسے بھی.... اس کی فیملی کو بھی.... اور وہ ایک بہت اچھی لڑکی تھی اور ہے....."

احسن سعد کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزرا تھا۔

"سو آئی واز رائٹ اٹ واز این اولڈ افیئر۔" (اس کا مطلب ہے میں ٹھیک سمجھا تھا یہ ایک پرانا افیئر ہے)

"شٹ اپ یو آر سک۔" (بکواس بند کرو پاگل ہو تم)

جبریل کو اب اپنے سر میں درد محسوس ہونے لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ تھوڑی ہی دیر میں احسن سعد کے ساتھ اسی کی طرح گالم گلوچ پر اتر آئے گا..... وہ شخص کسی کو بھی مشتعل کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا' وہ کسی کو بھی پاگل کر سکتا تھا۔

"تم مجھ سے کس لیے ملنے آئے ہو؟" جبریل نے اس بل جیکٹ کے اندر بل کی رقم رکھتے ہوئے بے حد بے زاری سے کہا جو ویٹر بہت پہلے رکھ کر گیا تھا' یہ جیسے احسن سعد کے لیے اشارہ تھا کہ وہ وہاں سے جانا چاہتا ہے۔

"میں تمہیں صرف اس عورت کے بارے میں بتانے آیا تھا کہ....." جبریل نے بے حد درشتی سے اس کی بات کاٹی "اور میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں اس کے یا اس کے کردار کے بارے میں کچھ بھی سننے میں.... بالکل بھی انٹرسٹڈ نہیں ہوں کیونکہ وہ کیا ہے' کیسی ہے' یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔"

"پھر تم اس عورت کو سپورٹ کرنا بند کرو۔" احسن سعد نے جواباً اس سے کہا تھا۔

"میں اسے اس لیے سپورٹ کر رہا ہوں کیونکہ کوئی ماں اپنی اولاد کو نہیں مار سکتی۔ لاپروا تھی تب بھی اس لاپروائی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اس اولاد کو مارنا چاہتی تھی اور اس کے خلاف قتل کا کیس کر دیا جائے۔" جبریل اب بے حد درشت ہو رہا تھا' یہ شاید احسن کا رویہ تھا جس نے اس کا سارا لحاظ منٹوں میں غائب کر دیا تھا۔

"تم پہلے یہ طے کرو کہ تمہیں عائشہ سے نفرت ہے کیوں؟ اس کے عورت ہونے کی وجہ سے؟ بیوی ہونے کی وجہ سے؟ ملکے کردار کی ہونے کی وجہ سے یا اپنے بیٹے کو مارنے کے شبہ کی وجہ سے.... تم بیٹھ کر پہلے طے کرو کہ تمہاری اتنی گہری نفرت کی وجہ ہے کیا؟" جبریل اس سے کہتا گیا تھا۔

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" احسن سعد نے درشتی سے کہا۔ "میں تم سے سائیکالوجی پڑھنے نہیں آیا۔"

جبریل نے سر ہلایا۔ "ایگزیکٹلی۔ میں بھی تم سے اخلاقیات پڑھنے نہیں آیا۔ تم مسلمان ہو بہت اچھی طرح جانتے ہو کہ جس عورت کو طلاق دے دی گئی ہو اس کے حوالے سے کیا ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں اور اس میں کم از کم یہ ذمہ داری شامل نہیں ہے کہ تم ہر مرد کے سامنے بیٹھ کر اس پر کیچڑ اچھالو۔"

"تم مجھے میرا دین سکھانے کی کوشش مت کرو۔" احسن سعد نے اس کی بات کاٹ کر بے حد تنفر سے کہا تھا۔ "میں حافظ قرآن ہوں اور تبلیغ کرتا ہوں سو رجنوں غیر مسلموں کو مسلمان کر چکا ہوں۔ تم مجھے یہ مت بتاؤ کہ میرا دین مجھ پر عورتوں کے حوالے سے کیا ذمہ داری عائد کرتا ہے اور کیا نہیں۔ تم اپنے دین کی فکر کرو کہ ایک نامحرم عورت کے ساتھ افیئر چلا رہے ہو اور مجھ سے کہہ رہے ہو کہ میں اپنی سابقہ آوارہ بیوی کی شان میں قصیدے پڑھوں۔"

وہ بات نہیں کر رہا تھا۔ زہر اگل رہا تھا۔ وہ جبریل کی زندگی میں آنے والا پہلا تبلیغی تھا جس کی زبان میں جبریل نے مٹھاس کی جگہ کڑواہٹ دیکھی تھی۔

"تمہاری تصویریں میں نے شادی کے بعد بھی اس کے لیپ ٹاپ میں دیکھی تھیں اور تب اس نے کہا تھا تم اس کی بہن کے دوست ہو تمہارا اور اس کا کوئی تعلق نہیں، لیکن میں غلط نہیں تھا میرا شک ٹھیک تھا۔ کوئی لڑکی بہن کے بوائے فرینڈ کی تصویریں اپنے لیپ ٹاپ میں جمع کر کے نہیں رکھتی۔" احسن سعد کہہ رہا تھا اور جبریل دم بخود تھا۔ "اور آج تم نے بتا دیا کہ یہ افیئر کتنا پرانا تھا۔ اسی لیے تو اس عورت نے جان چھڑائی ہے میرے بیٹے کو مار کر۔"

اس کی ذہنی حالت اس وقت جبریل کو قابل رحم لگ رہی تھی۔ اتنی قابل رحم کہ وہ بے اختیار کہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"احسن! اس نے تمہارے بیٹے کو نہیں مارا۔ وہ سرجری میں ہونے والی ایک غلطی سے مارا گیا۔" اس کی زبان سے وہ نکلا تھا جو شاید اس کے لاشعور میں تھا اور جس سے وہ خود نظریں چرا تا پھر رہا تھا۔ احسن کو اس کا جملہ سن کر کرنٹ لگا تھا اور جبریل پچھتایا تھا۔ وہ ایک برا دن تھا اور اس برے دن کا وہ ایک بدترین وقت تھا۔

"تم کیسے جانتے ہو یہ؟" احسن نے سرسراتی ہوئی آواز میں اس سے کہا تھا۔

"کیونکہ میں اس آپریشن ٹیم کا حصہ تھا۔" اس بار جبریل نے سوچ سمجھ کر کہا تھا۔ بدترین انکشاف وہ تھا جو ہو چکا تھا اب اس کے بعد کی تفصیلات کا پتا چلنا یہ نہ چلنا بے معنی تھا۔ احسن دم سادھے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ساکت پلکیں جھپکائے بغیر اس کے چہرے کا رنگ سانولا تھا سرخ یا زرد۔ چند لمحوں کے لیے جیسے جبریل کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

"وہ سرجری میں نے نہیں کی تھی احسن۔ میں اسسٹ کر رہا تھا ڈاکٹر ویزل کو۔ اور مجھے یہ بھی یقین نہیں ہے کہ سرجری میں واقعی کوئی غلطی ہوئی تھی یا وہ میرا وہم تھا۔"

جبریل نے اس کے سامنے جیسے وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی۔ احسن سعد وہاں اسے عائشہ عابدین سے بدگمان کرنے آیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اسے جواباً جبریل سے کیا پتا چلنے والا تھا۔

وہ یکدم اٹھا اور وہاں سے چلا گیا تھا۔ جبریل سکندر وہاں بیٹھا رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو، بیک ان یو ایس اے۔" صبح سویرے اپنے فون کی اسکرین پر ابھرنے والی اس تحریر اور بھیجنے والے کے نام نے رئیسہ کو چند لمحوں کے لیے ساکت کر دیا تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ یہ توقع کر رہی تھی کہ وہ واپس آنے کے بعد



اس سے رابطہ ضرور کرے گا۔ حالات جو بھی تھے' ان دونوں کے درمیان سرحال ایسا کچھ نہیں ہوا تھا کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے چھپنا پڑتا۔ "ویلکم بیک" کا ٹیکسٹ اسے بھیجتے ہوئے رئیسہ نے ایک بار پھر خود کو یاد دلایا تھا کہ زندگی میں ہونے والے اس پہلے بریک اپ کو اس نے دل پر نہیں لیا تھا۔ اور بار بار خود کو کرائی جانے والی یاد دہانی ضروری تھی۔ درد ختم نہیں ہو رہا تھا' لیکن کم ضرور ہو تا تھا۔ کچھ دیر کے لیے تھمتا ضرور تھا۔

"یونیورسٹی جا رہی ہو؟" وہ نہا کر نکلی تو اس نے فون پر ہشام کا اگلا ٹیکسٹ دیکھا۔ اس نے ہاں کا جوابی ٹیکسٹ کرتے ہوئے اسے اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔

"ملیں؟" اگلا ٹیکسٹ فوراً" آیا تھا۔ وہ کارن فلیکس کھاتے ہوئے میز پر پڑے فون پر چمکتے اس سوال کو دیکھتی رہی۔ کہنا چاہتی تھی۔ "اب کیسے؟" مگر لکھا تھا۔

"نہیں میں مصروف ہوں۔" کارن فلیکس حلق میں اٹکنے لگا تھا' وہ اب اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دل سنبھالنے کی ساری کوششوں کے باوجود اس کا سامنا مشکل ترین تھا۔ وہ روایتی لڑکی نہیں بننا چاہتی تھی۔ نہ گلے شکوے کرنا چاہتی تھی' نہ طعنے' نہ جھگڑا۔ اور نہ ہی اس کے سامنے رونا۔ وہ بحرین سرحال اس لیے نہیں گیا تھا کہ بچھڑ جانا۔

فون کی اسکرین پر جواباً" ایک منہ چڑاتی تصویر آئی تھی یوں جیسے اس کے بہانے کا مذاق اڑا رہی ہو۔ رئیسہ نے اسے اگنور کیا اور اسے جواباً" کچھ نہیں بھیجا۔

پندرہ منٹ بعد اس نے اپنے اپارٹمنٹ سے باہر نکلنے پر گاڑی سمیت اسے وہاں پایا تھا۔ وہ شاید وہیں بیٹھے ہوئے اسے ٹیکسٹ بھیج رہا تھا' ورنہ اتنی جلدی وہ وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اسے سرپرائز دینا اچھا لگتا تھا اور رئیسہ کو یہ سرپرائز لینا۔ مگر یہ کچھ دن پہلے کی بات تھی۔

وہ اس کے بلائے بغیر اس کی طرف آئی تھی' دونوں کے چہروں پر ایک دوسرے کو دیکھ کر خیر مقدمی مسکراہٹ ابھری' حال احوال پوچھا گیا' اس کے بعد رئیسہ نے اس سے کہا۔

"مجھے آج یونیورسٹی ضرور جانا ہے۔ کچھ کام ہے۔"

ہشام نے جواباً" کہا۔ "میں ڈراپ کر دیتا ہوں اور ساتھ کچھ گپ شپ بھی لگا لیں گے۔ بڑے دن ہو گئے ہمیں ملے اور بات کیے۔"

رئیسہ نے اس سے نظریں چرائی تھیں۔ مزید کچھ بھی کہے بغیر وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی ہشام نے اس کی طرف مڑتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"کیا؟" رئیسہ نے انجان بننے کی کوشش کی۔ یہ کہنا کہ میں ناخوش ہوں' دل شکستہ ہوں' کیونکہ تم مجھے امیدیں دلاتے دلاتے کسی اور لڑکی کو اپنی زندگی میں لے آئے ہو۔ یہ سب کم از کم رئیسہ کی زبان پر نہیں آسکتا تھا۔

"تمہارا موڈ آف ہے؟" وہ اب بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔ موڈ کیوں آف ہو گا؟" رئیسہ نے جواباً" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں' یہی تو جاننا چاہتا ہوں۔" وہ الجھا ہوا تھا۔ "تم کچھ دنوں سے مکمل طور پر غائب ہو میری زندگی سے۔ بحرین سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی' لیکن تم کال ریسیو نہیں کرتیں' نہ ہی میسجز کا جواب دیتی ہو۔ ہوا کیا ہے؟"

"تمہیں کیا لگتا ہے' کیا وجہ ہو سکتی ہے میرے اس رویے کی؟" رئیسہ نے جواباً" اس سے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا۔" ہشام نے ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد کہا تھا۔

"میں اب یہ سب ختم کرنا چاہتی ہوں۔" رئیسہ نے اس سے کہا۔

وہ چونکا نہیں اُسے دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر بولا۔

"یعنی میرا اندازہ ٹھیک ہے' تمہارا موڈ واقعی آف ہے۔" رئیسہ نے اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اپنے بیگ سے انگوٹھی کی وہ ڈبیا نکالی اور گاڑی کے ڈیش بورڈ پر رکھ دی' ہشام کچھ بول نہ سکا۔ گاڑی میں خاموشی رہی' پھر ہشام نے کہا۔

"تم نے انگیج منٹ کی خبر پڑھ لی ہے؟"

"اس سے بھی پہلے مجھے یہی خدشہ تھا اس لیے اس خبر سے میں حیران نہیں ہوئی۔" رئیسہ نے مدھم آواز میں اس سے کہا' بڑے ٹھنڈے انداز میں جس سے وہ ہمیشہ پہچانی جاتی تھی۔

"میں نے تم سے ایک کمٹمنٹ کی تھی رئیسہ اور میں اپنا وعدہ نہیں توڑوں گا۔ نیوز پیپر میں آنے والی ایک خبر ہم دونوں کے درمیان دیوار نہیں بن سکتی' اتنا کچا رشتہ نہیں ہے یہ۔" ہشام بڑی سنجیدگی سے کہتا گیا تھا۔

"نیوز پیپر کی خبر کی بات نہیں ہے ہشام! تمہاری فیملی کے فیصلے کی بات ہے۔ تم اب ولی عہد ہو۔ تمہاری ذمہ داریاں اور تم سے رکھی جانے والی توقعات اور ہیں۔"

وہ اس کی بات پر ہنسا تھا۔

"ولی عہد۔ میں ابھی تک نہ اپنے اس رول کو سمجھ پایا ہوں اور نہ ہی یہ اندازہ لگا پا رہا ہوں کہ میں اس منصب کے لیے اہل ہوں بھی یا نہیں۔ یہ پاور پالیٹکس ہے۔ آج جس جگہ پر ہم ہیں۔ کل ہوں گے بھی یا نہیں۔ کوئی یقینی بات نہیں ہے۔ اگر مجھے فیصلہ کرنا ہوتا تو میں کبھی یہ عہدہ نہ لیتا' مگر یہ میرے باپ کی خواہش ہے۔" وہ اب سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

رئیسہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "غلط خواہش نہیں ہے۔ کون ماں باپ نہیں چاہیں گے' اپنی اولاد کے لیے ایسا منصب۔ تم خوش قسمت ہو' تمہیں ایسا موقع ملا ہے۔" وہ مدھم آواز میں کہتی گئی۔

"پہلے میں بھی یہی سمجھتا تھا۔" ہشام نے جواباً کہا۔ "لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ کوئی بھی چیز لاٹری میں نہیں ملتی۔ یہ ضروری ہے ولی عہد کے لیے کہ وہ ایک شادی شاہی خاندان میں کرے وہ بھی پہلی' میری اور تمہاری شادی ہو چکی ہوتی تو اور بات تھی' لیکن اب نہیں ہو سکتا کہ میں شاہی خاندان میں شادی سے انکار کروں۔ جنہوں نے میرے باپ کی بادشاہت کا فیصلہ کیا ہے' انہوں نے ہی یہ فیصلہ بھی کیا ہے۔ مجھ سے اس بارے میں رائے نہیں لی گئی' مجھے بتایا گیا تھا۔" وہ خاموش ہوا۔

"میں اندازہ کر سکتی ہوں اور اسی لیے تم سے کوئی شکایت نہیں کر رہی۔ میرے اور تمہارے درمیان ویسے بھی کون سے عہد و پیمان ہوئے تھے کہ میں تم کو کسی بات کے لیے الزام دوں۔ اسی لیے ختم کرنا چاہتی ہوں خود یہ سب کچھ' تاکہ تم اگر کوئی obligation محسوس کر رہے ہو تو نہ کرو۔ اور میں ہرٹ نہیں ہوں۔" اس نے بات ختم کی' توقف کیا پھر آخری جملہ بولا۔

"تم ہوئی ہو' میں جانتا ہوں اور میں نادم بھی ہوں۔" ہشام نے اس کی بات کے اختتام پر کہا۔ "اور میں یہ سب ختم نہیں کرنا چاہتا' نہ ہی میں تم سے اس لیے ملنے آیا ہوں۔ رئیسہ! میں تم سے بھی شادی کروں گا اور یہ بات میں نے اپنی فیملی کو بتا دی ہے اور انہیں اعتراض نہیں ہے۔"

وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی اتنا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"حمین بالکل ٹھیک کہتا تھا۔ پتا نہیں اس کی زبان کالی ہے یا وہ ضرورت سے زیادہ عقل مند ہے۔" وہ اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے بولی۔

ہشام پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔ "وہ کیا کہتا ہے؟"

"یہی جو تم ابھی کہہ رہے ہو۔ دوسری شادی۔ وہ کہتا ہے کہ بادشاہ حرم رکھتے ہیں اور حرم کی ملکہ بھی کنیز ہی ہوتی ہے۔"

ہشام کچھ دیر کے لیے بول نہیں سکا یوں جیسے لفظ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہو پھر اس نے جیسے مدافعانہ انداز میں کہا۔

"عربوں میں ایسا نہیں ہوتا اگر بادشاہ کی چار بیویاں بھی ہوں تو بھی......"

رئیسہ نے بڑی نرمی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے کسی بادشاہ سے شادی کرنے کی خواہش نہیں تھی میں ہشام سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ تمہاری مجبوری ہو سکتی ہے ایک سے زیادہ شادیاں کرنا میری مجبوری نہیں ہے۔ میں محبت کرتی ہوں لیکن دل کے ہاتھوں اتنی مجبور نہیں ہوں کہ تمہارے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ ہی نہ سکوں۔"

اس کے لہجے میں وہی حقیقت پسندی تھی جس کے لیے ہشام اس کو پسند کرتا تھا مگر آج پہلی بار وہ عقل، وہ سمجھ بوجھ اسے بری لگی تھی۔

"اتنا کمزور رشتہ تو نہیں ہے ہمارا رئیسہ۔" اس نے رئیسہ کی بات کے جواب میں کہا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا کہ بہت مضبوط ہے لیکن میرا خیال غلط تھا۔ میری ممی بھی ایسی شادیوں کے حق میں نہیں تھیں اور میں سمجھتی تھی یہ bias ہے...... لیکن آج مجھے احساس ہوا ہے کہ وہ ٹھیک کہتی ہیں...... تہذیب کا فرق بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔" رئیسہ کہہ رہی تھی۔ "کبھی کبھی بہت بڑا مسئلہ بن سکتا ہے جیسے ابھی ہوا...... لیکن مجھے خوشی ہے کہ یہ سب پہلے ہو گیا ہے۔ بعد میں ہوتا تو......" وہ رکی، ہشام نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔

"میں تمہاری ممی سے متفق نہیں ہوں۔ محبت کا رشتہ ہر فرق سے بڑا اور طاقت ور ہوتا ہے۔"

"مانتی ہوں لیکن وہ تب ہوتا ہے جب مرد کی محبت میرے پاپا جیسی ہو اور وہ میرے پاپا کی طرح اپنے فیصلے پر قائم رہ سکے۔" رئیسہ نے کہا۔ اس نے سالار سکندر کا حوالہ دیا تھا اگر محبت کے بارے میں اسے کوئی ریفرنس یاد تھا تو وہ اپنے ماں باپ کی آپس میں محبت ہی کا تھا اور وہ حوالہ ہشام نے بہت بار سنا تھا لیکن آج پہلی بار اس نے ہشام کا موازنہ سالار سکندر سے کیا تھا اور علی الاعلان کیا تھا۔

"میں بھی اپنی محبت میں بہت کھرا ہوں اور تمہارے لیے لڑ سکتا ہوں۔" اس نے رئیسہ سے کہا تھا۔ اس کا وہ حوالہ اور موازنہ اسے پہلی بار شدید برا لگا تھا۔ وہ پچھلے کئی ہفتوں سے بحرین میں سر اور آنکھوں پر بٹھایا جا رہا تھا اور یہاں وہ اسے ایک "عام آدمی" کے سامنے چھوٹا گردان رہی تھی۔

"ہاں تم ہو محبت میں کھرے ہو لیکن تم لڑ نہیں سکتے ہشام! نہ مجھے زندگی میں شامل کرنے کے لیے، نہ ہی مجھے اپنی زندگی میں رکھنے کے لیے۔" رئیسہ نے اب گاڑی کا دروازہ کھول لیا تھا۔

"میں پھر بھی اپنے ماں باپ کو تمہارے ماں باپ کے پاس رشتے کے لیے بھیجوں گا اور یہ وقت بتائے گا کہ میں تمہارے لیے لڑ سکتا ہوں یا نہیں۔" گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے رئیسہ نے اسے کہتے سنا تھا۔ اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ پیچھے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے ہشام کے جملے کو سنتے ہوئے سوچا تھا۔

۞ ۞ ۞

وہ ایک ہفتہ جبریل سکندر کے لیے عجیب ذہنی انتشار لایا تھا۔ احسن سعد ایک بے حد ڈسٹرب کر دینے والی شخصیت رکھتا تھا اور وہ اسے بھی ڈسٹرب ہی کر کے گیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کے اسفند کی سرجری سے متعلقہ انکشاف پر اب وہ کیا رد عمل ظاہر کرے گا۔ جس بات کا اسے خدشہ تھا' وہ اس کیس میں کسی بھی حوالے سے اپنی نامزدگی تھی' جو وہ نہیں چاہتا تھا۔ ایک ڈاکٹر کے طور پر اپنے کیریر کے اس اسٹیج پہ اپنے پروفیشن سے متعلقہ کسی اسکینڈل یا کیس کا حصہ بننا اپنے کیریر کی تباہی کے مترادف تھا' لیکن اب اس پر پچھتانے کا فائدہ نہیں تھا۔ جو ہونا تھا' وہ ہو چکا تھا اور اسی ہفتے بے حد سوچ بچار کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ عائشہ کو بھی اس سرجری کے حوالے سے وہ سب کچھ بتا دے گا' جو وہ احسن سعد کو بتا چکا تھا۔ ان حالات میں ایسا کرنا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔

اس نے ہفتے کی رات کو اسے فون کیا تھا' فون بند تھا۔ جبریل نے اس کے لیے پیغام چھوڑا تھا کہ وہ اسے کال بیک کرے' آدھے گھنٹے کے بعد اس نے عائشہ کا نام اپنی اسکرین پر چمکتا دیکھا۔

کال ریسیو کرنے کے بعد ان کے درمیان حال احوال کے حوالے سے چند سیکنڈز کی گفتگو ہوئی' پھر جبریل نے اس سے اگلے دن ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔

"کس لیے ملنا چاہتے ہیں آپ؟" عائشہ نے بے تاثر انداز میں اس سے پوچھا تھا۔

"یہ بات میں آپ کو سامنے بیٹھ کر ہی بتا سکتا ہوں۔" اس نے جواباً کہا تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے پوچھا کہ وہ کس وقت اس سے ملنا چاہتا ہے۔

"کسی بھی وقت جب آپ کے پاس وقت ہو۔" اس نے جواباً کہا تھا۔

"گیارہ' بارہ بجے؟" عائشہ نے چند لمحے سوچ کر اس سے کہا۔

"ڈن۔" اس نے جواباً کہا اور عائشہ عابدین نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

جبریل فون ہاتھ میں لیے اگلا جملہ سوچتا ہی رہ گیا۔ احسن سعد نے اس سے کہا تھا اس نے عائشہ عابدین کے لیپ ٹاپ میں اس کی تصویریں دیکھی تھیں' جبریل کو یاد نہیں پڑتا تھا اس کے اور عائشہ کے درمیان کبھی تصویروں کا تبادلہ ہوا ہو اور تصویروں کا کوئی تبادلہ تو اس کے اور نساء کے درمیان بھی نہیں ہوا تھا' لیکن نساء کے پاس اس کے گروپ فوٹوز ضرور تھے۔ مگر عائشہ ان تصویروں کو اپنے پاس اس طرح الگ کیوں رکھے ہوئے تھی۔ وہ گروپ فوٹوز ہوتے تو احسن سعد اس میں سے صرف جبریل کو پہچان کر اس پر اعتراض نہ کرتا یقیناً' عائشہ کے پاس اس کی کچھ الگ تصویریں بھی تھیں اور وہ تصویریں وہ کہاں سے لے سکتی تھی؟ یقیناً' فیس بک سے جہاں وہ اس زمانے میں اپنی تصویریں باقاعدگی سے اپ لوڈ کیا کرتا تھا اور اس سے بھی بڑھ کر حسین۔۔۔ وہ اس کے بارے میں بہت سوچنا نہیں چاہتا تھا' لیکن سوچتا چلا گیا۔ احسن سعد سے ملاقات کے بعد عائشہ عابدین کے لیے اس کی ہمدردی میں دس گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

وہ اگلے دن ٹھیک وقت پر اس کے اپارٹمنٹ کے باہر کھڑا تھا اور پہلی بیل پر ہی عائشہ عابدین نے دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ شاید پہلے ہی اس کی منتظر تھی۔ سیاہ ڈھیلے پاجامے اور ایک بلو شرٹ کے ساتھ فلپ فلاپس پہنے' اپنے بالوں کو ایک ڈھیلے جوڑے کی شکل میں سمیٹے وہ جبریل کو پہلے سے بہتر لگی تھی۔ اس کی آنکھوں کے حلقے بھی کم تھے۔ وہ بے حد خوب صورت تھی اور سولہ سال کی عمر میں بھی اس پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ اب بھی کسی کی نظروں کو جکڑ سکتا تھا۔ جبریل کو احساس ہوا۔

"وعلیکم السلام۔" وہ اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اس نے جبریل

کے ہاتھوں میں اس چھوٹے سے گلدستے کو دیکھا جس میں چند سفید اور گلابی پھول تھے اور اس کے ساتھ ایک کوکیز کا پیک۔ اس کا خیال تھا وہ دونوں چیزیں اسے تھمائے گا لیکن وہ دونوں چیزیں اٹھائے اندر چلا گیا تھا۔

کچن کاؤنٹر پر اس نے پہلے پھول رکھے' پھر کوکیز کا وہ پیک اور پھر وہاں پڑے کافی کے اس مگ کو دیکھا جس میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ وہ یقیناً" اس کے آنے سے پہلے اسے پی رہی تھی۔ ایک پلیٹ میں آدھا آملیٹ تھا اور چند چکن ساسیجز۔۔۔ وہ ناشتا کرتے کرتے اٹھ کر گئی تھی۔

"میں بہت جلدی آگیا ہوں شاید؟" جبریل نے پلٹ کر عائشہ کو دیکھا جو اب اندر آگئی تھی۔

"نہیں' میں دیر سے جاگی ہوں۔۔۔ آج سنڈے تھا اور رات کو اسپتال میں ڈیوٹی تھی۔" اس نے جواباً" جبریل سے کہا۔

"آپ کا سنڈے خراب کردیا میں نے۔" جبریل نے مسکراتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ وہ اب لاؤنج میں پڑے صوفے پر جاکر بیٹھ گیا تھا۔ عائشہ کا دل چاہا اس سے کہے۔ اس کی زندگی میں ہر دن پہلے ہی بہت خراب تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی اور کچن کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔

"یہ آپ میرے لیے لائے ہیں؟" جبریل نے اسے پھول اٹھاتے ہوئے دیکھا۔

"جی!" اس نے جواباً" کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں تھی۔" اس نے جبریل کو دیکھا' پھر انہیں ایک گل دان میں لگانے لگی۔

"یہ بھی جانتا ہوں۔" جبریل نے کہا۔ ان پھولوں کو اس گل دان میں لگاتے ہوئے عائشہ کو خیال آیا کہ وہ شاید دو ڈھائی سال کے بعد اپنے لیے کسی کے لائے ہوئے پھولوں کو چھو رہی تھی۔ آخری بار اس کے گھر آنے والے پھول اسفند کے لیے اس کے کچھ عزیز و اقارب کے لائے ہوئے پھول تھے۔ اس نے ان تکلیف دہ یادوں کو جیسے سر سے جھٹکنے کی کوشش کی۔

"آپ بریک فاسٹ کرلیں' ہم پھر بات کرتے ہیں۔" جبریل کی آواز نے اسے چونکایا۔ وہ سینٹر ٹیبل پر پڑی اون کی سلائیاں اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ بے حد دلچسپی کے ساتھ۔

"یہ آپ کا شوق ہے؟" اس نے اسکارف کے اس حصے کو چھوتے ہوئے کہا' جو ادھ بنا تھا۔

"وقت گزارنے کی ایک کوشش ہے۔" آملیٹ کی پلیٹ سے آملیٹ کا ایک ٹکڑا کانٹے کی مدد سے اٹھاتے ہوئے عائشہ نے جواب دیا۔

"اچھی کوشش ہے۔" جبریل نے مسکراتے ہوئے اون کی سلائیوں کو دوبارہ اس باکس میں رکھا جس میں وہ پڑے تھے۔

"آپ یہ کافی لے سکتے ہیں۔ میں نے ابھی بنائی تھی' پی نہیں۔۔۔ میں اپنے لیے اور بنالیتی ہوں۔" اس نے کافی کا مگ لاکر اس کے سامنے ٹیبل پر پڑے ایک میٹ پر رکھ دیا تھا' وہ خود دوبارہ ناشتا کرنے کچن کاؤنٹر کے پاس پڑے اسٹول پر جاکر بیٹھ گئی تھی۔

"میرا خیال تھا آپ مجھے ناشتے کی بھی آفر کریں گی۔" جبریل نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

"میں نے اس لیے آفر نہیں کی کیونکہ آپ قبول نہیں کرتے۔" اس نے ساسیجز کے ٹکڑے کرتے ہوئے جواباً" کہا۔

"ضروری نہیں۔" جبریل نے اصرار کیا۔

"آپ ناشتا کریں گے؟" ٹھک سے اس سے پوچھا گیا۔

"نہیں۔" جبریل نے کہا اور پھر بے ساختہ ہنسا۔ "میں ناشتا کرکے آیا ہوں' اگر یہ پوچھا ہوتا کہ آپ کروا سکتی ہیں تو

نہ کر کے آتا۔ Assumptions بڑی نقصان دہ ہوتی ہیں۔" اس نے کہا' عائشہ خاموشی سے اس کی بات سنتے ہوئے ناشتا کرتی رہی۔

"میں آپ کی کال کا انتظار کرتا رہا تھا۔ اس توقع کے باوجود کہ آپ کال نہیں کریں گی۔" جبریل نے اس سے کہا۔ وہ کافی کے گھونٹ لے رہا تھا۔

عائشہ نے چکن سانجز کا آخری ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے اسے دیکھا۔ اسے ایک کاغذ پر لکھا ہوا سوری کا وہ لفظ یاد آگیا تھا جو وہ اسے ایک لفافے میں دے کر گیا تھا اور جسے دیکھ کر وہ بے حد الجھی تھی۔ وہ اس سے کس بات کے لیے معذرت خواہ تھا۔ کس چیز کے لیے شرمندگی کا اظہار کر رہا تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود کوئی وضاحت' کوئی توجیہہ ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی اور اتنا الجھنے کے باوجود اس نے جبریل کو فون کر کے اس ایک لفظ کی وضاحت نہیں مانگی تھی۔ وہ اس شخص سے راہ و رسم بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ بار بار اس سے بات کرنا' اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ ہر بار اس کی آواز' اس سے ملاقات' عائشہ عابدین کو پتا نہیں کیا کیا یاد دلانے لگتا تھا۔ کیسا کیسا پچھتاوا اور احساس زیاں تھا جو اسے ہونے لگتا تھا اور عائشہ اپنے ماضی کے اس حصے میں نہیں جانا چاہتی تھی جہاں جبریل سکندر کھڑا تھا۔ وہ اس باب کو بند کر چکی تھی۔

جبریل نے اسے کچن کاؤنٹر کے پار اسٹول پر بیٹھے اپنی خالی پلیٹ پر نظریں جمائے کسی گہری سوچ میں دیکھا' اس نے جبریل کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا یوں جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ جبریل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سے جو کہنے آیا تھا' وہ کیسے کہے گا۔ اس وقت اس نے بے اختیار یہ خواہش کی تھی کہ کاش اس نے اس سرجری کے دوران ڈاکٹر ویزل کی وہ غلطی دیکھی ہی نہ ہوتی۔

"آپ کا وزیٹنگ کارڈ مجھ سے کھو گیا تھا۔ مجھے یاد نہیں' وہ میں نے کہاں رکھ دیا تھا۔" وہ بولی تھی اور اس نے بے حد عجیب ایکسکیوز دی تھی۔ یعنی وہ اسے یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ اس نے جبریل کا نمبر محفوظ نہیں کیا ہوا تھا۔

کچھ کہنے کے بجائے جبریل نے اپنی جیب سے والٹ نکال کر ایک اور وزیٹنگ کارڈ نکالا اور اسے اون سلائیوں کے اس ڈبے میں رکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے گم نہ ہو شاید۔" عائشہ نے نظریں چرائی تھیں۔ وہ پلیٹیں اٹھاتے ہوئے انہیں سنک میں رکھ آئی۔

"آپ مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتے تھے۔" اپنے لیے کافی بناتے ہوئے اس نے بالآخر جبریل کو بات یاد دلائی جس کے لیے وہ یہاں آیا تھا۔

"احسن سعد مجھ سے ملنے آیا تھا۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جبریل نے اس سے کہا۔ اس کا خیال تھا وہ بری طرح چونکے گی۔

"میں جانتی ہوں۔" وہ انتہائی غیر متوقع جواب تھا۔ جبریل چند لمحے بول نہیں سکا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ کافی کو اس انہماک سے بنا رہی تھی جیسے اس کی زندگی کا مقصد کافی کا وہ کپ بنانا ہی تھا۔

"اس نے مجھے کال کی تھی۔" اس نے جیسے جبریل کی خاموشی کو سمجھتے ہوئے مزید کہا۔

جبریل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اب کیا کہے۔ اگر احسن سعد نے اسے کال کی تھی جبریل سے ملاقات کے بعد تو یہ ممکن نہیں تھا کہ اس نے عائشہ کو اسفند کی سرجری کے حوالے سے اس کے اعتراف کے حوالے سے کچھ نہ کہا ہو۔ اور اگر اس نے عائشہ سے ذکر کیا تھا تو عائشہ اس وقت اتنے پرسکون انداز میں اس کے سامنے کیسے بیٹھی رہ سکتی تھی۔ احسن سعد نے جبریل کے کام کو مشکل سے آسان کر دیا تھا' مگر اب اس کے بعد اگلا سوال جبریل کو سوجھ نہیں رہا تھا۔

وہ اب اپنا کافی کا مگ لیے اس کے سامنے صوفے پر آکر بیٹھ گئی تھی۔

"اب آپ کو یہ تو پتا چل گیا ہوگا کہ میں کتنی گناہ گار اور قابل نفرت ہوں۔"
عائشہ عابدین کے لہجے میں عجیب اطمینان تھا' یوں جیسے وہ خود ملامت نہیں' اپنی تعریف کررہی ہو۔ جبریل اسے دیکھتا رہا۔ عائشہ عابدین کی آنکھوں میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ تکلیف اور درد بھی نہیں جو جبریل نے ہر بار اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ وہ شرمندگی اور ندامت بھی نہیں جو ہر بار اس کی آنکھوں سے جھلکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب کچھ بھی نہیں تھا اور اس کے جملے نے جبریل کے سارے لفظوں کو گونگا کردیا تھا۔

"احسن نے آپ کو یہ بتایا کہ سرجری میں۔۔۔" جبریل کو پتا نہیں کیوں شبہ ہوا کہ شاید احسن نے اسے کچھ نہیں بتایا' ورنہ عائشہ عابدین کی زبان پر کچھ اور سوال ہونا چاہیے تھا۔

"ہاں!" اس یک لفظی جواب نے جبریل کو ایک بار پھر کچھ بولنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا' وہ اب اسے نہیں دیکھ رہی تھی' اس کافی کے مگ سے اٹھتی بھاپ کو دیکھ رہی تھی جو اس کے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ یوں جیسے وہ ہاتھوں میں کوئی کرسٹل بال لیے بیٹھی ہو جس میں اپنا مستقبل دیکھنے کی کوشش کررہی ہو۔ ماضی وہ تھا جسے وہ بھولنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرنا چاہتی تھی اور حال میں اسے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ زندگی کے اس حصے سے بس آنکھیں بند کرکے گزرنا چاہتی تھی۔ احسن سعد کی چلاتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"گالی۔۔۔ گالی۔۔۔ اور گالیاں۔۔۔" وہ فون کان سے لگائے کسی میکانکی انداز میں وہ گالیاں سن رہی تھی جو کئی سال اس کی زندگی کے شب و روز کا حصہ رہی تھیں اور وہ انہیں سنتے ہوئے اب بے حس ہوچکی تھی۔ ان برے لفظوں کا زہر اب اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑتا تھا۔ نہ اسے شرم محسوس ہوتی تھی' نہ تذلیل' نہ ہتک' نہ غصہ' نہ پریشانی۔ طلاق کا کیس چلنے کے دوران' طلاق ہونے کے بعد اور اسفند کی کسٹڈی کے کیس کے دوران بھی احسن کا جب دل چاہتا تھا' وہ اسے اسی طرح فون کرتا تھا اور یہی سارے لفظ دہراتا تھا' جو اس نے اب بھی دہرائے تھے۔ وہ کوشش کے باوجود اس کی کال نہ لینے کی ہمت نہیں کرپاتی تھی۔ نفسیاتی طور پر وہ اس قدر خائف تھی کہ اسے یوں لگتا تھا وہ اس کی کال نہیں سنے گی تو وہ اس کے گھر آجائے گا۔ وہ اس سے یہی کہتا تھا اور وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ امریکہ میں تھی۔ اس کی ایک کال پر پولیس احسن سعد کو کبھی اس کے گھر کے پاس پھٹکنے بھی نہ دیتی۔ لیکن عائشہ اتنی بہادر ہوتی تو اس کی زندگی ایسی نہ ہوتی۔ استحصال کی ایک قسم وہ تھی جو اس نے اپنی شادی قائم رکھنے کے لیے ایک اچھی بیوی اور اچھی مسلمان عورت بننے کی جدوجہد کرتے ہوئے سہی تھی۔ استحصال کی دوسری قسم وہ تھی جو اس نے اسفند کی زندگی میں باپ نام کی اس محرومی کو نہ آنے کے لیے سہی تھی' جو خود اس کی زندگی میں تھی۔

اسفند کے ایک کندھے میں پیدائشی نقص تھا' وہ اپنا بازو ٹھیک سے اٹھا نہیں پاتا تھا اور وہ Slow Learner (کند ذہن) تھا اور اس کے یہ دونوں "نقائص" احسن سعد اور اس کی فیملی کے لیے ناقابل یقین اور ناقابل معافی تھے۔ ان کی سات نسلوں میں بھی کوئی بچہ کسی ذہنی یا جسمانی نقص کا شکار نہیں ہوا تھا۔ تو ان کے گھر میں اسفند کی پیدائش کیسے ہوئی؟ یہ بھی عائشہ کا قصور تھا۔ اس کے جینز کا' اس کے اعمال کا' وہ اس کا عذاب اور سزا تھی۔ احسن سعد اور اس کی فیملی کے لیے آزمائش کیوں بنا تھا۔ اور عائشہ کے کھوکھلے لفظ اب بالکل گونگے ہوگئے تھے۔ اسے بھی یقین تھا کہ اس کی اولاد کی یہ تکلیف اس کے کسی گناہ کا نتیجہ تھی پر کون سا گناہ۔ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب اسے نہیں ملتا تھا اور اس معذور اولاد کے ساتھ اس نے احسن سعد کی اطاعت کی ہر حد پار کرلی تھی' صرف اس لیے کیونکہ اسے لگتا تھا کہ اس کے بیٹے کو باپ کی ضرورت تھی۔ وہ اکیلی اسے کیسے پالتی۔

وہ اسفند کی پیدائش کے بعد امریکہ گئی تھی اور سال احسن نے اسے رہائش پذیر ہونے کے لیے کہا تھا کیونکہ وہ معاشی طور پر اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کرسکتا تھا۔ عائشہ نے سوچے سمجھے بغیر اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع

کرریا تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ احسن کو یک دم ایسے کون سے اخراجات نظر آنے لگے تھے جس کے لیے اس کا کام کرنا بھی ضروری تھا اور وہاں آنے کے ایک سال بعد اسے پتا چلا تھا کہ اس کے امریکہ آنے کے چند مہینے بعد ہی احسن نے پاکستان میں دوسری شادی کرلی تھی۔ وہ اب اکثر پاکستان جاتا تھا اور عائشہ کو کبھی شک بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی دوسری عورت آچکی تھی۔ وہ انکشاف کسی نے اس کی فیملی کے سامنے کیا تھا جو احسن سعد کی دوسری بیوی اور اس کے خاندان کو جانتا تھا۔ عائشہ عابدین کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اس خبر پر کس طرح کے ردعمل کا اظہار کرتی' یہ سب فلموں اور ڈراموں میں ہوتا تھا مگر اس کے ساتھ جو ہوا تھا اس کے بعد اسے فلمیں اور ڈرامے بھی سچ لگنے لگے تھے۔

احسن سعد نے بے حد ڈھٹائی سے دوسری شادی کا اعتراف کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور چار شادیاں بھی کرسکتا ہے اور سال تو اس کے پاس ایک بے حد مضبوط وجہ تھی کہ اس کی بیوی اسے صحت مند اولاد نہیں دے سکی تھی جو اس کی دوسری بیوی اسے دے گی۔

زندگی میں وہ پہلا لمحہ تھا جب عائشہ عابدین تھک گئی اور اس نے احسن سعد اور اس کی فیملی کے بجائے اپنی فیملی کی بات مانتے ہوئے اس سے علیحدگی کا فیصلہ کیا تھا' اور اس فیصلے نے احسن سعد کے ہوش اڑا دیے تھے اسے عائشہ عابدین سے ایسے ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ اسفند کے نام کچھ جائیداد تھی جو عائشہ کے نانا نے عائشہ کے نام کرنے کے بجائے جائیداد کی تقسیم کے دوران اس کے بیٹے کے نام گفٹ کی تھی اور احسن کی نظر میں عائشہ کی کچھ قدر و قیمت تھی تو اس کی بڑی وجہ یہی تھی۔ اسے عائشہ کے کردار پر شک تھا' بے عملی اور بے ہدایتی کی شکایت تھی لیکن اس سب کے باوجود وہ عائشہ کو آزاد کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مگر اس کا کوئی حربہ کارگر نہیں ہوا تھا۔

عائشہ کی طلاق کی پروسیڈنگ کے دوران پاکستان میں احسن سعد کی دوسری بیوی نے بھی شادی کے آٹھ ماہ بعد خلع کا کیس فائل کردیا تھا۔ احسن سعد اور اس کی فیملی نے اس کے بعد کچھ مشترکہ فیملی فرینڈز کے ذریعے مصالحت کی بے انتہا کوششیں کی تھیں مگر۔ عائشہ کی فیملی نے ایسی کسی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا تھا اور عائشہ اس سارے عرصے میں ایک کیچوے کی مانند رہی تھی جو ہو رہا تھا وہی ہونا چاہیے تھا۔ مگر جو بھی ہو رہا تھا وہ خود نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ تب بھی یہ فیصلہ نہیں کر پارہی تھی کہ وہ صحیح کررہی تھی یا غلط۔ اللہ کے نزدیک اس کا یہ عمل گناہ تھا یا نہیں اور اگر وہ گناہ تھا تو وہ چاہتی تھی یہ گناہ کوئی اور اپنے سر لے لے لیکن اسے احسن سعد سے نجات دلادے۔

جس دن اس کی طلاق فائنل ہوئی تھی' اس دن اس نے حجاب اتار دیا تھا کیونکہ اسے یقین تھا اب وہ کتنی بھی نیکیاں کرلے' وہ اللہ کی نظروں میں گناہ گار رہے گی۔ احسن سعد نے ایک لڑکی کی زندگی تباہ نہیں کی تھی اس نے اسے اس دین سے بھی برگشتہ کردیا تھا جس کی پیروکار ہونے پر عائشہ عابدین کو فخر تھا۔

"تمہارے یار کو بتا آیا ہوں تمہارے سارے کرتوت۔" احسن سعد نے فون پر دھاڑتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ "تم کیا پلان کررہی ہو کہ میرے بیٹے کو مار کر تم اپنا گھر بساؤ گی' رنگ رلیاں مناؤ گی... میں صرف تمہیں جیل نہیں بھیجوں گا' تمہارے اس یار کو بھی بھیجوں گا جس نے میرے بیٹے کا آپریشن کرکے جان بوجھ کر اسے مارا اور اس نے خود اپنے منہ سے مجھے بتایا ہے۔"

وہ بکتا جھکتا یونہی چلا گیا اور وہ سنتی رہی۔

"عائشہ!" جبریل کی آواز نے ایک بار پھر اسے چونکایا۔ اس کے ہاتھوں میں موجود کافی کے مگ سے اب بھاپ اٹھنا بند ہوچکی تھی۔ کافی ٹھنڈی ہوچکی تھی۔ عائشہ نے سر اٹھا کر جبریل کو دیکھا۔ وہ اب اسے بتا رہا تھا کہ

اس آپریشن کے دوران کیا ہوا تھا..... اور اسے یقین نہیں تھا' صرف اس کا اندازہ تھا کہ ڈاکٹر ویرل سے اس آپریشن میں کچھ غلطیاں ہوئی تھیں۔۔۔ اور قصوروار نہ ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔ یہ اس کی بے وقوفی ہی تھی کہ وہ یہ انکشاف احسن سعد کے سامنے کر بیٹھا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔ احسن سعد آپ کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

اس کی بات کے اختتام پر عائشہ کی زبان سے نکلنے والے جملے نے جبریل کو حیران کر دیا تھا۔ وہ اسی طرح پرسکون تھی' وہ اگر کسی شدید جذباتی رد عمل کی توقع کر رہا تھا تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ کسی غصے کا اظہار' کوئی ملامتی لفظ کچھ بھی نہیں۔ وہ جوابا" اسے تسلی دے رہی تھی کہ اسے کچھ نہیں ہو گا۔

"میں نے احسن کو بتا دیا ہے کہ میں اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کو مانتے ہوئے کورٹ میں اسفند کے قتل کا اعتراف کر لوں گی۔"

اس کے اگلے جملے نے جبریل کا دماغ جیسے بھک سے اڑا دیا تھا۔



"تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔" جیل کے ایک سنتری نے۔۔۔ راہداری جتنی لمبی بیرک کی ایک دیوار کے ساتھ چادر زمین پر ڈال کر سوئے اس بوڑھے آدمی کو بڑی رعونت کے عالم میں اپنے جوتے کی ٹھوکر سے جگایا تھا۔ وہ ہڑبڑایا نہیں ویسے ہی رہا اور لیٹے لیٹے اس نے آنکھیں کھول کر سر پر کھڑے اس سنتری کو دیکھا۔ اسے یقین تھا اسے کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔ اس سے ملنے کون آ سکتا تھا۔ پچھلے بارہ سالوں سے تو کوئی نہیں آیا تھا' پھر اب کون آئے گا۔

"ارے اٹھ۔۔۔ مر گیا ہے۔۔۔ سنا نہیں ایک بار کہ کوئی ملنے آیا ہے۔" سنتری نے اس بار کچھ زیادہ طاقت سے اسے ٹھوکر ماری تھی' وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔

"کون آیا ہے؟" اس نے سنتری سے پوچھا۔

"وہی میڈیا والے کتے۔" سنتری نے گالی دی۔

"سزائے موت کے قیدیوں سے انٹرویو کرنا ہے انہیں۔"

اس نے ایک بار پھر لیٹنے کی کوشش کی لیکن سنتری کے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے کی حرکت نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اس کے ساتھ چل پڑے۔ وہ ان میڈیا والوں سے بے زار تھا اور این جی او والوں سے بھی جو وقتا" فوقتا" وہاں سروے کرنے آتے تھے۔ ان کے حالات زندگی جاننے' ان کے جرم کی وجوہات کریدنے' جیل کے حالات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے۔ وہ جیسے سرکس کے جانور تھے جنہیں ان کے سامنے پیش ہو کر بتانا پڑتا کہ انہوں نے جو کیا' کیوں کیا؟ کیا اب انہیں پچھتاوا تھا اور کیا انہیں اپنے گھر والے یاد آتے تھے؟

بے زاری کے ساتھ لڑکھڑاتے قدموں سے وہ اس سنتری کے پیچھے چلا گیا جو اسے بیرک سے نکال کر ملاقاتیوں والی جگہ کے بجائے جیلر کے کمرے میں لے آیا تھا اور وہاں غلام فرید نے پہلی بار ان چار افراد کو دیکھا جن میں سے دو گورے تھے اور دو مقامی خواتین۔ وہ چاروں انگلش میں بات کر رہے تھے اور غلام فرید کے اندر داخل ہوتے ہی ان کے اور جیلر کے درمیان کچھ بات چیت ہوئی اور پھر جیلر اس سنتری کے ہمراہ وہاں سے چلا گیا۔

"غلام فرید؟" ایک عورت نے تصدیقی انداز میں اس سے پوچھا تھا' غلام فرید نے سر ہلایا۔

"بیٹھو!" اسی عورت نے اشارے سے سامنے پڑی ایک کرسی پر اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

غلام فرید کچھ نروس ہوا تھا' لیکن پھر وہ جھجکتا' سکڑتا سمٹتا ان کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ ایک گورے نے اس کے بیٹھتے ہی ہاتھ میں پکڑے ایک فون سے اس کی کچھ تصویریں لی تھیں۔

جس عورت نے اس سے گفتگو کا آغاز کیا تھا وہ اب پنجابی میں اس سے پوچھ رہی تھی کہ وہ کس جرم میں یہاں آیا تھا۔ غلام فرید نے رٹے رٹائے طوطے کی طرح اس کے ان دس بارہ سوالات کا جواب دیا تھا اور پھر انتظار میں بیٹھ گیا تھا کہ وہ اب ان بنیادی سوالات کے بعد ایک بار پھر سے اس کے جرم کو کریدنا شروع کریں گے پھر جیل میں اس کی زندگی کے بارے میں پوچھیں گے اور پھر۔

مگر اس کی توقع غلط ثابت ہوئی تھی۔ انہوں نے اس کی زبانی اس کا نام' ولدیت' رہائش' جرم کی نوعیت اور جیل میں آنے کے سال کے بعد اس سے پوچھا تھا۔

"جیل سے باہر آنا چاہتے ہو غلام فرید؟" وہ گورا تھا مگر اس سے شستہ اردو میں بات کر رہا تھا۔ غلام فرید کو لگا اسے سننے میں کچھ دھوکہ ہوا ہے۔

"جیل سے باہر آنا چاہتے ہو؟" اس آدمی نے جیسے اس کے چہرے کے تاثرات پڑھ لیے تھے۔

"جیل سے باہر...؟" غلام فرید نے سوچا۔ ایک لمحے کے لیے کیا وہ جیل سے باہر آنا چاہتا تھا؟ پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ جو اس آدمی کے لیے جیسے غیر متوقع تھا۔

"کیوں؟" اس نے بے ساختہ پوچھا تھا۔

"باہر آکر کیا کروں گا؟" غلام فرید نے جواباً کہا تھا۔ "نہ کوئی گھر ہے نہ خاندان اور اس عمر میں محنت مزدوری نہیں ہوتی۔ جیل ٹھیک ہے' یہاں سب ملتا ہے۔" غلام فرید نے کہا تھا اس نے سوچا تھا۔ اب دوسرے کے سوال بدل گئے تھے۔

"اگر تمہیں ڈھیر سارا پیسہ' ایک شان دار سا گھر اور ایک بیوی بھی مل جائے تب بھی باہر آنا نہیں چاہتے؟ زندگی نئے سرے سے شروع کرنا نہیں چاہتے؟" اس بار دوسری عورت نے اس سے کہا تھا۔

بہت سارا پیسہ...؟ غلام فرید نے سوچا۔ بہت سارے پیسے کی خواہش نے ہی تو مسئلہ پیدا کیا تھا اس کے لیے... اسے پتا نہیں کیا کیا یاد آیا تھا اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی جب وہ سوچتا تھا تو اسے سب یاد آجاتا تھا۔ اپنی کڑوی زبان والی بیوی' جس کے عشق میں وہ گرفتار تھا اور جو بھی شہد جیسی میٹھی تھی۔ اور وہ بچے۔ ایک دو سال کے وقفے سے باری باری پیدا ہونے والے نو بچے' جن میں سے چند بچوں کے علاوہ اسے اب کسی کا نام اور شکل یاد نہیں تھی۔ وہ مولوی جو اس کا دشمن تھا اور وہ سود جو ختم ہی نہیں ہوتا تھا' اسے آج بھی وہ رقم یاد تھی جو اس نے سود پہ لی تھی اور وہ رقم بھی جو بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھ گئی تھی کہ ایک دن وہ اپنا ذہنی توازن ہی کھو بیٹھا تھا۔

"سالار سکندر یاد ہے تمہیں؟" اس کو خاموش دیکھ کر اس گورے نے غلام فرید سے پوچھا تھا۔

غلام فرید کی آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشت آئی تھی۔ جھریوں سے بھرے چہرے' بڑھے بالوں اور بے ترتیب داڑھی کے ساتھ پھٹے پرانے میلے کپڑوں میں وہاں ننگے پاؤں بیٹھے بھی اسے سالار سکندر یاد تھا۔ اور اس کا باپ۔ اور وہ نفرت بھی جو اس کے دل میں ان کے لیے تھی اور بہت سے ان دوسرے لوگوں کے لیے بھی جنہوں نے اس کا استعمال کیا تھا۔

غلام فرید نے زمین پر تھوکا تھا۔ کمرے میں بیٹھے چاروں افراد کے چہروں پر مسکراہٹ ابھری۔



"میرے بچپن میں' میری زندگی میں جتنا بڑا رول آپ لوگوں کی فیملی کا تھا' پچھلے پانچ سالوں میں اتنا ہی بڑا رول اس شخص کا ہے۔"

عبداللہ نے عنایہ کو بتایا تھا۔ چند ہفتوں بعد ہونے والی اپنی منگنی سے پہلے یہ ان کی دوسری ملاقات تھی۔ عنایہ ایک سیمی نار میں شرکت کے لیے کیلی فورنیا آئی تھی اور عبداللہ نے اسے ڈنر پر بلایا تھا۔ وہ اسے ڈاکٹر احسن سعد سے ملوانا چاہتا تھا جو اسی کے اسپتال میں کام کرتے تھے اور وہ ہمیشہ سے ان سے بہت متاثر تھا۔ عنایہ نے کئی بار اس سے پچھلے سالوں میں اس شخص کے حوالے سے سنا تھا جس سے وہ اب تھوڑی دیر میں ملنے والی تھی۔

"مسلمان ہونا آسان تھا میرے لیے.... لیکن مسلمان رہنا اور بننا بڑا مشکل تھا۔ ڈاکٹر احسن نے یہ کام بڑا آسان کر دیا میرے لیے۔ جبریل کے بعد یہ دوسرا شخص ہے جسے میں رول ماڈل سمجھتا ہوں کہ وہ دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔"

عبداللہ بڑے پرجوش انداز میں عنایہ کو بتا رہا تھا اور وہ مسکراتے ہوئے سن رہی تھی۔ عبداللہ جذباتی نہیں تھا' بے حد سوچ سمجھ کر بولنے والوں میں سے تھا اور کسی کی بے جا تعریف کرنے والوں میں سے بھی نہیں تھا۔

"کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئے ہو تم ان سے۔" عنایہ کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ وہ ہنس پڑا۔

"تم جیلس تو نہیں ہو رہیں؟" اس نے عنایہ کو چھیڑا۔

"ہوئی تو نہیں لیکن ہو جاؤں گی۔" اس نے جواباً" مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین ہے تم ان سے ملو گی تو تم بھی میری ہی طرح متاثر ہو جاؤ گی ان سے۔" عبداللہ نے کہا۔ "میں اپنے نکاح میں ایک گواہ انہیں بناؤں گا۔"

عنایہ اس بار قہقہہ مار کر ہنسی تھی۔ "عبداللہ تم اس قدر انسپائرڈ (متاثر) ہو ان سے؟ مجھے تھوڑا بہت اندازہ تو تھا لیکن اس حد تک نہیں... مجھے اب اور اشتیاق ہو رہا ہے ان سے ملنے کا۔" عنایہ نے اس سے کہا "وہ یقیناً اچھے شوہر بھی ہوں گے اگر تم نکاح میں بھی انہیں گواہ بنانا چاہتے ہو تو۔" عنایہ کو مزید تجسس ہوا تھا۔

"بس اس ایک معاملے میں خوش قسمت نہیں رہے وہ۔" عبداللہ یک دم سنجیدہ ہو گیا "اچھی بیوی ایک نعمت ہوتی ہے اور بُری ایک آزمائش... اور انہیں دوبار اس آزمائش سے گزرنا پڑا۔ ان کی نرمی اور اچھائی کا ناجائز فائدہ اٹھایا ان کی بیویوں نے۔" عبداللہ کہہ رہا تھا۔

"Ohhh that's sad" (اوہ' یہ افسوس ناک ہے) عنایہ نے کہے بغیر افسوس کا اظہار کیا۔

"تمہیں پتا ہے تم سے شادی کے لیے بھی میں نے ان سے بہت دعا کروائی تھی اور دیکھ لو ان کی دعا میں کتنا اثر ہے ورنہ تمہارے پیرنٹس آسانی سے ماننے والے تو نہیں تھے۔" عبداللہ اب بڑے فخریہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"میرے پیرنٹس کسی کی دعاؤں کے بجائے تمہارے کردار اور اخلاص سے متاثر ہوئے ہیں عبداللہ۔" عنایہ نے اسے جتایا۔

اسے اپنی بے یقینی کا وہ عالم ابھی بھی یاد تھا جب چند مہینے پہلے عبداللہ سے پاکستان میں ملنے کے بعد امامہ نے اسے فون کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ انہوں نے اس کا رشتہ امریکہ میں مقیم ایک ہارٹ سرجن کے ساتھ طے کر دیا ہے۔ وہ کچھ دیر کے لیے بھونچکا رہ گئی تھی۔ اس سے پہلے جو بھی پروپوزلز اس کے لیے زیر غور آتے تھے عنایہ سے مشورہ کیا جاتا تھا اور پھر اسے ملوایا جاتا تھا۔ یہ پہلا پروپوزل تھا جس کے بارے میں اسے اس وقت اطلاع دی جا رہی تھی جب رشتہ طے کر دیا گیا تھا۔ عجیب صدمے کی حالت میں اس نے امامہ سے کہا تھا۔

"مگر ممی! آپ کو مجھے پہلے ملوانا چاہیے تھا اس سے۔ اس کے بارے میں مجھ سے کچھ پوچھا تک نہیں آپ نے۔"

"تمہارے بابا نے بات طے کی ہے۔" امامہ نے جواباً" کہا۔ عنایہ خاموش ہو گئی۔ عجیب دھچکا لگا تھا اسے۔

"تم نہیں کرنا چاہتیں؟" امامہ نے اس سے پوچھا تھا۔
"نہیں میں نے ایسا تو نہیں کہا، پہلے بھی آپ لوگوں ہی کو کرنا تھا تو ٹھیک ہے۔"
عنایہ نے کچھ بجھے دل کے ساتھ کہا تھا۔ اسے عبداللہ یاد آیا تھا اور بالکل اسی لمحے امامہ نے اس سے کہا۔
"عبداللہ نام ہے اس کا۔" نام سن کر بھی لحظہ بھر کے لیے بھی اسے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ ایرک عبداللہ کی بات کر رہی تھی۔ امامہ اس قدر کٹر مخالف تھی ایرک عبداللہ سے شادی کی کہ عنایہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ جس عبداللہ کا اتنے دوستانہ انداز میں ذکر کر رہی تھی، وہ وہی تھا۔
"اوکے۔" عنایہ نے بمشکل کہا۔
"تم سے ملنا بھی چاہتا ہے۔ وہ نیویارک آیا ہوا ہے میں نے اسے تمہارا ایڈریس دیا تھا۔" امامہ کہہ رہی تھی۔
عنایہ نے بے ساختہ کہا "ممی پلیز! اب اس طرح میرے سر پر مت تھوپیں اسے کہ آج مجھے رشتہ طے ہونے کی خبر دے رہی ہیں اور آج ہی مجھے اس سے ملنے کا بھی کہہ رہی ہیں۔ ویسے بھی اب رشتہ طے ہو گیا ہے، ملنے نہ ملنے سے کیا فائدہ ہو گا۔" اس نے جیسے اپنے اندر کا غصہ نکالا تھا۔
"اس کی فیملی بھی شاید ساتھ ہو۔ اس کی ممی سے بات ہوئی ہے میری۔ اگلے ٹرپ پر میں بھی ملوں گی اس کی فیملی سے۔ منگنی کا فارمل فنکشن تو چند مہینوں بعد ہو گا۔" امامہ نے اس طرح بات جاری رکھی تھی جیسے اس نے عنایہ کی خفگی کو محسوس ہی نہیں کیا تھا۔
عنایہ صدمہ کی کیفیت میں اگلے ایک گھنٹے تک وہیں بیٹھی رہی تھی اور ایک گھنٹے کے بعد اس کے دروازے پر بیل بجنے پر اس نے جس شخص کو دیکھا تھا اسے لگا تھا سردیوں کے موسم میں ہر طرف بہار آ گئی ہے۔ گلاب کا ایک ادھ کھلا پھول شاخ سمیت اسے پکڑاتے ہوئے دروازے پر ہی اس نے عنایہ سے پھاوڑا مانگا تھا تاکہ اس کے دروازے کے باہر پڑی برف ہٹا سکے۔ وہ کئی سالوں بعد مل رہے تھے اور عنایہ کو وہی ایرک یاد آیا تھا جو اکثر ان کے گھر میں لگے پھول۔ توڑ توڑ کر اس کو اور امامہ کو لا کر دیا کرتا تھا اور جس کا پسندیدہ مشغلہ سردیوں میں اپنے اور ان کے گھر کے باہر سے برف ہٹانا تھا۔
"وہ بھائی ہے۔" عبداللہ کی آواز اسے خیالوں سے باہر لے آئی تھی۔ وہ ریسٹورنٹ کے دروازے پر نمودار ہونے والے کسی شخص کو دیکھتے ہوئے کھڑا ہوا تھا۔ عنایہ نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ احسن سعد سے اس کی پہلی ملاقات تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا اس سے ہونے والا اگلا سامنا اس کی زندگی میں کتنا بڑا بھونچال لانے والا تھا۔



"تمہارے لیے کوئی لڑکی دیکھیں؟" امامہ نے اس صبح ناشتے کی ٹیبل پر حمین سے کہا تھا۔ وہ ان کے پاس چند دنوں کے لیے پاکستان آیا ہوا تھا۔ یہ اس کی روٹین میں شامل تھا۔ ہر سال کچھ دنوں کے لیے امامہ اور سکندر عثمان سے ملنے آ جانا۔ اپنی زندگی اور بزنس کی بے پناہ مصروفیات میں بھی وہ کبھی یہ نہیں بھولتا تھا۔
"صرف ایک لڑکی؟" حمین نے بڑی سنجیدگی سے امامہ سے کہا جو اس کی پلیٹ میں کچھ اور آملیٹ ڈال رہی تھی۔ وہ پچھلے کچھ عرصے سے ہر بار اس کے پاکستان آنے پر اس سے شادی کے حوالے سے کچھ نہ کچھ کہتی رہتی تھی وہ ہنس کر ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتا تھا۔
"میں سیریس ہوں، مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔" امامہ نے اسے گھورا تھا۔
"باقی تینوں میں سے ہر ایک آزاد پھر رہا ہے تو میں نے کیا گناہ کیا ہے۔" حمین نے اس سے کہا تھا۔
"جبریل کے پاس ابھی شادی کے لیے وقت نہیں۔ عنایہ کی تو ریزیڈنسی مکمل ہوتے ہی کروں گی۔ رئیسہ اور

تمہارے لیے اب تلاش شروع کرتی ہوں۔" امامہ نے اپنے لیے کپ میں چائے ڈالتے ہوئے کہا۔
"آپ کو کچھ تعمیری کام کرنا چاہیے۔" حمین نے اسے چھیڑا۔
"مثلاً؟" اس نے جواباً بڑی سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔
"ڈھونڈتا ہوں آپ کے لیے کوئی تعمیری کام۔" حمین نے آملیٹ کا آخری ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔
"یہاں کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے اور اس عمر میں نئے سرے سے کوئی ایکٹوٹی ڈھونڈنا مشکل ہوتا ہے۔ اتنے سالوں سے ایک روٹین کی عادی ہوں اور پاپا کو اس طرح گھر چھوڑ کر میں کوئی ایکٹوٹی ڈھونڈنا بھی نہیں چاہتی۔" امامہ نے اس سے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا، یوں جیسے اسے خدشہ ہو وہ واقعی اس کے لیے کوئی ایکٹوٹی ڈھونڈنے نہ چل پڑے، وہ تھا بھی تو ایسا ہی۔
حمین نے امامہ کو بڑے پیار سے دیکھا۔ وہاں اسلام آباد کے ایک گھر میں اپنی منتخب کردہ گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے ہوئے بھی وہ ان سب کی زندگی کا محور تھی۔ حمین نے جو سال بچپن میں یہاں سالار اور جبریل کی عدم موجودگی میں امامہ کے ساتھ گزارے تھے وہ ان دونوں کو بہت قریب لے آئے تھے۔ وہ اس سے پہلے اپنے ہر دکھ سکھ کی بات جبریل سے کرنے کی عادی تھی، اب حمین سے کرنے لگی تھی۔ اس نے امامہ کی بات سننے اور ماننے کی عادت ان ہی سالوں میں سیکھی تھی۔
"ممی! آپ نے فیملی کے لیے سب سے زیادہ قربانیاں دی ہیں۔" حمین نے یک دم پتا نہیں کس ذہنی رو میں اس سے کہا تھا۔ وہ اس کی بات پر چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے مسکرا دی تھی۔
"ہمیشہ عورت ہی دیتی ہے حمین۔۔۔ میں نے کوئی انوکھا کام نہیں کیا۔" اس نے بڑی لاپروائی سے حمین سے کہا تھا۔
"اگر آپ کو کبھی اپنے جیسی کوئی عورت ملے تو مجھے اس سے ضرور ملوائیں، ہو سکتا ہے میں شادی کرلوں اس سے بلکہ فوراً کرلوں گا۔" اس نے کہا۔
امامہ بڑے پراسرار انداز میں مسکرائی "یہ کام تو بڑا آسان کردیا ہے تم نے میرے لیے۔"
"تمہارے ساتھ چلنا اور زندگی گزارنا بھی بہت مشکل ہوگا حمین۔۔۔ تم بھی کام کے معاملے میں اپنے بابا جیسے ہو ۔۔۔ workaholic۔ کام سامنے ہونے پر سب کچھ بھول بیٹھے۔" امامہ نے اس سے کہا تھا۔
"بابا سے موازنہ نہ کریں میرا۔۔۔ ان کی اور میری اسپیڈ میں بہت فرق ہے۔" وہ خوش دلی سے ہنسا تھا۔
"رئیسہ اچھی لڑکی ہے۔" امامہ نے یک دم کہا تھا۔ حمین کی سمجھ میں نہیں آیا اسے بیٹھے بٹھائے رئیسہ کیوں یاد آگئی تھی۔ امامہ نے بھی اس سے آگے کچھ نہیں کہا تھا۔
"ہاں، رئیسہ بہت اچھی لڑکی ہے۔" اس نے بھی سوچے سمجھے بغیر ماں کی بات کی تائید کی تھی اور اسے ہشام اور رئیسہ کا مسئلہ یاد آگیا تھا جسے ڈسکس کرنے کے لیے وہ امامہ کے پاس آیا تھا۔ مگر اگلے دن سکندر عثمان کی اچانک موت نے اسے یہ کرنے نہیں دیا۔



سکندر عثمان ان سب کی زندگی سے بے حد خاموشی سے چلے گئے تھے۔ وہ حمین کی وہاں آمد کے دوسرے دن نیند سے نہیں جاگے تھے۔ اس وقت اس گھر میں صرف امامہ اور حمین ہی تھے۔ طیبہ امریکہ میں تھیں۔
اس رات حمین، سکندر عثمان کے پاس بہت دیر تک بیٹھا رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح، وہ جب بھی یہاں آتا تھا

تمام۔ اور ان کے لیے ہی آتا تھا۔ سکندر عثمان سے وہ سالار کے دوسرے بچوں کی نسبت زیادہ اُنسیت رکھتا تھا اور ایسا ہی اُنس سکندر عثمان بھی اس سے رکھتے تھے۔ الزائمر کی اس انتہائی اسٹیج پر بھی حمین کے سامنے آنے پر ان کی آنکھیں چمکتی تھیں یا کم از کم دوسروں کو لگتی تھیں۔ کچھ بھی بول نہ سکنے کے باوجود وہ اسے دیکھتے رہتے تھے اور وہ دادا کا ہاتھ پکڑے ان کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ ان سے خود ہی بات چیت کی کوشش کرتا رہتا۔ خود سوال کرتا، خود جواب دیتا جیسے بچپن میں کرتا تھا اور ویسی ہی باتیں جو بچپن میں ہوتی تھیں اور تب سکندر عثمان ان کے جواب دیا کرتے تھے۔

"دادا! جانتے ہیں شترمرغ کی کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں؟" وہ ان کے ساتھ واک کرتے کرتے یک دم ان سے پوچھتا۔ سکندر عثمان الجھے شترمرغ کی تصویر ذہن میں لانے کی کوشش کرتے پھر ہار مانتے۔

"مرغ کی دو ہوں گی تو شترمرغ کی بھی دو ہوں گی دادا۔ یہ تو سوچے بغیر بتا دینے والا جواب تھا۔" سکندر عثمان اس کی بات پر سر ہلانے لگتے۔

سکندر عثمان کی یادداشت کے دیے حمین سکندر نے اپنے سامنے ایک ایک کر کے بجھتے دیکھے تھے اور ایک بچے کے طور پر الزائمر کو نہ سمجھنے کے باوجود اس نے اپنے دادا کے ساتھ مل کر ان دیوں کی روشنی کو بچانے کی بے پناہ کوشش کی تھی۔

وہ کسی بھی چیز کا نام بھول جانے پر انہیں تسلی دے دیا کرتا تھا کہ یہ نارمل بات تھی۔ اور بھولنا تو اچھا ہوتا ہے اسی لیے وہ بھی بہت ساری چیزیں بھولتا ہے۔ وہ بچے کی لاجک تھی اور بڑے کے سامنے لنگڑی تھی مگر سکندر عثمان کو اس عمر میں اس بیماری سے لڑتے ہوئے ویسی ہی لاجک چاہیے تھی جو انہیں یہ یقین دلا دیتی کہ وہ ٹھیک تھے، سب کچھ نارمل تھا۔

حمین ان کی بیماری کے بڑھتے جانے پر آہستہ آہستہ کر کے ان کے کمرے کی ہر چیز پر اس چیز کا نام کاغذ کی چٹوں پر لکھ کر چسپاں کر دیا کرتا تھا تاکہ دادا کچھ نہ بھولیں، وہ جس چیز کو دیکھیں اس کا نام یاد کرنے کے لیے انہیں تردد نہ کرنا پڑے۔ وہ چٹیں سینکڑوں کی تعداد میں تھیں اور اس کمرے میں آنے والے ہر شخص کو ایک بار سکندر عثمان کے ساتھ اس بیماری سے لڑنے والے اس دوسرے شخص کے بارے میں سوچنے پر بھی مجبور کر دیتیں اور حمین نے اس بیماری کے سامنے پہلی ہار اس دن مانی تھی جس دن سکندر عثمان اس کا نام بھول گئے تھے۔ وہ بے یقینی سے ان کا چہرہ دیکھتا رہا تھا۔ وہ آخر اس کا نام کیسے بھول گئے تھے؟ اس وجود کا جو چوبیس میں سے بارہ گھنٹے ان کے اردگرد منڈلاتا رہتا تھا۔ اس کے سامنے کھڑے سکندر عثمان اس کا نام یاد کرتے "اٹکتے" "الجھتے" "ہکلاتے" گڑگڑاتے رہے اور حمین ان کی جدوجہد اور بے بسی دیکھتا رہا۔

پھر وہ بڑی خاموشی سے سینٹر ٹیبل کے پاس گھٹنے ٹیک کر بیٹھا۔ وہاں پڑی ایک اسٹک آن چٹ اس نے اٹھائی، اس پر اپنا نام لکھا اور پھر اپنے ماتھے پر اسے چسپاں کرتے ہوئے وہ سکندر عثمان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا اور شاید زندگی میں پہلی بار لیکن وہ نہیں رویا تھا اس نے جیسے سکندر عثمان کے سامنے اس بات کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بات الزائمر سے جنگ کرتے اس شخص کے لیے مذاق نہیں تھی۔ وہ اس کے نام کے اسپیلنگ کرتے کرتے ہنس پڑے تھے اور پھر ہنستے ہنستے وہ وہیں کھڑے کھڑے اپنی مٹھیاں بھینچتے رونے لگے تھے اور ان سے قد اور عمر میں چھوٹے حمین نے اپنی عمر سے بڑے اس بوڑھے شخص کو تھپکتے ہوئے تسلی دی تھی جو اپنی "نا اہلی" اور "مجبوری" پر نادم تھا اور جو اپنے چہیتے ترین رشتے کا نام یاد رکھنے سے بھی قاصر تھا۔ ان کی اس بیماری نے حمین سکندر کو وقت سے پہلے میچور کر دیا تھا۔ جبریل نے سالار

سکندر کی بیماری کو جھیلا تھا' حمین نے سکندر عثمان کی وہ اسے اپنے ساتھ جوڑے رکھنے کے لیے اسے اپنی چیزیں دینا شروع ہو گئے تھے۔

"دادا! آپ کو یہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" حمین جیسے سمجھ جاتا تھا کہ وہ بارڈر ڈیل۔۔۔ کس شے کے لیے تھی "میرے پاس دنیا میں جتنا وقت ہے' آپ کے لیے ہے۔"

(I have all the time in the world for you)

وہ جیسے انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتا۔ وہ پھر بھی اسے کچھ نہ کچھ دینے کی کوشش کرتے' حمین ان کے بہت سارے رازوں سے واقف تھا۔ ان بہت ساری جگہوں سے بھی جہاں وہ اپنی قیمتی چیزیں چھپاتے تھے اس پر ان کے اعتبار کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر چیز چھپاتے ہوئے صرف حمین سکندر کو بتاتے تھے صرف اس لیے کیونکہ انہیں یہ خدشہ تھا کہ وہ کہیں اس جگہ کو بھی نہ بھول جائیں جہاں وہ سب کچھ چھپا رہے تھے۔ اور ایسا ہی ہوتا تھا ان کے بھولنے پر حمین انہیں وہ چیز نکال کر دیتا تھا۔ وہ کمرہ جیسے ان دونوں دادا اور پوتے کے لیے چھپن چھپائی والی جگہ بن گیا تھا۔

"ایک دن تم بہت بڑے آدمی ہو گے۔" سکندر عثمان اس سے اکثر کہا کرتے تھے۔ "اپنے بابا سے بھی بڑے آدمی۔"

وہ ان کی بات غور و فکر کے بغیر سنتا پر بیچ میں انہیں ٹوک کر پوچھتا۔

"خالی بڑا آدمی ہوں گا یا rich (امیر)؟ بابا تو rich (امیر) نہیں ہیں۔" اسے جیسے فکر لاحق ہوئی۔ سکندر عثمان ہنس پڑے۔

"بہت امیر ہو جاؤ گے۔۔۔ بہت زیادہ۔"

"پھر ٹھیک ہے۔" اسے جیسے اطمینان ہوتا "لیکن آپ کو کیسے پتا؟" اسے یک دم خیال آیا۔

"کیونکہ میں تمہارے لیے دعا کرتا ہوں۔" سکندر عثمان بڑھاپے کی اس لاٹھی کو دیکھتے جو ان کے سب سے عزیز بیٹے کا ان کے لیے تحفہ تھا۔

"او کے۔" حمین کے ذہن میں مزید سوالات آئے تھے لیکن وہ دادا سے اب بحث نہیں کرتا تھا۔

"میں تم پر دنیا میں سب سے زیادہ اعتماد کرتا ہوں۔" وہ اکثر اس سے کہتے تھے اور وہ بڑی سنجیدگی سے ان سے کہتا۔

"اور آپ واحد انسان ہیں جو یہ کام کرتے ہیں۔" اور سکندر عثمان جواباً کسی بچے کی طرح ہنسنے لگتے تھے۔

"جب میں اس دنیا سے چلا جاؤں گا تو یہ رنگ تم امامہ کو دے دینا۔" اعتماد کے ایسے ہی ایک لمحے میں انہوں نے حمین کو وہ انگوٹھی دکھائی تھی جسے وہ کئی سال اپنی ماں کی انگلی میں دیکھتا رہا تھا۔

"یہ تو ممی کی رنگ ہے۔" حمین جیسے چلایا تھا۔

"ہاں تمہاری ممی کی ہے۔ سالار نے شادی پر گفٹ کی تھی اسے۔ پھر وہ اسے بیچ کر سالار کے پراجیکٹ میں کچھ انویسٹمنٹ کرنا چاہتی تھی' تو میں نے اسے لے کر اسے وہ رقم دے دی۔ میں اسے واپس دوں گا تو وہ نہیں لے گی اور میں نہیں چاہتا' وہ اور سالار اسے بیچ کر مجھے میرا قرض واپس دینے کی کوشش کریں۔"

سکندر عثمان بتاتے گئے تھے۔ انہوں نے اسے ایک تھیلی میں ڈال کر اپنی وارڈروب کے ایک چور خانے میں حمین کے سامنے رکھا تھا۔ وہ چور خانہ حمین نے بھی پہلی بار ہی دیکھا تھا۔

"آپ اسے لاکر میں کیوں نہیں رکھوا دیتے؟" اس نے سکندر عثمان کو مشورہ دیا تھا۔ وہ مسکرا دیے تھے۔

"میرے مرنے کے بعد لاکر سے جو کچھ بھی نکلے گا' وہ ساری اولاد کی مشترکہ ملکیت ہوگا۔ کوئی یہ امامہ کو نہیں دے گا۔" سکندر نے کہا۔

"لیکن آپ will (وصیت) میں لکھ سکتے ہیں۔" سکندر اس کی بات پر ہنس پڑے تھے۔

"میری اولاد بہت اچھی ہے 'لیکن میں زندگی میں ان سے بہت ساری باتیں نہیں منوا سکتا تو مرنے کے بعد کیسے منوا سکوں گا' جب تمہاری اولاد ہوگی تو تمہیں سمجھ آجائے گی میری باتوں کی۔" انہوں نے جیسے بڑے پیار کے ساتھ اس سے کہا تھا۔

سکندر عثمان کی موت کے ایک ہفتے کے بعد اس گھر میں ان کی اولاد ترکے کی تقسیم کے لیے اکٹھی ہوئی تھی اور حمین سکندر کی سمجھ میں وہ بات آگئی تھی ——— سکندر عثمان اپنی زندگی میں ہی سب کچھ تقسیم کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنے پاس صرف چند چیزیں رکھی تھیں، جن میں وہ گھر بھی تھا، لیکن ان چند چیزوں کی ملکیت پر بھی سب میں کچھ اختلافات ہو گئے تھے اور یہ اختلافات بڑھ جاتے اگر سالار سکندر اور اس کا خاندان سکندر عثمان کے رہ جانے والے اثاثوں پر اپنے حصے کے حوالے سے کلیم کرتا۔ وہ ان کے خاندان کا مشترکہ فیصلہ تھا۔

سکندر عثمان کے بچنے والے اثاثوں میں سے سالار سکندر اور اس کے خاندان نے کچھ نہیں لیا تھا۔ البتہ سکندر عثمان کا وہ گھر حمین سکندر نے خریدنے کی آفر کی تھی کیونکہ طیبہ پہلے بھی زیادہ تر اپنے بیٹوں کے پاس بیرون ملک رہتی تھیں اور وہ اب مستقل طور پر ان کے پاس رہنا چاہتی تھیں اور ان کے وہاں سے شفٹ ہو جانے کے فیصلے کے بعد اس گھر کو فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور اس فیصلے کے دوران کسی نے امامہ کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ سالار سکندر اور اس کے اپنے بچوں کے علاوہ جنہیں یہ احساس ہو رہا تھا کہ سکندر عثمان کے چلے جانے

کے بعد اس گھر کے نہ رہنے سے ایک شخص ایک بار پھر دربدر ہونے والا تھا۔ حمین نے اس گھر کو صرف امامہ کے لیے خریدا تھا اور ان یادوں کے لیے جو ان سب کی اس گھر سے وابستہ تھیں۔ اور اس نے جس قیمت پر اسے خریدا تھا' وہ مارکیٹ سے دوگنی تھی۔



"ممی! مجھے آپ کو ایک امانت دینی ہے۔" حمین رات کو سالار اور امامہ کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ صبح واپس جا رہا تھا۔ باری باری ——— سب ہی واپس جا رہے تھے۔ سالار اور وہ دونوں کچھ دیر پہلے ہی کمرے میں آئے تھے' جب وہ دستک دے کر ان کے کمرے میں آیا تھا۔

"امانت؟" وہ کچھ حیران ہوئی تھی۔ حمین نے ایک تھیلی اس کے ہاتھ پر رکھی اور اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے کچھ حیران ہوتے ہوئے پہلے حمین پھر سالار کو دیکھا جو فون پر کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔

"آپ خود دیکھ لیں۔" حمین نے اسے کہا' امامہ نے تھیلی میں ہاتھ ڈال کر اندر موجود چیز نکالی اور ساکت رہ گئی۔ فون پر بات کرتا سالار بھی اسی طرح ٹھٹکا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ دونوں اس انگوٹھی کو سیکنڈز میں نہ پہچان جاتے جو ان کی زندگی کی بہترین اور قیمتی ترین یادوں میں سے ایک تھی۔

"یہ تمہیں کہاں سے ملی؟" امامہ نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔ سالار نے فون منقطع کر دیا تھا۔

"دادا نے بچپن میں میرے سامنے وارڈ روب میں ایک دراز میں رکھتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ اگر وہ اسے

بھول جائیں تو ان کے مرنے کے بعد میں اسے وہاں سے نکال کر آپ کو دے دوں۔" حمین کہہ رہا تھا۔
"وہ آپ کو یہ واپس دے دینا چاہتے تھے لیکن انہیں خدشہ تھا کہ آپ اسے نہیں لیں گی اور ایسا نہ ہو آپ اور بابا ان کا قرض ادا کرنے کے لیے اسے بیچ دیں۔"
آنسو سیلاب کی طرح امامہ کی آنکھوں سے نکل کر اس کے چہرے کو بھگوتے چلے گئے۔ سکندر عثمان ہمیشہ اس کا بہت شکریہ ادا کرتے رہتے تھے لیکن اس تشکر کو انہوں نے جس طرح اپنے جانے کے بعد اسے پہنچایا تھا' اس نے امامہ کو بولنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ایک شفیق باپ تھے لیکن اس سے بڑھ کر ایک شفیق سسر تھے۔
"تم نے کبھی بھی پہلے اس رنگ کے بارے میں ذکر نہیں کیا۔" سالار نے اپنے سامنے بیٹھے اپنے اس بیٹے کو دیکھا جو آج بھی ویسا ہی عجیب اور گہرا تھا جیسا بچپن میں تھا۔
"میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ میں کبھی کسی کو اس انگوٹھی کے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔ یہ ایک امانت تھی' میں خیانت نہیں کر سکتا تھا۔" اس نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ باپ سے کہا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہموار قدموں سے چلتا ہوا وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ دونوں تب تک اسے دیکھتے رہے' جب تک وہ غائب نہیں ہو گیا۔
"میں یہ انگوٹھی حمین کی بیوی کو دوں گی۔ اس پر اگر کسی کا حق ہے تو وہ حمین کا ہے۔" اس کے جانے کے بعد امامہ نے بھرائی آواز میں سالار سے کہا تھا۔ وہ انگوٹھی ابھی بھی اس کی ہتھیلی پر تھی جسے وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ دیکھ رہی تھی' کئی سالوں کے بعد' کئی سال پہلے کی ساری یادیں ایک بار پھر زندہ ہو گئی تھیں۔
سالار نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ اس نے امامہ کے ہاتھ سے وہ انگوٹھی لی اور بڑی نرمی سے اس کی انگلی میں پہنا دی۔ اس کی مخروطی انگلی میں آج بھی بے حد آسانی سے پوری آگئی تھی۔
"تمہارا بہت شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا میں امامہ۔" اس نے امامہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہنا شروع کیا "تم نے پاپا کی جتنی خدمت کی ہے' وہ میں نہیں کر سکتا تھا نہ ہی میں نے کی ہے۔"
"سالار!" امامہ نے اسے ٹوکا تھا۔ "تم مجھے شرمندہ کر رہے ہو۔"
"مجھے اگر زندگی میں دوبارہ شریک حیات کا انتخاب کرنے کا موقع ملے تو میں آنکھیں بند کر کے تمہیں چنوں گا۔"
وہ نم آنکھوں کے ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اس نے ہاتھ کی پشت پر سجی اس انگوٹھی کو دوبارہ دیکھا۔ سولہ سال کی جدائی تھی جو اس نے اس گھر میں سالار سے الگ رہ کر جھیلی تھی۔ وہ تب چند سال یہاں گزارنے آئی تھی اور تب وہ جیسے تلوار کی ایک دھار پر ننگے پاؤں چل رہی تھی۔ وہ سکندر عثمان کا خیال رکھتے ہوئے دن رات سالار کے لیے خوف زدہ رہتی تھی اور اس نے سالار کو یہ نہیں بتایا تھا مگر اس نے یہ دعا کی تھی تب کہ اگر سکندر عثمان کی خدمت کے عوض اسے اللہ نے کوئی صلہ دینا تھا تو وہ سالار سکندر کی زندگی اور صحت یابی کی شکل میں دے دے اور آج سولہ سال بعد اسے لگتا تھا شاید ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کی زندگی کا وہ ساتھی آج بھی اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ انگوٹھی ایک بار پھر سے اس کے ہاتھ میں سج گئی تھی اور وہ سولہ سال بعد بالآخر ایک بار پھر سے سالار اور اپنے بچوں کے ساتھ مستقل طور پر امریکہ جا کر رہ سکتی تھی۔ بے شک وہ اپنے رب کی کسی بھی نعمت کا شکر ادا نہیں کر سکتی تھی۔
"میں نے آج بہت عرصے بعد ایک خواب دیکھا۔ وہی خواب۔" وہ چونکی' سالار اسے کچھ بتا رہا تھا۔



"ہشام مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔" اپنے سامان کی پیکنگ کرتے ہوئے حمین نے رئیسہ سے کہا وہ بھی ابھی سکندر عثمان کے گھر پر ہی تھی اور چند دن اسے بھی وہاں ٹھہرنا تھا۔ وہ حمین کو اس کا کچھ سامان دینے آئی تھی جب اس نے اچانک اس سے کہا تھا۔

"وہ شاید دادا کی تعزیت کے لیے ملنا چاہتا ہو گا۔" وہ ایک لمحہ کے لیے اٹکی پھر اس نے روانی سے اس سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔" حمین نے اسی طرح کام میں مصروف ہوتے ہوئے کہا "تعزیت کے لیے وہ تم سے ملتا یا بابا سے ملتا مجھ سے ملنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تم دونوں کے درمیان کچھ بات چیت ہوئی ہے کیا؟" اس نے اپنے ہمیشہ کے دو ٹوک اور صاف گو انداز میں رئیسہ سے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے پوچھا۔ رئیسہ چند لمحے سوچتی رہی پھر اس نے حمین سے اپنی اور ہشام کی کچھ ہفتے پہلے ہونے والی ملاقات اور گفتگو دہرائی تھی۔

"تو اب وہ کیا چاہتا ہے؟" حمین نے پوری بات سننے کے بعد صرف ایک سوال کیا تھا کوئی تبصرہ نہیں۔

"پتا نہیں۔ شاید تم سے کہے گا کہ تم مجھے مناؤ۔"

حمین نے نفی میں سر ہلایا "نہیں وہ مجھ سے یہ بھی نہیں کہے گا کہ میں تمہیں اس کی دوسری بیوی بننے پر آمادہ کروں اتنا عقل مند تو ہے وہ کہ ایسا پرپوزل میرے پاس لے کر نہ آئے۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"رئیسہ، تم کیا چاہتی ہو؟" چند لمحے بعد اس نے دو ٹوک انداز میں رئیسہ سے پوچھا۔

"میری چوائس کا ایشو نہیں ہے۔" وہ کچھ بے دلی سے مسکرائی "اس کا مسئلہ جینوئن ہے تم نے ٹھیک کہا تھا وہ شاہی خاندان ہے اور اس کے اپنے قواعد و ضوابط ہیں۔ اپنی سوچ ہے مجھے بہت پہلے ہی اس میں نہیں پڑنا چاہیے تھا۔"

حمین اسے دیکھتا رہا اس کے سامنے بیٹھی وہ جیسے خود کلامی کے انداز میں بولتی جا رہی تھی یوں جیسے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"بادشاہ بزدل ہے۔" حمین نے مدہم آواز میں اس سے کہا۔ وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔ "اور بزدل نہ پیار کر سکتے ہیں نہ حکومت' نہ وعدہ نبھا سکتے ہیں نہ تعلق۔" حمین نے جیسے اسے ہشام بن صباح کا مسئلہ چار جملوں میں سمجھایا تھا جو وہ سمجھنے سے گریزاں تھی۔

"لوگ پیار کے لیے تخت و تاج ٹھکراتے ہیں نا تو وہ ٹھکرائے... اگر بادشاہ رہ کر تمہیں زندگی کا ساتھی نہیں بنا سکتا تو بادشاہت چھوڑ دے۔" رئیسہ ہنس پڑی۔

"بادشاہت چھوڑ دے... میرے لیے؟ میں اتنی قیمتی نہیں ہوں حمین کہ کوئی میرے لیے بادشاہت چھوڑتا پھرے۔" اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا تھا۔

"ہو سکتا ہے ہو... ہو سکتا ہے نہیں بھی نہ ہو۔ اور اگر وہ تمہاری قدر و قیمت پہچاننے کے قابل نہیں ہے تو ساتھ زندگی گزارنے کے قابل تو بالکل نہیں ہے۔" وہ دو ٹوک انداز میں کہہ رہا تھا۔

"تو حل میرے پاس ہے اب دیکھتے ہیں اس کی سمجھ میں آتا ہے یا نہیں... میں واپس جا کر اس سے ملوں گا۔" حمین نے اعلان کرتے ہوئے کہا۔ رئیسہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔



"ڈاکٹر احسن سعد آپ کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں بلکہ وہ بتا رہے تھے کہ ان کے والد صاحب بابا کے بھی بڑے قریبی دوست تھے۔ عبداللہ ہی بتا رہا تھا کہ وہ اور ان کے والد دادا کی تعزیت کے لیے امریکہ میں آکر ملیں گے بابا سے۔" عنایہ چہل قدمی کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

وہ اور جبریل لان میں چہل قدمی کر رہی تھے جب عنایہ کو اچانک عبداللہ کے ذکر چھیڑے جانے پر احسن سعد یاد آیا اور اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو اس نے جبریل سے اس کا ذکر کرنا ضروری سمجھا۔

احسن سعد کا نام ہی جبریل کو چونکانے کے لیے کافی تھا لیکن وہ یہ سن کر زیادہ حیران ہوا تھا کہ جس احسن سعد کی وہ بات کر رہی تھی وہ نہ صرف جبریل سکندر کو جانتا تھا بلکہ اس کا باپ سالار کا قریبی دوست تھا۔ وہ الجھا تھا جس احسن سے وہ ملا تھا اس نے ایسا کوئی ذکر یا حوالہ نہیں دیا تھا۔ اسے عائشہ کے سابقہ شوہر کی تفصیلات کا پتا نہیں تھا سوائے اس کے نام پروفیشن اور اسٹیٹ کے۔ فوری طور پر وہ یہ سمجھ نہیں سکا کہ یہ وہی احسن سعد تھا یا وہ کسی اور کا ذکر کر رہی ہے یہ بات کنفیوز کر رہی تھی۔

"عبداللہ تو بے حد انسپائرڈ ہے اس سے کہہ رہا تھا نکاح کے گواہوں میں سے ایک وہ احسن سعد کو رکھے گا۔ اس نے تو احسن سعد کو پیر و مرشد بنایا ہوا ہے' ہر بات میں اس کا حوالہ دیتا ہے۔" وہ کہتی جا رہی تھی اور جبریل بے چین ہونے لگا تھا۔

"عبداللہ ان ہی کے ساتھ پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے۔ مجھے بھی اچھا لگا وہ۔ ذکر تو پہلے بھی عبداللہ سے سنتی رہی تھی لیکن مل کر مجھے حیرانی ہوئی کہ وہ کافی ینگ ہے۔ بہت علم ہے دین کے بارے میں۔۔۔ اور حافظ قرآن بھی ہے۔"

عنایہ کہتی ہی جا رہی تھی۔ جبریل اب بولے بغیر نہیں رہ سکا۔

"شادی شدہ ہے؟" اس نے خواہش کی تھی وہ کوئی اور احسن سعد ہو۔ "نہیں بس بڑی ٹریجڈی ہوئی ہے اس کے ساتھ۔" عنایہ کے جواب نے جیسے اس کا دل نکال کر رکھ دیا تھا۔

"بیوی سائیکو اور خراب کریکٹر کی تھی۔ کسی کے ساتھ اس کا افیئر چلتا رہا اور احسن سعد بے چارے کو پتا ہی نہیں تھا پھر ڈائی وورس ہو گئی لیکن بیوی نے بچے کی کسٹڈی بھی نہیں دی اور اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ مل کر اس معذور بچے کو جان سے مار دیا تاکہ دونوں شادی کر سکیں اور بچے کے نام جو جائیداد تھی' وہ اسے مل جائے۔۔۔ احسن سعد نے کیس کیا تھا اپنی سابقہ بیوی کے خلاف قتل کا۔۔۔ تو اس عورت نے کچھ پیچ اپ کرنے کی کوشش میں اس بچے کے نام جو بھی جائیداد تھی' وہ اس کے نام کر کے معافی مانگی ہے۔ بہت اچھا انسان ہے وہ کہہ رہا تھا معاف کر دے گا اب بیٹا تو چلا گیا۔" عنایہ بڑی ہمدردی کے ساتھ وہ تفصیلات سنا رہی تھی۔

"تم جانتی ہو وہ بوائے فرینڈ کون ہے۔ جس نے احسن سعد کی بیوی کے ساتھ مل کر اس کے معذور بچے کا قتل کیا ہے؟" جبریل نے یک دم اسے ٹوکا تھا۔ عنایہ نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ جبریل کا سوال جتنا عجیب تھا اس کا لہجہ اور تاثرات اس سے زیادہ عجیب۔

"نہیں میں کیسے جان سکتی ہوں' ویسے عبداللہ احسن سعد سے کہہ رہا تھا کہ اسے اپنی سابقہ بیوی اور اس کے بوائے فرینڈ کو معاف نہیں کرنا چاہیے۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔" عنایہ نے روانی میں کہا اور جبریل کے اگلے جملے نے اس کا ذہن جیسے بھک سے اڑا دیا تھا۔

"وہ بوائے فرینڈ میں ہوں۔" بے حد بے تاثر آواز میں جبریل نے اس سے کہا تھا۔

"اور عنایہ! میں ایرک عبداللہ سے تمہاری شادی بھی نہیں ہونے دوں گا۔" اس کا اگلا جملہ پہلے سے بھی زیادہ ناقابل یقین تھا۔



سالار سکندر عثمان کے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ لائٹ آن کر کے اس نے سکندر عثمان کے بستر کو دیکھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی نمی دوڑی تھی۔ کئی سالوں سے اب اس کے اور ان کے درمیان صرف خاموشی کا رشتہ ہی رہ گیا تھا۔ بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ اس کے باوجود اسے ان کے وجود سے ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔

"میں اپنی نظروں کے سامنے تمہیں جاتا ہوا نہیں دیکھ سکتا سالار اس لیے بس یہی دعا کرتا ہوں کہ تم سے پہلے چلا جاؤں۔ تمہارا دکھ نہ دکھائے اللہ کسی بھی حالت میں مجھے۔"

سالار کو لگا جیسے یہ جملے پھر اس کمرے میں گونجے تھے۔ انہوں نے اس کی بیماری کے دوران کئی بار اس سے یہ باتیں کہی تھیں۔ اور ان کی دعا قبول ہو گئی تھی، وہ سالار کا دکھ دیکھ کر نہیں گئے تھے۔

"کیا فرق پڑتا ہے پاپا... ہر ایک کو جانا ہے دنیا سے... جس کا رول ختم ہو جائے وہ چلا جاتا ہے۔" سالار کئی بار انہیں جواباً کہتا تھا۔

"جوان بیٹے کا غم اللہ کسی کو نہ دکھائے سالار۔" وہ رو پڑے تھے اور یہ آنسو سالار نے ان کی آنکھوں میں صرف اپنی بیماری کی تشخیص کے بعد دیکھنا شروع کیے تھے، ورنہ سکندر عثمان کہاں بات بات پر رو پڑنے والے آدمی تھے۔

وہ ان کی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ اور امامہ اب وہاں سے جانے والے تھے۔ وہ کمرہ اور وہ گھر اب بے مکین ہونے والا تھا۔ وہ ہفتوں سے وہاں تھا اور اس سے زیادہ وہ وہاں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ حمین پہلے جا چکا تھا اور اب جبریل اور عنایہ بھی اس کے پیچھے چلے جاتے، پھر امامہ... جو سب سے آخر میں وہاں سے جاتی اور پھر پتا نہیں اس گھر میں دوبارہ کبھی وہ یوں اکٹھے بھی ہو پاتے یا نہیں... اور اکٹھے ہوتے بھی تو بھی پتا نہیں کب۔

زندگی کیا شے ہے، کیسے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ وقت کیا شے ہے رکتا ہے تو رک ہی جاتا ہے، چلتا ہے تو پہیوں پر۔

"میں آپ جیسا باپ کبھی نہیں بن سکا اپنی اولاد کے لیے پاپا۔" اس نے مدہم آواز میں وہاں بیٹھے خود کلامی کی۔

"میں آپ جیسا بیٹا بھی کبھی نہیں بن سکا۔" وہ رک کر دوبارہ بولا۔

"لیکن میرے بیٹے آپ جیسے باپ بنیں اور آپ جیسے ہی بیٹے... میرے جیسے نہیں... میری صرف یہ دعا ہے۔"

اس نے نم آنکھوں کے ساتھ ٹیبل پڑے ان کے گلاسز اٹھا کر چھوئے پھر انہیں ٹیبل پر رکھ کر دوبارہ اٹھ گیا۔

✿ ✿ ✿

"بیوی کو کیوں مارا؟"

"ایک بڑے آدمی کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات تھے۔"

"پھر؟"

"پھر مجھے پتا چلا کہ جسے میں اپنی بیٹی سمجھتا تھا، وہ بھی اس کی بیٹی تھی۔"

"پھر؟"

"پھر... بس برداشت نہیں کر سکا میں... میں غیرت مند تھا، اسے بھی قتل کر دیا، باقی اولاد کو بھی... پتا نہیں وہ بھی میری تھی یا نہیں۔"

CNN پر غلام فرید کے ساتھ ہونے والا وہ انٹرویو انگلش سب ٹائٹلز کے ساتھ چل رہا تھا اور دنیا کے تمام بڑے

چینلز اس وقت اس انٹرویو کو بریکنگ نیوز کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ صرف دس منٹوں میں دنیا بھر میں سالار سکندر اور SIF ایک بار پھر زبان زدعام ہونے والی تھی اور اس بار یہ "شہرت" نہیں رسوائی تھی جو اس خاندان کے حصے میں آنے والی تھی۔

"وہ بڑا آدمی کون تھا؟" انٹرویوئر نے غلام فرید سے اگلا سوال کیا۔

"میں اس کا چوکیدار تھا" اس کے اسکول کا۔ اس نے مجھے اس لیے وہاں سے نکال دیا کہ اس کے میری بیوی سے تعلقات تھے۔"

انٹرویو کرنے والے نے غلام فرید کو ٹوکا۔ "اس بڑے آدمی کا نام کیا تھا؟"

"سالار سکندر" غلام فرید نے بے حد روانی سے کہا۔

دنیا بھر کی ٹی وی اسکرینز پر عین اسی لمحے سالار سکندر کی تصویر نمودار ہوئی تھی اور پھر اس کے چند لمحے بعد رئیسہ سالار کی۔ بیک وقت۔ ایک ہی جیسی تصویریں۔

وہ CIA کا اسٹنگ آپریشن نہیں تھا، وہ انہوں نے پوری قوت اور طاقت سے مغربی انٹیلی جنس ایجنسیز کے اشتراک سے دنیا کے کامیاب ترین اسلامی مالیاتی نظام کے بانی اور SIF کی بنیادوں پر دن دہاڑے حملہ کیا تھا۔

"غلام فرید تم کیا چاہتے ہو؟" انٹرویو لینے والا اب اس سے پوچھ رہا تھا۔

غلام فرید ایک لمحہ کے لیے رکا پھر اس نے کہا۔ "سالار سکندر کے لیے پھانسی کی سزا۔"



نیروبی کے اس فائیو اسٹار ہوٹل میں ہونے والی تقریب افریقہ کی تاریخ کے یادگار ترین لمحوں میں سے ایک تھی۔ کچھ گھنٹوں کے لیے دنیا کی تمام آن لائن مارکیٹس جیسے اس ایک تقریب پر فوکس کر کے بیٹھ گئی تھیں جہاں SIF حمین سکندر کی کمپنی TAI کے ساتھ مل کر افریقہ میں دنیا کے سب سے بڑے مالیاتی فنڈز کے قیام کا اعلان کرنے والی تھی۔ وہ انضمام نہیں تھا، اشتراک تھا اور دنیا کا کوئی بڑا مالیاتی ادارہ نہیں تھا جس کا سربراہ وہاں اس فائیو اسٹار ہوٹل کے بینکوئیٹ ہال میں موجود نہ ہو۔ وہاں دنیا کے بہترین دماغ تھے "اپنی اپنی فیلڈز کے نامور لوگ" اور ان لوگوں کے جمگھٹے میں وہاں سالار سکندر اور حمین سکندر اس گلوبل فنڈ کا اعلان کرنے والے تھے۔ جس کی مالیت دنیا کے تمام بڑے مالیاتی اداروں کو پچھاڑنے والی تھی۔

9:14 پر بھی ٹیلی اسکوپ کی آنکھ سے اس ٹارگٹ کلر کو وہ "مہمان" لفٹ کے دروازے سے نمودار ہوتا نظر نہیں آیا۔ لیکن وہ دم سادھے "آنکھ ٹیلی اسکوپ پر لگائے" ایک انگلی ٹریگر پر رکھے لفٹ کا دروازہ کھلنے کا منتظر تھا۔

دس۔ نو۔ آٹھ۔ سات۔ چھ۔ پانچ۔ چار۔ تین۔ "۔ ایک۔

(آخری قسط ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

عمیرہ احمد



آبِ حیات

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کر دیا ہے۔ سالار نے امامہ کو وارڈ رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ مل جاتا ہے۔

1۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال



کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی سہیلی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ ہجے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی جسے دیکھ کر اس کے والدین اور وہاں کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرادی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کررہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کردیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بھی انکار کردیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال وجواب نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

پچیسویں اور آخری قسط

اس بینکوئٹ ہال کے اوپر والے فلور کے ایک کمرے کی ایک کھڑکی کے شیشوں سے ایک اور ٹیلی اسکوپ رائفل بالکل اسی طرح اس ٹارگٹ کلر کو نشانہ بنائے الٹی گنتی گننے میں مصروف تھی۔ وہ چوتھا فلور تھا اور وہ کمرہ اس فلور کے اسٹور رومز میں سے ایک تھا جہاں پر صفائی ستھرائی اور اسی طرح کا سامان ٹرالیوں میں بھرا پڑا تھا۔ جن لوگوں نے اس بینکوئٹ ہال میں اس مہمان کے لیے اس پیشہ ورانہ قاتل کا انتخاب کیا تھا ان ہی لوگوں نے اس قاتل کے لیے اس شخص کا انتخاب کیا تھا اور اس جگہ کا بھی جہاں وہ چالیس سالہ شخص رائفل کے ٹریگر پر انگلی رکھے ہم آنکھیں اس ٹارگٹ کلر پر لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے اس کمرے کو اندر سے لاک کر رکھا تھا۔ وہ ایک ٹرالی دھکیلتا ہوا اس کمرے میں صبح کے وقت آیا تھا جب اس فلور کے کمروں کی صفائی ہو رہی تھی اور پھر وہ اپنی ٹرالی کو اندر رکھ کر باہر جانے کے بجائے خود بھی اندر ہی رہ گیا تھا۔ وقتاً فوقتاً کچھ اور بھی ٹرالیاں لانے والے اندر آتے اور جاتے رہے تھے اور اس کے ساتھ ہیلو ہائے کا تبادلہ بھی کرتے رہے تھے مگر کسی کو اس پر شبہ نہیں ہوا تھا۔ ایک مقررہ وقت پر اس نے اسٹور روم کو اندر سے لاک کر لیا تھا کیونکہ اسے پتا تھا اب اس فلور کو بھی وقتی طور پر سیل کیا جانا تھا جب تک وہ کانفرنس وہاں جاری تھی۔

اسٹور روم کی کھڑکی کے شیشے میں اس کی ٹیلی اسکوپ رائفل کے لیے سوراخ پہلے سے موجود تھا جسے ٹیپ لگا کر وقتی طور پر بند کیا گیا تھا۔ اس نے ٹیپ ہٹانے سے پہلے ایک دوسری ٹیلی اسکوپ سے سڑک کے پاس اس عمارت کے اس فلیٹ کی اس کھڑکی کو دیکھا اور پھر اس پیشہ ور قاتل کو جو گھات لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی گھڑی کو دیکھ کر وقت کا اندازہ لگایا۔ ابھی بہت وقت تھا اور اس کی کھڑکی سے اس پیشہ ور قاتل کی کھڑکی کا منظر بے حد زبردست تھا۔ وہ پہلا فائر مس بھی کر جاتا تو بھی وہ قاتل اس کی رینج میں رہتا۔ بھاگتے ہوئے بھی۔ کھڑکی سے ہٹنے کی کوشش کے دوران بھی۔ انہوں نے جیسے اس کے لیے حلوہ بنا دیا تھا۔

اسے یقین تھا اس کھڑکی میں گھات لگانے کے بعد اس پیشہ ور قاتل نے اس ہوٹل کے اوپر نیچے کے ہر فلور کی کھڑکیوں کو اپنی ٹیلی اسکوپ رائفل سے ایک بار جیسے کھوجا ہوگا۔ کہیں کوئی غیر معمولی حرکت یا شخص کو ٹریس کرنے کی کوشش کی ہوگی وہ ٹیلی اسکوپ رائفل کھڑکی کے شیشے سے لگا کر بیٹھتا خود اس کی نظر میں نہ آتا تب بھی اس کی رائفل کی نال اس کی نظر میں آجاتی۔ اس لیے آخری منٹوں تک وہ کھڑکی کے پاس نہیں گیا تھا۔ اسے اس پیشہ ور قاتل پر ایک پہلا اور آخری کارگر شوٹ فائر کرنے کے لیے گھنٹے چاہیے تھے؟ کئی نہیں تھے۔ وہ بے حد قریبی رینج میں تھا۔

اور اب بالکل آخری لمحوں میں اس نے بالآخر رائفل کو اس سوراخ میں ٹکایا تھا۔

اسے اس پیشہ ور قاتل کو اس وقت مارنا تھا جب وہ فائر کر چکا ہوتا۔ اس مہمان کو صرف مارنا ضروری نہیں تھا بلکہ اس سازش کے سارے ثبوت مٹائے جانے بھی ضروری تھے۔

گھڑی کی سوئیاں جیسے بھاگتی جا رہی تھیں۔ ٹک... ٹک کرتے... وہ انگلیاں وہ ٹریگر پر اپنا دباؤ بڑھا رہی تھیں۔



حمین سکندر سے ہشام متاثر زیادہ تھا یا مرعوب۔ اسے کبھی اندازہ نہیں ہوا تھا۔ مگر وہ اس سے جلن محسوس کر رہا تھا۔ اس کے بارے میں اسے شبہ نہیں تھا۔ رئیسہ سے ملنے اور اس کی فیملی کے بارے میں جاننے سے بھی پہلے وہ حمین سکندر کے بارے میں جانتا تھا۔ اپنے تقریباً ہم عمر اس نوجوان کے بارے میں وہ انتہائی تجسس رکھتا تھا جتنا بزنس اور فائنانس کی دنیا میں دلچسپی رکھنے والا کوئی بھی شخص۔

ہشام کا باپ امریکا میں سفارت کاری کے دوران بھی بہت ساری کمپنیز چلا رہا تھا اور ان کمپنیز میں سے کچھ کا واسطہ حمین سکندر کی کمپنیز سے بھی پڑتا تھا۔ وہ خود حمین سے رئیسہ سے متعارف ہونے سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا، لیکن اس کا باپ مل چکا تھا اور اس کا مداح تھا۔ اپنی زندگی کی دوسری دہائی کے اوائل میں وہ جن بزنس ٹائیکونز سے ڈیل کر رہا تھا، وہ عمر میں اس سے دوگنا نہیں چار گنا ہوئے تھے اس کے باوجود حمین سکندر کی بزنس اور فائنانس کی سمجھ بوجھ پر کوئی سوال نہیں کرتا تھا۔ وہ بولتا تھا تو لوگ سنتے تھے۔ بیان جاری کرتا تھا تو اس پر تبصرے آتے تھے۔ پروڈکٹ پلان دیتا تھا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ مارکیٹ میں نوٹس نہ ہو۔ اور بزنس مینیج کرتا تھا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ ناکامی سے دوچار ہو۔

اور اس حمین سکندر سے متاثر ہونے والوں میں ایک ہشام بھی تھا متاثر بھی، مرعوب بھی، لیکن اس سے رقابت کا جذبہ اس نے رئیسہ کی وجہ سے رکھنا شروع کیا۔ وہ لڑکی جس پر ہشام جان چھڑکتا تھا۔ وہ صرف ایک شخص پر اندھا اعتماد کرتی تھی، صرف ایک شخص کا حوالہ بار بار دیتی تھی اور بدقسمتی سے وہ شخص وہ تھا جس سے ہشام پہلے ہی مرعوب تھا۔ پھر رقابت کے علاوہ کوئی اور جذبہ ہشام اپنے دل میں محسوس کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ رئیسہ اسے صرف ایک دوست اور بھائی سمجھتی تھی اور یہ جاننے کے باوجود کہ حمین کے بھی رئیسہ کے لیے احساسات ایسے ہی تھے۔ وہ رئیسہ سے متعارف ہونے کے بعد حمین سے چند بار سرسری طور پر مل چکا تھا، مگر یہ پہلا موقع تھا جب وہ اس سے تنہا ملنے جا رہا تھا اور وہ بھی اس کے گھر پر۔ وہ اب بحرین کا ولی عہد نہ ہوتا تو اس شخص سے ملنے کے لیے جاتے ہوئے بے حد احساس کمتری کا شکار ہو رہا ہوتا۔ حمین سکندر کی کامیابی اور ذہانت کسی کو بھی اس احساس سے دوچار کر سکتی تھی۔

نیویارک کے ایک مہنگے ترین علاقے میں ایک ستاون منزلہ عمارت کی چھت پر بنے اس پینٹ ہاؤس میں حمین سکندر نے بے حد گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا تھا۔ اس کے ساتھ اب سائے کی طرح رہنے والے باڈی گارڈز اس عمارت کے اندر نہیں آسکتے تھے کیوں کہ انٹرنس پر روسٹرز میں صرف ہشام کا نام تھا۔ ولی عہد یا شاہی خاندان کے القابات کے بغیر۔

ان چند مہینوں میں پہلی بار ''ہز رائل ہائی نیس'' صرف ہشام بن صباح کے طور پر پکارے گئے تھے اسے برا نہیں لگا، صرف عجیب لگا۔ وہ نام اس کے پینٹ ہاؤس کے دروازے پر اندر داخلے کے وقت حمین نے اور بھی چھوٹا کر دیا تھا۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم بالکل وقت پر آئے ہو ہشام۔'' اس سے مصافحہ کرتے ہوئے سیاہ ٹراوزر اور سفید ٹی شرٹ میں ملبوس حمین سکندر نے کہا۔

وہ اتوار کا دن تھا اور وہ لنچ کے بعد مل رہے تھے۔ وہ دنیا کے امیر ترین نوجوانوں میں سے ایک کے گھر پر تھا اور ہشام کا خیال تھا اس پینٹ ہاؤس میں بھی وہی سب لوازمات ہوں گے جو وہ اپنے خاندانی محلات اور اپنے سوشل سرکل میں دیکھتا آیا تھا۔ پر تعیش رہائش گاہ جہاں پر دنیا کی ہر آسائش ہوگی، ہر طرح کے لوازمات کے ساتھ۔ بہترین انٹیریر، فرنیچر، شوپیسز، بارز اور دنیا کی بہترین سے بہترین شراب۔ اس کا خیال تھا نیویارک کے اس مہنگے ترین علاقے میں اس پینٹ ہاؤس میں حمین سکندر نے ایک دنیاوی جنت بسا رکھی ہوگی کیوں کہ ہشام ایسی ہی جنتیں دیکھتا آیا تھا۔

حمین سکندر کے اس پینٹ ہاؤس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ بہت مختصر تقریباً ''نہ ہونے کے برابر فرنیچر۔۔۔ دیواروں پر چند کیلی گرافی کے شاہکار اور کچن کاؤنٹر پر ایک رحل میں کھلا قرآن پاک جس کے قریب پانی کا ایک گلاس اور کافی کا ایک مگ تھا۔

ہشام بن صباح رعب میں آیا تھا اس شخص کے جس سے وہ "مل" رہا تھا، جسے بزنس اور فائنانس کی دنیا کا گرو نہیں بھگوان مانا جاتا تھا اور جس کے کروڑوں روپے کے اس پینٹ ہاؤس میں بھی رکھی جانے والی نمایاں چیز قرآن پاک تھا۔ وہ سالار سکندر کا چشم و چراغ تھا۔

"یہ میرے دادا کا دیا ہوا قرآن پاک ہے، اسے ہمیشہ ساتھ رکھتا ہوں میں۔ گھر پر تھا، فرصت بھی تو تمہارے آنے سے پہلے پڑھ رہا تھا۔" حمین نے رحل پر رکھے قرآن پاک کو بند کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو۔" اس نے کاؤنٹر کے قریب پڑے کچن اسٹولز کے بجائے لاؤنج میں پڑے صوفوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہشام سے کہا۔ وہ پورا پینٹ ہاؤس اس وقت دھوپ سے چمک رہا تھا۔ سفید انٹیریئر میں گلاس سے چھن چھن کر آتی ہوئی روشنی کی کرنیں ان صوفوں تک بھی آ رہی تھیں جن پر اب وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہشام بن صباح شاہی محل کے تخت پر بیٹھ کر آیا تھا مگر۔ اپنے سامنے صوفے پر ٹانگ رکھ کر بیٹھے ہوئے شخص کے جیسا طمطراق اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

بات کا آغاز مشکل ترین تھا اور بات کا آغاز حمین نے کیا تھا، اسے چائے کافی کی آفر کے ساتھ۔

"کافی!" اس نے جواباً آفر قبول کرتے ہوئے کہا۔ حمین اٹھ کر اب سامنے کچن ایریا میں کافی میکر سے کافی بنانے لگا۔

"رئیسہ تمہاری بہت تعریف کرتی ہے میں نے اور ہمیشہ اچھا۔" وہ کافی بناتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔

"میں نے بھی۔" ہشام کہے بغیر نہیں رہ سکا۔ حمین کافی انڈیلتے ہوئے مسکرایا اور اس نے کہا۔ "آئی ایم ناٹ سرپرائزڈ۔"

وہ اب کافی کے دو مگ اور کوکیز کی ایک پلیٹ ایک ٹرے میں رکھے واپس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

ہشام نے پوچھے بغیر کافی کا مگ اٹھایا، حمین نے ایک کوکی۔

"تم مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔" کوکی کو کھانا شروع کرنے سے پہلے اس نے جیسے ہشام کو یاد دلایا۔

"ہاں۔" ہشام کو ایک دم کافی پینا مشکل لگنے لگا تھا جس مسئلے کے لیے وہ وہاں آیا تھا، وہ مسئلہ پھر گلے کے پھندے کی طرح یاد آیا تھا۔

"میں رئیسہ سے بہت محبت کرتا ہوں۔" اس نے اس جملے سے آغاز کیا جس جملے سے وہ آغاز کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"گڈ۔" حمین نے بے حد اطمینان سے جیسے کوکی کو نگلنے سے پہلے یوں کہا جیسے وہ اس کا چیس کا اسکور تھا۔

"میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" ہشام نے اگلا جملہ ادا کیا۔ اسے اپنا آپ عجیب چغد محسوس ہو رہا تھا اس وقت۔

"میں جانتا ہوں۔" حمین نے کافی کا پہلا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "مگر سوال یہ ہے کہ یہ کرو گے کیسے؟" اس نے جیسے ہشام کی مدد کرتے ہوئے کہا۔ وہ اسے سیدھا اس موضوع پر بات کرنے کے لیے لے آیا تھا جس پر بات کرنے کے لیے وہ آیا تھا۔ ہشام اگلے کئی لمحے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا یہاں تک کہ حمین کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔

"اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟" ہشام نے یک دم اس سے پوچھا۔ حمین کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"جو میں کرتا، وہ تم کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے۔" حمین نے جواباً کہا۔ ہشام کو عجیب سی ہتک محسوس ہوئی۔ وہ اسے چیلنج کر رہا تھا۔

"تم بتائے بغیر مجھے جج نہیں کر سکتے۔" اس نے حمین سے کہا۔
"ٹھیک ہے' بتا رہا ہوں۔" حمین نے کافی کا کپ رکھتے ہوئے کہا۔
"رئیسہ کو چھوڑ دینے کے علاوہ کوئی بھی حل بتا دو مجھے میرے مسئلے کا۔" پتا نہیں اسے کیا وہم ہوا تھا کہ حمین کے بولنے سے پہلے وہ ایک بار پھر بول اٹھا تھا۔ حمین اس بار مسکرایا نہیں' صرف اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔
"میں اگر تمہاری جگہ ہوتا تو۔۔۔"



امامہ۔ جبریل کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اسے کچھ دیر کے لیے جیسے اس کی بات سمجھنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے جو عنایہ اور عبداللہ کے حوالے سے کہا' جو احسن اور عبداللہ کے حوالے سے اور جو اپنے اور عائشہ کے حوالے سے' وہ سب کچھ عجیب انداز اس کے دماغ میں گڈمڈ ہو گیا تھا۔
"میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا جبریل۔" وہ اس سے کہے بغیر نہیں رہ سکی۔ "ممی۔۔۔ آئی ایم سوری۔" جبریل کو بے اختیار اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ اس نے ماں کو پریشان اور حواس باختہ کر دیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اس سے کسی لڑکی کے حوالے سے اپنے کسی "افیئر" کی بات کر رہا تھا' وہ بھی ایک ایسا معاملہ جس میں اس پر الزامات لگائے جا رہے تھے۔
عائشہ عابدین کون تھی؟ امامہ نے زندگی میں کبھی اس کا نام نہیں سنا تھا اور جبریل پر کیوں اس کے ساتھ ملوث ہونے کا الزام ایک ایسا شخص لگا رہا تھا جو اس کے ہونے والے داماد کے لیے ایک انسپریشن کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور جبریل کیوں عنایہ کی شادی عبداللہ کے ساتھ کرنے کے اچانک خلاف ہو گیا تھا جب کہ وہی تھا جو ماضی میں ہمیشہ امامہ کو عبداللہ کے حق میں قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔
"میں یہ سب آپ سے شیئر نہیں کرنا چاہتا تھا' لیکن اب اس کے علاوہ اور کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔" وہ شرمندہ زیادہ تھا یا پریشان' اندازہ لگانا مشکل تھا۔
"لیکن اس سب میں عنایہ اور عبداللہ کا کیا قصور ہے؟"
"ممی! اگر وہ اس شخص کے زیر اثر ہے تو وہ بیوی کے ساتھ رویے کے لحاظ سے بھی ہو گا۔ جو کچھ میں نے احسن سعد کو عائشہ کے ساتھ کرتے دیکھا ہے' وہ میں اپنی بہن کے ساتھ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔" جبریل نے غیر مبہم لہجے میں کہا۔
"تم نے عنایہ سے بات کی ہے؟" امامہ نے بے حد تشویش سے اس سے پوچھا۔
"ہاں' میں نے کی ہے اور وہ بہت اپ سیٹ ہوئی' لیکن اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ میں نہیں جانتا' وہ کیا سوچ رہی ہے۔"
جبریل کہہ رہا تھا اور امامہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے جبریل کو کبھی اس طرح پریشان اور اس طرح کسی معاملے پر اسٹینڈ لیتے نہیں دیکھا تھا۔
"کتنے مہینے سے عائشہ عابدین کا مسئلہ چل رہا ہے' تم نے پہلے کبھی مجھے اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔
وہ بے حد سنگین الزامات تھے جو جبریل پر کسی نے لگائے تھے اور اپنی اولاد پر اندھا اعتماد ہونے کے باوجود امامہ ہل کر رہ گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنی اولاد کے حوالے سے ایسی کسی بات کو سننا پڑ رہا تھا' وہ بھی جبریل کے

بارے میں۔۔۔ حسین کے حوالے سے کوئی بات سنتی تو شاید پھر بھی اس کے لیے غیر متوقع نہ ہوتی' وہ حسین سے کچھ بھی توقع کر سکتی تھی' لیکن جبریل۔۔۔؟؟

"بتانے کے لیے کوئی بات تھی ہی نہیں ممی۔" جبریل نے جیسے صفائی دینے کی کوشش کی۔ "ایک دوست کی بہن ہے وہ۔ دوست نے اس کی مدد کرنے کے لیے کہا اور میں اس لیے considerate (توجہ دے رہا) تھا کیوں کہ مجھے لگا' آپریشن میں کچھ غلطی ہوئی ہے ڈاکٹر ویزل سے۔۔۔ اگرچہ اس میں میرا قصور نہیں تھا پھر بھی میں اس سے ہمدردی کر رہا تھا۔۔۔ مجھے یہ تھوڑی پتا تھا کہ ایک سائیکو (نفسیاتی مریض) اگر خوامخواہ میں مجھے اپنی ایکس وائف (سابقہ بیوی) کے ساتھ انوالو کرنے کی کوشش کرے گا۔" وہ کہتا جا رہا تھا۔

"That man is۔۔۔" (وہ آدمی۔۔۔) جبریل کہتے کہتے رک گیا' یوں جیسے اس کے پاس احسن سعد کو بیان کرنے کے لیے لفظ ہی نہ رہے ہوں۔

"تمہارے پاپا سے بات کرنی ہوگی ہمیں۔۔۔ اتنا بڑا فیصلہ ہم خود نہیں کر سکتے۔" امامہ نے اس کی بات ختم ہونے کے بعد کہا۔

"فیصلہ بڑا ہو یا چھوٹا' ممی! میں عنایہ کی عبداللہ سے شادی نہیں ہونے دوں گا۔" جبریل نے شاید زندگی میں پہلی بار امامہ سے کسی بات پر ضد کی تھی۔

"کسی دوسرے کے جرم کی سزا ہم عبداللہ کو تو نہیں دے سکتے جبریل۔" امامہ نے مدھم آواز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"عبداللہ میری ذمہ داری نہیں ہے' عنایہ ہے۔ میں رسک نہیں لے سکتا اور نہ ہی آپ کو لینا چاہیے۔" وہ ماں کو جیسے خبردار کر رہا تھا اور امامہ اب واقعی پریشان ہونے لگی تھی۔

"تمہارے پاپا جو بھی فیصلہ کریں گے' وہ بہتر فیصلہ ہوگا۔۔۔ اور تم ٹھیک کہتے ہو ہم عنایہ کے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتے' لیکن ہم عبداللہ کی بات سنے بغیر اس طرح اس سے قطع تعلق بھی نہیں کر سکتے۔" امامہ نے کہا۔ "عبداللہ سے ایک بار بات کرنی چاہیے۔"

جبریل کچھ ناخوش ہو کر اٹھ کر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ دروازے کے قریب پہنچا جب امامہ نے اسے پکارا' وہ پلٹا۔

"ایک بات پوری ایمان داری سے بتانا مجھے۔" وہ ماں کے سوال اور انداز دونوں پر حیران ہوا۔

"جی؟"

"تم عائشہ عابدین کو پسند کرتے ہو؟" جبریل بول نہیں سکا۔



وہ عنایہ کے کہنے پر عائشہ عابدین سے ملنے آیا تھا' یقین اور بے یقینی کی ایک عجیب کیفیت میں جھولتے ہوئے۔ وہ اسلام سے ایک بچے کے طور پر متعارف ہوا تھا' ایک بچے کے طور پر متاثر۔ وہ ایک ایسے خاندان کے ذریعہ اس مذہب کے سحر میں آیا تھا کہ ان جیسے لوگ اس نے دیکھے ہی نہیں تھے' ان کی نرمی' فیاضی اور ہمدردی نے ایرک کا وجود نہیں' دل اپنی مٹھی میں کیا تھا اور اتنے سالوں میں وہ اسلام کی اسی روشن خیالی' اسی فیاضی اور نرمی کو ہی آئیڈیلائز کرتا رہا تھا۔ اور اب وہ اپنے mentor (مرشد) کے بارے میں ایسی باتیں سن رہا تھا جو اس کے لیے ناقابل یقین تھیں۔ وہ اس نے عنایہ کی زبان سے نہ سنی ہوتیں تو وہ انہیں جھوٹ کے پلندے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے جس کا الزام عنایہ ان پر لگا رہی تھی۔

عنایہ نے امریکا پہنچنے کے فوراً بعد اسے کال کرکے بلایا تھا اور پھر احسن سعد کے معاملے کو اس سے ڈسکس کیا تھا۔ جبریل پر ڈاکٹر احسن کے الزامات کو بھی اور عائشہ عابدین کے ساتھ ہونے والے معاملات کو بھی۔ وہ یقین کرنے پر تیار نہیں تھا کہ احسن سعد اتنا بے حس اور جھوٹا ہو سکتا ہے۔ اور جس پر وہ الزامات لگ رہے تھے اس کے بارے میں بھی عبداللہ قسم کھا سکتا تھا کہ وہ یہ نہیں کر سکتا۔

دونوں کے درمیان بحث ہوئی پھر تکرار اور پھر ان کی زندگی کا پہلا جھگڑا۔ وہ بے حد ٹھنڈے اور دھیمے مزاج کے لوگوں میں سے تھے۔

"میں یقین نہیں کر سکتا۔ میں یقین نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر احسن سعد عملی مسلمان ہیں۔ نماز کی امامت کرواتے ہیں' وہ اپنی بیوی کے ساتھ یہ سلوک کریں گے۔ یہ سب۔۔۔؟ اور بغیر وجہ کے میں مان ہی نہیں سکتا۔ میں مان ہی نہیں سکتا۔" وہ اس کے علاوہ کچھ کہتا بھی تو کیا کہتا۔

"تو جاؤ' تم پھر عائشہ سے مل لو اور خود پوچھ لو کہ کیا ہوا تھا اس کے ساتھ' لیکن میرا بھائی جھوٹ نہیں بول سکتا۔" عنایہ نے بھی جواباً بے حد خفگی سے کہا تھا۔

ملاقات کا اختتام بے حد تلخ موڑ پر ہوا تھا اور اس وقت پہلی بار عنایہ کو احساس ہوا کہ جبریل کے خدشات بے جا نہیں تھے۔ عبداللہ اگر اس حد تک احسن سعد سے متاثر تھا تو ان دونوں کے تعلق میں یہ اثر بہت جلد رنگ دکھانے لگتا۔ وہ عبداللہ سے مل کر آئی تو اس کا ذہن بری طرح انتشار کا شکار تھا۔ وہ مصیبت جو کسی اور کے گھر میں تھی ان کی زندگی میں ایسے آئی تھی کہ انہیں اندازہ بھی نہیں ہوا تھا۔

عبداللہ نے اس سے ملنے کے بعد اسے کال نہیں کی تھی' اس نے جبریل کو کال کی تھی۔۔۔ ایک بے حد شکایتی کال۔ یہ پوچھنے کے لیے کہ وہ احسن سعد کے حوالے سے یہ سب کیوں کہہ رہا تھا؟ کیا وہ نہیں جانتا تھا احسن کتنا اچھا انسان اور مسلمان تھا؟ وہ بہت دیر جبریل کی بات سنے بغیر بے حد جذباتی انداز میں بولتا ہی چلا گیا تھا۔ جبریل سنتا رہا تھا۔ وہ اس کی زندگی کے مشکل ترین لمحات میں سے ایک تھا۔ ایک نومسلم کو یہ بتانا کہ اس کے سامنے جو سب سے زیادہ عملی مسلمان تھا' وہ اچھا انسان ثابت نہیں ہوا تھا۔

وہ عبداللہ کا دل مسلمانوں سے نہیں پھیرنا چاہتا تھا' خاص طور پر ان مسلمانوں سے جو تبلیغ کا کام کر رہے تھے۔ وہ ایک حافظ قرآن ہو کر ایک دوسرے حافظ قرآن کے بارے میں ایک نومسلم کو یہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ جھوٹا تھا' ظالم تھا' بہتان لگانے والا ایک لالچی انسان تھا اس کے باوجود کہ وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند ایک مسلمان تھا۔ جبریل سکندر کا مخمصہ ایک بڑا مخمصہ تھا مگر اس کی خاموشی اس سے زیادہ خرابی کا باعث بنتی تو وہ خاموش نہیں رہ پایا تھا۔

"احسن سعد کے بارے میں جو میں جانتا ہوں اور جو میں کہوں گا' تم پھر اس سے ہرٹ ہو گے اس لیے سب سے بہترین حل یہ ہے کہ تم اس عورت سے جا کر ملو اور وہ سارے ڈاکومنٹس دیکھو جو اس کے پاس ہیں۔" اس نے عبداللہ کی باتوں کے جواب میں اسے کہا۔

اور اب عبداللہ یہاں تھا' عائشہ عابدین کے سامنے اس کے گھر پر' وہ جبریل کے حوالے سے آیا تھا۔ عائشہ عابدین اس سے ملنے سے انکار نہیں کر سکی۔ وہ اس رات آن کال تھی اور اب گھر سے نکلنے کی تیاری کر رہی تھی جب عبداللہ وہاں پہنچا تھا اور وہ وہاں اب اس کے سامنے بیٹھا اسے بتا رہا تھا کہ اس کی منگیتر نے احسن سعد کے حوالے سے کچھ شبہات کا اظہار کیا تھا خاص طور پر عائشہ عابدین کے حوالے سے اور وہ ان الزامات کی تصدیق یا تردید کے لیے وہاں آیا تھا۔۔۔ لیکن یہ کہنے سے پہلے اس نے عائشہ کو بتایا تھا کہ وہ احسن سعد کو کیا درجہ دیتا تھا اور اس کی زندگی کے پچھلے کچھ سالوں میں وہ اس کے لیے ایک رول ماڈل رہے تھے۔

وہ جیسے ایک "بت" لے کر عائشہ عابدین کے پاس آیا تھا جسے ٹوٹنے سے بچانے کے لیے وہ کسی بھی حد تک

جا سکتا تھا اور گفتگو کے شروع میں ہی اتنی لمبی تمہید جیسے ایک حفاظتی دیوار تھی جو اس نے صرف اپنے سامنے ہی نہیں 'عائشہ عابدین کے سامنے بھی کھڑی کر دی تھی۔

اس نے بھی جبرل جیسی ہی خاموشی کے ساتھ اس کی باتیں سنی تھیں۔ بے حد تحمل اور سکون کے ساتھ۔ کسی مداخلت یا اعتراض کے بغیر۔ عبداللہ کو کم از کم اس سے یہ توقع نہیں تھی۔ وہ یہاں آنے سے پہلے عائشہ عابدین کا ایک امیج ذہن میں رکھ کر آیا تھا وہ پہلی نظر میں اس امیج پر پوری نہیں اتری تھی۔ بے حجاب ہونے کے باوجود اس میں عبداللہ کو بے حیائی نظر نہیں آئی۔ بے حد سادہ لباس میں میک اپ سے بے نیاز چہرے والی ایک بے حد حسین لڑکی جس کی آنکھیں اداس تھیں اور جس کی آواز بے حد دھیمی' عبداللہ وہاں ایک تیز طرار' بے حد فیشن ایبل' الٹرا ماڈرن عورت سے ملنے کی توقع لے کر آیا تھا جسے اس کے اپنے خیال اور ڈاکٹر احسن سعد کے بتائے ہوئے کردار کے مطابق بے حد قابل اعتراض حلیے میں ہونا چاہیے تھا مگر عبداللہ کی قسمت میں شاید مزید حیران ہونا باقی تھا۔

عنایہ اور جبرل دونوں نے اس سے کہا تھا کہ وہ اسے ڈاکومنٹس دکھائے گی' احسن سعد سے طلاق کے کاغذات' قانونی کارروائی کے کاغذات' کورٹ کا فیصلہ' کسٹڈی کی تفصیلات اور وہ حقائق جو صرف وہی بتا سکتی تھی' عائشہ عابدین نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

"وہ احسن سعد برا شخص نہیں ہے' صرف میں اور وہ compatible نہیں تھے (مطابقت نہیں رکھتے تھے) اس لیے شادی نہیں چلی۔" تقریباً" دس منٹ تک اس کی بات سننے کے بعد عائشہ نے بے حد دھیم آواز میں اسے کہا تھا۔

"وہ یقیناً" اتنے ہی اچھے مسلمان ہیں' جتنا آپ انہیں سمجھتے ہیں اور اس میں بہت ساری خوبیاں ہیں۔ آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ آپ کا واسطہ ان کی خوبیوں سے پڑا۔ میں شاید اتنی خوش قسمت نہیں تھی یا پھر مجھ سے کوتاہیاں سرزد ہوئی ہوں گی۔" وہ کہہ رہی تھی اور عبداللہ کے دل کو جیسے تسلی نہیں ہو رہی تھی' یہ وہ کچھ نہیں تھا جو وہ سننا چاہتا تھا' لیکن وہ بھی نہیں تھا جس کی اسے توقع تھی۔

"وہ آپ کے لیے ایک انسپاریشن اور رول ماڈل ہیں۔ یقیناً" ہوں گے۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "کوئی انسان پرفیکٹ نہیں ہوتا' مگر چند غلطیاں کرنے پر ہم کسی کو نظروں سے نہیں گرا سکتے۔ میرے اور احسن سعد کے درمیان جو بھی ہوا' اس میں ان سے زیادہ میری غلطی ہے اور آپ کے سامنے میں ان کے بارے میں کچھ بھی کہہ کر وہ غلطی پھر سے دہرانا نہیں چاہتی۔"

عائشہ نے بات ختم کر دی تھی۔ عبداللہ اس کی شکل دیکھتا رہ گیا تھا۔ اسے تسلی ہونی چاہیے تھی' نہیں ہوئی۔ وہ وہاں احسن سعد کے بارے میں پوچھ جاننے اور کھوجنے نہیں آیا تھا' اس کا دفاع کرنے آیا تھا' اس عورت کے سامنے جو اس کی تذلیل اور تضحیک اور دل شکنی کا باعث بنی تھی لیکن اس عورت نے جیسے اس کے سامنے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی کسی صفائی' کسی وضاحت کی۔ اس نے ہر غلطی' ہر گناہ خاموشی سے اپنے کھاتے میں ڈال لیا تھا۔

اس کے لاؤنج میں بیٹھے عبداللہ نے دیواروں پر لگی اس کے بیٹے کی تصویریں دیکھی تھیں۔ اس کے کھلونوں کی ایک چھوٹا سا صاف ستھرا گھر ویسی جگہ نہیں جیسا وہ اسے تصور کر کے آیا تھا' کیوں کہ احسن سعد نے اسے اس عورت کے "پھوہڑپن" کے بھی بہت قصے سنا رکھے تھے جو احسن سعد کے گھر کو چلانے میں ناکام تھی' جس کا واحد کام اور مصروفیت ٹی وی دیکھتے رہنا یا آوارہ پھرنا تھا اور جو گھر کا کوئی کام کرنے کے لیے کہنے پر بھی برہم ہو جاتی تھی۔ عبداللہ کے دماغ میں گرہیں بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں۔ وہ اس لڑکی سے نفرت نہیں کر سکا' اسے ناپسند نہیں

کرسکا۔
"جبریل سے آپ کا کیا تعلق ہے؟" وہ بالآخر ایک آخری سوال پر آگیا تھا جہاں سے یہ سارا مسئلہ شروع ہوا تھا۔
"میں اس سے پیار کرتی ہوں۔" وہ اس کے سوال پر بہت دیر خاموش رہی پھر اس نے عبداللہ سے کہا' سر اٹھا کر نظریں چرائے بغیر۔



"I met your ex-wife" (میں آپ کی سابقہ بیوی سے ملا تھا) وہ جملہ نہیں تھا جیسے ایک بم تھا جو اس نے احسن سعد کے سر پر پھوڑا تھا۔
عبداللہ پچھلی رات واپس پہنچا تھا اور اگلے دن اسپتال میں اس کی ملاقات احسن سے ہوئی تھی۔ اسی طرح ہشاش بشاش' بااخلاق' پرجوش' عبداللہ کے کانوں میں عنایہ اور جبریل کی آوازیں اور انکشافات گونجنے لگے تھے۔ اس نے احسن سے ملاقات کا وقت مانگا تھا جو بڑی خوش دلی سے دیا گیا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی اپارٹمنٹ کی بلڈنگ میں رہتے تھے احسن کے والدین اس کے ساتھ رہتے تھے' اس لیے وہ ملاقات اپنے گھر پر کرنا چاہتا تھا' مگر احسن اس شام کچھ مصروف تھا تو عبداللہ کو اس ہی کے اپارٹمنٹ پر جانا پڑا' وہاں اس کی ملاقات احسن کے والدین سے بھی ہوئی تھی ہمیشہ کی طرح ایک رسمی ہیلو ہائے۔
احسن لاؤنج میں بیٹھے ہی اس سے بات کرنا چاہتا تھا' مگر عبداللہ نے اس سے علیحدگی میں ملنا چاہا تھا اور تب وہ اسے اپنے بیڈ روم میں لے آیا تھا مگر وہ کچھ الجھا ہوا تھا۔ عبداللہ کا رویہ کچھ عجیب تھا' مگر احسن سعد کی چھٹی حس اسے اس سے بھی برے اشارے دے رہی تھی اور وہ بالکل ٹھیک تھے۔
عبداللہ نے کمرے کے اندر آتے ہی گفتگو کا آغاز اسی جملے سے کیا تھا اور احسن سعد کا لہجہ' انداز اور تاثرات پلک جھپکتے میں بدلے تھے۔ عبداللہ نے زندگی میں پہلی بار اس کی زبان سے یہ آواز سنی تھی۔ وہ لہجہ بے حد خشک اور سرد تھا۔ کرخت بہتر لفظ تھا اسے بیان کرنے کے لیے۔ اور اس کے ماتھے پر بل آئے تھے۔ آنکھوں میں کھا جانے والی نفرت۔
بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اس نے عبداللہ سے کہا۔ "کیوں؟"
عبداللہ نے بے حد مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ عنایہ نے اس سے کہا تھا کہ جبریل اس کی شادی عبداللہ سے نہیں کرنا چاہتا اور اس کے انکار کی وجہ احسن سعد سے اس کا قریبی تعلق ہے۔ اس نے احسن سعد کو بتایا کہ عنایہ اور جبریل دونوں نے اس پر سنگین الزامات لگائے تھے اور اسے عائشہ عابدین سے ملنے کے لیے کہا جو اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔
"تو تم نے ان پر اعتبار کیا۔ اپنے استاد پر نہیں اور تم مجھ سے بات یا مشورہ کیے بغیر اس کتیا سے ملنے چلے گئے اور تم دعوا کرتے ہو کہ تم نے مجھ سے سب کچھ سیکھ لیا۔"
احسن نے اس کی گفتگو کے درمیان ہی اس کی بات بے حد خشمگیں لہجے میں کاٹی تھی' عبداللہ ویسے بھی بات کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس نے احسن سعد کی زبان سے ابھی ابھی ایک گالی سنی تھی عائشہ عابدین کے لیے... وہ گالی اس کے لیے شاکنگ نہیں تھی' احسن سعد کی زبان سے اس کا نکلنا شاکنگ تھا مگر وہ شام عبداللہ کے لیے وہ آخری شاک لانے والی نہیں تھی۔ وہ جس بت کی پرستش کر رہا تھا' وہ وہاں اس بت کو اوندھے منہ گرتے دیکھنے آیا تھا۔

"تمہیں کوئی حق نہیں تھا کہ تم میری سابقہ بیوی سے ملتے۔ میرے بارے میں اس طرح انویسٹی گیشن کرتے۔ تم اس ۔۔۔۔۔ کے پاس پہنچے جس نے میرے بارے میں تم سے جھوٹ پہ جھوٹ بولا ہوگا۔"

احسن سعد کے جملوں میں اب عائشہ کے لیے گالیاں اس روانی سے آرہی تھیں جیسے وہ اسے مخاطب کرنے کے لیے روزمرہ کے القابات تھے۔ وہ غصے کی شدت سے بے قابو ہو رہا تھا۔ عائشہ کی نفرت اس کے لیے سنبھالنا مشکل ہو رہی تھی یا اپنا سالوں کا بنایا ہوا امیج مسخ ہونے کی تکلیف نے اسے اس طرح بلبلانے پر مجبور کر دیا تھا' عبداللہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

"وہ دکھانے بیٹھ گئی ہوگی تمہیں کورٹ کے کاغذات کہ' یہ دیکھو کورٹ میرے شوہر کو جھوٹا کہہ رہی ہے۔ کورٹ نے مجھ پر مار پیٹ کے الزامات کو مانا ہے۔ کورٹ نے احسن سعد کو دوسری شادی کرنے کے لیے اسے دھوکے باز کہا ہے اور اس لیے اس ۔۔۔ عورت کے طلاق کے مطالبے کو جائز قرار دیتے ہوئے اسے طلاق دلوا دی اور بچے کی کسٹڈی بھی۔"

وہ بولتا ہی جا رہا تھا اور عبداللہ ساکت صرف اسے سن رہا تھا۔ وہ سارے انکشافات جن کو سننے کے لیے جبریل نے اسے عائشہ کے پاس بھیجا تھا' وہ الزامات وہ خود احسن سعد سے سن رہا تھا۔

"میں اس ملک کے کورٹس کو دو ٹکے کا نہیں سمجھتا' یہ کافروں کی عدالتیں ہیں' اسلام کو کیا سمجھتی ہوں گی' وہ یہ فیصلے دیتی ہیں جو شریعت کے خلاف ہیں۔ میرا مذہب حق دیتا ہے مجھے دوسری شادی کا' کسی بھی وجہ کے بغیر تو کورٹ کون ہوتی ہے مجھے اس عمل پر دھوکے باز کہنے والی' مجھے حق ہے کہ میں ایک نافرمان بیوی کو مار پیٹ سے راہ راست پر لاؤں۔ کورٹ کس حق کے تحت مجھے اس سے روک سکتی ہے؟ میں مرد ہوں' مجھے میرے دین نے عورت پر برتری دی ہے' کورٹ کیسے مجھے مجبور کر سکتی ہے کہ میں اپنی بیوی کو برابری دوں۔ ان ہی چیزوں کی وجہ سے تو تمہارا معاشرہ تباہ ہوگا' بے حیائی' عریانی' منہ زوری' مرد کی نافرمانی۔ یہی چیزیں تو لے ڈوبی ہیں تمہاری عورتوں کو اور تمہاری کورٹس کہتی ہیں ہم بھی بے غیرت ہو جائیں اور ان عورتوں کو بسائیں اور ان کے پیچھے کتے کی طرح دم ہلاتے پھریں۔"

وہ شخص کون تھا؟ عبداللہ پہچان ہی نہیں پا رہا تھا۔ اتنا زہر' ایسا تعصب' ایسے الفاظ اور یہ سوچ۔ اس نے ڈاکٹر احسن سعد کے اندر چھپا یہ انسان تو کبھی نہیں دیکھا تھا جو امریکا کو ہمیشہ اپنا ملک قرار دیتے ہوئے اپنے آپ کو فخریہ امریکن کہتا تھا اور آج وہ اسے تمہارا ملک' تمہارا معاشرہ' تمہارے کورٹس کہہ کہہ کر بات کر رہا تھا۔ امت اور اخوت کے جو دو لفظ اس کا کلمہ تھے وہ دونوں یکدم کہیں غائب ہو گئے تھے۔

"اب طلاق منہ پر مار کر میں نے اس حرافہ کو چھوڑا ہوا ہے تو خوار ہوتی پھر رہی ہے۔ کسی کی کیپ اور گرل فرینڈ ہی رہے گی وہ ساری عمر' کبھی بیوی نہیں بنے گی' اسے یہی آزادی چاہیے' تمہاری سب عورتوں کو یہی سب چاہیے۔ گھر' خاندان' چار دیواری کس چڑیا کے نام ہیں انہیں کیا پتا' عصمت جیسا لفظ ان کی ڈکشنری میں ہی نہیں اور پھر الزام لگاتی ہیں شوہروں پر تشدد کے' گھٹیا عورتیں۔"

اس کے جملوں میں اب بے ربطگی تھی۔ یوں جیسے وہ خود بھی اپنی باتیں جوڑ نہ پا رہا ہو' مگر وہ خاموش ہونے پر تیار نہیں تھا۔ اس کا علم بول رہا ہوتا تو کئی گھنٹے بھی عبداللہ اسی طرح اسے سن سکتا تھا جیسے وہ ہمیشہ سحر زدہ معمول کی طرح سنتا رہتا تھا' مگر یہ اس کی جہالت تھی جو گفتگو کر رہی تھی اور کرتے ہی رہنا چاہتی تھی۔

عبداللہ اس کی بات کاٹ کر کچھ کہنا چاہتا تھا' مگر اس سے پہلے احسن سعد کے ماں باپ اندر آگئے تھے۔ وہ یقیناً احسن کے اس طرح بلند آواز میں باتیں سن کر اندر آئے تھے۔

"ابو! میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ کے دوست کا بیٹا میرا دشمن ہے' مجھے نقصان پہنچائے گا۔ اب دیکھ

بس ؤہی ہو رہا ہے۔ وہ مجھے جگہ جگہ بدنام کرتا پھر رہا ہے۔" احسن نے اپنے باپ کو دیکھتے ہی کہا تھا۔
"کون؟" سعد نے کچھ ہکا بکا انداز میں کہا۔
"جبریل!" احسن نے جواباً کہا اور عبداللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسے عائشہ سے ملوایا ہے اس نے۔ اور اس عورت نے اس سے میرے بارے میں جھوٹی سچی باتیں کی ہیں' زہر اگلا ہے میرے بارے میں۔"
وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح باپ سے شکایت کر رہا تھا۔
"عائشہ نے مجھ سے آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا۔ جو بھی بتایا ہے' آپ نے خود بتایا ہے۔" عبداللہ نے سعد کے کچھ کہنے سے پہلے کہا تھا۔ "انہوں نے مجھ سے صرف یہ کہا کہ آپ کے اور ان کے درمیان compatibility (مطابقت) نہیں تھی' مگر کوئی کورٹ پیپرز اور کورٹ میں آپ پر ثابت ہونے والے کسی الزام کی انہوں نے بات کی نہ ہی مجھے کوئی پیپر دکھایا۔ جو بھی سن رہا ہوں' وہ میں آپ سے ہی سن رہا ہوں۔"
عبداللہ کا خیال تھا احسن سعد حیران رہ جائے گا اور پھر شرمندہ ہو گا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔
"تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔" احسن سعد نے اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا تھا۔
عبداللہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس گھر میں یک دم ہی اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اب صرف احسن سعد نہیں بول رہا تھا' اس کا باپ اور ماں بھی شامل ہو گئے تھے۔ وہ تینوں بیک وقت بول رہے تھے اور عائشہ عابدین کو لعنت ملامت کر رہے تھے اور جبریل کو بھی۔ سالار سکندر کے ماضی کے حوالے سے سعد کو یک دم بہت ساری باتیں یاد آنے لگی تھیں اور امامہ کے بارے میں۔ جس کا پہلا مذہب کچھ اور تھا۔ عبداللہ کو یک دم کھڑے کھڑے یہ محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ ایک پاگل خانے میں کھڑا ہے۔ وہ اس کے کھڑے ہونے پر بھی اسے جانے نہیں دے رہے تھے بلکہ چاہتے تھے وہ ان کی ہر بات سن کر جائے' ایک ایک بہتان' ایک ایک راز جو صرف ان کے سینوں میں دبا ہوا تھا اور جسے وہ آج آشکار کر دینا چاہتے تھے۔ اسلام کا وہ چہرہ عبداللہ نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ مذہب اس کے لیے ہمیشہ ہدایت اور مرہم تھا' بے ہدایتی اور زخم کبھی نہیں بنا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ کانوں میں پڑنے والی آوازوں کو روک دینا چاہتا تھا' احسن سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس کے قرآن کا استاد رہا ہے' وہ بس وہی سب بتائے اسے' یہ سب نہ سنائے۔
"برادر احسن۔۔۔ You disappointed me" (آپ نے مجھے مایوس کیا ہے) عبداللہ نے بالآخر بہت دیر بعد آوازوں کے اس طوفان میں اپنا پہلا جملہ کہا۔ طوفان جیسے چند لمحوں کے لیے رکا۔
"آپ کے پاس بہت علم ہے۔ قرآن پاک کا بہت زیادہ علم ہے لیکن ناقص۔۔۔ آپ قرآن پاک کو حفظ تو کیے ہوئے ہیں' مگر نہ اس کا مفہوم سمجھ پائے ہیں نہ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات۔ کیوں کہ آپ سمجھنا نہیں چاہتے' اس کتاب کو جو اپنے آپ کو سمجھنے اور سوچنے کے لیے بلاتی ہے' آپ سے ایک بار میں نے ایک آیت کا مطلب پوچھا تھا کہ قرآن دلوں پر مہر لگا دینے کی بات کرتا ہے تو اس کا کیا مفہوم ہے؟ مجھے اس کا مفہوم اس وقت سمجھ میں نہیں آیا تھا' آج آ گیا۔ آپ میرے استاد رہے ہیں' مگر میں دعا کرتا ہوں اللہ آپ کے دل کی مہر توڑ دے اور آپ کو ہدایت عطا فرمائے۔"
وہ احسن سعد کو بیچ بازار میں جیسے ننگا کر کے چلا گیا تھا۔ وہاں ٹھہرا نہیں تھا۔



وہ پھر وہیں کھڑا تھا جہاں عائشہ کو توقع تھی۔ اس کے اپارٹمنٹ کے باہر کمپاؤنڈ میں۔ ادھر سے ادھر ٹہلتے۔۔۔ گہری سوچ میں۔۔۔ زمین پر اپنے قدموں سے فاصلہ ناپتے ہوئے۔ برف باری کچھ دیر پہلے ہو کر رکی تھی اور جو برف

گری تھی، وہ بہت ہلکی سی چادر کی طرح تھی۔ جو دھوپ نکلنے پر پگھل جاتی مگر آج دھوپ نہیں نکلی تھی اور اس برف پر جبریل کے قدموں کے نشان تھے۔ بے حد ہموار اور متوازن جیسے بہت سوچ سمجھ کر رکھے جارہے ہوں۔ اس نے عائشہ کو باہر آتے نہیں دیکھا تھا، مگر عائشہ نے اسے دیکھ لیا تھا۔ لانگ کوٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اس کی طرف بڑھنے لگی۔

جبریل نے اسے کچھ دیر پہلے فون کیا تھا، وہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔

"میں گروسری کے لیے جارہی ہوں اور پھر اسپتال چلی جاؤں گی۔" اس نے جیسے بلاواسطہ انکار کیا تھا۔ وہ اب اس کا سامنا کرنے سے کترانے لگی تھی۔ اس کے سامنے آنا ہی نہیں چاہتی تھی اس ایک گفتگو کے بعد۔

"تو تم کورٹ میں یہ اعتراف کرنا چاہتی ہو کہ احسن سعد ٹھیک ہے اور تم نے اپنے بیٹے کی دیکھ بھال میں لاپروائی کا مظاہرہ کیا، تم اپنی زندگی تباہ کرنا چاہتی ہو؟"

جبریل نے بے حد خفگی سے تب کہا تھا۔

"مجھے اپنی زندگی میں اب دلچسپی نہیں رہی اور اگر اسے قربان کرنے سے ایک زیادہ بہتر زندگی بچ سکتی ہے تو کیوں نہیں۔" اس نے جوابا" ان سب ملاقاتوں میں پہلی بار اس سے اس طرح بات کی تھی۔

"تم مجھے بچانا چاہتی ہو؟" جبریل نے سیدھا اس سے پوچھا۔ اسے اتنے ڈائریکٹ سوال کی توقع نہیں تھی اس سے اور ایک ایسے سوال کی، جس کا جواب وہ اسے دینے کی جرأت ہی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اسے یہ کیسے بتا سکتی تھی کہ وہ احسن سعد سے اس شخص کو بچانا چاہتی تھی جو اسے اسفند کے بعد اب سب سے عزیز تھا۔

یہ جاننے کے باوجود کہ احسن سعد نے اسے جبریل کے آپریشن میں ڈاکٹر جبریل سے ہونے والی کوتاہی کے بارے میں بتایا تھا۔ اسے جبریل کے اس معذرت والے کارڈ کی سمجھ بھی تب ہی آئی تھی لیکن وہ پھر بھی جبریل کو معاف کرنے پر تیار تھی۔ یہ ماننے پر تیار نہیں تھی کہ اس کے بیٹے کی جان لینے میں اس شخص سے ہونے والی کسی دانستہ غلطی کا ہاتھ تھا۔ وہ اسے اتنی توجہ کیوں دیتا تھا، اس کے لیے کیوں بھاگتا پھرتا تھا، عائشہ عابدین جیسے اب ڈی کوڈ کر پائی تھی اور وہ اسے اس احساس جرم سے آزاد کرنا چاہتی تھی، یہ بتا کر کہ اس نے جبریل کو معاف کر دیا تھا اور وہ جبریل کو بچانے کے لیے احسن سعد کے آگے دیوار کی طرح کھڑی ہو سکتی تھی۔ وہ ایک کام، جو وہ زندگی میں اپنی ذات اور اپنی اولاد کے لیے بھی نہیں کر سکی تھی۔

"میں تمہیں صرف احساس جرم سے آزاد کرنا چاہتی ہوں جو تم اسفند کی وجہ سے رکھتے ہو۔" اس نے اس کے سوال کا جواب دیا تھا۔

جبریل بول نہیں سکا تھا۔

"میں اس کے لیے تمہارا شکریہ ادا کر سکتا ہوں، مگر تمہیں اپنی زندگی تباہ کرنے نہیں دے سکتا۔" بڑی لمبی خاموشی کے بعد جبریل نے کہا تھا۔

"تم اگر احسن کے اس الزام پر کورٹ میں یہ کہو گی تو میں اپنی غلطی کورٹ میں جا کر بتاؤں گا۔" اس نے عائشہ سے کہا۔ "تمہیں کوئی سمجھانے والا نہیں ہے ہوتا تو تمہیں یہ نہ کرنے دیتا اور نہیں۔ تمہارے پاس آنے کی واحد وجہ میرا احساس جرم نہیں ہے۔ زندگی میں احساس جرم ہمدردی تو کروا سکتا ہے محبت نہیں۔"

جبریل اس دن جانے سے پہلے اس سے یہ کہہ کر گیا تھا۔ ایسے ہی معمول کے انداز میں۔ یوں جیسے سر درد میں ڈسپرین تجویز کر رہا ہو یا نزلہ ہو جانے پر فلو تشخیص کر رہا ہو۔

اس کے جانے کے بعد بھی عائشہ کو لگا تھا اس نے جبریل سکندر کی بات سننے میں غلطی تھی اور اس میں اتنی

ہمت نہیں تھی کہ وہ اس بات کو دوبارہ سننے کا اصرار کرتی تاکہ اپنی تصحیح کر سکے "بعض وہم جی اٹھنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں" بعض شبہات متاعِ حیات ہوتے ہیں "یقین میں نہ بھی بدلیں تو بھی۔

اور اب وہ ایک بار پھر سامنے کھڑا تھا۔ نہیں کھڑا نہیں تھا۔ برف پر اپنے نشان بنانے میں مصروف تھا یوں جیسے اس کے پاس دنیا بھر کی فرصت تھی۔ اس کی چاپ پر جبریل نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ لانگ کوٹ کے اندر اپنی گردن کے مفلر کو بالکل ٹھیک ہونے کے باوجود ایک بار پھر ٹھیک کرتی اس کی طرف آرہی تھی "اس کی طرف متوجہ نہ ہونے کے باوجود۔

"گروسری میں بہت وقت لگے گا۔" اس کے قریب آتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اسے جتاتے ہوئے اس نے جبریل سے کہا تھا۔ "ہم پھر کسی دن فرصت میں مل سکتے تھے۔"

جبریل کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے ایک بار پھر جبریل کو جیسے اپنے ساتھ جانے سے روکنے کے لیے کہا۔ اس کے باوجود کہ جبریل نے اسے انتظار کرنے کا نہیں کہا تھا' وہ اس کے ساتھ سودا سلف کی خریداری کرنے جانے کے لیے تیار تھا۔ اسے صرف اتنا وقت ہی چاہیے تھا جتنا وقت وہ گروسری کرتی۔ ساتھ چلتے پھرتے وہ بات کر سکتا تھا۔

"میں جانتا ہوں مگر میرے پاس تو بہت فرصت ہے' تمہارے پاس بالکل نہیں۔" اس نے جواباً اس سے کہا۔ "گاڑی میں چلیں؟" جبریل نے بھی اپنے جواب پر اس کے تبصرہ کا انتظار نہیں کیا تھا۔

"نہیں یہاں قریب ہی ہے اسٹور چند قدم کے فاصلے پر' گاڑی کی ضرورت نہیں ہے' مجھے بہت زیادہ چیزیں نہیں چاہئیں۔" عائشہ نے قدم روکے بغیر سائیڈ سڑک کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"تم نے عبداللہ سے جھوٹ کیوں بولا؟" وہ چند قدم خاموشی سے چلتے رہے تھے' پھر جبریل نے اس سے پوچھنے میں دیر نہیں کی تھی۔ عائشہ نے گہرا سانس لیا اسے اس سوال کی توقع تھی' لیکن اتنی جلدی نہیں۔

"بزدلی اچھی چیز نہیں عائشہ۔" اس نے چند لمحے اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد کہا تھا۔ وہ طنز نہیں تھا' مگر اس وقت عائشہ کو طنز ہی لگا تھا۔ ساتھ چلتے ہوئے وہ دونوں اب فٹ پاتھ پر آگئے تھے۔ برف کی چادر پر وہ نشان جو کچھ دیر پہلے جبریل اکیلا بنا رہا تھا "اب وہ دونوں ساتھ ساتھ بنا رہے تھے۔

"تمہیں لگتا ہے میں بزدل ہوں اس لیے میں نے احسن سعد کے بارے میں عبداللہ کو سچ نہیں بتایا؟" اس نے ساتھ چلتے ہوئے پہلی بار گردن موڑ کر جبریل کو دیکھا تھا۔

"بزدلی یا خوف۔ اس کے علاوہ تیسری وجہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔" جبریل نے جیسے اپنی بات کی تصدیق کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔ "تمہیں ڈر تھا کہ احسن سعد تمہیں پریشان کرے گا' تمہیں فون کرے گا اور تنگ کرے گا۔" جبریل نے کہا تھا۔ "مگر تم نے عبداللہ سے جھوٹ بول کر احسن سعد کو بچا کر بہت زیادتی کی۔ تم نے مجھے اور عنایہ کو جھوٹا بنا دیا۔" اس کا لہجہ اب شاکی تھا۔

"آپ لوگوں کا جھوٹا ہونے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا احسن سعد کے جھوٹا ہونے سے عبداللہ کو ہوتا۔" عائشہ نے جواباً کہا۔

"وہ حافظِ قرآن ہے تو میں بھی ہوں۔" جبریل نے کہا۔

"آپ کو وہ اس مقام پر بٹھا کر نہیں دیکھتا' جس پر احسن کو دیکھتا ہے۔" عائشہ نے جواباً کہا۔ "وہ نو مسلم نہ ہوتا تو میں احسن کے بارے میں اب سب کچھ بتا دیتی اسے۔ وہ مجھ سے ملنے کے بعد دوبارہ احسن کی شکل بھی نہ دیکھتا شاید۔ مگر وہ نو مسلم ہے۔ میں اس سے کس منہ سے یہ کہتی کہ اتنے سالوں سے وہ جس شخص کو بہترین مسلمان اور انسان سمجھ رہا ہے' وہ ایسا نہیں ہے۔ عبداللہ نے صرف احسن کو جھوٹا نہیں ماننا تھا' میرے دین سے اس کا دل

اچاٹ ہو جاتا تھا۔" وہ کہہ رہی تھی اسی مدھم آواز میں جو اس کا خاصا تھی۔
"میرے ساتھ ہوا تھا ایک بار ایسے۔ میں احسن سعد سے ملنے سے پہلے بہت اچھی مسلمان تھی' آنکھیں بند کر کے اسلام کی پیروی کرنے والی۔ جنون اور پاگل پن کی حد تک دین کے راستے پر چلنے والی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولﷺ سے اندھی محبت اور عقیدت رکھنے والی لیکن پھر میری شادی احسن سعد سے ہوگئی اور میں نے اس کا اصل چہرہ دیکھ لیا اور میرا سب سے بڑا نقصان ایک خراب ازدواجی زندگی' طلاق یا اسفند کی موت نہیں ہے۔ میرا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس نے مجھے دین سے بے زار کر دیا۔ مجھے اب دین کی بات کرنے والا ہر شخص جھوٹا اور منافق لگتا ہے۔ داڑھی اور حجاب سے مجھے خوف آتا ہے' میرا دل جیسے عبادت کے لیے بند ہوگیا ہے۔ اتنے سال میں دن رات اتنی عبادتیں اور وظیفے کرتی رہی اپنی زندگی میں بہتری کے لیے کہ اب مجھے لگتا ہے مجھے اللہ سے کچھ مانگنا ہی نہیں چاہیے۔ میں مسلمان ہوں لیکن میرا دل آہستہ آہستہ منکر ہوتا جا رہا ہے اور مجھے اس احساس سے خوف آتا ہے لیکن میں کچھ نہیں کر پا رہی اور یہ سب اس لیے ہوا کیونکہ مجھے ایک اچھے عملی مسلمان سے بہت ساری توقعات اور امیدیں تھیں اور میں نے انہیں چکنا چور ہوتے دیکھا اور میں عبداللہ کو اس تکلیف سے گزارنا نہیں چاہتی تھی۔ اگر وہ احسن سعد کو اچھا انسان سمجھتے ہوئے ایک اچھا انسان بن سکتا ہے تو اسے بننے دیں۔"

وہ اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھوں اور گالوں کو رگڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔
"میں کافر ہوں لیکن میں کسی کو کافر نہیں کر سکتی بس مجھ میں اگر ایمان ہے تو صرف اتنا۔" وہ اب ٹشو اپنی جیب سے نکال کر آنکھیں رگڑ رہی تھی۔



"پسند۔۔۔؟ مجھے پسند کا نہیں پتا ممی مگر عائشہ عابدین میری عقل اور سمجھ سے باہر ہے۔ میں اس سے شدید ہمدردی رکھتا تھا مگر اب ہمدردی تو بہت پیچھے رہ گئی۔ میں اسے اپنے ذہن سے نکال نہیں پا رہا۔ بار بار اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا اور میرا کوئی فیوچر نہیں ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ لائف پارٹنر کے طور پر مجھے جیسی لڑکی کی خواہش ہے' عائشہ اس کی متضاد ہے۔ مجھے بے حد مضبوط' پراعتماد' زندگی سے بھرپور' کیریئر اورینٹڈ' ہر وقت ہنستی رہنے والی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں جو بہت اچھی (تربیت) بھی رکھتی ہوں اور عائشہ میں ان سب چیزوں میں سے صرف دو ہوں گی۔۔۔ یا تین۔۔۔ لیکن اس کے باوجود میں عائشہ سے (علیحدہ) نہیں رہ سکتا۔"
امریکہ آنے سے پہلے اس نے امامہ کے اس سوال پر اسے اپنی بے بسی بتائی تھی۔
"اس کی بھی کوئی وجہ ہوگی۔" امامہ نے جواباً اس سے پوچھا تھا۔ "کیا خصوصیت ہے اس میں ایسی کہ وہ تمہارے ذہن سے نہیں نکلتی؟" اس نے جبریل سے پوچھا تھا۔
"وہ عجیب ہے ممی' وہ بس عجیب ہے۔"
اس نے جیسے امامہ کو اپنی بے بسی سمجھانے کی کوشش کی تھی اور وہ بے بسی ایک بار پھر سے در آئی تھی۔ اس کے ساتھ چلتی ہوئی اس لڑکی کی منطق صرف اس کی منطق ہو سکتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو بے دین کافر کہہ رہی تھی اور وہ اس کے ظرف پر حیران تھا۔
"تم بے حد عجیب ہو۔" وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا۔
"ہاں میں ہوں۔" عائشہ عابدین نے اعتراف کیا۔
"مجھے یہ اعتراف کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ تم سولہ سال کی عمر میں زیادہ اچھی تھیں یا اب۔؟" بے حد غیر متوقع

جملہ تھا عائشہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔
"عبداللہ نے مجھ سے کہا، تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔" عائشہ کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس وقت وہیں اس میں سما جائے۔ ندامت کا یہ عالم تھا اس کا۔ وہ جملہ جبریل تک پہنچانے کے لیے نہیں تھا پھر بھی پہنچ گیا۔
"میں نے اس سے کہا، میں جانتا ہوں۔" وہ اسی طرح جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ پانی پانی اس جملے نے بھی کیا تھا اسے... وہ اس کے دل تک کب پہنچا تھا۔
"عبداللہ کا خیال ہے، ہم دونوں اچھے لائف پارٹنرز ہو سکتے ہیں۔" وہ اس جملے پر رک گئی۔ پتا نہیں کون زیادہ مہربان تھا، کہنے والا یا پہنچانے والا۔
"میں نے اس سے کہا میں یہ بھی جانتا ہوں۔" وہ بھی رک گیا تھا۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے کے بالمقابل فٹ پاتھ پر کھڑے تھے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے۔ برف باری پھر سے ہونے لگی تھی۔
"زندگی میں ایک اسٹیج وہ تھی جب میں سوچتی تھی میری شادی اگر آپ جیسے کسی شخص سے ہو جائے تو بس پھر میں خود کو بے حد خوش قسمت مانوں گی۔ سب مسئلے حل ہو جائیں گے۔" اس نے بالآخر کہنا شروع کیا تھا۔
"آج اس اسٹیج پر میں سوچتی ہوں شادی کوئی حل نہیں ہے۔ اچھی زندگی کی گارنٹی بھی نہیں ہے۔ تو اب میں ایک اچھی زندگی کے لیے کسی سہارے کی تلاش میں نہیں ہوں۔ میں کیریئر پر فوکس کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی زندگی اپنے لیے جینا چاہتی ہوں۔ ورلڈ ٹور پر جانا چاہتی ہوں۔"
"میں تمہیں اسپانسر کر سکتا ہوں۔" وہ نم آنکھوں سے بے اختیار ہنسی، بے حد سنجیدگی سے کہا گیا وہ جملہ اسے ہنسانے کے لیے ہی تھا۔
"آپ عجیب ہیں۔"
"میں جانتا ہوں۔" بے ساختہ کیے گئے تبصرے کا بے ساختہ ہی جواب آیا تھا۔ "عبداللہ نے بھی مجھ سے یہ ہی کہا تھا کہ آپ دونوں ہی عجیب ہیں۔ انہیں مدر ٹریسا بننے کا شوق ہے آپ کو اپنے مفروضوں پر دوسروں کی خوشیاں خراب کرنے کا۔ "نو کمپلیمنٹ ایچ ادر" وہ کہہ رہا تھا۔
"راستے سے ہٹ جائیں۔" وہ ایک راہ گیر تھا جو انہیں راستہ دینے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہ دونوں بیک وقت راستے سے ہٹے تھے۔
"کبھی کسی زیادہ اچھے موسم میں میں تم سے ایک بار پھر پوچھوں گا کہ کیا میں تمہارے ورلڈ ٹور کو اسپانسر کر سکتا ہوں۔" راہ گیر کے گزر جانے کے بعد جبریل نے اس سے کہا تھا۔
"مجھ جیسوں کو ڈھونڈنے کے بجائے تم اگر مجھ سے ہی بات کر لیتیں تو سولہ سال کی عمر میں بھی میں تمہیں "نہیں" نہیں کہتا۔ انتظار کرنے کو کہہ دیتا زیادہ سے زیادہ۔"
اس نے جبریل کو کہتے سنا۔ "میں نیورو سرجن ہوں، دماغ پڑھ سکتا ہوں، دل نہیں اور میں روایتی قسم کی رومانٹک باتیں بھی نہیں کر سکتا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "تم سولہ سال کی عمر میں بھی مجھے اچھی لگی تھیں۔ آج بھی لگتی ہو۔ میں نے اپنی ماں سے بھی یہ کہا، انہوں نے مجھ سے کہا، اگر اللہ نے جبریل سکندر کے دل میں اس کی محبت اتاری ہے تو پھر وہ بہت اچھی لڑکی ہو گی جس کی کوئی خوبی اللہ کو پسند ہے... میں اپنی ماں کا جملہ دہرا رہا ہوں، اسے خود پسندی مت سمجھنا۔"
آنسوؤں کا ایک ریلا آیا تھا عائشہ عابدین کی آنکھوں میں اور اس کے پتھر ہوتے دل کو گھلانے لگا تھا۔
"پتا نہیں ہم کتنے مومن، کتنے کافر ہیں، لیکن جو بھی ہیں۔ اللہ ہمارے دلوں سے بے خبر نہیں ہے۔" عائشہ عابدین نے ایک بار کہیں پڑھا تھا۔

"اچھا وقت اچھے وقت پر آتا ہے۔" اس کی نانی کہا کرتی تھیں۔

وہ عجیب جملے تھے۔ اور سالوں بعد اپنا مفہوم سمجھا رہے تھے۔

"تم میری ممی کی طرح بہت روتی ہو بات بات پر۔ تمہاری اور ان کی اچھی نبھے گی۔" جبریل نے گہرا سانس لیتے ہوئے اس کی سرخ بھیگی ہوئی آنکھوں اور ناک کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کافی پیو گی یا اب بھی گروسری کرو گی؟" وہ اسے اب چھیڑ رہا تھا۔

"گروسری زیادہ ضروری ہے۔" اس نے اپنی ندامت چھپاتے ہوئے آنسوؤں پر قابو پا کر کہا۔

"اگر اتنی ضروری ہوتی تو تم گروسری اسٹور کو پیچھے نہ چھوڑ آتیں۔" عائشہ نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔ وہ واقعی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ بہت ساری دوسری چیزوں کی طرح۔ آگے بہت کچھ تھا۔ اس نے جبریل کا نم چہرہ دیکھا پھر نم آنکھوں سے مسکرائی۔



امامہ نے اس اسکریپ بک کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔ وہ اس ہی کی اسکریپ بک تھی۔ وہ اسکریپ بک جس میں اس نے بھی اپنے تصوراتی گھر کے لیے ڈرائنگ کی تھی۔ مختلف گھروں کی مختلف چیزوں کی تصویریں کھینچ کھینچ کر ایک کلیکشن بنائی تھی کہ جب وہ اپنا گھر بنائے گی تو اس کا فلور اس گھر جیسا ہوگا۔ کھڑکیاں اس گھر جیسی، دروازے اس گھر جیسے۔ ہاتھ سے بنائے اسکیچز کے ساتھ۔ اور اس میں ان بہت سے خوب صورت گھروں کی میگزینز سے کاٹی گئی تصویریں بھی چسپاں تھیں۔

وہ اسکریپ بک چند سال پہلے اس نے پھینک دینے کے لیے بہت ساری ردی کے ساتھ نکالی تھی اور حمین نے اسے پھینکنے نہیں دی تھی۔ اس سے وہ اسکریپ بک لے لی تھی اور اب امامہ نے اس اسکریپ بک کو یہاں دیکھا تھا۔ حمین سکندر کے اس پینٹ ہاؤس کی ایک دراز میں۔ اس کی مرمت کی جا چکی تھی اور وہ بہت صاف ستھری اور اس سے بہتر حالت میں نظر آرہی تھی جس میں امامہ نے اسے آخری بار حمین کو دیتے ہوئے دیکھا تھا۔

"تم کیا کرو گے اس کا؟" اس نے حمین سے پوچھا تھا۔

"آپ کو ایسا ایک گھر بنا کر دوں گا۔" اسے وہی جواب ملا تھا جس کا اسے پہلے ہی اندازہ تھا، وہ حمین سکندر کے سرپرائز کو بوجھنے میں ماہر تھی۔

"مجھے اب ایسے کسی گھر کی تمنا نہیں ہے۔" امامہ نے اسے کہا تھا۔

"ایک وقت تھا جب تھی پر اب نہیں۔ اب مجھے بس ایک چھوٹا سا ایسا گھر چاہیے جہاں پر میں تمہارے بابا کے ساتھ رہوں اور تمہارے بابا کے پاس وہ ہے۔ اس لیے تم اس گھر کو بنانے میں اپنی انرجی اور وقت ضائع مت کرنا۔" اس نے حمین کو نصیحت کی۔

"میری خواہش ہے یہ ممی!" حمین نے اس سے کہا تھا۔

"یہ گھر میں نے تمہارے بابا سے مانگا تھا، وہ نہیں دے سکے اور تم سے میں لوں گی نہیں۔ میں کبھی سالار کو یہ احساس نہیں ہونے دوں گی کہ تم نے مجھے وہ دے دیا ہے جو وہ نہیں دے سکا۔" حمین کو اس کی بات سمجھ میں آگئی تھی۔

"سوچ لیں۔" اس نے جیسے امامہ کو چیلنج کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

"سوچ لیا۔" وہ چیلنج قبول کرتے ہوئے ہنس پڑی۔

"آپ کو دنیا میں بابا کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آتا۔" حمین نے شکایتاً اس سے کہا۔

"ہاں نہیں آتا۔" وہ ہنسی۔
"زیادتی ہے یہ۔" اس نے جتایا۔
"اتنا تو کر سکتی ہوں۔" اس نے جواباً "چھیڑا"۔
"دادا کہتے تھے آپ دونوں پتھر کے زمانے میں بھی ہوتے تو مل جاتے۔" وہ اب اسے چھیڑ رہا تھا' وہ بے اختیار ہنسی تھی اور ہنستی چلی گئی تھی۔
اور اب وہ اس اسکریپ بک کو کھولتے ہوئے اسے ورق بہ ورق دیکھ رہی تھی۔ جیسے اپنی زندگی کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس کے پاس وہ اسکریپ بک تو ہی خالی تھی اور اب وہ ساری بھر چکی تھی۔ اس نے کچھ تجسس کے عالم میں ان صفحوں سے آگے دیکھنا شروع کیا جو اس نے بھرے تھے۔ وہاں بھی تصویریں تھیں۔ خوب صورت گھروں کی۔ وہ حمین سکندر کا انتخاب تھا۔ اس ہی کی طرح کاٹ کاٹ کر لگائی ہوئی تصویریں' مگر فرق صرف یہ تھا کہ وہ میگزینز سے کاٹی ہوئی تصویریں نہیں تھیں' وہ کھینچی ہوئی تصویریں تھیں حمین سکندر کے اپنے گھروں کی' وہ چہرے پر مسکراہٹ لیے بڑے اشتیاق سے ان گھروں کی تصویروں کو دیکھتی جا رہی تھی۔ وہ یقیناً "خوش نصیب تھا' تیس سال کی عمر تک پہنچے بغیر درجنوں گھروں کا مالک تھا۔ اس کی ساری اولادوں میں دولت کے معاملے میں سب سے زیادہ امیر اور خرچ کرنے میں سب سے زیادہ فیاض۔ اس نے اپنی زندگی کی سب سے پہلی کمپنی امامہ سے قرض لے کر شروع کی تھی۔
"صرف اس لیے لے رہا ہوں آپ سے کہ بابا نے بھی ایس آئی ایف آپ کے قرض سے شروع کیا تھا۔" اس نے امامہ کو منطق بتائی تھی اور اس وقت پہلی بار امامہ نے سالار سے ایس آئی ایف میں دی جانے والی اپنی اصل رقم واپس مانگی تھی۔
"وہ ڈبو دے گا۔ مجھے یقین ہے۔" سالار نے اسے خبردار کیا تھا۔ وہ اس وقت سولہ سال کا بھی نہیں تھا اور اگر سالار یہ تبصرہ کر رہا تھا تو غلط نہیں تھا۔
"جب تمہیں ایس آئی ایف کے لیے یہ رقم دی تھی تو پاپا نے بھی یہ ہی کہا تھا۔ تم نے ڈبو دی کیا؟" اس نے سالار کو جتایا تھا۔
"تم میرا حمین سے موازنہ کر رہی ہو۔" سالار ناخوش ہوا تھا۔
"پہلی بار نہیں کر رہی۔" اس نے جواباً "کہا تھا۔
کتنا وقت گزر گیا تھا۔ گزر گیا تھا یا شاید بہہ گیا تھا۔ زندگی بہت آگے چلی گئی تھی۔ خواہشات نفس بہت پیچھے چلی گئی تھیں۔
امامہ نے ہاتھ میں پکڑی اسکریپ بک اپنے سامنے سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہاں پڑا چائے کا مگ اٹھا لیا۔ وہ اب سر اٹھا کر آسمان کو دیکھنے لگی تھی۔ وہ چند دن پہلے پاکستان سے مستقل طور پر امریکہ شفٹ ہوئی تھی اور حمین کا گھر اس کا پہلا پڑاؤ تھا۔ سالار بھی چند دن کے لیے وہیں تھا اور اس وقت صبح سویرے وہ اپنے لیے چائے بنا کر پینٹ ہاؤس کے اس حصے میں آ کر بیٹھی تھی جس کی چھت بھی شیشے کی تھی۔ نیلے آسمان پر تیرتے ہلکے بادلوں اور اڑتے پرندوں کو وہ اس پرسکون خاموشی میں بچوں کے سے اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ تب ہی اس نے اپنے عقب میں آہٹ سنی۔ وہ سالار تھا۔ چائے کے اپنے مگ کے ساتھ۔
دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے تھے ایک طویل مدت کے بعد وہ یوں امریکہ میں اس طرح فرصت سے مل رہے تھے۔ سالار کی زندگی کی بھاگ دوڑ کے بغیر۔ وہ بھی اس کے قریب کاؤچ پر بیٹھ گیا تھا' کاؤچ پر اس کے برابر بیٹھے چائے کے مگ ہاتھ میں لیے وہ دونوں آج بھی ویسے ہی تھے۔ سالار کم گو' وہ سب کچھ کہہ دینے والی۔

سالار سنتے رہنے والا' وہ دنیا جہاں کی باتیں دہرا دینے والی۔ مگر ان کے پاس فرصت صرف چائے کے مگ جتنی ہوتی تھی۔ چائے کا مگ بھرا ہوتا تو ان کی باتیں شروع ہوتیں اور اس کے ختم ہونے تک باتیں اور فرصت دونوں ختم ہو جاتیں۔ چائے کا وہ مگ جیسے ان کی قربت میں گزاری ہوئی زندگی تھی۔ نرم گرم' رک رک کر' ٹھہر ٹھہر کر گزرتی ہوئی' مگین' جتنی بھی تھی تسکین بھری تھی۔

سالار نے سامنے پڑی اسکریپ بک کو سرسری نظر سے دیکھا۔ چند لمحوں کے لیے اٹھا کر الٹا پلٹا پھر واپس رکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے جیسے شوق ہیں تمہارے بیٹے کے۔" وہ مسکرا دی۔ وہ دونوں اس کے پاس پینٹ ہاؤس میں پہلی بار آئے تھے۔

"دس سال ریٹائر ہونے کا سوچ رہا ہوں۔" چائے کا ایک سپ لیتے ہوئے سالار نے امامہ سے کہا۔

"کئی سالوں سے سن رہی ہوں۔" اس نے جواباً کہا۔ وہ بے اختیار ہنسا۔

"نہیں' اب تم آگئی ہو امریکہ تو اب ریٹائر ہو سکتا ہوں۔ پہلے تو تنہائی کی وجہ سے کام کرنا میری مجبوری تھی۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

"بیس سال کی ہوتی تو تمہاری اس بات پر خوش ہوتی۔" امامہ نے بے ساختہ کہا۔

"خیر بیس سال کی عمر میں میرے اس جملے پر تو تم کبھی خوش نہیں ہوتیں۔" اس نے ترکی بہ ترکی کہا۔ دونوں بیک وقت ہنسے۔

"یہ ویسا ہی گھر ہے جیسا ایک بار تم نے خواب میں دیکھا تھا۔ اس جھیل کے کنارے؟" سالار نے ایک دم آسمان کو دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ وہ بھی سر اٹھا کر شیشے سے نظر آتے آسمان کو دیکھنے لگی۔

"نہیں' ویسا گھر نہیں ہے۔" امامہ نے ایک لمحے کے بعد کہا۔ سکندر عثمان کی موت کے بعد امامہ نے ایک بار پھر وہی جھیل کنارے ایک گھر دیکھا تھا۔ جو وہ اپنی زندگی کے کئی سالوں میں بار بار دیکھتی رہی تھی۔ مگر اس بار وہ خواب اس نے بہت عرصے کے بعد دیکھا تھا۔

"وہ گھر ایسا نہیں تھا۔" وہ اس پینٹ ہاؤس کو گردن گھما کر دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ "وہ آسمان ایسا نہیں تھا۔ نہ وہ پرندے ایسے تھے' نہ وہ شیشہ ایسا۔" کاؤچ پر اس کے برابر بیٹھے چائے کے دو مگ ہاتھ میں لیے وہ بولی۔

"وہ گھر دنیا میں کبھی کہیں نہیں دیکھا میں نے۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "میں کوئی چیز دنیا بھر میں پھرنے کے باوجود کہیں نظر نہیں آئی مجھے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے وہ گھر جنت میں ملے گا ہمیں۔" وہ کہہ کر خاموش ہو گئی تھی۔ وہ بھی جو کہے بغیر خاموش ہی رہا تھا۔

"تم نے کچھ نہیں کہا۔" امامہ نے اس کی خاموشی کو کریدا۔ اس نے گردن موڑ کر مسکراتے ہوئے امامہ کو دیکھا اور بڑبڑایا۔

"آمین۔" وہ چپ رہی' پھر ہنس پڑی' وہ آج بھی ویسا ہی تھا۔ مختصر مگر اگلے کو لاجواب کر دینے والی باتیں کہہ دینے والا۔

"مگر وہ جنت ہے تو پھر میں تم سے پہلے وہاں جاؤں گا۔" وہ امامہ سے کہہ رہا تھا۔ "تمہیں یاد ہے نا میں وہاں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

"ضروری نہیں۔" لمحہ بھر کے لیے وہ چائے پینا بھولی۔ "خوابوں میں سب کچھ سچ نہیں ہوتا۔" اس نے بے اختیار کہا تھا۔ آج بھی بچھڑ جانے کا خیال اسے بے کل کر رہا تھا۔

"مگر وہ واقعی جنت... کیا تم چاہتی ہو یہ خواب سچ ہو جائے؟" وہ عجیب انداز میں مسکرایا تھا۔ ایک بار پھر

لاجواب کر دینے والے جملے کے ساتھ۔

"بس اتنا کہ تم وہاں پہلے انتظار میں مت کھڑے ہو۔ دونوں اکٹھے بھی تو جا سکتے ہیں۔" امامہ نے چائے کا مگ خالی کر کے سامنے پڑی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے اب سالار کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

"اب بھی کھونا؟" وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

"کیا؟" اس نے پوچھا۔

"آمین۔"

وہ ہنس پڑا۔ "آمین۔"



ٹھیک نو بج کر پندرہ پر لفٹ کا دروازہ کھلا تھا اور دو سیکیورٹی گارڈز تیز رفتار قدموں سے باہر نکلے تھے اور ان دونوں کے بالکل پیچھے چند قدموں کے فاصلے پر وہ نکلا تھا۔ اس پورے کوریڈور میں یکدم ہلچل مچ گئی تھی۔ وہاں پہلے سے کھڑے سیکیورٹی آفیشل اور پروٹوکول کے اہلکار یک دم الرٹ ہو گئے تھے۔

"وہ" بے حد تیز قدموں سے ان دو سیکیورٹی گارڈز کے عقب میں چل رہا تھا اور اس کے بالکل پیچھے اس کے اپنے عملے کے چند افراد بے حد تیز قدموں سے اس سے قدم ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"ایک، دو، تین، چار، پانچ۔" زیر لب گنتی کرتے ہوئے اس ٹارگٹ کلر نے "ایک" کا لفظ زبان سے ادا کرتے ہی اپنی رینج میں آنے والے اپنے ٹارگٹ پر فائر کر دیا تھا۔ اس نے بینکوئٹ ہال کے شیشے کے پرخچے اڑتے دیکھے۔

"تم نے اس سے کیا کہا ہے کہ اس نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دی؟" ہشام سے ملاقات کے کئی دن بعد تک بھی اس ملاقات کے حوالے سے کوئی تازہ خبر نہ ملنے اور ہشام کی طرف سے ہو جانے والی پُراسرار خاموشی نے رئیسہ کو فکرمند کیا اور وہ حمین سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

"اس نے تمہارا پیچھا چھوڑ دیا۔ یہ تو اچھا ہے، تم یہی تو چاہتی تھیں نا۔" اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔

رئیسہ کو جواب نہیں سوجھا۔ وہ اس کی یونیورسٹی آیا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے، مگر تم نے اس سے کیا کہا؟" رئیسہ نے کچھ بجھے ہوئے انداز میں حمین سے کہا تھا۔ وہ اس کے لیے برگر لایا تھا اور اپنا راستے میں ہی کھاتا آیا تھا۔ اب اس کے پاس صرف ایک ٹکڑا رہ گیا تھا جسے وہ بڑے بے ڈھنگے پن سے نگل رہا تھا۔ رئیسہ نے اپنا برگر نکال کر کھانا شروع کر دیا۔ اسے پتا تھا وہ اپنا ختم کرنے کے بعد اس کا برگر بھی کھانا شروع کر دیتا۔

"میں نے اس سے کہا اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو بادشاہت چھوڑ دیتا۔" اس نے آخری ٹکڑا نگلتے ہوئے کہا اور رئیسہ کی بھوک مر گئی تھی۔ کیا الٹا مشورہ تھا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

"لیکن میں نے اس سے صرف یہ نہیں کہا تھا۔" حمین اب اپنی انگلیاں چاٹ رہا تھا۔ پھر اس نے رئیسہ سے بڑے اطمینان سے کہا۔ "تمہاری بھوک تو مر گئی ہوگی، میری ابھی ہے۔ تم نے نہیں کھانا تو میں یہ باقی بھی کھا لوں۔"

رئیسہ نے خاموشی سے اسے برگر تھما دیا۔ اس کی بھوک واقعی مر گئی تھی۔

"میں نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ ولی عہد کے لیے مناسب امیدوار ہے ہی نہیں۔ نہ اہلیت رکھتا ہے، نہ صلاحیت۔ اور یہ شادی ہو یا نہ ہو۔ جلد یا بدیر وہ ویسے بھی ولی عہد کے عہدے سے معزول کر دیا جائے گا۔ (اس لیے اس کے پاس دو راستے ہیں) یا تو اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرے اور ولی عہد کا عہدہ ابھی چھوڑ دے یا پھر

بادشاہت کے خواب دیکھتے رہنے میں محبت بھی گنوائے اور تخت بھی۔" حمین نے بڑے اطمینان سے اسے گفتگو کا باقی حصہ سنایا تھا۔

"تم نے یہ سب کہا اس سے اس طرح۔" رئیسہ کو شدید صدمہ ہوا۔

"نہیں ایسے نہیں کہا، تمہیں تو میں مہذب انداز سے بتا رہا ہوں، اسے تو میں نے صاف صاف کہا کہ زیادہ سے زیادہ تین مہینے ہیں اور اس کے پاس۔ اگر تین مہینے میں وہ معزول نہ ہوا تو پھر رئیسہ سے دوسری شادی کر لینا۔" وہ دانت پر دانت رکھے حمین سکندر کو صرف دیکھ کر ہی رہ گئی۔ اس "گفتگو" کے بعد اگر ہشام بن صباح نے اسے اپنی زندگی سے نکال دیا تھا تو کوئی بھی خوددار شخص یہی کرتا۔

"صباح بن جراح کے خلاف شاہی خاندان کے اندر شدید لابنگ ہو رہی ہے اور صباح بن جراح اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے پرانے امیر کی فیملی میں شادی کروانا چاہتا ہے ہشام کی۔ اور یہ ہو بھی گئی تب بھی وہ بہت دیر تخت پر نہیں رہ سکتا۔ اس کے حریف بہت طاقتور لوگ ہیں اور صباح سے زیادہ بہتر حکمران ہو سکتے ہیں۔ اگر صباح ہٹ جاتا ہے تو پھر ہشام کو کون رہنے دے گا وہاں۔ میں نے ہشام کو یہ سب نہیں بتایا، تمہیں بتا رہا ہوں۔" اس نے برگر ختم کرتے ہوئے ہاتھ جھاڑے اور رئیسہ سے کہا۔

"تم فنانس کر رہے ہو اس کے حریفوں کو؟" اسے رئیسہ سے جس آخری سوال کی توقع تھی وہ یہی تھا۔

دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے پھر حمین نے کہا۔

"میں صرف "بزنس" کر رہا ہوں۔ امریکہ میں صباح کے ساتھ۔ بحرین میں اس کے مخالفین کے ساتھ۔" اس نے بالآخر کہا۔ وہ گول مول اعتراف تھا۔

"کیوں کر رہے ہو؟" رئیسہ نے جواباً اس سے زیادہ تیکھے انداز میں اس سے کہا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

"اپنی فیملی کے لیے۔" رئیسہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

"مجھے خیرات میں ملی ہوئی محبت نہیں چاہیے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"وہ تمہارے لیے میرے اندازے سے زیادہ مخلص ہے۔ نہ ہوتا تو میں تمہیں بتا دیتا۔ وہ تمہارے لیے بادشاہت بھی چھوڑ دے گا۔" حمین نے دو ٹوک انداز میں اس سے کہا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

اس نے اپنی ٹیلی اسکوپک رائفل سے اس ٹارگٹ کلر کو ٹریگر دباتے دیکھا۔ بے حد سکون اور اطمینان کے عالم میں اس نے اس کی ہلکی سی مسکراہٹ بھی دیکھی تھی۔ پھر اس نے اس ٹارگٹ کلر کو بے حد مطمئن انداز میں سر اٹھاتے اور ٹیلی اسکوپک رائفل سے آنکھ ہٹاتے دیکھا اور اس وقت اس نے اسے شوٹ کیا۔ ایک مدھم تک کی آواز کے ساتھ اس نے کھڑکی سے اس کے بھیجے کو اڑتے دیکھا اور اپنے کمرے کے باہر بھاگتے قدموں کا شور۔ اس کا مشن پورا ہو چکا تھا اب اسے یہاں سے فرار کرانے والے اس کے منتظر تھے۔

☼ ☼ ☼

عنایہ نے اپنے اسپتال کی پارکنگ میں داخل ہوتے ہوئے عبداللہ کی کال اپنے فون پر دیکھی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ الجھی پھر اس نے اس کی کال ریسیو کی۔

"مل سکتے ہیں؟" اس نے سلام دعا کے بعد پہلا جملہ کہا۔ وہ ایک لمحہ خاموش رہی۔

"تم یہاں ہو؟" اس نے پوچھا۔

"تمہاری گاڑی کے پیچھے ہی ہے میری گاڑی۔" عنایہ نے بے اختیار بیک ویو مرر سے عقب میں عبداللہ کی گاڑی کو دیکھا جو اسے لائٹ سے اشارہ کر رہا تھا۔ دس منٹ بعد پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرتے ہوئے وہ اس کی گاڑی میں آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پھول کے ساتھ دو شاخیں تھیں۔ عنایہ نے کچھ کہے بغیر اسے دیکھا پھر وہ تھام لیں۔

وہ فون پر پہلے ہی احسن اور عائشہ کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں کے بارے میں اسے بتا چکا تھا۔

"آئی ایم سوری۔" اس نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" عنایہ نے جواباً کہا۔

"میں نے اسپتال میں ڈاکٹر احسن کی امامت میں نماز پڑھنا چھوڑ دی۔"

عنایہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"میں نے اسے بتا دیا کہ اپنی بیوی کے ساتھ ایسا سلوک کرنے والا شخص امامت کا اہل نہیں ہے۔ عائشہ کے خلاف سارے الزامات واپس لینے ہوں گے اگر وہ دوبارہ امامت کروانا چاہتا ہے تو۔" عبداللہ بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"وہ تو اس لیے اس نے کیس واپس لیا ہے۔" عنایہ نے بے اختیار کہا۔

عبداللہ چونکا۔ "اس نے کیس واپس لے لیا؟"

"ہاں۔ جبریل نے بتایا مجھے۔ اس نے ایک معذرت کا خط بھی لکھا ہے عائشہ کے نام۔" عنایہ نے مزید بتایا۔

"یہ سب بے کار ہے اب وہ بہت زیادہ نقصان کر چکا ہے۔"

"عائشہ کا؟"

"نہیں اپنا۔" عبداللہ کے لہجے میں افسردگی تھی۔

"اچھے انسان رہ گزر کر جاتے ہیں ہر نقصان سے کیونکہ اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے، برے نہیں کر سکتے۔" عبداللہ کہہ رہا تھا۔

"وہ بہت برا چھوٹا ہے۔"

"وہ اپنے پیرنٹس کے ساتھ بابا سے ملنے بھی آئے تھے جبریل کی شکایت کرنے۔" عنایہ کہہ رہی تھی۔ "بابا نے اس کے باپ سے کہا کہ وہ مجھے اس کی منافقت اور تنگ نظری نے اس کے اکلوتے بیٹے کو کیا بنا دیا ہے۔"

"وہ شرمندہ ہوئے؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"پتا نہیں، خاموش ہو گئے تھے البتہ احسن سعد کی ماں رونے لگی تھی پتا نہیں کیوں، پھر وہ چلے گئے۔" عنایہ نے کہا۔

"تم نے مجھے معاف کر دیا؟" عبداللہ نے یک دم پوچھا۔

وہ مسکرا دی۔ "ہاں۔ ایسی کوئی بڑی غلطی تو نہیں تھی تمہاری کہ معاف ہی نہ کرتی۔"

عبداللہ نے ایک کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ بے اختیار ہنسی۔

"اب سب کچھ زبان سے کہنا سیکھو۔ سب کچھ لکھ لکھ کے کیوں بتاتے ہو۔" وہ کارڈ کھولتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی پھر وہ بات کرتے کرتے ٹھٹک گئی۔ ایک ہاتھ سے بنے ہوئے کارڈ پر صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔

"تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

عنایہ نے اپنی شرٹ کی جیب میں لگے بال پوائنٹ کو نکال کر اس تحریر کے نیچے لکھا۔ "ہاں۔"

عبداللہ مسکرایا اور اس نے اس کا بال پوائنٹ لیتے ہوئے لکھا۔ "کب؟"

عنایہ نے لکھا۔ "پھولوں کے موسم میں۔"
"بہار؟" عبداللہ کا سوال تھا۔
جواب میں عنایہ نے لکھا۔ "ہاں۔"
عبداللہ نے کارڈ پر ایک دل بنایا' عنایہ نے ایک اور۔ عبداللہ نے مسکراہٹ کا علامتی نشان بنایا۔ عنایہ نے ایک اور۔۔۔

کارڈ لکیروں' حرفوں' ہندسوں' جذبوں سے بھرتا جارہا تھا اور ہر شے صرف محبت کی ترجمان تھی جو اللہ تعالیٰ کی بہترین نعمتوں میں سے ایک ہے اور جسے پانے والے خوش نصیب۔ وہ دونوں خوش نصیب تھے جو اس کارڈ کو عہد اور تجدید عہد سے بھر رہے تھے۔



لفٹ کا دروازہ کھلا۔ سالار نے اپنی گھڑی دیکھی۔ اس کے دو سیکورٹی گارڈز اس سے پہلے لفٹ سے نکل گئے تھے اس کا باقی کا عملہ اس کے لفٹ سے نکلنے کے بعد پیچھے نکلا تھا۔ کوریڈور میں تیز قدموں سے چلتے وہ استقبال کرنے والے آفیشل سے ملا تھا۔ اس نے گھڑی ایک بار پھر دیکھی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ وقت پر پہنچا تھا۔ چند سیکنڈز کے بعد وہ بینکویٹ ہال میں داخل ہو جاتا۔ وہاں جو ہونے والا تھا' وہ اس سے بے خبر تھا۔ بے خبری زندگی میں ہر وقت نعمت نہیں ہوتی۔

ٹی وی پر چلتی اس خبر کو دیکھتے ہوئے سالار گنگ تھا۔ آخری چیز جو وہ اپنی زندگی اور کیریئر کے اس اسٹیج پر ہونے کی توقع کرسکتا تھا' وہ یہ تھی۔ رحم کھا کر گود لی گئی بچی کو اس کے گناہ کے طور پر پوری دنیا میں دکھایا جارہا تھا اور یہ سب کہنے والا اس بچی کا اپنا باپ تھا۔ جس کی بیوی کی سالار نے کبھی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ اغوا اور ناجائز اولاد تو دور کی بات تھی۔ وہ طاقت کا کھیل تھا۔ جنگ تھی اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ سازش کی جارہی تھی نیروبی میں ہونے والے ٹی اے آئی اور ایس آئی ایف کے اس اشتراک کو ہونے سے پہلے توڑنے کی کوشش کی جارہی تھی بے کار تھا۔

وہ اس وقت نیویارک ایئرپورٹ پر ایک فلائٹ لینے کے لیے موجود تھا جب پہلی بار وہ خبر بریک ہوئی تھی اور اس نے بزنس کلاس کے ڈیپارچر لاؤنج میں دیکھی تھی۔ اس کے ساتھ موجود اس کے اسٹاف نے ایک کے بعد ایک نیوز چینلز کی اپ ڈیٹ کو اس کے ساتھ شیئر کرنا شروع کر دیا تھا۔ سالار سکندر نے وہاں بیٹھے سب سے پہلی کال امامہ کو کی تھی۔ اور امامہ نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس سے کہا تھا۔
"مجھے کوئی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں' نہ مجھے' نہ اپنے بچوں کو۔"
"رئیسہ سے بات کرو۔ مجھے اپنے سے زیادہ تکلیف اس بات کی ہے کہ وہ اس کی تصویریں چلا رہے ہیں۔"
اس نے امامہ سے کہا تھا۔ وہ اپ سیٹ تھا۔ اس کا اندازہ امامہ کو اس کی آواز سے بھی ہو رہا تھا۔
"یہ وقت بھی گزر جائے گا سالار۔" امامہ نے اس سے کہا تھا' تسلی دینے والے انداز میں۔ "تم نے اس سے زیادہ برا وقت دیکھا ہے۔"
سالار نے سر ہلایا تھا' ممنونیت کے عجیب سے احساس کے ساتھ۔ گھر میں بیٹھی وہ عورت ان سب کے لیے عجیب طاقت تھی۔ عجیب طرح سے حوصلہ دیے رکھتی تھی ان کو۔ عجیب طریقے سے ٹوٹنے سے بچاتی تھی۔



وہ یہاں کسی جذباتی ملاقات کے لیے نہیں آئی تھی۔ سوال و جواب کے کسی لمبے چوڑے سیشن کے لیے بھی

نہیں۔ لعنت وملامت کے کسی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بھی نہیں۔ وہ یہاں کسی کا ضمیر جھنجھوڑنے آئی تھی، نہ ہی کسی سے نفرت کا اظہار کرنے کے لیے۔ نہ ہی وہ کسی کو یہ بتانے آئی تھی کہ وہ اذیت کے ماؤنٹ ایورسٹ پر کھڑی ہے نہ ہی وہ اپنے باپ کو گریبان سے پکڑنا چاہتی تھی۔ نہ اسے یہ جتانا چاہتی تھی کہ اس نے اس کی زندگی تباہ کردی تھی۔ اس کے تحت ذہن اور جسم کو ہمیشہ کے لیے مفلوج کردیا تھا۔

وہ یہ سب کچھ کہتی۔ یہ سب کچھ کرتی، اگر اسے یقین ہوتا کہ یہ سب کرنے کے بعد اسے سکون مل جائے گا۔ اس کا باپ احساس جرم یا پچھتاوے جیسی کوئی چیز جاننے لگے گا۔

پچھلے کئی ہفتے سے وہ آبلہ پا تھی۔ وہ راتوں کو سکون آور گولیاں لیے بغیر سو نہیں پا رہی تھی اور اس سے بڑھ کر تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ وہ سکون آور ادویات لینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سوچنا چاہتی تھی اس بھیانک خواب کے بارے میں، جس میں وہ چند ہفتے پہلے داخل ہوئی تھی اور جس سے اب وہ ساری زندگی نہیں نکل سکتی تھی۔

وہ یہاں آنے سے پہلے پچھلی پوری رات روتی رہی تھی۔ یہ بے بسی کی وجہ سے نہیں تھا۔ یہ اذیت کی وجہ سے بھی نہیں تھا۔ یہ اس غصے کی وجہ سے تھا جو وہ اپنے باپ کے لیے اپنے دل میں اتنے دنوں سے محسوس کررہی تھی۔ ایک آتش فشاں تھا جیسے کوئی الاؤ جو اس کو اندر سے سلگا رہا تھا، اندر سے جلا رہا تھا۔

کسی سے پوچھے بغیر، کسی کو بتائے بغیر یوں اٹھ کر وہاں آجانے کا فیصلہ جذباتی تھا، احمقانہ تھا اور غلط تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار ایک جذباتی، احمقانہ اور غلط فیصلہ بے حد سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اختتام چاہتی تھی وہ اپنی زندگی کے اس باب کا جس کے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ سکتی تھی اور جس کی موجودگی کا انکشاف اس کے لیے دل دہلا دینے والا تھا۔

اس کا ایک ماضی تھا۔ وہ جانتی تھی لیکن اسے کبھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کے ماضی کا "ماضی" بھی ہوسکتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر تھا جب وہ "خوش" تھی اپنی زندگی میں۔ جب وہ خود کو باسعادت سمجھتی تھی۔ اور "مقرب" سے "ملعون" ہونے کا فاصلہ اس نے چند سیکنڈز میں طے کیا تھا۔ چند سیکنڈز شاید زیادہ وقت تھا۔ شاید اس سے بھی بہت کم وقت تھا جس میں وہ احساس کمتری، احساس محرومی، احساس ندامت اور ذلت و بدنامی کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہوئی تھی۔ اور یہاں وہ اس ڈھیر کو دوبارہ وہی شکل دینے آئی تھی۔ اس بوجھ کو اس شخص کے سامنے اتار پھینکنے آئی تھی جس نے وہ بوجھ اس پر لادا تھا۔

کسی کو اس وقت یہ پتا نہیں تھا کہ وہ وہاں تھی۔ کسی کو پتا ہوتا تو وہ وہاں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کا سیل فون پچھلے کئی گھنٹوں سے آف تھا۔ وہ چند گھنٹوں کے لیے خود کو اس دنیا سے دور لے آئی تھی، جس کا وہ حصہ تھی۔ اس دنیا کا حصہ، یا پھر اس دنیا کا حصہ، جس میں وہ اس وقت موجود تھی۔۔۔؟ یا پھر اس کی کوئی بنیاد نہیں تھی؟ وہ کہیں کی نہیں تھی اور جہاں کی تھی، جس سے تعلق رکھتی تھی، وہ اس کو اپنا نہیں سکتی تھی۔

انتظار طویل ہوگیا تھا۔ انتظار ہمیشہ طویل ہوتا ہے۔ کسی بھی چیز کا انتظار ہمیشہ طویل ہوتا ہے۔ چاہے آنے والی شے پاؤں کی زنجیر بننے والی ہو یا گلے کا ہار، سر کا تاج بن کر سجنا ہو اس نے یا پاؤں کی جوتی۔ انتظار ہمیشہ لمبا ہی لگتا ہے۔

رئیسہ سالار صرف ایک سوال کا جواب چاہتی تھی اپنے باپ سے۔ صرف ایک چھوٹے سے سوال کا۔ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا تھا؟ اور اگر انہیں مار ڈالا تھا اور اسے کیوں چھوڑ دیا تھا یا اس کی زندگی اس کے باپ کی چوک کا نتیجہ تھی؟ سوالات کا ایک انبار تھا جو وہ اس سے کرنا چاہتی تھی۔

اس نے ویٹنگ ایریا میں بیٹھے اپنی سلگتی آنکھوں کو ایک بار پھر مسلا۔ وہ پتا نہیں کتنی راتوں سے سو نہیں پائی

تھی... ایک بھیانک خواب تھا پچھلے دو ہفتے، جس میں اسے پہلی بار میڈیا سے پتا چلا تھا کہ اس کا باپ کون تھا، وہ کون تھی، کہاں سے تھی۔ وہ سالار سکندر اور امامہ ہاشم کی بیٹی نہیں تھی، وہ یہ جانتی تھی لیکن اسے ہمیشہ یہی بتایا گیا تھا کہ وہ سالار کے ایک دوست کی بیٹی تھی جو ایک حادثے میں اپنی بیوی سمیت ہلاک ہو گیا تھا اور پھر سالار نے اسے اڈاپٹ کر لیا۔ مگر اب اس کی زندگی میں اچانک غلام فرید آ گیا تھا جسے ٹی وی پر دیکھتے ہوئے بھی اس کا ذہن اس سے کسی بھی رشتہ سے انکاری تھا۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتی تھی۔

وہ سب اس بھونچال میں اس کے پاس آ گئے تھے، حمین، جبریل، عنایہ، امامہ، سالار اور ہشام بھی۔ اسے یہ بتانے کہ انہیں فرق نہیں پڑتا کہ وہ کون تھی، کیا تھی؟ وہ ان کے لیے رئیسہ تھی۔ وہی پہلے والی رئیسہ۔ وہ ان سب کی شکر گزار تھی، ممنون تھی، احسان مند تھی اور اس نے ان سب کو یہ احساس دلایا تھا کہ وہ بالکل ٹھیک تھی مگر وہ ٹھیک نہیں تھی۔ اندر ہونے والی توڑ پھوڑ بے حد تھی، اس لیے بھی کہ وہ اس خاندان کی ذلت اور رسوائی کا سبب بن رہی تھی جنہوں نے اس پر رحم کھاتے ہوئے اسے پالا تھا۔ ایک لمحہ بھر کے لیے بھی سالار سکندر پر اپنے باپ کے لگائے ہوئے الزامات کے جھوٹا ہونے میں کوئی شک نہیں ہوا تھا اور اس کے یہاں آنے کی وجہ بھی وہی الزامات تھے۔ وہ کسی کو بتائے بغیر صرف اپنے تعلقات کو استعمال کرتے ہوئے یہاں تک آنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اپنے خاندان کو بے خبر رکھتے ہوئے۔

غلام فرید جیل کے ایک اہلکار کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوا تھا، جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں نے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر وہ جیل اہلکار وہاں سے چلا گیا۔ غلام فرید کچھ نروس انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کئی لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"آپ نے مجھے پہچانا؟"

"نہیں۔" ایک لمحہ کی تاخیر کے بعد غلام فرید نے کہا۔

"میں آپ کی سب سے چھوٹی بیٹی ہوں۔ جسے مارنا بھول گئے تھے آپ۔" وہ طنز نہیں تعارف تھا اور اس کے علاوہ اپنا تعارف کسی اور طرح سے نہیں کروا سکتی تھی وہ۔

"چنی۔" بہت دیر غلام فرید اس کا چہرہ دیکھتے رہنے کے بعد بے ساختہ بڑبڑایا تھا۔ رئیسہ نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئی تھیں۔ اس کے باپ نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ اب اس کا وہ نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس نے لکھوایا تھا پر یاد نہیں کر سکا۔ اس نے بیٹی کو ایک بار پھر دیکھا۔ بغور دیکھا۔ وہ میم صاحب لگ رہی تھی۔ اپنی سانولی رنگت کے باوجود۔ اس کی بیٹی تو نہیں لگ رہی تھی۔ وہ جانتا تھا اس کی آخری اولاد کی پرورش سالار سکندر نے کی ہے۔ یہ اسے ان لوگوں نے بتایا تھا جو بار بار اسے بہت کچھ یاد کرواتے اور بار بار دہراتے رہے تھے۔ اسے بچی کو دیکھ کر اپنی بیوی یاد آئی تھی۔ نیلی جینز اور سفید شرٹ میں بال ایک جوڑے کی شکل میں لپیٹے، گلاسز آنکھوں پر لگائے، گلے میں ایک باریک چین میں لٹکتا اللہ کے نام کا لاکٹ پہنے، کلائی میں ایک قیمتی گھڑی پہنے اس کے سامنے ایک کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے چنی نے اسے اس کی بیوی کی جو چنی کی ماں تھی ہی یاد دلائی تھی۔ اس کے نین نقش ویسے ہی تھے۔ سارے حلیے میں صرف نین نقش ہی تھے جو وہ پہچان پایا تھا، ورنہ وہ بیمار رہنے والی لاغر، کمزور اور ہر وقت روتی ہوئی چنی ایسے بن گئی تھی کہ اس کے سامنے بیٹھے غلام فرید کو اس کے سامنے اپنا وجود کمتر لگنے لگا تھا۔ پتا نہیں اپنی ایک بچ جانے والی اولاد کو ایسے اچھے حلیے میں دیکھتے ہوئے غلام فرید کو ایک عجیب سی خوشی بھی ہوئی تھی۔ وہ اس کیسے بھول گیا تھا کہ وہ اپنی اس اولاد پر ناجائز اولاد کا لیبل لگا رہا تھا۔ برسوں بعد اس نے کوئی "اپنا" دیکھا تھا اور اپنا دیکھ کر وہ پھر [illegible] گیا تھا۔

ایک لفافے میں موجود کچھ کھانے پینے کی چیزیں اس نے باپ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
"یہ میں آپ کے لیے لائی تھی۔" غلام فرید نے عجیب حیرت سے اس لفافے کو دیکھا اور پھر کانپتے ہاتھوں سے اسے تھام لیا۔ وہ سارے سوالات جو وہ غلام فرید سے کرنا چاہتی تھی' ایک دم توڑتے چلے گئے تھے۔ وہ نحیف و نزار شخص جو اس کے سامنے اپنی زندگی کی آخری سیڑھی پر کھڑا تھا اس سے وہ سوال جواب کرنا بے کار تھا۔ اسے اس پر ترس آگیا تھا' وہ اسے اب کسی کٹہرے میں کھڑا نہیں کرنا چاہتی تھی۔
غلام فرید نے گلاسز اتار کر اپنی آنکھیں صاف کرتی ہوئی اس لڑکی کو دیکھا جس نے کچھ دیر پہلے اس سے اپنا تعارف کرایا تھا۔
"تم پڑھتی ہو؟" اس نے پوچھا عجیب سے انداز میں۔
رئیسہ نے سر اٹھا کر غلام فرید کا چہرہ دیکھا' پھر سر ہلایا۔
غلام فرید کا چہرہ چمکا۔ "زیادہ پڑھنا۔"
رئیسہ کی آنکھوں میں نمی پھر اتری۔
"میں اور تمہاری ماں سوچتے تھے' سبھی پڑھائیں گے بچوں کو زیادہ۔ اور..." غلام فرید نے یادوں کے کسی دھند لکے کو لفظوں میں بدلا پھر چپ ہو گیا۔
"صاحب کو میرا شکریہ کہنا اور دوبارہ جیل مت آنا۔" غلام فرید نے چند لمحے بعد کہا اور رئیسہ کی آنکھوں کی نمی اب اس کے گالوں پر بہنے لگی تھی۔ غلام فرید کے لیے سالار سکندر ایک بار پھر "صاحب" ہو گیا تھا۔ اپنی اولاد کو ایسی اچھی حالت میں دیکھ کر رئیسہ کو لگا تھا اس کا باپ شرمندہ بھی تھا۔
وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ وہ بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور اس نے رئیسہ کے سر پر ہاتھ پھیرا' وہ اسے گلے لگاتے ہوئے جھجکا تھا... شاید لگانا چاہتا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر خود غلام فرید کے گلے لگ گئی پھر وہ اس سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا... اپنے باقی بچوں اور بیوی کے ناموں کو پکارتے ہوئے۔



وہ بڑا ہلکا وجود لیے امریکہ واپس آئی تھی اور امریکہ پہنچ کر اس نے اپنا نمبر آن کیا تھا اور اس کا فون یک دم سارے رشتوں سے جاگنے لگا تھا۔ پیغامات کا انبار تھا اس کی فیملی کی طرف سے' ایئرپورٹ سے گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ ان سب پیغامات کو پڑھتی گئی تھی۔ نم آنکھوں کے ساتھ... ایک کے بعد ایک پیغام۔
اور پھر ایک آخری پیغام ہشام کی طرف سے... بادشاہ نے تخت چھوڑ دیا تھا... کیوں؟... اس نے یہ نہیں لکھا تھا۔ اسے حمین یاد آیا تھا' اس کے لفظ۔
گھر کے باہر سالار کے ساتھ ساتھ حمین کی بھی گاڑی تھی۔ رئیسہ نے بیل بجائی۔ کچھ دیر بعد یہ سالار سکندر تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔
دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ آگے بڑھ کر سالار سے لپٹ گئی تھی' بالکل اسی طرح جب وہ ڈیڑھ سال کی عمر میں اس سے لپٹی تھی اور پھر الگ نہیں ہوئی تھی۔ سالار اسے بچوں کی طرح تھپکتا رہا۔ وہ امریکہ واپس آنے سے پہلے پاکستان میں ایک پریس کانفرنس میں اپنی ولدیت کا ٹیسٹ اور غلام فرید کا بیان میڈیا کے ساتھ شیئر کر کے آئی تھی اور ایک وکیل کے ذریعے اپنے خاندان کی واحد وارث ہونے کے طور پر اپنے باپ کو معاف کرنے کا حلف نامہ بھی۔ وہ طوفان جو سالار سکندر اور اس کے خاندان کو ڈبونے کے لیے آیا تھا' وہ اس بار رئیسہ نے روکا تھا۔

اور وہاں اب سالار سکندر کے سینے سے لگی بچوں کی طرح روتی رئیسہ کو دیکھتے ہوئے اسے کوئی دلیر نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ بھی سالار سکندر کا حصہ تھی۔ خون کا رشتہ نہ ہونے کے باوجود رحم اور مہربانی کے مضبوط ترین رشتوں سے ان کے ساتھ جوڑی گئی۔

اپنے نام کے ساتھ سالار کا نام استعمال کرتے ہوئے بھی وہ اپنے باپ کے نام سے واقف تھی مگر وہ باپ جیل میں سزائے موت کا ایک قیدی تھا' سالار کا دوست نہیں' وہ اس سے واقف نہیں تھی۔

اور اس "واقفیت" کے بعد اسے اس خاندان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو گیا تھا جو اس کا تعارف تھا۔

"میں نے تمہیں رونا تو کبھی نہیں سکھایا رئیسہ۔ نہ ہی رونے کے لیے تمہاری پرورش کی ہے۔" سالار نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ وہ اب اپنے آنسوؤں پر قابو پا رہی تھی اور اس نے سالار کے عقب میں کھلے دروازے سے حمین اور امامہ دونوں کو دیکھا تھا۔

"آخری بار روئی ہوں بابا۔" اس نے گیلی آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہنے کی کوشش کی اور اس کی آواز پھر بھرا گئی۔

"تم ہماری فیملی کا حصہ ہو۔" سالار نے اسے جتانے والے انداز میں کہا۔ "اور تم سمجھدار اور بہت بہادر ہو۔ ہم نے یہی سکھایا ہے تمہیں۔"

وہ جیسے اسے یاددہانی کرا رہا تھا۔ وہ سر ہلانے لگی تھی۔ زندگی میں کبھی کوئی ایسا موقع آتا جب وہ انہیں اپنی احسان مندی دکھا سکتی تو انہیں جتاتی کہ اپنے حقیقی باپ سے ملنے کے بعد اسے پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ وہ بے حد خوش قسمت تھی۔ واقعی خوش قسمت تھی کہ وہ سالار سکندر کے خاندان کا حصہ بنی تھی' اسے وہ اپنا سمجھتے تھے۔



نو بج کر پندرہ منٹ پر بالآخر لفٹ کا دروازہ کھلا تھا اور حمین سکندر اپنے دو ذاتی محافظوں کے پیچھے باہر نکلا تھا۔ اس کے پیچھے اس کے عملے کے باقی افراد تھے۔ کوریڈور میں پریس فوٹوگرافرز اور چینلز کے افراد بھی تھے جو ہر آنے والی اہم شخصیت کی کوریج کر رہے تھے۔ اس سے پانچ منٹ پہلے وہاں سے سالار سکندر گزر کر گیا تھا اور اب وہ وہاں آیا تھا۔۔۔ دونوں تقریب کے دو اہم ترین افراد تھے۔

بے حد تیز رفتاری سے قدم اٹھاتے ہوئے حمین سکندر کوریڈور میں اپنی آمد کی کوریج کرتے پریس فوٹوگرافرز پر نظر ڈالتے اپنا استقبال کرتے حکام کے ساتھ بڑی تیزی سے بینکوئٹ ہال کے داخلی دروازے کی طرف جا رہا تھا' جب اسے یک دم اپنے عقب میں آتے اپنی ٹیم کے ایک ممبر سے کچھ پوچھنے کا خیال آیا۔ اپنے چیف فنانس اسسٹنٹ سے۔۔۔ وہ لمحہ بھر کے لیے رکا' پلٹا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتا' اس نے اپنی گردن کی پشت میں کوئی سلاخ گھستی محسوس کی۔ پھر شیشہ ٹوٹنے کی آوازیں اور پھر چیخوں کی اور پھر کوئی اسے زمین پر گراتا ہوا اس پر لیٹا تھا۔۔۔ پھر کوئی چیخا تھا۔

"سامنے والی بلڈنگ سے گولی چلائی گئی ہے۔"

اور اس وقت پہلی بار حمین کو احساس ہوا اس کی گردن کی پشت پر کیا ہوا ہے۔ تکلیف شدید تھی' ناقابل برداشت تھی۔ وہ حواس میں تھا۔ سب کچھ سن رہا تھا۔ اسے اب زمین پہ ہی گھسیٹتے ہوئے اس کی سیکیورٹی ٹیم وہاں سے لفٹ کی طرف لے جا رہی تھی اور اس وقت حمین کو پہلی بار سالار سکندر کا خیال آیا تھا اور اس کا دل اور دماغ

بیک وقت ڈوبے تھے۔



سالار سکندر نے بینکوئٹ ہال میں اسٹیج پر رکھی اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے' اپنی تقریر کے نوٹس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اس بینکوئٹ ہال کے داخلی دروازے کے بالمقابل شیشے ٹوٹنے کی آواز سنی تھی۔ اس نے بے یقینی سے بہت دور کھڑکی کے اس شیشے کی گرتی کرچیاں دیکھی تھیں۔ وہ ساؤنڈ پروف بلٹ پروف شیشے تھے۔ ٹوٹ کیسے رہے تھے؟ ایک لمحہ کے لیے اس نے سوچا تھا اور پھر اس نے ہال کے عقبی حصے اور باہر کوریڈور میں شور سنا تھا اور اس سے پہلے وہ کچھ سمجھ سکتا' اس سمیت اسٹیج پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو سیکیورٹی گارڈز کور کرتے ہوئے اسٹیج کے عقب میں کھینچتے ہوئے فرش پر لیٹنے کا کہہ رہے تھے۔ ہال میں اب شور تھا۔ گارڈز چلا چلا کر احکامات دے رہے تھے اور جس جس اہم شخصیت کے ساتھ جو بھی سیکیورٹی پر مامور تھے وہ اسے محفوظ کرنے میں مصروف تھے۔ وہاں موجود ہر شخص خاص تھا۔ اہم۔ وہ دنیا کے کامیاب انسانوں کا مجمع تھا' جو اب زندگی بچانے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔

اور وہاں زمین پر اوندھے منہ لیٹے سالار کو حمین کا خیال آیا تھا اور اس کا دل کسی نے مٹھی میں لیا تھا۔ ہال میں اس کے بعد حمین سکندر کو داخل ہونا تھا۔ اور وہ نہیں آیا تھا۔ تو کیا یہ حملہ اس پر۔ وہ سوچ نہیں سکا' وہ زمین سے اٹھ گیا' گارڈز نے اسے روکنے کی کوشش کی' اس نے انہیں دھکا دیا اور چلایا۔

"دور ہٹو۔" وہ اس کے پیچھے لپکے تھے۔ وہ زمین پر لیٹے لوگوں کو پھلانگتا' کھڑے گارڈز سے ٹکراتا داخلی دروازے تک آ گیا تھا جو اس وقت سیکیورٹی حکام سے بھرا ہوا تھا۔ اور اس ہجوم میں بھی اس نے رہشن رنر کے ساتھ سفید ماربل کے فرش پر خون کے نشانات دیکھے تھے جو پورے فرش پر لفٹ تک گئے تھے۔

"کس کو گولی لگی ہے؟" اس نے اپنے سرد ہوتے وجود کے ساتھ وہاں ایک سیکیورٹی آفیشل کا کندھا پکڑ کر پوچھا۔

"حمین سکندر۔" سالار کے قدموں سے جان نکل گئی تھی' وہ لڑکھڑایا تھا۔ ان دونوں سیکیورٹی گارڈز نے اسے سنبھالا۔

"کیا وہ زندہ ہے؟" اس نے اس سیکیورٹی اہلکار سے دوبارہ پوچھا۔ جواب نہیں آیا۔



امامہ اس ہوٹل کے ساتویں فلور پر سالار سکندر کے کمرے میں تھی۔ وہ ایک سوئٹ تھا اور ان کے برابر کے کمرے میں حمین رہ رہا تھا۔ امریکہ شفٹ ہو جانے کے بعد امامہ' سالار کے ہر سفر میں اس کے ساتھ جا رہی تھی۔ اس سفر میں حمین بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ اسی کے ذاتی طیارے پر آئے تھے۔ وہ افریقہ دو دہائیوں سے بھی زیادہ عرصے کے بعد آئی تھی اور اس بار وہ کانگو بھی جانا چاہتے تھے۔ اپنی پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے۔ ان تینوں نے کچھ دیر پہلے اکٹھے ہی کمرے میں ناشتا کیا تھا۔ اس کانفرنس کے بعد وہ سہ پہر کو کنشاسا جانے والے تھے اور امامہ اس وقت اپنی پیکنگ میں مصروف تھی۔ وہ کچھ ہی دیر پہلے اس سوئٹ میں اپنے اور حمین کے بیڈ روم کا درمیانی دروازہ کھول کر اس کا سامان بھی پیک کر آئی تھی۔ اپنے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے اس نے اپنے کمرے کے دروازے پر زوردار دستک سنی تھی۔ وہ بری طرح ہڑبڑائی' پھر اس نے جا کر دروازہ کھولا۔ پورا کوریڈور سیکیورٹی حکام سے بھرا ہوا تھا اور وہ تقریباً" ہر کمرے کے دروازے پر تھے۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ کیوں؟" اس نے حیرانی سے کہا۔ وہ دونوں بڑی تہذیب سے اسے ہٹاتے ہوئے اندر چلے آئے تھے اور انہوں نے اندر آتے ہی کھڑکی کے کھلے ہوئے بلائنڈز بند کیے۔ پھر ان میں سے ایک حمین کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا اور کچھ دیر بعد لوٹا۔

"کیا بات ہے؟" امامہ اب شدید تشویش کا شکار ہوئی تھی۔

"ایک ایمرجنسی ہو گئی ہے۔ آپ کمرے سے باہر مت نکلیں۔ اگر کچھ مسئلہ ہو تو ہمیں بتا دیں۔" ان میں سے ایک اسے کہہ رہا تھا' دوسرا اس کا باتھ روم اور وارڈ روب برق رفتاری سے چیک کر آیا تھا۔ وہ جس تیز رفتاری سے آئے تھے اسی تیز رفتاری سے باہر نکل گئے تھے۔

امامہ پر جیسے گھبراہٹ کا حملہ ہوا تھا۔ وہ سالار اور حمین کو اس وقت فون نہیں کر سکتی تھی کیونکہ فون سروس اس وقت کام نہیں کر رہی تھی مگر اس نے ٹی وی آن کر لیا تھا' جہاں پر مقامی اور بین الاقوامی چینلز اس کانفرنس کی براہ راست کوریج کرنے میں مصروف تھے۔ اسکرین پر پہلی تصویر ابھرتے ہی امامہ کھڑی نہیں رہ سکی' وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ ٹی وی کی اسکرین پر وہ ٹوٹی ہوئی کھڑکی تھی اور بینکوئٹ ہال کے باہر ڈرون کیمروں کے ذریعے فضائی مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ اسکرین پر سرخی بار بار نمودار ہو رہی تھی۔ جو اس گلوبل کانفرنس پر ہونے والے حملے اور فائرنگ کی خبر بریکنگ نیوز کی طرح سے چلا رہے تھے۔ مگر وہ نیوز نہیں تھی جس نے امامہ کو بدحواس کیا تھا۔ وہ ٹکر تھا جو بار بار آ رہا تھا۔

"ٹی اے آئی کے سربراہ حمین سکندر اس حملے میں شدید زخمی۔"

امامہ کو لگا اسے سانس آنا بند ہو گیا ہے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی وہ اٹھ نہیں سکی۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی تھی مگر وہ چیخ بھی نہیں سکی۔ افریقہ اس کے لیے منحوس تھا۔ اس نے سوچا تھا اور اپنے کمرے کے دروازے پر اس نے خود ہڑاہٹ سنی اور پھر اس نے حمین سکندر کے کمرے کا دروازہ کھلتے دیکھا۔



سالار سکندر کو سیکیورٹی حکام روک نہیں پائے تھے۔ پکڑنے' سمجھانے' آگے جانے سے روکنے کی کوشش کے باوجود۔ وہ برق رفتاری سے ان چار لفٹس میں سے اس لفٹ کی طرف گیا تھا جس طرف خون کے وہ نشانات گئے تھے۔ سیکیورٹی حکام اب اسے عقب سے کور کر رہے تھے۔ وہ اسی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا' جہاں اب شیشہ نہیں تھا اور اس کے سامنے کی عمارت سے فائرنگ ہوئی تھی۔ سامنے والی عمارت کو اب گھیرے میں لیا جا رہا تھا اور جب تک وہاں سیکیورٹی کلیئرنس نہیں ہو جاتی' وہ وہاں سے کسی کو ایک بار پھر ان کھڑکیوں کے سامنے سے گزر کر لفٹس تک جانے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ مگر سالار سکندر کو وہ کوشش کے باوجود نہیں روک سکے تھے۔

لفٹ کا دروازہ اب کھل گیا تھا اور اس کا فرش بھی خون آلود تھا۔ بہت زیادہ نہیں لیکن فرش یہ بتا رہا تھا کہ وہ جو بھی تھا' شدید زخمی تھا۔ لفٹ کے اندر پہنچنے کے بعد سالار کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کے بعد آگے کیا کرے۔ وہ اپنے بیٹے کے خون پر بھی قدم رکھنے کی جرات نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی سیکیورٹی حکام اس کے پیچھے اندر گھسے تھے اور انہوں نے دروازہ فوری طور پر بند کیا اور پھر جیسے سکون کا سانس لیا۔

"اسے کہاں لے کر گئے ہیں؟" سالار نے کھوکھلی آواز کے ساتھ پوچھا۔

"ہمیں نہیں پتا سر!" ان میں سے ایک نے جواب دیتے ہوئے ساتویں منزل کا بٹن دبایا۔

"مجھے حمین کے پاس جانا ہے۔" وہ چلایا تھا۔
وہ دونوں خاموش رہے۔ لفٹ برق رفتاری سے حرکت میں تھی۔



حمین کے کمرے کے کھلے دروازے میں حمین کھڑا تھا۔ اس کی سفید شرٹ خون آلود تھی اور وہ سیاہ کوٹ بھی اس کے جسم پر نہیں تھا جو وہ پہن کر گیا تھا۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ اسکرین پر ابھی بھی اس پر ہونے والے حملے کی تفصیلات چل رہی تھیں۔ اور وہ اپنے پیروں پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ امامہ اٹھی پھر دوبارہ بیٹھ گئی۔ اس کی خون آلود شرٹ اس کی جان نکال رہی تھی اور اس کا اپنے پیروں پر کھڑا وجود اسے زندگی بخش رہا تھا۔
وہ ایک بار پھر اٹھی اور بھاگتے ہوئے اس نے جا کر حمین کو اپنے ساتھ لپٹایا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں ممی۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ کہہ رہا تھا۔
"بابا کہاں ہیں؟" اس نے امامہ سے اگلا سوال کیا تھا اور امامہ کو پہلی بار سالار کا خیال آیا۔ تب ہی دروازہ دوبارہ دھڑ دھڑایا گیا اور وہ اپنے قدموں پر چلتا دروازے تک گیا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے بالکل سامنے سالار سکندر کھڑا تھا۔ چند لمحوں کے لیے باپ بیٹا ایک دوسرے کو دیکھ کر جامد ہوئے تھے، پھر سالار آگے بڑھا اور شادیٔ مرگ کی سی کیفیت میں اس نے حمین کو لپٹایا تھا۔ زندگی میں پہلی بار حمین سکندر نے سالار سکندر کی گرفت کو اتنا سخت پایا تھا کہ اسے لگا اس کا دم گھٹ جائے گا۔ اسے اپنی گردن کی پشت سے بہتے خون سے اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی جتنی اپنے گالوں کو نم کرتے سالار کے آنسوؤں سے۔
"سالار کے خاندان میں سے اس کا جانشین کون ہوگا۔" اس کی پشت سے رستا خون اس کا اعلان کر رہا تھا۔
"بابا! میں ٹھیک ہوں۔ آئیں دوبارہ چلتے ہیں کانفرنس ہال میں۔" سالار نے اپنے کانوں میں مستحکم آواز میں کہی ہوئی ایک سرگوشی سنی تھی۔



وہ افریقہ کی تاریخ کا یادگار ترین دن تھا جب کئی سالوں بعد تاریخ ایک بار پھر دہرائی جا رہی تھی۔
بینکوئٹ ہال میں تمام وفود ایک بار پھر اپنی سیٹوں پر براجمان تھے۔ خوف و ہراس کی ایک عجیب سی فضا میں بے حد ناخوش گوار مگر کانفرنس جاری تھی۔ منسوخ نہیں ہوئی تھی۔ اس کھڑکی کا وہ شیشہ اسی طرح ٹوٹا ہوا تھا مگر اب سامنے والی بلڈنگ سیکیورٹی حکام کے حصار میں تھی۔ کانفرنس ایک گھنٹے کی تاخیر سے اب دوبارہ شروع ہونے جا رہی تھی۔
سالار سکندر اور حمین دونوں امامہ کے کمرے میں تھے۔ میڈیکل ٹیم حمین کو فرسٹ ایڈ دے چکی تھی اور فرسٹ ایڈ دینے کے دوران انہیں پتا چلا تھا کہ گولی اس کی گردن میں نہیں گھسی تھی۔ وہ اس کی گردن کی پشت پر رگڑ کھاتی اور جلد اور کچھ گوشت اڑاتے ہوئے گزر گئی تھی۔ اس کی گردن پر تین انچ لمبا اور آدھ انچ گہرا ایک زخم بناتے ہوئے۔ میڈیکل ٹیم نے اس کی بینڈیج کر دی تھی اور پین کلر لگا کر اس کے اس زخم کو کچھ دیر کے لیے سن کیا تھا تاکہ وہ کانفرنس اٹینڈ کر سکے۔ اسے خون چڑھانا تھا لیکن وہ فوری طور پر اس کے لیے تیار نہیں ہوا تھا۔ اس وقت اس کے لیے اہم ترین چیز اس کانفرنس ہال میں دوبارہ بیٹھنا تھا۔ ان لوگوں کو دکھانا تھا کہ وہ اسے گرا نہیں سکے۔ ڈرا بھی نہیں سکے۔
سالار سکندر اس سے پہلے کمرے سے نکلا تھا اور اب کپڑے تبدیل کرنے کے بعد حمین سکندر امامہ سے گلے

مل رہا تھا۔ امامہ نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ سالار سکندر کا بیٹا تھا اسے کون روک سکتا تھا۔ اس نے صرف اسے گلے لگایا تھا ماتھا چوما اور دروازے پر رخصت کر دیا تھا۔

اس لفٹ کا دروازہ دس بج کر چالیس منٹ پر ایک بار پھر کھلا تھا۔ اس بار حمین سکندر کے ساتھ سیکیورٹی کا کوئی اہلکار نہیں تھا۔ صرف اس کے اپنے اسٹاف کے لوگ تھے۔ اس کے لفٹ سے کوریڈور میں قدم رکھتے ہی وہاں تالیوں کا شور گونجنا شروع ہوا تھا۔ وہ پریس فوٹو گرافرز اور اس کوریڈور میں کھڑے سیکیورٹی اہلکار تھے جو اسے اس دلیری کی داد دے رہے تھے جو وہ دکھا رہا تھا۔ لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اس نے ٹوٹے شیشے والی اس کھڑکی کو بھی دیکھا جو ہال کے داخلی دروازے کے بالکل سامنے ایک عجیب سا منظر پیش کر رہی تھی۔ اگرچہ اس کے سامنے اب سیکیورٹی اہلکاروں کی ایک قطار تھی۔

تیز قدموں سے لمبے ڈگ بھرتا حمین سکندر جب ہال میں داخل ہوا تھا تو ہال میں تالیاں بجنی شروع ہوئی تھیں پھر وہاں بیٹھے لوگ فوراً اپنی سیٹوں سے کھڑے ہو گئے تھے

حمین سکندر مسکراتا سر کے اشارے سے ان تالیوں کا جواب دیتا اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے لوگ آہستہ آہستہ کھڑا ہونے شروع ہوئے تھے اور پھر حمین نے سالار سکندر کو کھڑا ہوتے دیکھا تھا۔ حمین چلتے چلتے رک گیا تھا۔ وہ اس کے باپ کی طرف سے اس کی تعظیم تھی جو اسے پہلی بار دی گئی تھی۔ ایک لمحہ ٹھٹکنے کے بعد حمین سکندر نے اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیا تھا۔

دنیا بھر کے ٹی وی چینلز وہ مناظر دکھا رہے تھے۔ دلیری کا ایک مظاہرہ وہ تھا جو دنیا نے کئی سال پہلے اسی افریقہ میں سالار سکندر کے ہاتھوں دیکھا تھا' جرات کا ایک مظاہرہ یہ تھا جو آج اسی افریقہ میں وہ حمین سکندر کے ہاتھوں دیکھ رہے تھے۔

اسٹیج پر اب بی اے آئی اور ایس آئی ایف کے دونوں سربراہان مل رہے تھے اور اس میمورنڈم پر دستخط کر رہے تھے جس کے لیے وہ وہاں آئے تھے اور پھر اس کے بعد حمین سکندر نے تقریر کی تھی۔ اس نے اسی آخری خطبے سے اپنی تقریر کا آغاز کیا تھا جس کا حوالہ کئی سال پہلے اس کے باپ نے افریقہ کے اسٹیج پر دیا تھا۔

"بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہے بادشاہی اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔" اس نے سورۃ ملک کی آیات سے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔

"وہ ذات جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ آزمائش کرے تمہاری کہ کون تم میں سے زیادہ اچھا ہے عمل میں۔۔۔ اور وہ زبردست ہے بے انتہا اور معاف فرمانے والا بھی۔"

اس ہال میں ایسی خاموشی تھی کہ سوئی بھی گرتی تو اس کی آواز آتی۔ "بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کرنے پر قادر ہے جو کُن کہتا ہے تو چیزیں ہو جاتی ہیں۔ جو دشمنوں کی چالیں ان ہی پر الٹا دیتا ہے۔

وہ کئی سال پہلے ایس آئی ایف نے سود کے خلاف اپنی پہلی جدوجہد افریقہ سے شروع کی تھی' یہ وہ زمین تھی جس پر میرے باپ نے ایک سودی نظام کے آلۂ کار کے طور پر کام کرتے ہوئے سود کے خلاف کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سود کو جسے آخری خطبے میں نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام قرار دیا تھا اور اس آخری خطبے میں صرف سود نہیں تھا جس کے خاتمے کا فیصلہ کیا تھا' یہ مساوات بھی تھی جس کا حکم دیا گیا تھا۔ انسانوں کو ان کے رنگ' نسل' خاندانی نام و نسب کے بجائے صرف ان کے تقویٰ اور پارسائی پر جانچنے کا۔ ایس آئی ایف اور بی اے آئی آج اسی مشن کو آگے بڑھانے کے لیے دنیا کے سب سے بڑے گلوبل فنڈ کا قیام عمل میں لایا ہے۔"

وہ بات [illegible] آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ دیتا ہوا بات کر رہا تھا اور وہ

بھی سننے پر مجبور تھے کیونکہ وہ باعمل بہترین مسلمان تھے جن کے قول و فعل میں دنیا کو تضاد نظر نہیں آ رہا تھا۔ جو طاقت ور تھے تو دنیا ان کے دین کو بھی عزت دے رہی تھی اور اس دین کے پیغام بر کو بھی۔ وہ ایک گولی جو دنیا کی تاریخ بدلنے آئی تھی وہ کاتب تقدیر کے سامنے بے بس ہو گئی تھی۔

تاریخ ویسے ہی لکھی جا رہی تھی جیسے اللہ تعالیٰ چاہتا تھا اور وہ ہی لکھ رہے تھے جن کو اللہ نے منتخب کیا تھا۔

بے شک طاقت کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے۔ جس کی محبت وہ آب حیات ہے جو زندگی کو دوام بخشتا ہے اس دنیا سے اگلی دنیا تک۔



ترپ کا پتا

مارچ 2040ء

امریکہ کے اس اسپتال کے نیورو سرجری ڈپارٹمنٹ کے آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹر جس شخص کا دماغ کھولے بیٹھے تھے وہ آبادی کے اس دو اعشاریہ پانچ فیصد حصے سے تعلق رکھتا تھا جو ایک سو پچاس آئی کیو لیول کے ساتھ غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل تھے۔

وہ آپریشن آٹھ گھنٹے سے ہو رہا تھا اور ابھی مزید کتنی دیر جاری رہنا تھا' یہ کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ ڈاکٹرز کی اس ٹیم کی سربراہی کرنے والا ڈاکٹر دنیا کے قابل ترین سرجنز میں سے ایک مانا جاتا تھا۔ آپریشن تھیٹر سے منسلک ایک گلاس روم میں سرجری ریذیڈنٹس اس وقت جیسے سحر زدہ معمول کی طرح اس ڈاکٹر کے چلتے ہوئے ہاتھوں کو بڑی اسکرین پر دیکھ رہے تھے جو اس کھلے ہوئے دماغ پر یوں کام کر رہا تھا جیسے کسی پیانسٹ کی انگلیاں ایک پیانو پر۔ وہ اپنی مہارت سے سب پر سحر طاری کیے ہوئے تھا' سوائے اس ایک شخص کے جس کی زندگی اور موت اس وقت اس کے ہاتھ میں تھی۔

آپریشن کے دوران وہ نیورو سرجن چند لمحوں کے لیے رکا تھا۔ ایک نرس نے بڑھ کے اس کے ماتھے پر ابھرنے والے قطروں کو ایک کپڑے سے خشک کیا۔ وہ شخص ایک بار پھر اپنے سامنے آپریشن تھیٹر کی ٹیبل پر پڑے ہوئے اس دماغ پر جھکا جو دنیا کے ذہین ترین دماغوں میں سے ایک تھا اور جو ایک گولی کا نشانہ بننے کے بعد اس کے سامنے آیا تھا۔

دنیا کی اہم ترین پوزیشن پر فائز رہنے والے اس شخص کے لیے اس ایمرجنسی میں اسے بلایا گیا تھا۔ وہ سرجن اب تک دو سو ستر اہم اور نازک ترین کامیاب سرجریز کرنے کے بعد اس وقت امریکہ کی تاریخ کا کم عمر اور سب سے قابل سرجن تھا۔ لیکن آج پہلی بار اسے لگ رہا تھا کہ اس کا وہ سو فیصد کامیابی کا ریکارڈ ختم ہونے والا ہے۔ وہ ایک بار پھر گہری سانس لے کر ٹیبل سے ہٹا۔ اسے کسی چیز کی ضرورت پڑی تھی اس آپریشن میں کامیابی کے لیے

